بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ
عَلٰى عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا (الفرقان)

وہ بابرکت ذات ہے جس نے اپنے محبوب بندہ پر تدریجاً الفرقان (قرآن کریم) نازل فرمایا تاکہ وہ تمام جہان والوں کے لیے (عذاب سے) ڈرانے والے ہو جائیں۔

تبیان القرآن

علامہ غلام رسول سعیدی

ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۝ (الفرقان:۱)

وہ بابرکت ذات ہے جس نے اپنے محبوب بندہ پر تدریجاً الفرقان (قرآن کریم) نازل فرمایا
تاکہ وہ تمام جہان والوں کے لیے (عذاب سے) ڈرانے والے ہو جائیں ۝

تبیان الفرقان

جلد سوم

التوبہ آیت: ۹۴ تا ۱۲۹ ☆ یونس ☆ ہود ☆ یوسف ☆ الرعد

☆ ابراہیم ☆ الحجر ☆ النحل ☆ بنی اسرائیل ☆ الکہف: ۱ تا ۷۴

علامہ غلام رسول سعیدی حفظہ اللہ تعالیٰ

شیخ الحدیث دارالعلوم نعیمیہ، کراچی ۳۸

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نام کتاب تبیان القرآن (جلد سوم)
مفسر علامہ غلام رسول سعیدی دامت برکاتہم العالیہ
شیخ الحدیث دار العلوم نعیمیہ، کراچی
ناشر محمد حفیظ البرکات شاہ
ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
سال اشاعت بار اول نومبر 2015ء
تعداد دو ہزار
کمپیوٹر کوڈ QT61

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور
داتا گنج بخش روڈ، لاہور۔ فون:۔ 042-37221953
9۔ الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور۔ فون:۔ 042-37225085
14۔ انفال سنٹر اردو بازار کراچی۔ فون:۔ 021-32210212
E.mail: info@zia-ul-quran.com www.zia-ul-quran.com
https://www.facebook.com/ziaulquranpublications

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مشمولات

(سورۂ توبہ تا سورۃ الکہف)

الخطبه

الحمد لله الذی نزل الفرقان علی عبدہٖ لیکون للعالمین نذیرا، والشکر لله ذی العزة القاهرة والقدرة الباهرة الذی اوجدنا بعد العدم وجعلنا الخیار الوسط من الأمم وخولنا عوارف لاتحصی الذی انزل الینا الفرقان الکریم والقرآن العظیم وعدفیه وبشر واوعد وحذّر وامَرَ وَنَهی وجعله الوسیلة العظمٰی والذریعة الفائزة۔

وافضل الصلوات والتسلیمات علی رسوله العظیم سیدنا محمدن الکریم شفیع الخلائق فی یوم الدین صاحب المقام المحمود والحوض المورود الناهض باعباء الرسالة وتبلیغ الکافیة صلی الله تعالٰی علیه وعلٰی آله واصحابه وازواجه صلٰوة مستمرة الدوام جدیدة علی مر اللیالی والایام۔

امابعد! فقد ذکرت فی تبیان الفرقان مباحث التفسیر وجمعت فیه احادیث النذیر والبشیر وحملت خواطری فیه علی التعب الخطیر فلیتصوب المرء فی تقریری وتحریری ولیعتذر فی تقصیری وخطئی وما ابرّئ نفسی عن الخطأ والنسیان وعلی الله التکلان وهو کثیر الغفران وحسبنا الله ونعم الوکیل نعم المولٰی ونعم النصیر۔

سبحان الله والحمد لله والله اکبر ولا حول ولا قوة الا بالله العلی العظیم، لآ اله الا الله وحدہٗ لا شریک لهٗ له الملک وله الحمد وهو علی کل شیء قدیر اللهم اغفرلی خطیئتی وجهلی واسرافی فی امری وما انت اعلم به منی انت المقدم وانت المؤخر وانت علی کل شیء قدیر۔ آمین یا رب العالمین بجاہ نبیک وحبیبک سید المرسلین!

ترجمۃ الخطبہ

تمام تعریفیں اللہ عزوجل کے ساتھ مخصوص ہیں جنہوں نے اپنے محبوب بندہ پر تدریجاً الفرقان (قرآن کریم) نازل فرمایا تاکہ وہ تمام جہان والوں کے لیے (عذاب سے) ڈرانے والے ہو جائیں، اور تمام نعمتوں کا شکر اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے جو بہت غلبہ والے ہیں اور بہت قدرت والے ہیں، جو ہم کو عدم سے وجود کی طرف لائے اور انہوں نے ہم کو تمام امتوں میں سے بہترین امت بنایا اور ہم کو بے شمار معارف عطا فرمائے، جنہوں نے ہماری طرف فرقان کریم اور قرآن عظیم کو نازل فرمایا، اس میں نیک اعمال کرنے پر اجر کا وعدہ ہے اور بشارت ہے اور بداعمالیوں پر وعید ہے اور عذاب سے ڈرایا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور کسی کام سے اللہ تعالیٰ کا منع فرمانا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس فرقان کو عظیم وسیلہ قرار دیا اور کامیابی کا ذریعہ بنایا۔

اور سب سے افضل درود اور سلام اس کے عظیم رسول پر نازل ہوں جن کا نام نامی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے، وہ کریم ہیں اور قیامت کے دن تمام مخلوقات کی شفاعت فرمانے والے ہیں، مقام محمود اور حوض کوثر پر فائز ہیں، جو رسالت کے بوجھ اور اس کی ذمہ داریوں کو اٹھانے والے ہیں اور کافی تبلیغ کرنے والے ہیں، اللہ تعالیٰ ان پر صلوٰۃ بھیجیں اور ان کی آل پر اور ان کے اصحاب پر اور ان کی ازواج پر ایسی صلوٰۃ جو ہمیشہ دن اور رات کے گزرنے کے ساتھ تازہ بہ تازہ نازل ہوتی رہے۔

حمد و صلوٰۃ کے بعد! میں نے "تبیان الفرقان" میں تفسیر کے مباحث ذکر کیے ہیں اور رسول معظم کی احادیث کو جمع کیا ہے جو عذاب سے ڈرانے والے ہیں اور ثواب کی بشارت دینے والے ہیں، میں نے اپنے دل میں اس عظیم کام کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھایا ہے، پس میں نے آیات کی جو تفسیر اور تقریر کی ہے اس میں کوئی شخص صواب کا پہلو تلاش کرے اور جو مجھ سے تقصیر اور خطا ہو گئی اس میں مجھ کو معذور قرار دے اور میں اپنے آپ کو خطاء اور نسیان سے بری نہیں سمجھتا اور اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسہ ہے اور وہ بہت مغفرت فرمانے والے ہیں اور ہمیں اللہ کافی ہیں اور وہ اچھے کارساز ہیں کیا خوب مالک ہیں اور کیا خوب مددگار ہیں!

اللہ تعالیٰ ہر نقص سے پاک ہیں اور تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں اور اللہ سب سے بڑے ہیں، اللہ بزرگ و برتر کی مدد کے بغیر نہ گناہوں سے باز رہنا ممکن ہے اور نہ نیکی کرنا ممکن ہے، انہیں کے لیے حمد ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہیں، اے اللہ! میری خطاؤں کو معاف فرما دیں اور جہالت سے کیے ہوئے میرے کاموں کو اور معاملات میں حد سے بڑھنے کو (معاف فرما دیں)، اور ان گناہوں کو معاف فرما دیں جن کو آپ مجھ سے زیادہ جاننے والے ہیں، آپ ہی مقدم کرنے والے ہیں اور آپ ہی مؤخر کرنے والے ہیں اور آپ ہر چیز پر قادر ہیں، اے رب العالمین! اس دعا کو اپنے نبی اور حبیب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے قبول فرمائیں۔

سلسبیل (افتتاحیہ)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نحمدہٗ ونصلی ونسلم علیٰ رسولہ الکریم!

اللہ جل شانہٗ کی بے حد و بے حساب ظاہری اور باطنی نعمتوں پر ہر لحظہ سپاس گزاری ہو اور اس کے افضل الرسل سیدنا محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء پر ہر آن مشامِ جان کو معطر کرنے والے صلوٰۃ وسلام کے گلہائے عقیدت نچھاور ہوں۔ جس نے انتہائی کم علم اور کم عمل شخص کو اتنا نوازا جتنا کبھی اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ میری تمناؤں اور آرزوؤں کے اتھاہ سمندروں میں کبھی یہ قطرۂ امید پیدا نہ ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کمزور، ناتواں اور ہیچ مداں شخص کو قرآنِ مجید کی تفاسیر اور احادیثِ صحیحہ کی تشریحات لکھنے کا موقع فراہم فرمائیں گے۔

اللہ کریم کا بے حد شکر ہے جس نے پہلے میرے ہاتھوں شرح صحیح مسلم کی تکمیل فرمائی، پھر مجھے تبیان القرآن کے نام سے تفسیر القرآن لکھنے کی عزت عطاء فرمائی اور اس کے بعد پھر میرے ناتواں ہاتھوں سے صحیح البخاری کی شرح نعم الباری کو تکمیل سے نوازا، میں اب عمر کے اس حصے میں پہنچ چکا ہوں اور ان گنت سخت اور جان لیوا بیماریوں کے تسلسل سے اس مرحلہ پر آچکا ہوں جہاں انسان کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سکون اور عافیت کے ساتھ زندگی کے بقیہ ایام گزار دیں اور عمر کے اس حصے میں انسان اپنے آپ کو کسی بڑے اور اہم کام کا اہل نہیں سمجھتا لیکن ہمیشہ سے میری یہ خواہش رہی ہے کہ اس حیاتِ مستعار کا جو وقت بھی اللہ تعالیٰ کے دینِ متین کی خدمت میں گزر جائے وہی زندگی کا حاصل ہے، سو اس نیت سے میں نے ایک نئے عزم اور ولولہ کے ساتھ ''تبیان الفرقان فی تفسیر القرآن'' لکھنے کا حوصلہ کیا، میں نے اس تفسیر کی پہلی جلد کو لکھنے کی ابتداء ۲ رجب المرجب ۱۴۳۵ھ/ 2 مئی 2014ء بروز جمعۃ المبارک کو کی تھی اور ۵ ذوالحجہ ۱۴۳۵ھ/ یکم اکتوبر 2014ء بروز بدھ اس کی پانچ پاروں پر مشتمل پہلی جلد مکمل ہو چکی ہے اور ۲۲ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۶ھ/ 14 مارچ 2015ء بروز ہفتہ تبیان الفرقان کی دوسری جلد بھی مکمل ہو چکی ہے، اور میں اب اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مسرور ہو کر اس کی تیسری جلد کا افتتاح کرنے لگا ہوں، میں نے اس جلد میں یہ کوشش کی ہے کہ اس میں قرآنِ مجید کی آیات کا ترجمہ انوار تبیان القرآن سے بالکل مختلف اور بے حد آسان ہو، اور اس کی تفسیر بھی تبیان القرآن کی تفسیر سے یکسر مختلف اور بے حد سہل اور دل نشیں ہو۔

بعض آزاد خیال (Liberal) لوگوں نے قرآن مجید کی تفسیر میں جو اپنے گمراہانہ افکار سمو دیے ہیں، میں نے اپنی بساط کے مطابق پوری کوشش کی ہے کہ ان کے ملحدانہ افکار کا قلع قمع کروں اور صدہا سال سے قرآن مجید کی جو تفسیر سلف صالحین سے منقول چلی آرہی ہے اسی کا دلائل و براہین سے احیاء کروں، میں نے اپنی اس تفسیر میں زیادہ تر احادیثِ صحیحہ سے استدلال کیا ہے اور ان احادیث کے جامع اور مکمل حوالہ جات تحریر کیے ہیں، اس تفسیر میں، میں نے صرف امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مسلک کو دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے اور دوسرے ائمہ کرام کے مسالک کو موضوعِ سخن نہیں بنایا ہے، اس موضوع پر میری پہلی تفسیر تبیان القرآن میں بہت زیادہ مواد پیش کیا جا چکا ہے اور دوسرے ائمہ کے مقابلہ میں فقہ حنفی کی ترجیح کو دلائل و براہین کے ساتھ رقم کیا جا چکا ہے، میں نے

یہاں پر اُن مباحث کا تکرار اور اعادہ نہیں کیا، جو حضرات اُن مباحث کو تفصیل کے ساتھ پڑھنا چاہیں وہ تبیان القرآن کا مطالعہ کرلیں، نیز عقائد کی ابحاث میں، میں نے اسلام کے مُسلّم عقائد کو تبیان القرآن کی بہ نسبت زیادہ تفصیل اور عمدگی سے لکھا ہے اور منکرین عظمت رسول اور منتقصین شانِ صحابہ واہل بیت کے رد و ابطال میں کوئی کمی نہیں چھوڑی اور جس کے ساتھ بھی اختلاف کیا ہے اس کی عزتِ نفس کو قائم رکھا ہے اور کہیں مجروح ہونے نہیں دیا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس تفسیر کو اپنی اور اپنے محبوب رسول کی بارگاہ میں مقبولیت سے نوازیں اور قیامت تک اس تفسیر کے مندرجات مینارۂ نور بنادیں۔ آمین یارب العالمین بجاہ حبیبک سید المرسلین۔

غلام رسول سعیدی غفرلہٗ

۲۲ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۶ھ/ 14 مارچ 2015ء

خادم الحدیث دارالعلوم جامعہ نعیمیہ

بلاک 15 فیڈرل بی ایریا، دستگیر، کراچی 38

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ؕ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ؕ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۹۴

اے مسلمانو! جب تم غزوۂ تبوک سے لوٹ کر منافقین کے پاس جاؤ گے تو وہ تمہارے سامنے اپنے نہ جانے کے حیلے اور بہانے پیش کریں گے، (اے رسولِ اکرم!) آپ (ان منافقین سے) کہیے: "تم عذر نہ تراشو ہم تمہارا اعتبار نہیں کریں گے، بے شک اللہ نے ہم کو تمہاری تمام خبریں بیان فرما دی ہیں، اور عنقریب اللہ اور اس کا رسول تمہارے کاموں کو دیکھیں گے، پھر تم کو عالم الغیب والشہادہ کی طرف لوٹا دیا جائے گا، پھر اللہ عزوجل تمہیں تمہارے اُن کرتوتوں کی خبریں دے گا جو تم کرتے رہے تھے" ۝

سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ؗ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۹۵

(اے مسلمانو!) جب تم ان منافقین کی طرف لوٹ کر جاؤ گے تو یہ تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے درگزر کرو، پس تم ان سے روگردانی کرو، بے شک یہ ناپاک ہیں اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے جو اُن کے کرتوتوں کی سزا ہے ۝

يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝۹۶

(اے مسلمانو!) وہ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ، پس اگر (بالفرض) تم ان سے راضی ہو گئے تو بے شک اللہ نافرمان لوگوں سے کبھی بھی راضی نہیں ہوتے ۝

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۹۷

دیہات کے رہنے والے منافق کفر اور نفاق میں (شہریوں سے) زیادہ سختی سے جمے ہوئے ہیں اور وہ اسی لائق ہیں کہ وہ ان احکام سے واقف نہ ہوں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل فرمائے ہیں، اور اللہ سب کچھ جاننے والے، سب سے زیادہ حکمت والے ہیں ۝

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۹۸

اور بعض دیہاتی ایسے ہیں کہ وہ جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس کو جرمانہ قرار دیتے ہیں اور وہ تم پر زمانہ کے حوادث اور

مصائب کے نزول کے منتظر رہتے ہیں، انہی پر گردشِ زمانہ کے مصائب نازل ہوں گے، اور اللہ تمام باتوں کو بہ خوبی سننے والے، سب کچھ جاننے والے ہیں O

وَمِنَ الۡاَعۡرَابِ مَنۡ يُّؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنۡفِقُ قُرُبٰتٍ عِنۡدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوۡلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرۡبَةٌ لَّهُمۡ ؕ سَيُدۡخِلُهُمُ اللّٰهُ فِىۡ رَحۡمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۹۹﴾

اور بعض دیہاتی ایسے ہیں جو اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، اور جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس کو اللہ کے تقرب اور رسول اللہ کی دعاؤں کے حصول کا ذریعہ قرار دیتے ہیں، سنو! بے شک ان کا اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ان کے تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے، عنقریب اللہ انہیں اپنی رحمت میں داخل فرمالیں گے، بے شک اللہ سب سے زیادہ بخشنے والے، سب سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”اے مسلمانو! جب تم غزوۂ تبوک سے لوٹ کر منافقین کے پاس جاؤ گے تو وہ تمہارے سامنے اپنے نہ جانے کے حیلے اور بہانے پیش کریں گے، (اے رسولِ اکرم!) آپ (ان منافقین سے) کہیے: ”تم عذر نہ تراشو ہم تمہارا اعتبار نہیں کریں گے، بے شک اللہ نے ہم کو تمہاری تمام خبریں بیان فرمادی ہیں، اور عنقریب اللہ اور اس کا رسول تمہارے کاموں کو دیکھیں گے، پھر تم کو عالم الغیب والشہادہ کی طرف لوٹا دیا جائے گا، پھر اللہ عزوجل تمہیں تمہارے اُن کرتوتوں کی خبر دیں گے جو تم کرتے رہے تھے“O (التوبہ: ۹۴)

منافقین کے جھوٹے اعذار کو قبول نہ فرمانا

علامہ ابوحفص عمر بن علی الدمشقی الحنبلی المتوفی ۸۸۰ھ، التوبہ: ۹۴ تا ۹۹ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”يَعۡتَذِرُوۡنَ اِلَيۡكُمۡ اِذَا رَجَعۡتُمۡ اِلَيۡهِمۡ“: روایت ہے کہ جو منافقین غزوۂ تبوک میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نہیں گئے تھے وہ اسی (۸۰) سے کچھ زیادہ افراد تھے، پس جب رسول اللہ ﷺ غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے تو وہ آپ کے سامنے آکر جھوٹے عذر پیش کرنے لگے، تب اللہ عزوجل نے فرمایا: ”قُلۡ لَّا تَعۡتَذِرُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَكُمۡ“: آپ کہیے کہ تم اب عذر پیش نہ کرو، ہم تمہارے جھوٹے اعذار کی ہرگز تصدیق نہیں کریں گے۔

”قَدۡ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنۡ اَخۡبَارِكُمۡ“: بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہارے احوال کی خبروں سے ہمیں مطلع فرمادیا ہے۔ اصل عبارت یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اطلاع فرمادی ہے کہ تم جھوٹے عذر پیش کررہے ہو، یہ اُن کے اعذار قبول نہ فرمانے کی دلیل ہے۔

”وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمۡ وَرَسُوۡلُهٗ“: اور عنقریب اللہ اور اس کا رسول تمہارے آئندہ کے کاموں کو دیکھیں گے کہ آیا تم اپنے نفاق سے توبہ کرتے ہو، یا تم اپنے نفاق پر برقرار رہتے ہو۔

"ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ": اگر یہ سوال کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کیوں نہیں فرمایا کہ پھر تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے بلکہ اللہ تعالیٰ کی صفت کا ذکر فرمایا کہ تم عالم الغیب والشہادۃ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اس لیے ہے تا کہ یہ جملہ اس پر دلالت کرے کہ اے منافقو! اللہ عزوجل تمہارے خبثِ باطن کو خوب جاننے والے ہیں اور تم نے اپنے دل میں جو جھوٹے اعذار اور سازشیں تیار کر رکھی ہیں، ان کو اللہ عزوجل خوب جاننے والے ہیں اور اس طور سے بیان فرمانے میں اُن کو بہت سختی کے ساتھ ڈرایا اور دھمکایا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "(اے مسلمانو!) جب تم ان منافقین کی طرف لوٹ کر جاؤ گے تو یہ تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھائیں گے تا کہ تم اِن سے درگزر کرو، پس تم ان سے روگردانی کرو، بے شک یہ ناپاک ہیں اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے جو اُن کے کرتوتوں کی سزا ہے O" (التوبہ: ۹۵)

"سَیَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَیْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ": اللہ تعالیٰ نے یہ بتلادیا کہ اے مسلمانو! جب تم غزوۂ تبوک سے لوٹ کر آؤ گے تو منافقین تمہارے سامنے اپنے ساتھ نہ جانے کے حیلے بہانے پیش کریں گے اور جھوٹی قسمیں کھا کر کہیں گے کہ: "وہ مسلمانوں کے ساتھ جانے پر قادر نہ تھے" تا کہ تم اُن سے درگزر کرو اور اُن کو ملامت نہ کرو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد ہے: تم اُن سے سلام اور کلام منقطع کر دو۔

اور مقاتل نے کہا کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس تشریف لائے تو آپ نے مسلمانوں سے فرمایا: "تم اُن کے ساتھ نہ بیٹھو اور نہ اُن سے کلام کرو" پھر اللہ تعالیٰ نے اُن سے اعراض کرنے کے حکم کا سبب بیان فرمایا، سو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "اِنَّهُمْ رِجْسٌ": اس کا معنی یہ ہے کہ ان کے باطن میں خبث ہے، روحانی نجاست ہے، پس جس طرح سے جسمانی نجاستوں سے احتراز کرنا واجب ہے، اسی طرح سے روحانی نجاستوں سے بھی بہ طریق اولیٰ احتراز کرنا واجب ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ ان کے اعمال قبیح ہیں، بہت برے ہیں۔ "وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ": اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

"المأوىٰ" کا معنی

علامہ اسماعیل بن حماد الجوہری الشافعی المتوفی ۳۹۸ھ لکھتے ہیں:

المأوی: ہر اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی شخص رات میں لوٹ کر آئے یا دن میں لوٹ کر آئے۔ کہا جاتا ہے: "قد اوٰی فلان الی منزلہ" یعنی فلاں شخص اپنے گھر لوٹ کر آ گیا، اسی سے اللہ عزوجل کا یہ ارشاد ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کا قول نقل فرمایا: "سَاٰوِیْۤ اِلٰى جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ" (ہود: ۴۳) "میں ابھی کسی پہاڑ کی طرف لوٹوں گا جو مجھے پانی کے اس طوفان سے بچالے گا"۔ (مختار الصحاح ص ۶۵، دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۲۹ھ)

"جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ": یعنی اُن کو ان کے کرتوتوں کی سزا دی جائے گی اور وہ جہنم میں لوٹ کر جائیں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "(اے مسلمانو!) وہ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تا کہ تم ان سے راضی ہو جاؤ، پس اگر (بالفرض) تم ان سے راضی ہو گئے تو بے شک اللہ نافرمان لوگوں سے کبھی بھی راضی نہیں

ہوتے O" (التوبہ:۹۶)

"یَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ": جب کہ پہلی آیت میں یہ بیان فرمایا تھا کہ منافقین اللہ کی قسمیں کھائیں گے تاکہ مسلمان اُن کو ایذاء پہنچانے سے باز رہیں، اور اس آیت میں بھی یہ بیان فرمایا ہے کہ وہ قسمیں کھائیں گے تاکہ مسلمان اُن سے راضی ہو جائیں، پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اُن سے راضی ہونے سے منع فرمایا اور اس کا سبب یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نافرمانوں سے راضی نہیں ہوتے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "دیہات کے رہنے والے منافق کفر اور نفاق میں (شہریوں سے) زیادہ سختی سے جمے ہوئے ہیں اور وہ اسی لائق ہیں کہ وہ ان احکام سے واقف نہ ہوں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل فرمائے ہیں، اور اللہ سب کچھ جاننے والے، سب سے زیادہ حکمت والے ہیں O" (التوبہ:۹۷)

"اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا": اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے مدینہ میں رہنے والے منافقین کے احوال ذکر فرمائے تھے اور اب اُن منافقین کا ذکر فرمایا ہے جو مدینہ سے باہر دیہاتوں میں رہتے ہیں، پس فرمایا: یہ اہل مدینہ کے منافقین سے کفر اور نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور ان کے دل قرآن مجید کو غور سے سننے سے بہت دور ہیں، اسی لیے اللہ عزوجل نے ان کے متعلق فرمایا: "وَاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ" اور وہ اسی لائق ہیں کہ وہ ان احکام سے واقف نہ ہوں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل فرمائے ہیں۔ نیز اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ مال فئے اور مال غنیمت میں ان منافقین کا کوئی حق نہیں ہے۔

لفظ الاعراب کی تحقیق

علامہ سید محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی حنفی متوفی ۱۲۰۵ھ، لکھتے ہیں:

عَرَبِیٌّ اور العُرُوْبِیَّۃ یہ دونوں لفظ ان مصادر میں سے ہیں جن کے افعال نہیں آتے۔ الازہری نے کہا ہے: جس شخص کا نسب عرب میں ثابت ہو اس کو رجل عربی کہا جاتا ہے خواہ وہ فصیح نہ ہو، اور اس کی جمع العرب ہے۔ اور جب وہ شخص فصیح ہو تو اس کو رجل معرب کہا جاتا ہے خواہ وہ عجمی النسب ہو، اور رجل اعرابی اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ دیہات کا رہنے والا ہو۔

اور الاعرابی کو جب یا عربی کہا جاتا ہے تو وہ اس سے خوش ہوتا ہے۔ اور العربی کو یا اعرابی کہا جائے تو وہ غضب ناک ہوتا ہے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا" (الحجرات:۱۴) "(دیہاتیوں نے کہا: "ہم ایمان لائے")، یہ دیہاتی وہ لوگ ہیں جو عرب کے جنگلوں میں رہتے تھے، یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ یہ لوگ صدقات کے لالچ میں مدینہ منورہ آئیں حالانکہ ان کو اسلام قبول کرنے کی کوئی رغبت نہیں تھی تو اللہ تعالیٰ نے ان کا نام الاعراب رکھا، پس فرمایا: "اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا" (دیہات کے رہنے والے منافق کفر اور نفاق میں (شہریوں سے) زیادہ سختی سے جمے ہوئے ہیں)۔

(تاج العروس من جواہر القاموس جز ۳ ص ۲۰۹، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۲۸ھ)

عَرَب، عَرَبِیُّوْن اور اَعْرَاب

اعرابی کو جب کہا جائے یا عربی تو وہ خوش ہوتا ہے اور عربی کو جب کہا جائے یا اعرابی تو وہ غضب ناک ہوتا ہے، پس جو شخص

عرب کے شہروں کو وطن بنائے وہ عرب ہیں اور جو دیہاتوں میں رہائش اختیار کرے، وہ اعراب ہیں۔ اور ان دونوں میں فرق کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عربوں کے متعلق فرمایا: "حب العرب من الایمان"۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قریش سے محبت رکھنا ایمان کی علامت ہے اور قریش سے بغض رکھنا کفر کی علامت ہے، اور العرب سے محبت رکھنا ایمان کی علامت ہے اور اُن سے بغض رکھنا کفر کی علامت ہے، پس جس نے عربوں سے محبت رکھی تو اس نے مجھ سے محبت رکھی اور جس نے عربوں سے بغض رکھا تو اس نے مجھ سے بغض رکھا"۔

(المعجم الاوسط: ٢٥٣٧، دار الفکر، بیروت، ١٤٢٠ھ، حلیۃ الاولیاء لابی نعیم ج ٢ ص ٣٣٣)

اور الاعراب کی اللہ تعالیٰ نے اس آیت (التوبہ: ٩٧) میں مذمت فرمائی ہے۔ نیز ایک حدیث میں الاعراب کے متعلق آپ کا ارشاد ہے: "سنو! کوئی عورت کسی مرد کی امامت نہ کرے اور نہ کوئی اعرابی مہاجر کی امامت کرے۔ الحدیث"۔

(سنن ابن ماجہ: ١٠٨١، سنن بیہقی ج ٣ ص ٩٠، ص ١٧١)

علامہ البوصیری نے کہا: اس حدیث کی سند ضعیف ہے، کیونکہ اس حدیث کی سند میں علی بن زید بن جدعان نام کا ایک راوی ہے اور عبد اللہ بن محمد العدوی نام کا راوی ہے اور یہ دونوں ضعیف ہیں۔ (زوائد ابن ماجہ علی الکتب الخمسہ ص ١٦٧، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ١٤١٤ھ)

عربوں کی وجہ تسمیہ

عرب کو عرب اس لئے کہا گیا ہے کہ ان کے باپ کا نام یعرب بن قحطان تھا سو وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے عربی میں کلام کیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کو عرب اس لئے کہا کہ اِن کے والد اسماعیل کی نشو و نما عربہ میں ہوئی اور یہ تہامہ ہے، پس اُن کو اُن کے شہر کی طرف منسوب کر دیا گیا اور ہر وہ جو جزیرۂ عرب میں رہتا ہے اور اُن کی زبان بولتا ہے، پس وہ عربوں میں سے ہے، کیونکہ یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے پیدا ہوئے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اِن کو عرب اس لئے کہا گیا کیونکہ ان کی زبانیں ان کے مافی الضمیر کو ظاہر کرنے والی تھیں، لیکن یہ اقوال صحیح نہیں ہیں۔ پہلی وجہ اس لیے صحیح نہیں ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام حضرت ہاجرہ سے پیدا ہوئے جو جرہم کے پاس ٹھہری تھیں، پس حضرت اسماعیل علیہ السلام انہی میں پلے بڑھے، اور جرہم حضرت اسماعیل علیہ السلام سے پہلے عرب تھے۔ اور دوسری وجہ اس لیے صحیح نہیں ہے کہ العرب العاربہ حضرت اسماعیل علیہ السلام سے پہلے تھے، انہی میں سے عاد، ثمود، طسم، جدیس، جرہم اور العمالقہ ہوئے ہیں۔ اور تیسری وجہ اس لیے صحیح نہیں ہے کہ ہر زبان اپنے مافی الضمیر کو اپنے مخاطب کے سامنے ظاہر کرتی ہے اور زیادہ ظاہر قول یہ ہے جو نسابین نے بیان کیا ہے کہ سام بن نوح ابو العرب ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ العرب سام بن نوح کے زمانہ سے موجود ہیں۔

اور بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے عربی زبان میں اور دوسری زبانوں میں کلام کیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: "وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا۔ (البقرہ: ٣١)" (اور اللہ نے آدم کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیے)۔

اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ عربی زبان فصاحت کی عظیم انواع کے ساتھ مخصوص ہے اس جیسی انواع دوسری زبانوں میں نہیں پائی جاتیں۔

(المقاصد النحویہ ج ٣ ص ٥٨٣، ہمع الہوامع ج ١ ص ٢٩، امالی ابن الحاجب ص ٣٦٣، اوضح المسالک ج ٢ ص ١٣٠، المقتضب ج ٣ ص ٢٥٠، ٢٧٥)

الاعراب کو کفر اور نفاق میں سب سے زیادہ سخت فرمانے کی توجیہات

(١) یہ لوگ دیہات کے رہنے والے تھے اور وحشی جانوروں کے مشابہ تھے۔

(٢) ان پر گرم اور خشک ہوا غالب تھی جس سے ان میں تکبر، فخر اور طیش کا اضافہ ہوا۔

(٣) انہیں کسی منتظم کی سیاست حاصل نہیں ہوئی نہ کسی ادب سکھانے والے نے ان کو ادب سکھایا، پس یہ جس طرح چاہتے تھے زندگی بسر کرتے تھے اور ہر جہت سے زیادہ فساد کرتے تھے۔

(٤) جو صحابہ صبح اور شام مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وعظ سنتے تھے اور آپ کے مؤثر بیانات سنتے تھے، ان کے مساوی وہ لوگ کیسے ہو سکتے تھے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مواعظ نہیں سنے، نہ ان تک آپ کی کوئی خبر پہنچی۔

(٥) تم پہاڑی پھلوں کا شہر کے باغات کے پھلوں سے مقابلہ کرو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ شہر کے پھلوں کے ذائقہ میں اور پہاڑی پھلوں کے ذائقہ میں کیسا فرق ہوتا ہے۔

اس کی توجیہ کہ ان کے متعلق فرمایا" اور وہ اسی لائق ہیں کہ وہ ان احکام سے واقف نہ ہوں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل فرمائے ہیں"

"وَاَجْدَرُ":

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی شافعی متوفی ٥٠٢ھ نے اس پر تنبیہ کی ہے کہ ان کو "اَجْدَر" کس وجہ سے فرمایا ہے، انہوں نے کہا کہ اجدر کا لفظ جدار سے ماخوذ ہے یعنی چار دیواری، اور الجدیر چار دیواری کی انتہا کو کہتے ہیں جہاں پر جا کر دیوار ختم ہو جاتی ہے، اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہ الجدر سے ماخوذ ہے جو درخت کی جڑ کو کہتے ہیں، پس گویا کہ ان کے خیالات اور ان کے مزعومات اس طرح ان کے دل میں پیوستہ ہوتے ہیں جس طرح جڑ زمین میں پیوستہ ہوتی ہے۔

"اَلَّا یَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ": اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر جو احکام نازل فرمائے اور جو حدود نازل فرمائیں، یہ ان سے نابلد ہیں، کیونکہ یہ لوگ دیہات میں رہتے تھے ان کا شہر میں آنا جانا نہیں تھا، اور قرآن مجید کے سننے سے اور احادیث کی معرفت سے یہ بہت بعید تھے۔

"وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ": یعنی اللہ تعالیٰ ان تمام چیزوں کو جاننے والے ہیں جو مخلوق کے دلوں میں ہوتی ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "بعض دیہاتی ایسے ہیں کہ وہ جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس کو جرمانہ قرار دیتے ہیں اور وہ تم پر زمانہ کے حوادث اور مصائب کے نزول کے منتظر رہتے ہیں، انہی پر گردش زمانہ کے مصائب نازل ہوں گے، اور اللہ تمام باتوں کو بہ خوبی سننے والے، سب کچھ جاننے والے ہیں O" (التوبہ:٩٨)

"وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یَّتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ مَغْرَمًا": اس سے مراد اسد، غطفان اور تمیم کے دیہاتی ہیں۔

مغرم کا معنی

"مغرم" کا معنی ہے الخسران یعنی نقصان، یہ الغرام سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی ہیں ہلاکت، قرآن مجید میں ہے:

"وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا۔ (الفرقان: ٦٥)" (اور جو عرض کرتے ہیں: "اے ہمارے رب! ہم سے جہنم کا عذاب دور فرما دیں، بے شک اس کا عذاب جسم کے ساتھ چمٹا رہتا ہے اور جسم سے الگ نہیں ہوتا)

کہا گیا ہے کہ اس کی اصل ہے الملازمۃ، کیونکہ یہ جسم کے ساتھ لازم رہتا ہے اور چمٹا رہتا ہے، اسی وجہ سے قرض خواہ کو الغریم کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی مقروض کے ساتھ لازم رہتا ہے اور چمٹا رہتا ہے اور اس سے مسلسل اپنے قرض کا مطالبہ کرتا رہتا ہے۔

عطاء نے کہا: یعنی یہ لوگ اللہ کی راہ میں اپنے خرچ پر کسی ثواب کی توقع نہیں رکھتے اور نہ خرچ نہ کرنے پر عذاب سے ڈرتے ہیں، وہ صرف دکھاوے، جرمانے اور تاوان کے طور پر خرچ کرتے ہیں۔

"وَيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ": الدوائر دائرۃ کی جمع ہے اور یہ وہ مصیبت ہے جو انسان کا احاطہ کر لیتی ہے جیسا کہ دائرہ اپنے مرکز کو محیط ہوتا ہے۔ اور "تربص الدوائر" کا معنی ہے: مصائب کا انتظار کرنا۔ یعنی یہ لوگ مسلمانوں کے اوپر گردشِ ایام کی وجہ سے مصائب کا انتظار کرتے ہیں۔ یمان بن رباب نے کہا: یعنی یہ لوگ اس کے منتظر ہیں کہ زمانہ مسلمانوں پر سے گزرے حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو جائیں اور مشرکین کا غلبہ ہو جائے۔

"السَّوء" اور "السُّوء" کا معنوی فرق

"عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ": امام اللغۃ خلیل بن احمد فراہیدی متوفی ١٧٥ھ، لکھتے ہیں:

ہر خراب اور ردی چیز کو "السُّوء" کہتے ہیں، اور "السُّوء" تمام آفات، مصائب اور بیماریوں کو جامع ہے، اور "السَّوء" مرد اور عورت کی شرم گاہ کو کہتے ہیں، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا۔ (طٰہٰ: ١٢١)" (پس اُن دونوں کی شرمگاہیں کھل گئیں)، اور "السّوأۃ" ہر برے کام اور بری بات کو کہتے ہیں، جب تم بہ طور نکرہ کہو تو کہو گے "رجل سَوء" اور جب تم معرفہ لا کر کہو تو کہو گے "ھذا الرجل السَّوء" اور اس کو بہ طور اضافت نہیں کہو گے، اور اضافت کے ساتھ کہو گے "ھذا عمل سَوئٍ" اور "العمل السُّوئ" نہیں کہو گے، کیونکہ السَّوء مرد کی صفت ہے اور السُّوء عمل کی صفت نہیں ہے۔ اور جیسے تم کہو گے: "رجل صدق" اور یوں نہیں کہو گے "الرجل الصدق"۔ اور رہا "السُّوء" تو جس کا بھی کسی برائی کے ساتھ ذکر کیا جائے تو وہ السُّوء ہے اور برص کے داغوں کا بھی السُّوئ سے کنایہ کیا جاتا ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ۔ (طٰہٰ: ٢٢)" (حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ بغیر برص کے چمکتا ہوا نکلے گا)، اور کہا جاتا ہے "لا خير في قول السُّوئِ" یعنی بری بات کہنے میں کوئی خیر نہیں ہے۔ اور "السُّوء" سے ہی "مَا سَاءَہ" کا لفظ ماخوذ ہے، اس کا معنی ہے: کسی بری بات یا برے خواب کا ناگوار ہونا۔

(کتاب العین ج ٢ ص ٨٧٠۔ ٨٧٢، انتشارات اسوہ، ایران، ١٤١٤ھ)

حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں، انہوں نے کہا: اے ابوبکرہ! مجھے کوئی ایسی حدیث سناؤ جو تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیک خواب کو پسند فرماتے تھے اور اس کے متعلق سوال کرتے تھے، پس ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آج رات تم میں سے کس نے خواب دیکھا ہے؟ پس ایک مرد نے کہا: "یا رسول اللہ! میں

نے خواب دیکھا ہے، میں نے دیکھا کہ آسمان سے ایک میزان کو لٹکایا گیا، پس آپ کا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ وزن کیا گیا تو آپ کا وزن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے زیادہ ہو گیا، پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ وزن کیا گیا، پس حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا وزن حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے زیادہ ہو گیا، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ وزن کیا گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وزن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے زیادہ ہو گیا، پھر میزان کو آسمان کی طرف اٹھا لیا گیا۔ "فاستاء لها رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم" یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خواب ناگوار ہوا، سو آپ نے فرمایا: "یہ خلافتِ نبوت ہے، پھر اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں گے سلطنت عطا فرما دیں گے۔

الشیخ شعیب الارنؤط نے اس حدیث کی شرح میں کہا ہے: عفان نے اس روایت میں بیان کیا ہے: "فاستاء لها" (مسند احمد: ٢٠٥٠٣) اور حماد نے کہا ہے "فساء ه ذالك" اور ہمیں اپنی روایت (مسند احمد: ٢٠٤٤٣) میں "فساء ه ذالك" ملا ہے اور دونوں کا معنی یہ ہے کہ آپ کو یہ خواب ناگوار گزرا۔ (مسند احمد: ٢٠٤٤٣)

نیز الشیخ شعیب الارنؤط نے کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے اور اس کی سند ضعیف ہے، کیونکہ اس حدیث کے رجال میں علی بن زید مذکور ہے جو کہ ابن جدعان ہے اور وہ ضعیف راوی ہے۔ اور اس حدیث کی سند کے باقی رجال ثقہ ہیں جو بخاری اور مسلم کے رجال ہیں۔

(مسند احمد: ٢٠٤٤٥، مسند ابوداؤد الطیالسی: ٨٦٦، غریب الحدیث ج ٣ ص ١٠٠، مصنف ابن ابی شیبہ ج ١١ ص ٦١-٦٠، ج ١٢ ص ١٨-١٩، سنن ابوداؤد: ٤٦٣٥، سنن ترمذی: ٢٢٨٧، (ہمیں سنن ابوداؤد اور سنن ترمذی میں "فاستاء لها" کا لفظ نہیں ملا)، السنہ لابن ابی عاصم: ١١٣١، ١١٣٢، ١١٣٣، ١١٣٥، ١١٣٦، مسند البزار: ٣٦٥٢، شرح مشکل الآثار للطحاوی: ٣٣٤٨، دلائل النبوۃ للبیہقی، ج ٦ ص ٣٤٢، المستدرک للحاکم ج ٣ ص ٧١، مستدرک میں اس حدیث کے آخر میں مذکور ہے: خلافتِ نبوت تیس سال رہے گی، پھر یا ایک دوسرے سے لڑنے والے بادشاہ ہوں گے۔ مؤسسۃ الرسالہ، بیروت، ١٤٢٠ھ)

شعیب الارنؤط اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں: امام ابوعبید نے کہا: "فاستاء لها" یہ لفظ المساءۃ سے ماخوذ ہے یعنی یہ خواب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار گزرا، کیونکہ اس حدیث میں مذکور ہے کہ خلافت کے بعد سلطنت کا یا دشاہت میں منتقل ہو جانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار گزرا، (غریب الحدیث لابی عبید ج ٣ ص ١٠٠)۔ ابن فارس نے کہا: امام ابوعبید کو مغالطہ ہوا، یہ لفظ "فاستاء لها" نہیں ہے، اس کی اصل ہے "استأول" یعنی آپ نے اس حدیث کی یہ تاویل کی کہ خلافت نبوت تیس سال رہے گی اور اس کے بعد بادشاہت ہو جائے گی۔

مسند احمد ٢٠٥٠٥ میں بھی یہ حدیث مذکور ہے اور اس کے آخر میں ہے "پھر میزان آسمان کی طرف اٹھا لی گئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خواب ناگوار ہوا، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خواب کی یہ تعبیر فرمائی کہ پہلے خلافتِ نبوت ہو گی، پھر اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں گے سلطنت عطا فرما دیں گے۔

راوی نے کہا: پھر ہم کو اس مجلس سے نکال دیا گیا، پھر اگلی صبح ہم دوبارہ آئے، پس ہم نے کہا اے ابوبکرہ! آپ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی حدیث بیان کریں تو انہوں نے بہت سختی سے کہا، پھر ہم لوگوں کو وہاں سے نکال دیا گیا، پھر تیسرے دن ہم لوٹے، پھر ان سے سوال کیا، وہ پھر سختی کے ساتھ پیش آئے، تب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: تم کہتے ہو کہ میں بادشاہ ہوں، فقد

رضينا بالملك، ہم اس بادشاہت پر راضی ہیں۔ (مسند احمد: ۲۰۵۰۵، مؤسسۃ الرسالہ بیروت، ۱۴۲۰ھ)

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "فاستاء له" کا معنی ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خواب کی تعبیر بیان فرمائی۔

امام ابوزکریا یحییٰ بن زیاد فراء حنفی، المتوفی ۲۰۷ھ لکھتے ہیں:

"السوء" کا معنی ہے: الهلاء اور العذاب، اور ابوالبقاء نے کہا: اس کا معنی ہے ضرر اور شر۔ اور اس کا معنی ہے الفساد والرداءة، اور دوسروں نے کہا کہ جب "السوء" پر پیش ہو یعنی السُّوء تو اس کا معنی ہے عذاب اور ضرر، جیسے قرآن مجید میں ہے: "وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ (البقرہ: ۴۹)" (اور (اے بنی اسرائیل! اس وقت کو یاد کرو) جب ہم نے تم کو فرعون والوں سے نجات عطا فرمائی جو تم کو بدترین عذاب میں مبتلا کر رہے تھے)۔ اور جب اس کے اوپر زبر ہو یعنی السَّوء تو اس کا معنی ہے مذمت، جیسے قرآن مجید میں ہے: "يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا۔ (مریم: ۲۸)" (اے ہارون کی بہن! نہ تو تمہارا باپ بدکردار تھا اور نہ ہی تمہاری ماں بدکار تھی)۔

(معانی القرآن للفراء ج ۱ ص ۳۵۰، بیروت)

علامہ اسماعیل بن حماد الجوہری الشافعی المتوفی ۳۹۸ھ لکھتے ہیں:

"السَّوء" زبر کے ساتھ قرآن مجید میں ہے: "عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ۔ (الفتح: ۶)" (انہی پر عذاب کی بری گردش ہے)۔ اس کا معنی ہے الهزيمة شکست کی رسوائی، اور الشر یعنی خرابی، کہا جاتا ہے "هذا رجل سَوْءٍ" یعنی یہ شخص برا آدمی ہے۔ الاخفش نے کہا کہ "الرجل السَّوء" نہیں کہا جاتا، کیونکہ السَّوء کا لفظ مرد کے لیے نہیں بولا جاتا اور اخفش نے کہا: "هذا رجل سُوْءٍ" بھی نہیں کہا جاتا، اس کا معنی ہے: اس نے اس کے ساتھ برا کیا۔ اور "السُّوأى" "الحسنى" کی نقیض ہے یعنی اچھائی اور بھلائی کی ضد۔ اور قرآن مجید میں مذکور ہے "ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓآٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ۔ (الروم: ۱۰)" (پھر برائی کے مرتکبین کا انجام دوزخ ہے کیونکہ وہ اللہ کی آیتوں کو جھٹلاتے تھے اور ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے)۔ اور کہا جاتا ہے "امرأة سَوْءَة" یعنی وہ بری عورت ہے۔ (معجم الصحاح ص ۵۲۱، ملخصا، دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۲۹ھ)

علامہ جمال الدین محمد بن مکرم ابن منظور افریقی متوفی ۷۱۱ھ، لکھتے ہیں

السُّوءُ: الفجور والمنكر، یعنی گناہ کا کام اور برائی۔ اور کہا جاتا ہے "رجل اسوئ" یعنی وہ برا مرد ہے، اور "الانثى سَوْآئ" یعنی وہ بری عورت ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓآٰى۔ (الروم: ۱۰)" اور السُّوأى سے مراد جہنم ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے پناہ میں رکھیں۔ اور "السُّوء" کا معنی ہے بری عادت، اور ہر بری بات کو "السُّوء" کہا جاتا ہے۔ "السَّوأة" کا معنی ہے: شرم کی جگہ اور بے حیائی کا کام، اور "السوأة" کا معنی ہے: اندام نہانی۔ اور "السَّوأة" کا معنی ہے: مرد اور عورت کی شرم گاہ، قرآن مجید میں ہے: "بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ۔ (الاعراف: ۲۲)" (ان دونوں کی شرمگاہیں کھل گئیں اور وہ دونوں اپنے بدن پر جنت کے پتے جوڑنے لگے)۔

ابن الاثیر نے کہا ہے: اصل میں "السَّوأة" کا معنی ہے الفرج یعنی شرم گاہ، پھر اس لفظ کو ہر اس جگہ استعمال کیا گیا جس کو ظاہر کرنے سے شرم دامن گیر ہو خواہ وہ قول ہو یا فعل ہو۔ اور "رجل سَوْء" اس شخص کے متعلق کہا جاتا ہے جو برے کام کرے، اور کہا

جاتا ہے"هٰذا رجلُ سَوْءٍ"،اور قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"عَلَیْهِمْ دَآىِٕرَةُ السَّوْءِ۔۔۔(الفتح:۶)"(یعنی ان پر گردش ایام کا عذاب ہے)۔(لسان العرب ج۷ ص۲۹۱۔۲۹۳،ملخصاً وملتقطاً،دار صادر،بیروت،۲۰۰۳ء)

علامہ سید محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی حنفی متوفی ۱۲۰۵ھ،لکھتے ہیں:

السَّوْأَة:الفرج،اللیث نے کہا:اس کا اطلاق مرد اور عورت کی شرمگاہ پر ہوتا ہے،اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا۔۔۔(الاعراف:۲۲)"پس"السَّوْأَة"ہر اس کام اور ہر اس بات کو کہا جاتا ہے جو بری ہو۔اور"السَّوْأَة"ہر برے اور ردی کام کے لیے کہا جاتا ہے۔اور"السُّوْء"کا معنی ہے برائی،قرآن مجید میں ہے:"اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ۔۔۔(الرعد:۱۸)"(یہی وہ لوگ ہیں جن کا حساب بہت سخت ہوگا)۔الزجاج نے کہا:یعنی ان کی کوئی نیکی قبول نہیں فرمائی جائے گی اور نہ ان کے کسی برے کام سے درگزر فرمایا جائے گا،کیونکہ ان کے کفر نے ان کے تمام نیک اعمال کو ضائع کر دیا ہے۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ"سُوْٓءُ الْحِسَابِ"کا معنی یہ ہے کہ ان سے پورا پورا حساب لیا جائے گا اور ان کی برائیوں میں سے کسی برائی سے درگزر نہیں فرمایا جائے گا۔

(تاج العروس من جواہر القاموس،جز۱،ص۲۰۰۔۲۰۱،دار الکتب العلمیہ،بیروت،۲۰۱۱ء)

"وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ":اور اللہ تمام باتوں کو بہ خوبی سننے والے،سب کچھ جاننے والے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:"اور بعض دیہاتی ایسے ہیں جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں،اور جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس کو اللہ کے تقرب اور رسول اللہ کی دعاؤں کے حصول کا ذریعہ قرار دیتے ہیں،سنو!بے شک ان کا اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ان کے تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے،عنقریب اللہ انہیں اپنی رحمت میں داخل فرمالیں گے،بے شک اللہ سب سے زیادہ بخشنے والے،سب سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں O"(التوبہ:۹۹)

بعض ایمان والے اعراب کے فضائل

"وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ":جب یہ بیان فرمایا گیا کہ الاعراب میں بعض ایسے لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کو جرمانہ،تاوان اور چٹی قرار دیتے ہیں تو اب یہ بیان فرمایا گیا کہ ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔مجاہد نے کہا:وہ قبیلہ مزینہ میں سے بنو مقرن ہیں اور الکلبی نے کہا کہ وہ اسلم،غفار اور جہینہ ہیں۔اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلم،غفار،مزینہ اور جہینہ کے چند لوگوں کے متعلق فرمایا:یہ اللہ کے نزدیک قیامت کے دن اسد،غطفان،ہوازن اور تمیم سے بہتر ہیں۔

بعض ایمان والے اعراب کی فضیلت میں احادیث

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:"الانصار،مزینہ،جہینہ،غفار اور اشجع اور جو لوگ بنو عبد اللہ میں سے آزاد شدہ غلام ہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مولا ہیں"۔

(صحیح مسلم:۲۵۱۹،الرقم المسلسل:۶۳۸۵،رقم حدیث الباب:۱۸۸،سنن ترمذی:۳۹۴۰)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قریش، الانصار، مزینہ، جہینہ، اسلم، غفار اور اشجع (یہ سب) میرے مددگار ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کے سوا ان کا کوئی مولا نہیں ہے''۔ (صحیح البخاری: ۳۵۰۴، ۳۵۱۲، صحیح مسلم: ۲۵۲۰، الرقم المسلسل: ۶۳۳۴) (موسوعۃ المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی الشریف، ج۸ ص ۳۹۳، دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۳۲ھ)

اس حدیث میں ''موالی'' کا لفظ ہے، ''موالی''، ''مولیٰ'' کی جمع ہے، ''مولیٰ'' کے متعدد معانی ہیں لیکن یہاں پر مقام کے مناسب اس کا معنی ناصر اور محب ہے اور ولی اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنی قوم کی ضروریات کا کفیل ہو اور ان کے معاملات کا متولی ہو۔

''وَ یَتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ قُرُبٰتٍ'': قُربۃ میں قاف پر پیش ہے اور یہ الرش اور نافع کی قراءت ہے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قربات، قربۃ کی جمع ہے جیسا کہ غرفات، غرفۃ کی جمع ہے، اور ظُلُمٰتٍ (البقرہ: ۱۷)، ظلمۃ کی جمع ہے۔

الزجاج نے کہا کہ قربات میں تین حرکات ہیں، ''قُرُبات'' راء پر پیش اور راء پر جزم یعنی قُربات اور راء پر زبر یعنی القُربات، اور اس کا معنی یہ ہے کہ یہ جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، اس کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک قربتوں کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔

''اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَیُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِیْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝'': اس آیت میں ان ایمان والے اعراب کو اپنے عقیدہ پر ثابت قدم رہنے کی بشارت فرمائی ہے اور یہ وعدہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ عنقریب ان کو اپنی رحمت میں داخل فرمائیں گے اور ان کی مغفرت فرمائیں گے۔ (اللباب فی علوم الکتاب، ج۱۰، ۱۷۶۔ ۱۸۳، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۱۱ء)

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝۱۰۰

مہاجرین اور انصار میں سے جو سابقین ہیں اور جو لوگ نیکی کے ساتھ ان کے متبعین ہیں اللہ اُن سے راضی ہو گئے اور یہ لوگ اللہ سے راضی ہو گئے، اور اللہ نے ان کے لیے جنت میں ایسے باغات تیار فرما رکھے ہیں جن کے نیچے سے دریا بہتے ہیں، یہ لوگ اُن جنتوں کے باغات میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہیں، یہی عظیم کامیابی ہے ۝

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛؕ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِیْنَةِ ۛؔ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۫ لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ؕ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَیْنِ ثُمَّ یُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِیْمٍ ۝۱۰۱

اور (اے مسلمانو!) تمہارے قرب و جوار میں چند دیہاتی منافقین ہیں، اور بعض اہلِ مدینہ ان کے نفاق کے عادی ہو چکے ہیں، آپ انہیں (اچھی طرح) نہیں جانتے، ہم انہیں (اچھی طرح) جانتے ہیں، عنقریب ہم ان کو دو مرتبہ عذاب دیں گے، پھر اُن کو سخت عذاب کی طرف لوٹا دیا جائے گا ۝

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَیِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ

اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۰۲﴾

اور بعض دوسرے مسلمان ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کے ساتھ نیک اعمال بھی کیے، عنقریب اللہ تعالیٰ اُن کی توبہ قبول فرمائیں گے، بے شک اللہ سب سے زیادہ بخشنے والے، سب سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں O

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۳﴾

(اے رسولِ اکرم!) آپ اِن مسلمانوں کے اموال سے زکوٰۃ وصول کیجیے، یہ زکوٰۃ ان کو پاکیزہ کردے گی اور ان کے باطن کو صاف کردے گی، اور آپ ان کے لیے دعائے خیر کیجیے، بے شک آپ کا دعا کرنا ان کے لیے سکون اور طمانیت کا باعث ہے، اور اللہ سب کچھ سننے والے ہیں، سب کچھ جاننے والے ہیں O

اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾

کیا ان مسلمانوں کو یہ معلوم نہیں کہ بے شک اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول فرمانے والے ہیں اور وہی زکوٰۃ اور صدقات کو اپنے دستِ قدرت سے لیتے ہیں، اور یہ کہ بے شک اللہ ہی سب سے زیادہ توبہ قبول فرمانے والے، سب سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں O

وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ ع

اور (اے رسولِ اکرم!) آپ کہیے: تم عمل کرتے رہو، بے شک اللہ اور اس کے رسول اور مومنین تمہارے اعمال کو دیکھ رہے ہیں، اور عنقریب تم سب عالم الغیب والشہادہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پس وہ تمہیں تمہارے اُن کاموں کی خبریں دیں گے جو تم کرتے رہے تھے O

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾

اور چند دوسرے لوگ ہیں جن کو اللہ کے حکم پر موقوف رکھا گیا ہے خواہ اللہ اُن کو عذاب دیں یا اُن کی توبہ قبول فرمائیں، اور اللہ سب کچھ جاننے والے، عظیم حکمتوں والے ہیں O

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

اوران میں سے بعض منافقین نے ایک مسجد بنائی تاکہ وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں اوراس میں کفر کریں اور مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ڈالیں، اوران لوگوں کے انتظار میں یہ مسجد بنائی جواس سے پہلے سے اللہ اوراس کے رسول کے خلاف جنگ کررہے تھے، اور یہ منافقین ضرور بہ ضرور قسم کھاکر کہیں گے (کہ اس مسجد کو بنانے سے) "ہمارا ارادہ تو صرف خیر خواہی اور بھلائی کا ہے" اوراللہ گواہی دیتے ہیں کہ بے شک یہ منافقین ضرور جھوٹے ہیںO

لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

(اے رسول اکرم!) آپ اس مسجد میں کبھی بھی کھڑے نہ ہوں، سوا اس مسجد کے کہ جس کی بنیاد اول روز سے ہی تقویٰ اور خدا خوفی پر رکھی گئی ہے، وہی مسجد اس کی مستحق ہے کہ آپ اس مسجد میں قیام کریں، اس مسجد کے قرب میں ایسے مرد ہیں جو اچھی طرح پاکیزہ ہونے سے محبت کرتے ہیں، اوراللہ اچھی طرح پاکیزگی حاصل کرنے والوں سے محبت فرماتے ہیںO

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾

تو کیا جن لوگوں نے اپنی مسجد کی بنیاد خدا خوفی اور اللہ کی رضا جوئی پر رکھی، وہ بہتر ہیں یا وہ بہتر ہیں جنھوں نے اپنی عمارت کی بنیاد ایسے کھوکھلے گڑھے کے گرنے والے کنارے پر رکھی جواس عمارت کو بنانے والے کو لے کر دوزخ کی آگ میں گر پڑا، اوراللہ ظالموں کو ہدایت نہیں عطا فرماتےO

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّاۤ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾ ع

ان کی بنائی ہوئی یہ عمارت ان کے دلوں میں ہمیشہ شکوک وشبہات سے کھٹکتی رہے گی سوا اس کے کہ ان کے دل پاش پاش ہو جائیں، اوراللہ سب کچھ جاننے والے، عظیم حکمتوں والے ہیںO

سورۃ التوبہ کی اس سورت کا نمبر ۹ ہے، اوراس پارے کا نمبر ۱۱ ہے، اوراس آیت کا نمبر ۱۱۰ ہے، اور یہ اس پارے کا دوسرا رکوع ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں: کہ سورہ توبہ کی اس آیت میں امریکا کی اس ۱۱۰ منزلہ عمارت کے منہدم ہوکر زمین بوس ہونے کی طرف

اشارہ ہے، اور یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے کہ اس نے پیشگی اس واقعہ کی طرف اشارہ فرمادیا جس کو اب بھی امریکی نائن الیون سے یاد کرتے ہیں، کیونکہ اس سورت کا نمبر ۹ ہے اور پارہ نمبر ۱۱ ہے، اور اس آیت کا نمبر ۱۱۰ ہے، اور ۲۰۰۱ء میں امریکا کی مشہور (Twin Tower) نامی ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی دو ایک سو دس (110) منزلہ عمارتیں منہدم ہو کر زمین بوس ہوگئی تھیں، اور التوبہ:۱۱۰ میں ارشاد فرمایا: ''ان کی بنائی ہوئی یہ عمارت ان کے دلوں میں ہمیشہ شکوک وشبہات سے کھٹکتی رہے گی سوا اس کے کہ ان کے دل پاش پاش ہو جائیں، اور اللہ سب کچھ جاننے والے، عظیم حکمتوں والے ہیں O''۔

سو نویں مہینے کی گیارہ تاریخ کو یہ ایک سو دس منزلہ عمارتیں منہدم ہو کر زمین بوس ہوگئی تھیں اور نویں مہینہ کی طرف اشارہ اس سورت کے نو نمبر کی طرف ہے، اور گیارہ تاریخ کی طرف اشارہ اس پارہ کے گیارہ نمبر کی طرف ہے، اور ایک سو دس منزلہ عمارت کی اس آیت کے نمبر ۱۱۰ کی طرف ہے، اور دوسرے رکوع سے (Twin Tower) دو عمارتوں کی طرف ہے۔ سو قرآن مجید کے اشارات نے پہلے ہی یہ خبر دے دی کہ ۹ ستمبر کو یہ ۱۱۰ منزلہ عمارتیں منہدم ہو کر زمین بوس ہو جائیں گی۔ چنانچہ آج تک امریکی باشندے اس تاریخ کو نائن الیون کے طور پر موسوم کر کے یاد رکھتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''مہاجرین اور انصار میں سے جو سابقین ہیں اور جو لوگ نیکی کے ساتھ ان کے متبعین ہیں اللہ اُن سے راضی ہو گئے اور یہ لوگ اللہ سے راضی ہو گئے، اور اللہ نے ان کے لیے جنت میں ایسے باغات تیار فرما رکھے ہیں جن کے نیچے سے دریا بہتے ہیں، یہ لوگ اُن جنتوں کے باغات میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، یہی عظیم کامیابی ہے O'' (التوبہ:۱۰۰)

الصحابہ اور التابعین کی پیروی کرنے کا وجوب اور روافض کے انکار کرنے کا ابطال

امام ابو منصور محمد بن محمد ماتریدی حنفی المتوفی ۳۳۳ھ، التوبہ:۱۰۰ تا ۱۱۰ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ'': یعنی جو لوگ مہاجرین اور انصار کے بعد ایمان لائے، اللہ تعالیٰ اُن کو بھی جنت میں السابقین الاولین کے ساتھ داخل فرما دیں گے۔

بعض مفسرین نے کہا: ''وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ'' سے مراد ہے جو سب سے پہلے اسلام لائے اور سب سے پہلے انہوں نے دین اسلام کی مدد کی۔ ''وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ'': یعنی جن لوگوں نے ان مہاجرین اور انصار کی اسلام میں احسان کے ساتھ ان کی اتباع کی۔ ''رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ'': ان سب سے اللہ تعالیٰ راضی ہو گئے اور ان سب کو بھی اللہ عزوجل نے راضی فرمادیا۔ بعض مفسرین نے کہا: اس سے مراد وہ صحابہ ہیں جنہوں نے بیعت رضوان کی تھی اور بعض دوسرے مفسرین نے کہا: اس سے مراد وہ صحابہ ہیں جنہوں نے دونوں قبلوں یعنی بیت المقدس اور بیت اللہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔ اور جن لوگوں نے قیامت تک اُن کی اتباع بالاحسان کی، ان سب سے اللہ تبارک وتعالیٰ راضی ہو گئے۔

پھر خصوصیت کے ساتھ اہلِ مدینہ کو انصار فرمایا، ہر چند کہ باقی مہاجرین نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کی تھی اور اسی وجہ سے ان کا نام انصار رکھا گیا، کیونکہ ان لوگوں نے مہاجرین کی مدد کی اور اُن کو اپنے گھروں میں رکھا اور اُن کے لیے اپنی جانوں اور مالوں کو خرچ کیا۔ اگرچہ شرعاً یہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کرنے میں مساوی تھے۔

اس آیت میں روافض کا رد ہے، کیونکہ وہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو ظالم قرار دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے خلافت اور امامت کے منصب پر قبضہ کرلیا اور اُن کا یہ موقف اس لئے باطل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مہاجرین اور انصار کے متعلق فرمایا ہے: ''اللہ اُن سے راضی ہو گئے'' اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کرنے والوں میں داخل ہیں۔

پھر چونکہ اللہ عزوجل نے یہ خبر دی ہے کہ اللہ عزوجل اُن سے راضی ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہیں، تو اس میں یہ دلیل ہے کہ اُن کا خلافت اور امامت کے منصب کو سنبھالنا یہ حق اور صواب ہے، اور جس نے اُن کو ظلم کے ساتھ تعبیر کیا وہ خود ظالم ہے، اور وہ ایک چیز کو اس کے غیر محل میں رکھتے ہیں۔

نیز اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ صحابہ اور تابعین کی تقلید کرنا جائز ہے اور اُن کی اقتداء کرنا صحیح ہے، کیونکہ اللہ عزوجل نے مہاجرین اور انصار اور اُن کے متبعین کے متعلق فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن سے راضی ہیں، اور اس سے یہ معلوم ہوا کہ اُن کی تقلید کرنا لازم ہے اور اُن کی اقتداء کرنا واجب ہے۔ جب وہ کسی کام کی خبر دیں یا کوئی حدیث بیان کریں تو اس پر عمل کرنا واجب ہے اور اس کو ترک کرنا جائز نہیں ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور (اے مسلمانو!) تمہارے قرب و جوار میں چند دیہاتی منافقین ہیں، اور بعض اہلِ مدینہ ان کے نفاق کے عادی ہو چکے ہیں، آپ انہیں (اچھی طرح) نہیں جانتے، ہم انہیں (اچھی طرح) جانتے ہیں، عنقریب ہم ان کو دو مرتبہ عذاب دیں گے، پھر اُن کو سخت عذاب کی طرف لوٹا دیا جائے گا ''(التوبہ:۱۰۱)

منافقین کے مصداق کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم تھا یا نہیں تھا؟

''وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْأَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۚ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۚ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ '': اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ مدینہ کے اردگرد جو دیہاتی ہیں وہ سب منافق ہیں اور نفاق کے عادی اور خوگر ہو چکے ہیں۔ بعض مفسرین نے کہا: ''مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ '' کا معنی ہے: یعنی وہ اپنے نفاق کے اوپر جمے ہوئے ہیں اور دوائم ہیں۔

''لَا تَعْلَمُهُمْ ۖ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ '': کیونکہ بعض منافقین میں سے وہ تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے کلام کے لہجہ سے اُن کو پہچانتے تھے، قرآن مجید میں ہے: ''وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ۔۔۔ (محمد:۳۰)'' (اور اللہ کی قسم! آپ ان منافقین کو ان کے کلام کے لہجے سے ضرور بہ ضرور پہچان لیں گے)۔

اور ان بعض منافقین میں سے وہ تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی نمازوں سے ان کو پہچان لیتے تھے، کیونکہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا (النساء:۱۴۲)'' (بے شک منافقین اپنے زعم میں اللہ کو دھوکا دے رہے ہیں حالانکہ (واقع میں) اللہ انہیں ان کے دھوکے کی سزا دے رہے ہیں، اور جب منافقین نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سُست روی سے محض لوگوں کو دکھانے کے لیے

کھڑے ہوتے ہیں اور اللہ کا ذکر بہت کم کرتے ہیں)۔

اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ تبوک کے لیے روانہ نہیں ہوئے سو اس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو پہچانتے ہیں، پس اللہ عزوجل نے یہ خبر دی کہ ان لوگوں کا نفاق ان کی سرکشی کی شدت اور ان کی سازشوں کی زیادتی کی وجہ سے ظاہر ہے، سو اس وجہ سے آپ ان کو پہچان لیتے ہیں۔

امام ابو جعفر محمد بن جریر الطبری المتوفی ۳۱۰ھ، التوبہ: ۱۰۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''لَا تَعْلَمُهُمْ ۭ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ'': یعنی اُن لوگوں کا کیا حال ہے جو اپنے علم میں تکلف کر کے یہ کہتے ہیں: ''کہ فلاں جنت میں ہے اور فلاں دوزخ میں ہے'' پھر جب تم اُن میں سے کسی شخص سے اس کے متعلق سوال کرو تو وہ کہے گا: ''مجھے علم نہیں ہے'' کیونکہ انبیاء علیہم السلام نے بھی اپنے علم کے متعلق تکلف سے کام نہیں لیا، حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا تھا: ''وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (الشعراء: ۱۱۲)'' (ان کافروں کے کاموں کو میں بالذات نہیں جانتا؟)۔ نیز اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ڬ وَمَا اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ۝ (ہود: ۸۶)'' (اگر تم مومن ہو تو اللہ کا دیا ہوا جو رزق تمہارے پاس بچ رہے وہی تمہارے لئے بہتر ہے اور میں تم پر نگہبان نہیں ہوں)۔

(تفسیر طبری ج ۱۱ ص ۶۴۳، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۲۳ھ، تفسیر عبدالرزاق ج ۱ ص ۲۸۵، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۸۷۴)

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ، التوبہ: ۱۰۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''لَا تَعْلَمُهُمْ ۭ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ'': اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اے محمد (صلی اللہ علیک وسلم!) آپ بھی لوگوں کے اخروی انجام کو نہیں جانتے، لوگوں کے اخروی انجام کے علم کے ساتھ ہم ہی مخصوص ہیں اور اس آیت میں اس سے منع فرمایا ہے کہ کسی شخص کے متعلق یہ حکم لگایا جائے کہ وہ جنتی ہے یا دوزخی ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، جز ۸ ص ۲۲۰، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ، التوبہ: ۱۰۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''لَا تَعْلَمُهُمْ ۭ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ'': یعنی یہ منافقین اپنے نفاق میں اتنے ماہر ہو چکے ہیں کہ باوجود اس کے کہ آپ کو شخصاً شخصاً ان کا علم ہے پھر بھی آپ اپنی پکی فراست کے باوجود ان کو نفاق کے عنوان سے نہیں پہچانتے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ آپ کو اگرچہ اجمالاً ان کے نفاق کا علم ہے لیکن ہر ایک کو شخصاً شخصاً آپ نفاق کے عنوان سے نہیں پہچانتے۔

پھر فرمایا: ''نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ''۔ حضرت نوح علیہ السلام کے قول کو اللہ تعالیٰ نے نقل فرمایا، انہوں نے کہا: ''وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (الشعراء: ۱۱۲)'' (ان کافروں کے کاموں کو میں بالذات نہیں جانتا؟) اور اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا: ''لَا تَعْلَمُهُمْ ۭ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ''۔ یہ اور اس جیسی دیگر آیات اس شخص کے رد پر قوی دلیل ہیں جس کا یہ زعم ہے کہ انسان محض اپنے صفاء قلب کی بناء پر مغیبات پر مطلع ہوتا ہے یعنی غیب کا علم اللہ تعالیٰ کے مطلع کرنے کے سوا اور کسی طریقہ سے حاصل نہیں ہوتا۔ (روح المعانی جز ۱۱ ص ۱۶، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۷ھ)

نیز علامہ آلوسی نے ''اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ۔۔۔ (البقرۃ: ۱۴۳)'' (اس کو ہم نے اسی لیے مقرر فرمایا تھا تاکہ جو لوگ رسول کی پیروی کرتے ہیں ان کو ہم ان لوگوں سے ممتاز کر کے ظاہر فرما دیں جو اپنی ایڑیوں پر واپس پلٹ

جاتے ہیں) کی تفسیر میں لکھا ہے: پھر علم کا معنی اگر مجازاً تمیز ہو تو اس سے مراد یہ ہے" تا کہ ہم اطاعت گزار کو جزا دیں اور نافرمان کو سزا دیں"۔ (پس میں کہتا ہوں: ہوسکتا ہے زیر بحث آیت میں بھی "لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ "علم بہ معنی جزا ہو، یعنی آپ ان منافقین کو سزا نہیں دیں گے، ان منافقین کو ہم سزا دیں گے۔ پھر اس آیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کی نفی پر استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ سعیدی غفرلہٗ)

علامہ سید محمد نعیم الدین مراد آبادی حنفی متوفی ۱۳۶۷ھ، التوبہ: ۱۰۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ": اس کے معنی یا تو یہ ہیں کہ ایسا جاننا جس کا اثر انہیں معلوم ہو وہ ہمارا جاننا ہے کہ ہم انہیں عذاب کریں گے یا حضور سے منافقین کے حال کے جاننے کی نفی باعتبار ماسبق ہے اور اس کا علم بعد کو عطا ہوا جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا: وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ۔ (محمد: ۳۰) "(جمل) کلبی و سدی نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے روز جمعہ خطبہ کے لئے قیام کر کے نام بنام فرمایا: نکل اے فلاں! تو منافق ہے، نکل اے فلاں! تو منافق ہے، تو مسجد سے چند لوگوں کو رسوا کر کے نکالا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضور کو اس کے بعد منافقین کے حال کا علم عطا فرمایا گیا۔

(تفسیر خزائن العرفان مع ترجمہ کنز الایمان ص ۳۸۱، مکتبۃ المدینہ کراچی ۱۴۳۲ھ)

منافقین کو دو مرتبہ عذاب دینے کا محمل

امام ابو منصور محمد بن محمد ماتریدی حنفی المتوفی ۳۳۳ھ، لکھتے ہیں:

"سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ": اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو عنقریب دو مرتبہ عذاب دیں گے، بعض مفسرین نے کہا: ان منافقین کو قتل کیا جائے گا اور قید کیا جائے گا۔ (تفسیر ابن جریر ج ۱۱ ص ۶۴۵، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۲۴ھ)

اور حسن بصری نے کہا: ایک مرتبہ ان کو دنیا میں عذاب دیا جائے گا اور دوسری مرتبہ انہیں قبر میں عذاب دیا جائے گا۔

بعض مفسرین نے کہا: ان کو اللہ تعالیٰ ایک مرتبہ بھوک میں مبتلاء فرما کر عذاب دیں گے اور دوسری مرتبہ ان کو قتل کرا کر عذاب دیں گے۔

ابوبکر الاصم نے کہا: ایک مرتبہ ان کو دنیا میں عذاب دیا جائے گا، ان کو قتل کرا کر اور موت سے پہلے قید کرا کر، اور دوسری مرتبہ ان کو قبر میں عذاب دیا جائے گا۔ اور بعض مفسرین نے کہا کہ ان کو موت کے وقت عذاب دیا جائے گا، ملائکہ ان کے چہروں اور ان کی پشتوں پر ضرب لگائیں گے۔ قرآن مجید میں ہے: "فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۝ (محمد: ۲۷)" (جب فرشتے ان کے چہروں اور پشتوں پر (لوہے کی گرزوں سے) ضربیں لگاتے ہوئے ان کی روحیں قبض کریں گے)۔ اور دوسری مرتبہ قبر میں منکر اور نکیر ان کو عذاب دیں گے۔

"ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ": پھر ان کو عذاب عظیم کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ، التوبہ: ۱۰۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ایک مرتبہ دنیا میں ان کو بیماریوں میں مبتلاء فرما کر عذاب دیں گے، اور دوسری مرتبہ آخرت میں عذاب دیں گے۔ پس مومن کی بیماری اس کے گناہوں کا کفارہ ہے اور کافر کی بیماری اس کے

گناہوں کی سزا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ پہلا عذاب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی اطلاع دے کر ان کو رسوا فرما دیا، اور دوسرا عذاب ان کو قبر میں ہوگا۔ حسن اور قتادہ نے کہا: پہلا عذاب ان کی رسوائی کے لیے ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے نفاق پر مطلع فرما دیں گے۔ اور دوسرا عذاب قبر میں ہوگا، الحسن اور قتادہ نے کہا: پہلا عذاب دنیا کا عذاب ہے اور دوسرا عذاب آخرت کا عذاب ہے۔ ابن زید نے کہا: پہلا عذاب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اور ان کے اموال اور ان کی اولاد کو مصائب میں مبتلاء فرما دیں گے اور دوسرا عذاب قبر کا عذاب ہے۔ مجاہد نے کہا: پہلا عذاب بھوک اور قتل ہے اور الفراء نے کہا: پہلا عذاب ان کو قتل کرنا ہے اور دوسرا عذاب قبر کا عذاب ہے، اور ایک قول ہے کہ پہلا عذاب ان کو قید کرنا اور قتل کرنا ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ پہلا عذاب ان کے اموال سے جبراً زکوٰۃ وصول کرنا ہے اور ان پر دنیاوی حدود قائم فرمانا ہے، اور دوسرا عذاب قبر کا عذاب ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، جز ۸ ص ۲۲۰، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

منافقین کو نام بنام پکار کر مسجد نبوی سے نکالنے کے متعلق متعدد احادیث اور اقوال مفسرین

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ، التوبہ: ۱۰۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"سَنُعَذِّبُهُم مَّرَّتَيْنِ": امام ابن ابی حاتم اور امام طبرانی نے المعجم الاوسط میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے، پس آپ نے فرمایا: اٹھ اے فلاں! پس مسجد سے نکل جا کیونکہ تو منافق ہے، اے فلاں! نکل تو منافق ہے، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کا ذکر ان کے اسماء کے ساتھ فرمایا اور ان کو رسوا فرما دیا، اور اس دن حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کسی وجہ سے جمعہ کے دن حاضر نہیں تھے، پس وہ منافقین سے اس حال میں ملے کہ ان کو مسجد سے نکالا جا رہا تھا، پس وہ منافقین سے چھپ گئے، ان کو اس سے حیاء آتی تھی کہ وہ جمعہ کی نماز میں حاضر نہیں ہوئے، اور لوگوں نے یہ گمان کیا کہ منافقین حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے چھپ گئے، اور انہوں نے یہ گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے منافقین کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دے دی، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد میں داخل ہوئے، تب ایک مرد نے کہا: اے عمر! آپ کو مبارک ہو، اللہ تعالیٰ نے منافقین کو رسوا فرما دیا، پس منافقین کو رسوا فرمانا ان کا پہلا عذاب ہے اور دوسرا عذاب قبر میں ہوگا۔

(المعجم الاوسط: ۷۹۲، زاد المسیر ج ۲ ص ۲۹۳، ج ۳ ص ۸۴، ج ۳ ص ۵۱۶، ج ۳ ص ۵۳۲)

اور ابن مردویہ نے حضرت ابن مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس دن منبر پر کھڑے ہوئے اور آپ نے چھتیس (۳۶) منافقین کو نام لے کر مسجد سے نکال دیا۔ (روح المعانی جز ۱۱ ص ۱۶، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۷ھ)

امام ابو جعفر محمد بن جریر الطبری المتوفی ۳۱۰ھ، نے التوبہ: ۱۰۱ کی تفسیر میں یہی قصہ بیان کیا اور اسی طرح علامہ زیلعی نے تخریج الکشاف میں امام طبری کے حوالہ سے اس قصہ کو بیان کیا اور امام طبرانی نے المعجم الاوسط: ۷۹۲ اور ابن مردویہ نے اس قصہ کو بیان کیا ہے جیسا کہ علامہ زیلعی نے تخریج احادیث الکشاف ج ۲ ص ۹۷ میں بیان کیا ہے۔ علامہ الہیثمی نے مجمع الزوائد ج ۷ ص ۳۴ میں اس قصہ کو بیان کیا۔

شیخ شبیر احمد عثمانی دیوبندی متوفی ۱۳۶۹ھ، التوبہ ۱۰۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"سَنُعَذِّبُهُم مَّرَّتَيْنِ": اس سے قبل کم از کم دو بار ضرور عذاب میں مبتلاء کیے جائیں گے، ایک عذاب قبر دوسرا وہ عذاب جو

اسی دنیوی زندگی میں پہنچ کر رہے گا۔ مثلاً حضرت ابن عباس کی ایک روایت کے موافق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے روز ممبر پر کھڑے ہوکر تقریباً چھتیس (٣٦) آدمیوں کو نام بنام پکار کر فرمایا: "اخرج فانك منافق" یعنی تو منافق ہے مسجد سے نکل جا، یہ رسوائی ایک قسم عذاب کی تھی، یا پہلے اسی سورت میں گزرا کہ ان کے اموال واولاد کو حق تعالیٰ نے ان کے حق میں عذاب بنادیا۔

(ترجمہ قرآن مع تفسیر ص ٢٦٨، الملک فہد بن عبدالعزیز آل سعود، المملکۃ العربیۃ السعودیہ)

حسب ذیل مفسرین نے اس حدیث کا ذکر کیا ہے، ان میں سے بعض نے اس کو اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے:

(١) امام ابن ابی حاتم متوفی ٣٢٧ھ (تفسیر القرآن ج ٦ ص ١٨٧٠)

(٢) امام ابواللیث سمرقندی حنفی متوفی ٣٧٥ھ، (تفسیر السمرقندی ج ٢ ص ٧١)

(٣) علامہ ابوالحسن الواحدی المتوفی ٤٦٨ھ، (الوسیط ج ٢ ص ٥٢١)

(٤) امام حسین بن مسعود بغوی متوفی ٥١٦ھ، (معالم التنزیل ج ٢ ص ٢٧٢)

(٥) علامہ محمود بن عمر زمخشری متوفی ٥٣٨ھ (الکشاف ج ٢ ص ٢٩١)

(٦) قاضی ابن عطیہ اندلسی متوفی ٥٤٦ھ، (المحرر الوجیز ج ٨ ص ٢٦٢)

(٧) امام عبدالرحمٰن الجوزی متوفی ٥٩٧ھ، (زاد المسیر ج ٣ ص ٤٩٢)

(٨) امام فخرالدین رازی متوفی ٦٠٦ھ (تفسیر کبیر ج ٦ ص ١٣١)

(٩) علامہ علاء الدین خازن متوفی ٧٢٥ھ، (لباب التاویل ج ٢ ص ٢٩١)

(١٠) علامہ نظام الدین نیشاپوری متوفی ٧٢٨ھ، (غرائب القرآن ج ٣ ص ٥٢٣)

(١١) علامہ ابوالحیان اندلسی متوفی ٧٥٤ھ (البحر المحیط ج ٥ ص ٤٩٧)

(١٢) حافظ ابن کثیر دمشقی متوفی ٧٧٤ھ (تفسیر القرآن ج ٢ ص ٤٩٧)

(١٣) علامہ ابوحفص عمر دمشقی متوفی ٨٨٠ھ (اللباب فی علوم الکتاب ج ١٠ ص ١٩٠)

(١٤) حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ٩١١ھ، (الدر المنثور ج ٣ ص ٢٧٣)

(١٥) قاضی ابوالسعود متوفی ٩٨٢ھ (تفسیر ابوسعود ج ٣ ص ١٨٦)

(١٦) مشہور غیر مقلد عالم قاضی محمد شوکانی متوفی ١٢٥٠ھ (فتح القدیر ج ٢ ص ٥٦٧)

(١٧) مشہور غیر مقلد عالم نواب صدیق حسن خان بھوپالی متوفی ١٣٠٧ھ، (فتح البیان ج ٥ ص ٢٨٦)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور بعض دوسرے مسلمان ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کے ساتھ نیک اعمال بھی کیے، عنقریب اللہ تعالیٰ اُن کی توبہ قبول فرمائیں گے، بے شک اللہ سب سے زیادہ بخشنے والے، سب سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں O" (التوبہ: ١٠٢)

"وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَیِّئًا": علامہ ماتریدی حنفی لکھتے ہیں:

اس آیت کی تفسیر میں عام اہلِ تاویل نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت حضرت ابولبابہ انصاری رضی اللہ عنہ اور ان کے اُن اصحاب کے متعلق نازل ہوئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ تبوک میں نہیں گئے تھے، پھر وہ اپنے اس فعل پر شرمندہ ہوئے اور انہوں نے اپنی خطاء کا اعتراف کیا اور اس سے رجوع کر لیا اور توبہ کی، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور اُن سے مغفرت کا وعدہ فرمایا، کیونکہ ارشاد فرمایا: "عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" "عنقریب اللہ تعالیٰ اُن کی توبہ قبول فرمائیں گے، بے شک اللہ سب سے زیادہ بخشنے والے، سب سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں۔

اور اس قصہ میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک سے واپس آئے تو وہ لوگ آپ کے پاس آئے جو اپنے اموال کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہ گئے تھے، پس انہوں نے کہا یا رسول اللہ! یہ ہمارے وہ اموال ہیں جن کی وجہ سے ہم آپ کے ساتھ نہیں گئے، پس آپ ان اموال کو قبول فرمالیں اور ہماری طرف سے ان کا صدقہ کر دیں، آپ نے اُن اموال کے قبول کرنے کو ناپسند فرمایا، آپ نے فرمایا: مجھے اس کا حکم نہیں دیا گیا ہے، پھر یہ آیت نازل ہوئی۔

امتِ مسلمہ کے تمام توبہ کرنے والوں کے متعلق مغفرت کی نوید

اور اللہ تعالیٰ کی یہ نوید ہر اُس مسلمان کے لیے ہے جس نے کسی گناہ کا ارتکاب کیا اور وہ ایمان سے نہیں نکلا، پھر اس گناہ پر نادم ہوا اور اس نے توبہ کی اور بخشش کی امید رکھی۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اُن مسلمانوں کا مومنین کے عنوان سے ذکر فرمایا اور منافقین کا ذکر اُن کے نفاق کے اعتبار سے فرمایا، پھر اُن لوگوں کا ذکر فرمایا جنہوں نے اپنے نیک اعمال کے ساتھ برے اعمال بھی کیے تھے، پھر وہ اس پر نادم ہوئے اور انہوں نے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے اُن سے توبہ قبول فرمانے اور ان کی مغفرت فرمانے کا وعدہ فرمایا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "(اے رسولِ اکرم!) آپ ان مسلمانوں کے اموال سے زکوٰۃ وصول کیجئے، یہ زکوٰۃ ان کو پاکیزہ کر دے گی اور ان کے باطن کو صاف کر دے گی، اور آپ ان کے لیے دعائے خیر کیجئے، بے شک آپ کا دعا کرنا ان کے لیے سکون اور طمانیت کا باعث ہے، اور اللہ سب کچھ سننے والے ہیں، سب کچھ جاننے والے ہیں O" (التوبہ: ١٠٣)

التوبہ: ١٠٣ میں جس صدقہ کو قبول کرنے کا حکم فرمایا ہے اس صدقہ کے متعلق متعدد اقاویل

"خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً": اس آیت میں جس صدقہ کو قبول کرنے کا ذکر فرمایا ہے، بعض مفسرین نے کہا: یہ صدقہ فریضہ ہے، پھر اس میں اختلاف ہے کہ اس آیت میں کون سے فرض صدقہ کا ذکر ہے، بعض مفسرین نے کہا: اس آیت میں اموال کی زکوٰۃ کا ذکر ہے۔

اور بعض دوسرے مفسرین نے کہا: یہ اُن کے گناہوں کا کفارہ ہے جس کا ادا کرنا فرض تھا، پھر یہ وہی لوگ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے غزوۂ تبوک میں پیچھے رہ گئے تھے، پھر وہ اپنے پیچھے رہ جانے پر نادم ہوئے اور انہوں نے توبہ کی، پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس آئے تو وہ اپنے اموال لے کر آئے اور عرض کیا: ہماری طرف سے ان اموال کو بہ طورِ صدقہ قبول فرمالیں، کیونکہ

ہمارے اموال ہی وہ ہیں جن کی وجہ سے ہم آپ سے پیچھے رہ گئے تھے۔ تب اللہ عزوجل نے اپنے رسول ﷺ کو حکم فرمایا کہ آپ ان کے اموال کو قبول کر کے ان کی طرف سے صدقہ کر دیں تا کہ یہ ان کی کوتاہی کا کفارہ ہو جائے۔

اور بعض دیگر مفسرین نے کہا کہ ہم نے اس سے پہلے جو ذکر کیا ہے وہ اہل تبوک کے متعلق نازل ہوا جو رسول اللہ ﷺ سے پیچھے رہ گئے تھے۔ اور بعض مفسرین نے کہا: یہ وہ صدقہ ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو حکم فرمایا کہ ان کے اموال سے نفلی صدقہ قبول فرمالیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کو غزوۂ تبوک میں خرچ کرنے پر برانگیختہ فرماتے تھے، پھر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اتنا اتنا مال لے کر آئے تو آپ نے اُن سے قبول فرمالیا۔

اور بعض اور مفسرین نے کہا: اس آیت میں ہر نفلی صدقہ مراد ہے خواہ وہ کم ہو یا زیادہ ہو، اور رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ ان کے اموال میں سے کچھ صدقہ قبول فرمالیں اور کل نہ قبول فرمائیں، کیونکہ اگر ان کے کل مال کا صدقہ قبول فرمالیا تو وہ لوگ اپنی دیگر ضروریات اور عبادات کو ادا کرنے میں مال کے ضرورت مند ہوں گے لیکن آپ کو یہ حکم فرمایا کہ آپ بہ قدر ضرورت ان سے مال کی اتنی مقدار لے لیں جو ان کی خطاؤں کا کفارہ ہو جائے۔

"تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا": یعنی ہر چند کہ زکوٰۃ کا صدقہ دینے والوں کے گناہوں کو مٹادیتا ہے اور ان کے اخلاق کو پاکیزہ کر دیتا ہے حتیٰ کہ اُن کے لیے اپنے مال کو صدقہ کرنا آسان ہو جائے۔ اور اگر صدقہ سے مراد صدقۂ کفارہ ہو تو اس کا تعلق ان لوگوں کے ساتھ ہے جو غزوۂ تبوک میں آپ کے ساتھ جانے سے پیچھے رہ گئے تھے۔ اور اگر یہ نفلی صدقہ ہو تو وہ بھی ان کو خطاؤں سے پاک کرے گا اور ان کے باطن کو صاف کرے گا اور ان میں بخل نہیں رہے گا۔

رسول اللہ ﷺ کا صرف مسلمانوں کے لیے دعاءِ خیر فرمانا

"وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ": بعض مفسرین نے کہا کہ جب رسول اللہ ﷺ کے پاس کوئی صدقہ لے کر آتا تو آپ اس کے لیے دعاءِ خیر کرتے اور استغفار فرماتے، اور آپ منافقین کے لیے استغفار نہیں فرماتے تھے۔ اور اُن کے دل نبی ﷺ کے استغفار کرنے سے پرسکون ہو جاتے اور مطمئن ہو جاتے، اور ان کو یقین ہو جاتا کہ وہ اہلِ نفاق میں سے نہیں ہیں۔

"وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ": اور اللہ سب کچھ سننے والے ہیں، سب کچھ جاننے والے ہیں۔

بعض علماء نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ امام اور امیر کے لیے یہ جائز ہے کہ لوگوں سے اُن کی اموال کی زکوٰۃ کو طلب کریں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "کیا ان مسلمانوں کو یہ معلوم نہیں کہ بے شک اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول فرمانے والے ہیں اور وہی زکوٰۃ اور صدقات کو اپنے دستِ قدرت سے لیتے ہیں، اور یہ کہ بے شک اللہ ہی سب سے زیادہ توبہ قبول فرمانے والے، سب سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں O" (التوبہ: ۱۰۴)

"اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ": یعنی مسلمانوں نے یہ جان لیا کہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کی توبہ قبول فرماتے ہیں۔ "وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ": یعنی صدقات کو قبول فرماتے ہیں۔

" وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ": ہمارے نزدیک التواب کا معنی یہ ہے کہ وہی خدا توبہ کرنے کی توفیق عطا فرماتے ہیں۔ پھر کافر جب مسلمان ہو جائے اور توبہ کرے تو اس کو اس توبہ کے ساتھ کفارہ ادا کرنا لازم نہیں ہے، اس کا کفارہ یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے توبہ کرے خواہ اس نے شرک اور کفر کے علاوہ بڑے بڑے گناہ کیے ہوں، اور مسلمان جب کسی برائی کا ارتکاب کریں تو اُن پر توبہ لازم ہے اور کفارہ لازم ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور (اے رسولِ اکرم!) آپ کہیے: تم عمل کرتے رہو، بے شک اللہ اور اس کے رسول اور مومنین تمہارے اعمال کو دیکھ رہے ہیں، اور عنقریب تم سب عالم الغیب والشہادہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پس وہ تمہیں تمہارے اُن کاموں کی خبر دیں گے جو تم کرتے رہے تھے O" (التوبہ: ۱۰۵)

بعض مفسرین نے کہا: یہ آیت ان مسلمانوں کے متعلق ہے جو غزوۂ تبوک میں جانے سے رہ گئے تھے، پھر وہ اس پر نادم ہوئے اور توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی، اور فرمایا: " وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ " یعنی اگر دوبارہ تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی تو عنقریب تم " عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ " کی طرف لوٹائے جاؤ گے، " فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ": اور بعض مفسرین نے کہا کہ یہ آیت منافقین کے متعلق نازل ہوئی ہے کہ تم عمل کرتے رہو، اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو اور مومنین کو تمہارے نفاق پر مطلع فرما دیں گے، پھر تم رسوا ہو گے جب تمہارے باطن کی باتوں پر اللہ تعالیٰ سب کو مطلع فرما دیں گے۔ یعنی تم جو کام بھی کرتے ہو اس کی تم کو جزا دیں گے۔

اور بعض احادیث میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین جب کسی کی نماز جنازہ پر حاضر ہوتے اور اس کی تعریف فرماتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وجبت" پوچھا گیا: یا رسول اللہ! کیا چیز واجب ہوگئی؟ آپ نے فرمایا: "ملائکہ آسمانوں میں اللہ تعالیٰ کے گواہ ہیں اور تم زمین پر اللہ تعالیٰ کے گواہ ہو، پس جس کی تم نے تعریف اور تحسین کی تو اس کے لئے جنت واجب ہوگئی"۔

پس جس کے متعلق مسلمان اس کی برائی کی شہادت دیں تو وہ برا ہے اور جس کی نیکی کی شہادت دیں تو وہ نیک ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور چند دوسرے لوگ ہیں جن کو اللہ کے حکم پر موقوف رکھا گیا ہے خواہ اللہ اُن کو عذاب دیں یا اُن کی توبہ قبول فرمائیں، اور اللہ سب کچھ جاننے والے، عظیم حکمتوں والے ہیں O" (التوبہ: ۱۰۶)

" وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ":

اور دوسرے وہ لوگ ہیں جن کا معاملہ موقوف ہے، اور لوگ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ ان کے متعلق کیا حکم فرمائیں گے، آیا ان کو عذاب دیں گے یا اُن کی توبہ قبول فرما لیں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ان میں سے بعض منافقین نے ایک مسجد بنائی تاکہ وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں اور اس میں کفر کریں اور مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ڈالیں، اور ان لوگوں کے انتظار میں یہ مسجد بنائی جو اس سے پہلے سے اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کر رہے تھے، اور یہ منافقین ضرور بہ ضرور قسم کھا کر

کہیں گے (کہ اس مسجد کو بنانے سے) ''ہمارا ارادہ تو صرف خیر خواہی اور بھلائی کا ہے'' اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ بے شک یہ منافقین ضرور جھوٹے ہیں O'' (التوبہ: ١٠٧)

''وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا'': حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ منافقین نے ایک مسجد بنائی، پھر جب مسجد کو بنانے سے فارغ ہوئے تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ غزوۂ تبوک کے سفر کی تیاری فرما رہے تھے، سو اُن لوگوں نے کہا: یارسول اللہ! ہم نے ایک مسجد تعمیر کی ہے تاکہ اس میں ضرورت مند لوگ آئیں، اور یارسول اللہ! ہم اس کو پسند کرتے ہیں کہ آپ ہمارے پاس آئیں اور اس مسجد میں نماز پڑھیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں حالتِ سفر میں ہوں اور اگر ہم اپنے سفر سے آچکے ہوتے تو ہم تمہارے پاس جاتے اور تمہیں نماز پڑھاتے اگر اللہ تعالیٰ چاہتے، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل فرمائی: ''وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا'' اور اس آیت میں یہ خبر دی کہ انہوں نے اس مسجد کو بنانے سے وہ ارادہ نہیں کیا جس کا انہوں نے ذکر کیا ہے کہ ہم نے ضرورت مند لوگوں کے لیے اور بارش کی رات میں لوگوں کے ٹھہرنے کے لیے یہ مسجد بنائی ہے۔

''وَكُفْرًا وَتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ'': لیکن ان کا مقصد اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو ضرر پہنچانا تھا اور مسلمانوں کے درمیان تفرقہ کرنا تھا، تاکہ جب کوئی دشمن ان پر حملہ کرنے کے لیے آئے تو ان کو متفرق پائے، سو دشمن کے لیے ان پر حملہ کرنا آسان ہو جائے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بہترین ساتھی چار ہیں، بہترین سریے وہ ہیں جس سریہ میں چار سو کی تعداد ہو، اور بہترین لشکر وہ ہے جس میں چار ہزار شریک ہوں، اور جس لشکر کی تعداد بارہ ہزار ہو وہ لشکر کی کمی کی وجہ سے مغلوب نہیں ہوگا۔

(مسند احمد: ٢٦٨٢، مسند عبد بن حمید: ٦٥٢، سنن ابوداؤد: ٢٦١١، سنن ترمذی: ١٥٥٥، مسند ابویعلیٰ: ٢٥٨٧، صحیح ابن خزیمہ: ٢٥٣٨، صحیح ابن حبان: ٤٧١٧، المستدرک للحاکم ج١ ص ٤٤٣، ج٢ ص ١٠١، سنن بیہقی ج٩ ص ١٥٦، مؤسسۃ الرسالہ، بیروت، ١٤٢٠ھ)

''وَإِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ مِن قَبْلُ'': یعنی منافقین نے یہ مسجد اس لئے تعمیر کی تھی کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کریں، وہ لوگ اس مسجد سے اُن لوگوں کی تاک میں رہیں جو اللہ اور اس کے رسول سے محاربہ کرتے ہیں۔

اور عام اہلِ تاویل نے کہا ہے کہ اس مسجد کا بنانے والا ابو عامر تھا، اور یہ ذکر کیا گیا ہے کہ ابو عامر اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتا تھا، پھر بھاگ جاتا، پس اس نے منافقین سے کہا: تم ایک مسجد بناؤ اور اس کی تیاری کرو۔

''وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنَىٰ'': یعنی منافقین نے قسمیں کھائیں کہ ہم نے اس مسجد کو بنانے سے سوائے خیر اور نیکی کے کوئی ارادہ نہیں کیا۔ ''وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ'': اور اللہ عزوجل شہادت دیتے ہیں کہ منافقین ضرور جھوٹے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''(اے رسولِ اکرم!) آپ اس مسجد میں کبھی بھی کھڑے نہ ہوں، سوا اُس مسجد کے کہ جس کی بنیاد اول روز سے ہی تقویٰ اور خدا خوفی پر رکھی گئی ہے، وہی مسجد اس کی مستحق ہے کہ آپ اس مسجد

میں قیام کریں، اس مسجد کے قرب میں ایسے مرد ہیں جو اچھی طرح پاکیزہ ہونے سے محبت کرتے ہیں، اور اللہ اچھی طرح پاکیزگی حاصل کرنے والوں سے محبت فرماتے ہیں O" (التوبہ: ۱۰۸)

"لَا تَقُمْ فِیْهِ اَبَدًا": یعنی خواہ منافقین آپ سے سوال کریں، تب بھی آپ اس مسجد میں نماز نہ پڑھیں۔

"لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِیْهِ": بعض مفسرین نے کہا: اس سے مراد مسجد قباء ہے۔ اور دوسرے مفسرین نے کہا: اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد ہے یعنی مسجد نبوی۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ہم میں مباحثہ ہوا کہ وہ کون سی مسجد ہے جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ میری مسجد ہے۔ (سنن ترمذی: ۳۰۹۹، سنن نسائی ج ۵ ص ۲۶۳، صحیح مسلم: ۱۰۱۵)

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا: وہ کون سی مسجد ہے جس کی بنیاد اول یوم سے تقویٰ پر ہے، انہوں نے کہا: وہ میری یہ مسجد ہے۔

ظاہر یہ ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے اس سے مسجد قباء کا ارادہ کیا تھا، کیونکہ اہل قباء کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی ہے: "فِیْهِ رِجَالٌ یُّحِبُّوْنَ اَنْ یَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الْمُطَّهِّرِیْنَ" (اس مسجد کے قرب میں ایسے مرد ہیں جو اچھی طرح پاکیزہ ہونے سے محبت کرتے ہیں، اور اللہ اچھی طرح پاکیزگی حاصل کرنے والوں سے محبت فرماتے ہیں)۔

اللہ عزوجل نے اہل قباء کے متعلق فرمایا: اللہ تعالیٰ تمہاری تحسین فرماتے ہیں کہ تم بہت اچھی طرح پاکیزگی حاصل کرتے ہو، سو تم کس طرح پاکیزگی حاصل کرتے ہو، انہوں نے کہا: ہمارے جسم پر جو بول اور براز کے آثار ہوتے ہیں ہم اُن کو اچھی طرح پانی سے دھوتے ہیں۔

اور بعض احادیث میں مذکور ہے کہ صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہ! ہم تورات میں استنجاء کا ذکر پاتے ہیں اور ہم پانی کے ساتھ استنجاء کرنے کو ترک نہیں کرتے، تو آپ نے فرمایا: تم اس کو ترک نہ کرو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "تو کیا جن لوگوں نے اپنی مسجد کی بنیاد خدا خوفی اور اللہ کی رضا جوئی پہ رکھی، وہ بہتر ہیں یا وہ بہتر ہیں جنہوں نے اپنی عمارت کی بنیاد ایسے کھوکھلے گڑھے کے گرنے والے کنارے پر رکھی جو اس عمارت کو بنانے والے کو لے کر دوزخ کی آگ میں گر پڑا، اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں عطا فرماتے O" (التوبہ: ۱۰۹)

"اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٍ خَیْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ":

الاس اور التاسیس کا معنی واحد ہے۔ "شَفَا جُرُفٍ هَارٍ": جُرُف اس زمین کو کہتے ہیں جس میں پانی بہتا ہو، اور "هار" کا معنی ہے: جو زمین سخت نہ ہو، "رجل هار" اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کمزور ہو، اور اس سے مراد ایسی زمین ہے جو نرم ہو اور اس کا انہدام بہت جلد ہو۔

امام ابوعبیدہ نے کہا: الشفا کا معنی ہے کنارہ، اور "جرف" سے مراد ہے: جس زمین میں وادیوں کا پانی بہہ کر آتا ہو۔

"فَانْهَارَ بِهٖ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ": بعض مفسرین نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ان کی مساجد کو جہنم کی آگ میں دھنسا دیا۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے: یعنی اس عمارت کی بنیادیں دوزخ کی آگ میں گر گئیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "ان کی بنائی ہوئی یہ عمارت ان کے دلوں میں ہمیشہ شکوک وشبہات سے کھٹکتی رہے گی سوا اس کے کہ ان کے دل پاش پاش ہو جائیں، اور اللہ سب کچھ جاننے والے، عظیم حکمتوں والے ہیں O"
(التوبہ:١١٠)

"لَا یَزَالُ بُنْیَانُهُمُ الَّذِیْ بَنَوْا رِیْبَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ":
بعض مفسرین نے کہا کہ انہوں نے اس مسجد کو شک کی بنیاد پر بنایا تھا، اور بعض نے کہا: وہ مسجد اُن کے لیے حسرت اور ندامت کا باعث ہوگی، یعنی جب وہ اپنے منافقانہ کاموں سے شرمندہ اور رسوا ہوں گے۔
"اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ": اس میں یہ مثال بیان فرمائی ہے کہ خوف اور ڈر سے اُن کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے قریب ہے۔ (تاویلات اہل السنۃ ج ٥ ص ٤٥٩۔ ٣٨٥، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ١٤٢٦ھ)

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَ یُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ وَ الْقُرْاٰنِ ؕ وَ مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِكُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿١١١﴾

بے شک اللہ نے مسلمانوں سے اُن کی جانوں اور اُن کے مالوں کو اس کے عوض خرید لیا کہ اُن کے لیے جنت ہوگی، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور (کافروں کو) قتل کرتے ہیں اور (ان کے ہاتھوں سے) شہید کیے جاتے ہیں، یہ اللہ کا تورات اور انجیل اور قرآن میں برحق وعدہ ہے، اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا ہے، سو تم اس بیع پر خوشی مناؤ جو تم نے اللہ سے بیع کی ہے اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے O

اَلتَّآىِٕبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآىِٕحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿١١٢﴾

جو لوگ توبہ کرنے والے ہیں، عبادت کرنے والے ہیں، اللہ کی حمد کرنے والے ہیں، روزہ رکھنے والے ہیں، رکوع کرنے والے ہیں، سجدہ کرنے والے ہیں، نیکی کا حکم دینے والے ہیں اور برے کاموں سے منع کرنے والے ہیں، اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے ہیں اور (ایسے ہی) مومنین کو خوش خبری سنا دیجئے O

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿١١٣﴾

اللہ کے نبی اور جو لوگ ایمان لائے ہیں اُن کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ مشرکین کے لیے مغفرت طلب کریں، خواہ وہ ان کے قریبی رشتہ دار ہوں جب کہ ان پر یہ واضح ہو چکا ہے کہ مشرکین دوزخ میں رہنے والے ہیں O

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ ۚ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ ﴿١١٤﴾

اور ابراہیم کا اپنے (عرفی) باپ کے لیے مغفرت طلب کرنا صرف اس وعدہ کی وجہ سے تھا جو انہوں نے اپنے (عرفی) باپ سے کیا تھا، پس جب اُن پر یہ واضح ہو گیا کہ اُن کا عرفی باپ اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گئے، بے شک ابراہیم بہت ہی رحم دل اور بردبار تھے O

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ إِذْ هَدَاهُمْ حَتَّىٰ يُبَيِّنَ لَهُمْ مَا يَتَّقُونَ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿١١٥﴾

اور اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو ہدایت دینے کے بعد انہیں گمراہی پر چھوڑ دیں حتیٰ کہ ان پر یہ واضح فرما دیں کہ ان لوگوں کو کن کاموں سے بچنا واجب ہے، بے شک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والے ہیں O

إِنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۚ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿١١٦﴾

بے شک اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمینوں کی سلطنت ہے، وہی زندہ فرماتے ہیں اور وہی مارتے ہیں، اور تمہارے لیے اللہ کے سوا نہ کوئی کارساز ہے اور نہ کوئی مدد کرنے والا O

لَقَدْ تَابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبُ فَرِيقٍ مِنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّهُ بِهِمْ رَءُوفٌ رَحِيمٌ ﴿١١٧﴾

اللہ کی قسم اللہ تعالیٰ نے نبی پر نظرِ رحمت فرمائی اور مہاجرین اور انصار پر جنہوں نے مشکل کے وقت (غزوہ تبوک) میں نبی کی پیروی کی جب کہ اس وقت اُن میں سے ایک فریق کے دل حق سے پھر جانے کے قریب تھے، پھر اللہ نے اُن سب کی توبہ قبول

فرمائی، بے شک اللہ اُن سب پر سب سے زیادہ شفیق، رحم فرمانے والے ہیں O

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَ ضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾

اور اُن تینوں کی بھی توبہ قبول فرمائی جن کی توبہ کے قبول ہونے کو موخر رکھا گیا تھا حتیٰ کہ جب زمین وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی اور ان کی جانیں بھی اُن پر تنگ ہوگئیں اور انہوں نے یہ غالب گمان کر لیا کہ اللہ کے غضب سے بچنے کی جگہ صرف اللہ ہی کی طرف ہے، پھر اللہ نے اُن کی توبہ قبول فرمائی تا کہ وہ اپنی توبہ پر (ہمیشہ) قائم رہیں، بے شک اللہ ہی بہت زیادہ توبہ قبول فرمانے والے، بہت رحم فرمانے والے ہیں O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”بے شک اللہ نے مسلمانوں سے اُن کی جانوں اور اُن کے مالوں کو اس کے عوض خرید لیا کہ اُن کے لیے جنت ہوگی، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور (کافروں کو) قتل کرتے ہیں اور (ان کے ہاتھوں سے) شہید کیے جاتے ہیں، یہ اللہ کا تورات اور انجیل اور قرآن میں برحق وعدہ ہے، اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا ہے، سو تم اس بیع پر خوشی مناؤ جو تم نے اللہ سے بیع کی ہے اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے O“ (التوبہ:۱۱۱)

آیات سابقہ سے التوبہ:۱۱۱ کا ارتباط

علامہ ابو حفص عمر بن علی الدمشقی الحنبلی المتوفی ۸۸۰ھ، التوبہ:۱۱۱ تا ۱۱۸ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

” إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ “:

ان آیات سے پہلے اللہ تعالیٰ نے منافقین کے احوال بیان فرمائے تھے، پھر اس کے بعد جہاد کی فضیلت کو بیان فرمایا۔ محمد بن کعب القرظی نے بیان کیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں لیلۃ العقبہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انصار سے بیعت کی اور وہ ستر (۷۰) انصاری تھے، تب حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ اپنے رب کے لیے اور اپنی جان کے لیے جو چاہیں شرط رکھیں تو آپ نے فرمایا: میں اپنے رب کے لیے یہ شرط رکھتا ہوں کہ تم اس کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو، اور اپنے لیے یہ شرط رکھتا ہوں کہ تم جس طرح اپنی جانوں اور اپنے مالوں کی دشمنوں سے حفاظت کرتے ہو، اسی طرح تم میری جان کی بھی حفاظت کرو۔ انصار نے کہا: جب ہم ایسا کر لیں تو ہمیں اس کے عوض میں کیا ملے گا؟ آپ نے فرمایا: الجنۃ، انصار نے کہا: یہ بہت نفع مند بیع ہے، نہ ہم اس بیع سے اقالہ کریں گے یعنی اس بیع کو فسخ نہیں کریں گے، تب یہ آیت نازل ہوئی:

"اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ" تب انصار نے کہا: اس بیع کی قیمت عطا فرمانے والے اللہ کریم ہیں اور انہوں نے اس بیع کی بہت زیادہ قیمت عطا فرمائی ہے۔

(تفسیر الطبری ج ۱۲ ص ۶-۷، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۳۳ھ، تفسیر ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۸۸۷، تخریج الکشاف للزیلعی ج ۲ ص ۱۰۳، اسباب النزول للواحدی ص ۱۹۶)

اللہ تعالیٰ کا تمام مسلمانوں سے جنت کا وعدہ اُن مسلمانوں کو بھی شامل ہے جو مرتکب کبیرہ ہوں

میں کہتا ہوں: بعض علماء نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مومنین سے اللہ کی راہ میں جان اور مال خرچ کرنے کے عوض جنت کا وعدہ فرمایا ہے اور تمام مومنین سے یہ بیع ایک ساتھ کی ہے اور جب خریدنے والا چند چیزوں کو ایک ساتھ خرید لے پھر اگر ان میں سے کوئی چیز عیب دار ہو تو پھر اسے یہ اختیار نہیں ہوتا کہ وہ بے عیب چیزوں کی خرید کو برقرار رکھے اور عیب دار چیز کو رد کر دے، مثلاً کوئی شخص سیبوں کے یا آموں کے پورے کریٹ یا پوری پیٹی کو خرید لے اور خریدنے کے بعد کہے: ان سیبوں یا آموں میں سے کوئی ایک آم یا سیب داغ دار ہے یا خراب ہے تو اب اسے یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس داغ دار آم یا سیب کو واپس کر دے، یا تو وہ کریٹ کے تمام آموں یا سیبوں کو خرید لے گا یا تمام کو رد کر دے گا، اب اللہ عزوجل نے تمام مومنین سے بلا استثناء ان کی جانوں اور مالوں کو جنت کے عوض خرید لیا ہے، اب اگر ان میں سے بعض مومنین بے عمل یا بدعمل ہوں تو پھر اللہ عزوجل ایسا نہیں فرمائیں گے کہ نیک مومنین کے ساتھ تو اس سودے کو برقرار رکھیں اور بدعمل اور بے عمل لوگوں کے ساتھ اس بیع کو رد فرما دیں، اگر کوئی شخص یہ کہے کہ خریدار نے بے خبری میں اس پورے کریٹ کی بیع کی تھی، اگر اس کو پتا ہوتا کہ اس کریٹ میں بعض آم یا سیب داغ دار ہیں تو وہ اس پورے کریٹ کی بیع نہ کرتا تو میں کہوں گا: اللہ عزوجل تو علام الغیوب ہیں، جس وقت وہ تمام مومنین سے یہ بیع فرما رہے تھے اس وقت بھی ان کو علم تھا کہ ان میں سے بعض مومنین بے عمل یا بدعمل ہیں، تو جب اللہ عزوجل نے اپنے علم کے باوجود اس بیع کو قائم رکھا اور بعض بے عمل اور بدعمل لوگوں کا استثناء نہیں فرمایا، اس سے یہ لازم ہوا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ تمام مومنین سے کیے ہوئے اس وعدہ کو پورا فرمائیں گے خواہ ان مومنین میں سے بعض بے عمل یا بدعمل کیوں نہ ہوں۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ جو مومنین بے عمل یا بدعمل ہوں، اللہ تعالیٰ ان کی موت سے پہلے اُن کو توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمائیں گے اور اُن کو دائمی جنتوں کا اہل بنا دیں گے، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے اللہ تعالیٰ اُن بعض بے عمل یا بدعمل مسلمانوں کی بھی مغفرت فرما دیں گے۔ (سعیدی غفرلہٗ)

گناہ کبیرہ کے مرتکبین کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے متعلق احادیث

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "شفاعتی لاھل الکبائر من امتی" (میری شفاعت میری امت کے کبیرہ گناہ کرنے والوں کے لیے ہے)۔

(سنن ترمذی: ۲۴۳۵، ۲۴۳۶، ۳۹۲۸، سنن ابن ماجہ: ۴۳۱۰، سنن ابوداؤد: ۴۷۳۹، مسند ابوداؤد الطیالسی: ۱۷۷۳، مسند احمد: ۱۳۲۲۶، ۱۳۲۲۲، ۱۳۲۲۳، السنۃ لابن ابی عاصم: ۸۳۰، مسند البزار: ۵۸۴۳، ۹۹۹۳، صحیح ابن حبان: ۶۴۶۷، ۶۴۶۸، کتاب الشریعۃ للآجری: ۷۷۸، المعجم الاوسط للطبرانی: ۵۶۶۳، المعجم الصغیر للطبرانی: ۴۴۸، المعجم الکبیر للطبرانی: ۷۴۹، ۱۱۴۵۴، المستدرک للحاکم: ۲۲۸، ۲۳۰، ۲۳۱، حلیۃ الاولیاء لابی نعیم ج ۳ ص ۲۰۰، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۱۵۸۳۸، شعب الایمان: ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، الاحد کار ج ۲ ص ۵۲۱، موارد الظمآن ج ۱ ص ۶۳۵، رقم

الحدیث:٢٥٩٦،الجامع الصحیح للسنن والمسانید ج١ص٥٨)

یا اللہ عزوجل اپنے فضل وکرم سے ان سب کو بخش دیں گے خواہ ان میں سے بعض کبیرہ گناہ کرنے والے کیوں نہ ہوں، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:"وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ (الرعد:٦)"۔

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی شافعی متوفی ٦٠٦ھ،الرعد:٦ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ہمارے اصحاب نے اس آیت سے اس پر استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو توبہ سے پہلے بھی معاف فرمادیں گے، کیونکہ اس آیت میں فرمایا ہے کہ جس حال میں لوگ اپنی جان پر ظلم کرنے کے ساتھ مشغول ہوں یعنی گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوں، اس حال میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو معاف فرمادیں گے، اور یہ معلوم ہے کہ جس حال میں انسان اپنی جان پر ظلم کرنے کے ساتھ مشغول ہو، اس حال میں وہ توبہ کرنے والا نہیں ہوتا، سو اس آیت نے اس پر دلالت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی توبہ کرنے سے پہلے بھی گناہ کو معاف فرمادیتے ہیں۔ اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اس آیت میں جان پر ظلم کرنے والوں سے مراد کفار ہوں، لہٰذا متعین ہو گیا کہ اس آیت میں وہ مسلمان مراد ہیں جو گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرکے اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہوں۔

(التفسیر الکبیر ج٧ ص١٢،دار احیاء التراث العربی، بیروت،١٤١٥ھ)

اللہ تعالیٰ کا اپنے فرمائے ہوئے وعدہ کے خلاف کرنے کا محال ہونا

"وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ":یعنی عہد کو توڑنا کذب ہے اور یہ انسان کے حق میں بھی قبیح ہے، تو جو ذات ہر عیب سے مبرا اور منزہ ہے اس کے حق میں وعدہ کے خلاف کرنا بہ طریق اولیٰ قبیح ہے اور اللہ کے حق میں ہر قبیح کام محال ہے۔

"فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ۚ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ":سو تم اس بیع پر خوشی مناؤ جو تم نے اللہ سے بیع کی ہے اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:"جو لوگ توبہ کرنے والے ہیں، عبادت کرنے والے ہیں، اللہ کی حمد کرنے والے ہیں، روزہ رکھنے والے ہیں، رکوع کرنے والے ہیں، سجدہ کرنے والے ہیں، نیکی کا حکم دینے والے ہیں اور برے کاموں سے منع کرنے والے ہیں، اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے ہیں اور (ایسے ہی) مومنین کو خوش خبری سنادیجئے O"(التوبہ:١١٢)

"اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ":جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے مومنین سے اُن کی جانوں اور ان کے مالوں کو خرید لیا تو یہاں بیان فرمایا کہ ان مومنین کا مصداق وہ لوگ ہیں جو ان صفات کے ساتھ متصف ہوں، یعنی توبہ کرنے والے ہوں، عبادت کرنے والے ہوں، اللہ تعالیٰ کی حمد کرنے والے ہوں، اللہ تعالیٰ کے لیے روزہ رکھنے والے ہوں، نمازوں میں رکوع کرنے والے اور سجدہ کرنے والے ہوں، اور نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے ہوں، اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے ہوں۔

یعنی جو مومنین ان صفات کے ساتھ متصف ہوں، انہی مومنین کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔

الزجاج نے کہا: گویا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مومنین سے جنت کا وعدہ فرمایا ہے، جیسے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى۔۔۔ (النساء: ٩٥)" (اور سب سے اللہ نے جنت کا وعدہ فرمایا ہے)۔

"اَلتَّآئِبُوْنَ": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یعنی وہ شرک سے توبہ کرنے والے ہیں۔ اور حسن بصری نے کہا: وہ شرک اور نفاق سے توبہ کرنے والے ہیں۔ علامہ قرطبی نے کہا: وہ ہر قسم کی معصیت سے اللہ عزوجل کی اطاعت کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔

"اَلْعٰبِدُوْنَ": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ فرائض اور واجبات کو ادا کرنے والے ہیں۔ اور دوسروں نے کہا: جو اللہ عزوجل کی اخلاص سے عبادت کرنے والے ہیں۔ حسن بصری نے کہا: یہ وہ لوگ ہیں جو خلوت اور جلوت میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں۔ قتادہ نے کہا: وہ لوگ رات اور دن عبادت کر کے اپنے بدن کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والے ہیں۔

"اَلْحٰمِدُوْنَ": یہ وہ لوگ ہیں جو ہر حال میں اللہ عزوجل کی ثناء کرتے ہیں خواہ خوشی کی حالت ہو یا رنج کی حالت ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے پہلے قیامت کے دن جن کو جنت کیلئے بلایا جائے گا، یہ وہ لوگ ہیں جو خوشی اور ناخوشی کی حالت میں اللہ عزوجل کی حمد کرتے رہتے ہیں۔ (شعب الایمان للبیہقی: ٤٣٨٣، ٤٣٨٤، ٤٣٧٣)

"اَلسَّآئِحُوْنَ": وہ روزہ رکھنے والے ہیں۔

(تفسیر الطبری ج ١٢ ص ١٠، دار عالم الکتب، ریاض، ١٤٢٤ھ، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ٦ ص ١٨٨٩)

عبید بن عمیر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے "السائحین" کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا "هم الصائمون" یہ وہ لوگ ہیں جو روزہ رکھتے ہیں۔

(تفسیر الطبری ج ١٢ ص ١١، دار عالم الکتب، ریاض، ١٤٢٤ھ، المطالب العالیہ: ٣٩٩٩، سنن بیہقی ج ٤ ص ٣٠٥، المستدرک للحاکم ج ٢ ص ٣٣٥، شعب الایمان للبیہقی: ٣٥٧٨)

حکیم بن حزام نے بیان کیا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اَلسَّآئِحُوْنَ" وہ لوگ ہیں جو روزہ رکھنے والے ہیں۔

(تفسیر الطبری ج ١٢ ص ١١، دار عالم الکتب، ریاض، ١٤٢٤ھ، کتاب الضعفاء للعقیلی ج ١ ص ٣١٧، الکامل لابن عدی ج ٢ ص ٦٣٨، معجم ابن المقری: ٥٩٩، العلل لامام احمد بن حنبل: ٥٣٢، تفسیر ابن ابی حاتم ج ٦ ص ١٨٨٩، المعجم الکبیر للطبرانی: ٩٠٩٥)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ "اَلسَّآئِحُوْنَ" سے مراد روزہ رکھنے والے ہیں۔

(تفسیر الطبری ج ١٢ ص ١٣، دار عالم الکتب، ریاض، ١٤٢٤ھ)

مجاہد نے کہا کہ "اَلسَّآئِحُوْنَ" سے مراد روزہ رکھنے والے ہیں۔

(تفسیر الطبری ج ١٢ ص ١٣، دار عالم الکتب، ریاض، ١٤٢٤ھ، تفسیر مجاہد ص ٣٧٧، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ٦ ص ١٨٩٠، حلیۃ الاولیاء لابی نعیم ج ٩ ص ٣٣)

الولید بن عبد اللہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں، انہوں نے فرمایا: اس امت کی سیاحت روزے رکھنا ہے۔

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

تمام اعمال میں افضل روزہ رکھنا ہے، یعنی اپنی پسند کی لذیذ چیزیں اور لذیذ مشروب اور جماع کو ترک کر دے، اور یہی یہاں پر سیاحت سے مراد ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کی یہ صفت بیان فرمائی ہے: "سٰٓئِحٰتٍ۔ (التحریم: ٥)" یعنی روزہ رکھنے والیاں۔ (تفسیر القرآن العظیم لحافظ ابن کثیر القرشی الدمشقی المتوفی ٧٧٤ھ ص ٩٩٠، دار الکتاب العربی، بیروت، ١٤٣٢ھ)

"الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ": یعنی نماز پڑھنے والے اور اپنی نمازوں میں رکوع اور سجدہ کرنے والے۔

حسن بصری نے کہا: یعنی فرض نمازیں پڑھنے والے۔

(تفسیر طبری ج ١٢ ص ١٥، دار عالم الکتب، ریاض، ١٤٣٣ھ تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ٦ ص ١٨٩١، نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ١٤١٧ھ)

"الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ": حسن بصری نے کہا: یعنی وہ لا الٰہ الا اللہ پڑھنے کا حکم دیتے ہیں۔ "وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ": یعنی وہ اللہ کا شریک بنانے سے منع کرتے ہیں۔

ابو العالیہ نے کہا: قرآن مجید میں جہاں بھی اللہ عزوجل نے الامر بالمعروف اور والنھی عن المنکر کا ذکر فرمایا ہے تو امر بالمعروف سے مراد ہے شرک کو ترک کر کے اسلام کی دعوت دینا، اور النھی عن المنکر سے مراد ہے بتوں اور شیاطین کی عبادت سے روکنا۔

امام ابن جریر طبری متوفی ٣١٠ھ نے کہا: المعروف سے مراد ہر وہ کام ہے جس کام کا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو کرنے کا حکم فرمایا ہے، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بندوں کو جس کام کے کرنے کا حکم دیا ہے، وہ المعروف ہے۔ اور ہر وہ کام جس سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو منع فرمایا ہے یا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کام سے منع فرمایا ہے وہ منکر ہے۔

(تفسیر طبری ج ١٢ ص ١٦۔١٧، دار عالم الکتب، ریاض، ١٤٣٣ھ تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ٦ ص ١٨٩١۔١٨٩٢، نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ١٤١٧ھ)

"وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر دوام کرتے ہیں۔ حسن بصری نے کہا: جو اللہ تعالیٰ کے فرائض کو ادا کرتے ہیں۔

(تفسیر الطبری ج ١٢ ص ١٨، دار عالم الکتب، ریاض، ١٤٣٣ھ تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ٦ ص ١٨٩٢، نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ١٤١٧ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اللہ کے نبی اور جو لوگ ایمان لائے ہیں اُن کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ مشرکین کے لیے مغفرت طلب کریں، خواہ وہ ان کے قریبی رشتہ دار ہوں جب کہ ان پر یہ واضح ہو چکا ہے کہ مشرکین دوزخ میں رہنے والے ہیں○" (التوبہ: ١١٣)

<u>عبد مناف یعنی ابو طالب کا کلمۂ توحید پڑھنے سے انکار کر دینا</u>

"مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ":

حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہما اپنے والد یعنی حضرت المسیب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، انہوں نے بیان کیا کہ جب

ابوطالب پر موت کا وقت آیا تو اس کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے، پس آپ نے اس کے پاس ابوجہل بن ہشام اور عبداللہ بن ابی امیہ بن المغیرہ کو دیکھا، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوطالب سے فرمایا: "اے میرے چچا! آپ یہ کلمہ پڑھیں: لا الٰہ الا اللہ، تو میں اللہ کے پاس آپ کے حق میں شہادت دوں گا"، پس ابوجہل اور عبداللہ بن ابی امیہ نے کہا: "اے ابوطالب! کیا تم عبدالمطلب کی ملت سے اعراض کرو گے؟" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوطالب پر مسلسل کلمۂ توحید پیش کرتے رہے اور وہ دونوں اپنی بات دہراتے رہے، حتیٰ کہ ابوطالب نے ان سے جو آخری بات کہی، وہ یہ تھی کہ "وہ عبدالمطلب کی ملت پر ہے اور اس نے لا الٰہ الا اللہ پڑھنے سے انکار کر دیا"، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سنو! اللہ کی قسم! میں آپ کے لیے اللہ سے مغفرت طلب کرتا رہوں گا جب تک مجھے اس سے منع نہیں فرمایا جائے گا"۔ تب اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق یہ آیت نازل فرمائی: "اللہ کے نبی اور جو لوگ ایمان لائے ہیں اُن کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ مشرکین کے لیے مغفرت طلب کریں، خواہ وہ ان کے قریبی رشتہ دار ہوں" (التوبہ: ۱۱۳)

(صحیح البخاری: ۱۳۶۰، ۳۸۸۴، ۴۶۷۵، ۴۷۷۲، ۶۶۸۱، صحیح مسلم: ۲۴، الرقم المسلسل: ۱۳۱، سنن نسائی: ۲۰۳۵، السنن الکبریٰ: ۱۱۳۸۳، مصنف عبدالرزاق: ۴۶۷۵۔ ۳۸۸۴، الاحاد والمثانی: ۷۲۰، المعجم الکبیر: ۸۲۰، ج ۲۰ ص ۳۴۹، دلائل النبوۃ ج ۲ ص ۳۴۲۔ ۳۴۳، الاسماء والصفات ص ۹۷۔ ۹۸، مسند الشامیین: ۳۰۳۳، شرح السنۃ: ۱۲۷۳، صحیح ابن حبان: ۹۸۲، شرح مشکل الآثار: ۲۳۸۶، ۲۳۸۵، ۲۳۸۴، مسند احمد ج ۵ ص ۴۳۳، طبع قدیم، مسند احمد: ۲۳۶۷۴، ج ۳۹ ص ۷۸۔ ۷۹، مؤسسۃ الرسالہ، بیروت، جامع المسانید لابن الجوزی: ۷۶۲۲، مکتبۃ الرشد، ریاض ۱۴۲۶ھ، مسند الطحاوی: ۳۳۳) (موسوعۃ المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی الشریف، ج ۱ ص ۷۔ ۶۳۸، دار المعرفہ بیروت، ۱۴۳۴ھ)

حضرت المسیب رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن المسیب رضی اللہ عنہما کا تذکرہ

علامہ بدر الدین ابو محمد محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ، لکھتے ہیں:

محمد بن مسلم بن شہاب الزہری نے کہا ہے کہ سعید ابن المسیب اور ان کے والد المسیب بن حزن القرشی المخزومی، یہ دونوں حضرات صحابی ہیں رضی اللہ عنہما۔ ان دونوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کی، حضرت المسیب رضی اللہ عنہ اُن صحابہ میں سے ہیں جنہوں نے درخت کے نیچے بیعت کی تھی، یہ تاجر تھے، انہوں نے سات (۷) احادیث کی روایت کی ہے۔ امام بخاری نے ان سے تین احادیث کی روایت کی ہے۔ علامہ ذہبی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت المسیب بن حزن رضی اللہ عنہ صحابی ہیں، اُن سے ان کے بیٹے روایت کرتے ہیں، وہ فتح خیبر کے بعد اسلام لائے تھے، انہوں نے کہا کہ حزن بن ابی وہب المخزومی نے بھی ہجرت کی تھی، وہ "طلقاء" میں سے ہیں، وہ دس (۱۰) ہجری میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دوران جنگ یمامہ میں شہید ہو گئے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ حدیث حقیقتاً مرسل ہے کیونکہ امام ابن حبان نے حضرت المسیب رضی اللہ عنہ کا تذکرہ ثقات تابعین میں کیا ہے، لیکن یہ قول غریب ہے۔

(عمدۃ القاری ج ۸ ص ۲۶۰۔ ۲۶۱، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۲۱ھ)

موت کے وقت کلمۂ توحید پڑھنا مفید نہیں ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوطالب کو موت کے وقت کلمہ پڑھنے کے لیے کیوں فرمایا؟

علامہ ابوالحسن علی بن خلف ابن بطال مالکی قرطبی متوفی ۴۴۹ھ لکھتے ہیں:

المہلب نے کہا ہے کہ کلمہ توحید پڑھنا اس کو نفع دیتا ہے جو فرشتوں کے روح قبض کرنے کے معائنہ اور مشاہدہ سے پہلے کلمہ توحید پڑھ لے، قرآن مجید میں ہے: "وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ۔ (النساء: ۱۸)" (اور توبہ کی مقبولیت اُن لوگوں کے لیے نہیں ہے جو مسلسل گناہ کرتے رہتے ہیں حتیٰ کہ جب اُن میں سے کسی ایک کو موت آتی ہے اس وقت وہ کہتا ہے: میں نے اب توبہ کرلی)۔

یعنی جب ملک الموت روح قبض کرنے کے لیے آجائے اور وہ اس کا مشاہدہ کرلے اور موت کے فرشتوں کو کوئی شخص اسی وقت دیکھ سکتا ہے جب وہ دنیا سے آخرت کی طرف منتقل ہو رہا ہو۔

علامہ ابن بطال لکھتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا سے موت کے وقت کہا: آپ لا الٰہ الا اللہ پڑھیں، میں اس کلمہ کی وجہ سے اپنے رب کے سامنے آپ کی شفاعت کروں گا، اس حدیث پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ موت کے وقت کلمہ پڑھنا تو معتبر نہیں ہوتا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے فرمایا: میں اس کلمہ کی وجہ سے آپ کی شفاعت کروں گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ابھی ابوطالب نے موت کے فرشتوں کو نہیں دیکھا تھا لیکن اس کا اعتقاد یہ تھا کہ اس نے کوئی عمل صالح نہیں کیا تھا نہ نماز پڑھی تھی، نہ روزہ رکھا تھا، نہ زکوٰۃ ادا کی تھی نہ حج کیا تھا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بتلایا کہ جس نے موت سے پہلے لا الٰہ الا اللہ پڑھ لیا، وہ مومنین میں داخل ہو جائے گا خواہ اس نے اس کے سوا اور کوئی عمل نہ کیا ہو۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ابوطالب نے آخرت کا معائنہ کرلیا تھا اور اس کو موت کا یقین ہو چکا تھا اور وہ اس حالت میں تھا کہ اگر وہ اس وقت ایمان لے آتا تو اس کو ایمان نفع نہ دیتا، اس لیے اس نے روح نکلنے کے وقت کہا: "وہ عبدالمطلب کی ملت پر ہے"، اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ امید ہوئی کہ اگر اس نے لا الٰہ الا اللہ پڑھ لیا اور آپ کی نبوت پر یقین کرلیا تو آپ اس کے لیے شفاعت کریں گے اور اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے کہ وہ اس سے درگزر فرمائیں اور اس حال میں اس کے ایمان کو قبول فرمالیں اور یہ ابوطالب کی خصوصیت ہوگی کیونکہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کرتا تھا اور آپ کا دفاع کرتا تھا، اس امید کی وجہ سے آپ نے فرمایا: اے چچا! آپ کلمہ پڑھ لیں، میں آپ کی شفاعت کروں گا۔ اس قسم کا جواب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی منقول ہے۔

علامہ ابن بطال لکھتے ہیں: کیا تم نے نہیں دیکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نفع پہنچایا ہے خواہ وہ اسلام پر فوت نہیں ہوا کیونکہ اس کو تمام اہل دوزخ میں سب سے کم عذاب ہوگا، تو اگر وہ اس حال میں کلمہ پڑھ لیتا تو آپ اس کو ضرور نفع پہنچاتے، خواہ اس نے موت کے فرشتوں کو دیکھ لیا ہوتا۔

اس اعتراض کا ایک اور جواب یہ ہے کہ ابوطالب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے دلائل دیکھے تھے اور آپ کے معجزات کی تصدیق کی تھی اور اس کو آپ کی نبوت کی صحت میں کوئی شک نہیں تھا، اگرچہ غیرت اور جاہلیت کا تعصب اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب پر ابھارتا تھا، اور باقی مشرکین اپنے سرداروں کی طرف دیکھ رہے تھے اور ان کے قول کی پیروی کر رہے تھے، پس ابوطالب اور اس جیسے لوگ بہت بڑے گناہ کے مستحق تھے کیونکہ ان کے پیروکاروں کے کفر اور ان کی تکذیب کا بوجھ بھی ان کے اوپر تھا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس توقع پر اس کو کلمہ پڑھنے کے لیے کہا کہ جب آپ اس سے کہیں گے کہ میں اللہ تعالیٰ کے پاس تمہاری شفاعت کروں گا تو اس کا عناد زائل ہو جائے گا اور وہ ایمان لانے میں تردد اور توقف نہیں کرے گا لیکن اس کے برخلاف ظاہر ہوا اور اس نے اللہ تعالیٰ کی

توحید اور آپ کی نبوت کی تصدیق نہیں کی۔ (شرح ابن بطال ج ٣ ص ٣٣٩۔ ٣٤٠، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ١٤٢٤ھ)

موت کے وقت کلمہ پڑھنا ابو طالب کی خصوصیت تھی

حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی شافعی متوفی ٨٥٢ھ لکھتے ہیں:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے موت کے وقت ابو طالب کو کلمہ پڑھنے کے لیے کہا، یہ اس کی خصوصیت تھی کیونکہ ابو طالب کے علاوہ کوئی اور شخص موت کے وقت کلمہ پڑھے تو اس وقت کلمہ پڑھنا اس کو نفع نہیں دے گا۔ سورۃ التوبہ: ١١٣ کی تفسیر میں ہم اس بحث کو زیادہ تفصیل سے لکھیں گے۔ (فتح الباری ج ٦ ص ٧٩٠، دار المعرفہ، بیروت، ١٤٢٦ھ)

سورۃ التوبہ: ١١٣ کی تفسیر میں حافظ ابن حجر نے لکھا ہے: ہم اس کی شرح ''کتاب الجنائز'' میں ابو طالب کی وفات کے قصہ میں لکھ چکے ہیں اور سورۃ القصص کی تفسیر میں ان شاء اللہ ہم اس پر کچھ کلام کریں گے۔ (فتح الباری ج ٥ ص ٦٢٤، دار المعرفہ، بیروت، ١٤٢٦ھ)

القصص: ٥٦ کی تفسیر میں حافظ ابن حجر نے لکھا ہے:

صحیح البخاری: ١٣٦٠ میں مذکور ہے: آپ نے موت کے وقت ابو طالب سے لا الٰہ الا اللہ پڑھنے کے لیے فرمایا۔ اس پر یہ اعتراض ہے کہ موت کے وقت تو کلمہ پڑھنا مفید نہیں ہوتا، علامہ کرمانی نے اس کے جواب میں کہا ہے: اس سے مراد ہے: جب ابو طالب پر موت کی علامات وارد ہوگئیں، ورنہ اگر وہ ملک الموت کا مشاہدہ کر لیتا تو پھر اس کا ایمان لانا مفید نہ ہوتا خواہ وہ کلمہ پڑھ لیتا، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بار بار کلمہ پڑھنے کے لیے فرماتے رہے اور ابو جہل وغیرہ اس کو منع کرتے رہے۔

حافظ ابن حجر اس اعتراض کے جواب میں لکھتے ہیں: یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ امید ہو کہ اگر اس نے ملک الموت کو دیکھنے کے بعد بھی کلمہ پڑھ لیا تو یہ اس کو مفید ہوگا، اگرچہ دوسروں کو اس حال میں کلمہ پڑھنا مفید نہیں ہوتا اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کے مرنے کے بعد آپ اس کے لیے تخفیف عذاب کی شفاعت کرتے رہے اور بالآخر اس کے عذاب میں تخفیف فرما دی گئی اور اس تخفیف کو اس کے خصائص میں سے شمار کیا گیا ہے۔

بعض علماء نے اس حدیث کو مراسیل صحابہ میں شمار کیا ہے کیونکہ حضرت المسیب رضی اللہ عنہ بیعت رضوان کے موقع پر اسلام لائے تھے اور ابو طالب کی وفات ہجرت سے پہلے ہوئی تھی، لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ حضرت المسیب رضی اللہ عنہ کے بعد میں اسلام لانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ حالت کفر میں ابو طالب کی وفات کے موقع پر حاضر نہ ہوں، جیسے عبد اللہ بن ابی امیہ، فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے تھے حالانکہ وہ ابو طالب کی وفات کے موقع پر موجود تھے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث روایت کی ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا سے فرمایا: آپ لا الٰہ الا اللہ پڑھیے، میں آپ کے حق میں گواہی دوں گا تو ابو طالب نے کہا: اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ قریش مجھے ملامت کریں گے اور کہیں گے کہ اس کو کلمہ توحید پڑھنے پر موت کی گھبراہٹ نے برانگیختہ کیا تو میں کلمہ پڑھ کر تمہاری آنکھوں کو ٹھنڈا کر دیتا، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ؕ ـــ (القصص: ٥٦)'' (بے شک آپ جس میں چاہیں ہدایت پیدا نہیں کر سکتے لیکن اللہ جس میں چاہتے ہیں ہدایت پیدا فرماتے ہیں)۔

(صحیح مسلم: ٢٥، الرقم المسلسل: ١٣٠، سنن ترمذی: ٣١٨٨، مسند احمد ج ٢ ص ٤٣٤)، (فتح الباری ج ٥ ص ٦٢٣۔ ٦٢٤، دار المعرفہ، بیروت، ١٤٢٦ھ)

اس کی توجیہ کہ نبی ﷺ نے صرف لا الٰہ الا اللہ پڑھنے کے لیے فرمایا اور محمد رسول اللہ پڑھنے کے لیے نہیں فرمایا

حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ٨٥٢ھ لکھتے ہیں:

نبی ﷺ نے ابوطالب سے فرمایا کہ وہ لا الٰہ الا اللہ پڑھے اور محمد رسول اللہ پڑھنے کے لیے نہیں فرمایا، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں جملے کمال اتصال کی وجہ سے ایک جملہ کے حکم میں ہیں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کو اللہ کا رسول تو مانتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار نہیں کرتا تھا۔ (فتح الباری ج ٥ ص ٧٥، دارالمعرفہ، بیروت، ١٣٢٦ھ)

ابوطالب کے ایمان کے متعلق بعض علماء کے شبہات اور ان کے جوابات

علامہ اسماعیل حقی متوفی ١١٣٧ھ لکھتے ہیں:

روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے والد اور والدہ اور آپ کے چچا ابوطالب کو زندہ فرمایا اور وہ آپ پر ایمان لائے۔

(روح البیان ج ١ ص ٢١٧، ج ٣ ص ٢٦٥، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ١٤٢١ھ)

میں کہتا ہوں کہ نبی ﷺ کے والدین کا ایمان تو اہل سنت کے نزدیک اتفاقی ہے لیکن ابوطالب کے متعلق اکثر اہل سنت کا مسلک یہ ہے کہ ان کا ایمان لانا ثابت نہیں ہے۔

علامہ شہاب الدین احمد خفاجی متوفی ١٠٦٩ھ لکھتے ہیں:

بہت عجیب و غریب باتوں میں سے ایک یہ عبارت ہے جس کو بعض علماء نے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے والدین کی طرح ابوطالب کو بھی نبی ﷺ کے لیے زندہ فرمایا حتیٰ کہ وہ موت کے بعد زندہ ہو کر اسلام سے مشرف ہوئے، میرا گمان ہے کہ یہ شیعوں کی من گھڑت روایت ہے۔ (نسیم الریاض ج ١ ص ٢١٠، مرکز اہل سنت، گجرات، دارالفکر، بیروت)

حافظ ابن کثیر الدمشقی متوفی ٧٧٤ھ لکھتے ہیں:

بعض غالی شیعہ کہتے ہیں کہ ابوطالب اسلام میں فوت ہوئے، حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ نے کہا: اے میرے بھتیجے! میرے بھائی نے وہ کلمہ پڑھ لیا جس کو پڑھنے کا انہیں حکم دیا تھا یعنی لا الٰہ الا اللہ، اس کا جواب کئی وجوہ سے ہے:

اولاً یہ کہ اس کی سند میں کئی مبہم راوی ہیں جن کا حال معلوم نہیں۔ ثانیاً یہ کہ نبی ﷺ نے فرمایا: میں نے نہیں سنا۔ ثالثاً یہ کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جب تک مجھے منع نہیں فرمایا جائے گا میں آپ کے لیے استغفار کرتا رہوں گا، پھر یہ آیت نازل ہوگئی:

"مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ○ (التوبہ: ١١٣)" (اللہ کے نبی اور جو لوگ ایمان لائے ہیں اُن کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ مشرکین کے لیے مغفرت طلب کریں، خواہ وہ ان کے قریبی رشتہ دار ہوں جب کہ ان پر یہ واضح ہو چکا ہے کہ مشرکین دوزخ میں رہنے والے ہیں ○)۔

اگر ابوطالب اسلام پر فوت ہوئے تھے تو نبی ﷺ ان کے لیے استغفار کیوں کرتے رہے اور پھر اس آیت کے نازل ہونے کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔

نیز اگر وہ اسلام پر فوت ہوئے تھے تو پھر دوزخ میں داخل نہ ہوتے، حالانکہ حدیث میں ہے کہ وہ دوزخ میں داخل ہوئے:

حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: آپ نے اپنے چچا سے کیا برائی دور کی، وہ آپ کی حفاظت کرتے تھے اور آپ کے لیے غضب ناک ہوتے تھے؟ آپ نے فرمایا: وہ دوزخ کے گڑھے میں تھے اور اگر میں نہ ہوتا تو وہ دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوتے۔ (صحیح البخاری: ۳۸۸۳، صحیح مسلم: ۲۰۹)

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا کا ذکر کیا اور فرمایا: شاید اس کو قیامت کے دن میری شفاعت سے نفع ہوگا، پس اس کو دوزخ کے گڑھے میں داخل فرما دیا جائے گا، آگ اس کے ٹخنوں تک پہنچے گی جس سے اس کا دماغ کھول رہا ہوگا۔ (صحیح البخاری: ۳۸۸۵، صحیح مسلم: ۲۱۰)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دوزخ والوں میں سب سے کم عذاب ابوطالب کو ہوگا، اس کو آگ کی دو جوتیاں پہنائی جائیں گی جس سے اس کا دماغ کھول رہا ہوگا۔ (صحیح البخاری: ۶۵۶۳، صحیح مسلم: ۲۱۲)

یہ تمام احادیث حافظ ابن کثیر نے شیعہ کی مذکورہ موضوع روایت کے رد میں ذکر کی ہیں۔ (البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۲۹۰-۲۹۳)

حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ اور حافظ بدرالدین عینی متوفی ۸۵۵ھ، اس موضوع روایت کے رد میں لکھتے ہیں:

اگر حضرت عباس کی طرف منسوب یہ روایت صحیح بھی ہوتی تب بھی اس کے معارض یہ احادیث صحیحہ ہیں، چہ جائے کہ یہ روایت صحیح بھی نہیں ہے، امام ابوداؤد اور امام نسائی نے یہ روایت ذکر کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب ابوطالب فوت ہوگئے تو میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کا بوڑھا گم راہ چچا فوت ہو گیا، آپ نے فرمایا: جاؤ! اس کو زمین میں چھپا دو، میں نے کہا: وہ مشرک ہونے کی حالت میں فوت ہوا ہے، آپ نے فرمایا: جاؤ! اس کو زمین میں چھپا دو۔ (سنن ابوداؤد: ۳۲۱۴، سنن نسائی: ۱۹۰)

(فتح الباری ج ۵ ص ۷۳، دارالمعرفہ، بیروت، ۱۴۲۶ھ، عمدۃ القاری ج ۱۷ ص ۲۳، دارالکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۲۱ھ)

ابوطالب کے ایمان نہ لانے کے متعلق مشاہیر علماء اہل سنت کی تصریحات

امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت متوفی ۱۵۰ھ لکھتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب کا کفر پر انتقال ہوا۔ (الفقہ الاکبر مع شرح الفقہ الاکبر ص ۱۰۸، مطبعہ مصطفی البابی، مصر)

علامہ علی ابوالحسن علی بن ابی بکر مرغینانی متوفی ۵۹۳ھ لکھتے ہیں:

جب کافر مر جائے اور اس کا کوئی مسلمان رشتہ دار موجود ہو تو وہ اس کو غسل دے، کفن پہنائے اور دفن کرے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کے باپ ابوطالب کے متعلق اسی طرح حکم دیا گیا، لیکن اس کو غسل اس طرح دیا جائے جیسے ناپاک کپڑے کو دھویا جاتا ہے اور کسی کپڑے میں لپیٹ دیا جائے اور اس کے لیے گڑھا کھودا جائے، کفن پہنانے اور لحد بنانے کی سنت کو ملحوظ نہ رکھا جائے اور نہ ہی اس کو گڑھے میں رکھا جائے بلکہ پھینکا جائے۔ (ہدایہ اولین ص ۱۶۱-۱۶۲، المکتبۃ العربیہ، دستگیر کالونی، کراچی)

علامہ ابراہیم بن محمد حلبی متوفی ۹۵۶ھ ہدایہ کی مذکورہ عبارت کی مثل لکھنے کے بعد فرماتے ہیں:

جب ابوطالب کا انتقال ہو گیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آ کر کہا: یا رسول اللہ! آپ کا گم راہ چچا فوت ہو گیا ہے۔

(غنیۃ المستملی ص ۶۰۳، سہیل اکیڈمی، لاہور)

علامہ سید احمد الطحطاوی متوفی ۱۲۳۱ھ، اور علامہ زین الدین ابن نجیم مصری نے بھی اس کے متقارب لکھا ہے۔
(حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح ج ۲ ص ۲۴۶، مکتبہ غوثیہ کراچی، البحرالرائق ج ۲ ص ۱۹۰، مصر)

حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی شافعی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

ہمیں امید ہے کہ عبدالمطلب اور ان کے تمام اہل بیت نجات پائیں گے، ماسوا ابوطالب (اس استثناء میں ابولہب کو بھی شامل کرنا ضروری تھا۔ سعیدی غفرلہٗ) کے، ان کے متعلق حدیث میں ہے کہ وہ پاؤں تک آگ میں ہے، یہ اس کا حال ہے جو کفر پر مرا اور اگر وہ توحید پر مرا ہوتا تو ضرور دوزخ سے نجات پاتا۔ (الاصابہ ج ۱ ص ۲۰۱، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

نیز حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چار چچاؤں نے اسلام کا زمانہ پایا، ان میں سے دو مسلمان نہیں ہوئے ابوطالب، ان کا نام عبد مناف ہے اور ابولہب، اس کا نام عبدالعزیٰ ہے، اور دو مسلمان ہوئے: حضرت حمزہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما۔
(فتح الباری ج ۵ ص ۷۵، دارالمعرفہ، بیروت، ۱۴۲۶ھ)

علامہ شہاب الدین احمد القسطلانی المتوفی ۹۱۱ھ لکھتے ہیں:

ابوطالب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرتا تھا اور آپ کی مدد کرتا تھا اور آپ سے طبعی محبت کرتا تھا نہ کہ شرعی محبت، پس اس پر تقدیر غالب آ گئی اور وہ ہمیشہ کفر پر رہا اور اللہ ہی کے لیے قوی حجت ہے۔ (ارشاد الساری ج ۸ ص ۳۹۸، دارالفکر، بیروت، ۱۴۲۱ھ)

علامہ بدرالدین ابو محمد محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ، حدیث: ۳۸۸۴، التوبہ: ۱۱۳، اور القصص: ۵۶ ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

اس سب سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابوطالب غیر اسلام پر مرا، اگر تم یہ کہو کہ سہیلی نے لکھا ہے کہ وہ اسلام لے آیا تھا تو میں کہوں گا کہ ان کا یہ قول حدیث صحیح کے معارض نہیں ہو سکتا۔ (عمدۃ القاری ج ۱۷ ص ۲۴، دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۲۱ھ)

ملا علی بن سلطان محمد القاری متوفی ۱۰۱۴ھ لکھتے ہیں:

اہل سنت کے نزدیک ابوطالب مسلمان نہیں ہے۔ (مرقات ج ۹ ص ۳۶۰، مکتبہ حقانیہ، پشاور)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ لکھتے ہیں:

حدیث صحیح نے ابوطالب کے کفر کو ثابت کر دیا ہے۔ (مدارج النبوت ج ۲ ص ۳۸، مکتبہ نوریہ رضویہ، سکھر)

روضۃ الاحباب میں بھی ابوطالب کے کفر پر مرنے کی احادیث لائی گئی ہیں۔ (مدارج النبوت ج ۲ ص ۴۹، مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر)

اعلیٰ حضرت عظیم البرکت امام احمد رضا فاضل بریلوی متوفی ۱۳۴۰ھ فرماتے ہیں:

علماء کا جابجا کفر ابوطالب پر اجماع نقل فرمانا اور اسلام ابوطالب کا قول مزعوم روافض فرمانا، جس کے نقول اگلے قصوں میں مذکور و منقول اس حکایت بے سروپا کے رد کو بس ہے۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۲۹ ص ۷۱۳، رضا فاؤنڈیشن، جامعہ رضویہ لاہور، پاکستان)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”اور ابراہیم کا اپنے (عرفی) باپ کے لیے مغفرت طلب کرنا صرف اس وعدہ کی وجہ سے تھا جو انہوں نے اپنے (عرفی) باپ سے کیا تھا، پس جب اُن پر یہ واضح ہو گیا کہ اُن کا عرفی باپ اللہ کا

دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گئے، بے شک ابراہیم بہت ہی رحم دل اور برد بار تھے O" (التوبہ: ۱۱۴)

"وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ":

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے (عرفی) باپ کے لیے مغفرت طلب کرنے کی آیات

(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَاغْفِرْ لِاَبِيْۤ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ـــ (الشعراء: ۸۶)" (اور میرے (عرفی) باپ کو بخش دیجئے بے شک وہ گمراہوں میں سے ہے)۔

(۲) نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ (ابراہیم: ۴۱)" (اے ہمارے رب! جس دن حساب قائم ہو مجھے، میرے والدین اور تمام مومنوں کو بخش دیجئے گا)۔

میں کہتا ہوں: اس آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والدین سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حقیقی والد ہیں نہ کہ اُن کے عرفی باپ جو آزر ہے، جس کے متعلق الشعراء: ۸۶ میں فرمایا ہے کہ اُن کا عرفی باپ گمراہوں میں سے تھا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حقیقی والد تارخ ہیں اور انہی کے متعلق اس آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مغفرت طلب کی ہے۔ اس کی پوری تحقیق ان شاء اللہ سورۃ الشعراء میں آئے گی۔

(۳) نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا (مریم: ۴۷)" (ابراہیم نے آزر سے کہا: "بس تجھے سلام ہے تاہم میں عنقریب تیرے لئے اپنے رب سے بخشش کی دعا کروں گا، بے شک وہ مجھ پر بڑے مہربان ہیں)۔

(۴) نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗۤ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَاۤ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ O (الممتحنہ: ۴)" (بے شک تمہارے لیے ابراہیم اور ان کے اصحاب میں اچھا نمونہ تھا، جب انہوں نے اپنی قوم (مشرکین) سے فرمایا: "بے شک ہم تم سے اور ان (جھوٹے) معبودوں سے بیزار ہیں جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو، ہم نے تمہارا انکار کیا، ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت اور دشمنی ظاہر ہو گئی، جب تک کہ تم واحد اللہ پر ایمان نہ لے آؤ" مگر ابراہیم کا اپنے (عرفی) باپ سے یہ کہنا "میں تیرے لئے ضرور بخشش چاہوں گا اور میں اللہ کے مقابل تیرے لئے کسی چیز کا مالک نہیں" (پھر ابراہیم نے یوں دعا کی:) "اے ہمارے رب! ہم نے آپ پر ہی توکل کیا ہے اور آپ ہی کی طرف رجوع کیا ہے اور آپ کی طرف ہی لوٹنا ہے)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے عرفی باپ آزر کے متعلق دعائے مغفرت کرنے کی توجیہ

ان آیات میں سے ابراہیم: ۴۱ کے سوا باقی تین آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے عرفی باپ یعنی آزر کے متعلق مغفرت کی دعا کی اور وہ کافر تھا، اور کافر کے لیے مغفرت کی دعا کرنا جائز نہیں ہے، سو اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کافر کے

لیے دعائے مغفرت سے براءت کا ذکر فرمایا، کیونکہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

''مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى ___ (التوبہ:١١٣)''۔

سو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دفاع میں یہ آیت نازل فرمائی:

''وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ○ (التوبہ:١١٤)'' (اور ابراہیم کا اپنے (عرفی) باپ کے لیے مغفرت طلب کرنا صرف اس وعدہ کی وجہ سے تھا جو اُن کے (عرفی) باپ نے اُن سے کیا تھا، پس جب اُن پر یہ واضح ہو گیا کہ اُن کا عرفی باپ اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گئے، بے شک ابراہیم بہت ہی رحم دل اور بردبار تھے)۔

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے عرفی باپ یعنی آزر کے متعلق جو دعا کی تھی، وہ اس وجہ سے دعا کی تھی کہ آزر نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ ایمان لے آئے گا حتیٰ کہ اس کو عذاب سے نجات ہو جائے، سو حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ دعا کرتے رہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ایمان عطا فرمائیں اور ان کے استغفار کا یہی معنی ہے، پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ خبر عطا فرمادی کہ وہ حالتِ کفر میں مرے گا تو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے عرفی باپ آزر کے لیے دعا کرنے کو ترک کر دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کیسے معلوم ہوا کہ اُن کا عرفی باپ یعنی آزر اللہ کا دشمن ہے؟

''فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ'':

ایک قول یہ ہے کہ چونکہ اُس نے بت پرستی پر اصرار کیا تھا اور اسی حال میں اس پر موت آئی تو اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سمجھا کہ یہ اللہ کا دشمن ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے وحی سے مطلع فرمایا کہ اُن کا عرفی باپ اللہ کا دشمن ہے، سو وہ اپنے عرفی باپ یعنی آزر سے بیزار ہو گئے۔

''اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ'': بے شک ابراہیم بہت ہی رحم دل اور بردبار تھے۔

''اَوَّاهٌ'' کا معنی

''الاوّاہ'' اس شخص کو کہتے ہیں جو کثرت سے آہ وزاری کرتا ہے، اور الاوّاہ فعّال کے وزن پر ہے، یہ مبالغہ کا صیغہ ہے۔

علامہ سید محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی حنفی متوفی ١٢٠٥ ھ، لکھتے ہیں:

''الاوّاہ'' شدّاد کی مثل ہے، اس کا معنی ہے: جس کو اپنی دعا کے مقبول ہونے پر یقین ہو، یا اس کا معنی ہے: بہت زیادہ دعا کرنے والا۔ اور حدیث میں اسی کی تفسیر کی گئی ہے'' رب اجعلنی لک شکّارا، لک ذکّارا، لک رهّابا، لک مطواعا، لک مخبتا، الیک اوّاها منیبا'' (اے اللہ! مجھے اپنا بہت زیادہ شکر ادا کرنے والا بنادیں، اور مجھے اپنا بہت زیادہ ذکر کرنے والا بنادیں، اور مجھے آپ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا بنادیں، اور مجھے اپنا اطاعت گزار بنادیں، جو آپ کے سامنے تواضع کرے اور آپ کے سامنے آہ وزاری کرے، اور آپ کی طرف رجوع کرنے والا ہو)۔

(تاج العروس من جواہر القاموس جز ٣٦ ص ٩٣، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ١٤٢٣ ھ)

''الاوّاہ'' سے متعلق حدیث مذکور کے دیگر کتب حدیث میں حوالہ جات

(سنن ترمذی: ۳۵۶۲، سنن ابن ماجہ: ۳۸۳۰، مسند احمد: ۱۹۹۷، الادب المفرد للبخاری: ۶۶۵، السنۃ لابن ابی عاصم: ۳۸۳، عمل الیوم واللیلۃ للنسائی: ۶۰۷، سنن ابوداؤد: ۱۵۰۷، صحیح ابن حبان: ۹۴۷، ۹۴۸، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۰ ص ۲۸۰۔۲۸۱، مسند عبد بن حمید: ۷۱۷، کتاب الدعا للطبرانی: ۱۴۱۱، المستدرک للحاکم ج ۱ ص ۵۱۹۔۵۲۰، شرح السنۃ للبغوی: ۱۳۷۵، موارد الظمآن ج ۱ ص ۵۹۹، الجامع الصحیح للسنن والمسانید، ج ۲۲ ص ۳۹۸، مؤسسۃ الرسالہ، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

(مُخْبِتًا کا معنی ہے: اللہ عزوجل کے سامنے خضوع، خشوع اور تواضع کرنے والا، الاوّاہ کا معنی ہے: اللہ عزوجل کے سامنے گڑگڑا کر دعا کرنے والا۔ (حاشیہ مسند احمد: ۱۹۹۷، مؤسسۃ الرسالہ، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

''الاوّاہ'' کے معنی کے متعلق احادیث اور آثار

حافظ ابوالفداء اسماعیل بن کثیر القرشی الدمشقی متوفی ۷۷۴ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک میت کو دفن کیا، پس آپ نے فرمایا: ''اللہ تم پر رحم فرمائیں بے شک ضرور ''اوّاہ'' تھے، یعنی قرآن مجید کی بہ کثرت تلاوت کرنے والے تھے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرد بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا اور اپنی دعا میں بار بار پڑھ رہا تھا ''اوہ، اوہ'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا: وہ ''اوّاہ'' ہے۔

الحسن بن مسلم بن یناق بیان کرتے ہیں کہ ایک مرد اللہ عزوجل کا بہ کثرت ذکر کرتا تھا اور بہ کثرت سبحان اللہ پڑھتا تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ''وہ ''اوّاہ'' ہے۔

ابوایوب بیان کرتے ہیں: ''الاوّاہ'' وہ شخص ہے جب وہ اپنی خطاؤں کو یاد کرتا ہے تو وہ ان خطاؤں پر اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہے۔ اور مجاہد نے کہا: ''الاوّاہ'' وہ شخص ہے جو اللہ سے بہت ڈرنے والا ہو، وہ تنہائی میں کوئی گناہ کرے، پھر تنہائی میں اللہ عزوجل سے استغفار کرے۔

کعب احبار سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: ''اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ'' انہوں نے کہا: جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے دوزخ کا ذکر کیا جاتا تو وہ کہتے ''اوہ من النار''۔

ابن جریج نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ ''اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ'' اس کے متعلق سب سے اولیٰ قول یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بہ کثرت دعا کرنے والے تھے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر جب کوئی شخص زیادتی کرتا اور ان کو کوئی ناگوار چیز پہنچتی تو وہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے تھے۔ (تفسیر القرآن العظیم ص ۹۰۳، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۲ھ)

امام ابوجعفر محمد بن جریر الطبری المتوفی ۳۱۰ھ، التوبہ: ۱۱۴ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ابوالعبیدین بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ ''الاوّاہ'' کا کیا معنی ہے تو انہوں نے کہا: الرحیم۔

(تفسیر الطبری ج ۱۲ ص ۳۵، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۲۳ھ، تفسیر ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۸۹۶، المعجم الکبیر للطبرانی: ۹۰۰۲، ۹۰۰۶، تفسیر

عبد الرزاق ج ۱ ص ۲۹۰)

مجاہد نے بیان کیا "الاوّاہ" کا معنی ہے الموقن یعنی جو اللہ تعالیٰ پر یقین رکھنے والا ہو۔

(تفسیر الطبری ج ۱۲ ص ۳۵، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۲۳ھ تفسیر ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۸۹۶)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو ہدایت دینے کے بعد انہیں گمراہی پر چھوڑ دیں حتیٰ کہ اُن پر یہ واضح فرما دیں کہ اُن لوگوں کو کن کاموں سے بچنا واجب ہے، بے شک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والے ہیں O" (التوبہ: ۱۱۵)

اللہ تعالیٰ کا احکام شرعیہ کو بیان فرمانے سے پہلے مواخذہ نہ فرمانا

"وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ":

جب کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مشرکین کے لیے استغفار کرنے سے منع فرمایا تھا اور اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے مسلمان، مشرکین کے لیے استغفار کرتے تھے، تو جب یہ آیت نازل ہوئی تو وہ خوف زدہ ہوئے کہ انہوں نے جو پہلے مشرکین کے لیے استغفار کیا تھا، اس کی وجہ سے انہیں کیا عذاب ہوگا۔ پس مسلمانوں کے دلوں میں خوف ہوا کہ اُن کا کیا حال ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے اُن سے اس خوف کو زائل فرمایا اور اس آیت میں یہ بیان فرمایا: اللہ تعالیٰ اِن سے اُن کاموں پر مواخذہ نہیں فرمائیں گے مگر جب تک کہ وہ ممنوعہ کام نہ کریں۔

اور اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مشرکین کے لیے تمہارے استغفار کی وجہ سے تم پر گمراہی کا حکم نہیں لگائیں گے حتیٰ کہ تمہیں یہ بیان فرما دیا جائے کہ کس چیز سے تمہارا بچنا واجب ہے۔

الضحاک نے کہا: اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اس وقت تک عذاب نہیں دیں گے حتیٰ کہ اس کو یہ بیان فرما دیں کہ وہ کیا کام کریں اور کیا کام نہ کریں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "بے شک اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمینوں کی سلطنت ہے، وہی زندہ فرماتے ہیں اور وہی مارتے ہیں، اور تمہارے لیے اللہ کے سوا نہ کوئی کارساز ہے اور نہ کوئی مدد کرنے والا O" (التوبہ: ۱۱۶)

مشرکین سے منقطع ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کو مشرکین سے ضرر نہ پہنچنا

"اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ":

جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کفار سے براءت ظاہر کرنے کا حکم فرما دیا تو بیان فرمایا کہ تمام آسمانوں اور زمینوں کی حکومت اللہ ہی کے لیے ہے، پس جب اللہ تمہارے مددگار ہیں تو یہ کفار تمہیں ضرر پہنچانے پر قادر نہیں ہوں گے۔ اس آیت کا دوسرا محمل یہ ہے کہ جب مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم فرمایا کہ تم کفار سے منقطع ہو جاؤ تو انہوں نے کہا: اب ہمارے لیے اپنے باپ دادا سے اور اپنے بیٹوں سے اور اپنے بھائیوں سے ملنا جلنا جائز نہ رہا، تو گویا کہ یہ کہا گیا: اگر تم اپنے باپ دادا اور بھائیوں اور بیٹوں کی مدد سے محروم

ہو گئے ہو تو اللہ تمام آسمانوں اور زمینوں کے مالک ہیں، وہی زندہ فرمانے والے ہیں، وہی مارنے والے ہیں اور وہی تمہارے مددگار ہیں تو اب تمہارے مشرک آباء واجداد اور بیٹوں اور بھائیوں سے منقطع ہونے کی وجہ سے تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ نے نبی پر توبہ قبول فرمائی اور مہاجرین اور انصار پر جنہوں نے مشکل کے وقت (غزوۂ تبوک) میں نبی کی پیروی کی جب کہ اس وقت اُن میں سے ایک فریق کے دل حق سے پھر جانے کے قریب تھے، پھر اللہ نے اُن سب کی توبہ قبول فرمائی بے شک اللہ اُن سب پر سب سے زیادہ شفیق، رحم فرمانے والے ہیں O“ (التوبہ: ۱۱۷)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین اور انصار صحابہ کی توبہ قبول فرمانے کے محامل

”لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ“:

جب منافقین نے غزوۂ تبوک میں آپ کے ساتھ نہ جانے کے متعلق جھوٹے اعذار پیش کیے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے ظاہری اعذار پر اعتماد کرتے ہوئے اُن کو غزوۂ تبوک میں شامل نہ ہونے کی اجازت دے دی، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ۝“ (التوبہ: ۴۳) (اللہ آپ کو معاف فرمائیں! آپ نے اس سے پہلے انہیں کیوں اجازت دے دی حتیٰ کہ آپ پر سچ بولنے والے ظاہر ہو جاتے اور آپ جھوٹ بولنے والوں کو بھی پہچان لیتے)۔

(۱) یعنی آپ کا منافقین کو غزوۂ تبوک میں ساتھ نہ چلنے کی اجازت دینا ایک خلاف اولیٰ کام تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کے اس خلاف اولیٰ کام کو بھی معاف فرما دیا، پھر اس میں اللہ تعالیٰ کا لطف یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے آپ کو معاف فرمانے کا ذکر کیا اور پھر وہ وجہ بیان فرمائی جس وجہ سے آپ کو معاف فرمانے کا ذکر فرمایا کہ آپ نے منافقین کو غزوۂ تبوک میں نہ جانے کی اجازت کیوں دی۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے مہاجرین اور انصار کی توبہ قبول فرمانے کا بھی ذکر فرمایا، یعنی اللہ تعالیٰ نے مہاجرین اور انصار کو غزوۂ تبوک کی شدت سے آسانی اور کشادگی کی طرف منتقل فرمایا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی توبہ قبول فرمانے کا معنی یہ ہے کہ آپ نے جو منافقین کو پیچھے رہ جانے کی اجازت عطا فرمائی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس پر آپ سے مواخذہ نہیں فرمایا۔ اور مومنین کی توبہ قبول فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ بعض مسلمانوں کے دلوں میں بھی آپ کے ساتھ نہ جانے کی طرف میلان تھا۔

(۳) یہ بھی کہا گیا ہے کہ بعض مہاجرین اور انصار سے مختلف قسم کی خطاؤں کا صدور ہوا تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے اُن کی توبہ قبول فرمائی اور اُن کو معاف فرما دیا، کیونکہ انہوں نے سخت گرمی میں غزوۂ تبوک کے سفر کی مشقت کو جہاد کے لیے برداشت کیا تھا اور اس کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ذکر فرمایا اس پر تنبیہ فرمانے کے لیے کہ ان صحابہ کا دین میں بہت عظیم مرتبہ ہے اور یہ اس مرتبہ تک پہنچ گئے جس کی وجہ سے ان کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ توبہ کے قبول کرنے میں فرمایا گیا۔

”الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۚ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ“: اس ترتیب میں یہ دلیل ہے کہ ان مہاجرین اور انصار کے دلوں میں گرمی کی شدت میں اور اس تنگی کی حالت میں سفر

کرنے سے جو دسوسے آرہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے سفر کی اس شدت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے کی وجہ سے اُن کو معاف فرما دیا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ''رؤف'' ہے اور دوسری صفت ''رحیم'' ہے۔ ''رؤف'' کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن سے ضرر کو دور فرما دیں گے اور ''رحیم'' کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو نفع پہنچائیں گے۔

(تفسیر الکشاف ج ۲ ص ۳۱۸، المحرر الوجیز ج ۳ ص ۷۹۳، البحر المحیط ج ۵ ص ۱۱۲، الدر المصون ج ۳ ص ۵۱۰)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور اُن تینوں کی بھی توبہ قبول فرمائی جن کی توبہ کے قبول ہونے کو مؤخر رکھا گیا تھا حتیٰ کہ جب زمین وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی اور ان کی جانیں بھی اُن پر تنگ ہوگئیں اور انہوں نے یہ غالب گمان کرلیا کہ اللہ کے غضب سے بچنے کی جگہ صرف اللہ ہی کی طرف ہے، پھر اللہ نے اُن کی توبہ قبول فرمائی تاکہ وہ اپنی توبہ پر (ہمیشہ) قائم رہیں، بے شک اللہ ہی بہت زیادہ توبہ قبول فرمانے والے، بہت رحم فرمانے والے ہیں O'' (التوبہ:۱۱۸)

جن تین صحابہ کی توبہ کے قبول ہونے کو مؤخر رکھا گیا تھا، ان کے اسماء

''وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا'':

ان میں سے ایک صحابی کا نام حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ ہے جو شاعر ہیں اور دوسرے حضرت ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ ہیں جن کے متعلق آیت لعان نازل ہوئی، اور تیسرے حضرت مرارہ بن الربیع رضی اللہ عنہ ہیں۔

ان تین صحابہ کے متعلق پہلا قصہ

(۱) یہ صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہ گئے تھے، حسن بصری نے کہا: ان میں سے ایک کی بہت وسیع زمین تھی جس کی قیمت ایک لاکھ درہم تھی تو انہوں نے اس زمین کو مخاطب کر کے کہا: اے زمین! میں صرف تیری وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہ گیا، پس تو اللہ کی راہ میں چلی جا، پس میں جنگلوں میں رہوں گا حتیٰ کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے واصل ہو جاؤں، اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اور دوسرے صحابی جو تھے اُن کے اہل وعیال تھے، انہوں نے کہا: اے اہل وعیال! میں صرف تمہاری وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہ گیا تھا، پس اب میں جنگلوں میں رہوں گا حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے واصل ہو جاؤں، اور تیسرے جو تھے نہ وہ مال دار تھے اور نہ اُن کے اہل وعیال تھے اور انہوں نے کہا: میرے پیچھے رہنے کا سبب صرف میری زندگی تھی، اللہ کی قسم! اب میں جنگلوں میں رہوں گا حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے واصل ہو جاؤں، پھر وہ تینوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر ملے اور اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

''وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ (التوبہ:۱۰۶)'' (اور چند دوسرے لوگ ہیں جن کو اللہ کے حکم پر موقوف رکھا گیا ہے خواہ اللہ اُن کو عذاب دیں یا اُن کی توبہ قبول فرمائیں، اور اللہ سب کچھ جاننے والے، عظیم حکمتوں والے ہیں)۔

ان تین صحابہ کے متعلق دوسرا قصہ اور وہی اکثرین کا مختار ہے

یہ اکثر علماء کا قول ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو غزوۂ تبوک میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نہیں گئے تھے، حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: رسول اللہ ﷺ میری بات کو پسند فرماتے تھے، پس جب میں نے غزوۂ تبوک کے لیے نکلنے میں تاخیر کی تو رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے پوچھا: وہ کیا سبب ہے جس نے کعب کو نکلنے سے روک دیا، پھر جب آپ مدینہ واپس آئے تو منافقین نے اپنے عذر پیش کیے، میں آپ کے پاس آیا، پس میں نے کہا کہ میرا سامانِ سفر موجود تھا اور میں محض اپنی تقصیر کی وجہ سے آپ کے ساتھ جانے سے رُک گیا، آپ میرے لیے مغفرت طلب کیجئے، سو رسول اللہ ﷺ نے اُن کے لیے مغفرت طلب کرنے سے انکار فرمایا، پھر رسول اللہ ﷺ نے ان تین صحابہ کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کو منع فرمادیا، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ازواج کو بھی حکم دیا کہ اُن کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ترک کردیں اور زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی، اور حضرت ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ کی بیوی آئیں اور انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہلال اس قدر رورہے ہیں کہ مجھے ڈر ہے کہ ان کی بینائی چلی جائے گی حتیٰ کہ جب پچاس دن گزر گئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

''لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ...... (التوبہ:١١٧)'' (اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ نے نبی پر توبہ قبول فرمائی اور مہاجرین اور انصار پر جنہوں نے مشکل کے وقت (غزوۂ تبوک) میں نبی کی پیروی کی جب کہ اس وقت اُن میں سے ایک فریق کے دل حق سے پھر جانے کے قریب تھے)۔ اور یہ آیت نازل فرمائی: ''وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ...... (التوبہ:١١٨)'' (اور اُن تینوں کی بھی توبہ قبول فرمائی جن کی توبہ کے قبول ہونے کو موخر رکھا گیا تھا)۔ پھر رسول اللہ ﷺ اپنے حجرہ کی طرف نکلے اور آپ اس روز حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں تھے، پس آپ نے فرمایا: اللہ اکبر! بے شک اللہ تعالیٰ نے ہمارے اصحاب کا عذر قبول فرمالیا ہے، پس جب آپ نے فجر کی نماز پڑھی تو آپ نے اس کا ذکر اپنے اصحاب سے فرمایا اور اُن کو خوش خبری دی کہ اللہ تعالیٰ نے ان تینوں کی توبہ قبول فرمالی ہے۔ پس یہ تینوں رسول اللہ ﷺ کی طرف گئے تو آپ نے ان کے سامنے وہ آیت پڑھی جو ان کے متعلق نازل ہوئی تھی، تو حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا: میری اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ یہ ہے کہ میں اپنا تمام مال صدقہ کردوں، آپ نے فرمایا: نہیں! میں نے عرض کیا: اچھا نصف مال صدقہ کردوں، آپ نے فرمایا: نہیں! میں نے عرض کیا: اچھا میں تہائی مال صدقہ کرتا ہوں، تو آپ نے فرمایا: یہ ٹھیک ہے۔

''حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ'': اس سورت میں اس کی تفسیر گزر چکی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان تین صحابہ سے اعراض کرلیا، اور مومنین کو ان کے ساتھ بات کرنے سے منع فرمادیا اور ان کی بیویوں کو بھی حکم فرمایا کہ وہ ان سے الگ رہیں، اور وہ اسی حالت پر پچاس دن تک رہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے زیادہ دنوں تک اسی حال پر رہے حتیٰ کہ ان کی جانیں بھی ان کے اوپر بوجھل ہوگئیں، اور ان کے سینے غم اور فکر سے اور اپنے دوستوں سے علیحدگی کی وجہ سے بہت تنگ ہوگئے اور مسلمان ان کی طرف نظرِ اہانت سے دیکھتے تھے اور انہوں نے گمان کرلیا کہ اللہ تعالیٰ سے بچنے کی جگہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہے۔

"ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا" کے متعدد محامل

(۱) ماضی میں اُن کے کاموں پر توبہ قبول فرمائی تاکہ وہ مستقبل میں ان کی توبہ کے لئے محرک ہو۔

(۲) توبہ کا اصل معنی ہے رجوع کرنا، یعنی اُن کو پہلے حال کی طرف لوٹا دیا تاکہ مومنین کے ساتھ مل جل کر رہیں اور ان کی بیویوں کو جو ان سے علیحدہ رہنے کا حکم دیا تھا اس کو بھی معاف فرما دیا تاکہ ان کے نفوس مطمئن ہو جائیں۔

(۳) تاکہ وہ اپنی توبہ پر دائما برقرار رہیں اور پھر کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے وہ توبہ باطل ہو جائے۔

(۴) پھر اُن کی توبہ اس لئے قبول فرمائی تاکہ وہ اس توبہ سے نفع پائیں۔

"اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ": بے شک اللہ تعالیٰ بہت زیادہ توبہ قبول فرمانے والے، بہت زیادہ رحم فرمانے والے ہیں۔

اور جب اللہ عزوجل نے ان تینوں کی توبہ قبول فرمائی تو اب یہ توبہ قبول فرمانا اس لیے تھا کہ آئندہ کے لیے وہ جہاد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے نہ رہیں۔ (اللباب فی علوم الکتاب، ج۱۰ص ۲۱۵۔ ۲۲۳، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۱۱ء)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور سچوں کے ساتھ رہو ○

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

اہلِ مدینہ اور ان کے قرب و جوار کے دیہاتیوں کو یہ نہیں چاہیے تھا کہ (وہ غزوۂ تبوک میں) رسول اللہ سے پیچھے رہ جائیں، اور نہ ہی یہ اُن کو چاہیے تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے کے بجائے اپنی جانوں کا تحفظ کریں، کیونکہ انہیں اللہ کے راستہ میں جو تھوڑی بھوک اور پیاس اور تکلیف پہنچتی ہے اور وہ کسی ایسی جگہ جاتے ہیں جو کفار کے غیظ و غضب کا باعث ہو اور وہ اللہ کے دشمنوں سے جتنا نقصان اٹھاتے ہیں اُن سب کے عوض اُن کے نیک عمل لکھے جاتے ہیں، بے شک اللہ مخلصین کا اجر و ثواب ضائع نہیں فرماتے ○

وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

اور وہ جتنا کم یا زیادہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور وہ جس وادی کو بھی عبور کرتے ہیں اس سب کو اُن کے لیے لکھا جاتا ہے تاکہ اللہ اُن کے کیے ہوئے کاموں کا بہترین اجر عطا فرمائیں ○

وَ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ؕ فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

تمام کے تمام مومنوں پر جہاد کے لیے جانا فرض نہیں ہے، تو مسلمانوں کی جماعت میں سے ایک گروہ جہاد کے لیے کیوں نہ روانہ ہوا تا کہ وہ دین کے احکام کو سمجھتے اور جب اُن کی قوم کے لوگ اُن کے پاس آتے تو وہ انہیں اس لیے اللہ کے عذاب کی وعید سناتے تا کہ وہ اللہ کے عذاب سے بچیں O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور سچوں کے ساتھ رہتے رہو O'' (التوبہ:١١٩)

علامہ ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی بن الجوزی الحنبلی المتوفی ٥٩٧ھ، التوبہ:١١٩ تا ١٢٢ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

التوبہ:١١٩ کے سبب نزول کے متعلق دو قول

''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ'':

(١) یہ آیت اُن تین صحابہ کے متعلق نازل ہوئی ہے جو غزوۂ تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہ گئے تھے۔

(٢) یہ آیت اہل کتاب کے متعلق نازل ہوئی ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ اے وہ لوگو! جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر ایمان لائے ہو تم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے متعلق اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو۔

مہاجرین صحابہ کی انصار صحابہ پر فضیلت

اس آیت میں صادقین یعنی سچے لوگوں سے متعلق حسب ذیل اقوال ہیں:

(١) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب ہیں۔ (٢) سعید بن جبیر اور الضحاک نے کہا: اس سے مراد حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔ اور ابن السمیفع، ابوالمتوکل اور معاذ القاری نے ''مَعَ الصّٰدِقِيْنَ'' (قاف پر زبر اور نون پر زیر) پڑھی، گویا یہ تثنیہ کا صیغہ ہے۔ (٣) السدی نے کہا: یہ وہ تین صحابہ ہیں جو غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے اور اپنے پیچھے رہنے کے متعلق انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی بات کہی اور کوئی جھوٹا عذر نہیں تراشا۔ (٤) ابن جریج نے کہا: ان صادقین سے مراد مہاجرین ہیں کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد میں پیچھے نہیں رہے۔ ابوسلیمان دمشقی نے کہا: ایک قول یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس آیت سے سقیفہ کے دن بیعت کرنے کی بحث میں انصار کی جماعت کے خلاف استدلال کیا کہ اے انصاریو! اللہ عزوجل اپنی کتاب میں ارشاد فرماتے ہیں: ''لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا وَّ يَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۸﴾ (الحشر:٨)'' (یہ مال اُن فقراء مہاجرین کے لئے بھی ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے نکال دیے گئے، وہ اللہ کا فضل اور خوشنودی چاہتے ہیں نیز اللہ اور اس کے رسول (کے دین) کی مدد کرتے ہیں وہی لوگ صادقین (سچے) ہیں)۔ پس اللہ عزوجل نے تم کو یہ حکم فرمایا ہے کہ تم ہمارے ساتھ رہو اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ حکم نہیں فرمایا کہ ہم تمہارے ساتھ رہیں، پس ہم امراء اور حکام ہوں گے اور تم ہمارے وزراء اور

مشیر ہو گے۔

(تفسیر الطبری ج ۱۲ ص ۶۸، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۲۴ھ، تفسیر ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۹۰۶، مکتبہ نزار مصطفیٰ، الباز، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ، تاریخ دمشق جز ۳۰ ص ۳۱۰، مسند علی فی تہذیب الآثار: ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۵، الادب المفرد للبخاری ص ۳۸۷)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اہلِ مدینہ اور ان کے قرب و جوار کے دیہاتیوں کو یہ نہیں چاہیے تھا کہ (وہ غزوۂ تبوک میں) رسول اللہ سے پیچھے رہ جائیں، اور نہ ہی یہ اُن کو چاہیے تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے کے بجائے اپنی جانوں کا تحفظ کریں، کیونکہ انہیں اللہ کے راستہ میں جو تھوڑی بھوک اور پیاس اور تکلیف پہنچتی ہے اور وہ کسی ایسی جگہ جاتے ہیں جو کفار کے غیظ و غضب کا باعث ہو اور وہ اللہ کے دشمنوں سے جتنا نقصان اٹھاتے ہیں اُن سب کے عوض اُن کے نیک عمل لکھے جاتے ہیں، بے شک اللہ مخلصین کا اجر و ثواب ضائع نہیں فرماتے O'' (التوبہ:۱۲۰)

''مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ'': حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس آیت میں الاعراب سے مراد مزینہ، جہینہ، اشجع، اسلم اور غفار ہیں۔

''وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ'': اور ان کو یہ نہیں چاہیے تھا کہ اپنی جانوں کے لیے آرام کو طلب کرتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت گرمی اور مشقت میں چھوڑ دیتے۔

''ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ'': ظَمَاٌ کے معنی ہیں پیاس اور نَصَبٌ کے معنی ہیں تھکاوٹ اور مَخْمَصَةٌ کے معنی ہیں بھوک، یعنی انہیں پیاس، تھکاوٹ اور بھوک پہنچنے کے ڈر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔

''وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ'': وہ دشمنوں کے ہاتھوں قید ہو جائیں یا قتل کر دیے جائیں یا انہیں شکست ہو جائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ بتلایا کہ ان مصائب پر اللہ عزوجل ان کو اجر عطا فرمائیں گے۔

اللہ کی راہ میں جہاد کی صعوبتیں اٹھانے والوں کے اجر و ثواب کے متعلق احادیث

(۱) عبایہ بن رفاعہ بیان کرتے ہیں کہ ابو عبس نے مجھے پالیا اور اس وقت میں جمعہ کی طرف جا رہا تھا، پس انہوں نے کہا: میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس کے پیر اللہ کی راہ میں غبار آلود ہو گئے، اللہ اس کو دوزخ پر حرام فرما دیں گے۔

(صحیح البخاری: ۹۰۷، ۲۸۱۱، سنن ترمذی: ۱۶۳۲، سنن نسائی: ۳۱۱۶، الاحاد والمثانی: ۱۹۷۳، صحیح ابن حبان: ۴۶۰۵، حلیۃ الاولیاء ج ۲ ص ۸، سنن بیہقی ج ۳ ص ۲۲۹، شرح السنۃ للبغوی: ۲۶۱۸، مسند احمد ج ۳ ص ۴۷۹، طبع قدیم، مسند احمد: ۱۵۹۳۶، ج ۲۵ ص ۲۸۴، موسسۃ الرسالہ، بیروت)

(موسوعۃ المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی الشریف ج ۳ ص ۶۶۱، دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۳۲ھ)

(۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص دوزخ میں داخل نہیں ہوگا جو خوفِ خدا سے رو یا ہو حتیٰ کہ دودھ تھن میں لوٹ جائے اور اللہ کی راہ میں پڑنے والا غبار اور دوزخ کا دھواں جمع نہیں ہوگا۔

(سنن ترمذی: ۱۶۳۳، سنن نسائی: ۳۱۰۷، ۳۱۰۸، سنن ابن ماجہ: ۲۷۷۴، المستدرک ج ۲ ص ۲۶۰، سنن بیہقی ج ۹ ص ۱۶۱، مجمع الزوائد ج ۵ ص ۸۶
صحیح ابن حبان: ۱۵۹۹، الترغیب والترہیب ج ۲ ص ۲۷۱، مسند احمد ج ۲ ص ۲۵۶ طبع قدیم، مسند احمد: ۷۴۸۰، موسسۃ الرسالہ، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

(۳) حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی راہ میں پڑنے والے غبار سے ناک پر کپڑا رکھو کیونکہ منتشر غبار اہل جنت کی مشک ہے۔ (کنز العمال: ۱۰۶۹۹)

(۴) حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر وہ شخص جس کے چہرے پر اللہ کی راہ میں غبار پڑا، اس کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن دوزخ کے دھوئیں سے محفوظ رکھیں گے اور ہر وہ شخص جس کے پیر اللہ کی راہ میں غبار آلود ہوئے، اللہ اس کے پیروں کو قیامت کے دن دوزخ سے محفوظ رکھیں گے۔
(المعجم الکبیر: ۷۴۸۲، حافظ الہیثمی نے کہا: اس کی سند میں ایک راوی متروک ہے، مجمع الزوائد ج ۵ ص ۲۸۷، الترغیب والترہیب ج ۲ ص ۲۷۴، کنز العمال: ۱۰۷۰۷)

(۵) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جس شخص کے دونوں پیر اللہ کی راہ میں غبار آلود ہوئے، اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ پر حرام فرمادے گا۔ (صحیح البخاری: ۹۰۷، المعجم الکبیر: ۲۹۷، ج ۱۹، مجمع الزوائد ج ۵ ص ۲۸۶، مسند احمد ج ۵ ص ۲۲۶، مسند احمد: ۲۱۹۹۳، صحیح ابن حبان: ۳۶۰۵)
(موسوعة المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی الشریف ج ۳ ص ۶۶۱، دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۲۲ھ)

"إِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ": بے شک اللہ مخلصین کا اجر وثواب ضائع نہیں فرماتے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور وہ جتنا کم یا زیادہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور وہ جس وادی کو بھی عبور کرتے ہیں اس سب کو ان کے لیے لکھا جاتا ہے تا کہ اللہ ان کے کیے ہوئے کاموں کا بہترین اجر عطا فرمائیں O" (التوبہ: ۱۲۱)

"وَلَا يُنْفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَّلَا كَبِيرَةً": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ خواہ وہ ایک کھجور اللہ کی راہ میں دیں یا اس سے زیادہ دیں۔ "وَلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا" اور خواہ وہ آگے بڑھتے ہوئے کسی وادی کو عبور کریں یا پیچھے ہٹتے ہوئے وادی کو عبور کریں۔

"إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ": مگر ان کے لیے اس کا اجر لکھا جاتا ہے۔

"لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ أَحْسَنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ": تا کہ اللہ ان کے کیے ہوئے کاموں کا بہترین اجر عطا فرمائیں۔

مجاہدین کی مدد اور ان کے اہل وعیال کی خبر گیری کی فضیلت کے متعلق احادیث

حضرت زید بن خالد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اللہ کی راہ میں کسی غازی کو سامانِ سفر فراہم کیا تو تحقیق یہ ہے کہ اس نے جہاد کیا اور جس نے کسی اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے غازی کے گھر والوں کی اس کے پیچھے اچھی طرح نگہبانی کی تو تحقیق یہ ہے کہ اس نے جہاد کیا۔
(صحیح البخاری: ۲۸۴۳، صحیح مسلم: ۱۸۹۵، الرقم المسلسل: ۴۷۹۵، سنن ابوداؤد: ۲۵۰۹، سنن ترمذی: ۱۶۲۸۔ ۱۶۳۱، سنن نسائی: ۳۱۸۰، سنن ابن ماجہ ۔۔۔ المعجم الکبیر: ۵۲۴۳، ۵۲۶۵، سنن بیہقی ج ۳ ص ۲۴۰، شعب الایمان: ۳۹۵۲، شرح السنہ: ۱۸۱۸، ۲۶۱۸، صحیح ابن حبان: ۴۶۳۰، مصنف عبد الرزاق: ۹۰۴۵، مسند الحمیدی: ۸۱۸، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۵ ص ۳۵۱، سنن کبریٰ للنسائی: ۴۳۳۰، حلیۃ الاولیاء ج ۷ ص ۹۸، سنن سعید ...

منصور:۲۳۲۸، المعجم الاوسط للطبرانی:۱۹۹۶، المعجم الصغیر:۸۰۳۶، تاریخ بغداد ج ا ص ۲۲۳، مسند احمد: ۱۷۰۳۳، موسسۃ الرسالۃ، بیروت، مسند ابوداؤد الطیالسی:۹۵۶، سنن بیہقی ج ۹ ص ۲۸، ۱۷۲۰۳، ابن الجارود: ۱۰۳۷)

آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کے لیے نکلنا تمام مسلمانوں پر واجب ہے یا بعض پر؟

علامہ ابوالفرج عبدالرحمن بن علی بن الجوزی الحنبلی المتوفی ۵۹۷ھ، التوبہ:۱۲۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ہمارے شیخ علی بن عبداللہ نے کہا ہے: اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کا اختلاف ہے، ایک جماعت نے کہا: ابتداء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد میں پیچھے رہ جانا بالکل جائز نہیں تھا کیونکہ ابتداء میں سب پر جہاد لازم تھا، پھر سب پر سے جہاد کی فرضیت اس آیت سے منسوخ فرما دی گئی "وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً۔۔۔ (التوبہ:۱۲۲)" (تمام کے تمام مومنوں پر جہاد کے لیے جانا فرض نہیں ہے)۔ اور دوسری جماعت نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے تمام اُن مومنین پر جہاد کو فرض فرما دیا تھا جن کے لیے جہاد سے نکلنے میں کوئی عذر نہیں تھا، اور اس کے دو سبب ہیں: پہلا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں پر واجب تھا کہ مسلمان اپنی جانوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کریں۔ اور دوسرا سبب یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاد کے لیے روانہ ہوئے تو مسلمانوں کو حکم فرمایا گیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کریں تا کہ مسلمانوں کا عدد کم نہ ہو، اور یہ حکم اس وقت تک باقی ہے۔ پس اگر مسلمانوں کا امیر جہاد کے لیے نکلے تو عامۃ المسلمین پر اس کی متابعت کرنا واجب ہے، اس اعتبار سے یہ آیت مُحکَمہ ہے۔ اور اس سے پہلے ذکر کیے ہوئے دلائل کے اعتبار سے تمام مسلمانوں پر جہاد کے لیے نکلنا واجب نہیں ہے۔

(تفسیر الطبری ج ۱۲ ص ۷۵، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۳۳ھ، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۹۰۹، نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ، زاد المسیر لابن الجوزی، ج ۳ ص ۳۰۹، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۳۱ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: " تمام کے تمام مومنوں پر جہاد کے لیے جانا فرض نہیں ہے تو مسلمانوں کی جماعت میں سے ایک گروہ جہاد کے لیے کیوں نہ روانہ ہوا تا کہ وہ دین کے احکام کو سمجھتے اور جب اُن کی قوم کے لوگ اُن کے پاس آتے تو وہ انہیں اس لیے اللہ کے عذاب کی وعید سناتے تا کہ وہ اللہ کے عذاب سے بچیں O"
(التوبہ:۱۲۲)

تمام کے تمام مسلمانوں کا جہاد کے لیے نکلنے کا فرض نہ ہونا

"وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ": اس آیت کے سبب نزول کے متعلق حسب ذیل اقوال ہیں:

(۱) ابوصالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے، انہوں نے بیان کیا: جب اللہ عزوجل نے غزوۂ تبوک میں منافقین کے عیوب بیان فرمائے تو مومنین نے کہا: اللہ کی قسم! ہم نہ کسی غزوہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑیں گے اور نہ کسی سریہ میں، (غزوہ اس لشکر کو کہتے ہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شریک ہوں اور سریہ اس لشکرِ اسلام کو کہتے ہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شریک نہ ہوں) پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک کے بعد سرایا کو بھیجا تو تمام مسلمان اس لشکر میں حصہ لینے کے لیے روانہ ہوئے اور

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں تنہا چھوڑ دیا، تب یہ آیت نازل ہوئی۔

(۲) ابوطلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے، انہوں نے بیان کیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ مضر کے خلاف دعا کی تو اُن کے شہروں میں قحط پڑ گیا، ان کا پورا قبیلہ قحط کی مشقت اٹھاتے ہوئے مدینہ میں حاضر ہوا اور وہ اسلام کا اظہار کر تے حالانکہ وہ جھوٹے تھے، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب تنگ ہوئے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اس روایت کو امام طبری نے اپنی تفسیر: ۱۷۴۸۸ میں ذکر کیا ہے لیکن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور علی بن طلحہ کے درمیان کوئی اور راوی نہیں ہے لہٰذا یہ روایت منقطع ہے، نیز اس آیت میں مومنین سے خطاب ہے نہ کہ کافرین سے۔

(۳) عکرمہ نے بیان کیا: کچھ لوگ اسلام لائے اور دیہاتوں میں نکل گئے اور اپنی قوم کو اسلام کے احکام کی تعلیم دے رہے تھے، اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی، تب بعض منافقین نے کہا کہ دیہاتوں میں سے جو جہاد کے لیے نہیں نکلا وہ ہلاک ہو گیا، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ الزجاج نے کہا: یہ آیت لفظاً خبر ہے اور معناً امر ہے، اور اس آیت کا معنی یہ ہے کہ بعض مومنین کو جہاد کے لیے روانہ ہونا چاہیے اور باقی بعض کو اپنے قبیلوں میں رہنا چاہیے۔

لفظِ ”نفیر“ کے معانی

اس آیت میں ”النفیر“ کا ذکر ہے اور مفسرین نے کہا: نفیر کی تفسیر میں دو قول ہیں:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: نفیر کا معنی ہے دشمن کی طرف روانہ ہونا، یعنی اُن کو یہ نہیں چاہیے کہ سب کے سب دشمن کی طرف روانہ ہو جائیں بلکہ ایک جماعت دشمن کی طرف روانہ ہو اور دوسری جماعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ٹھہری رہے، اور جو جماعت ٹھہری رہے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید کی آیات کی تفسیر اور نئے نئے نازل ہونے والے احکام کی تعلیم حاصل کرے۔

(۲) حسن بصری نے کہا: اس سے مراد ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف روانہ ہونا، یعنی سب کے سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف روانہ نہ ہوں بلکہ ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف روانہ ہوتا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کے احکام سیکھے اور اپنی قوم میں سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں گئے، ان کو اللہ کے عذاب سے ڈرائے، اور یہ قول اس ظاہر آیت کے زیادہ مناسب ہے۔ پہلے قول کی بناء پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی غزوہ کی طرف روانہ ہوں یا کسی سریہ کو بھیجیں تو ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف روانہ ہو، اور دوسرے قول کی بناء پر ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف روانہ ہو تا کہ وہ آپ سے احکامِ شرعیہ کا علم حاصل کرے۔

(تفسیر الطبری ج ۱۲ ص ۸۷۔ ۸۵، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۲۳ھ، تفسیر امام ابن ابی حاتم، ج ٦ ص ۱۹۰۹، ۱۹۱۲، نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ ۱۴۱۷ھ، سنن سعید بن منصور: ۲۸۹٦، تفسیر عبد الرزاق ج ۱ ص ۲۹۱)

دین میں تفقہ حاصل کرنے والے کی فضیلت میں احادیث

”لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ“:

ابن شہاب بیان کرتے ہیں کہ حمید بن عبد الرحمٰن نے کہا: میں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خطبہ دیتے ہوئے سنا، وہ کہہ رہے تھے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں، اس کو دین میں فقہ عطا

فرماتے ہیں اور میں صرف تقسیم کرنے والا ہوں اور اللہ تعالیٰ عطا فرماتے ہیں، اور یہ امت ہمیشہ اللہ کے دین پر قائم رہے گی اور کسی کی مخالفت سے اس کو ضرر نہیں ہوگا، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آجائے (یعنی قیامت)۔

(صحیح البخاری: ۷۱، ۳۱۱۶، ۳۶۴۱، ۷۳۱۲، ۷۴۶۰، صحیح مسلم: ۱۰۳۷، سنن ابن ماجہ: ۲۲۱، سنن ترمذی: ۲۶۴۵، سنن دارمی ج ۱ ص ۲۹۷، موطا امام مالک ج ۲ ص ۹۰۰، ۹۰۱، صحیح ابن حبان: ۸۹، مشکل الآثار للطحاوی: ۱۱۹۸۳، المعجم الکبیر: ۷۴۹، ۸۴۲، ۸۴۷، ۸۱۵، ۸۶۰، ۹۱۱، ۹۲۹، ج ۱۹، مسند الاعلیٰ: ۷۳۸۱، حلیۃ الاولیاء ج ۵ ص ۱۳۲، مسند احمد ج ۴ ص ۹۲ طبع قدیم، مسند احمد: ۱۶۸۴۳، ج ۲۸ ص ۳۸، موسسۃ الرسالہ، بیروت، ۱۴۲۰ھ، القضاعی: ۳۳۶، جامع بیان العلم لابن البر ج ۱ ص ۱۸، ۱۹)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگ (اس خلافت کے معاملہ میں) قریش کے تابع ہیں، مسلمان مسلمانوں کے تابع ہیں اور کافر، کافروں کے تابع ہیں۔ اور لوگ معدنیات ہیں جو ان میں جاہلیت میں بہتر تھے وہ اسلام میں بہتر ہیں جب وہ دین کی فہم حاصل کرلیں، تم دیکھو گے کہ جو لوگوں میں سب سے بہتر ہیں وہ سب سے زیادہ اس خلافت اور امارت کو ناپسند کرنے والے ہیں، حتیٰ کہ وہ اس میں مبتلا ہوجائیں۔

(صحیح البخاری: ۳۴۹۳، ۳۴۹۴، ۳۴۹۵، ۳۴۹۶، ۳۵۸۸، صحیح مسلم: ۲۵۲۶، الرقم المسلسل: ۶۳۴۹، صحیح ابن حبان: ۵۷۵۷، شرح السنۃ للبغوی: ۳۸۴۴، مسند احمد ج ۲ ص ۵۲۵ طبع قدیم، مسند احمد: ۱۰۷۹۱، ج ۱۶ ص ۳۶۱، موسسۃ الرسالہ، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

علم دین کی فضیلت میں احادیث

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم" (عالم کی عابد پر ایسی فضیلت ہے جیسے میری فضیلت تم میں سے ایک کم تر آدمی پر)۔

(سنن ترمذی: ۲۶۸۲، ۲۶۸۵، سنن ابوداؤد: ۳۶۴۱، سنن ابن ماجہ: ۲۲۳، سنن دارمی: ج ۱ ص ۸۸، ۹۸، مسند احمد ج ۵ ص ۱۹۶، جامع بیان العلم ص ۳۹، ۴۰، مشکل الآثار للطحاوی: ۹۸۲، صحیح ابن حبان: ۸۸، شرح السنۃ للبغوی: ۱۲۹)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فقیہ واحد شیطان پر ایک ہزار عبادت گزاروں سے بھاری ہے۔

(سنن دارقطنی: ج ۳ ص ۷۹، المعجم الاوسط للطبرانی: ۶۱۶۳، العلل لابن الجوزی: ۱۹۲، اخلاق العلماء للآجری ص ۲۳، الفقیہ والمتفقہ للخطیب ج ۱ ص ۲۵، ۲۶، القضاعی: ۲۰۶، تاریخ للخطیب ج ۲ ص ۴۰۲)

(زاد المسیر ج ۲ ص ۳۰۸۔ ۳۱۱، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۳۱ھ، معالم التنزیل ج ۲ ص ۴۰۲۔ ۴۰۶، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۳﴾

اے ایمان والو! تم اپنے قریب رہنے والے کافروں سے جہاد کرو اور چاہیے کہ وہ کفار تم میں سختی اور شدت پائیں، اور جان لو کہ

بے شک اللہ متقین کی مدد کے لیے ساتھ ہیں O

وَ اِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ یَّقُوْلُ اَیُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖۤ اِیْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّ هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

اور جب قرآن کی کوئی سورت نازل فرمائی جاتی ہے تو بعض منافق استہزاء کہتے ہیں: "اس سورت نے تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ کر دیا؟" لیکن ایمان والوں کے ایمان میں اس سورت نے اضافہ کیا ہے اور وہ خوش ہو رہے ہیں O

وَ اَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۲۵﴾

لیکن جن لوگوں کے دلوں میں نفاق کی بیماری ہے، اس سورت نے ان کے کفر کی نجاست کو پہلی نجاست کے ساتھ ملا دیا ہے اور وہ حالتِ کفر میں ہی مر گئے O

اَوَ لَا یَرَوْنَ اَنَّهُمْ یُفْتَنُوْنَ فِیْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَیْنِ ثُمَّ لَا یَتُوْبُوْنَ وَ لَا هُمْ یَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾

کیا منافق یہ نہیں دیکھتے کہ وہ ہر سال ایک یا دو بار مختلف مصائب میں مبتلاء کیے جاتے ہیں اس کے باوجود وہ نہ توبہ کرتے ہیں اور نہ ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں O

وَ اِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ؕ هَلْ یَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

اور جب قرآن (مجید) کی کوئی سورت نازل فرمائی جاتی ہے تو وہ منافق ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں کہ کہیں کوئی مسلمان تمہیں دیکھ تو نہیں رہا، پھر وہ لوٹ جاتے ہیں، اللہ نے اُن منافقوں کے دل پھیر دیے ہیں، کیونکہ وہ حق بات کو سمجھتے ہی نہیں O

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْكُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۲۸﴾

(اے مسلمانو!) بے شک تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک عظیم رسول آ چکے ہیں جن پر تمہارا مشقت میں مبتلاء ہونا بہت بھاری ہے اور وہ تمہاری ہدایت کے حصول کے لیے بہت زیادہ حریص ہیں، مومنین پر بہت زیادہ شفیق اور مہربان ہیں O

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ ۖۗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَ هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ ﴿۱۲۹﴾ ع

پس اگر کافر پیٹھ پھیر لیں تو آپ کہیے: ''مجھے اللہ کافی ہیں اور اُن کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، میں نے انہی پر توکل کیا ہے اور وہی عرشِ عظیم کے رب ہیں''O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اے ایمان والو! تم اپنے قریب رہنے والے کافروں سے جہاد کرو اور چاہیے کہ وہ کفار تم میں سختی اور شدت پائیں، اور جان لو کہ بے شک اللہ متقین کی مدد کے لیے ساتھ ہیں O'' (التوبہ: ١٢٣)

مسلمانوں کے قرب اور جوار میں رہنے والے دشمنانِ خدا سے قتال اور جہاد کا حکم

علامہ ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ٥١٦ھ، التوبہ: ١٢٣ تا ١٢٩ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِیْنَ یَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ'': مسلمانوں کو یہ حکم فرمایا گیا کہ وہ الاقرب فالاقرب سے قتال کریں، یعنی جو اپنی رہائش گاہوں میں اور نسب میں قریب ہیں، پہلے اُن سے قتال کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جیسے بنو قریظہ، بنو النضیر اور خیبر کے یہودی وغیرہ ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد شام کے رہنے والے عیسائی ہیں کیونکہ وہ بہ نسبت عراق کے مدینہ کے زیادہ قریب تھے۔

''وَلْیَجِدُوْا فِیْكُمْ غِلْظَةً'': اور چاہیے کہ اللہ کے دشمن تمہاری سختی اور حمیت کو پائیں، حسن بصری نے کہا: تم ان کے خلاف جہاد میں صبر کرو۔ ''وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ'': کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور اُن کی مدد متقین کے ساتھ ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور جب قرآن کی کوئی سورت نازل فرمائی جاتی ہے تو بعض منافق استہزاءً کہتے ہیں: ''اس سورت نے تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ کر دیا؟'' لیکن ایمان والوں کے ایمان میں اس سورت نے اضافہ کیا ہے اور وہ خوش ہو رہے ہیں O'' (التوبہ: ١٢٤)

''وَاِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ یَّقُوْلُ اَیُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖۤ اِیْمَانًا'': گویا کہ منافقین مسلمانوں کا استہزاء کرتے ہوئے کہتے تھے کہ قرآن کی جو آیت نازل ہوئی ہے اس میں سے کس نے تمہارے ایمان میں اضافہ کیا ہے۔

''فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّهُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ'': اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں کہ اس آیت نے مومنین کے ایمان میں اضافہ اور تقویت فرمائی ہے اور وہ اس آیت کے نزول سے خوش ہوتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''لیکن جن لوگوں کے دلوں میں نفاق کی بیماری ہے، اس سورت نے ان کے کفر کی نجاست کو پہلی نجاست کے ساتھ ملا دیا ہے اور وہ حالتِ کفر میں ہی مر گئے O'' (التوبہ: ١٢٥)

''وَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ'': اور جن لوگوں کے دلوں میں شک اور نفاق کی بیماری ہے۔ اس آیت کے نازل ہونے سے ان کے کفر کی نجاست اور نجاست کے ساتھ مل گئی، یعنی وہ ہر آیت کے نزول کے وقت اس آیت کے برحق ہونے کا انکار کرتے تھے اور ان کے کفر میں اضافہ ہوتا تھا۔ مجاہد نے کہا: اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ ایمان زیادہ بھی ہوتا ہے اور کم بھی ہوتا ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے اصحاب میں سے ایک مرد یا دو مردوں کا ہاتھ پکڑ کر کہتے: آؤ ہم اپنے ایمان

میں اضافہ کریں۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ابتداء میں ایمان سے دل میں سفیدی ہوتی ہے، پس جب اس کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے تو اس سفیدی میں اضافہ ہو جاتا ہے حتیٰ کہ اس کا پورا دل روشن ہو جاتا ہے، اور نفاق سے دل میں ابتداءً سیاہی ہوتی ہے، پس جوں جوں نفاق بڑھتا ہے اس کے دل میں وہ سیاہی بڑھتی جاتی ہے، اللہ کی قسم! اگر تم مومن کے قلب کو چیرو تو اس کو تم روشن اور سفید پاؤ گے، اور اگر تم منافق کے قلب کو چیرو تو اس کو تم مکمل سیاہ پاؤ گے۔

"وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ": اور منافق حالتِ کفر میں ہی مر گئے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "کیا منافق یہ نہیں دیکھتے کہ وہ ہر سال ایک یا دو بار مختلف مصائب میں مبتلاء کیے جاتے ہیں! اس کے باوجود وہ نہ توبہ کرتے ہیں اور نہ ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں O" (التوبہ:۱۲۶)

منافقین کا ہر سال مصائب و آلام میں مبتلاء ہونے کے باوجود کفر سے تائب نہ ہونا

"اَوَلَا يَرَوْنَ": اس آیت میں مذکورہ منافقین سے خطاب ہے۔ "اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ": کیا یہ لوگ اس پر غور نہیں کرتے کہ وہ ہر سال ایک مرتبہ یا دو مرتبہ شدید بیماریوں میں مبتلاء ہوتے ہیں، اور مجاہد نے کہا: سخت قحط میں مبتلاء ہوتے ہیں اور قتادہ نے کہا: جہاد اور غزوات میں مبتلاء ہوتے ہیں۔ اور مقاتل بن حیان نے کہا: وہ اپنے نفاق کے ظاہر ہونے سے رسوا ہوتے ہیں۔ اور عکرمہ نے کہا: وہ نفاق کرتے ہیں، پھر ایمان لے آتے ہیں، پھر نفاق کرتے ہیں۔ اور یمان بن رباب نے کہا: وہ سال میں ایک بار یا دو بار عہد کرنے کے بعد اس کو توڑ دیتے ہیں۔ "ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ": پھر عہد شکنی سے توبہ نہیں کرتے اور نفاق سے اللہ تعالیٰ کی طرف اخلاص سے رجوع نہیں کرتے۔

"وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ": اور اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کو سچا فرما کر مومنین کی مدد فرماتے ہیں اور منافقین نصیحت حاصل نہیں کرتے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور جب قرآن (مجید) کی کوئی سورت نازل فرمائی جاتی ہے تو وہ منافق ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں کہ کہیں کوئی مسلمان تمہیں دیکھ تو نہیں رہا، پھر وہ لوٹ جاتے ہیں، اللہ نے اُن منافقوں کے دل پھیر دیے ہیں، کیونکہ وہ حق بات کو سمجھتے ہی نہیں O" (التوبہ:۱۲۷)

منافقین کا قرآنِ مجید کی کسی سورت کے نزول کی ہیبت سے فرار ہونا

"وَاِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ": اور جب قرآن مجید کی ایسی سورت نازل ہوتی ہے جس میں زجر و توبیخ ہوتی ہے۔ "نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ": تو منافقین بھاگنے کے لیے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔

"هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ": یعنی وہ منافقین ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں سے کوئی تمہیں دیکھ تو نہیں رہا۔ پس اگر مسلمانوں میں سے کوئی نہ دیکھ رہا ہو تو وہ مسجد سے نکل جاتے ہیں اور اگر ان کو یہ معلوم ہو کہ ان میں سے کسی ایک کو مسلمان دیکھ رہے ہیں تو وہ پھر مسجد میں ٹھہرے رہتے ہیں۔ "ثُمَّ انْصَرَفُوْا": پھر یہ ایمان لانے سے پلٹ جاتے ہیں۔

"صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ": اللہ تعالیٰ ہی نے ان کے دلوں کو ایمان لانے سے پھیر دیا ہے۔ ابو اسحاق الزجاج نے کہا کہ اللہ

تعالیٰ نے ان کو ان کی گمراہی پر چھوڑ دے رکھا۔"بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ": کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے دین کو سمجھتے نہیں ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اے منافقو! جب تم نماز پڑھ لو تو پھر یہ نہ کہنا کہ ہم نماز سے پھر گئے، کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لانے سے پھر گئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:"(اے مسلمانو!) بے شک تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک عظیم رسول آچکے ہیں جن پر تمہارا مشقت میں مبتلاء ہونا بہت بھاری ہے اور وہ تمہاری ہدایت کے حصول کے لیے بہت زیادہ حریص ہیں، مومنین پر بہت زیادہ شفیق اور مہربان ہیںO"(التوبہ:۱۲۸)

التوبہ:۱۲۸ کی متعدد تفاسیر

علامہ ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ، التوبہ:۱۲۸ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ": بے شک تمہارے پاس تم میں سے وہ رسول آ گئے جن کے حسب و نسب کو تم پہچانتے تھے۔السدی نے کہا: بنو اسماعیل میں سے تمہارے پاس رسول آ گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: عرب کے ہر قبیلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب موجود تھا۔ اور امام جعفر بن محمد الصادق نے کہا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب پیدا ہوئے تو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک ولادت جاہلیہ کے آثار میں سے آپ کو کوئی اثر نہیں پہنچا۔

ابو الحویرث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے زمانہ جاہلیت کے زنا سے کسی چیز نے نہیں چھوا، میں صرف نکاح سے پیدا ہوا ہوں جیسے اسلام میں نکاح ہوتا ہے۔

(المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۰۸۱۲، سنن بیہقی ج ۷ ص ۱۹۰، الطبقات الکبریٰ ج ۱ ص ۵۱، المعجم الاوسط للطبرانی: ۴۷۲۵، تاریخ جرجان ص ۳۱۸۔۳۱۹، تاریخ دمشق لابن عساکر ج ۱ ص ۴۶۷، مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۱۳ رقم الحدیث: ۱۳۸۲۰، تفسیر عبدالرزاق: ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ج ۱ ص ۲۹۱، تفسیر الطبری ج ۱۲ ص ۹۷، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۲۳ھ، تفسیر امام ابن ابی حاتم: ج ۶ ص ۱۹۱۷، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ)

شیخ اشرف علی تھانوی دیوبندی متوفی ۱۳۶۲ھ، التوبہ:۱۲۸ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ":(اے لوگو!) تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس (بشر) سے ہیں (کہ تم کو نفع حاصل کرنا آسان ہو) جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گزرتی ہے (چاہتے ہیں کہ تم کو کوئی ضرورت پہنچے) جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہش مند رہتے ہیں (یہ حالت تو سب کے ساتھ ہے پھر بالخصوص) ایمانداروں کے ساتھ (تو) بڑے ہی شفیق (اور) مہربان ہیں (ایسے رسول سے مستفید نہ ہونا بڑی محرومی ہے) پھر اگر (اس پر بھی آپ کو رسول ماننے سے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کرنے سے یہ لوگ) روگردانی کریں تو آپ کہہ دیجئے (میرا کیا نقصان ہے) میرے لیے (تو) اللہ تعالیٰ (حافظ و ناصر) کافی ہے اس کے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں (پس جب وہ معبودیت اس کے ساتھ مختص ہے تو لامحالہ سارے کمالات علم و قدرت اس میں بے مثل ہوں گے پھر مجھ کو کسی کی مخالفت سے کیا اندیشہ) میں نے اسی پر بھروسہ کر لیا اور وہ بڑے بھاری عرش کا مالک ہے (تو اور چیزیں تو بہ طریق اولیٰ اس کی مملوک ہوں گی پس اس پر بھروسہ کرنے کے بعد مجھ کو کوئی اندیشہ نہیں

البتہ تم اپنی فکر کرلو کہ حق کا انکار کر کے تم کہاں رہو گے)۔ (تفسیر بیان القرآن مع التوضیح، ج ٢ ص ١٢٩، مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار، لاہور)

شیخ عبدالماجد دریا آبادی متوفی ١٣٩٧ھ/١٩٧٧ء، التوبہ: ١٢٨ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ'': سوال پیدا ہوا ہے کہ تمہاری ضمیر جمع مخاطب دونوں جگہ کس کی جانب ہے؟ یعنی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کس کے درمیان آئے ہیں؟ بعض نے کہا ہے کہ مخاطب عرب ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اہل عرب کے درمیان بھیجے گئے تھے۔ لیکن قول محقق یہ ہے کہ یہ خطاب ساری نوع انسان سے ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تنہا عرب کی جانب نہیں، سارے عالم کی جانب تھی۔ قال الزجاج هي مخاطبة لجميع العالم والمعنى لقد جاءكم رسول من البشر (قرطبی) يريد انه بشر مثلكم (کبیر) قيل الخطاب للبشر على الاطلاق (روح) يحتمل ان يكون خطابا لبني آدم (بحر) مشرک قوموں اور مشرک مزاج گروہوں کی سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا کہ منصب رسالت پر کوئی بشر کیسے مامور ہوسکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت پر بار بار زور دینا اسی عام گمراہی کے رد میں ہے۔ ''عَزِيْزٌ عَلَيْهِ۔۔۔ الخ'' مرشد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ صفات ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ اور چونکہ شیخ مربی بھی رسول ہی کا نائب ہوتا ہے اس لیے یہ صفات شفقت على الخلق اس میں بھی ہونے ضروری ہیں۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت ساری خلق اللہ کے لیے تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں درد نوع انسانی کے لیے تھا تو خاص مومنین کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے درجہ رأفت و کرم اور شفقت و تعلق قلب کا کہنا ہی کیا! (اور عرش عظیم موجودات میں سب سے اعظم ہے تو جو اس کا مالک ہے، اس کی تحت اور ملک کامل میں اور سارے موجودات عالم کا ہونا بالکل ظاہر ہے) ليدل على فيه ماودته اذا ذكره (قرطبی) خص العرش لانه اعظم المخلوقات (بحر)۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا: یعنی یہ لوگ یہ سب کچھ جاننے، بوجھنے اور سننے کے بعد بھی اگر انکار پر قائم رہیں۔ حَسْبِيَ اللّٰهُ: یعنی میرا حافظ و ناصر تو وہی مولیٰ حقیقی ہے مجھے تمہارے اعراض و انکار سے ضرر کیا؟ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ یعنی میرا تکیہ اسی ذات عظیم پر ہے نہ کہ اپنے نفس پر یا کسی اور ذات کے اوپر۔

(تفسیر الماجدی ص ٣٦٣، پاک کمپنی، اردو بازار، لاہور)

صدر الافاضل علامہ سید محمد نعیم الدین مراد آبادی حنفی متوفی ١٣٦٧ھ، التوبہ: ١٢٨ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ'': محمد صلی اللہ علیہ وسلم عربی قرشی جن کے حسب و نسب کو تم خوب پہچانتے ہو کہ تم میں سب سے عالی نسب ہیں اور تم ان کے صدق و امانت، زہد و تقویٰ، طہارت و تقدس اور اخلاق حمیدہ کو بھی خوب جانتے ہو اور ایک قراءۃ میں ''اَنْفَسِكُمْ'' بفتح فا آیا ہے، اس کے معنی ہیں کہ تم میں سب سے نفیس تر اور اشرف و افضل۔ اس آیت کریمہ میں سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری یعنی آپ کے میلاد مبارک کا بیان ہے۔ ترمذی کی حدیث سے بھی ثابت ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پیدائش کا بیان قیام کر کے فرمایا۔ مسئلہ: اس سے معلوم ہوا کہ محفل میلاد مبارک کی اصل قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ اس آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دو ناموں (یعنی رؤف اور رحیم) سے مشرف فرمایا، یہ کمال تکریم ہے اس سرور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ (تفسیر خزائن العرفان مع ترجمہ کنز الایمان ص ٣٩٠، مکتبۃ المدینہ، کراچی، ١٤٣٢ھ)

''لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ'':

اس آیت کی ایک قرأت ہے ''مِنْ اَنْفَسِكُمْ'' یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے پاس آئے اور آپ تم میں سب سے نفیس ہیں۔

امام رازی نے لکھا ہے کہ حضرت فاطمہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما کی قراءت میں "مِنْ اَنْفَسِکُمْ" ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے پاس اس حال میں آئے کہ وہ تم میں سب سے اشرف، سب سے افضل اور سب سے نفیس ہیں۔

(تفسیر کبیر ج ٦ ص ١٧٨، داراحیاء التراث العربی، بیروت، المستدرک ج ٢ ص ٢٤٠)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام انسانوں سے زیادہ نفیس اور افضل اور اشرف ہونے کے ثبوت میں احادیث

(۱) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں ہر قرن میں بنو آدم کے بہترین لوگوں میں سے مبعوث فرمایا گیا ہوں، حتیٰ کہ جس قرن میں، میں ہوں۔

(صحیح البخاری: ٣٥٥٧، مسند احمد: ٨٨٥٧، مشکوٰۃ: ٥٥٣٩، الطبقات الکبریٰ ج ١ ص ٢٥، مسند ابویعلیٰ: ٦٥٥٣، دلائل النبوۃ للبیہقی ج ١ ص ١٧٥، شعب الایمان: ١٣٣٩، شرح السنۃ للبغوی: ٣٦١٥، الجامع الصحیح للسنن والمسانید ج ١ ص ٣٣٧)

(موسوعۃ المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی الشریف، ج ١٥ ص ٣٩٣-٣٩٢، دارالمعرفہ، بیروت، ١٤٣٣ھ)

(۲) حضرت واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے ابراہیم کی اولاد میں سے اسماعیل کو فضیلت عطا فرمائی اور اسماعیل کی اولاد سے بنو کنانہ کو فضیلت عطا فرمائی اور بنو کنانہ میں سے قریش کو فضیلت عطا فرمائی اور قریش سے بنو ہاشم کو فضیلت عطا فرمائی اور بنو ہاشم میں سے مجھے فضیلت عطا فرمائی۔

(صحیح مسلم: ٢٢٧٦، الرقم المسلسل: ٥٨٩٧، رقم حدیث الباب: ١، سنن ترمذی: ٣٦٠٥، مصنف ابن ابی شیبہ: ١١٧٣١، مسند احمد: ١٦٩٨٦، ١٦٩٨٧، الاحاد والمثانی لابن ابی عاصم: ١٤٩٣، السنۃ لابن ابی عاصم: ١٣٩٥، صحیح ابن حبان: ٦٢٤٢، ٦٣٣٣، ٦٤٧٥، المعجم الکبیر للطبرانی: ج ٢٢ ص ٦٦، السنن الکبریٰ للبیہقی: ١٣٠٧٣، شرح السنۃ للبغوی: ٣٦١٣، کشف المشکل: ٢٢٣٦، الجامع الصحیح للسنن والمسانید: ج ١٣ ص ٢٠١)

(۳) حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو مجھے سب سے بہتر مخلوق میں رکھا، پھر جب ان کو گروہوں میں تقسیم فرمایا تو مجھے سب سے بہتر گروہ میں رکھا، پھر جب قبائل پیدا فرمائے تو مجھے سب سے بہتر قبیلہ میں رکھا، اور جب جانیں پیدا فرمائیں تو مجھے سب سے بہتر جان میں رکھا، پھر جب گھر پیدا فرمائے تو مجھے سب سے بہتر گھر میں رکھا، پس میرا گھر بھی سب سے بہتر ہے اور میری جان بھی سب سے بہتر ہے۔

(سنن ترمذی: ٣٥٣٢، ٣٦٠٧، ٣٦٠٨، مسند احمد: ١٧٨٨، ١٧٨٩، دلائل النبوۃ للبیہقی ج ١ ص ١٦٧، دلائل النبوۃ لابی نعیم: ١٢، مسند البزار ج ٣ ص ١٣٠، الجامع الصحیح للسنن والمسانید ج ١٣ ص ٢٠٥)

(۴) حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نکاح سے پیدا ہوا ہوں، (حضرت) آدم (علیہ السلام) سے لے کر حتیٰ کہ میں اپنے باپ اور ماں سے پیدا ہوا ہوں، زنا سے پیدا نہیں ہوا۔

(المعجم الاوسط: ٤٧٢٥، تفسیر عبدالرزاق: ١١٣٨، الجامع الصحیح للسنن والمسانید: ج ١ ص ٣٢٨، الشریعہ للآجری: ٩٥٧، التیسیر بشرح الجامع الصغیر ج ١ ص ٥١٣)

(۵) جعفر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نکاح سے پیدا ہوا ہوں اور آدم علیہ السلام سے لے کر میں کبھی زنا سے پیدا نہیں ہوا اور مجھے جاہلیت کے زنا نے نہیں چھوا۔

(مصنف ابن ابی شیبہ: ٣١٦٣١، الشریعہ للآجری: ٩٥٧، المعجم الاوسط للطبرانی: ٤٧٢٨، التیسیر بشرح الجامع الصغیر، ج ١ ص ٥١٣، الجامع الصحیح للسنن

والسانید: ج ۱ ص ۳۲۸، تاریخ دمشق جز ۳ ص ۲۲۶، دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۴۲۱ھ)

(۶) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے رب اللہ عزوجل نے مجھ پر یہ اکرام فرمایا کہ میں مختون پیدا ہوا ہوں اور میری شرم گاہ کو کسی نے بھی نہیں دیکھا۔

(المعجم الاوسط للطبرانی: ۶۱۴۸، المعجم الصغیر للطبرانی: ۹۳۶، حلیۃ الاولیاء ج ۳ ص ۲۴، الاحادیث المختارہ ج ۵ ص ۲۳۳، التیسیر بشرح الجامع الصغیر ج ۲ ص ۳۸۳، السند الرضوی الجامع للکتب العشر ، ج ۲ ص ۲۷۸، تاریخ بغداد ج ۱ ص ۳۲۹، تاریخ دمشق جز ۳، ص ۲۳۳، دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۴۲۱ھ)

(۷) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں ختنہ شدہ اور ناف بریدہ پیدا ہوا۔

(تاریخ دمشق جز ۳ ص ۲۳۳، دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۴۲۱ھ)

(۸) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہمارے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپ نے ہمارے پاس دوپہر کو آرام فرمایا۔ آپ کو پسینہ آ رہا تھا، میری والدہ ایک شیشی لے کر آئیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم پر ہاتھ پھیر کر پسینہ کو ایک شیشی میں جمع کر رہی تھیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوئے تو آپ نے فرمایا: اے ام سلیم! یہ تم کیا کر رہی ہو؟ انہوں نے عرض کیا: یہ آپ کا پسینہ ہے، ہم اس کو اپنی خوشبو کے لیے جمع کر رہے ہیں اور یہ ہماری سب سے اچھی خوشبو ہے۔

(صحیح مسلم: ۲۳۳۱، الرقم المسلسل: ۶۰۰۹، رقم حدیث الباب: ۸۳، مسند احمد: ۱۲۳۹۵، ۱۲۳۹۶، السند الرضوی الجامع للکتب العشر ، ج ۱ ص ۳۵۸)

(۹) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گندمی رنگ کے تھے اور جیسی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشبو تھی ایسی خوشبو کسی مشک اور عنبر میں نہیں تھی۔

(مسند احمد: ۱۳۰۱۵، الطبقات الکبریٰ ج ۱ ص ۴۱۳، البدایہ والنہایہ ج ۶ ص ۱۶، مسند البزار (کشف الاستار): ۲۳۸۸، ۲۳۸۹، تاریخ بغداد ج ۵ ص ۱۹۷، المختارہ للضیاء: ۱۹۵۵، ۱۹۵۶، ۱۹۵۷، دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۱ ص ۲۰۳، مسند ابو یعلیٰ: ۳۷۶۱، صحیح ابن حبان: ۶۳۰۳، موسسۃ الرسالہ بیروت، ۱۴۲۰ھ)

(۱۰) حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی راستے پر جاتے، پھر آپ کے بعد کوئی اس راستہ پر جاتا تو وہ اس راستہ میں آپ کی پھیلی ہوئی خوشبو سے یہ پہچان لیتا تھا کہ آپ اس راستے سے گزر گئے ہیں۔

(سنن دارمی: ۶۶، ۶۷، الخصائص الکبریٰ ج ۱ ص ۱۱۴، الادب لابن ابی شیبہ: ۹۵، ۹۶، مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۲۳۲۲، ۳۲۳۲۳، المراسیل لابی داؤد: ۴۳۵، مسند البزار: ۱۱۸۷، الجامع الصحیح للسنن والمسانید ج ۱۳ ص ۲۳۲)

(۱۱) حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے راستوں میں سے کسی راستہ سے گزرتے تو وہاں مشک کی خوشبو پھیلی ہوئی ہوتی تھی اور لوگ کہتے تھے کہ آج اس راستے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گزرے ہیں۔

(مسند ابو یعلیٰ: ۳۱۲۵، مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۸۲، الخصائص الکبریٰ ج ۱ ص ۱۱۵، الادب لابن ابی شیبہ: ۹۵، ۹۶، مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۲۳۲۲، ۳۲۳۲۳، المراسیل لابی داؤد: ۴۳۵، مسند البزار: ۱۱۸۷، الجامع الصحیح للسنن والمسانید ج ۱۳ ص ۲۳۲)

(۱۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے کہا: یا رسول اللہ! میں نے اپنی

بیٹی کا نکاح کیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ کسی چیز سے میری مدد فرمائیں، آپ نے فرمایا: اس وقت میرے پاس کوئی چیز نہیں ہے لیکن تم کل آنا اور ایک کھلے منہ کی شیشی اور ایک لکڑی لے کر آنا، پھر آپ نے اس شیشی میں اپنا پسینہ ڈال دیا حتیٰ کہ وہ شیشی بھر گئی، پھر آپ نے فرمایا: اپنی بیٹی سے کہنا کہ وہ اس لکڑی کو اس شیشی میں ڈبو کر اس سے خوشبو لگائے، پھر جب وہ لڑکی خوشبو لگاتی تو تمام مدینہ میں اس کی خوشبو پھیل جاتی اور ان کے مکان کا نام خوشبو والوں کا گھر پڑ گیا۔

(الکامل لابن عدی ج ۲ ص ۸۶۲ ـ ۸۶۳، مسند ابو یعلیٰ: ۶۲۹۵، مجمع الزوائد: ۱۳۰۵۶، طبع جدید)

اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔

(۱۳) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جبریل علیہ السلام نے کہا: میں نے زمین کے مشارق اور مغارب پلٹ ڈالے میں نے کسی شخص کو (سیدنا) محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل نہیں پایا اور نہ بنو ہاشم سے افضل کوئی گھر دیکھا۔

(المعجم الاوسط: ۶۲۸۱، مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۱۷ طبع قدیم، شرح اصول اعتقاد اہل السنۃ: ۱۴۰۲، ج ۴ ص ۸۲۹، التیسیر بشرح الجامع الصغیر ج ۲ ص ۱۹۱)

"عَزِيۡزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ": یعنی تمہارا مشقت کے کاموں میں پڑنا اور تمہارا نقصان ان پر بہت دشوار ہے۔

امت پر سخت احکام کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر دشوار ہونا

(۱) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر مجھے مسلمانوں پر دشوار نہ ہوتا یا فرمایا: اگر مجھے اپنی امت پر دشوار نہ ہوتا تو انہیں ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم فرماتا۔

(صحیح مسلم: ۲۵۲، الرقم المسلسل: ۵۸۸، رقم حدیث الباب: ۴۲، سنن ابوداؤد: ۴۶، سنن ابن ماجہ: ۲۹۰، سنن نسائی: ۵۳۴، سنن ترمذی: ۲۲، الآثار لابی یوسف: ۳۸، مصنف ابن ابی شیبہ ۱۷۸۶، ۱۷۸۷، ۱۷۹۵، ۱۸۰۳، مسند احمد: ۶۰۷، ۹۶۷، ۷۳۳۹، ۷۸۵۳، ۹۱۷۹، ۹۵۳۹، المنتخب من مسند عبد بن حمید ج ۱ ص ۲۶۴، سنن دارمی: ۱۵۲۵، مسند البزار ج ۲ ص ۱۲۱، السنن الکبریٰ للنسائی: ۳۰۲۲۶، ۳۰۲۷، صحیح ابن خزیمہ: ۱۳۹، ۲۰۰۴، شرح معانی الآثار: ۲۲۸، ۲۳۵، صحیح ابن حبان: ۱۰۶۸، المعجم الاوسط للطبرانی: ۷۳۴۳، المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۳۰۴۲، معالم السنن ج ۱ ص ۲۹، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۱۵۳، شرح السنۃ للبغوی: ۱۹۸، معجم ابن عساکر: ۱۵۲۵)

(۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات مسجد میں نماز پڑھی، لوگوں نے بھی آپ کی اقتداء میں نماز پڑھی، پھر دوسری رات کو بھی آپ نے نماز پڑھی تو بہت زیادہ لوگوں نے آپ کی اقتداء کی، پھر تیسری یا چوتھی رات کو بھی لوگ جمع ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف نہیں لائے، پھر صبح کو آپ نے فرمایا: مجھے معلوم ہے تم نے جو کچھ کیا تھا، لیکن میں صرف اس وجہ سے باہر نہیں آیا کہ مجھے یہ خوف تھا کہ تم پر یہ نماز فرض فرما دی جائے گی، پھر تم اس کو نہیں پڑھ سکو گے۔

(صحیح البخاری: ۱۱۲۹، صحیح مسلم: ۷۶۱، ۱۷۷۰، ۱۷۸۰، سنن نسائی: ۲۲۰۶)

(موسوعۃ المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی الشریف، ج ۱۲ ص ۷۰۴، دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۳۳ھ)

(۳) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ شب معراج نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک دن رات میں پچاس نمازیں فرض فرمائی گئیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں درخواست کی کہ میری امت ان کی طاقت نہیں رکھتی کچھ تخفیف فرمایئے حتیٰ کہ پچاس کی جگہ پانچ نمازیں فرض ہو گئیں اور فرمایا کہ یہ تعداد میں پانچ نمازیں اور اجر میں پچاس نمازیں ہیں۔ (ملخصاً)

(صحیح البخاری: ۳۹،۳۴۹،۳۶۱۳، ۳۳۴۲، صحیح مسلم: ۱۹۳، السنن الکبریٰ للنسائی: ۳۱۰، سنن نسائی: ۴۲۸، سنن ترمذی: ۳۳۳۶، سنن ابن ماجہ: ۴۳۹۹، مستخرج ابی عوانہ: ۳۵۳، صحیح ابن حبان: ۷۴۰۶، الایمان لابن مندہ: ج ۲ ص ۷۲۱، التیسیر بشرح الجامع الصغیر ج ۲ ص ۱۶۸، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشر ج ۷ ص ۳۴۷)۔(موسوعۃ المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی الشریف ج ۱۴ ص ۲۶۔۲۷، دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۳۳ھ)

(۴) حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وصال کے روزے نہ رکھو (یعنی بغیر سحر و افطار کے روزے پر روزے نہ رکھو)، مسلمانوں نے کہا: یا رسول اللہ! آپ بھی تو وصال کے روزے رکھتے ہیں! آپ نے فرمایا: میں تم میں سے کسی کی مثل نہیں ہوں، بے شک مجھے میرا رب کھلاتے اور پلاتے ہیں۔

(صحیح البخاری: ۱۹۶۳، ۱۹۶۷، سنن ابوداؤد: ۲۳۶۱، مسند احمد: ۱۰۶۷۱، ۱۱۰۵۵، سنن دارمی: ۱۷۰۵، سنن ترمذی: ۷۷۸، صحیح ابن حبان: ۳۵۷۳، مسند ابویعلیٰ: ۲۸۷۳، المسند الموضوعی: ج ۱ ص ۳۲۸)

(موسوعۃ المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی الشریف ج ۱ ص ۳۰۲، دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۳۳ھ)

(۵) حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: لوگوں میں سے جو شخص حج کو جانے کی استطاعت رکھے، اس پر حج کرنا فرض ہے، مسلمانوں نے پوچھا: یا رسول اللہ! کیا ہر سال؟ آپ نے فرمایا: اگر میں ہاں کہہ دیتا تو تم پر ہر سال حج کرنا فرض ہو جاتا۔

(سنن ترمذی: ۸۱۴، سنن ابن ماجہ: ۲۸۸۴، مسند ابویعلیٰ: ۵۱۷، مسند احمد: ۹۰۵، مسند البزار: ۹۱۳، المستدرک ج ۲ ص ۲۹۳، رقم الحدیث: ۳۱۵۷، اخبار مکۃ للفاکہی: ج ۱ ص ۳۶۸، المعجم الکبیر للطبرانی: ۷۶۷۱، مسند الشامیین للطبرانی: ۹۵۵، سنن دارقطنی: ۲۷۰۳، المسند الموضوعی ج ۱ ص ۲۷۹)

"حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ": یعنی وہ تمہارے ایمان لانے پر اور تمہارے نیک کاموں کے کرنے پر بہت حریص ہیں۔

"بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ": ایک قول یہ ہے کہ آپ نیک کام کرنے والوں پر برے کام کرنے والوں کی بہ نسبت زیادہ مہربان ہیں۔

"لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ" کے وظیفہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت

علامہ شمس الدین محمد بن ابی بکر ابن قیم الجوزیہ المتوفی ۷۵۱ھ اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

ابوبکر محمد بن عمر بیان کرتے ہیں کہ میں ابوبکر بن مجاہد کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ شبلی آ گئے، ابوبکر بن مجاہد ان کے لیے کھڑے ہوئے اور ان سے معانقہ کیا اور ان کی آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا۔ میں نے کہا: اے سیدی! آپ شبلی کی اس قدر تعظیم کر رہے ہیں حالانکہ آپ کا اور تمام اہل بغداد کا یہ خیال ہے کہ یہ دیوانہ ہے! انہوں نے کہا: میں نے اس کے ساتھ اسی طرح کیا ہے جس طرح میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے ساتھ کرتے ہوئے دیکھا ہے، کیونکہ میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، پھر دیکھا کہ شبلی آ رہے تھے۔ آپ اس کے لیے کھڑے ہوئے اور اس کی آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا۔ میں نے کہا: یا رسول اللہ! آپ شبلی کی اس قدر تعظیم کر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا: یہ ہر نماز کے بعد یہ پڑھتا ہے: "لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ الآیہ" (التوبہ: ۱۲۸۔۱۲۹)، اور اس کے بعد مجھ پر درود (شریف) پڑھتا ہے، اور ایک روایت میں ہے کہ یہ ہر فرض کے بعد یہ دو آیتیں پڑھتا ہے، اس کے بعد مجھ پر درود پڑھتا ہے اور تین مرتبہ اس طرح پڑھتا ہے: "صلی اللہ علیک یا محمد" انہوں نے کہا: پھر جب شبلی

آئے تو میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نماز کے بعد کیا ذکر کرتے ہیں تو انہوں نے اسی طرح ذکر کیا۔

(جلاء الافہام ص ۲۵۸، مکتبہ نوریہ رضویہ، لائل پور، پاکستان)

حافظ شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن السخاوی متوفی ۹۰۲ھ نے القول البدیع ص ۲۵۱۔۲۵۲ میں اور علامہ احمد بن محمد بن حجر ہیتمی متوفی ۹۷۳ھ نے الدر المنضود ص ۱۵۱۔۱۵۲ میں اور شیخ محمد زکریا نے فضائل درود ص ۱۱۶ میں اس روایت کا ذکر کیا ہے اور شیخ زکریا نے علامہ سخاوی کے حوالے سے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شبلی کا اتنی (۸۰) سال سے یہ معمول ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''پس اگر کافر پیٹھ پھیر لیں تو آپ کہیے: '' مجھے اللہ کافی ہیں اور اُن کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، میں نے انہی پر توکل کیا ہے اور وہی عرشِ عظیم کے رب ہیں''O (التوبہ:۱۲۹)

''فَإِنْ تَوَلَّوْا'': یعنی اگر تم ایمان لانے سے اعراض کرو۔

التوبہ:۱۲۹ کی تفسیر از امام ابن جریر طبری

امام محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ، لکھتے ہیں:

اے محمد! صلی اللہ علیک وسلم، آپ جن لوگوں کے پاس اپنے رب کی طرف سے اپنی قوم کے پاس دینِ حق لے کر آئے ہیں اگر وہ آپ سے روگردانی کریں، اور آپ کے پاس اللہ کی طرف سے جو نصیحت اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے دعوت، نور اور ہدایت لے کر آئے ہیں، اگر وہ اس کو قبول نہ کریں تو آپ کہیے: مجھے میرے اللہ رب العالمین کافی ہیں، جن کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، میں نے انہی پر توکل کیا ہے اور انہی پر میرا اعتماد ہے اور انہی کی مدد پر میرا بھروسا ہے، اور میں اپنی مدد میں انہی کی طرف دیکھتا ہوں، بے شک وہی میرے مخالفین کے مقابلہ میں میرے ناصر اور معین ہیں، اور لوگوں میں سے جنہوں نے مجھ سے روگردانی کر کے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھا تو مجھے کوئی پرواہ نہیں، میرے رب عرشِ عظیم کے رب ہیں جو ہر چیز کے مالک ہیں اور تمام بادشاہ اس کے مملوک اور اس کے غلام ہیں۔

مصحفِ کریم میں آیات کو درج کرنے کا ضابطہ

عبید بن عمیر بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کسی آیت کو اس وقت تک المصحف میں نہیں لکھتے تھے جب تک کہ اس آیت کے متعلق دو مرد یہ گواہی نہ دیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو لکھوایا تھا، پس انصار میں سے ایک مرد (حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ) ان دونوں آیتوں کو لے کر آئے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں تم سے اس کے متعلق کوئی گواہ کبھی بھی طلب نہیں کروں گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو لکھوایا۔

(تفسیر الطبری ج ۱۲ ص ۱۰۰۔۱۰۱، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۳۲ھ، کتاب الزہد لامام احمد ص ۳۹۳۔۳۹۴، المطالب العالیہ: ۳۹۹۴، المستدرک للحاکم ج ۲ ص ۳۳۸، دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۷، ص ۱۳۹)

سورۂ توبہ کی آخری دو آیتیں

''فَقُلْ حَسْبِيَ اللهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ'': حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: سورۂ توبہ میں جو آخری دو آیتیں نازل ہوئیں، وہ یہ

ہیں۔ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ الخ

"حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ" پڑھنے کی فضیلت

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے ہر صبح اور ہر شام کو سات مرتبہ یہ پڑھا: "حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ" اس کے دنیا اور آخرت کے اہم کاموں میں اللہ کافی ہوں گے۔ (سنن ابوداؤد:٥٠٨١، عمل الیوم واللیلۃ لابن سنی:٧١، الاذکار للنووی رقم الحدیث:٢١٩، کتاب الدعا للطبرانی:١٠٣٨)

سنن ابوداؤد میں یہ حدیث موقوف ہے اور باقی کتابوں میں مرفوع ہے۔

"عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ":

عرش کے متعلق احادیث اور آثار

(١) وہب بن منبہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے عرش کو اپنے نور سے پیدا فرمایا اور کرسی عرش سے ملی ہوئی ہے، اور پانی کرسی کے نیچے اور ہوا کے اوپر ہے اور فرشتوں نے اپنے کندھوں کے اوپر عرش کو اٹھایا ہوا ہے اور عرش کے گرد چار دریا ہیں، ان دریاؤں میں فرشتے کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کی تسبیح کر رہے ہیں، اور عرش بھی اللہ عزوجل کی تسبیح کرتا ہے۔

(کتاب العظمہ رقم الحدیث:١٩٢، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ١٤١٣ھ)

(٢) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ کرسی جو آسمانوں اور زمینوں کو محیط ہے قدموں کی جگہ ہے اور عرش کی مقدار کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا سوا ان کے جس نے اس کو پیدا فرمایا ہے اور تمام آسمان گنبد کی طرح ہیں۔

(کتاب العظمہ رقم الحدیث:١٩٨، المستدرک ج ٢ ص ٢٨٢، یہ حدیث صحیح ہے)

عرش کی تفسیر میں اقاویل علماء

امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ٤٥٨ھ لکھتے ہیں:

اہل تفسیر نے کہا ہے کہ عرش ایک تخت ہے اور وہ جسم مجسم ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا فرمایا اور اس کو اٹھانے کا حکم فرمایا اور اس کی تعظیم کے لیے طواف کرنے کا حکم فرمایا جیسے زمین میں ایک بیت پیدا فرمایا اور بنو آدم کو اس کا طواف کرنے اور اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم فرمایا اور اکثر آیات، احادیث اور آثار میں اس نظریہ کی صحت پر دلائل ہیں۔

(کتاب الاسماء والصفات للبیہقی ص ٣٩٢، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

ابوالحسن علی بن محمد الطبری نے کہا کہ رحمن کے عرش پر مستوی ہونے کا معنی یہ ہے کہ وہ عرش پر بلند ہیں جیسا کہ ہم کہتے ہیں کہ سورج ہمارے سر پر بلند ہے، اللہ سبحانہ عرش پر بلند ہیں، نہ وہ عرش پر بیٹھے ہوئے ہیں اور نہ وہ اس پر کھڑے ہوئے ہیں، نہ وہ عرش کے ساتھ مماس ہیں نہ وہ اس سے مبائن، بمعنی متباعد ہے کیونکہ مس کرنا اور بعید ہونا اور کھڑا ہونا اجسام کی صفات ہیں اور اللہ عزوجل احد اور صمد ہیں، وہ نہ مولود ہیں نہ والد اور نہ ان کا کوئی مماثل ہے اور جسم کے عوارض اور احوال سے وہ مبرا اور منزہ ہیں۔

(کتاب الاسماء والصفات للبیہقی ص ٤١١، مطبوعہ بیروت)

آیا سورۂ توبہ کی آخری آیت قرآن مجید کی آخری آیت ہے یا نہیں؟

امام ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ قرآن مجید کی جو آخری آیتیں نازل ہوئیں وہ یہ ہیں: "لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ۔۔۔ الآیہ" (التوبہ: ۱۲۸۔۱۲۹)۔

(تفسیر الطبری ج ۱۲ ص ۱۰۰۔۱۰۱، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۳۳ھ)

اس کے معارض یہ حدیث ہے:

حضرت البراء بن عازب رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: سب سے آخر میں نازل ہونے والی سورت البراءۃ (توبہ) ہے اور سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت: "يَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ؕ ۔۔۔ الخ (النساء: ۱۷۶)" ہے۔

(صحیح البخاری: ۴۶۰۵، صحیح مسلم: ۱۶۱۸، المنتخب من مسند عبد بن حمید ج ۱ ص ۸۶، معالم السنن ج ۴ ص ۹۲، الجامع الصحیح للسنن والمسانید ج ۳۶ ص ۳۰۷، المسند الموضوعی ج ۷ ص ۳۶۸)

نیز امام ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آخری آیت یہ ہے: "وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۔۔۔ (البقرہ: ۲۸۱)"۔ (جامع البیان جز ۳ ص ۱۵۶، رقم الحدیث: ۴۹۳۱)

امام ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نو راتیں زندہ رہے۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۲ ص ۵۵۴، رقم الحدیث: ۲۹۴۴)

نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو آخری آیت نازل ہوئی وہ آیت الربوٰ ہے۔

(صحیح البخاری ۴۵۴۴، دار ارقم، بیروت، تفسیر مقاتل بن سلیمان ج ۱ ص ۲۲۸، مسند احمد: ۲۳۵، شرح السنۃ للبغوی ج ۸ ص ۳۹، الجامع الصحیح للسنن والمسانید ج ۱۷ ص ۱۱۷)

واضح رہے کہ البقرہ: ۲۷۸۔۲۸۰ تک آیات الربوٰ ہیں اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ البقرہ: ۲۸۱ کا بھی پہلی آیتوں پر عطف ہے، اس لیے ان میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ (فتح الباری ج ۸ ص ۲۰۵، طبع لاہور)

ابن جریج نے کہا: یہ آیت (البقرہ: ۲۸۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے نو گھنٹے پہلے نازل ہوئی اور اس کے بعد کوئی چیز نازل نہیں ہوئی، اور ابن جبیر نے کہا: یہ آیت آپ کی وفات سے تین گھنٹے پہلے نازل ہوئی، سورۂ توبہ کی آخری آیت کو بھی قرآن مجید کی نازل ہونے والی آخری آیت کہا گیا ہے لیکن سورۃ البقرہ کی آیت: ۲۸۱ کا آخری آیت ہونا زیادہ صحیح، زیادہ معروف اور زیادہ علماء کا مختار ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۳ ص ۳۲۱، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کی گواہی سے "لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ۔۔۔ الآیۃ" کا سورۂ توبہ میں درج ہونا

جب صحابہ کرام قرآن مجید کو جمع کر رہے تھے تو ان کو سورۂ توبہ کی یہ آخری دو آیتیں نہیں ملیں، پھر حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ سے یہ آیتیں ملیں اور ان کی شہادت پر انہوں نے اس کو قرآن مجید میں شامل کیا۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھے پیغام بھیجا تو میں

نے قرآن مجید کو جمع کرنا شروع کیا حتیٰ کہ جب میں سورۂ توبہ کے آخر پر پہنچا تو "لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ" مجھے صرف حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس ملی اور ان کے علاوہ اور کسی کے پاس یہ آیت نہیں ملی۔

(صحیح البخاری: ۲۸۰۷، ۴۰۴۹، ۴۶۷۹، ۴۷۸۴، ۴۹۸۶، ۴۹۸۸، ۴۹۸۹، ۷۱۹۱، ۷۴۲۵، سنن ترمذی: ۳۱۰۳، صحیح ابن حبان: ۳۵۰۶، مسند احمد ۱: ۱۱۳، شرح مشکل الآثار: ۴۲۹۸، المعجم الکبیر للطبرانی: ۳۹۰۳، شعب الایمان: ۱۶۹، الجامع الصحیح للسنن والمسانید ج ۵ ص ۱۳۶، المسند الموضوعی ج ۶ ص ۱۸۶)

اس سوال کا جواب کہ قرآن مجید کا ثبوت خبر متواتر سے ہے، پس صرف حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کی گواہی سے سورۂ توبہ کی آخری دو آیتوں کو قرآن مجید میں کس وجہ سے درج کیا گیا؟

اس جگہ یہ سوال ہوتا ہے کہ قرآن مجید تو تواتر سے ثابت ہے، صرف ایک صحابی کے کہنے سے یہ آیت قرآن مجید کا جز کیسے بن گئی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ صحابہ کرام کو تواتر سے معلوم تھا کہ یہ آیت سورۂ توبہ کی آخری آیت ہے، لیکن مصحف میں ہر آیت کو درج کرنے کے لیے انہوں نے یہ ضابطہ بنایا تھا کہ دو صحابی اس پر گواہی دیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو لکھوایا تھا یا دو صحابی اس پر گواہی دیں کہ جس سال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اس سال آپ کے سامنے یہ آیت پڑھی گئی تھی، حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کے علاوہ اور کسی صحابی کے پاس اس کی شہادت نہیں تھی، لیکن چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خزیمہ کی شہادت کو دو شہادتوں کے قائم مقام قرار دیا تھا اس لیے اس آیت کو سورۂ توبہ میں درج کرلیا گیا۔

حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ لکھتے ہیں:

امام ابن ابی داؤد نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ دونوں مسجد کے دروازہ پر بیٹھ جائیں اور جب دو گواہ اس پر گواہی دیں کہ یہ آیت کتاب اللہ کی ہے تو اس کو لکھ لیں، اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کسی آیت کے صرف اپنے پاس لکھے ہونے پر اکتفاء نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ دو گواہ اس پر گواہی دیں اور یہ چیز ان کی غایت احتیاط پر دلالت کرتی ہے۔ علامہ سخاوی نے کہا: مراد یہ ہے کہ دو گواہ اس پر گواہی دیں کہ یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی تھی یا دو گواہ اس پر گواہی دیں کہ یہ آیت اسی طرح نازل ہوئی تھی، اور لیث بن سعد نے کہا کہ سب سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قرآن کو جمع کیا اور اس کو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے لکھا اور جب تک دو عادل (نیک) گواہ گواہی نہ دیتے حضرت زید رضی اللہ عنہ اس آیت کو مصحف میں درج نہیں کرتے تھے اور سورۂ توبہ کی آخری آیت صرف حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس پائی گئی تو مسلمانوں نے کہا: اس کو لکھ لو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کی گواہی کو دو مردوں کی گواہی کے برابر قرار دیا ہے۔ (الاتقان ج ۱ ص ۵۸، ملخصاً، مطبوعہ سہیل اکیڈمی، لاہور، ۱۴۰۰ھ)

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں مصحف میں آیات درج کر رہا تھا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۃ الاحزاب کی ایک آیت پڑھتے ہوئے سنا تھا، وہ مجھے حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کے سوا اور کسی کے پاس نہیں ملی جن کی شہادت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو گواہوں کے برابر قرار دیا تھا، وہ آیت یہ تھی: "مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ

عَلَيْهِ۔۔۔ (الاحزاب: ۲۳)"۔

(صحیح البخاری: ۲۸۰۷، ۴۰۴۹، ۴۶۷۹، ۴۷۸۴، ۴۹۸۶، ۴۹۸۸، ۴۹۸۹، ۷۱۹۱، ۷۴۲۵، سنن ترمذی: ۳۱۰۳، صحیح ابن حبان: ۳۵۰۶، مسند احمد: ۲۱۳۱، شرح مشکل الآثار: ۲۳۹۸، المعجم الکبیر للطبرانی: ۳۹۰۳، شعب الایمان: ۱۶۹، الجامع الصحیح للسنن والمسانید ج ۵ ص ۱۳۶، المسند الموضوعی ج ۶ ص ۱۸۶)

حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کی گواہی کو دو گواہوں کے برابر قرار دینے کے ثبوت میں احادیث

عمارہ بن خزیمہ بیان کرتے ہیں کہ اُن کے چچا نے اُن کو حدیث بیان کی اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اعرابی سے ایک گھوڑے کی بیع کی، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کہا: تم ٹھہرو! میں اس گھوڑے کی قیمت لے کر گھر سے آتا ہوں، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جلدی جلدی چل کر گھر گئے اور وہ اعرابی کافی دیر تک انتظار کرتا رہا، پھر بہت سے مرد اُس اعرابی کے پاس آئے اور انہوں نے اس گھوڑے کی قیمت ڈالی اور اُن کو یہ خبر نہیں تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس اعرابی سے گھوڑے کی بیع کر چکے ہیں، پس اس اعرابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ندا کر کے کہا: اگر آپ اس گھوڑے کو خریدنے والے ہیں تو خرید یں ورنہ میں اس گھوڑے کی بیع کر چکا ہوں، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے حتیٰ کہ آپ نے اعرابی کی ندا سنی، پس آپ نے فرمایا: کیا میں تم سے اس گھوڑے کی بیع نہیں کر چکا؟ اس اعرابی نے کہا: نہیں! اللہ کی قسم! میں نے اس گھوڑے کی آپ سے بیع نہیں کی، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیوں نہیں! تم اس گھوڑے کی بیع مجھ سے کر چکے ہو، پھر اعرابی کہنے لگا: اچھا! آپ کوئی گواہ لے کر آئیں، تو حضرت خزیمہ بن ثابت الانصاری رضی اللہ عنہ نے کہا: میں شہادت دیتا ہوں کہ تم اس گھوڑے کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیع کر چکے ہو، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کی طرف مڑ کر کہا: تم نے کس سبب سے شہادت دی؟ حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کی رسالت کی تصدیق کرنے کی وجہ سے میں نے یہ شہادت دی ہے، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کی گواہی کو دو گواہوں کے برابر قرار فرمایا۔

(سنن ابوداؤد: ۳۶۰۷، ۳۶۰۲، سنن نسائی: ۴۶۴۷، مصنف عبدالرزاق: ۱۵۵۶۵، مسند احمد: ۲۱۸۸۳، السنن الکبریٰ للنسائی: ۶۱۹۸، شرح مشکل الآثار: ۳۸۰۲، شرح معانی الآثار: ۶۱۱۰، المعجم الکبیر للطبرانی ج ۲۲ ص ۳۷۹، معالم السنن ج ۳ ص ۱۷۳، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۲۰۵۱۵، معرفۃ السنن والآثار: ۱۹۸۲۵، الاستذکار ج ۳ ص ۲۳۸، کشف المشکل ج ۱ ص ۳۰۷، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشرۃ ج ۱ ص ۳۱۹، المستدرک للحاکم ج ۲ ص ۱۵۵، الاصابہ ج ۲ ص ۲۳۹، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۵ھ، اسد الغابہ ج ۲ ص ۱۷۱، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

نگاہِ نبوت میں حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے واقعہ کا پیشگی علم ہونا

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کی گواہی کو دو گواہوں کے برابر قرار دیا تھا، اس وقت نگاہِ نبوت میں یہ تھا کہ ایک وقت آئے گا جب جمع قرآن کے وقت سورہ توبہ کی آخری آیت اور الاحزاب کی آیت: ۲۳ پر حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی گواہ نہیں ہوگا اور اگر ان کی گواہی کو دو گواہوں کے برابر قرار نہ دیا جائے تو سورہ توبہ اور سورہ احزاب میں یہ آیتیں درج ہونے سے رہ جائیں گی۔

سورۂ توبہ کی تفسیر کی تکمیل

اللہ عزوجل کا کمال احسان ہے کہ انہوں نے مجھے سورۂ توبہ کی تفسیر مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ قرآن مجید کی باقی سورتوں کی تکمیل کی بھی مجھے توفیق عطا فرمائیں۔ اب ان شاء اللہ سورۂ یونس کی تفسیر شروع ہو گی۔

غلام رسول سعیدی غفرلہٗ

۲۸ جمادی الاولی ۱۴۳۶ھ/ 20 مارچ 2015ء

بروز جمعۃ المبارک، بعد نماز عصر

يعتذرون ١١
يونس ١٠
يونس
(١٠)
تبیان القرآن
95
جلد سوم

سورۂ یونس کا اجمالی تعارف

سورۂ یونس، سورۂ ہود اور سورۂ یوسف، ان تینوں سورتوں کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ میں زمانۂ قیام سے ہے، اور دوسری مکی سورتوں کی طرح ان تینوں سورتوں میں بھی اسلام کے چار بنیادی مضامین بیان کیے گئے ہیں: (۱) قرآن مجید کا برحق ہونا، قرآن مجید کی صداقت اور اس کا وحی الٰہی ہونا (۲) اللہ عزوجل کی توحید کے عقلی اور نقلی دلائل و براہین (۳) انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور ان کا اسلوب تبلیغ، ان کی تبلیغ پر کفار کا ردعمل اور نافرمانوں کی سزا کا بیان (۴) وقوع قیامت، محاسبۂ اعمال اور جزا اور سزا۔

ان سورتوں کا زمانۂ نزول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کا آخری حصہ معلوم ہوتا ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کے خلاف کفار مکہ کی معاندانہ کارروائیاں بہت زیادہ ہو چکی تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل وعظ و نصیحت اور تبلیغ کے تمام ذرائع اور وسائل استعمال فرما چکے تھے مگر اہل مکہ کی طرف سے مسلسل انکار اور ان کی ایذاء رسانیوں میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا۔

سورۂ یونس اور سورۂ ہود میں ان انبیاء علیہم السلام کے علاوہ دیگر انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تبلیغی جدوجہد، کفار کی مسلسل نافرمانی اور پھر ان پر آنے والی سزاؤں کے نزول کا ذکر ہے، لیکن سورۂ یوسف میں صرف حضرت یوسف علیہ السلام کے ہی واقعات انتہائی دلچسپ انداز میں بیان فرمائے گئے ہیں، حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کو اللہ تعالیٰ نے احسن القصص سے تعبیر فرمایا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے واقعات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جزا اور سزا کا مدار ایمان اور کفر پر ہے اور اس میں کسی مقرب ترین شخصیت کا ذاتی تعلق بھی نجات کے لیے مفید نہیں ہو سکتا جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے نافرمان بیٹے اور حضرت لوط علیہ السلام کی نافرمان بیوی کی مثالوں سے واضح ہوتا ہے، اس کے برخلاف جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے اعمال صالحہ انجام دیئے، وہی کامیاب و کامران ہوئے۔

اس سورت کا نام یونس ہے، اس کے آخری سے پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کی نافرمانی اور ایمان لانے کا اختصار سے ذکر فرمایا ہے، اسی وجہ سے اس سورت کا نام سورۂ یونس ہے۔ اس سورت کا دوسرا نام الٓر ہے جو کہ اس سورت کے پہلے لفظ سے ماخوذ ہے، کیونکہ یہ سورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کے آخری دور میں نازل ہوئی، لہٰذا اس سورت کا مکی سورتوں میں شمار کیا گیا ہے۔

اس سورت کے مضامین سورۂ توبہ کے مضامین سے کافی مناسبت رکھتے ہیں، سورۂ توبہ کے اخیر میں توحید و رسالت کا ذکر فرمایا تھا سو اس سورت میں یہی مضمون بہت تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ سورۂ توبہ میں زیادہ تر جہاد بالسیف کا تذکرہ تھا اور اسی سلسلہ میں غزوۂ تبوک کی تفصیلات بیان فرمائی گئی تھیں مگر سورۂ یونس میں زیادہ تر جہاد باللسان کا ذکر ہے، بہر حال ان دونوں سورتوں میں جہاد کا ذکر قدر مشترک ہے۔

سورۂ توبہ میں کفار کے تین گروہ یعنی کفار، اہل کتاب اور منافقین کا رد فرمایا گیا تھا جب کہ سورۂ یونس میں مشرکین کے ساتھ بحث مباحثہ اور ان کا رد فرمایا ہے اور ان کو اسلام کی دعوت کا ذکر فرمایا ہے۔

سورۂ یونس کی وجہ تسمیہ

اس سورت کا نام سورۂ یونس اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے مکرم نبی حضرت یونس علیہ السلام کا تذکرہ ہے، اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی امت باقی امتوں سے ممتاز ہے، کیونکہ جب وہ ایمان لے آئے اور انہوں نے پچھلی بداعمالیوں پر سچے دل سے توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ نے اُن سے عذاب اٹھالیا۔

سورۂ یونس کا موضوع

اس سورت میں اولاً بالذات اللہ عزوجل کی توحید کو بیان فرمایا ہے اور شرک کا انہدام فرمایا ہے اور نبوت اور رسالت کے اثبات پر دلائل فراہم فرمائے ہیں، اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے پر اور حشر ونشر پر دلائل وبراہین قائم فرمائے ہیں، اور عموماً مکی سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے اسی انداز کو اختیار فرمایا ہے۔

سورۂ یونس کے مشمولات

(۱) اس سورت میں یہ بیان فرمایا ہے کہ اللہ عزوجل کی سنت یہ ہے کہ وہ ہر قوم میں رسول کو مبعوث فرماتے ہیں اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام رسولوں کی نبوت کو منقطع فرمادیا، لہٰذا فرمایا: ''اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ۔ (یونس:۲)'' (کیا اہل مکہ کو یہ بات عجیب معلوم ہوئی کہ ہم نے انہی میں سے ایک مرد کی طرف وحی نازل فرمائی تا کہ وہ لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیں!)۔

(۲) اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے عقائد بیان فرمائے اور منکرین نبوت کے شبہات کا ذکر فرما کر ان کا ازالہ فرمایا، ارشاد فرمایا: ''وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (یونس:۳۷)'' (قرآن کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ اللہ کی وحی کے بغیر از خود گھڑ کر اللہ پر افتراء باندھا گیا ہو)۔ اور قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے پر دلائل قائم فرمائے ہیں اور مشرکین اور منکرین کو للکارا ہے کہ اگر وہ قرآن مجید کو منزل من اللہ نہیں سمجھتے تو کوئی ایک سورت قرآن مجید کی مثل بنا کر لائیں، چنانچہ ارشاد فرمایا: ''اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ۔ (یونس:۳۸)'' (بلکہ کیا مشرک یہ کہتے ہیں: ''رسول عربی نے قرآن اپنے پاس سے گھڑ لیا ہے؟'' آپ کہیے: ''اگر تم سچے ہو تو اس جیسی کوئی ایک سورت لے آؤ'')۔

(۳) اس سورت میں انتہائی اختصار کے ساتھ دیگر انبیاء سابقین علیہم السلام کا تذکرہ فرمایا ہے جیسے نوح علیہ السلام کا قصہ، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْۤا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْۤا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ۝ (یونس:۷۱)'' ((اے رسول اکرم!) ان کفار مکہ کو نوح کی خبریں سنائیے! جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا: ''اے میری قوم! اگر تمہیں میرا تمہارے پاس طویل قیام کرنا اور اللہ کی آیتوں کے ساتھ نصیحت کرنا، ناگوار ہے تو میرا صرف اللہ پر توکل ہے، تم میرے خلاف اپنی تیاری مکمل کر لو اور تم نے اللہ کو چھوڑ کر جو شریک بنائے ہیں ان کو بھی اپنے ساتھ ملالو، پھر اتنا غور کر لو کہ فیصلے کا کوئی پہلو تم پر مخفی نہ رہے، پھر میرے خلاف تم جو کاروائی کر سکتے ہو کر لو اور مجھے بالکل مہلت نہ دو O)۔ اور اس سورت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بھی ذکر فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ کا

ارشاد ہے: "قَالَ مُوۡسٰٓی اَتَقُوۡلُوۡنَ لِلۡحَقِّ لَمَّا جَآءَکُمۡ ؕ اَسِحۡرٌ ہٰذَا ؕ وَ لَا یُفۡلِحُ السّٰحِرُوۡنَ ﴿۷۷﴾ (یونس: ۷۷)" (موسیٰ نے کہا: جب حق تمہارے پاس آگیا تو تم اس کے متعلق یہ کہتے ہو، کیا یہ جادو ہے؟ جب کہ جادوگر تو کامیاب نہیں ہوتے O)۔ اور اس سورت میں حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ بھی ذکر فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "فَلَوۡ لَا کَانَتۡ قَرۡیَۃٌ اٰمَنَتۡ فَنَفَعَہَاۤ اِیۡمَانُہَاۤ اِلَّا قَوۡمَ یُوۡنُسَ ؕ لَمَّاۤ اٰمَنُوۡا کَشَفۡنَا عَنۡہُمۡ عَذَابَ الۡخِزۡیِ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ مَتَّعۡنٰہُمۡ اِلٰی حِیۡنٍ ﴿۹۸﴾ (یونس: ۹۸)" (ایسا کیوں نہیں ہوا کہ تباہ ہونے والی کوئی بستی ایمان لاتی تو اس کا ایمان اسے فائدہ دیتا؟ سوا یونس کی قوم کے، جب وہ لوگ ایمان لے آئے تو ہم نے دنیا کی زندگی میں ہی ان سے ذلت کا عذاب اٹھا لیا اور انہیں ایک وقت تک اپنی نعمتوں سے بہرہ مند فرمایا O)۔

آياتها ١٠٩ ۱۰ سورۃ یونس مکیۃ ٥١ رکوعاتها ١١

(سورۂ یونس مکی ہے اور اس میں ایک سو نو آیات اور گیارہ رکوع ہیں)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ عزوجل کے بابرکت نام سے ہی (ابتداء ہے) جو سب پر رحم فرمانے والے، نہایت مہربان ہیں

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ①

الٓرٰ، یہ حکمت والی کتاب (قرآن مجید) کی آیات ہیں O

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ②

کیا اہلِ مکہ کو یہ بات عجیب معلوم ہوئی کہ ہم نے انہی میں سے ایک مرد کی طرف وحی نازل فرمائی تاکہ وہ لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیں اور ایمان والوں کو خوش خبری سنائیں کہ "اُن کے لیے اُن کے رب کے پاس اُن کے گزشتہ نیک اعمال کا بہترین اجر و ثواب ہے" ؟ کافروں نے کہا: "بے شک یہ تو کھلا ہوا جادوگر ہے" O

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ③

بے شک تمہارے رب اللہ ہی ہیں جنھوں نے تمام آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں پیدا فرمایا، پھر اس نے اپنی شان کے لائق عرش پر استویٰ فرمایا، وہ تمام کائنات کی تدبیر فرماتے ہیں، اُن کی اجازت سے ہی کوئی سفارش کرنے والا ان کے سامنے سفارش کر سکے گا، یہی اللہ ہیں جو تمہارے رب ہیں، سو تم انہی کی عبادت کیا کرو، کیا تم نصیحت کو قبول نہیں کرتے! O

اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ④

تم سب نے ان ہی کی طرف لوٹ کر حاضر ہونا ہے، یہ اللہ کا برحق وعدہ ہے، بے شک وہی مخلوق کو پہلی بار پیدا فرماتے ہیں، پھر وہی دوبارہ مخلوق کو پیدا فرمائیں گے تاکہ اُن لوگوں کو عدل کے ساتھ جزا عطا فرمائیں جو ایمان لا چکے ہیں اور انہوں نے نیک اعمال کئے ہیں، اور جن لوگوں نے کفر کو اختیار کیا اُن کے پینے کے لیے کھولتا ہوا گرم پانی ہے اور دردناک عذاب ہے کیونکہ وہ کفر کرتے تھے ۝

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّۚ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝۵

اللہ ہی ہیں جنہوں نے سورج کو روشن بنایا اور چاند کو منور بنایا، اور چاند کے لیے منزلیں مقرر فرمائیں تاکہ تم سالوں کی گنتی اور ان کے حساب کو جان لو، اللہ نے ان سب چیزوں کو صرف حق کے ساتھ پیدا فرمایا ہے، وہ غور و فکر کرنے والے لوگوں کے لیے اپنی آیتوں کو تفصیل کے ساتھ بیان فرماتے ہیں ۝

اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ ۝۶

بے شک رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آنے میں اور ہر اُس چیز میں جس کو اللہ نے آسمانوں اور زمینوں میں پیدا فرمایا ہے ضرور اُن لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں ۝

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ اطْمَاَنُّوْا بِهَا وَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝۷ۙ

بے شک جو لوگ ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے اور وہ دنیا کی زندگی سے راضی ہو گئے اور انہوں نے اسی پر قناعت کر لی اور وہ لوگ جو ہماری آیتوں سے غفلت میں پڑے ہوئے ہیں ۝

اُولٰٓىٕكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ۝۸

یہی وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ کی آگ ہے اُن برے کرتوتوں کی وجہ سے جن کا وہ ارتکاب کیا کرتے تھے ۝

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یَهْدِیْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِیْمَانِهِمْۚ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ۝۹

بے شک جو لوگ ایمان لا چکے ہیں اور انہوں نے نیک کام کئے ہیں، اُن کے رب اُن کے ایمان کی وجہ سے انہیں اخروی ترقی کے درجات کی طرف رہنمائی فرمائیں گے، دائمی جنتوں میں جن کے نیچے سے دریا بہہ رہے ہوں گے ۝

دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰

اُن جنتوں میں اُن کی دعا یہ ہوگی: ''اے اللہ! آپ ہر نقص اور عیب سے پاک ہیں'' اور باہم ملاقات کے وقت وہ یہ کہیں گے: ''تم سلامت رہو'' اور اُن کی آخری دعا یہ ہوگی: ''تمام تعریفیں اللہ رب العالمین کے لیے ہیں O''

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''الٓرٰ یہ حکمت والی کتاب (قرآن مجید) کی آیات ہیں O'' (یونس:۱)

سورۂ یونس کے مکی یا مدنی ہونے کا بیان

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ ھ، لکھتے ہیں:

حسن بصری، عکرمہ، عطاء اور جابر نے کہا ہے کہ سورت یونس مکی ہے، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بتایا کہ اس کی صرف تین آیتیں مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہیں اور وہ یہ آیتیں ہیں: ''فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝'' (یونس:۹۴) اور مقاتل نے کہا: اس کی صرف دو آیتیں مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہیں، ایک آیت یہ ہے: ''فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝'' (یونس:۹۴) اور دوسری آیت یہ ہے: ''وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝'' (یونس:۴۰) یہ آیت یہودیوں کے متعلق مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہے۔ اور مفسرین کی دوسری جماعت نے کہا کہ سورۂ یونس کی ابتدائی چالیس آیات مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں اور باقی آیات مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں، اور یہ کل ایک سو نو (۱۰۹) آیات ہیں۔ (الجامع لاحکام القرآن، جزء۸ ص ۲۷۷، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

حروفِ مقطعات میں سے الٓرٰ کی تحقیق

علامہ ابو حفص عمر بن علی الدمشقی الحنبلی المتوفی ۸۸۰ھ، یونس: ۱ تا ۱۰ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''الٓرٰ'': مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ اللہ عزوجل کا ارشاد ''الٓرٰ'' تنہا ایک مکمل آیت نہیں ہے اور اس پر اُن کا اتفاق ہے کہ اللہ عزوجل کا ارشاد ''طٰهٰ'' تنہا مکمل آیت ہے، اور اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ ''الٓرٰ'' بعد کی آیات کے مشابہ نہیں ہے، اس کے برخلاف ''طٰهٰ'' یہ بعد کی آیات کے مشابہ ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور الضحاک نے کہا: ''الٓرٰ'' کا معنی ہے: ''انا اللہ اریٰ'' (میں ہی اللہ ہوں جو سب کچھ دیکھتا ہوں) سعید بن جبیر نے کہا: ''الٓرٰ'' اور ''حٰمٓ'' اور ''نٓ'' یہ سب الرحمٰن کے حروف ہیں جن کو متفرق طور پر ذکر فرمایا ہے۔

اس کتاب کی آیات کے متعدد محامل

''تِلْكَ اٰيٰتُ'': یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے اس کتاب یعنی قرآن مجید کی آیات کی طرف اشارہ ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سورت سے پہلے جو قرآن مجید کی آیات ذکر فرمائی گئی ہیں اُن کی طرف اشارہ ہو۔

''الْكِتٰبِ'': یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد قرآن مجید ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ''الْكِتٰبِ'' سے مراد وہ کتاب ہو جو اللہ تعالیٰ کے پاس محفوظ ہے اور اسی سے ہر کتاب کو لکھا گیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۙ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۙ (الواقعہ: ۷۷۔۷۸)'' (بے شک یہ بہت عزت والا قرآن ہے O جو محفوظ کتاب میں مرقوم ہے O)۔

اور دوسرا قول یہ ہے کہ ''الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ'' سے مراد تورات اور انجیل ہے۔ اور اصل معنی یہ ہے کہ جو آیات اس سورت میں ذکر فرمائی گئی ہیں، یہ وہی آیات ہیں جو تورات اور انجیل میں بھی ذکر فرمائی گئی ہیں۔ اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس سورت میں جو قصے بیان فرمائے گئے ہیں، یہ اُن قصوں کے موافق ہیں جو تورات اور انجیل میں بیان فرمائے گئے ہیں۔

''الْحَكِيْمِ'': ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی ہے: اس کتاب میں حکمت کی باتیں ہیں، اور اکثرین کا قول یہ ہے کہ الحکیم بہ معنی الحاکم ہے، جیسے فعیل بہ معنی فاعل ہوتا ہے، مثلاً قرآن مجید میں ارشاد ہے: ''وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ ... (البقرہ: ۲۱۳)'' (اور ان کے ساتھ سچی کتاب نازل فرمائی تا کہ وہ ان کے درمیان اس باب میں فیصلہ کریں)، اور ایک قول یہ ہے کہ ''الْحَكِيْمِ'' بہ معنی المحکم ہے، یعنی یہ مضبوط کتاب ہے جس پر زمانہ کے تغیرات اثر انداز نہیں ہوں گے، اور اس سے مراد یہ ہے کہ یہ کتاب کذب اور تناقض سے بری ہے۔ حسن بصری نے کہا: اس کتاب میں عدل اور احسان کے ساتھ احکام بیان فرمائے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''کیا اہلِ مکہ کو یہ بات عجیب معلوم ہوئی کہ ہم نے انہی میں سے ایک مرد کی طرف وحی نازل فرمائی تا کہ وہ لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیں! اور ایمان والوں کو خوش خبری سنائیں کہ'' اُن کے لیے اُن کے رب کے پاس اُن کے گزشتہ نیک اعمال کا بہترین اجر و ثواب ہے''، کافروں نے کہا: ''بے شک یہ تو کھلا ہوا جادوگر ہے''O (یونس: ۲)

یونس: ۲ کے نزول کے متعدد اسباب

''اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى رَجُلٍ'': اس آیت کا سببِ نزول یہ ہے کہ اس میں اہلِ مکہ کے تعجب کا ذکر فرمایا ہے، تعجب انسان کی اُس کیفیت کو کہتے ہیں جو کسی خلافِ عادت چیز کو دیکھنے سے انسان پر طاری ہوتی ہے مثلاً کسی باوقار معزز انسان کو لوگ اچانک تیزی سے بھاگتا ہوا دیکھیں جو انسان ہمیشہ سکون اور وقار کے ساتھ چلتا ہو، تو جب اس کو اچانک لوگ تیزی سے بھاگتا ہوا دیکھیں تو اُن کو اس پر تعجب ہوتا ہے کہ آخر کیا سبب ہوا جو یہ شخص اپنی عادت کے خلاف تیزی سے بھاگتا ہوا جا رہا ہے۔ اور یہاں پر اہلِ مکہ کے تعجب کے متعدد اسباب ہیں:

(۱) جب اللہ عزوجل نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنا کر مبعوث فرمایا تو کفار کو اس پر تعجب ہوا کہ اللہ تعالیٰ تو اس سے بہت عظیم ہے کہ وہ کسی بشر اور انسان کو رسول بنا کر بھیجیں، پس اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس تعجب کا رد فرمایا۔

اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا ہے: ''وَعَجِبُوْۤا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ۡ وَ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۚ (ص: ۴)'' (اور اہلِ مکہ نے اس پر تعجب کیا کہ اُن کے پاس اُن ہی میں سے ایک مرد اللہ کے عذاب سے ڈرانے والا آ گیا اور اُن کافروں نے

کہا: یہ جادوگر ہے اور بہت بڑا جھوٹا ہے O۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝ (ص:۵)'' (کیا اس نے متعدد معبودوں کو صرف واحد مستحق عبادت بنا دیا ہے؟ بے شک یہ بہت تعجب خیز بات ہے O)۔

(۲) کفار کے تعجب کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اہل مکہ کہتے تھے کہ کیا اللہ تعالیٰ کو پوری مخلوق میں سے عبداللہ کے یہ یتیم ہی ملے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول بنایا۔

(۳) کفار نے کہا: ''وَ قَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ ۝ (الزخرف:۳۱)'' (اور انہوں نے کہا: یہ قرآن دو شہروں (مکہ اور طائف) کے کسی بڑے مال دار آدمی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ O'')۔ پس اللہ عزوجل نے اُن کے اس تعجب کا رد فرمایا: ''اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ ... (یونس:۲)'' (کیا اہلِ مکہ کو یہ بات عجیب معلوم ہوئی کہ ہم نے انہی میں سے ایک مرد کی طرف وحی نازل فرمائی)۔ یعنی انہیں اس پر حیرت تھی کہ یہ قرآن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی کیوں نازل فرمایا گیا۔

اللہ کے عذاب سے ڈرانے کو ثواب کی بشارت دینے پر مقدم کرنے کی وجہ

''اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ'': تاکہ وہ لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیں!

اس آیت میں انذار یعنی عذاب سے ڈرانے کو تبشیر یعنی خوش خبری سنانے پر مقدم فرمایا ہے، کیونکہ جو چیز نامناسب ہو، اس کو مناسب چیز کے حصول پر مقدم کیا جاتا ہے، اسی وجہ سے پہلے شر کو زائل کیا جاتا ہے، اس کے بعد خیر کو حاصل کیا جاتا ہے۔ نیز کفار اور فساق کو اس سے ڈرایا جاتا ہے کہ وہ ناجائز کام نہ کریں اور اُن سے باز آجائیں اور نیکوکاروں کو ثواب کی بشارت دی جاتی ہے تاکہ اُن کی اللہ تعالیٰ کی طرف رغبت زیادہ قوی ہو۔

''وَ بَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ'': الزجاج اور زمخشری نے کہا ہے: آپ ان مومنین کاملین کو بشارت دیجئے کہ اُن کے پہلے کئے ہوئے نیک کاموں کی وجہ سے وہ اس بشارت کے مستحق ہوئے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ انہوں نے جو پہلے نیک اعمال کئے ہیں، اس کی وجہ سے اُن کو اللہ تعالیٰ اچھا اجر عطا فرمائیں گے۔ اور زید بن اسلم نے کہا: اس وجہ سے اُن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت عطا فرمائی جائے گی۔ اور عطاء نے کہا: اس سے مراد ہے مقامِ صدق جس کو کبھی زوال نہیں ہوگا۔ اور قدم کی صدق کی طرف اضافت فرمائی گئی ہے حالانکہ صدق، قدم کی صفت ہے، یا اس طرح ہے جیسے کہا جاتا ہے ''مسجد الجامع''۔

کفار کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جادوگر کہنے کی توجیہ

''قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِیْنٌ'': جب کہ ان کافروں کے پاس انہی میں سے ایک رسول آیا اور اس رسول نے ان کو اللہ کے عذاب سے ڈرایا اور اللہ تعالیٰ کے اجر و ثواب کی بشارت دی تو کفار نے تعجب سے کہا: بے شک یہ تو کھلے ہوئے جادوگر ہیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ''هٰذَا'' سے قرآن مجید کی طرف اشارہ ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہو۔

کفار نے جو قرآن مجید کو جادو قرار دیا، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے بہ طور مذمت کے قرآن مجید کو جادو کہا ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے بہ طور مدح کے قرآن مجید کو جادو کہا ہو، اور دوسرے مفسرین نے کہا: اُن کی مراد یہ تھی کہ قرآن مجید اپنے کمال فصاحت کی وجہ سے اور اس کی مثال پیش کرنے سے لوگوں کے عجز کی وجہ سے قرآن مجید کو جادو کا قائم مقام قرار دیا، لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ انہی لوگوں میں سے مبعوث ہوئے تھے اور انہی کے درمیان پلے بڑھے اور کبھی ان سے غائب نہیں ہوئے، اور کسی کا آپ کے ساتھ میل جول نہیں تھا، اور مکہ کا شہر علماء کا شہر نہیں تھا حتیٰ کہ یہ کہا جاتا کہ رسول اللہ ﷺ نے اُن سے جادو سیکھ لیا ہے، یا اتنے علوم کثیرہ حاصل کر لیے ہیں کہ لوگ اس کی مثال لانے سے عاجز ہو گئے۔ اور جب اسی طرح تحقیق ہے تو قرآن مجید کے اوپر جادو کا اطلاق کرنا فاسد ہے بلکہ صحیح یہ ہے کہ کفار رسول اللہ ﷺ ہی کو جادوگر قرار دیتے تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''بے شک تمہارے رب اللہ ہی ہیں جنہوں نے تمام آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں پیدا فرمایا، پھر اس نے اپنی شان کے لائق عرش پر استویٰ فرمایا، وہ تمام کائنات کی تدبیر فرماتے ہیں، اُن کی اجازت سے ہی کوئی سفارش کرنے والا ان کے سامنے سفارش کر سکے گا، یہی اللہ ہیں جو تمہارے رب ہیں، سو تم انہی کی عبادت کیا کرو، کیا تم نصیحت کو قبول نہیں کرتے !O'' (یونس: ۳)

یونس: ۳ کا آیاتِ سابقہ سے ارتباط

''اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ '': اس آیت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا تھا کہ کفار کو اس پر تعجب ہوتا تھا کہ نبی ﷺ پر وحی نازل ہوتی ہے اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغام کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اُن کے تعجب کو زائل فرمایا کہ یہ بعید نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کی طرف ایسے رسول کو مبعوث فرمائیں جو اُن کو نیک اعمال پر ثواب کی بشارت دیں اور بداعمالیوں پر اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرائیں۔ اور یہ جواب تب مکمل ہو گا جب حسبِ ذیل چیزوں کو بیان فرمایا جائے:

(۱) اس جہان کے لیے ضروری ہے کہ اس کا کوئی پیدا فرمانے والا ہو جو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہو اور جو امر اور نہی کے ساتھ اپنے احکام کو نافذ فرما سکتا ہو اور لوگوں کو اپنے احکام کا مکلف فرما سکتا ہو، کیونکہ اس تمام جہان کا نسق واحد اور نظام واحد کا تسلسل اس کا متقاضی ہے کہ اس جہان کا کوئی مدبر ہو اور وہ مدبر واحد ہو، ورنہ اس جہان کا نظام ہمیشہ ایک طرز پر نہ ہوتا، ہم دیکھتے ہیں کہ سورج ہمیشہ مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور مغرب میں غروب ہوتا ہے اور کبھی اس کے خلاف نہیں ہوتا، ہم دیکھتے ہیں کہ برصغیر میں ہمیشہ مئی اور جون میں گرمی ہوتی ہے اور دسمبر اور جنوری میں سردی ہوتی ہے اور کبھی اس کے خلاف نہیں ہوتا، ہم دیکھتے ہیں کہ سیب کے درخت سے کبھی انگور پیدا نہیں ہوتا اور انگور کے درخت سے کبھی شہتوت پیدا نہیں ہوتا، سو اس نظام کائنات کی یکسانیت اور وحدت اس کو واجب کرتی ہے کہ اس کائنات کا نظام بنانے والا بھی واحد ہو۔

(۲) حشر اور نشر کو ثابت کیا جائے اور قیامت کو اور مرنے کے بعد اٹھنے کو ثابت کیا جائے حتیٰ کہ نیکوکاروں کو ثواب حاصل ہو اور بدکاروں کو عذاب دیا جائے، اور اگر قیامت قائم نہ ہوتی اور مرنے کے بعد لوگوں کو دوبارہ زندہ نہ فرمایا جاتا تو ظالم اپنی سزا کے بغیر رہ

جاتے اور مظلوم اپنی جزا کے بغیر رہ جاتے، سو اس لیے ضروری ہے کہ قیامت قائم ہو، سب لوگوں کے اعمال منقطع ہو جائیں، پھر لوگوں کو دوبارہ زندہ فرمایا جائے اور نیکو کاروں کو جزا اور بدکاروں کو سزا دی جائے۔ اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے انہی دو چیزوں کی خبر دی ہے۔

رہا اللہ تعالیٰ کی الوہیت کا ثبوت تو وہ اس آیت سے ہے: "اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ" اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے کا ثبوت تو وہ اس آیت سے ہے: "اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِیْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ... (یونس: ۴)"۔

اس سے یہ لازم آتا ہے کہ لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ہی آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں پیدا فرمایا ہے، اور اہل عرب اس کو جاننے والے نہ تھے تو یہ تعریف کیسے صحیح ہو گی؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات یہود اور نصاریٰ میں مشہور تھی، کیونکہ اُن کے پاس تورات اور انجیل میں یہ لکھا ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں پیدا فرمایا ہے اور عرب کے رہنے والے یہود و نصاریٰ سے مل جل کر رہتے تھے، پس ظاہر یہ ہے کہ عربوں نے بھی یہود و نصاریٰ سے یہ سن لیا تھا، اور جب عربوں کو بھی یہ معلوم تھا تو پھر اس آیت سے عربوں پر استدلال کرنا صحیح ہے۔

آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں پیدا فرمانے کی علامہ ابو حفص عمر بن علی کی حکمت اور اس کے متعلق مصنف کی تحقیق

اگر یہ سوال کیا جائے کہ اس کے بیان کرنے کا کیا فائدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں پیدا فرمایا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہیں کہ تمام جہانوں کو پلک جھپکنے سے پہلے پیدا فرما دیں؟

اس سوال کے جواب میں علامہ ابو حفص عمر بن علی الدمشقی الحنبلی المتوفی ۸۸۰ھ نے اس طرح لکھا ہے کہ:

اہل سنت کے طور پر اس کا جواب اس طرح دیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ جس کام کا بھی ارادہ فرمائیں وہ حسن ہے اور اللہ تعالیٰ کے افعال معلل بالاغراض نہیں ہوتے، نہ اس کے افعال کسی حکمت اور مصلحت پر موقوف ہوتے ہیں۔ نیز اس کی حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کسی کام میں عجلت نہیں کرنی چاہیے بلکہ اطمینان اور تسلی سے تمام کام انجام دینے چاہئیں۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ... (حم السجدۃ: ۵۳)" (عنقریب ہم انہیں اطراف عالم میں اور خود اُن کی جانوں میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ اُن پر ظاہر ہو جائے کہ قرآن حق ہے)۔ اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی جو نشانیاں آفاق اور زمین و آسمان میں تفصیل سے پھیلائی ہوئی ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی وہ تمام نشانیاں خود انسان کے اپنے اندر اجمالاً رکھ دی ہیں، سو جس طرح اللہ تعالیٰ اس کے باوجود کہ وہ تمام آسمانوں اور زمینوں کو ایک لفظ "کُن" سے پیدا فرما سکتے ہیں، لیکن انہوں نے کاموں کی انجام دہی میں اطمینان اور تسلی کو ثابت کرنے کے لیے چھ دنوں میں آسمانوں اور زمینوں کو بنایا، اسی طرح بچہ کی پیدائش اپنی ماں کے پیٹ سے نو ماہ میں ہوتی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہیں کہ وہ ایک دن میں یا ایک سیکنڈ میں ماں کے پیٹ سے بچہ کو نکال دیتے لیکن جس طرح اللہ

تعالیٰ نے چھ دنوں میں آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ماں سے بچہ کو نو ماہ کے بعد پیدا فرمایا، اور ظاہر ہے کہ اگر ایک دن یا ایک سیکنڈ میں بچہ ماں کے پیٹ سے باہر آتا تو اس کی ماں کو شدید تکلیف ہوتی تو نو ماہ کے طویل عرصہ میں اللہ تعالیٰ بچہ کی ماں کو بہ تدریج اس کے حمل کا عادی بناتے رہتے ہیں تاکہ یک لخت بچہ کی پیدائش سے ماں شدید تکلیف سے دو چار نہ ہو، اسی طرح مئی، جون کی گرمی کے بعد بہ تدریج اللہ تعالیٰ سردی کے موسم کو لاتے ہیں، ورنہ شدید گرمی کے بعد اگر یک لخت دسمبر اور جنوری کی شدید سردی پڑ جاتی تو لوگوں کے لیے اس کو برداشت کرنا سخت مصیبت کا باعث ہوتا، اللہ تعالیٰ گرمی کے بعد بہ تدریج سردی کو لاتے ہیں اور سردی کے بعد بہ تدریج گرمی کو لاتے ہیں، نہ سردی کے بعد اچانک گرمی کو لاتے ہیں اور نہ گرمی کے بعد اچانک سردی کو لاتے ہیں، اور تدریجاً ایک موسم کو دوسرے موسم کی طرف منتقل فرماتے ہیں، حالانکہ اس کی قدرت میں یہ ہے کہ وہ یک لخت گرمی کے بعد سردی کو اور سردی کے بعد گرمی کو لے آئیں، لیکن جس طرح اللہ تعالیٰ نے چھ ایام میں آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا اور اسی طرح نظامِ کائنات میں تدریج کا تسلسل ہے مثلاً بیج بونے کے بعد فوراً درخت نہیں بن جاتا اور اسی طرح مظاہر کائنات میں اللہ تعالیٰ نے تدریج کے عمل کو جاری و ساری رکھا ہے اور تدریج کے اس نظام کو اللہ تعالیٰ نے مخلوق میں بھی جاری فرمایا ہے، بچہ پیدا ہونے کے بعد فوراً جوان نہیں ہوتا اور جوان ہونے کے بعد فوراً بوڑھا نہیں ہوتا، نہ اسی طرح عموماً اچانک انسان کی موت ہوتی ہے بلکہ بہ تدریج وہ بیماریوں میں مبتلاء ہوتا ہے اور تکالیف برداشت کرنے کا عادی ہوتا ہے حتیٰ کہ ایک وقت میں اس پر موت آجاتی ہے، سو اللہ تعالیٰ نے چھ ایام میں اس کائنات کو پیدا فرمانے کے عمل کو اپنی مخلوق میں بھی ظاہر فرمایا۔ (سعیدی غفرلہٗ)

اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کا محمل

"ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ": ابن الخطیب نے کہا: اس آیت کو اپنے ظاہر پر محمول کرنا ممکن نہیں ہے، کیونکہ عرش پر استویٰ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر مستقر ہوں، اس حیثیت سے کہ اگر عرش نہ ہوتا تو معاذ اللہ، اللہ تعالیٰ اس سے گر جاتے۔ اور اس سے لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے استقرار میں عرش کے محتاج ہوں، اور اگر عرش نہ ہو تو اللہ تعالیٰ ساقط ہو جائیں اور یہ محال ہے، کیونکہ مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی عرش کو ٹھہرانے والے ہیں اور اس کی حفاظت فرمانے والے ہیں۔

جمہور مفسرین نے کہا ہے: عرش سے یہاں پر مراد یہ ہے کہ وہ بہت بڑا جسم ہے اور اس کو آسمانوں اور زمینوں کے پیدا فرمانے سے پہلے پیدا فرمایا گیا تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَّ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ۔۔۔ (ہود: ۷)" (اور اللہ عزوجل کا عرش پانی پر تھا) اللہ تعالیٰ نے یہ اس لیے ذکر فرمایا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے بیان میں بہت تعجب خیز ہے، کیونکہ بنانے والا کسی چیز کو زمین پر بناتے وقت پانی سے دور رہتا ہے، تاکہ اس کی بناء منہدم نہ ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو پانی پر بنایا تاکہ اہلِ عقل اس کی قدرت کے کمال کو پہچانیں، پس عرش پر استویٰ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے قہر کے ساتھ عرش پر غالب ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَالَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَ الْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ۝ لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَیْتُمْ عَلَیْهِ وَ تَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ۝ (الزخرف: ۱۲۔۱۳)" (اور جس نے تمام جوڑے بنائے اور تمہارے لئے کشتیوں اور چوپایوں سے سواریاں بنائیں ۝ تاکہ تم سواری کی پشت پر سیدھے بیٹھ سکو، پھر جب سیدھے بیٹھ جاؤ تو اپنے رب کی نعمت کو یاد کرو اور کہو: "وہ ذات ہر عیب اور نقص سے پاک ہے

جس نے اس سواری کو ہمارے تابع فرما دیا، حالانکہ ہم (از خود) اسے تابع کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے O۔

سو اس آیت کو بھی اسی معنی پر محمول کیا جائے گا اور اس کو اس عرش پر محمول کرنا جائز نہیں ہے جو آسمان میں ہے، کیونکہ صانع کے وجود پر استدلال کرنا اس چیز کے ساتھ ضروری ہے جو معلوم اور مشاہد ہو۔ اور جو عرش آسمانوں میں ہے وہ معلوم اور مشاہد نہیں ہے اور آسمانوں اور زمینوں کے اجسام مشاہد اور محسوس ہیں، پس اُن کے احوال سے صانع کے وجود پر استدلال کرنا نہایت عمدہ ہے۔

''یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ'': اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ عزوجل تمام معاملات کی اپنی حکمت کے تقاضا سے تدبیر فرماتے ہیں۔

''مَا مِنۡ شَفِیۡعٍ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اِذۡنِهٖ'': یعنی وہ تمام چیزوں کی از خود تدبیر فرماتے ہیں، کسی شفاعت کرنے والے کی شفاعت سے تدبیر نہیں فرماتے۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ سفارش کرنے والے اس کے اذن سے ہی سفارش کرتے ہیں۔

''ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمۡ فَاعۡبُدُوۡهُ'': اس آیت میں یہ بیان فرمایا ہے کہ عبادت صرف اللہ عزوجل ہی کی کی جانی چاہیے اور وہی تمام عبادات کے مستحق ہیں، کیونکہ وہی تمام نعمتوں کا انعام فرمانے والے ہیں۔

''اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ'': اس میں یہ دلیل ہے کہ ان دلائل قاہرہ، ظاہرہ پر غور و فکر کرنا لازم ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''تم سب نے ان ہی کی طرف لوٹ کر حاضر ہونا ہے، یہ اللہ کا برحق وعدہ ہے، بے شک وہی مخلوق کو پہلی بار پیدا فرماتے ہیں، پھر وہی دوبارہ مخلوق کو پیدا فرمائیں گے تاکہ اُن لوگوں کو عدل کے ساتھ جزا عطا فرمائیں جو ایمان لا چکے ہیں اور انہوں نے نیک اعمال کیے ہیں، اور جن لوگوں نے کفر کو اختیار کیا اُن کے پینے کے لیے کھولتا ہوا گرم پانی ہے اور دردناک عذاب ہے کیونکہ وہ کفر کرتے تھے O'' (یونس: ۴)

اس اعتراض کا جواب کہ اس آیت سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنین صالحین کو اجر و ثواب عطا فرمانے کے لیے پیدا فرمایا ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کے افعال کا معلل بالاغراض ہونا لازم ہوتا ہے

''اِلَیۡهِ مَرۡجِعُكُمۡ جَمِیۡعًا ؕ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ یَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُهٗ لِیَجۡزِیَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالۡقِسۡطِ'': اس آیت کا اصل معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابتداءً مخلوق کو پیدا فرمایا حتیٰ کہ ان کو اپنی عبادت کرنے کا حکم فرمایا، پھر وہ ان پر موت طاری فرمائیں گے، پھر اُن کو زندہ فرمائیں گے، اور یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کو دوبارہ پیدا فرمائیں گے۔ اور دوبارہ پیدا فرمانا اس وقت ہوگا کہ جب پہلے تمام مخلوقات کو معدوم کر دیا جائے ورنہ لازم آئے گا کہ موجود کو موجود کیا جائے اور یہ محال ہے۔

''وَالَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا لَهُمۡ شَرَابٌ مِّنۡ حَمِیۡمٍ وَّعَذَابٌ اَلِیۡمٌۢ بِمَا كَانُوۡا یَكۡفُرُوۡنَ'': یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو رحم فرمانے کے لیے پیدا فرمایا ہے اور اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن سے کفر کا ارادہ نہیں فرمایا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے افعال معلل بالاغراض نہیں ہوتے، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کسی فعل کو کسی علت کی وجہ سے پیدا فرمائیں، پس اگر وہ علت قدیم ہو تو فعل کا قدیم ہونا لازم آئے گا اور اگر وہ علت حادث ہو تو اس سے تسلسل لازم آئے گا اور وہ محال ہے۔

مومنین کے اجر کی عدل کے ساتھ تخصیص فرمانے کی توجیہ

اگر یہ سوال کیا جائے کہ مومنین کے اجر کو عدل کے ساتھ کیوں مخصوص فرمایا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کفار کو جو سزا دیں گے وہ بھی عدل کے ساتھ دیں گے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مومنین کے اجر وثواب کو عدل کے ساتھ اس لئے خاص فرمایا تا کہ یہ تخصیص اس پر دلالت کرے کہ مومنین پر اللہ تعالیٰ نے زیادہ احسان فرمایا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس آیت کا معنی یہ ہے تا کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو اُن کے عدل کے سبب سے جزا عطا فرمائیں کیونکہ انہوں نے اپنی جانوں پر عدل کیا اور اپنی جانوں پر ظلم نہیں کیا، کیونکہ وہ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے اور شرک سے بچے رہے، کیونکہ شرک بہت بڑا ظلم ہے، اور نافرمانوں نے بھی اپنی جانوں پر ظلم کیا اور مومنین صالحین نے اپنی جانوں پر عدل کیا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”اللہ ہی ہیں جنہوں نے سورج کو روشن بنایا اور چاند کو منور بنایا، اور چاند کے لیے منزلیں مقرر فرمائیں تا کہ تم سالوں کی گنتی اور ان کے حساب کو جان لو، اللہ نے اِن سب چیزوں کو صرف حق کے ساتھ پیدا فرمایا ہے، وہ غور وفکر کرنے والے لوگوں کے لیے اپنی آیتوں کو تفصیل کے ساتھ بیان فرماتے ہیں O“ (یونس:۵)

”هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ“:

جب اللہ تعالیٰ نے اپنی الوہیت پر دلائل ذکر فرمائے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا، پھر اس پر متفرع فرمایا کہ ان سب کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ فرمایا جائے گا، تو اس کے بعد پھر دلائلِ الوہیت کا ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند کو پیدا فرمایا، اور اس میں حشر اور نشر کی دلیل کی تاکید ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل محض سے اطاعت گزاروں کو ثواب عطا فرماتے ہیں اور اپنے عدل محض سے نافرمانوں کو عذاب دیتے ہیں تا کہ نیکوکار اور بدکار کے درمیان تمیز ہو۔

پھر اس آیت میں ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سورج کو روشن بنایا اور چاند کو منور بنایا اور اس کی منازل مقدر فرما دیں تا کہ مکلفین اس سے سالوں اور حساب کی معرفت حاصل کریں، اور اسی کے اوپر اپنی معاش، زراعت، کھیتی باڑی اور باغبانی کے حساب کو مرتب کریں اور اسی سے سردی اور گرمی کے موسم کو پہچانیں، پس گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نیکوکار کو بدکار سے ممتیز کرنا اس سے زیادہ اولیٰ ہے کہ لوگوں کو سالوں اور مہینوں کے احوال کا علم ہو۔ پس جب اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ سورج اور چاند کی وجہ سے لوگوں کو سالوں اور مہینوں کے احوال کا علم ہو تو معلوم ہوا کہ اس کی حکمت اور رحمت اس کا تقاضا کرتی ہے کہ نیکوکار کو بدکار سے موت کے بعد ممتیز کیا جائے، کیونکہ موت کے بعد نیکوکار کو دائمی نفع حاصل ہوتا ہے اور سعادتِ سرمدیہ حاصل ہوتی ہے، اس وجہ سے یہاں پر مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے پر دلائل دینا اولیٰ ہیں۔

سورج کے ذکر میں اللہ تعالیٰ نے ”ضیاء“ کا ذکر فرمایا، کیونکہ ”ضوء“ نور سے زیادہ قوی ہے۔

سورج دن کا سلطان ہے اور چاند رات کا سلطان ہے اور سورج کی حرکت سے خزاں اور بہار کا تحقق ہوتا ہے اور چاند کی حرکت

سے مہینوں کا تعین ہوتا ہے، اور ہر روز کی حرکت سے دن اور رات کا تحقق ہوتا ہے، پس دن کا وقت کسب کرنے کے لیے اور رات کا وقت راحت اور آرام کے لیے ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر بہ کثرت رحمت اور بہت زیادہ توجہ فرمانے کی دلیل ہے۔

''مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ'':

اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنی توحید اور الوہیت پر آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق سے استدلال فرمایا، پھر سورج اور چاند کے احوال سے استدلال فرمایا، پھر اس سے استدلال فرمایا کہ یہ منافع دن اور رات کے اختلاف سے حاصل ہوتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''بے شک رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آنے میں اور ہر اُس چیز میں جس کو اللہ نے آسمانوں اور زمینوں میں پیدا فرمایا ہے ضرور اُن لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو اللہ سے ڈرتے رہتے ہیںO'' (التوبہ:۶)

حوادثِ روزگار کی چار قسمیں

''اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ'': اس عالم کے حوادث کی چار قسمیں ہیں:

(۱) وہ احوال جو عناصر اربعہ میں حاصل ہوتے ہیں، ان میں رات، برق، بادل، بارش اور برف باری کے احوال ہیں اور انہی میں سمندروں کے احوال ہیں اور سمندر کے مدوجزر کے احوال ہیں، اور بجلی کے کڑکنے، زلزلوں کے آنے اور زمین کے دھنسنے کے احوال ہیں۔

(۲) معادن کے احوال ہیں اور یہ بہت عجیب اور بہت کثیر ہیں۔

(۳) نباتات کے اختلاف کے احوال ہیں، کیونکہ بعض مہینوں میں گرمیوں کے پھل پیدا ہوتے ہیں اور بعض دوسرے مہینوں میں سردیوں کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔

(۴) حیوانات کے اختلاف کے احوال ہیں، کیونکہ بعض حیوانات صرف زمین کی نباتات کو چرنے والے ہیں اور بعض حیوانات درندے ہیں اور وہ بعض دوسرے حیوانات کو چیر پھاڑ کر اپنا پیٹ بھرتے ہیں، اور یہ سب اس آیت میں مندرج ہیں: ''وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ''۔

''لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ'': اس آیت پر یہ سوال ہوتا ہے کہ ان نشانیوں کو اللہ سے ڈرنے والوں کے ساتھ کیوں خاص فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کیونکہ یہی لوگ آخرت کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''بے شک جو لوگ ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے اور وہ دنیا کی زندگی سے راضی ہوگئے اور انہوں نے اسی پر قناعت کر لی اور وہ لوگ جو ہماری آیتوں سے غفلت میں پڑے ہوئے ہیںO'' (یونس:۷)

''اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ اطْمَاَنُّوْا بِهَا وَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ'':

جب اللہ تعالیٰ نے اپنی الوہیت اور توحید پر مضبوط دلائل بیان فرما دیئے اور حشر ونشر پر بھی قوی دلائل بیان فرما دیئے، تو اس کے بعد اُن لوگوں کے احوال ذکر فرمائے کہ جو اس کا کفر کرتے ہیں اور جو اس پر ایمان لاتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اس کا کفر کرتے ہیں اُن کا ذکر اس آیت میں چار صفات کے ساتھ مذکور ہے:

کفار اور منکرین کی چار وہ صفات جن سے وہ مومنین سے متمیز ہیں

(۱) پہلی صفت ہے: ''اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا'': حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مقاتل اور کلبی نے کہا: اس کا معنی یہ ہے کہ جو لوگ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے سے نہیں ڈرتے کیونکہ وہ اس پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور امید اور خوف کا تعلق اسی کے ساتھ ہوتا ہے جو مرنے کے بعد زندہ کیے جانے پر ایمان رکھے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا ﴿۴۵﴾ (النازعات: ۴۵)'' (اے رسول اکرم!) آپ صرف اس شخص کو (روزِ قیامت کی ہولناکی سے) ڈرانے والے ہیں جو اس دن سے ڈرتا ہے O۔

(۲) دوسری صفت ہے: ''وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا''، اس میں یہ بتایا ہے کہ کفار اور منکرینِ حشر چونکہ دنیاوی لذات کی طلب میں مستغرق ہیں، اس لیے وہ صرف دنیا کی زندگی پر مطمئن ہیں۔

(۳) تیسری صفت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا'' یعنی انہوں نے دنیا کی محبت پر قناعت کرلی اور اس کی لذات کے حصول میں منہمک اور مشغول ہوگئے، لہٰذا اُن کے دلوں سے قیامت کا اور عذابِ الٰہی کا خوف زائل ہوگیا۔ اور جب یہ لوگ اُن آیتوں کو سنتے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے تو ان کے دل خوف زدہ نہیں ہوتے، سو یہ لوگ مردوں کی طرح ہیں اور ان لوگوں کا حال نیکوکاروں کے حال کے برخلاف ہے، کیونکہ نیکوکار جب اللہ تعالیٰ کی وعید کو سنتے ہیں تو اُن کے دل خوف زدہ ہوجاتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۲﴾ (الانفال: ۲)'' (مومن صرف وہی ہیں کہ جب اُن کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو اُن کے دل خوف زدہ ہوجائیں اور جب اُن کے سامنے اللہ کی آیات کی تلاوت کی جائے تو اُن کا ایمان زیادہ ہوجائے اور وہ صرف اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں O)۔

(۴) چوتھی صفت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ''، یعنی ان کفار کی صفت یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی امید نہیں رکھتے اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات سے غافل ہیں اور اُن سے اعراض کرتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''یہی وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ کی آگ ہے اُن برے کرتوتوں کی وجہ سے جن کا وہ ارتکاب کیا کرتے تھے O'' (یونس: ۸)

''اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ'': یہی وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ کی آگ ہے اُن برے کرتوتوں کی وجہ سے جن کا وہ ارتکاب کیا کرتے تھے۔

اس آیت میں ''باء'' سببیہ ہے اور ''ما'' مصدریہ ہے اور اس میں یہ دلیل ہے کہ یہ لوگ ہر زمانہ میں اسی حال پر مستمر رہے تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "بے شک جو لوگ ایمان لا چکے ہیں اور انہوں نے نیک کام کئے ہیں، اُن کے رب اُن کے ایمان کی وجہ سے انہیں اخروی ترقی کے درجات کی طرف رہنمائی فرمائیں گے، دائمی جنتوں میں جن کے نیچے سے دریا بہہ رہے ہوں گے O" (یونس:۹)

مومنین صالحین کے اُخروی درجات

" اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یَهْدِیْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِیْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ":
اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے احوال بیان فرمائے تھے، اب اُس کے بعد مومنین کے احوال بیان فرمائے یعنی جن لوگوں نے اپنے دلوں سے اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور اس کی توحید کی تصدیق کی، پھر نیک عمل کر کے اپنی تصدیق کو ظاہر کیا، پس اللہ تعالیٰ نے ان کی کرامات کے درجات کا ذکر فرمایا، لہٰذا ارشاد فرمایا: " یَهْدِیْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِیْمَانِهِمْ " یعنی اللہ تعالیٰ ان مومنین کی جنت کی طرف رہنمائی فرمائیں گے، ان کے اللہ پر ایمان اور ان کے اعمالِ صالحہ کی وجہ سے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
" یَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ یَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَبِاَیْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْیَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ۚ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝ (الحدید:۱۲)" ((اے رسولِ اکرم!) جس دن آپ دیکھیں گے کہ ایماندار مردوں اور عورتوں کا نور ان کے آگے اور ان کی دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا، ان سے کہا جائے گا: "آج تمہارے لئے سب سے زیادہ باعثِ مسرت وہ جنتیں ہیں جن کے نیچے دریا جاری ہیں، تم ان میں ہمیشہ رہنے والے ہو گے، یہی بڑی کامیابی ہے O")۔

قبر میں مومنین کے نیک اعمال کا حسین صورتوں میں متشکل ہونا اور کفار کے برے کاموں کا قبیح صورتوں میں متشکل ہونا

امام محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ، لکھتے ہیں:
ہمیں یہ حدیث پہنچی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک جب مومن اپنی قبر سے نکلے گا تو اس کے نیک اعمال حسین صورتوں اور خوشبودار چہروں میں دکھائی دیں گے، مومن پوچھے گا: تم لوگ کون ہو؟ بے شک میں تم کو ضرور سچا مرد گمان کرتا ہوں تو وہ حسین صورتیں کہیں گی: میں تمہارا نیک عمل ہوں، پس وہ نیک عمل اس کے لیے نور ہوگا اور جنت کی طرف رہنمائی کرنے والا ہوگا، اور رہا کافر! جب وہ اپنی قبر سے نکلے گا تو اس کے برے اعمال بری اور قبیح اور بدبودار صورتوں میں ظاہر ہوں گے، پس وہ کہے گا: تم لوگ کون ہو؟ پس اللہ کی قسم! میں تم کو بہت برا مرد گمان کرتا ہوں، تو وہ بری صورتیں کہیں گی: میں تمہارا عمل ہوں۔ پس وہ بری صورتیں اس کو لے کر چلیں گی حتیٰ کہ اس کو دوزخ میں داخل کر دیں گی۔
(تفسیر الطبری ج ۱۲ ص ۱۲۳ ـ ۱۲۴، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۲۳ھ، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۹۲۹، نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ ۱۴۱۷ھ، تفسیر مجاہد ص:۳۷۹)

حافظ ابو الفداء اسماعیل بن کثیر القرشی الدمشقی المتوفی ۷۷۴ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:
ابن جریج نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ مومن جب قبر سے اٹھے گا تو اس کا عمل حسین اور خوشبودار صورت میں متشکل کیا

جائے گا اور اس کو ہر خیر کی بشارت دے گا، پس مومن اس سے پوچھے گا: تم کون ہو؟ تو وہ کہے گا: میں تمہارا نیک عمل ہوں، پس اس نیک عمل کو اس کے سامنے نور بنا دیا جائے گا حتیٰ کہ وہ اس کو جنت میں داخل کر دے گا، اور کافر کے لیے اس کا عمل قبیح اور بدبودار صورت میں متشکل کیا جائے گا اور وہ اس کو دوزخ میں داخل کر دے گا۔ اس حدیث کی قتادہ نے مرسلاً روایت کی ہے۔

(تفسیر القرآن العظیم ص ۹۱۳، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۳۲ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اُن جنتوں میں اُن کی دعا یہ ہوگی: ''اے اللہ! آپ ہر نقص اور عیب سے پاک ہیں'' اور باہم ملاقات کے وقت وہ یہ کہیں گے: ''تم سلامت رہو'' اور اُن کی آخری دعا یہ ہوگی: ''تمام تعریفیں اللہ رب العالمین کے لیے ہیں''O (یونس: ۱۰)

''دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'':

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اہلِ جنت دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی ہر عیب اور نقص سے براءت کو بیان کریں گے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اہلِ جنت کا یہ ذکر اس بات کی علامت ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اُن کو اُن کی پسندیدہ چیزیں عطا فرمائیں گے۔ (اللباب فی علوم الکتاب، ج ۱۰ ص ۲۵۱ - ۲۷۳، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۱۱ء)

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ۭ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱﴾

اور اگر اللہ لوگوں پر عذاب نازل فرمانے میں اس طرح عجلت فرماتے جس طرح وہ بھلائی کو جلد طلب کرتے ہیں تو اب تک اُن کی مدتِ حیات پوری ہو چکی ہوتی، سو جو لوگ ہم سے ملاقات کی امید نہیں رکھتے، ہم اُن کو اُن کی اختیار کردہ سرکشی میں چھوڑے رکھتے ہیں تاکہ وہ اپنی سرکشی میں حیران و سرگشتہ رہیں O

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ۭ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲﴾

اور جب انسان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اس مصیبت کو ٹالنے کے لیے ہم سے کروٹ کے بل لیٹے ہوئے یا بیٹھے ہوئے یا کھڑے ہوئے دعا کرتا ہے، پھر جب ہم اس کی مصیبت کو اس سے دور فرما دیتے ہیں تو وہ ہمیں فراموش کر کے اس طرح چلا جاتا ہے گویا اس نے کبھی کسی مصیبت کے پہنچنے پر ہم سے اس مصیبت کو دور کرنے کی دعا ہی نہیں کی تھی، اسی طرح حد سے تجاوز کرنے والے لوگوں کے برے اعمال ان کے لیے خوشنما بنا دیے جاتے ہیں O

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۳﴾

اے کافرو! اللہ کی قسم! ہم نے تم سے پہلے بہت سے کافروں کو ہلاک فرما دیا تھا جب انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، حالانکہ اُن کے پاس ان کے رسول واضح دلائل پیش کر چکے تھے اور وہ کافر ایمان کو اختیار کرنے والے ہی نہ تھے، ہم اسی طرح مجرموں کو سزا فرماتے ہیں ۝

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝

پھر ہم نے اُن کے بعد تم کو زمین میں اُن لوگوں کا جانشین بنایا تاکہ ہم یہ ظاہر فرمائیں کہ اب تم کس طرح کے عمل کرتے ہو ۝

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝

اور جب ان مشرکین کے سامنے ہماری روشن آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے تو جو لوگ ہماری بارگاہ میں حاضر ہونے کی امید نہیں رکھتے تھے وہ کہتے ہیں: "(اے اللہ کے رسول!) آپ اس قرآن کے سوا کوئی دوسرا قرآن پیش کریں یا اسی میں تبدیلی کر دیں"، (اے رسولِ اکرم!) آپ کہیے: میرے اختیار میں یہ نہیں ہے کہ میں اپنی طرف سے اس قرآن میں کوئی تبدیلی کردوں، میں صرف اُسی وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف نازل فرمائی جاتی ہے، میں اس سے ڈرتا رہتا ہوں کہ اگر (بالفرض) میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو مجھے بہت بڑے دن کا عذاب پہنچے گا ۝

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

آپ کہیے: "اگر اللہ چاہتے تو نہ میں تمہارے سامنے اس قرآن کی تلاوت کرتا اور نہ اللہ ہی تمہیں اس قرآن سے واقف فرماتے، آخر میں اس نزولِ قرآن سے پہلے تمہارے سامنے زندگی کا ایک حصہ گزار چکا ہوں، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے ۝

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝

سو اُس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹا بہتان باندھے یا اُس کی آیتوں کو جھٹلائے، بے شک مجرم لوگ کبھی کامیاب نہیں ہوں گے ۝

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ؕ

سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۱۸﴾

مشرکین اللہ کو چھوڑ کر ان بتوں کی عبادت کرتے ہیں جو بت اُن کو نہ کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ کوئی نفع مہیا کر سکتے ہیں، اور وہ مشرکین یہ زعم کرتے ہیں: ''یہ بت اللہ کے حضور ہماری سفارش کرنے والے ہیں''، آپ کہیے: کیا تم اللہ کو ایسی خبر دیتے ہو جس کا علم اللہ کو نہ آسمانوں میں ہے اور نہ زمینوں میں ہے، وہ ان خبروں سے بلند اور برتر ہیں اور اُن بتوں سے پاک ہیں جن کو یہ مشرکین اللہ کا شریک قرار دیتے ہیں O

وَ مَا كَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِیَ بَیْنَهُمْ فِیْمَا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۹﴾

ابتداء میں تمام لوگ ایک ہی دین پر قائم تھے، پھر انہوں نے مختلف ادیان اختیار کر لیے، اور اگر آپ کے رب نے پہلے سے ہی مقدر نہ فرمایا ہوتا تو ان کے ادیان میں اختلاف کا اسی دنیا میں فیصلہ فرما دیا جاتا O

وَ یَقُوْلُوْنَ لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَیْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ ﴿۲۰﴾

اور کفار یہ بھی کہتے ہیں کہ ''رسول اللہ کی صداقت پر اُن کے رب کی طرف سے کوئی معجزہ کیوں نہیں نازل فرمایا گیا؟''، (اے رسول اکرم!) آپ کہیے: غیب کا مستقل علم تو صرف اللہ ہی کو ہے، پس تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور اگر اللہ لوگوں پر عذاب نازل فرمانے میں اس طرح عجلت فرماتے جس طرح وہ بھلائی کو جلد طلب کرتے ہیں تو اب تک اُن کی مدتِ حیات پوری ہو چکی ہوتی، سو جو لوگ ہم سے ملاقات کی امید نہیں رکھتے، ہم اُن کو اُن کی اختیار کردہ سرکشی میں چھوڑے رکھتے ہیں تا کہ وہ اپنی سرکشی میں حیران و سرگشتہ رہیں O'' (یونس: ۱۱)

علامہ ابو الفرج عبد الرحمٰن بن علی بن الجوزی الحنبلی المتوفی ۵۹۷ھ، یونس: ۱۱ تا ۲۰ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وَ لَوْ یُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَیْرِ لَقُضِیَ اِلَیْهِمْ اَجَلُهُمْ ؕ فَنَذَرُ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ'': بعض مفسرین نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت النضر بن الحارث کے متعلق نازل ہوئی جب اس نے کہا تھا: ''اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۳۲﴾ (الانفال: ۳۲)'' (اے اللہ! اگر یہ (قرآن) آپ کی طرف سے برحق ہے تو آپ ہم پر آسمان سے پتھر برسائیں یا ہم پر دردناک عذاب بھیج دیں)۔

اس آیت میں فرمایا ہے: ''وَ لَوْ یُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ'' اور تعجیل کا معنی ہے: کسی چیز کو اس کے مقررہ وقت سے پہلے

نافذ کر دیتا، اس آیت کی تفسیر میں دو قول ہیں:

(١) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور قتادہ نے کہا: جب لوگ غصہ میں آ کر اپنے خلاف یا اپنے گھر والوں کے خلاف کسی مصیبت کے نزول کی دعا کرتے ہیں اور اس دعا کے قبول ہونے میں اس طرح جلدی کرتے ہیں جس طرح اُن کے خیر کے لیے کی ہوئی دعا کے قبول ہونے میں جلدی کی جاتی ہے تو یہ تمام لوگ ہلاک ہو جاتے۔

(٢) الماوردی الشافعی المتوفی ٤٥٠ھ نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے: اگر اللہ عزوجل کافروں پر اُن کے اختیار کردہ کفر پر عذاب دینے میں اس طرح عجلت فرماتے جس طرح دنیا میں اُن کے مال اور اولاد میں افزائش کی دعا کو قبول کرنے میں عجلت فرمائی ہے تو اُن کی مدتِ حیات بہت جلد پوری فرما دی جاتی تا کہ انہیں آخرت کا عذاب جلد پہنچے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا کرتے ہوئے سنا ہے: "اے اللہ! میں نے جس مومن کو بھی برا کہا ہو تو وہ اس کے لیے قیامت تک اپنے قرب کا ذریعہ بنا دیں"۔

(صحیح البخاری: ٦٣٦١، صحیح مسلم: ٢٦٠١، شرح مشکل الآثار: ٦٠٠٨، المعجم الاوسط للطبرانی: ٨٧٧٥، السنن الکبریٰ للبیہقی: ١٣٣٧٩، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشرۃ ج ١ ص ٣٣١، سنن داری: ٢٧٦٥)

(موسوعۃ المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی الشریف، ج ١١ ص ٣٦٠، دار المعرفہ بیروت، ١٤٣٣ھ)

<u>حدیث مذکور کے ثبوت میں دیگر احادیث</u>

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کے پاس ایک یتیم لڑکی تھی اور اس حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں بشر ہوں، اس طرح راضی ہوتا ہوں جس طرح بشر راضی ہوتا ہے اور اس طرح ناراض ہوتا ہوں، جس طرح بشر ناراض ہوتا ہے، پس میں اپنی امت میں سے جس شخص کے خلاف کوئی ایسی دعا کروں کہ وہ اس دعا کا اہل نہ ہو تو "اے اللہ! اس کے لیے اس دعا کو طہارت اور زکوٰۃ اور قرب کا ذریعہ بنا دیں، جس سے وہ قیامت تک قرب حاصل کرتا رہے"۔

(صحیح مسلم: ٢٦٠٣، الرقم المسلسل: ٦٥٧٠، رقم حدیث الباب: ٩٥، مسند احمد: ١٣٣٣٢، مسند البزار: ٦٣٣٢، شرح مشکل الآثار: ٦٠٠٥، صحیح ابن حبان: ٦٥١٣، جامع العلوم والحکم ج ١ ص ٣٧٣، الجامع الصحیح للسنن والمسانید: ج ٢ ص ٥٢، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشرۃ ج ١ ص ٣٣٣)

علامہ بدر الدین ابو محمد محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ٨٥٥ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

اس پر یہ سوال کیا گیا ہے کہ جب آپ کی اس دعا پر کوئی اثر مرتب نہیں ہو گا تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ دعا اس بندہ کے لیے رحمت بنا دی جائے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خُلقِ کریم میں سے ایک خُلق ہے اور آپ کے کرمِ عمیم میں سے ایک کرم ہے۔ کیونکہ آپ نے یہ ارادہ فرمایا کہ آپ سے جو بھی ایسی چیز واقع ہو اس کو خیر اور کار آمد بنا دیا جائے اور بے شک نبی صلی اللہ علیہ وسلم خُلقِ عظیم پر فائز ہیں۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "میں صرف ایک بشر ہوں اور میں نے اپنے رب سے یہ شرط کی ہے کہ میں جس مسلمان کو بھی برا کہوں یا اس کے خلاف دعا کروں تو میری اس دعا کو اس کے لیے طہارت اور اجر بنا دیں"۔ (صحیح مسلم: ٢٦٠٢، الرقم المسلسل: ٦٥٦٨، رقم حدیث الباب: ٩٣)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی کے خلاف دعا کرنے کی توجیہات

علامہ ابی حفص عمر بن علی بن احمد الانصاری الشافعی المعروف بہ ابن ملقن متوفی ٨٠٤ھ، صحیح البخاری: ٦٣٦١ کی شرح میں لکھتے ہیں:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو برا نہیں فرماتے تھے اور نہ کسی کو ظلماً ایذاء پہنچاتے تھے اور آپ کی شریعت میں اس کو واجب فرما دیا گیا ہے۔ اور آپ اپنے نفس کا انتقام نہیں لیتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی فطرت میں عفو اور کرم کو رکھا ہے۔ اور صحیح البخاری کی باب مذکور کی حدیث کا معنی یہ ہے کہ جس کو آپ نے برا کہا ہو اس کے دل میں اُنس پیدا فرمایا جائے تا کہ اس کے اوپر شیطان غالب ہو کر اس کو مایوس نہ کر دے اور اس کے دل میں یہ وسوسہ نہ ڈالے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کے خلاف دعا کی وجہ سے اسے عنقریب کوئی ضرر ہوگا، کیونکہ آپ کی دعا قبول فرمائی جاتی ہے، تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کیا کہ آپ مومنین کے خلاف جو دعا کریں اس کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے قرب کا ذریعہ بنا دیں اور اس کو پاکیزگی اور رحمت بنا دیں اور اس دعا کو اس کے لیے سزا نہ بنائیں اور عذاب نہ بنائیں۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بطور تادیب کسی کو برا کہتے تھے اور حد سے تجاوز نہیں فرماتے تھے۔ اور کیونکہ آپ کی دعا قبول فرمائی جاتی ہے، اس لیے آپ نے اس کے عوض میں یہ دعا کی کہ اگر آپ کسی کے خلاف دعا کریں تو اللہ تعالیٰ اس شخص کے لیے آپ کی دعا کو رحمت بنا دیں۔

(التوضیح لشرح الجامع الصحیح ج ٢٩ ص ٢٩٥، ملخصاً وملتقطاً، وزارۃ الاوقاف والشؤون الاسلامیہ قطر، ١٤٢٩ھ)

حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی شافعی متوفی ٨٥٢ھ، صحیح البخاری: ٦٣٦١ کی شرح میں لکھتے ہیں:

علامہ المازری نے کہا ہے: اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے خلاف دعا کیسے کریں گے جو آپ کی دعائے ضرر کا مستحق نہ ہو۔

اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا کہ وہ اس دعا کا اہل یا مستحق نہ ہو اس کا معنی یہ ہے کہ اے اللہ! آپ کے نزدیک باطن امر میں وہ اس دعائے ضرر کا مستحق نہ ہو نہ کہ ظاہر حال کے اعتبار سے اور ظاہری جرم کے اعتبار سے جب میں نے اس کے خلاف دعا کی، پس گویا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں دعا کی کہ جس مسلمان کا باطنی امر آپ کے نزدیک اس قبیل سے ہو کہ آپ اس سے راضی ہوں تو اس کے خلاف میری اس دعا کو جو میں نے ظاہر حال کے تقاضے سے کی ہے اس کو اس مسلمان کے لیے طہارت اور رحمت بنا دیں۔ علامہ المازری نے کہا کہ یہ معنی صحیح ہے اور اس میں کوئی خرابی نہیں ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر حال کے اعتبار سے عبادت کرتے تھے اور باطن امر میں لوگوں کا جو حساب ہے اسے اللہ پر چھوڑ دیتے تھے۔

یہ جواب ان علماء کے قول پر مبنی ہے جو کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم احکام میں اجتہاد فرماتے تھے اور آپ اپنے اجتہاد کے اعتبار سے جو فیصلہ فرماتے اس پر عمل کرتے تھے، لیکن جو علماء یہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف وحی کے مطابق حکم دیتے تھے ان کے قول کی تقدیر پر یہ جواب نہیں بن سکتا۔

پھر علامہ المازری نے کہا: اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کا کیا معنی ہے کہ میں اس طرح ناراض ہوتا ہوں جس طرح بشر ناراض ہوتا ہے، کیونکہ اس قول سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اس کے خلاف دعا کی، وہ جوش غضب کے

تقاضے کی نہ کہ شرعی تقاضے کی۔ پھر دوبارہ سوال لوٹ آئے گا۔

پھر اس کا جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ آپ کا ارادہ یہ ہو کہ آپ نے جس کے خلاف دعا کی یا جس کو آپ نے برا کہا یا کوڑا مارا تو آپ کو یہ اختیار عطا فرمایا گیا تھا کہ آپ اس کے خلاف دعا کریں یا جرم کرنے والے کو سزا دیں یا سزا کو ترک کر دیں۔ پس آپ کا غضب اللہ تعالیٰ کے لیے تھا جس نے آپ کو اس پر لعنت کرنے پر برانگیختہ کیا یا کوڑے مارنے پر، اور یہ شریعت سے خارج نہیں ہے۔

علامہ المازری نے تیسرا جواب یہ دیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خطرہ ہوا کہ کہیں آپ نے اللہ تعالیٰ کی حدود سے تجاوز نہ کیا ہو اور آپ کا جو اس شخص پر غضب تھا اس نے جرم کرنے والے کو زیادہ سزا دینے پر نہ برانگیختہ کیا ہو، یا آپ کو یہ خطرہ تھا کہ آپ کے غضب نے جرم کرنے والے کو تھوڑی سی زیادہ سزا دینے پر برانگیختہ کیا ہو اور آپ کا یہ فعل خلاف اولیٰ ہوگا۔

علامہ المازری نے چوتھا جواب یہ دیا ہے کہ آپ نے جس پر لعنت کی یا جس کو برا کہا یہ بلاقصد کیا۔ اور یہ اس طرح نہیں ہے کہ آپ نے کسی پر لعنت کی ہو اور اللہ تعالیٰ سے اس لعنت کے قبول فرمانے کی دعا کی ہو۔

قاضی عیاض نے اس آخری احتمال کو ترجیح دی ہے، انہوں نے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کو برا کہا یا دعا کی وہ مقصود نہیں تھا اور نہ آپ کی نیت تھی، لیکن اہل عرب کی عادت ہے کہ وہ اپنے کلام میں اور اپنے خطابات میں عتاب کے وقت اس طرح کے کلمات کہتے ہیں اور ان کی یہ نیت نہیں ہوتی کہ ان کلمات کا وقوع ہو جیسے کہتے ہیں تم زخمی ہو جاؤ، تمہارا سر مونڈ دیا جائے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے مدینہ کی طرف روانہ ہونے لگے تو حضرت صفیہ ام المومنین رضی اللہ عنہا نے کہا: میرا خیال ہے کہ میں آپ لوگوں کو مدینہ جانے سے روکنے والی ہوں (کیونکہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے ہر چند کہ طواف زیارت کر لیا تھا لیکن انہوں نے طواف وداع نہیں کیا تھا، اس لیے اُن کا گمان تھا کہ وہ طواف وداع کے بغیر مکہ سے روانہ نہیں ہو سکتیں) تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عقری حلقی "تم زخمی ہو جاؤ، تمہارا سر مونڈ دیا جائے، کیا تم نے یوم النحر کو طواف زیارت نہیں کیا تھا؟ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: کیوں نہیں! آپ نے فرمایا: پھر کوئی حرج نہیں تم ہمارے ساتھ چلو۔

(صحیح البخاری: ۱۵۶۱، صحیح مسلم: ۱۲۱۱، سنن ابن ماجہ: ۳۰۷۳، کتاب الآثار لابی یوسف: ۵۶۱، مسند احمد: ۲۵۸۷۵، سنن دارمی: ۲۰۷۶، مسند البزار: ۳۲۲، السنن الکبریٰ للنسائی: ۴۱۷۷، صحیح ابن حبان: ۱۷۲۵، معالم السنن ج ۱ ص ۶۸، شرح السنۃ للبغوی: ۱۹۷۳، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۸۸۴۴، کشف المشکل: ۵۶۳)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میرے پاس میرے رضاعی چچا افلح آئے جو ابو القعیس کے بھائی تھے، وہ حجاب کے احکام نازل ہونے کے بعد مجھ سے ملاقات کی اجازت طلب کرتے تھے، میں نے اُن کو اجازت دینے سے انکار کیا حتیٰ کہ میرے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ نے فرمایا: "وہ تمہارے چچا ہیں، تم اُن کو آنے کی اجازت دے دو"۔ میں نے عرض کیا: مجھے تو عورت نے دودھ پلایا تھا (یعنی ابو القعیس کی بیوی نے) مرد نے تو دودھ نہیں پلایا؟ (سو افلح میرے رضاعی چچا کیسے ہو گئے) آپ نے فرمایا: "تمہارے ہاتھ خاک آلودہ ہو جائیں، اُن کو تمہارے پاس داخل ہونا چاہیے"۔ (یعنی وہ تمہارے رضاعی چچا ہی ہیں)

(سنن سعید بن منصور: ۹۵۱، مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۷۰۳۱، مسند اسحاق بن راہویہ: ۷۰۲، سنن ابن ماجہ: ۱۹۴۸، مستخرج ابی عوانہ: ۴۳۹۰)

چونکہ آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا: "تمہارے ہاتھ خاک آلودہ ہو جائیں" اس لئے آپ کو یہ خطرہ ہوا کہ کہیں واقع میں ایسا نہ ہو جائے اور آپ کی یہ دعا قبول نہ ہو جائے، تو آپ نے اپنے نفس سے عہد کیا اور اس کی طرف رغبت کی اور آپ نے یہ دعا کی کہ اللہ اس دعا کو رحمت اور اپنا قرب بنا دیں۔ (علامہ مازری کا کلام ختم ہوا)۔

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ یہ احتمال عمدہ ہے مگر اس پر یہ اعتراض ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا کہ میں نے جس کو کوڑا مارا ہو تو اس کو بھی اس کے لیے رحمت بنا دیں، تو یہ جواب وہاں نہیں چل سکے گا۔ کیونکہ بغیر قصد کے کوڑا نہیں مارا جاتا، اور آپ نے تمام امور کو ایک ترتیب سے ذکر کیا ہے سوا اس کے کہ کوڑے سے مراد ایک کوڑا ہو۔

پھر قاضی عیاض نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حالتِ غضب میں بھی کوئی بات خلافِ حق نہیں فرماتے تھے اور نہ کوئی کام خلافِ حق کرتے تھے لیکن اللہ کے لیے جو آپ کا غضب ہوتا تھا وہ کبھی آپ کو برانگیختہ کرتا کہ آپ مخالف کو جلد سزا دیں اور معاف کرنے اور درگزر کرنے کو ترک فرما دیں اور اس کی تائید حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث سے ہوتی ہے، وہ بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنے نفس کے لیے انتقام نہیں لیا سوا اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی حدود کو پامال کیا جائے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں: پھر اس احتمال کی بناء پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کا کیا معنی ہوگا کہ میں جس کے لیے دعائے ضرر کروں اور وہ دعائے ضرر کا مستحق نہ ہو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یعنی میں جلدی اس کے لیے دعائے ضرر کر دوں یا جلدی اس کو سزا دے دوں اور اس سے درگزر نہ کروں۔

اور اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت پر انتہائی درجہ شفیق تھے اور آپ کا خلق بہت جمیل تھا اور آپ کا کرم بہت عمیم تھا، کیونکہ اگر آپ سے کوئی خلافِ اولیٰ فعل سرزد ہوتا تو آپ اس کی تلافی کرتے اور اس کے لیے دعا کرتے۔

(فتح الباری ج ۷ ص ۳۲۳، دار المعرفہ، بیروت، ۱۳۲۶ھ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق اور آپ کی عادت میں فحش کلام کا نہ ہونا

شیخ محمد بن صالح العثیمین الحنبلی النجدی المتوفی ۱۴۲۱ھ، صحیح البخاری: ۶۱۳۱ کی شرح میں لکھتے ہیں:

اس باب میں جو احادیث روایت کی گئی ہیں ان سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خُلق اور آپ کی عادت اور آپ کی فطرت میں فحش کلام نہیں تھا۔ اور اس میں فرق ہے کہ کسی انسان کی فطرت اور عادت میں تو فحش کلام نہ ہو لیکن کبھی کبھار اس سے کوئی سخت بات صادر ہو اور یہ اس کی عصمت کے خلاف نہیں ہے۔ (شرح صحیح البخاری ج ۶ ص ۲۲۶، مکتبۃ الطبری، القاہرہ، ۱۴۲۹ھ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی کو کوڑا مارنے کے متعلق حدیث

میں کہتا ہوں کہ علامہ المازری نے جو بیان کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بلا قصد اگر کسی کو برا کہیں یا لعنت کریں یا اس کو کوڑا ماریں تو اس کے متعلق آپ نے یہ دعا کی کہ اے اللہ! اس کو اس شخص کے لیے رحمت بنا دے، اس کی نظیر درج ذیل حدیث میں ہے:

امام محمد بن یوسف الصالحی الشامی المتوفی ۹۴۲ھ لکھتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ بدر میں لشکر کی صفیں سیدھی کر رہے تھے، حضرت سواد بن غزیہ رضی اللہ عنہ صف کے آگے سے نکلے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پیٹ میں دھکا دیا یا تیر چبھویا اور آپ نے فرمایا: اے سواد! صف میں سیدھے رہو، انہوں نے کہا: یا رسول

اللہ! آپ نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے اور اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے! آپ مجھے اس کا قصاص دیں تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے پیٹ سے کپڑا ہٹادیا اور فرمایا کہ تم قصاص لے لو۔ وہ آپ کے ساتھ چمٹ گئے اور انہوں نے آپ کو بوسہ دیا، آپ نے پوچھا: تمہیں اس فعل پر کس چیز نے برانگیختہ کیا، انہوں نے کہا: اللہ کی تقدیر سے وہ ہونے والا ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں اور مجھے یہ خوف ہوا کہ آج میں قتل کر دیا جاؤں تو میں نے ارادہ کیا کہ میرا آخری کام یہ ہو کہ میں آپ کے ساتھ گلے لگ چکا ہوں۔ (سبل الہدیٰ والرشاد ج ۴ ص ۳۳۔ ۳۲، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۴ھ)

شبلی نعمانی متوفی ۱۹۱۴ء اپنی کتاب ''الفاروق'' میں لکھتے ہیں:

زمانہ حج میں تمام عاملوں کی طلبی

تمام عمال کو حکم تھا کہ ہر سال حج کے زمانے میں حاضر ہوں، حج کی تقریب سے پہلے تمام اطراف کے لوگ موجود ہوتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر باعلان کہتے تھے کہ جس کسی کو کسی عامل سے کچھ شکایات ہو تو پیش کرے۔ چنانچہ ذرا ذرا سی شکایتیں پیش ہوتی تھیں اور تحقیقات ہو کر ان کا تدارک کیا جاتا تھا۔ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بہت بڑا مجمع کر کے خطبہ دیا اور کہا کہ ''صاحبو! اعمال جو مقرر کر کے بھیجے جاتے ہیں اس لیے نہیں بھیجے جاتے کہ تم کو طمانچے ماریں یا تمہارا مال چھین لیں بلکہ میں ان کو اس لیے بھیجتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ سکھائیں۔ سو اگر کسی عامل نے اس کے خلاف کیا ہو تو مجھ سے بیان کرو تا کہ میں اس کا انتقام لوں''۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے جو مصر کے گورنر تھے اٹھ کر کہا کہ ''اگر کوئی عامل ادب دینے کے لیے کسی کو مارے گا تب بھی آپ اس کو سزا دیں گے'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اس خدا کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے ضرور میں سزا دوں گا'' کیونکہ میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو ایسا کرتے دیکھا ہے، خبردار مسلمانوں کو نہ مارا کرو ورنہ وہ ذلیل ہو جائیں گے۔ ان کے حقوق تلف نہ کرو ورنہ وہ کفران نعمت پر مجبور ہوں گے''۔

''ایک دفعہ حسب معمول تمام عمال حاضر تھے، ایک شخص اٹھا اور کہا کہ آپ کے عامل نے مجھ کو بے قصور سو کوڑے مارے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مستغیث کو حکم دیا کہ وہیں مجمع عام میں عامل کو سو کوڑے لگائے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر کہا کہ یہ امر عمال پر گراں ہو گا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ میں ملزم سے انتقام نہ لوں''۔

عمرو بن العاص نے منت کر کے مستغیث کو اس شرط پر راضی کیا کہ ایک ایک تازیانے کے عوض میں دو دو اشرفیاں لے کر اپنے حق سے باز آئے۔ (الفاروق ص ۱۹۹۔ ۲۰۰، اسلم عصمت پرنٹرز، بحوالہ کتاب الخراج ص ۶۶)

علامہ عزالدین ابن الاثیر ابوالحسن علی بن محمد الجزری المتوفی ۶۳۰ھ لکھتے ہیں:

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو اس پر مقرر کیا تھا کہ جب کسی عامل کے خلاف کوئی شکایت ہو تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ، محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو عمال کی سرزنش کے لیے بھیجتے تھے۔

(اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ، ج ۵ ص ۱۰۷، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

میں کہتا ہوں: اس اقتباس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد مذکور ہے: ''اس خدا کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے ضرور میں سزا دوں گا کیونکہ میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو ایسا کرتے دیکھا ہے''۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد میں اُس حدیث کی

طرف اشارہ ہے جس کو ہم نے سبل الھدیٰ والرشاد کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے ایک شخص کو دھکا دیا اور تیر چبھویا تو اس شخص نے کہا: آپ نے جو مجھے تیر چبھویا ہے مجھے اس کا قصاص دیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو قصاص لینے کے لیے پیش فرمادیا۔ اس حدیث سے یہ سبق ملتا ہے کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ والی مصر اور دیگر صوبہ کے گورنروں نے جو یہ کہا تھا کہ اگر آپ اس طرح مجمع عام میں گورنروں اور حاکموں سے قصاص لیتے رہیں گے تو لوگوں کے نزدیک ان حکام کا وقار اور احترام نہیں رہے گا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عمل سے یہ ظاہر فرمایا کہ تم کیا ہو اور تمہاری عزت اور تمہارا مقام کیا ہے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کائنات میں کسی کا وقار اور احترام نہیں ہے اور میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے آپ کو قصاص کے لیے پیش فرمادیا تھا۔ (سعیدی غفرلہٗ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور جب انسان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اس مصیبت کو ٹالنے کے لیے ہم سے کروٹ کے بل لیٹے ہوئے یا بیٹھے ہوئے یا کھڑے ہوئے دعا کرتا ہے، پھر جب ہم اس کی مصیبت کو اس سے دور فرما دیتے ہیں تو وہ ہمیں فراموش کر کے اس طرح چلا جاتا ہے گویا اس نے کبھی کسی مصیبت کے پہنچنے پر ہم سے اس مصیبت کو دور کرنے کی دعا ہی نہیں کی تھی، اسی طرح حد سے تجاوز کرنے والے لوگوں کے برے اعمال ان کے لیے خوشنما بنا دیے جاتے ہیں O'' (یونس: ۱۲)

''وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ'': اس آیت کے سبب نزول میں دو قول ہیں:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مقاتل نے کہا: یہ آیت ابوحذیفہ کے متعلق نازل ہوئی ہے جن کا نام ہاشم بن المغیرہ بن عبداللہ المخزومی ہے۔ (۲) عطاء نے کہا: یہ آیت عتبہ بن ربیع اور الولید بن مغیرہ کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

''الضُّرُّ'' سختی اور مصیبت۔ ''دَعَانَا لِجَنْبِهٖۤ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا'': اور اس آیت کی تفسیر میں دو قول ہیں:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب ان لوگوں پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ کروٹ کے بل یا بیٹھے ہوئے یا کھڑے ہوئے ہم سے دعا کرتے ہیں۔ (۲) الماوردی نے کہا: جب ان پر کروٹ کے بل یا بیٹھے ہوئے یا کھڑے ہوئے کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ اس مصیبت کے ازالہ کے لیے دعا کرتے ہیں۔

''فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ'': اس کی تفسیر میں تین اقوال ہیں:

(۱) مقاتل نے کہا: جب اللہ تعالیٰ اُن سے اس مصیبت کو ٹال دیتے ہیں تو وہ لوگ پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے سے اعراض کرتے ہیں۔

(۲) الزجاج نے کہا: جب اللہ تعالیٰ مصیبت نازل فرمانے سے پہلے انہیں عافیت میں برقرار رکھتے ہیں اور وہ لوگ اس مصیبت سے کوئی نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ (۳) الزجاج نے کہا: وہ اسی طرح سرکشی پر قائم رہتے ہیں اور مصیبت کے دور ہونے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کرتے۔

''كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ'': اس کا معنی یہ ہے: جیسا کہ انہوں نے ہم سے کبھی دعا کی ہی نہ تھی۔

''كَذٰلِكَ زُیِّنَ لِلْمُسْرِفِیْنَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ'': جس طرح کافر کے لیے مصیبت کے نزول کے وقت دعا کو اور عیش وعشرت میں اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری سے اعراض کرنے کو خوشنما بنایا گیا ہے، اسی طرح حد سے تجاوز کرنے والوں کے لیے کفر اور معصیت کو خوش نما بنا دیا گیا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اے کافرو! اللہ کی قسم! ہم نے تم سے پہلے بہت سے کافروں کو ہلاک فرما دیا تھا جب انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، حالانکہ اُن کے پاس ان کے رسول واضح دلائل پیش کر چکے تھے اور وہ کافر ایمان کو اختیار کرنے والے ہی نہ تھے، ہم اسی طرح مجرموں کو سزا فرماتے ہیں O'' (یونس: ۱۳)

''وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ'':

مقاتل نے بیان کیا کہ اس آیت سے کفارِ مکہ کو ڈرایا گیا ہے، اور اس آیت میں ظلم سے مراد شرک ہے۔

''وَمَا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْا'': اس آیت کی تفسیر میں دو قول ہیں:

(۱) مقاتل نے کہا: اس کا تعلق بھی اہل مکہ سے ہے۔ (۲) اور ابو سلیمان الدمشقی نے کہا: اس کا تعلق گزری ہوئی امتوں سے ہے۔ ابن الانباری نے کہا: چونکہ ان لوگوں نے حق سے عناد کی وجہ سے ایمان لانے کو ترک کر دیا تھا اور باطل کو ترجیح دی تھی۔ الزجاج نے کہا: ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو سزا دینے کے لیے ان کے دلوں پر کفر کی مہر لگا دی۔

''كَذٰلِكَ نَجْزِی الْقَوْمَ الْمُجْرِمِیْنَ'': اسی طرح ہم آپ کی قوم کے مشرکوں کو سزا دیتے ہیں اور ان کو ہلاک فرما دیتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''پھر ہم نے اُن کے بعد تم کو زمین میں اُن لوگوں کا جانشین بنایا تاکہ ہم یہ ظاہر فرمائیں کہ اب تم کس طرح کے عمل کرتے ہو O'' (یونس: ۱۴)

''ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ'':

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اے امتِ محمد! ہم نے تمھیں اس زمین میں گزشتہ لوگوں کا جانشین بنا دیا۔ قتادہ نے کہا: ہم نے تم کو ان کا جانشین اس لیے بنایا ہے تاکہ ہم تمہارے اعمال کو ظاہر فرمائیں، پس تم اللہ عزوجل کے سامنے دن اور رات میں ایسے عمل کرو جو نیک ہوں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور جب اِن مشرکین کے سامنے ہماری روشن آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے تو جو لوگ ہماری بارگاہ میں حاضر ہونے کی امید نہیں رکھتے تھے وہ کہتے ہیں: ''(اے اللہ کے رسول!) آپ اس قرآن کے سوا کوئی دوسرا قرآن پیش کریں یا اسی میں تبدیلی کر دیں''، (اے رسولِ اکرم!) آپ کہیے: میرے اختیار میں یہ نہیں ہے کہ میں اپنی طرف سے اس قرآن میں کوئی تبدیلی کر دوں، میں صرف اُسی وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف نازل فرمائی جاتی ہے، میں اس سے ڈرتا رہتا ہوں کہ اگر (بالفرض) میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو مجھے بہت بڑے دن کا عذاب پہنچے گا O'' (یونس: ۱۵)

"وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَیْهِمْ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ": اس آیت کی تفسیر میں دو قول ہیں:

(۱) ابوصالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ یہ آیت اہل مکہ میں سے اُن لوگوں کے متعلق نازل ہوئی ہے جو قرآن مجید کا استہزاء کرتے تھے۔ (۲) مجاہد اور قتادہ نے کہا: یہ آیت مشرکین مکہ کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

اس آیت میں "الآیات" سے مراد قرآن مجید ہے۔ اور "لَا یَرْجُوْنَ" کا معنی ہے: جو اللہ سے نہیں ڈرتے۔

"ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَاۤ اَوْ بَدِّلْهُ": کفار مکہ جو کہتے تھے کہ آپ اس قرآن کے علاوہ کوئی دوسرا قرآن لے آئیں، اس کی تفسیر میں دو قول ہیں۔

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اُن کی مراد یہ تھی کہ قرآن مجید میں جو عذاب کی آیتیں ہیں اُن کو رحمت کی آیتوں سے بدل دیں اور جو رحمت کی آیتیں ہیں اُن کو عذاب کی آیتوں سے بدل دیں۔

(۲) الزجاج نے کہا کہ وہ قرآن مجید میں مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے کے ذکر کو ناپسند کرتے تھے، کیونکہ وہ مرنے کے بعد اٹھنے پر ایمان نہیں لاتے تھے اور وہ اس کو بھی ناپسند کرتے تھے کہ اُن کے معبودوں کی مذمت کی جائے، پس اُن کا مطالبہ یہ تھا کہ اُن کے معبودوں کی مذمت میں جو آیات ہیں اُن کو نکال دیا جائے۔

"قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤى اِلَیَّ": اس آیت کا معنی یہ ہے کہ میں نے قرآن مجید کی جو آیات پیش کی ہیں، وہ اللہ کی طرف سے ہیں میں نے از خود تو نہیں بنائیں جو میں اُن میں تبدیلی کر سکوں۔

"اِنِّیْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ": یعنی اگر بالفرض میں نے قرآن مجید کی آیات میں تبدیلی کر دی یا تغیر کر دیا تو میں قیامت کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "آپ کہیے: "اگر اللہ چاہتا تو نہ میں تمہارے سامنے اس قرآن کی تلاوت کرتا اور نہ اللہ ہی تمہیں اس قرآن سے واقف فرماتا، آخر میں اس نزولِ قرآن سے پہلے تمہارے سامنے زندگی کا ایک حصہ گزار چکا ہوں، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے O" (یونس:١٦)

"قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَیْكُمْ": یعنی اگر اللہ چاہتا تو میں تم پر قرآن مجید کی ان آیات کو تلاوت نہ کرتا، کیونکہ اللہ عزوجل جو آیت نازل فرماتے ہیں تو مجھے تمہارے سامنے اس کی تلاوت کرنے کا حکم فرماتے ہیں۔

"وَلَاۤ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ": اور نہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس سے واقف فرماتا۔

"فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ میں نے تم میں چالیس سال زندگی گزاری ہے اور ان چالیس سالوں میں، میں نے قرآن مجید کی کوئی آیت از خود تمہارے سامنے تلاوت نہیں کی۔

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ، یونس:١٦ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یعنی کیا تم اس پر غور نہیں کرتے کہ اس عظیم الشان، فصیح و بلیغ کلام کا مجھ جیسے شخص سے صادر ہونا محال ہے اور یہ واجب ہے کہ یہ اللہ العزیز الحکیم کا نازل فرمایا ہوا کلام ہے، کیونکہ میں نے تم میں چالیس سال زندگی گزاری ہے، کیا تم نے کبھی دیکھا ہے کہ میں اس

طویل عرصہ میں کبھی علماء کی مجلس میں رہا ہوں، اور میں نے کبھی خطباء کے خطبات میں غور وفکر کیا پھر اچانک میں ایسا کلام لے کر آیا جس کی فصاحت و بلاغت میں عرب کے ماہر فصحاء اور بلغاء حیران رہ گئے اور ایسا کلام لے کر آیا جس نے غیب کے اسرار کو کھول دیا جن اسرار کو کوئی بھی شخص اپنی ذہانت سے نہیں جان سکتا اور میں نے گزشتہ قوموں اور اُن کے نبیوں کے احوال بیان فرمائے اور میں نے اس سے پہلے نازل شدہ آسمانی کتابوں کی تصدیق فرمائی جب کہ تمہارے علم میں ہے کہ میں اپنی اس طویل زندگی میں کبھی اُن لوگوں کے ساتھ نہیں ملا جو سابقہ آسمانی کتابوں کے عالم تھے، اور یہ کہ جو قرآن میں نے پیش کیا ہے اس کا صدور کسی انسانی طاقت سے باہر ہے، اور اس آیت کا معنی ہے: میں نزولِ وحی سے پہلے تمہارے سامنے ایک عرصہ گزار چکا ہوں اور میں نے کبھی کسی سے آسمانی کتابوں کے متعلق بحث اور تحقیق نہیں کی، پھر میرا اچانک ایسے کلام کو پیش فرمانا جس میں انسانی زندگی کے تمام شعبہ جات کی مکمل راہنمائی ہو اور اس میں غیب کی خبریں ہوں، سو یہ اس کے بغیر کیسے ہوسکتا ہے کہ صرف مجھ پر اللہ عزوجل کی وحی نازل ہوئی جس سے مجھے ان تمام احکام اور اسرار کا علم ہوا جو اللہ تعالیٰ نے بہ تدریج مجھ پر نازل فرمائے۔ کیا تم اِن امور پر غور کر کے یہ نہیں سمجھتے کہ یہ میرا بنایا ہوا کلام نہیں ہے، یہ صرف اللہ عزوجل کا نازل شدہ کلام ہے جو میں تمہارے سامنے پڑھتا ہوں۔

''اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ'': کیا ان حقائق پر غور کر کے تم یہ نہیں سمجھتے کہ یہ قرآن میری طرف سے بنایا ہوا نہیں ہے، یہ صرف اللہ عزوجل کا نازل شدہ کلام ہے۔ (روح المعانی ج ۱۱ ص ۱۲۵۔ ۱۲۶، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۷ھ)

صدر الافاضل علامہ سید محمد نعیم الدین مراد آبادی حنفی متوفی ۱۳۶۷ھ، یونس: ۱۶ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اور چالیس سال تم میں رہا ہوں، اس زمانہ میں، مَیں تمہارے پاس کچھ نہیں لایا اور میں نے تمہیں کچھ نہیں سنایا تم نے میرے احوال کا خوب مشاہدہ کیا ہے، میں نے کسی سے ایک حرف نہیں پڑھا، کسی کتاب کا مطالعہ نہ کیا، اس کے بعد یہ کتاب عظیم لایا جس کے حضور ہر ایک کلام فصیح پست اور بے حقیقت ہو گیا، اس کتاب میں نفیس علوم ہیں، اصول وفروع کا بیان ہے، احکام و آداب ہیں، مکارمِ اخلاق کی تعلیم ہے، غیبی خبریں ہیں، اس کی فصاحت و بلاغت نے ملک بھر کے فصحاء و بلغاء کو عاجز کر دیا ہے، ہر صاحب عقلِ سلیم کے لئے یہ بات اظہر من الشمس ہو گئی ہے کہ یہ بغیر وحی الٰہی کے ممکن ہی نہیں۔

(تفسیر خزائن العرفان مع ترجمہ کنز الایمان ص ۳۹۳، مکتبۃ المدینہ، کراچی، ۱۴۳۲ھ)

مفتی احمد یار خان نعیمی حنفی متوفی ۱۳۹۱ھ، یونس: ۱۶ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

کیونکہ نہ میں نے کسی سے کچھ پڑھا نہ سیکھا، رب تعالیٰ نے مجھے سکھایا اور تمہیں تعلیم دینے کا حکم فرمایا۔ لہٰذا میرا قرآن پڑھنا، اس کے اسرار بیان کرنا، اس کے حکم سے ہے معلوم ہوا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ہر کام رب کے حکم سے ہے۔ اس سے اشارۃً معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ظہورِ نبوت سے پہلے احکام قرآنی سے خبردار تھے۔ ظہورِ نبوت کے بعد تبلیغ شروع فرمائی، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کوئی گناہ نہ کیا، رب کے عابد اور نمازی پہلے سے ہی تھے بلکہ جب پہلی وحی آئی تو حضور اعتکاف اور عبادات میں مشغول تھے۔ آیت کا مقصد یہ ہے کہ اگر مجھے جھوٹ بولنے، فسق و فجور کی عادت ہوتی تو اس سے پہلے ہی کلام گھڑ کر رب کی طرف نسبت کر دیا کرتا۔ (تفسیر نور العرفان ص ۳۳۳، ادارہ کتب اسلامیہ، گجرات، پاکستان)

سید ابو الاعلیٰ مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء، یونس: ۱۶ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یہ ایک زبردست دلیل ہے، اُن کے اس خیال کی تردید میں کہ (حضرت) محمد ﷺ قرآن کو خود اپنے دل سے گھڑ کر خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں، اور حضرت محمد ﷺ کے اس دعوے کی تائید میں کہ وہ خود اس کے مصنف نہیں ہیں بلکہ یہ خدا کی طرف سے بذریعۂ وحی ان پر نازل ہو رہا ہے۔ دوسرے تمام دلائل تو پھر نسبتاً دور کی چیز تھے، مگر سیدنا محمد ﷺ کی زندگی تو اُن لوگوں کے سامنے کی چیز تھی۔ آپ ﷺ نے نبوت سے پہلے پورے چالیس سال ان کے درمیان گزارے تھے۔ ان کے شہر میں پیدا ہوئے، ان کی آنکھوں کے سامنے بچپن گزرا، جوان ہوئے، ادھیڑ عمر کو پہنچے۔ رہنا سہنا، ملنا جلنا، لین دین، شادی بیاہ، غرض ہر قسم کا معاشرتی تعلق انہی کے ساتھ تھا اور آپ ﷺ کی زندگی کا کوئی پہلو اُن سے چھپا ہوا نہ تھا۔ ایسی جانی بوجھی اور دیکھی بھالی چیز سے زیادہ کھلی شہادت اور کیا ہو سکتی تھی۔

آپ ﷺ کی اس زندگی میں دو باتیں بالکل عیاں تھیں جنہیں مکہ کے لوگوں میں سے ایک ایک شخص جانتا تھا:

ایک یہ کہ نبوت سے پہلے کی پوری چالیس سالہ زندگی میں آپ ﷺ نے کوئی ایسی تعلیم، تربیت اور صحبت نہیں پائی جس سے آپ ﷺ کو وہ معلومات حاصل ہوتیں جن کے چشمے یکا یک دعوائے نبوت کے ساتھ ہی آپ ﷺ کی زبان سے پھوٹنے شروع ہو گئے۔ اس سے پہلے کبھی آپ اُن مسائل سے دلچسپی لیتے ہوئے، ان مباحث پر گفتگو کرتے ہوئے، اور اُن خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نہیں دیکھے گئے جواب قرآن کی ان پے در پے سورتوں میں زیر بحث آئے تھے۔ حد یہ ہے کہ اس پورے چالیس سال کے دوران میں کبھی آپ کے کسی گہرے دوست اور کسی قریب ترین رشتہ دار نے بھی آپ ﷺ کی باتوں اور آپ ﷺ کی حرکات و سکنات میں کوئی ایسی چیز محسوس نہیں کی جسے اس عظیم الشان دعوت کی تمہید کہا جا سکتا ہو جو آپ ﷺ نے اچانک چالیسویں سال کو پہنچ کر دینی شروع کر دی۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت تھا کہ قرآن آپ ﷺ کے اپنے دماغ کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ خارج سے آپ ﷺ کے اندر آئی ہوئی چیز ہے۔ اس لیے کہ انسانی دماغ اپنی عمر کے کسی مرحلے میں بھی ایسی کوئی چیز پیش نہیں کر سکتا جس کے نشوونما اور ارتقا کے واضح نشانات اس سے پہلے کے مرحلوں میں نہ پائے جاتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ کے بعض چالاک لوگوں نے جب خود محسوس کر لیا کہ قرآن کو آپ ﷺ کے دماغ کی پیداوار قرار دینا صریح طور پر ایک لغو الزام ہے تو آخر کار انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ کوئی اور شخص ہے جو سیدنا محمد ﷺ کو یہ باتیں سکھا دیتا ہے۔ لیکن دوسری بات پہلی بات سے بھی زیادہ لغو تھی۔ کیونکہ مکہ تو در کنار، پورے عرب میں کوئی اس قابلیت کا آدمی نہ تھا جس پر انگلی رکھ کر کہہ دیا جاتا کہ یہ اس کلام کا مصنف ہے یا ہو سکتا ہے۔ ایسی قابلیت کا آدمی کسی سوسائٹی میں چھپا کیسے رہ سکتا ہے؟

دوسری بات جو آپ ﷺ کی سابق زندگی میں بالکل نمایاں تھی، وہ یہ تھی کہ جھوٹ، فریب، جعل، مکاری، عیاری اور اس قبیل کے دوسرے اوصاف میں سے کسی کا ادنیٰ شائبہ تک آپ ﷺ کی سیرت میں نہ پایا جاتا تھا۔ پوری سوسائٹی میں کوئی ایسا نہ تھا جو یہ کہہ سکتا ہو کہ اس چالیس سال کی یک جائی معاشرت میں آپ ﷺ سے کسی ایسی صفت کا تجربہ اسے ہوا ہے۔ برعکس اس کے جن جن لوگوں کو بھی آپ ﷺ سے سابقہ پیش آیا تھا، وہ آپ ﷺ کو ایک نہایت سچے، بے داغ اور قابل اعتماد (امین) انسان کی حیثیت ہی سے جانتے تھے۔ نبوت سے پانچ ہی سال پہلے تعمیر کعبہ کے سلسلے میں وہ مشہور واقعہ پیش آ چکا تھا جس میں حجر اسود کو نصب کرنے کے معاملے پر قریش کے مختلف خاندان جھگڑ پڑے تھے اور آپس میں طے ہوا تھا کہ کل صبح پہلا شخص جو حرم میں داخل ہوگا

اسی کو سچ مان لیا جائے گا۔ دوسرے روز وہ شخص سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے جو وہاں داخل ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہی سب لوگ پکار اٹھے: ھذا الامین، رضینا، ھذا محمد" یہ بالکل راست باز آدمی ہے، ہم اس پر راضی ہیں، یہ تو (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں"۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی مقرر کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ پورے قبیلہ قریش سے بھرے مجمع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے "امین" ہونے کی شہادت لے چکا تھا۔ اب یہ گمان کرنے کی کیا گنجائش تھی کہ جس شخص نے تمام عمر کبھی اپنی زندگی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں بھی جھوٹ، جعل اور فریب سے کام نہ لیا تھا، وہ یکا یک اتنا بڑا جھوٹ اور ایسا عظیم الشان جعل وفریب لے کر اٹھ کھڑا ہوا کہ اپنے ذہن سے کچھ باتیں تصنیف کیں اور ان کو پورے زور اور تحدی کے ساتھ خدا کی طرف منسوب کرنے لگا۔

اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہیں کہ ان کے اس بیہودہ الزام کے جواب میں ان سے کہو کہ اللہ کے بندو! کچھ عقل سے تو کام لو، میں کوئی باہر سے آیا ہوا اجنبی آدمی نہیں ہوں، تمہارے درمیان اس سے پہلے ایک عمر گزار چکا ہوں، میری سابق زندگی کو دیکھتے ہوئے تم کیسے یہ توقع مجھ سے کر سکتے ہو کہ میں خدا کی تعلیم اور اس کے حکم کے بغیر یہ قرآن تمہارے سامنے پیش کر سکتا تھا۔ (تفہیم القرآن، ج ۲ ص ۲۷۲۔ ۲۷۳، ادارہ ترجمان القرآن، اردو بازار، لاہور، مئی ۲۰۱۲ء)

یونس: ۱۶ کو مرزائیوں کا غلام احمد قادیانی پر چسپاں کرنا

مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود، یونس: ۱۶ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اس زمانہ کے مامور حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بھی اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ اور افسوس کہ آپ کے مخالف بھی ویسی ہی باتوں میں مشغول رہے ہیں، جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف، کاش لوگ غور کرتے کہ وہی شخص جو بدترین دشمنوں کے نزدیک بھی دعوائے مسیحیت سے پہلے اسلام کا سب سے بڑا خادم اور راستبازی کا ایک بے نظیر نمونہ تھا، وہ یکدم اس قدر کیوں بگڑ گیا کہ اس نے خدا تعالیٰ پر افترا کرنا شروع کر دیا۔ (تفسیر کبیر، ج ۳ ص ۴۸، نظارت اشاعت، ربوہ)

مرزا بشیر الدین محمود احمد کی مذکورہ تفسیر کا بطلان

میں کہتا ہوں: مرزا بشیر الدین نے غلام احمد قادیانی کو راست بازی کا ایک بے نظیر نمونہ قرار دیا ہے جب کہ غلام احمد قادیانی کے بہت سارے جھوٹ اس کی اپنی تصانیف سے ظاہر اور ثابت ہیں، غلام احمد قادیانی لکھتے ہیں:

"بخاری" میں لکھا ہے کہ آسمان سے اس کے لئے آواز آئے گی کہ "ھذا خلیفۃ اللہ المھدی" اب سوچو کہ یہ حدیث کس پائے اور مرتبہ کی ہے جو اس کتاب میں درج ہے۔ جو اصح الکتب بعد از کتاب اللہ ہے۔ (شہادت القرآن ص ۴۱)

حالانکہ صحیح البخاری میں ایسی کوئی حدیث موجود نہیں ہے۔

نیز لکھتے ہیں:

"میں سولہ برس سے برابر اپنی تالیفات میں اس بات پر زور دے رہا ہوں کہ مسلمانان ہند پر اطاعت گورنمنٹ فرض ہے اور جہاد حرام ہے"۔ (اشتہار مورخہ ۱۰ دسمبر، ۱۸۹۴ء)

مرزا غلام احمد قادیانی لکھتے ہیں:

میں بار بار کہتا ہوں کہ نفس پیشگوئی داماد احمد بیگ (سلطان محمد کی موت) کی تقدیر مبرم ہے۔ اس کا انتظار کرو اور اگر میں جھوٹا ہوں تو یہ پیش گوئی پوری نہیں ہوگی اور میری موت آجائے گی۔ (انجام آتھم ص ۳۱)

مرزا صاحب نے محمدی بیگم سے نکاح کی پیشگوئی کی، لیکن اس کا نکاح مرزا سلطان محمد سے ہوگیا۔ پھر مرزا صاحب نے پیشگوئی کی کہ مرزا سلطان محمد شادی کے اڑھائی سال بعد مرجائے گا اور محمدی بیگم ان کے نکاح میں آجائے گی۔ لیکن مرزا صاحب فوت ہوگئے اور سلطان محمد ان کی موت کے بعد دیر تک بفضلہٖ تعالیٰ زندہ رہا۔

مرزا غلام احمد قادیانی لکھتے ہیں:

پس خدا مارا ہشتاد سال عمر داد یا شاید ازیں زیادہ۔ (مواہب الرحمٰن ص ۲۱)، (اللہ تعالیٰ نے مجھے اسی (۸۰) سال کی عمر دی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ)۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

اور پھر آخر میں اردو میں فرمایا کہ میں تیری عمر بڑھا دوں گا، یعنی دشمن جو کہتا ہے کہ صرف جولائی ۱۹۰۷ء میں ۱۴ مہینے تک تیری عمر کے دن رہ گئے ہیں یا ایسا ہی جو دوسرے دشمن پیشگوئی کرتے ہیں ان سب کو جھوٹا کروں گا اور تیری عمر کو بڑھا دوں گا۔

(اشتہار مولفہ مرزا صاحب بنام تبصرہ: ۱۹۰۷ء)

پہلی بشارت کے بموجب مرزا صاحب کی عمر ۸۰ سال سے زیادہ ہونی چاہیے اور دوسری کے مطابق مرزا صاحب کو ستمبر ۱۹۰۸ء کے بعد تک زندہ رہنا چاہیے تھا، لیکن دونوں پیشگوئیاں غلط ثابت ہوئیں اور مرزا صاحب مئی ۱۹۰۸ء میں ۶۸ سال زندگی گزار کر راہی ملک عدم ہوئے۔

سو ایسے کذاب شخص کو راست بازی کا بے نظیر نمونہ قرار دینا اور اس پر یونس: ۱۶ کو منطبق کرنا کس قدر مضحکہ خیز ہے!

(سعیدی غفرلہٗ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "سو اُس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹا بہتان باندھے یا اُس کی آیتوں کو جھٹلائے، بے شک مجرم لوگ کبھی کامیاب نہیں ہوں گے O" (یونس: ۱۷)

"فَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰهِ کَذِبًا اَوۡ کَذَّبَ بِاٰیٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفۡلِحُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ":

یعنی اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ پر افتراء باندھے۔ سو میں نے اللہ تعالیٰ پر افتراء نہیں باندھا اور نہ اللہ تعالیٰ کے متعلق جھوٹ باندھا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "مشرکین اللہ کو چھوڑ کر اُن بتوں کی عبادت کرتے ہیں جو بُت اُن کو نہ کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ کوئی نفع مہیا کر سکتے ہیں، اور وہ مشرکین یہ زعم کرتے ہیں: "یہ بُت اللہ کے حضور ہماری سفارش کرنے والے ہیں"، آپ کہیے: کیا تم اللہ کو ایسی خبر دیتے ہو جس کا علم اللہ کو نہ آسمانوں میں ہے اور نہ زمینوں میں ہے، وہ ان خبروں سے بلند اور برتر ہیں اور اُن بتوں سے پاک ہیں جن کو یہ مشرکین اللہ کا شریک

قرار دیتے ہیں O" (یونس: ۱۸)

"وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ": مقاتل اور الزجاج نے کہا: یعنی یہ مشرکین جن بتوں کی عبادت کرتے ہیں، اگر یہ اُن کی عبادت نہ کریں تو وہ ان کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے اور اگر اُن کی عبادت کریں تو وہ ان کو کوئی نفع نہیں پہنچا سکتے۔ "وَ يَقُوْلُوْنَ هٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ": ابوعبیدہ نے کہا: یعنی یہ بت اللہ تعالیٰ کے سامنے ہماری سفارش کریں گے، اس کی تفسیر میں دو قول ہیں:

(۱) ابوصالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ یہ بت آخرت میں ہماری سفارش کریں گے۔

(۲) حسن بصری نے کہا: وہ ہماری دنیا کی زندگی کی اصلاح کے لیے اللہ کے سامنے ہماری سفارش کریں گے۔

"قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ": الضحاک نے کہا: کیا تم یہ خبر دیتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک ہے حالانکہ خود اللہ عزوجل کو آسمانوں اور زمینوں میں اپنے کسی شریک کا علم نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کو اپنے شرکاء کا علم نہ ہونا بظاہر اس کے علم محیط کے خلاف ہے، اس کی توجیہ میں مفسرین کی عبارات

الشاہ امام احمد رضا خان فاضل بریلوی متوفی ۱۳۴۰ھ نے اس آیت کا ترجمہ کیا ہے:

"تم فرماؤ کیا اللہ کو وہ بات بتاتے ہو جو اس کے علم میں نہ آسمانوں میں ہے نہ زمین میں ہے"۔

شیخ اشرف علی تھانوی دیوبندی متوفی ۱۳۶۴ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

(یعنی خدا تعالیٰ کو ان چیزوں کے شفیع یا معبود بحق ہونے کے وقوع کا یا امکان کا علم نہیں اور خدا تعالیٰ کا علم تمام اشیاء کو محیط ہے، پس جب ان کا علم نہیں تو معلوم ہوا کہ ان کا وقوع یا امکان باطل ہے، پس عدم اور استحالہ حق ہے اس سے عقیدۂ شرک کا بطلان لازم آ گیا پس وہ پاک اور برتر ہے ان لوگوں کے شرک سے۔ (تفسیر بیان القرآن ج ۲ ص ۱۷۷، مکتبہ رحمانیہ، لاہور)

صدر الافاضل مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی متوفی ۱۳۶۷ھ، اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

کیونکہ اس کا وجود ہی نہیں، کیونکہ جو چیز موجود ہے وہ ضرور علمِ الٰہی میں ہے۔

(تفسیر خزائن العرفان مع ترجمہ کنز الایمان، ص ۳۹۵، مکتبۃ المدینہ، کراچی ۱۴۳۲ھ)

مفتی احمد یار خان نعیمی حنفی متوفی ۱۳۹۱ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یعنی ان بتوں کی شفاعت نہ دنیا میں ہے نہ آخرت میں۔ اگر ہوتی تو رب تعالیٰ کے علم میں ہوتی۔ علمِ الٰہی کی نفی سے اصل نفی مراد ہے۔ (تفسیر نور العرفان، ص ۳۳۳، ادارہ کتب اسلامیہ، گجرات، پاکستان)

شیخ عبد الماجد دریا آبادی متوفی ۱۳۹۷ھ/ ۱۹۷۷ء، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اور ظاہر ہے کہ جو چیز اللہ کے علم میں نہیں تو اس کا وجود ہی باطل ہے۔ (تفسیر الماجدی ص: ۴۶۹، پاک کمپنی، لاہور)

سید ابو الاعلیٰ مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

کسی چیز کا اللہ کے علم میں نہ ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ سرے سے موجود ہی نہیں، اس لئے کہ سب کچھ جو موجود ہے اللہ کے علم میں ہے۔ (تفہیم القرآن ج ۲، ص ۲۷۶، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، مئی ۲۰۱۲ء)

شیخ امین احسن اصلاحی متوفی ۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۷ء اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:
یہ نفی الشی بنفی لازمہ کے اسلوب پر اُن فرضی سفارشیوں کی تردید ہے یعنی اُن کے فرضی سفارشیوں کا آسمان وزمین میں کوئی وجود ہوتا تو سب سے زیادہ اُن سے باخبر تو خود اللہ تعالیٰ ہوتا جس کے وہ مقرب اور چہیتے ٹھہرائے جاتے ہیں، لیکن خدا کو تو ان کا پتا ہی نہیں ہے، پس یہی لوگ ان کا سراغ بھی دے رہے ہیں اور یہی لوگ ان کو آسمان پر بھی چڑھا رہے ہیں۔
(تدبر قرآن ج ۴ ص ۳۴، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۴۳۴ھ)

مصنف کے نزدیک اس اشکال کا جواب

میں کہتا ہوں: یہ آیت اس کے خلاف نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کا کوئی آسمانوں اور زمینوں میں شریک ہوتا تو اسے اس کا علم ہوتا، اور جب اس کا اللہ تعالیٰ کو علم نہیں ہے تو یہ اس کو مستلزم ہے کہ اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ رہا یہ کہ اللہ تعالیٰ کو تو معدومات اور محالات کا بھی علم ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ معدوم کے معدوم ہونے کا اللہ تعالیٰ کو علم ہے، معدوم کے موجود ہونے کا اللہ تعالیٰ کو علم نہیں ہے، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کو کسی معدوم کے موجود ہونے کا علم ہو تو یہ علم واقع کے خلاف ہوگا، اور جو علم واقع کے خلاف ہو وہ جہل ہے اور اللہ تعالیٰ جہل سے بلند اور برتر ہیں۔ اسی لیے فرمایا: "سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ" کہ یہ مشرکین جو اللہ تعالیٰ کے لیے کسی شریک کو بیان کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس سے بلند و برتر ہیں، بےعیب اور منزہ ہیں۔ (سعیدی غفرلہٗ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "ابتداء میں تمام لوگ ایک ہی دین پر قائم تھے، پھر انہوں نے مختلف ادیان اختیار کر لیے، اور اگر آپ کے رب نے پہلے سے ہی مقدر نہ فرمایا ہوتا تو اِن کے ادیان میں اختلاف کا اسی دنیا میں فیصلہ فرما دیا جاتا O" (یونس: ۱۹)

"وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّا اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا": اس آیت کی تفسیر میں سب سے بہترین قول یہ ہے کہ سب سے پہلے تمام لوگ دینِ واحد پر تھے اور موحدین تھے، پھر اُن کا آپس میں اختلاف ہو گیا اور انہوں نے بتوں کی عبادت کی تو سب سے پہلے اُن کی طرف جس کو مبعوث فرمایا گیا وہ حضرت نوح علیہ السلام ہیں۔

"وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ": یعنی اللہ تعالیٰ پہلے ہی یہ مقدر فرما چکے ہیں کہ اس امت کو اس طرح آسمانی عذاب سے ہلاک نہیں فرمائیں گے جس طرح اس سے پہلی امتوں کو آسمانی عذاب سے ہلاک فرما چکے ہیں۔ اور اگر پہلے سے اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں یہ مقرر نہ ہوتا تو "لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ" ان مکذبین پر آسمانی عذاب نازل فرما کر ہلاک فرما دیا ہوتا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اگر پہلے سے قیامت کے آنے کا وقت مقرر نہ ہوتا تو ان مکذبین پر قیامت قائم فرما دی جاتی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور کفار یہ بھی کہتے ہیں کہ "رسول اللہ کی صداقت پر اُن کے رب کی طرف سے کوئی معجزہ کیوں نہیں نازل فرمایا گیا؟"، (اے رسولِ اکرم!) آپ کہیے: غیب کا مستقل علم تو صرف اللہ ہی کو ہے، پس تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں O" (یونس: ۲۰)

"وَيَقُوْلُوْنَ": یعنی مشرکین کہتے ہیں۔

"لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ": یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق پر کوئی ایسا معجزہ کیوں نہیں نازل فرمایا گیا جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصا عطا فرمایا گیا تھا اور ید بیضاء عطا فرمایا گیا تھا، اسی طرح دیگر انبیاء علیہم السلام کو معجزات عطا فرمائے گئے تھے۔

"فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ": اس آیت کی تفسیر میں دو قول ہیں:

(۱) تمہارا یہ سوال کرنا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی معجزہ کیوں نہیں عطا فرمایا گیا، اس کا تعلق غیب کے ساتھ ہے، اور آپ کو کسی معجزہ کا عطا نہ فرمانا اس کا تعلق علمِ غیب سے ہے اور علمِ غیب کو بالاستقلال اور بالذات اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

"فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ": پس تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔ (زاد المسیر فی علم التفسیر ج ۴ ص ۱۹۔۲۲۰، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۲ھ)

وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا ۭ قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ۭ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ﴿۲۱﴾

اور جب ہم نے مشرکین کو اُس تکلیف پہنچنے کے بعد جو انہیں لاحق ہوئی تھی راحت کا مزا چکھایا تو اُسی وقت انہوں نے ہماری آیتوں کے خلاف سازش کی، (اے رسولِ اکرم!) آپ کہیے: اللہ تمہاری اس سازش کی بہت جلد سزا دینے والا ہے، بے شک ہمارے فرشتے تمہاری تمام سازشوں کو لکھ رہے ہیں ○

هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڬ لَىِٕنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۲۲﴾

(اللہ) وہی ہیں جو تم کو خشکی میں اور سمندر میں روانہ فرماتے ہیں حتیٰ کہ تم جب بڑی کشتیوں میں سوار ہو گئے اور وہ کشتیاں موافق ہوا کے ساتھ روانہ ہو گئیں اور وہ اس روانگی سے خوش ہو گئے تو اچانک ہر جانب سے مخالف آندھی آئی اور ہر طرف سے سمندر میں طغیانی آ گئی اور کشتی میں سوار لوگوں کو یہ یقین ہو گیا کہ ہم چاروں طرف سے طوفان میں پھنس چکے ہیں، اس وقت انہوں نے اللہ عزوجل کو اخلاص سے پکارا: اے اللہ! اگر آپ نے ہم کو اِن مشکلات اور مصائب سے نجات عطا فرما دی تو ہم ضرور بہ ضرور آپ کے شکر ادا کرنے والے بندوں میں سے ہو جائیں گے ○

فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓي

أَنفُسِكُم مَّتَاعَ الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٢٣﴾

پھر جب اللہ نے اُن کو ان مشکلات اور مصائب سے نجات عطا فرمادی تو پھر وہ (حسبِ عادت) ناحق زمین میں بغاوت کرنے لگے، اے باغیو! تمہاری اس بغاوت کا وبال صرف تمہاری ہی جانوں پر ہے، دنیا کی زندگی کا نفع صرف عارضی ہے، پھر تمہیں ہماری ہی طرف لوٹنا ہے، پھر ہم تم کو تمہارے کرتوتوں کی خبر دیں گے ○

إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ أَنزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ حَتَّىٰ إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَادِرُونَ عَلَيْهَا أَتَاهَا أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَاهَا حَصِيدًا كَأَن لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ كَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿٢٤﴾

دنیا کی زندگی کی مثال بارش کے اُس پانی کی طرح ہے جس کو ہم نے آسمان سے نازل فرمایا، اُس کے سبب سے زمین کی پیداوار حاصل ہوئی جس کو انسان اور مویشی کھاتے ہیں، حتی کہ جب زمین کی وہ پیداوار خوش نما ہوگئی اور اس کے کاشتکاروں کو یہ یقین ہوگیا کہ یہ زمین مکمل طور پر اُن کی دسترس میں ہے، تو اچانک رات کے وقت یا دن کے وقت اس پر ہمارا عذاب نازل ہوگیا، سو ہم نے اس خوش نما پیداوار کو کٹے ہوئے بھوسے کی شکل بنادیا جیسے کل یہاں اس خوش نما پیداوار کا نام ونشان تک نہیں تھا، اور ہم غور وفکر کرنے والے لوگوں کے لیے اپنی آیات کو اسی طرح تفصیل سے سمجھاتے ہیں ○

وَاللَّهُ يَدْعُوا إِلَىٰ دَارِ السَّلَامِ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٢٥﴾

اور اللہ عزوجل دائمی سلامتی کے گھر (جنت) کی طرف دعوت دیتے ہیں اور وہ جسے چاہتے ہیں صراطِ مستقیم پر چلاتے ہیں ○

لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوهَهُمْ قَتَرٌ وَلَا ذِلَّةٌ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٦﴾

اُن لوگوں کے لیے آخرت میں بہترین انعام ہے جنھوں نے بڑھ چڑھ کر نیک کام کیے اور قیامت کے دن اُن کے چہروں پر نہ ندامت کی سیاہی ہوگی اور نہ پچھتاوے کا کوئی اثر ہوگا، یہی لوگ اہلِ جنت ہیں اور وہ ان جنتوں میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہیں ○

وَالَّذِينَ كَسَبُوا السَّيِّئَاتِ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ مَّا لَهُم مِّنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ كَأَنَّمَا أُغْشِيَتْ وُجُوهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ اللَّيْلِ مُظْلِمًا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٧﴾

اور جن لوگوں نے بُرے کام کئے، اُن کے بُرے کاموں کی سزا اُن کے بُرے کاموں کے مطابق ہوگی، اور اُن کے چہروں پر ذلت چھا جائے گی اور انہیں اللہ کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں ہوگا گویا کہ اُن کے چہروں پر اندھیری رات کے ٹکڑے چسپاں کر دیئے گئے ہوں، یہی لوگ اہلِ دوزخ ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں O

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۸﴾

اور اے لوگو! اُس دن کی ہولناکی سے ڈرو جس دن ہم تمام لوگوں کو ایک جگہ پر جمع فرما دیں گے، پھر ہم مشرکین سے فرمائیں گے: ''تم اور تمہارے خودساختہ شرکاء اپنی اپنی جگہ ٹھہرو'' پس ہم اُن مشرکین اور اُن کے خودساختہ معبودوں کے درمیان امتیاز فرما دیں گے اور مشرکین کے خودساختہ معبود اُن مشرکین سے کہیں گے: ''تم تو ہماری عبادت نہیں کرتے تھے''O

فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿۲۹﴾

(نیز مشرکین کے خودساختہ معبود کہیں گے:) ''پس ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ ہی کافی گواہ ہیں، بے شک ہم تمہاری عبادت کرنے سے بالکل بے خبر تھے''O

هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۳۰﴾

اُس ہولناک دن میں ہر شخص اپنے پہلے بھیجے ہوئے اعمال کو آزمالے گا اور اُن سب کو اُن کے برحق مولا کی طرف لوٹا دیا جائے گا اور اُن کے خودساختہ معبود اور اُن کی افتراء کردہ باتیں اُن سے اچانک غائب ہو جائیں گی O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور جب ہم نے مشرکین کو اُس تکلیف پہنچنے کے بعد جو انہیں لاحق ہوئی تھی راحت کا مزا چکھایا تو اُسی وقت انہوں نے ہماری آیتوں کے خلاف سازش کی، (اے رسولِ اکرم!) آپ کہیے: اللہ تمہاری اِس سازش کی بہت جلد سزا دینے والے ہیں، بے شک ہمارے فرشتے تمہاری تمام سازشوں کو لکھ رہے ہیں O'' (یونس:۲۱)

مشرکینِ مکہ کی تکذیب کی مکر سے تعبیر کرنے کی توجیہ

علامہ ابوحفص عمر بن علی الدمشقی الحنبلی المتوفی ۸۸۰ھ، یونس: ۲۱ تا ۳۰ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ'': یعنی جب ہم نے کفار کو قحط سالی کے بعد زرخیزی عطا فرمائی تو انہوں نے اس پر شکر ادا کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کی تکذیب کی، اس آیت میں فرمایا کہ ہم نے ان مشرکین کو اپنی رحمت کا

ذائقہ چکھایا، اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ذائقہ مونہہ سے نہیں چکھا جاتا، اُن کی رحمت کا صرف عقل سے ادراک کیا جاتا ہے۔

"اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْۤ اٰيَاتِنَا": مجاہد نے کہا: انہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور اُن کا مذاق اُڑایا، اس آیت میں تکذیب کو مکر یعنی سازش سے تعبیر فرمایا ہے، کیونکہ مکر کا معنی ہے خفیہ تدبیر سے کسی چیز کو اُس کے خلاف ظاہر پر محمول کرنا، اور یہ مشرکین خفیہ تدبیر سے اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور تکذیب کرتے تھے اور لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے خلاف شکوک شبہات ڈالتے تھے۔

مقاتل نے کہا: وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوش حالی ملی ہے بلکہ کہتے تھے کہ ہم پر جو بارش ہوئی ہے اور ہماری فصلیں زرخیز ہوئی ہیں، یہ فلاں ستارے کی تاثیر کی وجہ سے ہے جیسا کہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ۞ (الواقعہ: ٨٢)" (اور تمہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق عطا فرمایا جاتا ہے تم اس کی تکذیب کرکے یہ کہتے ہو کہ یہ رزق ہم کو فلاں ستارے کی تاثیر سے ملا ہے)۔

حضرت زید بن خالد الجہنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ میں ہمیں صبح کی نماز پڑھائی، اس وقت رات کی بارش کے آسمان پر آثار تھے، نماز سے فارغ ہو کر آپ لوگوں کی طرف مونہہ کرکے بیٹھ گئے، پھر آپ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے رب نے کیا فرمایا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول زیادہ جاننے والے ہیں، آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: میرے کچھ بندے صبح کو ایمان لانے والے ہوئے اور کچھ بندے کافر ہوئے، جنہوں نے کہا: اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے بارش ہوئی وہ مجھ پر ایمان لانے والے ہیں اور ستاروں کا کفر کرنے والے ہیں اور جنہوں نے کہا: فلاں فلاں ستارے کی وجہ سے بارش ہوئی ہے وہ میرا کفر کرنے والے ہیں اور ستاروں پر ایمان لانے والے ہیں۔

(صحیح البخاری: ٨٤٦، ١٠٣٨، ٤١٤٧، ٧٥٠٣، صحیح مسلم: ٧١، الرقم المسلسل: ٢٢٧، سنن ابوداؤد: ٣٩٠٦، السنن الکبریٰ للنسائی: ١٠٧٦١، عمل الیوم واللیلۃ: ٩٢٥، صحیح ابن حبان: ١٨٨، سنن بیہقی ج ٣ ص ٣٥٧، شرح السنۃ للبغوی: ١١٦٩، مسند احمد: ١٧٠٦١، موسسۃ الرسالہ، بیروت، جامع المسانید لابن الجوزی: ١٨٠١، مکتبۃ الرشد، ریاض) (موسوعۃ المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی الشریف، ج ١٦ ص ٣٠٢، دار المعرفۃ، بیروت، ١٤٣٣ھ)

محکمہ موسمیات کا بارش کی پیشگی اطلاع دینے کا حکم

محکمہ موسمیات والے برسانے والی ہواؤں کا رخ دیکھ کر پہلے سے بتا دیتے ہیں کہ فلاں دن فلاں علاقہ میں بارش ہوگی یا نہیں یا فلاں دن مطلع ابر آلود ہوگا یا دھوپ نکلے گی، ان کے پاس ایسے آلات ہوتے ہیں جن سے وہ ہواؤں کا اور بادلوں کا رخ جان لیتے ہیں اور اکثر و بیشتر ان کی اطلاع صحیح ہوتی ہے، لیکن وہ صرف علامات سے پیشگی خبر دیتے ہیں اور ان علامات کو حقیقی سبب نہیں قرار دیتے، اس لیے اُن کا خبر دینا جائز ہے۔ "قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا": اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری اس تکذیب کو اور مکر کو بہت جلد اپنی گرفت میں لینے والے ہیں اور وہ تمہیں اس تکذیب اور مکر کی بہت جلد سزا دینے والے ہیں۔

"اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ": اس آیت میں رُسُل سے مراد کراماً کاتبین ہیں، یعنی ہمارے فرشتے تمہاری تکذیب اور مکر کو تفصیل سے لکھ رہے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "(اللہ) وہی ہیں جو تم کو خشکی میں اور سمندر میں روانہ فرماتے ہیں حتیٰ کہ تم جب بڑی

کشتیوں میں سوار ہو گئے اور وہ کشتیاں موافق ہوا کے ساتھ روانہ ہو گئیں اور وہ اس روانگی سے خوش ہو گئے تو اچانک ہر جانب سے مخالف آندھی آئی اور ہر طرف سے سمندر میں طغیانی آ گئی اور کشتی میں سوار لوگوں کو یہ یقین ہو گیا کہ ہم چاروں طرف سے طوفان میں پھنس چکے ہیں، اس وقت انہوں نے اللہ عزوجل کو اخلاص سے پکارا: اے اللہ! اگر آپ نے ہم کو اِن مشکلات اور مصائب سے نجات عطا فرما دی تو ہم ضرور بہ ضرور آپ کے شکر ادا کرنے والے بندوں میں سے ہو جائیں گے O'' (یونس:۲۲)

مشکل کے بعد آسانی میسر ہونے کی مثال

''هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُكُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِؕ حَتّٰۤی اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِۚ وَجَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ۬ۚ لَىٕنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ۝'': اس سے پہلی آیت یونس:۲۱ میں فرمایا تھا کہ ہم لوگوں کو مشکل کے بعد آسانی اور مصیبت کے بعد راحت عطا فرماتے ہیں۔ اب اس کی اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بیان فرمائی ہے کہ انسان جب بحری جہاز میں سفر کرتا ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ ہوائیں اس کے مقصود کے موافق چل رہی ہیں تو اس کو بہت زیادہ مسرت حاصل ہوتی ہے، پھر اس کے اوپر ہلاکت کے آثار ظاہر ہوتے ہیں کہ اچانک مخالف جانب سے تیز آندھی چلتی ہے اور اس کے ساتھ سمندر کی تیز موجیں آ کر اس کے جہاز کو گھیر لیتی ہیں، اس وقت اُس پر زبردست خوف طاری ہوتا ہے اور انسان اس حال میں سوائے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی رحمت اور فضل کے کسی چیز کو اپنی نجات کا کارساز نہیں سمجھتا، اور اس وقت تمام مخلوق سے نجات کی امیدیں منقطع ہو جاتی ہیں اور وہ اپنے جسم کی تمام قوتوں سے اللہ عزوجل کی بارگاہ میں فریاد کرتا ہے، پھر جب اللہ تعالیٰ اس کو اس مصیبت سے نجات عطا فرما دیتے ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو بھول جاتا ہے اور پھر اپنے عقائدِ باطلہ کی طرف لوٹ جاتا ہے۔

خطاب سے غیبوبت کی طرف التفات

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنا ذکر مخاطب کے صیغوں کے ساتھ فرمایا تھا ''هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُكُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِؕ حَتّٰۤی اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ'' یہاں تک خطاب کے صیغے ذکر فرمائے ہیں یعنی ''یُسَیِّرُكُمْ'' اور ''حَتّٰۤی اِذَا كُنْتُمْ'' اور اس کے بعد فرمایا: ''وَجَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ'' اور یہ غیبوبت کے صیغے ہیں۔ ((اللہ) وہی ہیں جو تم کو خشکی میں اور سمندر میں روانہ فرماتے ہیں حتیٰ کہ تم جب بڑی کشتیوں میں سوار ہو گئے اور وہ کشتیاں موافق ہوا کے ساتھ روانہ ہو گئیں اور وہ اس روانگی سے خوش ہو گئے تو اچانک ہر جانب سے مخالف آندھی آئی اور ہر طرف سے سمندر میں طغیانی آ گئی اور کشتی میں سوار لوگوں کو یہ یقین ہو گیا کہ ہم چاروں طرف سے طوفان میں پھنس چکے ہیں، اس وقت انہوں نے اللہ عزوجل کو اخلاص سے پکارا)، پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنا ذکر غائب کے صیغہ کے ساتھ فرمایا، اس کو علمی اصطلاح میں التفات کہتے ہیں، یعنی پہلے اپنا ذکر مخاطب کے صیغوں سے فرمایا، پھر اس کے

بعد اللہ تعالیٰ نے اپنا ذکر غائب کے صیغہ سے فرمایا: "لَىِٕنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ" (اے اللہ! اگر آپ نے ہم کو ان مشکلات اور مصائب سے نجات عطا فرمادی تو ہم ضرور بہ ضرور آپ کے شکر ادا کرنے والے بندوں میں سے ہو جائیں گے)۔

خطاب سے غیبوبت کی طرف التفات کی وجوہ

(۱) علامہ محمود بن عمر الزمخشری الخوارزمی المتوفی ۵۳۸ھ لکھتے ہیں:

اگر تم یہ سوال کرو کہ اس کلام کو خطاب سے غیبوبت کی طرف پھیرنے کا کیا فائدہ ہے؟ تو میں کہوں گا: اس کا فائدہ مبالغہ کرنا ہے گویا کہ اللہ تعالیٰ دوسروں کے سامنے کفار کی ایسی حالت بیان فرماتے ہیں جس سے اُن کی حالت پر بہت تعجب کیا جائے، اور جس کا تقاضا اُن کی اس حالت کا انکار اور اُن کی اس حالت کی مذمت ہے۔ (الکشاف ج ۲ ص ۳۳۸، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۷ھ)

(۲) ابو محمد عبد الحق بن عطیہ الاندلسی المتوفی ۵۴۱ھ، لکھتے ہیں:

اس آیت میں خطاب سے غیبوبت کی طرف خروج ہے اور یہ بہت حسین ہے، کیونکہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ ۚ وَ جَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ" (حتیٰ کہ تم جب بڑی کشتیوں میں سوار ہو گئے)، اس آیت میں "اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ" یہ خطاب ہے اور "وَ جَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ" (اور وہ کشتیاں موافق ہوا کے ساتھ روانہ ہو گئیں) یہ غائب کا صیغہ ہے، اور اس میں حل سے غور کرنا ہے کہ جب تم میں سے کچھ لوگ بڑی بڑی کشتیوں میں سوار ہو گئے اور اُن کو آندھی کا سامنا ہوا، اور آندھی کا جب مستقل ذکر کیا جائے تو عرف میں یہ مقرر ہے کہ اس آندھی سے مراد عذاب اور سخت ناپسندیدہ حالت ہوتی ہے لیکن سمندر میں تنہا آندھی کا استعمال نہیں ہوتا، اس لیے مفرد "ریح" کو طیب کے ساتھ مقید فرمایا، اب یہ اس عرف سے نکل گیا۔ ابن ابی عبلہ نے اس آیت کو پڑھا ہے "جَآءَتْهُمْ رِیْحٌ عَاصِفٌ" اور العاصف کا معنی ہے: بہت تند و تیز آندھی۔ اس حالت میں مشرکین اپنے بتوں کو اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ مقرر کردہ شرکاء کو بھول گئے اور انہوں نے خالص اللہ عزوجل سے دعا کی، اس لیے خطاب سے اُن مشرکین کی حالت ظاہر کرنے کے لیے غائب کے صیغہ کی طرف التفات فرمایا۔ (المحرر الوجیز ص ۹۰۴، دار ابن حزم، بیروت ۱۴۲۳ھ)

(۳) علامہ محمد بن یوسف الشہیر بابی حیان الاندلسی المالکی المتوفی ۷۵۴ھ، لکھتے ہیں:

زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہاں پر التفات کی حکمت یہ ہے کہ جب اللہ عزوجل نے یہ فرمایا: "هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُكُمْ" تو اس خطاب میں مخاطبین پر احسان کا ذکر ہے اور مخاطبین پر ایک نعمت کا اظہار ہے، اور سمندر اور خشکی میں سفر کرنے والے مومنین بھی ہوتے ہیں اور کفار بھی ہوتے ہیں، اور اس آیت میں خطاب دونوں کو شامل ہے۔ پس اس آیت میں مخاطب کے صیغوں کے ساتھ خطاب کرنا مستحسن تھا تا کہ نیک لوگ دائماً شکر گزاری کرتے رہیں اور شاید کہ فساق اور فجار اس نعمت سے نصیحت حاصل کر لیں، جب کہ اس آیت کے آخر میں یہ مذکور ہے جس کا یہ تقاضا ہے کہ جب ان لوگوں نے اس طوفان سے نجات پالی تو انہوں نے زمین میں اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کرنے کے بجائے ناشکری کی تو اللہ عزوجل نے خطاب سے غیبوبت کی طرف التفات فرمایا، تا کہ مومنین کے ساتھ اُس چیز کا خطاب نہ ہو جس کا مومنین سے صدور نہیں ہوتا اور وہ ناحق زمین میں فساد کرنا ہے۔

(البحر المحیط ج ۵ ص ۱۳۲، دار الفکر بیروت، ۱۴۱۲ھ)

(۴) ابو علی الجبائی المعتزلی المتوفی ۳۰۳ھ، لکھتے ہیں:

اللہ سبحانہ جل ذکرہٗ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اپنے بندوں کو خطاب فرمایا اور یہ غائب کی خبر دینے کے قائم مقام ہے، اور ہر وہ جو غائب کو مخاطب کا قائم مقام کرے تو جب وہ دوبارہ اس کا ذکر کرے تو مستحسن یہ ہے کہ دوبارہ اس کو غائب کے صیغہ کے ساتھ ذکر کرے۔

(۵) ابن الخطیب نے کہا: غیوبت سے لفظِ خطاب کی طرف التفات کرنا مزید تقرب اور اکرام پر دلالت کرتا ہے اور لفظِ خطاب سے لفظِ غیوبت کی طرف التفات کرنا ناراضی اور عذاب پر دلالت کرتا ہے اور ان مشرکوں کے حال کے لائق یہی ہے کہ ان کے ساتھ ناراضی کے ساتھ کلام کیا جائے، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے احسان کے بدلہ میں کفر کرتے تھے تو ان کے یہی لائق تھا اور یہ ایسا ہے جیسا کہ سورۃ الفاتحہ کے شروع میں "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ (الفاتحہ: ۱۔۳)" یہ تمام غائب کے صیغے ہیں، پھر غائب کے صیغوں سے حاضر کے صیغوں کی طرف التفات کیا، لہٰذا فرمایا: "اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۝ (الفاتحہ: ۵)" اور یہ اس پر دلیل ہے کہ بندہ غیوبت کے مقام سے حضور کے مقام کی طرف منتقل ہو گیا اور یہ اس کے بلند درجہ اور کمالِ قرب پر دلالت کرتا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پھر جب اللہ نے اُن کو اِن مشکلات اور مصائب سے نجات عطا فرمادی تو پھر وہ (حسبِ عادت) ناحق زمین میں بغاوت کرنے لگے، اے باغیو! تمہاری اس بغاوت کا وبال صرف تمہاری ہی جانوں پر ہے، دنیا کی زندگی کا نفع صرف عارضی ہے، پھر تمہیں ہماری ہی طرف لوٹنا ہے، پھر ہم تم کو تمہارے کرتوتوں کی خبر دیں گے ۝" (یونس: ۲۳)

"فَلَمَّآ اَنْجٰهُمْ اِذَا هُمْ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ": پھر جب اللہ تعالیٰ نے اُن کو ان مشکلات اور مصائب سے نجات عطا فرمادی تو پھر وہ (حسبِ عادت) ناحق زمین میں بغاوت کرنے لگے۔

"یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْیُكُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ": یعنی اِن کفار کی بغاوت کا وبال ان ہی پر پڑے گا۔

بغاوت کا معنی ہے: نافرمانیوں اور گناہوں کا ارتکاب۔

مکحول بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "سب سے زیادہ ثواب والی نیکی رشتہ داروں سے ملاپ رکھنا ہے اور سب سے بڑی برائی اللہ تعالیٰ کے احکام سے بغاوت ہے اور جھوٹی قسم کھانا ہے"۔

(مسند اسحاق بن راہویہ ج ۵ ص ۲۰۷، رقم الحدیث: ۲۳۲۵)

اور روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں دو چیزوں کا جلد مواخذہ فرماتے ہیں: ایک بغاوت اور دوسرا ماں باپ کی نافرمانی۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ اگر ایک پہاڑ دوسرے پہاڑ پر بغاوت کرے تو ہم باغی پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دیں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "دنیا کی زندگی کی مثال بارش کے اُس پانی کی طرح ہے جس کو ہم نے آسمان سے نازل فرمایا، اُس کے سبب سے زمین کی پیداوار حاصل ہوئی جس کو انسان اور مویشی کھاتے ہیں، حتیٰ کہ جب

زمین کی وہ پیداوار خوش نما ہو گئی اور اس کے کاشتکاروں کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ زمین مکمل طور پر اُن کی دسترس میں ہے، تو اچانک رات کے وقت یا دن کے وقت اس پر ہمارا عذاب نازل ہو گیا، سو ہم نے اس خوش نما پیداوار کو کٹے ہوئے بھوسے کی مثل بنا دیا جیسے کل یہاں اس خوش نما پیداوار کا نام و نشان تک نہیں تھا، اور ہم غور و فکر کرنے والے لوگوں کے لیے اپنی آیات کو اسی طرح تفصیل سے سمجھاتے ہیں O" (یونس: ۲۴)

"اِنَّمَا مَثَلُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا یَاْكُلُ النَّاسُ وَ الْاَنْعَامُ":

اس آیت میں اُن لوگوں کی مثال بیان فرمائی ہے جو دنیا کی زندگی سے دھوکا کھا گئے اور دنیا کی زندگی سے بہت زیادہ چمٹ گئے اور انہوں نے آخرت کے ذکر سے اعراض کیا اور اس آیت میں دنیا کو زمین کی پیداوار کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

علامہ محمود بن عمر الزمخشری الخوارزمی المتوفی ۵۳۸ھ لکھتے ہیں:

یہ ایک مرکب کی دوسرے مرکب کے ساتھ تشبیہ ہے، دنیا جو کہ بہت جلد فنا ہونے والی ہے، اس کو زمین کی اُس پیداوار کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو بہت جلد سوکھ جاتی ہے۔ اور زمین کے سرسبز ہونے اور اُس کی رونق کو دنیا کی زندگی سے تشبیہ دی ہے جو بہت جلد فنا ہونے والی ہے۔ دنیا کے حال کے جلد فنا ہونے اور دنیا کی نعمتوں کے جلد منقطع ہونے کے حال کو زمین کی پیداوار کے ساتھ تشبیہ دی ہے جس کا سبزہ سوکھ کر لکڑیاں ہو جاتا ہے اور زمین کے سرسبز ہونے کو دنیا کی نعمتوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ "فَاخْتَلَطَ بِهٖ": پھر زمین کا سبزہ سوکھ کر ایک دوسرے کے ساتھ مل جاتا ہے۔ "اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَ ازَّیَّنَتْ": یعنی زمین کے سبزہ کی خوش نمائی کو اس دلہن کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو عمدہ اور خوبصورت لباس پہن کر مزین ہو جاتی ہے۔

(تفسیر الکشاف ص ۴۶۱، دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۳۰ھ)

"حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَ ازَّیَّنَتْ وَ ظَنَّ اَهْلُهَاۤ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَیْهَاۤۙ اَتٰىهَاۤ اَمْرُنَا لَیْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِیْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ":

دنیا کی زندگی کو زمین کی سرسبز پیداوار کے ساتھ تشبیہ دینے کی وجوہ

(۱) جو مرد دنیا کی زندگی میں تمام اعمال صرف کرتا ہے، اس کی مثال اس زمین کی پیداوار کی طرح ہے جس سے نفع حاصل کرنے کی امید رکھی جاتی ہے، پھر اچانک وہ سرسبز پیداوار سوکھ کر لکڑیوں کی طرح ہو جاتی ہے، یعنی دنیا کی زندگی کے عیش و عشرت میں منہمک ہونے والا اچانک مر جاتا ہے۔

(۲) جس طرح زمین کی سرسبز پیداوار کا کوئی قابلِ ستائش انجام نہیں ہوتا، اسی طرح جو دنیا کی زندگی میں دھوکا کھاتا ہے، اس کا انجام بھی قابلِ تعریف نہیں ہوتا۔

(۳) یہ تشبیہ اس طرح ہے جس طرح اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَ قَدِمْنَاۤ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾" (فرقان: ۲۳) "(اور کافروں نے جو عمل کیے تھے ہم اُن کے اُن اعمال کو غبار کے باریک ذرّوں کی طرح فضا میں بکھیر دیں گے O)۔ اور جس طرح کفار کا نیکی کے کاموں کے لیے کوشش کرنا رائیگاں جاتا ہے، اسی طرح جو شخص دنیا کی نعمتوں سے دھوکا کھاتا

ہے اس کے ہاتھ سے بھی اچانک وہ نیکیاں جاتی رہتی ہیں۔
(۴) اللہ تعالیٰ نے شاید یہ مثال اس لئے اس شخص کے لیے بیان فرمائی ہے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتا، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو زمین کی پیداوار انتہائی حسن اور خوبصورتی میں پہنچ جاتی ہے، پھر اچانک یہ حسن اور رونق بالکلیہ زائل ہو جاتا ہے، اسی طرح جو شخص دنیاوی نعمتوں سے دھوکا کھاتا ہے اچانک اس کے ہاتھ سے وہ نعمتیں نکل جاتی ہیں۔ ''كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ'': ہم غور وفکر کرنے والے لوگوں کے لیے اپنی آیات کو اسی طرح تفصیل سے سمجھاتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور اللہ عزوجل دائمی سلامتی کے گھر (جنت) کی طرف دعوت دیتے ہیں اور وہ جسے چاہتے ہیں صراط مستقیم پر چلاتے ہیں O'' (یونس:۲۵)

''وَاللّٰهُ يَدْعُوٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ۭ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ'':

اللہ تعالیٰ کا اپنے آپ کو ''سلام'' فرمانے کی وجوہ

(۱) جب کہ اللہ تعالیٰ واجب الوجود لذاتہٖ اور قدیم لذاتہٖ ہیں تو وہ فنا اور تغیر سے سلامت ہیں، اور وہ اپنی ذات اور صفات میں غیر کی طرف محتاج ہونے سے سلامت ہیں اور یہ صفت صرف خدا کی ہی ہو سکتی ہے۔
(۲) اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو سلام اس لئے فرمایا کہ مخلوق اس کے ظلم سے سلامت ہے، کیونکہ اللہ کے سوا ہر چیز اس کی ملکیت ہے اور مالک کا اپنی ملکیت میں تصرف فرمانا ظلم نہیں ہوتا۔
(۳) مبرد نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو ''سلام'' اس لئے فرمایا ہے کہ وہ آفات اور مصائب سے سلامت ہیں اور وہ مظلوم کا ظالموں سے حق لینے پر قادر ہیں۔

جنت کو ''دار السلام'' فرمانے کی وجوہ

(۱) جنت کو ''دار السلام'' اس لئے فرمایا ہے کہ جو شخص جنت میں داخل ہو جائے وہ آفات اور بلاؤں سے سلامت رہتا ہے۔
(۲) جنت کو ''دار السلام'' اس لئے فرمایا کہ جو جنت میں داخل ہو جائے، اللہ تعالیٰ اس پر سلام بھیجتے ہیں، قرآن مجید میں ہے: ''سَلٰمٌ ۣ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ'' (یٰس:۵۸) ''(بہت ہی مہربان رب کی طرف سے انہیں سلام کہا جائے گا)۔
(۳) جنت میں داخل ہونے والوں پر فرشتے سلام بھیجیں گے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَاۗىِٕهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۝ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ۝'' (الرعد:۲۳-۲۴) ''(وہ دائمی جنتوں میں داخل ہوں گے اور اُن کے آباء و اجداد اور اُن کی بیویوں میں سے اور اُن کی اولاد میں سے جو نیک ہوں گے، وہ بھی اُن کے ساتھ داخل ہوں گے، اور فرشتے اُن کے پاس ہر دروازے سے یہ کہتے ہوئے آئیں گے O ''چونکہ تم نے دنیا میں صبر کیا اس لیے تم پر سلامتی ہو، پس آخرت کا یہ گھر کتنا اچھا ہے O'')۔
(۴) اور اہلِ جنت ایک دوسرے کی بھی لفظِ سلام کے ساتھ تحیت اور تعظیم کریں گے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝'' (یونس:۱۰) ''(اُن جنتوں میں اُن کی دعا

یہ ہوگی: ''اے اللہ! آپ ہر نقص اور عیب سے پاک ہیں'' اور باہم ملاقات کے وقت وہ یہ کہیں گے: ''تم سلامت رہو'' اور اُن کی آخری دعا یہ ہوگی: ''تمام تعریفیں اللہ رب العالمین کے لیے ہیں O'')۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کی امت اور جنت کے متعلق حدیث میں ایک مثال

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ فرشتے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ اس وقت سوئے ہوئے تھے، پس بعض فرشتوں نے کہا کہ یہ سوئے ہوئے ہیں، اور دوسرے بعض فرشتوں نے کہا کہ آنکھ سوئی ہوئی ہے اور دل بیدار ہے، پس انہوں نے کہا: تمہارے اس صاحب کی ایک مثال ہے، پس اس کی وہ مثال بیان کرو، پس بعض فرشتوں نے کہا: وہ سوئے ہوئے ہیں اور دوسرے بعض فرشتوں نے کہا کہ آنکھ سوئی ہوئی ہے اور دل بیدار ہے، پس انہوں نے کہا: ان کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے ایک گھر بنایا اور اس میں ایک دستر خوان رکھا اور کسی دعوت دینے والے کو بھیجا گیا، پس جس نے دعوت دینے والے کی دعوت کو قبول کیا وہ گھر میں داخل ہو گیا اور اس نے دستر خوان سے کھانا کھایا، اور جس نے دعوت دینے والے کی دعوت کو قبول نہیں کیا تو وہ گھر میں داخل نہیں ہوا اور نہ اس نے دستر خوان سے کھایا، پھر فرشتوں نے کہا: اس مثال کی تاویل بیان کرو تا کہ یہ اس کو سمجھیں، پس بعض فرشتوں نے کہا کہ یہ سوئے ہوئے ہیں، اور بعض دوسرے فرشتوں نے کہا کہ آنکھیں سوئی ہوئی ہیں اور دل بیدار ہے، پھر انہوں نے کہا: گھر سے مراد جنت ہے اور دعوت دینے والے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، پس جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی، اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر لی، اور جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی، اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے درمیان امتیاز کر دیا، اس حدیث کی قتیبہ نے متابعت کی ہے از لیث از خالد از سعید بن ابی ہلال از حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس آئے۔

(صحیح البخاری: ٧٢٨١، سنن ترمذی: ٢٨٦٠، سنن دارمی: ١١، مسند البزار: ١٨٨٦، المعجم الکبیر للطبرانی: ٧٥٩٠، مسند الشامیین: ٣٣٩٨، المستدرک علی الصحیحین: ٢٠٤٠، حلیۃ الاولیاء ج ٣ ص ٣٠، الآداب للبیہقی: ١٠٣٠، شعب الایمان للبیہقی: ٨٥٨، ١٧٨٦، ٣٣١٢، شرح السنۃ للبغوی ج ١ ص ١٩٣، الجامع الصحیح للسنن والمسانید ج ١ ص ٣٥٨، مصنف عبد الرزاق: ٥٩٩٨، تفسیر عبد الرزاق: ١١٥٤، کتاب الزہد والرقاق لابن المبارک: ٧٨٧)

علامہ بدر الدین ابو محمد محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ٨٥٥ھ، اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

اس حدیث میں مذکور ہے ''فرشتے آئے'' ان فرشتوں کے نام کا پتا نہیں چلا اور سنن ترمذی میں اس روایت کا ذکر ہے اور اس میں مذکور ہے کہ وہ فرشتے حضرت جبریل اور حضرت میکائیل علیہما السلام تھے، اس کی عبارت اس طرح سے ہے کہ ایک دن ہمارے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم آئے، آپ نے فرمایا: میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت جبریل علیہ السلام میرے سرہانے ہیں اور حضرت میکائیل علیہ السلام میرے پاؤں کی جانب ہیں۔

اس حدیث میں مذکور ہے ''تمہارے صاحب کی ایک مثال ہے'' یعنی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مثال ہے۔

(عمدۃ القاری ج ٢٥ ص ٣٤، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ١٤٢١ھ)

حدیث مذکور کی متابعت

محدث احمد علی سہارنپوری حنفی متوفی ١٢٩٧ھ، صحیح البخاری: ٧٢٨١ کی شرح میں لکھتے ہیں:

یعنی حضرت جابر بن عبداللہ الانصاری رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے، آپ

نے فرمایا: میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت جبریل علیہ السلام میرے سرہانے ہیں اور حضرت میکائیل علیہ السلام میرے پیروں کی جانب ہیں، ان میں سے ایک نے اپنے صاحب سے کہا: ان کی کوئی مثال بیان کرو، دوسرے نے کہا: تم سنو تمہارا کان سنتا رہے اور تم سمجھو اور تمہارا دل سمجھتا رہے، انہوں نے کہا کہ آپ کی اور آپ کی امت کی مثال اس طرح ہے جیسے کسی بادشاہ نے ایک محل بنایا ہو اور اس کے اندر ایک گھر ہو، پھر اس میں ایک دسترخوان رکھا ہو، باقی اسی حدیث کی طرح ہے۔ اور یہ حدیث منقطع ہے کیونکہ سعید بن ابی ہلال نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کو نہیں پایا۔ کہا گیا ہے کہ امام بخاری نے اس متابعت کو اس لیے وارد کیا ہے تا کہ کوئی شخص یہ وہم نہ کرے کہ سعید بن میناء موقوف علیہ ہے کیونکہ انہوں نے یہ تصریح نہیں کی کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث اس طرح سنی ہے۔ (الجامع الصحیح، ج ۱۳ ص ۲۳۸، دار الطحاوئر الاسلامیہ، بیروت، ۱۴۲۲ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”اُن لوگوں کے لیے آخرت میں بہترین انعام ہے جنہوں نے بڑھ چڑھ کر نیک کام کئے اور قیامت کے دن اُن کے چہروں پر نہ ندامت کی سیاہی ہوگی اور نہ پچھتاوے کا کوئی اثر ہوگا، یہی لوگ اہلِ جنت ہیں اور وہ ان جنتوں میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہیں O“ (یونس:۲٦)

”لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِیَادَةٌ“:

”الحُسنٰی“ اور ”الزیادۃ“ کے مصداق کے متعلق احادیث

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ”الحُسنٰی“ سے مراد جنت ہے اور ”الزیادۃ“ کے متعلق حضرت ابوبکر صدیق، حضرت حذیفہ، حضرت ابوموسیٰ، حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ یہ اللہ عزوجل کے کریم چہرہ کی طرف دیکھنا ہے۔ حسن بصری، عکرمہ، عطاء، مقاتل، الضحاک اور السدی کا بھی یہی قول ہے۔

(تفسیر الطبری ج ۱۲ ص ۱۵٦۔۱۵۷، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۲۳ھ، تفسیر ابن ابی حاتم ج ٦ ص ۱۹۴۵، نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ، صحیح ابن خزیمہ، کتاب التوحید ص ۱۲۰، الشریعہ للآجری: ۵۹۰۔۵۹۱، الاسماء والصفات للبیہقی: ٦٦٦، کتاب السنہ لابن ابی عاصم: ۴۷۳۔۴۷۲، شرح اصول الاعتقاد للالکائی ج ۳ ص ۴٦۱، رقم الحدیث: ۷۹۲، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۳ ص ۸۱، تخریج احادیث الکشاف للزیلعی ج ۲ ص ۱۲۵، تفسیر عبدالرزاق ج ۱ ص ۲۹٦)

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اہل جنت، جنت میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرمائیں گے: تم کچھ اور چاہتے ہو جس کو میں تمہیں زیادہ دوں؟ اہلِ جنت عرض کریں گے: کیا آپ نے ہمارے چہروں کو سفید چمکیلا نہیں فرمایا، کیا آپ نے ہم کو جنت میں داخل نہیں فرمایا، کیا آپ نے ہم کو دوزخ سے نجات عطا نہیں فرمادی؟ راوی نے کہا: پس اللہ تعالیٰ اپنے اور مخلوق کے درمیان حجاب کو اٹھا دیں گے، پس اہلِ جنت کو اس سے زیادہ پسندیدہ کوئی چیز نہیں دی گئی ہوگی کہ وہ اپنے رب عزوجل کی طرف دیکھیں گے۔

(صحیح مسلم: ۱۸۱، رقم المسلسل: ۴۴۸، رقم حدیث الباب: ۲۹۷، سنن ترمذی: ۲۵۵۲، سنن ابن ماجہ: ۱۸۷، السنہ لابن ابی عاصم ج ۱ ص ۲۰٦، مسند ابی عوانہ: ۲۱۱، الایمان لابن مندہ: ۷۸۳، الاعتقاد للبیہقی ج ۱ ص ۱۲۳، البعث والنشور: ۴۴۷، شرح السنہ للبغوی: ۴۳۹۳)

لفظ ”رہق“ کے متعدد معانی

”وَلَا یَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ“: اس آیت میں ”یَرْهَقُ“ کا لفظ ہے، یہ لفظ الرہق سے ماخوذ ہے۔ رہق کا معنی ہے: کسی چیز کو سرعت کے ساتھ ڈھانپنا، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”وَلَا تُرْهِقْنِیْ مِنْ اَمْرِیْ عُسْرًا ۝ (الکہف: ۷۳)“ (اور میرے اس معاملہ میں مجھ پر سختی نہ کریں O)۔ نیز اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”فَلَا یَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا ۝ (الجن: ۱۳)“ (اسے نہ کسی کمی کا خوف ہے اور نہ زیادتی کا اندیشہ)۔ اسی سے ”ارھقت الصلاۃ“ ماخوذ ہے، یعنی جب تم نے نماز کو اتنا مؤخر کر دیا حتیٰ کہ دوسری نماز کے وقت نے اس کو ڈھانپ لیا۔ اور ”رجل مراھق“ اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کو زیادہ مہمان ڈھانپ لیتے ہیں۔

الازہری نے کہا: الرہق، ارھاق سے اسم ہے اور اس کا معنی ہے: انسان اپنے اوپر ایسے بوجھ کو لادے جس کی وہ طاقت نہ رکھتا ہو۔ اور دوسرے لوگوں نے کہا: الرہق کا معنی ہے: المقاربت، اسی سے غلام مراھق ماخوذ ہے یعنی لڑکا بلوغت کے قریب پہنچ گیا۔ اور اسی سے ماخوذ ہے ”رھقت الکلاب الصید“ یعنی شکاری کتے شکار کے قریب پہنچ گئے۔ (تہذیب اللغۃ ج ۵ ص ۳۹۷)

لفظ ”قتر“ کے معانی

لشکر کے گردوغبار کو بھی قتر کہا جاتا ہے، دوسرا قول ہے کہ دھوئیں کو بھی قتر کہا جاتا ہے، اسی سے ماخوذ ہے ”قتار القِدر“ یعنی دیگچی کا دھواں، اور ”القتر“ کا معنی ہے التقلیل یعنی کمی، قرآن مجید میں ہے: ”لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا (الفرقان: ۶۷)“ یعنی مومنین کاملین اعتدال سے خرچ کرتے ہیں نہ ضرورت سے زیادہ خرچ کرتے ہیں اور نہ ضرورت سے کم خرچ کرتے ہیں۔ اور اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”وَمَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۔ (البقرۃ: ۲۳۶)“ (غیر مدخولہ کو اس کے استعمال کی چند چیزیں دو خوش حال پر اس کی حیثیت کے مطابق دینا ہے اور تنگ دست پر اس کی گنجائش کے مطابق دینا ہے)۔

آیت مذکورہ کا حاصل معنی

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ نے کہا: یعنی اہل جنت کے چہروں پر نہ گردوغبار کی سیاہی ہوگی اور نہ ذلت کے آثار ہوں گے۔ ”اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ“: یہی لوگ اہل جنت ہیں اور وہ ان جنتوں میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”اور جن لوگوں نے برے کام کئے، اُن کے برے کاموں کی سزا اُن کے برے کاموں کے مطابق ہوگی، اور اُن کے چہروں پر ذلت چھا جائے گی اور انہیں اللہ کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں ہوگا گویا کہ اُن کے چہروں پر اندھیری رات کے ٹکڑے چسپاں کر دیئے گئے ہوں، یہی لوگ اہل دوزخ ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہیں O“ (یونس: ۲۷)

”وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۭ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ“: اس سے پہلی آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسلمانوں کا حال تفصیل سے بیان فرمایا اور اس کے بعد اس آیت میں اُن لوگوں کا حال بیان فرمایا جنہوں نے برے کاموں کا ارتکاب کیا، اللہ تعالیٰ نے اُن کے احوال کے متعلق چار امور بیان فرمائے:

جَزَآءُ سَيِّئَةٍۢ بِمِثْلِهَا: اس آیت سے مقصود ہے نیکیوں اور برائیوں کے درمیان فرق پر تنبیہ فرمانا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نیک اعمال کے متعلق فرمایا کہ وہ نیک عمل کرنے والوں کو ان کی نیکیوں کے ثواب اور اضافہ کے ساتھ پہنچائیں گے۔ اور جنہوں نے برے کام کیے ان کے متعلق ذکر فرمایا کہ ان کی برائیوں پر جتنی ان کی برائیاں تھیں اتنا ہی عذاب دیا جائے گا، زیادہ عذاب نہیں دیا جائے گا اور نیکوکاروں کو ان کی نیکیوں پر ثواب سے زیادہ دیا جائے گا اور یہ اللہ تعالیٰ کا محض فضل ہے، اور اس میں اطاعت گزاروں کے لیے ترغیب ہے۔ اور اگر برے کام کرنے والوں کو ان کی برائیوں سے زیادہ عذاب دیا جاتا تو یہ ان پر ظلم ہوتا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ معاذ اللہ ظلم فرمائیں تو ان کی حکمت باطل ہو جائے گی۔

(میں کہتا ہوں: امام رازی نے اس آیت کی تفسیر میں اسی طرح لکھا ہے لیکن میرے نزدیک اللہ تعالیٰ کا کیا ہوا کوئی کام ظلم نہیں ہوتا، اگر بالفرض اللہ تعالیٰ بدکاروں کو ان کی برائیوں پر ان کے زعم کے مطابق زیادہ عذاب دیتے تب بھی یہ ظلم نہیں ہے کیونکہ سب اللہ تعالیٰ کے مملوک ہیں اور اس کی ملکیت میں ہیں اور مالک اپنی ملکیت میں جو کام بھی کرے، وہ ظلم نہیں ہوتا۔ نیز کوئی نہیں جانتا کہ کسی برائی پر کتنا عذاب دینا چاہیے، یہ سب اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی حکمت پر موقوف ہے۔ سعیدی غفرلہ)

"وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ": اس میں ان کی رسوائی اور تحقیر کی طرف اشارہ ہے، پس ناقص انسان جب مر جائے تو اس کی روح ناقص ہوتی ہے اور کمالات سے خالی ہوتی ہے اور اس کا شعور بھی ناقص ہوتا ہے اور وہ ذلت، توہین، رسوائی اور عذاب کا مستحق ہوتا ہے۔

"مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ": یاد رکھو کہ دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں ہے۔

"كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا": اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ برے کام کرنے والے نیکوکاروں کے برخلاف ہوں گے، کیونکہ نیکوکاروں کے متعلق فرمایا تھا: "وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ"۔ حکماء اسلام نے کہا ہے کہ ان کے چہروں پر جو سیاہی چھائی ہوگی وہ جہالت اور گمراہی کی سیاہی ہے، کیونکہ علم کی طبیعت میں نور ہے اور جہالت کی طبیعت میں ظلمت ہے، اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں: "وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ۝ (عبس: ۳۸۔۴۲)" (بعض چہرے اس دن چمکدار ہوں گے ○ مسکراتے ہوئے اور خوش خبری حاصل کرتے ہوئے ○ اور بعض چہرے اس دن گرد و غبار سے آلودہ ہوں گے ○ ان پر سیاہی چھائی ہوئی ہوگی ○ یہی لوگ کافر بدکار ہیں ○)۔

"اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ": یہی لوگ اہل دوزخ ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اے لوگو! اس دن کی ہولناکی سے ڈرو جس دن ہم تمام لوگوں کو ایک جگہ پر جمع فرما دیں گے، پھر ہم مشرکین سے فرمائیں گے: "تم اور تمہارے خود ساختہ شرکاء اپنی اپنی جگہ ٹھہرو" پس ہم ان مشرکین اور ان کے خود ساختہ معبودوں کے درمیان امتیاز فرما دیں گے اور مشرکین کے خود ساختہ معبود ان مشرکین سے کہیں گے: "تم تو ہماری عبادت نہیں کرتے تھے" ○" (یونس: ۲۸)

"وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ": اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جس دن ہم

عابد اور معبود دونوں کو جمع فرمادیں گے، پھر معبود عابد سے بےزاری کا اظہار کرے گا، اس کی نظیر یہ آیت ہے: ''اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ۝ (البقرہ:۱۶۶)'' (اور جس وقت (کافروں کے) پیشوا اپنے پیروکاروں سے برأت کا اظہار کریں گے (اور وہ دونوں) عذاب کو دیکھ چکے ہوں گے اور ان کے باہمی تعلقات ٹوٹ جائیں گے ۝)۔

الحشر کا معنی ہے: ہر جانب سے سب کو ایک موقف میں جمع کر دینا۔ پھر ہم مشرکین سے کہیں گے کہ تم اپنی جگہ لازم رہو اور اُن کے شرکاء یعنی بتوں سے کہیں گے کہ تم بھی اسی جگہ ٹھہرے رہو۔ ''فَزَیَّلْنَا بَیْنَهُمْ'': پھر ہم اُن دونوں کے درمیان امتیاز فرمادیں گے۔

ایک سوال یہ کیا گیا ہے کہ ان کے شرکاء تو بت ہوں گے تو وہ کیسے کلام کریں گے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن بتوں میں حیات، عقل اور نطق پیدا فرمادیں گے اور ایک قول یہ ہے کہ روح بغیر حیات کے پیدا فرمادیں گے حتیٰ کہ وہ کلام نہیں گے، پس اگر یہ سوال کیا جائے کہ جب اللہ تعالیٰ اُن کو زندہ فرمائیں گے تو پھر یہ بت باقی رہیں گے یا فنا ہو جائیں گے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں ہو سکتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے افعال پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس خطاب میں بتوں کی عبادت کرنے والوں کو دھمکایا ہے، پس کیا یہ دھمکی اُن کے معبودوں کے متعلق بھی ہے، المعتزلہ نے کہا: یہ جائز نہیں ہے کیونکہ اُن معبودوں یعنی بتوں کا تو کوئی گناہ نہیں ہے اور جس کا کوئی گناہ نہ ہو اس کو دھمکانا صحیح نہیں ہے۔ اور اہل السنہ نے کہا: اللہ تعالیٰ جو کام فرمائیں، ان سے اس کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا۔ ''وَقَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِیَّانَا تَعْبُدُوْنَ'': وہ بت کہیں گے: تم ہماری عبادت نہیں کرتے تھے حالانکہ کافروں نے اُن کی عبادت کی تھی تو اُن کا یہ قول جھوٹ ہو گا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''(نیز مشرکین کے خود ساختہ معبود کہیں گے:) '' پس ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ ہی کافی گواہ ہیں، بے شک ہم تمہاری عبادت کرنے سے بالکل بے خبر تھے'' ۝ (یونس:۲۹)

کفار کے خود ساختہ معبودوں کا اپنے عابدوں کی عبادت سے غافل ہونے کی وجوہ

''قُلْ کَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِیْنَ'': مشرکین کے معبودوں نے اپنے عابدین سے کہا: بے شک ہم تمہاری عبادت کرنے سے ضرور غافل تھے۔ پس انہوں نے اُن معبودوں کے لیے عبادت کو ثابت کیا مگر اُن معبودوں کا یہ زعم تھا کہ وہ ان عابدوں کی عبادت سے غافل تھے۔ اور وہ اس قول میں سچے تھے کیونکہ غفلت کے اسباب میں سے بڑا سبب یہ تھا کہ کفار کے وہ خود ساختہ معبود تو جمادات تھے، نہ اُن کو کسی چیز کا احساس تھا، نہ کسی چیز کا شعور تھا، اور بعض مفسرین نے اس آیت کو اس کے ظاہر پر محمول کیا ہے اور انہوں نے کہا: ان شرکاء نے یہ خبر دی کہ کفار نے اُن شرکاء کی عبادت نہیں کی، پھر اس پر انہوں نے درج ذیل دلائل ذکر کیے:

(۱) حشر کا دن دہشت کا دن ہے اور اس دن ان کا جھوٹ بولنا بچوں کے جھوٹ بولنے کے قائم مقام ہے یا دیوانوں اور مدہوشوں کے جھوٹ بولنے کے قائم مقام ہے۔

(۲) انہوں نے کفار کے اعمال کو کوئی حیثیت نہیں دی اور ان کے اعمال کو باطل ہونے کی وجہ سے بہ منزلہ عدم قرار دیا، اس لیے ان خودساختہ معبودوں نے کہا کہ ان کفار نے ہماری عبادت نہیں کی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اُس ہولناک دن میں ہر شخص اپنے پہلے بھیجے ہوئے اعمال کو آزما لے گا اور اُن سب کو اُن کے برحق مولا کی طرف لوٹا دیا جائے گا اور اُن کے خودساختہ معبود اور اُن کی افتراء کردہ باتیں اُن سے اچانک غائب ہو جائیں گی O'' (یونس: ۳۰)

یونس: ۳۰ میں ''تَبۡلُوۡا'' اور ''تتلو'' کی دو قراءتیں

''هُنَالِكَ تَبۡلُوۡا كُلُّ نَفۡسٍ مَّاۤ اَسۡلَفَتۡ'': اس وقت ہر نفس اپنے کئے ہوئے کاموں کو آزمائے گا۔

امام ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ نے کہا: اس آیت کا معنی ہے: اس وقت ہر نفس اپنے پہلے کئے ہوئے کاموں کو آزما لے گا۔

(تفسیر الطبری ج ۱۲ ص ۱۷۳، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۳۴ھ، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۹۳۹، تفسیر مجاہد ص ۳۸۱)

بعض مفسرین نے کہا: اس آیت میں ''تَبۡلُوۡا'' کی جگہ ''تتلو'' ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ اس دن ہر ایک اپنے صحیفۂ اعمال میں اپنی نیکیوں کو اور اپنی برائیوں کو پڑھ لے گا جیسے اللہ جل ثناؤہ نے فرمایا ہے: ''وَكُلَّ اِنۡسَانٍ اَلۡزَمۡنٰهُ طٰٓـئِرَهٗ فِىۡ عُنُقِهٖ‌ ؕ وَنُخۡرِجُ لَهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلۡقٰٮهُ مَنۡشُوۡرًا ۞ اِقۡرَاۡ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفۡسِكَ الۡيَوۡمَ عَلَيۡكَ حَسِيۡبًا ؕ'' (بنی اسرائیل: ۱۳-۱۴) ''(اور ہم نے ہر انسان کی لکھی ہوئی قسمت اس کے گلے میں ڈال دی ہے اور قیامت کے دن ہم اس کا صحیفۂ اعمال نکالیں گے جسے وہ کھلا ہوا پائے گا O اسے کہا جائے گا: ''اپنا صحیفۂ اعمال تو خود ہی پڑھ لے، آج تو خود ہی اپنا حساب کرنے کے لئے کافی ہے O'')۔

(تفسیر طبری ج ۱۲ ص ۱۷۴، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۳۴ھ، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۹۳۹)

''وَرُدُّوۡۤا اِلَى اللّٰهِ مَوۡلٰٮهُمُ الۡحَـقِّ'': اور اس دن ان مشرکین کو اُن کے رب اور ان کے برحق مالک کی طرف لوٹا دیا جائے گا نہ کہ اُن کے خودساختہ معبودوں کی طرف۔ ''وَضَلَّ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ'': اور جو کچھ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف جھوٹ منسوب کرتے تھے، وہ اُن سے باطل ہو جائے گا، اور وہ جو یہ دعویٰ کر رہے تھے کہ اُن کے بت انہیں اللہ کے قریب کر دیں گے۔ اور جو وہ اللہ تعالیٰ کے لیے شریک بناتے تھے وہ سب غائب ہو جائیں گے۔

(تفسیر طبری ج ۱۲ ص ۱۷۵، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۳۴ھ، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۹۵۰)

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اس دن ہم ان کو آزمائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے آزمانے پر ایک اعتراض کا جواب

اس پر یہ سوال ہوتا ہے کہ آزماتا وہ شخص ہے جس کو نتیجہ کا علم نہ ہو، اس لئے اس آیت کا معنی ہے: اُن کے ساتھ وہ معاملہ فرمایا جائے گا جو کوئی آزمانے والا دوسرے کے ساتھ کرتا ہے۔ ''وَرُدُّوۡۤا اِلَى اللّٰهِ'' کا معنی ہے: انہیں اللہ تعالیٰ کی جزاء کی طرف لوٹایا جائے گا، اور جن لوگوں کے متعلق انہیں یہ اعتقاد تھا کہ وہ ان کی شفاعت کریں گے، وہ سب غائب ہو جائیں گے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوۡلَى الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَاَنَّ الۡكٰفِرِيۡنَ لَا مَوۡلٰى لَهُمۡ ۞'' (محمد: ۱۱) ''(یہ اس لئے کہ اللہ ایمان والوں کے مد

گار ہیں اور کافروں کا کوئی مددگار نہیں O)۔

(اللباب فی علوم الکتاب، ج ۱۰، ص ۲۸۹ ـ ۳۱۹، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۱۱ء، تفسیر کبیر، ج ۶، ص ۲۳۰ ـ ۲۳۶، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۱﴾

(اے رسولِ اکرم!) آپ کفار سے پوچھئے: ''تمہیں آسمان اور زمین سے کون رزق عطا فرماتا ہے؟ یا یہ بتاؤ کہ کانوں کا سننا اور آنکھوں کا دیکھنا کس کی ملکیت میں ہیں؟ اور (یہ بتاؤ کہ) مردہ سے زندہ کو کون نکالتا ہے اور زندہ سے مردہ کو کون نکالتا ہے اور (اس) کائنات کے نظام کو کون چلا رہا ہے؟'' تو وہ یقیناً کہیں گے کہ: ''اللہ ہی (یہ تمام کام فرما رہے ہیں)'' سو آپ کہیے: ''پھر تم (اللہ کا انکار کر کے) ان کے عذاب سے کیوں نہیں ڈرتے!'' O

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿۳۲﴾

پس یہی اللہ ہیں جو تمہارے برحق رب ہیں، پس حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کچھ نہیں، پس تم کہاں اوندھے پھر رہے ہو؟ O

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْۤا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾

اسی طرح نافرمانوں کے متعلق آپ کے رب کا (ازل میں) یہ فیصلہ ہو چکا ہے (اور ان کے متعلق مقدر ہو چکا ہے) کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے O

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۴﴾

(اے رسولِ اکرم!) آپ ان مشرکین سے پوچھئے: ''تم نے جن کو اللہ کا شریک بنا رکھا ہے ان میں سے وہ کون ہے جو ابتداءً مخلوق کو پیدا کرتا ہے اور پھر فنا کر کے دوبارہ لوٹاتا ہے؟'' آپ ان سے کہیے: ''اللہ ہی ابتداءً مخلوق کو پیدا فرماتے ہیں، پھر دوبارہ وہی اس کو زندہ فرما کر لوٹاتے ہیں'' سو تم کہاں اوندھے پھر رہے ہو O

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْۤ اِلَى الْحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ؕ اَفَمَنْ يَّهْدِيْۤ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّهْدٰى ۚ

فَمَا لَكُمْ ۟ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿٣٥﴾

آپ ان مشرکین سے پوچھیے: "کیا تمہارے خودساختہ خداؤں میں سے کوئی ہے جو دینِ حق کی طرف ہدایت دے سکے؟" آپ کہیے: اللہ ہی برحق دین کی طرف راہنمائی فرماتے ہیں، کیا جو برحق دین کی طرف راہنمائی فرمائے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کی اتباع کی جائے یا وہ اس کا مستحق ہے جو خود ہی ہدایت نہ پا سکے سوا اس کے کہ اس کو ہدایت دی جائے، سو تم کو کیا ہو گیا ہے، تم کیسے (غلط) فیصلے کرتے ہو؟ O

وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿٣٦﴾

اور اکثر مشرکین صرف اپنے گمان کی پیروی کرتے ہیں، اور بے شک گمان یقین سے کچھ بھی مستغنی نہیں کر سکتا، بے شک اللہ اُن کے سب کاموں کو خوب جاننے والے ہیں O

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٣٧﴾

اور یہ قرآن اللہ کی وحی کے بغیر کسی کے افتراء سے نہیں بنایا گیا لیکن یہ قرآن اس سے پہلے نازل شدہ آسمانی کتابوں کی تصدیق فرمانے والا ہے، اور اس قرآن میں رب العالمین کی طرف سے لکھے ہوئے اُن احکام کی تفصیل ہے جن میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے O

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٣٨﴾

بلکہ مشرکین یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے (یعنی رسول اکرم نے) اس قرآن کو اپنے پاس سے گھڑ لیا ہے، آپ کہیے: اگر تم اپنے اس قول میں سچے ہو تو اس قرآن کی کسی سورت کی مثال بنا کر لے آؤ، اور اللہ کے سوا تم اپنے جن مددگاروں کو بلا سکتے ہو ان کو بھی بلا لو O

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٣٩﴾

بلکہ انہوں نے (اس قول سے) اس قرآن کی تکذیب کی ہے جس کے علم کا وہ احاطہ نہیں کر سکے اور ابھی تک اُن کو اس تکذیب کی سزا بھی نہیں پہنچی، اسی طرح اُن سے پہلی امتوں نے بھی اپنے اپنے رسولوں کی تکذیب کی تھی، پس (اے رسول اکرم!) آپ دیکھیں کہ ان ظالموں کا کیسا انجام ہوا! O

وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۟ؑ

اور ان مشرکین میں سے بعض قرآن مجید پر ایمان لے آتے ہیں اور بعض ان میں سے اس پر ایمان نہیں لاتے، اور آپ کے رب ان فساد کرنے والوں کو بہت زیادہ جاننے والے ہیں O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''(اے رسولِ اکرم!) آپ کفار سے پوچھئے: ''تمہیں آسمان اور زمین سے کون رزق عطا فرماتا ہے؟ یا یہ بتاؤ کہ کانوں کا سننا اور آنکھوں کا دیکھنا کس کی ملکیت میں ہیں؟ اور (یہ بتاؤ کہ) مردہ سے زندہ کو کون نکالتا ہے اور زندہ سے مردہ کو کون نکالتا ہے اور (اس) کائنات کے نظام کو کون چلا رہا ہے؟'' تو وہ یقیناً کہیں گے کہ: ''اللہ ہی (یہ تمام کام فرما رہے ہیں)'' سو آپ کہیے: ''پھر تم (اللہ کا انکار کر کے) ان کے عذاب سے کیوں نہیں ڈرتے!'' O (یونس: ۳۱)

علامہ ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی بن الجوزی الحنبلی المتوفی ۵۹۷ھ یونس: ۳۱ تا ۴۰ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ'': آپ ان سے پوچھئے کہ آسمان سے بارش کون نازل فرماتے ہیں اور زمین سے سبزیوں اور پھلوں کو کون پیدا فرماتے ہیں؟

''اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ'': وہ کون ہیں جو کانوں میں سماعت کو پیدا فرماتے ہیں اور آنکھوں میں بصارت کو پیدا فرماتے ہیں۔ ''وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ'': یعنی کون زندہ کو نطفہ سے پیدا فرماتے ہیں اور نطفہ کو زندہ سے پیدا فرماتے ہیں۔ ''وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ'': یعنی کائنات کو اپنے نظام پر جاری رکھنے کے لیے دنیا اور آخرت کے امور کی کون تدبیر فرماتے ہیں۔ ''فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ'': تو وہ یہی کہیں گے کہ اللہ ہی یہ تمام کام انجام دیتے ہیں، اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی توحید کی دلیل ہے۔

''اَفَلَا تَتَّقُوْنَ'': حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کیا پس تم نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ اور مقاتل نے کہا: کیا تم اب بھی شرک کو ترک نہیں کرتے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''پس یہی اللہ ہیں جو تمہارے برحق رب ہیں، پس حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کچھ نہیں، پس تم کہاں اوندھے پھر رہے ہو؟'' O (یونس: ۳۲)

''فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ'': امام ابوسلیمان حمد بن محمد الخطابی متوفی ۳۸۸ھ نے کہا: الحق کا معنی ہے: جس کا وجود متحقق ہو، اور ہر وہ چیز جس کا وجود صحیح ہو۔ یعنی جو ان تمام امور کو انجام دیتے ہیں وہی تمہارے رب ہیں۔

''فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ'': پھر جب تم اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کرتے ہو، پھر تمہاری عقلیں تمہیں اس کی عبادت کی طرف کیوں پھیرتی ہیں جو نہ رزق دیتا ہے نہ زندہ کرتا ہے اور نہ مارتا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اسی طرح نافرمانوں کے متعلق آپ کے رب کا (ازل میں) یہ فیصلہ ہو چکا ہے (اور

ان کے متعلق مقدر ہو چکا ہے) کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے O" (یونس:۳۳)

"كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ": الکلبی نے کہا: اسی طرح آپ کے رب کا حکم ازل میں نافذ ہو چکا ہے، ابن کثیر اور عاصم وغیرہما نے اس آیت کی اسی طرح قراءت کی ہے "كَلِمَتُ رَبِّكَ"، اور نافع اور ابن عامر نے اس کی قراءت کی ہے: "كلمات ربك"۔ "عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ" اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ان نافرموں کے متعلق یہ مقدر ہو چکا ہے کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے، یعنی ازل میں اللہ تعالیٰ کو ان کے متعلق یہ علم تھا کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "(اے رسولِ اکرم!) آپ اِن مشرکین سے پوچھیے: "تم نے جن کو اللہ کا شریک بنا رکھا ہے اِن میں سے وہ کون ہے جو ابتداءً مخلوق کو پیدا کرتا ہے اور پھر فنا کر کے دوبارہ لوٹاتا ہے؟" آپ اِن سے کہیے: "اللہ ہی ابتداءً مخلوق کو پیدا فرماتے ہیں، پھر دوبارہ وہی اس کو زندہ فرما کر لوٹاتے ہیں" سو تم کہاں اوندھے پھر رہے ہو O" (یونس:۳۴)

"قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ": آپ ان مشرکین سے پوچھیے: کیا تمہارے بتوں میں سے کوئی ایسا ہے جو ابتداءً مخلوق کو پیدا کرے جب اس سے پہلے مخلوق کی کوئی مثال نہ ہو۔ "ثُمَّ يُعِيْدُهٗ": پھر موت کے بعد اس کو اسی طرح زندہ کر دے۔ پھر اگر وہ آپ کو جواب نہ دے سکیں تو "قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ": آپ کہیے کہ اللہ تعالیٰ ہی ابتداءً مخلوق کو پیدا فرماتے ہیں، پھر وہی دوبارہ اس کو زندہ فرماتے ہیں، سو تم سیدھے راستہ کو چھوڑ کر کہاں اوندھے مارے مارے پھر رہے ہو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "آپ اِن مشرکین سے پوچھیے: "کیا تمہارے خود ساختہ خداؤں میں سے کوئی ہے جو دینِ حق کی طرف ہدایت دے سکے؟" آپ کہیے: اللہ ہی برحق دین کی طرف راہنمائی فرماتے ہیں، کیا جو برحق دین کی طرف راہنمائی فرمائے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کی اتباع کی جائے یا وہ اس کا مستحق ہے جو خود ہی ہدایت نہ پا سکے سوا اس کے کہ اس کو ہدایت دی جائے، سو تم کو کیا ہو گیا ہے، تم کیسے (غلط) فیصلے کرتے ہو؟ O" (یونس:۳۵)

"قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ": کہا جاتا ہے کہ اس آیت اور اس سے پہلی آیت دونوں کا معنی واحد ہے، یعنی تمہارے خود ساختہ خداؤں میں سے کون ہے جو دینِ اسلام کی طرف راہنمائی کرے، پھر جب وہ کہیں کہ کوئی نہیں ہے تو آپ ان سے کہیں: "اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ": یعنی اللہ ہی دینِ حق کی طرف ہدایت دیتے ہیں۔ پھر ان کو زجر و توبیخ کرتے ہوئے کہیں: "اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ": یعنی جو دینِ حق کی طرف راہنمائی فرماتے ہیں اور وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہیں۔ "اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى": کیا اللہ سبحانہٗ اس کے زیادہ حق دار ہیں کہ ان کے دین کی پیروی کی جائے یا وہ بت جو از خود ہدایت پا نہیں سکتے جب تک کہ ان کی راہنمائی نہ کی جائے۔ یعنی وہ بت ایک جگہ سے دوسری جگہ خود چل کر نہیں جا سکتے جب تک کہ کوئی ان کو

اٹھا کر نہ لے جائے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد مشرکین کے سردار اور گمراہ کرنے والے ہیں جو خود اپنے آپ کو ہدایت نہیں دے سکتے سوا اس کے کہ اُن کی راہنمائی کی جائے۔

"فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ": پھر تمہارا بتوں کی عبادت کرنا کس دلیل سے ہے اور تم کیوں اس صریح باطل کے مطابق چلتے ہو تم اُن خداؤں کی عبادت کرتے ہو جو اپنے آپ سے کسی چیز کو دور نہیں کر سکتے۔ اور اللہ جو چاہتے ہیں وہ فرماتے ہیں، پس تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کو چھوڑ کر کیوں ان بتوں کی عبادت کرتے ہو، یہ تم کیسا غلط فیصلہ کرتے ہو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اکثر مشرکین صرف اپنے گمان کی پیروی کرتے ہیں، اور بے شک گمان یقین سے کچھ بھی مستغنی نہیں کر سکتا، بے شک اللہ اُن کے سب کاموں کو خوب جاننے والے ہیں ○" (یونس: ۳۶)

"وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا": یعنی ان مشرکین کے سردار صرف اپنے گمان کی پیروی کرتے ہیں اور انکل پچو سے کہتے ہیں کہ یہ بت خدا ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حضور ان کی شفاعت کریں گے اور ان کے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں ہے، یہ صرف اپنے آباء و اجداد کی تقلید کرتے ہیں۔ "إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا": ایک قول یہ ہے کہ حق سے مراد یہاں اللہ عزوجل ہیں یعنی ان سے اللہ عزوجل کے عذاب کو ان کے گمان کی تراشی ہوئی چیزیں دور نہیں کر سکتیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ حق سے مراد یہاں پر یقین ہے، یعنی گمان یقین کی مثل نہیں ہے۔ اور اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ عقائد کو ثابت کرنے کے لیے دلائل ظنیہ کافی نہیں ہیں۔

"إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ": یعنی یہ جو کچھ کفر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی تکذیب کرتے ہیں، اس سب کو اللہ تعالیٰ بہت زیادہ جاننے والے ہیں اور یہ آیت اُن کو دھمکانے کی مثل ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور یہ قرآن اللہ کی وحی کے بغیر کسی کے افتراء سے نہیں بنایا گیا لیکن یہ قرآن اس سے پہلے نازل شدہ آسمانی کتابوں کی تصدیق فرمانے والا ہے، اور اس قرآن میں رب العالمین کی طرف سے لکھے ہوئے اُن احکام کی تفصیل ہے جن میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے ○" (یونس: ۳۷)

"وَمَا كَانَ هَٰذَا الْقُرْآنُ أَن يُفْتَرَىٰ مِن دُونِ اللَّهِ": کسائی نے کہا: اس آیت کا معنی یہ ہے کہ یہ قرآن افتراء نہیں ہے اور الفراء نے کہا: اس قرآن کی یہ شان نہیں ہے کہ اس کو افتراء قرار دیا جائے۔

"وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ": لیکن یہ قرآن اُن سابقہ آسمانی کتابوں کی تصدیق ہے یعنی تورات اور انجیل وغیرہ کی، کیونکہ تورات اور انجیل میں بھی رسول اللہ ﷺ اور دینِ اسلام کی بشارت ہے اور تورات اور انجیل میں بھی اللہ تعالیٰ کی توحید اور قیامت پر ایمان لانے کی دعوت ہے۔

"وَتَفْصِيلَ الْكِتَابِ": تفصیل سے مراد اُن چیزوں کو بیان فرمانا ہے جو اس سے پہلے آسمانی کتابوں میں مذکور ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ تفصیل کتاب سے مراد وہ احکام ہیں جو قرآن مجید میں احکام بیان فرمائے گئے ہیں۔

"لَا رَيْبَ فِيهِ مِن رَّبِّ الْعَالَمِينَ": یہ ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے، یعنی قرآن مجید کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''بلکہ مشرکین یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے (یعنی رسولِ اکرم نے) اس قرآن کو اپنے پاس سے گھڑ لیا ہے، آپ کہیے: اگر تم اپنے اس قول میں سچے ہو تو اس قرآن کی کسی سورت کی مثال بنا کر لے آؤ، اور اللہ کے سوا تم اپنے جن مددگاروں کو بلا سکتے ہو ان کو بھی بلا لو O'' (یونس:۳۸)

''اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ'': بلکہ کیا یہ مشرکین یہ کہتے ہیں کہ آپ نے اس قرآن کو گھڑ لیا ہے۔

''قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ'': پہلی آیت میں یہ دلیل ہے کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل فرمایا گیا ہے، کیونکہ یہ اس سے پہلے جو آسمانی کتابیں نازل ہوئی تھیں، ان کی تصدیق کرتا ہے۔ اور یہ قرآن اس سے پہلے آسمانی کتابوں کے موافق ہے حالانکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چیزوں کی کسی سے تعلیم حاصل نہیں کی، اور اس آیت میں یہ بتایا ہے اور یہ حجت قائم فرمائی ہے کہ اگر یہ قرآن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے از خود گھڑ لیا ہے تو تم اس کی کسی ایک سورت کی مثل بنا کر لے آؤ۔

''وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ'': اور اگر تم اپنے اس قول میں سچے ہو تو اللہ کے سوا تم اپنے جن مددگاروں کو بلا سکتے ہو ان کو بھی بلا لو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''بلکہ انہوں نے (اس قول سے) اس قرآن کی تکذیب کی ہے جس کے علم کا وہ احاطہ نہیں کر سکے اور ابھی تک اُن کو اس تکذیب کی سزا بھی نہیں پہنچی، اسی طرح اُن سے پہلی امتوں نے بھی اپنے اپنے رسولوں کی تکذیب کی تھی، پس (اے رسولِ اکرم!) آپ دیکھیں کہ ان ظالموں کا کیسا انجام ہوا!O'' (یونس:۳۹)

''بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ یُحِیْطُوْا بِعِلْمِهٖ'': اس آیت کی تفسیر میں دو قول ہیں:

(۱) ایک قول یہ ہے کہ اس آیت کا یہ معنی ہے کہ قرآن مجید میں جو جنت اور دوزخ کا اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے کا اور جزا اور سزا کا ذکر ہے، یہ مشرکین اُس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ ان کو خود بھی اپنی تکذیب پر یقین نہیں ہے کیونکہ یہ اس میں شک کرتے ہیں۔

''وَلَمَّا یَاْتِهِمْ تَاْوِیْلُهٗ'': اس کی تفسیر میں دو قول ہیں:

(۱) ابھی تک ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی نازل فرمائی ہوئی وعیدوں کی تصدیق نہیں آئی اور تاویل کا معنی ہے جس کی طرف کوئی چیز لوٹائی جائے۔ (۲) اور الزجاج نے کہا: ان کے پاس قرآن مجید کی تاویل کا علم نہیں ہے۔

سفیان بن عیینہ سے کہا گیا کہ ہر انسان اس چیز کا دشمن ہوتا ہے جس سے وہ جاہل ہو، انہوں نے کہا: یہ کتاب اللہ میں مذکور ہے، ان سے پوچھا گیا: کہاں مذکور ہے تو انہوں نے کہا: ''بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ یُحِیْطُوْا بِعِلْمِهٖ''۔ اور حسین بن الفضل سے پوچھا گیا کہ کیا قرآن میں کوئی ایسی آیت ہے کہ جو شخص کسی چیز سے جاہل ہو تو وہ اس سے عداوت رکھتا ہے تو انہوں نے کہا: ہاں دو جگہ پر ہے، ایک تو یہ آیت ہے: ''بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ یُحِیْطُوْا بِعِلْمِهٖ'' اور دوسری یہ آیت ہے: ''وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَوْ

كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ ؕ وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ ﴿۱۱﴾ (الاحقاف: ۱۱)" (کافروں نے مومنوں کے متعلق کہا: "اگر قرآن میں کچھ خوبی ہوتی تو یہ لوگ ہم سے پہلے اس تک نہ پہنچ جاتے"، اور چونکہ انہوں نے قرآن سے ہدایت نہیں پائی اس لئے وہ اب کہیں گے: "یہ قدیم جھوٹ ہے O")۔

"كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ": یعنی آپ دیکھیں کہ مکذبین کو کس طرح ہلاک فرمایا گیا اور کس طرح ان پر عذاب نازل فرمایا گیا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ان مشرکین میں سے بعض قرآن مجید پر ایمان لے آتے ہیں اور بعض ان میں سے اس پر ایمان نہیں لاتے، اور آپ کے رب ان فساد کرنے والوں کو بہت زیادہ جاننے والے ہیں O"

(یونس: ۴۰)

"وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ": ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد اہل مکہ ہیں، یعنی ان اہل مکہ میں سے بعض وہ ہیں جو مستقبل میں ایمان لے آئیں گے خواہ ان کی تکذیب بہت طویل ہو چکی ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ازل میں علم ہے کہ یہ اہل سعادت میں سے ہیں۔

"وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ": اور ان اہل مکہ میں سے بعض وہ ہیں جو اپنی موت تک اپنے کفر پر اصرار کرتے رہیں گے جیسے ابوطالب، ابولہب اور ان جیسے دوسرے کفار۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد اہل کتاب ہیں۔ اور تیسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت تمام کفار کے حق میں عام ہے اور یہی قول زیادہ صحیح ہے۔ "وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ": اور اللہ عزوجل اُن لوگوں کو خوب جاننے والے ہیں جو اپنے کفر پر برقرار رہیں گے۔ اس آیت میں اُن کے لیے تہدید اور دھمکی ہے۔

(زاد المسیر فی علم التفسیر، ج ۴ ص ۳۲۹۔۳۳۲، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۱، الجامع لاحکام القرآن، جز۸ ص ۳۰۶۔۳۱۱، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۱﴾

اور (اے رسول اکرم!) اگر یہ مشرکین آپ کو جھٹلائیں تو آپ ان سے کہیے: میرے لیے میرے عمل کی جزا ہے اور تمہارے لئے تمہارے عمل کی سزا ہوگی، تم میرے کیے ہوئے کاموں سے بری ہو اور میں تمہارے کیے ہوئے کرتوتوں سے بری ہوں O

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۴۲﴾

اور ان مشرکین میں سے بعض وہ ہیں جو آپ کی بات خوب کان لگا کر سنتے ہیں، تو کیا آپ بہروں کو (از خود) سنا سکتے ہیں خواہ وہ کچھ بھی عقل سے کام نہ لیتے ہوں O!

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تَهْدِى الْعُمْىَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۴۳﴾

اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو آپ کی طرف دیکھتے ہیں، تو کیا آپ اندھوں کو (از خود) راستہ دکھا سکتے ہیں خواہ انہیں کچھ بھی دکھائی نہ دیتا ہو!O

إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَٰكِنَّ النَّاسَ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٤٤﴾

بے شک اللہ لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں فرماتے لیکن لوگ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیںO

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَن لَّمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ ۚ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَاءِ اللَّهِ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿٤٥﴾

اور جس دن اللہ اُن سب کو جمع فرمائیں گے (تو وہ یوں محسوس کریں گے کہ) گویا کہ وہ دنیا میں صرف دن کی ایک ساعت میں ٹھہرے تھے حالانکہ وہ ایک دوسرے کو پہچان رہے ہوں گے، بے شک وہ لوگ نقصان زدہ ہیں جنہوں نے اللہ سے ملاقات کو جھٹلایا اور وہ ہدایت یافتہ نہیں ہیںO

وَإِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ ﴿٤٦﴾

ہم ان مشرکین کو جس عذاب سے ڈرا رہے ہیں، اگر اس عذاب کا کچھ حصہ آپ کو ہمیں دکھا دیں یا اس سے پہلے ہی آپ کو وفات دے دیں تب بھی انہوں نے تو بہر طور ہماری ہی طرف لوٹنا ہے، پھر اللہ خود اُن کے تمام کاموں پر گواہ ہیںO

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٤٧﴾

اور ہر امت کے لیے ایک رسول ہیں، پس اُن کے پاس ان کا رسول گیا تو اُن کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلہ فرما دیا گیا اور اُن پر بالکل ظلم نہیں کیا جاتاO

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٤٨﴾

اور مشرکین کہتے ہیں: اے مسلمانو! اگر تم سچے ہو تو یہ بتاؤ کہ عذاب کی یہ وعید کب پوری ہوگی؟O

قُل لَّا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۚ إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿٤٩﴾

آپ کہیے: "میں اپنی جان کے لیے نہ کسی نقصان کا مالک ہوں اور نہ کسی نفع کا مگر جو اللہ چاہیں"، ہر گروہ کے لیے ایک وقت مقرر ہے، جب اُن کا وہ مقرر وقت آ جائے گا تو نہ وہ اس وقت سے ایک ساعت مؤخر ہو سکیں گے اور نہ مقدم ہو سکیں گےO

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَیَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا یَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۵۰

آپ کہیے: ''اے مشرکو! یہ بتاؤ اگر تمہارے پاس رات کے وقت اللہ کا عذاب آجائے یا دن کے وقت اللہ کا عذاب آجائے'' تو مجرم کون سے عذاب کو جلد طلب کر رہے ہیں O

اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝۵۱

تو کیا جب عذاب نازل ہو جائے گا تب تم اس کا یقین کرو گے! (اس وقت کہا جائے گا:) ''اب تم اس عذاب کو مان رہے ہو حالانکہ تم اس کو جلد طلب کرتے تھے''O

ثُمَّ قِیْلَ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۝۵۲

پھر ظالموں سے کہا جائے گا: ''تم دائمی عذاب کا مزا چکھو، اور تمہیں صرف انہی کاموں کی سزا دی جائے گی جو تم کرتے رہے تھے''O

وَیَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؔ قُلْ اِیْ وَرَبِّیْۤ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ؔۚ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ ۝۵۳ؑ

اور (اے رسول اکرم!) یہ مشرکین آپ سے پوچھتے ہیں: ''کیا یہ عذاب برحق ہے؟'' آپ کہیے: ''ہاں میرے رب کی قسم! بے شک یہ عذاب برحق ہے اور تم اللہ کو اس عذاب کے نازل فرمانے سے عاجز نہیں کر سکتے''O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور (اے رسول اکرم!) اگر یہ مشرکین آپ کو جھٹلائیں تو آپ ان سے کہیے: میرے لیے میرے عمل کی جزا ہے اور تمہارے لئے تمہارے عمل کی سزا ہوگی، تم میرے کئے ہوئے کاموں سے بری ہو اور میں تمہارے کئے ہوئے کرتوتوں سے بری ہوں O'' (یونس:۴۱)

امام ابومنصور محمد بن محمد ماتریدی المتوفی ۳۳۳ھ، یونس: ۴۱ تا ۵۳ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّیْ عَمَلِیْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ'': اس آیت کی تاویل یہ ہے کہ میں نے تم کو جو خبریں دی ہیں، اگر بالفرض میں نے اس میں جھوٹ بولا ہو حالانکہ میرے پاس وہ خبریں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہیں تو مجھے اس جھوٹی تبلیغ کی سزا ملے گی اور تم نے جو میری تبلیغ کو رد کیا ہے، اس جرم کی سزا تم کو ملے گی۔

''اَنْتُمْ بَرِیْٓـــُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَ اَنَا بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ'': یعنی مجھ سے تمہارے کئے ہوئے کاموں کا مواخذہ نہیں فرمایا جائے گا اور نہ تم سے میرے کئے ہوئے کاموں پر گرفت فرمائی جائے گی، اور یہ آیت اس کی مثل ہے: ''قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْهِ مَا حُمِّلَ وَ عَلَیْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَ اِنْ تُطِیْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ وَ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ۝ (النور:۵۴)'' (آپ کہیے: ''تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر ان لوگوں نے منہ پھیر لیا تو رسول کے ذمہ وہی تبلیغ ہے جو ان پر لازم فرمائی گئی ہے اور تمہارے ذمہ وہی اطاعت ہے جو تم پر واجب فرمائی گئی ہے، اور اگر تم رسول کی

اطاعت کرو گے تو ہدایت پا جاؤ گے اور رسول کے ذمہ تو صرف پیغام کا صاف صاف پہنچا دینا ہے)۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور ان مشرکین میں سے بعض وہ ہیں جو آپ کی بات خوب کان لگا کر سنتے ہیں، تو کیا آپ بہروں کو (از خود) سنا سکتے ہیں خواہ وہ کچھ بھی عقل سے کام نہ لیتے ہوں ○'' (یونس: ۴۲)

''وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ'': اللہ عزوجل نے یہ خبر فرمائی ہے کہ ان مشرکین میں سے بعض وہ ہیں جو آپ کی بات غور سے سنتے ہیں اور جو آپ قرآن کی آیات تلاوت کرتے ہیں ان کو غور سے سنتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو آپ کی بات اس لئے غور سے سنتے ہیں تاکہ آپ کا مذاق اڑائیں اور آپ کے کلام پر طعن کریں اور اس میں عیب نکالیں۔

''اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ'': پھر اللہ تعالیٰ نے ان مشرکین سے سماعت، عقل اور بصیرت کی نفی فرمائی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جو کچھ اپنے کانوں سے سنتے تھے اور اپنی عقلوں اور آنکھوں اور ان حواس سے کام لیتے تھے تو یہ حواس تو اس کے لیے ہیں جو ان سے نفع اٹھائے اور جو ان سے نفع نہ اٹھائے گویا کہ اس کے وہ حواس نہیں ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو آپ کی طرف دیکھتے ہیں، تو کیا آپ اندھوں کو (از خود) راستہ دکھا سکتے ہیں خواہ انہیں کچھ بھی دکھائی نہ دیتا ہو ○'' (یونس: ۴۳)

''وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ۚ اَفَاَنْتَ تَهْدِى الْعُمْىَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ'': اللہ تعالیٰ نے ان سے ہدایت پانے اور دیکھنے کی نفی فرمائی، کیونکہ بصارت سے انسان راستہ میں چلنے کی ہدایت پاتا ہے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ حیوانات بھی راستہ کو دیکھتے ہیں اور اس میں چلتے ہیں اور راستہ کی ایذا دینے والی چیزوں سے بچتے ہیں اور غور و فکر نہیں کرتے کیونکہ ان کے پاس عقل نہیں ہے جس سے وہ غور و فکر کر سکیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''بے شک اللہ لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں فرماتے لیکن لوگ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں ○'' (یونس: ۴۴)

''اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ'': اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو قبیح اور ناجائز کاموں کے کرنے پر مجبور نہیں فرماتے، وہ خود اپنے اختیار سے ان قبیح اور ناجائز کاموں کا ارتکاب کرتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور جس دن اللہ ان سب کو جمع فرمائیں گے (تو وہ یوں محسوس کریں گے کہ) گویا کہ وہ دنیا میں صرف دن کی ایک ساعت میں ٹھہرے تھے حالانکہ وہ ایک دوسرے کو پہچان رہے ہوں گے، بے شک وہ لوگ نقصان زدہ ہیں جنہوں نے اللہ سے ملاقات کو جھٹلایا اور وہ ہدایت یافتہ نہیں ہیں ○'' (یونس: ۴۵)

مشرکین کا دنیا میں اپنے قیام کی مدت کو قلیل قرار دینے کی وجہ

"ویوم یحشرھم کان لم یلبثوا الا ساعۃ من النھار": جب اللہ تعالیٰ نے ان مشرکین کے متعلق یہ بیان فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی آیات وعید پر غور وفکر نہیں کرتے تو اس کے بعد دوسری وعید فرمائی کہ جس دن ہم ان کو حشر کے دن جمع فرمائیں گے تو وہ یوں کہیں گے کہ ہم تو دنیا میں صرف دن کی ایک گھڑی میں رہے تھے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وہ اپنی قبروں میں یہ کہیں گے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "قل کم لبثتم فی الارض عدد سنین ○ قالوا لبثنا یوما او بعض یوم فسئل العادین ○ (المؤمنون: ۱۱۲۔ ۱۱۳)" (اللہ فرمائیں گے: "اے مشرکو! تم زمین میں کتنے سال رہے ہو؟" ○ وہ کہیں گے: ہم وہاں ایک دن یا دن کا کچھ حصہ رہے ہیں، لہٰذا اعمال کی گنتی کرنے والے فرشتوں سے دریافت فرما لیجئے ○")۔

ابو مسلم محمد بن بحر الاصفہانی المعتزلی المتوفی ۳۲۲ھ، نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا:

جب مشرکین نے اپنی زندگیوں کو دنیا کی طلب میں اور دنیا کی لذات کی حرص میں ضائع کر دیا اور انہوں نے اپنی زندگی سے کوئی نفع نہیں اٹھایا تو ان کی اس زندگی اور اس عمر کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے، اس وجہ سے انہوں نے دنیا میں اپنی زندگی کو بہت کم سمجھا۔

ابوبکر الاصم عبدالرحمن بن کیسان المعتزلی المتوفی ۲۲۵ھ، نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا:

جب مشرکین نے آخرت کے ہیبت ناک احوال کو دیکھا تو یوں کہا، کیونکہ انسان کو جب کسی چیز کا بہت زیادہ خوف ہوتا ہے تو وہ امور ظاہرہ بھول جاتا ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ ان کے نزدیک آخرت کے عذاب کے مقابلہ میں دنیا میں ٹھہرنے کی مدت بہت کم تھی، اس لئے انہوں نے دنیا میں ٹھہرنے کی مدت کو کم قرار دیا۔

"یتعارفون بینھم": اس آیت کا معنی ہے: مشرکین آخرت میں بھی ایک دوسرے کو اس طرح پہچان رہے ہوں گے جس طرح دنیا میں پہچانتے تھے۔

"قد خسر الذین کذبوا بلقاء اللہ": یعنی جب ہم ان کو قیامت کے دن جمع فرمائیں گے اس حال میں کہ وہ ایک دوسرے کو پہچان رہے ہوں گے اور خود یہ اقرار کر رہے ہوں گے کہ وہ لوگ نقصان زدہ ہو گئے جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا انکار کیا۔

"وما کانوا مھتدین": اور وہ اس تجارت کی مصلحتوں کی رعایت کرنے کی ہدایت نہ پا سکے کیونکہ وہ لوگ دنیا کی رنگینیوں میں سے دھوکا کھا گئے اور آخرت سے غافل ہو گئے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ہم ان مشرکین کو جس عذاب سے ڈرا رہے ہیں، اگر اس عذاب کا کچھ حصہ آپ کو ہمیں دکھا دیں یا اس سے پہلے ہی آپ کو وفات دے دیں تب بھی انہوں نے تو بہر طور ہماری ہی طرف لوٹنا ہے، پھر اللہ خود ان کے تمام کاموں پر گواہ ہیں ○" (یونس: ۴۶)

حق پر قائم رہنے والوں کا انجام محمود ہونا اور حق کے مخالفین کا انجام مذموم ہونا

"وَ اِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ":

یا تو ہم آپ کو ہماری وعیدوں میں سے کچھ حصہ دنیا میں دکھا دیں گے یا آپ کو دنیا میں ان وعیدوں میں سے کچھ حصہ دکھانے سے پہلے آپ کو وفات دے دیں گے تو عنقریب آپ ان کے متعلق جو وعیدیں ہیں ان کو آخرت میں دیکھ لیں گے۔

یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو کافروں کی ذلت اور رسوائی دنیا میں بھی دکھائیں گے اور آپ کی وفات کے بعد آخرت میں بھی دکھائیں گے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان میں سے اکثر وعیدوں کا صدق رسول اللہ ﷺ کی حیات کے زمانہ میں ظاہر ہو چکا تھا اور باقی حصہ قیامت کے دن ظاہر ہوگا۔ اور اس میں یہ تنبیہ ہے کہ جو لوگ حق پر قائم ہیں ان کا انجام محمود ہے اور جو حق کے مخالف ہیں، ان کا انجام مذموم ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ہر امت کے لیے ایک رسول ہیں، پس اُن کے پاس ان کا رسول گیا تو اُن کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلہ فرما دیا گیا اور اُن پر بالکل ظلم نہیں فرمایا جاتا O" (یونس: ۴۷)

اللہ تعالیٰ کا ہر قوم کے لیے ایک رسول کو مبعوث فرمانا

"وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ":

جب اللہ تعالیٰ نے اُن کافروں کا حال اُن کی قوم کے ساتھ بیان فرمایا تو اس کے ساتھ یہ بیان فرمایا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کے احوال اپنی قوم کے ساتھ اسی طرح ہیں۔

یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پچھلی قوموں میں سے ہر ایک کی طرف رسول مبعوث فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے گزشتہ امتوں میں سے کسی امت کو مہمل نہیں چھوڑا۔ اس کی تائید درج ذیل آیت سے ہوتی ہے:

"وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ O" (فاطر: ۲۴) "(ہر امت میں اللہ کے عذاب سے ایک ڈرانے والا نبی گزر چکا ہے)۔

اور قرآن مجید کی یہ آیتیں بھی اس موقف پر دلیل ہیں:

(۱) "وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا O" (بنی اسرائیل: ۱۵) "(اور ہم اس وقت تک کسی قوم کو عذاب دینے والے نہیں ہیں حتیٰ کہ اس قوم میں ایک رسول کو بھیج دیں O)۔

(۲) "رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا O" (النساء: ۱۶۵) "(اور ہم نے ثواب کی بشارت دینے والے رسول بھیجے اور عذاب سے ڈرانے والے رسول بھیجے تا کہ رسولوں کے بھیجنے کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کے خلاف کسی عذر کی گنجائش نہ رہے، اور اللہ بہت غالب، بے حد حکمت والے ہیں O)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور مشرکین کہتے ہیں: اے مسلمانو! اگر تم سچے ہو تو یہ بتاؤ کہ عذاب کی یہ وعید کب پوری ہوگی؟ O" (یونس: ۴۸)

"وَ یَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ":

منکرین نبوت کا ایک یہ شبہ بھی تھا کہ جب بھی رسول اللہ ﷺ کفار کو نزول عذاب سے ڈراتے اور کچھ زمانہ گزرنے کے بعد بھی وہ عذاب نہ آتا تو کفار کہتے کہ عذاب کی یہ وعید کب پوری ہوگی اگر تم سچے ہو۔ اور عذاب کے ظاہر نہ ہونے سے انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی نبوت میں طعن کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس شبہ کا اس طرح جواب دیا کہ اللہ کس قوم پر کب عذاب نازل فرمائیں گے، یہ نہ میرے علم میں ہے اور نہ میری قدرت میں ہے، لہٰذا فرمایا:

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "آپ کہیے: "میں اپنی جان کے لیے نہ کسی نقصان کا مالک ہوں اور نہ کسی نفع کا مگر جو اللہ چاہیں"، ہر گروہ کے لیے ایک وقت مقرر ہے، جب اُن کا وہ مقرر وقت آجائے گا تو نہ وہ اس وقت سے ایک ساعت مؤخر ہو سکیں گے اور نہ مقدم ہو سکیں گے ۝" (یونس:۴۹)

"قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا یَسْتَقْدِمُوْنَ":

اس آیت سے مراد یہ ہے کہ دشمنوں پر عذاب کا نازل فرمانا اور اللہ کے دوستوں کی نصرت فرمانا اس پر اللہ عزوجل کے سوا کوئی قادر نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس وعدہ اور وعید کے لیے کوئی وقت معین نہیں فرمایا حتیٰ کہ یہ کہا جاتا کہ یہ وعید کس وقت میں ظاہر ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ کی وعید کے خلاف ہونا اس وقت متحقق ہوتا جب اللہ تعالیٰ نے پہلے سے یہ معین فرمادیا ہوتا کہ فلاں تاریخ کو یا فلاں دن منکرین پر عذاب نازل ہوگا، سو منکرین پر عذاب کو نازل فرمانا اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے، اگر اللہ تعالیٰ نے اُن پر عذاب کے نزول کے لیے کوئی وقت معین فرمایا ہوتا تو پھر یہ کہا جاسکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی وعید کے مطابق اس وقت عذاب نازل نہیں فرمایا۔

شیخ اشرف علی تھانوی دیوبندی متوفی ۱۳۶۲ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

(اے نبی اور اے مسلمانو) یہ وعدہ (عذاب کا) کب (واقع ہوگا) اگر تم سچے ہو (تو واقع کیوں نہیں کرا دیتے) آپ (سب کی طرف سے جواب میں) فرما دیجئے کہ میں (خود) اپنی ذات خاص کے لئے تو کسی نفع (کے حاصل کرنے) کا اور کسی ضرر (کے دفع کرنے کا) اختیار رکھتا ہی نہیں مگر جتنا (اختیار) خدا کو منظور ہو (اتنا اختیار البتہ حاصل ہے پس جب خاص اپنے نفع ونقصان کا مالک نہیں تو دوسرے کے نفع ونقصان کا تو کیونکر مالک ہوں گا پس عذاب واقع کرنا میرے اختیار میں نہیں رہا یہ کہ کب واقع ہوگا سو بات یہ ہے کہ) ہر امت کے (عذاب کے) لئے (اللہ کے نزدیک) ایک معین وقت ہے خواہ دنیا میں یا آخرت میں سو) جب ان کا وہ معین وقت آپہنچتا ہے تو (اس وقت) ایک ساعت نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ آگے سرک سکتے ہیں (بلکہ فوراً عذاب واقع ہو جاتا ہے اسی طرح تمہارے عذاب کا وقت بھی معین ہے اس وقت اس کا وقوع ہو جاوے گا)۔

(تفسیر بیان القرآن، ص ۱۸۷، مکتبہ رحمانیہ اردو بازار، لاہور)

مشہور غیر مقلد عالم نواب صدیق بن حسن القنوجی بھوپالی متوفی ۱۳۰۷ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یعنی میں اپنے لئے کسی نفع کے حصول پر قادر نہیں ہوں اور نہ کسی ضرر کو دور کرنے پر قادر ہوں تو اپنے غیر کے لئے کسی نفع کے حصول یا ضرر کو دفع کرنے پر کیسے قادر ہوں گا، اور اس آیت میں ضرر کے دفع کرنے کو نفع کے حصول پر مقدم فرمایا ہے، کیونکہ کلام کا سیاق اس میں ہے کہ آپ اس وعید کے اظہار کرنے میں عاجز تھے جس وعید کا وہ عجلت سے مطالبہ کرتے تھے اور اس آیت میں "اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ" کا استثناء منقطع ہے جیسا کہ مفسرین نے ذکر کیا ہے اور یہی زمخشری کا قول ہے، لیکن اللہ تعالیٰ جو چاہتے ہیں وہ ہو جاتا ہے، سو میں کیسے اس پر قادر ہوں گا کہ اپنے نفس سے ضرر کو دور کرنے پر قادر ہوں یا نفع کے حصول پر قادر ہوں، اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ استثناء متصل ہے، یعنی جس ضرر کے دور کرنے کو اور جس نفع کے حصول کو اللہ چاہیں اس پر میں قادر ہوں اور پہلا معنی زیادہ بہتر ہے۔

اس آیت میں اُن لوگوں کے لیے بہت زجر و توبیخ ہے جو رسول اللہ ﷺ کو پکارتے ہیں اور مصائب کے نزول کے وقت آپ سے مدد کو طلب کرتے ہیں، جن مصائب کو دور کرنے پر اللہ عزوجل کے سوا کوئی قادر نہیں ہے۔ اور یہ اللہ عزوجل رب العالمین کا مقام ہے جنھوں نے انبیاء اور صالحین کو پیدا فرمایا اور تمام مخلوقین کو رزق عطا فرمایا، اور وہی ان کو زندہ کرتے ہیں اور مارتے ہیں، پس انبیاء میں سے کسی نبی سے یا فرشتوں میں سے کسی فرشتہ سے یا اولیاء اللہ میں سے کسی نیک بندہ سے کیسے اس چیز کو طلب کیا جائے گا جس سے وہ عاجز ہے اور قادر نہیں ہے اور وہ شخص رب الارباب سے طلب کو ترک کرتا ہے جو ہر چیز پر قادر ہیں، خالق ہیں، رازق ہیں، دینے والے ہیں اور منع فرمانے والے ہیں۔

اور اس آیت میں تمہاری نصیحت کے لیے یہ کافی ہے کہ یہ سید ولد آدم اور خاتم الرسل ہیں جن کو اللہ عزوجل یہ حکم فرماتے ہیں کہ وہ اللہ کے بندوں سے یہ کہیں کہ میں اپنے نفس سے کسی ضرر کو دور کرنے کا مالک نہیں ہوں اور نہ اپنی ذات کے لیے کسی نفع کے حصول پر قادر ہوں، تو دوسروں کے لیے کسی ضرر کو دور کرنے اور ان کے لیے نفع کے حصول پر کیسے قادر ہوں گا۔ پس اُن لوگوں پر تعجب ہوتا ہے جو مُردوں کی قبروں پر جم کر بیٹھتے ہیں اور اُن سے اپنی حاجات کو طلب کرتے ہیں، جن حاجات کو پورا کرنے پر اللہ عزوجل کے سوا کوئی قادر نہیں ہے، سو وہ کس طرح سمجھ حاصل نہیں کرتے اور شرک کا ارتکاب کرتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ تعجب اُن علماء پر ہوتا ہے جو اِن لوگوں کو غیر اللہ سے طلب حوائج پر منع نہیں کرتے اور یہ لوگ تو زمانہ جاہلیت کے مشرکین سے بدتر ہیں کیونکہ زمانہ جاہلیت کے مشرکین یہ مانتے تھے کہ اللہ سبحانہٗ وہی خالق ہیں، وہی رازق ہیں، وہی زندہ فرمانے والے ہیں، وہی مارنے والے ہیں، وہی ضرر پہنچانے والے ہیں اور وہی نفع عطا فرمانے والے ہیں، وہ صرف اپنے بتوں کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شفاعت کرنے والا مانتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے قریب کرنے والا مانتے تھے اور اس زمانہ کے قبر پرست لوگ اولیاء اللہ کے لیے ضرر پہنچانے اور نفع دینے کی قدرت مانتے ہیں اور کبھی ان کو استقلالاً پکارتے ہیں اور کبھی اللہ کے ساتھ پکارتے ہیں۔ اللہ شیطان کو رسوا فرمائیں، اس نے اس ذریعہ سے اس امت مبارکہ میں اس قسم کے کفریہ عقائد ڈال دیے۔

(فتح البیان فی مقاصد القرآن، ج ۳ ص ۲۳۵-۲۳۶، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

اس آیت کی تفسیر میں اسی طرح کی تفسیر ایک اور غیر مقلد عالم شیخ محمد بن علی بن محمد شوکانی المتوفی ۱۲۵۰ھ نے لکھی ہے اور نواب صدیق حسن بھوپالی کی تفسیر شیخ شوکانی کی تفسیر ہی کا چربہ ہے۔ (فتح القدیر، ج ۲ ص ۶۳۱، دارالوفا، بیروت، المنصورہ، ۱۴۱۸ھ)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

بعض محققین کا یہ نظریہ ہے کہ بندہ کے لیے قدرت ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے اذن سے موثر ہوتی ہے، اور اس آیت کا معنی یہ ہے کہ میں کسی ضرر یا نفع پہنچانے پر قادر نہیں ہوں مگر جس کو اللہ چاہے تو میں اُن کی مشیت سے نفع اور ضرر پہنچانے پر قادر ہوتا ہوں۔

مصنف کا نواب صدیق حسن بھوپالی اور قاضی شوکانی کی تفسیر کا رد کرنا

میں کہتا ہوں کہ نواب صدیق حسن بھوپالی اور قاضی شوکانی نے یونس: ۴۹ کی تفسیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مطلقاً نفع رسانی اور دفع ضرر کی نفی کر دی ہے، حالانکہ قرآن مجید کی متعدد آیات سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نفع پہنچانا ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا نَقَمُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ (التوبہ: ۷۴)

اور ان منافقین کو صرف یہ ناگوار ہوا کہ اللہ نے اور اس کے رسول نے مسلمانوں کو اپنے فضل سے خوش حال بنا دیا۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَیُؤْتِیْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗ (التوبہ: ۵۹)

کاش وہ اس سے راضی ہو جاتے جو اُن کو اللہ عزوجل نے اور اس کے رسول نے عطا فرمایا تھا اور کہتے: ہمیں اللہ کافی ہے، اور عنقریب اللہ اپنے فضل سے اور اس کے رسول (اپنے فضل سے) عطا فرمائیں گے۔

اِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْۤ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْهِ (الاحزاب: ۳۷)

اور جب آپ اس شخص سے کہتے تھے جس پر اللہ نے انعام فرمایا اور آپ نے انعام کیا۔

اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ یونس: ۴۹ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطلقاً ضرر سے دور کرنے اور مطلقاً نفع پہنچانے کی نفی نہیں فرمائی ہے بلکہ اس آیت کا محمل یہ ہے کہ میں کسی سے بالذات ضرر کو دور نہیں کر سکتا اور نہ بالذات کسی کو نفع پہنچا سکتا ہوں، ہاں جس پر اللہ تعالیٰ مجھے قدرت عطا فرمائیں اس سے میں ضرر بھی دور کرتا ہوں اور نفع بھی پہنچاتا ہوں۔ اور بالذات کی قید پر دلیل یہ حدیث ہے:

ربیعہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حجر اسود کے پاس آئے، پس اس کو بوسہ دیا، پھر کہا: میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے تو نقصان پہنچا سکتا ہے نہ نفع دے سکتا ہے اور اگر میں نے یہ نہ دیکھا ہوتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تجھے بوسہ دیتے تھے تو میں تجھے بوسہ نہ دیتا۔

(صحیح البخاری: ۱۵۹۷، ۱۶۱۰، صحیح مسلم: ۱۲۷۰، الرقم المسلسل: ۳۰۱۳، سنن ابوداؤد: ۱۸۷۳، سنن ترمذی: ۸۶۱، سنن نسائی: ۲۹۳۳، سنن ابن ماجہ: ۲۹۴۳، سنن کبریٰ: ۳۹۱۸، مصنف عبدالرزاق: ۹۰۳۳، مسند البزار: ۲۵۰، مسند الحمیدی: ۹، مسند احمد: ۲۲۹، موسسۃ الرسالہ، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

جن آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نفع رسانی اور ضرر سے دور کرنے کی نفی ہے، ہم اس کی شرح میں یہ لکھتے ہیں کہ ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ آپ بالذات کسی کو نفع یا ضرر نہیں پہنچا سکتے، تو غیر مقلد اور دیوبندی علماء یہ کہتے ہیں کہ آپ نے ان آیات میں بالذات کی قید اپنی طرف سے لگائی ہے، قرآن مجید میں تو مطلقاً نفع یا ضرر پہنچانے کی نفی فرمائی ہے، ہم کہتے ہیں کہ آپ کے مستند غیر مقلد اور دیوبندی علماء نے بھی حجر اسود کی نفع رسانی اور ضرر سے دور کرنے کی نفی کو بالذات پر محمول کیا ہے۔

غیر مقلدین علماء کا حجر اسود کی نفع رسانی کی نفی کو بالذات پر محمول کرنا

مشہور غیر مقلد صدیق بن حسن الحسینی القنوجی غیر مقلد، متوفی ۱۳۰۷ھ، اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خطرہ ہوا کہ جب وہ حجر اسود کی تعظیم کریں گے تو کہیں عام عرب ایسا نہ سمجھیں کہ یہ بھی زمانہ جاہلیت کی

طرح پتھروں کی تعظیم ہے، پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ ارادہ کیا کہ لوگوں کو یہ بتلائیں کہ اُن کا حجر اسود کی تعظیم کرنا محض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کی اتباع کی وجہ سے تھا، نہ اس لیے کہ حجر اسود بالذات نفع دیتا ہے اور بالذات نقصان پہنچاتا ہے۔

(عون الباری لحل ادلۃ صحیح البخاری ج ۳ ص ۱۲۳، دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۲۹ھ)

نیز شیخ محمد صدیق حسن خان بھوپالی المتوفی ۱۳۰۷ھ، صحیح مسلم کی اپنی شرح میں لکھتے ہیں:

پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ ارادہ کیا کہ لوگوں کو یہ تعلیم دیں کہ اُن کا حجر اسود کی تعظیم کرنا محض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کی اتباع کی وجہ سے تھا نہ اس وجہ سے کہ حجر اسود بالذات ضرر پہنچاتا ہے اور بالذات نفع پہنچاتا ہے جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں بت پرستوں کا یہ اعتقاد تھا۔ (السراج الوہاج فی کشف مطالب مسلم بن الحجاج للحافظ المنذری ج ۳ ص ۱۷۵، دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۲۵ھ)

مشہور غیر مقلد عالم محمد بن عبدالرحمن بن عبدالرحیم المبارک پوری متوفی ۱۳۵۳ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

امام ابن جریر طبری نے کہا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا کہ تو ایک پتھر ہے نہ نقصان پہنچا سکتا ہے نہ نفع دے سکتا ہے، یہ اس لیے فرمایا تھا کہ اُن دنوں لوگ بت پرستی کے ایام کے قریب تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خوف دامن گیر ہوا کہ جاہل لوگ یہ گمان کریں گے کہ پتھر کی تعظیم کرنا اس باب سے ہے جس میں بعض پتھروں کی تعظیم کی جاتی ہے جیسا کہ عرب زمانہ جاہلیت میں پتھروں کی تعظیم کرتے تھے، پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ ارادہ کیا کہ لوگوں کو اس کی تعلیم دیں کہ اُن کا حجر اسود کو بوسہ دینا اور اس کی تعظیم کرنا صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کی اتباع کی وجہ سے تھا نہ اس وجہ سے کہ حجر اسود بذاتہٖ نفع پہنچاتا ہے یا بذاتہٖ نقصان پہنچاتا ہے۔

(تحفۃ الاحوذی بشرح جامع الترمذی ج ۳ ص ۷۰۳، داراحیاء التراث العربی، بیروت ۱۴۱۹ھ)

علماء دیوبند کا حجر اسود کی نفع رسانی کی نفی کو بالذات پر محمول کرنا

مشہور دیوبندی عالم شیخ شبیر احمد عثمانی دیوبندی متوفی ۱۳۶۹ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

حجر اسود بذاتہٖ نفع اور نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ (فتح الملہم ج ۳ ص ۳۲۲، ۳۲۳، مطبوعہ مکتبۃ الحجاز، کراچی)

دوسرے مشہور دیوبندی عالم شیخ خلیل احمد سہارن پوری متوفی ۱۳۴۶ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

"لا لان الحجر ینفع ویضر بذاتہ" یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مراد یہ تھی کہ حجر اسود بذاتہٖ نفع اور نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

(بذل المجہود ج ۳ ص ۱۴۰، مکتبہ قاسمیہ ملتان)

اور جب ایک پتھر کی نفع رسانی کی نفی بالذات پر محمول ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نفع رسانی کی نفی بدرجہ اولیٰ بالذات پر محمول ہے۔

دیگر جمہور اہل سنت کے علماء کا اس حدیث میں حجر اسود کی نفی کو بالذات پر محمول کرنا

علامہ عینی حنفی نے لکھا ہے کہ حجر اسود بغیر اذن الٰہی کے نفع اور نقصان نہیں پہنچاتا۔ (عمدۃ القاری ج ۹ ص ۲۴۰) علامہ باجی مالکی نے لکھا ہے کہ حجر اسود بالذات نفع اور نقصان نہیں پہنچاتا۔ (منتقیٰ ج ۲ ص ۵۶) ملا علی قاری حنفی نے بھی لکھا ہے کہ حجر اسود بالذات نفع اور نقصان نہیں پہنچاتا۔ (مرقات ج ۵ ص ۳۲۵)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو حجر اسود کو مخاطب کر کے فرمایا تھا "تو ایک پتھر ہے اور میں خوب جانتا ہوں کہ تو نفع اور نقصان نہیں پہنچا سکتا" اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مراد بیان کرتے ہوئے متقدمین علماء اسلام اور خصوصاً علماء غیر مقلدین اور علماء دیوبند سب ہی نے

بالذات کی قید لگائی ہے کہ حجر اسود بالذات نفع اور نقصان نہیں پہنچا سکتا، جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں جو نفع رکھا ہے کہ وہ مسلمانوں کے حق میں حج کی گواہی دے گا وہ یہ نفع ضرور پہنچائے گا۔ اسی اسلوب پر کہا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید میں ہے: "قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ۔۔۔ (الاعراف: ۱۸۸)" ((اے رسول اکرم!) آپ کہیے: میں اپنی جان کے لیے (از خود) نہ کسی نفع کا مالک ہوں اور نہ کسی نقصان کا، سوا اس کے جو اللہ چاہے)۔ علماء اہل سنت یہاں بھی بالذات کی قید لگاتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بذاتہ نفع اور ضرر نہیں پہنچاتے لیکن اللہ تعالیٰ نے جو آپ میں نفع رکھا ہے وہ نفع آپ پہنچاتے ہیں کہ آپ کا کلمہ پڑھنے، آپ کی تبلیغ اور آپ کی شفاعت سے اربہا انسانوں کو نفع پہنچے گا اور وہ سب آپ کی وجہ سے جنت میں جائیں گے۔ یہ کوئی کم نفع ہے؟ لیکن علماء نجد اور علماء دیو بند اس کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بالذات کی قید لگانا اور ذاتی اور عطائی اختیارات کی تقسیم خالص مشرکانہ عقیدہ ہے اور یہ قید خانہ زاد اور سینہ زاد ہے قرآن مجید نے آپ کی ذات سے مطلقاً نفع رسانی کی نفی کر دی ہے اور ذاتی اور عطائی کی تقسیم اہل بدعت کی ایجاد اور اختراع ہے وغیرہ وغیرہ، ہم کہتے ہیں کہ آپ ایک پتھر (حجر اسود) کی نفع رسانی ثابت کرنے کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول "لا تنفع" میں بالذات کی قید لگائیں تو کوئی حرج نہیں ہے اور اگر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نفع رسانی ثابت کرنے کے لیے "لا املک لنفسی" میں بالذات کی قید لگائیں تو مجرم قرار پائیں! یہ کہاں کا انصاف ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نفع رسانی سے کون انکار کر سکتا ہے کہ انسان محمد رسول اللہ کہے تو جنت کا مستحق ہو جاتا ہے بلکہ اس وقت تک کوئی شخص جنت کا مستحق نہیں ہوگا جب تک وہ محمد رسول اللہ نہیں کہے گا، اللہ اکبر! جن کے نام کی نفع رسانی کا یہ مقام ہے ان کی ذات کی نفع رسانی کا کیا عالم ہوگا! اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نفع رسانی کا انکار کرتا ہے وہ آپ کا نام نہ لے اور ہمیں جنت میں جا کر دکھلا دے۔ (سعیدی غفرلہٗ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "آپ کہیے: "اے مشرکو! یہ بتاؤ اگر تمہارے پاس رات کے وقت اللہ کا عذاب آ جائے یا دن کے وقت اللہ کا عذاب آ جائے" تو مجرم کون سے عذاب کو جلد طلب کر رہے ہیں O" (یونس: ۵۰)

شیخ محمد علی صابونی، الاستاذ بکلیۃ الشریعۃ والدراسات الاسلامیہ بمکۃ المکرمۃ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَیَاتًا اَوْ نَهَارًا": یعنی ان مکذبین سے آپ کہیے: مجھے یہ خبر دو کہ اگر اللہ تعالیٰ کا عذاب رات کے وقت یا دن کے وقت آ جائے تو تمہیں اس میں کون نفع پہنچائے گا۔

"مَّاذَا یَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ": یہ استفہام ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ کیا تم اپنے ایمان لانے کو مؤخر کر رہے ہو اور جب عذاب واقع ہو جائے گا اور تم اس کو دیکھ لو گے تو پھر تمہارے ایمان لانے کا کیا فائدہ ہوگا، کیونکہ اس وقت تو ایمان فائدہ نہیں دیتا۔

اور امام ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ نے کہا ہے: اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اے مشرکو! جب تم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب واقع ہو جائے گا تو تم اس حال میں اللہ تعالیٰ کی تصدیق کرو گے حالانکہ اس حال میں تمہاری تصدیق تمہیں نفع نہیں پہنچائے گی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "تو کیا جب عذاب نازل ہو جائے گا تب تم اس کا یقین کرو گے! (اس وقت کہا جائے گا:) "اب تم اس عذاب کو مان رہے ہو حالانکہ تم اس کو جلد طلب کرتے تھے O" (یونس: ۵۱)

"اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ": یعنی اُن سے کہا جائے گا کہ اے مجرمو! تم اب ایمان لارہے ہو اور اس سے پہلے تم اللہ تعالیٰ کی آیات کا استہزاء کرتے تھے اور مذاق اڑاتے تھے اور عذاب کے جلد نزول کو طلب کرتے تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پھر ظالموں سے کہا جائے گا: "تم دائمی عذاب کا مزا چکھو، اور تمہیں صرف انہی کاموں کی سزا دی جائے گی جو تم کرتے رہے تھے" O (یونس: ۵۲)

"ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ": یعنی تم اس عذاب کو چکھو جو دائمی ہے اور اس عذاب کا نہ زوال ہوگا اور نہ وہ فنا ہوگا۔ "هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ": یعنی تمہیں صرف تمہارے کفر کو اختیار کرنے اور تکذیب کرنے کی سزا دی جارہی ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور (اے رسولِ اکرم!) یہ مشرکین آپ سے پوچھتے ہیں: "کیا یہ عذاب برحق ہے؟" آپ کہیے: "ہاں میرے رب کی قسم! بے شک یہ عذاب برحق ہے اور تم اللہ کو اس عذاب کے نازل فرمانے سے عاجز نہیں کر سکتے" O" (یونس: ۵۳)

"وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ": یعنی اے محمد! صلی اللہ علیک وسلم، یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ آپ نے جس عذاب کا ہم پر نازل ہونے کا وعدہ کیا ہے اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے کا وعدہ کیا ہے، کیا آپ کا یہ وعدہ برحق اور سچا ہے۔

"قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ": یعنی آپ کہیے: ہاں اور اللہ کی قسم! یہ عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ "وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ": یعنی تم اس عذاب سے بھاگ کر یا عذاب کو خود سے روک کر اللہ تعالیٰ کو عذاب کے نزول سے عاجز کرنے والے نہیں ہو، بلکہ تم اس کی سلطنت اور اس کے قبضہ میں ہو۔

(تاویلات اہل السنۃ، ج ۶ ص ۳۲ _ ۵۲، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۶ھ، تفسیر الکبیر ج ۶ ص ۲۵۶ _ ۲۶۴، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ، صفوۃ التفاسیر ص ۳۶۴، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۵۴﴾

اور اگر ہر ظلم کرنے والے کی ملکیت میں تمام روئے زمین ہوتی تو ضرور وہ اپنے (آپ کو) عذاب سے چھڑانے کے لیے ساری روئے زمین کی دولت دے ڈالتا اور جب وہ اپنے گناہوں کے عذاب کو دیکھیں گے تو اپنے دل میں نادم ہوں گے اور اُن کے خلاف عدل کے ساتھ فیصلہ فرمایا جائے گا اور ان پر بالکل ظلم نہیں کیا جائے گا O

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾

سنو! آسمانوں اور زمینوں کی تمام چیزیں اللہ ہی کی ملکیت میں ہیں، سنو! بے شک اللہ کا وعدہ برحق ہے لیکن اکثر ظالموں کو اس کا علم

نہیں ہے O

هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٥٦﴾

وہی زندہ فرماتے ہیں اور وہی مارتے ہیں اور ان ہی کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے O

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٥٧﴾

اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آچکی ہے اور گمراہوں کے سینوں میں جو بیماریاں ہیں ان کی ہدایت کی شفاء (یعنی قرآن مجید آچکا ہے) جو مومنین کے لیے ہدایت اور رحمت ہے O

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿٥٨﴾

(اے رسول اکرم!) آپ کہیے: یہ ہدایت اللہ کے فضل اور ان کی رحمت سے ہے اور اسی پر مسلمانوں کو خوش ہونا چاہیے، اور یہ ہدایت اس مال سے بہتر ہے جو لوگ جمع کرتے ہیں O

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ﴿٥٩﴾

آپ کہیے: تمہارے لئے اللہ نے جو رزق نازل فرمایا ہے جس میں سے تم نے بعض کو از خود حرام قرار دیا اور بعض کو از خود حلال کر ڈالا، آپ کہیے: کیا اللہ نے تمہیں (اس حلال اور حرام کرنے کی) اجازت دی تھی یا تم اللہ پر بہتان تراش رہے ہو؟ O

وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٦٠﴾

اور وہ لوگ جو اللہ پر ناحق جھوٹا بہتان باندھتے ہیں، ان کا قیامت کے دن کے متعلق کیا گمان ہے؟ بے شک اللہ لوگوں پر فضل و کرم فرمانے والے ہیں لیکن اکثر لوگ اللہ کا شکر ادا نہیں کرتے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور اگر ہر ظلم کرنے والے کی ملکیت میں تمام روئے زمین ہوتی تو ضرور وہ اپنے (آپ کو) عذاب سے چھڑانے کے لیے ساری روئے زمین کی دولت دے ڈالتا اور جب وہ اپنے گناہوں کے عذاب کو دیکھیں گے تو اپنے دل میں نادم ہوں گے اور اُن کے خلاف عدل کے ساتھ فیصلہ فرمایا جائے گا اور ان پر بالکل ظلم نہیں کیا جائے گا O'' (یونس: ۵۴)

ربع

قیامت کے دن دوزخ کے عذاب سے فدیہ میں روئے زمین کی تمام دولت کا ناکافی ہونا

علامہ ابومحمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ، یونس: ۵۴ تا ۶۰ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ'': یعنی اگر شرک کرنے والے ظالموں کے پاس ''مَا فِی الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ'': روئے زمین کی تمام دولت ہوتی تو وہ قیامت کے عذاب سے بچنے کے لیے اس ساری دولت کو خرچ کر ڈالتے۔

''وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ'': امام ابوعبیدہ نے کہا: اور انہوں نے اپنے دلوں میں چھپی ہوئی ندامت کو ظاہر کیا، کیونکہ اُس دن کسی چیز کو چھپانا کام نہیں آئے گا، دوسرا قول یہ ہے کہ اس آیت کا معنی ہے: کفر کرنے والے ظالموں کے بڑے بڑے سرداروں نے پسماندہ لوگوں سے اپنے دلوں میں چھپی ہوئی ندامت کو ظاہر کیا، کیونکہ اُن کو ڈر تھا کہ یہ پسماندہ لوگ ان کو ملامت کریں گے اور اُن کے کاموں پر عار دلائیں گے۔

''لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ'': جب وہ سب اپنے کرتوتوں کا عذاب دیکھ لیں گے۔

''وَقُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ'': اور اللہ عزوجل اُن کو عذاب دے کر فارغ ہو جائیں گے۔

''وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ'' اور اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''سنو! آسمانوں اور زمینوں کی تمام چیزیں اللہ ہی کی ملکیت میں ہیں، سنو! بے شک اللہ کا وعدہ برحق ہے لیکن اکثر ظالموں کو اس کا علم نہیں ہے ''O'' (یونس: ۵۵)

آسمانوں اور زمینوں کی تمام چیزوں کا اللہ عزوجل کی ملکیت میں ہونا

''اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'': یعنی اللہ جل وعلا ارشاد فرماتے ہیں: آسمانوں اور زمینوں میں جو چیز بھی ہے وہ صرف اللہ عزوجل کی ملکیت ہے اور کسی دوسرے کا اس میں اختیار نہیں ہے، پس کافر کی ملک میں اس دن کوئی چیز نہیں ہوگی جس کا وہ اپنے رب کے عذاب سے فدیہ دے سکے۔

''اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ'': سنو! اللہ عزوجل نے ان ظالموں کو جو عذاب دینے کی وعید فرمائی ہے وہ برحق ہے اور اُن پر وہ عذاب یقیناً واقع ہوگا لیکن اکثر یہ مشرکین اور ظالمین اس بات کو نہیں جانتے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''وہی زندہ فرماتے ہیں اور وہی مارتے ہیں اور ان ہی کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے ''O'' (یونس: ۵۶)

''هُوَ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ'': اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں کہ بے شک اللہ ہی زندہ فرمانے والے ہیں اور وہی مارنے والے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اِن مشرکین اور ظالمین کے متعلق جو کرنا چاہیں خواہ انہیں زندہ چھوڑنا چاہیں یا مارنا چاہیں اُن میں سے ہر چیز ان کی قدرت اور ان کے اختیار میں ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آچکی ہے اور گمراہوں

کے سینوں میں جو بیماریاں ہیں ان کی ہدایت کی شفاء (یعنی قرآن مجید آچکا ہے) جو مومنین کے لیے ہدایت اور رحمت ہےO" (یونس: ۵۷)

قرآن مجید کی آیات کا ہدایت اور شفاء ہونا

"یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ": یعنی اے لوگو! بے شک تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایسی نصیحت آگئی ہے جو بے حیائی اور برائی کے کاموں سے زجر و توبیخ کرنے والی ہے۔

"وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ": اور منکرین کے دلوں میں جو اسلام کے خلاف شکوک و شبہات ہیں اور کفر کی نجاستیں ہیں اُن کو زائل کرنے والی اور دھونے والی ہیں۔

"وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ": اور اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت اور رحمت حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ صرف مومنین اور مصدقین کے لیے ہے اور اللہ تعالیٰ کی آیات پر یقین رکھنے والوں کے لیے ہے، اور اس کی مثل یہ آیت ہے:

"وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۙ وَلَا یَزِیْدُ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا خَسَارًا ۝ (بنی اسرائیل: ۸۲)" (اور ہم قرآن نازل فرماتے ہیں جو مومنین کے لیے سراپا شفاء اور رحمت ہے اور وہ ظالموں کے ظلم میں صرف نقصان ہی کا اضافہ کرتا ہےO)۔

نیز اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "قُلْ هُوَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ؕ وَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَیْهِمْ عَمًى ؕ اُولٰٓئِكَ یُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِیْدٍ ۝ (حم السجدہ: ۴۴)" (آپ کہیے: "قرآن مجید ایمان والوں کے لئے مکمل ہدایت اور روحانی شفاء ہے اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے اُن کے لئے یہ قرآن اُن کے کانوں میں ڈاٹ ہے اور اُن کی آنکھوں پر ہدایت سے تاریکی ہے گویا اُن کو دور سے پکارا جا رہا ہےO")۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: " (اے رسول اکرم!) آپ کہیے: یہ ہدایت اللہ کے فضل اور ان کی رحمت سے ہے اور اسی پر مسلمانوں کو خوش ہونا چاہیے، اور یہ ہدایت اس مال سے بہتر ہے جو لوگ جمع کرتے ہیںO" (یونس: ۵۸)

دنیاوی مال و دولت کے بجائے اللہ تعالیٰ کے فضل اور ان کی رحمت پر خوشی منانے کا استحقاق

"قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا": آپ کہیے کہ مومنوں کے پاس جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت اور برحق دین آچکا ہے، وہ اس پر خوشی منائیں، کیونکہ جن نعمتوں پر وہ خوش ہوتے ہیں ان میں سب سے بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کا فضل اور ان کی رحمت ہے۔

"هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ": یعنی وہ دنیا کی خوش نما اور تر و تازہ چیزوں سے خوش ہوتے ہیں حالانکہ وہ چیزیں فانی ہیں اور جانے والی ہیں۔ اسی طرح امام ابن ابی حاتم نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے۔

صفوان بن عمرو نے بیان کیا کہ میں نے ایفع بن عبد اللہ الکلاعی سے سنا، وہ بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس عراق کا خراج آیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور اُن کے آزاد کردہ غلام آئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس مال میں سے اونٹوں کا شمار کر رہے تھے، اُن اونٹوں کی تعداد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے شمار سے بہت زیادہ تھی، تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: الحمد للہ، اور اُن کے آزاد کردہ غلام

نے کہا: اے امیر المومنین! یہ مال اللہ تعالیٰ کے فضل اور اُن کی رحمت سے ہے اور اسی پر خوش ہونا چاہیے۔ (یونس:٥٨)، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم نے جھوٹ کہا، تمہیں یوں کہنا چاہیے تھا کہ اللہ تعالیٰ کی نازل فرمائی ہوئی ہدایت اور سنت اور قرآن مجید وہ ان اموال دنیا سے بہتر ہے جس کو لوگ جمع کرتے ہیں، اور یہ دنیاوی مال اُن چیزوں میں سے ہے جن کو جمع کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ" ۔یعنی یہ دنیاوی مال و اسباب اس لائق نہیں کہ اس پر خوشی منائی جائے، خوشی منانے کے لائق تو اللہ تعالیٰ کا عطا فرمایا ہوا دینِ برحق ہے۔ اس حدیث کی روایت حافظ ابو القاسم الطبرانی نے از ابوزرعہ الدمشقی سے از حیوۃ بن شریح کی ہے۔

(مسند الشامیین للطبرانی:٧، ١٠٣، حلیۃ الاولیاء للامام ابی نعیم احمد بن عبد اللہ شافعی متوفی ٤٣٠ھ، ج ٥ ص ٣٢)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "آپ کہیے: تمہارے لئے اللہ نے جو رزق نازل فرمایا ہے جس میں سے تم نے بعض کو از خود حرام قرار دیا اور بعض کو از خود حلال کر ڈالا، آپ کہیے: کیا اللہ نے تمہیں (اس حلال اور حرام کرنے کی) اجازت دی تھی یا تم اللہ پر بہتان تراش رہے ہو؟O" (یونس:٥٩)

از خود کسی چیز کو حلال یا قرار دینے کی ممانعت

"قُلْ اَرَءَیْتُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ":
ان مشرکین نے کھیتوں اور مویشیوں میں سے بعض چیزوں کو حلال قرار کر ڈالا جیسے مویشیوں میں سے البحیرۃ، السائبۃ، الوصیلہ اور الحامی کو حرام قرار دے ڈالا، الضحاک نے کہا: یہ آیت اللہ عزوجل کے اس ارشاد کی مثل ہے:

"وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِیْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآىٕنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآىٕهِمْ فَلَا یَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ یَصِلُ اِلٰى شُرَكَآىٕهِمْ ؕ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ ۝ (الانعام:١٣٦)" (اور (ان مشرکین نے) کھیتوں اور مویشیوں میں سے اللہ کا ایک حصہ مقرر کر لیا، سو انہوں نے کہا: یہ (حصہ) اُن کے زعم میں اللہ کا ہے اور یہ (دوسرا حصہ) ہمارے شریکوں کا ہے، سو جو حصہ اُن کے شریکوں کا ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا، اور جو حصہ انہوں نے اللہ کا قرار دیا ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے، یہ (مشرکین) کیسا غیر منصفانہ فیصلہ کرتے ہیں O)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، الضحاک، قتادہ اور عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم نے کہا: یہ آیت مشرکین کے اس قول کا رد فرمانے کے لیے نازل ہوئی ہے کہ وہ بعض چیزوں کو حرام قرار دیتے تھے اور بعض چیزوں کو حلال قرار دیتے تھے۔ البحائر، السوائب اور الوصائل کو حرام قرار دیتے تھے جیسے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِیْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآىٕنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآىٕهِمْ فَلَا یَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ یَصِلُ اِلٰى شُرَكَآىٕهِمْ ؕ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ ۝ (الانعام:١٣٦)"۔

امام احمد بن حنبل نے از ابواسحاق یہ روایت کی ہے کہ میں نے ابوالاحوص سے سنا اور وہ عوف بن مالک بن نضلہ ہیں، وہ اپنے والد سے روایت کر کے بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور میرے کپڑے گرد و غبار سے اٹے

ہوئے تھے اور میں برے حال میں تھا، آپ نے پوچھا: تمہیں اللہ تعالیٰ نے جو مال عطا فرمایا ہے وہ تم پر دکھائی دینا چاہیے، اور فرمایا: کیا تم لوگوں کے اونٹ صحیح سالم بچے دیتے ہیں، پھر تم استرا لے کر ان کے کان کاٹ ڈالتے ہو اور کہتے ہو کہ یہ بحیرہ ہیں، اور تم اُن کی کھالوں کو چیر ڈالتے ہو اور کہتے ہو: یہ حُرم ہیں، اور تم اُن کو اپنے اوپر اور اپنے اہل و عیال پر حرام قرار دیتے ہو؟ اس نے کہا: جی ہاں! آپ نے فرمایا: پس بے شک تمہیں جو اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا ہے وہ تمہارے لیے حلال ہے۔ پھر مکمل حدیث ذکر کی۔

پھر دوسری سند کے ساتھ اس کو حضرت ابو الاحوص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا اور یہ حدیث جید اور قوی الاسناد ہے، اس میں یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں پر انکار فرمایا ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے حرام فرمائے ہوئے کو حلال کر ڈالا اور اللہ تعالیٰ کے حلال فرمائے کو محض اپنی خواہشوں سے حرام قرار دے ڈالا اور ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے اُن کو قیامت کے دن کے عذاب سے ڈرایا ہے۔

(مسند احمد: ۱۵۸۸۸، مسند ابو داؤد طیالسی: ۱۳۰۳، شرح مشکل الآثار للطحاوی: ۱: ۳۰۴۱، صحیح ابن حبان: ۵۴۱۶، ۱، المعجم الکبیر للطبرانی ج ۱۹ ص ۶۰۸، مستدرک للحاکم ج ۱ ص ۲۴۔۲۵، الاسماء والصفات للبیہقی: ص ۳۳۱۔۳۳۲)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وہ لوگ جو اللہ پر ناحق جھوٹا بہتان باندھتے ہیں، ان کا قیامت کے دن کے متعلق کیا گمان ہے؟ بے شک اللہ لوگوں پر فضل و کرم فرمانے والے ہیں لیکن اکثر لوگ اللہ کا شکر ادا نہیں کرتے O"

(یونس: ٦٠)

"وَمَا ظَنُّ الَّذِیۡنَ یَفۡتَرُوۡنَ عَلَی اللّٰهِ الۡکَذِبَ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ": ان کا کیا گمان ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کے جھوٹ کی ان کو کیا سزا دیں گے۔

"اِنَّ اللّٰهَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَهُمۡ لَا یَشۡکُرُوۡنَ": بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر اپنا فضل فرمانے والے ہیں جب اُن کو دنیا میں جلد عذاب نہیں دیتے، لیکن اکثر لوگ اس عذاب کو مؤخر فرمانے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کرتے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل کے امیدوار تین مردوں کی مثالیں

امام ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ کی ولایت کے اہل میں سے چند لوگوں کو لایا جائے گا، پس اللہ تعالیٰ کے سامنے تین قسم کے لوگ کھڑے ہوں گے، پھر پہلی قسم میں سے ایک مرد کو اللہ تعالیٰ کے سامنے لایا جائے گا، اللہ عزوجل استفسار فرمائیں گے: اے میرے بندے! تو نے کیا عمل کیا؟ پس وہ بندہ عرض کرے گا: اے میرے رب! آپ نے جنت کو پیدا فرمایا اور اس کے درختوں کو اور اس کے پھلوں کو اور اس کے دریاؤں کو اور اس کی حوروں کو اور اس کی دیگر نعمتوں کو اور وہ جو آپ نے آپ کے اطاعت گزاروں کے لیے تیار فرمایا، پس میں ساری رات جاگ کر قیام کرتا رہا اور سارا دن روزہ رکھتا رہا اور ان نعمتوں کے شوق میں منتظر رہا، اللہ عزوجل ارشاد فرمائیں گے: اے میرے بندے! تو نے جنت کے لیے عمل کیا، تو یہ جنت ہے تو اس جنت میں داخل ہو جا، اور میں نے اپنے فضل سے تجھے دوزخ کے عذاب سے آزاد فرما دیا، راوی نے کہا: پس وہ بھی جنت میں داخل ہو جائے گا اور جو اس کے

ساتھ ہوں گے وہ بھی جنت میں داخل ہو جائیں گے، پھر دوسری قسم میں سے ایک بندے کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا جائے گا، اللہ عزوجل استفسار فرمائیں گے: اے میرے بندے! تو نے کیا عمل کیا؟ وہ عرض کرے گا: اے میرے رب! آپ نے دوزخ کو پیدا فرمایا اور دوزخ میں طوقوں اور زنجیروں کو پیدا فرمایا اور بھڑکتی ہوئی آگ کو پیدا فرمایا، اور آپ نے عذاب کے مستحقین کے لیے اس میں جو پیدا فرمایا اور نافرمانوں کے لیے اس میں جو پیدا فرمایا، اس دوزخ کے عذاب کے خوف سے میں ساری رات بیدار رہا اور دن بھر بھوکا رہا، پس اللہ عزوجل ارشاد فرمائیں گے: اے میرے بندے! تو نے دوزخ کے خوف سے عمل کئے پس میں نے تجھ کو دوزخ سے آزاد فرمادیا، اور میں اپنے فضل سے تمہیں اپنی جنت میں داخل فرماتا ہوں، پس جنت میں وہ شخص اور جو اس کے ہمراہ ہوں گے وہ داخل ہو جائیں گے، پھر تیسری قسم میں سے ایک مرد کو لایا جائے گا، پس اللہ عزوجل ارشاد فرمائیں گے: اے میرے بندے! تو نے کیا عمل کئے؟ وہ بندہ عرض کرے گا: اے میرے رب! میں نے آپ کی محبت میں عمل کئے اور آپ سے ملاقات کے شوق میں عمل کئے اور آپ کی عزت و جلال کی قسم! میں ساری رات بیدار رہتا اور دن بھر روزے میں بھوک و پیاس برداشت کرتا محض آپ کی ملاقات کے لیے اور محض آپ کی محبت کی وجہ سے، اللہ عزوجل ارشاد فرمائیں گے: اے میرے بندے! تم نے میری محبت میں عمل کئے اور مجھ سے ملاقات کے شوق میں عمل کئے، پھر اللہ تعالیٰ اس کے اوپر اپنی تجلی فرمائیں گے اور ارشاد فرمائیں گے: یہ میں ہوں، میری طرف دیکھ، پھر اللہ عزوجل فرمائیں گے، میں نے اپنے فضل سے تجھے دوزخ سے آزاد فرمادیا اور اپنے فضل سے تجھے جنت میں داخل فرمادیا، اور فرشتوں کو تیری زیارت کرائی اور میں نے اپنا نفس تیرے سپرد کر دیا، پس اس شخص کو اور جو اس کے ہمراہ ہوں گے ان سب کو جنت میں داخل فرمائیں گے۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۹۶۱۔ ۱۹۶۲، رقم الحدیث: ۱۰۴۳۵، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ، تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر الدمشقی ص ۹۲۶، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۳۲ھ)

(معالم التنزیل ج ۲ ص ۳۲۲۔ ۳۲۳، دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۲۰ھ، زاد المسیر فی علم التفسیر ج ۴ ص ۳۳۵۔ ۳۳۶، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۳۱ھ)

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَّمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۱﴾

(اے رسول اکرم!) آپ جس کام کو بھی کرتے ہیں یا آپ قرآن مجید کی جس آیت کی بھی تلاوت کرتے ہیں اور آپ اور کوئی جو کام بھی شروع کرتے ہیں تو ہم ان تمام کاموں میں آپ پر گواہ ہوتے ہیں، اور زمینوں اور آسمانوں میں پائے جانے والے کسی ذرہ کے برابر بھی کوئی چیز آپ کے رب سے غائب نہیں ہے اور خواہ کوئی چھوٹی چیز ہو یا بڑی چیز ہو وہ سب لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہے ○

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

سنو! بے شک قیامت کے دن اللہ کے اولیاء پر نہ مستقبل کا کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ (ماضی میں کیے ہوئے کاموں پر) غمگین ہوں گے ○

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿٦٣﴾

یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ پر ایمان لائے اور وہ ہمیشہ اللہ سے ڈرتے رہتے تھے ○

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿٦٤﴾

ان ہی کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی خوش خبری ہے اور آخرت میں بھی (خوش خبری ہوگی)، اللہ کے ارشادات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے ○

وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ؕ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٦٥﴾

(اے رسولِ اکرم!) آپ کافروں کی باتوں سے رنجیدہ نہ ہوں، بے شک پورا پورا غلبہ اللہ ہی کے لیے ہے، وہی سب کچھ سننے والے سب کچھ جاننے والے ہیں ○

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ؕ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿٦٦﴾

سنو! بے شک آسمانوں اور زمینوں کی تمام چیزیں اللہ ہی کی ملکیت میں ہیں، اور جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر خودساختہ شرکاء کی عبادت کرتے ہیں، وہ صرف اپنے گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور وہ محض اٹکل پچو سے کام لے رہے ہیں ○

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿٦٧﴾

(اللہ) وہی ہیں جنہوں نے تمہارے لیے رات کو بنایا تاکہ تم اس میں آرام کرسکو اور دن کو روشن بنایا تاکہ تم اس میں کارِ معیشت انجام دے سکو، بے شک (دن اور رات کے) اس نظام میں ان لوگوں کے لیے ضرور نشانیاں ہیں جو غور سے اللہ کی آیتوں کو سنتے ہیں ○

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِيُّ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٨﴾

مشرکین نے کہا: "اللہ نے اپنا بیٹا بنا لیا ہے" اللہ (کسی کو بیٹا بنانے سے) پاک ہیں، وہی (ہر چیز سے) بے نیاز ہیں، آسمانوں اور

زمینوں کی تمام چیزیں اُن ہی کی ملکیت میں ہیں، تمہارے پاس اس غلط بات کی کوئی دلیل نہیں ہے، کیا تم اللہ کے متعلق ایسی بات کہتے ہو جس کا تمہیں کوئی علم نہیں ہے O

قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾

آپ کہیے: "جو لوگ اللہ کے متعلق جھوٹے بہتان باندھتے ہیں وہ کبھی کامیابی حاصل نہیں کریں گے O"

مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۰﴾

یہ دنیا کے کچھ فوائد ہیں، انجام کار انہوں نے ہماری ہی طرف لوٹنا ہے، پھر چونکہ وہ دنیا میں کفریہ کام کرتے رہے تھے تو ہم اُن کو آخرت میں سخت عذاب کا مزا چکھائیں گے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "(اے رسولِ اکرم!) آپ جس کام کو بھی کرتے ہیں یا آپ قرآن مجید کی جس آیت کی بھی تلاوت کرتے ہیں اور آپ اور کوئی جو کام بھی شروع کرتے ہیں تو ہم ان تمام کاموں میں آپ پر گواہ ہوتے ہیں، اور زمینوں اور آسمانوں میں پائے جانے والے کسی ذرہ کے برابر بھی کوئی چیز آپ کے رب سے غائب نہیں ہے اور خواہ کوئی چھوٹی چیز ہو یا بڑی چیز ہو وہ سب لوحِ محفوظ میں لکھی ہوئی ہے O" (یونس: ۶۱)

امام ابو منصور محمد بن محمد ماتریدی المتوفی ۳۳۳ھ، یونس: ۶۱ تا ۷۰ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ":

بعض اہلِ تاویل نے کہا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے کے لیے جب بھی قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں یا کسی اور عبادت میں مشغول ہوتے ہیں تو ہم اس پر گواہ ہوتے ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ سے خطاب فرما کر تنبیہ فرمائی ہے اور اس آیت سے مراد عام ہیں خواہ آپ ہوں یا کوئی اور، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "وَلَا تَعْمَلُوْنَ" اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ ہر کام میں تم اپنے رب کے سامنے ہوتے ہو، سو اللہ تم پر گواہ ہوتے ہیں۔

"وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۱﴾": اس آیت میں یہ تصریح فرمائی ہے کہ زمین و آسمان کی کوئی چیز اللہ تعالیٰ سے غائب نہیں ہے۔ "كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ" سے مراد لوحِ محفوظ بھی ہو سکتی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد سابقہ کتابیں ہوں جو آسمانوں سے نازل فرمائی گئی ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "سنو! بے شک قیامت کے دن اللہ کے اولیاء پر نہ مستقبل کا کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ (ماضی میں کیے ہوئے کاموں پر) غمگین ہوں گے O" (یونس: ۶۲)

"اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ":

معتزلہ نے کہا: یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ گناہ کبیرہ کے مرتکبین مومن نہیں ہیں، کیونکہ اگر وہ مومن ہوتے تو اولیاء اللہ ہوتے اور جب وہ اولیاء اللہ ہوتے تو نہ قیامت کے دن اُن پر کوئی خوف ہوتا اور نہ وہ غمگین ہوتے۔ اور جب اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قیامت کے دن مرتکبین کبیرہ کو خوف اور غم ہوگا تو اس میں یہ دلیل ہے کہ وہ مومن نہیں ہیں اور نہ انہیں ایمان کی ولایت حاصل ہے۔ اور ہم اہلسنت کے نزدیک اس آیت کا معنی یہ ہے کہ دنیاداروں کو دنیا میں خوف اور غم ہوتا ہے اور اُن کا وہ خوف اور غم اُن کے اخروی انجام کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور مشابہ بالحق بات یہ ہے کہ اُن کو جنت میں خوف اور غم نہیں ہوگا۔ اور جب وہ جنت میں داخل ہو جائیں گے تو وہ ہر قسم کے خوف اور غم سے مامون ہو جائیں گے۔

اور بعض مفسرین نے کہا کہ اولیاء اللہ وہ ہیں جو موحدین ہیں اور یہ وعدہ اُن لوگوں کے لیے ہے جن کا توحید پر کامل اعتقاد ہو اور اُس کے تقاضوں پر وہ عمل بھی کرتے ہوں۔ (تاویلات اہل السنہ ج ۶ ص ۵۸ ـ ۶۰، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۲۶ھ)

ولی کے لغوی معانی

علامہ سید محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی حنفی متوفی ۱۲۰۵ھ، لکھتے ہیں:

(۱) ولی کا معنی ہے قریب، اور اس کے اور متعدد معانی ہیں:

(۲) ولی کا معنی ہے الشحب جو دشمن کی ضد ہے اور (۳) اس کا معنی ہے الصدیق: یعنی دوست اور مددگار (۴) مولیٰ کا معنی ہے مالک: "أَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝" (البقرہ: ۲۸۶) "(آپ ہی ہمارے مددگار ہیں، سو کافروں کے خلاف ہماری مدد فرمائیں O)۔ (۵) اور اس کا اطلاق غلام پر بھی کیا جاتا ہے، حضرت ابوالعاص رضی اللہ عنہ کے غلام کہتے تھے: "انا مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" (مصنف عبدالرزاق: ۱۵۶۸۱، ۱۶۷۳۳) (۶) اور اس کا معنی الصاحب بھی ہے اور (۷) اس کا معنی قریبی رشتہ دار بھی ہے جیسے چچا زاد۔

ابن الاعرابی نے کہا: (۸) المولیٰ کا معنی ہے پڑوسی اور حلیف۔ (۹) نیز ولی اس کو کہتے ہیں جو تمہارے معاملات میں متصرف اور اُن کا مالک ہو، قرآن مجید میں ہے: "ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ۝ (محمد: ۱۱)" (یہ اس لیے کہ اللہ ایمان والوں کے مددگار ہیں اور کافروں کا کوئی مددگار نہیں O)۔ نیز حدیث میں ہے: "من کُنْتُ مولاہُ فعلی مولاہُ" یعنی میں جس کا دوست ہوں، سو علی بھی اُس کے دوست ہیں۔ یہ پوری حدیث اس طرح ہے:

"مَن کُنْتُ مولاہُ فعلی مولاہُ اللّٰھم والِ مَن والاہُ وعادِ مَن عاداہُ" (یعنی میں جس کا دوست ہوں تو علی اس کے دوست ہیں، اے اللہ! اُس سے محبت فرمائیں جو علی سے محبت رکھے اور اس سے عداوت فرمائیں جو علی سے عداوت رکھے)۔

حدیث "من کنتُ مَوْلاہُ فعلی مولاہُ" کی تخریج

(مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۲۰۹۱، ۳۲۰۹۲، ۳۲۱۱۸، فضائل الصحابہ لاحمد بن حنبل: ۹۹۱، ۹۹۲، ۱۰۱۶، ۱۰۲۱، مسند احمد: ۹۵۰، ۹۶۱، ۱۳۱۱، ۱۸۳۷۹، السنہ لابن ابی عاصم ج ۲ ص ۵۶۶، مسند البزار: ۳۲۹۸، ۹۶۵۹، السنن الکبریٰ للنسائی: ۸۴۲۳، شرح مشکل الآثار: ۱۷۶۴، ۱۷۷۰، ۳۲۷۱، المعجم الشیوخ: ۱۲۶، الشریعہ للآجری: ۱۵۲۲، ۱۵۲۳، ۱۵۲۵، المعجم الاوسط للطبرانی: ۱۱۱۱، ۱۹۶۶، ۲۲۵۳، ۲۲۳۳، المعجم الصغیر للطبرانی: ۱۷۵، المعجم الکبیر للطبرانی: ۳۵۱۴، ۳۰۵۳، ۳۹۸۶، ۵۰۵۹، مسند الشامیین للطبرانی: ۲۱۲۸، معجم ابن المقری: ۱۴۳، ۱۷۰، المستدرک علی الصحیحین: ۵۵۹۴، کتاب

الدعاء للبیہقی ج ۱ ص ۱۷۳، الاحادیث المختارہ: ۶۹۷، ۲۸۱۳، ۷۹۳، المقصد العلی: ۱۳۲۴، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشرۃ ج ۲۰ ص ۳۴۰)

(۱۰) نیز لفظ مولیٰ کا معنی رب جل وعلا بھی ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام جہانوں کو اپنی تدبیر سے اور اپنی قدرت سے چلا رہے ہیں، (۱۱) اور اس کا معنی "الناصر" بھی ہے، اور حدیث "مَن کُنتُ مولاہ" میں مولا کی تفسیر ناصر کے ساتھ کی گئی ہے، یعنی میں جس کا مددگار رہوں علی اُس کے مددگار ہیں۔ (۱۲) اور مولیٰ کا معنی المنعِم بھی ہے (۱۳) اور اس کا معنی المُحِب بھی ہے۔

(تاج العروس من جواہر القاموس، جز ۴۰ ص ۱۱۲-۱۱۴، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۳۳ھ)

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ لکھتے ہیں:

ولایت کا معنی قرب ہے خواہ یہ قرب جگہ کے اعتبار سے ہو یا نسبت کے اعتبار سے یا دین کے اعتبار سے یا دوستی کے اعتبار سے یا اعتقاد کے اعتبار سے یا نصرت کے اعتبار سے۔ ولایت کا معنی کسی چیز کا انتظام کرنا بھی ہے۔ (۱۴) اور ولی بہ معنی فاعل بھی ہے یعنی منتظم اور متصرف (۱۵) اور مفعول کے معنی میں بھی ہے یعنی جو کسی کے زیرِ انتظام اور زیرِ تصرف ہو، مومن کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ کا ولی ہے (جیسا کہ اس آیت میں ہے، یعنی وہ اللہ کی ذات کی معرفت اور ان کے جمال اور جلال کے نور میں مستغرق رہنے کی وجہ سے اس کے قریب اور مقرب ہو چکے ہیں، اور وہ اپنے قلب اور قالب میں اپنی خواہش سے تصرف نہیں کرتے بلکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور منشاء سے تصرف کرتے ہیں (۱۶) یا ان کو ہدایت پر قائم رکھنے کے اللہ تعالیٰ متولی ہیں، اور یا وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حق ادا کرنے کے لیے ہر وقت اپنے اعضاء میں متولی اور متصرف رہتے ہیں)۔ (۱۷) اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنین کے ولی ہیں قرآن مجید میں ہے: "اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" (البقرہ: ۲۵۷)"۔ (المفردات ج ۲ ص ۶۹۳، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ)

ولی کا اصطلاحی معنی

علامہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی متوفی ۷۹۳ھ لکھتے ہیں:

ولی وہ مومن کامل ہے جو عارف باللہ ہوتا ہے، دائمی عبادت کرتا ہے، ہر قسم کے گناہوں سے مجتنب رہتا ہے، لذات اور شہوات میں انہماک سے گریز کرتا ہے۔ (شرح المقاصد ج ۵ ص ۷۲-۷۳، منشورات الرضی، ایران، ۱۴۰۹ھ)

حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی شافعی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

ولی سے مراد وہ شخص ہے جو عالم باللہ ہو اور اخلاص کے ساتھ دائمی عبادات کرتا ہو۔

(فتح الباری ج ۱۱ ص ۳۴۲، لاہور، ۱۴۰۱ھ، ایضاً عمدۃ القاری جز ۲۳ ص ۸۹، مطبوعہ مصر)

اولیاء اللہ کے مصادیق

امام محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

(۱) ابو الضحیٰ بیان کرتے ہیں کہ العلاء بن المسیب اس آیت کو پڑھتے: "اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ" اور فرماتے کہ اولیاء اللہ وہ لوگ ہیں کہ اُن کو دیکھنے سے اللہ تعالیٰ یاد آجائیں۔

(تفسیر الطبری ج ۱۲ ص ۲۰۹، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۳۲ھ، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۹۶۴، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۳ ص ۵۲۱، کتاب الزہد لابن المبارک ص ۲۱۷، المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۰۴۷۶، السنن الکبریٰ للنسائی: ۱۱۲۳۵، مسند البزار:

(۶۲۶ حلیۃ الاولیاء ج ۷ ص ۲۳۱)

(۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے بندوں میں سے ایسے بندے ہیں جن کی انبیاء علیہم السلام اور شہداء تعریف وتحسین کریں گے، پوچھا گیا: یا رسول اللہ! وہ کون ہیں تاکہ ہم ان سے محبت رکھیں؟ آپ نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے بغیر مال ودولت اور بغیر نسبی قرابت کے محبت رکھتے ہیں، ان کے چہرے نور کے منبروں پر (سراپا نور) ہوں گے، جب لوگ (بعض) لوگوں سے ڈریں گے تو وہ ان سے نہیں ڈریں گے اور جب لوگ لوگوں سے رنجیدہ ہوں گے تو وہ رنجیدہ نہیں ہوں گے، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: ''اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ''۔

(تفسیر الطبری ج ۱۲ ص ۲۱۱، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۲۳ھ، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۹۶۳، نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ، شعب الایمان للبیہقی: ۸۹۹۷، السنن الکبریٰ للنسائی: ۱۱۲۳۶، مسند ابو یعلیٰ: ۶۱۱۰، صحیح ابن حبان: ۵۷۳، سنن ابوداؤد: ۳۵۲۷، حلیۃ الاولیاء ج ۱ ص ۵)

(۳) حضرت ابو مالک الاشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مختلف گروہوں اور قبیلوں میں سے ایسے لوگ آئیں گے جن کی کسی سے رشتہ داری نہیں ہوگی، وہ ان سے محض اللہ تعالیٰ کے لیے محبت رکھیں گے اور محض اللہ تعالیٰ کے لیے ان سے دوستی رکھیں گے، اللہ عزوجل قیامت کے دن ان کے لیے نور کے منبر رکھیں گے اور ان لوگوں کو نور کے منبروں پر بٹھائیں گے، جب لوگ گھبرائیں گے اور خوف زدہ ہوں گے تو وہ نہ گھبرائیں گے اور نہ خوف زدہ ہوں گے، سو وہی اولیاء اللہ ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ''۔

(کتاب الزہد لابن المبارک ص ۱۴۷، مسند ابو یعلیٰ: ۶۸۴۲، جامع معمر: ۲۰۳۲۴، المعجم الکبیر للطبرانی: ۳۴۳۳، ۳۴۳۵، شرح السنۃ للبغوی ج ۱۳ ص ۱۵۰، شعب الایمان للبیہقی: ۹۰۰۱)

اس اعتراض کا جواب کہ اولیاء اللہ کے لیے دنیا میں غم اور خوف کا ثبوت ہے

اللہ تعالیٰ نے اولیاء اللہ کے متعلق ارشاد فرمایا ہے: ان کو کوئی خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔ خوف کا تعلق مستقبل سے ہے اور غم کا تعلق ماضی سے ہے، یعنی ان کو ماضی میں کسی نعمت کے زوال کا ملال ہوگا نہ مستقبل میں کسی نعمت کے زوال کا خطرہ ہوگا۔ اس پر یہ اعتراض ہے کہ اگر اس سے مراد دنیا میں خوف اور غم کی نفی ہے تو یہ ثابت نہیں کیونکہ تمام اولیاء کے راس اور رئیس سیدنا محمد ﷺ ہیں اور آپ کو دنیا میں خوف بھی لاحق ہوا اور غم بھی، خوف کی مثال ان حدیثوں میں ہے:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ تیز آندھی کو دیکھتے تو یہ دعا کرتے: اے اللہ! میں آپ سے اس کی خیر کا سوال کرتا ہوں اور جو کچھ اس کے ساتھ ہے، اس کی خیر کا سوال کرتا ہوں اور میں اس کے شر سے اور جو شر اس میں ہے اور جو شر اس کے متعلق ہے تیری پناہ طلب کرتا ہوں اور جب آسمان پر ابر چھا جاتا تو آپ کا رنگ متغیر ہو جاتا اور آپ (خوف اور گھبراہٹ سے) کبھی حجرہ کے اندر جاتے اور کبھی حجرہ سے باہر جاتے اور جب بارش ہو جاتی تو آپ سے خوف دور ہو جاتا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے اس کیفیت کو بھانپ کر آپ سے اس کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا: اے عائشہ! مجھے یہ خوف تھا کہ کہیں یہ ابر قوم عاد کے ابر کی طرح نہ ہو، انہوں نے جب اپنی بستیوں میں ابر کو آتے ہوئے دیکھا تو کہا: یہ ہم پر برسنے والے بادل ہیں۔ (اور

وہ در حقیقت اللہ تعالیٰ کا عذاب تھا)۔ (صحیح البخاری: ۳۲۰۶، صحیح مسلم: ۸۹۹)

(موسوعة المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی الشریف ج ۴ ص ۳۰۱۷، دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۳۳ھ)

اور غم کی مثال اس حدیث میں ہے:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ابو سیف لوہار کے پاس گئے اور وہ (آپ کے صاحبزادے) حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کے رضاعی والد تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کو اٹھایا، ان کو بوسہ دیا اور ان کو سونگھا۔ پھر اس کے بعد ہم ان کے پاس گئے، اس وقت حضرت ابراہیم اپنے نفس کی سخاوت کر رہے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے (تعجب سے) کہا: یا رسول اللہ! آپ بھی! (رو رہے ہیں)، آپ نے فرمایا: اے ابن عوف! یہ (آنسو) رحمت ہیں۔ پھر آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آنکھ رو رہی ہے اور دل غم زدہ ہے اور ہم وہی بات کہیں گے جس سے ہمارے رب راضی ہوں، اور ہم آپ کے فراق سے اے ابراہیم! البتہ غمگین ہیں۔ (صحیح البخاری: ۱۳۰۳، صحیح مسلم: ۲۳۱۵، سنن ابوداؤد: ۳۱۲۶)

(موسوعة المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی الشریف ج ۱۵ ص ۵۰۵، دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۳۳ھ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیاء اللہ کے لیے دنیا کے غم اور خوف کی توجیہ

اس کا جواب یہ ہے کہ اولیاء اللہ کو دنیا میں ایسا خوف نہیں ہوگا جو ان کے لیے باعث ضرر ہو (کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ" اور "علی" کا لفظ ضرر کے لیے آتا ہے) اور جن احادیث میں آپ کے خوف کا ذکر ہے وہ خوف خدا ہے اور خوف خدا باعثِ ضرر نہیں ہے بلکہ باعثِ نفع ہے اور جو شخص جتنا زیادہ اللہ کے قریب ہوتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ کا اتنا زیادہ خوف ہوتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ان اتقاکم واعلمکم باللہ انا" (بے شک تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور تم سب سے زیادہ اللہ کو جاننے والا میں ہوں)۔ (صحیح البخاری: ۲۰، مسند احمد: ۲۳۷۹۸)

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اما واللہ انی لاتقاکم للہ واخشاکم لہ" (سنو! اللہ کی قسم! بے شک میں ضرور تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور تم سب سے زیادہ اللہ سے خشوع کرنے والا ہوں)۔ (صحیح مسلم: ۱۱۰۸)

نیز حدیث صحیح میں ہے: "میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتا ہوں اور تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہوں"۔ (کشف الخفاء: ۶۰۷)

اور آپ نے فرمایا: "پس اللہ کی قسم! میں ان سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو جاننے والا ہوں اور ان سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہوں"۔ (صحیح البخاری: ۶۱۰۱، صحیح مسلم: ۲۳۵۶)

نیز آپ نے فرمایا: "میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی حدود کو جاننے والا ہوں اور تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہوں"۔ (فتح الباری ج ۳ ص ۱۵۱، دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۲۶ھ)

اور اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: "اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ---" (فاطر: ۲۸) "(اللہ کے بندوں میں سے اللہ سے وہی ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں)۔

اور اولیاء اللہ سے غم کی نفی جو فرمائی ہے اس کا معنی یہ ہے کہ ان کو اپنے گناہوں کا غم نہیں ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کا ولی وہی ہوتا ہے جو اپنے آپ کو گناہوں سے باز رکھتا ہے اور اگر بالفرض بشری تقاضے سے اس سے کوئی گناہ ہو جائے تو وہ فوراً توبہ کر لیتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو سید المعصومین ہیں، آپ کے متعلق کسی معصیت پر غم کرنے کا کیا سوال ہے اور اس آیت میں جو غم کی نفی فرمائی ہے اس سے یہ مراد نہیں کہ ان کو دنیاوی نقصانات پر غم اور رنج نہیں ہوگا، دنیاوی نقصانات پر ان کو رنج اور غم ہوتا ہے اور وہ اس پر صبر کرتے ہیں اور اس میں ان کے لیے بہت بڑے اجر اور بڑے درجات ہوتے ہیں، قرآن مجید میں ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝ (البقرہ: ۱۵۵-۱۵۷)

اور ہم تمہیں کچھ خوف اور بھوک اور اموال اور جانوں اور پھلوں میں کمی کے ساتھ ضرور آزمائش میں ڈالیں گے اور آپ ان صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنا دیجئے ○ کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں: بے شک ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور بے شک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں ○ یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے خصوصی نوازشیں ہوں گی اور رحمت (نازل ہوگی)، اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں ○

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مومن کو جو مصیبت بھی پہنچتی ہے، خواہ تھکاوٹ ہو یا (کسی چیز کا) غم ہو یا دائمی درد اور بیماری ہو یا کوئی سخت پریشانی تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کے گناہوں کو مٹا دیتے ہیں''۔ (بعض روایات میں ہے: اور اس کے درجات بلند فرماتے ہیں)۔

(صحیح البخاری: ۵۶۴۲، صحیح مسلم: ۲۵۷۳، سنن ترمذی: ۹۶۶، مسند احمد: ۱۱۰۲۰، عالم الکتب، بیروت، مسند احمد: ۱۰۹۳۹، دار الحدیث القاہرہ، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۳ ص ۲۳۲، مسند ابو یعلیٰ رقم الحدیث: ۱۲۵۶)

اولیاء اللہ کے لیے آخرت کے غم اور خوف کی توجیہ

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر اس آیت سے مراد یہ ہے کہ اولیاء اللہ کو آخرت میں خوف اور غم نہیں ہوگا تو حشر کے دن انبیاء علیہم السلام خوف زدہ ہوں گے اور سب نفسی نفسی فرما رہے ہوں گے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ان کو گناہوں پر عذاب اور گرفت کا خوف نہیں ہوگا، ان کو اللہ تعالیٰ کی جلال ذات سے خوف ہوگا اور یہ خوف ان کے قرب الٰہی کی علامت ہے اور ان کے لیے باعث نفع ہے، حدیث میں ہے:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے متعلق پوچھا: ''وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰی رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ۝ (المؤمنون: ۶۰)'' (اور وہ لوگ جو کچھ دیتے ہیں اس حال میں دیتے ہیں کہ ان کے دل خوف سے لرز رہے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں ○)۔

میں نے پوچھا: ''کیا اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو شراب پیتے تھے اور چوری کرتے تھے؟'' آپ نے فرمایا: ''نہیں! اے صدیق کی بیٹی! لیکن یہ وہ لوگ ہیں جو روزے رکھتے تھے اور نماز پڑھتے تھے اور صدقہ دیتے تھے اور ان کو یہ خوف ہوتا تھا کہ

(کہیں ایسا نہ ہو کہ) ان کے یہ اعمال مقبول نہ ہوں، یہ وہ لوگ ہیں جو نیکی کے کاموں میں بہت جلدی کرتے تھے''۔
(سنن ترمذی: ۳۱۷۵، سنن ابن ماجہ: ۴۱۹۸)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے متعدد بار جنت کی بشارت دی تھی، اس کے باوجود وہ قبر کو دیکھ کر اس قدر روتے تھے کہ ان کی ڈاڑھی مبارک آنسوؤں سے بھیگ جاتی تھی۔ (سنن ترمذی: ۲۳۰۸، سنن ابن ماجہ: ۴۲۶۷)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ پر ایمان لائے اور وہ ہمیشہ اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں O'' (یونس: ۶۳)

''الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا یَتَّقُوْنَ'':

امام محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:
اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں: جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق کی اور اس کی تصدیق کی جو رسول اللہ ﷺ اللہ کے پاس سے خبریں اور احکام لے کر تشریف لائے اور وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں اور اس کے مقرر کردہ فرائض کو ادا کرتے ہیں اور اس کی نافرمانیوں سے اجتناب کرتے ہیں۔
(تفسیر الطبری ج ۱۲ ص ۲۱۳، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۲۳ھ، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۹۶۵، نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''ان ہی کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی خوش خبری ہے اور آخرت میں بھی (خوش خبری ہوگی)، اللہ کے ارشادات میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے O'' (یونس: ۶۴)

اولیاء اللہ کے لیے دنیا اور آخرت میں خوش خبری

''لَهُمُ الْبُشْرٰى فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ'':

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے کہا کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''دنیا کی زندگی میں بشارت وہ سچے خواب ہیں جو خود مومن دیکھتا ہے یا کوئی مومن کے لیے اس خواب کو دیکھتا ہے''۔
(سنن ترمذی: ۲۲۷۵، تفسیر الطبری ج ۱۲ ص ۲۱۳، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۲۳ھ، مسند احمد: ۲۷۵۲۶، ۲۲۷۵۱، تفسیر سفیان بن عیینہ: ۱۷۷۳، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۱ ص ۵۱، شرح مشکل الآثار: ۳۱۸۰، شعب الایمان: ۴۷۵۱، مسند ابو داؤد الطیالسی: ۱۰۶۹۹۷۶)

حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس آیت ''لَهُمُ الْبُشْرٰى فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ'' کے متعلق سوال کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم نے مجھ سے اس چیز کے متعلق سوال کیا ہے جس چیز کے متعلق تم سے پہلے مجھ سے کسی نے سوال نہیں کیا، پھر آپ نے فرمایا: یہ وہ سچے خواب ہیں جن کو کوئی نیک مرد دیکھتا ہے یا اُس مرد کے لیے خواب دکھائی دیتے ہیں۔
(شعب الایمان للبیہقی: ۴۷۵۳، تفسیر الطبری ج ۱۲ ص ۲۱۶، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۲۳ھ، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۹۶۷، نزار مصطفیٰ

البار، مکہ مکرمہ، معجم الصحابہ لابن قانع: ۶۸۹، المستدرک للحاکم ج ۳ ص ۳۹۱، سنن دارمی: ۲۱۳۰، ج ۲ ص ۱۲۳، سنن ابن ماجہ: ۳۸۹۸، سنن ترمذی: ۲۲۷۵، سنن سعید بن منصور: ۱۰۶۶، تخریج الکشاف ج ۲ ص ۱۳۳)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: اچھا خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت ہے اور یہی المبشرات ہیں۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۱ ص ۵۴، السنن الکبریٰ للنسائی: ۱۰۷۴۳، تفسیر الطبری ج ۱۲ ص ۲۱۸، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۲۳ھ)

قتادہ بیان کرتے ہیں: اس سے مراد دنیا کی زندگی میں وہ بشارت ہے جو موت کے وقت دی جاتی ہے۔

(تفسیر طبری ج ۱۲ ص ۲۲۴، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۲۳ھ، مصنف عبد الرزاق ج ۱ ص ۲۹۶)

ضحاک نے بیان کیا: بندۂ مومن کو موت سے پہلے یہ بشارت دی جاتی ہے کہ وہ کہاں ہوگا اور اُن بشارتوں میں سے فرشتوں کی دی ہوئی خوش خبری ہے جو اُس کی روح نکلتے وقت اللہ تعالیٰ کی رحمت کی بشارت دیتے ہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ "بندہ کی روح نکلنے کے وقت فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور وہ اس سے کہتے ہیں: اے روح! اللہ تعالیٰ کی رحمت اور رضوان کی طرف نکل"۔

(تفسیر الطبری ج ۱۲ ص ۲۲۵، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۲۳ھ)

اولیاء اللہ کے لیے دنیا میں بشارت

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۝ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ ۚ وَ لَكُمْ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْۤ اَنْفُسُكُمْ وَ لَكُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ۝ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ۝

(حم السجدہ: ۳۰-۳۲)

بے شک جن لوگوں نے کہا: ہمارے رب اللہ ہیں، پھر وہ اس پر دائماً قائم رہے ان پر فرشتے (یہ کہتے ہوئے) نازل ہوتے ہیں کہ "تم خوف نہ کرو اور نہ غمگین ہو، اور اس جنت کے ساتھ خوش ہو جاؤ جس کا تم سے وعدہ فرمایا جاتا تھا○ ہم دنیا کی زندگی میں تمہارے مددگار ہیں اور آخرت میں (بھی) اور تمہارے لیے اس جنت میں ہر وہ چیز ہے جس کو تمہارا دل پسند کرے اور تمہارے لیے اس میں ہر وہ چیز ہے جس کو تم طلب کرو○ بہت بخشنے والے بے حد رحم فرمانے والے کی طرف سے ضیافت ہے"○

اولیاء اللہ کے لیے آخرت میں بشارت

لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَ تَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ۔

(الانبیاء: ۱۰۳)

سب سے بڑی گھبراہٹ انہیں غمگین نہیں کرے گی، اور فرشتے ان کے استقبال کے لیے آئیں گے۔

یَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ یَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ بِاَیْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْیَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ۝

(الحدید: ۱۲)

(اے رسولِ اکرم!) جس دن آپ مومنین اور مومنات کو اس حال میں دیکھیں گے کہ ان کا نور ان کے آگے اور ان کی دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا (اور ان سے کہا جائے گا کہ) آج تمہاری خوشی کی چیز یہ جنتیں ہیں جن کے نیچے سے دریا جاری ہیں اس میں تم ہمیشہ رہو گے، یہی بڑی کامیابی ہے○

"لَا تَبْدِیْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ": اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کئے ہوئے وعدہ کے خلاف نہیں فرماتے اور نہ ان کے کلام میں تغییر ہوتی ہے۔

نافع بیان کرتے ہیں کہ ایک دن حجاج بن یوسف نے بہت طویل خطبہ دیا، پس حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنا سر اپنی گود میں رکھ دیا تو حجاج نے کہا: ابن الزبیر نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو بدل ڈالا، پس حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اللہ کی کتاب کو نہ تم بدل سکتے ہو اور نہ ابن الزبیر بدل سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "لَا تَبْدِیْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ"۔ حجاج نے کہا: آپ کو ایسا علم دیا گیا ہے جو آپ کو نفع دیتا ہے۔ (المستدرک للحاکم ج ۲ ص ۳۳۹، کتاب الاسماء والصفات للبیہقی: ۵۲۸)

"ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ": اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں: "جس کو دنیا کی زندگی میں بشارت مل گئی اور آخرت میں بشارت مل گئی تو یہی سب سے بڑی کامیابی ہے"۔

اولیاء اللہ کی فضیلت میں احادیث

(۱) زید بن اسلم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دن حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں گئے، وہاں دیکھا کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس بیٹھے ہوئے رو رہے تھے، انہوں نے کہا: تم کس وجہ سے رو رہے ہو؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں اس وجہ سے رو رہا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ تھوڑا سا ریا بھی شرک ہے اور بے شک جس شخص نے بھی میرے ولی سے عداوت رکھی اس نے اللہ سے اعلان جنگ کر دیا، بے شک اللہ ان نیک متقی بندوں سے محبت فرماتے ہیں جو چھپے رہتے ہیں، اگر وہ غائب ہوں تو ان کو تلاش نہیں کیا جاتا، اور اگر وہ حاضر ہوں تو ان کو بلایا نہیں جاتا، نہ پہچانا جاتا ہے، ان کے دل ہدایت کے چراغ ہیں، وہ ہر غبار آلود اندھیروں سے نکل آتے ہیں۔

(سنن ابن ماجہ: ۳۹۸۹، المعجم الکبیر ج ۲۰ رقم الحدیث: ۳۲۱، ص ۱۵۴، حلیۃ الاولیاء: ۳، طبع جدید، اتحاف السادۃ المتقین ج ۸ ص ۲۶۳-۲۶۴)

(۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے میرے ولی کو ایذاء پہنچائی اس سے میری جنگ حلال ہو گئی۔ (حلیۃ الاولیاء رقم الحدیث: ۲، ص ۳۵، اتحاف السادۃ المتقین ج ۸ ص ۴۷۷)

(۳) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ کتنے لوگ ہیں جن کے بال بکھرے ہوئے غبار آلود ہوتے ہیں، وہ دو بوسیدہ چادریں پہنے ہوئے ہوتے ہیں، ان کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ وہ اگر اللہ پر (کسی کام کے کرنے کی) قسم کھائیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پوری فرما دیں گے، ان میں سے براء بن مالک ہیں۔

(سنن ترمذی: ۳۸۵۴، مسند ابویعلیٰ: ۳۹۸۷، مسند احمد: ج ۳ ص ۱۴۵، المستدرک ج ۳ ص ۲۹۱، الجامع الصغیر: ۶۳۰۱، حلیۃ الاولیاء: ۱۰، کنز العمال: ۳۳۹۳۵، الکامل لابن عدی ج ۳ ص ۷۵، مطبوعہ: ۱۴۱۸ھ)

(۴) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ جب کسی بندے سے محبت کرتے ہیں تو حضرت جبرائیل علیہ السلام کو بلا کر فرماتے ہیں میں فلاں سے محبت کرتا ہوں تم اس سے محبت کرو، پس اس سے حضرت جبریل علیہ السلام محبت کرتے ہیں، پھر وہ آسمان میں ندا کرتے ہیں کہ اللہ فلاں سے محبت فرماتے ہیں تم بھی اس سے محبت کرو، پس آسمان والے اس سے محبت کرتے ہیں، پھر زمین میں اس کے لیے مقبولیت رکھ دی جاتی ہے اور جب وہ کسی بندے سے بغض فرماتے ہیں تو جبریل کو بلا کر

فرماتے ہیں: میں فلاں سے بغض رکھتا ہوں تم اس سے بغض رکھو، پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام اس سے بغض رکھتے ہیں، پھر آسمان والوں میں ندا کرتے ہیں: اللہ فلاں سے بغض رکھتے ہیں تم بھی اس سے بغض رکھو، تو آسمان والے اس سے بغض رکھتے ہیں، پھر زمین میں اس کے لیے بغض رکھ دیا جاتا ہے۔

(صحیح البخاری: ٣٢٠٩، صحیح مسلم: ٢٦٣٧، مسند احمد ج ٢ ص ٤١٣، مسند احمد: ٩٣٢٣، دار الحدیث قاہرہ، رقم الحدیث: ٧٦١٣، عالم الکتب، بیروت، سنن ترمذی: ٣١٦١، کنز العمال: ٣٠٧٧٠، مشکوٰۃ: ٥٠٠٥)

(٥) حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس امت میں تیس ابدال ایسے ہیں جو خلیل الرحمٰن کی شکل ہیں، جب بھی ان میں سے کوئی شخص فوت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسرے شخص کو ابدال بنا دیتے ہیں۔

(مسند احمد: ٢٢٥٦٠، اس کے حاشیہ میں الزین نے کہا: اس کی سند الہیثمی کے قول پر صحیح ہے، حافظ الہیثمی نے کہا: عبد الواحد بن قیس کے سوا اس حدیث کے تمام راوی صحیح ہیں، العجلی اور ابوزرعہ نے اس کی توثیق کی ہے اور دیگر نے اس کی تضعیف کی ہے، مجمع الزوائد ج ١٠ ص ٦٢)

(٦) حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت میں ہمیشہ تیس ایسے شخص رہیں گے جن کی وجہ سے زمین قائم رہے گی، ان ہی کی وجہ سے بارش ہوتی ہے اور ان ہی کی وجہ سے تمہاری مدد کی جاتی ہے۔ قتادہ نے کہا کہ مجھے امید ہے کہ حسن ان میں سے ہیں۔

(اتحاف السادۃ المتقین ج ٨ ص ٣٨٦، حافظ الہیثمی نے کہا ہے کہ اس حدیث کو امام طبرانی نے عمرو البزار از عنبسہ الخواص سے روایت کیا ہے اور ان دونوں کو میں پہچانتا ہوں اور اس کے بقیہ راوی صحیح ہیں، مجمع الزوائد ج ١٠ ص ٦٣، یہ حدیث الجامع الصغیر رقم: ٣٠٣٣ میں بھی ہے اور لا یزال (ہمیشہ) کی جگہ الابدال کا لفظ ہے)

(٧) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بے شک اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے میرے ولی سے عداوت رکھی سو میں اس سے اعلانِ جنگ فرماتا ہوں، اور میرا بندہ کسی ایسی عبادت سے میرا قرب حاصل نہیں کرتا جو مجھے ان عبادات سے زیادہ پسندیدہ ہو جو میں نے اس پر فرض فرمائیں، اور میرا بندہ نوافل کے ساتھ مسلسل میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ میں اس سے محبت فرماتا ہوں، پس جب میں اس سے محبت فرماتا ہوں تو میں اس کے وہ کان ہو جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے، اور میں اس کی وہ آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اور میں اس کے وہ ہاتھ ہو جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے، اور میں اس کے وہ پیر ہو جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے۔ اور اگر وہ مجھ سے سوال کرے تو میں اس کو ضرور عطا فرماتا ہوں، اور اگر وہ مجھ سے پناہ طلب کرے تو میں اس کو ضرور پناہ عطا فرماتا ہوں، اور میں کسی کام میں جس کو میں کرنے والا ہوں ایسا تردد نہیں فرماتا جیسا تردد میں مومن کی روح قبض کرنے میں فرماتا ہوں، وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں اسے رنجیدہ کرنے کو ناپسند فرماتا ہوں"۔

(صحیح البخاری: ٦٥٠٢، حلیۃ الاولیاء ج ١ ص ١٥، طبع جدید، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ٣٤٧، السنن الکبریٰ للبیہقی ج ٣ ص ٣٤٦، ج ١٠ ص ٢١٩، کتاب الاسماء والصفات للبیہقی ص ٤٩١، صفوۃ الصفوۃ ج ١ ص ١٥، مشکوٰۃ رقم الحدیث: ٢٢٦٦، کنز العمال رقم الحدیث: ٢١٣٢٧، المعجم الکبیر للطبرانی: ١٩٧١٢)

حدیث "من عادیٰ ولیا" کی سند پر بحث ونظر

حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی شافعی متوفی ٨٥٢ھ، اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

یہ حدیث یقیناً مسند احمد میں نہیں ہے۔ (فتح الباری ج ۷ ص ۵۶۰-۵۶۱، دار المعرفہ بیروت ۱۳۲۶ھ)

حدیث مذکور کی مسند احمد میں روایت

حافظ ابن حجر عسقلانی نے وثوق سے کہا ہے کہ یہ حدیث مسند احمد میں نہیں ہے، لیکن ہم نے دیکھا کہ یہ حدیث مسند احمد میں ہے۔ تاہم حافظ ابن حجر عسقلانی کے دفاع میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسند احمد میں یہ حدیث مذکور ہے لیکن یہ خالد بن مخلد کی روایت نہیں ہے جس کا حافظ ابن حجر عسقلانی نے انکار کیا ہے اور اس کا متن بھی خالد بن مخلد کی روایت کے متن سے قدرے مختلف ہے، ہم درج ذیل عبارت میں مسند احمد کی سند اور متن مع ترجمہ کے ذکر کر رہے ہیں تا کہ پورا کشف ہو جائے:

۲۶۱۹۳- حدثنا حماد وابوالمنذر، قالا: حدثنا عبدالواحد مولی عروة، عن عروة عن عائشة: قالت: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم قال الله عزوجل من اذل لی ولیا فقد استحل محاربتی وما تقرب الی عبدی بمثل اداء الفرائض، وما یزال العبد یتقرب الی بالنوافل حتی احبه، ان سالنی اعطیته، وان دعانی اجبته، ما ترددت عن شیء انا فاعله ترددی عن وفاته لانه یکره الموت، واکره مساء ته، قال ابی وقال ابوالمنذر: قال: حدثنی عروة، قال: حدثتنی عائشة، وقال ابوالمنذر آذی لی۔

ہمیں حماد نے اور ابوالمنذر نے حدیث بیان کی، ان دونوں نے کہا کہ ہمیں عبدالواحد نے حدیث بیان کی جو عروہ کے آزاد شدہ غلام ہیں از عروہ از حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، وہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا کہ اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں: جس نے میرے ولی کی تذلیل کی اس نے میرے ساتھ جنگ کو حلال کر لیا، اور میرا بندہ فرائض کی ادائیگی کی مثل سے کسی چیز سے میرا تقرب حاصل نہیں کرتا اور بندہ ہمیشہ نوافل سے میرا قرب حاصل کرتا ہے حتیٰ کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں، اگر وہ مجھ سے سوال کرے تو میں اس کو عطا فرماتا ہوں، اگر وہ مجھ سے دعا کرے تو میں اس کو قبول فرماتا ہوں، اور میں جس کام کو کرنے والا ہوں اس کے کرنے میں ایسا تردد نہیں فرماتا جیسا تردد میں اس بندہ کی وفات میں فرماتا ہوں، کیونکہ وہ بندہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں اس کی رنجیدگی کو ناپسند فرماتا ہوں، میرے والد نے کہا: اور ابوالمنذر نے کہا: کہ مجھے عروہ نے حدیث بیان کی، انہوں نے کہا: مجھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حدیث بیان کی اور ابوالمنذر نے کہا: جس نے میرے ولی کو ایذاء دی۔

(مسند احمد: ۲۶۱۹۳، مسند احمد ج ۶ ص ۲۵۶، موسسۃ الرسالہ، بیروت ۱۴۲۱ھ)

یہ حدیث مسند احمد کے درج ذیل نسخوں میں بھی مذکور ہے:

(مسند احمد ج ۶ ص ۲۵۶، دار الفکر طبع قدیم)، (مسند احمد ج ۶ ص ۲۸۶، دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۱۳ھ)

(مسند احمد ج ۸ ص ۵۰۶، عالم الکتب بیروت، ۱۴۱۹ھ)، (مسند احمد رقم الحدیث: ۲۶۰۷۱، دار الحدیث، قاہرہ، ۱۴۱۶ھ)

اللہ کے ولی کی تعریف

اس حدیث میں "ولی" کا ذکر ہے، ولی اس شخص کو کہتے ہیں جو اللہ عزوجل کی صفات کا عالم ہو اور ان کی اطاعت اور عبادت پر دوام کرتا ہو اور اپنی عبادت میں مخلص ہو۔

"اللہ بندہ کے کان ہو جاتے ہیں" اس حدیث کے محامل

اس حدیث میں مذکور ہے "میں اس کے کان ہو جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے"۔

(الف) علامہ داؤدی نے کہا ہے کہ یہ تمام الفاظ مجاز پر محمول ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ اس بندہ کی اس طرح حفاظت فرماتے ہیں جس طرح بندہ اپنے اعضاء کی حفاظت کرتا ہے کہ کہیں وہ ہلاکت میں واقع نہ ہو جائے۔

(ب) علامہ الخطابی نے کہا ہے: یہ مثالیں ہیں اور اللہ ہی بہتر جانتے ہیں، اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کو ان اعضاء کے ساتھ ایسی توفیق دیتے ہیں جس سے وہ ایسے کام کرے جو اللہ تعالیٰ کی محبت کا باعث ہوں، اور اللہ تعالیٰ اس کے اعضاء کو اپنی معصیت سے محفوظ رکھتے ہیں مثلاً اس کے کان ان چیزوں کو نہیں سنتے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہوں یعنی لہو ولعب کو نہیں سنتے، اور اللہ اس کی آنکھیں ہو جاتے ہیں یعنی وہ اپنی آنکھوں سے ان چیزوں کو نہیں دیکھتے جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے دیکھنے سے منع فرمایا ہے، اور اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ ہو جاتے ہیں، یعنی وہ اپنے ہاتھوں سے ان چیزوں کو نہیں پکڑتا جن کا پکڑنا اس کے لیے حلال نہیں ہے، اور وہ اس کے پاؤں ہو جاتے ہیں، یعنی وہ اپنے پاؤں سے چل کر باطل کی طرف نہیں جاتا، یا بندہ ایسا نہیں کرتا کہ دعا کو قبول کرنے میں جلدی کرے اور اپنی طلب پر اصرار کرے، کیونکہ انسان کی سعی ان چار اعضاء کے استعمال کے بعد ہوتی ہے۔

نیز اس حدیث میں مذکور ہے "میں اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے"۔ اس حدیث میں "بصر" کا لفظ ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں "عین" کا لفظ ہے، اور یعقوب بن مجاہد کی روایت میں عین کا لفظ ہے جس سے وہ دیکھتا ہے۔ اور عبدالواحد کی روایت میں یہ اضافہ ہے "میں اس کا دل ہو جاتا ہوں جس سے وہ تعقل کرتا ہے اور اس کی زبان ہو جاتا ہوں جس سے وہ کلام کرتا ہے"۔

(ج) ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے "میں بندہ کے لیے اس کے مقاصد کو مہیا فرما دیتا ہوں گویا کہ وہ کان اور آنکھوں سے اپنے مقاصد کو حاصل کر لیتا ہے"۔

(د) دوسرا قول ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ "میں اس کی نصرت کرنے میں اس کے کان، آنکھ اور ہاتھ اور پیر کی طرح ہو جاتا ہوں"۔ یعنی دشمن کے خلاف اس کی مدد کرنے میں۔

(ہ) تیسرا قول یہ ہے کہ یہاں پر مضاف محذوف ہے، اصل عبارت یوں ہے کہ "میں اس کی سماعت کا محافظ ہو جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے، پس وہ اسی بات کو سنتا ہے جس کا سننا اس کے لیے حلال ہوتا ہے اور اس کی بصارت کا محافظ ہو جاتا ہوں"۔

حدیث مذکور کی شرح از علامہ عینی

علامہ عینی نے اس کی یہ شرح کی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کے کانوں کے اور اس کی آنکھوں کے محافظ ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ اپنے

کانوں سے اسی بات کو سنتا ہے جس کا سننا اللہ تعالیٰ کو پسند ہوتا ہے اور لہو و لعب کو نہیں سنتا اور حتیٰ کہ وہ اپنی آنکھوں سے انہیں چیزوں کو دیکھتا ہے جن کو دیکھنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہوتا ہے اور ناجائز اور حرام چیزوں کو نہیں دیکھتا۔

علامہ عینی کی شرح پر مصنف کا تبصرہ

یہ شرح اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اس حدیث میں مذکور ہے "کہ بندہ نوافل کو (بشمول فرائض) دوام کے ساتھ ادا کر کے میرا قرب حاصل کرتا ہے حتیٰ کہ میں اسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں، اور جب میں اس کو اپنا محبوب بنالیتا ہوں تو پھر میں اس کے کان ہو جاتا ہوں اور اس کی آنکھیں ہو جاتا ہوں"۔ سو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو بندہ اپنے کانوں سے اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ چیز نہ سنے وہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرلے اور جو اپنی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ چیزوں کو نہ دیکھے وہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرلے، اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے بعد یہ مرتبہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنا محبوب بنالیتے ہیں، سو بندہ کا اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ چیزوں کو سننا اور پسندیدہ چیزوں کو دیکھنا یہ وہ مرتبہ ہے جو پہلے حاصل ہوتا ہے جس سے بندہ کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا محبوب ہونا اس کے بعد کا مرتبہ ہے، لہٰذا محبوب بننے کے بعد اسے جو نعمت حاصل ہوگی وہ اس سے زائد ہوگی جو حصول قرب کے وقت حاصل ہوئی تھی، اس لیے یہاں پر اللہ تعالیٰ کے کان ہونے اور آنکھیں ہونے کا یہ معنی نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ اس کے کان اور اس کی آنکھوں کے محافظ ہو جاتے ہیں بلکہ یہاں اس کے سوا کوئی اور معنی مراد ہوگا۔ اور اس معنی کو سمجھنے کے لیے امام رازی کی درج ذیل عبارت ملاحظہ فرمائیں:

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی شافعی متوفی ٦٠٦ ھ، لکھتے ہیں:

الحجة الثالثه: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب عزوجل سے حکایت کرتے ہوئے فرمایا: "کوئی بندہ فرائض کی ادائیگی کی مثل سے میرا قرب حاصل نہیں کرسکتا اور نہ کوئی بندہ نوافل پر دوام کرنے سے میرے قرب کی مثل حاصل کرسکتا ہے حتیٰ کہ میں اس بندہ کو محبوب بنالیتا ہوں، پس جب میں اس کو محبوب بنالیتا ہوں تو میں اس کے کان ہو جاتا ہوں اور آنکھ ہو جاتا ہوں اور زبان اور آنکھ اور دل اور ہاتھ اور پیر، وہ مجھ سے سنتا ہے اور مجھ سے دیکھتا ہے اور مجھ سے کلام کرتا ہے اور مجھ سے چلتا ہے"۔

یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ اولیاء اللہ کے اپنے کانوں میں غیر اللہ کا کوئی حصہ نہیں رہتا نہ ان کی آنکھوں میں اور نہ ان کے باقی اعضاء میں، کیونکہ اگر ان کی آنکھوں میں اور کانوں میں غیر اللہ کا حصہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ یہ نہ فرماتے کہ میں اس کے کان ہوں اور میں اس کی آنکھ ہوں، پس یہ ثابت ہو گیا تو ہم کہتے ہیں کہ یہ مقام اس سے بلند ہے کہ کسی سانپ کو مسخر کر دیا جائے یا کسی درندہ کو مسخر کر دیا جائے۔

الحجة الرابعه: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب عزوجل سے حکایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: "جس نے میرے ولی کو ایذاء پہنچائی اس نے مجھ سے اعلانِ جنگ کر دیا"۔ پس اللہ تعالیٰ نے ولی کی ایذاء کو اپنی ایذاء کے قائم مقام قرار دیا اور یہ اس آیت کے قریب ہے: "اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۗ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (الفتح: ١٠)" (بے شک جو لوگ آپ کی بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں، اللہ کا ہاتھ ہے ان کے ہاتھوں پر، سو جس نے یہ بیعت توڑی تو اس کا وبال صرف اسی

پر ہوگا اور جس نے اللہ سے کیا ہوا عہد پورا کیا تو عنقریب اللہ اسے بہت بڑا اجر عطا فرمائیں گے O)۔

پس اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کو اللہ کی بیعت قرار دیا اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا کو اللہ کی رضا قرار دیا اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذاء کو اللہ تعالیٰ کی ایذاء قرار دیا۔ پس ضروری ہوا کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ تمام درجات سے اعلیٰ ہو اور اپنی انتہا کو پہنچا ہوا ہو۔ اسی طرح یہاں بھی فرمایا: "جس نے میرے ولی کو ایذاء دی اس نے میرے ساتھ اعلانِ جنگ کر دیا"۔ یہ اس پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ولی کی ایذاء کو اپنی ایذاء کے قائم مقام قرار دیا۔ اور اس کی تائید درج ذیل حدیث سے ہوتی ہے:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ عزوجل قیامت کے دن فرمائیں گے: "اے ابن آدم! میں بیمار تھا تو نے میری عیادت نہیں کی، بندہ عرض کرے گا: اے میرے رب! میں آپ کی کس طرح عیادت کرتا حالانکہ آپ رب العالمین ہیں، اللہ عزوجل ارشاد فرمائیں گے: کیا تم کو یہ علم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا، تم نے اس کی عیادت نہیں کی، کیا تم یہ نہیں جانتے کہ بے شک اگر تم اس کی عیادت کرتے تو مجھے وہاں اس کے پاس پاتے؟"۔ "اے ابن آدم! میں نے تم سے کھانا طلب کیا تھا تو تم نے مجھے کھانا نہیں کھلایا؟" بندہ عرض کرے گا: اے میرے رب! میں آپ کو کیسے کھانا کھلاتا حالانکہ آپ رب العالمین ہیں، اللہ عزوجل فرمائیں گے: کیا تم نہیں جانتے کہ میرے فلاں بندہ نے تم سے کھانا طلب کیا تھا، اگر تم اس کو کھانا کھلا دیتے تو تم مجھے اس بندہ کے پاس پاتے: "اے ابن آدم! میں نے تم سے پانی طلب کیا تھا سو تم نے مجھے پانی نہیں پلایا؟" وہ بندہ عرض کرے گا: اے میرے رب! میں آپ کو کیسے پانی پلاتا حالانکہ آپ رب العالمین ہیں، اللہ عزوجل ارشاد فرمائیں گے: "میرے فلاں بندہ نے تم سے پانی طلب کیا تھا سو تم نے اس کو پانی نہیں پلایا، بہر حال اگر تم اس کو پانی پلا دیتے تو مجھے اس کے پاس پاتے"۔

(صحیح مسلم: ۲۵۶۹، مسند اسحاق بن راہویہ: ۴۸، الادب المفرد: ۵۱۷، صحیح ابن حبان: ۲۶۹، مکارم الاخلاق للطبرانی: ۱۷۰، الاسماء والصفات للبیہقی: ۲۷۴، شعب الایمان للبیہقی: ۸۷۵۲، شرح السنۃ للبغوی ج ۵ ص ۲۱۸، الجامع الصحیح للسنن والمسانید: ج ۳ ص ۱۳۶، مسند الموضوعی الجامع للکتب العشرۃ ج ۲ ص ۳۳۳)

الحجة السادسة: اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ افعال کا متولی روح ہے نہ کہ بدن۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت روح کے لیے ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ نے جب خیبر کے دروازہ کو اکھاڑا تو فرمایا: اللہ کی قسم! میں نے خیبر کا دروازہ جسمانی قوت سے نہیں اکھاڑا لیکن قوتِ ربانیہ سے اکھاڑا ہے، اس لیے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نظر اس وقت میں عالم اجساد سے منقطع ہو گئی تھی اور وہ عالم کبریاء کے ملائکہ کے انوار سے روشن ہو گئے تھے اور ان کی روح ارواحِ ملکیہ کے جواہر کے مشابہ ہو گئی تھی، اور عالم قدس کے انوار ان میں موجزن ہو گئے تھے، پس ضروری ہوا کہ ان میں وہ قدرت حاصل ہوتی جو عموماً دوسرے بشر کو حاصل نہیں ہوتی۔ اسی طرح جب بندہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر دوام کرتا ہے تو اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں اس کے کان ہو جاتا ہوں اور اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں، پس جب اللہ تعالیٰ کے جلال کا نور اس کے کان ہو جاتا ہے تو وہ قریب اور بعید کو سنتا ہے اور جب یہ نور اس کی آنکھ ہو جاتا ہے تو وہ قریب اور بعید کو دیکھتا ہے اور جب یہ نور اس کے ہاتھ ہو جاتا ہے تو وہ مشکل اور آسان چیزوں میں تصرف کرنے پر قادر ہوتا ہے اور بعید اور قریب چیزوں پر تصرف کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۷ ص ۳۳۵ـ۳۳۶، دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۴۱۵ھ)

امام رازی کی اس تفسیر کی تائید شیخ انور شاہ کشمیری کی درج ذیل عبارت سے ہوتی ہے:

حدیث مذکور کی شرح از شیخ انور شاہ الکشمیری ثم الدیوبندی

شیخ محمد انور شاہ الکشمیری ثم الدیوبندی المتوفی ۱۳۵۲ھ، اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد کہ "میں بندہ کے کان ہو جاتا ہوں" اس پر دلالت کرتا ہے کہ متقرب بالنوافل میں صرف اس کا جسم باقی رہتا ہے اور اس میں متصرف حضرت الالہیہ ہیں اور یہ وہی چیز ہے جس کو صوفیاء فناء فی اللہ سے کہتے ہیں یعنی بندہ اپنے نفس کے دواعی اور محرکات کو اتار پھینکتا ہے حتیٰ کہ اس میں صرف اللہ تعالیٰ متصرف ہوتے ہیں۔ اور اس حدیث میں وحدت الوجود کی چمک ہے اور ہمارے مشائخ اس مسئلہ کے معتقد ہیں۔

اور یہ ایسا ہے جیسے قرآن عزیز میں موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں مذکور ہے:

فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (النمل:٨)

پھر جب وہ اس جگہ پہنچے تو ان کو ندا فرمائی گئی کہ جو آگ (کی تجلی) میں ہے اور جو اس کے آس پاس ہے وہ برکت والا ہے اور اللہ سبحان ہیں جو تمام جہانوں کے رب ہیں O

فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰۤى اِنِّيْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (القصص:٣٠)

پھر جب موسیٰ آگ کے پاس پہنچے تو انہیں اس وادی کے دائیں کنارے پر برکت والی زمین کے ٹکڑے سے ایک درخت سے ندا فرمائی گئی کہ اے موسیٰ! بے شک میں ہی اللہ رب العلمین ہوں O

پس جو چیز دکھائی گئی تھی اور جس کا مشاہدہ ہوا تھا وہ صرف آگ تھی نہ کہ رب جل مجدہٗ، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس میں تجلی فرمائی تھی، پس دیکھنے میں درخت کلام کر رہا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے کلام کی اپنی طرف نسبت فرمائی، اس لیے کہ رب جل مجدہٗ اس درخت میں تجلی فرما چکے تھے اور وہ درخت اللہ تعالیٰ کی معرفت کا واسطہ بن گیا تھا۔ پس جس میں تجلی فرمائی گئی تھی اس نے تجلی کرنے والے کا حکم لے لیا، اور اس حدیث کی امثال میرے نزدیک مسئلہ تجلی کی طرف راجع ہیں، پس بے شک جب درخت کے لیے یہ جائز ہے کہ اس میں یہ ندا کی جائے کہ میں اللہ ہوں، تو اس ولی کا کیا حال ہوگا جو نوافل سے تقرب حاصل کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے کان اور اس کی آنکھیں نہ ہوں، یہ کیسے نہیں ہوگا حالانکہ ابن آدم جو رحمٰن کی صورت پر پیدا کیا گیا ہے موسیٰ علیہ السلام کے درخت سے کم تو نہیں ہے۔ (فیض الباری ج ۴ ص ۴۲۸۔۴۲۹ مجلس علمی، سورت، ہند ۱۹۳۸ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "(اے رسول اکرم!) آپ کافروں کی باتوں سے رنجیدہ نہ ہوں، بے شک پورا پورا غلبہ اللہ ہی کے لیے ہے، وہی سب کچھ سننے والے سب کچھ جاننے والے ہیں O" (یونس:٦٥)

شیخ محمد علی صابونی، الاستاذ بکلیۃ الشریعۃ والدراسات الاسلامیہ بمکۃ المکرمۃ، یونس:٦٥ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ": یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کو کفار کی تشدید درنج میں نہ ڈالے اور ان کا یہ کہنا آپ کو غزدہ نہ کرے" وہ کہتے ہیں: آپ نبی مرسل نہیں ہیں"، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا: "اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا" یعنی قوت

کاملہ اور غلبۂ شاملہ صرف اللہ عزوجل کے لیے ہے، وہی آپ کے مددگار ہیں اور وہی آپ کو اِن کے ضرر سے روکنے والے اور آپ کی مدد فرمانے والے ہیں، اور وہ غلبہ کے ساتھ منفرد ہیں جو اپنے اولیاء کو غلبہ عطا فرماتے ہیں اور اُن کو اُن کے دشمنوں سے بچاتے ہیں۔ "هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ": یعنی اللہ عزوجل اُن کی تمام باتوں کو سننے والے ہیں اور اُن کے تمام کاموں کو جاننے والے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "سنو! بے شک آسمانوں اور زمینوں کی تمام چیزیں اللہ ہی کی ملکیت میں ہیں، اور جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر خود ساختہ شرکاء کی عبادت کرتے ہیں، وہ صرف اپنے گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور وہ محض اٹکل پچو سے کام لے رہے ہیں O" (یونس: ٦٦)

"اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ" یعنی آسمانوں اور زمینوں کی تمام چیزیں اللہ سبحانہ کی مخلوق ہیں اور سب اس کی ملکیت میں ہے۔

"وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ": اور یہ مشرکین جو اللہ عزوجل کو چھوڑ کر اس کے غیر کی عبادت کرتے ہیں اور اُن کو اپنا معبود قرار دیتے ہیں، بلکہ وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ خود ساختہ بت ان کی شفاعت کریں گے اور ان کو نفع پہنچائیں گے اور وہ بت کسی کو بھی ضرر پہنچانے یا نفع پہنچانے کی طاقت نہیں رکھتے۔

"اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ": یعنی جس چیز کی وہ پیروی کرتے ہیں وہ صرف ان کا باطل گمان ہے۔

"وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ": یعنی وہ اپنے دل میں آئی ہوئی بات کی پیروی کرتے ہیں اور جھوٹ بولتے ہیں، اور اپنے اوہام کو حقائق قرار دیتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "(اللہ) وہی ہیں جنہوں نے تمہارے لئے رات کو بنایا تاکہ تم اس میں آرام کر سکو اور دن کو روشن بنایا تاکہ تم اس میں کارِ معیشت انجام دے سکو، بے شک (دن اور رات کے) اس نظام میں اُن لوگوں کے لیے ضرور نشانیاں ہیں جو غور سے اللہ کی آیتوں کو سنتے ہیں O" (یونس: ٦٧)

"هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا": اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ پر تنبیہ ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلائل ہیں جن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے تم لوگوں کے لیے رات کو تمہارے بدنوں کی راحت بنایا ہے جس میں تم تھکاوٹ سے اور طلبِ معاش کی مشقت سے راحت پاتے ہو۔ "وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا": اور اس نے دن کو روشن بنایا تم اس میں تمام چیزوں کو دیکھتے ہو تاکہ اس میں اپنی ضروریات کی تمام چیزوں کو پاؤ۔

"اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ": یعنی ان چیزوں میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلائل ہیں اور علامات ہیں اور یہ اُن لوگوں کے لیے ہے جو اللہ تعالیٰ کی آیات کو غور و فکر کے ساتھ سنتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "مشرکین نے کہا: "اللہ نے اپنا بیٹا بنالیا ہے" اللہ (کسی کو بیٹا بنانے سے) پاک ہیں، وہی (ہر چیز سے) بے نیاز ہیں، آسمانوں اور زمینوں کی تمام چیزیں اُن ہی کی ملکیت میں ہیں، تمہارے

پاس اس غلط بات کی کوئی دلیل نہیں ہے، کیا تم اللہ کے متعلق ایسی بات کہتے ہو جس کا تمہیں کوئی علم نہیں ہے O" (یونس: ۶۸)

"قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا": اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں اور عیسائیوں اور مشرکین کی گمراہی پر تنبیہ فرمائی ہے، یہودیوں اور عیسائیوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد کو ثابت کیا، پس یہودیوں نے کہا کہ "عزیر" اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائیوں نے کہا کہ "مسیح" اللہ کا بیٹا ہے، اس طرح کفارِ مکہ نے کہا تھا کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔

"سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِیُّ": یعنی اللہ عزوجل ان تمام شرکیہ باتوں سے منزہ اور مقدس ہیں جن کو یہ مشرکین اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں، کیونکہ اللہ عزوجل تمام مخلوق سے مستغنی ہیں، کیونکہ کسی کو بیٹا اسی لئے بنایا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی کے محتاج نہیں ہیں، پس ان سے اولاد کا ہونا محال ہے۔

"لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ": یعنی تمام مخلوق اُن کی ملکیت ہے۔

"اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا": کیا تمہارے اس شرکیہ دعویٰ پر تمہارے پاس کوئی دلیل ہے۔

"اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ": یا تم اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھتے ہو اور اُن کی طرف شریک کی اور اولاد کی جھوٹی نسبت کرتے ہو۔ اور اس آیت میں مشرکین کو جھڑکا ہے اور اُن کی جہالت کو آشکارا فرمایا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "آپ کہیے: "جو لوگ اللہ کے متعلق جھوٹے بہتان باندھتے ہیں وہ کبھی کامیابی حاصل نہیں کریں گے" O یہ دنیا کے کچھ فوائد ہیں، انجامِ کار انہوں نے ہماری ہی طرف لوٹنا ہے، پھر چونکہ وہ دنیا میں کفریہ کام کرتے رہے تھے تو ہم اُن کو آخرت میں سخت عذاب کا مزا چکھائیں گے O" (یونس: ۶۹-۷۰)

"قُلْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ": یعنی ہر وہ شخص جس نے اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھا ہے، وہ کبھی کامیاب نہیں ہوگا۔ "مَتَاعٌ فِی الدُّنْیَا": یعنی یہ دنیا کا تھوڑا سا فائدہ ہے جس کو تم دنیا کی زندگی میں حاصل کر رہے ہو۔

"ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُهُمْ": یعنی پھر تم سب کا لوٹنا ہماری طرف ہے اور اس دن ہم تمہارا حساب لیں گے اور تمہارے کرتوتوں پر سزا دیں گے۔ "ثُمَّ نُذِیْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِیْدَ بِمَا كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ": یعنی پھر آخرت میں ہم اُن کو ایسا عذاب چکھائیں گے جو اُن کے کفر کی وجہ سے اور اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے کی وجہ سے ہوگا اور وہ عذاب بہت سخت اور بہت درد دینے والا ہوگا۔

(صفوۃ التفاسیر: ۳۶۴-۳۶۵، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَیْكُمْ مَّقَامِیْ وَتَذْكِیْرِیْ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْۤا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا یَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَیْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْۤا اِلَیَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۷۱﴾

(اے رسولِ اکرم!) ان کافروں کو نوح کی خبر سنایئے جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! اگر تم کو میرا یہاں طویل قیام کرنا اور اللہ کی آیتوں کے ساتھ نصیحت کرنا ناگوار معلوم ہوتا ہے (سو تم اس کو ناگوار سمجھتے رہو) تو میرا توکل تو صرف اللہ پر ہے سو تم اپنی تمام تیاریاں مکمل کر لو اور اپنے خود ساختہ معبودوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لو اور اچھی طرح غور و فکر کر لو کہ تمہارے فیصلے کا کوئی پہلو تم سے مخفی نہ رہے، پھر تم میرے خلاف جو کارروائی کر سکتے ہو وہ کر لو اور مجھے بالکل مہلت نہ دو O

فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ ۖ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿٧٢﴾

پھر اگر تم نے (بدستور) پیٹھ پھیرے رکھی تو میں نے تم سے (اس تبلیغِ رسالت کا) کوئی معاوضہ نہیں طلب کیا، میرا اجر و ثواب تو صرف اللہ (کے ذمہ کرم) پر ہے، اور مجھے یہ حکم فرمایا گیا ہے کہ "میں اللہ کے اطاعت گزاروں میں سے رہوں" O

فَكَذَّبُوهُ فَنَجَّيْنَاهُ وَمَنْ مَعَهُ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنَاهُمْ خَلَائِفَ وَأَغْرَقْنَا الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۖ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِينَ ﴿٧٣﴾

سو کفارِ نوح نے اُن کی تکذیب کی، پس ہم نے اُن کو اور اُن کے ساتھ جو لوگ کشتی میں سوار تھے اُن سب کو نجات عطا فرما دی، اور ہم نے اُن کو باقی ماندہ لوگوں کا جانشین بنا دیا اور ہم نے اُن لوگوں کو غرق فرما دیا جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی تھی، پس آپ دیکھیے کہ جن لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرایا گیا تھا، اُن کا کیا انجام ہوا O

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِ رُسُلًا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ فَجَاءُوهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا بِهِ مِنْ قَبْلُ ۚ كَذَٰلِكَ نَطْبَعُ عَلَىٰ قُلُوبِ الْمُعْتَدِينَ ﴿٧٤﴾

پھر ہم نے نوح کے بعد متعدد رسول اُن کی قوم کی طرف مبعوث فرمائے، پس وہ رسول اُن کے پاس واضح دلائل لے کر آئے، پس جو لوگ اس سے پہلے نوح کی تکذیب کر چکے تھے وہ اُن پر ایمان لانے کے لیے تیار نہ ہوئے، ہم اسی طرح حد سے تجاوز کرنے والوں کے دلوں پر (کفر کی) مہر لگا دیتے ہیں O

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُوسَىٰ وَهَارُونَ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ بِآيَاتِنَا فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا مُجْرِمِينَ ﴿٧٥﴾

پھر ہم نے اُن کے بعد موسیٰ اور ہارون کو فرعون اور اس کے متبعین کی طرف اپنے معجزات عطا فرما کر مبعوث فرمایا، لیکن فرعون کے متبعین نے تکبر کیا اور وہ لوگ تھے ہی مجرم O

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۶﴾

پھر جب اُن کے پاس ہماری طرف سے دینِ حق آ گیا تو انہوں نے کہا: ''بے شک یہ تو کھلا ہوا جادو ہے''○

قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ﴿۷۷﴾

موسیٰ نے کہا: ''جب تمہارے پاس برحق دین آ گیا تو کیا تم اُس کے متعلق یہ کہتے ہو'' کیا یہ جادو ہے؟ حالانکہ جادوگر تو کبھی کامیاب نہیں ہوتے○

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ؕ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۸﴾

فرعون کے متبعین نے (موسیٰ اور ہارون سے) کہا: ''کیا آپ دونوں ہمارے پاس اس لئے آئے ہیں کہ ہمیں ان بتوں کی پرستش سے روک دیں جن کی ہمارے آباء واجداد پرستش کرتے چلے آئے ہیں اور سرزمین مصر میں تم دونوں کی بڑائی ثابت ہو جائے اور ہم تم دونوں پر ایمان لانے والے نہیں ہیں○''

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۷۹﴾

اور فرعون نے کہا: ''میرے پاس ہر قسم کے ماہر جادوگر لے آؤ''○

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۸۰﴾

پس جب وہ جادوگر آ گئے تو موسیٰ نے اُن سے کہا: ''تم (ہمارے مقابلہ میں) جو کچھ ڈالنے والے تھے وہ ڈال دو''○

فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۱﴾

پھر جب جادوگروں نے (زمین پر اپنی رسیاں اور لاٹھیاں) ڈال دیں تو موسیٰ نے کہا: تم نے جو کچھ پیش کیا ہے وہ جادو ہے، بے شک عنقریب اللہ اس جادو کو باطل فرما دیں گے، بے شک اللہ فساد کرنے والوں کے عمل کو درست نہیں فرماتے○

وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع

اللہ اپنی آیتوں سے دینِ حق کی تائید فرماتے ہیں خواہ مجرموں کو یہ ناگوار کیوں نہ ہو○

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''(اے رسولِ اکرم!) ان کافروں کو نوح کی خبر سنائیے جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! اگر تم کو میرا یہاں طویل قیام کرنا اور اللہ کی آیتوں کے ساتھ نصیحت کرنا ناگوار معلوم ہوتا

ہے (سوتم اس کو ناگوار سمجھتے رہو) تو میرا توکل تو صرف اللہ پر ہے، سوتم اپنی تمام تیاریاں مکمل کر لو اور اپنے خود ساختہ معبودوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لو اور اچھی طرح غور و فکر کر لو کہ تمہارے فیصلے کا کوئی پہلو تم سے مخفی نہ رہے، پھر تم میرے خلاف جو کارروائی کر سکتے ہو وہ کر لو اور مجھے بالکل مہلت نہ دو O" (یونس: ۷۱)

امام محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ، یونس: ۷۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ": یعنی اللہ عزوجل اپنے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہیں کہ آپ کی قوم میں سے جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹا بنالیا ہے، آپ اُن کے سامنے نوح کی خبر بیان کیجئے کہ اگر میرا تمہارے پاس طویل قیام تک رہنا تمہیں دشوار معلوم ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ میرا نصیحت کرنا تمہیں ناگوار ہوتا ہے (تو ہوتا رہے)۔ پس تم نے جو مجھے قتل کرنے کا یا مجھے اپنے درمیان سے نکالنے کا عزم کر لیا ہے، تو میں نے تو اللہ تعالیٰ پر توکل کیا ہے اور میرا اعتماد اللہ پر ہے۔ "فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ": سوتم میرے خلاف جو کچھ تیاری کر سکتے ہو، وہ کر لو۔ "اجمعت علی کذا" کا معنی ہے: میں نے اس کا عزم کر لیا، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: (جس نے فجر سے پہلے روزے کا عزم نہیں کیا تو اس کا روزہ نہیں ہے)۔

(سنن ترمذی: ۷۳۰، سنن نسائی: ۲۳۳۱، سنن ابوداؤد: ۲۴۵۴، سنن ابن ماجہ: ۱۷۰۰، مسند احمد: ۲۶۵۱۹)

"فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ": یعنی تم اپنے خود ساختہ معبودوں کو بھی اپنی مدد کے لیے بلا لو۔ اور شرکاء سے اُن کی مراد تھی اُن کے بت۔ "ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً": یعنی پھر میرے خلاف تمہاری تیاری میں کوئی کمی نہ رہے۔

اس آیت میں "غُمَّةً" کا لفظ ہے، یہ عرب کے اس قول سے ماخوذ ہے کہ جب اُن پر چاند کا دکھائی دینا مشکل ہو جائے اور چاند واضح نظر نہ آئے تو وہ کہتے ہیں کہ "چاند تم پر مشتبہ ہو گیا"۔ "ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ": پھر تم میرے خلاف جو فیصلہ کرتے ہو وہ کر لو۔

"وَلَا تُنْظِرُوْنِ": اور مجھے بالکل مہلت نہ دو۔

اس آیت میں اللہ عزوجل نے حضرت نوح علیہ السلام کے اس قول کی خبر دی ہے جو انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا تھا کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی مدد پر کامل بھروسا ہے اور وہ ان کفار اور بت پرستوں کی اُن کے خلاف سازشوں سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔ اور یہ خبر دی کہ اُن کے تراشیدہ بت نہ کسی کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ کسی کو نفع دے سکتے ہیں، اس لیے تم میرے خلاف اپنے بتوں سے جو مدد حاصل کر سکتے ہو وہ کر لو اور مجھے بالکل مہلت نہ دو، کیونکہ میرا اللہ تعالیٰ پر توکل ہے اور مجھے اُن ہی پر اعتماد ہے، اگر اللہ نہ چاہیں تو تم مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ (تفسیر الطبری ج ۱۲ ص ۲۳۰-۲۳۵، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۳۳ھ، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۹۷۰، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ، تفسیر مجاہد ص ۳۸۲)

ان آیات میں اگرچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ کی خبر دی لیکن ان آیات میں اللہ عزوجل نے اپنے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت نوح علیہ السلام کے طریقہ پر عمل کرنے پر برانگیختہ فرمایا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پھر اگر تم نے (بہ دستور) پیٹھ پھیرے رکھی تو میں نے تم سے (اس تبلیغ رسالت

کا) کوئی معاوضہ نہیں طلب کیا، میرا اجر وثواب تو صرف اللہ (کے ذمہ کرم) پر ہے، اور مجھے یہ حکم فرمایا گیا ہے
کہ" میں اللہ کے اطاعت گزاروں میں سے رہوں"O (یونس: ۷۲)

"فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ": یعنی اگر تم نے میری تبلیغ سے اعراض کیا اور میری نصیحت کو قبول کرنے سے انکار کیا: "فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ": تو میں نے اپنی رسالت کی تبلیغ پر اور تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے کا تو کوئی معاوضہ طلب نہیں کیا۔ "اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ": بے شک میرا اجر اور میرا ثواب صرف اللہ عزوجل کے ذمۂ کرم پر ہے۔ "وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ": اور مجھے یہی حکم فرمایا گیا ہے کہ میں ایمان لانے والوں میں سے یا اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنے والوں میں سے رہوں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "سو کفار نوح نے اُن کی تکذیب کی، پس ہم نے اُن کو اور اُن کے ساتھ جو لوگ کشتی میں سوار تھے اُن سب کو نجات عطا فرمادی، اور ہم نے اُن کو باقی ماندہ لوگوں کا جانشین بنادیا اور ہم نے اُن لوگوں کو غرق فرمادیا جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی تھی، پس آپ دیکھیے کہ جن لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرایا گیا تھا، اُن کا کیا انجام ہوا"O (یونس: ۷۳)

"فَكَذَّبُوْهُ": یعنی اُن کافروں نے نوح کی تکذیب کی۔ "فَنَجَّیْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ فِی الْفُلْكِ وَ جَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓىٕفَ": پس ہم نے نوح کو اور جو لوگ اُن کے ساتھ کشتی میں سوار تھے، اُن سب کو نجات عطا فرمائی، اور جو لوگ اُن کے ساتھ کشتی میں سوار تھے، اُن کو زمین پر اُن کا جانشین بنادیا جو اپنے کفر کی وجہ سے ہلاک ہو چکے تھے۔ "وَ اَغْرَقْنَا الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِیْنَ": اور جن لوگوں نے رسولوں کی تکذیب کی تھی اور اُن کا آخری معاملہ یہی تھا کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے رسولوں پر ایمان نہیں لائے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پھر ہم نے نوح کے بعد متعدد رسول اُن کی قوم کی طرف مبعوث فرمائے، پس وہ رسول اُن کے پاس واضح دلائل لے کر آئے، پس جو لوگ اس سے پہلے نوح کی تکذیب کر چکے تھے وہ اُن پر ایمان لانے کے لیے تیار نہ ہوئے، ہم اسی طرح حد سے تجاوز کرنے والوں کے دلوں پر (کفر کی) مہر لگا دیتے ہیں"O (یونس: ۷۴)

"ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ": پھر ہم نے نوح کے بعد اور رسولوں کو اُن کی قوموں کی طرف مبعوث فرمایا۔ "فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ": سو وہ اپنی قوم کے پاس واضح دلائل لے کر آئے۔ "فَمَا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ": سو وہ رسولوں پر ایمان لانے والے نہیں تھے جس طرح نوح کی قوم اس سے پہلے نوح پر ایمان نہیں لائی تھی۔ "كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِیْنَ": اسی طرح ہم حد سے گزرنے والوں کے دلوں پر (کفر کی) مہر لگا دیتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پھر ہم نے اُن کے بعد موسیٰ اور ہارون کو فرعون اور اس کے متبعین کی طرف اپنے معجزات عطا فرما کر مبعوث فرمایا، لیکن فرعون کے متبعین نے تکبر کیا اور وہ لوگ تھے ہی مجرم"O (یونس: ۷۵)

"ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَ هٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡىِٕهٖ بِاٰیٰتِنَا": پھر ہم نے اُن لوگوں کے بعد موسیٰ اور ہارون کو فرعون اور اُس کے درباریوں کی طرف اپنے معجزات عطا فرما کر بھیجا۔ "فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ": سو انہوں نے بھی ہمارے واضح دلائل کو دیکھنے کے باوجود موسیٰ اور ہارون پر ایمان لانے سے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ تھے ہی مجرم لوگ۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پھر جب اُن کے پاس ہماری طرف سے دینِ حق آ گیا تو انہوں نے کہا: "بے شک یہ تو کھلا ہوا جادو ہے" O" (یونس: ۷۶)

"فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا": پھر جب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام فرعون اور اس کے متبعین کے پاس ہمارے پاس سے دینِ حق کو لے کر آئے۔ "قَالُوْۤا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِیْنٌ": تو انہوں نے ان کے معجزات کو دیکھ کر کہا: "یہ تو کھلا ہوا جادو ہے"۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "موسیٰ نے کہا: "جب تمہارے پاس برحق دین آ گیا تو کیا تم اُس کے متعلق یہ کہتے ہو" کیا یہ جادو ہے؟ حالانکہ جادوگر تو کبھی کامیاب نہیں ہوئے O" (یونس: ۷۷)

"قَالَ مُوْسٰۤى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْؕ اَسِحْرٌ هٰذَاؕ": موسیٰ نے کہا کہ جب تمہارے پاس دینِ حق آ گیا تو تم اس کے متعلق یہ کہتے ہو کہ یہ جادو ہے۔ "وَ لَا یُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ" اور جادوگر کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "فرعون کے متبعین نے (موسیٰ اور ہارون سے) کہا: "کیا آپ دونوں ہمارے پاس اس لئے آئے ہیں کہ ہمیں ان بتوں کی پرستش سے روک دیں جن کی ہمارے آباء و اجداد پرستش کرتے چلے آئے ہیں اور سرزمین مصر میں تم دونوں کی بڑائی ثابت ہو جائے اور ہم تم دونوں پر ایمان لانے والے نہیں ہیں O" (یونس: ۷۸)

"قَالُوْۤا": یعنی فرعون اور اس کے متبعین نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: "اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا وَ تَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِیَآءُ فِی الْاَرْضِ": کیا آپ ہمارے پاس اس لئے آئے ہیں کہ آپ ہمیں اُس طریقہ سے روک دیں جس طریقہ سے ہم اپنے آباء و اجداد کی طرح بتوں کی پرستش کرتے آئے تھے اور تم دونوں کے لیے مصر کی سرزمین میں ملک اور سلطنت ہو جائے۔

"وَ مَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِیْنَ": اور ہم آپ دونوں کی تصدیق کرنے والے نہیں ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور فرعون نے کہا: "میرے پاس ہر قسم کے ماہر جادوگر لے آؤ" O" (یونس: ۷۹)

"وَ قَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِیْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِیْمٍ": اور فرعون نے کہا: "میرے پاس ہر قسم کے ماہر جادوگر لے آؤ"۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پس جب وہ جادوگر آ گئے تو موسیٰ نے اُن سے کہا: "(تم ہمارے مقابلہ میں) جو کچھ ڈالنے والے تھے وہ ڈال دو" O" (یونس: ۸۰)

"فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰۤى اَلْقُوْا مَاۤ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ": پس جب وہ جادوگر آ گئے تو موسیٰ نے اُن سے کہا: "(تم

ہمارے مقابلہ میں) جو کچھ ڈالنے والے تھے وہ ڈال دو"۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پھر جب جادوگروں نے (زمین پر اپنی رسیاں اور لاٹھیاں) ڈال دیں تو موسیٰ نے کہا: تم نے جو کچھ پیش کیا ہے وہ جادو ہے، بے شک عنقریب اللہ اس جادو کو باطل فرما دیں گے، بے شک اللہ فساد کرنے والوں کے عمل کو درست نہیں فرماتے O اللہ اپنی آیتوں سے دینِ حق کی تائید فرماتے ہیں خواہ مجرموں کو یہ ناگوار کیوں نہ ہو O" (یونس: ۸۱-۸۲)

"فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ": اس آیت کا معنی یہ ہے کہ تم جو رسیاں اور لاٹھیاں لے کر آئے ہو، اُن کو جھڑکتے ہوئے کہا: کیا یہی تمہارا جادو ہے۔ "اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ": بے شک عنقریب اللہ تعالیٰ تمہارے پیش کردہ جادو کو مٹا دیں گے اور تمہاری رسوائی کو ظاہر فرما دیں گے۔ "اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ": یعنی اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کے عمل کو اُن کے حق میں نفع دینے والا نہیں بناتے۔ "وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ": اور دینِ حق کو غالب فرماتے ہیں۔ "بِكَلِمٰتِهٖ": یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے پہلے وعدہ فرمایا ہے۔ "وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ": خواہ مجرموں کو یہ ناگوار کیوں نہ ہو۔

(معالم التنزیل ج ۲ ص ۳۲۸-۳۳۰، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰۤى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ۗ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝۸۳

پس موسیٰ کی قوم (بنی اسرائیل) کے چند لوگ ہی اُن پر ایمان لائے اور وہ بھی فرعون اور اُس کے درباریوں کے خوف سے سہمے ہوئے تھے کہ کہیں فرعون ہمیں کسی آزمائش میں مبتلا نہ کردے اور بے شک فرعون سرزمین مصر میں بہت زور آور تھا، اور بے شک وہ ضرور حد سے بڑھنے والوں میں سے تھا O

وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ۝۸۴

اور موسیٰ نے کہا: "اے میری قوم! اگر تم اللہ پر ایمان لے آئے ہو تو اُسی پر توکل کرو، اگر تم واقعی مسلمان ہو چکے ہو O"

فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝۸۵

پس انہوں نے کہا: ہم نے اللہ پر ہی توکل کیا ہے، اے ہمارے رب! ہمیں ظالم لوگوں کے فتنہ میں مبتلا نہ فرمانا O

وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝۸۶

اور ہمیں اپنی رحمت کے ساتھ کافروں سے نجات عطا فرمائیں O

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً

وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۷﴾

اور ہم نے موسیٰ اور اُن کے بھائی پر وحی نازل فرمائی کہ تم اپنی قوم کے لیے مصر میں مکانات بناؤ اور اپنے گھروں میں نماز پڑھنے کی جگہ بناؤ اور نماز پڑھتے رہو، اور ایمان والوں کو خوش خبری سناتے رہو ○

وَ قَالَ مُوْسٰى رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَیْتَ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاَهٗ زِیْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۙ رَبَّنَا لِیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ وَ اشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْا حَتّٰى یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ ﴿۸۸﴾

اور موسیٰ نے عرض کیا: "اے ہمارے رب! آپ نے فرعون کو اور اُس کے درباریوں کو دنیا کی زندگی میں سامانِ زینت اور بہت مال عطا فرمائے ہیں، اے ہمارے رب! تاکہ وہ انجام کار لوگوں کو آپ کے راستہ سے گمراہ کر دیں، اے ہمارے رب! اِن کے مال و اسباب کو تباہ فرما دیں اور اِن کے دلوں کو سخت فرما دیں تاکہ یہ اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک کہ دردناک عذاب کو دیکھ نہ لیں ○"

قَالَ قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِیْمَا وَ لَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِیْلَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾

اللہ نے فرمایا: تم دونوں کی دعا قبول فرمائی گئی ہے، پس تم ثابت قدم رہو اور جاہلوں کے طریقہ کی ہرگز پیروی نہ کرنا ○

وَ جٰوَزْنَا بِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَ جُنُوْدُهٗ بَغْیًا وَّ عَدْوًا ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۹۰﴾

اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر کے پار پہنچا دیا، سو فرعون اور اُس کے لشکروں نے سرکشی اور دشمنی سے اُن کا پیچھا کیا حتیٰ کہ جب فرعون غرق ہونے لگا تو اس نے کہا: "میں اُس پر ایمان لاتا ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، وہی جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں اب اسلام قبول کرنے والوں میں سے ہوں ○"

آٰلْـٰٔنَ وَ قَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَ كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ﴿۹۱﴾

(اُسے جواب دیا گیا:) کیا تو اب ایمان لا رہا ہے حالانکہ اس سے پہلے تو نے مسلسل نافرمانی کی اور تو فساد کرنے والوں میں سے تھا ○

فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰیَةً ؕ وَ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ

عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿۹۲﴾

پس آج ہم تجھے تیرے بدن سمیت نجات دیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لیے عبرت کا نشان بن جائے، اور بے شک بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے ضرور غافل ہیں O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''پس موسیٰ کی قوم (بنی اسرائیل) کے چند لوگ ہی اُن پر ایمان لائے اور وہ بھی فرعون اور اُس کے درباریوں کے خوف سے سہمے ہوئے تھے کہ کہیں فرعون ہمیں کسی آزمائش میں مبتلا نہ کر دے اور بے شک فرعون سرزمین مصر میں بہت زور آور تھا، اور بے شک وہ ضرور حد سے بڑھنے والوں میں سے تھا O'' (یونس: ۸۳)

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قصہ

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ، یونس: ۸۳ تا ۹۲ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰۤى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ'':

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عظیم معجزات عطا فرمائے ہیں اور یہ ظاہر ہو چکا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی نے تمام جادوگروں کے جادو کے آلات کو نگل لیا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ ان عظیم معجزات کو دیکھنے کے باوجود اُن کی قوم کے چند لوگوں نے ہی اسلام قبول کیا اور ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ وہ متعدد معجزات دکھانے کے باوجود اپنی قوم کے ایمان نہ لانے پر مغموم ہوتے تھے اور اُن کے کفر پر ڈٹے رہنے سے رنجیدہ ہوتے تھے تو اللہ عزوجل نے بیان فرمایا کہ ایسا تو تمام انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہوتا رہا ہے، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے جن معجزات کا ظہور ہوا وہ دیکھنے والوں کی آنکھوں میں بہت بڑے بڑے معجزات تھے، اس کے باوجود اُن میں سے چند لوگوں نے ہی اسلام قبول کیا۔

''ذُرِّيَّةٌ'' کے محامل

اس آیت میں ''ذُرِّيَّةٌ'' کا لفظ ہے اور ''ذُرِّيَّةٌ'' کے معنی میں کئی محامل ہیں:

(۱) ''ذُرِّيَّةٌ'' سے مراد ہے کم تعداد۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ لفظ ''ذُرِّيَّةٌ'' سے کسی قوم کو بہ طور تحقیر و تصغیر تعبیر کیا جاتا ہے، اور یہاں پر اہانت کے ساتھ تعبیر کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، اس لئے اس کو کم تعداد پر محمول کرنا واجب ہے۔

(۲) اس سے مراد بنی اسرائیل کی اولاد ہے، کیونکہ اُن کے آباء و اجداد تو کفر پر جمے ہوئے تھے، یا تو اس وجہ سے کہ اُن کی اولاد کے دل نرم تھے اور کفر پر جمے رہنے کے محرکات بہت معمولی تھے۔

(۳) ''ذُرِّيَّةٌ'' سے مراد آلِ فرعون میں سے حضرت آسیہ ہیں جو فرعون کی بیوی تھیں۔ اور فرعون کا خازن اور اس کی بیوی تھیں۔

اس آیت میں ''مِّنْ قَوْمِهٖ'' کا لفظ ہے، اس میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم ہے یا فرعون

کی قوم ہے، اور دونوں کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے، اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم ہے، کیونکہ انہی کا ذکر زیادہ قریب ہے، اور اس لئے بھی کہ منقول ہے کہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے تھے، وہ بنو اسرائیل تھے۔

اس آیت میں فرمایا ہے: "عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَاۡئِهِمْ اَنْ یَّفْتِنَهُمْ ": اس آیت میں چند ابحاث ہیں:

جو لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے تھے وہ فرعون سے بہت زیادہ خوف زدہ تھے، کیونکہ فرعون اپنے مخالفین پر بہت سخت گرفت کرتا تھا اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ دشمنی کو ظاہر کر چکا تھا، اور جب اسے معلوم ہوتا کہ اس کی قوم کے لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف مائل ہیں تو وہ ان کو ایذاء پہنچانے میں بہت اضافہ کرتا، اس سبب سے وہ سب فرعون سے سہمے ہوئے تھے۔

فرعون کے لیے جمع کے صیغے لانے کی وجوہ

اس آیت میں فرمایا ہے: "عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَاۡئِهِمْ " یہاں فرعون کے لیے جمع کی ضمیر لائی گئی ہے، اس کی حسب ذیل وجوہ ہیں:

(۱) کبھی لفظ واحد کو جمع کے ساتھ تعظیم کے لیے تعبیر کیا جاتا ہے جیسے قرآن مجید میں ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۝ (الحجر:۹) "(بے شک یہ قرآن (مجید) ہم نے ہی نازل فرمایا ہے اور بے شک ہم ہی اس کی ضرور حفاظت فرمانے والے ہیںO)۔

(۲) لفظ فرعون سے آل فرعون مراد ہے اور یہاں پر مضاف محذوف ہے۔

پھر فرمایا: "اَنْ یَّفْتِنَهُمْ " یعنی فرعون ان کو مصیبتوں میں مبتلاء کر کے ان کے برحق دین سے پھیر دے گا۔

پھر فرمایا: "وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِی الْاَرْضِ ": یعنی فرعون زمین پر بہت غالب اور قاہر تھا۔

"وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِیْنَ ": یعنی وہ زمین میں اپنے مخالفین کو قتل کرتا تھا اور طرح طرح کے عذاب اور مصائب میں مبتلاء کرتا تھا۔ اور اس آیت میں یہ سبب بیان فرمایا ہے کہ (سیدنا) موسیٰ علیہ السلام کی ذریت میں سے لوگ کس وجہ سے خوف زدہ تھے اور کیوں سہمے ہوئے تھے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نہایت خسیس بندہ تھا، اس کے باوجود اس نے الوہیت کا دعویٰ کیا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور موسیٰ نے کہا: "اے میری قوم! اگر تم اللہ پر ایمان لے آئے ہو تو اُسی پر توکل کرو، اگر تم واقعی مسلمان ہو چکے ہو"O" (یونس:۸۴)

توکل کا معنی اور اس کی حقیقت

"وَقَالَ مُوْسٰی یٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ ":

اس آیت کی نظیر یہ ہے جیسے کوئی شخص کسی مسلمان ہونے والے سے یہ کہے کہ اگر تو اللہ پر ایمان رکھتا ہے تو اسی پر توکل کر۔ اور معاملہ اسی طرح سے ہے، کیونکہ اسلام کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ کے احکام کے سامنے سر جھکانا۔ اور اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ آدمی پر جو تکالیف اور مصائب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوں تو اللہ تعالیٰ کے سامنے عجز کے ساتھ سر جھکائے رکھے اور سرکشی کو ترک کر دے۔ اور ایمان کا معنی یہ ہے کہ انسان دل سے یہ مانتا ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی واجب الوجود (قدیم بالذات) اور لذاتہٖ واحد ہیں اور اُن

کے ماسوا جو کچھ بھی ہے وہ حادث ،ممکن اور اللہ تعالیٰ کی مشیت کی تدبیر کے تحت ہے۔اور جب انسان کو یہ دونوں حالتیں میسر ہو جائیں تو پھر بندہ اپنے تمام معاملات کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے اور اس کے دل میں توکل کا نور پیدا ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے کا معنی یہ ہے کہ وہ تمام معاملات کو بالکلیہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دے اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرے۔اور جو اپنے تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ پر توکل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے کافی ہیں۔''وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ۔ (الطلاق:٣)''۔

اس آیت میں فرمایا ہے:''فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْا'' اور یہ نہیں فرمایا''توکلوا علیہ'' کیونکہ جب جار مجرور کو مقدم کیا جاتا ہے تو وہ حصر کا فائدہ دیتا ہے،گویا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی ذریّت کو اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے کا حکم فرمایا اور غیر پر توکل کرنے سے منع فرمایا ہے،اور واقعہ اسی طرح ہے،کیونکہ جب ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جو کچھ بھی ہے،وہ اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہے اور اللہ تعالیٰ ہی کی سلطنت ہے اور اللہ تعالیٰ ہی کے تصرف کے تحت ہے اور اللہ تعالیٰ ہی کے احکام کے مسخر ہے،تو اب عقل کے نزدیک یہ ناجائز ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے غیر پر توکل کرے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:''پس انہوں نے کہا: ہم نے اللہ پر ہی توکل کیا ہے،اے ہمارے رب! ہمیں ظالم لوگوں کے فتنہ میں مبتلاء نہ فرماناO اور ہمیں اپنی رحمت کے ساتھ کافروں سے نجات عطا فرمائیںO''

(یونس:٨٥_٨٦)

''فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا'': یعنی ہم نے اللہ ہی پر توکل کیا ہے اور ہم اللہ تعالیٰ کے غیر کی طرف بالکل التفات نہیں کرتے،اور جب انہوں نے یہ کہہ دیا تو پھر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دو دعائیں کیں:

ظالموں کی فتنہ انگیزیوں سے بچنے کی دعا کے محامل

ایک دعا یہ ہے:''رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ'':اس کے درج ذیل محامل ہیں:

(١) ہمیں فرعون اور اس کی قوم کے مظالم میں مبتلاء نہ فرمانا،کیونکہ اگر آپ نے اُن کو ہم پر غلبہ عطا فرمادیا تو ہمارے دل میں یہ شک پیدا ہوگا کہ اگر ہم دینِ حق پر ہوتے تو ہمارے دشمن ہم پر مسلط نہ ہوتے۔اور یہ اُن کے کفر پر اصرار کے لیے قوی شبہ ہوتا۔

(٢) اگر آپ نے فرعون اور اس کی قوم کو ہم پر مسلط فرمادیا تو وہ ہم پر زیادہ شدت کے ساتھ ضرر پہنچائیں گے۔

(٣) اس کا معنی ہے:ہمیں فتنہ کی جگہ پر نہ ٹھہرانا۔

''وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ'':اور اس دعا سے دوسرا مطلوب یہ ہے کہ آپ اپنی رحمت کے ساتھ ہمیں کافروں سے نجات عطا فرمائیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:''اور ہم نے موسیٰ اور اُن کے بھائی پر وحی نازل فرمائی کہ تم اپنی قوم کے لیے مصر میں مکانات بناؤ اور اپنے گھروں میں نماز پڑھنے کی جگہ بناؤ اور نماز پڑھتے رہو اور ایمان والوں کو خوش خبری سناتے رہوO'' (یونس:٨٧)

"وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا":

جب اللہ تعالیٰ نے کافروں سے مومنین کے خوف کو بیان فرمایا اور یہ ظاہر فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہیں تو اس کے بعد یہ ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو اپنے گھروں میں نماز پڑھنے کی جگہ بنانے کا حکم فرمایا، اور یہ کہ وہ نماز پڑھنے میں مشغول رہیں۔

مصر میں بنی اسرائیل کو گھر بنانے کے حکم کی توجیہ

اس آیت میں فرمایا ہے: "وَاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ": اس کے متعدد محامل ہیں:

(۱) تم اپنے گھروں میں مساجد بنالو اور نماز پڑھنے کے وقت اُن مساجد کے قبلہ کی طرف نماز پڑھو۔

(۲) الفراء نے کہا: تم اپنے گھروں کو قبلہ کی جانب بناؤ، اور ظاہر قرآن میں قبلہ کا تعین نہیں فرمایا ہے، تاہم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ اُن کا قبلہ وہ تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قبلہ تھا۔

(۳) حسن بصری نے کہا کہ الکعبہ تمام انبیاء علیہم السلام کا قبلہ ہے۔ اور ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قبلہ سے عدول کرنے کا حکم فرمایا گیا۔

(۴) اور دوسرے مفسرین نے کہا: یہ قبلہ بیت المقدس کی جہت میں بنا ہوا تھا۔

پھر اس آیت کے اخیر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ خصوصی خطاب فرمایا: "وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ"، اس لئے کہ تمام عبادات سے غرض اس بشارت کا حصول ہے، اور اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خصوصی خطاب اس لئے فرمایا تا کہ یہ خطاب اس پر دلالت کرے کہ اصل رسالت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں اور حضرت ہارون علیہ السلام اُن کے تابع ہیں۔

بنی اسرائیل کو گھروں میں نماز پڑھنے کے حکم کی حکمتیں

(۱) حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے متبعین کو شروع شروع میں یہ حکم فرمایا گیا تھا کہ وہ اپنے گھروں میں کافروں سے چھپ کر نماز پڑھیں، تا کہ مخالفین اُن پر غلبہ پا کر انہیں ایذاء نہ پہنچائیں اور اُن کو اُن کے دین حق سے پھیر نہ دیں جیسا کہ مسلمان ابتداء میں مکہ میں نماز پڑھتے تھے۔

(۲) جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف تبلیغ کے لئے بھیجا تو فرعون نے بنی اسرائیل کی مساجد کو تباہ و برباد کرنے کا حکم دیا اور اُن کو نماز پڑھنے سے روک دیا، تب اللہ عزوجل نے حکم فرمایا کہ اب تم اپنے گھروں میں نماز پڑھو تا کہ فرعون کے مظالم سے بچے رہو۔

(۳) جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بھیجا اور فرعون نے اُن کے خلاف شدید دشمنی ظاہر کی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور اُن کی قوم کو یہ حکم فرمایا کہ وہ اپنے گھروں میں مسجدیں بنالیں اور اللہ تعالیٰ اُن کو دشمنوں کی ایذاء رسانی سے محفوظ فرمائیں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "موسیٰ نے عرض کیا: "اے ہمارے رب! آپ نے فرعون کو اور اُس کے درباریوں کو دنیا کی زندگی میں سامانِ زینت اور بہت مال عطا فرمائے ہیں، اے ہمارے رب! تا کہ وہ

انجام کار لوگوں کو آپ کے راستہ سے گمراہ کردیں، اے ہمارے رب! اِن کے مال واسباب کو تباہ فرمادیں اور اِن کے دلوں کو سخت فرمادیں تاکہ یہ اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک کہ وہ دردناک عذاب کو نہ دیکھ لیں''O(یونس:۸۸)

فرعون اور اس کے متبعین کو دنیاوی مال ومتاع عطا فرمانے کے متعلق ابحاث

''وَ قَالَ مُوْسٰى رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَیْتَ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاَهٗ زِیْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۙ رَبَّنَا لِیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ'':

اس آیت میں ایک بحث یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''یہ ایمان نہیں لائیں گے'' تو اب ان سے ایمان کا صدور محال ہوگیا ہے، کیونکہ اگر وہ ایمان لے آتے تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی خبر جھوٹ ہوجاتی اور اللہ تعالیٰ کی خبر کا جھوٹ ہونا محال ہے اور جو محال پر موقوف ہو وہ بھی محال ہوتا ہے۔

اور دوسری بحث یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی دعا میں عرض کیا: ''اے ہمارے رب! آپ نے اُن کو دنیا کا مال واسباب اور دنیا کی زینت عطا فرمائی ہے ''لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ'' تاکہ یہ لوگوں کو آپ کے راستہ سے گمراہ کردیں''۔ اس کا ایک معنی یہ ہے کہ کہیں وہ لوگوں کو آپ کے راستہ سے گمراہ نہ کردیں۔

تیسری بحث یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے یہ نقل فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا کی کہ: ''اے اللہ! ان کے مال واسباب کو تباہ فرمادیں'' اور ''الطمس'' کے معنی ہیں: مسخ یعنی ان کے دراہم اور دنانیر کو مسخ فرما کر پتھر بنادیں۔ نیز انہوں نے دعا کی: ''وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ'' یعنی ان کے دلوں میں سختی پیدا فرمادیں حتیٰ کہ ان میں ایمان داخل نہ ہوسکے۔

پھر فرمایا: ''فَلَا یُؤْمِنُوْا حَتّٰى یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ'' اس کا معنی ہے کہ ان کے دلوں کو سخت فرمادیں حتیٰ کہ یہ لوگ اس وقت تک ایمان نہ لاسکیں، جب تک آپ کا دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو تباہ وبرباد کرنے اور ان کے دلوں کو اتنا سخت کردینے کی دعا کی کہ وہ ایمان نہ لاسکیں، اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے منکروں اور مخالفین کے لیے دعا کی: ''وَ قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ دَیَّارًا ۞ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ یُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَ لَا یَلِدُوْۤا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۞ (نوح:۲۶-۲۷)'' (اور نوح نے دعا کی: اے میرے رب! زمین پر کافروں میں سے کوئی بسنے والا نہ چھوڑیں O بے شک اگر آپ نے ان کافروں کو چھوڑا تو وہ آپ کے بندوں کو گمراہ کردیں گے اور ان کی جو اولاد بھی پیدا ہوگی وہ بدکار اور شدید کافر ہوگی O) اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی: ''وَ قَالَ مُوْسٰى رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَیْتَ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاَهٗ زِیْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۙ رَبَّنَا لِیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ وَ اشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْا حَتّٰى یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ ۞ (یونس:۸۸)'' (اور موسیٰ نے دعا کی: اے ہمارے رب! آپ نے فرعون کو اور اس کے ارکانِ حکومت کو دنیاوی زینت کا سامان عطاء فرمایا ہے اور دنیا کی زندگی میں بہت اموال عطاء فرمائے ہیں، اے ہمارے رب! تاکہ وہ انجام کار لوگوں کو آپ کے راستہ سے گمراہ کردیں، اے ہمارے رب! ان کے اموال کو ہلاکت میں ڈال دیں

اور ان کے دلوں کو سخت فرمادیں تا کہ وہ ایمان نہ لائیں حتیٰ کہ وہ دردناک عذاب کو دیکھ لیں O۔

دو جلیل القدر نبیوں (حضرت موسیٰ اور حضرت نوح علیہما السلام) کا اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرنا کہ ان کے منکر کفار کو اللہ تعالیٰ ان کے ایمان لانے کا موقع نہ دیں، اس کے برخلاف ہمارے نبی علیہ السلام کا اپنے منکرین کفار کے ایمان لانے کی تمنا فرمانا

عروہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ نے ان کو حدیث بیان کی کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: کیا آپ کے اوپر کوئی ایسا دن بھی آیا جو آپ کے نزدیک غزوۂ اُحد کے دن سے بھی زیادہ شدید تھا؟ آپ نے فرمایا: تمہاری قوم سے مجھے جو مصائب پہنچے سو پہنچے اور ان تمام مصائب میں سے سب سے زیادہ سخت مصیبت وہ تھی جو مجھے عقبہ کے دن پہنچی، جب میں نے اپنے آپ کو ابن عبد یالیل بن عبد کلال پر پیش کیا، اس نے میرے ارادہ کے مطابق میری دعوت کو قبول نہیں کیا، میں وہاں سے بہت مغموم حالت میں چل پڑا، پھر جب میں قرن الثعالب پر پہنچا تو میری حالت سنبھلی، پس میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو مجھ پر ایک بادل نے سایا کیا ہوا تھا، پھر میں نے غور کیا تو اس میں (حضرت) جبریل تھے، انہوں نے مجھے آواز دی اور کہا: بے شک اللہ نے آپ کی قوم کی باتیں سن لی ہیں اور انہوں نے آپ کو جو جواب دیا ہے وہ بھی سن لیا ہے اور اللہ نے آپ کی طرف پہاڑوں کا فرشتہ بھیجا ہے تا کہ آپ اس کو ان لوگوں کے متعلق جو چاہیں حکم دے دیں، پھر مجھ کو پہاڑوں کے فرشتہ نے آواز دی، پس اس نے مجھ کو سلام کیا، پھر اس نے کہا: اے محمد! اس نے بھی یہی کہا: آپ جو چاہیں، اگر آپ چاہیں تو جن دو پہاڑوں کے درمیان یہ لوگ ہیں، ان دو پہاڑوں کو آپس میں ملا دوں (جس سے یہ ان کے درمیان دھنس جائیں)، تب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلکہ مجھے امید ہے کہ اللہ ان لوگوں کی پشتوں سے ایسے لوگوں کو نکالیں گے جو صرف اللہ وحدہٗ کی عبادت کریں گے اور کسی کو اس کے ساتھ شریک نہیں کریں گے۔ (صحیح البخاری: ۳۲۳۱، ۷۳۸۹، صحیح مسلم: ۱۷۹۵، الرقم المسلسل: ۴۵۴۵)

اس حدیث سے یہ واضح ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مزاج نہیں تھا کہ کفار پر کوئی آسمانی عذاب بھیجا جائے، آپ کو یہ اختیار دیا گیا کہ جن کافروں نے آپ پر ظلم کیا ہے آپ فرشتہ کو حکم دیں تو وہ ان کافروں کو دو پہاڑوں کے درمیان پیس کر رکھ دے، تب بھی آپ نے یہی فرمایا: "بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ لوگ اسلام لے آئیں اور اگر یہ اسلام نہ لائیں تو ان کی پشتوں سے ایسی اولاد پیدا ہوگی جو اسلام لے آئے گی"۔ بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کفار کو عذاب میں مبتلا فرمانا نہیں چاہتے تھے۔ (سعیدی غفرلہٗ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اللہ نے فرمایا: تم دونوں کی دعا قبول فرمالی گئی ہے، پس تم ثابت قدم رہو اور جاہلوں کے طریقہ کی ہرگز پیروی نہ کرنا O" (یونس: ۸۹)

"قَالَ قَدۡ اُجِيۡبَتۡ دَّعۡوَتُكُمَا":

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام دعا کرتے تھے اور حضرت ہارون علیہ السلام اُس دعا پر آمین کہتے تھے، اس لیے فرمایا: تم دونوں کی دعا قبول فرمالی گئی ہے۔

حضرت موسیٰ اور حضرت نوح علیہما السلام نے اپنی دعا کے بعد کتنے عرصہ تک کفار کے درمیان قیام فرمایا؟

اس آیت میں فرمایا ہے: "فَاسْتَقِیْمَا": یعنی تم اپنی دعا پر اور رسالت پر مستقیم رہو۔ حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم میں چند سال کم ایک ہزار سال رہے، سو تم دونوں دعا کے قبول ہونے میں جلدی نہ کرنا۔ ابن جریج نے کہا: اس دعا کے بعد فرعون چالیس سال تک زندہ رہا۔

جاہلوں کے طریقہ کی پیروی نہ کرنے کے حکم کا محمل

"وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِیْلَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ": اس آیت کا درج ذیل محمل ہے:

یعنی تم دونوں جاہلوں کے طریقہ کی پیروی نہ کرنا جو یہ گمان کرتے ہیں کہ جب انہوں نے دعا کی تو وہ جلدی قبول ہو جائے گی۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ دعا کرتے ہی اُن کی دعا قبول ہو جائے۔ پس اللہ تعالیٰ انسان کی دعا کو اس وقت قبول فرماتے ہیں جو وقت اُس کی دعا کے قبول ہونے کے لیے مقرر فرمایا ہوا ہوتا ہے۔ اور دعا کی جلدی قبولیت کے لیے صرف جاہل مطالبہ کرتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر کے پار پہنچا دیا، سو فرعون اور اُس کے لشکروں نے سرکشی اور دشمنی سے اُن کا پیچھا کیا حتیٰ کہ جب فرعون غرق ہونے لگا تو اس نے کہا: "میں اُس پر ایمان لاتا ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، وہی جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں اب اسلام قبول کرنے والوں میں سے ہوں"O (یونس:۹۰)

فرعون کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تعاقب میں ناکام ہونا

"وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ": اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے کی دعا کو کسی معین وقت میں قبول فرمالیا اور انہیں وہاں سے نکلنے کے اسباب مہیا فرما دیے اور فرعون اس معاملہ سے غافل تھا، پس جب اس نے سنا کہ بنی اسرائیل مصر سے نکل گئے ہیں اور اُن کا ارادہ اس کے ملک سے باہر جانے کا ہے تو اس نے ان کا تعاقب کیا۔

"فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ": پس وہ اُن کے پیچھے روانہ ہوا۔

"بَغْیًا وَّعَدْوًا": البغی کا معنی ہے: ناحق غلبہ کو طلب کرنا اور "العدو" کا معنی ہے ظلم۔ روایت ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ساتھ نکلے اور سمندر کی ایک طرف پر پہنچ گئے اور فرعون اپنے لشکر کے ساتھ ان کے قریب جا کر پہنچا تو بنی اسرائیل شدید خوف میں مبتلاء ہوئے، کیونکہ اُن کے سامنے غرق کرنے والا سمندر تھا اور اُن کے پیچھے فرعون کا لشکر تھا جو اُن کو ہلاک کرنے کے درپے تھا، سو اللہ تعالیٰ نے اُن پر یہ انعام فرمایا کہ اُن کے لیے سمندر میں ایک راستہ بنا دیا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے اصحاب کے ساتھ اُس راستہ میں داخل ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے اُس راستہ کو خشک بنا دیا تا کہ فرعون اور اُس کا لشکر بھی اس راستہ پر چل کر سمندر کو عبور کرنے کی طمع کرے۔

"حَتّٰۤی اِذَاۤ اَدْرَکَهُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ":

پھر جب وہ سب سمندر میں داخل ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے پانی کے بعض اجزاء کو دوسرے بعض اجزاء کے ساتھ ملا دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا کہ جب فرعون اور اس کے لشکر والے غرق ہو گئے تو فرعون نے اخلاص کے ساتھ دعا کی، اس کا یہ گمان تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس آفت سے نجات عطا فرما دیں گے۔

فرعون کی دعا پر چند سوالات کے جوابات

(۱) جب انسان غرق ہو رہا ہو تو اُس سے کیسے ممکن ہے کہ وہ دعا کے یہ الفاظ کہے: ''اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ''؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارا مذہب یہ ہے کہ کلام حقیقی وہ کلام النفس ہے نہ کہ زبان سے کلام کرنا، تو اس نے دل میں یہ دعا مانگی تھی۔ دوسرا جواب یہ ہے: ''حَتّٰۤى اِذَاۤ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ'' اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ اس نے غرق ہونے کے بعد یہ دعا کی، بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ جب اس کے غرق ہونے کے اسباب مہیا ہو گئے اور قریب تھا کہ وہ غرق ہو جاتا، اس وقت اُس نے زبان سے یہ دعا کی۔

(۲) دوسرا سوال یہ ہے کہ اس نے تین مرتبہ دعا کی، ایک مرتبہ کہا: ''اٰمَنْتُ'' یعنی میں ایمان لے آیا، دوسری مرتبہ کہا: ''لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ'' (جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، وہی جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں)، اور تیسری مرتبہ کہا: ''وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ'' (اور میں اب اسلام قبول کرنے والوں میں سے ہوں)۔ اس کی اس دعا کے قبول نہ ہونے کا کیا سبب ہے؟ اس سوال کے حسب ذیل جوابات ہیں:

فرعون کی دعا کو رد فرمانے کی وجوہ

(الف) وہ عذاب کے نازل ہونے کے وقت ایمان لایا، اور جب بندہ نزولِ عذاب کو دیکھ لے اس وقت اس کا ایمان لانا مقبول نہیں ہوتا، اور اس حال میں توبہ بھی قبول نہیں ہوتی، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''فَلَمْ یَكُ یَنْفَعُهُمْ اِیْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا۔ (المؤمن: ۸۵)'' (پس جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو اس وقت ان کا ایمان انہیں فائدہ نہیں دے سکتا تھا)۔

(ب) اس نے یہ دعا اللہ تعالیٰ کی ذات سے اخلاص کے ساتھ نہیں مانگی تھی، اس کا منشاء صرف یہ تھا کہ اس وقت جو پیش آمدہ مصیبت ہے وہ اس سے ٹل جائے۔

(ج) اس کی یہ دعا تحقیق پر مبنی نہیں تھی بلکہ محض تقلید پر مبنی تھی، کیونکہ اس نے کہا: ''لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ'' (جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، وہی جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں)، گویا اُس نے یہ اعتراف کیا کہ اسے خود اللہ تعالیٰ کی معرفت نہیں ہے مگر اس نے بنی اسرائیل سے یہ سنا تھا کہ اس جہان کا کوئی خدا ہے، پس اُس نے اُس خدا کا اقرار کیا جس کا اُس نے بنی اسرائیل سے سنا تھا، لہٰذا اُس کا یہ کلام محض تقلید پر مبنی تھا تحقیق پر مبنی نہیں تھا۔ نیز فرعون وجودِ صانع کا منکر تھا، کیونکہ اس نے کہا تھا: ''اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾ (النازعات: ۲۴)'' (میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں O)، اس لئے فرعون کا یہ ایمان صرف تقلیدِ محض پر مبنی تھا اور جو ایمان محض تقلید کی بناء پر ہو وہ مفید نہیں ہوتا۔

(د) اُس کا ایمان اُس وقت مکمل ہوتا جب وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے اقرار کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا بھی اقرار کرتا، اور یہاں پر فرعون نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا تو اقرار کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا اقرار نہیں کیا، لہٰذا اس کا ایمان لانا صحیح نہ تھا، اور اس کی نظیر یہ ہے کہ اگر کافروں میں سے کوئی شخص ایک ہزار مرتبہ بھی کہے اشھد ان لا الٰہ الا اللہ تو اس کا ایمان صحیح نہیں ہوگا، مگر جب وہ اشھد ان لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ اشھد ان محمد رسول اللہ کہے تب اس کا ایمان مفید ہوگا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''(اُسے جواب دیا گیا:) کیا تو اب ایمان لا رہا ہے حالانکہ اس سے پہلے تو نے مسلسل نافرمانی کی اور تو فساد کرنے والوں میں سے تھا 〇'' (یونس: ۹۱)

''آٰلْـٰٔنَ وَ قَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَ كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ'':

حضرت جبریل علیہ السلام کا فرعون کے مونہہ میں کیچڑ والی مٹی بھرنے کے متعلق احادیث

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے فرعون کو غرق فرما دیا تو اس نے کہا: ''اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ''، پس حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا: اے محمد (صلی اللہ علیک وسلم)، کاش! آپ وہ وقت دیکھتے جب میں سمندر کی تہہ سے مٹی نکال رہا تھا اور فرعون کے مونہہ میں ڈال رہا تھا اس ڈر سے کہ کہیں اس کو اللہ کی رحمت نہ پالے۔ (سنن ترمذی: ۳۱۱۸، امام ابوعیسیٰ ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن ہے)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبریل فرعون کے مونہہ میں کیچڑ کی مٹی ڈال رہے تھے اس خوف سے کہ وہ کہیں یہ نہ کہہ دے لا الٰہ الا اللہ، پھر اللہ اس پر رحم فرمائیں۔

(سنن ترمذی: ۳۱۱۹، سنن نسائی، کتاب التفسیر: ۲۵۸، مسند ابوداؤد الطیالسی: ۲۶۱۸، المستدرک للحاکم ج ۱ ص ۵۷، ج ۲ ص ۳۴۰، ج ۴ ص ۲۴۹، رقم الحدیث: ۱۸۸، ۱۸۹، ۷۳۳۳، صحیح ابن حبان: ۶۲۱۵، الحافظ ابن حجر نے تخریج الکشاف ج ۲ ص ۳۶۸ میں اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور زمخشری پر رد کیا ہے، تفسیر الطبری ج ۱۲ ص ۲۷۶-۲۷۷، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۳۳ھ، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۹۸۱، السنن الکبریٰ للنسائی: ۱۱۱۷۳، ۱۱۲۳۸، مسند احمد: ۲۱۴۴، ۳۱۵۴، شعب الایمان للبیہقی: ۹۳۹۳، مجمع الزوائد ج ۷ ص ۳۶، مسند البزار: ۵۰۱۸، موارد الظمآن: ۱۷۴۵، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشر، ج ۷ ص ۳۳۵)

حضرت جبریل علیہ السلام کے فرعون کے مونہہ میں مٹی بھرنے کی احادیث پر علامہ زمخشری کا تبصرہ

ابوالقاسم محمود بن عمر الزمخشری الخوارزمی المتوفی ۵۳۸ھ، ان روایات کے متعلق لکھتے ہیں:

ان روایات کے ساتھ حضرت جبریل کے قول کے ساتھ یہ ملایا جاتا ہے کہ انہوں نے اس خوف سے اس کے مونہہ میں مٹی ڈال دی کہ کہیں وہ اللہ کی رحمت کو نہ پالے، یہ اُن لوگوں کا اضافہ ہے جو اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے کلام میں اپنی طرف سے ملا دیتے ہیں اور اس اضافہ میں دو جہالتیں ہیں: ایک یہ کہ ایمان لا نادل کے ساتھ صحیح ہوتا ہے جیسے گونگے کا ایمان ہے اور دوسری یہ جہالت ہے کہ اس میں یہ مذکور ہے کہ جبریل علیہ السلام نے کافر کے ایمان لانے کو مکروہ جانا اور اس کے کفر پر باقی رہنے کو پسند کیا اور جو ایسا کرے وہ کافر ہوتا ہے کیونکہ کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے۔ (تفسیر الکشاف، ج ۲ ص ۳۴۹، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۷ھ)

حضرت جبریل علیہ السلام کے فرعون کے مونہہ میں مٹی بھرنے کی احادیث پر امام رازی کا تبصرہ

امام فخر الدین رازی نے بھی زمخشری کی تقلید میں ان احادیث پر رد کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

یہ روایت حسب ذیل وجوہ سے صحیح نہیں ہے:

(۱) حضرت جبریل علیہ السلام کے لیے یہ جائز نہیں تھا کہ وہ فرعون کو توبہ سے منع فرماتے بلکہ اُن پر واجب یہ تھا کہ اس کی توبہ پر معاونت کرتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدہ: ۲)" (اور تم نیکی اور خدا خوفی کے کاموں پر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے رہو اور گناہ اور ظلم میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون نہ کرو)۔

اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ نیکی اور تقویٰ پر تعاون کرنا اس شرط کے ساتھ مشروط ہے جب کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے موافق ہو۔ (سعیدی غفرلہ)

(۲) نیز فرعون کے مونہہ میں مٹی ڈالنا اس لیے عبث ہے کہ توبہ کے لیے زبان سے الفاظ کہنا ضروری نہیں ہیں، اگر آدمی اپنے گناہوں پر دل سے بھی نادم ہو جائے تو اس کی توبہ صحیح ہے جیسے کوئی شخص اپنے کیے ہوئے ناجائز کاموں پر دل سے نادم ہو تو اس کی یہ توبہ صحیح ہے۔

اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ فرشتوں کا کوئی کام عبث نہیں ہوتا، وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے خلاف کوئی کام نہیں کرتے۔ (سعیدی غفرلہ)

(۳) نیز یہ روایت اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اگر حضرت جبریل علیہ السلام اُس کو توبہ کرنے سے منع کرتے تو گویا وہ اس کے کفر پر باقی رہنے پر راضی ہوتے اور کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے۔

اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ مطلقاً کفر پر راضی ہونا کفر نہیں ہے، بلکہ کفر پر راضی ہونا اس وقت کفر ہوتا ہے جب کہ کوئی شخص کفر کو پسند کرتے ہوئے اس پر راضی ہو۔ (سعیدی غفرلہ)

(۴) اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام سے ارشاد فرمایا: "فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝ (طٰہٰ: ۴۴)" (پس تم دونوں اس امید پر اُس سے نرم گفتگو کرنا کہ وہ نصیحت حاصل کرے یا اللہ سے ڈرے ۝)۔ اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ عزوجل یہ چاہتے تھے کہ وہ ایمان لے آئے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام اُس کو ایمان لانے سے روکنے کے لیے اس کے مونہہ میں مٹی ڈال دیں۔

اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ۝ (المزمل: ۱۱)" (اور جھٹلانے والے مال داروں کو مجھ پر چھوڑ دیجیے اور انہیں تھوڑی سی مہلت دے دیجیے)۔ اللہ عزوجل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکذبین کو مہلت دینے کا حکم فرمایا ہے، اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ مکذبین کے ایمان لانے کو ناپسند فرماتے ہیں۔ (سعیدی غفرلہ)

بعض دیگر علماء کا علامہ زمخشری کی توجیہ کا رد کرنا

امام ناصر الدین احمد بن محمد بن المنیر الاسکندری المالکی المتوفی ۶۸۳ھ، زمخشری پر رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

زمخشری نے ان احادیث کو باطل کرنے میں جو دو دلیلیں ذکر کی ہیں اُن سے وہ لازم نہیں آتا جو زمخشری نے ذکر کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ فرعون کافر تھا اور اس کا کفر عناداً تھا تو حضرت جبریل علیہ السلام کو یہ خطرہ ہوا کہ وہ دوبارہ اپنی سرکشی کی طرف لوٹے گا اور اپنی

زبان سے اخلاص کو ظاہر کرے گا تا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو حاصل کرے، پھر دنیا میں اسی طرح اپنے کفر، گمراہی اور سرکشی پر برقرار رہے گا تو انہوں نے اس کے مونہہ میں مٹی ڈال دی تا کہ وہ زبان سے ایمان کا اظہار نہ کر سکے، یہ اُن لوگوں کا اضافہ ہے جو حدیث پر افتراء باندھتے ہیں۔ اور اس توجیہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت جبریل علیہ السلام اس کے کفر پر راضی تھے، بلکہ اس سے اُس شخص کی جہالت لازم آتی ہے جس نے احادیث سمجھ کر اپنی فاسد رائے سے اعتراض کیا۔ نیز اس حالت میں اس کا ایمان اس پر موقوف تھا کہ وہ صدقِ دل سے تائب ہوتا کیونکہ اُس کی توبہ ایسے حال میں ہوتی جو اضطرار کا وقت تھا، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ'' اور اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ جب لوگ ہمارے عذاب کو دیکھ لیں تو اس وقت اس کا ایمان مفید نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا۔ (المومن: ۸۵)'' (پس جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو اس وقت ان کا ایمان انہیں فائدہ نہیں دے سکتا تھا)''۔ یہ حافظ ابن حجر کا مکمل کلام ہے۔

علامہ شرف الدین الحسین بن عبد اللہ الطیبی المتوفی ۷۴۳ھ، کشاف کی اس عبارت پر لکھتے ہیں:

زمخشری نے جو کہا ہے کہ کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ امام ابو منصور الماتریدی نے ''التاویلات اہل السنۃ'' میں لکھا ہے کہ رضا بالکفر مطلقاً کفر نہیں ہے، یہ اس وقت کفر ہوتا ہے کہ جب انسان اپنے کفر پر راضی ہو نہ کہ غیر کے کفر پر۔ اس کی تائید درج ذیل حدیث سے ہوتی ہے:

امام عبد الرحمن احمد بن شعیب نسائی شافعی متوفی ۳۰۳ھ، روایت کرتے ہیں:

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار مردوں اور دو عورتوں کے سوا سب کو امان دے دی اور فرمایا: ان کو قتل کر دو خواہ تم انہیں کعبہ کے پردوں میں لپٹا ہوا پاؤ، (اُن چار مردوں کے نام یہ ہیں: (۱) عکرمہ بن ابی جہل (۲) عبد اللہ بن خطل (۳) مقیس بن صبابہ (۴) عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح)۔ رہا عبد اللہ بن خطل تو وہ کعبہ کے پردوں میں لپٹا ہوا پایا گیا، پس حضرت سعید بن حریث اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم دونوں اس کی طرف جھپٹے، پس حضرت سعید بن حریث رضی اللہ عنہ نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما پر سبقت کی اور وہ ان دونوں میں زیادہ قوی مرد تھے، اور رہا مقیس بن صبابہ تو اس کو لوگوں نے بازار میں پکڑ لیا اور اس کو قتل کر دیا، اور رہے عکرمہ تو وہ سمندر میں کسی کشتی پر سوار ہو گئے، پس کشتی والوں پر بہت زبردست آندھی آئی، پس کشتی والوں نے کہا: تم اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو، کیونکہ تمہارے خود ساختہ معبود یہاں تم سے کسی ضرر کو دور نہیں کر سکتے، پس عکرمہ نے کہا: اللہ کی قسم! اگر سمندر میں اللہ تعالیٰ سے اخلاص سے کی ہوئی دعا ہمیں نجات دے سکتی ہے تو خشکی میں بھی اُن کے سوا کوئی نجات نہیں دے سکتا، اے اللہ! میں آپ سے یہ عہد کرتا ہوں کہ اگر آج آپ نے ہمیں اس طوفان سے نجات عطا فرما دی تو میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوں گا حتیٰ کہ اُن کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دوں گا، پس میں ضرور بہ ضرور اُن کو معاف کرنے والا اور کریم پاؤں گا، سو وہ آئے اور اسلام لے آئے، اور رہا عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح تو وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر چھپ گیا، پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بیعت کے لیے بلایا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کو لا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑا کر دیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! عبد اللہ کو بیعت کر لیجئے، پس آپ نے تین مرتبہ سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور ہر مرتبہ اس کو بیعت کرنے سے انکار فرما دیا، پھر تین مرتبہ کے بعد آپ نے اس کو بیعت فرما لیا، پھر آپ

اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: کیا تم میں کوئی سمجھ دار آدمی نہیں تھا جو اس مرد کی طرف کھڑا ہوتا جب اس نے مجھے دیکھا کہ میں اسے بیعت نہیں کر رہا تو وہ اس کو قتل کر دیتا، صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم نہیں جانتے تھے کہ آپ کے دل میں کیا ہے، آپ نے کیوں نہ اپنی دونوں آنکھوں سے ہماری طرف اشارہ کیا، آپ نے فرمایا: نبی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اس کی خیانت کرنے والی آنکھ ہو۔

(السنن الکبریٰ: ۵۱۶ ۳، موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۴۲۱ھ، شرح مشکل الآثار للطحاوی: ۱۵۰۶، ۳۵۲۱، المستدرک ج ۲ ص ۱۳۲، رقم الحدیث: ۲۵۱۶، شرح السنۃ للبغوی: ۲۶۹۲، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشرۃ، ج ۲۰ ص ۱۷۸)

علامہ ابو سلیمان حمد بن محمد الخطابی متوفی ۳۸۸ھ، لکھتے ہیں:

''خائنۃ الاعین'' کا معنی یہ ہے کہ انسان لوگوں کے سامنے جس بات کو ظاہر کر رہا ہے، دل میں اس کے خلاف ہو۔ جب وہ اپنی زبان سے بیان نہ کرے اور آنکھ سے اس کے خلاف اشارہ کرے تو اس نے خیانت کی ہے، لہٰذا اس کو خائنۃ الاعین کہا جاتا ہے۔ (معالم السنن ج ۲ ص ۲۸۷، حاشیۃ السنن الکبریٰ، ج ۳ ص ۳۳۳، موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۴۲۱ھ)

امام سلیمان بن داؤد شافعی متوفی ۲۰۴ھ، روایت کرتے ہیں:

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار مردوں اور دو عورتوں کے سوا سب کو امان دے دی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اُن کے نام ذکر کیے اور کہا: رہے ابن ابی سرح تو وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر چھپ گئے، پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بیعت کرنے کے لیے بلایا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ عبداللہ بن ابی سرح کو لے کر آئے حتیٰ اس کو لا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑا کر دیا، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی! عبداللہ بن ابی سرح کو بیعت کر لیجیے، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا اور ہر مرتبہ اس کو بیعت کرنے سے انکار کیا، پھر تین مرتبہ کے بعد اس کو بیعت کر لیا، پھر آپ اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: کیا تم میں کوئی سمجھ دار آدمی نہیں تھا جو اس مرد کی طرف کھڑا ہوتا، جب اس نے مجھے دیکھا کہ میں اس کو بیعت کرنے سے رک رہا ہوں تو وہ اٹھ کر اس کو قتل کر دیتا، آپ کے اصحاب نے کہا: یا رسول اللہ! ہم نہیں جانتے تھے کہ آپ کے دل میں کیا ہے، آپ نے کیوں نہ اپنی آنکھوں سے ہماری طرف اشارہ کر دیا، آپ نے فرمایا: نبی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اس کی خیانت کرنے والی آنکھ ہو۔ امام ابوداؤد نے کہا: عبداللہ بن ابی سرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا رضاعی بھائی تھا، اور ولید بن عقبہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ماں شریک بھائی تھا جس کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے شراب پینے کی حد میں کوڑے مارے تھے۔ (سنن ابوداؤد: ۲۶۸۰، المکتبۃ التوفیقیہ، القاہرہ، مصر، ۲۰۱۰ء)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن سعد بن سرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کاتب تھا، پس اس کو شیطان نے گمراہ کر دیا اور وہ کفار کے ساتھ جا ملا، فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قتل کرنے کا حکم فرمایا تو وہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی پناہ میں چلا گیا، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پناہ عطا فرما دی۔ (سنن ابوداؤد: ۴۳۵۸، المکتبۃ التوفیقیہ، القاہرہ، مصر، ۲۰۱۰ء)

علامہ شرف الدین الحسین بن عبداللہ الطیبی المتوفی ۷۴۳ھ، لکھتے ہیں:

ان احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہیں چاہتے تھے کہ عبداللہ بن ابی سرح ایمان لے آئے اور آپ اس

کے کفر پر راضی تھے، اس لیے مطلقاً یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ کفر پر رضا بھی کفر ہے۔

(فتوح الغیب فی الکشف عن قناع الریب، ج ۷ ص ۵۵۹، جائزۃ دبی الدولیۃ، دبی ۱۴۳۴ھ)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ، یونس: ۸۸ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

بعض علماء نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ کسی شخص کے خلاف کفر کی دعا کرنا کفر نہیں ہے جب تک کہ وہ کفر کو مستحسن سمجھتے ہوئے اس کفر کی دعا نہ کرے۔ اور شیخ الاسلام خواہرزادہ نے کہا ہے کہ دوسرے کے کفر پر راضی ہونا مطلقاً کفر نہیں ہے بلکہ ہمارے نزدیک اس میں یہ قید ہے کہ جب وہ کسی کے کفر کو اچھا سمجھتے ہوئے اس کے کفر پر راضی ہو تو پھر یہ کفر ہوگا۔ اور امام ماتریدی نے کہا ہے کہ بندہ کا اپنے کفر پر راضی ہونا بلاشبہ کفر ہے اور اگر وہ دوسرے کے کفر پر راضی ہو تو اس میں یہ قید ہے کہ وہ دوسرے کے کفر کو مستحسن سمجھتا ہو اور مطلقاً دوسرے کے کفر پر راضی ہونا کفر نہیں ہے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ عبداللہ بن ابی سرح کے کفر اور اس کو قتل کرنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راضی تھے، اگر دوسرے کے کفر پر راضی ہونا مطلقاً کفر ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ بن ابی سرح کے کفر اور اس کو قتل کرنے پر راضی نہ ہوتے۔ (روح المعانی، جز ۱۱، ص ۲۵۳، ملخصاً، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۷ھ)

میں کہتا ہوں: چونکہ متعدد احادیث میں یہ تصریح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی سرح کے کفر کی وجہ سے اس کو قتل کرنے کا تین بار حکم دیا اور بعد میں اس کی توبہ قبول فرمائی، اس سے معلوم ہوا کہ آپ عبداللہ بن ابی سرح کے کفر اور اس کو قتل کرنے پر راضی تھے لیکن آپ کا یہ فعل اس لیے جائز قرار پایا کہ آپ نے اس کے کفر کو مستحسن نہیں سمجھا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ دوسرے کے کفر پر راضی ہونا اسی وقت کفر ہوتا ہے جب اس کے کفر پر مطلع ہو کر اس کو مستحسن سمجھا جائے۔ لہٰذا علامہ زمخشری متوفی ۵۳۸ھ اور امام فخر الدین رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ کا مطلقاً یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے۔ (سعیدی غفرلہ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''پس آج ہم تجھے تیرے بدن سمیت نجات دیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لیے عبرت کا نشان بن جائے، اور بے شک بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے ضرور غافل ہیں O'' (یونس: ۹۲)

فرعون کو اس کے بدن کے ساتھ نجات دینے کے محامل

''فالیوم ننجیک ببدنک'':

(۱) یعنی ہم تجھے سمندر سے اس حال میں نکالیں گے کہ تو بدن محض ہوگا اور تجھ میں روح اور جان نہیں ہوگی۔

(۲) یعنی ہم تجھ کو تیرے مکمل بدن کے ساتھ نجات دیں گے اور تیرے بدن میں کوئی تغیر نہیں ہوگا۔

(۳) ہم تجھے تیرے بدن سے نجات دیں گے بایں طور کہ تو سمندر سے برہنہ بغیر لباس کے نکلے گا۔

''لتکون لمن خلفک اٰیۃ'': اس آیت کے بھی چند محمل ہیں:

(۱) بعض لوگوں کا فرعون کے متعلق الوہیت کا اعتقاد تھا جب کہ انہوں نے اس کے غرق ہونے کا مشاہدہ نہیں کیا تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ فرعون ایسا شخص مرنے والا نہیں ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اُس کو اس کی مردہ صورت کے ساتھ نکالا تاکہ ان کے دلوں سے یہ شبہ زائل ہو جائے۔

(۲) اور چونکہ فرعون اپنے آپ کو سب سے بڑا خدا کہتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ فرعون کی ذلت اور اہانت تمام مخلوق کے سامنے ظاہر فرمائیں۔

(۳) چونکہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کو اُس کی تمام قوم کے سامنے غرق فرمایا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے سمندر کی تہہ اور اس کی گہرائی سے فرعون کے سوا اور کسی کو نہیں نکالا تو فرعون کی یہ تخصیص اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کمال پر دلالت کرتی ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دعویٰ نبوت کے صدق پر دلالت کرتی ہے۔

''وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ'': اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا یہ قصہ فرعون کے انجام پر ختم فرمایا اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ قصہ بیان فرمایا تاکہ آپ اپنی امت کو اللہ تعالیٰ کی قدرت پر دلائل سے اعراض کرنے سے روکیں اور اپنی امت کو اللہ تعالیٰ کی آیات میں غور و فکر کرنے کی ترغیب دیں اور اس قصہ سے مقصود اللہ تعالیٰ کی آیات میں غور و فکر کرنا ہے۔

(تفسیر کبیر ج ۶ ص ۲۸۸۔ ۲۹۸، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

قرآن مجید کی صداقت پر مستحکم دلیل

میں کہتا ہوں: اس آیت میں قرآن مجید کی صداقت پر قوی دلیل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً'' (یونس: ۹۲) ''(پس آج ہم تجھے تیرے بدن سمیت نجات دیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لیے عبرت کا نشان بن جائے)۔ فرعون کے غرقاب ہونے اور اس کے بدن کے سلامت رہنے پر تقریباً تین ہزار سال گزر چکے ہیں۔ اس عرصہ میں مصر پر کئی غیر مسلم حکمرانوں کی حکومت رہی، اگر وہ چاہتے تو فرعون کے بدن کو مٹا دیتے اور قرآن کریم کو جھوٹا کر دیتے، کیونکہ قرآن مجید نے پیش گوئی فرمائی ہے کہ ہم اس کے بدن کو سلامت رکھیں گے، سو اس عرصہ میں قرآن کریم کے مکذبین کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ فرعون کے بدن کو تباہ کر کے ریزہ ریزہ کر دیتے لیکن اللہ عزوجل کی پیش گوئی برحق رہی ہے اور ان گنت منکرین کے ہاتھوں سے اللہ تعالیٰ نے فرعون کے بدن کو صحیح و سالم رکھوایا اور قرآن مجید کی یہ آیت آج تک آنکھوں والوں اور بصیرت سے کام لینے والوں کو یہ دعوت دے رہی ہے کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ دشمنوں کے ہاتھوں سے بھی قرآن مجید کی تصدیق کراتے ہیں۔ (سعیدی غفرلہ)

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۳﴾

اور بے شک ہم نے بنی اسرائیل کی رہائش کے لیے عمدہ جگہ مہیا فرمائی اور ہم نے اُن کے کھانے کے لیے پاکیزہ چیزیں عطا فرمائیں، پس وہ ایک دوسرے سے اختلاف کرتے رہے حتیٰ کہ اُن کے پاس برحق علم آ گیا، (اے رسول اکرم!) بے شک آپ کے رب قیامت کے دن اُن باتوں میں فیصلہ فرما دیں گے جن میں وہ باہم اختلاف کرتے رہے تھے O

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْئَلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ

جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۹۴﴾

پس (اے رسولِ اکرم!) اگر (بالفرض) آپ کو اس قرآن میں شک ہو جو ہم نے آپ کی طرف نازل فرمایا ہے تو آپ ان لوگوں سے پوچھ لیجئے جو آپ سے پہلے آسمانی کتابیں پڑھتے رہے ہیں، بے شک آپ کے پاس آپ کے رب کی طرف سے برحق کلام آگیا ہے، پس آپ ہرگز ہرگز قرآن میں شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جائیں ○

وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۹۵﴾

اور آپ ہرگز ہرگز اُن لوگوں میں سے نہ ہو جائیں جنھوں نے اللہ کی آیتوں کی تکذیب کی ورنہ (بالفرض) آپ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے ○

اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۹۶﴾

بے شک جن لوگوں کے متعلق آپ کے رب نے یہ مقدر فرما دیا ہے کہ اگر اُن کے پاس تمام دلائل آجائیں وہ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے ○

وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۹۷﴾

خواہ اُن کے پاس ہر قسم کی تمام نشانیاں کیوں نہ آجائیں (وہ ایمان نہیں لائیں گے) حتیٰ کہ (قیامت کے دن) وہ دردناک عذاب کو دیکھ لیں ○

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ؕ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۹۸﴾

پس قومِ یونس کے سوا تباہ ہونے والی کوئی بستی کیوں نہ ایمان لائی تو اس کا ایمان لانا اسے فائدہ پہنچاتا، یونس کی قوم کے لوگ جب ایمان لے آئے تو ہم نے اُن سے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب اٹھا لیا اور اُن کو ایک معین مدت تک اپنی نعمتوں سے نوازا ○

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾

اور اگر آپ کے رب چاہتے تو زمین میں بسنے والے تمام کے تمام لوگ ایمان لے آتے، کیا پس آپ لوگوں پر جبر کر سکتے ہیں حتیٰ کہ تمام لوگ ایمان لے آئیں ○!

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ

عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

اور اللہ کے حکم کے بغیر کسی شخص کے لیے ایمان لانا ممکن نہیں ہے، اور (اللہ) کفر کی نجاست اُن لوگوں کے دلوں پر ڈال دیتے ہیں جو غور و فکر سے کام نہیں لیتے O

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

آپ کفار سے کہیے: ''ذرا غور سے دیکھو کہ آسمانوں میں اور زمینوں میں اللہ کی توحید کے کیسے کیسے دلائل ہیں'' اور جو لوگ اللہ کی تقدیر میں ایمان لانے والے نہیں ہیں ان کو توحید کے یہ دلائل اور ایمان نہ لانے پر عذاب کی وعیدیں کچھ فائدہ نہیں دیں گی O

فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

پس یہ کفار صرف اُس عذاب کا انتظار کر رہے ہیں جو عذاب ان کی طرح گزشتہ امتوں کے کافروں پر آ چکا ہے، (اے رسول اکرم!) آپ کہیے: ''تم بھی اس عذاب کا انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں'' O

ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ ع

پھر ہم اپنے رسولوں کو اور ایمان والوں کو اسی طرح عذاب سے نجات عطا فرماتے رہے ہیں، اسی طرح ہم آئندہ بھی یقیناً ایمان لانے والوں کو عذاب سے نجات عطا فرماتے رہیں گے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور بے شک ہم نے بنی اسرائیل کی رہائش کے لیے عمدہ جگہ مہیا فرمائی اور ہم نے اُن کے کھانے کے لیے پاکیزہ چیزیں عطا فرمائیں، پس وہ ایک دوسرے سے اختلاف کرتے رہے حتیٰ کہ اُن کے پاس برحق علم آ گیا، (اے رسول اکرم!) بے شک آپ کے رب قیامت کے دن اُن باتوں میں فیصلہ فرما دیں گے جن میں وہ باہم اختلاف کرتے رہے تھے O'' (یونس: ۹۳)

امام محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ، یونس: ۹۳ تا ۹۴ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ'': یعنی فرعون کے ہلاک ہونے کے بعد ہم نے بنی اسرائیل کو عمدہ جگہ پر ٹھہرایا، ایک تفسیر یہ ہے کہ اُن کو مصر میں ٹھہرایا اور دوسری تفسیر یہ ہے کہ اُن کو اُردن اور فلسطین میں ٹھہرایا جو کہ ارضِ مقدسہ ہے۔ اور الضحاک نے کہا کہ مصر اور شام میں ٹھہرایا۔ ''وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ'': یعنی ہم نے اُن کو حلال کھانے عطا فرمائے۔

''فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ'': یعنی جو یہود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تھے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی

تصدیق میں اس وقت تک اختلاف کیا حتیٰ کہ ان کے پاس یقینی علم آ گیا، کیونکہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے وہ سب سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر متفق تھے اور آپ کی بعثت کا اقرار کرتے تھے، کیونکہ جو تورات اور انجیل اُن کے پاس تھی اس میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی علامات مذکور تھیں، پس جب اُن کے پاس وہ نشانیاں آ گئیں جن کو وہ پہلے سے جانتے تھے تو اُن میں سے بعض نے آپ کی نبوت کا انکار کیا اور اُن میں سے بعض آپ کی نبوت پر ایمان لے آئے اور وہ بہت کم تھے۔ اور اس آیت میں علم بہ معنی معلوم ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ حتیٰ کہ اُن کے پاس وہ معلوم آ گیا جس کی وجہ سے وہ جانتے تھے کہ آپ اللہ عزوجل کے برحق نبی ہیں۔ اور بعض مفسرین نے یہ تاویل کی ہے کہ علم سے مراد اس آیت میں اللہ کی کتاب اور اس کی وحی ہے۔

"اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ": یعنی اللہ جل شانہٗ نے فرمایا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) اِن اختلاف کرنے والے بنی اسرائیل کے درمیان قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فیصلہ فرما دیں گے بایں طور کہ آپ کے مکذبین کو دوزخ میں داخل فرما دیں گے اور آپ پر ایمان لانے والوں کو جنت میں داخل فرما دیں گے۔ یہ ان لوگوں کے متعلق اللہ عزوجل کی تقدیر میں مقرر ہو چکا ہے۔

(تفسیر الطبری ج ۱۲ ص ۲۸۳ دار عالم الکتب ریاض، ۱۳۳۳ھ تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۹۸۵، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ ۱۴۱۷ھ تاریخ دمشق ج ۱ ص ۱۵۱ تفسیر عبد الرزاق ج ۱ ص ۲۹۷)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پس (اے رسولِ اکرم!) اگر (بالفرض) آپ کو اس قرآن میں شک ہو جو ہم نے آپ کی طرف نازل فرمایا ہے تو آپ اُن لوگوں سے پوچھ لیجئے جو آپ سے پہلے آسمانی کتابیں پڑھتے رہے ہیں، بے شک آپ کے پاس آپ کے رب کی طرف سے برحق کلام آ گیا ہے، پس آپ ہرگز ہرگز قرآن میں شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جائیں O" (یونس: ۹۴)

"فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: آپ اُن لوگوں سے سوال کیجئے جو تورات اور انجیل کی تلاوت کرتے ہیں، جن لوگوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پایا اور آپ پر ایمان لے آئے، آپ ان سے سوال کیجئے کہ آپ کی رسالت کے متعلق ان کتابوں میں لکھا ہوا ہے یا نہیں؟

اور حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اُن اہلِ کتاب میں سے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے۔

اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی خبر میں شک تھا حتیٰ کہ آپ سے یہ کہا گیا: "فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ"؟ تو اہلِ علم کی ایک جماعت نے کہا: نہ آپ کو شک تھا اور نہ آپ نے سوال کیا۔ قتادہ نے بیان کیا ہے کہ ہمیں یہ حدیث پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہ مجھے اپنی نبوت کے متعلق کوئی شک ہے اور نہ میں ان اہلِ کتاب سے سوال کروں گا۔ پھر اس کلام کی کیا توجیہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اہلِ عرب کے طریقہ پر ہے، کوئی شخص اپنے غلام سے کہتا ہے: اگر تم میرے غلام ہو تو میری بات مانو، حالانکہ اس غلام کو اپنے آقا کے متعلق کوئی شک نہیں ہوتا، اسی طرح کوئی شخص اپنے بیٹے سے کہتا ہے: اگر تو میرا بیٹا ہے تو میرے

ساتھ نیک سلوک کر، حالانکہ اس کو اپنے بیٹے کے متعلق کوئی شک نہیں ہوتا کہ وہ اس کا بیٹا ہے۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے، اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا: "وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَ اُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ـــ (المائدہ: ۱۱۶)" حالانکہ اللہ جل شانہٗ کو علم تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایسا نہیں کہا اور اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی خبر کے صدق اور اس کی صحت میں شک کرنے والے نہیں تھے۔ اور اللہ تعالیٰ اس بات کے عالم تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے عرب کے محاورہ کے مطابق فرمایا، کیونکہ قرآن مجید اُن کی زبان کے موافق نازل ہوا ہے۔

"لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ": یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ خبر عطا فرمائی ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور یہ یہود و نصاریٰ آپ کے رسول ہونے کی صحت کو جانتے ہیں اور آپ کی بہ کثرت صفات اُن کی کتاب میں مذکور ہیں، پس آپ ہرگز ہرگز اپنی نبوت کی صحت کے متعلق شک نہ کریں۔

(تفسیر الطبری ج ۱۲ ص ۲۸۷، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۹۸۶، سنن سعید بن منصور: ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، تفسیر عبدالرزاق ج ۱ ص ۲۹۸)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور آپ ہرگز ہرگز اُن لوگوں میں سے نہ ہو جائیں جنہوں نے اللہ کی آیتوں کی تکذیب کی ورنہ (بالفرض) آپ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے O" (یونس: ۹۵)

شیخ محمد علی صابونی، الاستاذ بکلیۃ الشریعۃ والدراسات الاسلامیۃ بمکۃ المکرمۃ، یونس: ۹۵ تا ۹۸ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ": یعنی آپ اللہ عزوجل کی آیات میں سے کسی آیت کی ہرگز ہرگز تکذیب نہ کریں ورنہ آپ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے، یعنی آپ اُن لوگوں میں سے ہو جائیں گے جنہوں نے دنیا اور آخرت میں نقصان اٹھایا۔ قاضی بیضاوی نے کہا ہے: اس آیت میں مشرکین کی طمع کو منقطع فرما دیا ہے اور علامہ قرطبی نے کہا ہے: اس آیت میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور اس سے مراد آپ کے غیر ہیں۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۸، ص ۳۸۳)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "بے شک جن لوگوں کے متعلق آپ کے رب نے یہ مقدر فرما دیا ہے کہ اگر اُن کے پاس تمام دلائل آ جائیں وہ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے O" (یونس: ۹۶)

"اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ": یعنی جن لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں عذاب مقدر ہو چکا ہے وہ آپ کی ہرگز تصدیق نہیں کریں گے اور آپ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے خواہ آپ اُن کے پاس کتنے ہی دلائل اور معجزات کیوں نہ لے آئیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "خواہ اُن کے پاس ہر قسم کی تمام نشانیاں کیوں نہ آ جائیں (وہ ایمان نہیں لائیں گے) حتیٰ کہ (قیامت کے دن) وہ دردناک عذاب کو دیکھ لیں O" (یونس: ۹۷)

"وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ": خواہ اُن کے پاس ہر قسم کی تمام نشانیاں کیوں نہ آ جائیں (وہ ایمان نہیں لائیں گے) حتیٰ کہ (قیامت کے دن) وہ دردناک عذاب کو دیکھ لیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پس قوم یونس کے سوا تباہ ہونے والی کوئی بستی کیوں نہ ایمان لائی تو اس کا ایمان لاتا

تصدیق میں اس وقت تک اختلاف کیا حتیٰ کہ ان کے پاس یقینی علم آ گیا، کیونکہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے وہ سب سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر متفق تھے اور آپ کی بعثت کا اقرار کرتے تھے، کیونکہ جو تورات اور انجیل اُن کے پاس تھی اس میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی علامات مذکور تھیں، پس جب اُن کے پاس وہ نشانیاں آ گئیں جن کو وہ پہلے سے جانتے تھے تو اُن میں سے بعض نے آپ کی نبوت کا انکار کیا اور اُن میں سے بعض آپ کی نبوت پر ایمان لے آئے اور وہ بہت کم تھے۔ اور اس آیت میں علم بہ معنی معلوم ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ حتیٰ کہ اُن کے پاس وہ معلوم آ گیا جس کی وجہ سے وہ جانتے تھے کہ آپ اللہ عزوجل کے برحق نبی ہیں۔ اور بعض مفسرین نے یہ تاویل کی ہے کہ علم سے مراد اس آیت میں اللہ کی کتاب اور اس کی وحی ہے۔

”اِنَّ رَبَّكَ یَقْضِیْ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ“: یعنی اللہ جل ثناؤہ نے فرمایا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) ان اختلاف کرنے والے بنی اسرائیل کے درمیان قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فیصلہ فرما دیں گے بایں طور کہ آپ کے مکذبین کو دوزخ میں داخل فرما دیں گے اور آپ پر ایمان لانے والوں کو جنت میں داخل فرما دیں گے۔ یہ ان لوگوں کے متعلق اللہ عزوجل کی تقدیر میں مقرر ہو چکا ہے۔

(تفسیر الطبری ج ۱۲ ص ۲۸۳، دار عالم الکتب ریاض، ۱۴۳۳ھ، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۹۸۵، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ، تاریخ دمشق ج ۱ ص ۱۵۱، تفسیر عبد الرزاق ج ۱ ص ۲۹۷)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”پس (اے رسولِ اکرم!) اگر (بالفرض) آپ کو اس قرآن میں شک ہو جو ہم نے آپ کی طرف نازل فرمایا ہے تو آپ اُن لوگوں سے پوچھ لیجئے جو آپ سے پہلے آسمانی کتابیں پڑھتے رہے ہیں، بے شک آپ کے پاس آپ کے رب کی طرف سے برحق کلام آ گیا ہے، پس آپ ہرگز قرآن میں شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جائیں O“ (یونس: ۹۴)

”فَاِنْ كُنْتَ فِیْ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ فَسْــٴَـلِ الَّذِیْنَ یَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ“: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: آپ اُن لوگوں سے سوال کیجئے جو تورات اور انجیل کی تلاوت کرتے ہیں، جن لوگوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پایا اور آپ پر ایمان لے آئے، آپ ان سے سوال کیجئے کہ آپ کی رسالت کے متعلق ان کتابوں میں لکھا ہوا ہے یا نہیں؟

اور حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اُن اہلِ کتاب میں سے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے۔

اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی خبر میں شک تھا حتیٰ کہ آپ سے یہ کہا گیا: ”فَاِنْ كُنْتَ فِیْ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ فَسْــٴَـلِ الَّذِیْنَ یَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ“؟ تو اہلِ علم کی ایک جماعت نے کہا: نہ آپ کو شک تھا اور نہ آپ نے سوال کیا۔ قتادہ نے بیان کیا ہے کہ ہمیں یہ حدیث پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہ مجھے اپنی نبوت کے متعلق کوئی شک ہے اور نہ میں ان اہلِ کتاب سے سوال کروں گا۔ پھر اس کلام کی کیا توجیہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اہلِ عرب کے طریقہ پر ہے، کوئی شخص اپنے غلام سے کہتا ہے: اگر تم میرے غلام ہو تو میری بات مانو، حالانکہ اس غلام کو اپنے آقا کے متعلق کوئی شک نہیں ہوتا، اسی طرح کوئی شخص اپنے بیٹے سے کہتا ہے: اگر تو میرا بیٹا ہے تو میرے

ساتھ نیک سلوک کر، حالانکہ اس کو اپنے بیٹے کے متعلق کوئی شک نہیں ہوتا کہ وہ اس کا بیٹا ہے۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے، اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا: "وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" (المائدہ: ۱۱۶) حالانکہ اللہ جل ثناؤہ کو علم تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایسا نہیں کہا اور اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی خبر کے صدق اور اس کی صحت میں شک کرنے والے نہیں تھے۔ اور اللہ تعالیٰ اس بات کے عالم تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے عرب کے محاورہ کے مطابق فرمایا، کیونکہ قرآن مجید اُن کی زبان کے موافق نازل ہوا ہے۔

"لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ": یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ خبر عطا فرمائی ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور یہ یہود و نصاریٰ آپ کے رسول ہونے کی صحت کو جانتے ہیں اور آپ کی بہ کثرت صفات اُن کی کتاب میں مذکور ہیں، پس آپ ہرگز ہرگز اپنی نبوت کی صحت کے متعلق شک نہ کریں۔

(تفسیر الطبری ج ۱۲ ص ۲۸۷، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۹۸۶، سنن سعید بن منصور: ۱۰۷۷-۱۰۷۶، تفسیر عبدالرزاق ج ۱ ص ۲۹۸)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور آپ ہرگز ہرگز اُن لوگوں میں سے نہ ہو جائیں جنہوں نے اللہ کی آیتوں کی تکذیب کی ورنہ (بالفرض) آپ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے O" (یونس: ۹۵)

شیخ محمد علی صابونی، الاستاذ بکلیۃ الشریعۃ والدراسات الاسلامیہ بمکۃ المکرمۃ، یونس: ۹۵ تا ۹۸ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ": یعنی آپ اللہ عزوجل کی آیات میں سے کسی آیت کی ہرگز ہرگز تکذیب نہ کریں ورنہ آپ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے، یعنی آپ اُن لوگوں میں سے ہو جائیں گے جنہوں نے دنیا اور آخرت میں نقصان اٹھایا۔ قاضی بیضاوی نے کہا ہے: اس آیت میں مشرکین کی طمع کو منقطع فرما دیا ہے اور علامہ قرطبی نے کہا ہے: اس آیت میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور اس سے مراد آپ کے غیر ہیں۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۸ ص ۳۸۳)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "بے شک جن لوگوں کے متعلق آپ کے رب نے یہ مقدر فرما دیا ہے کہ اگر اُن کے پاس تمام دلائل آ جائیں وہ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے O" (یونس: ۹۶)

"اِنَّ الَّذِیْنَ حَقَّتْ عَلَیْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ": یعنی جن لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں عذاب مقدر ہو چکا ہے وہ آپ کی ہرگز تصدیق نہیں کریں گے اور آپ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے خواہ آپ اُن کے پاس کتنے ہی دلائل اور معجزات کیوں نہ لے آئیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "خواہ اُن کے پاس ہر قسم کی تمام نشانیاں کیوں نہ آ جائیں (وہ ایمان نہیں لائیں گے) حتیٰ کہ (قیامت کے دن) وہ دردناک عذاب کو دیکھ لیں O" (یونس: ۹۷)

"وَ لَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰیَةٍ حَتّٰى یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ": خواہ اُن کے پاس ہر قسم کی تمام نشانیاں کیوں نہ آ جائیں (وہ ایمان نہیں لائیں گے) حتیٰ کہ (قیامت کے دن) وہ دردناک عذاب کو دیکھ لیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پس قومِ یونس کے سوا تباہ ہونے والی کوئی بستی کیوں نہ ایمان لائی تو اس کا ایمان لانا

اسے فائدہ پہنچاتا، یونس کی قوم کے لوگ جب ایمان لے آئے تو ہم نے اُن سے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب اٹھالیا اور اُن کو ایک معین مدت تک اپنی نعمتوں سے نوازا O" (یونس:۹۸)

"فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَاۤ اِيْمَانُهَاۤ": پس اللہ کی بستیوں میں سے کوئی ایک بستی بھی کیوں نہ ایمان لائی جن کو ہم نے ہلاک فرمادیا تھا (سوائے قوم یونس کے) انہوں نے کفر سے توبہ کرلی اور عذاب کو دیکھ کر اخلاص کے ساتھ ایمان لے آئے تو ان کے ایمان نے اُن کو نفع پہنچایا۔ "اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ؕ لَمَّاۤ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا": سوا یونس کی قوم کے، جب کہ اُن کی قوم کفر سے تائب ہوگئی اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئی تو ہم نے اُن سے رسوائی والا عذاب دنیا کی زندگی میں اٹھالیا۔ "وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ": اور اُن کو اُن کی زندگی پوری ہونے تک عذاب سے محفوظ فرمایا۔

قتادہ نے کہا: روایت ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے اُن کو اللہ کے عذاب سے ڈرایا، پھر اُن کے درمیان سے نکل گئے، پس جب ان کی قوم نے اپنے نبی کو گم پایا اور یہ یقین کرلیا کہ عذاب اُن کے قریب آپہنچا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں میں توبہ نازل فرمادی۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں میں ایمان کے صدق کو پایا اور اُن کے گزشتہ کاموں پر ندامت کو پایا تو اللہ تعالیٰ نے اُن سے عذاب کو اٹھالیا۔ (صفوۃ التفاسیر ص ۴۰۷-۴۰۸، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

حضرت یونس علیہ السلام اور اُن کی قوم کا قصہ

علامہ ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ، یونس:۹۸ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ": حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور سعید بن جبیر نے یہ قصہ اس طرح بیان کیا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم نینویٰ میں رہتی تھی جو سرزمین الموصل میں ہے، اللہ تعالیٰ نے اُن کی طرف حضرت یونس علیہ السلام کو مبعوث فرمایا جو انہیں ایمان کی دعوت دیتے تھے، اُن کی قوم نے ایمان لانے سے انکار کیا تو حضرت یونس علیہ السلام نے اپنی قوم کو خبردار کیا کہ اگر تم ایمان نہیں لائے تو تین دن تک تم پر عذاب نازل ہوتا رہے گا، حضرت یونس علیہ السلام نے اپنی قوم کو اس کی خبر دے دی، تو انہوں نے کہا: ہم نے حضرت یونس علیہ السلام کو کبھی جھوٹا نہیں پایا، پس تم دیکھو اگر وہ تم میں اس رات رہتے ہیں تو کچھ نہیں ہوگا اور اگر وہ تم میں اس رات کو نہیں رہے تو یقین رکھو کہ تم پر عذاب لامحالہ آنے والا ہے۔ پھر جب آدھی رات گزر گئی تو حضرت یونس علیہ السلام اپنی قوم کے درمیان سے نکل گئے، پھر جب صبح ہوئی تو عذاب نے اُن کو ڈھانپ لیا اور اُن کے سروں پر ایک میل کے اندازہ تک وہ عذاب پہنچ چکا تھا۔

وہب بن منبہ نے کہا: آسمان اُن پر سیاہ رنگ کا ہوگیا اور زبردست دھوئیں نے اُن کو ڈھانپ لیا حتیٰ کہ اُن کے پورے شہر پر وہ دھواں پھیل گیا۔ پھر جب اُن لوگوں کو اپنی ہلاکت کا یقین ہوگیا تو انہوں نے حضرت یونس علیہ السلام کو ڈھونڈا، پس اُن کو نہ پایا اور اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں میں توبہ ڈال دی، پھر وہ سب ایک کھلے میدان میں گئے، وہ بھی اور اُن کی عورتیں بھی اور اُن کے بچے بھی اور اُن کی سواریاں بھی، اور انہوں نے ٹاٹ کا لباس پہن لیا اور اپنی پچھلی کارروائی پر توبہ کی اور ایمان کا اظہار کیا، اور اللہ عزوجل کے سامنے گڑگڑائے۔ پس اُن کے رب نے اُن پر رحم فرمایا اور اُن کی فریاد کو قبول فرمالیا اور اُن سے عذاب کو دور فرمالیا۔ اور یہ عاشوراء (دس محرم) کا دن تھا۔ اور حضرت یونس علیہ السلام اُن کے پاس سے نکل چکے تھے اور اپنی قوم پر عذاب اور اس کی ہلاکت کا انتظار کر رہے

تھے، انہیں عذاب کے آثار نظر نہیں آئے۔ حضرت یونس علیہ السلام نے دل میں کہا: میں اپنی قوم کی طرف کیسے واپس جاؤں حالانکہ میں اُن کو عذاب کی وعید سنا چکا ہوں۔ پس وہ اپنی قوم پر غضب ناک ہوتے ہوئے وہاں سے نکلے، پس سمندر پر آئے، وہاں کچھ لوگ ایک بڑی کشتی میں سفر کر رہے تھے، انہوں نے حضرت یونس علیہ السلام کو پہچان لیا اور بغیر اجرت کے انہیں سوار کر لیا۔ پھر جب وہ کشتی سمندر کے درمیان پہنچی تو ٹھہر گئی نہ آگے جاتی تھی نہ پیچھے جاتی تھی، تب اس بڑی کشتی والوں نے کہا: ہماری اس کشتی میں کوئی نہ کوئی بات ہوئی ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام نے کہا: میں نے اس کے سبب کو جان لیا، اس کشتی میں کوئی بڑی خطا کا مرتکب سوار ہوا ہے، لوگوں نے پوچھا: وہ کون ہے؟ حضرت یونس علیہ السلام نے کہا: میں ہوں، تم مجھے سمندر میں پھینک دو۔ انہوں نے کہا: ہم آپ کو سمندر میں نہیں پھینکیں گے حتیٰ کہ ہم قرعہ اندازی کر کے معلوم کر لیں، انہوں نے تین دفعہ قرعہ اندازی کی تو حضرت یونس علیہ السلام کے نام کا قرعہ نکلا اور ایک بڑی مچھلی (یعنی وہیل) کشتی کے گرد پھر رہی تھی اور وہ اپنا مونہہ کھولے ہوئے اپنے رب کے حکم کی منتظر تھی۔ حضرت یونس علیہ السلام نے فرمایا کہ تم لوگ مجھے سمندر میں پھینک دو ورنہ تم سب ہلاک ہو جاؤ گے، تو اُن لوگوں نے حضرت یونس علیہ السلام کو سمندر میں پھینکا اور اس وہیل مچھلی نے حضرت یونس علیہ السلام کو نگل لیا۔

روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُس وہیل مچھلی کی طرف وحی فرمائی تھی اور وہ مچھلی پہاڑ جتنی بڑی تھی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت یونس علیہ السلام اپنی قوم پر غضب ناک ہوئے اور بحر روم پر پہنچ گئے۔ وہاں پر ایک کشتی مسافروں سے بھری ہوئی تھی، حضرت یونس علیہ السلام بھی اس کشتی میں سوار ہو گئے اور وہ کشتی سمندر میں ڈگمگانے لگی حتیٰ کہ قریب تھا کہ وہ سب غرق ہو جاتے، تو اس کشتی کے ملاحوں نے کہا: یہاں پر کوئی ایسا مرد ہے جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والا ہے یا کوئی ایسا غلام ہے جو اپنے آقا سے بھاگ گیا ہے اور کشتی میں یہی رسم تھی کہ جب اس کشتی میں کوئی بھاگا ہوا مرد سوار ہو تو وہ کشتی چلتے چلتے رُک جاتی تھی اور اُن کی رسم یہ تھی کہ ایسی صورت میں وہ قرعہ اندازی کرتے، پھر جس کے نام کا قرعہ نکلتا، اس کو وہ سمندر میں پھینک دیتے، کشتی والوں نے تین مرتبہ قرعہ اندازی کی، ہر مرتبہ حضرت یونس علیہ السلام کے نام کا قرعہ نکلا تو حضرت یونس علیہ السلام نے کہا: میں ہی وہ نافرمانی کرنے والا مرد ہوں اور میں ہی بھاگا ہوا غلام ہوں، تو لوگوں نے اُن کو سمندر میں پھینک دیا اور ایک وہیل مچھلی نے اُن کو نگل لیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس وہیل مچھلی کی طرف وحی فرمائی کہ تم یونس کو ایک بال کے برابر بھی ایذاء نہ پہنچانا، میں نے تمہارے پیٹ کو اُن کے لیے قید خانہ بنا دیا ہے اور اُن کو وہیل مچھلی کی خوراک نہیں بنایا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ وہ وہیل مچھلی حضرت یونس علیہ السلام کو نگل کر زمین کے ساتویں طبقہ میں پہنچ گئی اور حضرت یونس علیہ السلام اس مچھلی کے پیٹ میں چالیس راتیں رہے۔ پھر انہوں نے تین ظلمتوں (رات کی ظلمت، سمندر کی ظلمت اور مچھلی کے پیٹ کی ظلمت) میں اللہ تعالیٰ کو پکارا: "لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ﳓ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ (الانبیاء:۸۷)" پس اللہ تعالیٰ نے اُن کی دعا قبول فرمائی اور وہیل مچھلی کو حکم دیا، اس مچھلی نے سمندر کے ساحل پر آپ کو اُگل دیا، اس وقت آپ بہت کمزور ہو چکے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے کدو کی بیل اگائی، پس حضرت یونس علیہ السلام اس کے سائے میں رہے۔

پھر حضرت یونس علیہ السلام ایک چرواہے کے پاس سے گزرے، آپ نے اس سے پوچھا: تم کن لوگوں میں سے ہو؟ اس نے کہا: میں حضرت یونس علیہ السلام کی قوم سے ہوں، حضرت یونس علیہ السلام نے فرمایا کہ جب تم اپنے لوگوں کے پاس پہنچو تو بتا دینا میں یونس سے

ملا ہوں، اس چرواہے نے کہا کہ اگر میرے پاس کوئی گواہ نہ ہو تو وہ لوگ مجھے جھوٹا قرار دیں گے اور مار ڈالیں گے۔ تو حضرت یونس علیہ السلام نے فرمایا کہ زمین کا یہ ٹکڑا اور یہ درخت تمہاری گواہی دیں گے۔ پھر وہ چرواہا واپس گیا اور اس نے لوگوں کو بتایا کہ اس کی حضرت یونس علیہ السلام سے ملاقات ہوئی ہے، بادشاہ نے کہا: اس کو قتل کر دو، اس چرواہے نے کہا: میرے پاس گواہی ہے، پس تم میرے ساتھ لوگوں کو بھیجو، پس وہ زمین کے اس ٹکڑے پر اور اس درخت کے پاس پہنچے اور اس درخت نے اور اس زمین کے ٹکڑے نے حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق گواہی دی، پس بادشاہ نے اس چرواہے کو اپنے پاس بٹھایا اور کہا: میرے بجائے تم اس جگہ کے زیادہ حق دار ہو۔ پھر وہ چرواہا چالیس سال تک اُن لوگوں پر حکومت کرتا رہا۔ (معالم التنزیل ج ۲ ص ۳۳۳۔۳۳۶، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”اور اگر آپ کے رب چاہتے تو زمین میں بسنے والے تمام کے تمام لوگ ایمان لے آتے، کیا پس آپ لوگوں پر جبر کر سکتے ہیں حتیٰ کہ تمام لوگ ایمان لے آئیں!○“ (یونس:۹۹)

”وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ“:

یعنی اے محمد! (صلی اللہ علیک وسلم)، اگر آپ کے رب چاہیں تو روئے زمین کے تمام لوگ ایمان لے آئیں۔ اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی عطا فرمائی ہے کیونکہ آپ اہلِ مکہ کے ایمان لانے پر حریص تھے، تو اللہ عزوجل نے یہ بتایا کہ ایمان وہی لائے گا جس کے متعلق ازل میں سعادت مقرر ہو چکی ہے۔ اور وہی شخص گمراہی پر برقرار رہے گا جس کے متعلق تقدیر میں شقاوت مقرر ہو چکی ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”اور اللہ کے حکم کے بغیر کسی شخص کے لیے ایمان لانا ممکن نہیں ہے، اور (اللہ) کفر کی نجاست اُن لوگوں کے دلوں پر ڈال دیتے ہیں جو غور و فکر سے کام نہیں لیتے○“ (یونس:۱۰۰)

”وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ“: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ”اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ“ کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر، اور عطاء نے کہا: اللہ عزوجل کی مشیت کے بغیر، اور ایک قول یہ ہے کہ اللہ عزوجل کے علم کے بغیر۔ ”وَیَجْعَلُ الرِّجْسَ“: ”الرِّجْسَ“ کا معنی ہے عذاب۔ ”عَلَى الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ“: یعنی جو لوگ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے منع فرمانے پر عقل سے کام نہیں لیتے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”آپ کفار سے کہیے: ”ذرا غور سے دیکھو کہ آسمانوں میں اور زمینوں میں اللہ کی توحید کے کیسے کیسے دلائل ہیں“ اور جو لوگ اللہ کی تقدیر میں ایمان لانے والے نہیں ہیں ان کو توحید کے یہ دلائل اور ایمان نہ لانے پر عذاب کی وعیدیں کچھ فائدہ نہیں دیں گی○“ (یونس:۱۰۱)

”قُلِ انْظُرُوْا“: یعنی آپ اُن مشرکین سے کہیے جو آپ سے معجزات طلب کرتے ہیں: تم غور کرو۔ ”مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ“: یعنی آسمانوں میں، سورج میں، چاند میں، ستاروں میں، زمین میں، پہاڑوں میں، سمندروں میں، دریاؤں میں اور درختوں میں اللہ تعالیٰ کی توحید پر کتنی نشانیاں ہیں۔ ”وَمَا تُغْنِی الْاٰیٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ“: یعنی جن لوگوں کے متعلق

اللہ تعالیٰ کو ازل میں یہ علم ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے تو معجزات اور عذاب سے ڈرانے کی وعیدیں اُن پر اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''پس یہ کفار صرف اُس عذاب کا انتظار کر رہے ہیں جو عذاب اِن کی طرح گزشتہ امتوں کے کافروں پر آچکا ہے، (اے رسولِ اکرم!) آپ کہیے: ''تم بھی اس عذاب کا انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں''O'' (یونس:۱۰۲)

''فَهَلْ یَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَیَّامِ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ'': یعنی مکہ کے مشرکین اُن سے پہلے گزری ہوئی قوموں کی طرح اللہ کے عذاب کا انتظار کر رہے ہیں۔ یعنی جس طرح قومِ نوح پر عذاب آیا تھا اور عاد اور ثمود پر عذاب آیا تھا۔ ''قُلْ فَانْتَظِرُوْۤا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ'': (اے رسولِ اکرم!) آپ کہیے: ''تم بھی اس عذاب کا انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''پھر ہم اپنے رسولوں کو اور ایمان والوں کو اسی طرح عذاب سے نجات عطا فرماتے رہے ہیں، اسی طرح ہم آئندہ بھی یقیناً ایمان لانے والوں کو عذاب سے نجات عطا فرماتے رہیں گےO'' (یونس:۱۰۳)

''ثُمَّ نُنَجِّیْ رُسُلَنَا وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'': یعنی پھر ہم اپنے رسولوں کو اور جو اُن کے ساتھ ایمان لائے ہیں بنزولِ عذاب کے وقت بچالیں گے۔ ''كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَیْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِیْنَ'': جس طرح ہم نے اُن کو نجات دی تھی، اسی طرح ہم پر لازم ہے کہ ہم مومنین کو نجات دیں۔ (معالم التنزیل ج ۲ ص ۳۳۴۔ ۳۳۷، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْ دِیْنِیْ فَلَاۤ اَعْبُدُ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ ۖۚ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۰۴﴾

آپ کہیے: ''اے لوگو! اگر تم میرے لائے ہوئے دین کے برحق ہونے میں شک کرتے ہو (تو سنو!) میں اُن بتوں کی کبھی عبادت نہیں کروں گا جن بتوں کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو لیکن میں اللہ کی عبادت کرتا ہوں جو تمہارے جسموں سے روحیں نکالتے ہیں، اور مجھے یہ حکم فرمایا گیا ہے کہ میں مومنین کے ساتھ رہوں''O

وَ اَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا ۚ وَ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۰۵﴾

اور (مجھے یہ حکم فرمایا گیا ہے) کہ آپ اپنا چہرہ اس دین کی طرف رکھیں جو ادیانِ باطلہ سے اعراض کرنے والا ہے اور (مجھے حکم فرمایا گیا ہے کہ) آپ ہرگز ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہ ہو جائیںO

وَ لَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُكَ وَ لَا یَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۰۶﴾

اور (مجھے یہ حکم فرمایا گیا ہے کہ) آپ اللہ کو چھوڑ کر اُن بتوں کی عبادت نہ کریں جو نہ آپ کو نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں، پس اگر (بالفرض) آپ نے ایسا کیا تو آپ کا شمار بھی ظالموں میں سے ہو جائے گا O

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿١٠٧﴾

اور اگر اللہ آپ کو کوئی ضرر پہنچائیں تو اللہ کے سوا کوئی بھی اس ضرر کو دور کرنے والا نہیں ہے، اور اگر اللہ آپ کو کوئی نعمت عطا فرمانا چاہیں تو اُن کے فضل کو کوئی روکنے والا نہیں ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہیں اپنا فضل عطا فرماتے ہیں، اور وہ سب سے زیادہ بخشنے والے، سب سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں O

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَاۤ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ؕ ﴿١٠٨﴾

(اے رسول اکرم!) آپ کہیے: ''اے کافرو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے برحق دین آچکا ہے، سو جس نے ہدایت پائی تو اس نے اپنے ہی فائدہ کے لیے ہدایت پائی ہے، اور جس نے گمراہی کو اختیار کیا تو اس گمراہی کا وبال اُسی پر ہوگا، اور میں تم پر جبر کرنے والا نہیں ہوں O''

وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚۖ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿١٠٩﴾ ع

(اے رسول اکرم!) آپ صرف اُس وحی کی پیروی کیجئے جو آپ کی طرف نازل فرمائی جاتی ہے اور صبر کرتے رہیے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمادیں، اور وہ سب سے بہتر فیصلہ فرمانے والے ہیں O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: '' آپ کہیے: '' اے لوگو! اگر تم میرے لائے ہوئے دین کے برحق ہونے میں شک کرتے ہو (تو سنو!) میں اُن بتوں کی کبھی عبادت نہیں کروں گا جن بتوں کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو لیکن میں اللہ کی عبادت کرتا ہوں جو تمہارے جسموں سے روحیں نکالتے ہیں، اور مجھے یہ حکم فرمایا گیا ہے کہ میں مومنین کے ساتھ رہوں O'' (یونس: ۱۰۴)

''قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ '': حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یعنی اے اہل مکہ! '' اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ '': یعنی اگر تم اسلام کے برحق دین ہونے میں شک کرتے ہو۔ '' فَلَاۤ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ '': تو میں اُن بتوں کی عبادت نہیں کروں گا جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو۔ '' وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۚ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ '': لیکن میں اللہ عزوجل کی عبادت کرتا ہوں جو تم کو مارنے پر قادر ہیں۔ اور ابن جریر نے کہا: اس آیت کا معنی ہے کہ

تمہارے لیے جائز نہیں ہے کہ تم میرے دین کے برحق ہونے کے متعلق شک کرو، کیونکہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہوں جو مارتے ہیں اور نفع پہنچاتے ہیں اور نقصان میں مبتلا فرماتے ہیں۔ لیکن تمہارے لیے لائق یہ ہے کہ تم اُس دین کے برحق ہونے میں شک کرو جس دین کی بناء پر تم بتوں کی عبادت کرتے ہو جو نہ کسی کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ نفع دے سکتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور (مجھے یہ حکم فرمایا گیا ہے) کہ آپ اپنا چہرہ اس دین کی طرف رکھیں جو ادیانِ باطلہ سے اعراض کرنے والا ہے اور (مجھے حکم فرمایا گیا ہے کہ) آپ ہرگز ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہ ہو جائیں O'' (یونس: ۱۰۵)

''وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ '': اس آیت کا معنی یہ ہے کہ آپ اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لیے اپنا عمل کرتے رہیں۔ اس کا دوسرا معنی یہ ہے: جس کی طرف عبادت کے وقت اپنا رخ کرنے کا حکم فرمایا ہے اسی کی طرف اپنا رخ رکھیں۔ اس آیت میں ''الحنیف'' کا لفظ ہے، اس کی تفسیر میں دو اقوال ہیں:

(۱) عطاء نے کہا: اس سے مراد ہے مخلص۔ (۲) القرظی نے کہا: اس سے مراد ہے دینِ مستقیم۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور (مجھے یہ حکم فرمایا گیا ہے کہ) آپ اللہ کو چھوڑ کر اُن بتوں کی عبادت نہ کریں جو نہ آپ کو نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں، پس اگر (بالفرض) آپ نے ایسا کیا تو آپ کا شمار بھی ظالموں میں سے ہو جائے گا O'' (یونس: ۱۰۶)

''وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ '':

اس آیت میں ''الظّٰلِمِيْنَ '' کا لفظ فرمایا ہے، ظالم اس کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو اس کے غیر محل میں رکھے، یعنی اگر آپ بالفرض اللہ عزوجل کی عبادت چھوڑ کر کسی اور کی عبادت کریں تو آپ کا شمار العیاذ باللہ ظالموں میں سے کیا جائے گا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور اگر اللہ آپ کو کوئی ضرر پہنچائیں تو اللہ کے سوا کوئی بھی اس ضرر کو دور کرنے والا نہیں ہے، اور اگر اللہ آپ کو کوئی نعمت عطا فرمانا چاہیں تو اُن کے فضل کو کوئی روکنے والا نہیں ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہیں اپنا فضل عطا فرماتے ہیں، اور وہ سب سے زیادہ بخشنے والے، سب سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں O'' (یونس: ۱۰۷)

''وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ '': یعنی اگر اللہ تعالیٰ آپ کو کسی مصیبت اور تنگی میں مبتلا فرمائیں۔ ''فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ '': تو اس مصیبت کو اللہ عزوجل کے سوا کوئی دور کرنے والا نہیں ہے، یعنی مشرکین جو بتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ ''وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ '': یعنی اگر اللہ تعالیٰ آپ کو کشادگی نعمت اور عافیت عطا فرمائیں، تو اللہ تعالیٰ کے سوا ان نعمتوں کو کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ ''يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ '': یعنی اللہ تعالیٰ ہی ضرر اور خیر کو پہنچانے والے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: " (اے رسولِ اکرم!) آپ کہیے: "اے کافرو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے برحق دین آچکا ہے، سو جس نے ہدایت پائی تو اس نے اپنے ہی فائدہ کے لیے ہدایت پائی ہے، اور جس نے گمراہی کو اختیار کیا، تو اس گمراہی کا وبال اُسی پر ہوگا، اور میں تم پر جبر کرنے والا نہیں ہوں" O (اے رسولِ اکرم!) آپ صرف اُس وحی کی پیروی کیجئے جو آپ کی طرف نازل فرمائی جاتی ہے اور صبر کرتے رہیے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمادیں، اور وہ سب سے بہتر فیصلہ فرمانے والے ہیں O (یونس: ۱۰۸۔۱۰۹)

"قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ": اس آیت کی تفسیر میں دو قول ہیں:

(۱) ایک قول یہ ہے کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے قرآن مجید آچکا ہے۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کے آخری رسول سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم آچکے ہیں۔

"وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا": یعنی جو شخص گمراہی کو اختیار کرے تو اس گمراہی کا عذاب صرف اسی کو پہنچے گا۔

"وَمَاۤ اَنَا عَلَیْكُمْ بِوَكِیْلٍ": اس آیت کا معنی ہے: میں تمہیں ہلاکت سے بچانے والا نہیں ہوں۔ جس طرح کوئی نگران مال و متاع کو ہلاکت سے بچاتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مشرکین سے قتال کے حکم سے یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے۔ اور جو اس کے بعد ہے وہ بھی منسوخ ہو چکی ہے اور وہ یہ ہے: "وَاتَّبِعْ مَا یُوْحٰۤى اِلَیْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى یَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ": کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو قتل کرنے کا حکم فرمایا ہے اور اہلِ کتاب کو جزیہ ادا کرنے کا حکم فرمایا ہے، اور صحیح قول یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے جیسا کہ ہم نے الانعام: ۱۰۷، اور البقرہ: ۱۰۹ میں تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔

الانعام ۱۰۷ میں فرمایا ہے: "وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشْرَكُوْا": یعنی اگر اللہ چاہتے تو تمام کافروں کو جبراً مومن بنا ڈالتے۔ "وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا": یعنی آپ کو اس لیے نہیں بھیجا گیا کہ آپ مشرکین کی عذاب سے حفاظت فرمائیں، آپ کو تو صرف احکام پہنچانے والا اور مبلغ بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اور البقرہ: ۱۰۹ میں فرمایا ہے: "فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تم ان کو معاف کرو اور ان سے درگزر کرو حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنے عذاب کو لے آئیں جس عذاب سے بنو قریظہ کے سات سو جوانوں کو قتل کیا گیا اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قید کیا گیا اور بنی نضیر کو مدینہ سے نکال دیا گیا۔

(الکشف والبیان ج ۱ ص ۲۵۷۔۲۵۸، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۲ھ)، (زاد المسیر فی علم التفسیر ج ۲ ص ۳۵۳۔۳۵۴، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۱ھ)

سورۂ ہود کا اجمالی تعارف

اس سورت کا نام سورۂ ہود ہے۔ حضرت ہود عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام اللہ عَزَّوَجَلَّ کے برگزیدہ رسول ہیں جو حضرت نوح عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کے بعد قومِ عاد کی طرف مبعوث ہوئے۔ سورۂ ہود میں حضرت ہود عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی تبلیغ کے حالات بیان فرمائے گئے ہیں، اس اعتبار سے اس سورت کا نام بھی آپ کے نام پر سورۂ ہود رکھا گیا ہے۔ سورۂ ہود بھی سورۂ یونس کی طرح مکی ہے۔

اس سورت میں حضرت ہود عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی اپنی قوم کو توحید کی دعوت دینے کا اور اللہ عَزَّوَجَلَّ کی عبادت کرنے اور بتوں کی عبادت کو ترک کرنے کا ذکر فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وَ اِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًاؕ-قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗؕ-اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ۝ (ہود: ۵۰)“ (اور ہم نے قومِ عاد کی طرف اُن کے قبیلے کے ایک فرد ہود کو بھیجا، انہوں نے کہا: ”اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی برحق عبادت کا مستحق نہیں ہے تم تو صرف بہتان تراشنے والے ہو○“)۔

پھر جب حضرت ہود عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی قوم نے اپنی بت پرستی اور شرک پر اصرار کیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن پر سخت عذاب نازل فرمایا اور حضرت ہود عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کو اس عذاب سے بچالیا، اللہ عَزَّوَجَلَّ کا ارشاد ہے: ”وَ لَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّیْنَا هُوْدًا وَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّاۚ-وَ نَجَّیْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِیْظٍ۝ (ہود: ۵۸)“ (اور جب ہمارا عذاب آیا تو ہم نے ہود اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنی رحمت سے بچالیا اور انہیں سخت عذاب سے نجات عطا فرمادی○)۔

سورۂ ہود کی جو آیتیں مکہ مکرمہ میں نازل نہیں ہوئیں

تین آیتوں کے سوا یہ پوری سورت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے اور وہ تین آیتیں یہ ہیں:

(۱) ”فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا یُوْحٰۤى اِلَیْكَ وَ ضَآىٕقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ یَّقُوْلُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌؕ-اِنَّمَاۤ اَنْتَ نَذِیْرٌؕ-وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ۝ (ہود: ۱۲)“۔ (۲) ”اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَ یَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤى اِمَامًا وَّ رَحْمَةًؕ-اُولٰٓىٕكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖؕ-وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗۚ-فَلَا تَكُ فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْهُۗ-اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یُؤْمِنُوْنَ۝ (ہود: ۱۷)“۔ (۳) ”وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّیْلِؕ-اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِؕ-ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِیْنَ۝ (ہود: ۱۱۴)“۔

سورۂ ہود کے متعلق احادیث

حضرت ابن عباس رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! بے شک آپ بوڑھے ہو گئے ہیں، آپ نے فرمایا: مجھے سورۂ ہود نے، سورۃ الواقعہ نے، سورۃ المرسلات نے، سورۂ عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ نے اور اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ نے بوڑھا کر دیا۔ امام ترمذی کہتے ہیں: یہ حدیث حسن غریب ہے اور اس حدیث کو ہم حضرت ابن عباس رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا کی سند کے سوا اور کسی سند سے نہیں جانتے۔

(سنن ترمذی: ۳۲۹۷، مصنف عبد الرزاق: ۵۹۹۷، مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۰۲۶۸، مسند البزار ج ۱ ص ۱۹۳، المعجم الکبیر للطبرانی: ۵۸۰۴، ۵۷۹۰، المستدرک علی الصحیحین: ۳۳۱۴، شعب الایمان للبیہقی: ۲۲۱۵، ۷۵۶، شرح السنۃ للبغوی: ۴۱۷۵، الجامع الصحیح للسنن والمسانید ج ۱۰ ص ۲۳۳، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشرۃ، ج ۶ ص ۲۰۳)

شیخ ابو العلاء محمد بن عبد الرحمٰن بن عبد الرحیم المبارک پوری المتوفی ۱۳۵۳ھ، اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

ملا علی قاری حنفی متوفی ۱۰۱۴ھ نے لکھا ہے کہ آپ کے چند بال سفید ہو گئے، یعنی بڑھاپے کے آنے سے پہلے آپ پر ضعف کے آثار ظاہر ہو گئے تھے، اور اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ آپ کے زیادہ بال سفید ہو گئے تھے، کیونکہ امام ترمذی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک اور آپ کی ڈاڑھی مبارک میں صرف چودہ (۱۴) سفید بال گنے۔

"شَیَّبَتْنِیْ هُوْد": یہ لفظ تشییب سے ماخوذ ہے، کیونکہ ان سورتوں میں زیادہ تر قیامت کے احوال بیان فرمائے گئے ہیں اور گزشتہ امتوں کے منکرین پر جو عذاب کا نزول ہوا، اس کا ذکر فرمایا گیا ہے، اس لئے فرمایا کہ ان سورتوں میں جو قیامت کے احوال بیان فرمائے گئے ہیں اس کی وجہ سے مجھ پر جو خوفِ خدا طاری ہوا، اس وجہ سے مجھ پر بڑھاپے کے آثار ظاہر ہو گئے ہیں۔

(تحفۃ الاحوذی، ج ۹ ص ۱۷۵-۱۷۶، دار احیاء التراث الاسلامی، بیروت، ۱۴۱۹ھ)

کعب بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جمعہ کے دن سورۂ ہود کی تلاوت کیا کرو"۔

(سنن دارمی: ۳۳۴۶، الادب المفرد للبخاری ج ۱ ص ۴۳)

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے جا رہا تھا، آپ سواری پر سوار تھے، میں نے آپ کے قدم مبارک پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے، میں نے عرض کیا: آپ مجھے سورۂ ہود پڑھائیے یا سورۂ یوسف پڑھائیے! آپ نے فرمایا: تم "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ" کے سوا کسی ایسی سورت کو نہیں پڑھو گے جو تمہیں اللہ عزوجل کے زیادہ نزدیک کرنے والی ہو۔

(السنن الکبریٰ للنسائی: ۱۰۲۷۷، مسند احمد: ۱۷۳۳۱، ۱۷۳۵۵، سنن دارمی: ۳۷۶۰، سنن نسائی: ۹۵۳، ۵۴۳۹، صحیح ابن حبان: ۷۹۵، موارد الظمآن: ۱۷۷۸، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشر، ج ۶ ص ۲۱۸)

سورۂ ہود کے اہم مضامین

(۱) سورۂ ہود میں صرف اللہ عزوجل کی عبادت پر زور دیا گیا ہے جیسا کہ اس سورت کے شروع میں فرمایا ہے: "اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ (ہود: ۲)"۔

(۲) اس سورت میں جزا اور سزا کا بیان فرمایا ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۝ (ہود: ۴)"۔

(۳) اس سورت میں نیک اعمال کے ساتھ بندوں کی آزمائش کا بیان ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (ہود: ۷)"۔

(۴) اس سورت میں انبیاء سابقین کے قصص تفصیل کے ساتھ بیان فرمائے گئے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین کی طرف سے پہنچنے والی ایذاؤں پر تسلی فرمائی گئی ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَ كُلًّا نَّقُصُّ عَلَیْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ

لِلْمُؤْمِنِيْنَ (ہود:۱۲۰)"۔

(۵) اس سورت میں حضرت ہود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق ہود: ۵۰ سے لے کر ہود: ۶۰ تک بیان فرمایا۔

(۶) اس سورت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس فرشتوں کے بطورِ مہمان آنے کا ذکر فرمایا ہے۔

(۷) اور اس سورت میں ہود: ۷۰ سے: ۸۳ تک حضرت لوط علیہ السلام کے قصے کا ذکر فرمایا ہے اور ہود: ۸۳ سے ہود: ۹۵ تک حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے قصے کا ذکر فرمایا ہے۔

آیاتها ۱۲۳ | ۱۱ سورۃ ھود مکیۃ ۵۲ | رکوعاتها ۱۰

(سورۃ ہود مکی ہے اور اس میں ایک سو تیئس آیات اور دس رکوع ہیں)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ عزوجل کے بابرکت نام سے ہی (ابتداء ہے) جو سب پر رحم فرمانے والے، نہایت مہربان ہیں

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۙ﴿۱﴾

الٓرٰ، یہ وہ کتاب ہے جس کی تمام آیات مستحکم ہیں، پھر ان کی تفصیل ان کی طرف سے بیان فرمادی گئی ہے جو تمام حکمتوں کے جاننے والے، تمام چیزوں کی خبر رکھنے والے ہیں ○

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ۙ﴿۲﴾

وہ یہ ہے کہ اے لوگو! تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، میں تم کو اللہ کی طرف سے عذاب سے ڈرانے والا ہوں اور خوش خبری دینے والا ہوں ○

وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ﴿۳﴾

اور یہ کہ تم سب اپنے رب سے مغفرت طلب کرو، پھر ان ہی کی طرف توبہ کرو، وہ تم کو ایک معین وقت تک دنیا کے اچھے ساز و سامان عطا فرمائیں گے اور ہر فضیلت کے مستحق کو اس کی فضیلت عطا فرمائیں گے، اور اگر تم پیٹھ پھیرلو تو میں تمہارے متعلق بہت بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ○

اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴﴾

تم سب نے اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے اور وہ ہر اس چیز پر قادر ہیں جس کو وہ چاہیں ○

اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ؕ اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۵﴾

سنو! یہ کفار اپنے سینوں کو موڑ کر دوہرا کرتے ہیں تاکہ اللہ سے چھپ جائیں، سنو! جس وقت یہ اپنے کپڑوں میں لپٹ کر پڑے

ہوتے ہیں، تب بھی اللہ اُن سب چیزوں کو جانتے ہیں جن کو وہ چھپاتے ہیں اور جن کو وہ ظاہر کرتے ہیں، بے شک اللہ سینوں کی تمام باتوں کو جاننے والے ہیں O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''الٓرٰ یہ وہ کتاب ہے جس کی تمام آیات مستحکم ہیں، پھر ان کی تفصیل ان کی طرف سے بیان فرمادی گئی ہے جو تمام حکمتوں کے جاننے والے، تمام چیزوں کی خبر رکھنے والے ہیں O'' (ہود:۱)

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ ھ، ہود:۱ تا ۵ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ'': قتادہ نے اس آیت کی تفسیر میں کہا: یعنی قرآن مجید کی تمام آیات مستحکم اور مربوط ہیں، نہ ان میں خلل ہے اور نہ ان میں کسی باطل کی آزمائش ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کتاب کی آیات اس طرح منسوخ نہیں ہوئیں جس طرح تورات اور انجیل کی آیات منسوخ ہو چکی ہیں۔ حسن بصری اور ابوالعالیہ نے کہا: اس کتاب کی آیات میں امر اور نہی مستحکم ہے، پھر وعد اور وعید اور ثواب اور عذاب کی آیات سے ان کی تفصیل فرمائی گئی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ کتاب لوح محفوظ میں جمع فرمائی گئی، پھر قرآن مجید میں اس کی تفصیل بیان فرمائی گئی ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس کی آیات کو بہ تدریج تھوڑا تھوڑا نازل فرمایا گیا تاکہ ان آیات میں تدبر کیا جائے۔

''مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ'': یہ کتاب اُن کی طرف سے نازل فرمائی گئی ہے جو حکیم ہیں اور ہر اُس چیز کی خبر رکھنے والے ہیں جو ہو چکی ہے اور جو ہوگی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''وہ یہ ہے کہ اے لوگو! تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، میں تم کو اللہ کی طرف سے عذاب سے ڈرانے والا ہوں اور خوش خبری دینے والا ہوں O'' (ہود:۲)

''اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ'': الزجاج نے کہا: اس کتاب کی آیات مستحکم ہیں، پھر ان کی تفصیل فرمائی گئی تاکہ تم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو۔ ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم فرمایا کہ وہ لوگوں سے کہیں کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ ''اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ'': میں اللہ کی طرف سے تم سب کو اللہ کے عذاب سے ڈرانے والا ہوں اور اللہ کی نافرمانی کرنے والوں کو اُن کے غضب سے ڈرانے والا ہوں۔ ''وَّبَشِيْرٌ'': اور میں تم کو اللہ تعالیٰ کی رضا اور اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزاروں کو جنت کی خوش خبری دینے والا ہوں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور یہ کہ تم سب اپنے رب سے مغفرت طلب کرو، پھر ان ہی کی طرف توبہ کرو، وہ تم کو ایک معین وقت تک دنیا کے اچھے ساز و سامان عطا فرمائیں گے اور ہر فضیلت کے مستحق کو اس کی فضیلت عطا فرمائیں گے، اور اگر تم پیٹھ پھیر لو تو میں تمہارے متعلق بہت بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں O''

(ہود:۳)

''وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ'': یعنی تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر کے اور اس کی عبادت کر کے ان سے مغفرت طلب کرو۔

"ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ": پھر تم اپنی اطاعت اور عبادت سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو، کیونکہ استغفار کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ تم اپنے گزشتہ گناہوں پر اللہ تعالیٰ سے استغفار کرو۔ بعض صلحاء نے کہا ہے: اگر گناہ کو دل سے اکھاڑ کر نہ پھینک دیا جائے تو یہ کذابین کی توبہ ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس آیت میں استغفار اور توبہ دو چیزوں کا ذکر فرمایا ہے، یعنی تم اپنے صغیرہ گناہوں پر استغفار کرو اور کبیرہ گناہوں سے اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ کرو۔

"يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا": یہ استغفار اور توبہ کرنے کا ثمرہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تم کو رزق کی وسعت سے اور اس کے منافع سے اور معیشت میں کشادگی سے تم کو بہرہ مند فرمائیں گے اور تم پر اس طرح عذاب نہیں نازل فرمائیں گے جس طرح تم سے پہلی امتوں کو عذاب دے کر ملیامیٹ فرما دیا گیا۔ اور سہل بن عبد اللہ التستری نے کہا کہ متاعِ حسن کا معنی ہے: مخلوق کو ترک کر کے بالکلیہ اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہونا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ تمہیں جو چیزیں دے دی گئی ہیں ان پر قناعت کرو اور جو چیزیں نہیں دی گئیں اُن پر غم نہ کرو۔

"اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى": ایک قول یہ ہے کہ تمہاری موت تک، دوسرا قول یہ ہے کہ قیامت تک اور تیسرا قول یہ ہے کہ دخولِ جنت تک۔ اور المتاع الحسن کا معنی یہ ہے کہ وہ تم کو ہر ناپسندیدہ چیز سے محفوظ رکھیں گے اور ہر خوف دلانے والی چیز سے بچائیں گے، یعنی جو چیزیں قبر میں ڈرانے والی ہیں اور قیامت کے خوف زدہ کرنے والے امور ہیں۔

"وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ": یعنی ہر وہ شخص جس نے نیک کام کئے، اس کے اُن نیک کاموں پر جزا عطا فرمائیں گے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ہر وہ شخص جس کی نیکیاں اس کی برائیوں سے زیادہ ہوں اور "فَضْلَهٗ" سے مراد جنت ہے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔

"وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ": یعنی اگر تم پیٹھ پھیرو اور روگردانی کرو تو مجھے تم پر قیامت کے دن کے عذاب کا خوف ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ الیوم الکبیر سے مراد غزوۂ بدر ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "تم سب نے اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے اور وہ ہر اس چیز پر قادر ہیں جس کو وہ چاہیں O" (ہود: ۴)

"اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ": یعنی موت کے بعد تم نے ہماری ہی طرف لوٹنا ہے۔

"وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ": یعنی ہر قسم کے ثواب عطا فرمانے اور ہر قسم کے عذاب دینے پر اللہ عزوجل قادر ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "سنو! یہ کفار اپنے سینوں کو موڑ کر دوہرا کرتے ہیں تاکہ اللہ سے چھپ جائیں، سنو! جس وقت یہ اپنے کپڑوں میں لپٹ کر پڑے ہوتے ہیں، تب بھی اللہ اُن سب چیزوں کو جانتے ہیں جن کو وہ چھپاتے ہیں اور جن کو وہ ظاہر کرتے ہیں، بے شک اللہ سینوں کی تمام باتوں کو جاننے والے ہیں O" (ہود: ۵)

"اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ": اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ اور مومنین سے مشرکین کی عداوت کی خبر دی ہے، وہ یہ گمان کرتے تھے کہ اُن کے احوال اللہ تعالیٰ سے مخفی ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مشرکین نے اپنے سینوں میں جس بغض اور مسلمانوں سے عداوت کو چھپا کر رکھا ہے اور

اُس چھپائی ہوئی عداوت کے خلاف ظاہر کرتے ہیں۔

یہ آیت الاخنس بن شریق کے متعلق نازل ہوئی ہے، وہ ایسا مرد تھا کہ اس کی زبان بہت میٹھی تھی، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میٹھی باتیں کرتا تھا اور اس کے دل میں جو آپ کے خلاف بغض اور عداوت تھی اس کو چھپا کر رکھتا تھا۔

اور مجاہد نے کہا: وہ اپنے سینوں میں شک اور کج بحثی کو چھپا کر رکھتے ہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت اُن بعض منافقین کے متعلق نازل ہوئی کہ جب اُن میں سے کوئی شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرتا تو وہ اپنے سینے کو اور پیٹھ کو موڑ لیتا اور سر جھکاتا اور اپنے چہرے کو ڈھانپ لیتا، تاکہ اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نہ دیکھیں اور نہ اسے ایمان لانے کی دعوت دیں۔

محمد بن عباد بن جعفر نے بیان کیا کہ انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا: "اَلَاۤ اِنَّهُمۡ یَثۡنُوۡنَ صُدُوۡرَهُمۡ۔ (ہود: ۵)" (سنو! یہ کفار اپنے سینوں کو موڑ کر دہرا کرتے ہیں)، انہوں نے کہا: میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا: کچھ لوگ کھلی جگہ میں قضائے حاجت کرتے وقت آسمان کی طرف ستر کھولنے سے حیاء کرتے تھے، اسی طرح اپنی عورتوں سے جماع کرتے وقت آسمان کی طرف ستر کھولنے سے حیاء کرتے تھے (تو وہ اپنے سینوں کو موڑ کر جھکا لیتے تھے)، یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی۔ (صحیح البخاری: ۴۶۸۱، ۴۶۸۲، ۴۶۸۳)

علامہ بدرالدین ابو محمد محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ، اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

کانوا یستحیون: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ اس سے حیاء کرتے تھے کہ کھلے میدان میں قضاء حاجت کے وقت آسمان کی طرف منہ کریں یا اپنی عورتوں کے ساتھ جماع کریں یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے انہیں برہنہ ہونے سے حیاء آتی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ تو ہر کھلی اور ڈھکی چیز کو دیکھنے والے اور جاننے والے ہیں۔ (عمدۃ القاری ج ۱۸ ص ۳۹۴)

"اَلَا حِیۡنَ یَسۡتَغۡشُوۡنَ ثِیَابَهُمۡ": یعنی جس وقت وہ اپنے سروں کو اپنے کپڑوں سے ڈھانپ لیتے ہیں۔

(الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، جزء ۹ ص ۶-۹، دارالکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

"یَعۡلَمُ مَا یُسِرُّوۡنَ وَمَا یُعۡلِنُوۡنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ": اللہ اُن سب چیزوں کو جانتے ہیں جن کو وہ چھپاتے ہیں اور جن کو وہ ظاہر کرتے ہیں، بے شک اللہ سینوں کی تمام باتوں کو جاننے والے ہیں۔

شیخ اشرف علی تھانوی دیوبندی متوفی ۱۳۶۴ھ، ہود: ۵ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یاد رکھو وہ لوگ دوہرا کیے دیتے ہیں اپنے سینوں کو (اور اوپر سے کپڑا لپیٹ لیتے ہیں) تاکہ اپنی باتیں خدا سے چھپا سکیں (یعنی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف میں جو باتیں کرتے ہیں تو اس ہیئت سے کرتے ہیں تاکہ کسی کو خبر نہ ہو جاوے اور جس کا اعتقاد ہوگا کہ خدا کو ضرور خبر ہوتی ہے اور آپ کا صاحب وحی ہونا دلائل سے ثابت ہے پس وہ اخفاء کی یہ تدبیر کبھی نہ کرے گا گویا بدلالت حال اللہ سے پوشیدہ رہنے کی کوشش کرتا ہے سو) یاد رکھو کہ وہ لوگ جس وقت (دوہرے ہو کر) اپنے کپڑے (اپنے اوپر) لپیٹتے ہیں وہ اس وقت بھی سب جانتا ہے جو کچھ چپکے چپکے باتیں کرتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہراً باتیں کرتے ہیں (کیونکہ) بالیقین وہ (تو) دلوں کے اندر کی باتیں جانتا ہے (تو زبان سے کہی ہوئی باتوں کو کیوں نہ جانے گا)۔ (تفسیر بیان القرآن، جلد دوم، ص ۲۰۵، مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور)

صدرالافاضل علامہ سید محمد نعیم الدین مراد آبادی حنفی متوفی ۱۳۶۷ھ، ہود:۵ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

بخاری نے افراد میں ایک حدیث روایت کی کہ مسلمان بول و براز و مجامعت کے وقت اپنے بدن کھولنے سے شرماتے تھے ان کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی کہ اللہ سے بندے کا کوئی حال چھپا ہی نہیں ہے، لہٰذا چاہیے کہ وہ شریعت کی اجازتوں پر عامل رہے۔ (تفسیر خزائن العرفان مع ترجمہ کنز الایمان، ص۴۱۶، مکتبۃ المدینہ، کراچی، ۱۴۳۲ھ)

وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَ یَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ۝۶

اور زمین پر چلنے پھرنے والے تمام جانداروں کا رزق اللہ ہی (کے ذمۂ کرم) پر ہے، اللہ اُن کے دنیا میں ٹھہرنے کی جگہ کو اور موت کے بعد ان کو سپرد کیے جانے کی جگہوں کو جاننے والے ہیں، ہر چیز لوحِ محفوظ میں لکھی ہوئی ہے ۝

وَ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَ لَىٕنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝۷

اور وہی ہیں جنہوں نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں پیدا فرمایا اور اُن کا عرش پانی پر تھا، (انہوں نے تم سب کو پیدا فرمایا) تاکہ وہ یہ دکھا دیں کہ تم سب میں سے کون زیادہ اچھا عمل کرنے والا ہے، اور اگر آپ یہ کہیں کہ بے شک تم سب موت کے بعد دوبارہ زندہ فرمائے جاؤ گے تو یہ کفار ضرور بہ ضرور کہیں گے کہ آپ کا یہ کہنا تو صرف کھلا ہوا جادو ہے ۝

وَ لَىٕنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰۤى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّیَقُوْلُنَّ مَا یَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا یَوْمَ یَاْتِیْهِمْ لَیْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۸

اور اگر ہم ان کافروں سے چند سالوں تک نزولِ عذاب کو موخر فرما دیں تو وہ کفار ضرور بہ ضرور کہیں گے: "اس عذاب کے نازل ہونے کو کس چیز نے روک لیا ہے؟"، سنو! جس دن اُن پر عذاب نازل ہوگا تو اس عذاب کو اُن سے دور نہیں کیا جا سکے گا، اور جس عذاب کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے وہ اُن کا احاطہ کر لے گا ۝

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور زمین پر چلنے پھرنے والے تمام جانداروں کا رزق اللہ ہی (کے ذمۂ کرم) پر ہے، اللہ اُن کے دنیا میں ٹھہرنے کی جگہ کو اور موت کے بعد ان کو سپرد کیے جانے کی جگہوں کو جاننے والے ہیں، ہر چیز لوحِ محفوظ میں لکھی ہوئی ہے ۝" (ہود:۶)

"وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَ یَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ":

لفظ "دَآبَّۃ" کے معانی

علامہ اسماعیل بن حماد الجوہری الشافعی المتوفی ۳۹۸ھ، لکھتے ہیں:

ہر وہ جاندار جو زمین پر چلتا ہو اس کو "دَآبَّۃ" کہتے ہیں۔ اور "دَآبَّۃ" اُس جانور کو کہتے ہیں جس پر سواری کی جائے۔ اور "دابۃ الارض" قیامت کی علامات میں سے ایک علامت ہے۔ (مجم الصحاح،ص ۳۲۹،دارالمعرفہ،بیروت،۱۴۲۹ھ)

"دابۃ الارض" کا مصداق

علامہ سید محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی حنفی متوفی ۱۲۰۵ھ لکھتے ہیں:

"دابۃ الارض" کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہ ایسا جانور ہے جس کی لمبائی ساٹھ (۶۰) ہاتھ ہوگی، یا پنچے پیروں پر چلتا ہوگا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس کی خلقت مختلف ہے اور یہ متعدد حیوانات کے مشابہ ہوگا۔ مکہ کے پہاڑ صفا سے مزدلفہ کی رات کو نکلے گا جب لوگ منیٰ کی طرف جا رہے ہوں گے، یا طائف کی زمین سے نکلے گا۔ نیز یہ بھی حدیث میں ہے کہ یہ کافر کے چہرے پر ایک سیاہ نشان ڈال دے گا اور مومن کے چہرے پر سفید نشان ڈال دے گا۔ پس کافر کا نشان ظاہر ہوگا اور اس کا پورا چہرہ سیاہ ہوجائے گا اور مومن کا نشان بھی ظاہر ہوگا حتیٰ کہ اس کا پورا چہرہ سفید چمک دار ہوجائے گا۔ اور کہا جاتا ہے کہ "دابۃ الارض" کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا ہوگا اور حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کی انگوٹھی ہوگی۔ مومن پر وہ عصا مارے گا اور کافر کے چہرے پر انگوٹھی سے نقش ڈالے گا جس نقش پر لکھا ہوگا کہ "یہ کافر ہے"۔

(تاج العروس من جواہر القاموس، جزء ۲ ص ۴۳۱، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۳۳ھ)

"دابۃ الارض" کے متعلق احادیث

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "دابۃ الارض" نکلے گا اور اس کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا ہوگا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی ہوگی، وہ کافر کی ناک پر انگوٹھی سے نشان ڈال دے گا اور مومن کے چہرہ پر وہ عصا مارے گا اور تمام لوگ مومن کو کافر سے تمیز کرلیں گے۔ (مسند ابوداؤد طیالسی: ۲۶۸۷، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشرۃ، ج ۴ ص ۳۱۲)

اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعت

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ، ہود: ۶ تا ۸ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جانداروں کی بہت اقسام ہیں اور وہ جاندار خشکی میں بھی ہیں، سمندر میں بھی ہیں اور پہاڑوں میں بھی ہیں، اور صرف اللہ تعالیٰ ہی اُن کا شمار فرما سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ تمام چیزوں کی طبیعتوں کی کیفیات کو اور اُن کے اعضاء کو، ان کے احوال کو، ان کی غذاؤں کو اور اُن کے گھروں کو جاننے والے ہیں اور یہ جاننے والے ہیں کہ کیا چیزیں اُن کے موافق ہیں اور کیا چیزیں اُن کے مخالف ہیں، پس اللہ تعالیٰ ہی تمام آسمانوں اور زمینوں کے مدبّر ہیں، اور حیوانات اور نباتات کی کیفیات کو جاننے والے ہیں۔

روایت ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ آیت نازل ہوئی تو اُن کا دل اپنے گھر والوں کے احوال سے متعلق ہوگیا تو اللہ

عزوجل نے اُن کو حکم فرمایا کہ وہ اپنی لاٹھی ایک پتھر پر ماریں، وہ پتھر پھٹا تو اس سے دوسرا پتھر نکلا، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس دوسرے پتھر پر لاٹھی ماری تو وہ شق ہو گیا اور اس سے ایک تیسرا پتھر نکلا، پھر انہوں نے اس پر اپنی لاٹھی ماری تو اس سے ایک چوتھا پتھر نکلا، اس میں چیونٹی کی جسامت کا ایک کیڑا تھا اور اس کے منہ میں غذا کے قائم مقام کوئی چیز تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے حجابات کو اٹھایا تو انہوں نے اس کیڑے کی آواز سنی "سبحان ہے وہ ذات جو مجھے دیکھتی ہے اور میرا کلام سنتی ہے اور میری جگہ کو پہچانتی ہے اور مجھے یاد رکھتی ہے اور مجھے بھلاتی نہیں ہے"۔

اللہ تعالیٰ پر کسی چیز کا واجب نہ ہونا

اس جگہ دوسری بحث یہ ہے کہ معتزلہ کہتے ہیں: ہر جاندار کو رزق پہنچانا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے۔
اس کا جواب یہ ہے کہ فی نفسہٖ اللہ تعالیٰ پر کچھ واجب نہیں ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم، فضل اور احسان سے وعدہ فرمایا ہے تو اس وعدہ کے اعتبار سے انہوں نے اپنے کرم سے اپنے اوپر اس کو لازم فرما لیا ہے۔

حرام کا بھی رزق ہونا

تیسری بحث یہ ہے کہ حرام بھی رزق ہوتا ہے، کیونکہ اگر کسی انسان نے ساری عمر حلال نہیں کھایا تو اگر وہ حرام رزق نہ ہوتا تو لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر رزق دینے کے وعدہ کو اس کے حق میں پورا نہیں فرمایا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور وہی ہیں جنہوں نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں پیدا فرمایا اور اُن کا عرش پانی پر تھا، (انہوں نے تم سب کو پیدا فرمایا) تاکہ وہ یہ دکھا دیں کہ تم سب میں سے کون زیادہ اچھا عمل کرنے والا ہے، اور اگر آپ یہ کہیں کہ بے شک تم سب موت کے بعد دوبارہ زندہ فرمائے جاؤ گے تو یہ کفار ضرور بہ ضرور کہیں گے کہ آپ کا یہ کہنا تو صرف کھلا ہوا جادو ہے O" (ہود:۷)

"وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ": یونس:۳ میں اس آیت پر مفصل بحث گزر چکی ہے۔

"كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ" کی متعدد تفاسیر

عبدالرحمٰن بن کیسان المعتزلی المتوفی ۲۲۵ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:
"وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ": یہ آیت اہلِ عرب کے اس قول کی مثل ہے کہ آسمان زمین کے اوپر ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے ساتھ چپکا ہوا ہے۔ اور یہ کس طرح ہو سکتا ہے کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ عرش اور آسمان، آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش سے پہلے موجود تھے۔ (تفسیر ابوبکر الاصم، ص۹۷، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۸ھ)

ابومسلم محمد بن بحر الاصفہانی المعتزلی المتوفی ۳۲۲ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:
اس آیت کا معنی یہ ہے کہ پانی پر کسی چیز کا بنانا بہت عجیب و غریب اور بہت تعجب خیز ہے۔
(تفسیر ابومسلم الاصبہانی ص۱۵۲، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۸ھ)

امام ابومنصور محمد بن محمد ماتریدی المتوفی ۳۳۳ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

بعض اہل تاویل نے کہا ہے کہ عرش تخت اور کرسی کا نام ہے تو یہ بادشاہ کا تخت ہے تا کہ اس تخت کے ذریعے بادشاہ اپنی مخلوق میں سے جسے چاہیں مکرم فرمائیں، تا کہ فرشتوں کو اس تخت کے اٹھانے پر اور خدمت کرنے پر مامور فرمائیں۔ جیسا کہ زمین کے بادشاہوں کا تخت ہوتا ہے اور وہ اس تخت پر بیٹھ کر اپنے ماتحت لوگوں سے خدمت طلب کرتے ہیں۔ اور عرش اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے۔ اور تخت کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف اس تخت کی تعظیم کیلئے ہے، جیسے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ ۔۔۔ (الجن: ۱۸)" (اور یہ کہ مسجدیں اللہ ہی کی ہیں)۔ (تاویلات اہل السنۃ ج ۶ ص ۱۰۱، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۶ھ)

ابواللیث نصر بن محمد بن احمد السمرقندی الحنفی المتوفی ۳۷۵ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یعنی آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمانے سے پہلے عرش پانی پر تھا اور عرش کے نیچے پانی کے سوا کوئی چیز نہیں تھی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہر دو آسمانوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے اور ساتویں آسمان اور کرسی کے درمیان بھی پانچ سو سال کی مسافت ہے اور کرسی اور پانی کے درمیان بھی پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ اور عرش پانی پر ہے اور اللہ عزوجل اپنی بلندی کے سبب عرش پر ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا تو پانی کے دو حصے فرما دیئے، ایک حصہ عرش کے نیچے تھا اور وہ البحر المسجور ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَ الْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ۝ (الطور: ۶)" (اور (قیامت کے دن) سلگائے ہوئے سمندر کی قسم ۝)، اور دوسرا حصہ سب سے نچلی زمین کے نیچے ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت (وَّ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ) کے متعلق سوال کیا گیا کہ پانی کس چیز پر تھا؟ تو انہوں نے کہا: پانی ہوا کی پیٹھ پر تھا۔ اور "وَّ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ" کا معنی یہ ہے کہ وہ عرش پانی پر تھا، یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ پانی سے ملا ہوا تھا۔ (تفسیر السمرقندی ج ۲ ص ۱۱۷، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۳ھ)

علامہ ابوالبرکات احمد بن محمد نسفی حنفی متوفی ۷۱۰ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ آسمانوں اور زمینوں کے پیدا فرمانے سے پہلے عرش کے نیچے پانی کے سوا کوئی مخلوق نہیں تھی، اور اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ عرش اور پانی دونوں آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے پہلے پیدا فرمائے گئے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے سبز رنگ کا یاقوت پیدا فرمایا، پھر اس پر نظر ہیبت ڈالی تو وہ یاقوت پگھل کر پانی ہو گیا، پھر ہوا کو پیدا فرمایا، پھر پانی کو ہوا کی پیٹھ پر برقرار رکھا، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے عرش کو پانی پر رکھا۔

(مدارک التنزیل وحقائق التاویل، ج ۲ ص ۳۸، دار ابن کثیر، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

حافظ اسماعیل بن کثیر الشافعی الدمشقی المتوفی ۷۷۴ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

حضرت ابورزین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہمارے رب مخلوق کو پیدا فرمانے سے پہلے کہاں تھے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ خلاء میں تھے نہ اُن کے نیچے ہوا تھی نہ اُن کے اوپر ہوا تھی، پھر اس کے بعد اللہ عزوجل نے عرش کو پیدا فرمایا۔ (سنن ترمذی: ۳۱۰۹، سنن ابن ماجہ: ۱۸۲، مسند احمد ج ۴ ص ۱۱، رقم الحدیث: ۱۶۲۰۰)

وہب بن منبہ، قتادہ، ابن جریر اور متعدد علماء نے "کَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ" کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں یہ خبر دے رہے ہیں کہ آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمانے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنی تخلیق کی ابتداء کس طرح فرمائی۔ اور الربیع بن انس نے کہا کہ جب اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا تو پانی کے دو حصے فرما دیے، ایک حصہ عرش کے نیچے تھا اور وہ البحر المسجور ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے متعلق سوال کیا گیا کہ پانی کس چیز پر تھا؟ تو انہوں نے کہا: وہ ہوا کی پیٹھ پر تھا۔ (تفسیر القرآن العظیم، ج ٢ ص ٣٨٦۔٣٨٧، دار الفکر، بیروت، ١٤١٩ھ)

صدر الافاضل علامہ سید محمد نعیم الدین مراد آبادی حنفی متوفی ١٣٦٧ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یعنی عرش کے نیچے پانی کے سوا اور کوئی مخلوق نہ تھی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عرش اور پانی آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش سے قبل پیدا فرمائے گئے۔ (تفسیر خزائن العرفان مع ترجمہ کنز الایمان ص ٣١٧، مکتبۃ المدینہ، کراچی، ١٤٣٢ھ)

شیخ عبد الماجد دریا آبادی متوفی ١٣٩٧ھ/ ١٩٧٧ء، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"کَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ": قرآن مجید نے اس حقیقت کو ایک دوسری جگہ یہ کہہ کر اور زیادہ صاف کر دیا ہے کہ اس کائنات کی جاندار مخلوق کا مادہ حیات پانی ہی ہے۔ "وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ" (الانبیاء: ٣٠)۔

(تفسیر ماجدی ص ٣٩١، پاک کمپنی، لاہور)

ضیاء الامت حضرت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری حنفی متوفی ١٤١٨ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اس سے یہ بتایا گیا کہ ارض و سما سے پہلے پانی کی تخلیق ہو چکی تھی اور یہی اصل کائنات ہے اور یہی منبع حیات ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: "وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ" (الانبیاء: ٣٠)" یعنی ہم نے پانی کے ذریعہ ہر چیز کی زندگی کا سامان فراہم کیا۔ اس پانی کی حقیقت کیا تھی۔ کیا وہ یہی پانی تھا یا کوئی مائع (بہنے والی چیز تھی جسے سیال ہونے کی مناسبت سے پانی فرمایا گیا)۔ واللہ تعالیٰ اعلم (ضیاء القرآن ج ٢ ص ٣٣٣، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور)

"کَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ" کے متعلق محدثین کی تشریحات

علامہ بدر الدین ابو محمد محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ٨٥٥ھ، لکھتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس کا عرش پانی پر تھا"۔

اس ارشاد کا معنی یہ ہے کہ عرش کے نیچے صرف پانی تھا، اور اس میں یہ دلیل ہے کہ عرش اور پانی آسمانوں اور زمینوں سے پہلے پیدا فرمائے گئے، اور اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ عرش اور پانی اس عالم کی تخلیق کا مبدأ ہیں۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ بعض احادیث میں دوسری چیزوں کے متعلق تصریح ہے کہ ان کو سب سے پہلے پیدا فرمایا گیا ہے، جیسا کہ حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "بے شک اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا فرمایا، پس فرمایا: لکھ! اس نے عرض کیا: کیا لکھوں؟ فرمایا: تقدیر لکھو جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ ابد تک ہوگا"۔ (سنن ترمذی: ٢١٥٥، ٢١٦٢، سنن ابوداؤد: ٤٧٠٠، مسند احمد ج ٥ ص ٣١٧، رقم الحدیث: ٢٢٧٦٨، ٢٢٧٧٠)

علامہ عینی لکھتے ہیں کہ امام محمد بن اسحاق نے یہ روایت کی ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے نور اور ظلمت کو پیدا فرمایا ہے، پھر

ان کو ایک دوسرے سے ممتاز فرمایا، پس ظلمت کو سیاہ رات بنا دیا اور نور کو سفید دن بنا دیا۔

ایک قول یہ ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نور پیدا فرمایا۔

ان روایات میں تطبیق اس طرح ہے کہ اوّلیت ایک امر اضافی ہے اور ہر وہ چیز جس کے متعلق آپ نے فرمایا ہے کہ وہ اول ہے، وہ اپنے بعد والی چیزوں کے اعتبار سے اول ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۱۵ ص ۱۵۰، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۱ھ)

حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی شافعی متوفی ۸۵۲ھ، لکھتے ہیں:

ان چیزوں میں تخلیق کی ترتیب اس طرح ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے پانی کو پیدا فرمایا، پھر پانی کے اوپر عرش کو پیدا فرمایا، پھر قلم کو پیدا فرمایا اور اس سے فرمایا: جو کچھ ہونے والا ہے اس کو لکھو، پھر آسمانوں اور زمینوں کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، اس کو لکھو۔ (فتح الباری ج ۳ ص ۳۵۵، دار المعرفہ، بیروت، ۱۳۲۶ھ)

علامہ احمد بن اسماعیل کورانی حنفی متوفی ۸۹۳ھ، لکھتے ہیں:

حدیث میں فرمایا ہے: "آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش سے پہلے عرش پانی پر تھا"، اس حدیث کا یہ معنی نہیں ہے کہ عرش پانی کی سطح پر تھا اور اس سے چپکا ہوا تھا، بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ عرش پانی کی سمت پر تھا اور عرش اور پانی کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں تھی، اس سلسلہ میں یہ حدیث ہے:

حضرت ابو رزین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے پوچھا: یا رسول اللہ! مخلوق کو پیدا فرمانے سے پہلے ہمارے رب تبارک وتعالیٰ کہاں تھے؟ آپ نے فرمایا: اُن کے ساتھ کوئی چیز نہیں تھی، ان کے نیچے بھی خلاء تھا اور ان کے اوپر بھی خلاء تھا اور انہوں نے اپنے عرش کو پانی پر پیدا فرمایا۔ (سنن ترمذی: ۳۱۰۹، سنن ابن ماجہ: ۱۸۲، مسند احمد ج ۴ ص ۱۱، رقم الحدیث: ۱۶۲۰۰)

آیت کریمہ "كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ" کے متعلق مصنف کا نقطۂ نظر

ہم نے اس آیت کے متعلق مشاہیر مفسرین اور مستند شارحین حدیث کے اقوال نقل کیے ہیں، ان تمام اقوال کو پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں کسی قول فیصل پر اتفاق نہیں ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ آیات متشابہات میں سے ہے اور اس کی کنہ اور حقیقت کا علم صرف اللہ عزوجل اور اُن کی عطاء سے اُن کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ تاہم جو بات حتمی اور یقینی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ عزوجل واجب اور قدیم ہیں اور اُن کا وجود سب پر مقدم ہے، پھر جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے پیدا فرمایا وہ عرش ہے، جس کے متعلق فرمایا کہ وہ پانی پر ہے اس پانی سے مراد معروف پانی ہے یا کوئی سیال اور بہنے والی چیز ہے، سو اس کے متعلق اپنی عقل سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اور احادیث میں اس کی وضاحت نہیں ہے کہ اس پانی سے کیا مراد ہے۔ سو اس مقام پر ہمیں اپنی عقلِ نارسا کا اعتراف کرنا چاہیے اور اس آیت سے اللہ تعالیٰ کی جو بھی مراد ہو وہ انہی پر چھوڑ دینا چاہیے۔ (سعیدی غفرلہٗ)

بعث بعد الموت پر دلائل

حافظ اسماعیل بن کثیر الشافعی الدمشقی المتوفی ۷۷۴ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا": یعنی اللہ عزوجل نے آسمانوں اور زمینوں کو اپنے بندوں کی منفعت کے لئے پیدا فرمایا، اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو پیدا فرمایا تا کہ وہ اللہ عزوجل کی عبادت کریں اور اُن کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں، اور اللہ تعالیٰ

نے اپنی مخلوق کو عبث اور بے فائدہ نہیں پیدا فرمایا، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿﴾ (المؤمنون:۱۱۵۔۱۱۶)" (کیا تم نے یہ گمان کرلیا ہے کہ ہم نے تمہیں بے مقصد پیدا فرمایا ہے اور یہ کہ تم ہماری بارگاہ میں پیش نہیں کئے جاؤ گے؟O سنو! اللہ تعالیٰ سب سے بڑے بادشاہ ہیں، ان کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے اور وہی عرشِ کریم کے رب ہیں O)۔ نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿﴾ (الذاریات:۵۶)" (اور میں نے جن اور انسان کو صرف اس لئے پیدا فرمایا ہے کہ وہ میری عبادت کریں O)۔

"لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا": تا کہ ہم یہ دکھائیں کہ تم میں سے کون زیادہ اچھا عمل کرنے والا ہے۔ اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ تم میں سے کون زیادہ عمل کرنے والا ہے بلکہ فرمایا: تم میں سے کون زیادہ اچھا عمل کرنے والا ہے۔ اور کوئی عمل زیادہ اچھا اس وقت ہوتا ہے کہ جب وہ عمل خالص اللہ عزوجل کیلئے ہو اور رسول اللہ ﷺ کی شریعت کے مطابق کیا جائے۔ پس جس عمل میں ان دونوں میں سے کوئی ایک شرط بھی نہ ہو، وہ عمل باطل ہے اور ضائع ہو جاتا ہے۔

"وَلَىِٕنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ": اس آیت میں اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اگر آپ ان مشرکین کو یہ خبر دیں کہ بے شک اللہ تعالیٰ تمہاری موت کے بعد تمہیں دوبارہ زندہ فرمائیں گے جیسا کہ اُن کو ابتداءً پیدا فرمایا تھا، اس کے باوجود کہ وہ اس کا اعتراف کرتے تھے کہ اللہ ہی نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ــــ (العنکبوت:۶۱)" (اللہ کی قسم! اگر آپ ان کفار سے پوچھیں: "زمینوں اور آسمانوں کو کس نے پیدا فرمایا؟ سورج اور چاند کو کس نے کام پر لگایا؟" تو وہ ضرور بہ ضرور کہیں گے: "اللہ نے")۔

اس اعتراف کے باوجود وہ کفار مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے کا اور قیامت کے دن کا انکار کرتے تھے، حالانکہ کسی چیز کو دوبارہ بنانا پہلی مرتبہ بنانے سے آسان ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ــ (الروم:۲۷)" (اور وہی ہیں جو مخلوق کو پہلی بار پیدا فرماتے ہیں، پھر اسے دوبارہ پیدا فرمائیں گے اور وہ ان کیلئے زیادہ آسان ہے)۔

"لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ": تو کفار ضرور بہ ضرور اس کے جواب میں کفر اور عناد سے یہی کہیں گے کہ یہ تو صرف کھلا ہوا جادو ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اگر ہم ان کافروں سے چند سالوں تک نزولِ عذاب کو مؤخر فرمادیں تو وہ کفار ضرور بہ ضرور کہیں گے: "اس عذاب کے نازل ہونے کو کس چیز نے روک لیا ہے؟" سنو! جس دن اُن پر عذاب نازل ہوگا تو اس عذاب کو اُن سے دور نہیں کیا جاسکے گا، اور جس عذاب کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے وہ اُن کا احاطہ کرلے گا O" (ہود:۸)

"وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰۤى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ": یعنی اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر ہم ان مشرکین سے ایک مدت معینہ تک عذاب کو مؤخر فرمالیں۔

لفظِ اُمّت کے متعدد معانی اور مصادیق

اور امت کا لفظ قرآن اور سنت میں متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے:

(۱) امت کا استعمال مدتِ معینہ کے لیے بھی ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے: "وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰۤى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ"۔

(۲) اور امت کا استعمال امام اور مقتدیٰ کے لیے بھی ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے: "اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ (النحل: ۱۲۰)" (بے شک ابراہیم اپنی ذات میں مکمل امت تھے، اللہ کے انتہائی فرمانبردار، ہر باطل کو چھوڑ کر دینِ حق پر قائم رہنے والے تھے اور مشرکین میں سے نہ تھے)۔

(۳) اور امت کا استعمال جماعت کے لیے بھی ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے: "وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ۔ (القصص: ۲۳)" (اور جب (حضرت موسیٰ علیہ السلام) مَدْیَن کے پانی پر پہنچے تو وہاں لوگوں کا ایک گروہ پایا جو اپنے جانوروں کو پانی پلا رہا تھا)۔

(۴) اور امت کا استعمال ملّت اور دین کے معنی میں بھی ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے: "اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ۝ (الزخرف: ۲۳)" (ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک دین پر پایا ہے اور ہم بھی اُن کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہیں ○)۔

اور اس آیت (ہود: ۸) میں اُمّت سے مراد وہ لوگ ہیں جن لوگوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو مبعوث فرمایا۔ اُن میں سے بعض اُس رسول پر ایمان لانے والے تھے اور بعض کفر کرنے والے تھے۔

(تفسیر القرآن العظیم، ج ۴ ص ۲۸۶۔ ۲۸۷، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۹ھ)

"لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ": یعنی اگر ہم عذاب کو کچھ مدت کے لیے مؤخر فرمالیں تو یہ کفار جو جلد از جلد عذاب کو طلب کرتے تھے وہ ضرور بہ ضرور کہیں گے کہ کس چیز نے عذاب کے نزول کو مؤخر کر دیا اور اللہ کی آیات کا مذاق اڑائیں گے، اللہ تعالیٰ نے اُن کا رد کرتے ہوئے فرمایا: "اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝": جس دن وہ عذاب آجائے گا اُس دن اس عذاب کو کوئی اُن سے ٹال نہیں سکے گا، اور جس عذاب کے نزول کا وہ مذاق اڑاتے تھے، وہ اِن کا احاطہ کر لے گا۔ (معالم التنزیل ج ۲ ص ۴۳۱، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَـُٔوْسٌ كَفُوْرٌ ۝

اور اگر ہم کسی انسان کو اپنی کسی رحمت کا مزا چکھائیں، پھر اس سے (اس کی ناشکری کی بناء پر) اس رحمت کو چھین لیں تو بے شک وہ ضرور بہت مایوس اور بہت ناشکرا بن جاتا ہے ○

وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَیَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّیِّاٰتُ عَنِّیْؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌۙ ﴿۱۰﴾

اور اگر ہم اُسے مصیبت کے بعد راحت کا مزا چکھائیں تو وہ ضرور بہ ضرور کہے گا: "مجھ سے تمام مصائب دور ہو گئے" بے شک وہ اترانے والا اور بہت فخر کرنے والا ہے ○

اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِؕ اُولٰٓىٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِیْرٌ ﴿۱۱﴾

سوا اُن لوگوں کے جنہوں نے صبر کیا اور وہ نیک اعمال کرتے رہے، ان ہی کے لیے بخشش ہے اور بہت بڑا اجر ہے ○

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا یُوْحٰۤى اِلَیْكَ وَ ضَآىٕقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ یَّقُوْلُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ نَذِیْرٌؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌؕ ﴿۱۲﴾

(اے رسول اکرم!) آپ کی طرف جو وحی نازل فرمائی جاتی ہے شاید آپ اُس کا کچھ حصہ ترک کر دیتے اور اس وجہ سے اس کی تلاوت سے آپ کا سینہ تنگ ہوتا کہ وہ کافر کہیں گے: "ان پر کوئی خزانہ کیوں نہیں نازل کیا گیا یا ان کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا"، آپ تو صرف اللہ کے عذاب سے ڈرانے والے ہیں، اور اللہ ہر چیز کے نگہبان ہیں ○

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَیٰتٍ وَّ ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۳﴾

یا وہ کافر کہیں گے: "قرآن ان کا خود سے بنایا ہوا ہے"، آپ کہیے: "اگر تم سچے ہو تو اس قرآن کی مثل دس سورتیں خود سے بنا کر لے آؤ اور اللہ کے سوا جن کو بھی تم اپنی مدد کے لیے بلا سکتے ہو بلا لو" ○

فَاِلَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾

پھر اگر وہ آپ کا چیلنج قبول نہ کر سکیں تو اے مسلمانو! یاد رکھو کہ قرآن اللہ ہی کے علم سے نازل فرمایا گیا ہے اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، تو اے کافرو! کیا اب تم اسلام قبول کر لو گے؟ ○

مَنْ كَانَ یُرِیْدُ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَ زِیْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَیْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِیْهَا وَ هُمْ فِیْهَا لَا یُبْخَسُوْنَ ﴿۱۵﴾

جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت چاہتے ہیں، ہم دنیا میں اُن کے اعمال کا پورا پورا صلہ عطا فرمائیں گے اور اُن کو اس صلہ میں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا جائے گا O

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٦﴾

یہی وہ کفار ہیں جن کے لیے آخرت میں دوزخ کی آگ کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور انہوں نے دنیا میں (بزعم خویش) جو نیک کام کئے تھے وہ ضائع ہو گئے اور دنیا میں وہ جو کام بھی کرتے تھے وہ سب بے سود ہے O

أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِن قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً ۚ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ ۚ وَمَن يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهُ ۚ فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٧﴾

اور جو لوگ اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل پر قائم ہوں اور اس کے علاوہ ایک (آسمانی) گواہ (یعنی قرآن مجید) بھی اُن کے ساتھ ہو اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب (تورات) بطور امام اور اللہ کی طرف سے رحمت آچکی ہو، یہی لوگ قرآن پر ایمان لاتے ہیں، اور جو فرقے اس قرآن کا انکار کرتے ہیں تو اُن کے لیے دوزخ کی آگ کی وعید ہے، سو (اے رسول اکرم!) آپ اس قرآن کریم کے متعلق کسی شک میں مبتلا نہ ہوں، یہ آپ کے رب کی طرف سے برحق ہے، لیکن اکثر لوگ اس پر ایمان نہیں لائیں گے O

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۚ أُولَٰئِكَ يُعْرَضُونَ عَلَىٰ رَبِّهِمْ وَيَقُولُ الْأَشْهَادُ هَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ ۚ أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿١٨﴾

اور اس سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹا افتراء باندھے ایسے ظالمین اپنے رب کے سامنے پیش کئے جائیں گے اور گواہ (یعنی فرشتے) کہیں گے: یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹا افتراء کیا تھا، سنو! ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے O

الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا وَهُم بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ﴿١٩﴾

اور جو کفار اللہ کے راستہ سے لوگوں کو روکتے ہیں اور اس میں کجی تلاش کرتے ہیں اور وہی آخرت کا بھی انکار کرتے ہیں O

أُولَٰئِكَ لَمْ يَكُونُوا مُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُم مِّن دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ۘ يُضَاعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ۚ مَا كَانُوا يَسْتَطِيعُونَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوا يُبْصِرُونَ ﴿٢٠﴾

یہ لوگ زمین میں کسی جگہ بھاگ کر اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہیں اور نہ اللہ کے سوا ان کے کوئی مددگار ہیں، ان کو دگنا عذاب دیا

جائے گا، کیونکہ یہ لوگ غلبۂ کفر کی وجہ سے آپ کا پیغام نہیں سنتے تھے اور نہ حقیقت میں آپ کو دیکھتے تھے O

اُولٰٓىٕكَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ﴿۲۱﴾

یہی وہ خالسین ہیں جنہوں نے اپنی جانوں کو نقصان میں مبتلا کیا اور یہ خالسین دنیا میں اللہ پر جو افتراء کرتے تھے وہ آخرت میں ان سے غائب ہو جائے گا O

لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴿۲۲﴾

یقیناً یہی لوگ آخرت میں سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے ہیں O

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَخْبَتُوْۤا اِلٰى رَبِّهِمْۙ اُولٰٓىٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۳﴾

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کئے اور اپنے رب کے سامنے عجز کا اظہار کیا، یہی لوگ جنت والے ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں O

مَثَلُ الْفَرِیْقَیْنِ كَالْاَعْمٰى وَ الْاَصَمِّ وَ الْبَصِیْرِ وَ السَّمِیْعِؕ هَلْ یَسْتَوِیٰنِ مَثَلًاؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ۠ ﴿۲۴﴾

(مومنین اور کفار) ان دو گروہوں کی مثال اندھے اور بہرے اور دیکھنے والے اور سننے والے کی طرح ہے، کیا یہ دونوں گروہ برابر ہو سکتے ہیں؟ اے مشرکو! پس تم نصیحت کو کیوں قبول نہیں کرتے !O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ’’اور اگر ہم کسی انسان کو اپنی کسی رحمت کا مزا چکھائیں، پھر اس سے (اس کی ناشکری کی بناء پر) اُس رحمت کو چھین لیں تو بے شک وہ ضرور بہت مایوس اور بہت ناشکرا بن جاتا ہے O‘‘ (ہود:۹)

ہود:۹ میں انسان سے مراد مطلق انسان ہے یا کافر مراد ہے؟

’’وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُۚ اِنَّهٗ لَیَـُٔوْسٌ كَفُوْرٌ‘‘: ابن جریج نے اس آیت کی تفسیر میں کہا: اے ابن آدم! جب تم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی نعمت کا نزول ہوتا ہے تو تم بہت زیادہ ناشکری کرنے والے ہوتے ہو، اور جب وہ نعمت تم سے چھین لی جائے تو تم ناامید اور مایوس ہو جاتے ہو۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس آیت میں انسان سے مراد کافر ہے، کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ جو منکر معرّف باللام ہو اس سے معہود سابق مراد ہوتا ہے سوا اس کے کہ اس مراد سے کوئی مانع ہو۔ اور یہاں کوئی مانع نہیں ہے لہٰذا اس کو معہود سابق پر محمول کرنا واجب ہے اور وہ کافر ہے جیسا کہ اس سے پہلی آیت میں مذکور ہے۔ نیز انسان کی جو صفات یہاں ذکر فرمائی گئی ہیں وہ صرف کافر کے مناسب ہیں، کیونکہ اس کی صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ کفور ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور اگر ہم اُسے مصیبت کے بعد راحت کا مزا چکھائیں تو وہ ضرور بہ ضرور کہے گا: ''مجھ سے تمام مصائب دور ہو گئے'' بے شک وہ اِترانے والا اور بہت فخر کرنے والا ہے O'' (ہود: ۱۰)

آیتِ مذکورہ میں الانسان سے کافر مراد ہونے پر دلائل

''وَلَىٕنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَیَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّیِّاٰتُ عَنِّیْؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ'': نیز اس آیت میں فرمایا کہ جب وہ راحت کو پالے تو وہ کہتا ہے مجھ سے تمام مصائب دور ہو گئے، اور ایسا کہنا اللہ تعالیٰ پر سنگین جرأت ہے۔ نیز اس انسان کی یہ صفت فرمائی کہ وہ اِتراتا ہے اور اِترانا دین دار لوگوں کی صفت نہیں ہے۔ پھر اس آیت میں فرمایا: ''وَلَىٕنْ اَذَقْنٰهُ'' یعنی اگر ہم اسے رحمت کا ذائقہ چکھائیں اور جو چیز چکھائی جاتی ہے اس کی مقدار بہت تھوڑی ہوتی ہے، یعنی اگر اس انسان کو تھوڑی سی بھی راحت مل جائے تو وہ بہت زیادہ اِتراتا ہے۔ اور جب ہم اس سے یہ راحت چھین لیں تو وہ مایوس اور کفور ہو جاتا ہے اور کفور کا معنی ہے: جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شدت سے کفر کرتا ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ کافر سے جب نعمت زائل ہو جائے تو وہ مایوس ہو جاتا ہے اور جب اس کو نعمت حاصل ہو جائے تو وہ اِترانے لگتا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''سوا اُن لوگوں کے جنہوں نے صبر کیا اور وہ نیک اعمال کرتے رہے، ان ہی کے لیے بخشش ہے اور بہت بڑا اجر ہے O'' (ہود: ۱۱)

''اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِؕ اُولٰٓىٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِیْرٌ'': اس آیت میں مومنین صالحین کے لیے دو بشارتیں ہیں، ایک بشارت یہ ہے کہ اُن کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت حاصل ہوگی اور دوسری بشارت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کو اجر و ثواب عطا فرمائیں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''(اے رسولِ اکرم!) آپ کی طرف جو وحی نازل فرمائی جاتی ہے شاید آپ اُس کا کچھ حصہ ترک کر دیتے اور اس وجہ سے اس کی تلاوت سے آپ کا سینہ تنگ ہوتا کہ وہ کافر کہیں گے: ''اِن پر کوئی خزانہ کیوں نہیں نازل کیا گیا یا اِن کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا''، آپ تو صرف اللہ کے عذاب سے ڈرانے والے ہیں اور اللہ ہر چیز کے نگہبان ہیں O'' (ہود: ۱۲)

لفظ ''لَعَلَّ'' پر ایک اعتراض کا جواب

''فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا یُوْحٰۤى اِلَیْكَ'': ''لَعَلَّكَ'' کے لفظ کی بناء شک کے لیے ہے، اور اللہ تعالیٰ کے لیے تو شک کرنا محال ہے، پھر اس لفظ کو یہاں لانے کا کیا فائدہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ محاوراتِ عرب میں لعلّ کا لفظ زجر و توبیخ کے لیے آتا ہے، جیسے کوئی شخص اپنے بیٹے سے کہے کہ شاید کہ تو میرے حکم پر عمل کرنے میں تقصیر کرے گا، اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ تم میرے حکم کی تعمیل میں تقصیر نہ کرو اور یہ اپنے حکم کی تاکید کیلئے بولا جاتا ہے۔ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کی طرف جو وحی فرمائی جاتی ہے شاید آپ اس کا کوئی

حصہ ترک کردیں گے اور اُن آیتوں کی کفار کو تبلیغ نہیں کریں گے، اس کی وجہ یہ ہے کہ کفار مکہ یہ کہتے تھے آپ اس قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن لے آئیں جس میں ہمارے خداؤں کو برا نہ کہا گیا ہو، تو اس لئے تاکیداً فرمایا کہ آپ ان کے طعنوں کی وجہ سے قرآن مجید کی اُن آیتوں کی تبلیغ کو ترک نہ کریں جس میں ان کے خداؤں کی مذمت کی گئی ہے۔

"وَضَآىٕقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ یَّقُوْلُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ": اور شاید آپ کا سینہ اس وجہ سے تنگ ہوگا کہ یہ کفار کہیں گے کہ اگر یہ سچے نبی ہیں تو ان کے اوپر کوئی خزانہ کیوں نہ نازل کیا گیا، یا ان کے ساتھ ایسا فرشتہ کیوں نہیں آیا جو ان کی نبوت کی تصدیق کرتا۔ یہ عبداللہ بن امیہ المخزومی نے کہا تھا۔

روایت ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ مکہ کے سردار یہ کہتے تھے: اے محمد! (صلی اللہ علیک وسلم) اگر آپ واقعی رسول ہیں تو ہمارے لیے مکہ کے پہاڑوں کو سونا بنا دیں، اور دوسرے سردار یہ کہتے تھے کہ ہمارے پاس اُن فرشتوں کو لائیں جو آپ کے نبی ہونے کی شہادت دیں، تو آپ نے فرمایا: میں اس پر قادر نہیں ہوں، تب یہ آیت نازل ہوئی۔

"اِنَّمَاۤ اَنْتَ نَذِیْرٌؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ": وکیل سے مراد ہے: جو ان کفار کے اعمال کی حفاظت کرے اور ان اعمال پر ان کو جزا دے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "یا وہ کافر کہیں گے: "قرآن ان کا خود سے بنایا ہوا ہے"، آپ کہیے: "اگر تم سچے ہو تو اس قرآن کی مثل دس سورتیں خود سے بنا کر لے آؤ اور اللہ کے سوا جن کو بھی تم اپنی مدد کے لیے بلا سکتے ہو بلا لو"○ (ھود:۱۳)

جن دس سورتوں کی مثل بنا کر لانے کا کفار کو چیلنج کیا گیا

"اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَیٰتٍ":

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جن دس سورتوں کے ساتھ کفار کو چیلنج کیا گیا تھا وہ دس سورتیں یہ ہیں:

(۱) سورۃ البقرہ (۲) سورۃ آل عمران (۳) سورۃ النساء (۴) سورۃ المائدہ (۵) سورۃ الانعام (۶) سورۃ الاعراف (۷) سورۃ الانفال (۸) سورۃ التوبہ (۹) سورۃ یونس (۱۰) اور سورۃ ھود۔ اور اس آیت میں جو فرمایا ہے کہ اگر یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ نہیں ہے بلکہ خود سے بنالیا گیا ہے تو تم ان دس سورتوں کی مثال بنا کر لے آؤ لیکن اَولیٰ یہ ہے کہ اس سے مراد مطلقاً دس سورتیں ہیں۔

قرآن مجید کے معجز ہونے کی وجوہ

ایک قول یہ ہے کہ قرآن مجید کے معجز ہونے کا سبب اس کی فصاحت ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ قرآن مجید کے معجز ہونے کا سبب اس کا اُسلوب ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ قرآن مجید کے معجز ہونے کا سبب قرآن مجید کی آیات میں تناقض اور تخالف کا نہ ہونا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَؕ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا○ (النساء:۸۲)" (پس کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے! اور اگر یہ قرآن اللہ کے غیر کی طرف سے نازل ہوتا تو لوگ اس میں ضرور بہت

اختلاف پاتے O۔ اور چوتھا قول یہ ہے کہ قرآن مجید غیب کی خبروں پر مشتمل ہے۔ اور پانچواں قول یہ ہے کہ قرآن مجید کی دی ہوئی پیشگوئیوں کا صادق اور برحق ہونا ہے۔

"وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ": یعنی اگر یہ قرآن مجید کسی انسان کا خود بنایا ہوا ہوتا تو ہر انسان اس کی مثل بنا سکتا لیکن وہ اس کی مثل بنانے پر قادر نہیں ہوئے، حالانکہ قرآن مجید کے مخالفین بہت زیادہ ہیں اور علوم اور فنون کے ہر شعبہ میں ترقی ہو چکی ہے، تو اگر کسی انسان کے بس میں قرآن مجید کی کسی سورت کی مثل بنانا ممکن ہوتا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے ضرور اس کی مثل لے آتا۔ اور جب اتنا طویل عرصہ گزرنے کے باوجود کوئی قرآن مجید ایسا کلام نہیں بنا سکتا جو فصاحت اور بلاغت میں بے نظیر ہو جس میں غیب کی خبریں ہوں اور جس میں کی ہوئی سب پیش گوئیاں پوری ہو چکی ہوں، تو معلوم ہوا کہ اس قرآن کی کسی سورت کی بھی مثل کوئی نہیں بنا سکتا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پھر اگر وہ آپ کا چیلنج قبول نہ کر سکیں تو اے مسلمانو! یاد رکھو کہ قرآن اللہ ہی کے علم سے نازل فرمایا گیا ہے اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، تو اے کافرو! کیا اب تم اسلام قبول کرلو گے؟O (ہود: ۱۴)

"فَاِلَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ": یعنی اے اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اگر ہم یہ کہیں کہ اس آیت میں مومنین سے خطاب ہے، تو اب اس آیت کا معنی یہ ہے کہ تم اس علم پر قائم رہو جو تمہارا قرآن مجید کے متعلق یقین ہے تاکہ تمہارا یقین زیادہ ہو اور اس پر تم ثابت قدم رہو کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہاں پر یہ مقدر ہے کہ اے مسلمانو! کفار سے کہو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم سے اس قرآن مجید کو نازل فرمایا ہے۔

اور اگر اس آیت میں کفار سے خطاب ہے تو اب اس آیت کا معنی یہ ہے: تم اللہ کو چھوڑ کر جن بتوں کی عبادت کرتے ہو، اگر وہ قرآن مجید سے معارضہ کرنے میں تمہاری مدد نہ کریں، تو اے کفار! یاد رکھو کہ اس قرآن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے علم سے نازل فرمایا ہے، اب بتاؤ کہ تم اسلام قبول کرتے ہو اور یہ مانتے ہو کہ اللہ عزوجل کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، سو تم جان لو کہ بے شک اللہ عزوجل کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے۔ "فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ": یہ بہ ظاہر استفہام ہے اور معناً امر ہے، یعنی سو اب تم اسلام قبول کرلو۔ گویا کہ یوں فرمایا گیا ہے کہ جب کفار کا قرآن مجید کی مثل لانے سے عجز ثابت ہو گیا تو یہ ثابت ہو گیا کہ قرآن مجید برحق ہے اور یہ ثابت ہو گیا کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا رسالت کا دعویٰ کرنا برحق ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت چاہتے ہیں، ہم دنیا میں اُن کے اعمال کا پورا پورا صلہ عطا فرمائیں گے اور اُن کو اس صلہ میں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا جائے گاO" (ہود: ۱۵)

ہود: ۱۵ کے دو محمل

"مَنْ كَانَ یُرِیْدُ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَزِیْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَیْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِیْهَا وَهُمْ فِیْهَا لَا یُبْخَسُوْنَ": ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت کافروں کے ساتھ مخصوص ہے، یعنی وہ کفار جن کے لیے آخرت میں دوزخ کی آگ کے سوا کچھ نہیں ہے اور انہوں نے دنیا میں جو

اپنے زعم میں نیک کام کیے تھے وہ سب باطل ہو گئے۔اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت کفار کے متعلق نہیں ہے،اس میں بالعموم فرمایا ہے کہ جو دنیا کی زندگی اور فقط اس کی زیب و زینت کو چاہتا ہے تو ہم دنیا کی زندگی میں اُن کے کیے ہوئے کاموں کا پورا پورا صلہ عطا فرمائیں گے اور اُس صلہ میں کوئی کمی نہیں فرمائی جائے گی۔اور جو اُخروی سعادت کو طلب کرتا ہے تو اس کو آخرت میں اجر عطا فرمایا جائے گا۔

دنیاوی زندگی اور اس کی لذتوں کو اختیار کرنے والوں کے متعلق متعدد محامل

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس آیت سے مراد ہے: جو لوگ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے کا انکار کرتے تھے، سو وہ آخرت کا بھی انکار کرتے تھے اور دنیا کی لذتوں میں رغبت کرتے تھے۔اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد منافقین ہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد کے لیے جانے میں مالِ غنیمت کی تمنا کرتے تھے اور آخرت پر اُن کا ایمان نہیں تھا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ اس آیت سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔

محمد بن کعب القرظی نے بیان کیا کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جو نیکوکار نیک عمل کرتا ہے تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر دنیا میں بھی ہے اور آخرت میں بھی ہے۔(تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۲۰۱۲، تفسیر عبدالرزاق ج ۱ ص ۳۰۲)

مجاہد نے اس آیت کی تفسیر میں کہا: اس آیت سے مراد وہ لوگ ہیں جو ریاکاری کے لیے عبادت کرتے ہیں۔

(کتاب الزہد لابن المبارک: ۶۰)

ریاکاروں کے متعلق دوزخ کی وعید

سلیمان بن یسار کہتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس لوگوں کا ہجوم تھا، جب لوگ ان سے چھٹ گئے تو اہل شام میں سے ناتل نامی ایک شخص نے کہا: اے شیخ! آپ مجھے وہ حدیث سنائیے جو آپ نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہو۔آپ نے فرمایا: ہاں میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ سنا ہے: قیامت کے دن سب سے پہلے جس شخص کے متعلق فیصلہ فرمایا جائے گا وہ شہید ہوگا، اس کو بلایا جائے گا اور اسے اس کی نعمتیں دکھائی جائیں گی، جب وہ ان نعمتوں کو پہچان لے گا تو (اللہ تعالیٰ) فرمائیں گے: تو نے ان نعمتوں سے کیا کام لیا؟ وہ کہے گا: میں نے آپ کی راہ میں جہاد کیا حتیٰ کہ شہید ہو گیا۔اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تو جھوٹ بولتا ہے، بلکہ تو نے اس لیے قتال کیا تھا تاکہ تو بہادر کہلائے، سو تجھے بہادر کہا گیا، پھر اس کو منہ کے بل جہنم میں ڈالنے کا حکم فرمایا جائے گا حتیٰ کہ اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔اور ایک شخص نے علم حاصل کیا اور لوگوں کو تعلیم دی اور قرآن مجید پڑھا، اس کو بلایا جائے گا اور اس کو اس کی نعمتیں دکھائی جائیں گی، جب وہ ان نعمتوں کو پہچان لے گا تو (اللہ تعالیٰ) اس سے فرمائیں گے: تو نے ان نعمتوں سے کیا کام لیا؟ وہ کہے گا: میں نے علم حاصل کیا اور اس علم کو سکھایا اور آپ کے لیے قرآن مجید پڑھا۔اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تو جھوٹ بولتا ہے، تو نے اس لیے علم حاصل کیا تھا تاکہ تو عالم کہلائے اور تو نے قرآن پڑھا تاکہ تو قاری کہلائے، سو تجھے (عالم اور قاری) کہا گیا، پھر اس کو منہ کے بل جہنم میں ڈالنے کا حکم فرمایا جائے گا حتیٰ کہ اس کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔اور ایک شخص پر اللہ تعالیٰ نے وسعت کی اور اس کو ہر قسم کا مال عطا فرمایا، اس کو قیامت کے دن بلایا جائے گا اور وہ نعمتیں دکھائی جائیں گی اور جب وہ ان نعمتوں کو پہچان لے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تو نے ان نعمتوں سے کیا کام لیا؟ وہ کہے گا: میں نے ہر اس راستہ میں خرچ کیا جس

راستہ میں مال خرچ کرنا آپ کو پسند ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تو جھوٹ بولتا ہے، تو نے یہ کام اس لیے کیے تاکہ تجھ کو سخی کہا جائے، سو تجھ کو سخی کہا گیا۔ پھر اس کو منہ کے بل جہنم میں ڈالنے کا حکم فرمایا جائے گا، اور پھر اس کو آگ میں ڈال دیا جائے گا۔

(صحیح مسلم: ۱۹۰۵، سنن ترمذی: ۲۳۸۲، سنن نسائی: ۳۱۳۷، صحیح ابن حبان: ۴۰۸، شرح السنہ: ۴۱۴۳، مسند احمد ج ۲ ص ۳۲۱، رقم الحدیث: ۸۲۷۷، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۹ ص ۱۶۸، کتاب الزہد لابن المبارک: ۴۶۹، خلق افعال العباد للبخاری: ۲۵۳، صحیح ابن خزیمہ: ۲۴۸۲، المستدرک للحاکم ج ۱ ص ۴۱۸، حلیۃ الاولیاء لابی نعیم ج ۵ ص ۶۹، السنن الکبریٰ للنسائی ج ۱۰ ص ۱۱۱)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”یہی وہ کفار ہیں جن کے لیے آخرت میں دوزخ کی آگ کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور انہوں نے دنیا میں (بزعم خویش) جو نیک کام کیے تھے وہ ضائع ہو گئے اور دنیا میں وہ جو کام بھی کرتے تھے وہ سب بے سود رہے O“ (ھود:۱۶)

”أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ“:

چونکہ ریا کرنے والے لوگ اخلاص سے اللہ عزوجل کی عبادت نہیں کرتے تھے اور دوسروں کو دکھانے کے لیے عبادت کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو باطل فرما دیں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”اور جو لوگ اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل پر قائم ہوں اور اس کے علاوہ ایک (آسمانی) گواہ (یعنی قرآن مجید) بھی اُن کے ساتھ ہو اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب (تورات) بہ طور امام اور اللہ کی طرف سے رحمت آ چکی ہو، یہی لوگ قرآن پر ایمان لاتے ہیں، اور جو فرقے اس قرآن کا انکار کرتے ہیں تو اُن کے لیے دوزخ کی آگ کی وعید ہے، سو (اے رسولِ اکرم!) آپ اس قرآن کریم کے متعلق کسی شک میں مبتلا نہ ہوں، یہ آپ کے رب کی طرف ﷺ سے برحق ہے، لیکن اکثر لوگ اس پر ایمان نہیں لائیں گے O“ (ھود:۱۷)

”اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ“:

”اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ“ اس سے مراد سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

”وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ“: محمد بن الحنفیہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے والد (سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ) سے پوچھا: اے میرے ابا جان! اس آیت میں جو فرمایا ہے کہ ”ایک شاہد بھی اس کے ساتھ ہو“ تو کیا آپ وہ شاہد ہیں؟ تو انہوں نے کہا: نہیں اللہ کی قسم! اے میرے بیٹے! میری تمنا تھی کہ میں ہی وہ شاہد ہوتا۔ لیکن اس سے مراد اس کی زبان ہے۔

اور حسن بصری نے اس کی تفسیر میں کہا: اس سے مراد اس کی زبان ہے۔

قتادہ اس آیت کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ وہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو اپنے رب کی طرف سے گواہی پر تھے۔ اور دوسروں نے کہا: ”وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ“ سے مراد سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

(تفسیر عبد الرزاق ج ۱ ص ۳۰۳، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۱ ص ۵۰۲، تفسیر ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۲۰۱۵، سنن سعید بن منصور: ۱۰۸۳، تفسیر الشوریٰ ص ۴۹)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: "اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ" اس سے مراد سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور "وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ" اس سے مراد حضرت جبریل علیہ السلام ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر شاہد تھے کہ یہ وہ کتاب ہے جو سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ" سے مراد وہ فرشتے ہیں جو حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ تھے۔

"وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤى اِمَامًا وَّرَحْمَةً": گویا کہ فرمایا گیا: اور اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب تھی جو بنی اسرائیل کے لیے امام تھی اور وہ اس کی اتباع کرتے تھے۔

"اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ": یعنی جن لوگوں کا ذکر فرمایا گیا ہے وہ اس کی تصدیق کرتے ہیں اور اقرار کرتے ہیں۔ خواہ مشرکین یہ کہتے ہیں کہ (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کلام کو اپنی طرف سے بنا لیا ہے۔

"وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ": اور جو لوگ اس قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا انکار کرتے ہیں، پس ان لوگوں کے لیے دوزخ کی آگ کی وعید ہے۔ یعنی قرآن مجید کی تکذیب کی وجہ سے انہیں جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔

"فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ": یعنی آپ اس میں شک نہ کریں کہ یہ قرآن اللہ عزوجل کی طرف سے منزل ہے، اور جن لوگوں نے اس کے منزل من اللہ ہونے کا انکار کیا، ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

"اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ": یہ آپ کے رب کی طرف سے برحق کتاب ہے، لیکن اکثر لوگ اس پر ایمان نہیں لائیں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اس سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹا افتراء باندھے! یہ ظالمین اپنے رب کے سامنے پیش کیے جائیں گے اور گواہ (یعنی فرشتے) کہیں گے: یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹا افتراء کیا تھا، سنو! ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے O" (ہود: ۱۸)

"وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ؕ اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ": اس آیت کو بہ طور مبالغہ ذکر فرمایا ہے کہ جو لوگ اللہ پر افتراء باندھتے ہیں، وہ سب سے بڑا ظلم ہے۔

"وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰۤؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ": الاشهاد، شاهد کی جمع ہے جیسے صاحب کی جمع اصحاب ہے، یا یہ شہید کی جمع ہے جیسے شریف کی جمع اشراف ہے۔

مجاہد نے کہا: "الْاَشْهَادُ" سے مراد بندوں کے اعمال کی حفاظت کرنے والے فرشتے ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد انبیاء علیہم السلام ہیں۔

مومن کے لیے خصوصی رحمت اور مغفرت

صفوان بن محرز بیان کرتے ہیں: جب حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما طواف کر رہے تھے تو ان کے پاس ایک مرد آیا، سو اس نے کہا: اے ابو عبد الرحمٰن! یا کہا: اے ابن عمر! کیا آپ نے النجویٰ (سرگوشی) کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سنا ہے؟ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما

نے کہا: میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ مومن کو اس کے رب کے قریب کیا جائے گا، اور ہشام نے کہا: مومن قریب ہوگا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس پر اپنی رحمت کا پر رکھ دیں گے، پھر اس سے اس کے گناہوں کا اقرار کرائیں گے: تم فلاں گناہ کو پہچانتے ہو؟ وہ کہے گا: اے میرے رب! میں پہچانتا ہوں اور وہ دو مرتبہ کہے گا: میں پہچانتا ہوں، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میں نے دنیا میں تمہارا پردہ رکھا تھا اور آج میں تم کو بخش دیتا ہوں، پھر اس کی نیکیوں کا صحیفہ لپیٹ دیا جائے گا۔ رہے دوسرے لوگ یا کفار تو ان کو گواہوں کے سامنے پکارا جائے گا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ باندھا تھا۔ سنو! اللہ کی لعنت ہے ظالموں پر (ہود:۱۸)۔

(صحیح مسلم: ۲۴۴۱، ۴۶۸۵، ۶۰۷۰، ۷۵۱۴، صحیح مسلم: ۲۷۶۸، سنن ابن ماجہ: ۱۸۳، مسند احمد: ۵۴۳۶)

(موسوعۃ المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی الشریف ج ۱۵ ص ۳۸۳، دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۳۳ھ)

علامہ بدر الدین ابو محمد محمود بن احمد العینی الحنفی المتوفی ۸۵۵ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

اس حدیث میں مذکور ہے "فی النجوی" نجویٰ کے معنی ہیں: سرگوشی، یعنی وہ چپکے چپکے باتیں جو اللہ عزوجل اور اس کے مومن بندہ کے درمیان قیامت کے دن ہوں گی۔

اس حدیث میں مذکور ہے "یدنوا" یہ لفظ الدنو سے ماخوذ ہے، اس کا معنی ہے: مرتبہ کے اعتبار سے قریب ہونا نہ کہ مکان کے اعتبار سے قریب ہونا۔ اس حدیث میں مذکور ہے "کنفہ" یہ ساتر ہے، یعنی وہ چھپانے والا، یعنی اللہ تعالیٰ اپنی توجہ سے بندہ کو اپنی رحمت کے پروں میں چھپالیں گے۔

اس حدیث میں مذکور ہے "عملت کذا و کذا" یعنی تو نے اس طرح اور اس طرح کام کیا، اور اللہ تعالیٰ بندہ سے اقرار کرائیں گے، یہ حدیث متشابہات میں سے ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اس کے معنی کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا جائے، یا اس کی ایسی تاویل کی جائے جو مقام کے مناسب ہو۔ (عمدۃ القاری ج ۲۲ ص ۲۱۸۔۲۱۹، دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۲۱ھ)

علامہ شہاب الدین ابو العباس احمد القسطلانی المتوفی ۹۱۱ھ، اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

اس حدیث میں مذکور ہے "یدنو احدکم من ربہ" یعنی اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندہ کو اپنی رحمت کے قریب فرمالیں گے۔

اس حدیث میں مذکور ہے "حتی یضع اللہ تعالیٰ کنفہ علیہ" یعنی اللہ تعالیٰ اس مومن بندہ کو تمام اہل محشر سے چھپائیں گے اور اس بندہ کو اس کی نافرمانیاں اور اس کے گناہ پوشیدہ طریقہ پر یاد دلائیں گے، پھر بندہ سے اقرار کرائیں گے تاکہ بندہ کو معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر پردہ رکھ کر کتنا عظیم احسان فرمایا، دنیا میں اس کے گناہوں پر پردہ رکھا اور آخرت میں اسے معاف فرمادیا۔

(ارشاد الساری ج ۱۵ ص ۵۵۷، دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۲۱ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور جو کفار اللہ کے راستہ سے لوگوں کو روکتے ہیں اور اس میں کجی تلاش کرتے ہیں اور وہی آخرت کا بھی انکار کرتے ہیں O" (ہود:۱۹)

"اَلَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا": یعنی جو لوگ اللہ تعالیٰ کے دین کے راستہ سے لوگوں کو روکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے دین میں کجی کو تلاش کرتے ہیں، یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جانوں پر کفر کا التزام کیا۔

"وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ": الزجاج نے کہا: اس آیت میں لفظ "هُمْ" کو مکرر ذکر فرمایا ہے اور یہ ان کے کفر کی تاکید ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''یہ لوگ زمین میں کسی جگہ بھاگ کر اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہیں اور نہ اللہ کے سوا ان کے کوئی مددگار ہیں، ان کو دگنا عذاب دیا جائے گا، کیونکہ یہ لوگ غلبۂ کفر کی وجہ سے آپ کا پیغام نہیں سنتے تھے اور نہ حقیقت میں آپ کو دیکھتے تھے O'' (ہود:۲۰)

''اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ'': یعنی اُن کے لیے ہمارے عذاب سے بھاگنا ممکن نہیں ہے، کیونکہ کسی بندے کا اللہ عزوجل کے عذاب سے بھاگنا محال ہے، کیونکہ اللہ عزوجل تمام ممکنات پر قادر ہیں۔

''وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ'': یعنی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچانے کے لیے ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔

''يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ'': یعنی اُن کے عذاب میں اضافہ فرمایا جائے گا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اُن کا عذاب اس لیے دگنا فرمایا جائے گا کیونکہ وہ دوسروں کو گمراہ کرتے تھے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اُن کے عذاب کو اس لیے دگنا فرمایا جائے گا کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے اور حشر اور نشر کا انکار کرتے تھے۔

''مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ'': یعنی اگرچہ اُن کے کان بھی تھے اور اُن کی آنکھیں بھی تھیں لیکن چونکہ وہ اپنے کانوں اور اپنی آنکھوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے تھے، اس لیے فرمایا گویا کہ اُن کے کان اور اُن کی آنکھیں نہیں ہیں۔ یا تو یہ مراد ہے کہ وہ دنیا میں اپنے کانوں سے حق بات کو سننے کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور حق کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے، یا اس سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں طاقت نہیں رکھتے تھے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ''وَيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝'' (القلم:۴۲) (اور نافرمانوں کو سجدے کے لیے بلایا جائے گا تو وہ سجدہ نہیں کر سکیں گے O)۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''یہی وہ ظالمین ہیں جنہوں نے اپنی جانوں کو نقصان میں مبتلا کیا اور یہ ظالمین دنیا میں اللہ پر جو افتراء کرتے تھے وہ آخرت میں اِن سے غائب ہو جائے گا O یقیناً یہی لوگ آخرت میں سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے ہیں O'' (ہود:۲۱۔۲۲)

''اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ'': اُن کافروں کا یہ زعم تھا کہ فرشتے اور بت اُن کی شفاعت کریں گے، اور قیامت کے دن اُن کی کوئی بھی شفاعت نہیں کرے گا، اور وہ جو اللہ عزوجل پر افتراء باندھتے تھے وہ اُن سے گم ہو جائے گا۔ ''لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ'': یقیناً یہی لوگ آخرت میں سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کئے اور اپنے رب کے سامنے عجز کا اظہار کیا، یہی لوگ جنت والے ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں O'' (ہود:۲۳)

''اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ'':

الاخبات کا معنی ہے الاطمینان، التذلل، التواضع، الخضوع اور الاخبات ''الخبت'' سے ماخوذ ہے۔ اس کا معنی ہے: زمین میں گڑھا۔ کہا جاتا ہے ''اخبت الرجل'' یعنی کوئی شخص گڑھے میں داخل ہو گیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کا معنی ہے: جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں، اور ایک قول یہ ہے کہ جو اللہ کے سامنے خشوع کرتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "(مومنین اور کفار) اِن دو گروہوں کی مثال اندھے اور بہرے اور دیکھنے والے اور سننے والے کی طرح ہے، کیا یہ دونوں گروہ برابر ہوسکتے ہیں؟ اے مشرکو! پس تم نصیحت کو کیوں قبول نہیں کرتےO" (ھود: ۲۴)

"مَثَلُ الْفَرِیْقَیْنِ كَالْاَعْمٰى وَ الْاَصَمِّ وَ الْبَصِیْرِ وَ السَّمِیْعِ ؕ هَلْ یَسْتَوِیٰنِ مَثَلًا": اس میں دو چیزوں کو دو چیزوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے، پس اندھے کا تقابل بصیر (دیکھنے والے) کے ساتھ ہے اور بہرے کا سننے والے کے ساتھ ہے۔ زمخشری نے اس کی تفسیر میں کہا ہے: کافروں کو اندھے اور بہرے کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور مومنین کو دیکھنے والے اور سننے والے کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ اس کے بعد فرمایا: "اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ" یعنی اس اندھے پن اور بہرے پن کا علاج ممکن ہے، تو سمجھ دار شخص پر واجب ہے کہ وہ اس علاج میں کوشش کرے۔ (اللباب فی علوم الکتاب ج ۱۰ ص ۴۶۳۔۴۶۵، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۱۱ء)

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ ٘ اِنِّیْ لَكُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌۙ﴿۲۵﴾

اور بے شک ہم نے نوح کو اُن کی قوم کی طرف (رسول بنا کر) مبعوث فرمایا، (انہوں نے اپنی قوم سے کہا:) "بے شک میں تمہیں اللہ کے عذاب سے کھلا کھلا ڈرانے والا ہوںO

اَنْ لَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ اَلِیْمٍ﴿۲۶﴾

کہ تم اللہ کو چھوڑ کر کسی کی عبادت نہ کرو، بے شک میں تم پر دردناک عذاب کے دن سے ڈرتا ہوں"O

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ ۚ وَ مَا نَرٰى لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِیْنَ﴿۲۷﴾

اُن کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا: "ہم تمہیں صرف اپنے جیسا بشر ہی سمجھتے ہیں، اور ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ تمہاری پیروی صرف ہم میں سے پسماندہ لوگ بغیر غور و فکر کے کر رہے ہیں اور نہ ہم تم میں اپنے اوپر کسی طرح کی برتری دیکھتے ہیں، بلکہ ہم تم کو (اور تمہارے ساتھ ایمان لانے والوں کو) جھوٹا گمان کرتے ہیں"O

قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ اٰتٰىنِیْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّیَتْ عَلَیْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ﴿۲۸﴾

نوح نے کہا: "اے میری قوم! یہ بتاؤ اگر میں اپنے رب کی طرف سے کسی روشن دلیل پر قائم ہوں اور مجھے میرے رب نے اپنے پاس سے رحمت (رسالت) عطا فرمائی ہو جو تم سے مخفی رکھی گئی ہے، کیا ہم تم کو اس (رسالت) کے ماننے پر مجبور کر سکتے ہیں جب کہ تم اس کو ناپسند کر رہے ہو" O

وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝۲۹

"اور اے میری قوم! میں تم سے اس تبلیغ رسالت پر کوئی مال نہیں طلب کر رہا، میرا اجر تو صرف اللہ عزوجل (کے ذمۂ کرم) پر ہے، اور میں اُن پسماندہ لوگوں کو خود سے دور کرنے والا نہیں ہوں جو مجھ پر ایمان لا چکے ہیں، بے شک وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں لیکن میری رائے یہ ہے کہ تم بہت جاہل لوگ ہو" O

وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳۰

"اور اے میری قوم! (اگر میں نے تمہاری خواہش پر) ان پسماندہ ایمان والوں کو خود سے دور کر دیا تو اللہ کے مقابلہ میں میری کون مدد کرے گا، تم سمجھتے کیوں نہیں؟" O

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْۤ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ ۚۖ اِنِّيْۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۳۱

اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میرے ہی پاس اللہ کے سارے خزانے ہیں، اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں از خود غیب جانتا ہوں اور نہ ہی یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، اور جو لوگ تمہاری نگاہوں میں حقیر ہیں نہ اُن کے متعلق میں یہ کہتا ہوں کہ اللہ اُن کو کبھی بھی خیر نہیں عطا فرمائیں گے، اور جو کچھ اُن پسماندہ ایمان والوں کے دلوں میں ہے اسے اللہ ہی سب سے زیادہ جانتے ہیں، (اور بالفرض اگر میں نے ایسا کہا) تو میرا شمار ضرور حد سے بڑھنے والوں میں سے ہوگا O

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۳۲

کافروں نے کہا: "اے نوح! بے شک تم نے ہمارے ساتھ بحث کی ہے، پھر تم نے اس بحث میں ہم سے بہت جھگڑا کیا ہے، پس اگر تم سچوں میں سے ہو تو ہم پر وہ عذاب لے آؤ جس سے تم ہمیں دھمکاتے تھے" O

قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝۳۳

نوح نے کہا: "اگر اللہ نے چاہا تو وہی تم پر اس عذاب کو نازل فرمائیں گے اور تم اس عذاب کو روکنے والے نہیں ہو" O

وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْۤ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ؕ هُوَ رَبُّكُمْ ۫ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ؕ﴿۳۴﴾

''اور اگر میں تمہاری خیر خواہی کا ارادہ کرلوں تب بھی میری خیر خواہی تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی، جب اللہ ہی تمہیں گمراہی پر برقرار رکھنا چاہیں، وہی تمہارے رب ہیں اور تم ان ہی کی طرف لوٹائے جاؤ گے''O

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ۠﴿۳۵﴾

یا کفار یہ کہتے ہیں: ''اس رسول نے ازخود قرآن بنالیا ہے'' (اے رسول اکرم!) آپ کہیے: ''اگر میں نے ازخود قرآن بنایا ہے تو اس کا ضرر صرف مجھ پر ہوگا اور تم جو اللہ عزوجل کی حکم عدولی کرتے رہے ہو، میں اس سے بےزار ہوں''O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور بے شک ہم نے نوح کو اُن کی قوم کی طرف (رسول بنا کر) مبعوث فرمایا، (انہوں نے اپنی قوم سے کہا:) ''بے شک میں تمہیں اللہ کے عذاب سے کھلا کھلا ڈرانے والا ہوں O کہ تم اللہ کو چھوڑ کر کسی کی عبادت نہ کرو، بے شک میں تم پر دردناک عذاب کے دن سے ڈرتا ہوں''O (ہود:۲۵۔۲۶)

حضرت نوح علیہ السلام کا اپنی قوم کو تبلیغ فرمانا

علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ، ہود:۲۵ تا ۳۵ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ ؗ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ '':

اللہ سبحانہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر انبیاء سابقین کے قصے نازل فرمائے تا کہ آپ کفار کی ایذا اور سازشوں پر صبر کرتے رہیں حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اُن کو اُن کے کرتوتوں کی سزا دیں۔

''اَنْ لَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ '':

یعنی تم اپنے خود ساختہ بتوں کی عبادت کو ترک کردو اور صرف اللہ وحدہٗ کی عبادت کرو۔ بے شک میں تم پر دردناک عذاب کے دن سے ڈرتا ہوں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اُن کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا: ''ہم تمہیں صرف اپنے جیسا بشر ہی سمجھتے ہیں، اور ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ تمہاری پیروی صرف ہم میں سے پسماندہ لوگ بغیر غور وفکر کے کر رہے ہیں اور نہ ہم تم میں اپنے اوپر کسی طرح کی برتری دیکھتے ہیں، بلکہ ہم تم کو (اور تمہارے ساتھ ایمان لانے والوں کو) جھوٹا گمان کرتے ہیں''O (ہود:۲۷)

''فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ '': ابواسحاق الزجاج نے کہا: ''اَلْمَلَاُ'' سے کفار کے سردار مراد ہیں۔

''مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا '': یعنی ہماری رائے میں تم صرف ہمارے جیسے ہی آدمی ہو۔

کسی شخص کے پیشے کی وجہ سے اس کو غیر معزز قرار دینے کی مذمت

"وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا": اس آیت میں آراذِل کا ذکر ہے اور یہ رذیل کی جمع ہے جیسے اساود، اسود کی جمع ہے یعنی سیاہ رنگ کا سانپ۔ اُن کافر سرداروں کی مراد یہ تھی کہ جو لوگ ہمارے طبقہ میں پسماندہ ہیں، وہ تمہاری پیروی کرتے ہیں۔ الزجاج نے کہا: وہ جولاہوں کے متعلق ایسا کہتے تھے اور وہ یہ نہیں سمجھے کہ کسی شخص کی عزت اور وجاہت پر اس کے پیشے اثر انداز نہیں ہوتے۔ (میں کہتا ہوں: جیسا کہ امام احمد ابوبکر الخصاف المتوفی ۲۶۱ھ جوتیوں کی مرمت کرتے تھے، حالانکہ وہ بہت بڑے فقیہ اور محدث تھے اور اُن کی مشہور زمانہ کتاب "ادب القاضی" ہے، علامہ ابوالحسن احمد بن محمد القدوری المتوفی ۴۲۸ھ بہت بڑے فقیہ ہیں اور اُن کی کتاب "المختصر القدوری" تمام مدارسِ اسلامیہ میں پڑھائی جاتی ہے، اور وہ مٹی کے برتن بناتے تھے جن کو کمہار کہا جاتا ہے، اور جیسے علامہ ابوبکر بن علی بن محمد الحداد الحنفی الزبیدی الیمنی المتوفی ۸۰۰ھ بہت بڑے مفسر تھے، ان کی "تفسیر الحداد" بہت مشہور ہے حالانکہ وہ لوہار تھے اور لوہے کا کام کرتے تھے اور جو انہیں باقی وقت ملتا تو وہ اس میں تفسیر لکھتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن پیشوں کو ہمارے عرف میں کم حیثیت قرار دیا جاتا ہے اور لوگ اُن کو بے وقعت سمجھتے ہیں ان پیشوں والے درحقیقت بہت بڑے عالم، فقیہ، محدث اور مفسر ہوتے تھے، اس لیے کسی شخص کو اس کے پیشے کی وجہ سے کم حیثیت نہیں سمجھنا چاہیے۔ سعیدی غفرلہ)

"آراذِل" کے معنی کی تحقیق

علامہ قرطبی نے کہا ہے اس آیت میں "آراذِل" سے مراد فقراء اور ضعفاء ہیں جس طرح ہرقل نے ابوسفیان سے کہا تھا: کیا معزز لوگ اس نبی کی پیروی کرتے ہیں یا ضعفاء؟ تو ابوسفیان نے جواب دیا: بلکہ ضعفاء اُن کی پیروی کرتے ہیں، ہرقل نے کہا: وہی رسولوں کے پیروکار ہوتے ہیں۔ الحدیث

(صحیح البخاری: ۷، صحیح مسلم: ۱۷۷۳، سنن ترمذی: ۲۷۱۷، سنن ابوداؤد: ۵۱۳۶، مسند احمد: ۲۳۶۶)

پسماندہ لوگوں کے متعلق علماء کی آراء

(۱) سفیان نے کہا: پسماندہ لوگ وہ ہیں جو کسی حاکم کے آنے پر لہو ولعب کے ساتھ اس کا استقبال کرتے ہیں، اور جو لوگ حاکموں اور بادشاہوں کے دربار پر حاضر ہوتے ہیں۔

(۲) ابن الاعرابی نے کہا: پسماندہ لوگ وہ ہیں جو اپنے دین کے بدلہ میں دنیا کا مال کھاتے ہیں۔

(۳) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ پسماندہ لوگ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا: وہ لوگ جب مجتمع ہوں تو غالب ہوں اور جب متفرق ہوں تو اُن کو نہ پہچانا جائے۔

(۴) امام مالک بن انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ نچلے طبقہ کے لوگ کون ہیں؟ کہا: جو صحابہ کی برائی کرتے ہیں۔

(۵) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: نچلے طبقہ کے لوگ جولاہے ہیں اور حجام ہیں اور رنگریز ہیں اور گند صاف کرنے والے ہیں۔

"بَادِیَ الرَّاْیِ": یعنی ایسی رائے جو ظاہر حال پر مبنی ہو اور حقیقت اس کے خلاف ہو۔ اور اس کا ایک معنی ہے: جو کسی کے

متعلق پکی رائے قائم کی جائے۔

"وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ": اس قول سے حضرت نوح علیہ السلام کی نبوت کا اُن کی قوم نے انکار کیا ہے۔

"بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ": اس آیت سے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے حضرت نوح علیہ السلام اور اُن کے ساتھ ایمان لانے والوں کو جھوٹا کہا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "نوح نے کہا: "اے میری قوم! یہ بتاؤ اگر میں اپنے رب کی طرف سے کسی روشن دلیل پر قائم ہوں اور مجھے میرے رب نے اپنے پاس سے رحمت (رسالت) عطا فرمائی ہو جو تم سے مخفی رکھی گئی ہے، کیا ہم تم کو اس (رسالت) کے ماننے پر مجبور کر سکتے ہیں جب کہ تم اس کو ناپسند کر رہے ہو"O (ہود:۲۸)

حضرت نوح علیہ السلام کا اپنے منکرین اور مخالفین کا دلائل سے رد فرمانا

"قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ": حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: خواہ میرے رب نے میری رسالت پر معجزہ عطا فرمایا۔

"وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ": اور میرے رب نے مجھے اپنے پاس سے نبوت اور رسالت عطا فرمائی ہے۔

"فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ": پھر میری رسالت اور میری ہدایت تم پر مخفی رکھی گئی ہے۔

"اَنُلْزِمُكُمُوْهَا": ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد لا الٰہ الا اللہ کی شہادت ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ ضمیر رحمت کی طرف راجع ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ ضمیر البینۃ کی طرف راجع ہے، یعنی کیا ہم تم کو اس نبوت اور رسالت کے قبول کرنے پر مجبور کریں گے؟

"وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ": یعنی تمہارا ناپسندیدگی کے ساتھ میری نبوت اور رسالت کو قبول کرنا صحیح نہیں ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اے میری قوم! میں تم سے اس تبلیغ رسالت پر کوئی مال نہیں طلب کر رہا، میرا اجر تو صرف اللہ عزوجل (کے ذمۂ کرم) پر ہے، اور میں اُن پسماندہ لوگوں کو خود سے دور کرنے والا نہیں ہوں جو مجھ پر ایمان لاچکے ہیں، بے شک وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں لیکن میری رائے یہ ہے کہ تم بہت جاہل لوگ ہو"O (ہود:۲۹)

"وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ": یعنی میں اس تبلیغ رسالت پر اور تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے پر اور تمہارے ایمان لانے پر تم سے کسی مال کو طلب نہیں کرتا جس کو دینا تم پر دشوار ہو۔ اس تبلیغ رسالت پر میرا ثواب تو اللہ عزوجل کے ذمۂ کرم پر ہے۔

"وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ": یعنی اگر میں نے تمہارے کہنے سے اِن پسماندہ مومنین کو اپنے سے دور کر دیا تو وہ اللہ عزوجل کے سامنے مجھ سے جھگڑا کریں گے، سو اللہ تعالیٰ اُن کے ایمان لانے پر اُن کو جزا دیں گے اور انہیں دور کرنے والوں کو سزا دیں گے۔

”وَلٰكِنِّىْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ“ تمہاری جہالت یہ ہے کہ تم پسماندہ مومنوں کو ذلیل قرار دیتے ہو اور انہیں دھکارنے کا سوال کرتے ہو۔

اللہ عز وجل کا ارشاد ہے: ”اور اے میری قوم! (اگر میں نے تمہاری خواہش پر) ان پسماندہ ایمان والوں کو خود سے دور کر دیا تو اللہ کے مقابلہ میں میری کون مدد کرے گا تم سمجھتے کیوں نہیں؟“O (ہود: ۳۰)

”وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِىْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ“: یعنی اے میرے قوم! اگر میں نے تمہارے کہنے سے اُن کو خود سے دور کر دیا تو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے مجھے کون بچائے گا تم کیوں نہیں سمجھتے۔

اللہ عز وجل کا ارشاد ہے: ”اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میرے ہی پاس اللہ کے سارے خزانے ہیں، اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں از خود غیب جانتا ہوں اور نہ ہی یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، اور جو لوگ تمہاری نگاہوں میں حقیر ہیں نہ اُن کے متعلق میں یہ کہتا ہوں کہ اللہ اُن کو کبھی بھی خیر نہیں عطا فرمائیں گے، اور جو کچھ اُن پسماندہ ایمان والوں کے دلوں میں ہے اسے اللہ ہی سب سے زیادہ جانتے ہیں، (اور بالفرض اگر میں نے ایسا کہا) تو میرا شمار ضرور حد سے بڑھنے والوں میں سے ہوگا O“ (ہود: ۳۱)

حضرت نوح علیہ السلام سے علم غیب کی اور خزانوں کی نفی کے محامل

”وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِىْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ“: حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی تذلل اور تواضع کو اختیار کرتے ہوئے فرمایا: میں ایسا دعویٰ نہیں کرتا کہ میرے پاس اللہ عز وجل کے سارے خزانے ہیں، اور یہ خزانے تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہیں انعام فرماتے ہیں۔ اور نہ میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ میں از خود غیب کو جانتا ہوں، کیونکہ اللہ عز وجل کی تعلیم کے بغیر کوئی غیب کو نہیں جانتا۔

”وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّىْ مَلَكٌ“: اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ لوگوں کے سامنے میرا مرتبہ فرشتوں کے مرتبہ کی مثل ہے۔ علماء نے کہا ہے کہ اس کلام کا فائدہ یہ ہے کہ اس پر دلیل قائم ہو کہ ملائکہ انبیاء سے افضل ہیں، کیونکہ ملائکہ ہمیشہ عبادت کرتے ہیں اور اُن کی عبادت قیامت تک متصل رہے گی صلوات اللہ علیہم اجمعین۔

ہود: ۳۱ کی تفسیر میں دیگر مفسرین کی عبارات اور علامہ قرطبی مالکی کی تفسیر کا صحیح نہ ہونا

میں کہتا ہوں: علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

اس آیت میں یہ دلیل نہیں ہے کہ ملائکہ انبیاء علیہم السلام سے افضل ہیں۔ (روح المعانی جز ۱۲ ص ۶۳، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۷ھ)

علامہ ابو حفص عمر بن علی الدمشقی الحنبلی المتوفی ۸۸۰ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ایک قوم نے اس آیت سے اس پر استدلال کیا ہے کہ ملائکہ انبیاء سے افضل ہوتے ہیں، کیونکہ انسان جب یہ کہے کہ میں فلاں فلاں چیز کا دعویٰ نہیں کرتا تو اس کا یہ کہنا اس وقت صحیح ہوگا کہ جب وہ چیز اس کہنے والے سے افضل ہو۔ (اللباب فی علوم الکتاب ج ۱۰

ص ۴۷۵ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۱۱ء)

اہل سنت وجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام ملائکہ سے افضل ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی فرشتوں پر افضلیت کے دلائل

امام مسعود بن عمر بن عبداللہ الشہیر سعد الدین تفتازانی متوفی ۷۹۳ھ، لکھتے ہیں:

رہا رسل بشر کی فضیلت رسل ملائکہ پر اور عامۃ البشر کی فضیلت عامۃ الملائکہ پر تو وہ متعدد وجوہ سے ہے:

(۱) اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کو بہ طور تعظیم وتکریم کے سجدہ کریں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے اس قول کی حکایت فرمائی ہے: ''اَرَءَیْتَكَ هٰذَا الَّذِیْ كَرَّمْتَ عَلَیَّ ۔۔۔ (بنی اسرائیل: ۶۲)'' (مجھے یہ تو بتا کہ تو نے اس شخص کو مجھ پر برتری کیوں عطا کی؟) نیز شیطان نے کہا: ''قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ ۝ (الاعراف: ۱۲)'' (میں آدم سے بہتر ہوں، تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور تو نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا ہے ۝)۔

اور حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ادنیٰ کو اعلیٰ کی تعظیم کے لیے سجدہ کا حکم دیا جاتا ہے نہ کہ اس کے برعکس۔ (سو اس سے معلوم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام فرشتوں سے افضل تھے اسی لئے فرشتوں کو حضرت آدم علیہ السلام کی تعظیم کے لیے سجدہ کا حکم فرمایا)۔

(۲) اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ۔۔۔ (البقرہ: ۳۱)'' (اور اللہ نے آدم کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیے) اور اہل زبان میں سے ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس آیت سے حضرت آدم علیہ السلام کی فرشتوں پر فضیلت بیان کرنے کا قصد فرمایا ہے اور اس کا قصد فرمایا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں سے زیادہ علم تھا، اسی وجہ سے وہ فرشتوں کی تعظیم اور تکریم کے مستحق ہوئے۔

(۳) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ۝ (آل عمران: ۳۳)'' (بے شک اللہ نے آدم کو اور نوح کو اور آل ابراہیم کو اور آل عمران کو (ان کے زمانہ میں) تمام جہان والوں پر فضیلت عطا فرمائی)۔

اور ملائکہ بھی عالمین میں داخل ہیں، سو اس سے ثابت ہوا کہ انبیاء علیہم السلام جب تمام جہان والوں پر فضیلت رکھتے ہیں تو فرشتوں پر بھی فضیلت رکھتے ہیں۔ ہاں اس پر اجماع ہے کہ عامۃ البشر رسل ملائکہ سے افضل نہیں ہیں۔ لہٰذا رسل ملائکہ کے علاوہ باقی ملائکہ پر اور آل ابراہیم اور آل عمران کی فضیلت ثابت ہے۔ اور یہ مسئلہ ظنی ہے اور اس پر دلائل ظنیہ کافی ہیں۔

(۴) انسان کو فضائل اور کمالات علمیہ اور کمالات عملیہ حاصل ہوتے ہیں باوجود اس کے کہ اُن میں اُن کمالات کے حصول سے شہوت، غضب اور ضروریات طبعیہ کے موانع موجود ہوتے ہیں جو انسان کو کمالات کے حصول سے مشغول رکھتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بغیر ان موانع کے عبادت کرنا اور کمالات کو ان شواغل اور صوارف کے ساتھ حاصل کرنا زیادہ دشوار ہے اور زیادہ اخلاص میں داخل ہے، پس انسان فرشتوں سے افضل ہوں گے۔ (کیونکہ فرشتوں میں نہ بھوک پیاس ہوتی ہے نہ اُن میں شہوت ہوتی ہے نہ اُن میں غضب ہوتا ہے نہ اُن میں طبعی ضروریات ہوتی ہیں جس کی وجہ سے وہ دائما عبادت نہ کرسکیں، اور جب انسان ان سب موانع کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے تو وہ یقیناً فرشتوں سے افضل قرار پائے گا)، اس کے برخلاف معتزلہ کا مسلک یہ ہے کہ ملائکہ انبیاء علیہم السلام سے افضل ہوتے ہیں)۔ (شرح العقائد النسفیہ ص ۲۲۶۔ ملخصاً وموضحاً، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، علی تاجران کتب، دستگیر کالونی، کراچی ۳۸)

اس لیے میں کہتا ہوں کہ ہود: ۳۱ کی تفسیر میں علامہ قرطبی کا یہ لکھنا صحیح نہیں ہے کہ ''علماء نے کہا ہے کہ اس کلام کا فائدہ یہ ہے کہ اس

پر دلیل قائم ہو کہ ملائکہ انبیاء سے افضل ہیں، کیونکہ ملائکہ ہمیشہ عبادت کرتے ہیں اور اُن کی عبادت قیامت تک متصل رہے گی"۔

شیخ تھانوی کی تفسیر سے انبیاء علیہم السلام کے لیے بعض علوم غیبیہ کا ثبوت

شیخ اشرف علی تھانوی دیوبندی متوفی ۱۳۶۴ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

لیکن میں تو کسی امر عجیب کا دعویٰ نہیں کرتا چنانچہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے تمام خزانے ہیں اور نہ میں (یہ کہتا ہوں کہ میں) تمام غیب کی باتیں جانتا ہوں اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ (تفسیر بیان القرآن ج ۲ ص ۲۱۳، مکتبہ رحمانیہ لاہور)

شیخ تھانوی کی اس عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے پاس اللہ تعالیٰ کے تمام خزانے نہیں تھے، اس کا مفاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو زمین کے کچھ نہ کچھ خزانے عطا فرمائے تھے۔ نیز انہوں نے لکھا ہے کہ نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں تمام غیب کی باتیں جانتا ہوں"، اس کا مفاد یہ ہے کہ ہر چند کہ حضرت نوح علیہ السلام یہ نہیں کہتے تھے کہ میں غیب کی تمام باتیں جانتا ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کو بعض غیب کی باتوں کا علم عطا فرمایا تھا اور یہی اہل سنت و جماعت کا مسلک ہے کہ اللہ عزوجل نے انبیاء علیہم السلام کو تمام غیب کی باتوں کا علم نہیں عطا فرمایا بلکہ بعض غیوب سے اُن کو مطلع فرمایا ہے۔ (سعیدی غفرلہ)

"وَلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ": اور جو لوگ تمہاری نگاہوں میں حقیر ہیں نہ اُن کے متعلق میں یہ کہتا ہوں کہ اللہ اُن کو کبھی بھی خیر نہیں عطا فرمائیں گے۔ یعنی جو لوگ تمہاری نگاہوں میں حقیر ہیں۔ کہا جاتا ہے "ازدریت علیه اذا عبته" یعنی جب تم کسی شخص کا عیب بیان کرو تو کہا جاتا ہے میں نے اس کو حقیر جانا۔

"لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا": اور نہ میں اُن کو حقیر قرار دے کر یہ کہتا ہوں کہ اُن کا اجر و ثواب باطل ہو گیا یا اُن کا ثواب کم ہو گیا۔

"اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ": اللہ ہی زیادہ جاننے والے ہیں کہ اُن کے دلوں میں کیا ہے، لہٰذا اس کے مطابق اللہ تعالیٰ اُن کو اجر عطا فرمائیں گے۔ اور اگر اُن کے دل میں خیر نہ ہوئی تو اُن کا مواخذہ فرمائیں گے۔

"اِنِّيْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ": یعنی اگر میں ایسا کہوں تو میرا شمار ظالموں میں سے ہوگا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "کافروں نے کہا: "اے نوح! بے شک تم نے ہمارے ساتھ بحث کی ہے، پھر تم نے اس بحث میں ہم سے بہت جھگڑا کیا ہے، پس اگر تم سچوں میں سے ہو تو ہم پر وہ عذاب لے آؤ جس سے تم ہمیں دھمکاتے تھے"O (ہود: ۳۲)

"قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا":

اس آیت میں "جٰدَلْتَنَا" فرمایا، اور کلامِ عرب میں جدل جھگڑے میں مبالغہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، اور شکرے کو بھی پرندوں میں اجدل کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بہت تیزی سے اُڑ کر شکار پر جھپٹتا ہے، اور دین میں جھگڑا کرنا پسندیدہ ہے، اسی لئے حضرت نوح علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام نے اپنی اپنی قوموں سے اظہار حق کے لیے جھگڑا کیا۔ پس جس نے اُن کے دلائل کو قبول کر لیا وہ کامیاب ہو گیا اور جس نے اُن کے دلائل کو رد کر دیا وہ ناکام اور نقصان زدہ ہو گیا، اور ناحق جدال کرنا حتیٰ کہ باطل کو حق کی صورت میں ظاہر کرنا یہ مذموم ہے اور ایسا کرنے والا دنیا اور آخرت میں ملامت زدہ ہے۔

"فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ کُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ": پس اگر تم سچوں میں سے ہو تو ہم پر وہ عذاب لے آؤ جس سے تم ہمیں دھمکاتے تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "نوح نے کہا: "اگر اللہ نے چاہا تو وہی تم پر اس عذاب کو نازل فرمائیں گے اور تم اس عذاب کو روکنے والے نہیں ہو"O (ھود: ۳۳)

"قَالَ اِنَّمَا یَاْتِیْکُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَ مَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ": یعنی اگر اللہ عزوجل نے تمہیں ہلاک فرمانے کا ارادہ فرمایا تو تم پر عذاب نازل فرمادیں گے اور تم اللہ تعالیٰ کو عذاب نازل فرمانے سے عاجز کرنے والے نہیں ہو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اگر میں تمہاری خیر خواہی کا ارادہ کرلوں تب بھی میری خیر خواہی تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی، جب اللہ ہی تمہیں گمراہی پر برقرار رکھنا چاہیں، وہی تمہارے رب ہیں اور تم ان ہی کی طرف لوٹائے جاؤ گے"O (ھود: ۳۴)

"وَلَا یَنْفَعُکُمْ نُصْحِیْٓ": یعنی تمہارے اسلام قبول کرنے میں میری تبلیغ اور میری کوشش کام نہیں آسکتی۔

"اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَکُمْ": اگر میں تمہیں نصیحت کرنے کا ارادہ کروں پھر بھی، کیونکہ تم نصیحت کو قبول ہی نہیں کرتے۔

"اِنْ کَانَ اللّٰهُ یُرِیْدُ اَنْ یُّغْوِیَکُمْ": یعنی اگر اللہ ہی تمہیں گمراہی پر برقرار رکھنے کا ارادہ فرمائیں۔ اس آیت سے المعتزلہ، القدریہ اور اُن کے موافقین کا موقف باطل ہوجاتا ہے، کیونکہ وہ یہ زعم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نافرمان سے اس کی نافرمانی کا ارادہ نہیں فرماتے اور نہ کافر سے اس کے کفر کا ارادہ فرماتے ہیں اور نہ گمراہ کو گمراہی پر چھوڑے رکھتے ہیں۔ اور بے شک اللہ تعالیٰ یہ تمام امور انجام دیتے ہیں۔ سو اللہ تعالیٰ نے اُن کے قول کا رد کرتے ہوئے فرمایا: "اِنْ کَانَ اللّٰهُ یُرِیْدُ اَنْ یُّغْوِیَکُمْ"۔ اور انہوں نے اپنے شیخ اللعین ابلیس کو جھوٹا قرار دیا، کیونکہ سورۃ الاعراف میں ہم نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو گمراہی پر برقرار رکھا، کیونکہ ابلیس نے کہا: "فَبِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ ـــــ (الاعراف: ۱۶)" کیونکہ تو نے مجھے گمراہ کردیا ہے)۔ اور حضرت نوح علیہ السلام نے بھی اللہ تعالیٰ کی طرف اغواء کی نسبت فرمائی ہے، کیونکہ وہی ہدایت دینے والے ہیں اور وہی گمراہی پر برقرار رکھنے والے ہیں۔ اور وہی تمہارے رب ہیں، وہی اغواء (یعنی گمراہ) فرماتے ہیں اور وہی ہدایت دیتے ہیں۔

"هُوَ رَبُّکُمْ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ": اور وہی تمہارے رب ہیں، اور تم سب نے ان ہی کی طرف رجوع کرنا ہے۔

اس آیت میں دھمکی بھی ہے اور وعید بھی ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "یا کفار یہ کہتے ہیں: "اس رسول نے از خود قرآن بنالیا ہے" (اے رسولِ اکرم!) آپ کہیے: "اگر میں نے از خود قرآن بنایا ہے تو اس کا ضرر صرف مجھ پر ہوگا اور تم جو اللہ عزوجل کی حکم عدولی کرتے رہے ہو، میں اس سے بے زار ہوں"O (ھود: ۳۵)

"اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ": کفار یہ مراد لیتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کو اپنی طرف سے بنالیا ہے، حضرت ابن عباس

جمہور نے فرمایا کہ اس آیت میں حضرت نوح علیہ السلام کے اپنی قوم سے مباحثہ کا ذکر ہے اور یہی زیادہ ظاہر ہے، کیونکہ اس آیت سے پہلے اور اس کے بعد صرف حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر ہے۔

"قُلْ اِنِ افْتَرَیْتُهٗ فَعَلَیَّ اِجْرَامِیْ": یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام سے فرمایا کہ آپ کہیے: اگر میں نے وحی اور رسالت کو اپنے پاس سے گھڑلیا ہے تو اس کی سزا مجھے ملے گی۔ اور اگر میں اپنی رسالت کے دعویٰ کے حق پر ہوں اور تم میرے دعویٰ رسالت کی تکذیب کرتے ہو تو اس کا وبال مجھ پر ہوگا۔

"وَاَنَا بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ": اور تم جو اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے ہو اور میری نبوت کی تکذیب کرتے ہو، اس جرم کی سزا تمہیں ملے گی۔ (احکام القرآن للقرطبی جز ۹ ص ۲۲۔۲۸، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

وَاُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾

اور نوح کی طرف وحی فرمائی گئی: "تمہاری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے ہیں اُن کے سوا ہرگز کوئی ایمان نہیں لائے گا لہٰذا تم اُن کے کرتوتوں پر غم نہ کرنا"O

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْیُنِنَا وَوَحْیِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۳۷﴾

اور تم ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری وحی کے مطابق کشتی بناؤ اور ظالموں کے متعلق مجھ سے کوئی بات نہ کرو، بے شک وہ ضرور غرق فرمائے جائیں گے O

وَیَصْنَعُ الْفُلْكَ ۟ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَیْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ؕ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ﴿۳۸﴾

اور نوح کشتی بنا رہے تھے اور جب بھی اُن کی قوم کے سردار اُن کے پاس سے گزرے تو انہوں نے اُن کا مذاق اڑایا، نوح نے کہا: "اگر اب تم ہمارا مذاق اڑا رہے ہو تو ہم بھی ایک دن تمہارا اسی طرح مذاق اڑائیں گے جس طرح تم (ہمارا) مذاق اڑا رہے ہو O

فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ یَّاْتِیْهِ عَذَابٌ یُّخْزِیْهِ وَیَحِلُّ عَلَیْهِ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ ﴿۳۹﴾

پس عنقریب تم یہ جان لو گے کہ کس شخص کے پاس ذلت میں مبتلا کرنے والا عذاب آتا ہے اور کس پر دائمی عذاب نازل ہوگا O

حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِیْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلٌ ﴿۴۰﴾

حتیٰ کہ جب (کافروں کو غرق کرنے کے متعلق) ہمارا حکم آ گیا اور تنور جوش سے ابلنے لگا، تو ہم نے نوح کو حکم فرمایا: "اس کشتی

میں ہر جنس سے نر اور مادہ کے دو جوڑے رکھو اور اپنے گھر والوں کو بھی اس کشتی میں سوار کرلو سوا اُن لوگوں کے جن کے متعلق پہلے غرق فرمائے جانے کا فیصلہ ہو چکا ہے اور اُن کے ساتھ ایمان والوں کو بھی سوار کرلو' اور اُن کے ساتھ ایمان لانے والے صرف چند لوگ تھے O

وَ قَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۱﴾

اور نوح نے کہا: اللہ کا نام لے کر اس کشتی میں سوار ہو جاؤ، اس کشتی کا چلنا اور اس کا ٹھہرنا اللہ کے نام سے ہے، بے شک میرے رب سب سے زیادہ بخشنے والے، سب سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں O

وَ هِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۫ وَ نَادٰى نُوْحُ ا۟بْنَهٗ وَ كَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَ لَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۲﴾

اور وہ کشتی اُن کو پہاڑوں کی مثل موجوں میں لے کر جا رہی تھی اور نوح نے اپنے بیٹے کو پکارا اور وہ اُن سے الگ تھلگ تھا: "اے میرے بیٹے! تم ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ اور کافروں کے ساتھ نہ رہو" O

قَالَ سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَ حَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿۴۳﴾

اس نے کہا: "میں ابھی کسی پہاڑ کی طرف پناہ لے لوں گا جو مجھے پانی کے اس سیلاب سے بچا لے گا" نوح نے کہا: "آج اللہ کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں ہے سوا اُس کے جس پر اللہ رحم فرمائیں" اور اُن دونوں کے درمیان ایک تند و تیز موج حائل ہو گئی سو اُن کا بیٹا غرق ہونے والوں میں سے ہو گیا O

وَ قِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَ غِيْضَ الْمَآءُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ وَ اسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَ قِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

اور حکم فرمایا گیا: "اے زمین! تو اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان! تو بارش برسانے سے رک جا" اور سیلاب کا پانی خشک فرما دیا گیا اور کام پورا فرما دیا گیا اور وہ کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہر گئی اور فرمایا گیا: "ظالم لوگ دور ہو جائیں" O

وَ نَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَ اِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَ اَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۴۵﴾

اور نوح نے اپنے رب کو پکار کر عرض کیا: "اے میرے رب! بے شک میرا بیٹا بھی میرے اہل سے ہے اور آپ کا وعدہ برحق ہے

اور آپ تمام حاکموں سے بڑے حکم فرمانے والے ہیں''O

قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّيْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝۴۶

(اللہ نے) فرمایا: ''اے نوح! بے شک تمہارا بیٹا تمہارے اہل سے نہیں ہے، بے شک اس کے کام نیک نہیں ہیں، لہٰذا تم مجھ سے اس چیز کا سوال نہ کرو جس کا تمہیں علم نہیں ہے، بے شک میں تمہیں نصیحت فرماتا ہوں کہ تم نادانوں میں سے نہ ہو جانا''O

قَالَ رَبِّ اِنِّيْۤ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِيْ وَتَرْحَمْنِيْۤ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۴۷

نوح نے عرض کیا: ''اے میرے رب! میں اس سے آپ کی پناہ میں آتا ہوں کہ میں آپ سے اس چیز کا سوال کروں جس کا مجھے علم نہیں ہے، اور اگر آپ نے میری مغفرت نہ فرمائی اور مجھ پر رحم نہ فرمایا تو میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤں گا''O

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰۤى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۴۸

فرمایا گیا: ''اے نوح! تم ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ اور اُن برکتوں کے ساتھ کشتی سے اتر جاؤ جو تم پر نازل فرمائی گئی ہیں اور کشتی میں تمہارے ساتھ سوار ہونے والوں پر نازل فرمائی گئی ہیں، عنقریب چند گروہوں کو ہم عارضی نفع پہنچائیں گے، پھر ہماری طرف سے اُن کو دردناک عذاب پہنچے گا''O

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَاۤ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَاۤ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛؕ فَاصْبِرْ ۛؕ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝۴۹

(اے رسولِ اکرم!) یہ وہ غیب کی خبریں ہیں جن کی ہم آپ کی طرف وحی فرماتے ہیں، جن خبروں کو نہ اس سے پہلے آپ از خود جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم، پس آپ لوگوں کی طعنہ زنی پر صبر کیجیے بے شک نیک انجام اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے ہے''O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور نوح کی طرف وحی فرمائی گئی: ''تمہاری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے ہیں اُن کے سوا ہرگز کوئی ایمان نہیں لائے گا، لہٰذا تم اُن کے کرتوتوں پر غم نہ کرنا''O (ھود:۳۶)

اللہ تعالیٰ کے علم میں جس قوم کے بعض افراد کا ایمان لانا ممکن ہو، اس پوری قوم کو ہلاک کرنے کے متعلق علماء کے نظریات

"وَأُوحِيَ إِلَىٰ نُوحٍ أَنَّهُ لَن يُؤْمِنَ مِن قَوْمِكَ إِلَّا مَن قَدْ آمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ":

اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اس قوم کو جڑ سے اکھاڑ دیں جس قوم کے متعلق یہ معلوم ہو کہ ان میں سے کچھ لوگ ایمان لے آئیں گے یا اُن کی اولاد میں سے کچھ لوگ ایمان لے آئیں گے۔

قاضی عبد الجبار المعتزلی الاسدآبادی المتوفی ۴۱۵ھ نے کہا ہے کہ ہمارے اکثر علماء نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ایسا کرنا جائز ہے خواہ اس قوم میں سے بعض لوگ ایمان لانے والے ہوں، رہا حضرت نوح علیہ السلام کا یہ دعا کرنا "وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ﴿٢٦﴾ إِنَّكَ إِن تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿٢٧﴾ (نوح: ۲۶۔۲۷)" (اے میرے رب! زمین پر کافروں میں سے کوئی بسنے والا نہ چھوڑیں O بے شک اگر آپ نے ان کافروں کو چھوڑا تو وہ آپ کے بندوں کو گمراہ کر دیں گے اور ان کی جو اولاد بھی پیدا ہوگی وہ بدکار اور شدید کافر ہوگی O)۔ سو اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے یہ دعا اس وقت کی تھی جب اُن کو یہ معلوم تھا کہ ان کی قوم کے کافر لوگ اللہ کے بندوں کو گمراہ کریں گے اور اُن کی جو اولاد پیدا ہوگی وہ بھی کافر ہوگی۔ (تفسیر المحیط ص ۲۳۶، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۹ھ)

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ، ہود: ۳۶ تا ۳۹ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

زیادہ حق کے قریب بات یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے ایمان کی شدید محبت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی تھی کہ وہ اُن کی قوم کو باقی رکھیں، تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو یہ خبر دی کہ جو لوگ ایمان لا چکے ہیں اُن کے سوا اور کوئی ہرگز ایمان نہیں لائے گا، تاکہ حضرت نوح علیہ السلام کے دل سے اپنی قوم کے ایمان کی محبت زائل ہو جائے، اس لیے فرمایا: "فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ" یعنی تم اپنی قوم کے کرتوتوں پر رنج اور غم نہ کرنا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور تم ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری وحی کے مطابق کشتی بناؤ اور ظالموں کے متعلق مجھ سے کوئی بات نہ کرو، بے شک وہ ضرور غرق فرمائے جائیں گے O" (ہود: ۳۷)

ہماری آنکھوں کے سامنے کشتی بنانے سے اللہ تعالیٰ کے لیے جسمیت کے ثبوت کا اشکال اور اس کے جوابات

"وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا":

اس آیت پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ اس آیت میں فرمایا: "ہماری آنکھوں کے سامنے کشتی بنائیں" حالانکہ آنکھیں اس کی ہوتی ہیں جس کا جسم ہو اور اللہ تعالیٰ تو جسم سے بلند و برتر ہیں، تو پھر اس کا کیا معنی ہوگا کہ ہماری آنکھوں کے سامنے کشتی بنائیں؟

ابو علی الجبائی المعتزلی المتوفی ۳۰۳ھ نے اس اشکال کا یہ جواب دیا ہے کہ "ہماری آنکھوں" سے مراد یہ ہے کہ ملائکہ میں سے ہمارے اولیاء کی آنکھوں کے سامنے کشتی بنائیں جو آپ کو کشتی بنانے کا طریقہ بتائیں گے اور جن کو ہم نے آپ کا محافظ بنایا ہے۔

(تفسیر ابو علی الجبائی ص ۳۰۸، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۷ء)

اللہ تعالیٰ کے لیے جن اعضاء کے ثبوت کی آیات ہیں، ان کے متعلق متقدمین متکلمین کا موقف

اہل سنت کا مسلک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آنکھیں ہیں لیکن وہ ہماری آنکھوں کی مثل نہیں ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہیں، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ۔ (الفتح: ۱۰)" لیکن وہ انسانوں کے ہاتھوں کی مثل نہیں ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا چہرہ ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے "فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ۔ (البقرہ: ۱۱۵)، كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (القصص: ۸۸)" لیکن وہ انسانوں کے چہرہ کی مثل نہیں ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی پنڈلی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ۔ (القلم: ۴۲)" لیکن ان کی آنکھیں، اُن کا چہرہ، اُن کے ہاتھ اور اُن کی پنڈلی ہمارے اعضاء کی مثل نہیں ہے کیونکہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ۔ (الشوریٰ: ۱۱)"۔

اللہ تعالیٰ کے لیے جن اعضاء کے ثبوت کی آیات ہیں، ان کے متعلق متاخرین متکلمین کا موقف

متقدمین علماء کا تو یہی مختار تھا کہ اللہ تعالیٰ کی آنکھیں ہیں مگر ہماری آنکھوں کی مثل نہیں ہیں، لیکن متاخرین نے جب یہ دیکھا کہ ان آیات کی وجہ سے قرآن مجید پر طعن کرنے والے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ان آیات سے تو اللہ تعالیٰ کی جسمیت ثابت ہوتی ہے اور ہر جسم حادث ہوتا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ کا حدوث ثابت ہوتا ہے، تو انہوں نے ان آیات کی تاویل کی اور ان آیات کے کامل بیان کیے، انہوں نے کہا: ہاتھ سے مراد قوت اور نعمت ہے، آنکھوں سے مراد اس کی نگرانی اور حفاظت ہے، اور پنڈلی کھولنے سے مراد قیامت کی شدتیں اور ہولناکیاں ہیں، اور چہرہ سے مراد اُن کی جلالتِ شان ہے۔

علامہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی متوفی ۷۹۳ھ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کے جسم سے منزہ ہونے پر دلائل قطعیہ قائم ہیں، اس لیے ان نصوص کا علم اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا واجب ہے جیسا کہ متقدمین کا طریقہ ہے، کیونکہ اسی میں سلامتی ہے، یا ان آیات کی صحیح تاویلات کی جائیں جیسا کہ متاخرین علماء نے جاہلوں کے اعتراضات دور کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا ہے تاکہ جو کم علم مسلمان ہیں وہ اسلام سے برگشتہ نہ ہوں۔

(شرح عقائد نسفی ص ۴۳، مطبوعہ کراچی)

حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اپنی قوم کے کافروں کو تبلیغ فرمانے کا قصہ

"وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ": اس آیت کے متعدد محامل ہیں:

(۱) یعنی تم ہم سے ان کافروں کے عذاب کی تاخیر کی دعا نہ کرنا، کیونکہ میں نے ان کو طوفان میں غرق کرنے کا فیصلہ فرمالیا ہے اور جب حضرت نوح علیہ السلام نے اس حقیقت کو جان لیا تو پھر انہوں نے کہا: "رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا۝ (نوح: ۲۶)" (اے میرے رب! زمین پر کافروں میں سے کوئی بسنے والا نہ چھوڑیں۝)۔

(۲) مجھ سے ان ظالموں پر عذاب بھیجنے کی جلدی کی دعا نہ کرنا، کیونکہ میں ان ظالموں پر عذاب بھیجنے کا وقت متعین فرما چکا ہوں لہٰذا اس وقت سے پہلے ان پر عذاب کا آنا ممتنع ہے۔

(۳) ظالموں سے مراد اُن کی بیوی اور اُن کا بیٹا کنعان ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور نوح کشتی بنارہے تھے اور جب بھی اُن کی قوم کے سردار اُن کے پاس سے گزرے تو انہوں نے اُن کا مذاق اڑایا، نوح نے کہا: ''اگر اب تم ہمارا مذاق اڑارہے ہو تو ہم بھی ایک دن تمہارا اسی طرح مذاق اڑائیں گے جس طرح تم (ہمارا) مذاق اڑارہے ہوO'' (ہود:۳۸)

''وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ'': اس آیت کی تفسیر میں دو قول ہیں:

(۱) اس میں ماضی کے حال کی حکایت ہے، یعنی ماضی کے جس حال میں اُن پر یہ صادق آتا تھا کہ وہ کشتی بنارہے ہیں۔

(۲) اور حضرت نوح علیہ السلام کشتی بنانے کی طرف متوجہ ہوئے۔

کشتی کی صفت میں اقوال

(۱) حضرت نوح علیہ السلام نے دو سال میں کشتی بنائی، ایک قول یہ ہے کہ چار سال میں کشتی بنائی اور اس کشتی کا طول تین سو ہاتھ تھا اور اس کا عرض پچاس ہاتھ تھا۔

(۲) حسن بصری نے کہا کہ اس کا طول ایک ہزار دو سو ہاتھ تھا اور اس کا عرض چھ سو ہاتھ تھا۔

امام رازی لکھتے ہیں: ان مباحث میں مشغول ہونا مناسب نہیں ہے، کیونکہ کسی حدیث میں اس کشتی کی مقدار کے متعلق کوئی تصریح وارد نہیں ہوئی۔

حضرت نوح علیہ السلام کے کشتی بنانے پر کفار کے مذاق اڑانے کی وجوہ

''وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ'': یعنی کافروں کی ایک جماعت حضرت نوح علیہ السلام کے پاس سے گزرتی تو وہ اُن کا مذاق اڑاتی، اور اُن کے مذاق اڑانے کی حسب ذیل وجوہ ہیں:

(۱) وہ کہتے تھے: اے نوح! تم تو رسالت کے دعویٰ دار تھے، اب تم بڑھئی کیسے بن گئے؟

(۲) وہ کہتے تھے کہ اگر تم اپنے دعویٰ رسالت میں سچے ہو تو تمہارا خدا تمہیں اس پُرمشقت عمل سے مستغنی کیوں نہیں فرمادیتا؟

(۳) انہوں نے اس سے پہلے کسی کشتی کو نہیں دیکھا تھا اور وہ نہیں جانتے تھے کہ کشتی سے کس طرح فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے، اس وجہ سے وہ کشتی بنانے پر تعجب کرتے تھے اور حضرت نوح علیہ السلام کا مذاق اڑاتے تھے۔

(۴) وہ کشتی بہت بڑی تھی اور حضرت نوح علیہ السلام اس کو پانی سے بہت دور فاصلے پر بنارہے تھے اور اُن کی قوم کے منکرین کہتے تھے: یہاں پر تو پانی ہے نہیں اور تم اتنی بڑی کشتی کو اتنے بڑے دریاؤں میں اور سمندروں میں خود اٹھا کر لے جانہیں سکتے، تو وہ حضرت نوح علیہ السلام کی اس کارروائی کو جنون قرار دیتے تھے۔

(۵) جب حضرت نوح علیہ السلام کے کافروں کو عذاب سے ڈرانے پر کافی مدت گزر گئی اور انہوں نے اتنے عرصہ میں کسی کے غرق ہونے کی خبر نہیں سنی تو اُن کا ظن غالب یہ تھا کہ حضرت نوح علیہ السلام اس خبر دینے میں جھوٹے تھے، پھر جب وہ کشتی بنانے میں مشغول ہوگئے تو پھر انہوں نے اُن کا مذاق اڑانا شروع کردیا۔

کسی کا مذاق اڑانا معصیت ہے پھر حضرت نوح علیہ السلام نے کیسے کہہ دیا کہ "ہم بھی تمہارا مذاق اڑائیں گے"؟

"قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ": اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: "وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا" (الشوریٰ: ۴۰)" (برائی کا بدلہ اسی کی مثل برائی ہے)۔ یعنی انہوں نے حضرت نوح علیہ السلام کا مذاق اڑایا تو اس کے جواب میں حضرت نوح علیہ السلام کا مذاق اڑانا اُن کے مذاق اڑانے کی سزا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پس عنقریب تم یہ جان لوگے کہ کس شخص کے پاس ذلت میں مبتلاء کرنے والا عذاب آتا ہے اور کس پر دائمی عذاب نازل ہوگا O" (ہود: ۳۹)

"فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ": یعنی تم عنقریب جان لوگے کہ کس پر رسوا کُن عذاب آتا ہے اور تمہیں عنقریب معلوم ہوجائے گا کہ در حقیقت مذاق اڑایا جانا کس کے لائق تھا۔

"مَنْ يَّاْتِيْهِ" کا معنی

یہ استفہام ہے گویا کہ یوں کہا گیا کہ عنقریب تمہیں معلوم ہوجائے گا کہ ہم میں سے کس پر عذاب آتا ہے۔

"وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ": اور کس پر دائمی عذاب واجب ہوگا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "حتیٰ کہ جب (کافروں کو غرق کرنے کے متعلق) ہمارا حکم آگیا اور تنور جوش سے ابلنے لگا، تو ہم نے نوح کو حکم فرمایا: "اس کشتی میں ہر جنس سے نر اور مادہ کے دو جوڑے رکھو اور اپنے گھر والوں کو بھی اس کشتی میں سوار کرلو سوا اُن لوگوں کے جن کے متعلق پہلے غرق کیے جانے کا فیصلہ ہوچکا ہے اور اُن کے ساتھ ایمان والوں کو بھی سوار کرلو" اور اُن کے ساتھ ایمان لانے والے صرف چند لوگ تھے O" (ہود: ۴۰)

"حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا" کے دو محمل

(۱) اس کا ایک محمل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کوئی چیز وجود میں نہیں آتی، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ (النحل: ۴۰)" (ہم جب کسی چیز کو پیدا فرمانا چاہتے ہیں تو اس کے متعلق صرف اتنا فرماتے ہیں: "ہوجا" تو وہ چیز فوراً ہوجاتی ہے O)۔

(۲) اس سے مراد وہ عذاب ہے جس سے قوم نوح کو ڈرایا گیا تھا۔

تنور کی تفسیر میں متعدد اقوال

"وَفَارَ التَّنُّوْرُ": تنور کے متعلق حسب ذیل اقوال ہیں:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حسن بصری اور مجاہد نے کہا ہے: اس سے مراد مٹی یا پتھر کا بنا ہوا وہ تنور ہے جس میں روٹیاں پکائی جاتی ہیں۔

(۲) حسن بصری نے کہا: یہ حضرت آدم علیہ السلام کا تنور تھا جو پتھر سے بنا ہوا تھا اور حضرت حوا اس میں روٹیاں پکاتی تھیں، پھر یہ حضرت

نوح علیہ السلام تک پہنچ گیا۔

(۳) شعبی نے کہا: یہ تنور کوفہ کی جانب تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ یہ تنور مسجد کوفہ میں تھا، انہوں نے فرمایا: اس مسجد میں ستر (۷۰) نبیوں نے نماز پڑھی ہے۔

(۴) ایک قول یہ ہے کہ ایک عورت اس تنور میں روٹیاں پکا رہی تھی، اس نے بتایا کہ اس تنور سے پانی نکل رہا ہے۔

(۵) اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جب زمین کی تہوں سے پانی نکلنے لگا اور بلند جگہوں سے پانی نکلنے لگا تو ان جگہوں کو تنور کے مشابہ قرار دیا۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ ان اقوال میں سے کون سا قول صحیح ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ تنور حقیقت میں اس جگہ کو کہتے ہیں جس جگہ روٹیاں پکائی جاتی ہیں، پس واجب ہے کہ اس لفظ کو اسی معنی پر محمول کیا جائے۔

اس سوال کا جواب کہ ''زَوْجَیْنِ'' تو خود تثنیہ کا صیغہ ہے، پھر اس کے بعد ''اثْنَیْنِ'' کیوں فرمایا؟

''قُلْنَا احْمِلْ فِیْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ'': اس آیت میں فرمایا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے ہر چیز سے دو جوڑے کشتی میں رکھ لیے، اس پر سوال یہ ہے کہ جوڑے میں تو دو چیزیں ہی ہوتی ہیں، پھر ''زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ'' کہنے کا کیا فائدہ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''لَا تَتَّخِذُوْۤا اِلٰهَیْنِ اثْنَیْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ ﴿ (النحل:۵۱)'' (دو معبود نہ بناؤ وہ تو ایک ہی سچا معبود ہے، لہٰذا مجھ ہی سے ڈرو O)۔

یعنی جس طرح ''اِلٰهَیْنِ'' تثنیہ کا صیغہ ہے تو اس کے بعد ''اثْنَیْنِ'' فرمایا ہے، جب کہ تثنیہ میں دو فرد ہی ہوتے ہیں، سو جس طرح اس آیت میں ''اِلٰهَیْنِ'' کے بعد ''اثْنَیْنِ'' فرمایا ہے، اسی طرح زیر بحث آیت میں بھی ''زَوْجَیْنِ'' کے بعد ''اثْنَیْنِ'' فرمایا ہے۔

''وَاَهْلَكَ'': مفسرین نے کہا ہے کہ کشتی میں سات لوگ سوار تھے: حضرت نوح علیہ السلام اور تین اُن کے بیٹے اور وہ سام، حام اور یافث تھے اور اُن میں سے ہر ایک کی بیوی بھی تھی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وہ آٹھ لوگ تھے، ان سات کے علاوہ حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی بھی تھی۔

''اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ'': یعنی جن کے متعلق پہلے یہ مقدر ہو چکا ہے کہ وہ کشتی میں سوار نہیں ہوں گے۔ اس سے مراد اُن کا بیٹا اور اُن کی بیوی ہے اور یہ دونوں کافر تھے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ہلاکت مقدر فرما دی تھی۔

انسانوں سے پہلے حیوانات کو کشتی میں سوار کرنے کی توجیہ

اس آیت میں فرمایا ہے: ''اس کشتی میں ہر جنس سے نر اور مادہ کے دو جوڑے رکھو''، اس پر یہ سوال ہے کہ انسان تمام حیوانات سے اشرف اور افضل ہے، پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ کشتی میں سوار کرنے والوں کی ابتداء حیوانات کے ذکر سے فرمائی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ انسان خود صاحب عقل ہے اور وہ اپنے صاحب عقل ہونے کی وجہ سے اضطراراً ہلاکت کے اسباب کو اپنے سے دور کرتا ہے تو اس لیے اس میں ترغیب کے لیے مبالغہ کی ضرورت نہیں تھی۔

" وَ مَنْ اٰمَنَ ": مفسرین نے کہا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام پر ایمان لانے والے اسّی (۸۰) مرد تھے۔ مقاتل نے کہا: وہ الموصل کی جانب ایک بستی میں رہتے تھے۔ اور اس بستی کا نام " قریۃ الثمانین " تھا۔ یعنی اس بستی میں اسّی (۸۰) لوگ رہتے تھے۔

" وَ مَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلٌ ": اگر یہ کہا جائے کہ جو ایمان والے کشتی میں داخل ہوئے تھے، وہ ایک جماعت تھی تو " قلیلون " کیوں نہیں فرمایا؟ جیسے اس آیت میں ارشاد ہے: " اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِیْلُوْنَ ۙ (الشعراء: ۵۴) " (یہ لوگ ایک چھوٹا سا گروہ ہیں O)۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں امر جائز ہیں خواہ کسی کو اختیار کر لیا جائے۔

بعض روایات میں یہ ہے کہ ابلیس بھی کشتی میں داخل ہو گیا تھا، یہ بہت بعید روایت ہے کیونکہ ابلیس جنات میں سے ہے تو اس پر غرقاب ہونا کیسے موثر ہوگا؟ نیز نہ یہ قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں ہے اور جو روایت قرآن و حدیث کے خلاف ہو وہ غیر معتبر ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: " نوح نے کہا: اللہ کا نام لے کر اس کشتی میں سوار ہو جاؤ، اس کشتی کا چلنا اور اس کا ٹھہرنا اللہ کے نام سے ہے، بے شک میرے رب سب سے زیادہ بخشنے والے، سب سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں O " (ھود: ۴۱)

" وَ قَالَ ارْكَبُوْا فِیْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا ": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ وہ کشتی اللہ تعالیٰ کے نام اور اُن کی قدرت سے چلتی تھی اور اللہ تعالیٰ کے نام اور اُن کی قدرت سے ہی ٹھہرتی تھی۔

اس آیت سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ انسان کو چاہیے کہ کسی کام میں اللہ تعالیٰ کا نام لیے بغیر شروع نہ ہو، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے قوم کو یہ خبر دی کہ یہ کشتی نجات کے حصول کا سبب نہیں ہے، نجات کے حصول کا سبب اللہ تعالیٰ کا فضل اور اُن کا کرم ہے۔

" اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ": یہاں پر یہ سوال ہے کہ یہ وقت کفار کو ہلاک کرنے کا اور اُن پر قہر فرمانے کا تھا تو یہاں پر غفور اور رحیم کا ذکر کیسے مناسب ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ جو لوگ کشتی میں سوار ہوئے اُن کا دل میں یہ اعتقاد ہو کہ ہم اپنے علم کی برکت سے نجات پا گئے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس تکبر کو اُن سے زائل فرمایا، کیونکہ کوئی بھی انسان انواع و اقسام کی لغزشوں سے اور ظلمات الشہوات سے بری نہیں ہوتا، وہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی مدد فرمانے اور اُن کے فضل و کرم اور اُن کے احسان کا محتاج ہے اور وہ آخر کار اس پر رحم فرمانے والے ہیں اور اُس کے گناہوں کو بخشنے والے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: " وہ کشتی اُن کو پہاڑوں کی مثل موجوں میں لے کر جا رہی تھی اور نوح نے اپنے بیٹے کو پکارا اور وہ اُن سے الگ تھلگ تھا: " اے میرے بیٹے! تم ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ اور کافروں کے ساتھ نہ رہو O " (ھود: ۴۲)

"وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ": اس آیت کے دو محمل ہیں:

(۱) بڑی بڑی موجیں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب شدید آندھیاں آئیں، اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت شدید آندھی آئی تھی اور اس سے مقصود لوگوں میں خوف اور گھبراہٹ کو پیدا کرنا ہے۔

(۲) بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تند و تیز آندھیوں نے موجوں کو کشتی میں داخل کر دیا تھا اور اس سے کشتی میں سوار لوگوں کا غرق ہونا لازم آتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سمندر کی موجوں نے جب کشتی کو چاروں طرف سے گھیر لیا تو کشتی اس کے مشابہ ہوگئی کہ وہ موجیں کشتی میں داخل ہوگئیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کے متعلق مفسرین کے اقوال

"وَنَادٰى نُوْحُ ابْنَهٗ":

(۱) وہ حضرت نوح علیہ السلام کا حقیقی بیٹا تھا، اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں صریح آیت ہے: "وَنَادٰى نُوْحُ ابْنَهٗ"۔ نیز قرآن مجید میں ہے، حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: "یٰبُنَیَّ" یہ بھی اس معنی میں صریح ہے کہ وہ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا تھا۔

(۲) بعض لوگوں نے اس کو مستبعد قرار دیا کہ رسول معصوم کا بیٹا کافر ہو۔ امام رازی نے اس کا رد کیا ہے کہ یہ ثابت ہے کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد کافر تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد بھی کافر تھے، یہ نص قرآن سے ثابت ہے، سو یہاں بھی اسی طرح سے ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۶ ص ۳۵۰، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

امام رازی کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد کو اور اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کو کافر لکھنے کا بطلان

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے زمین کے دو حصے فرمائے اور مجھے ان میں سب سے اچھے حصے میں رکھا، پھر اس نصف کے تین حصے کیے اور مجھے اس تیسرے حصہ میں رکھا جو سب سے خیر، اچھا اور سب سے افضل تھا، پھر لوگوں میں سے عرب کو چن لیا، پھر عرب میں سے قریش کو چن لیا، پھر قریش میں سے بنو ہاشم کو چن لیا، پھر بنو ہاشم میں سے عبد المطلب کو چن لیا، پھر حضرت عبد المطلب کی اولاد میں سے مجھ کو چن لیا۔ (اس حدیث میں خیر کا لفظ ہے اور مومن اور کافر میں مومن خیر ہے، سو آپ کے تمام آباء مومن ہیں)۔ (الطبقات الکبریٰ ج ۱ ص ۱۸، جمع الجوامع رقم الحدیث: ۵۳۰۷، کنز العمال رقم الحدیث: ۳۲۱۲۲)

یہ حدیث آپ کے تمام آباء کے ایمان پر عموی اور حضرت عبد المطلب کے ایمان پر خصوصی دلیل ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا: آپ پر میرے باپ فدا ہوں! جب حضرت آدم جنت میں تھے تو آپ کہاں تھے؟ آپ نے مسکرا کر فرمایا: میں حضرت آدم کی پشت میں تھا، اور جب مجھے کشتی میں سوار کرایا گیا تو میں اپنے باپ حضرت نوح کی پشت میں تھا۔ اور جب مجھے (آگ میں) پھینکا گیا تو میں حضرت ابراہیم کی پشت میں تھا، میرے والدین کبھی بدکاری پر جمع نہیں ہوئے، اور اللہ تعالیٰ مجھے ہمیشہ معزز پشتوں سے پاکیزہ رحموں کی طرف منتقل فرماتے رہے، میری صفت مہدی ہے، اور جب بھی دو شاخیں ملیں میں سب سے خیر (اچھی) شاخ میں تھا، اللہ تعالیٰ نے مجھ سے نبوت کا میثاق اور اسلام کا عہد لیا، اور تورات اور انجیل میں میرا ذکر پھیلایا اور ہر نبی نے میری صفت بیان کی اور زمین میرے نور سے چمک

اٹھی اور بادل میرے چہرے سے برستا ہے اور مجھے اپنی کتاب کا علم فرمایا اور آسمانوں میں میرے شرف کو زیادہ فرمایا اور اپنے ناموں میں سے میرا نام بنایا پس عرش والے محمود ہیں اور میں محمد ہوں۔ الحدیث۔

(البدایہ والنہایہ للحافظ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۰۲ دارالفکر، بیروت، ۱۴۱۸ھ)

رہا امام رازی کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کو کافر قرار دینا تو یہ اس لیے غلط ہے کہ قرآن مجید نے آزر کو کافر قرار دیا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد آزر نہیں تھے، اُن کے والد تارخ تھے۔ نیز حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی: ''رَبَّنَا اغۡفِرۡ لِیۡ وَ لِوَالِدَیَّ ۔۔۔ (ابراہیم: ۴۱)''، اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کافر ہوتے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ دعا نہ کرتے، اور اگر دعا کی بھی تھی تو اللہ تعالیٰ آپ کو اس دعا سے روک دیتے لیکن آج تک ہم اپنی نمازوں میں یہ دعا تواتر سے پڑھتے چلے آئے ہیں، پس معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والدین مومن تھے۔ (سعیدی غفرلہ)

''فِیۡ مَعۡزِلٍ'' کی وجوہ

اس آیت میں مذکور ہے: ''وَ کَانَ فِیۡ مَعۡزِلٍ''۔

(۱) وہ کشتی سے الگ تھا، کیونکہ اس کا یہ گمان تھا کہ پہاڑ اس کو غرق ہونے سے بچا لے گا۔

(۲) وہ اپنے والد اور اپنے بھائیوں اور قوم سے الگ تھا۔

(۳) وہ کفار سے الگ ہو گیا تھا، تو حضرت نوح علیہ السلام نے گمان کیا کہ اس نے کفار سے الگ ہونے کو پسند کر لیا۔

اس لیے حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: ''یٰبُنَیَّ ارۡکَبۡ مَّعَنَا وَ لَا تَکُنۡ مَّعَ الۡکٰفِرِیۡنَ'':

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اس نے کہا: ''میں ابھی کسی پہاڑ کی طرف پناہ لے لوں گا جو مجھے پانی کے اس سیلاب سے بچا لے گا'' نوح نے کہا: ''آج اللہ کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں ہے سوا اُس کے جس پر اللہ رحم فرمائیں'' اور اُن دونوں کے درمیان ایک تند و تیز موج حائل ہو گئی سو اُن کا بیٹا غرق ہونے والوں میں سے ہو گیا O'' (ھود: ۴۳)

''قَالَ لَا عَاصِمَ الۡیَوۡمَ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰہِ اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ'': اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام اور جو جماعت اُن کے ساتھ تھی، ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے ساتھ مخصوص فرما لیا، اور مراد یہ ہے کہ جن پر اللہ تعالیٰ رحم فرماتے ہیں، انہی کے سبب سے رحمت حاصل ہوتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا: ''وَ حَالَ بَیۡنَہُمَا الۡمَوۡجُ فَکَانَ مِنَ الۡمُغۡرَقِیۡنَ'' کہ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا غرق ہونے والوں میں سے ہو گیا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور حکم فرمایا گیا: ''اے زمین! تو اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان! تو بارش برسانے سے رک جا'' اور سیلاب کا پانی خشک کر دیا گیا اور کام پورا کر دیا گیا اور وہ کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہر گئی اور فرمایا گیا: ''ظالم لوگ دور ہو جائیں'' O'' (ھود: ۴۴)

جمادات کی اطاعت کرنے سے انسانوں کی اطاعت نہ کرنے پر ملامت

"وَقِیْلَ یٰۤاَرْضُ ابْلَعِیْ مَآءَكِ وَیٰسَمَآءُ اَقْلِعِیْ وَغِیْضَ الْمَآءُ وَقُضِیَ الْاَمْرُ":

یہ آیت اللہ تعالیٰ کی عظمت اوراُن کی کبریائی پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اے زمین! تو اپنا پانی نگل لے اوراے آسمان! تو بارش برسانے سے رک جا"، اس سے معلوم ہوا کہ زمین اور آسمان سب اللہ تعالیٰ کے احکام کے پابند ہیں۔اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زمین اور آسمان سب اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کرتے ہیں، حالانکہ یہ جمادات میں سے ہیں اور مکلف نہیں ہیں، تو انسان جو مکلف ہے اس کو بدرجہ اولیٰ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرنی چاہیے۔

طوفان نوح سے کئی غیر مکلف بھی ہلاک ہو گئے، اس پر اعتراض کا جواب

اس جگہ یہ سوال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے یہ کیسے مناسب ہے کہ بچوں کو کفار کے جرم کی وجہ سے ہلاک فرمادیں؟

اس کے دو جواب ہیں:

(۱) اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کی عورتوں کو غرق فرمانے سے چالیس سال پہلے بانجھ فرما دیا تھا، پس وہی غرق ہوا جس کی عمر چالیس سال کو پہنچ چکی تھی۔

(۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کسی اعتراض کی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "لَا یُسْـَٔلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یُسْـَٔلُوْنَ۝ (الانبیاء:۲۳)" (اللہ عزوجل جو کام فرماتے ہیں اس کام سے متعلق اُن سے باز پرس نہیں ہو سکتی جب کہ مخلوقات سے باز پرس فرمائی جائے گی۝)۔

"وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِیِّ": یعنی وہ کشتی ایک جزیرہ کے پہاڑ پر ٹھہر گئی جس کو جودی کہا جاتا تھا، اور کشتی کا جودی پہاڑ پر ٹھہرنا عاشوراء کے دن تھا۔"وَقِیْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ": اس کلام کے دو محمل ہیں:

(۱) ایک یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں دھتکارتے ہوئے فرمایا۔

(۲) دوسرا محمل یہ ہے کہ یہ حضرت نوح علیہ الصلوۃ والسلام کا کلام ہے، اور یہ دعا کے قائم مقام ہے، لہٰذا یہ بشر کے لائق ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور نوح نے اپنے رب کو پکار کر عرض کیا: "اے میرے رب! بے شک میرا بیٹا بھی میرے اہل سے ہے اور آپ کا وعدہ برحق ہے اور آپ تمام حاکموں سے بڑے حکم فرمانے والے ہیں"۝

(ہود:۴۵)

"وَنَادٰی نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ":

حضرت نوح علیہ السلام کی عصمت پر اعتراض کا جواب

(۱) منکرین عصمت کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو اپنے بیٹے کی نجات کا سوال کرنے سے منع فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ اُن کا یہ سوال کرنا گناہ اور معصیت تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا اجتہاد یہ تھا کہ اُن کا بیٹا اُن کے اہل سے ہے اور یہ اُن کی اجتہادی خطاء تھی، جس طرح دیگر انبیاء علیہم السلام سے اجتہادی خطائیں ہوئیں مثلاً حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے اجتہاد سے شجرِ ممنوع سے کھالیا، لیکن جب وہ اپنی خطائی الاجتہاد پر مطلع ہوئے تو اللہ تعالیٰ سے مسلسل استغفار کرتے رہے، اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام نے اجتہاد کیا کہ کسی طور پر اُن کا بیٹا اُن کے اہل سے ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''يٰنُوۡحُ اِنَّهٗ لَيۡسَ مِنۡ اَهۡلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيۡرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسۡـَٔلۡنِ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ اِنِّىۡۤ اَعِظُكَ اَنۡ تَكُوۡنَ مِنَ الۡجٰهِلِيۡنَ ۝ (ہود:۴۶)'' (''اے نوح! بے شک تمہارا بیٹا تمہارے اہل سے نہیں ہے، بے شک اس کے کام نیک نہیں ہیں، لہٰذا تم مجھ سے اس چیز کا سوال نہ کرو جس کا تمہیں علم نہیں ہے، بے شک میں تمہیں نصیحت فرماتا ہوں کہ تم ناواقفوں میں سے نہ ہوجانا ۝'')، تب حضرت نوح علیہ السلام اپنی خطائی الاجتہاد پر مطلع ہوئے اور پھر انہوں نے اپنے بیٹے کی مغفرت کا سوال نہیں کیا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''(اللہ نے) فرمایا: ''اے نوح! بے شک تمہارا بیٹا تمہارے اہل سے نہیں ہے، بے شک اس کے کام نیک نہیں ہیں، لہٰذا تم مجھ سے اس چیز کا سوال نہ کرو جس کا تمہیں علم نہیں ہے، بے شک میں تمہیں نصیحت فرماتا ہوں کہ تم ناواقفوں میں سے نہ ہوجانا'' ۝ (ہود:۴۶)

''قَالَ يٰنُوۡحُ اِنَّهٗ لَيۡسَ مِنۡ اَهۡلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيۡرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسۡـَٔلۡنِ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ اِنِّىۡۤ اَعِظُكَ اَنۡ تَكُوۡنَ مِنَ الۡجٰهِلِيۡنَ ۝'': اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو اُن کی خطاء فی الاجتہاد پر مطلع فرمایا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''نوح نے عرض کیا: ''اے میرے رب! میں اس سے آپ کی پناہ میں آتا ہوں کہ میں آپ سے اس چیز کا سوال کروں جس کا مجھے علم نہیں ہے، اور اگر آپ نے میری مغفرت نہ فرمائی اور مجھ پر رحم نہ فرمایا تو میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوجاؤں گا'' ۝ (ہود:۴۷)

''قَالَ رَبِّ اِنِّىۡۤ اَعُوۡذُ بِكَ اَنۡ اَسۡـَٔلَكَ مَا لَيۡسَ لِىۡ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ وَاِلَّا تَغۡفِرۡ لِىۡ وَتَرۡحَمۡنِىۡۤ اَكُنۡ مِّنَ الۡخٰسِرِيۡنَ'': اس آیت میں حضرت نوح علیہ السلام کی اپنی اجتہادی خطاء سے براءت کی دلیل ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''فرمایا گیا: ''اے نوح! تم ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ اور اُن برکتوں کے ساتھ کشتی سے اتر جاؤ جو تم پر نازل فرمائی گئی ہیں اور کشتی میں تمہارے ساتھ سوار ہونے والوں پر نازل فرمائی گئی ہیں، عنقریب چند گروہوں کو ہم عارضی نفع پہنچائیں گے، پھر ہماری طرف سے اُن کو دردناک عذاب پہنچے گا'' ۝ (ہود:۴۸)

''قِيۡلَ يٰنُوۡحُ اهۡبِطۡ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيۡكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنۡ مَّعَكَ ؕ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمۡ ثُمَّ يَمَسُّهُمۡ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيۡمٌ'':

حضرت نوح علیہ السلام کے لیے متعدد بشارتیں

(۱) اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو یہ خبر دی کہ آپ سلامتی کے ساتھ اس کشتی سے اتر جائیں گے، پھر انہیں یہ خوش خبری دی کہ آپ برکت کے ساتھ اتریں گے، کیونکہ پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا تھا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی اجتہادی خطاء سے رجوع کر لیا اور اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا کی: "وَ اِلَّا تَغْفِرْ لِیْ وَ تَرْحَمْنِیْۤ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۴۷﴾ (ھود:۴۷)" (اور اگر آپ نے میری مغفرت نہ فرمائی اور مجھ پر رحم نہ فرمایا تو میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤں گا O)، اور یہ اسی طرح ہے جس طرح حضرت آدم علیہ السلام اپنی اجتہادی خطاء پر مطلع ہوئے اور انہوں نے اس سے رجوع کر کے کہا: "رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا ٚ وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۲۳﴾ (الاعراف:۲۳)" (اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، اور اگر آپ ہماری مغفرت نہ فرمائیں اور ہم پر رحم نہ فرمائیں تو ہم ضرور بہ ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے O)۔

(۲) حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر جو طوفان آیا تھا، یہ تمام روئے زمین پر آیا تھا۔ اور جب حضرت نوح علیہ السلام کشتی سے باہر آئے تو انہیں معلوم ہوا کہ زمین میں اب کوئی چیز نہیں ہے جو جانداروں کے لیے نافع ہو تو گویا وہ اس بات سے ڈرے کہ وہ کیسے زندہ رہیں گے اور اپنی تمام ضروریات کو کیسے پورا کریں گے، کیا کھائیں گے اور کیا پئیں گے؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا" آپ اس کشتی سے سلامتی سے اتر جائیں اور اُن سے اس خوف کو زائل فرما دیا۔

(۳) پھر جب اللہ تعالیٰ نے اُن سے اس خوف کو زائل فرما دیا اور سلامتی کا وعدہ فرمایا تو اس کے ساتھ انہیں برکت کی نوید سنائی، اور برکت کا معنی ہے دوام، بقاء اور ثبات اور اپنی امیدوں کو پانا۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "بِسَلٰمٍ مِّنَّا" یہ اس پر دلیل ہے کہ صدیقین نعمت من حیث النعمت پر خوش نہیں ہوتے لیکن اس وجہ سے خوش ہوتے ہیں کہ یہ نعمت اُن کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے۔ اور سلامتی پر خوش ہونا عام لوگوں کا حصہ ہے اور مقربین کا حصہ یہ ہے کہ وہ اس پر خوش ہوتے ہیں کہ یہ نعمت اُن کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "(اے رسولِ اکرم!) یہ وہ غیب کی خبریں ہیں جن کی ہم آپ کی طرف وحی فرماتے ہیں، جن خبروں کو نہ اس سے پہلے آپ از خود جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم، پس آپ لوگوں کی طعنہ زنی پر صبر کیجئے بے شک نیک انجام اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے ہے" O (ھود:۴۹)

ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے علمِ غیب کا ثبوت

"تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهَاۤ اِلَیْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَاۤ اَنْتَ وَ لَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛؕ فَاصْبِرْ ۛؕ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِیْنَ"۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ سنا کر اخبارِ غیبیہ پر مطلع فرمایا۔ اور جس طرح حضرت نوح علیہ السلام سے اُن کی قوم کے کفار عجلت سے عذاب کو طلب کرتے تھے، اسی طرح سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی آپ کی قوم کے کفار عجلت سے عذاب طلب کرتے تھے۔ رہے حضرت نوح علیہ السلام تو انہوں نے اس پر صبر کیا اور اُن پر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتیں کشادہ

فرمادیں، لہٰذا اے محمد (صلی اللہ علیک وسلم!) آپ بھی اسی طرح اپنی قوم کی ان طعن آمیز باتوں پر صبر کریں۔

(تفسیر کبیر ج ۶ ص ۳۴۳۔۳۶۲ ملخصاً، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا مُفْتَرُونَ ﴿٥٠﴾

اور ہم نے قوم عاد کی طرف اُن کے ہم قبیلہ بھائی ہود کو (رسول بنا کر) بھیجا، انھوں نے کہا: اے میری قوم! "اللہ کی عبادت کرو، تمہارے لیے اُن کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، تم (شرک کرکے) صرف جھوٹا بہتان تراشنے والے ہو"O

يَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى الَّذِي فَطَرَنِي ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٥١﴾

اے میری قوم! میں تم سے تبلیغ دین پر کسی معاوضہ کا سوال نہیں کر رہا، میرا اجر تو صرف اُنہی کے ذمۂ کرم پر ہے جنھوں نے مجھے پیدا فرمایا ہے، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟O

وَيَا قَوْمِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُم مِّدْرَارًا وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِينَ ﴿٥٢﴾

اور اے میری قوم! تم اپنے رب کے ساتھ شریک بنانے پر مغفرت طلب کرو، پھر اُن کی طرف توبہ کرو، وہ تم پر تیز موسلا دھار بارش نازل فرمائیں گے اور تمہاری جتنی طاقت ہے اس سے زیادہ تمہیں طاقت عطا فرمائیں گے اور تم توبہ کرنے سے اعراض کرتے ہوئے مجرم نہ بنوO

قَالُوا يَا هُودُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِي آلِهَتِنَا عَن قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ﴿٥٣﴾

اُن کی قوم نے کہا: "اے ہود! آپ ہمارے پاس اپنے اس قول پر کوئی دلیل نہیں لائے اور ہم صرف آپ کے کہنے پر اپنے خود ساختہ معبودوں کی عبادت ترک کرنے والے نہیں ہیں اور نہ ہی ہم آپ پر ایمان لانے والے ہیں"O

إِن نَّقُولُ إِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ آلِهَتِنَا بِسُوءٍ ۗ قَالَ إِنِّي أُشْهِدُ اللَّهَ وَاشْهَدُوا أَنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ ﴿٥٤﴾

ہم کہتے ہیں کہ آپ کو ہمارے خود ساختہ معبودوں میں سے کسی نے سزا دے کر (پاگل بنا دیا) ہے، ہود نے کہا کہ میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہی دو کہ جن کو تم اللہ کا شریک قرار دیتے ہو میں اُن سے بیزار ہوںO

مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ۝۵۵

اللہ کو چھوڑ کر تم سب مل کر مجھے جو ضرر پہنچا سکتے ہو وہ پہنچاؤ، پھر مجھے بالکل مہلت نہ دو O

اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۵۶

بے شک میں نے اللہ پر توکل کیا ہے جو میرے بھی رب ہیں اور تمہارے بھی رب ہیں، زمین پر ہر چلنے والے جان دار کی پیشانی صرف انہی کے قبضہ وقدرت میں ہے، بے شک میرے رب سیدھے راستہ پر چلنے والوں کو ملتے ہیں O

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖۤ اِلَيْكُمْ ؕ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْــًٔا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ۝۵۷

پھر بھی اگر تم نے روگردانی کی تو بے شک میں تم کو وہ پیغام پہنچا چکا ہوں جو پیغام دے کر مجھے تمہاری طرف بھیجا گیا تھا (اور اگر میرے رب نے تم کو ہلاک فرما دیا) تو وہ تمہارے علاوہ دوسری قوم کو لے آئیں گے اور تم اُن کو بالکل ضرر نہیں پہنچا سکو گے، بے شک میرے رب ہر چیز پر نگہبان ہیں O

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۝۵۸

اور جب (اُن کے منکرین پر) ہمارا عذاب آیا تو ہم نے ہود کو اور اُن کے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنی رحمت سے نجات عطا فرمائی اور ہم نے اُن کو سخت عذاب سے نجات عطا فرما دی O

وَتِلْكَ عَادٌ ۟ۙ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۝۵۹

یہ عاد کی قوم کے لوگوں کا قصہ ہے جنہوں نے اپنے رب کی نشانیوں کا انکار کیا اور اپنے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر جابر اور معاند کے حکم کی اطاعت کی O

وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ۝۶۰ ع

اور اس دنیا میں اور قیامت کے دن اُن پر لعنت مسلط فرما دی گئی ہے، سنو! عاد کی قوم نے اپنے رب کا کفر کیا، سنو! ہود کی قوم عاد کے لیے (ہماری رحمت سے) دوری ہے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور ہم نے قومِ عاد کی طرف اُن کے ہم قبیلہ بھائی ہود کو (رسول بنا کر) بھیجا، انہوں نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، تمہارے لیے اُن کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، تم (شرک کر کے) صرف جھوٹا بہتان تراشنے والے ہو○'' (ھود:۵۰)

حضرت ہود علیہ السلام کا اُن کی قوم کے ساتھ قصہ اور حضرت ہود علیہ السلام کو قومِ عاد کا بھائی فرمانے کی توجیہات

''وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا'':

امام ابو منصور محمد بن محمد ماتریدی المتوفی ۳۳۳ھ، ھود:۵۰ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

(۱) اس سے مراد حضرت ہود علیہ السلام کے قومِ عاد کے ہم جنس ہونے کی اخوت ہے اور نسبی اخوت مراد ہے۔

ھود:۵۰ سے علماء دیوبند کا انبیاء علیہم السلام کو اپنا بھائی کہنے پر استدلال اور مصنف کا اس پر رد بلیغ

میں کہتا ہوں: اس آیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ کسی امتی کے لیے اپنے نبی کو بھائی کہنا جائز ہے، کیونکہ اس آیت میں حضرت ہود علیہ السلام نے تواضع اور انکسار سے اپنے آپ کو قومِ عاد کا بھائی فرمایا ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ امتی بھی نبی کو اپنا بھائی کہے۔

شیخ اسماعیل دہلوی متوفی ۱۸۳۱ء، لکھتے ہیں:

یعنی انسان آپس میں سب بھائی ہیں، جو بڑا بزرگ ہو وہ بڑا بھائی ہے، سو اس کے بڑے بھائی کی سی تعظیم کیجئے اور مالک سب کا اللہ ہے بندگی اس کو چاہئے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اولیاء و انبیاء امام و امام زادہ پیر و شہید یعنی جتنے اللہ کے مقرب بندے ہیں وہ سب انسان ہی ہیں اور بندے عاجز اور ہمارے بھائی مگر ان کو اللہ نے بڑائی دی وہ بڑے بھائی ہوئے ہم کو ان کی فرمانبرداری کا حکم ہے ہم ان کے چھوٹے ہیں سو ان کی تعظیم انسانوں کی سی کرنی چاہئے نہ خدا کی سی۔

(تقویۃ الایمان ص ۴۲، مطبع علیمی اندرون لوہاری دروازہ لاہور)

شیخ اسماعیل دہلوی کے ایک وکیل شیخ سرفراز احمد گکھڑوی نے تقویۃ الایمان کی عبارت مذکورہ کی تائید میں لکھا ہے:

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ''وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۔۔۔ (ھود:۵۰)'' ''وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۔۔۔ (ھود:۶۱)'' ''وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ۔۔۔ (ھود:۸۴)''۔

سو ان آیات کے ہوتے ہوئے کون مسلمان اپنی قوم کے لیے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی اس اخوت سے انکار کر سکتا ہے۔

(عبارات اکابر ص ۶۹، گوجرانوالہ ۱۴۰۵ھ)

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو اپنا بھائی کہنے کے عدمِ جواز پر مصنف کے دلائل

اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کے مالک و مولیٰ ہیں اور انبیاء علیہم السلام اس کے بندے ہیں، اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو جو کچھ فرمائیں وہ ان کو زیبا ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں: ''وَعَصٰۤی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی ۝ (طٰہٰ:۱۲۱)'' (اور آدم نے اپنے رب کی معصیت کی، پس وہ بے راہ ہوئے○)۔ کیا اس آیت کو دیکھ کر حضرت آدم علیہ السلام کو عاصی، بے راہ اور گمراہ کہنا جائز ہے؟

علامہ ابن الحاج مالکی متوفی ۷۳۷ھ لکھتے ہیں:

جس شخص نے تلاوت کے دوران یا حدیث کی قراءت کے دوران حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق کہا کہ انہوں نے معصیت کی، وہ کافر ہو گیا۔ (المدخل، ج ۲ ص ۱۴، دار الفکر، بیروت)

نیز حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: "قَالَ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ"۔ (القصص:۱۶)" (موسیٰ نے کہا: اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر ظلم کیا)۔ کیا اس آیت کو دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ظالم کہنا جائز ہے؟، کیونکہ انہوں نے خود کہا: "میں نے اپنی جان پر ظلم کیا"۔

شیخ اسماعیل دہلوی اور ان کے وکلاء کے رد کے لیے خود ان کے گھرانے کے مشہور عالم شیخ خلیل احمد سہارنپوری متوفی ۱۳۴۶ھ کی یہ عبارت کافی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"جو اس کا قائل ہو کہ نبی کریم علیہ السلام کو ہم پر بس اتنی فضیلت ہے جتنی بڑے بھائی کو چھوٹے بھائی پر ہوتی ہے تو اس کے متعلق ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ دائرہ ایمان سے خارج ہے (الی قولہ) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا افضل البشر اور تمام مخلوقات سے اشرف اور جمیع پیغمبروں کا سردار اور سارے نبیوں کا امام ہونا ایسا قطعی امر ہے جس میں ادنیٰ مسلمان بھی تردد نہیں کر سکتا"۔

(عقائد علماء دیوبند ص ۲۸، مطبوعہ مطبع سعیدی، کراچی)

ہود: ۵۰ کی بقیہ توجیہات

(۲) اس سے اُن کی دینی اُخوت مراد نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ"۔ (الحجرات:۱۰)" (یعنی صرف مومنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں)۔ اور چونکہ قومِ عاد مومن نہیں تھی، اس لیے حضرت ہود علیہ السلام نے اُن کو بھائی کہہ کر اُن سے دینی اخوت مراد نہیں لی۔

(۳) تمام لوگ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، اس لیے حضرت ہود علیہ السلام قومِ عاد کے نسباً بھائی تھے۔

"قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ": یعنی تم جن کی عبادت کرتے ہو وہ عبادت کے مستحق نہیں ہیں، عبادت کے مستحق صرف اللہ عزوجل ہیں جنہوں نے تم کو بھی پیدا فرمایا ہے اور تمام چیزوں کو پیدا فرمایا ہے۔

"اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ": حضرت ہود علیہ السلام نے ابتداءً قومِ عاد سے یہ نہیں کہا کہ تم اللہ پر افتراء باندھنے والے ہو، بلکہ ابتداءً اُن کو توحید کی دعوت دی، کیونکہ انبیاء علیہم السلام کو یہ حکم فرمایا جاتا ہے کہ وہ تبلیغ میں نرمی کو اختیار کریں، جیسے اللہ عزوجل نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرعون کی طرف بھیجتے وقت فرمایا: "فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا"۔ (طہ:۴۴)" (یعنی تم دونوں فرعون سے نرمی سے بات کرنا)، لیکن جب بار بار حضرت ہود علیہ السلام نے اُن کو توحید کی نرمی کے ساتھ دعوت دی اور اُن پر توحید پر دلائل اور براہین بھی پیش کر دیے اور پھر بھی اُن کی قوم نے یہ کہا: "يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ"۔ (ہود:۵۳)" (اے ہود! آپ ہمارے پاس اپنے اس قول پر کوئی دلیل نہیں لائے)۔ تب حضرت ہود علیہ السلام نے اُن سے کہا: "اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ"۔

قومِ عاد کو "مفترین" فرمانے کی توجیہات

(۱) قومِ عاد کو افتراء باندھنے والے اس وجہ سے فرمایا کہ وہ یہ کہتے تھے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے ان بتوں کی عبادت کرنے کا حکم دیا ہے تو حضرت ہود علیہ السلام نے کہا کہ تم اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھ رہے ہو۔

(۲) یا اس وجہ سے فرمایا کہ وہ حضرت ہود علیہ السلام کے مبعوث ہونے اور رسول ہونے کا انکار کرتے تھے، تو یہ اُن کا افتراء ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اے میری قوم! میں تم سے تبلیغ دین پر کسی معاوضہ کا سوال نہیں کر رہا، میرا اجر تو صرف اُنہی کے ذمۂ کرم پر ہے جنہوں نے مجھے پیدا فرمایا ہے، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟O (ہود: ۵۱)

''یٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى الَّذِیْ فَطَرَنِیْ'': یعنی میں اس تبلیغ کی مشقت اٹھانے پر تم سے کسی معاوضہ کا سوال نہیں کرتا، پھر تم میری اس تبلیغ کو کیوں قبول نہیں کرتے؟

''اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ'': کیا تم عقل سے اس پر غور نہیں کر رہے کہ میں تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے نشانیاں اور دلائل لے کر آیا ہوں، یا تم اس پر عقل سے غور نہیں کرتے کہ اللہ عزوجل واحد ہیں اور وہ ہر چیز کے رب ہیں اور ہر چیز کے خالق ہیں اور اس کے پیدا فرمانے والے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور اے میری قوم! تم اپنے رب کے ساتھ شریک بنانے پر مغفرت طلب کرو، پھر اُن کی طرف توبہ کرو، وہ تم پر تیز موسلا دھار بارش نازل فرمائیں گے اور تمہاری جتنی طاقت ہے اس سے زیادہ تمہیں طاقت عطا فرمائیں گے اور تم توبہ کرنے سے اعراض کرتے ہوئے مجرم نہ بنوO'' (ہود: ۵۲)

استغفار اور توبہ کے محامل

''وَیٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ'':

(۱) یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ نے اُن کو پہلے توبہ کا حکم دیا ہو، پھر اپنے برے کاموں پر استغفار کرنے کا حکم دیا ہو، یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو قبول کرو اور اپنے کیے ہوئے برے کاموں پر نادم ہو۔

(۲) یہ معلوم ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام نے جو ''اسْتَغْفِرُوْا'' کہا، اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ اُن کی قوم کہے: ''ہم اللہ سے استغفار کرتے ہیں''، بلکہ اُن کو یہ حکم دیا کہ وہ اس سبب کو طلب کریں جس کی وجہ سے اُن کے لیے مغفرت کرنا واجب ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ اللہ عزوجل کو واحد نہیں مانتے تھے، تو گویا کہ یوں فرمایا: تم اپنے رب کو واحد مانو، پس ان پر ایمان لاؤ پھر اُن کی طرف توبہ کرو۔

''یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا'': یعنی اللہ تعالیٰ تم پر مسلسل بارش نازل فرمائیں گے جس سے تمہاری قوت میں اضافہ ہوگا، اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اُن کے جرائم کی وجہ سے اُن سے بارش کو روک دیا گیا تھا اور اُن کی نسل منقطع ہوگئی تھی، تو حضرت ہود علیہ السلام نے اُن کو خبر دی کہ اگر تم نے اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ کر لی اور اپنے رب سے استغفار کر لیا تو اللہ تعالیٰ تم پر مسلسل بارش نازل فرمائیں گے۔

''وَّیَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ'': یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے اعضاء میں کام کرنے کی قوت عطا فرمائیں گے۔

''وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِیْنَ'': یعنی میں تم کو جس توحید کی طرف دعوت دے رہا ہوں، تم اس دعوت کا انکار کر کے اور گناہوں پر اصرار کر کے مجرم نہ بنو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اُن کی قوم نے کہا: ''اے ہود! آپ ہمارے پاس اپنے اس قول پر کوئی دلیل نہیں

لائے اور ہم صرف آپ کے کہنے پر اپنے خودساختہ معبودوں کی عبادت ترک کرنے والے نہیں ہیں اور نہ ہی ہم آپ پر ایمان لانے والے ہیں"O (ہود: ۵۳)

"قَالُوْا یٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَیِّنَةٍ وَّ مَا نَحْنُ بِتَارِكِیْۤ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَ مَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِیْنَ":

یعنی قوم عاد نے کہا: آپ ہمیں جس توحید کی دعوت دے رہے ہیں یا آپ ہمیں اپنے رسول ہونے کے اعتراف کی دعوت دے رہے ہیں، آپ اس پر کوئی قوی دلیل نہیں لائے، اور ہم محض آپ کے کہنے سے اپنے خودساختہ معبودوں کی عبادت کو ترک کرنے والے نہیں ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "ہم کہتے ہیں کہ آپ کو ہمارے خودساختہ معبودوں میں سے کسی نے سزا دے کر (پاگل بنا دیا) ہے، ہود نے کہا کہ میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہی دو کہ جن کو تم اللہ کا شریک قرار دیتے ہو میں اُن سے بیزار ہوں O اللہ کو چھوڑ کر تم سب مل کر مجھے جو ضرر پہنچا سکتے ہو وہ پہنچاؤ، پھر مجھے بالکل مہلت نہ دو O" (ہود: ۵۴۔۵۵)

"اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ":

چونکہ حضرت ہود علیہ السلام قوم ہود کے خودساختہ معبودوں کی مذمت کرتے تھے اور اُن کا عجز بیان کرتے تھے تو ان کی قوم نے کہا: آپ نے جو ہمارے خودساختہ معبودوں کی مذمت کی ہے، اس کی سزا نے آپ کو دیوانہ بنا دیا ہے، گویا کہ انہوں نے کہا کہ ہم آپ کو اپنے خداؤں کی مذمت کرنے سے منع کرتے ہیں تاکہ کہیں آپ کو کوئی ضرر نہ پہنچے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ قوم عاد نے کہا: آپ نے ہمارے خداؤں کو برا کہا ہے تو انہوں نے آپ کو مجنون بنا دیا ہے۔

"قَالَ اِنِّیْۤ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَ اشْهَدُوْۤا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ": یعنی تم جن خداؤں کی عبادت کرتے ہو، میں اللہ کو گواہ کر کے اپنے آپ کو اُن سے بری قرار دیتا ہوں اور تم بھی گواہ ہو جاؤ کہ میں تمہارے خودساختہ معبودوں سے بری ہوں۔

"مِنْ دُوْنِهٖ فَكِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا": پھر تم اور تمہارے معبود مل کر مجھے جو ضرر پہنچا سکتے ہوں اور نقصان دے سکتے ہوں، وہ نقصان پہنچائیں۔ "ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ": پھر مجھے تم بالکل بھی مہلت نہ دو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "بے شک میں نے اللہ پر توکل کیا ہے جو میرے بھی رب ہیں اور تمہارے بھی رب ہیں، زمین پر ہر چلنے والے جان دار کی پیشانی صرف انہی کے قبضہ وقدرت میں ہے، بے شک میرے رب سیدھے راستہ پر چلنے والوں کو ملتے ہیں O" (ہود: ۵۶)

"اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّیْ وَ رَبِّكُمْ": یعنی میں نے اپنے معاملات اللہ تعالیٰ کو سونپ دیے ہیں اور اپنے تمام کاموں میں انہی پر بھروسا کیا ہے۔ اور تم جو مجھے اپنے بتوں کے ہلاک کر دینے سے ڈراتے ہو تو مجھے اپنے اللہ پر ہی اعتماد ہے کہ جن سزاؤں سے تم

نے ڈرایا ہے اُن سے میرے اللہ ہی بچانے والے ہیں جو میرے بھی رب ہیں اور تمہارے بھی رب ہیں۔ پس تم مجھے کیوں اپنے اُن خداؤں سے ڈراتے ہو جن کی تم عبادت کرتے ہو اور تم اس ذات سے نہیں ڈرتے جو میرے بھی رب ہیں اور تمہارے بھی رب ہیں۔

"مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِهَا": یعنی روئے زمین پر چلنے والا ہر جان دار اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں ہے اور اُن کی سلطنت میں ہے۔ "اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ": یعنی اللہ ہی نے مجھے صراط مستقیم پر چلنے کا حکم فرمایا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پھر بھی اگر تم نے روگردانی کی تو بے شک میں تم کو وہ پیغام پہنچا چکا ہوں جو پیغام دے کر مجھے تمہاری طرف بھیجا گیا تھا (اور اگر میرے رب نے تم کو ہلاک فرما دیا) تو وہ تمہارے علاوہ دوسری قوم کو لے آئیں گے اور تم اُن کو بالکل ضرر نہیں پہنچا سکو گے، بے شک میرے رب ہر چیز پر نگہبان ہیں○"
(ھود: ۵۷)

"فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖۤ اِلَیْكُمْؕ وَ یَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَكُمْۚ وَ لَا تَضُرُّوْنَهٗ شَیْــٴًـا": یہ آیت اس طرح ہے جیسے المائدہ: ۹۹ میں فرمایا: "مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ"، یا جیسے النحل: ۸۲ میں فرمایا: "فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ○" یعنی رسول کے ذمہ تو صرف احکام کو پہنچا دینا ہے اور اگر تم نے میرے احکام کو قبول نہیں کیا تو اس پر مجھ سے مواخذہ نہیں ہوگا۔

"وَ یَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ" کے دو محمل

(۱) یعنی اللہ عزوجل نے قومِ عاد کو ہلاک فرمانے کی خبر دی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ وہ ان کے بدلے دوسری قوم کو لے آئیں گے اور جب تک یہ لوگ ہلاک نہ ہوں تو ان کے بدلہ میں دوسری قوم کیسے آئے گی؟

(۲) دوسرا محمل یہ ہے کہ وہ کہتے تھے: "مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً" (حم السجدہ: ۱۵)" (ہم سے زیادہ قوت والا کون ہے؟) اللہ عزوجل نے جتلایا کہ تمہاری بدنی طاقتیں اللہ تعالیٰ کے تم کو ہلاک فرمانے سے عاجز نہیں کر سکتیں۔ اور اس سے یہ معلوم ہوا کہ عاد اس جہان میں آخری لوگ نہیں تھے بلکہ ان کے بعد بھی اور لوگ تھے۔

"وَ لَا تَضُرُّوْنَهٗ شَیْــٴًـا" کے محامل

(۱) یعنی اگر تم نے میرے پیغام کو رد کر دیا اور مجھے رسول نہیں مانا تو ایسا نہیں ہوگا کہ جیسے دنیاوی بادشاہوں کی رعایا اُن سے پیٹھ پھیر لے تو اُن کو نقصان ہوتا ہے، لہٰذا مجھے تمہاری روگردانی سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

(۲) یعنی تم مجھے اس طرح ضرر نہیں پہنچا سکو گے جس طرح دنیاوی بادشاہوں سے بغاوت کر کے اور اُن سے جنگ کر کے انہیں نقصان پہنچاتے ہو۔

(۳) حضرت ہود علیہ السلام کو یہ خطرہ نہیں تھا کہ اگر قومِ عاد نے اُن سے روگردانی کی تو جو فوائد قومِ عاد سے اُن کو ملے تھے، جاتے رہیں گے، کیونکہ قومِ عاد سے انہیں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا تھا۔

"اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ": یعنی کوئی چیز خواہ کتنی باریک ہو، وہ میرے رب سے مخفی نہیں ہے تو تمہارے اعمال

اور تمہارے احوال جو بالکل ظاہر ہیں، وہ میرے رب سے کیسے مخفی رہیں گے؟ یا اس کا معنی یہ ہے کہ میرے رب ہر چیز کے محافظ ہیں، اور کوئی چیز اُن سے تجاوز نہیں کر سکتی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور جب (اُن کے منکرین پر) ہمارا عذاب آیا تو ہم نے ہود کو اور اُن کے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنی رحمت سے نجات عطا فرمائی اور ہم نے اُن کو سخت عذاب سے نجات عطا فرمادی O''

(ہود:۵۸)

''وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا'': اس آیت میں امر سے مراد امر تکوین ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اِنَّمَآ اَمْرُهٗۤ اِذَآ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ۝ (یٰس:۸۲)'' (جب وہ کسی چیز کا ارادہ فرماتے ہیں تو اُن کی شان یہی ہے کہ وہ اس چیز سے فرماتے ہیں: ''ہوجا'' تو وہ ہوجاتی ہے)۔

''نَجَّیْنَا هُوْدًا وَّالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا'' ''وَنَجَّیْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِیْظٍ'': یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ جو شخص بھی نجات پائے تو وہ اپنے عمل سے نجات نہیں پاتا، وہ صرف اللہ تعالیٰ کی رحمت سے نجات پاتا ہے۔

عمل پر نجات کا مدار نہ ہونا بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی رحمت پر نجات کا مدار ہونا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: درست کام کرو اور میانہ روی سے کرو اور بشارت لو، کیونکہ تم میں سے کسی شخص کو اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرے گا، صحابہ نے عرض کیا: اور نہ آپ کو یا رسول اللہ؟ آپ نے فرمایا: اور نہ مجھے سوا اس کے کہ اللہ تعالیٰ مجھے مغفرت اور رحمت سے ڈھانپ لیں۔

(صحیح البخاری: ۶۴۶۳، صحیح مسلم: ۲۸۱۸، سنن ابن ماجہ: ۴۲۰۱، سنن ابوداؤد: ۱۳۶۹، مسند احمد: ۲۴۴۳۰، مسند اسحاق بن راہویہ: ۱۰۶۰، المنتخب من مسند عبد بن حمید: ۸۹۳، سنن دارمی: ۲۷۷۵، الادب المفرد للبخاری: ۴۶۱، مسند البزار ج ۸ ص ۱۱۸، شرح مشکل الآثار: ۵۸۴۰، صحیح ابن حبان: ۳۴۸، المعجم الاوسط للطبرانی: ۳۳۹۳، المعجم الکبیر للطبرانی: ۴۹۳، ۱۰۰۱، ۲۱۸، ۷، مسند الشامیین للطبرانی: ۲۸۶، حلیۃ الاولیاء: ج ۷ ص ۱۲۹، مسند الشہاب القضاعی: ۱۲۶۱، البعث والنشور للبیہقی: ۱۰۳۵، الآداب للبیہقی: ۸۶۶، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۴۷۲۰، شعب الایمان للبیہقی: ۷۵۰، شرح السنۃ للبغوی: ۴۱۹۳، کشف المشکل لابن الجوزی: ۷۱۵، موارد الظمآن للہیثمی: ۱۷۴۸، الجامع الصحیح للسنن والمسانید لابن الجوزی ج ۳ ص ۳۶۹، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشرۃ ج ۵ ص ۳۸۳)

جب نجات صرف اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہوگی تو پھر اس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کی توجیہ

علامہ بدرالدین ابو محمد محمود بن احمد العینی الحنفی المتوفی ۸۵۵ھ، اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

اس حدیث میں مذکور ہے ''لن ینجی'' یعنی تم میں سے کوئی شخص ہرگز نجات نہیں پا سکتا یا اللہ تعالیٰ کے عذاب سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔

اس حدیث میں مذکور ہے ''ولا انا'' علامہ کرمانی شافعی متوفی ۷۸۶ھ نے کہا ہے: جب تمام لوگ جنت میں صرف اللہ تعالیٰ کی رحمت سے داخل ہوں گے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذکر کے ساتھ تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ جب آپ کے متعلق قطعی دلیل سے یہ ثابت

ہے کہ آپ جنت میں داخل ہوں گے اور آپ اللہ کی رحمت سے ہی جنت میں داخل ہوں گے تو جو آپ کے علاوہ کوئی شخص ہے وہ تو بطریق اولیٰ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بغیر داخل نہیں ہوگا۔

تغمّد بالرحمۃ کا معنی

اس حدیث میں مذکور ہے "الا ان یتغمدنی اللہ برحمۃ" یعنی سوا اس صورت کے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں مجھے چھپالیں۔ جب اللہ تعالیٰ کسی کو اپنی رحمت سے چھپالیں تو کہا جاتا ہے "تغمدہ اللہ برحمتہ" اور جب تم کسی شخص کو چھپالو تو کہا جاتا ہے "تغمدت فلانا" اور اسی سے ماخوذ ہے "غمد السیف" یعنی تلوار کی میان، کیونکہ جب تم نے تلوار کو میان میں رکھ لیا تو تم نے تلوار کو اس کے غلاف میں چھپالیا۔ اور سہیل کی روایت میں ہے "الا ان یتدارکنی" سوا اس صورت کے کہ اللہ تعالیٰ اس کا تدارک فرمائیں اور اس کی تلافی فرمائیں۔

اس سوال کا جواب کہ جنت کا حصول بندوں کے عمل سے نہیں ہوگا صرف اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہوگا اور قرآن مجید میں مذکور ہے کہ بندوں کے اعمال کی وجہ سے جنت کا حصول ہوگا

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِیْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ (الزخرف:٧٢) اور یہ وہ جنت ہے جس کے تم اپنے اعمال کی وجہ سے وارث فرمائے گئے ہو ○

علامہ ابن بطال نے اس کا جواب دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جنت کے درجات اور مراتب اعمال کی وجہ سے ملیں گے اور جنت کے درجات اعمال کے اعتبار سے مختلف ہیں اور حدیث اس پر محمول ہے کہ جنت میں نفسِ دخول اور اس میں دوام اللہ کے فضل کے بغیر نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ۔ (فاطر:٣٥) "(جس نے ہمیں اپنے فضل سے ہمیشہ رہنے کے گھر میں ٹھہرایا)۔ البتہ جنت کے درجات اعمال کے اعتبار سے ملیں گے۔

پھر اس جواب پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ قرآن مجید میں ہے:

سَلٰمٌ عَلَیْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ (النحل:٣٢) تم پر سلام ہو، تم جنت میں داخل ہو جاؤ، ان (نیک) کاموں کی وجہ سے جو تم کرتے تھے ○

اس آیت میں تصریح ہے کہ جنت میں دخول بھی اعمال کے سبب سے ہوگا۔

اس کا جواب علامہ ابن بطال نے اس طرح دیا کہ یہ لفظ مجمل ہے اور حدیث نے اس کو بیان کر دیا ہے اور اصل عبارت یوں ہے کہ "تم جنت کے منازل اور جنت کے محلات میں داخل ہو جاؤ اپنے اعمال کی وجہ سے"۔

اس حدیث میں مذکور ہے "سددوا" یعنی سداد کا قصد کرو، اور سداد کا معنی ہے ثواب۔

علامہ کرمانی نے کہا ہے کہ قول اور عمل میں میانہ روی کو اختیار کرو اور وہی صواب ہے۔

عبادت میں غلو کی ممانعت اور اعتدال سے عبادت کرنے کی ترغیب

اس حدیث میں مذکور ہے "وقاربوا" یعنی تم عمل میں افراط اور زیادتی نہ کرو تم عبادت کرنے میں بہت زیادہ کوشش کرو گے تو وہ تم کو تھکا دے گی، پھر تم عبادت کرنے سے اکتا جاؤ گے اور عمل کو چھوڑ دو گے، اس لیے تم حد سے زیادہ عمل نہ کرو بلکہ درمیانی عمل کرو۔

اس حدیث میں مذکور ہے "القصدَ القصدَ"، ان الفاظ میں القصد پر زبر ہے اور اس پر زبر برانگیختہ کرنے کے لیے ہے، یعنی طریق متوسط کو لازم رکھو اور اس منزل پر پہنچ جاؤ جو تمہارا مقصود ہے۔ اس میں عبادت گزاروں کو مسافروں کے ساتھ تشبیہ دی ہے گویا کہ فرمایا کہ تم تمام اوقات میں عبادت نہ کرو بلکہ خوشی کے اوقات میں عبادت کرنے کو لازم رکھو، کچھ صبح کے وقت کچھ شام کے اخیر میں اور کچھ رات کے بعض حصہ میں، اور اپنے نفسوں پر رحم کرو۔

اس حدیث میں اس آیت سے اقتباس ہے:

وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِیْنَ ۚ (ہود: ۱۱۴)

اور دن کی دونوں طرفوں میں اور (ابتدائی) رات کے کچھ حصوں میں نماز قائم رکھئے، بے شک نیکیاں، گناہوں کو مٹا دیتی ہیں، یہ ان لوگوں کے لیے نصیحت ہے جو نصیحت قبول کرنے والے ہیں O

(عمدۃ القاری ج ۲۳ ص ۹۷، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۱ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "یہ عاد کی قوم کے لوگوں کا قصہ ہے جنہوں نے اپنے رب کی نشانیوں کا انکار کیا اور اپنے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر جابر اور ظالم کے حکم کی اطاعت کی O" (ہود: ۵۹)

"وَ تِلْكَ عَادٌ ﳜ جَحَدُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ وَ عَصَوْا رُسُلَهٗ": اس آیت میں یہ بیان فرمایا ہے کہ قوم عاد نے اپنے رب کی آیات کا انکار کیا اور اپنے رسولوں کی نافرمانی کی اور اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ کفر کرنا تمام رسولوں کے ساتھ کفر کرنے کو مستلزم ہے، اور کسی ایک رسول کا کفر کرنا تمام رسولوں کا کفر کرنا ہے۔ یعنی یہ سوال نہ کیا جائے کہ قوم عاد نے تو صرف حضرت ہود علیہ السلام کی نافرمانی اور اُن کے دلائل کا انکار کیا تھا، اور قرآن مجید کی اس آیت میں فرمایا: "انہوں نے اللہ کی آیات اور ان کے رسولوں کا انکار کیا" تو اس کا علامہ ماتریدی نے جواب دیا کہ ایک رسول کا انکار اللہ تعالیٰ کے سارے رسولوں کا انکار ہے۔

"وَ اتَّبَعُوْۤا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ": اس آیت میں یہ خبر دی ہے کہ انہوں نے جابر اور ظالم حکمرانوں کی پیروی کی اور رسولوں کی اتباع اور اُن کی اطاعت کرنے کو ترک کر دیا۔ کہا گیا ہے کہ جبار وہ شخص ہے جو از خود بڑا بنا ہوا اور رسولوں کے سامنے اپنی بڑائی ظاہر کرتا ہو، کیونکہ اُن کے سردار رسولوں کے سامنے اپنی بڑائی ظاہر کرتے تھے اور تکبر کرتے تھے، پھر اُن کے پیروکار اپنے سرداروں کے عمل کی پیروی کرتے تھے۔

ابوعبیدہ نے کہا: جبار اس شخص کو کہتے ہیں جو از خود بڑا بنا ہوا اور العنید اس شخص کو کہتے ہیں جو معاند اور مخالف ہو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اس دنیا میں اور قیامت کے دن اُن پر لعنت مسلط فرما دی گئی ہے، سنو! عاد کی قوم نے اپنے رب کا کفر کیا، سنو! ہود کی قوم عاد کے لیے (ہماری رحمت سے) دوری ہے O" (ہود: ۶۰)

بعض مفسرین نے کہا: لعن سے مراد ہے عذاب۔ یعنی اُن پر اس دنیا میں بھی عذاب نازل فرمایا گیا اور آخرت میں بھی ان کو عذاب کے ساتھ جکڑ لیا جائے گا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۸﴾ (ہود:۱۸)'' (سنو! ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے)۔

''وَاُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً وَّیَوْمَ الْقِیٰمَةِ'': یعنی اُن ظالموں کے ساتھ ان کے پیروکاروں کو بھی ملا دیا گیا، دوسرا قول ہے کہ اللعن کا معنی ہے: اپنے دروازہ سے بھگا دینا، یعنی یہ ظالم لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور فرما دیئے گئے حتیٰ کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی رحمت کو نہ اس دنیا میں پایا اور نہ آخرت میں پائیں گے۔

''اَلَاۤ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ'': یعنی ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور فرما دیا گیا۔

(تاویلات اہل السنۃ ج ۶ ص ۱۳۱۔۱۳۶، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۶ھ)

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِیْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ ؕ اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ ﴿۶۱﴾

اور ہم نے قومِ ثمود کی طرف اُن کے ہم قبیلہ بھائی صالح کو (رسول بنا کر) بھیجا، انہوں نے اپنی قوم سے کہا: ''اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، تمہاری عبادت کا اللہ کے سوا کوئی اور مستحق نہیں ہے، انہوں نے ہی تم کو زمین سے پیدا فرمایا اور تم کو اسی زمین میں آباد فرمایا، سو تم ان ہی سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرو، پھر تم انہی کی طرف توبہ کرو، بے شک میرے رب (سب کے) بہت قریب ہیں، (وہی) دعاؤں کو قبول فرمانے والے ہیں'' O

قَالُوْا یٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِیْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَاۤ اَتَنْهٰىنَاۤ اَنْ نَّعْبُدَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِیْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَیْهِ مُرِیْبٍ ﴿۶۲﴾

اُن کی قوم نے کہا: ''اے صالح! اس سے پہلے تو ہماری امیدیں آپ سے وابستہ تھیں، کیا آپ ہم کو اُن کی عبادت سے منع کرتے ہیں جن کی عبادت ہمارے آباء و اجداد کرتے تھے، اور آپ جس رب کی توحید کی ہمیں دعوت دیتے ہیں، اس پر ہمیں بہت بڑا شک ہے'' O

قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَاٰتٰىنِیْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ یَّنْصُرُنِیْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَیْتُهٗ ۫ فَمَا تَزِیْدُوْنَنِیْ غَیْرَ تَخْسِیْرٍ ﴿۶۳﴾

صالح نے کہا: ''اے میری قوم! یہ بتاؤ اگر میرے پاس میرے دعویٰ رسالت پر کوئی دلیل ہو اور اللہ نے مجھے اپنے پاس سے رحمت (یعنی رسالت) عطا فرمائی ہو، پھر اگر میں اپنے رب کی (بالفرض) نافرمانی کروں تو مجھے اللہ کے عذاب سے کون بچائے

گا؟ پس تم مجھے سوا نقصان میں اضافہ کرنے کے اور کیا دو گے!" O

وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ﴿۶۴﴾

اور اے میری قوم! یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے ایک (عظیم) نشانی ہے، اس کو کھلا چھوڑ دو یہ اللہ کی زمین میں چرتی رہے اور اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچانا، ورنہ تم کو اللہ کا عذاب جلد اپنی گرفت میں لے لے گا O

فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿۶۵﴾

سو صالح کی قوم نے اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں، تب صالح نے کہا: "تم اپنے اپنے گھروں میں تین دنوں تک فائدہ اٹھاتے رہو (یعنی تم صرف تین دن تک زندہ رہو گے)، یہ اللہ کا برحق وعدہ ہے اور اس میں جھوٹ نہیں ہے" O

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿۶۶﴾

پھر جب ہمارا عذاب آ گیا تو ہم نے صالح اور اُن کے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنی رحمت سے نجات دے دی اور اپنی رحمت سے اُن کو اس دن کی رسوائی سے محفوظ رکھا، بے شک آپ کے رب ہی سب سے زیادہ قوت والے، سب سے زیادہ غالب ہیں O

وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۶۷﴾

اور اپنی جان پر ظلم کرنے والے کافروں کو ایک ہولناک چیخ نے پکڑ لیا، سو وہ اپنے گھروں میں ہی گھٹنوں کے بل مردہ پڑے رہ گئے O

كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَا۟ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿۶۸﴾

گویا کہ وہ کبھی اُن گھروں میں رہے ہی نہ تھے، سنو! بے شک قومِ ثمود نے اپنے رب کا کفر کیا، سنو! قومِ ثمود کے لیے (اللہ سے) دوری ہو O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ہم نے قومِ ثمود کی طرف اُن کے ہم قبیلہ بھائی صالح کو (رسول بنا کر) بھیجا، انہوں نے اپنی قوم سے کہا: "اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، تمہاری عبادت کا اللہ کے سوا کوئی اور مستحق نہیں ہے، انہوں نے ہی تم کو زمین سے پیدا فرمایا اور تم کو اسی زمین میں آباد فرمایا، سو تم ان ہی سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرو، پھر تم انہی کی طرف توبہ کرو، بے شک میرے رب (سب کے) بہت قریب

ہیں، (وہی) دعاؤں کو قبول فرمانے والے ہیں'' O (ہود:٦١)

حضرت صالح علیہ السلام کا اُن کی قوم کے ساتھ قصہ

علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ٦٦٨ھ، ہود:٦١ تا ٦٨ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا'': اور ہم نے قوم ثمود کی طرف صالح کو رسول بنا کر بھیجا۔

''قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ'': یعنی ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتداء زمین سے فرمائی ہے، کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کو زمین کی مٹی سے پیدا فرمایا گیا ہے۔ ''وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِیْهَا'': اور تم کو زمین میں رہنے والا بنادیا۔ الضحاک نے کہا کہ تمہاری عمروں کو طویل فرمایا، اور اُن کی عمریں تین سو سے لے کر ایک ہزار سال تک تھیں۔

العمریٰ کے متعلق فقہاء کے مذاہب

(۱) جب کوئی شخص یہ کہے کہ تم تاحیات میرے مال سے فائدہ اٹھاتے رہو تو اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنی تمام زندگی اس شخص کی نفع آور چیزوں سے فائدہ اٹھاتا رہے، پھر جب وہ شخص مرجائے تو اس کا مال اس شخص کی طرف لوٹ جائے گا یا اس کے وارثوں کی طرف۔ یہ القاسم بن محمد اور یزید بن قسیط اور اللیث بن سعد کا قول ہے، اور یہی امام مالک کا مشہور مذہب ہے اور امام شافعی کا ایک قول ہے۔

(۲) جب کوئی شخص کسی سے کہے کہ تم الرقبی تک فائدہ اٹھاتے رہو تو اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنی املاک کے منافع کا اس شخص کو مالک بنا رہا ہے اور یہ قطعی طور پر ہبہ ہے، اور یہ امام ابوحنیفہ، امام شافعی، اور ان دونوں کے اصحاب کا، الثوری کا، الحسن بن حی کا، امام احمد بن حنبل، ابن شبرمہ اور امام ابوعبید کا قول ہے، انہوں نے کہا: جب کسی شخص نے کسی کو اپنی تمام زندگی کے لیے اپنے منافع کا مالک بنادیا تو اُن منافع کی ملکیت اس شخص کی زندگی تک ہے اور اس کی وفات کے بعد وہ منافع اس کے وارثوں کی طرف لوٹ جائیں گے، اور دینے والے کا حیات اور عمر کی قید لگانا باطل ہے، کیونکہ حدیث میں ہے:

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس شخص نے اپنی پوری عمر کے لیے کسی دوسرے شخص کو کوئی چیز دے دی تو وہ اس دوسرے شخص کے لیے اور اس کے وارثوں کے لیے ہوگی، اور جس نے وہ چیز دی ہے اس کی طرف نہیں لوٹے گی، کیونکہ اس نے اس کو ایسی چیز دی ہے جس میں وراثت جاری ہوتی ہے''۔

(صحیح مسلم: ١٦٢٥، الرقم المسلسل: ٤١٦٣، رقم حدیث الباب: ٢٠، صحیح البخاری: ٢٦٢٥، سنن ترمذی: ١٣٤٨، سنن نسائی: ٣٧٤٣، ٣٧٥٢، سنن ابن ماجہ: ٢٣٨٠)

العمریٰ کے متعلق فقہاء کا اختلاف

اب اس میں اختلاف ہے کہ جب وہ چیز اس کی ملک میں آ گئی، جس کے لیے عمریٰ کیا ہے تو آیا وہ اس چیز کے رقبہ کا مالک ہو گیا، وہ اس کو فروخت کرسکتا ہے، خرید سکتا ہے اور دیگر تصرفات کرسکتا ہے؟ سو یہ امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد کا قول ہے اور امام مالک کا قول یہ ہے کہ وہ صرف منفعت کا مالک ہے جیسے وقف ہوتا ہے، اس مذہب کے مطابق جب وہ فوت ہو جائے گا جس کے لیے

تا حیات ہبہ کیا تھا تو پھر یہ چیز ہبہ کرنے والے کی طرف لوٹ جائے گی، نیز امام مالک نے کہا ہے کہ خواہ بہ طور عمریٰ دینے والے نے یہ کہہ دیا کہ تمہارے مرنے کے بعد یہ چیز تمہارے وارثوں کی ہوگی، پھر بھی وہ اس کی موت کے بعد اصل مالک کی طرف لوٹ جائے گی۔ (عمدۃ القاری ج ۱۳ ص ۲۵۲۔۲۵۳، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۱ھ)

العمریٰ میں امام مالک کا موقف اور اس کے خلاف جمہور کے دلائل

علامہ ابوالحسن علی بن خلف ابن بطال مالکی قرطبی متوفی ۴۴۹ھ، امام مالک کا مذہب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ جب کسی شخص نے دوسرے سے کہا: میں نے تم کو اپنا یہ گھر یا یہ زمین عمر بھر کے لیے دے دی تو اس نے اس شخص کو اپنی مدتِ حیات میں یہ مکان یا زمین نفع حاصل کرنے کے لیے دی ہے اور جب وہ مر جائے گا تو وہ مکان یا زمین اس کے اصل مالک کی طرف لوٹ جائے گی اور جب اس نے یہ کہا کہ میں نے یہ مکان تم کو عمر بھر کے لیے دیا ہے اور تمہارے بعد یہ تمہارے وارثوں کا ہوگا، تب بھی اس نے اس شخص کے لیے اس مکان کی منفعت کو ہبہ کیا ہے اور اس شخص اور اس کے وارثوں کے مرنے کے بعد وہ مکان اصل مالک کی طرف لوٹ جائے گا کیونکہ اس نے مکان کی منفعت ہبہ کی تھی، مکان کا رقبہ ہبہ نہیں کیا تھا۔ امام شافعی کا ایک قول بھی اس کے موافق ہے۔

فقہاء احناف، امام شافعی کا دوسرا قول اور امام احمد بن حنبل کا مذہب یہ ہے کہ بعد میں وہ مکان اس کی ملکیت ہو جاتا ہے، جس کو ہبہ کیا گیا ہے اور اس کے مرنے کے بعد وہ اس کے وارثوں کی ملک ہو جائے گا اور ہبہ کرنے والے کی طرف وہ کبھی بھی نہیں لوٹے گا۔ جمہور کا استدلال اس حدیث سے ہے:

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس شخص نے اپنی پوری عمر کے لیے کسی دوسرے شخص کو کوئی چیز دے دی تو وہ اس دوسرے شخص کے لیے اور اس کے وارثوں کے لیے ہوگی، اور جس نے وہ چیز دی ہے اس کی طرف نہیں لوٹے گی، کیونکہ اس نے اس کو ایسی چیز دی ہے جس میں وراثت جاری ہوتی ہے"۔

(صحیح مسلم: ۱۶۲۵، الرقم المسلسل: ۴۱۶۳، رقم حدیث الباب: ۲۰، صحیح البخاری: ۲۶۲۵، سنن ترمذی: ۱۳۸۰، سنن نسائی: ۳۷۴۴، ۳۷۵۲، سنن ابن ماجہ: ۲۳۸۰، موطا امام مالک، کتاب الاقضیہ، باب العمریٰ، حدیث: ۴۳)

یہ حدیث درج ذیل کتب میں بھی ہے:

(مصنف عبدالرزاق: ۱۶۸۷۶، صحیح ابن حبان: ۵۱۳۱، سنن بیہقی ج ۶ ص ۱۷۳، شرح السنۃ للبغوی ج ۸ ص ۲۹۳، مسند احمد: ۸۳۶۲)

علامہ ابن بطال لکھتے ہیں:

علماء نے کہا ہے کہ امام مالک نے خود اس حدیث کو روایت کیا ہے اور اس کی مخالفت کی ہے، پھر انہوں نے لکھا ہے کہ اصحاب امام مالک نے کہا کہ اہل عرب کے عرف میں عمریٰ سے مراد کسی ضرورت مند کو رہائش کی جگہ دینا ہے، یہ "المنحة" ہے اور "العارية" ہے۔ (شرح ابن بطال ج ۷ ص ۱۱۳، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۴ھ)

"فَاسْتَغْفِرُوْهُ": یعنی تم نے جو بتوں کی عبادت کی ہے، اس پر اللہ عزوجل سے مغفرت کو طلب کرو۔ "ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ": پھر تم اپنے رب کی طرف توبہ کرو۔ "اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ": یعنی میرے رب دعا کرنے والے کی دعا کو جلد قبول فرمانے والے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اُن کی قوم نے کہا: ''اے صالح! اس سے پہلے تو ہماری امیدیں آپ سے وابستہ تھیں، کیا آپ ہم کو اُن کی عبادت سے منع کرتے ہیں جن کی عبادت ہمارے آباء و اجداد کرتے تھے، اور آپ جس رب کی توحید کی ہمیں دعوت دیتے ہیں، اس پر ہمیں بہت بڑا شک ہے''O (ھود: ۶۲)

''قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ'': یعنی ہم آپ کے دعویٰ نبوت کرنے سے پہلے یہ امید رکھتے تھے کہ آپ ہمارے سردار ہوں گے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام اُن کے خود ساختہ خداؤں کو برا کہتے تھے، ان کی مذمت کرتے تھے اور اُن کو یہ امید تھی کہ وہ اُن کے دین کی طرف پلٹ جائیں گے، پھر جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی توحید کی طرف دعوت دی تو انہوں نے کہا: ہم نے آپ سے جو امیدیں قائم کی تھیں وہ ٹوٹ گئیں۔

''اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا'': کیا آپ ہمیں اُن کی عبادت سے منع کرتے ہیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے چلے آئے ہیں۔ ''وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ'': یہ اُن کی قوم کا حضرت صالح علیہ السلام سے خطاب ہے اور سورۂ ابراہیم میں مذکور ہے ''تَدْعُوْنَنَا''۔

''اِلَيْهِ مُرِيْبٍ'': مُرِیب کا لفظ اس شخص کے متعلق کہا جاتا ہے جو شخص کوئی ایسا کام کرے جس کی وجہ سے اس پر تہمت واجب ہو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''صالح نے کہا: ''اے میری قوم! یہ بتاؤ اگر میرے پاس میرے دعویٰ رسالت پر کوئی دلیل ہو اور اللہ نے مجھے اپنے پاس سے رحمت (یعنی رسالت) عطا فرمائی ہو، پھر اگر میں اپنے رب کی (بالفرض) نافرمانی کروں تو مجھے اللہ کے عذاب سے کون بچائے گا؟ پس تم مجھے سوا نقصان میں اضافہ کرنے کے اور کیا دو گے!''O (ھود: ۶۳)

''قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً'': اس آیت کی تفسیر سورۂ ہود میں حضرت نوح علیہ السلام کے قول کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ ''فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ'': یعنی اگر میں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تو کوئی (اللہ کے مقابلہ میں) میری مدد نہیں کر سکتا۔ ''فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ'': یعنی تم تو لوگ صرف میرے نقصان میں اضافہ کرو گے۔

الفراء نے کہا: یہ نقصان اُن کی قوم کے لیے تھا نہ کہ حضرت صالح علیہ السلام کے لیے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ تم جو اپنے آباء و اجداد کے دین کے لیے مجھ سے بحث کر رہے ہو، اس میں تم کو اندازہ نہیں ہے کہ تمہاری بات پر عمل کرنے میں کتنا نقصان ہوگا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور اے میری قوم! یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے ایک (عظیم) نشانی ہے، اس کو کھلا چھوڑ دو یہ اللہ کی زمین میں چرتی رہے اور اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچانا، ورنہ تم کو اللہ کا عذاب جلد اپنی گرفت میں لے لے گا''O (ھود: ۶۴)

''وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً'': اس اونٹنی کے متعلق حضرت صالح علیہ السلام نے کہا: یہ اللہ کی اونٹنی ہے، کیونکہ حضرت صالح

علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی نشانی دکھانے کے لیے اس اونٹنی کو پہاڑ سے نکالا تا کہ وہ ایمان لے آئیں، دوسرا قول ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے ایک پتھر کی چٹان سے اس اونٹنی کو نکالا، پھر جب اُن کے مطالبہ کے مطابق چٹان سے اونٹنی نکل آئی تو پھر اُن سے اُن کے نبی حضرت صالح علیہ السلام نے کہا: "هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً"۔

حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی میں وجوہ اعجاز

(۱) اللہ تعالیٰ نے ایک چٹان سے اس اونٹنی کو پیدا فرمایا۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے پہاڑ کے اندر اس اونٹنی کو پیدا فرمایا، پھر اس پہاڑ کو شق کر کے اس اونٹنی کو نکالا۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی نر کے اس اونٹنی کو حاملہ بنایا۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے بغیر ولادت کے مکمل جسامت اور شکل وصورت کے ساتھ اس اونٹنی کو پیدا فرمایا۔

(۵) روایت ہے کہ ایک دن وہ کنویں سے پانی پیتی تھی اور ایک دن پوری قوم پانی پیتی تھی۔

(۶) اس سے بہت زیادہ مقدار میں دودھ حاصل ہوتا تھا جو پوری قوم کے لیے کافی ہوتا تھا۔

یہ تمام وجوہات اس کے معجزہ ہونے پر قوی دلیل ہیں، لیکن قرآن کریم میں صرف یہ مذکور ہے کہ وہ اونٹنی آیت اور معجزہ تھی، باقی رہا یہ کہ وہ کس اعتبار سے معجزہ تھی، اس کا قرآن مجید میں ذکر نہیں ہے۔

اونٹنی سے حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کی دشمنی کا سبب

"فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِیْۤ اَرْضِ اللّٰهِ": حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا: اس اونٹنی کو تم جنگل میں چھوڑ دو، وہ وہاں پر چرتی رہے۔

اس قول سے حضرت صالح علیہ السلام کی مراد یہ تھی کہ قوم سے مشقت کو دور فرمادیں، وہ اونٹنی ان کے لیے معجزہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کو نفع پہنچاتی تھی اور ان کو نقصان نہیں دیتی تھی، کیونکہ وہ اس کے دودھ سے فائدہ اٹھاتے تھے جیسا کہ روایت میں ہے۔

حضرت صالح علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ وہ کفر پر اصرار کر رہے ہیں تو ان کو اس اونٹنی کے لیے خطرہ محسوس ہوا، کیونکہ لوگ اپنے مخالف کی حجت اور دلیل کے غلبہ سے بغض رکھتے ہیں بلکہ وہ اپنے مخالف کی حجت کو کمزور اور باطل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے، اس وجہ سے حضرت صالح علیہ السلام کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ یہ لوگ اس اونٹنی کو قتل کر دیں گے، اس لیے انہوں نے پیش بندی کے طور پر فرمایا: اس اونٹنی کو کوئی تکلیف نہ پہنچانا ورنہ عنقریب تم کو عذاب پہنچے گا، اور اس میں ان لوگوں کے لیے سخت وعید تھی جو اس اونٹنی کو قتل کرنے کا ارادہ کریں۔

"وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَیَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِیْبٌ": تم اس کو کوئی ایذاء نہ پہنچانا ورنہ تمہیں بہت جلد عذاب آلے گا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "سو صالح کی قوم نے اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں، تب صالح نے کہا: "تم اپنے اپنے گھروں میں تین دنوں تک فائدہ اٹھاتے رہو (یعنی تم صرف تین دن تک زندہ رہو گے) یہ اللہ کا برحق وعدہ ہے اور اس میں جھوٹ نہیں ہے" O (ہود: ۶۵)

"فَعَقَرُوْهَا": ان کی قوم میں سے ایک شخص نے اس اونٹنی کی کونچیں کاٹی تھیں اور پوری قوم کی طرف اضافت فرمائی گئی ہے،

کیونکہ پوری قوم اس فعل پر راضی تھی۔

حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو قتل کرنے کی وجوہ

انہوں نے اونٹنی کو جو قتل کر دیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ اونٹنی حضرت صالح علیہ السلام کے دعویٰ نبوت پر دلیل تھی، تو انہوں نے حضرت
صالح علیہ السلام کی مخالفت اور ان کی دشمنی میں اس اونٹنی کو قتل کر دیا اور یا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس بات سے تنگ آ گئے تھے کہ ایک دن وہ
لوگ کنویں سے پانی پئیں اور ایک دن وہ اونٹنی کنویں سے پانی پیے، اور وہ اونٹنی اس قدر غیر معمولی جسیم تھی کہ وہ اپنی باری کے دن
جب پانی پیتی تو سارا کنواں خالی کر دیتی، تب انہوں نے اس سے جان چھڑانے کے لیے اس کو قتل کر دیا اور یا انہوں نے اس کو اس
لیے قتل کیا کہ وہ اس کا گوشت اور اس کی چربی کھانا چاہتے تھے، بہر حال انہوں نے اس کو قتل کر دیا۔

حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو قتل کرنے کی تفصیل

امام ابن ابی حاتم اپنی سند کے ساتھ امام محمد بن اسحاق سے روایت کرتے ہیں:
جب اونٹنی پانی پی کر لوٹ رہی تھی تو وہ اس کی گھات میں بیٹھے ہوئے تھے، اس کے راستہ میں ایک چٹان تھی، اس کے نیچے قدار
نامی ایک شخص چھپ کر بیٹھا ہوا تھا اور اس چٹان کے دوسرے نچلے حصہ میں مصدع نام کا ایک اور شخص چھپ کر بیٹھا ہوا تھا۔ جب وہ
اس کے پاس سے گزری تو مصدع نے اس کی پنڈلی کے گوشت پر تاک کر تیر مارا اور قدار تلوار کے ساتھ اس پر حملہ آور ہوا اور اس کی
کونچوں (ایڑی کے اوپر کے پٹھوں) پر تلوار ماردی۔ وہ چیخ مار کر گر پڑی، انہوں نے اس کی ٹانگوں کو باندھ دیا، پھر اس کے لبہ
(گردن کا نچلا حصہ) پر نیزہ مارا اور اس کو نحر (ذبح) کر دیا۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم: ۱۰۹۸۸، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ)
ابو الہذیل نے بیان کیا ہے کہ جب اس اونٹنی کی کونچیں کاٹی گئیں تو اس کا بچہ چیختا ہوا پہاڑوں کی طرف بھاگ گیا، پھر دوبارہ اس
کو نہیں دیکھا گیا۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم، رقم الحدیث: ۱۰۹۸۹، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ)

"فَقَالَ تَمَتَّعُوْا": یعنی حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا: تم چند دن عذاب کے آنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے نفع
اٹھالو۔ "فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ": یعنی تم میں سے ہر شخص تین دن اپنے گھر میں زندہ رہے گا اور اس سے فائدہ اٹھائے گا۔ پس اُن
لوگوں نے بدھ کے دن اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔ پھر جمعرات، جمعہ اور ہفتہ کے دن تک اپنے گھروں میں رہے اور اتوار کے دن اُن
پر عذاب آ گیا۔ پہلے دن اُن کے چہرے زرد پڑ گئے، پھر دوسرے دن ان کے چہرے سرخ ہو گئے، اور تیسرے دن اُن کے
چہرے سیاہ ہو گئے اور چوتھے دن وہ سب ہلاک ہو گئے۔

قوم ثمود پر عذاب نازل ہونے کا واقعہ

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (صالح نے کہا) تم صرف تین دن مزے اٹھالو (پھر تم پر عذاب آجائے گا)، یہ اللہ تعالیٰ کی
وعید ہے جو (ہرگز) جھوٹی نہیں ہوگی۔

امام ابن ابی حاتم اپنی سند کے ساتھ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ غزوۂ تبوک کے سفر میں جب ہم مقام حجر پر پہنچے
تو آپ نے ہم سے فرمایا: میں لوگوں کو معجزات طلب کرنے سے منع کرتا ہوں، یہ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم ہے جس نے اپنے نبی سے

معجزہ طلب کیا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایک اونٹنی کو بھیج دیا، وہ اس راستہ سے آتی تھی اور اپنی باری کے دن اس کا سارا پانی پی جاتی تھی، اور جس دن وہ پانی پیتی تھی اس دن وہ قوم اس اونٹنی کا دودھ دوہ کر پیتی تھی اور پھر لوٹ جاتی تھی۔ اس قوم نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی اور اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں، جب اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ وعید سنائی کہ وہ صرف تین دن اپنے گھروں میں مزے اڑا لیں (پھر اللہ تعالیٰ کا عذاب آ جائے گا)، یہ اللہ تعالیٰ کی وعید ہے جو (ہرگز) جھوٹی نہیں ہوگی۔ (پھر تین دن کے بعد) ایک زبردست چنگھاڑ کی آواز آئی جس نے اس زمین کے مشرق اور مغرب کے لوگوں کو ہلاک کر دیا، سوا اس شخص کے جو اللہ تعالیٰ کے حرم میں تھا، وہ اللہ تعالیٰ کے حرم میں ہونے کی وجہ سے بچ گیا۔ آپ سے پوچھا گیا: یا رسول اللہ! وہ کون ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ ابو رغال ہے، پوچھا: وہ کون ہے؟ فرمایا: وہ ابو ثقیف ہے۔

(مسند احمد: ۱۴۱۹۰، المستدرک علی الصحیحین: ۶۱۹۷، السنۃ الموضوعی الجامع للکتب العشر ، ج ۷، ص ۲۲۳)

امام محمد بن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ حضرت صالح علیہ السلام ان کے پاس گئے تو دیکھا کہ اونٹنی کی کونچیں کٹی ہوئی ہیں تو وہ رونے لگے اور فرمایا: تم نے اللہ تعالیٰ کی نشانی کی بے حرمتی کی، اب تمہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب اور ان کی ناراضی کی بشارت ہو۔ انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا: اچھا یہ عذاب کب آئے گا اور اس کی کیا علامت ہے؟ اور انہوں نے دنوں کے اس طرح نام رکھے تھے: وہ اتوار کو اول کہتے تھے، پیر کو ہون (آسان) کہتے تھے، منگل کو دبار (مصیبت) کہتے تھے، بدھ کو جبار (درست) کہتے تھے، جمعرات کو مونس کہتے تھے اور جمعہ کو عروبہ کہتے تھے، ہفتہ کو شبار (عمر) کہتے تھے۔ انہوں نے بدھ کے دن اونٹنی کی کونچیں کاٹی تھیں۔ حضرت صالح علیہ السلام نے کہا: جب مونس (جمعرات) کے دن اٹھو گے تو تمہارے چہرے زرد ہوں گے اور جب تم عروبہ (جمعہ) کے دن اٹھو گے تو تمہارے چہرے سرخ ہوں گے اور جب تم شبار (ہفتہ) کے دن اٹھو گے تو تمہارے چہرے سیاہ ہوں گے، پھر پہلے دن (اتوار) تم پر عذاب آ جائے گا۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۲۰۵۰-۲۰۵۱، رقم الحدیث: ۱۰۹۹۰، ۱۰۹۹۱، ۱۰۹۹۲، ۱۰۹۹۳، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ)

"ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ": یعنی یہ اللہ کی وعید ہے، جھوٹ نہیں ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پھر جب ہمارا عذاب آ گیا تو ہم نے صالح اور اُن کے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنی رحمت سے نجات عطا فرما دی اور اپنی رحمت سے اُن کو اس دن کی رسوائی سے محفوظ رکھا، بے شک آپ کے رب ہی سب سے زیادہ قوت والے، سب سے زیادہ غالب ہیں O" (ھود: ۶۶)

"فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا": یعنی جب اُن کے پاس ہمارا عذاب آ گیا۔

"نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا": اس کی تفسیر سورۃ الاعراف کی آیت: ۷۹ میں گزر چکی ہے۔

"وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ": یعنی ہم نے اُن کو اس دن کی رسوائی سے بچا لیا۔

"اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ": بے شک آپ کے رب ہی سب سے زیادہ قوت والے، سب سے زیادہ غالب ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اپنی جان پر ظلم کرنے والے کافروں کو ایک ہولناک چیخ نے پکڑ لیا، سو وہ اپنے

گھروں میں ہی گھٹنوں کے بل مُردہ پڑے رہ گئے O" (ہود: ۶۷)

"وَ اَخَذَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَۃُ": یعنی چوتھے روز اُن پر ایک زبردست چیخ آئی جس سے وہ سب مر گئے۔ ایک قول یہ ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے وہ چیخ ماری تھی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ آسمان سے ایک چیخ کی آواز آئی تھی جیسے بجلی کی کڑک کی آواز ہوتی ہے، سو اُن کے دل پھٹ گئے اور وہ مر گئے۔ یہاں پر فرمایا ہے: "وَ اَخَذَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَۃُ" اور الاعراف: ۷۸ میں فرمایا ہے "فَاَخَذَتْھُمُ الرَّجْفَۃُ"۔

اور تفسیر میں مذکور ہے کہ جب اُن لوگوں کو عذاب کا یقین ہو گیا تو انہوں نے ایک دوسرے سے کہا: کیا تمہارے پاس اچانک وہ عذاب آئے گا؟، پھر انہوں نے کہا: پھر ہم کیا کریں، تو انہوں نے اپنی تلواریں اور اپنے نیزے نکال لیے اور یہ بارہ ہزار (۱۲۰۰۰) قبیلے تھے اور ہر قبیلہ میں بارہ ہزار جنگ جو مرد تھے، پس وہ راستہ میں ہتھیار لے کر کھڑے ہو گئے، ان کا خیال یہ تھا کہ وہ آنے والے عذاب کا مقابلہ کریں گے، پس جو فرشتہ سورج کے ساتھ موکل تھا، اس کی طرف اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کہ اپنی گرمی سے ان کو عذاب پہنچائے تو سورج اُن کے سروں کے قریب آ پہنچا، پس اُن کے ہاتھ جل گئے اور پیاس کی شدت سے اُن کی زبانیں لٹک کر اُن کے سینوں پر آ گئیں، اور وہاں جتنے وحشی جانور تھے وہ سب مر گئے۔ اور چشموں سے گرم پانی اُبل کر نکلنے لگا اور جس پر بھی وہ پانی پہنچا اس کو اپنی گرمی سے ہلاک کر دیتا، وہ اسی حال پر قائم رہے حتیٰ کہ اللہ عزوجل نے ملک الموت کو وحی فرمائی کہ عذاب سے غروب آفتاب تک ان کی روحوں کو نکال لو۔ پھر ان پر ایک چیخ ماری گئی اور وہ سب ہلاک ہو گئے۔

"فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِھِمْ جٰثِمِیْنَ": پھر وہ سب مونہوں کے بل گر پڑے اور مٹی کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "گویا کہ وہ کبھی اُن گھروں میں رہے ہی نہ تھے، سنو! بے شک قومِ ثمود نے اپنے رب کا کفر کیا، سنو! قومِ ثمود کے لیے (اللہ سے) دوری ہو O" (ہود: ۶۸)

"کَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْھَا ؕ اَلَاۤ اِنَّ ثَمُوْدَا۟ کَفَرُوْا رَبَّھُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ": اس کی تفسیر سورہ ہود کی آیت: ۶۰ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، جز ون ۹ ص ۵۰۔ ۵۵، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

وَ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَاۤ اِبْرٰهِیْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِیْذٍ ﴿۶۹﴾

بے شک ابراہیم کے پاس ہمارے فرشتے خوش خبری لے کر آئے، انہوں نے کہا: "آپ پر سلام ہو" ابراہیم نے کہا: تم پر بھی سلام ہو، پھر تھوڑی دیر بعد ابراہیم ایک بھنا ہوا بچھڑا لے کر آ گئے O

فَلَمَّا رَاٰۤ اَیْدِیَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَیْهِ نَكِرَهُمْ وَ اَوْجَسَ مِنْهُمْ خِیْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ؕ﴿۷۰﴾

پھر جب ابراہیم نے دیکھا کہ اُن (فرشتوں) کے ہاتھ اس بھنے ہوئے بچھڑے کی طرف نہیں بڑھ رہے تو انہوں نے اُن فرشتوں کو اجنبی سمجھا اور دل میں ان سے ڈر محسوس کیا، اُن فرشتوں نے کہا: ''آپ نہ ڈریں، بے شک ہم قومِ لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں''O

وَامْرَاَتُهٗ قَآىٕمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴿۷۱﴾

اور ابراہیم کی بیوی کھڑی ہوئی تھیں وہ (ابراہیم کے خوف زدہ ہونے پر) ہنسیں (یعنی متعجب ہوئیں)، پس ہم نے اُن کو اسحاق کی ولادت کی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی ولادت کی خوش خبری سنائی O

قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ۭ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ﴿۷۲﴾

وہ کہنے لگیں: ''ہائے ہائے! کیا میرے ہاں بچہ ہوگا حالانکہ میں بوڑھی ہوں اور یہ میرا خاوند بھی بوڑھا ہے، یہ تو سخت تعجب خیز بات ہے''O

قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ۭ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ﴿۷۳﴾

فرشتوں نے کہا: ''کیا آپ اللہ کی قدرت پر تعجب کرتی ہیں! اے ابراہیم کے گھر والو! تم پر اللہ کی رحمت اور اُن کی برکتیں نازل ہوں، بے شک اللہ ہر قسم کی تعریف کے لائق اور بزرگی والے ہیں''O

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۴﴾ؕ

پھر جب ابراہیم سے خوف دور ہوگیا اور اُن کے پاس اولاد کی خوش خبری بھی پہنچ گئی تو وہ ہم سے لوط کی قوم کے متعلق بحث کرنے لگے O

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ﴿۷۵﴾

بے شک ابراہیم ضرور بردبار، سوز و گداز والے، اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے O

يٰٓاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ﴿۷۶﴾

فرشتوں نے کہا: ''اے ابراہیم! یہ بحث چھوڑ دیجئے، بے شک (قومِ لوط کے عذاب کے متعلق) اللہ کا حکم آچکا ہے اور بے شک اُن پر ایسا عذاب آنے والا ہے جو لوٹایا نہیں جائے گا''O

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ

عَصِيْبٌ ﴿۷۷﴾

اور جب ہمارے فرشتے لوط کے پاس پہنچے تو وہ اُن کے آنے کی وجہ سے غم زدہ اور پریشان ہوئے اور انہوں نے کہا: ''یہ بہت آزمائش کا دن ہے''O

وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ قَالَ يٰقَوْمِ هٰۤؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ؕ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ﴿۷۸﴾

اور لوط کے پاس اُن کی قوم کے (ہم جنس پرست) لوگ دوڑتے ہوئے آئے اور وہ پہلے ہی ہم جنس پرستی کے عادی تھے، لوط نے کہا: ''اے میری قوم! یہ میری قوم کی بیٹیاں ہیں، (ان سے نکاح کرکے اپنی نفسانی خواہش پوری کرلو)، وہ تمہارے لیے بہت پاکیزہ ہیں سو تم اللہ سے ڈرو اور مجھے میرے مہمانوں کے سامنے شرمندہ نہ کرو، کیا تم میں کوئی بھی شریف مرد نہیں ہے!''O

قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ﴿۷۹﴾

اُن لوگوں نے کہا: ''آپ کو خوب معلوم ہے کہ ہمیں آپ کی قوم کی بیٹیوں میں کوئی رغبت نہیں ہے اور آپ خوب جانتے ہیں کہ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں''O

قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْۤ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ﴿۸۰﴾

لوط نے کہا: ''کاش! میرے پاس تم سے مقابلہ کی طاقت ہوتی یا میں کسی مضبوط قبیلہ کی پناہ لیتا''O

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْۤا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ؕ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَاۤ اَصَابَهُمْ ؕ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ؕ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ﴿۸۱﴾

فرشتوں نے کہا: ''اے لوط! ہم آپ کے رب کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں، یہ لوگ کبھی بھی آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے، پس آپ رات کے کسی وقت میں اپنے گھر والوں کو لے کر روانہ ہو جائیں اور آپ میں سے کوئی بھی پلٹ کر نہ دیکھے، آپ اپنی بیوی کے سوا باقی گھر والوں کو لے کر روانہ ہوں کیونکہ اس پر بھی وہی عذاب آئے گا جو ان لوگوں پر عذاب آئے گا، اُن پر عذاب آنے کے لیے صبح کا وقت مقرر ہو چکا ہے، کیا صبح قریب نہیں ہے!''O

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ

مَّنْضُوْدٍ ﴿۸۲﴾

پھر جب ہمارا عذاب آ گیا تو ہم نے اُن کی بستی کو الٹ پلٹ فرما دیا، اس کے اوپر والا حصہ نیچے اور نیچے والا حصہ اوپر فرما دیا، اور ہم نے اُن پر لگاتار آگ میں تپائے ہوئے پتھر برسائے O

مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۳﴾

وہ پتھر آپ کے رب کی طرف سے نشان زدہ تھے، اور (پتھر برسانے کی) یہ سزا اپنی جانوں پر ظلم کرنے والوں کیلئے بعید نہیں ہے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "بے شک ابراہیم کے پاس ہمارے فرشتے خوش خبری لے کر آئے، انہوں نے کہا: "آپ پر سلام ہو" ابراہیم نے کہا: تم پر بھی سلام ہو، پھر تھوڑی دیر بعد ابراہیم ایک بھنا ہوا بچھڑا لے کر آ گئے O" (ہود:۶۹)

علامہ ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ، ہود: ۶۹ تا ۸۳ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ": اس آیت میں رُسُل سے مراد ملائکہ علیہم السلام ہیں اور ان کی تعداد میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عطاء نے کہا کہ یہ تین فرشتے تھے: حضرت جبریل، حضرت میکائیل اور حضرت اسرافیل علیہم السلام۔ الضحاک نے کہا: یہ نو فرشتے تھے اور مقاتل نے کہا: یہ بارہ فرشتے تھے۔ اور محمد بن کعب نے کہا: ایک حضرت جبریل علیہ السلام تھے اور اُن کے ساتھ دیگر فرشتے تھے۔ السدی نے کہا: یہ گیارہ فرشتے تھے جو خوب صورت اور بے ریش لڑکوں کی صورتوں میں آئے تھے۔ "بِالْبُشْرٰى": یعنی حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہما السلام کی ولادت کی بشارت لے کر آئے تھے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وہ قوم لوط کی ہلاکت کی خبر لے کر آئے تھے۔

"قَالُوْا سَلٰمًا": اُن فرشتوں نے کہا: آپ پر اللہ تعالیٰ کی سلامتی نازل ہو۔

"قَالَ سَلٰمٌ": حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: اے فرشتو! تم پر بھی سلامتی نازل ہو۔ اور الذاریات: ۲۵ میں ہے "سِلْمٌ" سین پر زیر ہے اور الف نہیں ہے اور اس کا معنی بھی سلام ہے جیسے کہا جاتا ہے حِلٌّ وَحَلَالٌ اور حِرْمٌ وَحَرَامٌ اسی طرح سِلْمٌ وَسَلَامٌ ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ ہم تمہارے لیے سلامتی لے کر آئے ہیں، تم سے جنگ کرنے نہیں آئے۔

(یہ علامہ بغوی کا تسامح ہے، ہود: ۶۹ اور الذاریات: ۲۵ میں دونوں جگہ سلامٌ کا لفظ ہے اور الذاریات: ۲۵ میں سِلْمٌ کا لفظ نہیں ہے۔ سعیدی غفرلہ)

"فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ": الحنیذ کا معنی ہے: جو پتھروں پر رکھ کر آگ سے بھونا گیا ہو اور وہ بچھڑا بہت موٹا تازہ تھا جیسے الذاریات: ۲۶ میں فرمایا: "فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ"۔ (پس وہ ایک بھنا ہوا موٹا تازہ بچھڑا لے کر آئے)۔

اور قتادہ نے بیان کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مال اور مویشیوں میں زیادہ تر گائے اور بچھڑے تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''پھر جب ابراہیم نے دیکھا کہ اُن (فرشتوں) کے ہاتھ اس بھنے ہوئے بچھڑے کی طرف نہیں بڑھ رہے تو انہوں نے اُن فرشتوں کو اجنبی سمجھا اور دل میں ان سے ڈر محسوس کیا، اُن فرشتوں نے کہا: ''آپ نہ ڈریں، بے شک ہم قومِ لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں'' O (ہود: ۷۰)

''فَلَمَّا رَآ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ'': جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ وہ فرشتے اس بھنے ہوئے بچھڑے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھا رہے۔ ''نَكِرَهُمْ'': تو انہوں نے ان کو اجنبی سمجھا۔ ''وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً'': اور اپنے دل میں اُن سے ڈرے۔ قتادہ نے کہا: کیونکہ جب کسی شخص کے پاس کوئی مہمان جائے اور اُن کے طعام سے نہ کھائے تو وہ یہ گمان کرتے تھے کہ یہ کسی اچھائی کے ساتھ نہیں آیا، یہ کسی برائی کے ساتھ آیا ہے۔ ''قَالُوْا لَا تَخَفْ'': فرشتوں نے کہا: اے ابراہیم! آپ مت ڈریں۔

''اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ'': ہم اللہ کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں اور ہمیں قومِ لوط کی طرف بھیجا گیا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور ابراہیم کی بیوی کھڑی ہوئی تھیں وہ (ابراہیم کے خوف زدہ ہونے پر) ہنسیں (یعنی متعجب ہوئیں)، پس ہم نے اُن کو اسحاق کی ولادت کی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی ولادت کی خوش خبری سنائی O'' (ہود: ۷۱)

''وَامْرَاَتُهٗ'': یعنی حضرت سارہ بنت ہاران بن ناحور اور یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چچا کی بیٹی تھیں۔

''قَآئِمَةٌ'': وہ پردے کے پیچھے کھڑی ہوئی اُن کی باتیں سن رہی تھیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وہ کھڑی ہوئی اُن کی مہمان نوازی کر رہی تھیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اُن کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔

''فَضَحِكَتْ'': مجاہد اور عکرمہ نے کہا: اس کا معنی ہے: انہیں اسی وقت حیض آ گیا۔ عرب کہتے ہیں: ''ضحکت الارنب'' یعنی خرگوش کو حیض آ گیا۔ (میں کہتا ہوں: یہ قول صحیح نہیں ہے، کیونکہ خود حضرت سارہ نے کہا تھا: ''وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ O (الذاریات: ۲۹)'' (میں بوڑھی اور بانجھ ہوں) اور بوڑھی اور بانجھ عورت کو حیض نہیں آتا۔ سعیدی غفرلہٗ)۔

اکثر مفسرین نے کہا ہے: اس آیت میں ضحک سے اس کا معروف معنی مراد ہے یعنی وہ ہنسیں۔

اور اُن کے ہنسنے کے سبب میں اختلاف ہے:

ایک قول یہ ہے کہ جب فرشتوں نے کہا: ''لَا تَخَفْ'' تو وہ اس سے خوش ہوئیں کہ اُن سے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے خوف زائل ہو گیا۔ (میں کہتا ہوں: پھر اس جگہ ضحکت کا معنی یہ ہونا چاہیے کہ وہ خوش ہوئیں۔ سعیدی غفرلہٗ)۔

السُّدِّی نے کہا: جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرشتوں کے سامنے کھانا پیش کیا، پس انہوں نے وہ کھانا نہیں کھایا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اُن سے خوف زدہ ہوئے، انہوں نے گمان کیا کہ شاید یہ لوگ چوری کرنے آئے ہیں، پس اُن سے فرمایا: تم کیوں نہیں کھاتے؟ فرشتوں نے جواب دیا: ہم بغیر قیمت دیے کھانا نہیں کھاتے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: اس کھانے کی قیمت ہے، فرشتوں نے پوچھا: وہ کیا قیمت ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: تم کھانے کے اول میں بھی اللہ تعالیٰ کا نام لو اور آخر میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، پس حضرت جبریل نے حضرت میکائیل علیہ السلام کی طرف دیکھا اور کہا: یہ بندہ اسی کا مستحق ہے کہ ان کے رب ان کو اپنا خلیل

بنائیں، پس جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت سارہ نے دیکھا کہ اُن کے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھ رہے تو حضرت سارہ اس پر متعجب ہوئیں اور کہا: ہمارے مہمانوں پر تعجب ہے کہ ہم اُن کی عزت افزائی کے لیے از خود اپنی جانوں سے ان کی خدمت کر رہے ہیں اور وہ ہمارا کھانا نہیں کھا رہے۔ (اس تقدیر پر فضحکت کا معنی ہے: پس حضرت سارہ متعجب ہوئیں، اور یہ اس لئے مناسب ہے کہ کسی شخص کو تعجب کی بناء پر ہنسی آتی ہے، جب کسی شخص کے سامنے کوئی خلافِ معمول کام کیا جائے تو وہ اس پر متعجب ہوتا ہے اور تعجب کو ہنسی لازم ہے تو اس آیت میں ملزوم بول کر لازم کا ارادہ فرمایا ہے۔ سعیدی غفرلہٗ)۔

اور قتادہ نے کہا: حضرت سارہ قوم لوط کی غفلت پر ہنسیں اور اُن پر قربِ عذاب دیکھ کر ہنسیں۔ (میں کہتا ہوں: یہ ہنسنے کا مقام نہیں ہے بلکہ افسوس کا مقام ہے، اس لئے یہ تفسیر صحیح نہیں ہے۔ سعیدی غفرلہٗ)

اور مقاتل اور الکلبی نے کہا کہ حضرت سارہ، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ڈرنے پر ہنسیں، کیونکہ اُن کے گھر میں اُن کے علاوہ اُن کے خدام بھی تھے، مددگار بھی تھے، پھر بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام ڈر رہے تھے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہ اولاد کی بشارت پر خوش ہو کر ہنسیں۔ (میں کہتا ہوں: یہ قول بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ بشارت کا ذکر تو اس آیت کے بعد ہے۔ سعیدی غفرلہٗ)۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور وہب بن منبہ نے کہا: وہ اس پر تعجب سے ہنسیں کہ جب وہ بھی بوڑھی ہو چکی ہیں اور اُن کا شوہر بھی بوڑھا ہو چکا ہے تو پھر اُن کے ہاں اولاد کیسے ہوگی؟ انہوں نے کہا: ہائے ہائے! میں کیسے بچہ جنوں گی حالانکہ میں بوڑھی ہوں اور میرا شوہر بھی بوڑھا ہے؟ (میں کہتا ہوں: ان تمام تقدیروں پر ضحکت کا یہی معنی مناسب ہے کہ وہ متعجب ہوئیں۔ سعیدی غفرلہٗ)

"فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ": اس سے مراد اولاد کی اولاد ہے۔ پس انہیں یہ خوش خبری دی گئی کہ وہ کافی عرصہ زندہ رہیں گی حتیٰ کہ وہ اپنے بیٹے اور بیٹے کے بیٹے کو دیکھیں گی، پھر جب انہیں اولاد کی بشارت دی گئی تو وہ متعجب ہوئیں اور تعجب سے انہوں نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا جیسا کہ لوگ تعجب کے موقع پر اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وہ کہنے لگیں: "ہائے ہائے! کیا میرے ہاں بچہ ہوگا حالانکہ میں بوڑھی ہوں اور یہ میرا خاوند بھی بوڑھا ہے، یہ تو سخت تعجب خیز بات ہے" ○ (ہود: ۷۲)

"قَالَتْ يٰوَيْلَتٰىٓ": یہ ایسی نداء ہے جو آدمی کسی تعجب خیز چیز کو دیکھ کر کہتا ہے: یاعجب، اور "يٰوَيْلَتٰىٓ" کی اصل ہے یا ویلتاہ۔ "ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ": ابن اسحاق نے کہا: اس وقت حضرت سارہ کی عمر نوے (۹۰) سال تھی۔ اور مجاہد نے کہا: ننانوے (۹۹) سال تھی۔ "وَّهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا": بعل کا معنی ہے شوہر۔ اور شوہر کو بعل اس لیے فرمایا ہے کہ وہ بیوی کے معاملات کا کفیل ہوتا ہے۔ ابن اسحاق نے کہا: حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر اس وقت ایک سو بیس (۱۲۰) سال تھی۔ اور مجاہد نے کہا: ایک سو (۱۰۰) سال تھی۔ اور یہ بشارت ایک سال کے بعد پوری ہوئی۔ "اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ": یعنی یہ بشارت بہت تعجب خیز ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "فرشتوں نے کہا: "کیا آپ اللہ کی قدرت پر تعجب کرتی ہیں! اے ابراہیم کے گھر والو! تم پر اللہ کی رحمت اور اُن کی برکتیں نازل ہوں، بے شک اللہ ہر قسم کی تعریف کے لائق اور بزرگی والے ہیں" ○ (ہود: ۷۳)

"قَالُوْۤا": یعنی فرشتوں نے حضرت سارہ سے کہا۔" اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ": یہ استفہامِ انکاری ہے، یعنی آپ اللہ عزوجل کے کسی حکم پر تعجب نہ کریں، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کا ارادہ فرماتے ہیں تو وہ ہوجاتی ہے۔

"رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ": یعنی اے ابراہیم علیہ السلام کے اہلِ بیت! دوسرا قول یہ ہے کہ یہ ملائکہ کی طرف سے دعا ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ اے اہلِ بیت! تم خیریت سے رہو، تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور ان کی نعمتیں نازل ہوں۔ اور البرکات، برکت کی جمع ہے، اور برکت کا معنی بھی خیر کا ثبوت ہے۔ اور اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ کسی شخص کی بیویاں بھی اس کے اہلِ بیت سے ہوتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:" اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ۝ (الاحزاب: ۳۳)"

(اے رسول کے گھر والو! اللہ تو یہی چاہتے ہیں کہ تم سے ہر قسم کے گناہ کے میل کچیل کو دور رکھیں اور تمہیں خوب اچھی طرح پاکیزگی اور صفائی پر برقرار رکھیں ۝)۔

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اس آیت میں اہلِ بیت سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات ہیں اور اس آیت کا سیاق و سباق بھی اسی پر دلالت کرتا ہے۔ علاوہ ازیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم ازواجِ مطہرات کے گھر میں ہی تشریف فرما ہوتے تھے۔

امام ابن ابی حاتم اور امام ابن عساکر نے از حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کی ہے کہ آیت کریمہ" اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ" خصوصیت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے متعلق ہے۔

اور عکرمہ نے کہا: جو چاہے میں اس سے مباہلہ کرنے پر تیار ہوں کہ یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

اور امام ابن سعد نے عروہ سے روایت کی ہے کہ یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے متعلق نازل ہوئی ہے، اور اس پر قرینہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی زوجہ سے فرشتوں نے کہا تھا:" اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ" اور اس آیت میں بھی اہلِ بیت سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اہلِ بیت ہیں۔ (روح المعانی جز ۲۲ ص ۱۹-۲۰، دار الفکر بیروت، ۱۴۱۷ھ)

صدر الافاضل علامہ سید محمد نعیم الدین مراد آبادی حنفی متوفی ۱۳۶۷ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یعنی گناہوں کی نجاست سے تم آلودہ نہ ہو۔ اس آیت سے اہلِ بیت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور اہلِ بیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات اور حضرت خاتونِ جنت فاطمہ زہراء اور علی مرتضیٰ اور حسنین کریمین رضی اللہ عنہم سب داخل ہیں۔ آیات و احادیث کو جمع کرنے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے اور یہی حضرت امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ سے منقول ہے، ان آیات میں اہلِ بیتِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نصیحت فرمائی گئی ہے تاکہ وہ گناہوں سے بچیں اور تقویٰ و پرہیزگاری کے پابند رہیں، گناہوں کو ناپاکی سے اور پرہیزگاری کو پاکی سے استعارہ فرمایا گیا کیونکہ گناہوں کا مرتکب ان سے ایسا ہی ملوث ہوتا ہے جیسا جسم نجاستوں سے، اس طرزِ کلام سے مقصود یہ ہے کہ اربابِ عقول کو گناہوں سے نفرت دلائی جائے اور تقویٰ و پرہیزگاری کی ترغیب دی جائے۔

(تفسیر خزائن العرفان مع ترجمہ کنز الایمان، ص ۷۸۰، مکتبۃ المدینہ، کراچی، ۱۴۳۲ھ)

ضیاء الامت حضرت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری حنفی متوفی ۱۴۱۸ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اس آیت کا سیاق و سباق دیکھنے کے بعد یہ تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے کہ آیت کے اس جملہ (اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ) میں بھی وہی مخاطب ہیں جن سے پہلے اور بعد میں خطاب ہو رہا ہے اور وہ ازواج مطہرات ہیں رضی اللہ عنہن اور اہلِ بیت سے بھی ازواج مطہرات مراد ہیں۔
(ضیاء القرآن ج ۳ ص ۵۱۰ ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور)

اس آیت پر مکمل بحث ان شاء اللہ الاحزاب: ۳۳ کی تفسیر میں ذکر کی جائے گی۔

"اِنَّهٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ": اس آیت میں حمید کا معنی محمود ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے ہر فعل پر ان کی حمد اور ستائش لائق ہے۔ اور المجید کا معنی ہے: الکریم، اور المجد کا اصل معنی ہے بلندی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پھر جب ابراہیم سے خوف دور ہو گیا اور اُن کے پاس اولاد کی خوش خبری بھی پہنچ گئی تو وہ ہم سے لوط کی قوم کے متعلق بحث کرنے لگے ○ بے شک ابراہیم ضرور بردبار، سوز و گداز والے، اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے" ○ (ہود: ۷۴-۷۵)

"فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِیْمَ الرَّوْعُ": الروع کا معنی ہے الخوف۔ "وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰی": اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہلے اسحاق کی اور پھر یعقوب کی ولادت کی خوش خبری پہنچ گئی۔ "یُجَادِلُنَا فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ": یعنی وہ ہم سے بحث کرنے لگے۔ یہاں یجادل کا معنی جھگڑا کرنا نہیں ہے، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے رب عزوجل سے جھگڑا کرنے والے نہ تھے، انہوں نے اللہ عزوجل سے سوال کیا اور ان سے یہ دعا کی کہ قومِ لوط پر عذاب نہ بھیجیں۔ اور عام اہل تفسیر نے کہا: اس کا معنی ہے: وہ ہمارے فرشتوں سے جھگڑنے لگے یا بحث کرنے لگے۔ اور وہ یہ بحث کر رہے تھے کہ انہوں نے فرشتوں سے کہا کہ یہ بتاؤ کہ اگر لوط کے شہروں میں پچاس ایمان والے ہوں تو کیا تم سب کو ہلاک کر دو گے؟ فرشتوں نے کہا: نہیں! حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: اگر ان بستیوں میں چالیس ایمان والے ہوں تو کیا تم اُن سب کو ہلاک کر دو گے، فرشتوں نے کہا: نہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: اور اگر تیس ہوں تو فرشتوں نے کہا: نہیں، حتیٰ کہ وہ پانچ کی تعداد تک پہنچ گئے، فرشتوں نے کہا: نہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: یہ بتاؤ کہ اگر ان میں ایک مرد مسلمان ہو تو کیا تم اس کو ہلاک کر دو گے؟ فرشتوں نے کہا: نہیں، اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: اُن شہروں میں تو لوط ہیں، فرشتوں نے کہا: ہمیں معلوم ہے کہ اس میں لوط ہیں، ہم اُن کو اور اُن کے گھر والوں کو نجات دے دیں گے سوائے اُن کی بیوی کے، کیونکہ وہ پیچھے رہ جانے والیوں میں سے ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام جو ہم سے قومِ لوط کے معاملہ میں بحث کر رہے تھے، اس کا یہی محمل ہے۔ "اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَحَلِیْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیْبٌ": ابن جریج نے کہا: لوط کی قوم میں چار لاکھ لوگ تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "فرشتوں نے کہا: "اے ابراہیم! یہ بحث چھوڑیے، بے شک (قومِ لوط کے عذاب کے متعلق) اللہ کا حکم آ چکا ہے اور بے شک اُن پر ایسا عذاب آئے گا جو لوٹایا نہیں جائے گا" ○ (ہود: ۷۶)

پس فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا: "یٰۤاِبْرٰهِیْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا": یعنی اے ابراہیم! اس بحث کو چھوڑیے۔ "اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ": بے شک قومِ لوط کو عذاب دینے کے لیے آپ کے رب کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ "وَاِنَّهُمْ اٰتِیْهِمْ": اور بے شک

وہ عذاب اُن پر ضرور نازل ہوگا۔ ''عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ'': یعنی وہ عذاب اُن سے دور نہیں کیا جائے گا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور جب ہمارے فرشتے لوط کے پاس پہنچے تو وہ اُن کے آنے کی وجہ سے غم زدہ اور پریشان ہوئے اور انہوں نے کہا: ''یہ بہت آزمائش کا دن ہے''O (ہود: ۷۷)

''وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا'': یعنی جب یہ فرشتے لوط کے پاس آئے۔ وہ فرشتے بے ریش، خوبصورت اور حسین لڑکوں کی شکل میں آئے تھے۔ ''سِیْٓءَ بِهِمْ'': تو حضرت لوط علیہ السلام فرشتوں کے بے ریش، حسین صورتوں میں آنے سے پریشان ہو گئے۔ ''وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا'': اور اُن کا دل تنگ ہو گیا۔ یہ اس وقت کہا جاتا ہے کہ جب کسی انسان پر کوئی ایسی ناگوار مصیبت نازل ہو جس سے نکلنے کی اس کے پاس کوئی صورت نہ ہو، کیونکہ جب حضرت لوط علیہ السلام نے اُن بے ریش حسین چہروں کو دیکھا اور اُن کی پاکیزہ خوشبوئیں سونگھیں تو وہ اپنی قوم کے متعلق رنجیدہ ہوئے کہ اُن کی قوم کے ہم جنس پرست لوگ اب ان فرشتوں کے ساتھ بے حیائی کے کام کا ارادہ کریں گے اور اُن کو معلوم تھا کہ وہ اُن حسین صورتوں میں فرشتوں سے مدافعت کرنے کے محتاج ہیں، تو انہوں نے کہا: ''هٰذَا يَوْمٌ عَصِيبٌ'': یعنی آج کے دن میں سخت شر ہے اور بہت بڑی آزمائش ہے۔

قتادہ اور سدی نے کہا: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس سے فرشتے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی طرف روانہ ہوئے، پس وہ دوپہر کے وقت حضرت لوط علیہ السلام کے پاس پہنچے اور اس وقت لوگ اپنے کام کاج میں مصروف ہوتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ لوگ جنگل میں لکڑیاں چُن رہے تھے اور اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا تھا کہ تم اس بستی کے لوگوں کو اس وقت تک ہلاک نہ کرنا جب تک کہ اُن کے خلاف چار مرتبہ حضرت لوط علیہ السلام اُن کی بدکاری کی شہادت نہ دیں۔ پس وہ فرشتے حضرت لوط علیہ السلام کے مہمان ہوئے، حضرت لوط علیہ السلام اُن کو اپنے گھر میں لے گئے، کچھ دیر کے بعد حضرت لوط علیہ السلام نے فرشتوں سے پوچھا: تمہیں اس بستی کے رہنے والوں کے متعلق کیا حکم فرمایا گیا ہے؟ فرشتوں نے پوچھا: آپ یہ بتائیں کہ یہ لوگ کیسے ہیں؟ حضرت لوط علیہ السلام نے کہا: میں اللہ تعالیٰ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ اس بستی میں سب سے برا کام کرنے والے ہیں اور چار مرتبہ حضرت لوط علیہ السلام نے بستی کے لوگوں کے متعلق یہ فرمایا، اور ہر مرتبہ حضرت جبریل علیہ السلام فرشتوں سے کہتے تھے: اس کو لکھ لو۔ پھر وہ سب فرشتے حضرت لوط علیہ السلام کے ساتھ اُن کے گھر میں چلے گئے۔

روایت ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام جنگل سے لکڑیاں اٹھا رہے تھے، فرشتے اُن کے پیچھے آئے (وہ فرشتے حسین بے ریش لڑکوں کی صورتوں میں تھے)، اُن لوگوں نے اُن بے ریش لڑکوں کو دیکھ کر آپس میں اشارہ کیا، تو حضرت لوط علیہ السلام نے کہا: میری قوم کے یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سب سے بدترین ہیں، پھر حضرت لوط علیہ السلام دوسرے لوگوں کے پاس سے گزرے، انہوں نے بھی فرشتوں کو حسین صورتوں میں دیکھ کر اسی طرح اشارے کئے، پھر حضرت لوط علیہ السلام نے اسی طرح کہا، پھر اور لوگوں کے پاس سے گزرے، انہوں نے بھی اسی طرح اشارے کئے، پھر اور لوگوں کے پاس سے گزرے تو انہوں نے بھی اسی طرح اشارے کیے، ہر مرتبہ حضرت لوط علیہ السلام جب فرشتوں سے یہ کہتے تو حضرت جبریل علیہ السلام فرشتوں سے کہتے: تم اس پر گواہ ہو جاؤ۔

روایت ہے کہ فرشتے حضرت لوط علیہ السلام کے گھر آئے تو فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کو اپنے گھر میں پایا اور اس بات کی کسی کو خبر نہ تھی سوائے حضرت لوط علیہ السلام کے گھر والوں کے۔ پس اُن کی بیوی نکلی اور اس نے لوگوں کو بتایا کہ لوط کے گھر میں ایسے مرد آئے ہیں

کہ میں نے اُن جیسے حسین چہرے والے کبھی نہیں دیکھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور لوط کے پاس اُن کی قوم کے (ہم جنس پرست) لوگ دوڑتے ہوئے آئے اور وہ پہلے ہی ہم جنس پرستی کے عادی تھے، لوط نے کہا: ''اے میری قوم! یہ میری قوم کی بیٹیاں ہیں، (ان سے نکاح کر کے اپنی نفسانی خواہش پوری کرلو) وہ تمہارے لیے بہت پاکیزہ ہیں، سو تم اللہ سے ڈرو اور مجھے میرے مہمانوں کے سامنے شرمندہ نہ کرو، کیا تم میں کوئی بھی شریف مرد نہیں ہے!''O (ھود: ۷۸)

''وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ'': حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ نے کہا: وہ لوگ دوڑتے ہوئے اُن کے پاس آئے۔ حسن بصری نے کہا: وہ درمیانی رفتار سے چلتے ہوئے آئے۔ ''وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ'': اور فرشتوں کے حضرت لوط علیہ السلام کے پاس آنے سے پہلے اُن کی قوم بدفعلی کرتی تھی۔ یعنی مرد مردوں کے ساتھ اُن کی دبروں میں دخول کرتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیوں کا کافروں کے ساتھ نکاح کا قصہ

''قَالَ'': حضرت لوط علیہ السلام نے اُن سے اس وقت کہا جب اُن لوگوں نے حضرت لوط علیہ السلام کے مہمانوں یعنی فرشتوں کو بے ریش لڑکوں کی صورت میں دیکھا اور اُن سے بدفعلی کا قصد کیا۔ تو حضرت لوط علیہ السلام نے کہا: ''يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ'': یعنی تم میری قوم کی بیٹیوں کے ساتھ نکاح کرلو، اور اس وقت اُن کے دین میں مسلم عورت کا کافر سے نکاح جائز تھا جیسا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شرعی ممانعت کے نازل ہونے سے پہلے اپنی دو بیٹیوں کا نکاح عتبہ بن ابی لہب اور ابو العاص بن ربیع سے کیا، اس وقت تک مسلمہ کے کافروں کے ساتھ نکاح کی ممانعت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا اور عتبہ بن ابی لہب اور العاص بن ربیع دونوں کافر تھے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی شافعی متوفی ۸۵۲ نے کہا ہے کہ ابو العاص بن الربیع کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی اور اسی طرح عتبہ بن ابی لہب کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کے نکاح کا ذکر امام ابن اسحاق نے ''المغازی'' میں کیا۔ اور امام طبرانی نے اپنی سند کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ ابو العاص بن الربیع مکہ کے بہت مال دار مردوں میں سے تھا اور بہت امانت دار مردوں میں سے تھا اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اس کی خالہ تھیں۔ پس حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ وہ اپنی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو ابو العاص کے نکاح میں دے دیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی مخالفت نہیں کرتے تھے۔ اور یہ اس وقت کا قصہ ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ حکم نازل نہیں ہوا تھا کہ مسلمہ کا کافر کے ساتھ نکاح نہ کریں، پھر جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت کے ساتھ سرفراز فرمایا اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور ان کی صاحبزادیاں ایمان سے مشرف ہوگئیں اور ابو العاص اپنے شرک پر برقرار رہا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے پہلے عتبہ بن ابی لہب سے اپنی دوسری صاحبزادی رقیہ کا عقد نکاح کر چکے تھے، پھر قریش کے لوگوں نے ابو العاص سے کہا کہ تم حضرت زینب کے ساتھ نکاح کو فسخ کر دو، اس نے انکار کیا۔ پھر وہ عتبہ بن ابی لہب کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ تم رقیہ کے ساتھ نکاح کو فسخ کر دو تو عتبہ بن ابی لہب حضرت رقیہ سے الگ ہو گیا اور پھر اس نے سعید بن العاص کی بیٹی سے نکاح کیا اور اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔

(تخریج الکشاف ج ۲ ص ۱۴، ۲۱۳، ۲۱۴)

اور امام بیہقی نے دلائل النبوۃ میں قتادہ سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی ام کلثوم کا نکاح زمانہ جاہلیت میں ابن ابی لہب سے کیا تھا اور حضرت رقیہ کا نکاح عتبہ بن ابی لہب کے بھائی سے کیا تھا، پس جب اسلام کے احکام آگئے تو ابولہب نے اپنے دونوں بیٹوں کو حکم دیا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ان دونوں صاحبزادیوں کو طلاق دے دیں، سو انہوں نے طلاق دے دی۔

اور الحسین بن الفضل نے اس آیت کی تفسیر میں کہا: کہ حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کی بیٹیوں کے نکاح کو ان پر اس شرط کے ساتھ پیش کیا کہ تم اسلام قبول کرلو تو ہم تمہارا نکاح ان کے ساتھ کر دیتے ہیں۔ اور مجاہد اور سعید بن جبیر نے کہا کہ میری قوم کی ان بیٹیوں کے ساتھ نکاح کر کے اپنی خواہش کو پورا کرنا تمہارے لیے بہت پاکیزہ عمل ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی بیٹیوں کو اپنی بیٹیاں فرمانے کی توجیہ

ان عورتوں کو حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی بیٹیاں فرمایا، کیونکہ ہر نبی اپنی امت کا باپ ہوتا ہے، اس لئے ان کی قوم کی مسلمان عورتیں بھی اُن کے لیے اُن کی بیٹیوں کے حکم میں تھیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام نے اُن لوگوں کو دفع کرنے کے لیے اس طرح فرمایا نہ بطور تحقیق کے، اور فرمایا: ''فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ لَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَیْفِیْ'': پس تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور مجھے میرے مہمانوں کے متعلق شرمندہ اور غمزدہ نہ کرو۔ ''اَلَیْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ'': کیا تم میں کوئی ہدایت یافتہ نیک مرد نہیں ہے۔

عکرمہ نے کہا: یعنی تم میں کوئی ایسا مرد نہیں ہے جو لا الٰہ الا اللہ کہتا ہو۔ ابن اسحاق نے کہا: تم میں کوئی ایسا مرد نہیں ہے جو نیکی کا حکم دیتا ہو اور برائی سے روکتا ہو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اُن لوگوں نے کہا: ''آپ کو خوب معلوم ہے کہ ہمیں آپ کی قوم کی بیٹیوں میں کوئی رغبت نہیں ہے اور آپ خوب جانتے ہیں کہ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں''O (ہود: ۷۹)

''قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ'': یعنی اے لوط! آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ ''مَا لَنَا فِیْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ'': اس کا معنی یہ ہے کہ ہمیں آپ کی قوم کی بیٹیوں میں کوئی رغبت نہیں ہے، ہمیں ان کی ضرورت نہیں ہے، ہمیں ان پر شہوت نہیں آتی۔

''وَ اِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِیْدُ'': یعنی بے شک آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم تو ہم جنس پرست ہیں، ہم مردوں میں دخول کرنا چاہتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''لوط نے کہا: ''کاش! میرے پاس تم سے مقابلہ کی طاقت ہوتی یا میں کسی مضبوط قبیلہ کی پناہ لیتا''O (ہود: ۸۰)

''قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیْۤ اِلٰی رُكْنٍ شَدِیْدٍ'': حضرت لوط علیہ السلام نے کہا: کاش! میرے پاس اتنی بدنی قوت ہوتی کہ میں تم کو اپنے گھر سے نکال سکتا، یا میں کسی مضبوط پناہ دینے والے قبیلہ کی پناہ حاصل کرتا جو تم کو اس برائی اور بے حیائی کے کاموں سے روکتا۔ یعنی ایسا کوئی مضبوط قبیلہ ہوتا جو تم سے جنگ کرتا اور تمہارے اور ہمارے درمیان حائل ہو جاتا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم حضرت ابراہیم کی بہ نسبت شک کرنے کے زیادہ حق دار ہیں، جب انہوں نے یہ کہا تھا: اے میرے رب! مجھے دکھائیں کہ آپ مردے کو کس طرح زندہ فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

کیا آپ کو اس پر یقین نہیں ہے؟ عرض کیا: کیوں نہیں! مگر اس لیے کہ میرا دل مطمئن ہو جائے (البقرہ: ۲۶۰)، اور اللہ تعالیٰ حضرت لوط علیہ السلام پر رحم فرمائیں جو کسی مضبوط جائے پناہ کی پناہ لینے کی تمنا کرتے تھے اور اگر میں قید خانہ میں اتنی لمبی مدت گزارتا جتنی لمبی مدت حضرت یوسف نے گزاری تھی تو میں (قید خانے سے نکل کر) بلانے والے کی بات مان لیتا۔

(صحیح البخاری: ۳۳۷۲، ۳۳۷۵، ۳۳۸۷، ۴۵۳۷، ۴۶۹۴، ۶۹۹۲، صحیح مسلم: ۱۵۱، سنن ابن ماجہ: ۴۰۲۶، مسند احمد: ۸۱۲۹، صحیح ابن حبان: ۶۲۰۸، مشکل الآثار للطحاوی: ۳۲۷)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ حضرت لوط علیہ السلام نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر دیا اور فرشتے گھر کے اندر تھے اور وہ اُن سے بحث کر رہے تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''فرشتوں نے کہا: ''اے لوط! ہم آپ کے رب کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں، یہ لوگ کبھی بھی آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے، پس آپ رات کے کسی وقت میں اپنے گھر والوں کو لے کر روانہ ہو جائیں اور آپ میں سے کوئی بھی پلٹ کر نہ دیکھے، آپ اپنی بیوی کے سوا باقی گھر والوں کو لے کر روانہ ہوں کیونکہ اس پر بھی وہی عذاب آئے گا جو اِن لوگوں پر عذاب آئے گا، اُن پر عذاب آنے کے لیے صبح کا وقت مقرر ہو چکا ہے، کیا صبح قریب نہیں ہے!''O (ہود:۸۱)

''قَالُوْا یٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ یَّصِلُوْۤا اِلَیْكَ'': فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام سے کہا: آپ دروازہ کھول دیں اور ہمیں ان فحش کام کرنے والوں کے ساتھ چھوڑ دیں، یہ کبھی بھی آپ کو نقصان پہنچانے کے لیے آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے، پس حضرت لوط علیہ السلام نے دروازہ کھول دیا، پھر حضرت جبریل علیہ السلام نے اپنے رب عزوجل سے ان لوگوں کو سزا دینے کے متعلق سوال کیا، پس اللہ تعالیٰ نے اُن کو اجازت عطا فرما دی، پس حضرت جبریل علیہ السلام اپنی اصل صورت میں کھڑے ہو گئے اور انہوں نے اپنے پروں کو کھولا جس میں موتی پروئے ہوئے تھے اور اُن کے دانت بہت چمکیلے تھے، پیشانی بہت کشادہ تھی اور اُن کا سر مرجان کی طرح تھا گویا وہ برف کی طرح سفید تھا، اور ان کے دونوں پیر سبز رنگ کے تھے۔ پس انہوں نے اُن لوگوں کے سامنے اپنے پروں کو جھاڑا تو اُن لوگوں کی آنکھیں اندھی ہو گئیں اور اُن کو راستہ نہیں مل رہا تھا، اور وہ اپنے گھروں کو جانے کا راستہ نہیں پا رہے تھے۔ پس وہ النجاۃ، النجاۃ کہتے ہوئے واپس لوٹے۔ انہوں نے کہا: لوط کے گھر میں اس زمین کا سب سے بڑا جادوگر ہے جس نے ہم پر جادو کر دیا اور وہ یہ کہنے لگے: اے لوط! اسی طرح رہو حتیٰ کہ صبح ہو جائے، پس صبح کو تم دیکھو گے کہ ہماری طرف سے تمہیں کیا سزا ملتی ہے، پس فرشتوں نے کہا: آپ بالکل نہ ڈریں، ہمیں ان کو ہلاک کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے، پھر حضرت لوط علیہ السلام نے فرشتوں سے پوچھا: ان کو ہلاک کرنے کا وعدہ کب پورا ہوگا؟ فرشتوں نے کہا: صبح کو، حضرت لوط علیہ السلام نے کہا: میں اس سے بھی جلدی چاہتا ہوں، کاش! تم ان کو ابھی اسی وقت ہلاک کر دیتے۔ تب فرشتوں نے کہا: ''اَلَیْسَ الصُّبْحُ بِقَرِیْبٍ'' یعنی کیا صبح اب جلد آنے والی نہیں ہے، پھر فرشتوں نے کہا: ''فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ'': اے لوط! آپ اپنے گھر والوں کو لے کر راتوں رات نکل جائیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر میں کہا: رات کے ایک حصہ میں نکل جائیں۔ الضحاک نے کہا: رات کے بقیہ حصہ

میں نکل جائیں، اور قتادہ نے کہا کہ سحر اول کے وقت نکل جائیں۔

"وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ": یعنی آپ لوگوں میں سے کوئی بھی مڑ کر نہ دیکھے سوائے آپ کی بیوی کے، کیونکہ وہ مڑ کر دیکھے گی اور ہلاک ہو جائے گی اور حضرت لوط علیہ السلام نے اس کو گھر سے نکال دیا۔ اور جن کو وہ رات کے وقت لے کر روانہ ہوئے تھے، اس کو اُن کے ساتھ لے جانے سے منع فرما دیا۔ اور جو اُن کے ساتھ تھے اُن کو بھی مڑ کر دیکھنے سے منع فرما دیا سوا اُن کی بیوی کے، اس نے جب اس عذاب کی آواز سنی تو مڑ کر دیکھا اور چلا کر کہا: اے میری قوم! اس کو پکڑ لو تو اس کے اوپر ایک پتھر آ کر لگا جس نے اس کو جان سے مار ڈالا۔ "اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَاۤ اَصَابَهُمْ": اس کو وہ عذاب پہنچنے والا ہے جو ان لوگوں کو عذاب پہنچا ہے۔

"اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ": اور ان سے صبح کے وقت عذاب کا وعدہ فرمایا گیا ہے، یعنی اُن کی ہلاکت کا وقت صبح ہوگا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پھر جب ہمارا عذاب آ گیا تو ہم نے اُن کی بستی کو الٹ پلٹ کر دیا، اس کے اوپر والا حصہ نیچے اور نیچے والا حصہ اوپر کر دیا، اور ہم نے اُن پر لگا تار آگ میں تپائے ہوئے پتھر برسائے O"

(ہود: ۸۲)

"فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا": یعنی جب اُن پر ہمارا عذاب آ گیا تو ہم نے اس بستی کو الٹ پلٹ کر دیا۔ اور اس بستی کا اوپر والا حصہ نیچے کر دیا اور نیچے والا حصہ اوپر کر دیا، کیونکہ حضرت جبریل علیہ السلام نے اپنا ایک پَر حضرت لوط علیہ السلام کی بستیوں کے نیچے رکھا اور یہ پانچ بستیاں تھیں اور ان میں چار لاکھ لوگ تھے۔ پس انہوں نے تمام بستیوں یا اُن کے شہروں کو اٹھا لیا حتیٰ کہ آسمان والوں نے مرغ کے چلانے کی اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنیں، پس انہوں نے اپنے برتن سیدھے نہیں کئے تھے اور کوئی سونے والا بیدار نہیں ہوا تھا، سو انہوں نے اپنے پَر کو پلٹا تو بستی کے اوپر والا حصہ نیچے کر دیا اور نیچے والا حصہ اوپر کر دیا۔

"وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ": اور ہم نے اُن کے اہلیان پر نشان زدہ کنکر برسائے۔ قتادہ اور عکرمہ نے کہا: "سِجِّيْل" مٹی کے پتھر ہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ الذاریات: ۳۳ میں فرمایا ہے: "لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍۙ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ۝" (الذاریات: ۳۳۔۳۴) "(تا کہ ہم اُن پر مٹی کے ایسے پتھر برسائیں O جن پر آپ کے رب کے پاس حد سے تجاوز کرنے والوں کے لئے نشان لگا یا ہوا ہے O)۔

مجاہد نے کہا: شروع میں پتھر برسائے اور آخر میں مٹی کے ڈھیلے برسائے۔ حسن بصری نے کہا: پتھروں کی اصل مٹی تھی جس کو گوندھا ہوا تھا۔ الضحاک نے کہا: یعنی وہ پکی اینٹیں تھیں۔ ایک قول یہ ہے کہ "سِجِّيْل" آسمانِ دنیا کا نام ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ وہ آسمانوں میں پہاڑ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ؕ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ۝" (النور: ۴۳) "(کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ ہی بادلوں کو تیز رفتاری سے چلاتے ہیں، پھر اس کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو یکجا فرماتے ہیں، پھر انہیں تہہ بہ تہہ کر دیتے ہیں، پھر آپ دیکھتے ہیں کہ اس بادل کے درمیان سے بارش نکلتی ہے اور اللہ آسمان میں پائے جانے والے پہاڑوں سے پکھاولے نازل فرماتے ہیں، پھر انہیں جس پر چاہتے ہیں برسانے ہیں

اور جس سے چاہتے ہیں پھیر دیتے ہیں، قریب ہے کہ بادل کی بجلی کی چمک آنکھوں کی بینائی کو اچک کر لے جائے)۔

"مَّنْضُوْدٍ": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ وہ نشان زدہ پتھر لگاتار ایک دوسرے کے بعد برس رہے تھے، یہ لفظ النضد کا مفعول ہے اور اس کا معنی یہ کہ چیزوں کو ایک دوسرے کے اوپر رکھنا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وہ پتھر آپ کے رب کی طرف سے نشان زدہ تھے، اور (پتھر برسانے کی) یہ سزا اپنی جانوں پر ظلم کرنے والوں کیلئے بعید نہیں ہے O" (ہود: ۸۳)

"مُّسَوَّمَةً": یہ پتھروں کی صفت ہے اور اس پر زبر بر بنائے حال ہے۔ ابن جریج نے کہا: اُن پتھروں پر ایسے نشان تھے جو زمین کے دوسرے پتھروں کے مشابہ نہیں تھے۔ اور قتادہ اور عکرمہ نے کہا: اُن پر سرخ دھاریاں تھیں۔ اور ایک قول یہ ہے کہ ہر پتھر پر اس شخص کا نام لکھا ہوا تھا جس پر وہ پتھر پھینکا جا رہا تھا۔ "عِنْدَ رَبِّكَ": یعنی وہ پتھر آپ کے رب کی طرف سے گرائے گئے تھے۔

"وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ": اور مشرکین مکہ سے بھی یہ عذاب زیادہ دور نہیں ہے۔ اور قتادہ اور عکرمہ نے کہا: یعنی اس امت میں سے جو اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے تھے اُن پر بھی یہ عذاب نازل فرمانا زیادہ دور نہیں ہے۔

روایت ہے کہ وہ پتھر اُن بستیوں میں سفر کرنے والوں پر بھی آکر گرے خواہ وہ کسی شہر میں ہوں۔ اور ایک مرد اُن میں سے حرم میں داخل ہو گیا، پس وہ پتھر آسمان اور زمین میں چالیس روز تک معلق رہا حتی کہ وہ شخص حرم سے باہر نکلا تو اس کو وہ پتھر آکر لگا اور اس نے اس کو ہلاک کر دیا۔ (معالم التنزیل، ج ۲ ص ۳۵۶۔۳۶۱، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ﴿۸۴﴾

اور ہم نے مدین کی طرف اُن کے ہم قبیلہ بھائی شعیب کو (رسول بنا کر) بھیجا، انہوں نے کہا: اے میری قوم! "اللہ کی عبادت کرو، تمہارے لیے اُن کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، اور تم ناپ اور تول میں کمی نہ کرو، بے شک میں تمہیں خوش حالی میں دیکھتا ہوں، اور بے شک میں تم پر احاطہ کر لینے والے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں O"

وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۸۵﴾

اور اے میری قوم! عدل کے ساتھ پورا پورا ناپ تول کرو اور لوگوں کو اُن کی طلب کردہ چیزیں کم کر کے نہ دیا کرو اور زمین میں نافرمانی کرتے ہوئے فساد نہ کروO

بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَاۤ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۸۶﴾

اللہ کا دیا ہوا باقی رزق جو تمہارے پاس ہے، وہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم اللہ پر ایمان رکھنے والے ہو، اور میں تمہاری نگرانی کرنے والا نہیں ہوں O

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴿۸۷﴾

اُن کی قوم نے کہا: "اے شعیب! کیا آپ کی نماز آپ کو یہ حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے اُن معبودوں کو ترک کر دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں یا ہم اپنے مالوں میں حسب منشا تصرف نہ کریں، کیا صرف آپ ہی بردبار اور عقلمند ہیں!"O

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰي مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ۭ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۭ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿۸۸﴾

شعیب نے کہا: "اے میری قوم! یہ بتاؤ اگر میں اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل پر قائم ہوں اور انہوں نے اپنے پاس سے مجھے عمدہ رزق عطا فرمایا ہو، اور میں یہ نہیں چاہتا کہ میں جن کاموں سے تم کو منع کرتا ہوں، میں خود اُن کاموں کو کروں، میں تو اپنی طاقت کے مطابق صرف اصلاح کرنا چاہتا ہوں، اور میری توفیق صرف اللہ کی طرف سے ہے، میں نے انہی پر توکل کیا ہے اور میں انہی کی طرف رجوع کرتا ہوں"O

وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ۭ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۹﴾

اے میری قوم! میری مخالفت تمہیں ایسے کاموں پر برانگیختہ نہ کرے کہ تم پر بھی ایسا ہی عذاب آجائے جیسا عذاب قوم نوح پر یا قوم ہود پر یا قوم صالح پر آیا تھا، اور لوط کی قوم کا عذاب تم سے زیادہ دور نہیں ہے O

وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ﴿۹۰﴾

اور تم اپنے رب سے مغفرت طلب کرو، پھر اُن کی طرف توبہ کرو، بے شک میرے رب سب پر رحم فرمانے والے سب سے محبت فرمانے والے ہیں O

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۡ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ﴿۹۱﴾

اُن کی قوم نے کہا: "اے شعیب! آپ کی کہی ہوئی اکثر باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور بے شک ہم آپ کو اپنے درمیان کمزور سمجھتے ہیں، اور اگر آپ کی پشت پر آپ کا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم آپ کو سنگسار کر چکے ہوتے، اور آپ ہم پر غلبہ رکھنے والے نہیں ہیں O"

قَالَ یٰقَوْمِ اَرَهْطِیْۤ اَعَزُّ عَلَیْكُمْ مِّنَ اللّٰهِؕ وَ اتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِیًّاؕ اِنَّ رَبِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ ﴿۹۲﴾

شعیب نے کہا: "اے میری قوم! کیا تمہارے نزدیک میرے قبیلہ کا رعب اور دبدبہ اللہ سے زیادہ ہے؟ اور کیا تم نے اللہ کو اپنے پس پشت ڈال رکھا ہے، بے شک میرے رب تمہارے کیے ہوئے تمام کاموں کا احاطہ فرمانے والے ہیں O"

وَ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّیْ عَامِلٌؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَۙ مَنْ یَّاْتِیْهِ عَذَابٌ یُّخْزِیْهِ وَ مَنْ هُوَ كَاذِبٌؕ وَ ارْتَقِبُوْۤا اِنِّیْ مَعَكُمْ رَقِیْبٌ ﴿۹۳﴾

اور اے میری قوم! تم اپنی جگہ کام کرتے رہو میں اپنی جگہ کام کرنے والا ہوں، تم عنقریب جان لوگے کہ کس پر رسوا کرنے والا عذاب آئے گا اور کون جھوٹا ہے، تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں O

وَ لَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّیْنَا شُعَیْبًا وَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ اَخَذَتِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِهِمْ جٰثِمِیْنَۙ ﴿۹۴﴾

اور جب ہمارا عذاب آ پہنچا تو ہم نے شعیب کو اور جو اُن کے ساتھ ایمان لانے والے تھے ان کو اپنی رحمت سے نجات عطا فرمادی اور اپنی جان پر ظلم کرنے والوں کو زبردست چنگھاڑ نے پکڑ لیا، سو وہ اپنے گھروں میں گھٹنوں کے بل پڑے ہوئے رہ گئے O

كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَاؕ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْیَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ۠ ﴿۹۵﴾

گویا کہ وہ کبھی اُن گھروں میں رہے ہی نہ تھے، سنو! مدین میں رہنے والوں کے لیے ایسی ہی تباہی ہے جیسے قوم ثمود پر تباہی نازل ہوئی O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ہم نے مدین کی طرف اُن کے ہم قبیلہ بھائی شعیب کو (رسول بنا کر) بھیجا، انہوں نے کہا: اے میری قوم! "اللہ کی عبادت کرو، تمہارے لیے اُن کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، اور تم ناپ اور تول میں کمی نہ کرو، بے شک میں تمہیں خوش حالی میں دیکھتا ہوں، اور بے شک میں تم پر احاطہ کر لینے والے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں" O (ہود: ۸۴)

حضرت شعیب علیہ السلام کا اُن کی قوم کے ساتھ قصہ

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ، ہود: ۸۴ تا ۹۵ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَاِلٰی مَدۡیَنَ اَخَاهُمۡ شُعَیۡبًا": مدین حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے کا نام تھا، پھر یہ قبیلہ کا نام پڑ گیا۔ اور اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ مدین اس شہر کا نام ہے جس کو مدین بن ابراہیم علیہ السلام نے آباد کیا تھا۔ اور اس صورت میں اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ہم نے اہلِ مدین کی طرف (سیدنا) شعیب علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا۔

"قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَیۡرُهٗ":

انبیاء علیہم السلام کی تبلیغ کا اسلوب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام ابتداءً اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور اُن کی توحید کی دعوت دیتے ہیں۔ اس لیے حضرت شعیب علیہ السلام نے اہلِ مدین سے کہا کہ میرے نزدیک تمہاری عبادت کا اللہ عزوجل کے سوا اور کوئی مستحق نہیں ہے۔ پھر توحید کی دعوت دینے کے بعد انبیاء علیہم السلام زیادہ ضروری کاموں کا اور اہم کاموں کا حکم دیتے ہیں، اور جب کہ اہلِ مدین میں یہ معروف تھا کہ وہ ناپ اور تول میں کمی کرتے تھے تو حضرت شعیب علیہ السلام نے اُن کو اس عادت کے ترک کرنے کی دعوت دی۔ پس فرمایا: "وَلَا تَنۡقُصُوا الۡمِکۡیَالَ وَالۡمِیۡزَانَ": تم ناپ اور تول کے اندر کمی نہ کرو۔ یعنی جب انہوں نے کسی سے کچھ لینا ہوتا تو اپنے حق سے زیادہ لیتے تھے اور جب کسی کو کچھ دینا ہوتا تو اس کے حق سے کم دیتے تھے۔

پھر فرمایا: "اِنِّیۡۤ اَرٰىکُمۡ بِخَیۡرٍ": یعنی تم خوش حال لوگ ہو۔ اور اُن کو اس سے ڈرایا کہ اگر تم نے اپنی اس عادت کو نہ چھوڑا تو چیزیں مہنگی ہو جائیں گی اور تم سے خوش حالی چلی جائے گی۔ اور دوسرا محمل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو بہت مال و دولت عطا فرمایا ہے تو تمہیں کم تولنے اور کم پیمائش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

"وَاِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ مُّحِیۡطٍ": اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس عذابِ محیط سے ڈرایا ہے جو سب پر آئے گا اور کوئی اس سے بچ نہیں سکے گا۔ بہ ظاہر المحیط دن کی صفت ہے اور معنی میں یہ عذاب کی صفت ہے۔

بعض مفسرین نے کہا: اس عذاب سے قیامت کے دن کا عذاب مراد ہے، کیونکہ یہی وہ دن ہے جس دن معذبین کو اُن کا عذاب احاطہ کرے گا۔ اور بعض نے کہا: اس سے دنیا اور آخرت کا عذاب مراد ہے۔ اور زیادہ قریب بات یہ ہے کہ اس سے ہر قسم کا عذاب مراد ہے۔

ایک اعتراض کا جواب

اس آیت میں ناپ تول میں کمی کرنے کے متعلق تین آیتوں کو ذکر فرمایا ہے: (۱) "وَلَا تَنۡقُصُوا الۡمِکۡیَالَ وَالۡمِیۡزَانَ" (۲) "اَوۡفُوا الۡمِکۡیَالَ وَالۡمِیۡزَانَ"، (۳) "وَلَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡیَآءَهُمۡ"۔

ناپ تول میں کمی کی آیات کے تکرار کی توجیہات

(۱) چونکہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم ناپ تول میں کمی پر اصرار کرتی تھی تو اس لیے یہ ضرورت تھی کہ اُن کو اس سے ممانعت کے لیے مبالغہ اور تاکید فرمائی جائے اور آیتوں کو بار بار ذکر فرمایا جائے تاکہ تاکید کا فائدہ ہو۔

(۲) اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَ لَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ" اس آیت میں ناپ تول میں کمی کرنے سے منع فرمایا ہے اور دوسری آیت میں فرمایا ہے: "اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ" اس آیت میں عدل کے ساتھ پورا پورا تولنے اور ناپنے کا حکم فرمایا ہے۔

(۳) پہلی آیت میں فرمایا ہے: "وَ لَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ" اور دوسری آیت میں فرمایا ہے: "اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ" اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ جب کسی شخص کو اس کے حق سے زیادہ دیا جائے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اے میری قوم! عدل کے ساتھ پورا پورا ناپ تول کرو اور لوگوں کو ان کی طلب کردہ چیزیں کم کر کے نہ دیا کرو اور زمین میں نافرمانی کرتے ہوئے فساد نہ کروO" (ہود: ۸۵)

"وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ":

"العثو" کا معنی ہے پورا پورا فساد اور "وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ" اس کے قائم مقام ہے کہ کہا جائے: "وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ"۔

(۱) اس کا معنی ہے کہ تم دوسرے کی مصلحتوں کو فاسد کرنے کی کوشش نہ کرو، کیونکہ در حقیقت یہ تمہاری اپنی مصلحتوں کے فساد کو متضمن ہے۔

(۲) "وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ" سے مراد ہے تم اپنی دنیا اور آخرت کی مصلحتوں کو فاسد نہ کرو۔

(۳) "وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ" سے مراد ہے کہ تم تمام ادیان کی مصلحتوں کو فاسد نہ کرو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اللہ کا دیا ہوا باقی رزق جو تمہارے پاس ہے، وہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم اللہ پر ایمان رکھنے والے ہو، اور میں تمہاری نگرانی کرنے والا نہیں ہوںO" (ہود: ۸۶)

"بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ":

اس کی ایک قراءت ہے "تَقِيَّةُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ" یعنی اللہ سے ڈرنا اور اللہ سے ڈر کر ناپ تول میں کمی کو ترک کر دینا تمہارے لیے دنیا کے مال سے بہت بہتر ہے، یعنی جو مال حلال ہو وہ تمہارے لیے لوگوں کے اموال میں کمی کر کے نفع حاصل کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔

حسن بصری نے کہا: "بَقِيَّتُ اللّٰهِ" سے مراد ہے تمہارا اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنا تمہارے لئے اس معمولی مقدار سے بہتر ہے جو تم ناپ تول میں کمی کر کے حاصل کرتے ہو، کیونکہ طاعت کا ثواب ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ اور قتادہ نے کہا: تمہارے رب سے جو تمہیں حصہ مل جائے وہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔

"اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ": یعنی اس کا بہتر ہونا اس سے مشروط ہے کہ تم اللہ تعالیٰ پر کامل یقین رکھتے ہو اور ثواب اور عذاب پر یقین رکھتے ہو، اور تم یہ جانتے ہو کہ ثواب کے حاصل کرنے میں کوشش کرنا اور عذاب سے بچنے کی سعی کرنا یہ دنیا کے مال قلیل سے بہت بہتر ہے۔

"وَمَاۤ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ": اس کا معنی یہ ہے کہ میں نے تمہیں نصیحت کی اور تم کو ہدایت دی اور نیکی کا راستہ دکھایا، لیکن میں

تمہارے اعمال پر نگہبان نہیں ہوں، مجھے اس پر قدرت نہیں ہے کہ میں تم کو جبراً اس برے کام سے روک دوں۔ نیز اس میں یہ اشارہ بھی کیا کہ ناپ تول میں کمی کے ساتھ مشغول ہونا اللہ تعالیٰ کی نعمت کے زوال کا باعث ہے، اور میں تم پر نگران نہیں ہوں، یعنی اگر تم نے یہ برا کام نہ چھوڑا تو تم سے اللہ تعالیٰ کی نعمتیں جاتی رہیں گی اور میں تمہارے لیے اُن نعمتوں کی حفاظت کرنے پر قادر نہیں ہوں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اُن کی قوم نے کہا: ''اے شعیب! کیا آپ کی نماز آپ کو یہ حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے اُن معبودوں کو ترک کر دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں یا ہم اپنے مالوں میں حسب منشاء تصرف نہ کریں، کیا صرف آپ ہی بُردبار اور عقلمند ہیں!''O (ھود:۸۷)

''قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ'': حضرت شعیب علیہ السلام نے اُن کو دو چیزوں کا حکم دیا تھا، ایک توحید کا کہ تمہارے آباء واجداد جن خود ساختہ بتوں کی عبادت کرتے تھے ان کو چھوڑ دو اور صرف اللہ واحد کی عبادت کرو، اور دوسرا یہ حکم دیا تھا کہ ناپ تول میں کمی کو ترک کر دو، تو اُن کی قوم نے یہ کہہ کر اُن کی بات ماننے سے انکار کر دیا ''اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ'' اس میں یہ اشارہ ہے کہ آپ نے جو ہمیں توحید کا حکم دیا ہے، ہم اس کو نہیں مانیں گے۔

نیز انہوں نے کہا: ''اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا'' کہ آپ نے جو ہمیں ناپ تول میں کمی کرنے سے منع کیا ہے اور ہمیں اپنی مرضی سے اپنے اموال میں تصرف کرنے سے روکا ہے ہم اس کو بھی نہیں مانیں گے۔

''اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ'': کیا صرف آپ ہی بُردبار اور عقلمند ہیں۔

''الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ'' کہنے کی توجیہات

(۱) اُن کی مراد یہ تھی کہ آپ بے وقوف جاہل ہیں، لیکن انہوں نے طنزاً اس کے برعکس کہا، جیسے کسی بخیل اور خسیس کو کہا جائے کہ اگر تمہاری سخاوت کو حاتم بھی دیکھ لیتا تو تمہیں سجدہ کرتا۔

(۲) اُن کی مراد یہ تھی کہ آپ اپنے آپ کو علم اور رُشد کے ساتھ موصوف کرتے ہیں۔

(۳) اُن کے نزدیک مشہور یہ تھا کہ حضرت شعیب علیہ السلام حلیم، رشید ہیں، پھر جب حضرت شعیب علیہ السلام نے انہیں اُن کے طریقہ کو چھوڑنے کا حکم فرمایا تو انہوں نے کہا کہ آپ تو الحلیم الرشید ہیں تو آپ ہمیں کیوں اس دین سے روکتے ہیں جس پر ہم نے اپنے آباء واجداد کو پایا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''شعیب نے کہا: ''اے میری قوم! یہ بتاؤ اگر میں اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل پر قائم ہوں اور انہوں نے اپنے پاس سے مجھے عمدہ رزق عطا فرمایا ہو، اور میں یہ نہیں چاہتا کہ میں جن کاموں سے تم کو منع کرتا ہوں، میں خود اُن کاموں کو کروں، میں تو اپنی طاقت کے مطابق صرف اصلاح کرنا چاہتا ہوں، اور میری توفیق صرف اللہ کی طرف سے ہے، میں نے اسی پر توکل کیا ہے اور میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں''O اے میری قوم! میری مخالفت تمہیں ایسے کاموں پر برانگیختہ نہ کرے کہ تم پر بھی ایسا ہی عذاب آجائے جیسا عذاب قومِ نوح پر، یا قومِ ہود پر یا قومِ صالح پر آیا تھا، اور لوط کی قوم کا عذاب تم سے زیادہ دور

نہیں ہے O تم اپنے رب سے مغفرت طلب کرو، پھر اُن کی طرف توبہ کرو، بے شک میرے رب سب پر رحم فرمانے والے، سب سے محبت فرمانے والے ہیں O (ہود:۸۸۔۸۹۔۹۰)

"قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿۸۸﴾ وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۹﴾ وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ":

حضرت شعیب علیہ السلام نے جو اُن کے متعلق یہ امور ذکر فرمائے، ان میں لطیف ترتیب ہے، اس لئے کہ انہوں نے پہلے یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جو مجھ پر بہ کثرت انعامات فرمائے ہیں اور ظاہر اور باطن میں اپنی توحید پر دلائل قائم فرمائے ہیں، وہ مجھے اس سے منع کرتے ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ کی وحی میں خیانت کروں۔ پھر دوبارہ یہ بیان فرمایا کہ وہ اس دعوت اور تبلیغ پر دائماً عمل کرتے رہیں گے۔ پھر یہ بیان فرمایا کہ حضرت شعیب علیہ السلام اس بات میں معروف تھے کہ وہ نیکی کے راستوں کو حاصل کرتے ہیں اور فتنہ کے موجبات کو ترک کرتے ہیں، پس اگر اُن کی یہ دعوت باطل ہوتی تو وہ اس کے ساتھ نہ مشغول ہوتے۔ پھر بہ طور تعریض یہ فرمایا کہ تم مجھ سے عداوت کر رہے ہو تو کوئی مذہب اور کوئی دین اس کی اجازت نہیں دیتا اور اس کے سبب سے تم عذابِ شدید کے مستحق ہوتے ہو جیسا کہ اس سے پہلے انبیاء متقدمین کا طریقہ ہے۔ پھر جب انہوں نے اپنے مذہب کے دلائل کو واضح کر دیا تو پھر اپنی تقریر کو دہرایا اور وہ اللہ تعالیٰ کی توحید کی طرف دعوت دیتا تھا اور ناپ تول میں کمی کرنے سے منع فرماتا تھا۔

"ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ": پھر بیان کیا کہ ان کی قوم نے جو پہلے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی ہے اور کفر کیا ہے تو وہ اُن کی توبہ کرنے سے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کو طلب کرنے سے مانع نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ایمان کو قبول فرماتے ہیں اور کافر کی بھی توبہ قبول فرما لیتے ہیں اور فاسق کے رجوع کو بھی قبول فرما لیتے ہیں، کیونکہ اُن کی رحمت اور اُن کی محبت کا یہی تقاضا ہے اور یہ تقریر انتہائی کمال پر مبنی ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اُن کی قوم نے کہا: "اے شعیب! آپ کی کہی ہوئی اکثر باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور بے شک ہم آپ کو اپنے درمیان کمزور سمجھتے ہیں، اور اگر آپ کی پشت پر آپ کا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم آپ کو سنگسار کر چکے ہوتے، اور آپ ہم پر غلبہ رکھنے والے نہیں ہیں" O (ہود:۹۱)

"قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ":

حضرت شعیب علیہ السلام کی تقریر کا اُن کی قوم نے جو جواب دیا اس کے محامل

کوئی شخص یہ کہہ سکتا تھا کہ جب حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم سے اُن کی زبان میں خطاب کرتے تھے تو پھر انہوں نے کیوں کہا: "ہم آپ کی باتوں کو نہیں سمجھتے"؟ اس کے حسب ذیل محامل ہیں:

(ا) انہوں نے جو کہا کہ ہم آپ کی اکثر باتوں کو نہیں سمجھتے، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حضرت شعیب علیہ السلام کی تقریر کو غور سے نہیں سنتے تھے، اور چونکہ وہ حضرت شعیب علیہ السلام سے شدید نفرت کرتے تھے، اس لئے انہوں نے کہا: آپ کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں، جیسا

کہ قرآن مجید میں ہے: ''وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ‘‘ (الانعام: ۲۵) ''(اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں کہ وہ اس کو سمجھ نہ سکیں، اور ان کے کانوں میں ثقل پیدا فرما دیا ہے (کہ وہ سن نہ سکیں)۔

(۲) اگرچہ قوم شعیب، حضرت شعیب علیہ السلام کی باتوں کو سمجھتی تھی لیکن وہ ان باتوں کو کوئی حیثیت نہیں دیتی تھی تو انہوں نے بہ طور توہین کہا کہ ہم نہیں جانتے تم کیا کہہ رہے ہو۔

(۳) اُن کی مراد یہ تھی کہ جو دلائل آپ نے ذکر کیے ہیں یہ ہمارے نزدیک اللہ تعالیٰ کی توحید کو ثابت کرنے کے لیے اور آپ کی نبوت کو ثابت کرنے کے لیے اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے پر ایمان لانے کے لیے کافی نہیں ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کے نابینا ہونے کی بحث

''وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا '': ضعیف کا معنی حمیر کی لغت میں نابینا ہے۔

ہمارے اصحاب انبیاء علیہم السلام کے لیے نابینا ہونے کو جائز قرار دیتے ہیں، اور رہے معتزلہ تو وہ یہ کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کا نابینا ہونا غیر ممکن ہے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے عبادت گزار ہوتے ہیں اور نابینا شخص کا نجاسات سے احتراز کرنا ممکن نہیں ہے۔ اور اس لیے کہ کسی حاکم یا شاہد کے لیے نابینا ہونا ممکن نہیں ہے تو نبی کے لیے نابینا ہونا بہ طریق اولیٰ ناممکن ہوگا۔

حضرت شعیب علیہ السلام کے نابینا ہونے کے متعلق آثار

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

امام واحدی اور امام ابن عساکر نے شداد بن اوس سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شعیب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی محبت میں اس قدر روئے حتیٰ کہ وہ نابینا ہو گئے، پس اللہ تعالیٰ نے اُن پر اُن کی بصارت کو لوٹا دیا اور اُن کی طرف یہ وحی فرمائی کہ اے شعیب! یہ تمہارا رونا کس لیے ہے؟ کیا جنت کے شوق میں روتے ہو یا دوزخ کے خوف سے روتے ہو؟ حضرت شعیب علیہ السلام نے عرض کیا: لیکن میرے دل میں آپ کی محبت ہے، پس جب میں آپ کی طرف دیکھتا ہوں تو میں پرواہ نہیں کرتا کہ آپ میرے ساتھ کیا کرتے ہیں، تب اللہ عزوجل نے حضرت شعیب علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی: اگر تمہارا یہ کلام برحق ہے تو اے شعیب! تمہیں میری ملاقات مبارک ہو، اسی وجہ سے میں موسیٰ بن عمران کو جو میرا کلیم ہے آپ کی خدمت میں مہیا کرتا ہوں۔

(روح المعانی جز ۱۲ ص ۱۸۵، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۷ھ)

''وَلَوْلَا رَهْطُكَ '': صاحب الکشاف علامہ زمخشری نے کہا ہے: ''رهط '' کا اطلاق تین سے لے کر دس افراد تک ہوتا ہے، دوسرا قول ہے کہ سات افراد تک ہوتا ہے۔ اُن کی مراد یہ تھی کہ اگر آپ کے قبیلہ کی تکریم ہمارے نزدیک نہ ہوتی تو ہم آپ کو رجم کر دیتے، اور اس کلام سے مقصود یہ ہے کہ اُن کے نزدیک حضرت شعیب علیہ السلام کی کوئی حرمت نہیں تھی۔

''لَرَجَمْنٰكَ '':

رجم کا لغت میں معنی ہے کسی چیز کو پھینکنا، اور کبھی یہ پتھر پھینکنے سے پورا ہوتا ہے اور کبھی قول سے ہوتا ہے، اور کبھی گالی دینے اور لعنت کرنے سے ہوتا ہے جیسے الشیطان الرجیم کہا جاتا ہے۔ اور کبھی دھتکارنے سے ہوتا ہے جیسے قرآن مجید میں ہے ''رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ '' (الملک: ۵) '' (اور ہم نے شہاب ثاقب کو شیطانوں کے بھگانے کا سبب بنایا)۔

لہٰذا "لَرَجَمۡنٰكَ" کا معنی ہے: ہم آپ کو قتل کر دیتے۔ یا اس کا معنی ہے: ہم آپ کی مذمت کرتے اور آپ کو دھتکار دیتے۔

"وَمَاۤ اَنۡتَ عَلَيۡنَا بِعَزِيۡزٍ": اس کا معنی یہ ہے کہ چونکہ آپ ہمارے نزدیک غالب نہیں ہیں، اس لئے ہمارے لئے آپ کو قتل کرنا اور آپ کو ایذاء پہنچانا بہت آسان ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "شعیب نے کہا: "اے میری قوم! کیا تمہارے نزدیک میرے قبیلہ کا رعب اور دبدبہ اللہ سے زیادہ ہے؟ اور کیا تم نے اللہ کو اپنے پسِ پشت ڈال رکھا ہے، بے شک میرے رب تمہارے کیے ہوئے تمام کاموں کا احاطہ فرمانے والے ہیں" O اور اے میری قوم! تم اپنی جگہ کام کرتے رہو میں اپنی جگہ کام کرنے والا ہوں، تم عنقریب جان لوگے کہ کس پر رسوا کرنے والا عذاب آئے گا اور کون جھوٹا ہے، تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں O" (ہود: ۹۲۔۹۳)

"قَالَ يٰقَوۡمِ اَرَهۡطِىۡۤ اَعَزُّ عَلَيۡكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ":

ہود: ۹۲ کا معنی یہ ہے کہ (سیدنا) شعیب علیہ السلام کی قوم کا اپنے زعم میں اُن کو ایذاء پہنچانے کو ترک کرنا اُن کی قوم کی رعایت کی وجہ سے تھا تو حضرت شعیب علیہ السلام نے کہا کہ تم اپنے زعم میں میرے قتل کرنے کو میرے قبیلے کے اکرام کی وجہ سے ترک کر رہے ہو، اور اللہ تعالیٰ اس کے زیادہ لائق ہیں کہ اُن کے حکم کی اتباع کی جائے۔

"وَاتَّخَذۡتُمُوۡهُ وَرَآءَكُمۡ ظِهۡرِيًّا": اس کا معنی یہ ہے کہ تم نے اللہ عزوجل کو بھلا دیا اور تم نے اللہ عزوجل کو ایسی چیز قرار دیا جس کو پسِ پشت پھینک دیا جائے اور اس کی طرف توجہ اور التفات نہ کی جائے۔

"اِنَّ رَبِّىۡ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ مُحِيۡطٌ": یعنی میرے رب تمہارے تمام احوال کو جاننے والے ہیں، لہٰذا اُن سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔

"وَيٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا عَلٰى مَكَانَتِكُمۡ اِنِّىۡ عَامِلٌ":

اس کا معنی یہ ہے کہ تم اپنی انتہائی قدرت کے ساتھ اور طاقت کے ساتھ جو کچھ کر سکتے ہو، وہ کر لو۔ اور میری طرف تم شرور کو پہنچاؤ، اور میں بھی اللہ تعالیٰ نے جو مجھے قدرت عطا فرمائی ہے، اس کے مطابق عمل کرتا رہوں گا۔

"سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ مَنۡ يَّاۡتِيۡهِ عَذَابٌ يُّخۡزِيۡهِ وَمَنۡ هُوَ كَاذِبٌ": گویا کہ اُن کی قوم نے کہا کہ پھر اس کے بعد کیا ہوگا، تو شعیب علیہ السلام نے فرمایا: تم عنقریب جان لوگے۔

پھر فرمایا: "وَارۡتَقِبُوۡۤا اِنِّىۡ مَعَكُمۡ رَقِيۡبٌ": یعنی تم بھی عاقبت کا انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور جب ہمارا عذاب آپہنچا تو ہم نے شعیب کو اور جو اُن کے ساتھ ایمان لانے والے تھے ان کو اپنی رحمت سے نجات عطا فرما دی اور اپنی جان پر ظلم کرنے والوں کو زبردست چنگھاڑ نے پکڑ لیا، سو وہ اپنے گھروں میں گھٹنوں کے بل پڑے ہوئے رہ گئے O گویا کہ وہ کبھی اُن گھروں میں رہے ہی نہ تھے، سنو! مدین میں رہنے والوں کے لیے ایسی ہی تباہی ہے جیسے قومِ ثمود پر تباہی نازل ہوئی O" (ہود: ۹۴۔۹۵)

الکلبی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو امتوں کو ایک قسم کا عذاب نہیں دیا سوائے قوم شعیب اور قوم صالح کے۔ رہی قوم صالح تو ان کو ان کے نیچے سے ایک چنگھاڑ نے آ کر پکڑ لیا، اور رہی قوم شعیب تو ان کو ان کے اوپر سے ایک چنگھاڑ نے آ کر پکڑ لیا۔

''وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا'': اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ جب ان پر عذاب کا وقت آیا تو ہم نے فرشتوں میں سے کسی فرشتہ کو حکم فرمایا، پھر اس نے وہ چیخ یا چنگھاڑ ماری، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امر سے مراد عذاب ہو۔ ہر دو تقدیر پر اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کو اور جو ان کے ساتھ ایمان لانے والے تھے، ان کو اپنی رحمت سے نجات عطا فرما دی۔

''نَجَّیْنَا شُعَیْبًا وَّالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا'': اور اس کے دو محمل ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ نے ان کو جو عذاب سے محفوظ رکھا، وہ محض اپنی رحمت سے، اس پر تنبیہ فرماتے ہوئے کہ بندہ کو جو نعمت بھی پہنچتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے محض فضل سے پہنچتی ہے۔

(۲) رحمت سے مراد ایمان، اطاعت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے اور باقی نیک اعمال جو صرف اللہ تعالیٰ کی توفیق سے حاصل ہوتے ہیں۔

''وَاَخَذَتِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَةُ'': اس سے مراد مخصوص چیخ ہے اور یہ حضرت جبریل علیہ السلام کی چیخ تھی۔

''فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ'': جاثم اس کو کہتے ہیں جو اپنی جگہ پر لازم رہے اور اس جگہ سے ادھر ادھر نہ ہو سکے، یعنی جب حضرت جبریل علیہ السلام نے چیخ ماری تو وہ اسی ساعت میں مر گئے۔

''كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا'': گویا کہ وہ کبھی اپنے گھروں میں زندہ رہے ہی نہ تھے۔

''اَلَا بُعْدًا لِّمَدْیَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ'': یعنی جس طرح قوم ثمود پر لعنت اور عذاب کا نزول ہوا تھا، اسی طرح (سیدنا) شعیب علیہ السلام کی قوم کے منکروں اور کافروں پر بھی لعنت اور عذاب کا نزول ہوا۔

(تفسیر کبیر ج ۶ ص ۳۸۳-۳۹۳، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۹۶﴾

اور بے شک ہم نے موسیٰ کو اپنی واضح نشانیوں اور روشن دلیل کے ساتھ رسول بنا کر بھیجا O

اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَاۡئِهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ ﴿۹۷﴾

فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف، پس فرعون کے درباریوں نے اس کے حکم کی پیروی کی، حالانکہ فرعون کا حکم درست نہیں تھا O

یَقْدُمُ قَوْمَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿۹۸﴾

قیامت کے دن فرعون اپنی قوم کے آگے ہو گا اور وہ ان کو دوزخ میں جھونک دے گا، اور دوزخ میں ٹھہرنے کا کیسا برا گھاٹ ہے O

وَأُتْبِعُوا فِي هَٰذِهِ لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُودُ ﴿٩٩﴾

اور اُن پر دنیا میں اور آخرت میں لعنت بھیجی جاتی رہے گی، اور یہ لعنت بہت ہی سنگین چیز ہے O

ذَٰلِكَ مِنْ أَنبَاءِ الْقُرَىٰ نَقُصُّهُ عَلَيْكَ ۖ مِنْهَا قَائِمٌ وَحَصِيدٌ ﴿١٠٠﴾

یہ ان بستیوں کی چند خبریں ہیں جن کا قصہ ہم آپ کو بیان فرما رہے ہیں، ان میں سے کچھ بستیاں ابھی تک قائم ہیں اور کچھ بستیوں کی فصل کٹ چکی ہے O

وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَٰكِن ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ ۖ فَمَا أَغْنَتْ عَنْهُمْ آلِهَتُهُمُ الَّتِي يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مِن شَيْءٍ لَّمَّا جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ ۖ وَمَا زَادُوهُمْ غَيْرَ تَتْبِيبٍ ﴿١٠١﴾

اور ہم نے اُن بستیوں والوں پر کوئی ظلم نہیں فرمایا لیکن وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے، اور جب آپ کے رب کا عذاب آ گیا تو ان کے جھوٹے معبود ان کے کسی کام نہ آ سکے اور انہوں نے ہلاکت اور بربادی کے سوا انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچایا O

وَكَذَٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرَىٰ وَهِيَ ظَالِمَةٌ ۚ إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ ﴿١٠٢﴾

اور اسی طرح آپ کے رب جب بستیوں کو ان کے ظلم کرنے کے وقت پکڑتے ہیں تو بے شک اُن کی گرفت بہت دردناک اور سخت ہوتی ہے O

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْآخِرَةِ ۚ ذَٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوعٌ لَّهُ النَّاسُ وَذَٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُودٌ ﴿١٠٣﴾

بے شک ان قصوں میں اس شخص کے لیے ضرور عبرت کی نشانی ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہے، یہ وہ دن ہے جس میں سب لوگوں کو جمع فرمایا جائے گا اور اسی دن سب لوگوں کو حاضر فرمایا جائے گا O

وَمَا نُؤَخِّرُهُ إِلَّا لِأَجَلٍ مَّعْدُودٍ ﴿١٠٤﴾

اور ہم اس معین دن کو صرف معین مدت کے لیے ہی مؤخر فرما رہے ہیں O

يَوْمَ يَأْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَسَعِيدٌ ﴿١٠٥﴾

جب وہ دن آئے گا تو کوئی ذی روح اُن کی اجازت کے بغیر بات نہیں کر سکے گا، سو ان میں سے بعض بد بخت ہیں اور بعض نیک بخت ہیں O

فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُوا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ ﴿١٠٦﴾

رہے وہ لوگ جو بد بخت ہیں تو وہ دوزخ کی آگ میں ہوں گے تو وہ اس میں چلائیں گے اور دہاڑیں گے O

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿۱۰۷﴾

وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں جب تک کہ آسمان اور زمینیں قائم رہیں گے سوا اس عرصہ کے جس کو آپ کے رب چاہیں، بے شک آپ کے رب جس چیز کو چاہیں اس کو کرنے والے ہیں O

وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِى الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾

رہے وہ لوگ جو نیک بخت ہیں سو وہ جنت میں ہیں، اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں جب تک کہ آسمان اور زمینیں قائم ہیں، مگر جتنا آپ کے رب چاہیں، یہ اللہ کی وہ عطا ہے جو کبھی منقطع نہیں ہو گی O

فَلَا تَكُ فِىْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ؕ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿۱۰۹﴾

سو (اے رسول اکرم!) یہ کفار جو بتوں کی عبادت کرتے ہیں، آپ اُن کی عبادت کے متعلق (بالفرض) کسی شک میں نہ ہیں، یہ اسی طرح خود ساختہ بتوں کی عبادت کرتے ہیں جس طرح ان سے پہلے ان کے باپ دادا کیا کرتے تھے، بے شک ہم ان کو ان کا پورا پورا عذاب دیں گے اس میں کوئی کمی نہیں ہو گی O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور بے شک ہم نے موسیٰ کو اپنی واضح نشانیوں اور روشن دلیل کے ساتھ رسول بنا کر بھیجا O" (ہود: ۹۶)

فرعون اور اس کے متبعین کا قصہ

امام ابو منصور محمد بن محمد ماتریدی المتوفی ۳۳۳ھ، ہود: ۹۶ تا ۱۰۲ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ": "سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ" سے مراد دلائل ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "آیات" اور "سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ" دونوں سے مراد واحد ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "آیات" سے مراد اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواہی ہوں، اور "سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ" سے مراد دلائل اور براہین ہوں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف، پس فرعون کے درباریوں نے اس کے حکم کی پیروی کی، حالانکہ فرعون کا حکم درست نہیں تھا O" (ہود: ۹۷)

"اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ": ہم نے پہلے ذکر کیا تھا کہ "الملاء" دو چیزوں کا نام ہے، ایک تو جماعت کا نام ہے اور دوسرا معزز اور مقتدر لوگوں کا نام ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے اشراف اور اپنی قوم کی جماعت دونوں کی طرف مبعوث فرمائے گئے تھے، ان کی بعثت کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف مخصوص رکھا گیا تھا، اگرچہ وہ مبعوث سب کی طرف تھے، لیکن بادشاہوں کا عرف یہ ہے کہ وہ مقتدر اور معزز لوگوں سے خطاب کرتے ہیں، اگرچہ مقصود سب سے خطاب کرنا ہوتا ہے۔

"فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ": اس لیے ان کی قوم کے اشراف اور معزز لوگوں نے فرعون کی اطاعت کی، اللہ عزوجل فرماتے ہیں: "وَمَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ" یعنی فرعون کا حکم ہدایت پر مبنی نہیں تھا، بلکہ فرعون گمراہی میں مبتلا تھا لیکن ہمارے نزدیک معنی یہ ہے کہ اس کی قوم کے سرداروں نے فرعون کے تمام احکام میں اس کی اطاعت کی۔ بتوں کی عبادت کرنے میں اور دیگر معاملات میں۔

اللہ عزوجل نے فرمایا: "وَمَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ" یعنی فرعون کے احکام ہدایت پر مبنی نہیں تھے بلکہ وہ ضال اور مضل تھا، خود بھی گمراہ تھا اور لوگوں کو بھی گمراہ کرتا تھا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "قیامت کے دن فرعون اپنی قوم کے آگے ہوگا اور وہ اُن کو دوزخ میں جھونک دے گا اور دوزخ میں ٹھہرنے کا کیسا برا گھاٹ ہے ○" (ہود:۹۸)

"یَقْدُمُ قَوْمَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ": بعض مفسرین نے کہا: وہ اپنی قوم کی پیشوائی میں آگے آگے چلے گا۔ اور دیگر مفسرین نے کہا: وہ اپنی قوم کی پیشوائی کرتا ہوا دوزخ تک لے آئے گا حتیٰ کہ اُن کو دوزخ میں داخل کر دے گا۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "یَقْدُمُ قَوْمَهٗ" کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنی قوم کا قیامت کے دن امام ہوگا، اس کی قوم اس کی پیروی کرے گی جیسا کہ دنیا میں وہ اپنی قوم کا امام تھا اور اس کی قوم اس کی اتباع کرتی تھی، اسی طرح آخرت میں بھی وہ امام ہوگا۔ بنی اسرائیل: ۷۱ میں ارشاد ہے: "یَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ" (بنی اسرائیل:۷۱) "(اس دن کو یاد کیجئے جب ہم ہر جماعت کو اس کے امام کے ساتھ بلائیں گے)۔ اور اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً یَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ" (القصص:۴۱) "(اور ہم نے ان کو (دنیا میں) کافروں کا پیشوا بنایا تھا جو لوگوں کو دوزخ کی آگ کی طرف بلاتے ہیں)۔ ان آیتوں میں یہ خبر دی ہے کہ جو کافر دنیا میں عوام کے پیشوا تھے وہ آخرت میں بھی اُن کے پیشوا ہوں گے۔

"فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ": یعنی اُن پیشواؤں نے دنیا میں انہیں ایسے کاموں کی دعوت دی جس کا انجام دوزخ کی آگ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "فَمَاۤ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ" (البقرۃ:۱۷۵) "(سو یہ لوگ اہلِ دوزخ کے کاموں پر کس قدر زیادہ صبر کرنے والے ہیں)۔ "وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ": الورد کا معنی ہے دخول اور المورود کا معنی ہے مدخول۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: قرآن مجید میں جہاں بھی الورود کا لفظ آیا ہے اس کا معنی ہے ان کا داخل ہونا، اور مریم: ۷۱ میں فرمایا ہے: "وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا" (مریم:۷۱) "(یعنی تم میں سے ہر شخص کو دوزخ پر سے گزرنا ہوگا)۔ نیز فرمایا: "وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِیْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ۞" (مریم:۸۶) "(اور ہم گنہگاروں کو دوزخ کی طرف پیاسے ہانک کر لے جائیں گے)۔ اور اللہ کی قسم! ہر نیکوکار اور بدکار دوزخ پر وارد ہوگا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِیْنَ فِیْهَا جِثِیًّا ۞" (مریم:۷۲) "(پھر ہم متقین کو نجات دے دیں گے اور ظالموں کو اس میں گھٹنوں کے بل پڑا ہوا چھوڑ دیں گے ○)۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اُن پر دنیا میں اور آخرت میں لعنت بھیجی جاتی رہے گی، اور یہ لعنت بہت ہی سنگین چیز ہے O'' (ہود: ۹۹)

''وَ اُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ'': ہوسکتا ہے کہ دنیا میں لعنت سے مراد وہ عذاب ہو جو اُن پر نازل ہوا، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لعنت سے مراد یہ ہو کہ تمام مخلوق اُن پر لعنت کرے گی اور آخرت میں بھی اُن پر لعنت کے یہی دو محمل ہیں، یعنی اُن کو آخرت میں اسی طرح عذاب دیا جائے گا جس طرح دنیا میں عذاب دیا گیا تھا۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آخرت میں جو بھی اُن کو دیکھے گا اُن پر لعنت کرے گا، اور لغت میں لعنت کا معنی دھتکارنا ہے، اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دھتکار دیے گئے تھے، اور دنیا میں بھی ان کے عذاب پر رحم نہیں فرمایا گیا اور آخرت میں بھی ان کے عذاب پر رحم نہیں فرمایا جائے گا۔

''بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ'': حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یعنی دنیا اور آخرت کی لعنت بہت بری چیز ہے۔ اور قتادہ نے کہا: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن پر دو لعنتیں مترادف ہوگئیں، دنیا کی لعنت اور آخرت کی لعنت۔ اور اصمعی نے کہا: ''الرِّفْدُ'' کا معنی ہے العطیۃ، اور الْمَرْفُوْدُ کا معنی ہے جس چیز کا عطیہ کیا جائے، یعنی اس دینے والے کی عطا بہت بری ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''یہ اُن بستیوں کی چند خبریں ہیں جن کا قصہ ہم آپ کو بیان فرما رہے ہیں، ان میں سے کچھ بستیاں ابھی تک قائم ہیں اور کچھ بستیوں کی فصل کٹ چکی ہے O'' (ہود: ۱۰۰)

''ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَیْكَ'': یعنی جن بستیوں کا پہلے ذکر ہو چکا ہے اور اس سورت میں جو غیب کی خبریں دی گئی ہیں، ہم اُن کا قصہ آپ کے سامنے بیان فرماتے ہیں تاکہ یہ آپ کی نبوت کے لیے علامت اور دلیل بن جائے کیونکہ آپ نے ان واقعات کا مشاہدہ نہیں کیا تھا اور نہ آپ نے مختلف لوگوں سے ان کے متعلق کچھ سنا تھا، اور نہ ان کی کتابیں آپ کی زبان میں تھیں کہ آپ نے اُن کو پڑھ کر لوگوں کے سامنے یہ واقعات بیان کر دیے، سو نہ جب آپ کے سامنے یہ واقعات پیش آئے اور نہ آپ نے کسی سے ان واقعات سے متعلق سنا اور پھر آپ نے وہ واقعات اسی طرح بیان کر دیے جس طرح وہ واقعات پیش آئے تھے تو اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر وحی نازل فرما کر آپ کو ان واقعات سے مطلع فرما دیا ہے۔

''مِنْهَا قَآىِٕمٌ وَّ حَصِیْدٌ'': آپ اُن بستیوں میں سے بعض کو اپنی جگہ پر قائم دیکھتے ہیں اور بعض وہ ہیں جن کا نام ونشان مٹ چکا ہے۔ ایک تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ اُن بستیوں کے رہنے والے ہلاک ہوگئے اور وہ بستیاں باقی رہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور ہم نے اُن بستیوں والوں پر کوئی ظلم نہیں کیا لیکن وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے، اور جب آپ کے رب کا عذاب آ گیا تو ان کے جھوٹے معبود اُن کے کسی کام نہ آسکے اور انہوں نے ہلاکت اور بربادی کے سوا انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچایا O'' (ہود: ۱۰۱)

''وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ'': یعنی اُن بستیوں کو مٹا کر ہم نے اُن پر ظلم نہیں فرمایا، کیونکہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں اور جو مالک ہو اس کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ اپنی ملکیت کو قائم رکھے یا اس کو تلف کر دے۔ اور جو اس کو تلف کر دے اس کو ظلم

کے ساتھ متصف نہیں کیا جاتا۔ دوسرا محمل یہ ہے کہ ظلم کا معنی ہے کسی چیز کو اس کے غیر محل میں رکھنا، یعنی ہم اُن پر عذاب نازل فرما کر اُن پر ظلم نہیں فرمائیں گے کیونکہ وہ اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے اس عذاب کے مستحق تھے، پس ہم نے عذاب کو اس کے غیر محل میں نہیں رکھا، بلکہ خود ان لوگوں نے ظلم کیا کہ انہوں نے اپنی جانوں کو غیر محل میں رکھا، کیونکہ انہوں نے اپنی جانوں کو اپنے مالک کے غیر کی طرف خرچ کیا اور اپنے مالک کے غیر کی عبادت کی، تو ان کافروں نے اللہ کی عبادت نہ کر کے جب کہ اللہ تعالیٰ ہی اُن کی عبادت کے مستحق تھے خود اپنی جانوں پر ظلم کیا۔

اور یہ جو فرمایا ہے کہ انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، اس کی کئی وجوہ ہیں:

(۱) انہوں نے غیر اللہ کی عبادت کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ (۲) انہوں نے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت سے روکا اور اللہ کے راستہ سے لوگوں کو پھیرا اور اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی عبادت کے بجائے غیر اللہ کی عبادت کی۔ (۳) انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا کیونکہ انہوں نے خود عذاب کا سوال کیا تھا۔

"فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِیْ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ": اس کی تفسیر میں بھی دو قول ہیں:

(۱) وہ جو اپنے خود ساختہ خداؤں کی عبادت کر رہے تھے وہ اُن سے کسی عذاب کو دور نہیں کر سکے، یعنی اُن کا اُن بتوں کی عبادت کرنے سے اُن کو وہ نفع حاصل نہیں ہو سکا جس کی وہ توقع رکھتے تھے اور خواہش رکھتے تھے۔

(۲) یعنی اُن کے خود ساختہ معبود اُن کی انتہائی ضرورت کے وقت اُن کے کسی کام نہیں آ سکے۔

"وَمَا زَادُوْهُمْ غَیْرَ تَتْبِیْبٍ": عام اہل تاویل نے کہا ہے کہ تتبیب کا معنی ہے تخسیر، یعنی اُن کے معبودوں نے صرف اُن کے نقصان میں اضافہ کیا۔ اور ابو عوسجہ نے کہا: "غَیْرَ تَتْبِیْبٍ" کا معنی ہے غیر فساد، اور تتبیب کا معنی ہے فساد۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اسی طرح آپ کے رب جب بستیوں کو ان کے ظلم کرنے کے وقت پکڑتے ہیں تو بے شک اُن کی گرفت بہت دردناک اور سخت ہوتی ہے ○" (ہود: ۱۰۲)

"وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِیَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِیْمٌ شَدِیْدٌ": یعنی جس طرح ہم نے گزری ہوئی قوموں کو عذاب دیا جب کہ وہ قومیں ظالم تھیں، مشرک تھیں اور کافر تھیں، اسی طرح اس امت میں جو لوگ ظلم کرتے ہیں، کفر کرتے ہیں اور شرک کرتے ہیں ان کو بھی ہم عذاب دیں گے، لیکن اگر ہم نے اس امت سے عذاب کو مؤخر کیا ہوا ہے تو یہ ہماری رحمت ہے، اور اُن کو سخت عذاب میں پکڑا جائے گا۔ (تاویلات اہل السنۃ ج ۶ ص ۱۷۸-۱۸۳، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۶ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "بے شک ان قصوں میں اس شخص کے لیے ضرور عبرت کی نشانی ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہے، یہ وہ دن ہے جس میں سب لوگوں کو جمع فرمایا جائے گا اور اسی دن سب لوگوں کو حاضر فرمایا جائے گا ○" (ہود: ۱۰۳)

علامہ ابو الفرج عبد الرحمٰن بن علی بن الجوزی الحنبلی المتوفی ۵۹۷ھ، ہود ۱۰۳ تا ۱۰۹ کی تفسیر میں لکھتے ہیں

"اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ": یعنی اس سے پہلے جو دردناک عذاب کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ گزشتہ امتوں کو

دردناک عذاب میں پکڑ لیا گیا۔ اس جگہ آیت سے مراد عبرت اور نصیحت ہے، یعنی اس میں بعد کے لوگوں کے لیے عبرت اور نصیحت ہے۔ "ذٰلِكَ یَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَ ذٰلِكَ یَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ": کیونکہ تمام مخلوق کو اس دن جمع فرمایا جائے گا اور ان میں نیکوکار بھی حاضر ہوں گے اور بدکار بھی حاضر ہوں گے اور تمام آسمان اور زمین والے حاضر ہوں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ہم اس معین دن کو صرف معین مدت کے لیے ہی مؤخر فرمائیں گے O" (ھود: ۱۰۴)

"وَ مَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ": یعنی ہم اس قیامت یا حساب کتاب کے دن کو ایک وقتِ معلوم تک مؤخر کرتے ہیں اور اس وقتِ معلوم کو اللہ عزوجل کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "جب وہ دن آئے گا تو کوئی ذی روح اُن کی اجازت کے بغیر بات نہیں کر سکے گا، سو اُن میں سے بعض بدبخت ہیں اور بعض نیک بخت ہیں O" (ھود: ۱۰۵)

"یَوْمَ یَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِیٌّ وَّ سَعِیْدٌ": مفسرین نے کہا ہے: جب وہ دن آئے گا، اس دن کوئی نفس اللہ کی اجازت کے بغیر کلام نہیں کر سکے گا، پس تمام مخلوق خاموش رہے گی سوا اُن کے جن کو اللہ عزوجل نے بات کرنے کی اجازت عطا فرمائی ہو۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس آیت میں کلام سے مراد شفاعت ہے، یعنی جس کو اللہ عزوجل شفاعت کرنے کی اجازت عطا فرمائیں گے وہی شفاعت کرے گا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "رہے وہ لوگ جو بدبخت ہیں تو وہ دوزخ کی آگ میں ہوں گے تو وہ اس میں چلّائیں گے اور دہاڑیں گے O" (ھود: ۱۰۶)

"لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّ شَهِیْقٌ": اس آیت کے متعلق تین اقوال ہیں:

(۱) ایک قول یہ ہے کہ "زفیر" سے مراد گدھے کا رینکنا ہے جب وہ شروع میں آواز نکالتا ہے، یعنی گدھے کے رینکنے کی پہلی آواز، اور گدھے کا ڈھیچو ڈھیچو کرنا۔ اور "شھیق" کا معنی ہے: گدھے کے رینکنے کی آخری آواز۔

(۲) الضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ الزفیر وہ آواز ہے جو حلق سے نکلتی ہے اور الشہیق یہ وہ آواز ہے جو سینے سے نکلتی ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا دوسرا قول یہ ہے کہ الزفیر بلند آواز کو کہتے ہیں اور الشہیق پست آواز کو کہتے ہیں۔

(۳) ابن السائب نے کہا: الزفیر گدھے کے چیخنے کو کہتے ہیں اور الشہیق خچروں کے چیخنے کو کہتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں جب تک کہ آسمان اور زمینیں قائم رہیں گے سوا اس عرصہ کے جس کو آپ کے رب چاہیں، بے شک آپ کے رب جس چیز کو چاہیں اس کو کرنے والے ہیں O رہے وہ لوگ جو نیک بخت ہیں سو وہ جنت میں ہیں، اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں جب تک کہ آسمان اور زمینیں قائم ہیں، مگر جتنا آپ کے رب چاہیں، یہ اللہ کی وہ عطا ہے جو کبھی منقطع نہیں ہوگی O" (ھود: ۱۰۷۔۱۰۸)

"مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ": معروف قول یہ ہے کہ آسمانوں اور زمینوں سے مراد وہ آسمان ہیں جو ہمارے نزدیک معروف ہے اور وہ زمین ہے جو ہمارے نزدیک معروف ہے۔ ابن قتیبہ اور ابن الانباری نے کہا: عرب کسی کام کو ہمیشہ کرنے کے متعلق کہتے ہیں کہ میں یہ کام اس وقت تک نہیں کروں گا جب تک رات اور دن کے اختلاف کا سلسلہ جاری ہے اور کہتے ہیں جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں، کیونکہ اُن کا گمان یہ ہوتا ہے کہ اِن چیزوں میں تغیر نہیں ہوتا، تو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے محاورات کے مطابق کلام فرمایا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ان آسمانوں اور زمینوں سے مراد جنت اور دوزخ کے آسمان اور زمین ہیں۔

"اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ": یہ استثناء اہلِ دوزخ کے حق میں ہے، یعنی جب تک آپ کے رب چاہیں گے اہلِ دوزخ کو دوزخ میں عذاب ہوتا رہے گا۔ اور اُن اہلِ دوزخ کے متعلق چند اقوال ہیں:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور الضحاک نے کہا: یہ استثناء اُن موحدین کے حق میں ہے جن کو شفاعت کے ذریعے دوزخ سے نکال لیا جائے گا۔ (۲) یہ قول بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ چاہیں گے اہلِ دوزخ کو دوزخ میں رکھیں گے۔ (۳) الزجاج نے کہا: اس کا فائدہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اُن پر رحم فرمانا چاہیں تو اُن پر رحم فرمائیں گے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ خبر دی ہے کہ اہلِ دوزخ، دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ (۴) الزجاج نے ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب تک چاہیں گے اُن کو محشر میں رکھیں گے، پس یہ استثناء اس مقدار کے متعلق ہے جس مقدار میں وہ محشر میں رہیں گے۔ (۵) قتادہ اور الضحاک نے بیان کیا کہ یہ استثناء ان موحدین کی طرف راجع ہے جنہوں نے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کیا تھا، اللہ تعالیٰ جب تک چاہیں گے ان کو دوزخ میں رکھیں گے، پھر ان کو دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل فرما دیں گے۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۱۱۲۳۶، ۱۱۲۳۷، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ)

(۶) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اہل جنت کو جنت میں داخل فرما دیں گے، وہ اپنی رحمت سے جس کو چاہیں گے جنت میں داخل فرمائیں گے اور اہل دوزخ کو دوزخ میں داخل فرما دیں گے، پھر فرمائیں گے: تم دیکھو جس کے دل میں ایک رائی کے برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکال لو، پھر وہ دوزخ سے اس حال میں نکالے جائیں گے کہ وہ جل کر کوئلہ ہو چکے ہوں گے پھر ان کو حیات کے دریا میں ڈال دیا جائے گا تو وہ اس طرح نشو و نما پانے لگیں گے جس طرح دریا کے کنارے اگا ہوا دانہ نشو و نما پاتا ہے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح زرد رنگ کا لپٹا ہوا نکلتا ہے۔

(صحیح البخاری: ۲۲، ۶۵۶۰، صحیح مسلم: ۱۸۴)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "سو (اے رسولِ اکرم!) یہ کفار جو بتوں کی عبادت کرتے ہیں، آپ اُن کی عبادت کے متعلق (بالفرض) کسی شک میں نہ رہیں، یہ اسی طرح خود ساختہ بتوں کی عبادت کرتے ہیں جس طرح ان سے پہلے ان کے باپ دادا کیا کرتے تھے، بے شک ہم اِن کو اِن کا پورا پورا عذاب دیں گے اس میں کوئی کمی نہیں ہوگی ○" (ہود: ۱۰۹)

''فَلَا تَكُ فِیْ مِرْیَةٍ مِّمَّا یَعْبُدُ هٰۤؤُلَآءِ ؕ مَا یَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ وَ اِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِیْبَهُمْ غَیْرَ مَنْقُوْصٍ '': یعنی یہ مشرکین جو بتوں کی عبادت کرتے ہیں، ان کے متعلق آپ کسی قسم کے شک میں نہ رہیں، ہم ان کو ان کا پورا پورا حساب دیں گے۔ اس کی تفسیر میں تین قول ہیں:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اُن کے نصیب میں جو خیر اور شر مقدر فرمائی گئی ہے وہ اُن کو ضرور پوری پوری دی جائے گی۔ (۲) ابو العالیہ نے کہا: جو ان کے نصیب میں رزق ہے وہ ان کو پورا پورا دیا جائے گا۔ (۳) اور ابن زید نے کہا: جو ان کے نصیب میں عذاب ہے وہ ان کو پورا پورا دیا جائے گا۔ (زاد المسیر فی علم التفسیر ج ۴ ص ۳۰۰۔۳۰۳، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۲ھ)

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِیْهِ ؕ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِیَ بَیْنَهُمْ ؕ وَ اِنَّهُمْ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِیْبٍ ﴿۱۱۰﴾

اور بے شک ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا فرمائی سو اس میں اختلاف کیا گیا، اور اگر آپ کے رب کی طرف سے ان لوگوں کا فیصلہ پہلے سے مقدر نہ ہو چکا ہوتا تو اُسی وقت اِن لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا جا چکا ہوتا، اور بے شک وہ لوگ شک ڈالنے اور تہمت لگانے میں مشغول ہیں ○

وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَیُوَفِّیَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ؕ اِنَّهٗ بِمَا یَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ﴿۱۱۱﴾

اور بے شک آپ کے رب اِن سب لوگوں کو ان کے کرتوتوں کا ضرور بہ ضرور پورا بدلہ دیں گے، بے شک وہ لوگ جو بھی کام کرتے ہیں اللہ اس سے اچھی طرح خبر رکھنے والے ہیں ○

فَاسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ وَ مَنْ تَابَ مَعَكَ وَ لَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۱۱۲﴾

سو (اے رسولِ اکرم!) آپ اُسی طریقہ پر ثابت قدم رہیں جس پر چلنے کا آپ کو حکم دیا گیا ہے اور جو لوگ آپ کے ساتھ توبہ کرنے والے ہیں وہ بھی اسی طریقہ پر قائم رہیں اور (اے لوگو!) اللہ کی حکم عدولی کر کے سرکشی نہ کرو، کیونکہ اللہ تمہارے تمام کاموں کو خوب دیکھنے والے ہیں ○

وَ لَا تَرْكَنُوْۤا اِلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِیَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

اور (اے مسلمانو!) تم اُن لوگوں کی طرف مائل نہ ہونا جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے ورنہ تمہیں بھی دوزخ کی آگ چھوئے گی اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی مددگار نہیں ہوگا، پھر تمہاری مدد نہیں فرمائی جائے گی ○

وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ

ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

اور (اے رسول اکرم!) آپ دن کے دونوں کناروں میں اور رات کے قریب نمازیں پڑھتے رہیے، بے شک نیکیاں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں، یہ نصیحت قبول کرنے والوں کے لیے نصیحت ہے O

وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

اور آپ صبر کرتے رہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کے اجر کو ضائع نہیں فرماتے O

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَاۤ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾

پس (اے مسلمانو!) تم سے پہلے جو امتیں گزر چکی ہیں اُن میں سے ایسے نیک لوگ کیوں نہ باقی رہے جو لوگوں کو زمین میں فساد کرنے سے روکتے سوا اُن چند لوگوں کے جن کو ہم نے اُن میں سے نجات عطا فرمائی تھی، اور جو ظالم لوگ تھے وہ انہی کاموں کو کرتے رہے جن میں ظاہری عیش و عشرت تھی اور وہ لوگ تھے ہی مجرم O

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

اور کسی بستی کے رہنے والوں کو اپنی جانوں پر ظلم کرنے کی وجہ سے آپ کے رب ہلاک نہیں فرمائیں گے جب کہ اس بستی میں نیکوکار بھی موجود ہوں O

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾

اور اگر آپ کے رب چاہتے تو تمام لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتے، اور (لیکن) وہ ہمیشہ آپس میں اختلاف کرتے رہیں گے O

اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۭ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

مگر جن لوگوں پر آپ کے رب نے رحم فرمایا (وہ آپس میں اختلاف نہیں کریں گے)، اور اس نے اسی لیے ان دونوں فرقوں کو پیدا فرمایا ہے اور اللہ کے علم ازلی میں جو فیصلہ تھا وہ ظاہر ہو گیا کہ میں جنات اور انسانوں سب سے ضرور بہ ضرور دوزخ کو بھر دوں گا O

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ

وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

اور ہم آپ کے سامنے تمام رسولوں کی خبروں کا قصہ بیان فرماتے ہیں جن قصوں سے ہم آپ کے دل کو تقویت دیتے ہیں، اور ان قصوں میں آپ کے پاس حق بات پہنچ گئی اور مومنوں کے لیے وعظ اور نصیحت پہنچ گئی O

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

اور (اے رسولِ اکرم!) جو لوگ ایمان نہیں لاتے آپ اُن سے کہیے: "تم اپنی جگہ عمل کرتے رہو بے شک ہم اپنا عمل کرنے والے ہیں O"

وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

اور تم انتظار کرو بے شک ہم بھی انتظار کرنے والے ہیں O

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اور تمام آسمانوں اور زمینوں کا مستقل غیب اللہ ہی کے لیے ہے اور انہی کی طرف تمام کام لوٹائے جائیں گے، سو (اے رسولِ اکرم!) آپ انہی کی عبادت کیجئے اور انہی پر توکل رکھیے اور (کہیے:) آپ کے رب اُن کاموں سے غافل نہیں ہیں جن کو تم کر رہے ہو O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور بے شک ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا فرمائی سو اس میں اختلاف کیا گیا، اور اگر آپ کے رب کی طرف سے اِن لوگوں کا فیصلہ پہلے سے مقدر نہ ہو چکا ہوتا تو اُسی وقت اِن لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا جا چکا ہوتا، اور بے شک وہ لوگ شک ڈالنے اور تہمت لگانے میں مشغول ہیں O" (ھود: ۱۱۰)

علامہ ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ، ھود: ۱۱۰ تا ۱۲۳ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ": بے شک ہم نے موسیٰ کو کتاب یعنی تورات عطا فرمائی۔

"فَاخْتُلِفَ فِیْهِ": پس تورات میں اختلاف کیا گیا، بعض لوگ اس کی تصدیق کرتے تھے اور بعض لوگ اس کی تکذیب کرتے تھے، جیسا اے رسولِ اکرم! آپ کی قوم نے قرآن مجید کے ساتھ کیا ہے۔

"وَلَوْلَا کَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ": یعنی اگر ازل میں اللہ تعالیٰ اُن سے عذاب مؤخر کرنے کا فیصلہ نہ فرما چکے ہوتے۔

"لَقُضِیَ بَیْنَهُمْ" تو اِن لوگوں کو اسی وقت عذاب میں مبتلاء کر دیا جاتا اور اُن کو ہلاک کرنے اور عذاب دینے سے فراغت ہو گئی ہوتی۔ "وَاِنَّهُمْ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِیْبٍ": بے شک وہ شک میں ڈالنے والے ہیں اور تہمت میں ڈالنے والے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور بے شک آپ کے رب اِن سب لوگوں کو اِن کے کرتوتوں کا ضرور بہ ضرور پورا بدلہ دیں گے، بے شک وہ لوگ جو بھی کام کرتے ہیں اللہ اس سے اچھی طرح خبر رکھنے والے ہیں O" (ہود: ۱۱۱)

"وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ۚ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ": اس آیت میں لفظ "مَا" لفظِ "مَنْ" کے معنی میں ہے اور یہ لوگوں کی ایک جماعت کا نام ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ" (النساء: ۳) اس آیت میں بھی لفظ ما لفظِ مَن کے معنی میں ہے یعنی جو عورتیں تمہیں اچھی لگتی ہوں، ان سے تم نکاح کرو۔

اور اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے عمل کا بدلہ ضرور بہ ضرور پورا دیا جائے گا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "سو (اے رسولِ اکرم!) آپ اُسی طریقہ پر ثابت قدم رہیں جس پر چلنے کا آپ کو حکم فرمایا گیا ہے اور جو لوگ آپ کے ساتھ توبہ کرنے والے ہیں وہ بھی اسی طریقہ پر قائم رہیں اور (اے لوگو!) اللہ کی حکم عدولی کر کے سرکشی نہ کرو، کیونکہ اللہ تمہارے تمام کاموں کو خوب دیکھنے والے ہیں O" (ہود: ۱۱۲)

"فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ": یعنی آپ اپنے رب کے دین پر برقرار اور ثابت قدم رہیں اور اُسی پر عمل کرتے رہیں اور اُسی کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے رہیں۔ "وَ مَنْ تَابَ مَعَكَ": اور جو لوگ آپ کے ساتھ ایمان لا چکے ہیں، وہ بھی آپ کے رب کے دین پر قائم رہیں۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ استقامت کا معنی یہ ہے کہ جن کاموں کے کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے اُن پر عمل کیا جائے اور جن کاموں سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے اُن سے رکا جائے۔

حضرت سفیان بن عبداللہ الثقفی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے اسلام میں کوئی ایسی فیصلہ کن بات بتائیے کہ میں اُس بات کے متعلق آپ کے بعد کسی سے بھی سوال نہ کروں، آپ نے فرمایا: تم کہو: میں اللہ پر ایمان لایا پھر اس پر ڈٹ جاؤ یا اس پر جمے رہو۔

(صحیح مسلم: ۳۸، الرقم المسلسل: ۱۵۸، رقم حدیث الباب: ۶۲، سنن ترمذی: ۲۴۱۰، سنن ابن ماجہ: ۳۹۷۲، مسند ابوداؤد والطیالسی: ۱۲۳۱، مسند احمد: ۱۵۴۱۸، شرح السنۃ للبغوی: ۱۶، المعجم الکبیر للطبرانی: ۶۳۹۶، ۶۳۹۷، ۶۳۹۸، صحیح ابن حبان: ۳۲۲)

"وَ لَا تَطْغَوْا": یعنی تم میرے احکام سے تجاوز نہ کرو اور میری نافرمانی نہ کرو۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا معنی ہے کہ تم دین میں غلو نہ کرو، اور میں نے جو حکم دیا ہے یا جس کام سے منع کیا ہے اس سے بڑھ کر کام کرنے کی کوئی کوشش نہ کرو۔

"اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ": یعنی اللہ تمہارے تمام کاموں کو دیکھنے والے ہیں اور تمہارا کوئی عمل اللہ عزوجل سے مخفی نہیں ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! بے شک آپ بوڑھے ہو گئے ہیں، آپ نے فرمایا: مجھے سورۂ ہود نے، سورۃ الواقعہ نے، سورۃ المرسلات نے، سورۂ عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ نے اور اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ نے بوڑھا کر دیا۔ امام ترمذی کہتے ہیں: یہ حدیث حسن غریب ہے اور اس حدیث کو ہم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سند کے سوا اور کسی سند سے نہیں جانتے۔

(سنن ترمذی: ۲۲۹۷، مصنف عبدالرزاق: ۵۹۹۷، مصنف ابن ابی شیبہ: ۲۶۸ ۳۰، مسند البزار: ج ا ص ۱۶۳، المعجم الکبیر للطبرانی: ۵۸۰۴، ۲۹۰، المستدرک علی الصحیحین: ۳۳۱۴، شعب الایمان للبیہقی: ۲۲۱۵، ۵۶، شرح السنہ للبغوی: ۳۱۷۵، الجامع الصحیح للسنن والمسانید ج ۱۰ ص ۲۳۲، الموسوعۃ الجامع للکتب العشرۃ ج ۶ ص ۲۰۳)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک دین آسان ہے اور جو شخص بھی دین پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرے گا، اس پر دین غالب آجائے گا، پس تم درست کام کرو اور درستی کے قریب کام کرو اور (جنت کی) خوش خبری سن لو، اور صبح کے وقت اور شام کے وقت اور رات کے کچھ اندھیرے میں عبادت سے مدد حاصل کرو۔

(صحیح البخاری: ۳۹، سنن نسائی: ۵۰۳۹، الاحاد والمثانی: ۱۱۹۰، مسند ابویعلیٰ: ۶۸۶۳، المعجم الکبیر: ۲۷۳، ج ۱۷، صحیح ابن حبان: ۳۵۱، سنن بیہقی ج ۳ ص ۱۸، مسند احمد: ۲۰۶۶۹، مسند احمد ج ۵ ص ۶۹، مؤسسۃ الرسالہ، بیروت، شرح السنہ للبغوی: ۹۳۰)

سہولت اور آسانی کے ساتھ عمل کرنے کے متعلق دیگر احادیث

اس حدیث میں سہولت اور آسانی کے ساتھ عمل کرنے پر برانگیختہ فرمایا ہے، اس سلسلہ میں حسب ذیل احادیث ہیں:

(۱) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ کون سے اعمال اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ ہیں؟ آپ نے فرمایا: جن میں زیادہ دوام ہو خواہ وہ تھوڑے ہوں۔ اور آپ نے فرمایا: اتنے اعمال کو کرو جن کی تم طاقت رکھتے ہو۔ (صحیح مسلم: ۷۸۲، سنن نسائی: ۷۶۲، مسند احمد: ۲۳۹۰۳)

(۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم وصال کے روزے (جن میں نہ سحری ہو نہ افطار) نہ رکھو، صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ تو وصال کے روزے رکھتے ہیں، آپ نے فرمایا: تم میری مثل نہیں ہو، بے شک میں اپنے رب کے پاس رات گزارتا ہوں، میرے رب مجھے کھلاتے ہیں اور پلاتے ہیں، تم (خود کو) ان اعمال کا مکلف کرو جن کی تم طاقت رکھتے ہو۔ (صحیح مسلم: ۲۵۲۶)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادات میں اعتدال اور میانہ روی کا حکم دیا ہے اور اپنے نفس کو زیادہ مشقت میں ڈالنے سے منع فرمایا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بندوں پر جو عبادات فرض فرمائی ہیں، وہ مسلسل اور لگاتار نہیں فرض فرمائیں مثلاً وقفے وقفے سے ان کے مختلف اوقات میں پانچ نمازیں فرض فرمائی ہیں، یہ بندوں پر ان کی آسانی اور رحمت ہے۔

نیز فرمایا: ''جو شخص بھی دین پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرے گا، دین اس پر غالب آجائے گا'' یعنی تم میں سے کوئی شخص زیادہ گہرائی میں نہ جائے اور آسان عبادت کو چھوڑ کر مشکل عبادت کو نہ اختیار کرے اور جو شخص ایسا کرے گا وہ تھک جائے گا یا اکتا جائے گا یا عاجز آجائے گا، پھر وہ بعض یا کل عبادات کے کام نہیں کر سکے گا اور پھر اس کو عمل نہ کرنے کا عذاب ہوگا، سو تم حتی الامکان درست کام کرنے کی کوشش کرو۔

نیز فرمایا: تم صبح، شام اور رات کے کچھ وقت میں عبادت کرو، یعنی فرصت کے اوقات میں عبادت کرو تا کہ تم ترو تازہ ہو کر خوشی سے عبادت کرو اور بے دلی اور اکتاہٹ سے عبادت نہ کرو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور (اے مسلمانو!) تم اُن لوگوں کی طرف مائل نہ ہونا جنہوں نے اپنی جانوں پر

ظلم کیا ہے ورنہ تمہیں بھی دوزخ کی آگ چھوئے گی اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی مددگار نہیں ہوگا، پھر تمہاری مدد نہیں فرمائی جائے گیO" (ہود: ۱۱۳)

"وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ":

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ تم ظالموں کے ساتھ میل جول نہ رکھو۔ اور "لَا تَرْكَنُوْٓا" کا لفظ رکون سے ماخوذ ہے اور رکون کا معنی ہے: کسی کی طرف میلان کرنا اور دل سے اس کے ساتھ محبت رکھنا۔ ابو العالیہ نے کہا: تم ان ظالموں کے اعمال پر راضی نہ ہو۔ اور السدی نے کہا: تم ظالموں کے ساتھ مداہنت نہ کرو۔ عکرمہ نے کہا: تم اُن کے اقوال پر عمل نہ کرو۔ دوسرا قول یہ ہے کہ تم ظالموں سے میل جول نہ رکھو ورنہ تمہیں بھی دوزخ کی آگ جلائے گی اور اللہ کے سوا تمہیں عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں ہوگا۔

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ کرام سے دلی محبت رکھنے پر دلیل

میں کہتا ہوں: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ظالموں سے میل جول رکھنے پر دوزخ کے عذاب کی وعید سنائی ہے، اس آیت سے ثابت ہوا کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ کرام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخلصین اصحاب میں سے تھے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اپنے حبالۂ عقد میں قبول فرمایا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو بھی اپنے عقدِ نکاح سے مشرف فرمایا۔ اگر معاذ اللہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما ظالم ہوتے جیسا کہ شیعہ علماء کا زعم ہے کہ انہوں نے حضرت سیدتنا فاطمہ رضی اللہ عنہا کو باغ فدک نہ دے کر اُن پر ظلم کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث اُن کو نہ دے کر اُن پر ظلم کیا تو یہ شیعہ حضرات، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو تو ظالم کہہ دیں گے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کیا کہیں گے کہ آپ نے ان کے بہ قول ظالموں سے میل جول رکھا یعنی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ رشتہ مصاہرت قائم فرمایا۔ اور جو ظالموں سے میل جول رکھے وہ اس آیت کے مطابق دوزخ کی آگ کا مستحق ہے۔ سو واضح ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر اور اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہم سے میل جول رکھا، حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی صاحبزادیوں کو اپنے عقدِ نکاح میں داخل کیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عقدِ نکاح میں اپنی دو صاحبزادیوں حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہما کو عطا فرمایا۔ اور آپ کا ان خلفاء ثلاثہ سے رشتہ داری اور مصاہرت کے تعلقات کو قائم رکھنا اس بات کی روشن دلیل ہے کہ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ظالم نہیں تھے، خائن نہیں تھے ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے محبت اور دلی تعلقات نہ رکھتے۔ اور جب کہ آپ نے ان کے ساتھ محبت کے اور دلی تعلقات رکھے ہیں تو اس سے واضح ہو گیا کہ یہ عظیم الشان صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ظالم نہ تھے اور خائن نہ تھے۔ (سعیدی غفرلہٗ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور (اے رسولِ اکرم!) آپ دن کے دونوں کناروں میں اور رات کے قریب نمازیں پڑھتے رہیے، بے شک نیکیاں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں، یہ نصیحت قبول کرنے والوں کے لیے نصیحت ہےO" (ہود: ۱۱۴)

"وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ": یعنی صبح کی نماز اور ظہر اور عصر کی نمازیں۔ مجاہد نے کہا: دن کی طرف صبح کی نماز ہے اور ظہر

اور عصر کی نمازیں ہیں۔" وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ": یعنی رات کے قریب کی نمازیں اور وہ مغرب اور عشاء کی نمازیں ہیں۔ مقاتل نے کہا: فجر اور ظہر کی نمازیں ایک طرف ہیں اور عصر اور مغرب کی نمازیں دوسری طرف ہیں اور " وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ " یعنی رات کے قریب نماز پڑھیں، اس سے مراد عشاء کی نمازیں ہیں۔ اور الحسن البصری نے کہا: دن کی دو طرفیں صبح اور عصر کی نمازیں ہیں اور " وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ " رات کے قریب کی نمازیں مغرب اور عشاء کی نمازیں ہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: دن کی دو طرفیں صبح اور شام کی نماز ہے یعنی صبح کی اور مغرب کی نماز " وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ " یعنی رات کے قریب کی نماز وہ مغرب اور عشاء کی نمازیں ہیں۔

" اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ": یعنی یہ پانچ نمازیں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں۔

پانچ نمازوں کے گناہوں کو مٹا دینے کی تائید میں احادیث صحیحہ

(۱) حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے ایک عورت کا بوسہ لے لیا، پھر اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی خبر دی، تب اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: "اور دن کی دونوں طرفوں میں نماز پڑھیے اور رات کی کچھ ساعتوں میں بھی، بے شک نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔۔ (ہود: ۱۱۴)" اس شخص نے پوچھا: یا رسول اللہ! آیا یہ حکم صرف میرے لیے ہے (یا تمام امت کے لیے ہے؟) آپ نے فرمایا: میری تمام امت کے لیے ہے۔

(صحیح البخاری: ۵۲۶، صحیح مسلم: ۲۷۶۳، الرقم المسلسل: ۶۸۶۸، سنن ابن ماجہ: ۴۲۵۴، السنن الکبریٰ: ۱۱۲۴۷، سنن ترمذی: ۳۱۱۴، مصنف عبد الرزاق: ۱۳۸۳۰، صحیح ابن خزیمہ: ۳۱۳۹۸، صحیح ابن حبان: ۱۷۲۹، المعجم الکبیر: ۱۰۵۶۰، سنن بیہقی ج ۸ ص ۲۴۱، اسباب النزول للواحدی ص ۲۶۹، شرح السنہ للبغوی: ۳۴۲۶، مسند احمد ج ۱ ص ۸ طبع قدیم، مسند احمد: ۳۶۵۳، موسسۃ الرسالہ، بیروت، جامع المسانید لابن الجوزی: ۳۰۷۵، مکتبۃ الرشد، ریاض، ۱۴۲۶ھ)

حدیث مذکور کی تائید میں دیگر احادیث

اس حدیث میں جس شخص کا واقعہ ہے، اس کا نام ابو الیسر تھا، اس کے متعلق متعدد روایات ہیں:

(۲) حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص نے آ کر کہا: میں مدینہ کے آخر میں ایک عورت سے لپٹ گیا، میں نے اس سے خوب بوس و کنار کیا، بس اس میں دخول نہیں کیا، اب میں آپ کے سامنے حاضر ہوں، آپ جو چاہیں میرے متعلق فیصلہ فرمائیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: اللہ تعالیٰ نے تجھ پر پردہ رکھ لیا تھا، کاش! تو بھی اپنا پردہ رکھتا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کوئی جواب نہیں دیا، وہ شخص اٹھ کر جانے لگا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو بھیج کر اسے بلوایا اور اس پر یہ آیت تلاوت فرمائی: " وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ " (اور (اے رسول اکرم!) آپ دن کے دونوں کناروں میں اور رات کے قریب نمازیں پڑھتے رہیے، بے شک نیکیاں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں۔۔ (ہود: ۱۱۴)" لوگوں میں سے ایک شخص نے کہا: اے اللہ کے نبی! کیا یہ حکم اس کے ساتھ مخصوص ہے؟ آپ نے فرمایا: بلکہ سب کے لیے ہے۔

(صحیح مسلم: ۲۷۶۳، الرقم المسلسل: ۶۸۷۱، سنن ابو داؤد: ۴۴۶۸، سنن ترمذی: ۳۱۱۲)

(۳) حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے اور ہم آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص نے آ کر کہا: یا رسول اللہ! میں نے ایسا کام کیا ہے جو مستوجب حد ہے، پس آپ مجھ پر حد قائم فرمائیے، پس رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے، اس نے پھر دوبارہ عرض کیا اور کہا: یارسول اللہ! میں نے ایسا کام کیا ہے جو مستوجب حد ہے، آپ مجھ پر حد قائم فرمایئے، آپ خاموش رہے اور نماز کی اقامت کہی گئی، جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو وہ شخص پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں بھی دیکھ رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص کو کیا جواب دیتے ہیں، وہ شخص پھر آپ سے ملا اور کہا: یارسول اللہ! میں نے ایسا کام کیا ہے جو مستوجب حد ہے، سو آپ مجھ پر حد قائم فرمایئے، حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ بتاؤ جب تم اپنے گھر سے نکلے تو کیا تم نے اچھی طرح وضو کیا تھا، اس نے کہا: کیوں نہیں! یارسول اللہ، آپ نے فرمایا: پھر تم نے ہمارے ساتھ نماز پڑھ لی؟ اس نے کہا: جی ہاں! یارسول اللہ، پھر اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پس بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہارے گناہ کو معاف فرمادیا۔

(صحیح مسلم:۲۷۶۵،۱۰،الرقم المسلسل:۶۸۶۳،سنن ابوداؤد:۴۳۸۱،۱،السنن الکبریٰ:۷۳۱۵)

اس شخص نے جو کہا تھا: میں نے ایسا کام کیا ہے جو مستوجب حد ہے، اس سے مراد حد کا معروف معنی نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ہے بہت بڑا گناہ۔

(۴) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پانچ نمازیں پڑھنا اور ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک جمعہ پڑھنا ان کے درمیان واقع ہونے والے گناہوں کا کفارہ ہوجاتا ہے جب تک کہ کوئی شخص اپنے آپ کو گناہ کبیرہ سے نہ ڈھانپ لے۔

(صحیح مسلم:۲۳۳،الرقم المسلسل:۵۲۹،رقم حدیث الباب:۱۴،سنن ترمذی:۲۱۴،سنن ابن ماجہ:۱۰۸۶،مسند احمد:۹۳۶۷،سنن بیہقی ج ۱۰ ص ۱۸۷،مسند ابوعوانہ ج ۲ ص ۲۰،صحیح ابن خزیمہ:۳۱۴،۱۸۱۴،صحیح ابن حبان:۱۷۳۳،شرح السنۃ للبغوی:۳۳۶،مسند ابوداؤد الطیالسی:۲۴۷۰)

(۵) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: یہ بتاؤ کہ اگر تم میں سے کسی ایک کے دروازہ پر دریا ہو اور وہ اس میں ہر روز پانچ مرتبہ غسل کرے، تم کیا کہتے ہو یہ غسل اس کے جسم پر میل کو باقی رہنے دے گا؟ صحابہ نے کہا: یہ اس کے جسم پر کوئی میل نہیں چھوڑے گا، آپ نے فرمایا: یہی پانچ نمازوں کی مثال ہے، اللہ ان کے سبب سے گناہوں کو مٹادیتا ہے۔

(صحیح البخاری:۵۲۸،صحیح مسلم:۶۶۷،الرقم المسلسل:۱۳۹۴،سنن ترمذی:۲۸۶۸،سنن نسائی:۴۶۲،صحیح ابن حبان:۱۷۲۶،سنن بیہقی ج ۳ ص ۶۲۔۶۳،شرح السنۃ للبغوی:۳۴۲،مسند احمد ج ۲ ص ۳۷۹،طبع قدیم،مسند احمد:۸۹۲۴،ج ۱۴ ص ۳۹۳،مؤسسۃ الرسالہ،بیروت،جامع المسانید لابن الجوزی:۵۱۹۳،مکتبۃ الرشد،ریاض،۱۴۲۶ھ)

"ذٰلِكَ": یعنی ہم نے جو پہلے ذکر کیا ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ قرآن مجید کی طرف اشارہ ہے۔

"ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ": یعنی اس میں نصیحت حاصل کرنے والوں کے لیے نصیحت ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور آپ صبر کرتے رہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کے اجر کو ضائع نہیں فرماتے O" (ہود:۱۱۵)

"وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ": اور اے رسول اکرم! آپ کو کفار کی طرف سے جو ایذائیں پہنچتی ہیں، آپ

اس پر صبر کرتے رہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں فرماتے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد ہے: نماز پڑھنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں فرماتے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''پس (اے مسلمانو!) تم سے پہلے جو امتیں گزر چکی ہیں اُن میں سے ایسے نیک لوگ کیوں نہ باقی رہے جو لوگوں کو زمین میں فساد کرنے سے روکتے سوا اُن چند لوگوں کے جن کو ہم نے اُن میں سے نجات عطا فرمائی تھی، اور جو ظالم لوگ تھے وہ انہی کاموں کو کرتے رہے جن میں ظاہری عیش وعشرت تھی اور وہ لوگ تھے ہی مجرم O'' (ھود:۱۱۶)

''فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ'': یعنی ایسا کیوں نہ ہوا کہ ہم نے تم سے پہلے جن بستیوں کو ہلاک فرمادیا تھا۔

''اُولُوْا بَقِيَّةٍ'': اُن میں سمجھدار لوگ ہوتے۔ دوسرا قول ہے کہ اطاعت گزار لوگ ہوتے۔ تیسرا قول ہے نیک لوگ ہوتے۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص بقیہ ہے جب اس میں کوئی خیر ہو۔ اس آیت کا معنی ہے: پس جو تم سے پہلے بستیاں گزر چکی ہیں، کیا اُن میں کوئی نیک لوگ نہیں تھے جو زمین میں فساد پھیلانے سے روکتے۔ یا اس وقت کہا جاتا ہے جب کسی شخص میں کوئی نیک عادت ہو۔

''يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا'': یعنی وہ لوگوں کو فساد پھیلانے سے منع کرتا۔ یعنی کیا اُن بستیوں میں ایسے نیک لوگ نہیں تھے، یعنی ایسے لوگ تھوڑے سے تھے۔ ''مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ'': جو اُن بستیوں والوں میں انبیاء علیہم السلام کے پیروکار تھے اور وہ زمین میں فساد پھیلانے سے منع کرتے تھے۔ ''وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ'': اور جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، انہوں نے ان لوگوں کی اتباع کی جو عیش وعشرت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ یعنی ظالم لوگوں نے دنیا کی نعمتوں اور لذات کو آخرت کی نعمتوں پر ترجیح دی۔ ''وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ'': اور وہ کافر لوگ تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور کسی بستی کے رہنے والوں کو اپنی جانوں پر ظلم کرنے کی وجہ سے آپ کے رب ہلاک نہیں فرمائیں گے جب کہ اس بستی میں نیکوکار بھی موجود ہوں O'' (ھود:۱۱۷)

''وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ'': یعنی اللہ عزوجل لوگوں کو اُن کے شرک کرنے کی وجہ سے ہلاک نہیں فرمائیں گے جب اُن لوگوں میں نیکوکار لوگ موجود ہوں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو اُن کے ظلم کی وجہ سے ہلاک نہیں فرمائیں گے جب کہ وہ اپنے اعمال میں اصلاح کرنے والے ہوں، لیکن لوگوں کو اُن کے کفر کی وجہ سے اور برے کاموں کے ارتکاب کی وجہ سے ہلاک فرمائیں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور اگر آپ کے رب چاہتے تو تمام لوگوں کو ایک ہی امت بنادیتے، اور (لیکن) وہ ہمیشہ آپس میں اختلاف کرتے رہیں گے O مگر جن لوگوں پر آپ کے رب نے رحم فرمایا (وہ آپس میں اختلاف نہیں کریں گے)، اور اس نے اسی لیے ان دونوں فرقوں کو پیدا فرمایا ہے اور اللہ کے علم ازلی میں جو فیصلہ تھا وہ ظاہر ہوگیا کہ میں جنات اور انسانوں سب سے ضرور بہ ضرور دوزخ کو بھر دوں گا O'' (ھود:۱۱۸۔۱۱۹)

"وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ ": یعنی اگر آپ کے رب چاہتے تو تمام لوگوں کو ایک دین پر متفق فرما دیتے۔ اور وہ ہمیشہ مختلف دینوں کو اختیار کرتے رہے ہیں، کوئی یہودی ہے، کوئی نصرانی ہے، کوئی مجوسی ہے، کوئی مشرک ہے اور کوئی مسلم ہے۔" اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ": لیکن جن پر آپ کے رب رحم فرمائیں، وہ اختلاف نہیں کرتے۔

"وَ لِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ": اشہب نے کہا: میں نے امام مالک سے اس آیت کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا فرمایا تا کہ اُن کا ایک فریق دوزخ میں جائے اور ایک فریق جنت میں جائے۔ اور امام ابو عبید نے کہا: میرے نزدیک مختار اُن لوگوں کا قول ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک فریق اپنی رحمت کے لیے پیدا فرمایا اور دوسرا فریق اپنے عذاب کے لیے پیدا فرمایا۔ اور الفراء نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اہلِ رحمت کو رحمت فرمانے کے لیے پیدا فرمایا، اور اہلِ اختلاف کو اُن کے اختلاف کے لیے پیدا فرمایا۔ اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ اہلِ باطل مختلف ہیں اور اہلِ حق متفق ہیں، پس اللہ تعالیٰ نے اہلِ حق کو اتفاق کے لیے پیدا فرمایا ہے اور اہلِ باطل کو اختلاف کے لیے پیدا فرمایا ہے۔" وَ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ ": اور آپ کے رب کا یہ حکم پختہ ہو گیا۔ " لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ": کہ میں جنات اور انسانوں سے ضرور بہ ضرور دوزخ کو بھر دوں گا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ہم آپ کے سامنے تمام رسولوں کی خبروں کا قصہ بیان فرماتے ہیں جن قصوں سے ہم آپ کے دل کو تقویت دیتے ہیں، اور ان قصوں میں آپ کے پاس حق بات پہنچ گئی اور مومنوں کے لیے وعظ اور نصیحت پہنچ گئی O" (ہود: ۱۲۰)

"وَ كُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ ": یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جن رسولوں کی خبروں کی ضرورت ہوتی ہے، اُن سب کی خبروں پر اللہ تعالیٰ آپ کو مطلع فرما دیتے ہیں، یعنی اُن کی خبریں بھی بیان فرماتے ہیں اور اُن کی امتوں کی خبریں بھی بیان فرماتے ہیں۔ "مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ": تا کہ ہم آپ کے یقین کو اور پختہ کریں اور آپ کے دل کو مضبوط کریں۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب ان آیات کو سنتے تو کفار کی ایذاؤں پر آپ کے صبر کی قوت زیادہ ہوتی۔ "وَ جَآءَكَ فِیْ هٰذِهِ الْحَقُّ ": الحسن اور قتادہ نے کہا: یعنی اس دنیا میں آپ کے پاس حق آ چکا ہے اور دوسروں نے کہا: اس سورت میں آپ کے پاس حق آ چکا ہے، اور یہی اکثر مفسرین کا مختار ہے۔ اس سورت کا ذکر اس کی عزت افزائی کے لیے فرمایا ہے اگرچہ تمام سورتوں میں آپ کے پاس حق آیا ہے۔

بہ ظاہر ہود: ۱۲۰ کا النساء: ۱۶۴ سے تعارض کا جواب

میں کہتا ہوں: اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَ رُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَ رُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ۔ (النساء: ۱۶۴)" (اور ہم نے ایسے رسول بھیجے جن کا قصہ اس سے پہلے ہم نے آپ سے بیان فرمایا تھا اور ایسے رسول (بھی) بھیجے جن کا ہم نے اس سے پہلے آپ سے قصہ بیان نہیں فرمایا تھا)۔ یہ آیت ہود: ۱۲۰ بہ ظاہر، النساء: ۱۶۴، سے معارض ہے، کیونکہ النساء: ۱۶۴ میں فرمایا ہے کہ ہم نے اس سے پہلے آپ کو بعض رسولوں کے واقعات بیان نہیں فرمائے، اور ہود: ۱۲۰ میں فرمایا ہے کہ ہم اُن تمام رسولوں کے واقعات آپ سے بیان فرماتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ النساء: ۱۶۴ میں ماضی میں بیان نہ فرمانے کا ذکر ہے اور ہود: ۱۲۰ میں حال یا مستقبل میں تمام انبیاء

سبحانہ کے واقعات کو بیان فرمانے کا ذکر ہے۔ لہٰذا نفی زمانہ ماضی میں ہے اور ثبوت زمانہ حال یا مستقبل میں ہے، پس ان آیتوں میں کوئی تعارض نہ رہا۔ علماء دیوبند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کل علم کی نفی کرنے کے لیے النساء: ۱۶۴ کو پیش کرتے ہیں، ہم کہتے ہیں کہ ہود: ۱۲۰ میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمادیا ہے کہ ہم حال یا مستقبل میں آپ کو تمام رسولوں کی خبروں پر مطلع فرمائیں گے لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کل علم کی نفی نہیں ہے۔ واضح رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کل علم سے مراد اللہ تعالیٰ کا کل علم نہیں ہے بلکہ تمام مخلوق کا کل علم مراد ہے۔ (سعیدی غفرلہٗ)

"وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ": یعنی یہ ذکر مومنوں کے لیے نصیحت ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور (اے رسولِ اکرم!) جو لوگ ایمان نہیں لاتے آپ اُن سے کہیے: "تم اپنی جگہ عمل کرتے رہو بے شک ہم اپنا عمل کرنے والے ہیں" O اور تم انتظار کرو اور بے شک ہم بھی انتظار کرنے والے ہیں O" (ہود: ۱۲۱۔۱۲۲)

"وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ": یہ امر تہدید اور وعید کے لیے ہے، یعنی اُن کو بہ طور دھمکی کے فرمایا کہ تم اپنی جگہ عمل کرتے رہو۔ "اِنَّا عٰمِلُوْنَ": اور ہم اپنی جگہ عمل کرنے والے ہیں۔ "وَانْتَظِرُوْا": تم اس کا انتظار کرو کہ ہم پر اللہ تعالیٰ کی کیا رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ "اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ": اور ہم اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ تم پر اللہ تعالیٰ کا کتنا عذاب نازل ہوگا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور تمام آسمانوں اور زمینوں کا مستقل غیب اللہ ہی کے لیے ہے اور انہی کی طرف تمام کام لوٹائے جائیں گے، سو (اے رسولِ اکرم!) آپ انہی کی عبادت کیجئے اور انہی پر توکل رکھیے اور (کہیے:) آپ کے رب اُن کاموں سے غافل نہیں ہیں جن کو تم کر رہے ہو O" (ہود: ۱۲۳)

"وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ": یعنی جو چیزیں بندوں سے غائب ہیں، اُن کا مستقل علم اللہ ہی کے پاس ہے۔

"وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ": اور آخرت میں ہر چیز اُن کی طرف لوٹنے والی ہے۔ "فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ": یعنی آپ صرف اللہ عزوجل کی عبادت کیجئے اور انہی پر توکل رکھیے۔ "وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ": اور تم جو کچھ بھی کام کر رہے ہو، اللہ عزوجل اس سے غافل نہیں ہیں، اور یہ سورۂ ہود کی آخری آیت ہے۔

(معالم التنزیل ج ۲ ص ۲۶۷۔ ۲۷۳، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

یوسف ۱۲
وما من دآبۃ ۱۲
یوسف
(۱۲)
جلد سوم
329
تبیان القرآن
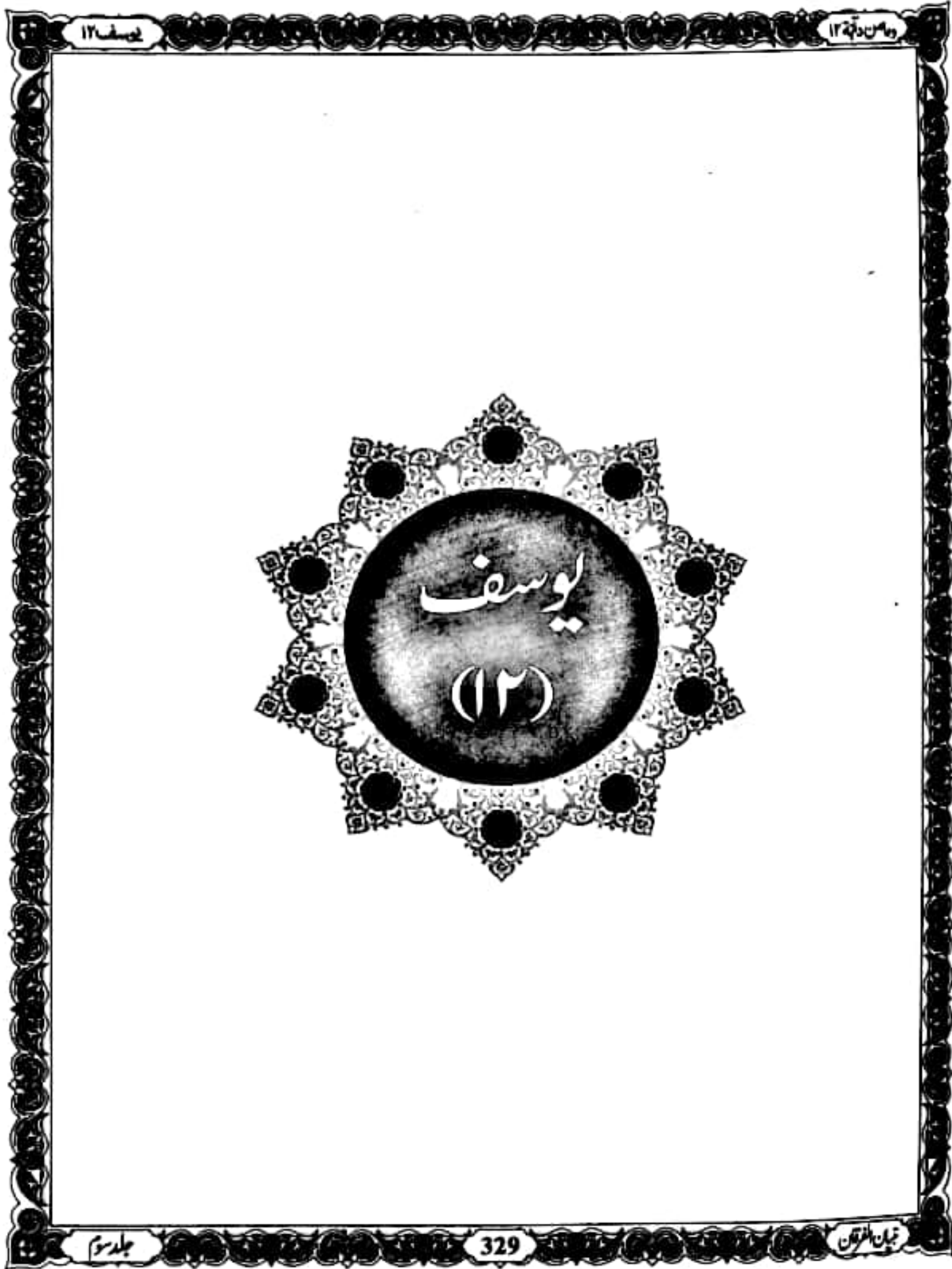
سورۂ یوسف کا اجمالی تعارف

سورۂ یوسف کا نام یوسف رکھنے کی توجیہ

سورۂ یوسف کا نام یوسف اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس سورت میں اللہ کے نبی حضرت یوسف علیہ السلام کا مکمل قصہ بیان فرمایا گیا ہے۔قرآن مجید کی صرف دو سورتیں ایسی ہیں جن میں مکمل طور پر صرف ایک نبی کا واقعہ بیان کیا گیا ہے،ایک سورۂ یوسف ہے اور دوسری سورۂ نوح ہے۔

سورۂ یوسف کے بنیادی مقاصد

اس سورت کا موضوع اللہ عزوجل کی الوہیت اور اُن کی وحدانیت پر دلائل قائم کرنا ہے،علاوہ ازیں انبیاء علیہم السلام کی رسالت اور قرآن مجید کا صادق اور برحق ہونا اور انبیاء علیہم السلام کی اپنی قوموں کو تبلیغ فرمانا اور اُن کی قوموں کا انبیاء علیہم السلام کی نافرمانی کرنا اور اس کے نتیجہ میں جو اُن پر سزا نازل ہوئی،اس کا ذکر فرمانا ہے۔

سورۂ ہود میں متعدد انبیاء علیہم السلام کا ذکر فرمایا تھا اور اس سورت میں صرف ایک نبی اور رسول کا ذکر فرمایا ہے اور وہ حضرت یوسف علیہ السلام ہیں۔سورۂ ہود میں مختلف انبیاء کے صبر و برداشت کا ذکر ہوا تھا،جب کہ اس سورت میں صرف حضرت یوسف علیہ السلام پر اُن کے بھائیوں کے کئے ہوئے مظالم اور اس پر حضرت یوسف علیہ السلام کے صبر و استقامت کا ذکر ہے۔اور اللہ تعالیٰ نے جو آپ کو تعبیر الرؤیا کا علم عطا فرمایا تھا،اس کا بھی اس سورت میں خصوصیت کے ساتھ ذکر ہے۔

سورۂ یوسف کے متعلق احادیث

حافظ ابن کثیر الدمشقی المتوفی ۷۷۴ھ نے سورۂ یوسف کے متعلق حسب ذیل احادیث ذکر کی ہیں:

(۱) حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اپنے غلاموں کو سورۂ یوسف کی تعلیم دو،کیونکہ جو مسلمان بھی اس سورت کی تلاوت کرے گا یا اپنے گھر والوں کو اس کی تعلیم دے گا یا اپنے غلاموں کو اس کی تعلیم دے گا تو اللہ تعالیٰ اس پر موت کی سختیوں کو آسان فرما دیں گے۔

(۲) امام بیہقی نے ''دلائل النبوۃ'' میں یہ حدیث ذکر کی ہے کہ جب یہود کی ایک جماعت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ سورۂ یوسف کی تلاوت فرماتے ہیں تو اُن کے نزدیک اس سورت کی موافقت میں جو دلائل تھے،اس وجہ سے انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔(تفسیر ابن کثیر جز ۲ ص ۵۱۷،دار الفکر،بیروت،۱۴۱۹ھ)

حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کے اہم واقعات

حضرت یوسف علیہ السلام بہت حسین و جمیل تھے اور اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کے نزدیک بہت محبوب تھے،اس وجہ سے اُن کے دیگر بھائیوں نے اُن سے حسد رکھا اور انہوں نے بچپن میں خواب دیکھا تھا جب اُن کی عمر سترہ سال یا بارہ سال تھی کہ گیارہ ستارے ہیں اور چاند اور سورج حضرت یوسف علیہ السلام کو سجدہ کر رہے ہیں،حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ خواب اپنے والد حضرت یعقوب

علیہ السلام کے سامنے بیان کیا، حضرت یعقوب علیہ السلام نے اُن کو یہ بشارت دی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو نبوت سے سرفراز فرمائیں گے اور آپ کو خوابوں کی تعبیر کا علم عطا فرمائیں گے۔

ایک دفعہ اُن کے بھائی اُن کو جنگل میں سیر و سیاحت اور کھیل کود کے قصد سے لے گئے، پھر انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈال دیا اور اپنے والد کو یہ جھوٹی خبر دی کہ بھیڑیے نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کھا لیا، حضرت یعقوب علیہ السلام نے اُن کی بات پر اعتماد نہیں کیا اور فرمایا کہ تم نے یوسف کے خلاف سازش کی۔ پھر حضرت یوسف علیہ السلام کنویں میں لٹکی ہوئی رسی کے ساتھ لپٹ گئے اور یوں کنویں سے باہر انہوں نے نجات حاصل کر لی، پھر اُن کے بھائیوں نے اُن کو مصر میں بہت کم قیمت پر فروخت کر دیا اور یہ دعویٰ کیا کہ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اُن کے آقا سے خریدا اور جو وہاں کا رئیس تھا العزیز اس کے ہاتھ اُن کو فروخت کر دیا۔ العزیز نے اُن سے بہت محبت اور شفقت کی اور اس نے اپنی بیوی زلیخا سے کہا کہ ان کو تم تعظیم و تکریم کے ساتھ رکھو۔

حضرت یوسف علیہ السلام عزیز مصر کی بیوی کی محبت کی وجہ سے فتنہ میں مبتلا ہوئے۔ اس کا قصہ قرآن مجید میں تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔ اور عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام پر جھوٹا بہتان باندھا اور اُن کو ایک مدت تک قید خانہ میں رکھا۔ یہ قصہ بھی قرآن مجید کی آیات میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ پھر عزیز مصر نے ایک خواب دیکھا کہ سات دبلی گائیں ہیں اور سات موٹی تازی گائیں ہیں، دبلی گائیں موٹی تازہ گائیوں کو کھا لیتی ہیں، عزیز مصر نے اپنے درباریوں سے اس خواب کی تعبیر پوچھی تو وہ اس کی تعبیر بتانے سے عاجز ہو گئے اور بالآخر حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانہ سے بلایا گیا اور انہوں نے اس خواب کی تعبیر بتائی جس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اُن کو بہت عزت اور کرامت عطا فرمائی ہے۔ یہ تمام واقعات سورۂ یوسف میں تفصیل سے نازل فرمائے گئے ہیں۔

سورۂ یوسف کے اہم مسائل

(۱) اس سورت سے معلوم ہوتا ہے کہ بھائی ایک دوسرے سے کینہ اور حسد رکھتے ہیں جس کا انجام کسی کی موت یا کسی کی ہلاکت پر ہوتا ہے۔

(۲) حضرت یوسف علیہ السلام نے بہت صالح زندگی گزاری، وہ اخلاق کریمہ اور خصائل حمیدہ پر فائز تھے اور کبھی شدت کے بعد آسانی آتی ہے اور کبھی مشکلات کے بعد اللہ تعالیٰ کی مدد پہنچتی ہے۔

(۳) پاکیزگی اور امانت داری ہر خیر کا مصدر و منبع ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کو اُن کی پاک دامنی اور اُن کے بلند اخلاق کی وجہ سے عزت اور سرفرازی حاصل ہوئی۔

(۴) فتنہ کی جڑ کسی مرد کا اجنبی عورت کے ساتھ تنہائی میں ہونا ہے، اس لیے اسلام نے کسی اجنبی عورت کے ساتھ تنہائی میں ملنے کو حرام قرار دے دیا۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی مرد ہرگز ہرگز کسی بھی اجنبی عورت کے ساتھ تنہائی میں نہیں ملتا مگر اُن میں کا تیسرا شیطان ہوتا ہے''۔

(سنن ترمذی: ۱۱۷۱، مسند البزار: ۸۱۷، السنن الکبریٰ للنسائی: ۹۱۷۹، مسند الرویانی: ۱۳۳۱، شرح مشکل الآثار: ۸۱۷، صحیح ابن حبان: ۵۵۸۶، المعجم الاوسط للطبرانی: ۲۹۲۹، المعجم الصغیر للطبرانی: ۳۲۵، المستدرک علی الصحیحین: ۳۸۷، حلیۃ الاولیاء ج ۳ ص ۱۸۳، شعب الایمان للبیہقی: ۱۰۵۷۳)

آیاتہا ۱۱۱ — ۱۲ سورۃ یوسف مکیۃ ۵۳ — رکوعاتہا ۱۲

(سورۃ یوسف مکی ہے اور اس میں ایک سو گیارہ آیات اور بارہ رکوع ہیں)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ عزوجل کے بابرکت نام سے ہی (ابتداء ہے) جو سب پر رحم فرمانے والے، نہایت مہربان ہیں

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۱﴾

الٓرٰ یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو صاف صاف بیان فرمانے والی ہے O

إِنَّآ أَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲﴾

بے شک ہم نے اس قرآن کو عربی زبان میں نازل فرمایا ہے تاکہ تم لوگ اس کو سمجھ سکو O

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْءٰنَ ۖ
وَإِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۳﴾

(اے رسول اکرم!) بے شک ہم اس قرآن میں آپ کی طرف نہایت عمدہ قصہ کی وحی فرماتے ہیں اور بے شک آپ اس سے پہلے ضرور بے خبروں میں سے تھے O

إِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِأَبِيْهِ يٰٓأَبَتِ إِنِّيْ رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ
رَأَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ﴿۴﴾

جب یوسف نے اپنے والد سے کہا کہ اے ابا جان! میں نے خواب میں گیارہ ستاروں کو اور سورج اور چاند کو دیکھا ہے، میں نے دیکھا کہ وہ سب مجھے سجدہ کرنے والے ہیں O

قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى إِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ۖ إِنَّ الشَّيْطٰنَ
لِلْإِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۵﴾

یوسف کے والد نے کہا: اے میرے بیٹے! آپ اپنے خواب کا ذکر اپنے بھائیوں کے سامنے نہ کریں ورنہ وہ تمہارے خلاف کوئی سازش کریں گے، بے شک شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے O

وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَ عَلٰۤى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰۤى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۠ ۶

اور اسی طرح تمہارے رب تمہیں منتخب فرمالیں گے اور تمہیں خواب کی تعبیرات کا علم عطا فرمائیں گے اور تم پر اور آل یعقوب پر اسی طرح اپنی نعمت کو پورا فرمائیں گے جس طرح انہوں نے اس سے پہلے تمہارے دو دادا ؤں پر اپنی نعمت مکمل فرمائی تھی ابراہیم اور اسحاق پر، بے شک آپ کے رب سب کچھ جاننے والے، سب حکمتوں والے ہیں O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''الٓرٰ یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو صاف صاف بیان فرمانے والی ہے O'' (یوسف:۱)

علامہ ابو الفرج عبد الرحمن بن علی بن الجوزی الحنبلی المتوفی ۵۹۷ھ، یوسف: ۱ تا ۶ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یوسف: ۱ کے شانِ نزول میں دو قول

''الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ'': اس آیت کی تفسیر میں دو قول ہیں:

(۱) حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید نازل فرمایا گیا، آپ ایک عرصہ تک لوگوں کے سامنے اس کی تلاوت کرتے رہے، پھر لوگوں نے کہا: یارسول اللہ! کاش! آپ ہمیں کوئی قصہ بیان فرماتے، تب اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: ''الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ''۔

(مسند البزار: ۳۲۱۸، مسند ابو یعلیٰ: ۷۴۰، صحیح ابن حبان: ۶۲۰۹، المستدرک للحاکم ج ۲ ص ۳۴۵)

(۲) الضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ یہود نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا، پس انہوں نے کہا: ہمیں یعقوب اور ان کے بیٹے یوسف کے متعلق بتایئے، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تورات عبرانی زبان میں ہے اور انجیل سریانی زبان میں ہے اور تم عرب قوم ہو، اگر میں نے بغیر عربی زبان کے کوئی قصہ بیان کیا تو تم نہیں سمجھ سکو گے۔ نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو قرآن مجید کی آیات سننے سے اکتاہٹ ہوئی اور ملال ہوا تو انہوں نے کہا: آپ ہمیں ایسی چیز بیان کریں کہ جس سے یہ اکتاہٹ دور ہو جائے، آپ نے فرمایا: میں تمہارے سامنے جو بیان کرتا ہوں وہ الکتاب المبین کی آیات ہیں۔

''الْمُبِيْنِ'' کے معنی میں متعدد اقوال

(الف) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد نے کہا: جس کتاب میں حلال اور حرام کا واضح بیان فرمایا ہو۔

(ب) اور قتادہ نے کہا: المبین کا معنی ہے: جس کتاب میں ہدایت اور رشد واضح ہو۔

(ج) الماوردی نے کہا: جن آیات کا معجز ہونا بہت واضح ہو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ” بے شک ہم نے اس قرآن کو عربی زبان میں نازل فرمایا ہے تا کہ تم لوگ اس کو سمجھ سکو O “ (یوسف: ۲)

” اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ “ ”اَنْزَلْنٰهُ“ کی ضمیر کے متعلق دو قول ہیں:

(۱) جمہور کا قول یہ ہے کہ یہ ضمیر کتاب کی طرف راجع ہے، یعنی ہم نے اس کتاب کو نازل فرمایا۔

(۲) الزجاج اور ابن القاسم نے کہا: یہ ضمیر خبر یوسف کی طرف راجع ہے۔

” قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا “: اس میں علماء کا اختلاف ہے، کیا قرآن میں کچھ الفاظ غیر عربی کے ہیں یا نہیں۔ پس ہمارے اصحاب کا مذہب یہ ہے کہ قرآن مجید میں کوئی لفظ غیر عربی کا نہیں ہے۔ امام ابوعبیدہ نے کہا: جس کا یہ زعم ہو کہ قرآن میں عربی زبان کے علاوہ بھی کچھ الفاظ ہیں، اس نے اللہ پر بہت بڑا جھوٹ باندھا۔ اور ان کا استدلال اس آیت سے ہے: ” اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا ۔ (الزخرف: ۳) “۔

اس کی تحقیق کہ قرآن مجید میں بعض الفاظ غیر عربی ہیں یا نہیں

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور عکرمہ سے روایت ہے کہ اس قرآن میں عربی زبان کے علاوہ بھی الفاظ ہیں جیسے سِجِّيْلٍ، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ” تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۞ (الفیل: ۴) “ (ابابیل اُن پر پتھروں کی کنکریاں پھینکتے تھے O)، اور اَلْمِشْكٰوةِ، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ” مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ۔ (النور: ۳۵) “ (اُن کے نور کی مثال ایسی ہے گویا کہ ایک طاق ہے جس میں چراغ ہے)۔ اور اَلْيَمِّ، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ” فَاَخَذْنٰهُ وَ جُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ وَ هُوَ مُلِيْمٌ ۞ (الذاریات: ۴۰) “ (پس ہم نے فرعون اور اس کے لشکروں کو پکڑ لیا اور ان کو سمندر میں پھینک دیا اور وہ کام ہی قابل ملامت کرتا تھا O)۔ اور الطُّوْرِ، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ” وَ الطُّوْرِ ۙ (الطور: ۱) “ ((کوہ) طور کی قسم!)۔ اور اَبَارِيْقَ، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ” بِاَكْوَابٍ وَّ اَبَارِيْقَ ۙ وَ كَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ۞ (الواقعہ: ۱۸) “ (یعنی آب خورے اور آفتابے اور صاف شراب کے گلاس لے کر O)۔ اور اِسْتَبْرَقٍ، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ” مُتَّكِئِيْنَ عَلٰى فُرُشٍۭ بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ۔ (الرحمٰن: ۵۴) “ ((اہل جنت) ایسے بچھونوں پر جن کے استر اطلس کے ہیں تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے)۔

علامہ ابن الجوزی کہتے ہیں: میں نے اپنے شیخ ابومنصور اللغوی کے سامنے یہ الفاظ پڑھے تو انہوں نے کہا: یہ علماء ابوعبیدہ سے زیادہ جاننے والے ہیں لیکن اُن کا ایک مذہب ہے اور ابوعبیدہ کا دوسرا مذہب ہے۔ اور ان شاء اللہ دونوں ہی صواب پر ہیں، کیونکہ یہ حروف اصل میں لسان عرب پر نہیں ہیں، پھر اہل عرب اِن الفاظ کو استعمال کرنے لگے تو یہ الفاظ عربی شمار ہونے لگے، یعنی درحقیقت ان الفاظ کی اصل اعجمی ہے لیکن عربی زبان میں ان کا استعمال ہو گیا، سو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لغات متداخلہ میں سے ہیں۔ ” لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ “: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تا کہ تم سمجھ سکو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ” (اے رسول اکرم!) بے شک ہم اس قرآن میں آپ کی طرف نہایت عمدہ قصہ کی وحی فرماتے ہیں اور بے شک آپ اس سے پہلے ضرور بے خبروں میں سے تھے O “ (یوسف: ۳)

"نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ": سعید بن جبیر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی طرف گئے، پس کہا: ہمیں تورات سے کوئی آیت سنایئے، کیونکہ تورات میں بہت عمدہ آیات ہیں، تب اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: "نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ" یعنی قرآن مجید میں جو قصص بیان فرمائے گئے ہیں وہ تورات سے بہت زیادہ اچھے ہیں۔ اور الزجاج نے کہا: اس کا معنی ہے: ہم آپ کے لیے عمدہ پیرائے میں بیان فرماتے ہیں۔ اور "القاص" اس کو کہتے ہیں جو حقیقت کے مطابق کوئی قصہ بیان کرے۔

"بِمَاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ": یعنی ہم نے آپ کی طرف اس قرآن کی وحی نازل فرمائی ہے۔ علماء نے بیان کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کو سب سے عمدہ قصہ اس لئے فرمایا ہے کہ اس قصہ میں انبیاء علیہم السلام، صالحین، ملائکہ اور شیاطین کا ذکر ہے اور بادشاہوں اور تاجروں اور علماء کی سیرتوں کا بیان ہے، اور مردوں اور عورتوں کا ذکر ہے، اور عورتوں کی سازشوں کا ذکر ہے، اور اس میں توحید کا اور فقہ کا ذکر ہے اور خواب کی تعبیروں کا ذکر ہے، اور سیاست اور معاشرت اور تدبیر معاش کا ذکر ہے، اور مصائب پر صبر کا ذکر ہے، اسی طرح اور عجیب و غریب امور کا بیان ہے۔

"وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ": یعنی تحقیق آپ قرآن مجید کی آیات کے نزول سے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام کی خبر سے ناواقف تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "جب یوسف نے اپنے والد سے کہا کہ اے ابا جان! میں نے خواب میں گیارہ ستاروں کو اور سورج اور چاند کو دیکھا ہے، میں نے دیکھا کہ وہ سب مجھے سجدہ کرنے والے ہیں O" (یوسف:۴)

"اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ": الزجاج اور ابن الانباری نے کہا: اس آیت کا معنی ہے: آپ اس وقت کو یاد کیجئے جب یوسف نے اپنے والد سے کہا تھا۔ "يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ": حضرت یوسف علیہ السلام نے جو خواب دیکھا تھا، اس کے متعلق دو قول ہیں:

(۱) اکثرین کا قول یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے سورج، چاند اور ستاروں کو دیکھا تھا۔

مفسرین نے کہا: ان ستاروں کی تعبیر حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں سے کی گئی ہے اور سورج کی تعبیر ان کی والدہ سے کی گئی ہے اور قمر کی تعبیر ان کے والد سے کی گئی ہے، پس جب حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ خواب حضرت یعقوب علیہ السلام کے سامنے بیان کیا تو حضرت یعقوب علیہ السلام کو ان کے بھائیوں کے حسد کی وجہ سے خوف دامن گیر ہوا۔

اور السدی نے کہا: الشمس سے مراد حضرت یوسف علیہ السلام کے والد ہیں اور القمر سے مراد ان کی خالہ ہیں، کیونکہ ان کی والدہ تو پہلے ہی فوت ہو چکی تھیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین کو اور اپنے بھائیوں کو اپنے سامنے سجدہ کرتے ہوئے دیکھا، تو انہوں نے ان کا صراحتاً ذکر کرنے سے کنایہ کیا۔

اور جب حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ خواب دیکھا تھا تو اس وقت ان کی عمر کے مطابق تین قول ہیں:

(۱) وہ سات سال کے تھے۔ (۲) وہ بارہ سال کے تھے۔ (۳) وہ سترہ سال کے تھے۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الکریم ابن الکریم ابن الکریم ابن الکریم یوسف بن

یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم ہیں۔ (صحیح البخاری: ۳۳۸۲، ۳۳۹۰، ۴۶۸۸، سنن ترمذی: ۳۱۱۶، صحیح ابن حبان: ۵۷۷۶، شرح السنۃ للبغوی: ۳۴۴۱) (موسوعۃ المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی الشریف، ج ۱۶ ص ۱۶۱، دارالمعرفۃ، بیروت، ۱۴۳۴ھ)

کریم کا معنی

اس حدیث میں حضرت یوسف علیہ السلام کی صفت کریم بیان کی گئی ہے۔ "کریم" "لئیم (ملامت زدہ) کی ضد ہے، کریم اس شخص کو کہتے ہیں جو دنیا اور آخرت میں نیک ہو۔

علامہ نووی نے کہا: کریم اصل میں اس کو کہتے ہیں جس میں بہ کثرت خیر ہو، حضرت یوسف علیہ السلام نے شرف نبوت کے ساتھ تمام مکارم اخلاق کو جمع کر لیا تھا، اور وہ تین متناسل انبیاء (حضرت یعقوب، حضرت اسحاق اور حضرت ابراہیم علیہم السلام) کے بیٹے تھے اور جب وہ دنیاوی ریاست کے امیر ہوئے تو انہوں نے انتہائی عدل و انصاف سے کام کیا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "یوسف کے والد نے کہا: اے میرے بیٹے! آپ اپنے خواب کا ذکر اپنے بھائیوں کے سامنے نہ کریں ورنہ وہ تمہارے خلاف کوئی سازش کریں گے، بے شک شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے O" (یوسف: ۵)

"قَالَ يٰبُنَيَّ": مفسرین نے کہا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو معلوم تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی خواب کی تعبیر سمجھتے تھے، اس لئے انہوں نے کہا: "لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا": ابن قتیبہ نے کہا: اس آیت کا معنی ہے کہ تمہارے بھائی تمہارے لئے کوئی حیلہ کر کے تمہیں کوئی نقصان پہنچائیں گے۔

"اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ": بے شک شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے۔

خواب کی تعبیر کے متعلق احادیث

حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں (برے) خواب دیکھتا تھا اور ان سے میں بیمار ہو جاتا تھا حتیٰ کہ میں نے حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں بھی (برے) خواب دیکھتا تھا پس میں بیمار ہو جاتا تھا حتیٰ کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اچھا خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، پس جب تم میں سے کوئی شخص پسندیدہ خواب دیکھے تو یہ خواب صرف اسی کے سامنے بیان کرے جس سے وہ محبت کرتا ہے اور جب وہ ناپسندیدہ خواب دیکھے تو اللہ تعالیٰ سے اس خواب کے شر سے پناہ طلب کرے، اور شیطان کے شر سے پناہ طلب کرے اور تین مرتبہ تھوک دے، اور وہ خواب کسی کو بیان نہ کرے تو پھر وہ خواب اس کو ضرر نہیں پہنچائے گا۔

(صحیح البخاری: ۳۲۹۲، ۵۷۴۷، ۶۹۸۴، ۶۹۸۶، ۶۹۹۵، ۶۹۹۶، ۷۰۰۵، ۷۰۴۴، صحیح مسلم: ۲۲۶۱، سنن ترمذی: ۲۲۷۷، سنن ابوداؤد: ۵۰۲۱، سنن ابن ماجہ: ۳۹۰۹، مسند احمد: ۲۲۰۵۸، موطا امام مالک: ۱۷۸۳، سنن دارمی: ۲۱۴۱، شرح السنۃ للبغوی: ۳۱۶۸، صحیح ابن حبان: ۶۰۵۸، عمل الیوم واللیلۃ للنسائی: ۸۹۹، مسند الحمیدی: ۴۱۸، ۱۳۹، ۴۲۰، عمل الیوم واللیلۃ لابن السنی: ۷۷۴، الآداب للبیہقی: ۹۸۷)

(موسوعۃ المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی الشریف، ج ۱۲ ص ۶۴۵، دارالمعرفۃ، بیروت، ۱۴۳۴ھ)

علامہ بدرالدین ابو محمد محمود بن احمد العینی الحنفی المتوفی ۸۵۵ھ، اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

محب کے سامنے خواب بیان کرنے کے فوائد

اس حدیث میں مذکور ہے "فلا یحدث بہ الا من یحب" یعنی وہ اپنا اچھا خواب صرف اسی شخص کے سامنے بیان کرے جو اس سے محبت کرتا ہے، کیونکہ اگر اس نے کسی ایسے شخص کے سامنے وہ خواب بیان کیا جو اس سے وہ محبت نہیں کرتا، تو وہ کبھی خواب کی تعبیر اپنے بغض کی وجہ سے ایسی بیان کرے گا یا اپنے حسد کی وجہ سے ایسی بیان کرے گا جس سے اس کو نقصان ہوگا، اور خواب اس کی بیان کردہ تعبیر کے مطابق ہوگا اور جو اس کا محب ہوگا وہ اس خواب کی وہی تعبیر بیان کرے گا جو اچھی ہو، اور جو شخص پہلے تعبیر بیان کرتا ہے خواب اسی پر واقع ہوتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "خواب پہلی تعبیر بیان کرنے والے پر مرتب ہوتا ہے"۔ (سنن ابن ماجہ: ۳۹۱۵)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ اپنا خواب یا عالم کے سامنے بیان کرو یا خیر خواہ کے سامنے بیان کرو۔

اس حدیث میں مذکور ہے "ولیتفل" یعنی اسے چاہیے کہ وہ تھوک دے، اور یہ شیطان کو دھتکارنے کے لیے اور اس کو نجس قرار دینے کے لیے ہے۔

علامہ داؤدی نے کہا ہے: اس سے مراد یہ ہے کہ جو خواب شیطان کی طرف سے ہو، لیکن جو خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے خواہ وہ خیر ہو یا شر ہو تو وہ لامحالہ واقع ہوگا۔ (عمدۃ القاری ج ۲۵۱-۲۵۲، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۱ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اسی طرح تمہارے رب تمہیں منتخب فرمالیں گے اور تمہیں خواب کی تعبیرات کا علم عطا فرمائیں گے اور تم پر اور آل یعقوب پر اسی طرح اپنی نعمت کو پورا فرمائیں گے جس طرح انہوں نے اس سے پہلے تمہارے دو داداؤں پر اپنی نعمت مکمل فرمائی تھی ابراہیم اور اسحاق پر، بے شک آپ کے رب سب کچھ جاننے والے، سب حکمتوں والے ہیں O" (یوسف: ۶)

"وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ": آپ نے جس طرح اپنے بلند درجہ کو دیکھا ہے تو آپ کے رب آپ کو آپ کے بھائیوں پر فضیلت عطا فرمائیں گے۔ اور اجتباء کا معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ آپ کو نبوت سے سرفراز فرمائیں گے۔

"وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ": اس کی تفسیر میں تین اقوال ہیں:

(۱) ایک یہ کہ آپ کو خوابوں کی تعبیروں کا علم عطا فرمائیں گے، اسی وجہ سے خواب کی تعبیر کو تاویل کہتے ہیں کیونکہ بندہ نے خواب میں جو کچھ دیکھا تھا، بیداری میں اسی واقعہ کو لوٹایا جائے گا۔

(۲) ابن زید نے کہا: اس سے مراد علم اور حکمت ہے۔

(۳) الزجاج اور مقاتل نے کہا: اس سے مراد انبیاء سابقین، ان کی امتوں اور ان کی کتابوں کا علم ہے۔

"وَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ": اس کی تفسیر میں بھی تین اقوال ہیں:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: آپ کو نبوت عطا فرمائیں گے۔

(۲) آپ کا ذکر بلند فرمائیں گے۔

(۳) الماوردی نے کہا: آپ کے بھائیوں کو آپ کا محتاج بنا دیں گے، حتیٰ کہ آپ اُن پر انعام فرمائیں گے۔

"وَعَلٰۤى اٰلِ یَعْقُوْبَ": اس میں بھی تین اقوال ہیں:

(۱) ابوصالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ اس سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہے۔

(۲) مقاتل نے کہا: حضرت یعقوب علیہ السلام اور اُن کی بیوی اور اُن کی گیارہ اولادیں، ان سب پر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت پوری فرمائی اور ان سب نے حضرت یوسف علیہ السلام کو سجدہ کیا۔

(۳) ابوعبیدہ نے کہا: اس سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام کے اہل ہیں۔

"كَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰۤى اَبَوَیْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْحٰقَ": عکرمہ نے کہا: اللہ تعالیٰ کی حضرت ابراہیم علیہ السلام پر نعمت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو نمرود کی جلائی ہوئی آگ سے نجات عطا فرمائی۔ اور حضرت اسحاق علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کی نعمت یہ تھی کہ اُن کو ذبح سے نجات عطا فرمائی۔ (میں کہتا ہوں: حضرت اسحاق علیہ السلام ذبیح نہیں تھے بلکہ ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے۔ سعیدی غفرلہ)۔

"اِنَّ رَبَّكَ عَلِیْمٌ": یعنی بے شک آپ کے رب خوب جاننے والے ہیں کہ نبوت کس کو عطا فرمانی چاہیے۔ "حَكِیْمٌ": اپنی تمام مخلوق کی تدبیر حکمت سے فرماتے ہیں۔ (زاد المسیر فی علم التفسیر ج ۴ ص ۲۱۱-۲۱۲، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۲ھ)

لَقَدْ كَانَ فِیْ یُوْسُفَ وَ اِخْوَتِهٖۤ اٰیٰتٌ لِّلسَّآئِلِیْنَ ﴿۷﴾

بے شک یوسف اور اُن کے بھائیوں کے واقعات میں سوال کرنے والوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں ○

اِذْ قَالُوْا لَیُوْسُفُ وَ اَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰۤى اَبِیْنَا مِنَّا وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنِۚ ﴿۸﴾

جب یوسف کے بھائیوں نے کہا: "یوسف اور اس کا حقیقی بھائی (بنیامین) دونوں ہمارے والد کے نزدیک ہم سے زیادہ محبوب ہیں حالانکہ ہم ایک (طاقتور) جماعت ہیں، بے شک ہمارے والد علانیہ ان کی محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں" ○

اقْتُلُوْا یُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا یَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِیْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِیْنَ ﴿۹﴾

تم سب مل کر یوسف کو قتل کر دو یا اس کو کسی اور ملک میں پھینک آؤ، پھر تمہارے والد کی توجہ صرف تمہاری طرف رہے گی، اور تم اس کے بعد (تائب ہو کر) نیک بن جانا ○

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا یُوْسُفَ وَ اَلْقُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ یَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّیَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ ﴿۱۰﴾

اُن میں سے ایک کہنے والے نے مشورہ دیا کہ اگر تم کچھ کرنا ہی چاہتے ہو تو تم یوسف کو قتل نہ کرو اور اسے کسی اندھے کنویں میں ڈال دو، تا کہ کوئی راہ چلتا مسافر اسے کنویں سے نکال لے گا O

قَالُوا يَا أَبَانَا مَا لَكَ لَا تَأْمَنَّا عَلَىٰ يُوسُفَ وَإِنَّا لَهُ لَنَاصِحُونَ (۱۱)

انہوں نے (اپنے والد سے) کہا: ''اے ہمارے ابا جان! کیا وجہ ہے کہ آپ یوسف کے متعلق ہم پر بھروسا نہیں کرتے حالانکہ ہم اس کے خیر خواہ ہیں''O

أَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (۱۲)

''آپ کل یوسف کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے، تا کہ وہ درختوں کے پھل کھائے اور کھیلے کودے، بے شک ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''O

قَالَ إِنِّي لَيَحْزُنُنِي أَنْ تَذْهَبُوا بِهِ وَأَخَافُ أَنْ يَأْكُلَهُ الذِّئْبُ وَأَنْتُمْ عَنْهُ غَافِلُونَ (۱۳)

(یوسف کے والد نے) کہا: ''بے شک مجھے یہ بات غمگین کرتی ہے کہ تم اس کو لے جاؤ گے اور مجھے خطرہ ہے کہ اس کو بھیڑیا کھا لے گا جب کہ تم اس سے غافل ہو گے''O

قَالُوا لَئِنْ أَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّا إِذًا لَخَاسِرُونَ (۱۴)

(یوسف کے بھائیوں نے) کہا: ''اگر ہماری پوری جماعت کے ہوتے ہوئے یوسف کو بھیڑیا کھا گیا تو بے شک ہم ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوں گے''O

فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَأَجْمَعُوا أَنْ يَجْعَلُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ ۚ وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِأَمْرِهِمْ هَٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ (۱۵)

پھر جب وہ یوسف کو لے گئے اور وہ سب اس پر متفق ہو گئے کہ یوسف کو کسی اندھے کنویں میں ڈال دیں، اور ہم نے یوسف کی طرف وحی فرمائی: تم ضرور بہ ضرور ان کو (کسی وقت) اس واقعہ کی خبر دو گے جب کہ ان کو اس کا شعور نہیں ہو گا O

وَجَاءُوا أَبَاهُمْ عِشَاءً يَبْكُونَ (۱۶)

اور رات کے وقت وہ روتے ہوئے اپنے والد کے پاس آئے O

قَالُوا يَا أَبَانَا إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَأَكَلَهُ الذِّئْبُ ۖ وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَنَا وَلَوْ كُنَّا صَادِقِينَ (۱۷)

انہوں نے کہا: "اے ہمارے ابا جان! ہم آپس میں مقابلہ کرتے ہوئے دوڑ رہے تھے اور ہم نے یوسف کو اپنے سامان کی حفاظت کے پاس چھوڑ دیا سو اس کو بھیڑیا کھا گیا، اور آپ ہماری خبر کی تصدیق کرنے والے نہیں ہیں خواہ ہم سچے کیوں نہ ہوں O"

وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾

اور وہ یوسف کی قمیص پر جھوٹا خون لگا کر لائے تھے، (یعقوب نے اُن سے) فرمایا: "بلکہ تمہارے دلوں نے بچنے کا ایک بہانہ گھڑ لیا سو صبر کرنا ہی بہت بہتر ہے، اور تم جو کچھ بیان کر رہے ہو، اس کے متعلق میں اللہ ہی سے مدد طلب کرنے والا ہوں O"

وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ ؕ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ؕ وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾

اور ایک قافلہ آیا سو انہوں نے پانی منگانے کے لیے کسی کو کنویں پر بھیجا، اس نے کنویں میں اپنا ڈول لٹکایا، کہا: تمہیں خوش خبری ہو یہ ایک (خوبصورت) لڑکا ہے، اور یوسف کو مال تجارت بنا کر چھپا لیا، اور اللہ اُن کے کیے ہوئے کاموں کو خوب جاننے والے ہیں O

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۢ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ ﴿۲۰﴾

اور یوسف کے بھائیوں نے یوسف کو انتہائی کم قیمت چند دراہم کے عوض بیچ ڈالا، اور وہ پہلے بھی یوسف میں کوئی رغبت کرنے والے نہ تھے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "بے شک یوسف اور اُن کے بھائیوں کے واقعات میں سوال کرنے والوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں O" (یوسف: ۷)

علامہ ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ، یوسف: ۷ تا ۲۰ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کے اسماء

"لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖۤ": یعنی حضرت یوسف علیہ السلام اور اُن کے بھائیوں کی خبر میں۔

اور اُن کے بھائیوں کے اسماء یہ ہیں:

(۱) روبیل، اور ایک قول ہے روبین، وہ اُن میں سب سے بڑے بھائی تھے (۲) شمعون (۳) لاوی (۴) یہوذا (۵) آشر (۶) زبالون، ان سب کی ماؤں کا نام لیا بنت لیان ہے اور وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے ماموں کی بیٹی تھی اور اُن سے دو باندیوں کی اولاد ہوئی، ایک کا نام زلفہ تھا اور دوسری کا نام بلہہ تھا، اور اُن سے چار بیٹے ہوئے: (۷) دان (۸) نفتالی، اور ایک قول ہے نفتولی (۹) جعد (۱۰) اشیر، پھر جب وہ فوت ہو گئیں تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اُن کی بہن راحیل سے نکاح کر لیا، اور اُن سے

(۱۱) حضرت یوسف اور (۱۲) بنیامین پیدا ہوئے۔ پس حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے۔

"اٰیٰتٌ لِّلسَّآئِلِیْنَ": اس کی وجہ یہ ہے کہ یہود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کے متعلق سوال کیا، اور ایک قول یہ ہے کہ انہوں نے یہ سوال کیا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے جو کنعان سے مصر منتقل ہوئے تھے، اس کی کیا وجہ ہے؟ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے سامنے حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ مکمل بیان فرمایا، اور انہوں نے وہ قصہ تورات کے موافق پایا، تب اُن کو اس پر بہت تعجب ہوا۔

اور "اٰیٰتٌ لِّلسَّآئِلِیْنَ" کا معنی یہ ہے کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر دلیل ہے۔ اور دوسرا معنی یہ ہے کہ اس میں اعتبار کرنے والوں کے لیے عبرت کی نشانیاں ہیں، کیونکہ ان قصوں میں مذکور ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی حضرت یوسف علیہ السلام سے حسد کرتے تھے۔ اور اُن کے حسد کا کیا انجام ہوا، اور ان واقعات میں حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب کی تعبیر کا ذکر ہے۔ اور ان واقعات میں حضرت یوسف علیہ السلام کے عظیم صبر کا ذکر ہے جو انہوں نے غلامی پر صبر کیا اور شہوت کے تقاضوں کو رد کرنے پر صبر کیا، اور کافی مدت تک قید خانہ میں رہنے پر صبر کیا، اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو ملک اور سلطنت عطا فرمائی۔ اور ان واقعات میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا حضرت یوسف علیہ السلام کی جدائی پر غم اور صبر کا بیان ہے اور انجام کار اُن کی مراد پوری ہونے کا بیان ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "جب یوسف کے بھائیوں نے کہا: "یوسف اور اس کا حقیقی بھائی (بنیامین) دونوں ہمارے والد کے نزدیک ہم سے زیادہ محبوب ہیں حالانکہ ہم ایک (طاقتور) جماعت ہیں، بے شک ہمارے والد علانیہ اُن کی محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں" O (یوسف: ۸)

"اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ": اس آیت میں لام قسم کے جواب میں ہے، اصل عبارت اس طرح ہے: "اللہ کی قسم ! ضرور یوسف"۔

"وَاَخُوْهُ": اور اس کے حقیقی بھائی بنیامین۔ "اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا": ہمارے والد کے نزدیک ہم سے زیادہ محبوب ہیں۔

"العصبة" کی تعداد میں اختلاف

اور حضرت یوسف علیہ السلام اور اُن کے حقیقی بھائی بنیامین ایک ماں سے پیدا ہوئے۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام سے بہت زیادہ محبت تھی۔ اور اُن کے بھائی یہ دیکھتے تھے کہ اُن کے والد کا جو میلان اور رجحان اُن دونوں کی طرف ہے، وہ ان کی طرف نہیں ہے، تب انہوں نے یہ کہا: "وَنَحْنُ عُصْبَةٌ": یعنی حالانکہ ہم ایک جماعت ہیں اور اُن کے بھائیوں کی تعداد دس تھی۔ الفراء نے کہا: العصبہ کا معنی ہے دس یا اس سے زیادہ، دوسرا قول یہ ہے کہ العصبہ ایک سے لے کر دس تک کی تعداد ہے۔ اور تیسرا قول یہ ہے کہ وہ تین سے لے کر دس تک کی تعداد ہے۔ اور مجاہد نے کہا: وہ دس سے لے کر پندرہ تک کی تعداد ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ وہ دس سے لے کر چالیس تک کی تعداد ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ وہ جماعت ہے جو ایک دوسرے کے ساتھ مضبوط تعلق رکھتے ہوں، اس کا واحد کا صیغہ نہیں ہے جیسا کہ النفر اور الرھط کا بھی واحد کا صیغہ نہیں ہے۔

ضلال سے خطاء فی الدین کے بجائے خطاء فی التدبیر مراد لینا

"اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ": یعنی ہمارے والد ظاہر خطاء میں پڑے ہوئے ہیں کہ وہ یوسف اور اس کے بھائی کو ہم پر ترجیح

دیتے ہیں۔اس آیت میں "ضَلٰلٍ" سے مراد دین سے گمراہ نہیں ہے، اور اگر وہ اس سے دین سے گمراہ مراد لیتے تو کافر ہو جاتے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ دنیاوی معاملات کی تدبیر میں وہ خطاء کرتے ہیں حتیٰ کہ وہ اُن کو اس پر ترجیح دیتے ہیں جو دنیا کے معاملات میں اور معاش کے معاملات میں اور مویشیوں کو چرانے کے معاملات میں یوسف علیہ السلام سے زیادہ نفع پہنچانے والے ہیں، سو ہم اس کے زیادہ لائق ہیں کہ ہمارے والد ہم سے زیادہ محبت کرتے، تو وہ جو یوسف کی طرف زیادہ محبت کرتے ہیں، اس وجہ سے وہ خطاء پر ہیں۔

میں کہتا ہوں: "ضَلٰلٍ" کا معنی محبت بھی ہے، سو یہاں پر یہی معنی ہوگا کہ ہمارے والد یوسف علیہ السلام سے پرانی محبت میں مبتلاء ہیں۔(سعیدی غفرلہ)۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "تم سب مل کر یوسف کو قتل کر دو یا اُس کو کسی اور ملک میں پھینک آؤ، پھر تمہارے والد کی توجہ صرف تمہاری طرف رہے گی، اور تم اس کے بعد (تائب ہو کر) نیک بن جاناO" (یوسف:۹)

"اُقْتُلُوْا یُوْسُفَ": اس کے قائل میں اختلاف ہے کہ کس نے کہا تھا کہ یوسف کو قتل کر دو۔

وہب بن منبہ نے کہا: یہ شمعون نے کہا تھا۔ اور کعب نے کہا: یہ دان نے کہا تھا۔ اور مقاتل نے کہا کہ یہ روبیل نے کہا تھا۔

"اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا": یعنی اُن کو کسی دور دراز کے علاقہ میں پھینک آؤ۔ اور ایک قول یہ ہے کہ انہیں ایسی زمین میں پھینک آؤ جہاں ان کو درندے کھا جائیں۔ "یَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِیْكُمْ": پھر تمہارے والد کا رُخ صرف تمہاری طرف ہوگا اور وہ یوسف کے ساتھ مشغول نہیں رہیں گے۔

"وَ تَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِیْنَ": یعنی یوسف کو قتل کرنے کے بعد تم سب اللہ تعالیٰ سے توبہ کر لینا تو اللہ تعالیٰ تمہارے جرم کو معاف فرما دیں گے۔ اور مقاتل نے کہا کہ "صٰلِحِیْنَ" کا معنی ہے: پھر تمہارے اپنے باپ کے ساتھ معاملات درست ہو جائیں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اُن میں سے ایک کہنے والے نے مشورہ دیا کہ اگر تم کچھ کرنا ہی چاہتے ہو تو تم یوسف کو قتل نہ کرو اور اُسے کسی اندھے کنویں میں ڈال دو، تاکہ کوئی راہ چلتا مسافر اسے کنویں سے نکال لے گاO" (یوسف:۱۰)

"قَالَ قَآىٕلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا یُوْسُفَ": اس قول کا قائل حضرت یوسف علیہ السلام کا سوتیلا بھائی یہوذا تھا۔ اور قتادہ نے کہا: وہ روبیل تھا اور وہ حضرت یوسف علیہ السلام کی خالہ کا بیٹا تھا، اور وہ اُن سب بھائیوں میں بڑی عمر کا تھا اور اس کی رائے اُن سب سے بہتر تھی۔ اور پہلا قول یعنی یہوذا کا، وہ زیادہ صحیح ہے۔ اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قتل کرنے سے منع کیا اور کہا کہ قتل کرنا گناہ کبیرہ ہے۔

"وَ اَلْقُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ": یعنی کسی کنویں کی تہہ میں اور اس کے اندھیرے میں ان کو پھینک دو۔ اور "الغیابۃ" کا معنی ہے: ہر وہ چیز جو تم سے مستور ہو اور چھپی ہوئی ہو۔ اور "الجُبّ" کا معنی ہے: ایسا کنواں جس کی طرف منڈیر نہ ہو، اس کو جُبّ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ مقطوع ہوتا ہے۔

"یَلْتَقِطْهُ": یعنی اُن کو حاصل کر لیں گے۔ التقاط کا معنی ہے: کسی ایسی چیز کو انسان کا اٹھا لینا جس کا کسی کو گمان نہ ہو۔

"بَعْضُ السَّیَّارَۃِ": یعنی بعض مسافرین جو ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ کی طرف زمین میں سفر کرتے ہیں، پھر تم یوسف سے نجات پا جاؤ گے۔

"اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ": یعنی اگر تم اپنے فعل کا پختہ عزم کر چکے ہو۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی اس وقت تک نبی نہیں ہوئے تھے، کیونکہ انہوں نے کہا: "وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِیْنَ" اور تم اس کے بعد نیک لوگ بن جانا، جیسا کہ یوسف: ۹۷ میں ارشاد ہے: "قَالُوْا يٰۤاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ ۔ (یوسف: ۹۷)" (اے ابا جان! آپ ہمارے گناہوں پر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کیجئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے متعدد جرائم

محمد بن اسحاق نے کہا ہے: حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا یہ فعل متعدد جرائم پر مشتمل تھا:

(۱) رحم کو منقطع کرنا (۲) والدین کی نافرمانی کرنا (۳) اس کم عمر بچے پر شفقت نہ کرنا جس کا کوئی گناہ نہیں تھا۔ (۴) امانت میں خیانت کرنا (۵) عہد پورا نہ کرنا (۶) باپ کے سامنے جھوٹ بولنا۔

بعض اہل علم نے کہا ہے: انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قتل کرنے کا عزم کر لیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اُن کو قتل کے ارتکاب سے بچایا، اور اگر وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو قتل کر دیتے تو وہ سب کے سب ہلاک ہو جاتے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "انہوں نے (اپنے والد سے) کہا: "اے ہمارے ابا جان! کیا وجہ ہے کہ آپ یوسف کے متعلق ہم پر بھروسا نہیں کرتے، حالانکہ ہم اس کے خیر خواہ ہیں" O (یوسف: ۱۱)

"قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى یُوْسُفَ": گویا کہ انہوں نے کہا: آپ ہمارے ساتھ یوسف کو کیا اس لئے نہیں بھیج رہے کہ آپ کو ہم سے خطرہ ہے۔

"وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ": النصح سے مراد ہے مصلحت کو قائم کرنا، دوسرا قول ہے نیکی اور مہربانی کرنا۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ ہم مصلحت سے اُن کی حفاظت کریں گے حتیٰ کہ آپ کی طرف واپس لوٹائیں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "آپ کل یوسف کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے، تا کہ وہ درختوں کے پھل کھائے اور کھیلے کودے، بے شک ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں" O (یوسف: ۱۲)

"اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا یَّرْتَعْ وَیَلْعَبْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ":

ابو عمرو بن العلاء سے سوال کیا گیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی انبیاء تھے، پھر انہوں نے کیسے کہا کہ ہم لعب کریں گے یعنی کھیلیں گے کودیں گے؟ انہوں نے جواب دیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے یہ بات اُن کو نبی بنائے جانے سے پہلے کی تھی۔ پھر جب انہوں نے اس پر اتفاق کر لیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام اور اُن کے والد کے درمیان کسی تدبیر سے جدائی ڈالیں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "(یوسف کے والد نے) کہا: "بے شک مجھے یہ بات غمگین کرتی ہے کہ تم اس کو لے

جاؤ گے اور مجھے خطرہ ہے کہ اس کو بھیڑیا کھا لے گا جب کہ تم اس سے غافل ہو گے"O (یوسف کے بھائیوں نے) کہا: "اگر ہماری پوری جماعت کے ہوتے ہوئے یوسف کو بھیڑیا کھا گیا تو بے شک ہم ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوں گے"O (یوسف: ۱۳-۱۴)

"قَالَ اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ": یعنی تمہارے یوسف کو اپنے ساتھ لے جانے سے میں غمزدہ ہوں، میرے دل میں رنج ہے جیسے محبوب کے فراق سے رنج ہوتا ہے۔

"وَ اَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ": اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک بھیڑیے نے حضرت یوسف علیہ السلام پر حملہ کیا، اس وجہ سے حضرت یعقوب علیہ السلام کو یہ خطرہ تھا کہ کہیں بھیڑیا ان کو کھا جائے۔

"قَالُوْا لَىٕنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ": انہوں نے کہا: ہم دس ہیں، ہمارے دس کے ہوتے ہوئے اگر ان کو بھیڑیا کھا جائے گا تو پھر ضرور ہم عاجز اور کمزور ہوں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پھر جب وہ یوسف کو لے گئے اور وہ سب اس پر متفق ہو گئے کہ یوسف کو کسی اندھے کنوئیں میں ڈال دیں، اور ہم نے یوسف کی طرف وحی فرمائی: تم ضرور بہ ضرور ان کو (کسی وقت) اس واقعہ کی خبر دو گے جب کہ ان کو اس کا شعور نہیں ہوگا"O (یوسف: ۱۵)

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا حضرت یوسف علیہ السلام پر ظلم اور تشدد

"فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْۤا": یعنی جب وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو لے گئے اور انہوں نے یہ عزم کر لیا۔ "اَنْ یَّجْعَلُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ" کہ وہ اس کو کسی اندھے کنوئیں کی گہرائی میں پھینک دیں گے۔ "وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْهِ": تو ہم نے یوسف کی طرف وحی فرمائی۔

"لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ": یعنی ہم نے حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ تم ضرور اپنے خواب کی تصدیق پاؤ گے اور تم ضرور بہ ضرور ان کو خبر دو گے کہ تمہارے بھائیوں نے تمہارے ساتھ کیا، کیا تھا۔ اور انہیں اس کا پتا نہیں ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نہیں فرمائی اور نہ ان کو خبر دی۔

اور مجاہد نے کہا: اس کا معنی یہ ہے کہ تمہیں اس کا شعور نہیں ہوگا کہ جب تم ان کو خبر دو گے کہ تم یوسف ہو۔ اور یہ اس وقت ہوا جب وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس آئے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کو پہچان لیا اور وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو نہیں پہچان سکے۔

اور وہب بن منبہ نے کہا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ بہت اعزاز و اکرام کے ساتھ پیش آئے اور انہوں نے ان کو گود میں اٹھا لیا، پھر جب جنگل آیا تو انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اس کنوئیں میں پھینک دیا اور وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو مار رہے تھے، جب ایک بھائی مارتا تو وہ دوسرے بھائی سے مدد طلب کرتے، تو دوسرا بھی ان کو مارتا۔ پس حضرت یوسف علیہ السلام نے ان میں سے کسی کو بھی رحم دل نہ پایا، پھر وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو مارتے رہے اور قریب تھا کہ ان کو جان سے مار ڈالتے، اور حضرت یوسف علیہ السلام پکار رہے تھے: اے ابا جان! کاش! آپ کو علم ہوتا کہ یہ بھائی آپ کے بیٹے کے ساتھ کیا

سلوک کر رہے ہیں۔ پھر جب وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو مار ڈالنے کے قریب تھے تو اُن سے یہوذا نے کہا: کیا تم لوگوں نے مجھ سے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ تم یوسف کو قتل نہیں کرو گے، پھر وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اندھے کنویں کی طرف لے گئے تا کہ اُن کو اس میں ڈال دیں۔ اور اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کی عمر بارہ سال تھی، اور ایک قول ہے کہ اٹھارہ سال تھی۔ پھر وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اس کنویں کے پاس لے کر گئے جو راستہ پر بنا ہوا نہیں تھا اور اس کا منہ اوپر سے تنگ تھا اور نیچے سے کھلا ہوا تھا۔

مقاتل نے کہا: وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے گھر سے تین فرسخ دور تھا۔ کعب الاحبار نے کہا: وہ مدین اور مصر کے درمیان تھا۔ وہب بن منبہ نے کہا: وہ اُردن کی سرزمین میں تھا۔ قتادہ نے کہا: یہ بیت المقدس کا کنواں تھا۔

وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالنے لگے، تو حضرت یوسف علیہ السلام کنویں کے کنارے سے لٹکنے لگے، پس انہوں نے آپ کے ہاتھ باندھ دیے اور آپ کی قمیص اتار دی، حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: اے میرے بھائیو! میری قمیص تو مجھے لوٹا دو، میں اس کے ساتھ کنویں میں اپنا بدن چھپاؤں گا، تو بھائیوں نے کہا: اب سورج، چاند اور ستاروں کو بلاؤ، وہ تمہارے بدن کو چھپائیں گے، حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا، سو انہوں نے آپ کو اس میں پھینک دیا۔

اور ایک قول یہ ہے کہ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ایک ڈول میں ڈال دیا اور اس ڈول کو کنویں میں چھوڑ دیا۔ اور اُن کا ارادہ یہ تھا کہ یہ اسی طرح اس ڈول میں پڑے رہیں۔ اور اس کنویں میں پانی تھا، حضرت یوسف علیہ السلام اس پانی میں گر گئے، پھر وہاں انہوں نے ایک چٹان کی پناہ لی اور اس پر کھڑے ہو گئے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ جب انہوں نے آپ کو کنویں میں ڈال لیا تو آپ رونے لگے، پس بھائیوں نے اُن کو پکارا، حضرت یوسف علیہ السلام نے سمجھا کہ شاید اب اُن کے دل میں رحم آ گیا، جبکہ انہوں نے ارادہ کیا کہ آپ پر اس چٹان کو گرا دیں تا کہ آپ کو مار ڈالیں تو یہوذا نے منع کیا اور یہوذا تین دن تک حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں کھانا لا کر دیتے رہے اور حضرت یوسف علیہ السلام تین دن تک کنویں میں رہے۔

اور اکثر علماء نے کہا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی گئی اور اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف بھیجا، وہ اُن کے ساتھ اُنس سے پیش آتے اور انہیں کنویں سے نکلنے کی بشارت دیتے اور یہ خبر دیتے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائیوں کو اُن کے ان کاموں کی خبر دیں گے اور اُن کو جزا دیں گے اور انہیں اپنے اس ظالمانہ سلوک کا پتا بھی نہیں ہوگا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ایک بکری کا بچہ ذبح کیا اور اس کے خون کو حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص پر لگا دیا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور رات کے وقت وہ روتے ہوئے اپنے والد کے پاس آئے ○" (یوسف:۱۶)

"وَجَآءُوْٓ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ":

اہل المعانی نے کہا ہے کہ وہ عشاء کے وقت رات کے اندھیرے میں آئے تا کہ اُن کے جھوٹ پر عذر بن سکے۔

اور روایت ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اُن کی چیخ و پکار کو سنا، پس باہر آئے اور کہا: اے میرے بیٹو! تمہیں کیا ہوا؟ کیا تمہاری بکریوں پر کوئی حادثہ پیش آ گیا؟ انہوں نے کہا: نہیں! حضرت یعقوب علیہ السلام نے پوچھا: پھر تم پر کیا مصیبت آئی اور یوسف کہاں ہے؟

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "انہوں نے کہا: "اے ہمارے ابا جان! ہم آپس میں مقابلہ کرتے ہوئے دوڑ رہے تھے اور ہم نے یوسف کو اپنے سامان کی حفاظت کے پاس چھوڑ دیا سو اس کو بھیڑیا کھا گیا، اور آپ ہماری خبر کی تصدیق کرنے والے نہیں ہیں خواہ ہم سچے کیوں نہ ہوں"O (یوسف: ۱۷)

"قَالُوْا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ": یعنی ہم مقابلہ میں بھاگ رہے تھے اور اپنی ٹانگوں سے چل رہے تھے۔

"وَتَرَكْنَا یُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا": اور ہم نے اپنے کپڑوں اور دیگر سامان کی حفاظت کے لیے یوسف کو اس سامان کے پاس چھوڑ دیا۔ "فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَمَاۤ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِیْنَ": سو یوسف کو بھیڑیے نے کھا لیا اور آپ ہماری تصدیق کرنے والے نہیں ہیں خواہ ہم اپنے قول میں صادق ہوں۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام سے کیسے کہا کہ آپ کسی صادق کی تصدیق نہیں کریں گے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اُن کی بات کا مطلب یہ تھا کہ آپ حضرت یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں ہم پر تہمت لگائیں گے، کیونکہ ابتداء میں بھی آپ کو ہم پر خطرہ تھا اور اُن کے معاملہ میں آپ نے ہم پر تہمت لگائی تھی۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ آپ ہماری تصدیق اس لیے نہیں کریں گے، کیونکہ ہمارے پاس اپنے صدق پر کوئی دلیل نہیں ہے، اگرچہ اللہ کے نزدیک ہم صادق ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور وہ یوسف کی قمیص پر جھوٹا خون لگا کر لائے تھے، (یعقوب نے اُن سے) فرمایا: "بلکہ تمہارے دلوں نے بچنے کا ایک بہانہ گھڑ لیا، سو صبر کرنا ہی بہت بہتر ہے، اور تم جو کچھ بیان کر رہے ہو، اس کے متعلق میں اللہ ہی سے مدد طلب کرنے والا ہوں"O (یوسف: ۱۸)

"وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِیْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ": یعنی وہ حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص پر جھوٹا خون لگا کر آئے تھے، کیونکہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کا خون نہیں تھا۔ اور اس قصہ میں مذکور ہے کہ انہوں نے اس قمیص کو خون کے ساتھ لتھیڑ دیا اور قمیص کو پھاڑا نہیں تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: بھیڑیے نے اس کو کیسے کھایا، حالانکہ اس کی قمیص تو کہیں سے پھٹی ہوئی نہیں ہے، تب حضرت یعقوب علیہ السلام نے اُن پر حضرت یوسف علیہ السلام کے قتل کی تہمت لگائی اور فرمایا:

"قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ": یعنی تم نے اپنے پاس سے ایک جھوٹا بہانہ گھڑ لیا ہے۔ پس میرا کام تو صبر جمیل کرنا ہے یا مجھ پر صبر جمیل کرنا لازم ہے، یا میں صبر جمیل کو اختیار کرتا ہوں۔ اور "صبر جمیل" وہ صبر ہوتا ہے جس میں نہ مصیبت کی شکایت ہوتی ہے اور نہ اس کے خلاف فریاد ہوتی ہے۔

"وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ": میں تمہارے جھوٹ پر صبر کر کے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتا ہوں۔

اور اس قصہ میں مذکور ہے کہ وہ ایک بھیڑیے کو لے کر آئے اور کہا: اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کھایا ہے، تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھیڑیے سے کہا: تو نے میرے بیٹے کو اور میرے دل کے ٹکڑے کو کھا لیا؟ تو اللہ تعالیٰ نے اس بھیڑیے کو گویائی بخشی، اس نے کہا: اللہ کی قسم! میں نے تو آپ کے بیٹے کے چہرے کو دیکھا تک نہیں، حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا: پس تم سرزمین کنعان میں

کیسے پہنچے؟ اس نے کہا: میرے رشتہ داروں نے میرا انکار کیا، پھر حضرت یوسف علیہ السلام کنویں میں تین دن تک رہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور ایک قافلہ آیا، سو انہوں نے پانی منگانے کے لیے کسی کو کنویں پر بھیجا، اس نے کنویں میں اپنا ڈول لٹکایا، کہا: تمہیں خوش خبری ہو، یہ ایک (خوبصورت) لڑکا ہے، اور یوسف کو مالِ تجارت بنا کر چھپا لیا، اور اللہ اُن کے کیے ہوئے کاموں کو خوب جاننے والے ہیں O'' (یوسف: ۱۹)

''وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ'': سیارہ اُن لوگوں کو کہتے ہیں جو سفر کرتے ہیں، کیونکہ زمین کے ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ تک وہ سفر کرتے ہیں، اور وہ مدین سے مصر کی طرف جا رہے تھے، پس وہ راستہ بھول گئے اور اس کنویں کے قریب اترے، اور وہ کنواں آبادی سے دور جگہ پر تھا، وہاں چرواہوں اور راہگیروں کا گزر نہیں ہوتا تھا، اور اس کا پانی کھارا تھا، تو جب حضرت یوسف علیہ السلام کو اس کنویں میں ڈالا گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کنویں کو میٹھا بنا دیا۔ پس جب وہ لوگ اس جگہ پہنچے تو انہوں نے اہلِ مدین میں سے ایک مرد کو اس کنویں سے پانی لینے کے لیے بھیجا جس کا نام مالک بن ذعر تھا۔

''فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ'': وارد اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنی جماعت کے لوگوں کا پیش رو ہو۔ اور وہ کنویں سے پانی نکالنے کے لیے رسی اور ڈول مہیا کرے۔

''فَأَدْلٰى دَلْوَهٗ'': اس نے رسی کنویں میں ڈالی تو حضرت یوسف علیہ السلام اُس رسی کے ساتھ لٹک گئے اور جب وہ کنویں سے باہر آئے تو دنیا کے حسین ترین لڑکے تھے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے معراج کی ایک طویل حدیث کے ضمن میں یہ ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پس اچانک میں یوسف صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا اور یہ وہ شخص تھے جن کو کائنات کا آدھا حسن عطا فرمایا گیا تھا۔ الحدیث

(صحیح مسلم: ۱۶۲، الرقم المسلسل: ۴۰۹، رقم حدیث الباب: ۲۵۹، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۷ ص ۲۸، المستدرک للحاکم ج ۲ ص ۵۷۰، الوسیط للواحدی ج ۲ ص ۸۸)

کہا جاتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ حسن و جمال اپنی دادی حضرت سارہ سے پایا، اور اُن کو حسن کا چھٹا حصہ عطا فرمایا گیا تھا۔ ابن اسحاق نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام اور اُن کی والدہ دو تہائی حسن کو لے گئے تھے۔

پھر جب مالک بن ذعر نے اُن کو دیکھا تو کہا: ''يٰبُشْرٰى'' یعنی کنویں سے پانی لانے والے نے اپنے اصحاب کو بشارت دی اور کہا: تم خوش خبری قبول کرو۔

''هٰذَا غُلٰمٌ'' یہ ایک لڑکا ہے۔ اور ابن مجاہد نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں سے نکالا گیا تھا تو کنویں کی دیواریں حضرت یوسف علیہ السلام کے فراق پر رو رہی تھیں۔

''وَأَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً'': اور انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو چھپا لیا۔ مجاہد نے کہا: مالک بن ذعر نے اُن کو چھپا لیا تھا اور اس کے اصحاب تاجر لوگ تھے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کو چھپا لیا تھا اور انہوں نے ان قافلہ والوں سے کہا: یہ ہمارا غلام ہے جو ہم سے بھاگ گیا تھا۔

''وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ'': پھر یہوذا اپنی عادت کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں کھانا پہنچانے کے لیے آیا تو

انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں نہ پایا، تو پھر یہوذا نے اپنے بھائیوں کو خبر پہنچائی کہ حضرت یوسف علیہ السلام اس کنویں میں نہیں ہیں، پس انہوں نے ان کو تلاش کیا تو انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو مالک بن ذعر اور اس کے اصحاب کے پاس پایا تو وہاں پر حضرت یوسف علیہ السلام تھے، ان کے بھائیوں نے کہا: یہ ہمارا غلام ہے جو ہم سے بھاگ چکا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دھمکایا حتیٰ کہ انہوں نے اُن کا حال نہیں بتایا، پھر انہوں نے قافلہ والوں کے ہاتھ حضرت یوسف علیہ السلام کو فروخت کر دیا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''یوسف کے بھائیوں نے یوسف کو انتہائی کم قیمت چند دراہم کے عوض بیچ ڈالا، اور وہ پہلے بھی یوسف میں کوئی رغبت کرنے والے نہ تھے O'' (یوسف:۲۰)

''وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ '': الضحاک، مقاتل اور السدی نے کہا کہ انہوں نے ایک حرام قیمت کے عوض حضرت یوسف علیہ السلام کو فروخت کیا، کیونکہ آزاد کی قیمت حرام ہے۔ اور حرام چیز کو 'بخس'' فرمایا، کیونکہ اس سے برکت چھین لی جاتی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: ''بِثَمَنٍ بَخْسٍ '' کا معنی ہے: کھوٹے سکے کے عوض بیچ ڈالا۔ عکرمہ اور شعبی نے کہا ہے: تھوڑی قیمت کے عوض بیچ دیا۔

''دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ '': یعنی بہت کم دراہم کے عوض بیچ دیا، کیونکہ اس زمانہ میں جس کی قیمت چالیس درہم سے کم ہو اس کا وزن نہیں کرتے تھے، اس کو صرف گنتی سے شناخت کرتے تھے۔ پس جب اس کی قیمت چالیس درہم کو پہنچ جائے تو وہ اس کا وزن کرتے تھے۔ اور اُن دراہم کے عدد میں بھی اختلاف ہے، حضرت ابن عباس، ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور قتادہ نے کہا: وہ بیس درہم تھے، ان کے بھائیوں نے آپس میں، دو، دو درہم بانٹ لیے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے خریداروں کا قصہ

''وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ '': یعنی وہ حضرت یوسف علیہ السلام میں رغبت کرنے والے نہ تھے، کیونکہ ان کو معلوم نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حضرت یوسف علیہ السلام کا کتنا بڑا مرتبہ ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وہ اس قیمت میں رغبت کرنے والے نہ تھے، کیونکہ ان کا مقصد پیسوں کا حصول نہیں تھا، ان کا مقصد یہ تھا کہ یوسف کو ان کے والد سے دور کر دیا جائے۔ پھر مالک بن ذعر اور اس کے اصحاب حضرت یوسف علیہ السلام کو لے گئے تو حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اس کا پیچھا کیا۔ پھر وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو لے گئے حتیٰ کہ مصر پہنچ گئے، پھر مالک بن ذعر نے اُن کو خریدنے پر پیش کیا، پس قطفیر نے ان کو خرید لیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ قطفیر اس ملک کا بادشاہ تھا اور وہ مصر کے خزانوں پر قابض تھا اور اس کا لقب العزیز تھا۔ اور اس زمانے میں مصر اور اس کے مضافات الریان بن الولید بن شروان کی حکومت میں تھے اور وہ العمالقہ میں سے تھا۔

اور ایک قول یہ ہے کہ وہ بادشاہ اس وقت تک نہیں مرا جب تک کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام پر ایمان نہیں لایا اور اُن کے دین کی پیروی نہیں کی، پھر وہ بادشاہ مر گیا اور حضرت یوسف علیہ السلام زندہ تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: جب وہ لوگ مصر میں داخل ہوئے تو قطفیر کی مالک بن ذعر سے ملاقات ہوئی، اس نے

مالک بن ذعر سے حضرت یوسف علیہ السلام کو بیس دینار کے عوض خرید لیا اور جوتے کا ایک جوڑا دیا اور دو سفید کپڑے دیے۔

اور وہب بن منبہ نے کہا کہ وہ سیارہ حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر میں لے کر آئے، پس ان کو لے کر بازار میں داخل ہوگئے اور اُن کو خریداری کے لیے پیش کر دیا، تو اُن کی قیمت بڑھنے لگی حتیٰ کہ ان کی قیمت یہاں تک پہنچی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے وزن کے برابر سونا اور چاندی دی جائے، اور ان کی عمر تیرہ سال تھی۔ پس قطفیر نے مالک بن ذعر سے اس قیمت پر اُن کو خرید لیا۔

(معالم التنزیل ج ۲ ص ۴۷۷ ـ ۴۸۲، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

وَقَالَ الَّذِی اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖۤ اَكْرِمِیْ مَثْوٰىهُ عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ ٘ وَ لِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ؕ وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾

اور مصر کے جس شخص نے یوسف کو خریدا تھا اس نے اپنی بیوی سے کہا: "ان کی رہائش تکریم کے ساتھ کرنا، ہو سکتا ہے کہ یہ ہم کو فائدہ پہنچائیں یا ہم ان کو اپنا بیٹا بنالیں"، اور اس طرح ہم نے یوسف کو اس سرزمین میں بلند مقام عطا فرمایا اور تاکہ ہم ان کو خوابوں کی تعبیر کا علم سکھائیں، اور اللہ اپنے فیصلوں کو نافذ فرمانے پر غالب ہیں، لیکن اکثر لوگ ناواقف ہیں O

وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۲۲﴾

اور جب یوسف اپنی جوانی کی عمر کو پہنچے تو ہم نے انہیں حکمت اور شریعت کا علم عطا فرمایا، اور ہم نیکی کرنے والوں کو ایسا ہی صلہ عطا فرماتے ہیں O

وَ رَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَ غَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَ قَالَتْ هَیْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

اور وہ جس عورت کے گھر میں تھے اس نے انہیں اپنی نفسانی خواہش پوری کرنے پر راغب کیا اور اس نے گھر کے دروازے بند کر دیے اور کہنے لگی: "اب آجاؤ" یوسف نے کہا: "اللہ کی پناہ، بے شک عزیز مصر نے تو میری رہائش کا نہایت عمدہ انتظام کیا ہے" بے شک اپنی جان پر ظلم کرنے والے کبھی کامیاب نہیں ہوتے O

وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَ هَمَّ بِهَا لَوْ لَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ ﴿۲۴﴾

اور بے شک اس عورت نے تو اُن کا ارادہ کر لیا تھا اور اگر انہوں نے اپنے رب کی مضبوط دلیل نہ دیکھی ہوتی تو وہ بھی اس کی طرف راغب ہو جاتے، اسی طرح ہم اُن سے برائی اور بے حیائی کو دور فرما رہے تھے، بے شک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھے O

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾

اور وہ دونوں دروازے کی طرف دوڑے، اس عورت نے ان کی قمیص پیچھے سے پھاڑ دی اور ان دونوں نے اس عورت کے شوہر کو دروازہ کے ساتھ کھڑا پایا، اس عورت نے کہا: جس شخص نے آپ کی اہلیہ کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا ہے اس کی اس کے سوا کیا سزا ہوگی کہ اس کو قید کر دیا جائے یا اس کو دردناک عذاب میں مبتلاء کیا جائے O

قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۶﴾

یوسف نے کہا: "یہی عورت مجھے اپنی نفسانی خواہش پوری کرنے کی طرف راغب کر رہی تھی، اور اس کے گھر والوں میں سے بھی ایک گواہ نے گواہی دی، کہ اگر یوسف کی قمیص سامنے کی جانب سے پھٹی ہوئی ہے تو وہ عورت سچی ہے اور یوسف غلط بات کرنے والوں میں سے ہیں O"

وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۷﴾

"اور اگر یوسف کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے تو اس عورت نے جھوٹی تہمت لگائی، اور یوسف سچوں میں سے ہیں O"

فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾

پھر جب عزیز مصر نے دیکھا کہ یوسف کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی تھی تو اس نے کہا: "یہ تم عورتوں کا مکر و فریب ہے، بے شک تمہارا مکر و فریب بہت خطرناک ہوتا ہے O"

يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ٚ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۖ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ﴿۲۹﴾

اے یوسف! آپ اس سے درگزر کریں، اور اے عورت! تم اپنے گناہ کی معافی طلب کرو، بے شک تم ہی خطا کاروں میں سے تھیں O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور مصر کے جس شخص نے یوسف کو خریدا تھا اس نے اپنی بیوی سے کہا: "ان کی رہائش تکریم کے ساتھ کرنا، ہو سکتا ہے کہ یہ ہم کو فائدہ پہنچائیں یا ہم ان کو اپنا بیٹا بنالیں"، اور اس طرح ہم نے یوسف کو اس سرزمین میں بلند مقام عطا فرمایا اور تاکہ ہم ان کو خوابوں کی تعبیر کا علم سکھائیں، اور اللہ اپنے فیصلوں کو نافذ فرمانے پر غالب ہیں، لیکن اکثر لوگ ناواقف ہیں O" (یوسف:۲۱)

علامہ ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ، یوسف: ۲۱ تا ۲۹ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَقَالَ الَّذِی اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖٓ": عزیز مصر کی بیوی کا نام راعیل ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا نام زلیخا تھا۔

"اَكْرِمِیْ مَثْوٰىهُ": یعنی یوسف کے ٹھہرنے کا باعزت جگہ اہتمام کرنا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ان کے کھانے پینے اور ان کے لباس اور ان کے مقام کا بہت اچھا انتظام کرنا۔ "عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ": یعنی اگر ہم ان کو فروخت کرنے کا ارادہ کریں تو ہوسکتا ہے کہ ہم ان کو اچھے نفع کے ساتھ فروخت کردیں۔ یا جب یہ بڑے ہوجائیں تو ہمارے اہم کاموں میں ہماری معاونت کریں۔

"اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا": یا ہم ان کو اپنا بیٹا بنالیں۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تمام لوگوں میں سب سے زیادہ فراست والے تین لوگ ہیں:

(۱) عزیز مصر، جس نے یوسف کے متعلق اپنی بیوی سے کہا: ان کو باعزت مقام پر ٹھہرانا، ہوسکتا ہے کہ یہ ہم کو نفع پہنچائیں۔

(۲) حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی، جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق اپنے والد سے عرض کیا: اے ابا جان! ان کو اجرت پر ملازم رکھ لیں۔

(۳) اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق فراست سے جانتے تھے، اس لئے انہوں نے کہا: آپ ان کو خلیفہ بنائیں۔

"وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ": الارض سے مراد مصر کی سرزمین ہے۔ (جیسا کہ ہم نے یوسف کو بھائیوں کے قتل کرنے سے بچایا تھا اور ہم نے اُن کو اندھے کنویں سے نکالا تھا) اسی طرح مصر کی سرزمین میں ان کو بلندی عطا فرمائی اور ان کو مصر کے خزانوں پر مقرر فرمادیا۔

"وَ لِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ": یعنی ہم نے اُن کو مصر کی سرزمین میں جگہ عطا فرمائی تاکہ ہم اُن کو خوابوں کی تعبیر کا علم عطا فرمائیں۔

"وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ": یعنی اللہ تعالیٰ اپنے فیصلوں کو پورا فرمانے پر غالب ہیں، وہ جس طرح چاہیں اپنے فیصلہ کو نافذ فرمائیں اور اُن کے فیصلہ کو کوئی رد نہیں کرسکتا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف راجع ہے اور اس کا معنی ہے کہ بے شک اللہ عزوجل تدبیر کے ساتھ حضرت یوسف علیہ السلام کے معاملہ کو پورا فرمانے والے ہیں۔

"وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ": لیکن اکثر لوگ اللہ تعالیٰ کی توحید سے واقف نہیں ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور جب یوسف اپنی جوانی کی عمر کو پہنچے تو ہم نے انہیں حکمت اور شریعت کا علم عطا فرمایا، اور ہم نیکی کرنے والوں کو ایسا ہی صلہ عطا فرماتے ہیں O" (یوسف: ۲۲)

"وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ": یعنی جب یوسف اپنی قوت اور اپنے شباب کی انتہاء کو پہنچے۔

مجاہد نے کہا: جب اُن کی عمر تینتیس سال کی ہوئی۔ اور السدی نے کہا: جب اُن کی عمر تیس سال کی ہوئی۔ اور الضحاک نے کہا: جب اُن کی عمر بیس سال کی ہوئی۔ الکلبی نے کہا: اٹھارہ سال سے لے کر تیس سال کی عمر تک کو الاشد کہا جاتا ہے۔

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے اشد کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا: وہ بردباری ہے۔

"اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا": حکم سے مراد نبوت ہے اور علم سے مراد دین میں تفقہ ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ حکم سے مراد صحیح قول کرنا

ہے اور خوابوں کی تعبیر کا علم ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ الحکیم اور العالم کے درمیان فرق یہ ہے کہ عالم وہ شخص ہے جس کو چیزوں کا علم ہو اور حکیم وہ شخص ہے جو اپنے علم کے تقاضا کے مطابق عمل کرتا ہو۔

"وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس آیت میں اَلْمُحْسِنِیْنَ سے مراد المومنین ہیں۔ اور ان سے دوسرا قول یہ منقول ہے کہ اس سے مراد المہتدین ہیں۔ الضحاک نے کہا: اس سے مراد صابرین ہیں جو مصائب پر اس طرح صبر کریں جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے مصائب پر صبر کیا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور وہ جس عورت کے گھر میں تھے اس نے انہیں اپنی نفسانی خواہش پوری کرنے پر راغب کیا اور اس نے گھر کے دروازے بند کر دیئے اور کہنے لگی: "اب آ جاؤ" یوسف نے کہا: "اللہ کی پناہ، بے شک عزیز مصر نے تو میری رہائش کا نہایت عمدہ انتظام کیا ہے" بے شک اپنی جان پر ظلم کرنے والے کبھی کامیاب نہیں ہوتے O" (یوسف: ۲۳)

"وَ رَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ": یعنی عزیزِ مصر کی بیوی نے اور "مُرَاوَدَة" کا معنی ہے فعل کو طلب کرنا، اور یہاں یہ مراد ہے کہ اس عورت نے یوسف کو اپنی نفسانی خواہش پوری کرنے کے لیے دعوت دی تاکہ یوسف شہوت کے تقاضوں کو پورا کریں۔

"وَ غَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ": اور اس نے دروازوں کو بند کر دیا، اور یہ سات دروازے تھے۔

"وَ قَالَتْ هَیْتَ لَكَ": اور کہا: آؤ۔ اور قتادہ نے اس کو پڑھا ہے "هِیْتُ لَكَ"۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "هَیْتَ لَكَ" پڑھایا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: "هَیْتَ لَكَ" اور کہا: ہم اس کو اس طرح پڑھتے ہیں جس طرح ہمیں اس کی تعلیم دی گئی۔ مَثْوَاهُ اس کا معنی ہے: ان کا مقام اور مرتبہ۔ (صحیح البخاری: ۴۶۹۲)

"قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ": یعنی یوسف نے اس موقع پر کہا: تم جس کام کی طرف مجھے دعوت دے رہی ہو، میں اس کام سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتا ہوں۔

"اِنَّهٗ رَبِّیْ": حضرت یوسف علیہ السلام کی مراد یہ تھی کہ تمہارا خاوند قطفیر میرا سید ہے یعنی میرا مالک اور محسن ہے۔

"اَحْسَنَ مَثْوَایَ": اس نے مجھے باعزت ٹھہرنے کی جگہ فراہم کی ہے۔

اکثر مفسرین کا یہی مختار ہے۔ اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کی مراد یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ اُن کے رب ہیں، انہوں نے ان پر احسان فرمایا اور ٹھہرنے کی باعزت جگہ عطا فرمائی، اور مجھے کنویں کی مصیبت سے عافیت میں رکھا۔

"اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ": یعنی اگر میں نے یہ بے حیائی کا کام کر کے عزیزِ مصر کی اہلیہ میں خیانت کی جب کہ اس نے مجھے ٹھہرنے کا باعزت مقام فراہم کیا تھا تو میں اپنی جان پر ظلم کرنے والا ہوں گا اور جان پر ظلم کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ فلاح نہیں پہنچاتے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "بے شک اس عورت نے تو اُن کا ارادہ کرلیا تھا اور اگر انہوں نے اپنے رب کی مضبوط دلیل نہ دیکھی ہوتی تو وہ بھی اس کی طرف راغب ہو جاتے، اسی طرح ہم اُن سے برائی اور بے حیائی کو دور فرما رہے تھے، بے شک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھے O" (یوسف: ۲۴)

"وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا": الھم کا معنی ہے کسی کام کو کرنے کے قریب ہونا، جبکہ اس کام کو کیا نہ گیا ہو۔ اس عورت کا ھم اور اس کا عزم معصیت اور زنا تھا۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام کا "ھم" اس کام سے بچنا تھا۔

اور امام ابن اسحاق نے کہا: جب عزیز مصر کی بیوی حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کر رہی تھی تو وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے محاسن بیان کرتی اور اُن کی طرف پر شوق نگاہوں سے دیکھتی، اس نے کہا: اے یوسف! تمہارے بال کتنے حسین ہیں، تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: یہ بال سب سے پہلے میرے جسم سے جدا کیے جائیں گے، اس نے کہا: آپ کی آنکھیں کتنی حسین ہیں، حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: قبر میں سب سے پہلے یہ میری آنکھیں بہہ کر میرے چہرہ پر آئیں گی، اس نے کہا: آپ کا چہرہ کتنا خوبصورت ہے، حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: یہ مٹی کے لیے ہے، مٹی اس کو کھا لے گی۔ ایک قول یہ ہے کہ اس نے کہا: یہ ریشم کا بستر میں نے تمہارے لیے بچھایا ہے، آؤ اور اپنی خواہش پوری کر لو۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: پھر میرا حصہ جنت سے دور ہو جائے گا۔ پس وہ برابر حضرت یوسف علیہ السلام کو جسمانی لذت کی طرف دعوت دیتی رہی اور حضرت یوسف علیہ السلام نوجوان تھے اور وہ خوبصورت عورت تھی۔ اور قریب تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام اس کی طرف راغب ہو جاتے، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندہ کو اور اپنے نبی کو اس دلیل کے ساتھ بچا لیا جس کا ذکر فرمایا ہے۔

اور بعض متاخرین نے کہا کہ اس قسم کا ارادہ انبیاء علیہم السلام کی شان کے لائق نہیں ہے۔ اور یہ آیت "وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ" پر پوری ہو گئی، پھر دوبارہ حضرت یوسف علیہ السلام کی خبر کو بیان فرمایا: "وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ" یعنی اگر یوسف نے اپنے رب کی برہان نہ دیکھی ہوتی تو وہ بھی راغب ہو جاتے، لیکن چونکہ انہوں نے اپنے رب کی برہان دیکھی تھی اور اُن کو معلوم تھا کہ کن کاموں سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں، اور پھر دوبارہ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو بیان فرمایا۔

اور بعض اہل حقائق نے کہا ہے کہ "ھم" کی دو قسمیں ہیں، ایک "ھم" ثابت ہے جب اس "ھم" کے ساتھ عزم، عقد اور رضا بھی ہو جیسے عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام کا "ھم" کیا تھا، اور ایک "ھم" وہ ہے جو دل میں کسی برے کام کا خطرہ آئے اور بغیر انسان کے اختیار کے اس کے دل میں کوئی بات آئے۔ اور اس پر بندہ سے مواخذہ نہیں ہوتا۔ اور جب تک بندہ اس کے موافق کلام نہ کرے یا کوئی عمل نہ کرے اس سے مواخذہ نہیں ہوتا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں: "جب میرا بندہ کسی برے کام کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اس کے اس برے کام کو اس وقت تک نہ لکھو جب تک کہ وہ اس پر عمل نہ کرلے، پس اگر وہ اس برائی کا عمل کرلے تو اس کی ایک برائی لکھ دو، اور اگر اس برے کام کو میرے خوف کی وجہ سے ترک کردے تو اس کے لیے ایک نیکی لکھ دو، اور جب وہ اس نیک کام کو کرنے کا ارادہ کرے اور اس نیکی پر عمل نہ کرے تو اس کے لیے

ایک نیکی لکھ دو، اگر وہ اس نیکی کا عمل کرلے تو اس بندہ کے لیے اس نیکی کی دس مثلیں سات سو سے لے کر چودہ سو تک لکھ دو۔

(صحیح مسلم: ۱۲۹، سنن ترمذی: ۳۰۷۳، مسند احمد: ۹۰۷۰)

سو اس قصہ میں زلیخا نے تو حضرت یوسف علیہ السلام سے شہوت براری کا "ھمّ" کرلیا تھا، یعنی قصد کرلیا تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام بھی اس کا "ھمّ" کرلیتے، یعنی برائی کا قصد کرلیتے اگر انہوں نے اپنے رب کی برہان نہ دیکھی ہوتی۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ نے اُن کو شریعت کا علم نہ دیا ہوتا۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو علم شریعت دے کر یہ واضح فرما دیا تھا کہ کون سے کام صحیح اور جائز ہیں اور کون سے کام ناجائز اور گناہ ہیں اور اپنے نفس کی خواہش پوری کرنے کے لیے بے حیائی کا ارتکاب کرنا ہرگز جائز نہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اس عورت سے برائی کا قصد نہیں کیا، یہ ہوسکتا ہے کہ غیر اختیاری طور پر دل میں کوئی ایسا خیال آیا تو اللہ تعالیٰ نے اس سے بھی آپ کو محفوظ رکھا، کیونکہ دل میں اگر کسی کام کا خیال آئے تو بندہ سے اس وقت تک اس پر مواخذہ نہیں ہوتا جب تک وہ اس کو پورا کرنے کے لیے اپنے دل سے کوئی بات نہ کرے یا اس کے متعلق کوئی عمل نہ کرے۔ اور "ھمّ" پر مواخذہ نہیں ہوتا، مواخذہ "عزم" پر ہوتا ہے۔

"بُرْهَانَ رَبِّهٖ" کے متعلق قدیم مفسرین کی تفسیر

"لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ": اس برہان میں اختلاف ہے۔ قتادہ اور اکثر مفسرین نے کہا کہ انہوں نے اس موقع پر حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت دیکھی اور وہ حضرت یوسف علیہ السلام سے کہہ رہے تھے: اے یوسف! کیا تم جاہلوں کا سا کام کرو گے، حالانکہ تمہارا نام تو انبیاء میں لکھا ہوا ہے۔ اور حسن بصری، سعید بن جبیر، مجاہد، عکرمہ اور الضحاک نے کہا کہ اُن کے گھر کی چھت شق ہوگئی تو انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو دیکھا وہ دانتوں میں اپنی انگلی کو دبا رہے تھے۔ اور سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ اُن کے لیے حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت کی مثال بنائی گئی اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنا ہاتھ حضرت یوسف علیہ السلام کے سینہ پر مارا تو ان کی شہوت اُن کی انگلیوں کی پوروں سے نکل گئی۔ السدی نے کہا: اُن کو یہ ندا کی گئی کہ اے یوسف! تم ایسا کام کرنے لگے ہو جو تم جیسے شخص سے متصور نہیں ہے۔

قدیم مفسرین کی تفسیر پر مصنف کا تبصرہ

میں کہتا ہوں: یہ تمام روایات معتبر نہیں ہیں ورنہ کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو برائی اور بے حیائی میں مبتلاء ہونے سے ان کے والد کی مثال دکھا کر بچا لیا گیا، پس عام لوگ اگر ایسے فتنہ میں مبتلاء ہوں اور وہ اس فتنہ سے نہ بچ سکیں تو اُن کا اس میں کیا قصور ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے اس فتنہ سے بچنے میں اُن کی کیا عظمت ہے، جب کہ قرآن مجید میں یہ بتایا ہے "وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ" حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے رب کی برہان کا علم نہ ہوتا، یعنی ان کو شریعت معلوم نہ ہوتی اور انہیں یہ معلوم نہ ہوتا کہ یہ بے حیائی کا کام اللہ تعالیٰ کی سخت ناراضی کا موجب ہے جیسا کہ انہوں نے زلیخا سے کہا: "مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ"۔ تو اس موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام کا اس فحش کام میں مبتلاء نہ ہونا محض اُن کی خدا خوفی کی وجہ سے تھا، کیونکہ جب زلیخا نے ان کو دھمکی دی کہ اگر یوسف نے اس کی خواہش پوری نہیں کی تو وہ ان کو قید میں ڈلوا دے گی، اس موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: "رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ" (اے میرے رب! جس بے حیائی کے کام کی طرف یہ عورتیں مجھے دعوت

دے رہی ہیں اور اس کی دعوت قبول نہ کرنے پر مجھے قید کرنے کی دھمکی دے رہی ہیں تو اس کی خواہش پوری کرنے کی بہ نسبت مجھے قید خانہ میں رہنا پسند ہے)۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام میں خوفِ خدا کا اتنا زیادہ غلبہ تھا کہ وہ کسی طور اس بے حیائی کے کام کرنے پر تیار نہیں تھے۔ اور اسی خدا خوفی کی اللہ عزوجل نے تحسین فرمائی ہے: "اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ"، ورنہ اس سنگین صورت حال سے اپنے نفس کو بچانے میں اُن کا کوئی کردار نہ ہوتا۔

"بُرْهَانَ رَبِّهٖ" کے متعلق صدر الافاضل کی تفسیر

صدر الافاضل علامہ سید محمد نعیم الدین مراد آبادی حنفی متوفی ۱۳۶۷ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے رب کی برہان دیکھی اور اس ارادۂ فاسدہ سے محفوظ رہے اور برہان عصمتِ نبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے نفوسِ طاہرہ کو اخلاقِ ذمیمہ و افعالِ رذیلہ سے پاک پیدا کیا ہے اور اخلاقِ شریفہ طاہرہ مقدسہ پر ان کی خلقت فرمائی ہے اس لیے وہ ہر ناکردنی فعل سے باز رہتے ہیں۔

(تفسیر خزائن العرفان مع ترجمہ کنز الایمان ص ۴۴۵، مکتبۃ المدینہ کراچی، ۱۴۳۲ھ)

"بُرْهَانَ رَبِّهٖ" کے متعلق سید ابو الاعلیٰ مودودی کی تفسیر

سید ابو الاعلیٰ مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

برہان کے معنی ہیں دلیل اور حجت کے۔ رب کی برہان سے مراد خدا کی سجھائی ہوئی وہ دلیل ہے جس کی بناء پر حضرت یوسف علیہ السلام کے ضمیر نے ان کے نفس کو اس بات کا قائل کیا کہ اس عورت کی دعوتِ عیش قبول کرنا تجھے زیبا نہیں ہے۔ اور وہ دلیل تھی کیا؟ اسے پچھلے فقرے میں بیان کیا جا چکا ہے، یعنی یہ کہ "میرے رب نے تو مجھے یہ منزلت بخشی اور میں ایسا برا کام کروں، ایسے ظالموں کو کبھی فلاح نصیب نہیں ہوا کرتی"۔ یہی وہ برہانِ حق تھی جس نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو اس نوخیز جوانی کے عالم میں ایسے نازک موقع پر معصیت سے باز رکھا۔ پھر یہ جو فرمایا کہ "یوسف بھی اس کی طرف بڑھتا اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتا" تو اس سے عصمتِ انبیاء کی حقیقت پر بھی پوری روشنی پڑ جاتی ہے۔ نبی کی معصومیت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس سے گناہ اور لغزش و خطا کی قوت و استعداد سلب کر لی گئی ہے، حتیٰ کہ گناہ کا صدور اس کے امکان ہی میں نہیں رہا ہے۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ نبی اگرچہ گناہ کرنے پر قادر ہوتا ہے لیکن بشریت کی تمام صفات سے متصف ہونے کے باوجود اور جملہ انسانی جذبات، احساسات اور خواہشات رکھتے ہوئے بھی وہ ایسا نیک نفس اور خدا ترس ہوتا ہے کہ جان بوجھ کر کبھی گناہ کا قصد نہیں کرتا۔ وہ اپنے ضمیر میں اپنے رب کی ایسی زبردست حجتیں اور دلیلیں رکھتا ہے جن کے مقابلے میں خواہشِ نفس کبھی کامیاب نہیں ہونے پاتی۔ اور اگر نادانستہ اس سے کوئی لغزش سرزد ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ فوراً وحی جلی کے ذریعے اس کی اصلاح فرما دیتے ہیں، کیونکہ اس کی لغزش تنہا ایک شخص کی لغزش نہیں ہے، ایک پوری امت کی لغزش ہے۔ وہ راہِ راست سے بال برابر ہٹ جائے تو دنیا گمراہی میں میلوں دور نکل جائے۔

اس ارشاد کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ اس کا دلیلِ رب کو دیکھنا اور گناہ سے بچ جانا ہماری توفیق و ہدایت سے ہوا، کیونکہ ہم اپنے اس منتخب بندے سے بدی اور بے حیائی کو دور کرنا چاہتے تھے۔ دوسرا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے، اور یہ زیادہ گہرا مطلب ہے کہ یوسف کو یہ معاملہ جو پیش آیا تو یہ بھی دراصل ان کی تربیت کے سلسلے میں ایک ضروری مرحلہ تھا۔ ان کو بدی اور بے

حیائی سے پاک کرنے اور ان کی طہارتِ نفس کو درجۂ کمال پر پہنچانے کے لیے مصلحتِ الٰہی میں یہ ناگزیر تھا کہ ان کے سامنے معصیت کا ایک ایسا نازک موقع پیش آئے اور اس آزمائش کے وقت وہ اپنے ارادے کی پوری طاقت پرہیز گاری و تقویٰ کے پلڑے میں ڈال کر اپنے نفس کے برے میلانات کو ہمیشہ کے لیے قطعی طور پر شکست دے دیں۔ خصوصیت کے ساتھ اس مخصوص طریقۂ تربیت کے اختیار کرنے کی مصلحت اور اہمیت اس اخلاقی ماحول کو نگاہ میں رکھنے سے بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے جو اس وقت کی مصری سوسائٹی میں پایا جاتا تھا۔ آگے رکوع ۴ میں اس ماحول کی جو ایک ذرا سی جھلک دکھائی گئی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت کے "مہذب مصر" میں بالعموم اور اس کے اونچے طبقے میں بالخصوص صنفی آزادی قریب قریب اسی پیمانے پر تھی جس پر ہم اپنے زمانے کے اہل مغرب اور مغرب زدہ طبقوں کو "فائز" پا رہے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو ایسے بگڑے ہوئے لوگوں میں رہ کر کام کرنا تھا، اور کام بھی ایک معمولی آدمی کی حیثیت سے نہیں بلکہ فرماں روائے ملک کی حیثیت سے کرنا تھا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جو خواتین کرام ایک حسین غلام کے آگے بچھی جارہی تھیں، وہ ایک جوان اور خوب صورت فرماں روا کو پھانسنے اور بگاڑنے کے لیے کیا نہ کر گزرتیں۔ اسی کی پیش بندی اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمائی کہ ایک طرف تو ابتداء ہی میں اس آزمائش سے گزار کر حضرت یوسف علیہ السلام کو پختہ فرمادیا، اور دوسری طرف خود خواتینِ مصر کو بھی ان سے مایوس کر کے ان کے سارے فتنوں کا دروازہ بند کر دیا۔

(تفہیم القرآن ج ج دوم ص ۳۹۳۔ ۳۹۴، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور)

"هَمَّ بِهَا" کے متعلق حضرت ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری کی تفسیر

ضیاء الامت حضرت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری حنفی متوفی ۱۴۱۸ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یہ آیت بڑی معرکۃ الآراء ہے۔ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ اس کے متعلق تفصیل سے لکھا جائے تاکہ حقیقت منکشف ہو اور کسی قسم کا شبہ دل میں خلجان پیدا نہ کرے۔ اس آیت میں "هَمَّ" کا لفظ دو دفعہ مذکور ہے لیکن دونوں کے فاعل جدا جدا ہیں۔ "هَمَّتْ" کا فاعل عزیز کی بیوی ہے اور دوسرے "هَمَّ" کا فاعل حضرت یوسف ہیں۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ دونوں فعل ایک ہی معنی میں مستعمل ہوئے ہیں یا "هَمَّتْ" فعل کا معنی اور ہے اور "هَمَّ" کا اور ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ "هَمَّ بِهَا" مستقل جملہ ہے اور "لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ" شرط ہے اور اس کی جزا محذوف ہے۔ اس جملہ شرطیہ کا پہلے کلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اس رائے کے حاملین پھر اس بات میں باہم مختلف ہیں کہ کیا ان دونوں فعلوں کا ایک ہی معنی ہے یا الگ الگ۔ ان میں سے ایک جماعت کا خیال ہے کہ "هَمَّتْ" کا معنی ہے کسی چیز کا عزم اور قصد کرنا اور "هَمَّ بِهَا" میں عزم و قصد کا معنی نہیں بلکہ محض میلانِ طبع مراد ہے۔ ان کے خیال کے مطابق آیت کا معنی یہ ہوگا کہ زلیخا نے تو اس حرکت کے ارتکاب کا عزم مصمم کیا لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں محض میلانِ طبع کا ظہور ہوا لیکن یہ معنی بیان کرنے میں لغت سے زیادہ عقیدت کو دخل ہے۔ جو شخص حضرت یوسف علیہ السلام کی نبوت کا قائل نہیں یا نبی کا معصوم ہونا ضروری نہیں سمجھتا، اس کو آپ کیسے مطمئن کریں گے۔ اگر وہ یہ اصرار کرے کہ پہلا فعل جس کا اسناد زلیخا کی طرف ہے، اس کا معنی محض میلانِ طبع ہے اور دوسرے فعل کا معنی عزم و قصد ہے تو ہم اسے کیونکر قائل کر سکیں گے۔ دوسری جماعت کا خیال ہے کہ دونوں کا معنی ایک ہے، یعنی کسی کام کے کرنے کا عزم اور قصد کرنا۔ وہ کہتے ہیں: زلیخا نے بھی اس فعل کا قصد و عزم کیا اور آپ بھی (نعوذ باللہ) بالکل تیار ہو گئے۔ لیکن اس سے ملوث نہیں ہوئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی دلیل نمودار ہو گئی

دے رہی ہیں اور اس کی دعوت قبول نہ کرنے پر مجھے قید کرنے کی دھمکی دے رہی ہیں، تو اس کی خواہش پوری کرنے کی بہ نسبت مجھے قید خانہ میں رہنا پسند ہے)۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام میں خوفِ خدا کا اتنا زیادہ غلبہ تھا کہ وہ کسی طور اس بے حیائی کے کام کرنے پر تیار نہیں تھے۔ اور اسی خدا خوفی کی اللہ عزوجل نے تحسین فرمائی ہے: "اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ" ورنہ اس سنگین صورتِ حال سے اپنے نفس کو بچانے میں اُن کا کوئی کردار نہ ہوتا۔

"بُرْهَانَ رَبِّهٖ" کے متعلق صدر الافاضل کی تفسیر

صدر الافاضل علامہ سید محمد نعیم الدین مراد آبادی حنفی متوفی ۱۳۶۷ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے رب کی برہان دیکھی اور اس ارادۂ فاسدہ سے محفوظ رہے اور برہان عصمتِ نبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے نفوسِ طاہرہ کو اخلاقِ ذمیمہ و افعالِ رذیلہ سے پاک پیدا کیا ہے اور اخلاقِ شریفہ طاہرہ مقدسہ پر ان کی خلقت فرمائی ہے اس لیے وہ ہر ناکردنی فعل سے باز رہتے ہیں۔

(تفسیر خزائن العرفان مع ترجمہ کنز الایمان ص ۴۴۵، مکتبۃ المدینہ، کراچی، ۱۴۳۲ھ)

"بُرْهَانَ رَبِّهٖ" کے متعلق سید ابو الاعلیٰ مودودی کی تفسیر

سید ابو الاعلیٰ مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

برہان کے معنی ہیں دلیل اور حجت کے۔ رب کی برہان سے مراد خدا کی سجھائی ہوئی وہ دلیل ہے جس کی بناء پر حضرت یوسف علیہ السلام کے ضمیر نے ان کے نفس کو اس بات کا قائل کیا کہ اس عورت کی دعوتِ عیش قبول کرنا تجھے زیبا نہیں ہے۔ اور وہ دلیل تھی کیا؟ اسے پچھلے فقرے میں بیان کیا جا چکا ہے، یعنی یہ کہ "میرے رب نے تو مجھے یہ منزلت بخشی اور میں ایسا برا کام کروں، ایسے ظالموں کو کبھی فلاح نصیب نہیں ہوا کرتی"۔ یہی وہ برہانِ حق تھی جس نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو اس نوخیز جوانی کے عالم میں ایسے نازک موقع پر معصیت سے باز رکھا۔ پھر یہ جو فرمایا کہ "یوسف بھی اس کی طرف بڑھتا اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتا" تو اس سے عصمتِ انبیاء کی حقیقت پر بھی پوری روشنی پڑ جاتی ہے۔ نبی کی معصومیت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس سے گناہ اور لغزش وخطا کی قوت و استعداد سلب کر لی گئی ہے، حتیٰ کہ گناہ کا صدور اس کے امکان ہی میں نہیں رہا ہے۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ نبی اگرچہ گناہ کرنے پر قادر ہوتا ہے لیکن بشریت کی تمام صفات سے متصف ہونے کے باوجود اور جملہ انسانی جذبات، احساسات اور خواہشات رکھتے ہوئے بھی وہ ایسا نیک نفس اور خدا ترس ہوتا ہے کہ جان بوجھ کر کبھی گناہ کا قصد نہیں کرتا۔ وہ اپنے ضمیر میں اپنے رب کی ایسی ایسی زبردست حجتیں اور دلیلیں رکھتا ہے جن کے مقابلے میں خواہشِ نفس کبھی کامیاب نہیں ہونے پاتی۔ اور اگر نادانستہ اس سے کوئی لغزش سرزد ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ فوراً وحیِ جلی کے ذریعے اس کی اصلاح فرما دیتے ہیں، کیونکہ اس کی لغزش تنہا ایک شخص کی لغزش نہیں ہے، ایک پوری امت کی لغزش ہے۔ وہ راہِ راست سے بال برابر ہٹ جائے تو دنیا گمراہی میں میلوں دور نکل جائے۔

اس ارشاد کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ اس کا دلیلِ رب کو دیکھنا اور گناہ سے بچ جانا ہماری توفیق وہدایت سے ہوا، کیونکہ ہم اپنے اس منتخب بندے سے بدی اور بے حیائی کو دور کرنا چاہتے تھے۔ دوسرا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے، اور یہ زیادہ گہرا مطلب ہے کہ یوسف کو یہ معاملہ جو پیش آیا تو یہ بھی دراصل ان کی تربیت کے سلسلے میں ایک ضروری مرحلہ تھا۔ ان کو بدی اور بے

خیالی سے پاک کرنے اور ان کی طہارتِ نفس کو درجۂ کمال پر پہنچانے کے لیے مصلحتِ الٰہی میں یہ ناگزیر تھا کہ ان کے سامنے معصیت کا ایک ایسا نازک موقع پیش آئے اور اس آزمائش کے وقت وہ اپنے ارادے کی پوری طاقت پرہیزگاری وتقویٰ کے پلڑے میں ڈال کر اپنے نفس کے برے میلانات کو ہمیشہ کے لیے قطعی طور پر شکست دے دیں۔ خصوصیت کے ساتھ اس مخصوص طریقۂ تربیت کے اختیار کرنے کی مصلحت اور اہمیت اس اخلاقی ماحول کو نگاہ میں رکھنے سے بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے جو اس وقت کی مصری سوسائٹی میں پایا جاتا تھا۔ آگے رکوع ۴ میں اس ماحول کی جو ایک ذرا سی جھلک دکھائی گئی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت کے "مہذب مصر" میں بالعموم اور اس کے اونچے طبقے میں بالخصوص صنفی آزادی قریب قریب اسی پیمانے پر تھی جس پر ہم اپنے زمانے کے اہل مغرب اور مغرب زدہ طبقوں کو "فائز" پا رہے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو ایسے بگڑے ہوئے لوگوں میں رہ کر کام کرنا تھا، اور کام بھی ایک معمولی آدمی کی حیثیت سے نہیں بلکہ فرماں روائے ملک کی حیثیت سے کرنا تھا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جو خواتین کرام ایک حسین غلام کے آگے بچھی جا رہی تھیں، وہ ایک جوان اور خوب صورت فرماں روا کو پھانسنے اور بگاڑنے کے لیے کیا نہ کرگزرتیں۔ اسی کی پیش بندی اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمائی کہ ایک طرف تو ابتداء ہی میں اس آزمائش سے گزار کر حضرت یوسف علیہ السلام کو پختہ فرما دیا، اور دوسری طرف خود خواتینِ مصر کو بھی ان سے مایوس کر کے ان کے سارے فتنوں کا دروازہ بند کر دیا۔

(تفہیم القرآن ج ج دوم ص ۳۹۳۔ ۳۹۴، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور)

"ہَمَّ بِهَا" کے متعلق حضرت ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری کی تفسیر

ضیاء الامت حضرت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری حنفی متوفی ۱۴۱۸ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یہ آیت بڑی معرکۃ الآراء ہے۔ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ اس کے متعلق تفصیل سے لکھا جائے تاکہ حقیقت منکشف ہو اور کسی قسم کا شبہ دل میں خلجان پیدا نہ کرے۔ اس آیت میں "ھَمّ" کا لفظ دو دفعہ مذکور ہے لیکن دونوں کے فاعل جدا جدا ہیں۔ "ھَمَّت" کا فاعل عزیز کی بیوی ہے اور دوسرے "ھَمّ" کا فاعل حضرت یوسف ہیں۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ دونوں فعل ایک ہی معنی میں مستعمل ہوئے ہیں یا "ھَمَّت" فعل کا معنی اور ہے اور "ھَمّ" کا اور ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ "ھَمَّ بِهَا" مستقل جملہ ہے اور "لَوْلَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ" شرط ہے اور اس کی جزا محذوف ہے۔ اس جملہ شرطیہ کا پہلے کلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اس رائے کے حاملین پھر اس بات میں باہم مختلف ہیں کہ کیا ان دونوں فعلوں کا ایک ہی معنی ہے یا الگ الگ۔ ان میں سے ایک جماعت کا خیال ہے کہ "ھَمَّت" کا معنی ہے کسی چیز کا عزم اور قصد کرنا اور "ھَمَّ بِهَا" میں عزم وقصد کا معنی نہیں بلکہ محض میلانِ طبع مراد ہے۔ ان کے خیال کے مطابق آیت کا معنی یہ ہوگا کہ زلیخا نے تو اس حرکت کے ارتکاب کا عزم مصمم کیا لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں محض میلانِ طبع کا ظہور ہوا لیکن یہ معنی بیان کرنے میں لغت سے زیادہ عقیدت کو دخل ہے۔ جو شخص حضرت یوسف علیہ السلام کی نبوت کا قائل نہیں یا نبی کا معصوم ہونا ضروری نہیں سمجھتا، اس کو آپ کیسے مطمئن کریں گے۔ اگر وہ یہ اصرار کرے کہ پہلا فعل جس کا اسناد زلیخا کی طرف ہے، اس کا معنی محض میلانِ طبع ہے اور دوسرے فعل کا معنی عزم وقصد ہے تو ہم اسے کیونکر قائل کر سکیں گے۔ دوسری جماعت کا خیال ہے کہ دونوں کا معنی ایک ہے، یعنی کسی کام کے کرنے کا عزم اور قصد کرنا۔ وہ کہتے ہیں: زلیخا نے بھی اس فعل کا قصد وعزم کیا اور آپ بھی (نعوذ باللہ) بالکل تیار ہو گئے۔ لیکن اس سے ملوث نہیں ہوئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی دلیل نمودار ہو گئی

تھی۔ امام فخر الدین رازی اور دیگر محققین نے ان لوگوں پر سخت تنقید کی ہے اور ان کے اس قول پر انتہائی ناگواری اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے اور اسے حضرت یوسف کے دامانِ عصمت پر ایک ناروا بہتان قرار دیا ہے۔ چونکہ حضرت امام رازی نے اس مسئلہ کو بڑی شرح وبسط سے لکھا ہے، اس لیے انہیں سے استفادہ کرتے ہوئے اس گتھی کو سلجھانے کی بتوفیق اللہ کوشش کروں گا، وہ فرماتے ہیں: "لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ"۔ اس آیت کا معنی یہ ہوگا کہ زلیخا نے تو اس فعل کا عزم مصمم کیا اور اگر یوسف برہانِ الٰہی کو نہ دیکھتے تو وہ بھی (ان انتہائی اشتعال انگیز حالات میں) اس فعل کا عزم اور قصد کرتے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آپ نے کیونکہ برہانِ الٰہی کا مشاہدہ فرمایا اس لیے ان سے اس فعل کا عزم وقصد وقوع پذیر نہیں ہوا۔ علامہ موصوف نے اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے متعدد زوردار دلائل پیش کیے ہیں، ان میں سے صرف ایک کے ذکر کرنے پر اکتفاء کروں گا، آپ فرماتے ہیں کہ آؤ ان سے پوچھیں جن کا اس واقعہ کے ساتھ براہِ راست تعلق تھا کہ کیا حضرت یوسف نے عزم وقصد کیا تھا یا نہیں، جو فیصلہ وہ دیں اس کو تسلیم کرنے میں تو کسی کو تذبذب نہیں ہونا چاہیے۔ فرماتے ہیں کہ جن کا اس واقعہ سے براہِ راست تعلق تھا، وہ یہ ہیں:

خود حضرت یوسف علیہ السلام۔ زلیخا، اس کا خاوند۔ زنانِ مصر۔ گواہ خود رب العالمین۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنا بیان یہ ہے "هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ" کہ اس نے عورت نے مجھے طرح طرح سے پھسلانا چاہا۔ پھر آپ کا یہ دعا فرمانا "رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ" اے اللہ! جس بری حرکت کی طرف مجھے وہ بلاتی ہیں اس سے تو قید خانہ زیادہ پسند ہے۔ عزیز کی بیوی نے دو بار آپ کے دامن کی پاکی کا اعتراف کیا۔ پہلی مرتبہ اس نے زنانِ مصر کے سامنے کہا "وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ" اور دوبارہ جب بادشاہِ مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانہ سے رہا کر کے اپنے دربار میں لے آنے کا حکم دیا تو حضرت یوسف نے اس کی اس دعوت کو قبول نہ کیا بلکہ فرمایا کہ جب تک مجھ پر لگائے ہوئے بہتان کی تحقیق نہ ہو جائے میں جیل سے نکلنے کے لیے تیار نہیں۔ اس وقت زلیخا نے پھر بلا کر کہا "اَلْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ٘ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ" اور عزیز مصر نے تو اس وقت ہی کہہ دیا تھا "اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ" یہ سب تمہارا مکر ہے، یوسف بے گناہ ہے اور اس گواہ نے بھی گواہی دی کہ اگر اس کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے تو یہ سچا ہے اور سب سے سچے گواہ اللہ جل مجدہ ہیں۔ انہوں نے بھی آپ کی پاک دامنی کی شہادت دی، اسی آیت میں "لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ" یعنی یوسف تو ہمارے چنے ہوئے بندوں میں سے ہے۔ اس سے تو ہم نے ہر قسم کی برائی اور فحشاء کو دور فرما دیا ہے۔ اس کے بعد امام فرماتے ہیں کہ اور تو اور خود ابلیس نے کہہ دیا کہ یوسف کا دامن اس داغ سے پاک ہے "فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۙ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۝" (ص: ۸۲۔ ۸۳) یعنی مجھے تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو راہِ راست سے بھٹکا دوں گا لیکن تیرے مخلص بندوں پر میرا داؤ نہیں چل سکتا اور یوسف بارشادِ الٰہی مخلصین میں سے ہیں، اس لیے شیطان کے فریب میں نہیں آسکتے۔ (ضیاء القرآن ج دوم ص ۴۲۱۔ ۴۲۲ ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور)

"كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ": السوء سے مراد ہے گناہ، اور دوسرا قول یہ ہے کہ "السوء" سے مراد ہے فحش اور بے حیائی کا کام اور زنا۔

"اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ": المخلصین کا معنی ہے: جن کو اللہ تعالیٰ نے نبی بنانے کے لیے مختار فرما لیا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:" اور وہ دونوں دروازے کی طرف دوڑے، اس عورت نے اُن کی قمیص پیچھے سے پھاڑ دی اور اُن دونوں نے اس عورت کے شوہر کو دروازہ کے ساتھ کھڑا پایا، اس عورت نے کہا: جس شخص نے آپ کی اہلیہ کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا ہے اس کی اس کے سوا کیا سزا ہوگی کہ اس کو قید کر دیا جائے یا اس کو دردناک عذاب میں مبتلاء کیا جائے O" (یوسف:۲۵)

"وَاسْتَبَقَا الْبَابَ": یعنی حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کو چونکہ اللہ تعالیٰ نے علم شریعت عطا فرمایا تھا تو وہ اس گناہ سے بچنے کے لیے گھر کے پیچھے دوڑے۔

"وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ": اور اس عورت نے ان کا پیچھا کیا حتیٰ کہ پیچھے سے اُن کی قمیص کھینچی، پس حضرت یوسف علیہ السلام نے ان پر سبقت کی اور عورت نے ان کو پیچھے سے پکڑ لیا اور ان کی قمیص کے ساتھ لٹک گئی اور اسے کھینچا تاکہ وہ نہ نکل سکیں اور قمیص پیچھے کی جانب سے پھٹ گئی، پس جب وہ دونوں نکلے تو عزیز مصر کو انہوں نے "وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ قَالَتْ": یعنی اس عورت کا خاوند جس کا نام قطفیر تھا، وہ دروازے پر بیٹھا ہوا تھا۔ جب اس عورت نے عزیز مصر کو دیکھا تو خوفزدہ ہوگئی اور اس نے جلدی سے کہا: "مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا": یعنی جو آپ کی بیوی کے ساتھ زنا کرنے کا ارادہ کرے، اس کی سزا کیا ہوگی۔

"اِلَّاۤ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ": اس نے کہا: اس کے سوا اور کیا سزا ہوگی کہ اس کو قید کر لیا جائے یا اس کو عذاب الیم میں مبتلاء کیا جائے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:" یوسف نے کہا:" یہی عورت مجھے اپنی نفسانی خواہش پوری کرنے کی طرف راغب کر رہی تھی، اور اس کے گھر والوں میں سے بھی ایک گواہ نے گواہی دی، کہ اگر یوسف کی قمیص سامنے کی جانب سے پھٹی ہوئی ہے تو وہ عورت سچی ہے اور یوسف غلط بات کرنے والوں میں سے ہیں"O" اور اگر یوسف کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے تو اس عورت نے جھوٹی تہمت لگائی، اور یوسف سچوں میں سے ہیں"O

(یوسف:۲۶۔۲۷)

حضرت یوسف علیہ السلام کی زلیخا کی تہمت سے براءت پر اُن کے گھرانے کی شہادت

"قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ": یعنی اس عورت نے مجھ سے بے حیائی کا کام کرنے کا مطالبہ کیا تو میں نے انکار کیا اور میں اس سے بھاگا۔ پس جب اس عورت نے کہا: اس شخص کی کیا سزا ہونی چاہیے جس نے آپ کی اہلیہ کے ساتھ برے کام کا ارادہ کیا تب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی براءت کے لیے کہا: اس عورت نے ہی مجھ سے بے حیائی کا کام کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔

"وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا": اس شاہد کے متعلق اختلاف ہے، پس سعید بن جبیر اور الضحاک نے کہا: وہ پالنے میں ایک بچہ تھا، اللہ عزوجل نے اسے گویائی عطا فرمائی۔

العوفی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پنگوڑے میں چار بچوں نے کلام کیا جب کہ وہ

کم عمر تھے: (۱) فرعون کی بیٹی ابن ماشطہ (۲) حضرت یوسف علیہ السلام کا شاہد (۳) جریج کا صاحب (۴) اور عیسیٰ بن مریم علیہ السلام۔
(مسند ابو یعلیٰ: ۲۵۱۷، صحیح ابن حبان: ۲۹۰۴، دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۲ ص ۳۸۹)

ایک قول یہ ہے کہ وہ بچہ اس عورت کے ماموں کا بیٹا تھا، اور حسن، عکرمہ، قتادہ اور مجاہد نے کہا: وہ بچہ نہیں تھا لیکن وہ ایک مرد حکیم تھا اور صائب الرائے تھا۔ اور السدی نے کہا: وہ راعیل کے چچا کا بیٹا تھا، سو اس نے یہ فیصلہ کیا: "اِنْ كَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ": اگر یوسف کی قمیص آگے سے پھٹی ہوئی ہے تو وہ عورت سچی ہے اور یوسف غلط بات کہہ رہے ہیں۔

"وَاِنْ كَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ":
اور اگر یوسف کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے تو اس عورت نے جھوٹی تہمت لگائی، اور یوسف سچوں میں سے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پھر جب عزیز مصر نے دیکھا کہ یوسف کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی تھی تو اس نے کہا: "یہ تم عورتوں کا مکر و فریب ہے، بے شک تمہارا مکر و فریب بہت خطرناک ہوتا ہے"O (یوسف: ۲۸)

"فَلَمَّا رَاٰ قَمِیْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ": پس جب قطفیر نے دیکھا کہ ان کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے تو اس نے جان لیا کہ اس کی بیوی نے خیانت کی ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کی براءت کو اور ان کی پاک دامنی کو اس نے پہچان لیا۔

"قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَیْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَیْدَكُنَّ عَظِیْمٌ": اور اس نے اپنی بیوی سے کہا: تم نے جو یہ کام کیا ہے یہ تمہارے مکر سے ہے، بے شک تمہارا مکر بہت سنگین ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ قول اُس شاہد کا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اے یوسف! آپ اس سے درگزر کریں، اور اے عورت! تم اپنے گناہ کی معافی طلب کرو، بے شک تم ہی خطا کاروں میں سے تھیں"O (یوسف: ۲۹)

پھر قطفیر حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوا، پس کہا: "یُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا": اے یوسف! اس بات کو اب چھوڑ دو اور کسی کے سامنے اس کا ذکر نہ کرنا حتیٰ کہ لوگوں میں یہ مشہور نہ ہو جائے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ تم اب اس بات کو بیان نہ کرنا، بے شک تمہارا عذر اور تمہاری اس الزام سے براءت ظاہر ہو چکی ہے، پھر یوسف نے اپنی بیوی سے کہا: "وَاسْتَغْفِرِیْ لِذَنْۢبِكِ": یعنی تم اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو۔

"اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِئِیْنَ": بے شک تم گناہگاروں میں سے ہو۔
دوسرا قول یہ ہے کہ یہ بات اس شاہد نے حضرت یوسف علیہ السلام سے اور راعیل سے کہی۔ اور "وَاسْتَغْفِرِیْ لِذَنْۢبِكِ" سے مراد یہ ہے کہ تم اپنے خاوند سے یہ درخواست کرو کہ وہ تم کو سزا نہ دے اور تم سے درگزر کرے، تم نے یوسف پر جھوٹا بہتان لگایا ہے۔

اس آیت میں فرمایا ہے: "مِنَ الْخٰطِئِیْنَ"، اور یہ نہیں فرمایا "مِنَ الخَاطِئَات" جو مونث کا صیغہ ہے، کیونکہ عزیز مصر نے اس سے عورتوں کی خبر دینے کا ارادہ نہیں کیا تھا، بلکہ اس نے کہا تھا کہ جو بھی ایسا کام کرے وہ خطا کاروں میں سے ہے، جیسے حضرت مریم کے بارے میں اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِیْنَ ۝" (التحریم: ۱۲) (اور وہ فرمانبرداروں میں سے تھیں)۔
(معالم التنزیل ج ۲ ص ۳۸۷-۳۸۸، دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۴۲۰ھ)

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِی الْمَدِیْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِیْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۳۰﴾

اور شہر کی چند عورتوں میں چہ میگوئیاں ہوئیں، انہوں نے کہا کہ عزیزِ مصر کی بیوی اپنے نوجوان غلام کو اپنے نفس کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتی ہے، اس نوجوان کی محبت نے عزیزِ مصر کی بیوی کو ڈھانپ لیا ہے، بے شک ہم دیکھ رہی ہیں کہ وہ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہے O

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَیْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّیْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَیْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَیْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِیْمٌ ﴿۳۱﴾

جب عزیزِ مصر کی بیوی نے اُن عورتوں کی چہ میگوئیاں سنیں تو اس نے انہیں پیغام بھیج کر بلوایا، اور اُن کے بیٹھنے کے لیے ایک محفل منعقد کی، اور ان میں سے ہر ایک کو ایک چھری دے دی، اور یوسف سے کہا: تم نکل کر ان کے سامنے آ جاؤ، پس جب ان طعنہ دینے والی عورتوں نے یوسف کو دیکھا تو وہ ششدر رہ گئیں اور انہوں نے (لیموں کے بجائے) اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے اور بے ساختہ کہا: "اللہ ہر عیب سے پاک ہے، یہ بشر نہیں ہیں، یہ تو صرف اللہ کے معزز فرشتے ہیں" O

قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِیْ لُمْتُنَّنِیْ فِیْهِ ؕ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ وَلَئِنْ لَّمْ یَفْعَلْ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَیُسْجَنَنَّ وَلَیَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِیْنَ ﴿۳۲﴾

عزیزِ مصر کی بیوی نے کہا: پس یہی وہ شخص ہے جس کے متعلق تم مجھے ملامت کرتی تھیں، اور بے شک میں نے ان کو اپنی طرف مائل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن انہوں نے اپنے آپ کو بچائے رکھا، اور اگر انہوں نے وہ کام نہ کیا جس کا میں انہیں حکم دیتی ہوں تو ضرور بہ ضرور ان کو قید کیا جائے گا اور وہ بے وقعت لوگوں میں سے ہو جائیں گے O

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۳۳﴾

یوسف نے کہا: اے میرے رب! مجھے قید میں رہنا اس سے بڑھ کر پسندیدہ ہے جس کام کی طرف یہ مجھے دعوت دیتی ہیں، اور اگر آپ نے ان کا مکر مجھ سے دور نہ فرمایا تو میں (بالفرض) ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور نادانوں میں سے ہو جاؤں گا O

فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَیْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۴﴾

سو اُن کے رب نے اُن کی دعا قبول فرمائی اور اُن عورتوں کا مکر اُن سے دور فرما دیا، بے شک وہ سب کچھ سننے والے سب کچھ جاننے والے ہیں O

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۳۵﴾

پھر یوسف کی پاکیزگی کی نشانیاں دیکھنے کے باوجود ان لوگوں نے فیصلہ کیا کہ ان کو ضرور کچھ عرصہ کے لیے قید میں رکھا جائے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور شہر کی چند عورتوں میں چہ میگوئیاں ہوئیں، انہوں نے کہا کہ عزیزِ مصر کی بیوی اپنے نوجوان غلام کو اپنے نفس کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتی ہے، اس نوجوان کی محبت نے عزیزِ مصر کی بیوی کو ڈھانپ لیا ہے، بے شک ہم دیکھ رہی ہیں کہ وہ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلاء ہے O'' (یوسف: ۳۰)

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ، یوسف: ۳۰ تا ۳۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

زُلیخا پر نکتہ چینی کرنے والی عورتوں کے مصادیق

''وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ'': الکلبی نے بیان کیا کہ یہ چار عورتیں تھیں:

(۱) عزیزِ مصر کو شراب پلانے والے کی بیوی (۲) روٹی پکانے والے کی بیوی (۳) قید خانہ کے داروغہ کی بیوی (۴) شاہی اصطبل کی دیکھ بھال کرنے والے کی بیوی۔ اور مقاتل نے اضافہ کیا کہ پانچویں دربان کی بیوی تھی۔ یہ واقعہ شہر میں مشہور ہو گیا تھا اور خصوصاً عورتیں اس کے متعلق باتیں کرتی تھیں۔

اس آیت میں ''امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ'' فرمایا، یعنی عزیزِ مصر کی بیوی جس کے ساتھ یہ قصہ ہوا تھا۔

''تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ'': الفتیٰ کا معنی ہے نوجوان لڑکا، اور ''الفتاۃ'' کا معنی ہے نوجوان لڑکی۔

''الشغاف'' کا معنی

''قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا'': اس آیت کے کئی محمل ہیں:

(۱) ''الشغاف'' اس کھال کو کہتے ہیں جس نے دل کا احاطہ کیا ہوا ہوتا ہے، اس کو قلب کا غلاف بھی کہتے ہیں۔ جب کسی کی محبت دل کے غلاف میں داخل ہو جائے تو کہا جاتا ہے ''شغفت فلانہ'' یعنی تمہاری محبت اس کے دل کے غلاف میں داخل ہو گئی ہے۔ اور ''شَغَفَهَا حُبًّا'' کا معنی ہے: یوسف کی محبت عزیزِ مصر کی بیوی کے دل کی کھال کے اندر داخل ہو گئی۔

(۲) یوسف کی محبت اس کے دل میں جاگزیں ہو گئی ہے جیسا کہ دل کی کھال دل کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ اور اس سے مراد یہ ہے کہ یوسف کی محبت کے سوا عزیزِ مصر کی بیوی کے دل سے ہر چیز محو ہو گئی تھی، وہ یوسف کے سوا اور کسی کو نہیں سوچتی تھی اور اس کے دل میں یوسف کے سوا اور کسی کا خیال نہیں آتا تھا۔

(۳) اس کے دل کی گہرائی میں یوسف کی محبت رچ گئی تھی اور یہ اس سے کنایہ ہے کہ اس کو یوسف سے شدید محبت تھی اور بہت زیادہ عشق تھا۔

" اِنَّا لَنَرٰىهَا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ": یعنی اُن عورتوں نے کہا کہ ہم عزیزِ مصر کی بیوی کو یوسف کی محبت کی شدت کی وجہ سے راہِ راست سے بھٹکا ہوا پاتی ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: " جب عزیزِ مصر کی بیوی نے اُن عورتوں کی چہ میگوئیاں سنیں تو اس نے انہیں پیغام بھیج کر بلوایا، اور اُن کے بیٹھنے کے لیے ایک محفل منعقد کی، اور ان میں سے ہر ایک کو ایک چھری دے دی، اور یوسف سے کہا: تم نکل کر ان کے سامنے آجاؤ، پس جب ان طعنہ دینے والی عورتوں نے یوسف کو دیکھا تو وہ ششدر رہ گئیں اور انہوں نے (لیموں کے بجائے) اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے اور بے ساختہ کہا: " اللہ ہر عیب سے پاک ہیں، یہ بشر نہیں ہیں، یہ تو صرف اللہ کے معزز فرشتے ہیں"O (یوسف:۳۱)

نکتہ چیں عورتوں کی باتوں کو مکر سے تعبیر کرنے کی وجوہ

" فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ ":

عزیزِ مصر کی بیوی نے اُن عورتوں کی باتیں سنیں اور اُن کے قول کو مکر سے تعبیر کیا، اور اس کی کئی وجوہ ہیں:

(۱) اُن عورتوں نے یہ کلام اس لیے کہا کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھنا چاہتی تھیں اور اُن کے خوبصورت چہرہ کی طرف نظر ڈالنا چاہتی تھیں، کیونکہ انہوں نے جان لیا کہ جب وہ ایسی باتیں کریں گی تو عزیزِ مصر کی بیوی حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے سامنے پیش کرے گی تاکہ وہ اپنی شدید محبت میں اپنا عذر ظاہر کرے۔

(۲) " امْرَاَتُ الْعَزِیْزِ " (عزیز کی بیوی) نے ان عورتوں کے سامنے چپکے سے یہ بتایا تھا کہ وہ یوسف سے شدید محبت کرتی ہے اور ان کو بتایا کہ وہ اس راز کو مخفی رکھیں، پھر جب ان عورتوں نے عزیزِ مصر کی بیوی کے اس راز کو ظاہر کر دیا تو گویا کہ یہ اُن کی طرف سے عہد شکنی اور مکر تھا۔

(۳) وہ عورتیں عزیزِ مصر کی بیوی کی غیبت کی مرتکب ہوئیں، اور غیبت بھی چپکے چپکے کی جاتی ہے تو وہ مکر کے مشابہ ہو گئی۔

نکتہ چیں عورتوں کو بلانے اور ان کے لیے محفل سجانے کی وجوہ

" اَرْسَلَتْ اِلَیْهِنَّ وَ اَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً ":

(۱) جب عزیزِ مصر کی بیوی نے اُن عورتوں کی ملامت کو سنا جو حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ اس کی شدید محبت کی وجہ سے اسے ملامت کرتی تھیں، تو اس نے یہ ارادہ کیا کہ اپنی محبت کی شدت کے عذر کو ظاہر کریں، پس اس نے ایک دسترخوان رکھا اور اُن تمام عورتوں میں سے جو بڑی بڑی اور سردار تھیں، ان سب کو بلایا اور اُن کے لیے ایک محفل سجائی۔

(۲) " مُتَّكَاً " سے مراد ہے وہ چادر جس پر ٹیک لگائی جاتی ہے۔

(۳) " مُتَّكَاً " سے مراد طعام ہے۔ العتبی نے کہا: اس میں اصل یہ ہے کہ جس شخص کو تم اپنے پاس کھانے کے لیے بلاؤ تو تم اس کے لیے ایک گدا تیار کرتے ہو، اور یہاں پر طعام کا استعارہ اس گدے سے کیا ہے۔

(۴) ''مُتَّكَاً'' سے مراد ایسا طعام ہے جسے کھانے کے لیے اس کو چھری سے کاٹنے کی ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ جب اس قسم کا طعام ہوگا تو اسے کاٹنے کے لیے انسان کسی چیز پر ٹیک لگا کر اس کو کاٹے گا۔

''وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ'': خلاصہ یہ ہے کہ عزیزِ مصر کی بیوی نے اُن عورتوں کو بلایا اور اُن کے لیے ایک مجلس مقرر کردی اور اُن عورتوں میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں چھری دی تا کہ وہ پھلوں کو کھانے سے پہلے کاٹیں، یا گوشت کو کاٹنے کے لیے چھری دی۔ پھر اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ اُن کے سامنے آجائیں اور حضرت یوسف علیہ السلام اس کی مخالفت پر قادر نہ تھے۔

''فَلَمَّا رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ'': ''اَكْبَرْنَهٗ'' کی تفسیر میں دو قول ہیں:

(۱) ایک قول یہ ہے کہ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بہت عظیم اور بہت بڑا سمجھا۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھتے ہوئے ان عورتوں کو حیض آگیا، کیونکہ جب کوئی عورت کسی چیز سے خوف زدہ ہو اور مرعوب ہو تو بسا اوقات اس کے پیٹ سے بچہ ساقط ہو جاتا ہے، سو اس کو حیض آتا ہے۔

''وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ'': یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر وہ حیرت سے مبہوت ہوگئیں اور دہشت زدہ ہوگئیں اور چھری سے پھلوں کو کاٹنے کے بجائے انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے۔ اور اس حیرت اور دہشت کی وجہ سے چھری کی جو تیز دھار تھی، اس تیز دھار کو اور اس کے دستے کو فرطِ حیرت کی وجہ سے متمیز نہ کرسکیں اور بجائے چھری کے دستے کو پکڑنے کے انہوں نے اس کی تیز دھار کو پکڑ لیا۔

(۳) اکثر علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن و جمال کی برتری اور حسن و جمال کے کمال کی وجہ سے وہ عورتیں حیرت میں مبتلاء ہوئیں، ایک قول یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی فضیلت حسن میں دوسروں پر ایسی تھی جیسے چودھویں رات کے چاند کی فضیلت تمام ستاروں پر ہوتی ہے۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ شبِ معراج حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس سے گزرے تو آپ نے حضرت جبریل علیہ السلام سے پوچھا: یہ کون ہیں؟ تو انہوں نے بتایا کہ یہ یوسف ہیں، تو حضرت جبریل علیہ السلام نے پوچھا: آپ نے یوسف کو دیکھ کر کیا محسوس کیا؟ فرمایا: جیسے چودھویں رات کا چاند ستاروں پر فوقیت رکھتا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام مصر کی گلیوں میں چلتے تھے تو اُن کے چہرہ کی چمک وہاں کی دیواروں پر پڑتی تھی، جیسے آسمان سے سورج کا نور بکھر گیا ہو۔

امام رازی فرماتے ہیں: میرے نزدیک اس کی توجیہ یہ ہے کہ جب اُن عورتوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو آپ کے چہرہ میں انہوں نے نبوت کے نور کو دیکھا اور رسالت کی علامتوں کو دیکھا، تو وہ آپ میں نبوت کی علامات کو دیکھ کر خوف زدہ ہوگئیں اور خوفزدگی اس درجہ کی تھی کہ انہیں یہ پتا نہیں چلا کہ وہ کیا چیز کھا رہی ہیں۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام کا جمال بہت عظیم تھا، وہ اس ہیبت کے ساتھ ملا ہوا تھا تو وہ اس حالت سے متعجب ہوگئیں، اس لئے انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بہت بڑا جانا اور عظیم جانا اور اُن کے دلوں میں آپ کا رعب اور آپ کا خوف طاری ہوگیا۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ جب اُن عورتوں کی یہ حالت تھی تو انہوں نے عزیزِ مصر کی بیوی پر طعن کیسے کیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جب انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام میں مَلَکیت طاہرہ کی سیرت دیکھی تو اس سے ان کے دل میں شدید محبت پیدا ہوئی اور ملکیت کی سیرت کی وجہ سے حضرت یوسف علیہ السلام سے وصال سے متعلق ان کے دل میں حسرت پیدا ہوئی، تو انہوں نے زلیخا پر طعن کیا۔

"وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ": اس آیت میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کی کسی چیز کے عجز سے براءت کو بیان کیا۔ اور اس پر تعجب کا اظہار کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ایسی مخلوق پیدا فرمائی ہے جو اس طرح گناہوں سے باز رہتی ہے۔

زنانِ مصر کا حضرت یوسف علیہ السلام سے بشریت کی نفی کرنا اور ان کے لیے فرشتہ ہونے کا اثبات کرنا

"مَا هٰذَا بَشَرًا ۖ إِنْ هٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ": اس کی متعدد وجوہ ہیں:

(۱) اس آیت سے مقصود حضرت یوسف علیہ السلام کے عظیم حسن کا اثبات ہے، کیونکہ لوگوں کے دلوں میں یہ مرکوز ہے کہ فرشتہ سے زیادہ کوئی حسین نہیں ہے، جس طرح ان کے دلوں میں یہ مرکوز ہے کہ شیطان سے زیادہ قبیح کوئی نہیں ہے اور اسی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں یہ بسا ہوا ہے کہ سب سے زیادہ قبیح شیطان ہے۔ اور سب سے زیادہ حسین فرشتہ ہے۔ پس جب اُن عورتوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن میں مبالغہ کیا تو پھر اُن کو فرشتہ قرار دیا۔

(۲) مشہور یہ ہے کہ فرشتے شہوت پر برانگیختہ کرنے والے امور سے پاک ہوتے ہیں اور غضب کے محرکات سے مبرّا ہوتے ہیں اور وہم اور خیال کے جھگڑوں سے محفوظ ہوتے ہیں، پس اُن کا طعام اللہ تعالیٰ کی توحید ہے اور اُن کا مشروب اللہ عزوجل کی ثناء ہے۔ پھر اُن عورتوں نے جب حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو کسی اور چیز کی طرف التفات نہ کرتی تھیں اور انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام میں نبوت کی ہیبت اور رسالت کے دبدبہ کو دیکھا تو گویا کہ انہوں نے کہا: ہم نے تو اس شخص میں شہوت کا کوئی اثر نہیں پایا اور نہ کوئی بشریت کا اثر پایا ہے اور نہ کوئی انسانی صفت پائی ہے، لہٰذا یہ اُن تمام صفاتِ مذمومہ سے خالی ہیں جو بشر میں ہیں اور یہ انسانیت کی حد سے ترقی کر کے ملکیت کی حد میں داخل ہو چکے ہیں۔

بعض علماء کے فرشتہ کو بشر سے افضل قرار دینے پر دلائل

جو علماء اس کے قائل ہیں کہ فرشتہ بشر سے افضل ہوتا ہے، انہوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے، پس انہوں نے کہا: اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جب اُن عورتوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی تعظیم میں یہ باتیں کہیں تو ضروری ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام بشریت سے خالی ہوں اور ملکیت میں داخل ہو چکے ہوں۔ اسی وجہ سے اُن کی عظیم شان بیان کی گئی اور اُن کے مرتبہ کو بلند کیا گیا، اور یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب کہ فرشتہ بشر سے اعلیٰ اور افضل ہو۔ پھر ہم یہ کہتے ہیں کہ یا تو اس کلام سے مقصود حضرت یوسف علیہ السلام کے ظاہری حسن کو بیان کرنا ہے یا اُن کے خلقِ باطن کے کمال کو اور حسنِ معنوی کو بیان کرنا ہے۔ اول تو ہو نہیں سکتا کیونکہ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی صفت یہ بیان کی کہ وہ کریم ہیں اور کریم اخلاقِ باطنہ کی وجہ سے ہوں گے نہ کہ صورتِ ظاہرہ کی وجہ سے۔

اور دوسری صورت اس لئے باطل ہے کہ ہم بداہۃً جانتے ہیں کہ انسان کا چہرہ فرشتوں کے چہرہ کے مشابہ نہیں ہے، رہا اُن کا شہوت اور غضب کے محرکات سے دور ہونا اور لذاتِ جسمانیہ سے اعراض کرنا اور اللہ عزوجل کی عبادت کی طرف متوجہ ہونا اور دل کا اس میں مستغرق ہونا، تو یہ ایسا امر ہے جو انسانِ کامل میں اور فرشتوں میں مشترک ہے۔ اور جب یہ ثابت ہو گیا تو ہم کہتے ہیں کہ

انسان کو فرشتہ کے ساتھ تشبیہ دینا اسی وجہ سے اولیٰ ہے جو اس کا کمال باطن ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ اس آیت میں حضرت یوسف علیہ السلام کو فرشتوں کے مشابہ قرار دینا اُن کے خلقِ باطن کی وجہ سے تھا نہ کہ ظاہری صورت کی وجہ سے۔ اور جب یہ واضح ہو گیا تو معلوم ہوا کہ اِن فضائل میں فرشتہ انسان سے افضل ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ فرشتہ بشر سے افضل ہوتا ہے۔

(تفسیر کبیر ج ۶ ص ۴۴۷۔۴۵۰، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

بشر کے فرشتوں سے افضل ہونے کے متعلق مصنف کا نظریہ

میں کہتا ہوں کہ عام معتزلہ کا یہی مسلک ہے کہ فرشتہ، بشر سے افضل ہوتا ہے، اور امام رازی نے بھی بہ ظاہر اس جگہ معتزلہ کے موافق لکھا ہے لیکن تحقیق یہ ہے کہ اگر فرشتہ شہوت اور غضب کے محرکات سے دور ہوتا ہے اور اللہ عزوجل کی عبادت میں مستغرق رہتا ہے تو یہ اس قدر حیرت کا باعث اور موجب کمال نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی حقیقت میں وہ چیز رکھی ہی نہیں ہے جو شہوت اور غضب کا موجب ہوتی اور انسان میں شہوت اور غضب کے موجبات اور محرکات رکھے ہیں، پھر انسان کا ان شہوت کے موجبات اور محرکات کے ہوتے ہوئے اپنا دامن شہوت اور غضب کے تقاضوں سے بچانا جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنا دامن بچایا، انہوں نے زلیخا کے کمالِ حسن اور اس کی وارفتگی اور اس کی اقتدار پر قوت اور سلطنت اور اس کے حضرت یوسف علیہ السلام کو پیہم اپنے نفس کے تقاضوں کو پورا کرنے پر اصرار کرنا اور اس کی بات نہ ماننے کی پاداش میں اُن کو قید کی دھمکی دینا پھر بھی حضرت یوسف علیہ السلام کا ان دھمکیوں کو نظر انداز کر دینا اور یہی فرمانا کہ مجھے قید میں رہنا اس کی بات ماننے سے زیادہ پسند ہے اور یہ ایسا مقام ہے کہ قوی سے قوی انسان ایسے موقع پر پھسل جاتا ہے لیکن حضرت یوسف علیہ السلام چٹان کی طرح اپنی عصمت کو برقرار رکھنے پر قائم رہے، سو یہ ایسا مقام ہے جو فرشتوں کو حاصل نہیں، کیونکہ اُن میں شہوت اور غضب کا مادہ نہیں رکھا گیا، تو اُن کا عبادت و ریاضت میں مشغول ہونا اس قدر باعثِ حیرت اور قابلِ ستائش نہیں ہے جس طرح نفس کے محرکات کے ہوتے ہوئے اور شہوت اور غضب کے تقاضوں کے ہوتے ہوئے پھر بھی ان چیزوں کو ترک کر کے اپنی پاک دامنی پر قائم رہنا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت و ریاضت میں مشغول رہنا یہ فرشتوں کی عبادت سے کہیں افضل ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”عزیزِ مصر کی بیوی نے کہا: پس یہی وہ شخص ہے جس کے متعلق تم مجھے ملامت کرتی تھیں، اور بے شک میں نے اِن کو اپنی طرف مائل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن انہوں نے اپنے آپ کو بچائے رکھا، اور اگر انہوں نے وہ کام نہ کیا جس کا میں انہیں حکم دیتی ہوں تو ضرور بہ ضرور ان کو قید کیا جائے گا اور وہ بے وقعت لوگوں میں سے ہو جائیں گے O“ (یوسف:۳۲)

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ، یوسف: ۳۲ تا ۳۵ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

عزیزِ مصر کی بیوی کا نکتہ چین خواتین کے سامنے عذر پیش کرنا

”قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِیْ لُمْتُنَّنِیْ فِیْهِ“:

جب مصر کی عورتوں نے عزیزِ مصر کی بیوی کے متعلق یہ کہا کہ اس کو کنعان کے اس غلام کی محبت نے وارفتہ کر دیا ہے اور بے شک

ہم اس کو کھلی ہوئی گمراہی میں پاتے ہیں، تب عزیزِ مصر کی بیوی نے ایک مجلس منعقد کی اور اس میں اُن نکتہ چین عورتوں کو بلایا اور جب اُن کے سامنے اچانک حسنِ یوسف بے حجاب ہو کر آیا تو انہوں نے پھلوں کی جگہ اپنی انگلیاں کاٹ دیں، تب انہوں نے اُن عورتوں کو یہ بتایا کہ تمہارا مجھے ملامت کرنا بلاوجہ تھا تم نے تو ایک نظر اس کو دیکھا ہے تو تمہارا یہ حال ہو گیا ہے اور میں جو اس کے ساتھ عرصۂ دراز تک رہی ہوں، تو سوچو میرا کیا حال ہو گا!

اور علامہ زمخشری نے کہا ہے کہ جب اُن عورتوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو وہ مدہوش ہو گئیں اور عزیزِ مصر کی بیوی نے کہا: یہی وہ کنعان کا غلام ہے جس سے محبت کے متعلق تم مجھے ملامت کر رہی تھیں، یعنی تم نے اس کا صحیح تصور نہیں کیا اور اگر تمہارے خیال میں اس کی صورت آ چکی ہوتی تو تم اس ملامت کو ترک کر دیتیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام پر لگائی ہوئی تہمت سے اُن کی براءت

اور جب حقیقت حال منکشف ہو گئی تو عزیزِ مصر کی بیوی نے کہا: ''وَ لَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ'' (اور بے شک میں نے ان کو اپنی طرف مائل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن انہوں نے اپنے آپ کو بچائے رکھا)۔ اس آیت میں اس کی تصریح ہے کہ حضرت سیدنا یوسف علیہ السلام اس تہمت سے بری تھے، پھر عزیزِ مصر کی بیوی نے کہا: ''وَ لَىٕنْ لَّمْ یَفْعَلْ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَیُسْجَنَنَّ وَ لَیَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِیْنَ'' (اور اگر انہوں نے وہ کام نہ کیا جس کا میں انہیں حکم دیتی ہوں تو ضرور بہ ضرور ان کو قید کیا جائے گا اور وہ بے وقعت لوگوں میں سے ہو جائیں گے)۔

اس سے مراد یہ تھی کہ اگر حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیزِ مصر کی بیوی کی موافقت نہیں کی اور اس کی خواہش پوری نہیں کی تو حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانہ میں ڈال دیا جائے گا اور وہ صاغرین میں سے ہو جائیں گے، یعنی کم درجہ کے لوگوں میں سے ہو جائیں گے، کیونکہ جس شخص کا مرتبہ بہت عظیم ہو اور لوگوں کی نگاہوں میں اس کی بہت وقعت ہو، اگر اس کو یہ دھمکی دی جائے کہ تمہارا کم حیثیت کے لوگوں میں شمار ہو گا تو یہ اس کے لیے زیادہ مؤثر ہوتی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''یوسف نے کہا: اے میرے رب! مجھے قید میں رہنا اس سے بڑھ کر پسندیدہ ہے جس کام کی طرف یہ مجھے دعوت دیتی ہیں، اور اگر آپ نے ان کا مکر مجھ سے دور نہ فرمایا تو میں (بالفرض) ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور ناواقفوں میں سے ہو جاؤں گا O'' (یوسف: ۳۳)

عزیزِ مصر کی بیوی نے تمام خواتین کے سامنے حضرت یوسف علیہ السلام کو دھمکی دی، پس ظاہر ہے کہ وہ خواتین حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس گئیں اور انہوں نے کہا: عزیزِ مصر کی بیوی کی مخالفت کرنے میں تمہارے لیے کوئی بھلائی نہیں ہے، ورنہ تم قید خانہ میں ڈال دیے جاؤ گے اور کم درجہ اور کم حیثیت کے لوگوں میں سے ہو جاؤ گے۔

عزیزِ مصر کی بیوی کی دعوتِ گناہ کے دواعی اور محرکات

عزیزِ مصر کی بیوی کی دعوتِ گناہ کے حسبِ ذیل دواعی اور محرکات تھے:

(۱) زلیخا دنیا کی حسین ترین عورت تھی۔ (۲) وہ بہت مال دار تھی اور اس نے کہا تھا کہ اگر یوسف نے میری موافقت کی تو میں یہ

سارا مال اُن پر نچھاور کر دوں گی۔ (۳) وہ طعنہ زن خواتین حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس گئیں اور اُن میں سے ہر ایک نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اس گناہ کی ترغیب بھی دی اور گناہ سے بچنے کی صورت میں انواع و اقسام کے مصائب و آلام سے بھی ڈرایا تو حضرت یوسف علیہ السلام کے حق میں زلیخا کی موافقت کی ترغیب کی جہات بھی تھیں اور اس کی مخالفت کی صورت میں ڈر اور خوف کی وجوہات بھی سوا تھیں۔

ایسی صورت میں عام انسانی طاقت اور عام قوتِ بشریہ کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اس موقع پر گناہ میں آلودہ ہونے سے بچ جائے، سو اس وجہ سے حضرت یوسف علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ملتجی ہوئے اور عرض کیا: ''رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ'' (یوسف نے کہا: اے میرے رب! مجھے قید میں رہنا اس سے بڑھ کر پسندیدہ ہے جس کام کی طرف یہ مجھے دعوت دیتی ہے)۔

بعض سوالات کے جوابات

(۱) قید خانہ انتہائی تکلیف دہ جگہ ہے اور جس کی طرف وہ عورتیں انہیں دعوت دیتی تھیں وہ انتہائی مطلوب چیز ہے، پس انہوں نے کیسے کہا کہ میرے نزدیک مشقت، لذت سے زیادہ پسندیدہ ہے؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس لذت کے حصول کے نتیجہ میں دنیا میں مذمت اور آخرت میں عذاب ہوتا، اور قید خانہ کی تکلیف کو اٹھانا متعدد سعاداتِ عظیمہ کا باعث تھا، یعنی دنیا میں اُن کی تحسین کی جاتی اور آخرت میں دائمی ثواب ملتا، اسی لیے انہوں نے کہا: ''السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ''۔

(۲) اُن کا حضرت یوسف علیہ السلام کو قید میں ڈالنا بھی معصیت ہے جیسا کہ زنا معصیت ہے، پس کیسے جائز ہوگا کہ انہوں نے قید خانہ کو محبوب جانا حالانکہ وہ بھی معصیت ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جب دو امروں میں سے ایک امر لازم تھا یا تو وہ زنا کرتے یا قید میں رہتے، تو قید میں رہنا اُن کے لیے اولیٰ تھا تاکہ وہ بڑے گناہ یعنی زنا سے بچ جائیں۔

''وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ'': یعنی اے میرے رب! اگر آپ نے اپنی خصوصی توجہ سے مجھے اس امتحان میں کامیاب نہیں فرمایا تو میں ان عورتوں کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہلوں کا کام کر بیٹھوں گا۔

ہمارے اصحاب نے اس آیت سے اس پر استدلال کیا ہے کہ انسان کے لیے اس وقت تک کسی گناہ سے باز آنا ممکن نہیں ہے جب تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس گناہ سے باز نہ رکھیں۔ اور اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اُن کو اس قبیح فعل سے باز نہ رکھتے تو وہ اس قبیح فعل میں واقع ہو جاتے۔ پس ثابت ہوا کہ بندے کا کسی قبیح کام سے باز رہنا اور بچنا اللہ تعالیٰ کے بچائے بغیر ممکن نہیں ہے۔ دوسری تقریر یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے حق میں اس معصیت کی تمام ترغیبات جمع ہو چکی تھیں اور وہ مال و دولت اور عزت کا حصول ہے۔ اور جب ایسا ہو تو اس کام کے کرنے کے دواعی اور محرکات قوی ہو جاتے ہیں اور ترک کے محرکات کمزور پڑ جاتے ہیں، تب حضرت یوسف علیہ السلام نے اللہ عزوجل سے طلب کیا اور یہ دعا کی کہ اللہ تعالیٰ اُن کے دل میں ایسے دواعی اور محرکات پیدا فرما دیں جو اس معصیت کی نفی کریں۔ اور اگر اللہ تعالیٰ اُن کے دل میں اس معصیت سے اجتناب کے دواعی اور محرکات پیدا نہ فرماتے تو وہ اس معصیت میں واقع ہو جاتے۔ اور یہی اللہ عزوجل کے اس ارشاد کی مراد ہے: ''أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُنْ مِّنَ

اَلْجٰهِلِیْنَ ''(میں (بالفرض) ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور نادانوں میں سے ہو جاؤں گا)۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''سو اُن کے رب نے اُن کی دعا قبول فرمالی اور اُن عورتوں کا مکر اُن سے دور فرمادیا، بے شک وہ سب کچھ سننے والے، سب کچھ جاننے والے ہیں O'' (یوسف: ۳۴)

''فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۚ إِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ'': سو اُن کے رب نے اُن کی دعا قبول فرمالی اور اُن عورتوں کا مکر اُن سے دور فرمادیا، بے شک وہ سب کچھ سننے والے، سب کچھ جاننے والے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''پھر یوسف کی پاکیزگی کی نشانیاں دیکھنے کے باوجود ان لوگوں نے فیصلہ کیا کہ ان کو ضرور کچھ عرصہ کے لیے قید میں رکھا جائے O'' (یوسف: ۳۵)

''ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ'':

عزیز مصر پر حضرت یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی منکشف ہونے کے بعد اس نے ان کو قید میں کیوں ڈالا، اس کی توجیہ

جب اس عورت کے خاوند پر حضرت یوسف علیہ السلام کے گناہ کے الزام کی براءت منکشف ہوگئی تو پھر ضروری تھا کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام سے کوئی تعرض نہ کرتا، چونکہ اس عورت نے ہر قسم کے حیلے اختیار کیے حتیٰ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنی مراد پوری کرنے پر قائل کر لیتی، حضرت یوسف علیہ السلام نے پھر بھی اس کی طرف التفات نہیں فرمایا، جب وہ اس سے مایوس ہوگئی تو اس نے ایک اور حیلہ کیا اور اپنے شوہر سے کہا کہ کنعان کا یہ غلام لوگوں کے سامنے مجھے رسوا کر دے گا اور ان سے بیان کرے گا کہ میں نے اس کو زنا پر راغب کیا تھا اور میں اپنی براءت کا عذر بیان کرنے پر قادر نہیں ہوں، پس یا تو آپ مجھے اجازت دیں کہ میں آپ کے گھر سے نکل جاؤں اور یا پھر آپ اس کو قید کرلیں، پس اس وقت عزیز مصر کے دل میں یہ خیال آیا کہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ یوسف کو قید کر لیا جائے حتیٰ کہ لوگوں کی زبانوں سے زلیخا کے متعلق اعتراض ساقط ہو جائے اور وہ رسوائی نہ ہو جو زلیخا کے حقیقت حال کو بیان کرنے سے ہوتی۔

اس آیت میں ''حَتّٰی حِیْنٍ'' مذکور ہے۔ اہل لغت نے بیان کیا ہے کہ ''حِیْنٍ'' زمانہ کے غیر معین وقت کو کہتے ہیں، اس کا اطلاق زمانہ کی کم مقدار پر بھی ہوتا ہے اور زیادہ مقدار پر بھی ہوتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: عزیز مصر کی مراد یہ تھی کہ جتنی مدت تک یہ داغ زلیخا سے دھل نہیں جاتا اس وقت تک ان کو قید میں رکھا جائے۔

اور صحیح یہ ہے کہ یہ مقدار معلوم ہے اور جو مقدار معلوم ہے وہ یہ ہے کہ ایک طویل مدت تک حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانہ میں رکھا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَقَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّکَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ (یوسف: ۴۵)'' (دو قیدیوں میں سے بچ جانے والے کو ایک مدت کے بعد یوسف یاد آئے)۔ (تفسیر کبیر ج ۶ ص ۴۵۰-۴۵۳، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَاۤ اِنِّيْۤ اَرٰىنِيْۤ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ

إِنِّيٓ أَرَىٰنِيٓ أَحۡمِلُ فَوۡقَ رَأۡسِي خُبۡزٗا تَأۡكُلُ ٱلطَّيۡرُ مِنۡهُۖ نَبِّئۡنَا بِتَأۡوِيلِهِۦٓۖ إِنَّا نَرَىٰكَ مِنَ ٱلۡمُحۡسِنِينَ ﴿٣٦﴾

اور یوسف کے ساتھ دو اور جوان بھی قید خانہ میں داخل ہوئے، ان میں سے ایک نے اپنے متعلق بیان کیا کہ: "میں نے اپنے آپ کو خواب میں دیکھا کہ میں خمر (انگور) نچوڑ رہا ہوں"، دوسرے نے اپنے متعلق بیان کیا کہ: "میں نے اپنے آپ کو خواب میں دیکھا ہے کہ میں اپنے سر پر روٹیاں اٹھا کر جا رہا ہوں جن میں سے پرندے نوچ کر کھا رہے ہیں، (اے یوسف!) آپ ہمیں اس خواب کی تعبیر بتایئے! بے شک ہم آپ کو نیک لوگوں میں سے خیال کرتے ہیں" O

قَالَ لَا يَأۡتِيكُمَا طَعَامٞ تُرۡزَقَانِهِۦٓ إِلَّا نَبَّأۡتُكُمَا بِتَأۡوِيلِهِۦ قَبۡلَ أَن يَأۡتِيَكُمَاۚ ذَٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّيٓۚ إِنِّي تَرَكۡتُ مِلَّةَ قَوۡمٖ لَّا يُؤۡمِنُونَ بِٱللَّهِ وَهُم بِٱلۡأٓخِرَةِ هُمۡ كَٰفِرُونَ ﴿٣٧﴾

یوسف نے کہا: "تمہارے لیے جو کھانا لایا جاتا ہے تم دونوں کے پاس اس کھانے کے آنے سے پہلے میں تم دونوں کو اس خواب کی تعبیر بتا دوں گا، خواب کی تعبیر ان چیزوں میں سے ہے جس کی اللہ نے مجھے تعلیم فرمائی ہے، جو قوم اللہ کی توحید پر ایمان نہیں لائی میں اس قوم کو چھوڑ چکا ہوں اور وہی لوگ آخرت کا انکار کر کے کفر کرتے ہیں" O

وَٱتَّبَعۡتُ مِلَّةَ ءَابَآءِيٓ إِبۡرَٰهِيمَ وَإِسۡحَٰقَ وَيَعۡقُوبَۚ مَا كَانَ لَنَآ أَن نُّشۡرِكَ بِٱللَّهِ مِن شَيۡءٖۚ ذَٰلِكَ مِن فَضۡلِ ٱللَّهِ عَلَيۡنَا وَعَلَى ٱلنَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكۡثَرَ ٱلنَّاسِ لَا يَشۡكُرُونَ ﴿٣٨﴾

اور میں نے اپنے آباء و اجداد ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کے دین کی پیروی کی ہے، اور ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک قرار دیں، یہ ہم پر اللہ کا فضل ہے اور دوسرے لوگوں پر (بھی)، لیکن اکثر لوگ اللہ کا شکر ادا نہیں کرتے O

يَٰصَٰحِبَيِ ٱلسِّجۡنِ ءَأَرۡبَابٞ مُّتَفَرِّقُونَ خَيۡرٌ أَمِ ٱللَّهُ ٱلۡوَٰحِدُ ٱلۡقَهَّارُ ﴿٣٩﴾

اے میرے قید خانہ کے دو ساتھیو! یہ بتاؤ کیا الگ الگ خداؤں کا ماننا بہتر ہے یا ایک اللہ کو ماننا (بہتر ہے) جو سب پر غالب ہیں؟ O

مَا تَعۡبُدُونَ مِن دُونِهِۦٓ إِلَّآ أَسۡمَآءٗ سَمَّيۡتُمُوهَآ أَنتُمۡ وَءَابَآؤُكُم مَّآ أَنزَلَ ٱللَّهُ بِهَا مِن سُلۡطَٰنٍۚ إِنِ ٱلۡحُكۡمُ إِلَّا لِلَّهِۚ أَمَرَ أَلَّا تَعۡبُدُوٓاْ إِلَّآ إِيَّاهُۚ ذَٰلِكَ ٱلدِّينُ ٱلۡقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكۡثَرَ ٱلنَّاسِ لَا يَعۡلَمُونَ ﴿٤٠﴾

تم اللہ کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو وہ صرف چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباء و اجداد نے رکھ لیے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان

ناموں کی صحت پر کوئی دلیل قائم نہیں فرمائی، حکم دینا صرف اللہ کا حق ہے، انہوں نے یہ حکم دیا ہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر اور کسی کی عبادت نہ کرو، یہی مضبوط دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے O

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ۭ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ﴿۴۱﴾

اے قید خانہ کے میرے دو ساتھیو! تم میں سے ایک تو اپنے بادشاہ کو خمر (شراب) پلایا کرے گا، اور رہا دوسرا تو اس کو صلیب پر چڑھایا جائے گا، پس پرندے اس کے سر سے گوشت نوچ کر کھائیں گے، اس خواب کی تعبیر مقدر ہو چکی ہے جس کے متعلق تم مجھ سے سوال کرتے تھے O

وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ۡ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ﴿۴۲﴾

اُن دونوں میں سے جس کے متعلق یوسف کا گمان تھا کہ وہ ان دونوں میں سے نجات پانے والا ہے اس سے یوسف نے کہا: "تم اپنے بادشاہ کے سامنے میرا ذکر کرنا" پس اس کو شیطان نے بادشاہ کے سامنے ان کا ذکر کرنا بھلا دیا، لہٰذا وہ کئی سال قید خانہ میں ٹھہرے رہے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور یوسف کے ساتھ دو اور جوان بھی قید خانہ میں داخل ہوئے، ان میں سے ایک نے اپنے متعلق بیان کیا کہ: "میں نے اپنے آپ کو خواب میں دیکھا کہ میں خمر (انگور) نچوڑ رہا ہوں"، دوسرے نے اپنے متعلق بیان کیا کہ: "میں نے اپنے آپ کو خواب میں دیکھا ہے کہ میں اپنے سر پر روٹیاں اٹھا کر جا رہا ہوں جن میں سے پرندے نوچ کر کھا رہے ہیں، (اے یوسف!) آپ ہمیں اس خواب کی تعبیر بتائیے! بے شک ہم آپ کو نیک لوگوں میں سے خیال کرتے ہیں" O (یوسف:۳۶)

حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانۂ قید کے احوال

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ، یوسف: ۳۶ تا ۴۲ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ": "فَتَيَان" کا لفظ، لفظِ "فتی" کا تثنیہ ہے اور یہ اُن الفاظ میں سے ہے جن کے آخر میں "یاء" ہے۔ اور جن لوگوں نے "فتو" کہا ہے وہ شاذ قول ہے۔

وہب بن منبہ اور دوسروں نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کو ایک گدھے کے اوپر باندھ کر قید خانہ میں لے جایا گیا اور اُن کے ساتھ کوئی منادی ندا کر رہا تھا: "یہ اس کی سزا ہے جو اپنی مالک کی نافرمانی کرتا ہے"۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام فرماتے تھے: "یہ سزا دوزخ کی آگ کے ٹکڑوں سے اور قطران کا لباس پہننے سے، اور کھولتا ہوا پانی پینے سے، اور زقوم (تھوہر کا درخت) کے کھانے سے

بہت بہتر ہے''۔اور قید خانہ میں اُن کی اُن لوگوں سے ملاقات ہوئی جن کی رہائی کی امید ختم ہو چکی تھی اور اُن پر مصائب بہت زیادہ ہو چکے تھے،تو حضرت یوسف علیہ السلام ان کو تلقین کرتے: ''تم صبر کرو اور بشارت کو قبول کرو اور اجر پاؤ گے''۔اُن لوگوں نے کہا: ''اے نوجوان! آپ کی گفتگو کتنی حسین ہے،ہمیں آپ کا پڑوس عطا کر کے ہم پر برکت نازل فرمائی گئی ہے،تو اے نوجوان! آپ کون ہیں؟'' حضرت یوسف علیہ السلام نے بتایا: ''میں یوسف ہوں،اللہ کے برگزیدہ بندے یعقوب اور اللہ کے نیک بندے اور رسول کا بیٹا ہوں،اور ابراہیم خلیل اللہ کا بیٹا ہوں''۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب اس عورت نے اپنے خاوند سے کہا کہ اس عبرانی غلام نے مجھے رسوا کر دیا،میں چاہتی ہوں کہ آپ اس کو قید میں ڈال دیں،تو اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قید میں ڈال دیا۔حضرت یوسف علیہ السلام قید خانہ میں غمزدہ قیدیوں سے تعزیت کرتے،بیماروں کی عیادت کرتے،زخمیوں کی دواداری کرتے اور ساری رات نماز پڑھتے رہتے تھے اور خوفِ خدا سے روتے حتیٰ کہ اُن کے ساتھ قید خانہ کی دیواریں بھی روتیں اور چھت بھی روتی اور دروازے بھی روتے۔اور قیدی اُن سے مانوس ہو گئے،اُن میں سے جب کوئی قیدی قید سے نکل کر واپس آتا تو حضرت یوسف علیہ السلام سے ملنے کے لیے آتا اور قید خانہ کا داروغہ بھی اُن سے محبت کرتا تھا اور اُن کا خیال رکھتا تھا،پھر ایک دن اُس نے کہا: اے یوسف! میں تم سے اتنی زیادہ محبت کرتا ہوں کہ میں نے کسی سے اتنی محبت نہیں کی،حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: میں تمہاری محبت سے اللہ کی پناہ طلب کرتا ہوں،اس نے پوچھا: کیوں! تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: میرے باپ نے مجھ سے محبت کی تو میرے بھائیوں نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا جو کیا،اور میری مالکہ نے مجھ سے محبت کی تو اس کی محبت کے نتیجہ میں،میں آج قید میں ہوں۔

پھر حضرت یوسف علیہ السلام کی قید کے ایام میں بادشاہ اپنے باورچی پر اور شراب پلانے والے پر کسی وجہ سے ناراض ہوا،پس بادشاہ نے اُن دونوں کو قید کرنے کا حکم دیا۔قید خانہ میں وہ دونوں حضرت یوسف علیہ السلام سے مانوس ہو گئے۔اور اس کے متعلق اس آیت میں ارشاد ہے: ''وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ''۔

اور ایک قول یہ ہے کہ باورچی نے طعام میں زہر ڈال دیا تھا،جب وہ طعام آیا تو شراب پلانے والے نے کہا: اے بادشاہ! تم یہ طعام نہ کھانا،اس میں زہر ملا ہوا ہے،اور باورچی نے کہا: اے بادشاہ! تم یہ شراب نہ پینا اس شراب میں زہر ملا ہوا ہے۔پس بادشاہ نے شراب پلانے والے سے کہا: اس کو پیو،اس نے شراب پی تو اس کو کوئی ضرر نہیں ہوا،اور باورچی سے کہا کہ تم روٹی کھاؤ تو اس نے انکار کر دیا۔پھر اس نے وہ طعام کسی جانور کے سامنے رکھا تو وہ اسی ساعت مر گیا،پس بادشاہ نے ان دونوں کو قید کر دیا اور وہ ایک مدت تک حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ قید خانہ میں رہے۔اور شراب پلانے والے کا نام ''منجا'' تھا اور روٹی پکانے والے کا نام ''مجلث'' تھا۔اس کو علامہ الثعلبی نے کعب احبار سے روایت کیا ہے۔

(الکشف والبیان للامام الہمام ابو اسحاق احمد المعروف بالامام الثعلبی المتوفی ۴۲۷ھ، ج ۵ ص ۲۲۱۔۲۲۲، دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۲۲ھ)

اور اس آیت میں فرمایا ہے ''فَتَيٰنِ''،کیونکہ وہ دونوں غلام تھے اور غلام کو ''فتی'' کہا جاتا ہے خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو،اس کا الماوردی نے ذکر کیا ہے۔حضرت یوسف علیہ السلام نے قید خانہ میں قید لوگوں سے کہا تھا کہ میں خواب کی تعبیر بتاتا ہوں تو اُن دو قیدیوں میں سے ایک نے اپنے صاحب سے کہا: آؤ! ہم اس عبرانی غلام کو آزمائیں،پس اُن دونوں نے حضرت یوسف علیہ السلام سے سوال کیا

کہ ہم دونوں نے خواب دیکھا ہے۔

جھوٹا خواب بیان کرنے والے کے متعلق وعید

حدیث میں ہے کہ جو شخص سچا ہوتا ہے اس کا خواب بھی سچا ہوتا ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ یہ جھوٹا خواب تھا۔ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی آزمائش اور تجربہ کرنے کے متعلق ان کے سامنے یہ خواب بیان کیا۔ اور یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور السدی کا قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ جس شخص کو سولی پر چڑھایا جانا تھا وہ جھوٹا تھا اور دوسرا سچا تھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے ایسا خواب بیان کیا جو اس نے نہیں دیکھا تھا، اسے اس کا مکلف فرمایا جائے گا کہ وہ دو جَو کے درمیان گرہ لگائے اور وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکے گا، اور جس شخص نے کسی قوم کی بات سننے کے لیے کان لگائے اور وہ لوگ اس کو ناپسند کرتے ہوں یا اس سے بھاگتے ہوں تو اس کے کانوں میں قیامت کے دن پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جائے گا، اور جس نے کوئی تصویر بنائی اس کو عذاب دیا جائے گا اور اس کو اس کا مکلف فرمایا جائے گا کہ وہ اس میں جان ڈالے اور وہ اس میں جان نہیں ڈال سکے گا۔

(صحیح البخاری: ۷۰۴۲، صحیح مسلم: ۲۱۱۰، سنن ترمذی: ۱۷۵۱، سنن ابوداؤد: ۵۰۱۸، سنن نسائی: ۵۳۵۸، مسند احمد: ۳۳۸۳، ۵۹۹۳، ۲۲۲۵)

"قَالَ أَحَدُهُمَا": یعنی اُن میں سے ایک نے کہا: میں نے تین انگوروں کے خوشے لیے، پھر میں نے ان کو صبح صبح نچوڑلیا، پھر میں نے ان کو صاف کیا، پھر میں نے اس کو بادشاہ کو پلایا جس طرح میری عادت تھی، اور یہ اس آیت کے متعلق ہے" إِنِّيْ أَرٰىنِيْ أَعْصِرُ خَمْرًا "یعنی میں نے خواب میں دیکھا کہ میں خمر نچوڑ رہا ہوں، یعنی میں انگور نچوڑ رہا ہوں۔ اور یہ عمان کی لغت ہے۔

"وَقَالَ الْاٰخَرُ إِنِّيْ أَرٰىنِيْ أَحْمِلُ فَوْقَ رَأْسِيْ خُبْزًا تَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَأْوِيْلِهٖ ۚ إِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ": حضرت یوسف علیہ السلام نے اُن دونوں سے پوچھا کہ تم نے کیا خواب دیکھا ہے، تو روٹی پکانے والے نے کہا: گویا کہ میں نے تین تنوروں میں روٹیاں لگائیں اور وہ روٹیاں میں نے تین ٹوکروں میں رکھیں، پھر اس ٹوکرے کو میں نے اپنے سر پر رکھا اور پرندے آئے اور اس میں سے کھانے لگے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "یوسف نے کہا: "تمہارے لیے جو کھانا لایا جاتا ہے تم دونوں کے پاس اس کھانے کے آنے سے پہلے میں تم دونوں کو اس خواب کی تعبیر بتا دوں گا، خواب کی تعبیر ان چیزوں میں سے ہے جس کی اللہ نے مجھے تعلیم فرمائی ہے، جو قوم اللہ کی توحید پر ایمان نہیں لائی میں اس قوم کو چھوڑ چکا ہوں اور وہی لوگ آخرت کا انکار کر کے کفر کرتے ہیں" O (یوسف: ۳۷)

"قَالَ لَا يَأْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖ إِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيْلِهٖ قَبْلَ أَنْ يَّأْتِيَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ إِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ": حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: میں تمہیں اس خواب کی تعبیر کی خبر دوں گا، انہوں نے کہا: اچھا آپ خبر دیں۔ اور یہ وہ علم غیب تھا جو حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ مخصوص تھا، انہوں نے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اُن کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے، کیونکہ انہوں نے اُن لوگوں کے دین کو ترک کر دیا جو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لائے، یعنی بادشاہ کے

دین کو ترک کر دیا۔ پس پہلے تم دین کے متعلق میری بات سنو تا کہ تم ہدایت پا جاؤ، اس لیے اُن کو اس وقت تک خواب کی تعبیر نہیں بتائی حتیٰ کہ پہلے انہیں اسلام کی دعوت دی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور میں نے اپنے آباء و اجداد ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کے دین کی پیروی کی ہے، اور ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک قرار دیں، یہ ہم پر اللہ کا فضل ہے اور دوسرے لوگوں پر (بھی)، لیکن اکثر لوگ اللہ کا شکر ادا نہیں کرتے O'' (یوسف: ۳۸)

''وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَآءِيْ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا'': یعنی میں نے اپنے ان آباء کی ملت کی پیروی کی ہے، کیونکہ وہ انبیاء برحق ہیں۔ اور ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں، یہ اللہ تعالیٰ کا ہم پر فضل ہے۔ اس میں اشارہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو زنا کے فعل سے محفوظ رکھا۔ ''وَعَلَى النَّاسِ'': اور مومنین پر بھی اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے شرک سے بچایا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ہم پر فضل ہے کہ انہوں نے ہم کو انبیاء بنایا۔ اور لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ انہوں نے رسولوں کو اُن کی طرف بھیجا۔ ''وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ'': اور لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔ یعنی توحید کی نعمت کا اور ایمان کی نعمت کا شکر ادا نہیں کرتے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اے میرے قید خانہ کے دو ساتھیو! یہ بتاؤ کیا الگ الگ خداؤں کا ماننا بہتر ہے یا ایک اللہ کو ماننا (بہتر ہے) جو سب پر غالب ہیں؟O'' (یوسف: ۳۹)

''يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ'': اے قید خانہ میں رہنے والے لوگو یہ بتاؤ! کہ کیا مختلف خداؤں کو ماننا بہتر ہے یا ایک اللہ کو ماننا بہتر ہے جو الواحد القہار ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ خطاب اُن دونوں سے تھا اور دوسروں سے تھا، اور اُن کے سامنے بت رکھے تھے جن کی وہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے۔ اور انہوں نے یہ بتایا کہ اگر مختلف خدا ہوں اور اُن سب کی الگ الگ مشیت ہو تو اُن میں سے کس کا چاہا ہوا پورا ہوگا، سو جس کا چاہا ہوا پورا ہو جائے وہ غالب ہوگا اور باقی خدا مغلوب ہوں گے، اور جو مغلوب ہو جائیں وہ اس لائق نہیں ہیں کہ اُن کی پرستش کی جائے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''تم اللہ کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو وہ صرف چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباء و اجداد نے رکھ لیے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اُن ناموں کی صحت پر کوئی دلیل قائم نہیں فرمائی، حکم دینا صرف اللہ کا حق ہے، انہوں نے یہ حکم دیا ہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر اور کسی کی عبادت نہ کرو، یہی مضبوط دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے O'' (یوسف: ۴۰)

''مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ'': یعنی تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جن کی پرستش کرتے ہو، وہ صرف نام ہیں ان کا کوئی مصداق نہیں ہے، اور یہ نام بھی تم نے اپنے پاس سے رکھ لیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ

نے اپنی کتاب میں اُن کی الوہیت پر کوئی دلیل قائم نہیں فرمائی۔"اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ": یعنی حکم دینا صرف اللہ کا حق ہے، انہوں نے یہ حکم دیا ہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر اور کسی کی عبادت نہ کرو، یہی مضبوط دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:"اے قید خانہ کے میرے دو ساتھیو! تم میں سے ایک تو اپنے بادشاہ کو خمر (شراب) پلایا کرے گا، اور رہا دوسرا تو اس کو صلیب پر چڑھایا جائے گا، پس پرندے اس کے سر سے گوشت نوچ کر کھائیں گے، اس خواب کی تعبیر مقدر ہو چکی ہے جس کے متعلق تم مجھ سے سوال کرتے تھے O"(یوسف: ۴۱)

"يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّاۤ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَ اَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ": شراب پلانے والے سے حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: تم تین دن کے بعد بادشاہ کے پاس لوٹا دیے جاؤ گے اور تمہیں اپنے منصب پر فائز کر دیا جائے گا۔ اور دوسرے سے فرمایا: تمہیں تین دن کے بعد بلایا جائے گا، تمہیں سولی پر چڑھایا جائے گا اور پرندے تمہارے سر سے نوچ نوچ کر کھائیں گے، اس نے کہا: اللہ کی قسم! میں نے تو کوئی خواب نہیں دیکھا تھا، حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: تم نے خواب دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو، اب اسی طرح ہوگا۔ تم دونوں نے جس چیز کے متعلق سوال کیا تھا، ان کے متعلق اسی طرح تقدیر میں مقدر ہو چکا ہے۔

ہمارے علماء نے بیان کیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے خواب کے متعلق جھوٹ بولے اور تعبیر کرنے والا اس کے مطابق تعبیر بیان کر دے تو کیا اس کی تعبیر اس پر لازم ہوگی؟ تو ہم کہتے ہیں کہ اس کی تعبیر اس پر لازم نہیں ہوگی، یہ صرف حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے تھا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نبی تھے، اور نبی کی تعبیر اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتی ہے۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام نے ان دونوں سے فرمایا تھا کہ تمہارے ساتھ ایسا ہوگا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ ویسا ہی فرما دیا، تاکہ نبی کی نبوت کا صدق ظاہر ہو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:"اُن دونوں میں سے جس کے متعلق یوسف کا گمان تھا کہ وہ ان دونوں میں سے نجات پانے والا ہے اس سے یوسف نے کہا:"تم اپنے بادشاہ کے سامنے میرا ذکر کرنا" پس اس کو شیطان نے بادشاہ کے سامنے ان کا ذکر کرنا بھلا دیا، لہٰذا وہ کئی سال قید خانہ میں ٹھہرے رہے O"(یوسف: ۴۲)

"وَ قَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ": اس آیت میں مذکور ہے:"اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ" یعنی اپنے بادشاہ کے سامنے میرا ذکر کرنا، اور لغت میں یہ معروف ہے کہ سید کو اور بادشاہ کو رب کہا جاتا ہے۔ یعنی بادشاہ کو یہ بیان کرنا جو تم نے دیکھا ہے اور یہ بتلانا کہ مجھے ظلماً قید میں بغیر کسی جرم کے رکھا گیا ہے۔

اپنے مالک یا آقا کو رب کہنے کی ممانعت میں حدیث

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص (اپنے غلام سے) یہ نہ کہے کہ اپنے رب کو کھلاؤ، اپنے رب کو وضو کراؤ، اپنے رب کو پانی پلاؤ، بلکہ اس کو کہنا چاہیے: اپنے سردار، میرا آقا اور تم میں سے کوئی شخص یہ نہ کہے کہ

میرا بندہ یا میری بندی، اور اس کو یوں کہنا چاہیے کہ میرا خادم اور میری خادمہ اور میرا غلام۔
(صحیح البخاری: ۲۵۵۲، صحیح مسلم: ۲۲۴۹، الرقم المسلسل: ۵۷۶۷، عمل الیوم واللیلۃ للنسائی: ۲۴۲، مشکل الآثار: ۱۵۶۸، مسند احمد ج ۲ ص ۴۲۳ طبع قدیم، مسند احمد: ۹۷۲۹، ج ۱۵ ص ۴۵۳، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت)

"فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ": یعنی شیطان نے حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ بھلا دیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کریں، اور وہ اللہ تعالیٰ سے فریاد کرتے اور انہوں نے بادشاہ کو شراب پلانے والے سے کہا کہ وہ بادشاہ کے سامنے میرا ذکر کرے اور اس کو بتائے کہ مجھے ناحق قید کیا گیا، تاکہ بادشاہ مجھے اس قید سے چھڑائے تو چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام نے مخلوق سے مدد چاہی تھی اس لیے اس کے عتاب میں اُن کو چند سال مزید قید میں رکھا گیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے چند سال مزید قید میں رہنے کے متعلق روایات

عبدالعزیز بن عمیر الکندی نے بیان کیا ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام حضرت یوسف نبی علیہ السلام کے پاس قید خانہ میں آئے، حضرت یوسف علیہ السلام نے اُن کو پہچان لیا، تو انہوں نے کہا: کیا وجہ ہے کہ آپ کو میں ان نافرمانوں کے ساتھ دیکھ رہا ہوں، حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا: اے طاہر ابن الطاہرین! اللہ رب العالمین آپ کو سلام کہتے ہیں، کیا آپ کو خیال نہیں آیا کہ آپ نے آدمیوں سے مدد چاہی؟ اور مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم! میں آپ کو چند سال مزید قید میں رکھوں گا، حضرت یوسف علیہ السلام نے پوچھا: اے جبریل! کیا میرے رب مجھ سے راضی ہیں، کہا: ہاں!

اور ایک روایت ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے آکر رب عزوجل کے عتاب کی خبر سنائی اور کہا: اللہ عزوجل فرماتے ہیں: اے یوسف! آپ کو بھائیوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے کس نے نجات عطا فرمائی تھی؟ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے، کہا: پھر آپ کو اس اندھے کنویں سے کس نے نکالا تھا؟، انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے، کہا: پھر آپ کو بے حیائی کے کاموں سے کس نے بچایا تھا؟ کہا: اللہ تعالیٰ نے، پھر عورتوں کی سازش سے کس نے بچایا تھا، انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے، کہا: پھر آپ نے کیسے مخلوق سے مدد چاہی اور رب کو چھوڑ دیا اور رب سے سوال نہیں کیا؟ حضرت یوسف علیہ السلام نے عرض کیا: اے میرے رب! یہ مجھ سے لغزش ہو گئی کہ میں آپ سے سوال کرتا، اے ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب اور آدم علیہم السلام کے رب! آپ مجھ پر رحم فرمائیں، تب حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا: آپ پر اس عتاب کی وجہ سے مزید چند سال قید خانہ میں رہنے کو مقدر فرما دیا گیا ہے۔

روایاتِ مذکورہ کا بطلان

ان روایات پر رد کیا گیا ہے، کیونکہ قرآن مجید میں ہے: "وَقَالَ الَّذِي نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ" (یوسف: ۴۵) "(دو قیدیوں میں سے بچ جانے والے کو ایک مدت کے بعد یوسف یاد آئے)۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنے رب کا ذکر کرنا نہیں بھولے تھے بلکہ وہ شراب پلانے والا بھولا تھا۔ نیز اس روایت میں ہے کہ "شیطان نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا بھلا دیا"، یہ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام پر شیطان تصرف نہیں کر سکتا، قرآن مجید میں ہے:"
اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ (الحجر: ۴۲)" (بے شک میرے مخلص بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا)۔ اور انبیاء علیہم السلام کا بھولنا ممکن ہے، وہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام پہنچاتے ہیں اور خبر پہنچاتے ہیں، اس میں ان کا بھولنا ممکن نہیں ہے، البتہ

معاملات میں ان کا بھولنا محال نہیں ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے قید خانہ میں زیادہ مدت تک ٹھہرنے کی صحیح توجیہ

"فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ": لہٰذا وہ کئی سال قید خانہ میں ٹھہرے رہے۔

میں کہتا ہوں: پھر یہ سوال ہوگا کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا نہیں بھولے اور انہوں نے مخلوق سے مدد نہیں چاہی تو پھر کس وجہ سے ان کو کئی سال تک مزید قید میں رکھا گیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے تقدیری معاملات ہیں، اللہ تعالیٰ نے ازل میں اسی طرح مقدر فرمایا تھا تاکہ حضرت یوسف علیہ السلام زیادہ عرصہ قید خانہ کی صعوبتیں برداشت کریں اور وہ جتنا عرصہ قید خانہ میں رہیں گے اتنا عرصہ دین کی تبلیغ کرتے رہیں گے اور ان کا یہ وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت اور ان کے دین کی تبلیغ میں گزرے گا، اور قید خانہ کی مشقتوں پر صبر کرتے رہیں گے اور ان کے اجر و ثواب میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ اور بہرحال اللہ تعالیٰ مالک علی الاطلاق ہیں، وہ اپنی مخلوق کے ساتھ جس طرح چاہیں، جو چاہیں کریں، وہ مالک اور مختار ہیں اور کسی کو ان پر اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے۔ اور جتنا زیادہ حضرت یوسف علیہ السلام نے مصائب پر صبر کیا، اللہ تعالیٰ نے اتنا زیادہ ان کا مرتبہ بڑھایا اور ان کو بہت زیادہ اجر و ثواب عطا فرمایا۔ یا یہ اس وجہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت میں یہ ہو کہ اس شخص کا سیدنا یوسف علیہ السلام پر کوئی احسان نہ ہو بلکہ حضرت یوسف علیہ السلام جو اس قید خانہ سے نکلیں تو ان کا قوم پر احسان ہو اور وہ صرف اپنے رب کے شکرگزار رہیں، اس کے غیر کے نہیں۔ (سعیدی غفرلہ)

(الجامع لاحکام القرآن، جز ۹، ص ۱۶۰-۱۶۸، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَىٰ سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعَ سُنبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ ۖ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِي فِي رُؤْيَايَ إِن كُنتُمْ لِلرُّؤْيَا تَعْبُرُونَ ﴿٤٣﴾

اور بادشاہ نے کہا: "میں نے خواب میں سات ایسی گائیں دیکھی ہیں جو بہت موٹی تازی ہیں اور ان موٹی تازی گائیوں کو سات دبلی پتلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات سرسبز خوشے دیکھے ہیں اور دوسرے سات خشک خوشے دیکھے ہیں، اے درباریو! اگر تم میرے اس خواب کی تعبیر بیان کر سکتے ہو تو مجھے بیان کرو"O

قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ ۖ وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعَالِمِينَ ﴿٤٤﴾

اہل دربار نے کہا: یہ پریشان خواب ہیں، اور ہم پریشان خوابوں کی تعبیر کو جاننے والے نہیں ہیںO

وَقَالَ الَّذِي نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ أَنَا أُنَبِّئُكُم بِتَأْوِيلِهِ فَأَرْسِلُونِ ﴿٤٥﴾

اور دو قیدیوں میں سے بچ جانے والے کو ایک عرصہ کے بعد یوسف یاد آئے، (اس نے کہا:) میں تمہیں اس خواب کی تعبیر بتاؤں گا سو آپ لوگ مجھے (قید خانہ میں) بھیج دیںO

يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعِ

سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ یٰبِسٰتٍۙ لَّعَلِّیْۤ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَعْلَمُوْنَ۝۴۶

(قید خانہ میں پہنچ کر اس نے کہا:) اے یوسف! اے بہت سچے دوست، ہمیں اس کی تعبیر بتائیں کہ سات ایسی گائیں ہیں جو موٹی تازی ہیں، ان کو سات دبلی گائیں کھا لیتی ہیں اور سات سرسبز خوشے ہیں اور دوسرے خشک خوشے ہیں، شاید میں لوٹ کر ان لوگوں کے پاس جاؤں تا کہ وہ آپ کی قدر پہچانیں O

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِیْنَ دَاَبًاۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ۝۴۷

یوسف نے کہا: تم سات سال لگا تار کھیتوں میں کاشت کرو گے، پھر جب تم فصل کاٹو تو اس کو اس کے خوشوں میں ہی چھوڑ دو، مگر تھوڑی سی مقدار رکھ لینا جس کو تم کھاتے رہو O

ثُمَّ یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ یَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ۝۴۸

پھر اس کے بعد سات سال بہت قحط کے آئیں گے، پس جو کچھ تم نے جمع کر رکھا تھا وہ ان سب کو کھا جائیں گے سوا تھوڑی مقدار کے جس کو تم محفوظ کرو گے O

ثُمَّ یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِیْهِ یُغَاثُ النَّاسُ وَ فِیْهِ یَعْصِرُوْنَ۠۝۴۹

پھر اس کے بعد ایک ایسا سال آئے گا جس میں لوگوں پر خوب بارش ہوگی اور لوگ اس میں (پھلوں سے) خوب رس نچوڑیں گے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور بادشاہ نے کہا: "میں نے خواب میں سات ایسی گائیں دیکھی ہیں جو بہت موٹی تازی ہیں اور ان موٹی تازی گائیوں کو سات دبلی پتلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات سرسبز خوشے دیکھے ہیں اور دوسرے سات خشک خوشے دیکھے ہیں، اے درباریو! اگر تم میرے اس خواب کی تعبیر بیان کر سکتے ہو تو مجھے بیان کرو" O (یوسف:۴۳)

یوسف: ۴۳ کا گزشتہ آیتوں سے ارتباط

علامہ ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ، یوسف: ۴۳ تا ۴۹ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّیْۤ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ یٰبِسٰتٍ":

اللہ عزوجل کا طریقہ یہ ہے کہ جب وہ کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو اس کے اسباب مہیا فرما دیتے ہیں اور جب حضرت یوسف علیہ السلام کی خوش حالی اور کشادگی کا دور آیا تو بادشاہ نے خواب میں سات موٹی تازی گائیں دیکھیں جو ایک خشک دریا سے نکلیں، پھر ان کے بعد سات انتہائی دبلی پتلی گائیں نکلیں اور وہ دبلی پتلی گائیں ان موٹی تازی گائیوں کو نگل گئیں، اور اس نے سات سرسبز خوشے دیکھے

جن کے دانے پک چکے تھے اور سات دوسرے خشک خوشے دیکھے، پھر انہیں کاٹ کر رکھا گیا تو وہ سات خشک خوشے اُن سات سرسبز خوشوں پر غالب آ گئے اور ان کی کوئی چیز باقی نہ رہی، سو بادشاہ نے کاہنوں کو، نجومیوں کو اور خواب کی تعبیر بتانے والوں کو جمع کیا اور ان کے سامنے اپنے خواب کا قصہ بیان کیا جیسا کہ ارشاد ہے: ''یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِیْ فِیْ رُءْیَایَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْیَا تَعْبُرُوْنَ''۔ (اے درباریو! اگر تم میرے اس خواب کی تعبیر بیان کر سکتے ہو تو مجھے بیان کرو)۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اہلِ دربار نے کہا: یہ پریشان خواب ہیں، اور ہم پریشان خوابوں کی تعبیر کو جاننے والے نہیں ہیںO'' (یوسف: ۴۴)

''قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ'': اہلِ دربار نے کہا: یہ پریشان خواب ہیں۔

اس آیت میں ''اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ'' کا ذکر ہے، اس کا معنی ہے: وہ خواب جس کی تعبیر صحیح نہ ہو سکے، کیونکہ اس خواب میں خلط ملط باتیں ہوں۔ (الصحاح ص ۶۲۲، دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۲۹ھ)

''وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِیْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِیْنَ'': اور درباریوں نے کہا: ہم پریشان خوابوں کی تعبیر کو جاننے والے نہیں ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور دو قیدیوں میں سے بچ جانے والے کو ایک عرصہ کے بعد یوسف یاد آئے، (اس نے کہا:) میں تمہیں اس خواب کی تعبیر بتاؤں گا، سو آپ لوگ مجھے (قید خانہ میں) بھیج دیںO'' (یوسف: ۴۵)

''وَقَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِیْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ'': اور اُن دو قیدیوں میں سے جو ایک قتل ہونے سے بچ گیا تھا اور وہ شراب پلانے والا تھا، اس کو ایک عرصہ کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ کہنا یاد آیا کہ تم اپنے بادشاہ کے پاس میرا ذکر کرنا، اور اس کو یہ سات سال کے بعد یاد آیا۔ اس نے کہا: اے بادشاہ! قید خانہ میں ایک مرد ہے جو خواب کی تعبیروں کو جانتا ہے، آپ لوگ مجھے وہاں بھیج دیں، یعنی اے بادشاہ! مجھے اس شخص کے پاس ملنے کے لیے قید خانہ بھیج دیں، پھر بادشاہ نے اس کو بھیج دیا، پس وہ قید خانہ میں پہنچا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ وہ قید خانہ شہر میں نہیں تھا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''(قید خانہ میں پہنچ کر اس نے کہا:) اے یوسف! اے سچے دوست! ہمیں اس کی تعبیر بتائیں کہ سات ایسی گائیں ہیں جو موٹی تازی ہیں، ان کو سات دبلی گائیں کھا لیتی ہیں اور سات سرسبز خوشے ہیں اور دوسرے خشک خوشے ہیں، شاید میں لوٹ کر اُن لوگوں کے پاس جاؤں تاکہ وہ آپ کی قدر پہچانیںO'' (یوسف: ۴۶)

''یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ یٰبِسٰتٍ'': اس نے کہا: اے یوسف! اے بہت زیادہ سچ بولنے والے! ہمیں اس کی تعبیر بتائیں کہ سات ایسی موٹی گائیں ہیں جن کو سات دبلی گائیں کھا لیتی ہیں اور سات سرسبز خوشے ہیں اور سات خشک خوشے ہیں، کیونکہ بادشاہ نے یہ خواب دیکھا ہے۔

''لَّعَلِّیْۤ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَعْلَمُوْنَ'': شاید کہ میں لوگوں کی طرف یعنی شہر والوں کی طرف جاؤں اور شاید وہ اس

خواب کی تعبیر کو جان لیں، اور دوسرا قول یہ ہے کہ شاید کہ وہ لوگ بادشاہ کے پاس آپ کی قدر و منزلت کو جانیں، پس اُن سے حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر بیان کرتے ہوئے اور اُن کو بتاتے ہوئے فرمایا: رہی سات موٹی تازی گائیں اور رہے سات سرسبز خوشے، تو یہ وہ سات سال ہیں جن میں غلہ کی فراوانی ہوگی، اور رہی سات دبلی گائیں اور سات خشک خوشے تو یہ اس کے بعد سات سال قحط کے آئیں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''یوسف نے کہا: تم سات سال لگاتار کھیتوں میں کاشت کرو گے، پھر جب تم فصل کاٹو اس کو اس کے خوشوں میں ہی چھوڑ دو، مگر تھوڑی سی مقدار رکھ لینا جس کو تم کھاتے رہو O'' (یوسف: ۴۷)

''قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِیْنَ دَاَبًا'': یوسف نے کہا: تم سات سال تک خوب کاشت کاری کرو، سات سال اپنی معروف عادت کے مطابق کھیتوں میں فصل اگاتے رہو۔ اس آیت میں ''دَاَبًا'' کا لفظ ہے اس کا معنی ہے عادت، دوسرا معنی ہے پوری جدو جہد اور کوشش کے ساتھ کاشت کاری کرتے رہو۔ ''فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ'': پس جو تم فصل کاٹو تو اس فصل کو اس کے خوشوں میں چھوڑ دو، یعنی گندم کو اس کے خوشوں میں چھوڑ دو، تاکہ وہ دیر تک باقی رہے اور خراب نہ ہو، سوا اس قلیل مقدار کے جس کو تم اپنے کھانے کے لیے روک لو۔ ان کو یہ حکم دیا کہ اکثر کو تم محفوظ کر لو اور بہ قدر ضرورت کھالو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''پھر اس کے بعد سات سال بہت قحط کے آئیں گے، پس جو کچھ تم نے جمع کر رکھا تھا وہ ان سب کو کھا جائیں گے سوا تھوڑی مقدار کے جس کو تم محفوظ کرو گے O'' (یوسف: ۴۸)

''ثُمَّ یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ یَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ'': پھر اس کے بعد سات قحط کے سال آئیں گے، پھر تم ان میں اپنا جمع شدہ غلہ کھالو۔ ''اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ'': سوا اس تھوڑی سی مقدار کے جس کو تم محفوظ کر لو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''پھر اس کے بعد ایک ایسا سال آئے گا جس میں لوگوں پر خوب بارش ہوگی اور لوگ اس میں (پھلوں سے) خوب رس نچوڑیں گے O'' (یوسف: ۴۹)

''ثُمَّ یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِیْهِ یُغَاثُ النَّاسُ وَ فِیْهِ یَعْصِرُوْنَ'': پھر اس کے بعد ایسا سال آئے گا جس میں ان لوگوں پر خوب بارش ہوگی۔ اور اس سال لوگ انگوروں سے شراب نچوڑیں گے، اور تلوں سے تیل نکالیں گے۔ ابوعبیدہ نے کہا: یعنی اس سال ان کو مصیبت سے نجات مل جائے گی۔ (معالم التنزیل ج ۲ ص ۴۹۳۔ ۴۹۵، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

وَ قَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِیْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّیْ بِكَیْدِهِنَّ عَلِیْمٌ ۝

اور بادشاہ نے کہا: جس نے تعبیر بتائی ہے (یعنی یوسف نے) اس کو میرے پاس لاؤ، جب قاصد یوسف کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا: تم اپنے بادشاہ کے پاس واپس جاؤ، پس اس سے سوال کرو ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے، بے شک میرے رب اُن کے مکر کو خوب جاننے والے ہیں O

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ إِذْ رَاوَدتُّنَّ يُوسُفَ عَن نَّفْسِهِ ۚ قُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِن سُوءٍ ۚ قَالَتِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ الْآنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ أَنَا رَاوَدتُّهُ عَن نَّفْسِهِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ ﴿٥١﴾

بادشاہ نے (ان عورتوں سے) پوچھا: اے عورتو! تمہارا اس وقت کیا حال تھا جب تم یوسف کے نفس کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں؟ ان عورتوں نے کہا: اللہ ہر عیب سے پاک ہے، ہمارے علم کے مطابق یوسف میں کوئی عیب نہیں تھا، عزیز مصر کی بیوی نے کہا: "اب تو حق واضح ہو ہی گیا ہے، میں نے ہی یوسف کو اُن کے نفس سے اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی تھی اور بے شک وہ وہ ضرور سچوں میں سے تھے" O

ذَٰلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي كَيْدَ الْخَائِنِينَ ﴿٥٢﴾

یوسف نے کہا: میں نے یہ بات اس لیے کہی تھی تا کہ بادشاہ کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی پیٹھ پیچھے اس کی خیانت نہیں کی، اور بے شک اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو ہدایت نہیں عطا فرماتے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور بادشاہ نے کہا: جس نے تعبیر بتائی ہے (یعنی یوسف نے) اس کو میرے پاس لاؤ، جب قاصد یوسف کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا: تم اپنے بادشاہ کے پاس واپس جاؤ، پس اس سے سوال کرو ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے، بے شک میرے رب اُن کے مکر کو خوب جاننے والے ہیں O" (یوسف: ۵۰)

حضرت یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی ظاہر ہونے کا قصہ

علامہ ابو الفرج عبد الرحمٰن بن علی بن الجوزی الحنبلی المتوفی ۵۹۷ھ، یوسف: ۵۰ تا ۵۲ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ": مفسرین نے بیان کیا ہے کہ جب وہ شراب پلانے والا بادشاہ کی طرف لوٹا اور اس کو اس کے خواب کی تعبیر بتائی تو بادشاہ کے دل میں اس خواب کی صحت جاگزیں ہو گئی، اس نے کہا: میرے پاس اس شخص کو لے کر آؤ جس نے میرے خواب کی تعبیر بیان کی ہے۔ "فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ": پھر قاصد حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس آیا اور کہا کہ بادشاہ کی دعوت کو قبول کرو اور اس کے پاس جاؤ۔ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے جانے سے انکار کیا حتیٰ کہ اُن کی اس تہمت سے براءت معلوم ہو جائے جو اُن پر لگائی گئی تھی، اس لیے انہوں نے کہا: "ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ": یعنی تم بادشاہ کے پاس واپس جاؤ۔

"فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ ۚ إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ": سو اس بادشاہ سے سوال کرو کہ اُن عورتوں کے بارے میں معلوم کرے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے اور انہوں نے ایک سازش کی تھی۔ اور بے شک میرے رب اُن کی سازش کو خوب جاننے والے ہیں۔

اور ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ آپ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی اس احتیاط کی تحسین فرمائی، جو انہوں نے قید خانہ سے جلد نکلنے کے معاملہ میں صبر کیا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم حضرت ابراہیم کی بہ نسبت شک کرنے کے زیادہ حق دار ہیں، جب انہوں نے یہ کہا تھا: اے میرے رب! مجھے دکھا ئیں کہ آپ مردے کو کس طرح زندہ فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا آپ کو اس پر یقین نہیں ہے؟ عرض کیا: کیوں نہیں! مگر اس لیے کہ میرا دل مطمئن ہو جائے (البقرہ: ۲۶۰) اور اللہ تعالیٰ حضرت لوط علیہ السلام پر رحم فرمائیں جو کسی مضبوط جائے پناہ کی پناہ لینے کی تمنا کرتے تھے اور اگر میں قید خانہ میں اتنی لمبی مدت گزارتا جتنی لمبی مدت حضرت یوسف نے گزاری تھی تو میں (قید خانے سے نکل کر) بلانے والے کی بات مان لیتا۔

(صحیح البخاری: ۳۳۷۲، ۳۳۷۵، ۳۳۸۷، ۴۵۳۷، ۴۶۹۴، ۶۹۹۲، صحیح مسلم: ۱۵۱، سنن ابن ماجہ: ۴۰۲۶، مسند احمد: ۸۱۲۹، صحیح ابن حبان: ۶۲۰۸، مشکل الآثار للطحاوی: ۳۲۷)

حضرت یوسف علیہ السلام نے جن عورتوں سے دریافتِ حال کا مطالبہ کیا، ان میں زلیخا کا ذکر نہ کرنے کی توجیہات

اس آیت میں عزیزِ مصر کی بیوی کے سوا عورتوں کا ذکر کیا ہے، اس کی چار توجیہات ہیں:

(۱) الزجاج نے کہا: اس آیت میں عزیزِ مصر کی بیوی کا ذکر نہیں کیا اور دوسری عورتوں کے ساتھ اس کو ملا دیا تا کہ اس کا ادب قائم رہے (۲) کیونکہ وہ بادشاہ کی بیوی تھی تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کو بچایا (۳) کیونکہ وہ عورتیں عزیزِ مصر کی بیوی پر گواہ تھیں (۴) اس کا ذکر کرنے میں اس پر ایک قسم کی تہمت تھی، اس لیے حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کے ذکر سے اعراض فرمایا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "بادشاہ نے (ان عورتوں سے) پوچھا: اے عورتو! تمہارا اس وقت کیا حال تھا جب تم یوسف کے نفس کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں؟ ان عورتوں نے کہا: اللہ ہر عیب سے پاک ہے، ہمارے علم کے مطابق یوسف میں کوئی عیب نہیں تھا، عزیزِ مصر کی بیوی نے کہا: "اب تو حق واضح ہو ہی گیا ہے، میں نے ہی یوسف کو اُن کے نفس سے اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی تھی اور بے شک وہ ضرور سچوں میں سے تھے" O (یوسف: ۵۱)

مفسرین نے کہا ہے کہ وہ قاصد حضرت یوسف علیہ السلام کے پیغام کو لے کر بادشاہ کے پاس پہنچا تو بادشاہ نے اُن عورتوں کو بلایا اور ان میں عزیزِ مصر کی بیوی بھی تھی، پس بادشاہ نے کہا: "مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ": یعنی بادشاہ نے کہا: تم اس قصہ کے متعلق کیا کہتی ہو جب تم سب نے یوسف کو اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کی تھی؟

ایک سوال کا جواب

اپنے نفس کی طرف راغب کرنے والی تو صرف ایک عورت تھی، تو بادشاہ نے ان سب کو سوال میں جمع کیوں کیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ صرف زلیخا نے یوسف کو اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کی تھی اور باقی عورتوں نے اس کی موافقت

کی تھی۔ اس لئے اس نے ان سب کو سوال میں جمع کیا۔

"قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ": (ان عورتوں نے کہا: اللہ ہر عیب سے پاک ہے، ہمارے علم کے مطابق یوسف میں کوئی عیب نہیں تھا)۔ پس بادشاہ کو حضرت یوسف علیہ السلام کے عیب اور تہمت سے بری ہونے کا علم ہو گیا۔ "قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ": اس وقت عزیز مصر کی بیوی نے کہا: "اَلْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ": ("اب تو حق واضح ہو گیا ہے، میں نے ہی یوسف کو ان کے نفس سے اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی تھی اور بے شک وہ ضرور سچوں میں سے تھے")۔ یعنی اب تو حقیقت مکمل کر واشگاف ہو گئی ہے، تو اس نے ندامت اور توبہ کو ظاہر کیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کے صدق اور سچائی کو ثابت کیا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "یوسف نے کہا: میں نے یہ بات اس لیے کہی تھی تاکہ بادشاہ کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی پیٹھ پیچھے اس کی خیانت نہیں کی، اور بے شک اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو ہدایت نہیں عطا فرماتاO" (یوسف: ۵۲)

"ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ": یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے بتایا کہ میں نے جو قاصد کو بادشاہ کی طرف لوٹایا تھا، وہ اس لئے تھا کہ میں نے بادشاہ کے پیٹھ پیچھے اس کی خیانت نہیں کی۔ یعنی بادشاہ کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کے پیٹھ پیچھے اس کی خیانت نہیں کی۔ "وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ": اور بے شک اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو ہدایت عطا نہیں فرماتے۔
(زاد المسیر، ج ۴ ص ۲۴۵۔ ۲۴۸، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۲ھ)

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ، لکھتے ہیں:

ان آیات میں اس عورت کی طرف سے اس بات کی قوی شہادت ہے کہ حضرت یوسف صلوات اللہ علیہ ہر قسم کے گناہوں سے پاک دامن تھے اور تمام عیوب سے مبرا تھے۔ اور یہاں پر ایک باریک نکتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کی بیوی کی جانب کی رعایت کی، کیونکہ انہوں نے فرمایا: "مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ"، ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے۔ پس حضرت یوسف علیہ السلام نے ان عورتوں کا ذکر کیا اور عزیز مصر کی بیوی کا ذکر نہیں کیا۔ تو اس عورت نے جان لیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے دانستہ اس کے ذکر کو ترک کر دیا، تاکہ اس کی پردہ پوشی ہو اور اہل دربار کے سامنے اس کی عزت اور اس کا احترام قائم رہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے اس حسن سلوک کا یہ اثر ہوا کہ اس عورت نے بھی جواب میں حقیقت کو واشگاف کر کے حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پاک دامنی سے پردہ اٹھا دیا اور اس نے اعتراف کر لیا کہ ہر قسم کا گناہ اس عورت کی جانب سے ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام ہر قسم کے گناہوں سے مبرا ہیں۔
(تفسیر کبیر، ج ۶ ص ۴۶۷۔ ۴۶۸، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

وَمَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۳﴾

(یوسف نے تواضعاً کہا:) میرا مقصد اپنے نفس کی پاک دامنی اور ستائش کرنا نہیں تھا، بے شک نفس برائی کا حکم دینے والا ہے سوا اس کے جس پر میرے رب رحم فرمائیں، بے شک میرے رب سب سے زیادہ بخشنے والے، سب سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں O

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ﴿۵۴﴾

اور بادشاہ نے کہا: ان کو میرے پاس لاؤ، میں ان کو اپنا خاص مقرب بناؤں گا، پھر جب بادشاہ نے یوسف سے بات کی تو بادشاہ نے کہا: اے یوسف! آج سے آپ ہمارے نزدیک معزز اور معتمد ہیں O

قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۵﴾

یوسف نے کہا: مجھے سرزمین مصر کے خزانوں پر مقرر فرما دیں، بے شک میں خزانوں کی خوب حفاظت کرنے والا، خوب جاننے والا ہوں O

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ؕ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾

اور اسی طرح ہم نے یوسف کے لیے سرزمین مصر میں اقتدار عطا فرما دیا، وہ اس زمین کے جس حصہ میں چاہیں، وہاں جائیں، ہم اپنی رحمت سے جسے چاہتے ہیں عطا فرماتے ہیں اور ہم نیکی کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں فرماتے O

وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۷﴾

اور بے شک آخرت کا اجر ان لوگوں کے لیے بہت بہتر ہے جو ایمان لاتے ہیں اور اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''(یوسف نے تواضعاً کہا:) میرا مقصد اپنے نفس کی پاک دامنی اور ستائش کرنا نہیں تھا، بے شک نفس برائی کا حکم دینے والا ہے سوا اس کے جس پر میرے رب رحم فرمائیں، بے شک میرے رب سب سے زیادہ بخشنے والے، سب سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں O'' (یوسف: ۵۳)

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ ھ، یوسف: ۵۳ تا ۵۷ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ'':

کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام نے پہلے یہ کہا تھا: ''ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ (یوسف: ۵۲)'' (میں نے یہ بات اس لیے کہی تھی تاکہ بادشاہ کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی پیٹھ پیچھے اس کی خیانت نہیں کی)۔ اس سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنی تحسین کر رہے ہیں اور کسی بھی شخص کے لیے اپنی تعریف و تحسین کرنا ممنوع ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''فلا

تُزَكُّوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ ؕ هُوَ اَعۡلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی ۞ (النجم: ۳۲)" (پس تم اپنی پاک بازی کا دعویٰ نہ کرو، اللہ اُن کو خوب جانتے ہیں جو اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں O)۔ اور چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے یہ کہنے سے کہ میں نے بادشاہ کے پیٹھ پیچھے اس کی خیانت نہیں کی، ان کی اپنی تعریف و تحسین کا پہلو نکلتا تھا، اس لیے حضرت یوسف علیہ السلام نے اس سے اپنی براءت کا اظہار کیا اور کہا: "وَمَاۤ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ"۔

نفسِ امارہ اور نفسِ مطمئنہ کی تعریفات

امام رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ نفسِ امارۃ بالسوء (برائی کا حکم دینے والا نفس) کیا ہے؟ اور محققین نے یہ کہا ہے کہ نفسِ انسانیہ ایک چیز ہے اور اس کی صفات بہت ہیں، پس جب وہ عالمِ الٰہی کی طرف مائل ہوتا ہے تو وہ نفسِ مطمئنہ ہے اور جب وہ شہوت اور غضب کی طرف مائل ہوتا ہے تو وہ نفس امارۃ بالسوء ہے اور اس کا امارۃ بالسوء ہونا مبالغہ کا فائدہ دیتا ہے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ نفس اپنے حدوث کی ابتداء سے محسوسات اور لذائذ سے الفت رکھتا ہے، اور اس سے محبت و عشق میں مبتلاء ہوتا ہے، اور نفس کا عالمِ مجردات کا شعور رکھنا اور اس کی طرف مائل ہونا بہت نادر ہے اور یہ کسی کسی کو حاصل ہوتا ہے۔ اور کسی ایک کو اپنی زندگی کے کسی ایک وقت میں عالمِ مجردات کی طرف میلان نصیب ہوتا ہے اور وہ اس پر غالب عالم جسمانی کی طرف رغبت کرتا ہے اور عالمِ اعلیٰ کی طرف اس کی ترقی بہت نادر ہوتی ہے، اس وجہ سے ضروری تھا کہ نفس پر نفس امارۃ بالسوء کا حکم لگایا جائے، اور بعض لوگوں کا یہ زعم ہے کہ نفسِ مطمئنہ یہی نفس عقلیہ ہے۔ اور رہا نفسِ شہوانیہ اور نفسِ غضبیہ یہ نفسِ عقلیہ سے الگ الگ ہیں اور اس کی تفسیر معقولات میں مذکور ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۶ ص ۴۷۱، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

امام ابو منصور محمد بن محمد ماتریدی المتوفی ۳۳۳ھ، یوسف: ۵۳ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

کیونکہ نفس اپنی طبیعت اور جبلت سے شہوات اور لذات کی طرف مائل ہوتا ہے اور اس میں گرنا چاہتا ہے۔ اور مکروہات اور سختیوں سے دور رہتا ہے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "فَاَمَّا مَنۡ طَغٰی ۙ﴿۳۷﴾ وَ اٰثَرَ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا ۙ﴿۳۸﴾ فَاِنَّ الۡجَحِیۡمَ هِیَ الۡمَاۡوٰی ﴿ؕ۳۹﴾ وَ اَمَّا مَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَی النَّفۡسَ عَنِ الۡهَوٰی ﴿ۙ۴۰﴾ فَاِنَّ الۡجَنَّةَ هِیَ الۡمَاۡوٰی ﴿ؕ۴۱﴾ (النازعات: ۳۷۔۴۱)" (تو جس نے سرکشی کی O اور دنیاوی زندگی کو ترجیح دی O تو بے شک دوزخ ہی اس کا ٹھکانا ہے O اور جو اپنے رب کی بارگاہ میں کھڑا ہونے سے ڈرا اور اس نے (اپنے) نفس کو (بری) خواہش سے روکا O تو بے شک جنت ہی اس کا ٹھکانا ہے O)

(تاویلات اہل السنۃ ج ۶ ص ۲۵۴، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۶ھ)

میں کہتا ہوں: اس آیت سے نفس کی تین قسمیں مستفاد ہوتی ہیں کہ جو نفس دنیاوی زندگی کی راحتوں اور عیش و عشرت کو ترجیح دیتا ہو خواہ وہ عیش و عشرت اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی سے حاصل ہو وہ نفسِ امارہ ہے جیسے ارشاد باری ہے: "فَاَمَّا مَنۡ طَغٰی ۙ﴿۳۷﴾ وَ اٰثَرَ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا ۙ﴿۳۸﴾ (النازعات: ۳۷۔۳۸)"۔

اور جو نفس برے کاموں سے روکتا ہو اور برے کاموں پر ملامت کرتا ہو، وہ نفسِ لوامہ ہے، جیسے ارشاد ہے: "وَ اَمَّا مَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَی النَّفۡسَ عَنِ الۡهَوٰی ﴿ۙ۴۰﴾ (النازعات: ۴۰)"۔

اور جو نفس اپنے آپ کو برے کاموں سے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے دور رکھتا ہو وہ نفسِ مطمئنہ ہے اور یہ بھی اسی آیت میں داخل ہے۔

نفسِ لوامہ اور نفسِ مطمئنہ کی تعریفات

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی شافعی متوفی ۵۰۲ھ، لکھتے ہیں:

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَلَاۤ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ۝ (القیامہ:۲)" (اور اپنے اوپر بہت ملامت کرنے والے نفس کی قسم۝)۔ایک قول یہ ہے کہ نفسِ لوامہ وہ نفس ہے جو اگر کوئی ناپسندیدہ کام کرے تو خود پر ملامت کرتا ہے اس کا درجہ نفسِ مطمئنہ سے کم ہوتا ہے۔دوسرا قول یہ ہے کہ یہ وہ نفس ہے جو اپنی ذات میں مطمئن ہوتا ہے اور دوسرے نیک آداب کے حصول میں کوشاں ہوتا ہے اور یہ نفسِ مطمئنہ کے اوپر کا درجہ ہے۔(المفردات ج ۲ ص ۵۸۸، مکتبہ نزار مصطفی الباز، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ)

نفس کی مزید اقسام اور اُن کی تعریفات

علامہ علی بن محمد بن علی الجرجانی الحنفی المتوفی ۸۱۶ھ، لکھتے ہیں:

(۱) نفسِ امارہ: یہ وہ نفس ہے جو طبیعتِ بدنیہ کی طرف مائل ہو اور لذات اور شہواتِ حسیہ کے حصول کا حکم دیتا ہو اور دل کو سفلی جانب کھینچتا ہو۔یہ نفس شرور کا ماویٰ ہے اور اخلاقِ ذمیمہ کا منبع ہے۔

(۲) النفس القدسیہ: یہ وہ نفس ہے جو تحقیقی طور پر تمام ممکنہ مطالب کو حاضر کرنے پر قادر ہو۔

(۳) النفس اللوامہ: یہ وہ نفس ہے جو نورِ عقل سے روشن ہو اور جب بھی غفلت سے کسی معصیت کا ارتکاب ہو تو یہ ملامت کرے اور اس معصیت سے توبہ کرے۔

(۴) النفس المطمئنہ: یہ وہ نفس ہے جو نورِ عقل سے منور ہو حتیٰ کہ صفاتِ مذمومہ سے خالی ہو اور اخلاقِ محمودہ سے متخلق ہو۔

(کتاب التعریفات ص ۱۶۸، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۸ھ)

شیخ اشرف علی تھانوی دیوبندی متوفی ۱۳۶۴ھ، یوسف: ۵۳ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

بجز اس (نفس) کے جس پر میرا رب رحم کرے (اور اس میں امر بالسوء کا مادہ نہ رکھے جیسا انبیاء علیہم السلام کے نفوس ہوتے ہیں، مطمئنہ جن میں یوسف علیہ السلام کا نفس بھی داخل ہے، خلاصہ مطلب یہ ہوا کہ میری نزاہت وعصمت میرے نفس کا ذاتی کمال نہیں کہ تخلف محال ہو بلکہ رحمت وعنایاتِ الٰہیہ کا اثر ہے اس لئے وہ امر بالسوء نہیں کرتا ورنہ جیسے اوروں کے نفوس ہیں ویسا ہی میرا ہوتا) بلاشبہ میرا رب بڑی مغفرت والا بڑی رحمت والا ہے (یعنی اوپر جو نفس کی دو قسمیں معلوم ہوئیں امارہ اور مطمئنہ سو امارہ اگر توبہ کرلے تو اس کی مغفرت فرمائی جاتی ہے اور مرتبہ توبہ میں وہ لوامہ کہلاتا ہے اور جو مطمئنہ ہے وہ کمال اس کا لازم ذات نہیں بلکہ عنایت ورحمت کا اثر ہے پس امارہ کے لوامہ ہونے پر عفو کا ظہور ہوتا ہے اور مطمئنہ میں رحیم کا)۔

(تفسیر بیان القرآن ج ۲ ص ۲۵۷، مکتبہ رحمانیہ لاہور)

سید ابو الاعلیٰ مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء لکھتے ہیں:

قرآن مجید میں نفسِ انسانی کی تین قسموں کا ذکر کیا گیا ہے: ایک وہ نفس جو انسان کو برائیوں پر اکساتا ہے اس کا نام نفسِ امارہ

ہے۔ دوسرا وہ نفس جو غلط کام کرنے، یا غلط سوچنے، یا بری نیت رکھنے پر نادم ہوتا ہے اور انسان کو اس پر ملامت کرتا ہے، اس کا نام نفسِ لوامہ ہے۔ اور اسی کو ہم آج کل کی اصطلاح میں ضمیر کہتے ہیں۔ تیسرا وہ نفس جو صحیح راہ پر چلنے اور غلط راہ چھوڑ دینے میں اطمینان محسوس کرتا ہے اس کا نام نفسِ مطمئنہ ہے۔ (تفہیم القرآن، ج ۶ ص ۱۶۴، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور)

نفس کی سات اقسام

علامہ سید عمر بن احمد آفندی الحنفی الخر پوتی المتوفی ۱۲۹۹ھ، لکھتے ہیں کہ نفس کی سات اقسام ہیں:

(۱) النفس الامارة: یہ وہ نفس ہے جو طبیعتِ بدنیہ کی طرف مائل ہوتا ہے اور لذات اور شہواتِ حسیہ کے حصول کا حکم دیتا ہے اور دل کو سفل جانب کے حصول کا امر کرتا ہے اور یہ برائیوں اور اخلاقِ مذمومہ کا منبع ہے، کیونکہ یہ تکبر، حرص، شہوت، حسد، غضب، بخل اور کینہ کا منبع ہے۔

(۲) النفس اللوامة: یہ وہ نفس ہے جو قلب کے نور سے منور ہوتا ہے اور قوتِ عاقلہ کے حکم کی اطاعت کرتا ہے اور کبھی اس کی نافرمانی کرتا ہے اور کبھی برے کاموں پر نادم ہوتا ہے، پس اپنے نفس کو برے کاموں پر ملامت کرتا ہے اور یہ ندامت کا منبع ہے۔

(۳) النفس المطمئنة: یہ وہ نفس ہے جو نورِ قلب سے منور ہوتا ہے اور صفاتِ مذمومہ سے خالی ہوتا ہے اور اخلاقِ محمودہ سے متصف ہوتا ہے۔

(۴) النفس الملهمة: یہ وہ نفس ہے جس میں اللہ تعالیٰ علم اور تواضع اور قناعت اور سخاوت کا الہام فرماتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ نفس صبر اور شکر اور سخاوت کا منبع ہے۔

(۵) النفس الراضية: یہ وہ نفس ہے جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہو گئے ہیں اور اس میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے آثار ظاہر ہوتے ہیں اور وہ کرامت، اخلاص اور اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔

(۶) النفس المرضية: یعنی جو نفس اللہ تعالیٰ سے راضی ہو جائے جیسے قرآن مجید میں ہے: "وَرَضُوۡا عَنۡهُ۔ (البینۃ: ۸)"۔

(۷) النفس الصالحة: یہ وہ نفس ہے جو اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان مقامِ اسرار پر فائز ہوتا ہے۔

پھر نفس کا پہلا مرتبہ یعنی نفسِ امارہ، یہ کافرین، شیطان اور فاسقین کا ہوتا ہے۔ اور دوسرا مرتبہ یعنی نفسِ لوامہ یہ مومنین غیر فاسقین کا ہوتا ہے۔ اور تیسرا مرتبہ یعنی نفسِ مطمئنہ، یہ متعلمین العالمین کا ہوتا ہے، اور چوتھا مرتبہ النفس الملهمه، یہ معلمین اور عالمین کا ہوتا ہے، اور پانچواں مرتبہ النفس الراضیه، یہ اولیاء کرام کا نفس ہوتا ہے، اور چھٹا مرتبہ النفس المرضیه یہ عارفین کا نفس ہوتا ہے، اور ساتواں مرتبہ النفس الصالحه، یہ انبیاء اور مرسلین کا نفس ہوتا ہے۔

(قصیدۃ البردہ مع شرح عصیدۃ الشہدہ، ص ۴۷، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

مصنف کے نزدیک نفس کی مشہور اقسام

(۱) نفسِ امارہ: جس کا نفس شہوت اور غضب کے تقاضوں میں ڈوبا رہتا ہو اور وہ انسان کو برائی اور بدکاری کا حکم دیتا ہو، یہ عموماً فساق اور فجار کا نفس ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "فَاَمَّا مَنۡ طَغٰیۙ ﴿۳۷﴾ وَ اٰثَرَ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَاۙ ﴿۳۸﴾ فَاِنَّ الۡجَحِیۡمَ هِیَ الۡمَاۡوٰی ﴿۳۹﴾ (النازعات: ۳۷-۳۹)" (تو جس نے سرکشی کی ○ اور دنیاوی زندگی کو ترجیح دی ○ تو بے شک دوزخ ہی اس کا ٹھکانا ہے ○)۔

(۲) نفسِ لوامہ: جس کا نفس اس کو اس کے کیے ہوئے برے کاموں پر ملامت کرتا ہو، یہ عموماً عام مسلمانوں کا نفس ہوتا ہے جو برے کام کرنے کے بعد اپنے آپ کو ملامت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓىٕفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۝" (الاعراف: ۲۰۱) (بے شک جو لوگ اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں، جب ان کے دلوں میں شیطان کی طرف سے کوئی خیال آتا ہے، وہ فوراً سنبھل جاتے ہیں، سو اسی وقت ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں O)۔

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۪ وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۪۫ وَلَمْ یُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ۝" (آل عمران: ۱۳۵) (اور وہ لوگ جنہوں نے کسی بے حیائی کا ارتکاب کیا یا اپنی جانوں پر (گناہ کر کے) ظلم کیا، پس انہوں نے اللہ کو یاد کیا، پھر انہوں نے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کی اور اللہ کے سوا کون گناہوں کی مغفرت فرماتا ہے! اور انہوں نے جان بوجھ کر اپنے کیے ہوئے کاموں پر اصرار نہیں کیا O)۔

(۳) نفسِ مطمئنہ: جس کا نفس اللہ تعالیٰ کی محبت میں مستغرق رہتا ہو اور وہ کوئی غلط اور برا کام نہیں کرتا اور نیک کاموں میں مصروف رہتا ہو۔ یہ انبیاء علیہم السلام اور صالحین کے نفوس ہیں، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىٕنَّةُ ۝ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۝ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ۝ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۝" (الفجر: ۲۷-۳۰) (اے مطمئن روح O اپنے رب کی طرف اس حال میں لوٹ جا کہ تو ان سے راضی وہ تجھ سے راضی O پھر میرے خاص بندوں میں داخل ہو O اور میری جنت میں داخل ہو جا O)۔

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِیَ رَبَّهٗ ۝" (البینۃ: ۸) (اللہ اُن سے راضی ہوئے اور وہ اللہ سے راضی ہوئے، یہ اس کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈرے O)۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور بادشاہ نے کہا: ان کو میرے پاس لاؤ، میں ان کو اپنا خاص مقرب بناؤں گا، پھر جب بادشاہ نے یوسف سے بات کی تو بادشاہ نے کہا: اے یوسف! آج سے آپ ہمارے نزدیک معزز اور معتمد ہیں O" (یوسف: ۵۴)

"وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِیْ بِهٖۤ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْیَوْمَ لَدَیْنَا مَكِیْنٌ اَمِیْنٌ":

اس آیت میں متعدد مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: اس بادشاہ کے مصداق میں اختلاف ہے، بعض مفسرین نے کہا کہ وہ عزیزِ مصر ہے، بعض نے کہا: نہیں وہ ریان ہے جو بڑا بادشاہ ہے۔ اور یہ قول دو وجہ سے زیادہ ظاہر ہے۔

(۱) حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ کہنا کہ "اجْعَلْنِیْ عَلٰى خَزَآىٕنِ الْاَرْضِ"، یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس سے مراد بڑا بادشاہ ہے۔

(۲) اس بادشاہ کا یہ کہنا کہ میں اس کو خاص اپنے لیے رکھوں گا، یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس سے پہلے وہ خاص اس کے لیے نہیں تھا۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام اس سے پہلے تو عزیزِ مصر کے لیے خاص تھے۔ پس یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ بادشاہ وہی تھا جو بڑا بادشاہ تھا۔

دوسرا مسئلہ: مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس قید خانہ میں گئے اور اُن سے کہا: آپ یہ دعا

کیجئے "اے اللہ! میرے لیے اپنے پاس سے کشادگی فرمادیں اور مصیبت سے نکلنے کا راستہ بنادیں اور مجھے وہاں سے رزق عطا فرمائیں جہاں سے مجھے گمان بھی نہ ہو"۔ پس اللہ تعالیٰ نے اُن کی دعا قبول فرمائی اور اُن کے قید خانہ سے نکلنے کا یہ سبب بنادیا۔

بادشاہ کے نزدیک حضرت یوسف علیہ السلام کے عظیم اعتقاد کی وجوہ

(۱) حضرت یوسف علیہ السلام کے علم کے سبب سے بادشاہ کے دل میں اُن کا اعتقاد پیدا ہو گیا، کیونکہ جس خواب کی تعبیر سے اس کے دربار کے حاضرین اور کاہن وغیرہ عاجز رہے اور حضرت یوسف علیہ السلام نے ایسا جواب دیا کہ عقل اس کی صحت پر شاہد تھی اور طبیعت اس کی طرف رغبت کرتی تھی۔

(۲) حضرت یوسف علیہ السلام کے صبر اور ثابت قدمی کی وجہ سے بادشاہ کے دل میں اُن کا اعتقاد پیدا ہو گیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام قید خانہ میں کئی سال قید رہے، اور جب انہیں قید خانہ سے نکلنے کی اجازت دی گئی تو انہوں نے نکلنے میں جلدی نہیں کی بلکہ صبر کیا اور توقف کیا اور پہلے یہ مطالبہ کیا کہ تمام تہمتوں سے ان کی براءت ہو جائے۔

(۳) حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن ادب کی وجہ سے بادشاہ کے دل میں اُن کی وقعت زیادہ ہو گئی، کیونکہ انہوں نے یہ کہا" مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ ۔ (یوسف: ۵۰)" (پس اس سے سوال کرو ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے) اور بادشاہ کی بیوی کا نام نہیں لیا تا کہ وہ بدنام نہ ہو۔ پس انہوں نے اس کے ذکر کو چھپایا اور باقی عورتوں کا ذکر کیا، اور یہ اُن کا بہت عجیب وغریب ادب ہے۔

(۴) حضرت یوسف علیہ السلام کا تمام تہمتوں سے بری ہونا، کیونکہ ان کے مخالف نے ان کی پاکیزگی کا اور جرم سے براءت کا اعتراف اور اقرار کیا۔

(۵) اس شراب بنانے والے نے قید خانہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کی عبادت وریاضت کا اور ان کی حسنِ کارکردگی کا ذکر کیا۔

(۶) وہ قید خانہ میں کئی سال رہے، اور ان امور میں سے ہر امر کسی انسان کے حق میں حسنِ اعتقاد کو واجب کرتا ہے، تو اس کا مجموعہ بادشاہ کے حسنِ اعتقاد کا سبب کیوں نہیں ہوگا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "یوسف نے کہا: مجھے سرزمینِ مصر کے خزانوں پر مقرر فرمادیں، بے شک میں خزانوں کی خوب حفاظت کرنے والا، خوب جاننے والا ہوں O" (یوسف:۵۵)

"قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ": یوسف نے کہا: مجھے سرزمین مصر کے خزانوں پر مقرر فرمادیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا منصب امارت کو طلب کرنا

کوئی شخص یہ اعتراض کرسکتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے امارت کو کیوں طلب کیا؟ حالانکہ حدیث میں اس کی ممانعت ہے، حدیث میں ہے:

حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عبدالرحمٰن امارت کا سوال نہ کرنا، کیونکہ اگر تمہیں منصب امارت سوال کے بعد دیا گیا تو تم کو اس کی طرف سونپ دیا جائے گا، اور اگر تم کو بغیر سوال کے یہ منصب عطا کیا گیا تو

تمہاری اس پر مدد کی جائے گی۔

(صحیح البخاری: ۶۶۲۲، ۶۷۲۲، ۷۱۴۶، ۷۱۴۷، صحیح مسلم: ۱۶۵۲، سنن ابن ماجہ: ۲۳۰۹، سنن ابوداؤد: ۲۹۲۹، سنن ترمذی: ۱۵۲۹، السنن الکبریٰ للنسائی: ۵۹۰۲، ۸۶۹۲، سنن نسائی: ۵۳۸۴، مستخرج ابی عوانہ: ۵۹۳۸، مسند احمد: ۲۰۶۱۸، مسند ابن ابی شیبہ: ۸۸۸، مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۲۵۴۳، سنن دارمی: ۲۳۹۱، شرح مشکل الآثار: ۵۹، صحیح ابن حبان: ۳۳۳۸، المعجم الاوسط للطبرانی: ۱۳، المستدرک علی الصحیحین ۸۶۱۸، حلیۃ الاولیاء ج ۷ ص ۲۳۰، مسند الشہاب القضاعی: ۹۳۸، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۱۹۸۳۱، معرفۃ السنن والآثار: ۱۹۳۸۰، شرح السنۃ للبغوی: ۲۳۳۵، کشف المشکل: ۲۶۵)

اس حدیث کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کا تعلق ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت سے ہے اور رہے حضرت یوسف علیہ السلام تو وہ اللہ کے نبی تھے اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ اُن کی شریعت میں منصب کا سوال کرنا جائز تھا۔

نیز وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخلوق کی طرف برحق رسول تھے اور رسول پر اپنی امت کی مصلحتوں کی بہ قدر امکان رعایت کرنا واجب ہے۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام یہ سمجھتے تھے کہ اس منصب کی وجہ سے وہ مستحقین تک نفع پہنچائیں گے اور اُن سے ضرر کو دور فرمائیں گے، اس لیے اُن کا مخلوق کی مصلحتوں کی وجہ سے اس منصب کا سوال کرنا اُن پر واجب تھا۔

نیز حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: "اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ": یعنی میں لوگوں کی تمام مصلحتوں کی حفاظت کرنے کو جانتا ہوں اور اُن کی تمام ضروریات کو جانتا ہوں۔ اور اس مال کے ذریعہ اُن کی ضرورتوں کو پورا کرنا جانتا ہوں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اسی طرح ہم نے یوسف کے لیے سرزمین مصر میں اقتدار عطا فرمادیا، وہ اس زمین کے جس حصہ میں چاہیں، وہاں جائیں، ہم اپنی رحمت سے جسے چاہتے ہیں عطا فرماتے ہیں اور ہم نیکی کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں فرماتے O" (یوسف: ۵۶)

علامہ محمود بن عمر الزمخشری الخوارزمی المتوفی ۵۳۸ھ، یوسف: ۵۶ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ":

روایت ہے کہ بادشاہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے شاہی سلطنت کی انگوٹھی نکال کر حضرت یوسف علیہ السلام کی انگلی میں پہنادی اور اپنی تلوار اُن پر لٹکادی اور اُن کے لیے سونے کا تخت بچھادیا جس میں موتی اور یاقوت جڑے ہوئے تھے۔

روایت ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس بادشاہ سے کہا: رہا یہ تخت تو اس کے ساتھ تم اپنے ملک کو مضبوط کرنا، اور رہی یہ انگوٹھی تو اس کے ساتھ تم اپنے ملک کی تدبیر کرنا۔ رہا یہ تاج تو نہ یہ میرا لباس ہے اور نہ میرے آباء و اجداد کا لباس ہے۔ بادشاہ نے کہا: میں نے یہ تاج آپ کے سر پر اس لیے رکھا ہے تاکہ آپ کی بزرگی ظاہر ہو اور آپ کی فضیلت کا اقرار ہو، پس اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو تخت پر بٹھادیا اور تمام سردار حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے سرنگوں ہوگئے، پس بادشاہ نے ملک حضرت یوسف علیہ السلام کے سپرد کردیا اور قطفیر معزول ہوگیا اور اس کے بعد مرگیا۔

پھر بادشاہ کی بیوی زلیخا حضرت یوسف علیہ السلام کے نکاح میں آگئی، پھر جب حضرت یوسف علیہ السلام اس کے پاس داخل ہوئے تو فرمایا: کیا یہ حلال ذریعہ اس سے بہتر نہیں ہے جو تم حرام ذریعہ سے طلب کررہی تھیں؟ انہوں نے اس عورت کو دوشیزہ (کنواری)

پایا۔اس سے ان کے دو بیٹے "افرائیم" اور "میشا" پیدا ہوئے اور حضرت یوسف علیہ السلام نے تمام سرزمین مصر میں عدل کو قائم فرمایا اور تمام مصر کے رہنے والے مرد اور عورتیں ان سے محبت کرنے لگے۔اور بہت سارے سرداروں نے اُن کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔

اور قحط کے ایام میں پہلے سال لوگوں نے دراہیم اور دینار دے کر طعام خریدا تھا،اور دوسرے سال زیورات اور جواہر دے کر طعام خریدا تھا، پھر تیسرے سال اپنی سواریاں اور زمینیں دے کر طعام خریدا، پھر اپنے غلاموں اور خدام کو دے کر طعام خریدا، حتیٰ کہ ان سالوں میں وہ سب لوگ حضرت یوسف علیہ السلام کے غلام بن گئے۔اور لوگوں نے کہا: ہم نے اس شان کا بادشاہ کوئی نہیں دیکھا کہ تمام مخلوق اس کی غلام بن گئی ہو، جب حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ سنا تو انہوں نے کہا: میں اللہ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں نے مصر کے تمام لوگوں کو اول سے لے کر آخر تک آزاد کر دیا اور ان کی جائیداد اور ان کی املاک ان پر واپس کر دیں، اور جب لوگ اُن سے طعام خریدنے کے لیے طلب کرتے تو وہ صرف اتنا طعام بیچتے جو صرف ایک اونٹ پر لادا جاتا، تا کہ باقی لوگوں پر طعام کی تنگی نہ ہو۔

"يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ؕ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ":

اور کنعان اور شام کے شہروں میں یہ خبریں پہنچ گئیں تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس بھیجا تا کہ ان سے طعام خریدیں، اور حضرت یوسف علیہ السلام نے بنیامین کو اپنے پاس روک لیا اور یہ دنیا میں ہماری ان پر عطاء اور نوازش تھی کہ اُن پر خوش حالی عطا فرمائی گئی اور ہم اپنی حکمت کے اعتبار سے جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں اور نیکوکاروں کے اجر کو ضائع نہیں فرماتے۔(تفسیر الکشاف ج ۲ ص ۳۵۵۔۳۵۶، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۷ھ تفسیر کبیر ج ۶ ص ۴۷۳۔۴۷۶، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:"اور بے شک آخرت کا اجر اُن لوگوں کے لیے بہت بہتر ہے جو ایمان لاتے ہیں اور اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں O" (یوسف:۵۷)

"وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ": اس آیت سے مراد یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اگرچہ دنیا میں بلند مقامات تک پہنچے اور عظیم درجات سے واصل ہوئے، لیکن آخرت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے لیے اس سے بہت زیادہ اجر وثواب رکھا ہے۔(تفسیر کبیر ج ۶ ص ۴۶۹۔۴۷۶، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۸﴾

اور یوسف کے بھائی (مصر) آئے، پس وہ یوسف کے دربار میں داخل ہوئے، سو یوسف نے ان کو پہچان لیا اور ان کے بھائی یوسف کو پہچاننے والے نہ تھے O

وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ ۚ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْۤ اُوْفِي الْكَيْلَ وَاَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿۵۹﴾

اور جب یوسف نے اُن کو اُن کی ضرورت کا سامان مہیا کر دیا تو ان سے کہا:"تم اپنے باپ شریک بھائی (بنیامین) کو میرے پاس

نے کرآتا، کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں پیمانہ بھر بھر کر غلہ دیتا ہوں، اور میں بہترین مہمان نوازوں میں سے ہوں"O

فَإِن لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِندِي وَلَا تَقْرَبُونِ ﴿٦٠﴾

"اور اگر تم اس کو میرے پاس نہ لائے تو میرے پاس تمہارے لئے کوئی غلہ نہیں ہوگا اور آئندہ تم میرے قریب بھی نہ آنا"O

قَالُوا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ أَبَاهُ وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ ﴿٦١﴾

یوسف کے بھائیوں نے کہا: "ہم اس کے متعلق عنقریب اپنے والد سے مشورہ کریں گے اور ہم ضرور یہ کام کرنے والے ہیں"O

وَقَالَ لِفِتْيَانِهِ اجْعَلُوا بِضَاعَتَهُمْ فِي رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُونَهَا إِذَا انقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٦٢﴾

اور یوسف نے اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ "ان کی رقم ان کی بوریوں میں ڈال دو تا کہ جب وہ لوٹ کر اپنے گھر والوں کے پاس جائیں تو پہچان لیں کہ یہ تو وہی رقم ہے، ہوسکتا ہے وہ اسی وجہ سے لوٹ آئیں"O

فَلَمَّا رَجَعُوا إِلَىٰ أَبِيهِمْ قَالُوا يَا أَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَأَرْسِلْ مَعَنَا أَخَانَا نَكْتَلْ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴿٦٣﴾

پھر جب یوسف کے بھائی اپنے والد کے پاس لوٹ کر گئے تو انہوں نے کہا: "اے ہمارے ابا جان! ہمیں آئندہ کے لیے غلہ دینے سے روک دیا گیا، سو آپ ہمارے ساتھ ہمارے (باپ شریک) بھائی کو بھیج دیں تا کہ ہم غلہ لاسکیں اور بے شک ہم ضرور اس کی حفاظت کرنے والے ہیں"O

قَالَ هَلْ آمَنُكُمْ عَلَيْهِ إِلَّا كَمَا أَمِنتُكُمْ عَلَىٰ أَخِيهِ مِن قَبْلُ ۖ فَاللَّهُ خَيْرٌ حَافِظًا ۖ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ﴿٦٤﴾

یعقوب نے کہا: "کیا میں اس کے متعلق تم پر اسی طرح اعتبار کرلوں جس طرح پہلے میں نے اس کے بھائی کے متعلق تم پر اعتبار کیا تھا؟" پس اللہ سب سے بہتر حفاظت فرمانے والے ہیں اور ہر رحم کرنے والے سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں"O

وَلَمَّا فَتَحُوا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ إِلَيْهِمْ ۖ قَالُوا يَا أَبَانَا مَا نَبْغِي ۖ هَٰذِهِ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ إِلَيْنَا ۖ وَنَمِيرُ أَهْلَنَا وَنَحْفَظُ أَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيرٍ ۖ ذَٰلِكَ كَيْلٌ يَسِيرٌ ﴿٦٥﴾

اور جب انہوں نے اپنی بوریاں کھولیں تو دیکھا کہ ان کی رقم انہیں لوٹا دی گئی ہے، انہوں نے کہا: اے ہمارے ابا جان! ہمیں اس سے زیادہ اور کیا چاہیے، یہ ہماری رقم ہے جو ہماری طرف واپس کر دی گئی ہے، ہم اپنے گھر والوں کے لیے غلہ لائیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور ایک اونٹ پر لادے جانے والے غلہ سے زیادہ غلہ لائیں گے، یہ جو ہم غلہ لے کر آئے ہیں یہ تو بہت ناکافی ہے O

قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِیْ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ یُّحَاطَ بِكُمْۚ فَلَمَّاۤ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِیْلٌ ﴿۶۶﴾

یعقوب نے کہا: میں اس کو ہرگز تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا حتیٰ کہ تم اللہ کی قسم کھا کر مجھ سے پکا وعدہ کرو کہ تم اس کو ضرور لے کر آؤ گے سوا اس کے کہ تم پر کوئی مصیبت طاری ہو جائے، پھر جب انہوں نے یعقوب سے قسم کھا کر پختہ وعدہ کر لیا تو یعقوب نے کہا: ''ہم نے جو کچھ وعدہ کیا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ گواہ ہیں'' O

وَقَالَ یٰبَنِیَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍؕ وَمَاۤ اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُۚ وَعَلَیْهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۶۷﴾

اور یعقوب نے کہا: اے میرے بیٹو! تم ایک ہی دروازہ سے داخل نہ ہونا اور الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا، میں تم سے اللہ کی تقدیر کو ٹال نہیں سکتا، بے شک حکم صرف اللہ کا ہے، میں نے اسی پر توکل کیا ہے اور توکل کرنے والوں کو اسی پر توکل کرنا چاہیے O

وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَیْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْؕ مَا كَانَ یُغْنِیْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِیْ نَفْسِ یَعْقُوْبَ قَضٰىهَاؕ وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ۠ ﴿۶۸﴾

اور جب یعقوب کے بیٹے اس طرح داخل ہوئے جس طرح ان کو ان کے باپ نے حکم دیا تھا اور یعقوب ان سے اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو کچھ ٹال نہیں سکتے تھے مگر یعقوب کے دل میں خواہش تھی جس کو انہوں نے پورا کیا، اور بے شک یعقوب ہمارے سکھائے ہوئے علم کے مطابق علم والے تھے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور یوسف کے بھائی (مصر) آئے، پس وہ یوسف کے دربار میں داخل ہوئے، سو یوسف نے ان کو پہچان لیا اور ان کے بھائی یوسف کو پہچاننے والے نہ تھے O'' (یوسف:۵۸)

علامہ ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ، یوسف: ۵۸ تا ۶۸ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ": یہ دس بھائی تھے اور ان کا گھر سرزمین فلسطین اور شام کے قریب تھا اور وہ دیہاتوں کے رہنے والے تھے اور اُن کے پاس اونٹ اور بکریاں تھیں، پس ان کو حضرت یعقوب علیہ السلام نے بلایا اور کہا: اے میرے بیٹو! مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ مصر میں ایک نیک بادشاہ ہے جو طعام فروخت کر رہا ہے، تم اپنا سامان سفر باندھو اور اس کے پاس جاؤ تاکہ اس سے غلہ خریدو۔ پس حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو بھیج دیا۔ "فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ۝": پس حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی مصر میں آئے اور حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کو پہچان لیا۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام نے پہلی نظر میں ہی اپنے بھائیوں کو پہچان لیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان کو نہیں پہچانا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ جب ان کے بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالا تھا، اس وقت سے لے کر جب وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس مصر میں آئے تو اس دوران چالیس سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اسی وجہ سے انہوں نے ان کو نہیں پہچانا۔ عطاء نے کہا: ان کے بھائیوں نے اس لیے نہیں پہچانا کہ وہ بادشاہ کے تخت پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے سر پر بادشاہ کا تاج تھا۔ تیسرا قول یہ ہے کہ وہ مصر کے بادشاہوں کے لباس میں تھے، انہوں نے ریشم کا لباس پہنا ہوا تھا اور ان کی گردن میں سونے کی زنجیر تھی۔

پھر جب حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کو دیکھا اور ان سے عبرانی زبان میں کلام کیا تو ان سے پوچھا: مجھے بتاؤ تم لوگ کون ہو اور تمہارا کیا معاملہ ہے، کیونکہ میں نے تم کو نہیں پہچانا، انہوں نے کہا: ہم اہل شام کے بکریاں چرانے والوں میں سے ہیں، ہم پر مصیبت آئی ہے، پس ہم سفر کر کے یہاں آئے ہیں، حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: کہیں تم اس لیے تو نہیں آئے کہ میرے ملک کی جاسوسی کرو، انہوں نے کہا: نہیں! اللہ کی قسم! ہم جاسوس نہیں ہیں، ہم تو سگے بھائی ہیں۔ ایک باپ کی اولاد ہیں اور ہمارا باپ بوڑھا اور بہت سچا آدمی ہے، اس کا نام یعقوب ہے، وہ اللہ کے انبیاء میں سے نبی ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے پوچھا: تم لوگ کتنے تھے؟ تو انہوں نے کہا: ہم بارہ بھائی تھے، ہمارا ایک بھائی ہمارے ساتھ جنگل میں گیا اور وہاں ہلاک ہو گیا، اور ہمارا وہ بھائی ہمارے والد کے نزدیک بہت زیادہ محبوب تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے پوچھا: تو اب تم کتنے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم دس بھائی ہیں، حضرت یوسف علیہ السلام نے پوچھا: اور وہ دوسرا کہاں ہے، انہوں نے کہا: وہ ہمارے باپ کے پاس ہے، کیونکہ وہ ہمارا وہ بھائی ہے جس کی ماں فوت ہو چکی ہے، تو ہمارے باپ کو اس سے تسلی رہتی ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: پس کیسے معلوم ہوگا کہ تم جو بات کر رہے ہو وہ حق اور سچ ہے؟ ان کے بھائیوں نے کہا: اے بادشاہ! ہم ایسے ملک میں ہیں کہ اس ملک میں ہمیں کوئی پہچاننے والا نہیں ہے، پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سے کہا: پھر تم اپنے باپ شریک بھائی کو لے کر آؤ اگر تم سچے ہو، اور میں تم سے راضی ہو جاؤں گا، انہوں نے کہا: ہمارا باپ اس کی جدائی پر غمگین ہوگا، تاہم اپنے باپ سے ہم مشورہ کریں گے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: تم اپنے میں سے کسی ایک کو بہ طور تاوان یہاں پر چھوڑ دو حتیٰ کہ تم اپنے اس باپ شریک بھائی کو لے آؤ۔ پھر انہوں نے قرعہ اندازی کی کہ کس کو چھوڑیں، پھر قرعہ شمعون کے نام کا نکلا، اور شمعون حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق بہت عمدہ رائے رکھتا تھا۔ سو انہوں نے شمعون کو حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس گروی چھوڑ دیا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور جب یوسف نے اُن کو اُن کی ضرورت کا سامان مہیا کر دیا تو ان سے کہا: ''تم اپنے باپ شریک بھائی (بنیامین) کو میرے پاس لے کر آنا، کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں پیمانہ بھر بھر کر غلہ دیتا ہوں، اور میں بہترین مہمان نوازوں میں سے ہوں''O (یوسف: ۵۹)

''وَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ '': یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے اُن میں سے ہر ایک کے لیے ایک اونٹ پر لادے جانا والا غلہ دے دیا۔ ''قَالَ ائْتُونِي بِأَخٍ لَّكُم مِّنْ أَبِيكُمْ '': یعنی تم بنیامین کو میرے پاس لے کر آؤ جو تمہارا باپ شریک بھائی ہے۔

''أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي الْكَيْلَ '': کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں لوگوں کو پیمانہ بھر بھر کر غلہ دے رہا ہوں اور کوئی کمی نہیں کر رہا، پس اگر تم اپنے باپ شریک بھائی کو لے کر آئے تو میں تمہیں ایک اونٹ پر لادے جانے والے غلہ کے برابر انعام دوں گا۔

''وَأَنَا خَيْرُ الْمُنزِلِينَ '': مجاہد نے کہا: میں بہترین مہمان نوازی کرنے والا ہوں۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کی بہت عمدہ طریقہ سے مہمان نوازی کی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور اگر تم اس کو میرے پاس نہ لائے تو میرے پاس تمہارے لئے کوئی غلہ نہیں ہوگا اور آئندہ تم میرے قریب بھی نہ آنا''O (یوسف: ۶۰)

''فَإِن لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِندِي '': یعنی اگر تم اپنے باپ شریک بھائی کو لے کر نہیں آئے تو آئندہ تمہارے لیے میرے پاس غلہ نہیں ہوگا۔ ''وَلَا تَقْرَبُونِ '': اور نہ تم میرے ملک میں اور میرے علاقہ میں آسکو گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''یوسف کے بھائیوں نے کہا: ''ہم اس کے متعلق عنقریب اپنے والد سے مشورہ کریں گے اور ہم ضرور یہ کام کرنے والے ہیں''O (یوسف: ۶۱)

''قَالُوا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ أَبَاهُ '': انہوں نے کہا: ہم عنقریب اپنے والد سے اس کو طلب کریں گے اور ان سے کہیں گے کہ اس کو ہمارے ساتھ بھیج دیں۔ ''وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ '': اور جو کچھ آپ نے کہا ہے ہم اس کے مطابق عمل کریں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور یوسف نے اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ ''ان کی رقم ان کی بوریوں میں ڈال دو تاکہ جب وہ لوٹ کر اپنے گھر والوں کے پاس جائیں تو پہچان لیں کہ یہ تو وہی رقم ہے، ہوسکتا ہے وہ اسی وجہ سے لوٹ آئیں''O (یوسف: ۶۲)

''وَقَالَ لِفِتْيَانِهِ '': بعض قراءت میں ہے ''لِفِتْيَتِهِ '' اور اس سے مراد غلمان ہیں یعنی بادشاہ کے کارندے۔ اور یہ دو لغتیں ہیں جیسے الصبیان اور الصبیۃ، اسی طرح الفتیان اور الفتیہ۔ ''اجْعَلُوا بِضَاعَتَهُمْ '': یعنی ان کے طعام کی قیمت جو چند دراہم تھی۔

الضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے گندم کی جو قیمت ادا کی تھی، اس میں جوتیاں اور چمڑے کی کھالیں تھیں۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس میں آٹھ جراب ستو تھے، اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

''فِي رِحَالِهِمْ '': یعنی اُن کے سامان میں رکھ دو۔ یہ رحل کی جمع ہے۔ ''لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُونَهَا إِذَا انقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ

يَرْجِعُوْنَ ": شاید کہ جب وہ اپنے گھر لوٹ کر جائیں تو اپنی اس دی ہوئی قیمت کو پہچان لیں۔
اس میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جو یہ اقدام فرمایا تھا، اس کا کیا سبب تھا۔ ایک قول یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اُن لوگوں کو اپنا کرم دکھانا چاہتے تھے کہ انہوں نے اُن کی پونجی واپس کر دی اور اس سے پہلے جو انہوں نے ان کے بھائی کو لانے کی ضمانت لی تھی، وہ اس لیے تھی تا کہ وہ دوبارہ لوٹ کر آئیں اور یہ جان لیں کہ اُن پر یہ کرم فرمایا گیا ہے۔
الکلبی نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ خطرہ تھا کہ شاید اُن کے والد کے پاس اتنی چاندی یا اتنی قیمت نہ ہو جس کی وجہ سے دوبارہ ان کو غلہ لینے کے لیے بھیجیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: " پھر جب یوسف کے بھائی اپنے والد کے پاس لوٹ کر گئے تو انہوں نے کہا: "اے ہمارے ابا جان! ہمیں آئندہ کے لیے غلہ دینے سے روک دیا گیا، سو آپ ہمارے ساتھ ہمارے (باپ شریک) بھائی کو بھیج دیں تا کہ ہم غلہ لا سکیں اور بے شک ہم ضرور اس کی حفاظت کرنے والے ہیں O"
(یوسف: ۶۳)

" فَلَمَّا رَجَعُوْۤا اِلٰۤى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا ": انہوں نے کہا: اے ابا جان! ہم بہترین مرد کے پاس گئے تھے جس نے ہمیں ٹھہرایا اور ہماری تعظیم اور توقیر کی، اور اگر اولاد یعقوب سے کوئی مرد ہوتا تو وہ ہماری اتنی عزت افزائی نہ کرتا۔ تو اُن سے حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا: جب تم مصر کے بادشاہ کے پاس جاؤ تو میری طرف سے اس پر سلام پڑھنا اور کہنا کہ ہمارے والد آپ پر سلام بھیجتے ہیں اور آپ کے لیے دعا کرتے ہیں جو آپ نے ہم پر بخشش فرمائی ہے، پھر پوچھا: شمعون کہاں ہے؟، انہوں نے کہا: مصر کے بادشاہ نے اس کو رہن رکھ لیا ہے اور پورا قصہ بیان کیا۔
حضرت یعقوب علیہ السلام نے اُن سے پوچھا: تم نے ان کو پورے واقعہ کی خبر کیوں دی؟ انہوں نے کہا: بادشاہ نے ہم کو پکڑ لیا اور کہا: تم لوگ جاسوس ہو، کیونکہ ہم عبرانی زبان میں بات کر رہے تھے اور پورا قصہ بیان کیا اور انہوں نے کہا: اے ہمارے ابا جان! " مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ ": اگر ہم اپنے ساتھ اگلی مرتبہ اپنے باپ شریک بھائی کو نہ لے کر گئے تو پھر ہم کو غلہ نہیں دیا جائے گا۔ اور انہوں نے ہم میں سے ہر ایک کو اتنا غلہ دیا جو ایک اونٹ پر لادا جاتا ہے۔ اور بنیامین کی وجہ سے ہمیں مزید غلہ دینے سے منع کر دیا۔
" فَاَرْسِلْ مَعَنَاۤ اَخَانَا ": سو آپ ہمارے ساتھ ہمارے بھائی بنیامین کو بھیج دیں۔ " نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ": اور بے شک ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: " یعقوب نے کہا: " کیا میں اس کے متعلق تم پر اسی طرح اعتبار کر لوں جس طرح پہلے میں نے اس کے بھائی کے متعلق تم پر اعتبار کیا تھا؟ "، پس اللہ سب سے بہتر حفاظت فرمانے والے ہیں اور ہر رحم کرنے والے سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں O" (یوسف: ۶۴)
" قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَاۤ اَمِنْتُكُمْ عَلٰۤى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ؕ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ":

یعنی میں کیسے تم پر بھروسا کروں حالانکہ تم اس سے پہلے یوسف کے ساتھ وہ کر چکے ہو جو کر چکے ہو، اور اللہ بہترین حفاظت فرمانے والے ہیں اور وہ تمام رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور جب انہوں نے اپنی بوریاں کھولیں تو دیکھا کہ ان کی رقم انہیں لوٹا دی گئی ہے، انہوں نے کہا: اے ہمارے ابا جان! ہمیں اس سے زیادہ اور کیا چاہیے، یہ ہماری رقم ہے جو ہماری طرف واپس کردی گئی ہے، ہم اپنے گھر والوں کے لیے غلہ لائیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور ایک اونٹ پر لادے جانے والے غلہ سے زیادہ غلہ لائیں گے، یہ جو ہم غلہ لے کر آئے ہیں یہ تو بہت ناکافی ہے O''

(یوسف:۶۵)

''وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ؕ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا نَبْغِيْ'': جب انہوں نے وہ بوریاں کھولیں جو مصر سے لاد کر لائے تھے تو اُن بوریوں میں انہوں نے اپنے لائے ہوئے غلہ کی قیمت دیکھی جو اُن کی طرف واپس کردی گئی تھی، انہوں نے کہا: اے ہمارے ابا جان! ہمیں اور کیا چاہیے اور ہم کس چیز کو طلب کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام سے مصر کے بادشاہ کے احسانات کا ذکر کیا تھا اور انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو اس پر برانگیختہ کیا کہ وہ بنیامین کو ان کے ساتھ بھیج دیں۔ ''هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا'': انہوں نے کہا: ہم اس بادشاہ کا کرم اور احسان زبان سے کیسے بیان کریں، اس نے تو ہماری دی ہوئی قیمت بھی ہمیں واپس کردی ہے اور وہ اپنے والد کا دل خوش کرنا چاہتے تھے۔ ''وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا'': اور ہم ان پیسوں سے مزید طعام خریدیں گے۔ ''مار اهله يمير'' اس وقت کہا جاتا ہے جب ایک شہر سے طعام دوسرے شہر لایا جائے۔ اور ہم اپنے بھائی بنیامین کی حفاظت کریں گے۔ ''وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ'': کیونکہ بادشاہ ہر آدمی کو اتنا غلہ دیتا ہے جو اس کے اونٹ پر لادا جائے۔ ''ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ'': ہم جو غلہ لے کر آئے ہیں وہ تھوڑا ہے، ہمیں اور ہمارے گھر والوں کو کافی نہیں ہوگا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ ہم ایک اونٹ پر لدے ہوئے غلہ کی مقدار لے کر آئیں گے، یہ تھوڑا غلہ ہے۔

مجاہد نے کہا: بعیر سے یہاں پر مراد گدھا ہے، کیونکہ وہ گدھے پر غلہ کو لاد کر لے جاتے تھے۔ اور گدھوں کو بھی ''بعیر'' کہا جاتا ہے اور وہ لوگ گدھوں کو پالنے والے تھے۔ اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے کہ یہاں ''بعیر'' سے مراد اونٹ ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''یعقوب نے کہا: میں اس کو ہرگز تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا حتیٰ کہ تم اللہ کی قسم کھا کر مجھ سے پکا وعدہ کرو کہ تم اس کو ضرور لے کر آؤ گے سوا اس کے کہ تم پر کوئی مصیبت طاری ہو جائے، پھر جب انہوں نے یعقوب سے قسم کھا کر پختہ وعدہ کرلیا تو یعقوب نے کہا: ''ہم نے جو کچھ وعدہ کیا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ گواہ ہیں'' O (یوسف:۶۶)

''قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ'': اُن سے حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا: میں تمہارے ساتھ بنیامین کو اس وقت تک ہرگز نہیں بھیجوں گا حتیٰ کہ تم پکی قسم کھا کر وعدہ کرو کہ تم اس کو اپنے ساتھ لے کر آؤ

گے،سوا اس کے کہ تم پر کوئی مصیبت طاری ہو جائے۔مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہے سوا اس کے کہ تم سب ہلاک کر دیے جاؤ۔قتادہ نے کہا: اس کا معنی ہے: سوا اس کے کہ تم سب مغلوب ہو جاؤ حتیٰ کہ تمہارے پاس اس کی حفاظت کی طاقت نہ رہے۔

''فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ'': پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس بنیامین کو ان کے پاس بھیجنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔

''قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ'': حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا: ہم جو عہد کر رہے ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ گواہ ہیں۔اور ایک قول یہ ہے کہ اس کی اللہ تعالیٰ حفاظت فرمانے والے ہیں۔ایک قول یہ ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا: ''فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا۪ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ'' تو اللہ عزوجل نے فرمایا: میری عزت اور جلال کی قسم! میں ضرور آپ کے پاس آپ کا بیٹا واپس لاؤں گا جب کہ آپ نے مجھ پر توکل کر کے اپنا بیٹا ان کے حوالے کیا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور یعقوب نے کہا: اے میرے بیٹو! تم ایک ہی دروازہ سے داخل نہ ہونا اور الگ الگ دروازہ سے داخل ہونا، میں تم سے اللہ کی تقدیر کو ٹال نہیں سکتا، بے شک حکم صرف اللہ کا ہے، میں نے انہی پر توکل کیا ہے اور توکل کرنے والوں کو انہی پر توکل کرنا چاہیے O'' (یوسف: ٦٧)

نظر لگنے کے خطرہ سے برکت کی دعا کرنا

''وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ'': جب انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس سے اٹھنے کا ارادہ کیا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا: اے میرے بیٹو! تم سب اکٹھے ایک دروازے سے نہ داخل ہونا اور مختلف دروازوں سے داخل ہونا، کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو یہ خطرہ تھا کہ ان پر نظر نہ لگ جائے کیونکہ ان کے بیٹے بہت حسین و جمیل تھے اور بہت بلند قامت کے تھے، اور وہ ایک آدمی کی اولاد تھے تو انہوں نے حکم دیا کہ وہ اکٹھے کسی دروازہ میں داخل نہ ہوں، کہ ان کو نظر نہ لگ جائے، کیونکہ نظر برحق ہے۔

عامر بن ربیعہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص اپنے آپ کو یا اپنے مال کو یا اپنے بھائی کو ایسے حال میں دیکھے جو اس کو اچھا لگے تو وہ اس کو برکت کی دعا دے، کیونکہ نظر کا لگنا برحق ہے۔

(سنن ابن ماجہ: ۳۵۰۸، مصنف ابن ابی شیبہ: ۲۳۵۹۳، شرح مشکل الآثار: ۲۹۰۱، المستدرک علی الصحیحین: ۷۴۹۹)

''وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ'': اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے متعلق جس چیز کا فیصلہ فرمالیا ہے، یقیناً وہ چیز تم کو پہنچے گی خواہ تم اکٹھے دروازہ سے نکلو یا الگ الگ نکلو، کیونکہ جو چیز مقدر فرمائی جا چکی ہے وہ ضرور ہوگی اور احتیاط تقدیر کو ٹال نہیں سکتی۔

''اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَيْهِ'': پھر حضرت یعقوب علیہ السلام نے تمام امور کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنے کا ذکر کیا۔

''تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ'': حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا: میں نے انہی پر توکل کیا ہے اور توکل کرنے والوں کو انہی پر توکل کرنا چاہیے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور جب یعقوب کے بیٹے اس طرح داخل ہوئے جس طرح ان کو ان کے باپ نے

حکم دیا تھا اور یعقوب ان سے اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو کچھ ٹال نہیں سکتے تھے، مگر یعقوب کے دل میں خواہش تھی جس کو انہوں نے پورا کیا، اور بے شک یعقوب ہمارے سکھائے ہوئے علم کے مطابق علم والے تھے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے O" (یوسف: ۶۸)

"وَلَمَّا دَخَلُوا مِنْ حَيْثُ أَمَرَهُمْ أَبُوهُمْ": یعنی جب حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے مختلف دروازوں سے داخل ہوئے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس شہر کے چار دروازے تھے، سو وہ مختلف دروازوں سے داخل ہوئے۔ "مَا كَانَ يُغْنِي عَنْهُمْ مِّنَ اللَّهِ مِن شَيْءٍ إِلَّا حَاجَةً فِي نَفْسِ يَعْقُوبَ قَضَاهَا": یعنی اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو اُن کا مختلف دروازوں سے داخل ہونا ٹال نہیں سکتا تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے دل میں جو مراد تھی اس کو پورا فرما دیا۔ وہ باپ کی شفقت کی وجہ سے یہ چاہتے تھے کہ ان کے بیٹے الگ الگ دروازوں سے داخل ہوں، تو وہ الگ الگ دروازوں سے داخل ہوئے۔

"وَإِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنَاهُ": اور حضرت یعقوب علیہ السلام جو کچھ کرتے تھے، اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے علم کے مطابق کرتے تھے۔

"وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ": یعنی اکثر لوگوں کو وہ علم نہیں تھا جو حضرت یعقوب علیہ السلام کو علم تھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مشرکین اس کو نہیں جانتے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کو الہام فرمایا ہے۔

(معالم التنزیل ج ۲ ص ۵۰۰۔ ۵۰۳، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

وَلَمَّا دَخَلُوا عَلَىٰ يُوسُفَ آوَىٰ إِلَيْهِ أَخَاهُ ۖ قَالَ إِنِّي أَنَا أَخُوكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٦٩﴾

اور جب تمام بھائی یوسف کے پاس آ گئے تو انہوں نے اپنے سگے بھائی (بنیامین) کو اپنے پاس ٹھہرا لیا، اس سے کہا: "بے شک میں تمہارا بھائی ہوں، سو تمہارے ساتھ جو کچھ یہ کرتے رہے ہیں تم اس سے غمگین نہ ہونا O"

فَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ ﴿٧٠﴾

پھر جب یوسف نے اُن کو اُن کی ضرورت کا غلہ فراہم کر دیا تو شاہی پیمانہ اپنے بھائی کی بوری میں رکھوا دیا، پھر ایک اعلان کرنے والے نے اعلان کیا: اے قافلہ والو! بے شک تم لوگ ضرور چور ہو O"

قَالُوا وَأَقْبَلُوا عَلَيْهِم مَّاذَا تَفْقِدُونَ ﴿٧١﴾

یوسف کے بھائیوں نے اس اعلان کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "تم کس چیز کو گم پاتے ہو؟ O"

قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِیْرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِیْمٌ ﴿۷۲﴾

کارندوں نے کہا: "ہم بادشاہ کا پیمانہ گم پا رہے ہیں اور جو شخص اس پیمانہ کو لے کر آئے گا اس کو بھی اتنا غلہ دیا جائے گا جو ایک اونٹ پر لادا جائے اور میں اس بات کا ضامن ہوں" O

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِی الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِیْنَ ﴿۷۳﴾

یوسف کے بھائیوں نے کہا: "اللہ کی قسم! تم جانتے ہو کہ ہم اس زمین میں لوٹ مار کرنے کے لیے نہیں آئے اور نہ ہم چور ہیں" O

قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِیْنَ ﴿۷۴﴾

کارندوں نے کہا: "اگر تم جھوٹے ثابت ہوئے تو پھر تمہاری کیا سزا ہوگی؟" O

قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِیْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۷۵﴾

انہوں نے کہا: "چوری کی سزا یہ ہے کہ جس کے سامان میں چوری کا مال پایا جائے، اس کو اس کی سزا میں رکھ لیا جائے، ہم اسی طرح ظالموں کو سزا دیتے ہیں" O

فَبَدَاَ بِاَوْعِیَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِیْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِیْهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِیُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِیَاْخُذَ اَخَاهُ فِیْ دِیْنِ الْمَلِكِ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَفَوْقَ كُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ ﴿۷۶﴾

یوسف نے تلاشی کی ابتداء کی اور اپنے بھائی کی بوری سے پہلے دوسری بوریوں کی تلاشی لی، پھر آخر میں اپنے سگے بھائی کی بوری سے وہ شاہی پیمانہ برآمد کر لیا، ہم نے اسی طرح یوسف کو اس معاملہ کی تدبیر بتائی تھی، اور یوسف بادشاہ کے قانون کے مطابق اپنے بھائی کو نہیں رکھ سکتے تھے مگر جو اللہ چاہے، ہم جس کے چاہتے ہیں اس کے کئی درجات بلند فرما دیتے ہیں اور ہر علم والے سے اوپر ایک زیادہ علم والا ہے O

قَالُوْۤا اِنْ یَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا یُوْسُفُ فِیْ نَفْسِهٖ وَلَمْ یُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ﴿۷۷﴾

یوسف کے بھائیوں نے کہا: "اگر اس نے چوری کی ہے تو کوئی تعجب نہیں، اس سے پہلے اس کا بھائی (یوسف) بھی چوری کر چکا ہے، یوسف نے یہ بات اپنے دل میں رکھی اور ان پر ظاہر نہ کی اور دل میں کہا: تم خود بہت برے ہو اور جو کچھ تم بیان کر رہے ہو اللہ اس کو خوب جاننے والے ہیں" O

قَالُوْا یٰۤاَیُّهَا الْعَزِیْزُ اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَیْخًا كَبِیْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۷۸﴾

یوسف کے بھائیوں نے کہا: اے مصر کے بادشاہ! بے شک ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے، آپ اس کی جگہ ہم میں سے کسی ایک کو رکھ لیں، بے شک ہم آپ کو احسان کرنے والوں میں سے سمجھتے ہیں O

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ﴿۷۹﴾

یوسف نے کہا: "معاذ اللہ! ہم نے جس کے پاس اپنا مال پایا ہے اس کے سوا کسی دوسرے کو اپنے پاس رکھ لیں، پھر تو ہم یقیناً ظلم کرنے والوں میں سے ہوں گے"O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور جب تمام بھائی یوسف کے پاس آ گئے تو انہوں نے اپنے سگے بھائی (بنیامین) کو اپنے پاس ٹھہرالیا، اس سے کہا: "بے شک میں تمہارا بھائی ہوں، سو تمہارے ساتھ جو کچھ یہ کرتے رہے ہیں تم اس سے غمگین نہ ہونا"O (یوسف:۶۹)

علامہ ابومحمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ، یوسف: ۶۹ تا ۷۹ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ": حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے کہا: یہ ہمارا وہ بھائی ہے جس کو آپ کے پاس لانے کا آپ نے حکم دیا تھا، ہم اس کو لے کر آ گئے ہیں، پس حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: تم نے ٹھیک کیا اور درست کیا، اور عنقریب تمہیں میرے پاس سے اس کی جزا ملے گی۔ پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو ٹھہرایا اور ان کی تعظیم و تکریم کی، پھر ان کی مہمان نوازی کی اور ان دو دو میں سے ہر ایک کو دسترخوان پر بٹھایا، تو بنیامین اکیلے رہ گئے، سو وہ رونے لگے اور انہوں نے کہا: اگر میرا بھائی یوسف زندہ ہوتا تو وہ مجھے اپنے ساتھ بٹھاتا، تب حضرت یوسف علیہ السلام نے ان لوگوں سے کہا: یہ تمہارا بھائی اکیلا رہ گیا ہے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اُن کو اپنے ساتھ دسترخوان پر بٹھالیا اور ان کو کھلانا شروع کر دیا۔ پس جب رات ہوگئی تو ان سے پھر اسی طرح کہا اور کہا: تم میں سے ہر دو بھائی ایک بستر پر سو جائیں، سو بنیامین اکیلے رہ گئے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: یہ میرے ساتھ میرے بستر پر سوئے گا، پس وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ سو گئے، پھر حضرت یوسف علیہ السلام ان کو اپنے ساتھ چمٹاتے رہے اور ان کو سونگھتے رہے حتیٰ کہ صبح ہوگئی۔ اور روبیل نے کہا: ہم نے ایسی مثال اس سے پہلے نہیں دیکھی، پھر جب صبح ہوئی تو ان سے کہا: میری رائے ہے کہ اس مرد کا کوئی ثانی نہیں ہے، میں عنقریب اس کو اپنے ساتھ ملاؤں گا تو اس کی رہائش میرے ساتھ ہوگی، پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے اُن کو ایک جگہ ٹھہرایا اور ان پر کھانا پیش کیا اور اپنے (سگے) بھائی کو اپنے ساتھ رکھا، اور یہ اللہ عزوجل کے اس قول کے مطابق ہے: "اٰوٰۤى اِلَیْهِ اَخَاهُ" یعنی یوسف علیہ السلام نے اپنے ساتھ اپنے بھائی کو ملالیا۔

پھر جب تنہائی ہوئی تو حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سے پوچھا: تمہارا کیا نام ہے؟ انہوں نے کہا: بنیامین، حضرت یوسف علیہ السلام نے پوچھا: اور بنیامین کیا ہے؟ تو بنیامین نے کہا: وہ ابن المثکل ہے، کیونکہ جب وہ پیدا ہوئے تو ان کی والدہ فوت ہوگئیں، حضرت

یوسف علیہ السلام نے ان سے پوچھا: اور تمہاری ماں کا کیا نام ہے؟ تو انہوں نے کہا: راحیل، حضرت یوسف علیہ السلام نے پوچھا: راحیل کس کی بیٹی ہے؟ تو انہوں نے کہا: راحیل لاوی کی بیٹی ہے۔ پھر پوچھا: تمہاری اولاد ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! میرے دس بیٹے تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے پوچھا: تمہارا کوئی سگا بھائی ہے، انہوں نے کہا: ہاں میرا ایک بھائی تھا وہ ہلاک ہو گیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: کیا تم یہ پسند کرو گے کہ تمہارے اس ہلاک ہونے والے بھائی کے بدلہ میں، میں تمہارا بھائی ہو جاؤں؟، پس بنیامین نے کہا: اے بادشاہ! آپ جیسا بھائی کس کو نصیب ہوتا ہے، لیکن آپ یعقوب سے پیدا نہیں ہوئے اور نہ راحیل سے پیدا ہوئے ہو، یہ سن کر حضرت یوسف علیہ السلام رو پڑے اور کھڑے ہو کر بنیامین کو گلے لگایا اور ان سے کہا: "إِنِّي أَنَا أَخُوكَ فَلَا تَبْتَئِسْ" میں ہی تمہارا سگا بھائی ہوں، سو تم غمگین نہ ہو، یعنی جو کچھ ہو چکا ہے اس پر غم نہ کرو۔

"بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ" اور جو کچھ یہ تمہارے ساتھ کرتے رہے ہیں، اس پر غم نہ کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ عمدہ سلوک فرمایا ہے اور میں نے جو کچھ تمہیں بتایا ہے، تم اپنے بھائیوں کو اس کی خبر نہ دینا۔

پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے لیے پورا پورا غلہ لاد دیا اور ان سب کو ایک ایک اونٹ سے لدا ہوا غلہ دیا۔ اور بنیامین کو بھی ایک اونٹ سے لدا ہوا غلہ دیا۔ پھر انہوں نے حکم دیا کہ بادشاہ کا پیمانہ بنیامین کی بوری میں رکھ دو۔

السدی نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام نے وہ پیمانہ اپنے بھائی کی بوری میں رکھ دیا اور بھائی کو پتا نہیں تھا۔

اور کعب نے کہا: جب حضرت یوسف علیہ السلام نے بنیامین سے کہا کہ میں تمہارا سگا بھائی ہوں، تو بنیامین نے کہا: میں آپ سے الگ نہیں ہوں گا، حضرت یوسف علیہ السلام نے اُن سے کہا: تم جانتے ہو کہ میری وجہ سے میرے والد نے کتنا غم اٹھایا ہے اور جب میں نے تم کو روک لیا تو ان کا غم اور زیادہ ہو جائے گا اور میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے، مگر اس صورت میں کہ تمہاری طرف میں ایک ایسی بات منسوب کر دوں جو جائز نہیں ہے۔ بنیامین نے کہا: کوئی پرواہ نہیں جو آپ کا دل چاہے وہ کریں، میں آپ سے الگ نہیں ہوں گا۔ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے بتایا: میں شاہی پیمانہ تمہاری بوری میں رکھ دوں گا، پھر منادی تم پر چوری کی ندا کرے گا، تا کہ وہ مجھے تمہاری طرف لوٹا دے، بنیامین نے کہا: آپ وہی کریں جو آپ چاہتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پھر جب یوسف نے اُن کو اُن کی ضرورت کا غلہ فراہم کر دیا تو شاہی پیمانہ اپنے بھائی کی بوری میں رکھوا دیا، پھر ایک اعلان کرنے والے نے اعلان کیا: اے قافلہ والو! بے شک تم لوگ ضرور چور ہو O یوسف کے بھائیوں نے اس اعلان کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "تم کس چیز کو گم پاتے ہو؟" O کارندوں نے کہا: "ہم بادشاہ کا پیمانہ گم پا رہے ہیں اور جو شخص اس پیمانہ کو لے کر آئے گا اس کو بھی اتنا غلہ دیا جائے گا جو ایک اونٹ پر لادا جائے اور میں اس بات کا ضامن ہوں" O (یوسف: ۷۰-۷۲)

"فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ": وہ پانی پینے کا ایک پیالا تھا جس میں بادشاہ پانی پیتا تھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: وہ زمرد کا پیالا تھا۔ ابن اسحاق نے کہا: وہ چاندی کا پیالا تھا، اور ایک قول ہے کہ وہ سونے کا پیالا تھا، عکرمہ نے کہا: وہ چاندی کا پیالا تھا جس میں مختلف جواہر جڑے ہوئے تھے۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کو پیمانہ بنا دیا

تاکہ کوئی اور اس کے ساتھ پیمائش نہ کرے، اور وہ اس پیالے سے پانی پیا کرتے تھے۔

پھر وہ پیالا بنیامین کی بوری میں رکھ دیا گیا۔ پھر وہ لوگ کوچ کر گئے اور حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کو مہلت دی حتیٰ کہ وہ روانہ ہوئے اور ایک منزل پر پہنچ گئے۔ دوسرا قول ہے: حتیٰ کہ وہ آبادی سے نکل گئے۔ پھر ان کے پیچھے کسی کو بھیجا اور ان کو روک لیا۔

"ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَیَّتُهَا الْعِیْرُ": پھر ایک منادی نے ندا کی: اے قافلہ والو! یہ وہ قافلہ تھا جس میں بوریوں میں غلہ لادا ہوا تھا۔ مجاہد نے کہا: گدھوں پر ان کی بوریاں تھیں۔ فراء نے کہا: اونٹوں پر ان کی بوریاں تھیں۔

"اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ": تم رک جاؤ، اور انہوں نے یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے حکم کے بغیر کہا تھا۔

"قَالُوْا وَ اَقْبَلُوْا عَلَیْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ": پھر منادی نے ان سے کہا: کیا ہم نے تمہاری بہت عمدہ مہمانی نہیں کی، کیا ہم نے تم کو بہت اچھی جگہ نہیں ٹھہرایا، کیا ہم نے تم کو پیمانہ بھر بھر کر غلہ نہیں دیا۔ اور تم نے ہمارے ساتھ وہ کیا ہے جو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ انہوں نے پوچھا: کیا کیا ہے؟ کہا: بادشاہ کا شاہی پیالا ہم گم پا رہے ہیں اور تمہارے علاوہ اور کسی پر اس کی تہمت نہیں ہے۔ یہ اللہ عزوجل کے اس ارشاد کے مطابق ہے: "قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَ لِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِیْرٍ وَّ اَنَا بِهٖ زَعِیْمٌ"۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "یوسف کے بھائیوں نے کہا: "اللہ کی قسم! تم جانتے ہو کہ ہم اس زمین میں لوٹ مار کرنے کے لیے نہیں آئے اور نہ ہم چور ہیں"O (یوسف: ۷۳)

"قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِی الْاَرْضِ وَ مَا كُنَّا سٰرِقِیْنَ":

یعنی ہم مصر کی سرزمین میں چوری کرنے نہیں آئے۔

ایک سوال کا جواب

اگر یہ سوال کیا جائے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے یہ کیسے کہا کہ تم کو معلوم ہے، اور ان کو کہاں سے معلوم ہوا؟

انہوں نے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ ہم اس زمین میں لوٹ مار کرنے نہیں آئے، ہم نے جب سے یہ مسافت قطع کی ہے ہم نے کسی کے سامان میں کوئی کمی نہیں کی، تم ان لوگوں سے پوچھ لو جنہوں نے ہمارے ساتھ سفر کیا ہے، کیا ہم نے کسی کو کوئی ضرر پہنچایا؟ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو غلہ کی قیمت ان کی بوری میں رکھ دی گئی تھی وہ انہوں نے واپس کر دی تھی، انہوں نے کہا: اگر ہم چور ہوتے تو وہ ہم واپس نہ کرتے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "کارندوں نے کہا: "اگر تم جھوٹے ثابت ہوئے تو پھر تمہاری کیا سزا ہوگی؟"O (یوسف: ۷۴)

"قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِیْنَ":

منادی اور اس کے اصحاب نے کہا: اگر تم جھوٹے نکلے تو اس چور کی کیا سزا ہوگی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "انہوں نے کہا: "چور کی سزا یہ ہے کہ جس کے سامان میں چوری کا مال پایا جائے، اس کو اس کی سزا میں رکھ لیا جائے، ہم اسی طرح ظالموں کو سزا دیتے ہیں"O (یوسف: ۷۵)

"قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ":

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے کہا: جس کے سامان سے چوری کا مال نکلے، اس کو غلام بنا کر رکھ لیا جائے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے خاندان میں چوری کی سزا کا یہ طریقہ مقرر تھا۔ اور بادشاہ کے قانون میں یہ مقرر تھا کہ چور کو مارا جائے اور اس سے چوری کے سامان کی دگنی چوگنی قیمت وصول کی جائے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اپنے بھائی کو اپنے پاس رکھیں۔ اس لیے انہوں نے اس معاملہ کا فیصلہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں پر چھوڑ دیا، تا کہ اس طریقہ کے مطابق بنیامین کو وہ اپنے پاس ٹھہرا لیں۔

"كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ":

ہم اسی طرح سے کرتے ہیں کہ جس کے پاس سے چوری کا مال برآمد ہو، اس کو غلام بنا کر رکھ لیا جائے۔ پھر منادی نے کہا: اب ضروری ہے کہ تمہارے سامان کی تلاشی لی جائے، پھر تلاشی شروع کی اور وہ ایک ایک کر کے سب کے سامان کی تلاشی لیتے رہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "یوسف نے تلاشی کی ابتداء کی اور اپنے بھائی کی بوری سے پہلے دوسری بوریوں کی تلاشی لی، پھر آخر میں اپنے سگے بھائی کی بوری سے وہ شاہی پیمانہ برآمد کر لیا، ہم نے اسی طرح یوسف کو اس معاملہ کی تدبیر سجھائی تھی، اور یوسف بادشاہ کے قانون کے مطابق اپنے بھائی کو نہیں رکھ سکتے تھے مگر جو اللہ چاہیں، ہم جس کے چاہتے ہیں اس کے کئی درجات بلند فرما دیتے ہیں، اور ہر علم والے سے اوپر ایک زیادہ علم والا ہے O" (یوسف:۷۶)

"فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ":

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی ان کے سگے بھائی کی تلاشی لینے سے پہلے سامان کی تلاشی لی تا کہ کوئی تہمت نہ لگا سکے۔ قتادہ نے کہا: ہم سے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ وہ کسی سامان کو نہیں کھولتے تھے اور نہ اس برتن کی طرف دیکھتے تھے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے، پھر جب بنیامین کی بوری رہ گئی تو اس نے کہا: میرا یہ گمان نہیں ہے کہ انہوں نے اس پیالا کو لیا ہوگا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے کہا: اللہ کی قسم! نہ چھوڑیں حتیٰ کہ اس کی بوریوں کی بھی تلاشی لیں، یہ بہت انصاف کا معاملہ ہے، آپ کے لیے بھی اور ہمارے لیے بھی، پس جب انہوں نے اس بوری کو کھولا تو وہاں سے وہ پیالا مل گیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ"۔

پھر اُن کے بھائی بنیامین کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: تم نے یہ کیا، کیا، ہم کو رسوا کر دیا اور ہمارا منہ کالا کر دیا اے راحیل کے بیٹے! پس بنیامین نے کہا: بلکہ راحیل کے بیٹے ہمیشہ تمہارے لیے آزمائش کا سبب بنتے رہے ہیں، پس تم میرے بھائی کو لے گئے تھے اور ان کو جنگل میں ہلاک کر دیا تھا۔ پھر انہوں نے بنیامین کو غلام بنایا اور کہا: اس مرد نے وہ پیالا چرایا تھا۔ ان کو گردن سے پکڑا اور حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس لے گئے جس طرح چور کو لے جایا جاتا ہے۔

"كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ": اور ہم نے اسی طرح تدبیر فرمائی تھی، یعنی جس طرح انہوں نے ابتداء میں یوسف کے ساتھ سازش کی تھی، اسی طرح ہم نے ان کے ساتھ جوابی تدبیر فرمائی۔ اور یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا تھا: "فَيَكِيْدُوْا

لَكَ كَيْدًا ــــ (یوسف:۵)" اور کید کا معنی ہے: کوئی حیلہ کرنا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت ہو تو اس کا معنی ہے تدبیر فرمانا۔

"مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ ": یعنی بادشاہ کے قانون کے مطابق بنیامین کو یوسف کے ساتھ ملانے کی اور کوئی تدبیر نہیں تھی۔

"اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ": یعنی یوسف کے لیے اپنے بھائی کو روکنے کی اور کوئی تدبیر نہیں تھی سوا اس کے جو ہم نے اپنے لطف سے ان کے لیے تدبیر فرمائی کہ خود ان کے بھائیوں کی زبان سے یہ جاری ہو گیا کہ چوری کی سزا یہ ہے کہ اس کو غلام بنا لیا جائے۔ پس اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام کی مراد پوری ہو گئی۔

"نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ": ہم جس کے چاہیں علم سے اس کے درجات بلند فرماتے ہیں، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کا ان کے بھائیوں پر درجہ بلند فرمایا۔

"وَفَوْقَ كُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ ":

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ہر عالم کے اوپر ایک عالم ہوتا ہے یہاں تک کہ یہ سلسلہ اللہ تعالیٰ پر جا کر ختم ہو جاتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر عالم کے اوپر فوق ہیں۔

اس جگہ یہ سوال ہوتا ہے کہ جب ہر علم والے کے اوپر کوئی اس سے بڑھ کر علم والا ہے تو اس سے لازم آئے گا کہ اللہ عزوجل کے اوپر بھی کوئی اس سے زیادہ علم والا ہو؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہر علم متناہی والے کے اوپر کوئی اس سے زیادہ علم والا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "یوسف کے بھائیوں نے کہا: "اگر اس نے چوری کی ہے تو کوئی تعجب نہیں، اس سے پہلے اس کا بھائی (یوسف) بھی چوری کر چکا ہے، یوسف نے یہ بات اپنے دل میں رکھی اور اُن پر ظاہر نہ کی اور دل میں کہا: تم خود بہت برے ہو اور جو کچھ تم بیان کر رہے ہو اللہ اس کو خوب جاننے والے ہیں" ○ (یوسف:۷۷)

"قَالُوْۤا اِنْ یَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ": ان کی مراد یہ تھی کہ بنیامین کا ایک ماں شریک بھائی ہے، اس سے مراد ان کی یوسف تھی۔ پھر اس چوری کے متعلق اختلاف ہے جس کی انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف نسبت کی تھی۔

سعید بن جبیر اور قتادہ نے کہا کہ اُن کے نانا کا ایک بت تھا جس کی وہ عبادت کرتے تھے، تو حضرت یوسف علیہ السلام نے چپکے سے وہ بت اٹھا کر توڑ ڈالا اور اس کو راستہ میں پھینک دیا تاکہ اس کی عبادت نہ کی جائے۔

اور مجاہد نے کہا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس ایک دن ایک سائل آیا تو انہوں نے گھر سے ایک انڈا اٹھا کر اس سائل کو دے دیا۔ اور سفیان بن عیینہ نے کہا کہ انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے گھر میں ایک مرغی تھی، وہ اٹھا کر سائل کو دے دی۔ اور وہب بن منبہ نے کہا کہ وہ چپکے سے دسترخوان سے طعام اٹھا کر فقراء کو دے دیتے تھے۔

اور محمد بن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنی والدہ راحیل کی موت کے بعد اپنی پھوپھی بنت اسحاق کے پاس

رہتے تھے۔ان کی پھوپھی نے ان کو پالا اوران سے بہت محبت کرنے لگیں۔ادھر حضرت یعقوب (علیہ السلام) کو بھی حضرت یوسف (علیہ السلام) سے بہت محبت تھی، تو ایک دن انہوں نے کہا: اے میری بہن! آپ یوسف کو میرے حوالہ کر دیں، پس اللہ کی قسم! میں اس پر قادر نہیں ہوں کہ ایک ساعت کے لیے بھی یوسف مجھ سے غائب ہوں، ان کی بہن نے کہا: نہیں!، حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے کہا: میں ان کو چھوڑنے والا نہیں ہوں۔تو ان کی بہن نے کہا: چند دن کے لیے ان کو میرے پاس چھوڑ دیں تا کہ مجھے تسلی ہو جائے، حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے اسی طرح کیا تو حضرت یوسف (علیہ السلام) کی پھوپھی نے حضرت اسحاق (علیہ السلام) کا منطقہ جو اُن کے پاس منتقل ہوا تھا، کیونکہ وہ حضرت اسحاق (علیہ السلام) کی اولاد میں سب سے بڑی تھیں، انہوں نے وہ منطقہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کے کپڑے کے نیچے رکھ دیا اور وہ اس وقت کم سن تھے، پھر انہوں نے کہا کہ حضرت اسحاق (علیہ السلام) کا منطقہ میں نے گم پایا، تو گھر والوں کی تلاشی لی، پس تلاشی لی تو وہ منطقہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کے پاس سے مل گیا تھا، تو انہوں نے کہا: اللہ کی قسم! اب تم یوسف کو مجھے سونپ دو۔حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے کہا: اگر اس نے وہ منطقہ رکھا تھا تو ٹھیک ہے۔پھر انہوں نے حضرت یوسف (علیہ السلام) کو اپنے پاس رکھا حتی کہ وہ فوت ہو گئیں۔یہ وہ واقعہ ہے کہ جس کی طرف حضرت یوسف (علیہ السلام) کے بھائیوں نے اشارہ کیا: " اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ "۔

" فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِیْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ":

پس حضرت یوسف (علیہ السلام) نے اس بات کو دل میں چھپایا اور ظاہر نہیں فرمایا اور دل میں کہا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم بہت برے ہو، جو تم نے یوسف کی طرف چوری کی تہمت لگائی ہے، حالانکہ حضرت یوسف (علیہ السلام) نے حقیقتاً چوری نہیں کی تھی اور نہ خیانت کی تھی۔

" وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ": اور جو کچھ تم بیان کر رہے ہو اللہ اس کو خوب جاننے والے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: " یوسف کے بھائیوں نے کہا: اے مصر کے بادشاہ! بے شک ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے، آپ اس کی جگہ ہم میں سے کسی ایک کو رکھ لیں، بے شک ہم آپ کو احسان کرنے والوں میں سے سمجھتے ہیں O" (یوسف: ۷۸)

" قَالُوْا ": اس قصہ میں مذکور ہے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کے بھائی بہت شدید غضب ناک ہوئے۔اور حضرت یعقوب (علیہ السلام) کے بیٹے جب کسی پر غضب ناک ہوتے تو برداشت نہیں کرتے تھے۔اور روبیل جب کسی پر غضب ناک ہوتا تو اپنے غضب کی وجہ سے کسی کو کچھ نہ کہتا۔

پس وہ بھائی حضرت یوسف (علیہ السلام) کے پاس گئے تو روبیل نے کہا کہ آپ ہمارا بھائی ہمیں واپس کر دیں، ورنہ میں اتنے زور سے چیخ ماروں گا کہ مصر میں جو حاملہ عورت بھی ہوگی اس کا حمل ساقط ہو جائے گا، اور روبیل کے جسم کے تمام رونگٹے کھڑے ہو گئے، حضرت یوسف (علیہ السلام) نے بنیامین سے کہا کہ تم جا کر اس کو ہاتھ لگاؤ، اس کا غضب ٹھنڈا ہو جائے گا۔تب روبیل نے کہا: یہاں پر یعقوب (علیہ السلام) کے بیج میں سے ایک بیج ہے، حضرت یوسف (علیہ السلام) نے کہا: کون یعقوب؟ پھر حضرت یوسف (علیہ السلام) اس کی طرف کھڑے ہوئے اور اس پر پیر کی ایک ٹھوکر لگائی اور اس کو زمین پر گرا دیا اور کہا: اے عبرانیوں کی جماعت: تم یہ سمجھتے ہو کہ تم سے زیادہ زور آور کوئی نہیں ہے؟ اور جب معاملہ یہاں تک پہنچا اور حضرت یوسف (علیہ السلام) کے بھائیوں نے دیکھا کہ اب ان کی نجات کی کوئی راہ نہیں

ہے تو وہ پسپا ہو گئے اور انہوں نے کہا: "یٰۤاَیُّهَا الْعَزِیْزُ اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَیْخًا كَبِیْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ"۔ (اے مصر کے بادشاہ! بے شک ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے، آپ اس کی جگہ ہم میں سے کسی ایک کو رکھ لیں)۔

"اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ":

کیونکہ آپ بہت نیکو کاروں میں سے ہیں، آپ صحیح ناپ تول کے ساتھ غلہ دیتے ہیں اور عمدہ میزبانی کرتے ہیں اور غلہ کی قیمت واپس کر دیتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "یوسف نے کہا: "معاذ اللہ! ہم نے جس کے پاس اپنا مال پایا ہے اس کے سوا کسی دوسرے کو اپنے پاس رکھ لیں، پھر تو ہم یقیناً ظلم کرنے والوں میں سے ہوں گے"O (یوسف:۷۹)

"قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ":

یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: اللہ کی پناہ! کہ ہم اس کے سوا کسی کو غلام بنائیں جس کے پاس سے ہمارا مال برآمد ہوا ہے۔ اور اپنے آپ کو جھوٹ سے بچاتے ہوئے یہ نہیں کہا کہ جس نے چوری کی ہے۔ پھر تو یقیناً ہم ظلم کرنے والے ہوں گے کہ ہم کسی بے قصور کو غلام بنا لیں۔ (معالم التنزیل ج ۳ ص ۵۰۳۔ ۵۰۷، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

فَلَمَّا اسْتَیْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِیًّا ؕ قَالَ كَبِیْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَیْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَ مِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِیْ یُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى یَاْذَنَ لِیْۤ اَبِیْۤ اَوْ یَحْكُمَ اللّٰهُ لِیْ ۚ وَ هُوَ خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ (۸۰)

پھر جب یوسف کے بھائی بادشاہ کی طرف سے مایوس ہو گئے تو الگ ہو کر انہوں نے مشورہ کیا، ان کے بڑے بھائی نے کہا: "کیا تمہیں یاد نہیں کہ تمہارے والد نے تم سے اللہ کی قسم کے ساتھ پختہ وعدہ لیا ہوا تھا اور اس سے پہلے تم نے یوسف کے معاملہ میں بھی کوتاہی کی تھی، لہٰذا میں مصر کی زمین سے اس وقت تک نہیں جاؤں گا حتیٰ کہ مجھے میرے والد اجازت دیں یا اللہ میرے لیے کوئی حکم نازل فرما دیں، اور وہ بہترین حکم نازل فرمانے والے ہیں"O

اِرْجِعُوْۤا اِلٰۤى اَبِیْكُمْ فَقُوْلُوْا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَ مَا شَهِدْنَاۤ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَ مَا كُنَّا لِلْغَیْبِ حٰفِظِیْنَ (۸۱)

تم سب اپنے والد کی طرف لوٹ کر جاؤ، پس ان سے کہو: "اے ہمارے ابا جان! بے شک آپ کے بیٹے نے چوری کی اور ہم صرف اسی بات پر گواہ ہیں جو ہمارے علم میں ہے اور ہم غیب کی حفاظت کرنے والے نہیں ہیں"O

وَ سْـَٔلِ الْقَرْیَةَ الَّتِیْ كُنَّا فِیْهَا وَ الْعِیْرَ الَّتِیْۤ اَقْبَلْنَا فِیْهَا ؕ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (۸۲)

اور آپ اس بستی والوں سے پوچھ لیجئے جس بستی میں ہم تھے اور اس قافلہ سے معلوم کر لیجئے جس میں ہم آئے تھے، اور بے شک ہم ضرور سچے ہیں O

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۸۳﴾

یعقوب نے کہا: بلکہ یہ بات تمہارے دلوں نے گھڑ لی ہے، سو اب صبر ہی عمدہ ہے، قریب ہے کہ اللہ ان سب کو اکٹھا کر کے میرے پاس لے آئیں، بے شک وہ سب کچھ جاننے والے، سب سے زیادہ حکمت والے ہیں O

وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰۤاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۸۴﴾

یہ کہہ کر یعقوب نے اُن سے پیٹھ پھیر لی اور کہا: ہائے افسوس! یوسف کے فراق پر، اور ان کی دونوں آنکھیں شدت غم کی بناء پر سفید ہو گئیں، سو وہ اپنے غم کو ضبط کرتے رہے O

قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾

ان کے بیٹوں نے کہا: اللہ کی قسم! آپ ہمیشہ یوسف کو یاد کرتے رہیں گے حتیٰ کہ آپ کا جسم گھل جائے گا یا آپ ہلاک ہونے والوں میں سے ہو جائیں گے O

قَالَ اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾

یعقوب نے کہا: "میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کی شکایت صرف اللہ سے کرتا ہوں، اور میں اللہ کی طرف سے وہ چیزیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے" O

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْــَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْــَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾

اے میرے بیٹو! جاؤ یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بے شک اللہ کی رحمت سے صرف کفار ہی مایوس ہوتے ہیں" O

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِى الْمُتَصَدِّقِيْنَ ﴿۸۸﴾

پھر جب یوسف کے بھائی (دوبارہ) یوسف کے پاس پیش ہوئے تو انہوں نے کہا: "اے بادشاہ! ہم پر اور ہمارے گھر والوں پر

سخت مصیبت آئی ہے اور ہم بہت تھوڑی سی رقم لے کر آئے ہیں، پس آپ ہمیں غلہ کا پورا پیمانہ بھر کر دے دیں اور ہم پر صدقہ فرمائیں، بے شک اللہ صدقہ کرنے والوں کو بہترین جزا عطا فرماتے ہیں"O

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ﴿۸۹﴾

بادشاہ نے کہا: کیا تمہیں یاد ہے کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا، کیا تھا جب تم اس کے نتیجہ سے ناواقف تھے؟O

قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ۭ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ ۡ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ۭ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۰﴾

یوسف کے بھائیوں نے کہا: کیا بے شک آپ ہی یوسف ہیں؟ یوسف نے کہا: ہاں میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے، بے شک اللہ نے ہم پر احسان فرمایا، بے شک جو اللہ سے ڈرے اور صبر کرے تو یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں فرماتےO

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ ﴿۹۱﴾

یوسف کے بھائیوں نے کہا: "اللہ کی قسم! اللہ نے آپ کو ہم پر بہت برتری عطا فرمائی ہے اور بے شک ہم ہی خطا کرنے والے تھے"O

قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۭ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۡ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۹۲﴾

یوسف نے کہا: "آج کے دن تم پر کوئی ملامت نہیں، اللہ تمہیں معاف فرمائیں اور وہ تمام رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیںO

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰي وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۳﴾

میری یہ قمیص لے جاؤ اور اسے میرے باپ کے چہرہ پر ڈال دو، وہ دیکھنے والے ہو جائیں گے، اور تم اپنے تمام گھر والوں کو لے کر میرے پاس آجاؤO

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پھر جب یوسف کے بھائی بادشاہ کی طرف سے مایوس ہو گئے تو الگ ہو کر انہوں نے مشورہ کیا، ان کے بڑے بھائی نے کہا: "کیا تمہیں یاد نہیں کہ تمہارے والد نے تم سے اللہ کی قسم کے ساتھ پختہ وعدہ لیا ہوا تھا اور اس سے پہلے تم نے یوسف کے معاملہ میں بھی کوتاہی کی تھی، لہٰذا میں مصر کی زمین سے اس وقت تک نہیں جاؤں گا حتیٰ کہ مجھے میرے والد اجازت دیں یا اللہ میرے لیے کوئی حکم نازل فرما دیں، اور وہ بہترین حکم نازل فرمانے والے ہیں"O (یوسف:۸۰)

علامہ ابومحمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ، یوسف: ۸۰ تا ۹۳ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا": جب حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی اس سے مایوس ہو گئے کہ حضرت یوسف علیہ السلام ان کی مراد کو پورا کریں گے۔

اور امام ابوعبیدہ نے کہا کہ "اسْتَيْـَٔسُوْا" کا معنی ہے: جب انہیں یقین ہو گیا کہ یوسف ان کے بھائی کو ان کی طرف واپس نہیں فرمائیں گے تو وہ سب سے الگ ہو کر ایک دوسرے سے مشورہ کرنے لگے۔

"قَالَ كَبِيْرُهُمْ": یعنی جو عقل میں اور علم میں اُن سب سے بڑے تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور الکلبی نے کہا: وہ یہوذا تھے اور وہ ان سب سے زیادہ عقل والے تھے۔ اور مجاہد نے کہا: وہ شمعون تھے اور وہ تمام بھائیوں پر رئیس تھے۔ قتادہ، السدی اور الضحاک نے کہا: وہ روبیل تھے، وہ عمر میں سب سے بڑے تھے اور یہ وہی تھے جنہوں نے بھائیوں کو حضرت یوسف علیہ السلام کے قتل کرنے سے منع کیا تھا۔

"اَلَمْ تَعْلَمُوْا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ": کیا تمہیں یاد نہیں کہ تم نے اپنے باپ سے قسم کھا کر پکا عہد کیا تھا۔

"وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ": اور اس سے پہلے تم یوسف کے معاملہ میں تقصیر کر چکے ہو۔

"فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ": میں مصر کی اس زمین سے نہیں نکلوں گا جس میں، میں ہوں۔

"حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ": حتیٰ کہ میرے والد مجھے یہاں سے نکلنے کے لیے کہیں اور مجھے بلائیں۔

"اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ": یا اللہ تعالیٰ ایسا فیصلہ فرمادیں کہ میرے بھائی میرے طرف واپس فرمادیں، یا اللہ تعالیٰ مجھے تلوار کے ساتھ قوت عطا فرمائیں تو میں ان سے لڑوں اور اپنے بھائی کو واپس لے جاؤں۔

"وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ": اور اللہ بہترین فیصلہ فرمانے والے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "تم سب اپنے والد کی طرف لوٹ کر جاؤ، پس ان سے کہو: "اے ہمارے ابا جان! بے شک آپ کے بیٹے نے چوری کی اور ہم صرف اسی بات پر گواہ ہیں جو ہمارے علم میں ہے اور ہم غیب کی حفاظت کرنے والے نہیں ہیں"O (یوسف: ۸۱)

"اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ": اس بھائی نے اپنے دیگر بھائیوں سے کہا جس نے اپنے آپ کو سرزمین مصر میں روک لیا تھا کہ تم اپنے والد کے پاس لوٹ کر جاؤ۔

"فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ": پس تم کہو: اے ابا جان! بے شک آپ کے بیٹے بنیامین نے چوری کی ہے۔ اور اس کا یہ معنی بھی ہے کہ وہ چوری کی طرف منسوب کر دیے گئے ہیں۔

"وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا": اور ہم نے یہ جو کچھ کہا ہے، یہ اپنے علم کے مطابق کہا ہے، کیونکہ ہم نے خود دیکھا ہے کہ بادشاہ کا پیالہ بنیامین کی بوری سے برآمد ہوا ہے۔ اور یہ آپ کے بیٹے کی صحیح خبر ہے۔

"وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ": یعنی ہم اپنے بھائی کی حفاظت وہیں تک کر سکتے تھے جہاں تک ہمارے لیے ممکن تھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ہمارے لیے پوری رات اور پورا دن اور آنے جانے میں بنیامین کی حفاظت کرنا ممکن نہ تھا۔ عکرمہ نے کہا: ہم غیب کی حفاظت کرنے والے نہیں ہیں، ہو سکتا ہے رات کے کسی وقت میں اس نے وہ شاہی پیالا اپنی بوری میں ڈال لیا ہو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور آپ اس بستی والوں سے پوچھ لیجیے جس بستی میں ہم تھے اور اس قافلہ سے معلوم کر لیجیے جس میں ہم آئے تھے اور بے شک ہم ضرور سچے ہیں O'' (یوسف: ۸۲)

''وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا'': یعنی آپ اُن بستی والوں سے پوچھیے جو مصر میں تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ مصر کی بستیوں میں سے ایک بستی ہے، وہ وہاں سے مصر کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ ''وَالْعِيْرَ الَّتِيْ اَقْبَلْنَا فِيْهَا'': اور اس قافلہ سے پوچھیے جس میں ہم تھے اور اُن کے ساتھ کنعان کے لوگوں میں سے حضرت یعقوب علیہ السلام کے پڑوسی تھے۔

(شام اور مصر کے درمیان تقریباً ایک ہزار ایک سو بیاسی (1,182) کلومیٹر کی مسافت ہے، اور اونٹ کی رفتار سے شام اور مصر کا درمیانی سفر تقریباً تین دن کے لگ بھگ ہے)۔

''وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ'': صحیح یہ ہے کہ یہ جو کچھ ہوا یہ اللہ عزوجل کے حکم سے ہوا، تاکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی مصیبت میں اضافہ ہو اور اُن کا اجر زیادہ ہو، اور وہ اپنے آباء کے ساتھ درجہ میں مل جائیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''یعقوب نے کہا: بلکہ یہ بات تمہارے دلوں نے گھڑ لی ہے، سو اب صبر ہی عمدہ ہے، قریب ہے کہ اللہ ان سب کو اکٹھا کر کے میرے پاس لے آئیں، بے شک وہ سب کچھ جاننے والے، سب سے زیادہ حکمت والے ہیں O'' (یوسف: ۸۳)

''قَالَ'': یہاں اختصار کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس آیت کا معنی ہے: پس وہ اپنے والد کے پاس لوٹ کر گئے اور انہوں نے اپنے والد سے ذکر کیا کہ اُن کے بڑے بھائی نے کیا کہا ہے۔ تب حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا: ''بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا''۔ تم اپنے بھائی کو مصر لے گئے تاکہ تمہیں جلدی سے دنیا کا نفع حاصل ہو جائے۔

''فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا'': یعنی قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ یوسف اور بنیامین کو ہمارے پاس لے آئیں۔

''اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ'': بے شک اللہ میرے غم کو اور میرے رنج کو جاننے والے ہیں جو مجھے ان کی جدائی پر ہے۔

''الْحَكِيْمُ'': اور وہ اپنی مخلوق کے معاملات کی تدبیر فرمانے والے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''یہ کہہ کر یعقوب نے اُن سے پیٹھ پھیر لی اور کہا: ہائے افسوس! یوسف کے فراق پر، اور ان کی دونوں آنکھیں شدتِ غم کی بناء پر سفید ہو گئیں، سو وہ اپنے غم کو ضبط کرتے رہے O'' (یوسف: ۸۴)

"وَ تَوَلّٰی عَنْهُمْ": جب حضرت یعقوب علیہ السلام کو بنیامین کی خبر پہنچی تو ان کا رنج اور غم بہت زیادہ ہو گیا اور حضرت یوسف علیہ السلام پر اُن کا غم تازہ ہو گیا، پس انہوں نے اپنے بیٹوں سے پیٹھ پھیر لی۔

"وَ قَالَ یٰۤاَسَفٰی عَلٰی یُوْسُفَ": یعنی ہائے میرا غم۔ اور اسف کا معنی ہے: شدید رنج اور غم۔

"وَ ابْیَضَّتْ عَیْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ": یعنی ان کی بصارت چلی گئی اور وہ نابینا ہو گئے۔ مقاتل نے کہا: وہ اپنی آنکھوں سے چھ سال تک نہیں دیکھ سکے۔ "فَهُوَ كَظِیْمٌ": یعنی وہ اپنے رنج اور غم کو ضبط کرنے والے تھے۔ قتادہ نے کہا: وہ اپنے غم کو اپنے پیٹ میں ہی دہراتے رہتے تھے اور خیر کے سوا کوئی بات نہ کہتے تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "ان کے بیٹوں نے کہا: اللہ کی قسم! آپ ہمیشہ یوسف کو یاد کرتے رہیں گے حتیٰ کہ آپ کا جسم گھل جائے گا یا آپ ہلاک ہونے والوں میں سے ہو جائیں گے O" (یوسف: ۸۵)

"قَالُوْا": یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے کہا: "تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ یُوْسُفَ": یعنی آپ ہمیشہ یوسف کو یاد کرتے رہتے ہیں۔

"حَتّٰی تَكُوْنَ حَرَضًا": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حتیٰ کہ آپ دفن کر دیے جائیں، موت سے پہلے جو حالت ہے اس کو حرض کہتے ہیں، یعنی موت کے قریب پہنچ جائیں۔ ابن اسحاق نے کہا: آپ سٹھیا جائیں اور آپ کی عقل کام نہ کرے۔ اور الحرض وہ ہے جس کا جسم اور عقل دونوں فاسد ہو جائیں۔ اور ایک قول ہے کہ غم سے گھل جائیں گے۔

"اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِیْنَ": یعنی مردہ لوگوں میں سے ہو جائیں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "یعقوب نے کہا: میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کی شکایت صرف اللہ سے کرتا ہوں، اور میں اللہ کی طرف سے وہ چیزیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے O" (یوسف: ۸۶)

"قَالَ": حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس وقت کہا جب انہوں نے اپنی بیٹوں کی سختی کا مشاہدہ کیا۔

"اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّیْ وَ حُزْنِیْۤ اِلَى اللّٰهِ": البث کا معنی ہے شدید غم۔

روایت ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا پڑوسی ان کے پاس آیا اور ان سے پوچھا: آپ کا یہ حال کیسے ہو گیا، آپ تو نحیف و نزار اور تقریباً فنا ہو چکے ہیں۔ تب حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا: مجھے یوسف کی جدائی نے غم میں ڈال دیا ہے، پس اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی: اے یعقوب! کیا تم میری مخلوق سے میری شکایت کر رہے ہو؟ تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے عرض کیا: اے میرے رب! یہ میری خطاء ہے، آپ میری اس خطاء کو معاف فرمائیں۔ اللہ عزوجل نے فرمایا: میں نے آپ کو معاف فرما دیا، پھر جب ان سے کوئی سوال کرتا تو کہتے: "اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّیْ وَ حُزْنِیْۤ اِلَى اللّٰهِ"۔

میں کہتا ہوں: یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام لوگوں سے اللہ تعالیٰ کی شکایت کرنے والے نہ تھے، وہ تو اپنے غم اور دکھ کا اظہار صرف اللہ عزوجل سے کرتے تھے۔ (سعیدی غفرلہ)

"وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ": یعنی مجھے یوسف علیہ السلام کے زندہ ہونے کا علم ہے، جو تم نہیں جانتے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اے میرے بیٹو! جاؤ یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بے شک اللہ کی رحمت سے صرف کفار ہی مایوس ہوتے ہیں" O (یوسف: ۸۷)

"یٰبَنِیَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ یُّوْسُفَ وَ اَخِیْهِ": اے میرے بیٹو! جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کی خبر کو تلاش کرو۔ تحسس خیر کے مواقع پر استعمال کیا جاتا ہے اور تجسس شر کے مواقع پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اور تحسس کا معنی ہے: کسی چیز کو حواس سے تلاش کرنا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کا معنی ہے: تم ڈھونڈو اور تلاش کرو۔

"وَلَا تَایْــَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ": اور تم اللہ تعالیٰ کی رحمت اور ان کی کشادگی سے ناامید نہ ہو۔

"اِنَّهٗ لَا یَایْــَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ": بے شک اللہ کی رحمت سے صرف کفار ہی مایوس ہوتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پھر جب یوسف کے بھائی (دوبارہ) یوسف کے پاس پیش ہوئے تو انہوں نے کہا: "اے بادشاہ! ہم پر اور ہمارے گھر والوں پر سخت مصیبت آئی ہے اور ہم بہت تھوڑی سی رقم لے کر آئے ہیں، پس آپ ہمیں غلہ کا پورا پیمانہ بھر کر دے دیں اور ہم پر صدقہ فرمائیں، بے شک اللہ صدقہ کرنے والوں کو بہترین جزا عطا فرماتے ہیں" O (یوسف: ۸۸)

"فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَیْهِ قَالُوْا": یہاں پر کچھ الفاظ مقدر ہیں اور اصل عبارت اس طرح ہے: پس حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے نکل کر مصر کی طرف روانہ ہوئے حتیٰ کہ وہ مصر تک پہنچ گئے، پھر حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس گئے اور جب ان کے پاس داخل ہوئے تو انہوں نے کہا: "یٰۤاَیُّهَا الْعَزِیْزُ مَسَّنَا وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ": اے بادشاہ! ہم کو سخت مصیبت اور بھوک کا سامنا ہے۔ "وَ جِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ": اور ہم بہت تھوڑی رقم لے کر آئے ہیں، اس رقم سے طعام کی قیمت ادا نہیں کی جا سکتی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ کھوٹے درہم تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ کچھ پھٹی ہوئی پرانی بوریاں اور رسیاں تھیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ دیہات سے حاصل کیا ہوا اون اور پنیر تھا۔ الکلبی اور مقاتل نے کہا: وہ سبز دانے تھے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ وہ ستو تھے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ وہ کچا چمڑا اور جوتیاں تھیں۔

"فَاَوْفِ لَنَا الْكَیْلَ": یعنی آپ ہمیں اتنا غلہ دے دیں جتنا آپ کھری قیمت کے ساتھ غلہ دیتے ہیں۔

"وَ تَصَدَّقْ عَلَیْنَا": اور ہم پر صدقہ فرمائیں۔ اور ابن جریر اور الضحاک نے کہا: آپ ہمارا بھائی ہم کو واپس کر کے ہم پر صدقہ کر دیں۔ "اِنَّ اللّٰهَ یَجْزِی الْمُتَصَدِّقِیْنَ": بے شک اللہ عزوجل صدقہ کرنے والوں کو اجر عطا فرماتے ہیں۔

الضحاک نے کہا کہ یوسف کے بھائیوں نے یہ نہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صدقہ عطا کرنے کی جزا عطا فرمائیں گے، کیونکہ ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ بادشاہ مومن ہے یا نہیں۔ اور سفیان بن عیینہ سے سوال کیا گیا: کیا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کسی پر صدقہ حرام فرمایا گیا ہے؟ تو سفیان نے کہا: کیا تم نے نہیں سنا: "وَ تَصَدَّقْ عَلَیْنَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ یَجْزِی الْمُتَصَدِّقِیْنَ" یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد پر صدقہ حلال تھا۔

روایت ہے کہ حسن بصری نے ایک آدمی سے سنا وہ کہہ رہا تھا "اللهم تصدق علی" تو انہوں نے کہا: اللہ عزوجل تو کسی پر

صدقہ نہیں فرماتے ،صدقہ تو وہ کرتا ہے جو ثواب کوطلب کرتا ہے،تم یوں دعا کرو: اے اللہ! مجھے عطا فرمائیں اور مجھ پر فضل فرمائیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:'' بادشاہ نے کہا: کیا تمہیں یاد ہے کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا جب تم اس کے نتیجہ سے ناواقف تھے؟O (یوسف:۸۹)

''قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَ اَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ'': اس میں اختلاف ہے کہ کس وجہ سے حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ بات کہی۔ابن اسحاق نے کہا کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اُن سے اپنے مصائب بیان کیے تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے،اور وہ چیز ظاہر ہو گئی جس کو وہ چھپاتے تھے۔

الکلبی نے کہا: جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے یہ حکایت بیان کی کہ مالک بن ذعر نے ان سے بیان کیا: میں نے ایک لڑکے کو کنویں میں پایا، اس کا حال اس طرح اور اس طرح تھا تو میں نے اس کو اتنے اور اتنے درہم کے عوض بیچ دیا تو حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے کہا: اے بادشاہ! ہم نے اس لڑکے کو فروخت کیا تھا۔پس حضرت یوسف علیہ السلام یہ سن کر مشتعل ہو گئے اور اُن کو قتل کرنے کا حکم دیا۔پس جب اُن کے کارندے ان کو قتل کرنے کے لیے لے جا رہے تھے تو یہودا پیٹھ پھیر کر مڑا اور وہ یہ کہہ رہا تھا کہ یعقوب ہم میں سے کسی ایک کے بھی گم ہونے پر رنجیدہ ہوتے اور غمزدہ ہوتے تھے حتیٰ کہ ان کی بینائی چلی گئی، ان کا اس وقت کیا حال ہوگا جب انہیں خبر دی جائے گی کہ تمہارے تمام بیٹے قتل کر دیے گئے۔پھر انہوں نے کہا: اگر آپ ایسا کر رہے ہیں تو ہمارا سامان ہمارے والد کی طرف بھیج دیں، وہ فلاں فلاں جگہ پر ہے۔پس اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کو اُن پر رحم آیا اور وہ روئے، پھر انہوں نے کہا:'' هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَ اَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ'': حسن بصری نے کہا: جب تم جوان تھے اور تم پر جوانوں کا جہل غالب تھا۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے مشتعل ہونے اور بھائیوں کو قتل کرنے کا حکم دینے کی جو حکایت بیان کی گئی ہے وہ صحیح نہیں ہے،حضرت یوسف علیہ السلام تو مصائب پر بہت صبر فرمانے والے تھے اور وہ غیظ وغضب میں آنے والے نہیں تھے اور انتقام لینے والے نہیں تھے،جیسا کہ عنقریب آئے گا کہ انہوں تو اپنے بھائیوں کے لیے دعائے مغفرت فرمائی۔(سعیدی غفرلہ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:''یوسف کے بھائیوں نے کہا: کیا بے شک آپ ہی یوسف ہیں؟ یوسف نے کہا: ہاں میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے، بے شک اللہ نے ہم پر احسان فرمایا، بے شک جو اللہ سے ڈرے اور صبر کرے تو یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں فرماتے O'' (یوسف:۹۰)

''قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ'': ابن اسحاق نے بیان کیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام ان سے پردہ کے پیچھے سے کلام فرماتے تھے۔پھر جب حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا:'' عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَ اَخِيْهِ'': تو انہوں نے وہ حجاب اٹھا دیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان کو پہچان لیا۔

الضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ بات کہی تو ان کے بھائیوں نے ان کے سامنے کے دانت دیکھے جیسے موتی ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہوں، تو انہوں نے بادشاہ کو یوسف کے مشابہ پایا۔

اور عطاء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان کو نہیں پہچانا تھا حتیٰ کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے سر سے تاج اتارا اور اُن کے بالوں کے درمیان ایک علامت تھی اور حضرت یعقوب علیہ السلام میں بھی وہ علامت تھی اور حضرت اسحاق علیہ السلام میں بھی تھی اور حضرت سارہ میں بھی تھی، وہ تل کے مشابہ کوئی چیز تھی، تب حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو پہچان لیا اور کہا: "ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ یُوْسُفُ" اور انہوں نے یہ بہ طور وہم کہا تھا۔

"قَالَ اَنَا یُوْسُفُ وَ هٰذَاۤ اَخِیْ": حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی بنیامین ہے۔

"قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا": اللہ تعالیٰ نے ہم پر انعام فرمایا کہ ہم سب کو جمع فرما دیا۔

"اِنَّهٗ مَنْ یَّتَّقِ": جو فرائض کی ادائیگی کرے اور نافرمانیوں سے اجتناب کرتا ہے۔ "وَ یَصْبِرْ": اور جن کاموں کو اللہ عزوجل نے حرام قرار فرمایا ہے، ان سے رکتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: زنا سے بچتا ہے اور بے نکاحی پر صبر کرتا ہے۔ مجاہد نے کہا: جو نافرمانی سے بچتا ہے اور قید پر صبر کرتا ہے۔

"فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ": یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں فرماتے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "یوسف کے بھائیوں نے کہا: "اللہ کی قسم! اللہ نے آپ کو ہم پر بہت برتری عطا فرمائی ہے اور بے شک ہم ہی خطا کرنے والے تھے" O (یوسف: ۹۱)

"قَالُوْا": حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے عذر پیش کرتے ہوئے کہا: "تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَیْنَا": یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو مختار فرمایا اور ہم پر فضیلت عطا فرمائی۔

"وَ اِنْ كُنَّا لَخٰطِـٕیْنَ": یعنی ہم نے جو کچھ آپ کے ساتھ سلوک کیا، اس میں ہم خطا کار اور گناہ گار تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "یوسف نے کہا: "آج کے دن تم پر کوئی ملامت نہیں، اللہ تمہیں معاف فرمائیں اور وہ تمام رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں" O (یوسف: ۹۲)

"قَالَ": حضرت یوسف علیہ السلام بہت حلیم اور بردبار تھے، انہوں نے کہا: "لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْكُمُ الْیَوْمَ": تم پر آج کے بعد کوئی ملامت نہیں ہے، میں آج کے بعد تمہیں تمہارا گناہ یاد نہیں دلاؤں گا۔

"یَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ٘ وَ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ": اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائیں، وہ تمام رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "میری یہ قمیص لے جاؤ اور اسے میرے باپ کے چہرہ پر ڈال دو، وہ دیکھنے والے ہو جائیں گے، اور تم اپنے تمام گھر والوں کو لے کر میرے پاس آ جاؤ" O (یوسف: ۹۳)

پس جب حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کو پہچان لیا تو ان سے ان کے والد کے متعلق سوال کیا، پس کہا: میرے بعد میرے والد نے کیا کیا؟ بھائیوں نے بتایا کہ رو رو کر اُن کی دونوں آنکھیں جاتی رہیں۔ تب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی قمیص ان کو دی اور کہا: "اِذْهَبُوْا بِقَمِیْصِیْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِیْ یَاْتِ بَصِیْرًاۚ وَ اْتُوْنِیْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِیْنَ": یعنی ان کے والد دیکھنے والے ہو جائیں

گے۔ یا میرے پاس اس حال میں آئیں گے کہ وہ دیکھنے والے ہوں گے، کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والد کے لیے دعا کی تھی۔ حسن بصری نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ پتا نہیں تھا کہ اُن کے والد دیکھنے والے ہو جائیں گے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو اس پر مطلع فرمایا اور وہ قمیص جنت کے دھاگوں سے بنی ہوئی تھی۔

مجاہد بیان کرتے ہیں کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ کا حکم پہنچایا کہ اپنی قمیص بھیج دیں، اور یہ وہی قمیص تھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قمیص تھی، جب ان کے کپڑے اتار کران کو آگ میں ڈالا گیا تو ان کا اوپری بدن برہنہ تھا تو حضرت جبریل علیہ السلام جنت سے ایک ریشمی قمیص لے کر آئے اور ان کو پہنائی اور وہ قمیص حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس رہی، پس جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وفات ہوگئی تو حضرت اسحاق علیہ السلام اس کے وارث ہوئے، پس جب حضرت اسحاق علیہ السلام فوت ہو گئے تو حضرت یعقوب علیہ السلام اس کے وارث ہوئے، پھر جب حضرت یوسف علیہ السلام جوان ہوئے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس قمیص کو حضرت یوسف علیہ السلام کو پہنا دیا۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام اس قمیص کو کسی حال میں الگ نہیں فرماتے تھے۔ اور کنویں میں بھی حضرت جبریل علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو وہ قمیص پہنائی تھی، اور اس وقت حضرت جبریل علیہ السلام ان کے پاس آئے اور ان سے کہا: آپ اپنے والد کے پاس وہ قمیص بھیج دیجئے، کیونکہ اس میں جنت کی خوشبو ہے، وہ قمیص جس بیمار پر پڑتی ہے تو وہ شفایاب ہو جاتا ہے، تو حضرت یوسف علیہ السلام نے وہ قمیص اپنے بھائیوں کو دے دی اور کہا: جا کر یہ قمیص میرے باپ کے چہرہ پر رکھو تو وہ دیکھنے والے ہو جائیں گے۔

"وَأْتُونِي بِأَهْلِكُمْ أَجْمَعِينَ": اور تم اپنے تمام گھر والوں کو لے کر میرے پاس آ جاؤ۔

(معالم التنزیل ج ۲ ص ۵۰۷۔ ۵۱۳، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَنْ تُفَنِّدُونِ ﴿۹۴﴾

اور جب قافلہ مصر سے روانہ ہوا تو ان کے باپ یعقوب نے کہا: بے شک مجھے یوسف کی خوشبو آرہی ہے، اگر تم یہ نہ کہو کہ یہ بوڑھا سٹھیا گیا ہے۔

قَالُوا تَاللَّهِ إِنَّكَ لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ ﴿۹۵﴾

ان کے بیٹوں نے کہا: اللہ کی قسم! بے شک آپ پرانی محبت کی وارفتگی میں ہیں۔

فَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ أَلْقَاهُ عَلَىٰ وَجْهِهِ فَارْتَدَّ بَصِيرًا ۖ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۹۶﴾

پھر جب خوش خبری سنانے والا آیا اور اس نے یوسف کی قمیص اُن کے چہرہ پر ڈالی تو اسی وقت وہ بینا ہو گئے، انہوں نے کہا: "کیا میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ میں اللہ کی طرف سے اُن باتوں کو جانتا ہوں جن کو تم نہیں جانتے"۔

قَالُوا يَا أَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إِنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ ﴿۹۷﴾

ان کے بیٹوں نے کہا: اے ابا جان! آپ ہمارے لیے ہمارے گناہوں کی مغفرت طلب کریں، بے شک ہم خطا کرنے والے تھے O

قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۹۸﴾

انہوں نے کہا: "میں عنقریب تمہارے لیے اپنے رب سے مغفرت طلب کروں گا بے شک وہ نہایت بخشنے والے سب سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں" O

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَ قَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ؕ﴿۹۹﴾

پھر جب وہ سب یوسف کے پاس پہنچ گئے تو یوسف نے اپنے ماں باپ کو اپنے پاس (تخت پر) بٹھایا اور کہا: آپ سب مصر میں (رہنے کے لیے) داخل ہو جائیں، ان شاء اللہ آپ امن سے رہنے والے ہوں گے O

وَ رَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَ قَالَ يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ٝ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ؕ وَ قَدْ اَحْسَنَ بِيْۤ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَ جَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَ بَيْنَ اِخْوَتِيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۰۰﴾

اور یوسف نے اپنے والدین کو شاہی تخت پر بٹھایا اور سب یوسف کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے، اور یوسف نے کہا: "اے ابا جان! یہ میرے اس بچپن کے خواب کی تعبیر ہے، میرے رب نے اس خواب کو سچا بنا کر دکھا دیا، اور میرے رب نے مجھ پر احسان فرمایا جب انہوں نے مجھے قید خانہ سے نکالا اور آپ سب کو دیہات سے یہاں لے آئے، یہ سب اس کے بعد ہوا جب شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان بگاڑ پیدا کر دیا تھا، بے شک میرے رب جس کے لیے چاہتے ہیں، اس کی لطف کے ساتھ تدبیر فرماتے ہیں، بے شک وہ، بہت وسیع علم والے، وسیع حکمت والے ہیں O

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ٝ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۱﴾

اے میرے رب! آپ نے مجھے مصر کی حکومت عطا فرمائی اور مجھے خواب کی تعبیروں میں سے کچھ علم عطا فرمایا، اے آسمانوں اور زمینوں کے پیدا فرمانے والے! آپ ہی دنیا اور آخرت میں میرے کارساز ہیں، مجھے حالت اسلام میں دنیا سے اٹھائیں

اور نیکوکاروں کے ساتھ مجھے ملا دیں O

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ ۚ وَ مَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ وَ هُمْ یَمْكُرُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

(اے رسول اکرم!) یہ غیب کی چند خبریں ہیں جن کی ہم آپ کی طرف وحی فرماتے ہیں، اور آپ اس وقت یوسف کے بھائیوں کے پاس موجود نہیں تھے جب وہ یوسف کے خلاف سازش کا پختہ منصوبہ بنا رہے تھے O

وَ مَاۤ اَكْثَرُ النَّاسِ وَ لَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۰۳﴾

آپ کی خواہ کتنی ہی خواہش ہو پھر بھی اکثر لوگ ایمان نہیں لائیں گے O

وَ مَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰۴﴾ ع

حالانکہ آپ اُن سے دین کی تبلیغ پر کسی اجر کو طلب نہیں کرتے، یہ (دین کی) تبلیغ تو صرف تمام جہان والوں کے لیے نصیحت ہے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور جب قافلہ مصر سے روانہ ہوا تو ان کے باپ یعقوب نے کہا: بے شک مجھے یوسف کی خوشبو آ رہی ہے، اگر تم یہ نہ کہو کہ یہ بوڑھا سٹھیا گیا ہے O'' (یوسف: ۹۴)

علامہ ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ، یوسف: ۹۴ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ'': یعنی جب مصر کے شہر سے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا قافلہ کنعان کی طرف روانہ ہوا۔ ''قَالَ اَبُوْهُمْ'': تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے پوتوں سے کہا: ''اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ'': روایت ہے کہ بادِ صبا نے اپنے رب سے اجازت طلب کی کہ وہ خوش خبری دینے والے کے حضرت یعقوب علیہ السلام تک پہنچنے سے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام کی خوشبو اُن کے باپ تک پہنچا دے، مجاہد نے کہا: حضرت یعقوب علیہ السلام نے تین دن کی مسافت سے یہ خوشبو پائی۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آٹھ دن کی مسافت سے یہ خوشبو پائی۔ حسن بصری نے کہا: ان کے درمیان اسی (۸۰) فرسخ کا فاصلہ تھا۔ اور کہا گیا ہے کہ بادِ صبا نے حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص کی خوشبو اٹھائی اور حضرت یعقوب علیہ السلام تک پہنچائی، حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس میں جنت کی خوشبو پائی۔ تو انہوں نے جان لیا کہ اس قمیص کے سوا اور کہیں سے جنت کی خوشبو نہیں آ گی، اس وجہ سے انہوں نے کہا کہ مجھے یوسف کی خوشبو آ رہی ہے۔

''لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ'': یعنی اگر تم مجھے بے وقوف نہ قرار دو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: اگر تم مجھے جاہل نہ قرار دو۔ الضحاک نے کہا: اگر تم یہ نہ کہو کہ یہ بوڑھا ہو گیا ہے اور اس کی عقل جاتی رہی ہے۔

امام ابو جعفر محمد بن جریر الطبری المتوفی ۳۱۰ھ، یوسف: ۹۴ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ'': جب حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں کا قافلہ حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس سے حضرت یعقوب علیہ السلام

کی طرف روانہ ہوا۔ ذکر کیا گیا ہے کہ ہوا نے اپنے رب سے اجازت طلب کی کہ وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس حضرت یوسف علیہ السلام کی خوشبو اس سے پہلے لے کر جائے کہ ان کے پاس بشارت دینے والا پہنچے، اللہ تعالیٰ نے اجازت عطا فرمائی تو وہ خوشبو انہیں لگی۔ "قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَاۤ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ": تب حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا: بے شک مجھے یوسف کی خوشبو آرہی ہے اگر تم یہ نہ کہو کہ یہ بوڑھا سٹھیا گیا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کی خوشبو اس وقت پائی جب وہ ان سے آٹھ راتوں کے فاصلہ پر تھے۔

حسن بصری نے کہا ہے: ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ اُن دونوں کے درمیان اس وقت اسی (۸۰) فرسخ کا فاصلہ تھا۔ یعنی مصر کی سرزمین سے لے کر جہاں حضرت یوسف علیہ السلام تھے اور کنعان کی زمین تک جہاں حضرت یعقوب علیہ السلام تھے اسی (۸۰) فرسخ کا فاصلہ تھا۔ اور اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کو حضرت یعقوب علیہ السلام سے جدا ہوئے ستتر (۷۷) سال گزر چکے تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: "لَوْلَاۤ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ" کا معنی ہے: اگر تم مجھ کو بیوقوف قرار نہ دو۔

اور مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہے کہ تم یہ نہ کہو کہ ان کی عقل جا چکی ہے۔

(تفسیر الطبری ج ۱۲ ص ۳۳۲، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۳۳ھ، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۷ ص ۲۱۹۶، رقم الحدیث: ۱۱۹۵۵، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ، تفسیر عبد الرزاق ج ۱ ص ۳۲۹، البحر المحیط ج ۵ ص ۳۴۵)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "ان کے بیٹوں نے کہا: اللہ کی قسم! بے شک آپ پرانی محبت کی وارفتگی میں ہیں O" (یوسف: ۹۵)

علامہ ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ، یوسف: ۹۵ تا ۱۰۴ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"قَالُوْا": یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کے پوتوں نے کہا: "تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ": یعنی آپ اپنی پہلی خطاء میں مبتلاء ہیں کیونکہ آپ یوسف کو یاد کر رہے ہیں اور ان کو نہیں بھول رہے۔ اور "ضلال" کا معنی ہے: صحیح راستہ سے نکل جانا۔ کیونکہ ان کے پوتوں کے نزدیک حضرت یوسف علیہ السلام فوت ہو چکے تھے اور اُن کا خیال یہ تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام ان کی یاد میں وارفتہ ہو رہے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پھر جب خوش خبری سنانے والا آیا اور اس نے یوسف کی قمیص اُن کے چہرہ پر ڈالی تو اسی وقت وہ بینا ہو گئے، انہوں نے کہا: "کیا میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ میں اللہ کی طرف سے اُن باتوں کو جانتا ہوں جن کو تم نہیں جانتے" O (یوسف: ۹۶)

"فَلَمَّاۤ اَنْ جَآءَ الْبَشِیْرُ": یعنی جب حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف سے بشارت دینے والا آیا۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: وہ خوش خبری دینے والا قافلہ کے پہنچنے سے پہلے آ گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ یہوذا تھے۔ یہوذا نے کہا: پہلے میں خون آلودہ قمیص کو لے کر یعقوب کے پاس گیا تھا اور ان کو یہ خبر دی تھی کہ یوسف کو بھیڑیے نے

کھا لیا ہے، اور اب میں ان کی تازہ قمیص لے کر جاؤں گا اور ان کو بتاؤں گا کہ یوسف زندہ ہیں، پس میں ان کو اسی طرح خوش کروں گا جس طرح میں نے پہلے ان کو غم زدہ کیا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہوذا نے اس قمیص کو اٹھایا اور ننگے پیر دوڑتا ہوا گیا۔ اور اس کے ساتھ سات روٹیاں تھیں، اس نے وہ روٹیاں پوری نہیں کھائی تھیں کہ وہ اپنے والد کے پاس پہنچ گیا، اور ان کے درمیان مسافت اسی (۸۰) فرسخ تھی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ بشارت دینے والا مالک بن ذعر تھا۔

''اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ'': یعنی خوش خبری دینے والے نے حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص حضرت یعقوب علیہ السلام کے چہرہ پر ڈال۔ ''فَارْتَدَّ بَصِيْرًا'': تو وہ اسی وقت بینا ہو گئے، جبکہ اس سے پہلے وہ نابینا تھے۔ اور کمزوری کے بعد ان میں طاقت آ گئی اور بڑھاپے کے بعد ان میں جوانی آ گئی اور غم کے بعد خوشی آ گئی۔ ''قَالَ'' یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا: ''اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْۤ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ'': یعنی میں یوسف کی زندگی کے بارے میں وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو جمع فرمائیں گے۔

اور روایت ہے کہ انہوں نے بشارت دینے والے سے پوچھا: تم نے یوسف کو کس حال میں پایا؟ اس نے بتایا کہ وہ مصر کے بادشاہ ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا: مجھے اُن کی بادشاہت سے کیا دلچسپی ہے، یہ بتاؤ کہ وہ کس دین پر ہیں؟ اس نے بتایا کہ وہ دین اسلام پر ہیں، تب حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا: اب اللہ کی نعمت مکمل ہو گئی ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: '' ان کے بیٹوں نے کہا: اے ابا جان! آپ ہمارے لیے ہمارے گناہوں کی مغفرت طلب کریں، بے شک ہم خطا کرنے والے تھے O انہوں نے کہا: ''میں عنقریب تمہارے لیے اپنے رب سے مغفرت طلب کروں گا بے شک وہ نہایت بخشنے والے، سب سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں''O

(یوسف: ۹۷-۹۸)

''قَالُوْا يٰۤاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ'': یعقوب کے بیٹوں نے کہا: اے ابا جان! آپ اپنے رب سے ہمارے لیے مغفرت طلب کریں، بے شک ہم خطاء کرنے والے تھے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کے لیے استغفار کو کس وقت تک کے لیے مؤخر کیا تھا، اس میں مفسرین کے اقوال

''قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ'': یعقوب نے کہا: میں عنقریب تمہارے لیے اپنے رب سے مغفرت طلب کروں گا۔

(۱) اکثر مفسرین نے کہا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے سحری کے وقت تک دعا کو مؤخر کیا۔ اور یہ وہ وقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو شخص بھی اس وقت دعا کرے گا، تو اس کی دعا قبول فرمائی جائے گی، تو پھر حضرت یعقوب علیہ السلام سحری تک تہجد کی نماز پڑھتے رہے، پھر جب تہجد سے فارغ ہوئے تو اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ عزوجل کی بارگاہ میں دعا کی: اے اللہ! میں نے یوسف کے متعلق جس رنج کا اظہار کیا ہے اور صبر کی کمی کی ہے، اس کو معاف فرما دیں، اور میری اولاد کی بھی مغفرت فرما دیں، انہوں نے جو یوسف کے ساتھ کارروائی کی تھی، اس کو معاف فرما دیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی کہ میں نے تمہاری بھی مغفرت فرما دی اور ان

سب کی بھی مغفرت فرمادی۔

(۲) عکرمہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے جمعہ تک ان کی مغفرت کی دعا کرنے کو موخر کر دیا تھا۔ (۳) اور وہب بن منبہ نے کہا: وہ ہر جمعہ کی رات کو استغفار کرتے تھے۔ (۴) طاؤس نے کہا: انہوں نے جمعہ کی رات دعا کرنے کو موخر کر دیا اور وہ دس محرم کی رات تھی۔ (۵) شعبی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں یوسف سے سوال کروں گا، اگر یوسف نے تم کو معاف کر دیا تو پھر میں بھی تمہارے لیے استغفار کروں گا۔

"اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ": بے شک وہ سب کو بخشنے والے، سب سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں۔

روایت ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے خوش خبری دینے والے کے ساتھ حضرت یعقوب علیہ السلام کے لیے دو سو اونٹنیاں اور ان کا ساز و سامان بھیجا تھا تا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے گھر والوں اور اپنی اولاد وغیرہ کو لے کر آئیں۔ پھر حضرت یعقوب علیہ السلام مصر کی طرف روانہ ہونے کے لیے تیار ہوئے، تو جب وہ وہاں سے نکلے تو مرد اور عورتیں ملا کر بہتر (۷۲) افراد تھے اور مسروق نے کہا: وہ ترانوے (۹۳) افراد تھے۔ پھر جب وہ مصر کے قریب پہنچے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اس بادشاہ سے بات کی جو ان سے اوپر تھا، پھر حضرت یوسف علیہ السلام اور وہ بادشاہ چار ہزار کے لشکر کے ساتھ نکلے، اور اہل مصر بھی ان دونوں کے ساتھ نکلے، اور حضرت یعقوب علیہ السلام یہوذا کا سہارا لے کر چل رہے تھے، پھر انہوں نے گھوڑوں اور لوگوں کی طرف دیکھا تو کہا: اے یہوذا! یہ فرعون مصر ہے، اس نے کہا: نہیں یہ آپ کا بیٹا ہے۔ پھر جب ان میں سے ہر ایک دوسرے کے قریب پہنچا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے سلام کرنے سے ابتداء کی، حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا: نہیں حتیٰ کہ یعقوب علیہ السلام سلام سے ابتداء کریں، پس حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا: "السلام علیک یا مذهب الاحزان" (یعنی اے غموں کے دور کرنے والے! تم پر سلامتی ہو)۔

روایت ہے کہ وہ دونوں اپنی سواریوں سے اترے اور ایک دوسرے کو گلے لگایا۔ الثوری نے کہا: جب حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام سے ملے تو ہر ایک نے اپنے صاحب سے معانقہ کیا اور وہ دونوں رونے لگے۔ پس حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: اے ابا جان! آپ میرے اوپر روتے رہے حتیٰ کہ آپ کی بینائی چلی گئی، کیا آپ کو معلوم نہیں تھا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہم کو جمع فرما دیں گے؟ حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا: کیوں نہیں اے میرے بیٹے، لیکن جب تم مجھ سے جدا ہوئے تھے اس وقت تم کم عمر تھے۔ مجھے یہ ڈر ہوا کہ کہیں تم سے تمہارا دین نہ چھین لیا جائے اور میرے اور تمہارے درمیان جدائی ہو جائے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پھر جب وہ سب یوسف کے پاس پہنچ گئے تو یوسف نے اپنے ماں باپ کو اپنے پاس (تخت پر) بٹھایا اور کہا: آپ سب مصر میں (رہنے کے لیے) داخل ہو جائیں، ان شاء اللہ آپ امن سے رہنے والے ہوں گے O" (یوسف:۹۹)

"فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى یُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَیْهِ اَبَوَیْهِ": اس آیت میں فرمایا ہے کہ "یوسف نے اپنے ماں باپ کو تخت پر بٹھایا"۔ اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے باپ اور اپنی خالہ "لیّا" کو تخت پر بٹھایا، کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ راحیل تو بنیامین کی پیدائش کے وقت فوت ہو چکی تھیں۔ اور حسن بصری نے کہا کہ انہوں نے اپنے والد اور اپنی والدہ کو تخت پر بٹھایا اور ان کی

والدہ زندہ تھیں۔ اور بعض تفاسیر میں مذکور ہے کہ اللہ عزوجل نے ان کی والدہ کو زندہ فرمادیا حتیٰ کہ وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے ساتھ مصر تک آئیں۔

"وَ قَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ": (اور حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا): آپ سب مصر میں (رہنے کے لیے) داخل ہوجائیں، ان شاء اللہ آپ امن سے رہنے والے ہوں گے)۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ جب وہ مصر میں داخل ہوچکے تھے تو پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے کیسے کہا: آپ مصر میں داخل ہوجائیں ان شاء اللہ آپ امن سے رہنے والے ہوں گے۔

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سے یہ اس وقت کہا تھا جب ان کے مصر میں داخل ہونے سے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام اُن سے ملے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "یوسف نے اپنے والدین کو شاہی تخت پر بٹھایا اور سب یوسف کے سامنے سجدہ ریز ہوگئے، اور یوسف نے کہا: "اے ابا جان! یہ میرے اس بچپن کے خواب کی تعبیر ہے، میرے رب نے اس خواب کو سچا بنا کر دکھادیا، اور میرے رب نے مجھ پر احسان فرمایا جب انہوں نے مجھے قید خانہ سے نکالا اور آپ سب کو دیہات سے یہاں لے آئے، یہ سب اس کے بعد ہوا جب شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان بگاڑ پیدا کردیا تھا، بے شک میرے رب جس کے لیے چاہتے ہیں، اس کی لطف کے ساتھ تدبیر فرماتے ہیں، بے شک وہ بہت وسیع علم والے، وسیع حکمت والے ہیں O" (یوسف:۱۰۰)

"وَ رَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا": یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والد کو تخت پر بٹھایا اور وہ سب حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے سجدہ میں گر گئے، یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت یوسف کی خالہ اور ان کے بھائی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے والدین اور ان کے بھائیوں کے سجدہ کرنے کی کیفیت

اس زمانہ میں بادشاہوں کا یہی طریقہ تھا کہ ان کے سامنے لوگ جھک جاتے تھے۔ اور اس سجدہ سے پیشانی کو زمین پر رکھنے کا ارادہ نہیں کیا۔ اس سے مراد صرف جھکنا اور تواضع کرنا ہوتا تھا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ انہوں نے اپنی پیشانیاں بہ طور تعظیم اور تحیت کے زمین پر رکھ دیں، نہ بہ طور عبادت کے۔ اور یہ گزشتہ امتوں میں جائز تھا اور اس شریعت میں منسوخ فرمادیا گیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میں کسی کو حکم دیتا کہ وہ دوسرے کے لیے سجدہ کرے تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔

(سنن ترمذی: ۱۱۵۹، سنن ابوداؤد: ۲۱۴۰، کشف الاستار: ۱۴۶۶، صحیح ابن حبان: ۴۱۶۲، المستدرک ج ۴ ص ۱۷۱۔ ۱۷۲، الکامل لابن عدی ج ۳ ص ۹۴۳، مشکوۃ: ۳۲۵۵، مجمع الزوائد ج ۴ ص ۳۱۰۔ ۳۱۱، کنز العمال: ۴۴۷۷۳)

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ سب اللہ عزوجل کے لیے یوسف کے سامنے جھک گئے، یعنی سجدہ اللہ تعالیٰ کو کیا تھا، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

"وَقَالَ یٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ مِنْ قَبْلُ": اور وہ حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ قول ہے: "اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ ۝ (یوسف:۴)"۔

"قَدْ جَعَلَهَا رَبِّیْ حَقًّا": اور میرے رب نے مجھ پر یہ احسان فرمایا کہ انہوں نے اس خواب کو سچ کر دکھایا۔

"وَقَدْ اَحْسَنَ بِیْۤ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ": اور انہوں نے مجھ کو قید خانہ سے نکالا۔

یہاں پر کنویں سے نکلنے کا ذکر نہیں فرمایا، حالانکہ وہ قید خانہ سے بہت بڑی مصیبت تھی، تاکہ اُن کے بھائی شرمندہ نہ ہوں اور جب کہ وہ یہ کہہ چکے تھے: "لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْكُمُ الْیَوْمَ۔۔۔ (یوسف:۹۲)" اور اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت تھی کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے قید خانہ سے نکالا اور وہ عزیزِ مصر کے پاس پہنچا دیے گئے۔ اور کنویں میں ان کا واقع ہونا ان کے بھائیوں کے حسد کی وجہ سے تھا۔ اور قید خانہ میں رہنا ان کی کسی ظاہری لغزش کی وجہ سے مکافات کے طور پر تھا۔

"وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ": "الْبَدْو" اس کھلی زمین کو کہتے ہیں جہاں پر مویشیوں کے چرانے والے اپنے مویشیوں کے ساتھ رہتے ہیں اور وہ لوگ دیہات کے رہنے والے اور مویشیوں کے ساتھ رہنے والے تھے۔

"مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّیْطٰنُ بَیْنِیْ وَبَیْنَ اِخْوَتِیْ": یعنی جب شیطان نے میرے بھائیوں کے دلوں میں حسد اور بغض کو ڈال دیا۔ "اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ": یعنی میرے رب جس پر چاہیں اس پر لطف کے ساتھ تدبیر فرماتے ہیں اور اس پر احسان فرماتے ہیں۔ "اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ": بے شک وہ بہت وسیع علم والے، وسیع حکمت والے ہیں۔

مؤرخین نے بیان کیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس مصر میں چوبیس (۲۴) سال تک انتہائی عیش و عشرت اور خوشی کے ساتھ رہے۔ پھر وہ مصر میں فوت ہو گئے۔ پھر جب ان کی وفات قریب ہوئی تو انہوں نے اپنے بیٹے یوسف کو یہ وصیت کی کہ اُن کے جسد کو اٹھا کر لے جائیں حتیٰ کہ اُن کے والد اسحاق کے پاس اُن کی تدفین کر دیں۔ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے ایسا ہی کیا۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے جسم کو لے گئے حتیٰ کہ اُن کو شام میں دفن کر دیا۔ پھر مصر واپس آ گئے۔

سعید بن جبیر نے کہا: حضرت یعقوب علیہ السلام کو ساگوان کی بنی ہوئی لکڑی کے تابوت میں بیت المقدس تک لے جایا گیا، اور اسی دن العیص کی موت ہوئی تھی، پس ان دونوں کو ایک قبر میں داخل کر دیا گیا اور یعقوب اور العیص دونوں ایک پیٹ سے پیدا ہوئے تھے اور ان دونوں کی عمر ایک سو چوہتر (۱۷۴) سال تھی۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام پر دنیا کی یہ نعمتیں مکمل فرما دیں اور دنیا کی نعمتیں دائمی نہیں رہتیں تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے حسنِ آخرت کا سوال کیا، پس یہ دعا کی:

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اے میرے رب! آپ نے مجھے مصر کی حکومت عطا فرمائی اور مجھے خواب کی تعبیروں میں سے کچھ علم عطا فرمایا، اے آسمانوں اور زمینوں کے پیدا فرمانے والے! آپ ہی دنیا اور آخرت میں میرے کارساز ہیں، مجھے حالتِ اسلام میں دنیا سے اٹھائیں اور نیکوکاروں کے ساتھ مجھے ملا دیں ۝" (یوسف:۱۰۱)

"رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ": یعنی آپ نے مجھے مصر کا مُلک اور سلطنت عطا فرمائی۔

"وَعَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ": اور مجھے خوابوں کی تعبیر کا علم عطا فرمایا۔

"فاطر السّمٰوٰت و الارض": اے آسمانوں اور زمینوں کے خالق۔

"انت ولیّ فی الدّنیا و الاٰخرۃ": آپ میرے معاملات کے دنیا و آخرت میں متولی اور میرے مددگار ہیں۔

"توفّنی مسلمًا": یعنی جب مجھ پر موت کا وقت آئے تو میری روح کو اپنی طرف حالتِ اسلام میں قبض فرمائیں۔

"و الحقنی بالصّٰلحین": اور مجھے میرے آباء جو انبیاء علیہم السلام ہیں، اُن کے ساتھ ملا دیں۔

قتادہ نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کے سوا انبیاء میں سے کسی نبی نے موت کا سوال نہیں کیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی وفات کی دعا کی توجیہات اور وفات کے بعد ان کی تدفین تک کے احوال

اور اس کا قصہ اس طرح ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اُن میں اُن کے تمام اوصافِ حمیدہ جمع فرما دیے اور اُن کے ماں باپ کو اور اُن کے گھر والوں کو اُن سے ملا دیا تو اب وہ اپنے رب سے ملاقات کے مشتاق ہوئے، سو انہوں نے یہ دعا کی۔

حسن بصری نے کہا: اس دعا کے بعد متعدد سال تک وہ زندہ رہے۔ اور دوسروں نے کہا: جب انہوں نے یہ دعا کی تو اس کے ایک ہفتہ گزرنے کے بعد وہ فوت ہو گئے۔

اور حضرت یوسف علیہ السلام جو اپنے والد سے غائب رہے تھے، اس کی مدت میں اختلاف ہے۔

الکلبی نے کہا: بائیس سال۔ دوسرا قول ہے چالیس سال۔ حسن بصری نے کہا: حضرت یوسف علیہ السلام کی عمر سترہ سال تھی اس وقت ان کو کنویں میں ڈالا گیا تھا اور وہ اپنے والد سے اسی (۸۰) سال تک غائب رہے۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے ملاقات کے بعد تیئیس (۲۳) سال تک زندہ رہے۔ اور جس وقت ان کی وفات ہوئی اس وقت ان کی عمر ایک سو بیس سال تھی۔ اور التوراۃ میں مذکور ہے کہ وہ ایک سو بیس سال کی عمر میں فوت ہوئے۔

اور حضرت یوسف علیہ السلام کی عزیزِ مصر کی بیوی سے تین اولادیں ہوئیں: (۱) افرائیم (۲) میشا اور (۳) رحمت۔ یہ حضرت ایوب علیہ السلام کی بیوی تھیں جو بیماریوں میں مبتلاء ہوئے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنے باپ سے ملاقات کے بعد ساٹھ سال تک زندہ رہے، دوسرا قول اس سے بھی زیادہ کا ہے اور یہ مختلف اقوال ہیں۔ اور ان کی وفات اس وقت ہوئی جب ان کی عمر ایک سو بیس سال تھی۔ سو ان کو ایک لکڑی کے صندوق میں رکھ کر دریائے نیل میں دفن کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اُن کی وفات ہوئی تو ہر محلے کے لوگ چاہتے تھے کہ اُن کے محلے میں حضرت یوسف علیہ السلام کو دفن کیا جائے تا کہ اُن کی برکتیں ان کو حاصل رہیں حتیٰ کہ وہ باہم لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گئے۔ پھر اُن کی یہ رائے ہوئی کہ ان کو دریائے نیل میں دفن کر دیں اور دریا کا پانی مصر میں آتا رہے گا اور ان کی برکت سب کو پہنچ جائے گی۔

اور عکرمہ نے کہا: اُن کو دریائے نیل کی دائیں جانب دفن کیا گیا تو وہ جانب سرسبز رہتی اور دوسری جانب خشک ہو جاتی۔ پھر اُن کو دوسری جانب منتقل کیا گیا تو وہ جانب سرسبز ہو جاتی اور دوسری جانب خشک ہو جاتی، پھر انہوں نے دریائے نیل کے وسط میں ان کو دفن کر دیا تو پھر دریا کی دونوں جانبیں سرسبز رہتیں۔ پھر وہ دریائے نیل میں ہی مدفون رہے یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن کو شام میں اُن کے آباء علیہم السلام کے قرب میں دفن کر دیا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''(اے رسولِ اکرم!) یہ غیب کی چند خبریں ہیں جن کی ہم آپ کی طرف وحی فرماتے ہیں، اور آپ اس وقت یوسف کے بھائیوں کے پاس موجود نہیں تھے جب وہ یوسف کے خلاف سازش کا پختہ منصوبہ بنا رہے تھے O'' (یوسف:۱۰۲)

''ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ'': یہ قصہ جو ذکر فرمایا گیا ہے غیب کی چند خبروں میں سے ہے، جس کی ہم آپ کی طرف وحی فرماتے ہیں۔

''وَ مَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ وَ هُمْ یَمْكُرُوْنَ'': اے رسولِ اکرم! جس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اُن کے خلاف اپنی سازش پوری کرنے کا عزم کر لیا اور وہ اُن کے خلاف تدبیریں کر رہے تھے اس وقت آپ اُن کے پاس موجود نہ تھے، یعنی جب انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں گرانے کا ارادہ کر لیا تھا تو آپ اُن کے پاس موجود نہ تھے، آپ کو اس کی اطلاع صرف اللہ تعالیٰ کی وحی سے ہوئی ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''آپ کی خواہ کتنی ہی خواہش ہو پھر بھی اکثر لوگ ایمان نہیں لائیں گے O'' (یوسف:۱۰۳)

''وَ مَاۤ اَكْثَرُ النَّاسِ وَ لَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِیْنَ'': اے رسولِ اکرم! اگر آپ ان لوگوں کے ایمان کی پوری پوری کوشش کر لیں، پھر بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے۔

روایت ہے کہ یہود اور قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کے متعلق سوال کیا، پس جب آپ نے وہ قصہ تورات کے موافق بیان فرما دیا، پھر بھی انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم غمگین ہوئے تو آپ کو بتایا گیا کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے، خواہ آپ ان کے ایمان کی پوری پوری کوشش کر لیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''حالانکہ آپ اُن سے دین کی تبلیغ پر کسی اجر کو طلب نہیں کرتے، یہ (دین کی) تبلیغ تو صرف تمام جہان والوں کے لیے نصیحت ہے O'' (یوسف:۱۰۴)

''وَ مَا تَسْـٴَـلُهُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ'':

یعنی اے رسولِ اکرم! آپ اِن لوگوں کو رسالت کی تبلیغ کرنے پر اور اللہ تعالیٰ کی توحید کی طرف دعوت دینے پر کسی اجر کا سوال نہیں کرتے۔

''اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ'': یعنی قرآن تو صرف تمام جہان والوں کے لیے نصیحت ہے۔

(معالم التنزیل ج ۲ ص ۵۱۳۔۵۱۷، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

وَ كَاَیِّنْ مِّنْ اٰیَةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ یَمُرُّوْنَ عَلَیْهَا وَ هُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ (۱۰۵)

اور آسمانوں میں اور زمینوں میں کتنی ہی نشانیاں ہیں، لوگ اُن کے پاس سے غور و فکر کیے بغیر گزر جاتے ہیں O

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾

اور اُن میں سے اکثر لوگ اللہ پر اس طرح ایمان لاتے ہیں کہ وہ اس کے ساتھ شرک بھی کرتے رہتے ہیں O

أَفَأَمِنُوْٓا أَنْ تَأْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ أَوْ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

کیا وہ اس بات سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ اُن کو اللہ کا عذاب ڈھانپ لے یا اُن پر اچانک قیامت آ جائے اور وہ اس کا شعور نہ رکھتے ہوں O

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ أَدْعُوْٓا إِلَى اللّٰهِ ۚ عَلٰى بَصِيْرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۖ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

(اے رسولِ اکرم!) آپ کہیے: یہ ہے میرا راستہ، میں پوری بصیرت کے ساتھ اللہ کی طرف دعوت دے رہا ہوں میں بھی اور میرے پیروکار بھی، اور اللہ شریکوں سے پاک ہیں اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں O

وَمَآ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ إِلَيْهِمْ مِّنْ أَهْلِ الْقُرٰى ۗ أَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۗ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۗ أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

اور ہم نے آپ سے پہلے بستیوں میں رہنے والوں میں سے صرف مردوں کو رسول بنا کر بھیجا ہے جن پر ہم وحی نازل فرماتے ہیں، کیا اِن لوگوں نے زمین میں سفر نہیں کیا تا کہ وہ دیکھتے کہ اُن سے پہلے لوگوں کا کیا انجام ہوا، اور بے شک آخرت کا گھر اللہ سے ڈرتے رہنے والوں کے لیے بہتر ہے، کیا تم لوگ عقل سے کام نہیں لیتے O

حَتّٰىٓ إِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ۗ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۰﴾

حتیٰ کہ جب رسول لوگوں کے ایمان لانے سے مایوس ہو گئے اور لوگوں نے یہ گمان کر لیا کہ اُن کو ایمان نہ لانے پر جھوٹی دھمکیاں دی گئی تھیں تو ان رسولوں کے پاس ہماری مدد آ گئی، اور جس کو ہم نے چاہا عذاب سے بچا لیا گیا کیونکہ ہمارا عذاب مجرموں سے لوٹایا نہیں جاتا O

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۭ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝۱۱۱

بے شک رسولوں کے قصوں میں عقل والوں کے لیے غور وفکر کا مقام ہے، قرآن مجید کسی کا من گھڑت کلام نہیں ہے بلکہ یہ اُن کتابوں کی تصدیق فرمانے والا ہے جو اس سے پہلے نازل ہوئی ہیں، اور اس میں ہر چیز کی بہ قدر ضرورت تفصیل ہے، اور یہ ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور آسمانوں میں اور زمینوں میں کتنی ہی نشانیاں ہیں، لوگ اُن کے پاس سے غور وفکر کیے بغیر گزر جاتے ہیں O'' (یوسف:۱۰۵)

اللہ تعالیٰ کی توحید اور ان کی الوہیت پر دلائل

حافظ اسماعیل بن کثیر الشافعی الدمشقی المتوفی ۷۷۴ھ، یوسف:۱۰۵ تا ۱۱۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ'': اللہ عزوجل یہ خبر دے رہے ہیں کہ اکثر لوگ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں اور توحید کے دلائل میں غور وفکر کیے بغیر گزر جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں میں اور زمین میں اور ثابت ستاروں میں اور سیاروں میں اور افلاک میں نشانیاں رکھی ہیں اور یہ سب اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہو کر کام کر رہے ہیں۔ اور زمین میں جگہ جگہ باغات ہیں اور پہاڑ ہیں اور سمندر ہیں اور موجیں ہیں اور جنگلات ہیں اور کتنے لوگ زندہ ہیں اور کتنے مر چکے ہیں، اور کتنے جاندار ہیں اور کتنے نباتات ہیں اور کتنے ایسے پھل ہیں جو ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اور ذائقوں میں مختلف ہیں، اور کتنی خوشبوئیں اور کتنے رنگ ہیں۔ پس سبحان ہیں وہ واحد، احد جنہوں نے طرح طرح کی مخلوقات کو پیدا فرمایا ہے اور وہ ہمیشہ رہنے کے ساتھ اور بقاء کے ساتھ متفرد ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور اُن میں سے اکثر لوگ اللہ پر اس طرح ایمان لاتے ہیں کہ وہ اس کے ساتھ شرک بھی کرتے رہتے ہیں O'' (یوسف:۱۰۶)

''وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ'': حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ان کا اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اس طرح ہے کہ جب ان سے کہا گیا کہ آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں کو کس نے پیدا فرمایا؟ تو انہوں نے کہا: اللہ نے، اور وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک بھی کرتے رہے۔

ایمان کے ساتھ شرک کرنے والوں کے مصادیق

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ مشرکین کہتے تھے: لبیک لا شریک لک، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے: تم پر افسوس

ہے قد، قد، (یعنی بس کرو، اس پر اضافہ نہ کرو)، پس وہ کہتے: "لا شریک لک" سوا اس کے جو تیرا شریک ہے تو اس کا مالک ہے اور اس کا بھی مالک ہے جس کا وہ مالک ہے، مشرکین اس طرح کہتے تھے اور وہ بیت اللہ کا طواف کرتے تھے۔

(صحیح مسلم: ۱۱۸۵، الرقم المسلسل: ۲۸۰۷، رقم حدیث الباب: ۲۲، سنن ابن ماجہ: ۲۹۱۸، مسند البزار: ۱۸۸۷، مستخرج ابی عوانہ: ۳۴۲۶)

اور اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "إِنَّ ٱلشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ۝ (لقمان: ۱۳)"، یہ وہ شرک ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیر اللہ کی عبادت کی جائے۔ اور حسن بصری نے اس آیت کی تفسیر میں کہا: یہ منافق ہے جو لوگوں کو دکھانے کے لیے عمل کرتا ہے اور وہ اپنے عمل کے ساتھ مشرک ہوتا ہے۔ اور یہاں پر ایک اور شرک بھی ہے جو شرک خفی ہے اور جس کا غالباً شعور نہیں ہوتا۔

اور جیسا کہ حماد بن سلمہ نے عاصم بن ابی النجود سے از عروہ روایت کی ہے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ ایک مریض پر داخل ہوئے تو انہوں نے اس کے بازو پر چمڑا بندھا ہوا دیکھا تو اس کو کاٹ دیا یا کھینچ دیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایمان کے ساتھ شرک کرنے کا مصداق مشرکوں کا تلبیہ پڑھنا ہے، اور ریا کاروں کا دکھاوے کے لیے عمل کرنا ہے اور زمانہ جاہلیت کی رسوم کو اپنانا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "کیا وہ اس بات سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ان کو اللہ کا عذاب ڈھانپ لے یا ان پر اچانک قیامت آجائے اور وہ اس کا شعور نہ رکھتے ہوں ۝" (یوسف: ۱۰۷)

کافروں کی بے خبری میں ان پر اچانک اللہ تعالیٰ کا عذاب آنے کے متعلق دیگر آیات

"أَفَأَمِنُوٓا۟ أَن تَأْتِيَهُمْ غَٰشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ ٱللَّهِ أَوْ تَأْتِيَهُمُ ٱلسَّاعَةُ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ": کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے والے یہ لوگ اس بات سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ان کو اللہ کا عذاب ڈھانپ لے اور ان کو اس کا پتا بھی نہ ہو۔ یہ آیت قرآن مجید کی اس آیت کی مثل ہے: "أَفَأَمِنَ ٱلَّذِينَ مَكَرُوا۟ ٱلسَّيِّـَٔاتِ أَن يَخْسِفَ ٱللَّهُ بِهِمُ ٱلْأَرْضَ أَوْ يَأْتِيَهُمُ ٱلْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ۝ أَوْ يَأْخُذَهُمْ فِى تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُم بِمُعْجِزِينَ ۝ (النحل: ۴۵-۴۶)" (کیا وہ کفار جنہوں نے (اسلام کے خلاف) بدترین سازشیں کیں اس بات سے نہیں ڈرتے کہ اللہ انہیں زمین میں دھنسا دیں یا ان پر ایسی جگہ سے عذاب آجائے جس کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتے ۝ یا انہیں چلتے پھرتے ہی گرفت میں لے لیں، کیونکہ وہ اللہ کو عاجز تو نہیں کر سکتے ۝)۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "(اے رسول اکرم!) آپ کہیے: یہ ہے میرا راستہ، میں پوری بصیرت کے ساتھ اللہ کی طرف دعوت دے رہا ہوں میں بھی اور میرے پیروکار بھی، اور اللہ شریکوں سے پاک ہیں اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں ۝" (یوسف: ۱۰۸)

شرک کی نفی پر دلائل

"قُلْ هَٰذِهِۦ سَبِيلِىٓ أَدْعُوٓا۟ إِلَى ٱللَّهِ ۚ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا۠ وَمَنِ ٱتَّبَعَنِى": اللہ تعالیٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہیں جن کو انہوں نے انسانوں اور جنات کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ حکم فرمایا کہ آپ لوگوں کو یہ خبر دیں کہ یہ اللہ کا

راستہ ہے اور وہ ہے اللہ عزوجل کے واحد ہونے کی شہادت دینا کہ ان کا کوئی شریک نہیں ہے اور آپ اللہ تعالیٰ کی طرف اس کلمۂ توحید کے ساتھ پوری بصیرت اور یقین اور برہان کے ساتھ دعوت دیتے ہیں، آپ بھی اور جو آپ کے پیروکار ہیں وہ بھی پوری بصیرت اور یقین کے ساتھ اور برہانِ عقلی اور شرعی کے ساتھ دعوت دیتے ہیں۔ "وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ": یعنی میں اللہ عزوجل کی اُن چیزوں سے براءت بیان کرتا ہوں جو تم اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک ہو یا ان کا کوئی نظیر ہو یا ان کا کوئی بیٹا ہو یا ان کی کوئی بیوی ہو یا ان کا کوئی وزیر ہو یا ان کا کوئی مشیر ہو، اللہ تبارک وتعالیٰ ان سب چیزوں سے بہت زیادہ بلند و برتر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے لیے تمام آسمان اور زمینیں اور جو کچھ ان میں ہے، وہ اللہ عزوجل کی اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں۔ اور ہر چیز اللہ تعالیٰ کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتی ہے لیکن تم اس کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو، بے شک وہ بہت بردبار اور بہت بخشنے والے ہیں۔

"وَمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ": میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ہم نے آپ سے پہلے بستیوں میں رہنے والوں میں سے صرف مردوں کو رسول بنا کر بھیجا ہے جن پر ہم وحی نازل فرماتے ہیں، کیا اِن لوگوں نے زمین میں سفر نہیں کیا تا کہ وہ دیکھتے کہ اُن سے پہلے لوگوں کا کیا انجام ہوا، اور بے شک آخرت کا گھر اللہ سے ڈرتے رہنے والوں کے لیے بہتر ہے، کیا تم لوگ عقل سے کام نہیں لیتے ○" (یوسف:١٠٩)

عورتوں کی طرف وحی تشریع کو نازل نہ فرمانا اور اُن میں سے کسی عورت کا نبیہ نہ ہونا

"وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْۤ اِلَيْهِمْ": اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر فرمائی ہے کہ اللہ عزوجل نے اپنے رسول مردوں سے بھیجے ہیں عورتوں سے نہیں بھیجے اور جمہور علماء کا یہی مختار ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی بیٹیوں میں سے کسی بیٹی کی طرف وحی تشریع نازل نہیں فرمائی۔

جن آیات سے بعض علماء نے عورتوں کے لیے نبوت کو ثابت کیا، ان آیات کا محمل

بعض علماء کا یہ زعم ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی سارہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور مریم بنت عمران جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ تھیں، یہ عورتیں نبیات ہیں اور ان کا استدلال اس سے ہے کہ فرشتوں نے حضرت سارہ کو اسحاق کے بعد یعقوب کی بشارت دی، اور ان کا اس سے استدلال ہے کہ قرآن مجید میں ہے: "وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى اَنْ اَرْضِعِيْهِ۔ (القصص:٧)" (اور ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی فرمائی کہ تم انہیں دودھ پلاتی رہو)۔ (عورتوں کے لیے جہاں پر وحی کا لفظ آیا ہے اس سے مراد الہام ہے)۔ اور ان کا اس سے استدلال ہے کہ فرشتہ حضرت مریم کے پاس گیا اور ان کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت دی اور اس سے استدلال ہے کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: "وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ۞ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۞ (آل عمران:٤٢۔٤٣)" (اور (اس وقت کو یاد کیجئے) جب فرشتوں نے (مریم سے) کہا: اے مریم! بے شک اللہ نے آپ کو چن لیا ہے اور آپ کو خوب پاک فرما دیا ہے اور آپ کو تمام جہانوں کی عورتوں پر فضیلت عطا فرمائی ہے ○ اے مریم! اپنے رب کے حضور قیام کیجئے اور سجدہ کیجئے اور رکوع کرنے والوں کے

ساتھ رکوع کیجئے O)۔

جو علماء عورتوں میں نبوت کے قائل ہیں، یہ اُن کے دلائل ہیں، لیکن ان آیات سے یہ لازم نہیں آتا کہ عورتیں نبیات ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ان آیات سے ان عورتوں کی فضیلت تو ثابت ہوتی ہے لیکن اُن کی نبوت ثابت نہیں ہے۔ اور شیخ ابوالحسن علی بن اسماعیل الاشعری نے کہا ہے کہ عورتوں میں کوئی نبیہ نہیں تھی، ان میں صدیقات تھیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے ان سے افضل عورت مریم بنت عمران کے متعلق فرمایا: ''مَا الۡمَسِيۡحُ ابۡنُ مَرۡيَمَ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّهٗ صِدِّيۡقَةٌ ؕ كَانَا يَاۡكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ (المائدہ: ۷۵)'' (مسیح ابن مریم صرف اللہ کے رسول ہیں، بے شک اُن سے پہلے بہت رسول گزر چکے ہیں اور ان کی ماں صدیقہ ہیں، وہ دونوں کھانا کھاتے تھے)۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم بنت عمران کے فضائل کے ذکر میں یہ فرمایا کہ وہ صدیقہ ہیں، اگر وہ نبیہ ہوتیں تو اللہ تعالیٰ اُن کے فضائل کے مقام میں اُن کے نبیہ ہونے کا ذکر فرماتے، پس قرآن مجید کی تصریح کے مطابق حضرت مریم صدیقہ ہیں۔

''مِنۡ اَهۡلِ الۡقُرٰى'': ''الۡقُرٰى'' سے مراد المدن یعنی شہر ہیں، یعنی ہم نے جن کو رسول بنا کر مبعوث فرمایا ہے وہ شہروں میں سے مرد ہیں نہ کہ دیہاتیوں میں سے جن کی طبیعت سخت ہوتی ہے۔ قتادہ نے کہا: کیونکہ شہر والے زیادہ علم اور حلم والے ہوتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک دیہاتی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک اونٹنی ہبہ کی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بدلہ میں کچھ انعام فرمایا اور فرمایا: کیا تم راضی ہو گئے ہو؟ اس نے کہا: نہیں! پھر آپ نے اور زیادہ عطا فرمایا اور پوچھا: کیا تم راضی ہو گئے ہو؟ اس نے کہا: نہیں، پھر آپ نے اور زیادہ فرمایا اور پوچھا: کیا تم راضی ہو گئے ہو؟ اس نے کہا: ہاں! تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے ارادہ کیا کہ میں صرف کسی قریشی سے ہبہ قبول فرماؤں گا یا انصاری سے یا ثقفی سے۔ (یعنی دیہاتی سے کوئی ہبہ قبول نہیں کروں گا)۔ یہ حدیث امام بخاری اور مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔

(مسند احمد: ۲۶۸۷، کشف الاستار: ۱۹۳۸، صحیح ابن حبان: ۶۳۸۳، المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۰۸۹۷، الحمیدی: ۱۰۵۲، مصنف عبدالرزاق: ۱۶۵۲۱)

اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ آئندہ میں صرف ان لوگوں سے ہی ہبہ کو قبول فرماؤں گا نہ کہ دیہاتیوں سے۔ کیونکہ یہ لوگ شہروں کے رہنے والے ہیں اور وہ مکارم اخلاق میں معروف ہیں اور دیہاتوں اور جنگلوں کے رہنے والوں کے اخلاق میں جفا ہوتی ہے۔

''اَفَلَمۡ يَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَيَنۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ'': یعنی اے رسول اکرم! کیا ان مکذبین نے زمین میں سفر نہیں کیا کہ وہ دیکھ لیتے کہ آپ سے پہلے جن لوگوں نے اپنے رسولوں کو جھٹلایا، ان کا کیا انجام ہوا اور کس طرح اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کو ہلاک فرما دیا۔ اور اسی لیے فرمایا: ''وَلَدَارُ الۡاٰخِرَةِ خَيۡرٌ لِّلَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ'': یعنی جس طرح ہم نے دنیا میں مومنین کو نجات عطا فرمائی ہے، اسی طرح ہم نے آخرت میں بھی اُن کے لیے نجات کو مقرر فرما دیا اور یہ اُن کے لیے دنیا کے احوال سے بہت زیادہ بہتر ہے۔ ''وَلَدَارُ الۡاٰخِرَةِ'': اس آیت میں دار کی آخرت کی طرف اضافت فرمائی ہے جیسے کہا جاتا ہے صلاۃ الاولیٰ، المسجد الجامع وغیرہ۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''حتیٰ کہ جب رسول لوگوں کے ایمان لانے سے مایوس ہو گئے اور لوگوں نے یہ گمان کر لیا کہ اُن کو ایمان نہ لانے پر جھوٹی دھمکیاں دی گئی تھیں تو ان رسولوں کے پاس ہماری مدد آ گئی، اور جس کو

ہم نے چاہا عذاب سے بچا لیا گیا کیونکہ ہمارا عذاب مجرموں سے لوٹایا نہیں جاتاO''(یوسف:۱۱۰)

یوسف:۱۱۰ میں مذکور''وَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا'' کی تحقیق

''حَتّٰۤی اِذَا اسْتَیْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ'': اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر فرمایا ہے کہ اُن کی مدد ان کے رسل صلوات اللہ علیہم اجمعین پر تنگی کے حال میں پہنچتی ہے اور جب وہ اللہ تعالیٰ سے کشادگی کے انتظار میں ہوتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ'' (البقرہ:۲۱۴)''(اور ان کو جھنجوڑ ڈالا گیا حتیٰ کہ رسول اور اُن پر ایمان لانے والوں نے کہا: اللہ کی مدد کب آئے گی؟)۔''قَدْ كُذِبُوْا'': اس لفظ کی دو قراءتیں ہیں، ایک قراءت تشدید کے ساتھ ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اسی قراءت کے مطابق پڑھتی تھیں۔

عروہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کو بتایا جب وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے متعلق سوال کر رہے تھے: (حَتّٰۤی اِذَا اسْتَیْـَٔسَ الرُّسُلُ) عروہ نے بتایا کہ میں نے پوچھا کہ یہ لفظ كُذِبُوْا ہے یا كُذِّبُوْا ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: كُذِّبُوْا ہے، میں نے کہا: رسولوں کو یقین تھا کہ ان کی قوم نے ان کی تکذیب کی ہے، لہٰذا یہ ظن تو نہیں ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: معاذ اللہ! رسول اپنے رب کے ساتھ یہ گمان کرنے والے نہیں تھے۔ میں نے کہا: پھر اس آیت کا کیا معنی ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بتایا: وہ رسولوں کے پیروکار تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور انہوں نے رسولوں کی تصدیق کی، پھر ان پر مصائب بہت طویل ہو گئے اور اللہ کی مدد موخر ہو گئی حتیٰ کہ جب رسول ان لوگوں سے مایوس ہو گئے جنہوں نے ان کی قوم میں سے ان کی تکذیب کی تھی اور رسولوں نے یہ گمان کیا کہ ان کے پیروکار بھی ان کی تکذیب کریں گے تو اس وقت ان کے پاس اللہ کی مدد آگئی۔ (صحیح البخاری:۴۶۹۵، ۳۵۲۵)

عروہ کے سوال اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے جواب کی وضاحت

علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

عروہ کو جو اشکال پیدا ہوا تھا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسولوں کو یہ یقین تھا کہ ان کی تکذیب کی گئی اور قرآن مجید میں مذکور ہے کہ ان کو گمان تھا کہ ان کی تکذیب کی گئی ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں گمان بہ معنی یقین ہے، یعنی رسولوں نے یہ خبر دی تھی کہ ان کے منکر کافروں پر عذاب آئے گا لیکن جب ان پر عذاب آنے میں تاخیر ہوئی تو رسولوں کے پیروکاروں کے متعلق کافروں نے یہ گمان کیا کہ ان سے جھوٹا وعدہ کیا گیا تھا تو پھر اللہ تعالیٰ کی مدد آئی اور کافروں پر عذاب آگیا۔

(عمدۃ القاری ج ۱۵ ص ۳۸۷، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۱ھ)

''كُذِبُوْا'' کی قراءت کی توجیہ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ''حتیٰ کہ جب رسول مایوس ہو گئے اور انہوں نے یہ گمان کیا کہ رسول اپنی قوم کی تصدیق کرنے سے مایوس ہو گئے اور ان کی قوم نے یہ گمان کیا کہ رسولوں نے اُن سے جھوٹ بولا تھا'' تو اس وقت ہماری مدد آگئی۔

(تفسیر الطبری ج ۱۳ ص ۸۳، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۲۳ھ تفسیر ابن ابی حاتم ج ۷ ص ۲۲۱۱ رقم الحدیث: ۱۲۰۵۹، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ)

" جَآءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ؕ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ": ۔ پس ہماری مدد آگئی، اور جس کو ہم نے چاہا عذاب سے بچالیا کیونکہ ہمارا عذاب مجرموں سے لوٹایا نہیں جاتا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: " بے شک رسولوں کے قصوں میں عقل والوں کے لیے غور وفکر کا مقام ہے، قرآن مجید کسی کا من گھڑت کلام نہیں ہے بلکہ یہ اُن کتابوں کی تصدیق فرمانے والا ہے جو اس سے پہلے نازل ہوئی ہیں اور اس میں ہر چیز کی بہ قدر ضرورت تفصیل ہے، اور یہ ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے O" (یوسف:۱۱۱)

" لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ؕ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى ": یعنی یہ قرآن اللہ تعالیٰ پر افترا نہیں ہے۔

" وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ": یعنی آسمان سے جو پہلے کتابیں نازل ہوئی ہیں، اس میں ان کی تصدیق ہے۔

" وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ ": اور ہر چیز کے حلال یا حرام اور محبوب یا مکروہ ہونے کا بیان ہے۔ اس کے علاوہ اس میں عبادات، واجبات اور مستحبات کا حکم ہے اور محرمات کے ارتکاب سے ممانعت کا حکم ہے، اور بڑے بڑے امور کی خبریں ہیں اور مستقبل غیوب کی خبریں ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات کا ذکر ہے اور یہ ان کے اسماء اور ان کی صفات مخلوق کے اسماء اور ان کی صفات سے مشابہ نہیں ہیں۔ " وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ": یعنی جو لوگ ایمان لانے والے ہوں، ان کے لیے گمراہی سے سیدھے راستہ پر چلنے کی ہدایت ہے، ایمان والے اپنے رب سے رحمت کو طلب کرتے ہیں اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، تو ہم بھی اللہ عظیم سے سوال کرتے ہیں کہ ہمیں دنیا اور آخرت میں ایمان والوں کے ساتھ رکھیں۔

(تفسیر القرآن العظیم، ج ۲ ص ۵۴۶۔ ۵۵۱، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۹ھ)

الرعد ۱۳
وما ابرئ ۱۳
الرعد
(۱۳)
جلد سوم
433
تبیان القرآن
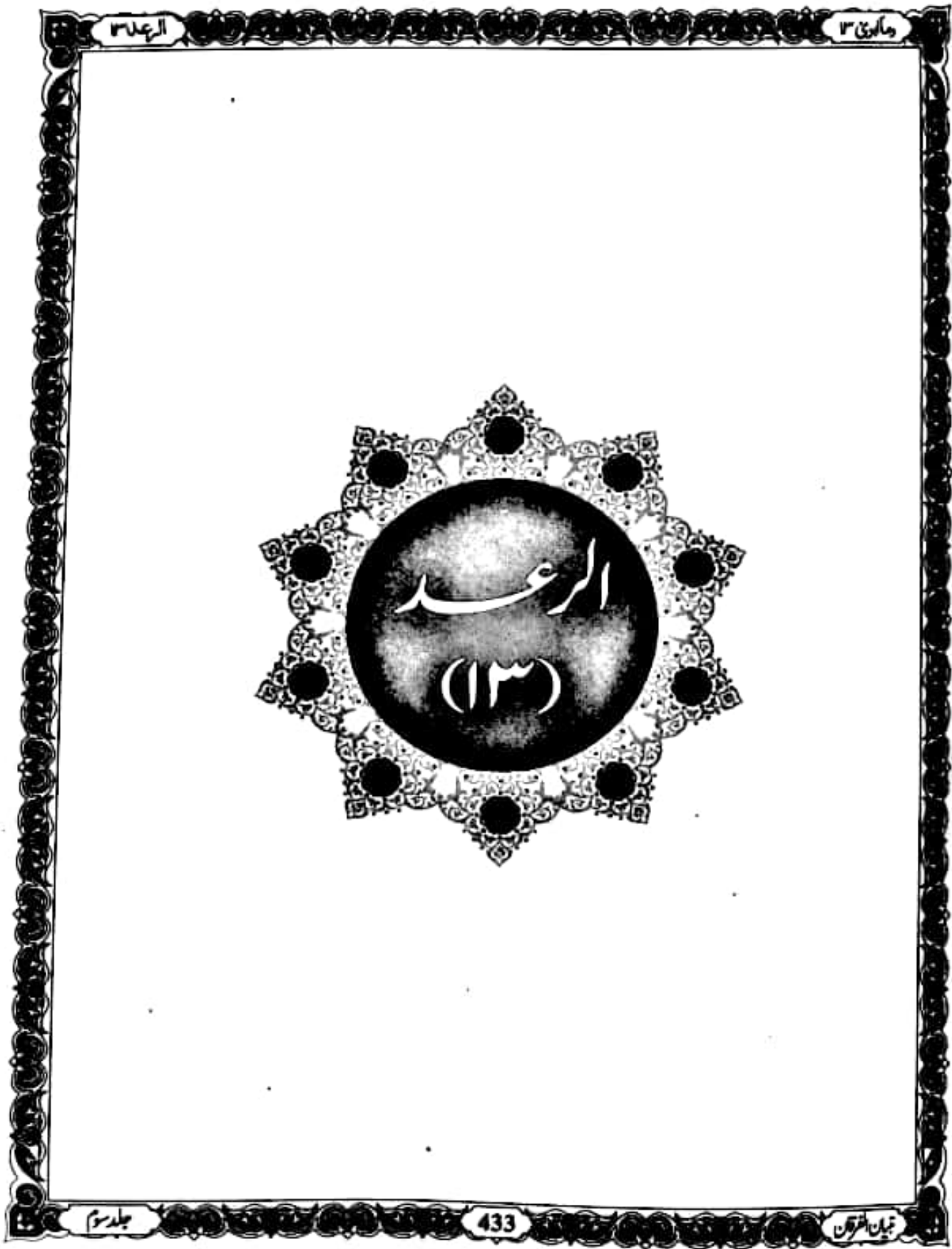
سورۃ الرعد کا اجمالی تعارف

سورۃ الرعد کی وجہ تسمیہ

اس سورت کا نام سورۃ الرعد رکھا گیا ہے، رعد کا معنی ہے بادل کی گرج، کیونکہ اس سورت میں بادل کے گرجنے، بجلی کے چمکنے، بجلی کے کڑکنے اور بادلوں سے بارش کے برسانے کا ذکر ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''هُوَ الَّذِیْ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ یُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ۚ وَ یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَ الْمَلٰٓىٕكَةُ مِنْ خِیْفَتِهٖ ۚ وَ یُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَیُصِیْبُ بِهَا مَنْ یَّشَآءُ وَ هُمْ یُجَادِلُوْنَ فِی اللّٰهِ ۚ وَ هُوَ شَدِیْدُ الْمِحَالِ ؕ'' (الرعد: ۱۲۔۱۳) (وہی ہیں جو تمہیں بجلی کی چمک دکھاتے ہیں بعض کو ڈرانے اور دوسروں کو امید دلانے کے لیے اور بھاری بادلوں کو پیدا فرماتے ہیں O اور بادلوں پر مقرر فرشتہ ان کی ثناء کے ساتھ تسبیح کرتا ہے، دوسرے فرشتے بھی ان کے خوف سے ان کا ہر عیب سے پاک ہونا بیان کرتے ہیں، اور اللہ کڑکتی ہوئی بجلیاں بھیجتے ہیں اور انہیں جن کافروں پر چاہتے ہیں گرا دیتے ہیں، اس حال میں کہ وہ اللہ کے بارے میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں جب کہ اللہ کی گرفت بہت سخت ہے O)۔

بارش یا پانی انسانی حیات کا سبب ہے اور حیوانات اور نباتات کی حیات کا بھی سبب ہے اور بجلی کا کڑکنا بھی فنا کرنے کے لیے ہوتا ہے اور یہ پانی کی متضاد صفات ہیں۔

سورۃ الرعد کی سورۂ یوسف کے ساتھ مناسبت

کی سورتوں میں عموماً توحید، رسالت اور قیامت وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی حقانیت اور صداقت کو بھی مختلف انداز سے بیان فرمایا جاتا ہے، توحید کے ساتھ ساتھ شرک کی تمام اقسام کا رد فرمایا جاتا ہے اور ایمان کی جزئیات کو بیان فرمایا جاتا ہے۔ لہٰذا اس سورۃ الرعد میں بھی بالعموم انہی امور کا ذکر ہوگا۔

سورۂ یوسف میں بھی انبیاء سابقین کا ذکر ہے، اسی طرح سورۃ الرعد میں بھی انبیاء سابقین کا ذکر ہے اور یہ ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنین متقین کو نجات عطا فرمائی اور کافرین کو ہلاک فرما دیا۔

سورۃ الرعد کے مضامین

(۱) سورۃ الرعد کی ابتداء اللہ تعالیٰ کے وجوب اور ان کی وحدانیت پر دلائل قائم کرنے کی ساتھ فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا، اور سورج اور چاند کو، رات اور دن کو، پہاڑوں کو، دریاؤں کو، کھیتوں اور باغات کو، مختلف رنگ کی خوشبوؤں کو اور مختلف ذائقوں کے پھلوں کو پیدا فرمایا، اور اللہ تعالیٰ ان چیزوں کی تخلیق کے ساتھ متفرد ہیں۔

(۲) انبیاء و رسل کی بعثت کا بیان، قیامت کے دن جزا و سزا کا ذکر، دنیا میں کفار پر عذاب نازل کرنے کا بیان فرمایا۔

(۳) فرشتوں کے وجود کی خبر اور وہ کس طرح اللہ تعالیٰ کے حکم سے انسان کی حفاظت کرتے ہیں۔

(۴) اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کے لیے دائمی جنت کی بشارت اور اللہ تعالیٰ کا عہد توڑنے والوں کے لیے دوزخ کے عذاب کی وعید۔

(۵) انبیاء علیہم السلام بھی بشر ہیں، ان کی بیویاں بھی ہیں اور ان کی اولاد بھی ہے، اور ان سے معجزات کا صدور اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہے۔

آیاتھا ۴۳ — ۱۳ سُوْرَۃُ الرَّعْدِ مَدَنِیَّۃٌ ۹۶ — رکوعاتھا ۶

(سورۃ الرعد مدنی ہے اور اس میں تینتالیس آیات اور چھ رکوع ہیں)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ عزوجل کے بابرکت نام سے ہی (ابتداء ہے) جو سب پر رحم فرمانے والے، نہایت مہربان ہیں

الٓمّٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ ؕ وَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝۱

الٓمّٓرٰ یہ اس کتاب کی آیات ہیں، اور جو آیات آپ کے رب کی طرف سے نازل فرمائی گئی ہیں وہ سب برحق ہیں، لیکن اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں O

اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ۝۲

اللہ وہی ہیں جنہوں نے آسمانوں کو بغیر کسی ستون کے بلندی عطا فرمائی جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو، پھر انہوں نے اپنی شان کے لائق عرش پر استویٰ فرمایا اور سورج اور چاند کو اپنے احکام کا پابند فرمادیا، ہر سیارہ اپنی مقرر میعاد تک اپنے مدار میں چلتا رہے گا، (اللہ) ہر کام کی تدبیر فرماتے ہیں اور اپنی آیات کو تفصیل کے ساتھ بیان فرماتے ہیں تا کہ تم اپنے رب سے ملاقات پر یقین رکھو O

وَ هُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَ اَنْهٰرًا ؕ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۳

اور وہی ہیں جنہوں نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور دریا پیدا فرمائے، اور پھلوں کی ہر قسم میں سے دو دو جوڑے پیدا فرمائے، وہ رات سے دن کو ڈھانپ دیتے ہیں، بے شک ان چیزوں میں غور کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں O

وَ فِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ زَرْعٌ وَّ نَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّ غَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۫ وَ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ

لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۴﴾

اور زمین میں ایک دوسرے سے متصل متعدد ٹکڑے ہیں اور انگوروں کے باغات ہیں اور کھیت ہیں، اور کھجور کے درخت پیدا فرمائے جن میں سے بعض کی متعدد شاخیں ہوتی ہیں اور بعض کی شاخیں نہیں ہوتیں ان سب کو ایک ہی پانی سے سیراب کیا جاتا ہے اور ہم پھلوں کے ذائقہ کے اعتبار سے بعض پھلوں کو دوسرے پھلوں پر ترجیح دیتے ہیں، بے شک ان سب چیزوں میں غور وفکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں O

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۬ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۵﴾

اور (اے رسول اکرم!) اگر آپ کافروں کے انکار پر تعجب کریں تو اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ "جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم کو نئے سرے سے پیدا کیا جائے گا" یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کا کفر کیا، انہی لوگوں کی گردنوں میں (لعنت کے) طوق پڑے ہوں گے اور یہی لوگ دوزخی ہیں جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہیں O

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۶﴾

اور (اے رسول اکرم!) یہ مشرکین آپ سے رحمت کے نزول سے پہلے جلد عذاب کے نزول کو طلب کرتے ہیں، جب کہ ان سے پہلے کافروں کو انکار بعثت پر سزائیں دی جا چکی ہیں، بے شک آپ کے رب لوگوں کے ظلم کے باوجود ضرور ان کی مغفرت فرمانے والے ہیں، اور بے شک آپ کے رب سخت عذاب دینے والے ہیں O

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴿۷﴾ ع

کفار کہتے ہیں: "اس رسول پر ان کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں نازل کی گئی" (حالانکہ) آپ تو صرف اللہ کے عذاب سے ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے لیے ایک ہدایت دینے والا ہوتا ہے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "الٓمّٓرٰ یہ اس کتاب کی آیات ہیں، اور جو آیات آپ کے رب کی طرف سے نازل فرمائی گئی ہیں وہ سب برحق ہیں، لیکن اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں O" (الرعد: ۱)

امام ابو منصور محمد بن محمد ماتریدی المتوفی ۳۳۳ھ، الرعد: ۱ تا ۷ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''الٓمّٓرٰ'' کے دو محمل

(۱) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ''الٓمّٓرٰ'' حروفِ مقطعہ مجمہ سے کنایہ ہو، پھر ''تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ'' ''الٓمّٓرٰ'' کی تفسیر ہے، یعنی ''الٓمّٓرٰ'' اس کتاب کی آیات میں سے ہیں۔ اور یہی زیادہ ظاہر ہے، کیونکہ حروفِ مقطعات کے بعد جو ذکر کیا جاتا ہے وہ اس کی تفسیر ہوتی ہے۔

(۲) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ''الٓمّٓرٰ'' ان دلائل اور براہین سے اور باقی کتابوں سے کنایہ ہو، گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ دلائل اور براہین اور باقی آسمانی کتابیں، ان کو ہم نے قرآن مجید کی آیات اور حجتیں قرار دیا ہے۔

''تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ ؕ وَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ'': یہ کتاب کی آیات اور جو اس سے پہلے آپ کے رب کی طرف سے آیات نازل فرمائی گئی ہیں، اس سے مراد قرآن مجید ہے جو آپ پر نازل فرمایا گیا ہے۔ اور دوسرے مفسرین نے کہا: ''تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ'' سے مراد التورات اور انجیل ہے اور باقی آسمانی کتابیں ہیں۔ اور ''وَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ'' سے مراد قرآن مجید ہے جو سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا گیا ہے، یعنی یہ سب آپ کے رب کی طرف سے برحق ہیں۔

''الْحَقُّ'' کے دو محمل

''الْحَقُّ'': اس کے دو محمل ہیں:

(۱) یعنی آپ پر جو قرآن مجید نازل فرمایا گیا ہے، یہ برحق اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل فرمایا گیا ہے، ایسا نہیں ہے جیسا کہ کفار کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل نہیں فرمایا گیا بلکہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کو اپنی طرف سے بنا لیا ہے۔

(۲) یعنی یہ قرآن مجید برحق ہے، باطل نہ اس کے سامنے سے آسکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے آسکتا ہے۔

''وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یُؤْمِنُوْنَ'': لیکن اکثر لوگ اس پر ایمان نہیں لاتے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل فرمایا گیا ہے، یا اکثر لوگ اس پر ایمان نہیں لاتے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی آیات اور اُن کے دلائل ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اللہ وہی ہیں جنہوں نے آسمانوں کو بغیر کسی ستون کے بلندی عطا فرمائی جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو، پھر انہوں نے اپنی شان کے لائق عرش پر استویٰ فرمایا اور سورج اور چاند کو اپنے احکام کا پابند فرما دیا، ہر سیارہ اپنی مقرر میعاد تک اپنے مدار میں چلتا رہے گا، (اللہ) ہر کام کی تدبیر فرماتے ہیں اور اپنی آیات کو تفصیل کے ساتھ بیان فرماتے ہیں تا کہ تم اپنے رب سے ملاقات پر یقین رکھو O'' (الرعد: ۲)

بعث بعد الموت پر دلیل

''اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ'': یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو بلند پیدا فرمایا ہے، یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے آسمانوں کو پیدا فرمایا اور پھر ان کو بلند فرمایا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَ الْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۝'' (الرحمٰن: ۱۰) ''(اور انہوں نے مخلوق کے لیے زمین رکھی O)''۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَ الْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ۝'' (النازعات: ۳۲) ''(اور پہاڑوں کو (اس پر) جما دیا O)''۔ اس آیت کا مطلب ہے کہ آسمانوں کو جو پیدا فرمایا تو بلند پیدا فرمایا، اسی طرح زمین کو جو پیدا فرمایا تو اس کو پھیلا یا ہوا پیدا فرمایا۔

اور اس میں اس پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ مرنے کے بعد لوگوں کو دوبارہ پیدا فرمائیں گے، کیونکہ فرمایا: "لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ" (تاکہ تم اپنے رب سے ملاقات پر یقین رکھو)۔

"بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا": یعنی جنہوں نے ان آسمانوں کو ان کی وسعت اور ایک دوسرے سے بُعد کے باوجود بغیر ستونوں کے پیدا فرمایا ہے، وہ اس پر ضرور قادر ہیں کہ مخلوق کو مرنے کے بعد دوبارہ پیدا فرمائیں۔ بلکہ آسمانوں کو ان کی وسعت اور بُعد کے باوجود بغیر ستون کے پیدا فرمانا کسی چیز کو فنا کے بعد دوبارہ پیدا کرنے سے زیادہ بڑا ہے۔

"ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ": اللہ تعالیٰ نے یہ خبر فرمائی ہے کہ ان کی مثل کوئی چیز نہیں ہے۔ (الشوریٰ:۱۱)

عرش میں اختلاف ہے، بعض مفسرین نے کہا کہ عرش کے استواء سے مراد یہ ہے کہ مخلوق کے پیدا فرمانے کی تدبیر عرش پر پوری ہوگئی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۝ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ۝ (المؤمنون:۱۱۵۔۱۱۶)" (کیا تم نے یہ گمان کرلیا ہے کہ ہم نے تمہیں بے مقصد پیدا فرمایا ہے اور یہ کہ تم ہماری بارگاہ میں پیش نہیں کیے جاؤ گے؟O سنو! اللہ تعالیٰ سب سے بڑے بادشاہ ہیں، ان کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے اور وہی عرشِ کریم کے رب ہیں O)۔

"وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۚ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ": یعنی اللہ تعالیٰ نے جو آسمانوں کو بغیر ستون کے پیدا فرمایا، اس میں مرنے کے بعد دوبارہ پیدا فرمانے پر دلیل ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور وہی ہیں جنہوں نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور دریا پیدا فرمائے، اور پھلوں کی ہر قسم میں سے دو دو جوڑے پیدا فرمائے، وہ رات سے دن کو ڈھانپ دیتے ہیں، بے شک ان چیزوں میں غور کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں O" (الرعد:۳)

"وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا": یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین کو پھیلا دیا اور اس میں پہاڑ اور دریا رکھ دیے۔

ذکر کیا گیا ہے کہ زمین کو پانی پر پھیلا دیا، تو زمین اپنے اوپر بیٹھنے والوں کے ساتھ مضطرب ہو رہی تھی جیسے کشتی میں بیٹھنے والے اس کے چلنے سے مضطرب ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس زمین پر بھاری پہاڑوں کو رکھ دیا تو وہ مستقر ہوگئی اور ثابت ہوگئی۔

اور یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ زمین کو ہوا پر پھیلایا گیا تھا پھر اس کے اندر یہ پہاڑ رکھ دیے گئے تاکہ زمین ثابت ہو جائے، یعنی اپنی طبیعت سے زمین میں استقرار نہیں ہو سکتا تھا تو اس وجہ سے اس میں پہاڑ رکھ دیے تاکہ وہ مضطرب نہ ہو۔ اور اس آیت کا یہ مطلب بھی ہے کہ ہم نے جب زمین کو پیدا فرمایا تو اس کو پھیلا ہوا پیدا فرمایا، یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے زمین کو پیدا فرمایا اور پھر اس کو پھیلایا، جیسے آسمانوں کو بلند پیدا فرمایا۔

"وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ": یعنی دو مختلف رنگوں کے پھلوں کے جوڑے پیدا فرمائے۔

اور بعض مفسرین نے کہا: یعنی دو مختلف ذائقوں کے پھل پیدا فرمائے۔ کیونکہ پھلوں کے رنگ بھی مختلف ہوتے ہیں سرخ، سفید

وغیرہ اور اسی طرح ذائقے بھی مختلف ہوتے ہیں کھٹے، میٹھے، کڑوے۔

اور بعض مفسرین نے کہا: درختوں میں مذکر اور مونث پیدا فرمائے۔ جو درخت پھل دیتے ہیں وہ مونث ہیں اور جو درخت پھل نہیں دیتے وہ مذکر ہیں۔

"يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ": یعنی رات کی ظلمت دن کی روشنی سے چلی جاتی ہے اور دن کی روشنی رات کی ظلمت سے چلی جاتی ہے۔

"اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ": یعنی چونکہ ان چیزوں میں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ فرمانے پر نشانیاں ہیں، اور تدبیر اور علم اور حکمت پر نشانیاں ہیں اور اللہ تعالیٰ کی توحید پر دلائل ہیں۔

یعنی جو ان نشانیوں میں غور وفکر کرے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی توحید پر بھی دلائل ہیں اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ فرمانے پر بھی دلائل ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور زمین میں ایک دوسرے سے متصل متعدد ٹکڑے ہیں اور انگوروں کے باغات ہیں اور کھیت ہیں، اور کھجور کے درخت پیدا فرمائے جن میں سے بعض کی متعدد شاخیں ہوتی ہیں اور بعض کی شاخیں نہیں ہوتیں ان سب کو ایک ہی پانی سے سیراب کیا جاتا ہے اور ہم پھلوں کے ذائقہ کے اعتبار سے بعض پھلوں کو دوسرے پھلوں پر ترجیح دیتے ہیں، بے شک ان سب چیزوں میں غور وفکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں O" (الرعد: ۴)

"وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ": زمین میں کئی ٹکڑے اس وقت متصور ہوں گے کہ جب کہ زمین ٹکڑوں پر مشتمل ہو، اگر پوری زمین ایک ہی زمین ہو تو اس میں یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس میں ٹکڑے ہیں۔

"قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ" سے مراد وہ زمینیں ہیں جو کھیتی باڑی کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

"وَجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ": یعنی زمین میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے باغات ہیں۔ اور "جنّٰت" ان باغات کو کہا جاتا ہے جو مختلف اقسام کے درختوں سے گھرے ہوئے ہوں۔

"وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ": ایک قول یہ ہے کہ "صِنْوَانٌ" کھجور کے ان دو درختوں کو کہتے ہیں جن کی جڑ ایک ہو اور "غَيْرُ صِنْوَانٍ" کھجور کے وہ درخت ہیں جو منفرد ہوں۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ "صِنْوَانٌ" وہ ہیں کہ جن کی اصل ایک ہو اور وہ متفرق ہوں اور "غَيْرُ صِنْوَانٍ" وہ ہیں جو اکیلے پیدا ہوں۔

"يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ": یعنی یہ مختلف کھیت ہیں اور کھجور کے پھلوں کے درخت ہیں اور باغات ہیں، ایک ہی پانی سے ان کو سیراب کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی توحید پر دلائل

"وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ": پوری روئے زمین کا جوہر واحد ہے، اور یہ زمین کے متعدد ٹکڑے ہیں جو ملے ہوئے ہیں۔ پھر پھلوں اور میووں کے حق میں یہ مختلف ہو جاتے ہیں، اسی طرح سے عام درخت اور کھجور کے درخت ہیں، ان کا بھی جوہر

واحد ہے اور جنس واحد ہے، اور ان سب کو ایک ہی پانی پلایا جاتا ہے، پھر ان میں سے مختلف رنگوں کے اور مختلف ذائقوں کے پھل نکلتے ہیں اور ان کی شکلیں بھی دیکھنے میں مختلف ہوتی ہیں۔ تو معلوم ہوا ان کا یہ اختلاف اپنے طور سے نہیں ہے بلکہ ایک مدبر، علیم اور حکیم نے ان میں یہ اختلاف رکھا ہے، کیونکہ اگر یہ پھل اپنی طبیعت میں ہوتے تو ان سب کا ایک رنگ ہوتا اور ان سب کا ایک ذائقہ ہوتا، لیکن جب ان کے رنگ بھی مختلف ہیں اور ان کے ذائقے بھی مختلف ہیں تو معلوم ہوا کہ یہ کسی مدبر اور حکیم کے فرمانے سے ہیں از خود نہیں ہیں۔ پس جب کہ یہ ایک رنگ کے نہیں ہیں اور سب کا ایک ذائقہ نہیں ہے اور سب کا ایک منظر نہیں ہے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ یہ کسی مدبر واحد اور علیم اور لطیف کے کرنے سے ہیں، تو اس میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی دلیل ہے۔ یعنی زمین کے ٹکڑے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور ایک ہی پانی سے ان کو سیراب کیا جارہا ہے، پھر پھل اور میوے مختلف رنگوں اور مختلف ذائقوں کے نکلتے ہیں، تو معلوم ہوا کہ نہ اس میں زمین کا عمل ہے، نہ پانی کا عمل ہے، نہ دیگر اسباب اور ان کی طبیعتوں کا عمل ہے، یہ صرف اللہ عزوجل کی تدبیر سے ہو رہا ہے۔

"اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ": یعنی جو ہم نے ذکر کیا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر اور ان کی تدبیر پر اور ان کے علم اور حکمت پر ان لوگوں کے لیے دلائل ہیں جو اپنی عقل اور فہم سے کام لیتے ہیں اور ان نشانیوں میں غور و فکر کرتے ہیں، نہ کہ اس قوم کے لیے جو ہٹ دھرمی سے کام لیتی ہے اور عناد کرتی ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور (اے رسولِ اکرم!) اگر آپ کافروں کے انکار پر تعجب کریں تو اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ "جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم کو نئے سرے سے پیدا کیا جائے گا" یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کا کفر کیا، انہی لوگوں کی گردنوں میں (لعنت کے) طوق پڑے ہوں گے اور یہی لوگ دوزخی ہیں جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہیں O" (الرعد: ۵)

"وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ":

حسن بصری نے کہا: اے محمد! اگر آپ کو اس پر تعجب ہو کہ یہ آپ کی رسالت کا انکار کرتے ہیں تو اس سے زیادہ تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ یہ کہتے ہیں: "ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ" (جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم کو نئے سرے سے پیدا کیا جائے گا)۔ یعنی اگر آپ کو اس پر تعجب ہو کہ یہ آپ کی رسالت کا انکار کرتے ہیں تو اس سے زیادہ تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا انکار کرتے ہیں۔

"اُولٰٓىٕكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ": یعنی جب ان لوگوں نے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ فرمائے جانے کا انکار کیا اور ان کا مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے کا انکار کرنا یہ اللہ کا کفر کرنا ہے، کیونکہ انہوں نے العیاذ باللہ، اللہ تعالیٰ کو عاجز قرار دیا کہ اللہ تعالیٰ دوبارہ ان کو زندہ فرمانے پر قادر نہیں ہیں، اور جس نے اپنے رب کو عاجز قرار دیا تو اس نے اپنے رب کو حقیقت میں نہیں پہچانا۔

"وَاُولٰٓىٕكَ الْاَغْلٰلُ فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ": یعنی انہوں نے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کیا تھا، وہ ان کی گردنوں میں لعنت کا طوق بنا دیا، جس طرح انہوں نے بشر کے رسول ہونے کا انکار کیا تھا۔ پھر انہوں نے بتوں کو اپنا معبود قرار دیا اور اُن کے سامنے بیٹھ گئے اور اُن

کے سامنے عاجزی کا اظہار کیا تو یہی ان کے گلوں میں لعنت کا طوق ہے۔

''وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ'': اور یہی لوگ دوزخی ہیں جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور (اے رسول اکرم!) یہ مشرکین آپ سے رحمت کے نزول سے پہلے جلد عذاب کے نزول کو طلب کرتے ہیں، جب کہ ان سے پہلے کافروں کو انکار بعثت پر سزائیں دی جا چکی ہیں، بے شک آپ کے رب لوگوں کے ظلم کے باوجود ضرور اُن کی مغفرت فرمانے والے ہیں، اور بے شک آپ کے رب سخت عذاب دینے والے ہیں O'' (الرعد: ٦)

''وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ'': یعنی اے محمد (صلی اللہ علیک وسلم!) یہ آپ سے عجلت کے ساتھ عذاب کو طلب کرتے ہیں، کیونکہ انہوں نے آپ کی رسالت کی تکذیب کی اور آپ کو ایذاء پہنچائی اور ان کی طرف سے آپ کو کوئی بھلائی نہیں پہنچی۔ سو ان کا نزولِ عذاب کا سوال کرنا جہالت ہے، کیونکہ ان کو یہ پتا نہیں کہ آپ رسولِ برحق اور صادق ہیں۔ اور اگر یہ جان لیتے کہ آپ اللہ کے صادق رسول ہیں اور آپ نے جو عذاب کی وعید سنائی ہے، وہ برحق ہے تو پھر یہ آپ سے نزولِ رحمت سے پہلے نزولِ عذاب کا سوال نہ کرتے، لیکن انہوں نے اپنی جہالت سے یہ سوال کیا اور گویا آپ کا مذاق اڑایا۔

''اَلْمَثُلٰتُ'' کا معنی

''وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ'': ''اَلْمَثُلٰتُ'' کا معنی ہے العقوبات، یعنی سزائیں۔ گویا اس سے پہلے گزری ہوئی امتوں پر ان کے عناد کی وجہ سے اور ان کے عذاب پر سوال کرنے کی وجہ سے عذاب آ چکے ہیں۔

اور بعض دوسرے مفسرین نے کہا: ''اَلْمَثُلٰتُ'' کا معنی ہے الامثال والاشباہ، یعنی اگر وہ اعتبار کرتے تو پچھلی امتوں میں ایسی مثالیں دیکھ کر عبرت پکڑتے لیکن وہ عبرت نہیں حاصل کرتے۔

اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کے لیے مغفرت فرمانے والے ہیں

''وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ'': بعض مفسرین نے کہا: بے شک آپ کے رب لوگوں کے اپنی جانوں پر کیے ہوئے ظلم پر پردہ ڈالنے والے ہیں اور عذاب کو اس کے وقت سے پہلے موخر فرمانے والے ہیں۔ اور بعض دوسرے مفسرین نے کہا: آپ کے رب لوگوں کے ظلم کے باوجود اُن کی مغفرت فرمانے والے ہیں جب لوگ توبہ کر لیں اور اس توبہ پر ہی مر جائیں۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ مومنین میں سے جو اپنی جانوں پر کیے ہوئے ظلم پر توبہ کر لیں ان کے لیے مغفرت فرمانے والے ہیں۔

''وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ'': اور جو اپنی جانوں پر کیے ہوئے ظلم پر توبہ نہ کریں تو ان کی سخت گرفت فرمانے والے ہیں، جو لوگ ظلم اور شرک پر مر جائیں۔

الرعد ٦ کی تفسیر میں امام رازی کا موقف

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی شافعی متوفی ٦٠٦ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس حال میں انسان اپنے نفس پر ظلم کر رہا ہو، اس حال میں بھی اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرما دیتے ہیں۔ اور یہ معلوم ہے کہ جس حال میں انسان اپنے اوپر ظلم کرنے والا ہو، اس حال میں وہ توبہ کرنے والا نہیں ہوتا۔ سو اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ کبھی اللہ تعالیٰ توبہ کرنے سے پہلے بھی گناہ کو معاف فرما دیتے ہیں۔

(تفسیر کبیر ج ۷ ص ۱۲، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

بہر حال امام ماتریدی اور دیگر مفسرین نے اس آیت کا یہی محمل بیان کیا ہے کہ جو شخص اپنے گناہوں پر اور اپنے ظلم پر توبہ کرنے والا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرما دیتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”کفار کہتے ہیں: ”اس رسول پر اُن کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں نازل کی گئی“ (حالانکہ) آپ تو صرف اللہ کے عذاب سے ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے لیے ایک ہدایت دینے والا ہوتا ہے O“ (الرعد:۷)

کفار کے مطالبہ کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی نشانی کیوں نہیں پیش کی

”وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ“:

کفار کہتے تھے کہ ان کے اوپر ان کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں نازل فرمائی گئی۔ اور دوسری جگہ انہوں نے کہا: ”فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَاۤ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ (الانبیاء:۵)“ (اور اگر یہ رسول ہیں تو پہلے رسولوں کی طرح ہمارے پاس کوئی نشانی لائیں O)۔ اور دوسری جگہ انہوں نے کہا: ”وَ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۙ (بنی اسرائیل:۹۰)“ (اور انہوں نے کہا: ہم آپ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ آپ ہمارے لئے زمین سے ایک چشمہ جاری نہ کر دیں O)۔ تو جس طرح پہلے کافروں نے سوال کئے تھے، اسی طرح ان لوگوں نے بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کئے۔ اور تمام رسول ایک قسم کی نشانی نہیں لائے بلکہ وہ مختلف قسم کی نشانیاں لائے ہیں، اور ہر رسول ایسی نشانی لے کر آیا جیسی نشانی دوسرا نہیں لایا تھا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ آپ کے اختیار میں نہیں، آپ تو صرف عذاب سے ڈرانے والے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے کفار کی ہلاکت کے وقت نشانیاں بھیجنا اس امت پر معاف فرما دیا اور کفار کا نشانیاں طلب کرنے کا سوال محض عناد تھا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے پاس اپنی رسالت کے اثبات پر اور اس کے اظہار پر اتنی نشانیاں پیش کر چکے تھے جو اُن کے ایمان لانے کے لیے کافی تھیں لیکن وہ بہ طور عناد سوال کرتے تھے۔

”اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرٌ“: یعنی ان نشانیوں کو لانے پر آپ قادر یا مالک نہیں ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اِنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ (العنکبوت:۵۰)“ (آپ کہیے: نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں اور میں تو صرف برملا عذاب سے ڈرانے والا ہوں O)۔

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِيَ الْاَمْرُ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝ (الانعام:۵۸)“ (آپ کہیے: اگر میرے اختیار میں وہ (عذاب) ہوتا جس کو تم جلد طلب کر رہے ہو تو ضرور میرے اور تمہارے

درمیان (کبھی کا) فیصلہ ہو چکا ہوتا، اور اللہ ظالموں کو خوب جاننے والے ہیں O)۔

یا اس آیت کا معنی یہ ہے کہ معجزات کو نکالنا اور ان کا اختراع کرنا آپ کے ذمہ نہیں ہے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اِنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝'' (العنکبوت: ۵۰) ''(آپ کہیے: نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں اور میں تو صرف برملا عذاب سے ڈرانے والا ہوں O)''۔

''وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ'': یعنی میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور ان کے دین کی طرف دعوت دینے والا ہوں، جیسے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ؕ وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ۝'' (فاطر: ۲۴) ''(بے شک ہم نے آپ کو ثواب کی خوشخبری دینے والا اور عذاب سے ڈرانے والا بنا کر سچے دین کے ساتھ بھیجا، اور ہر امت میں ایک عذاب سے ڈرانے والا نبی گزر چکا ہے O)۔

''وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ'': اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ ہر وقت میں ایک ہدایت دینے والا ہے، پھر اس میں اختلاف ہے کہ وہ دعوت دینے والا کون ہے؟ بعض مفسرین نے کہا: وہ اللہ تعالیٰ ہیں، اور بعض مفسرین نے کہا: وہ انبیاء میں سے کوئی نبی ہوتا ہے جو کسی نہ کسی وقت میں ہدایت دیتا ہے۔ اور دوسرے مفسرین نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی دلیل اُن کو ہدایت کی دعوت دیتی ہے۔

فرقۂ باطنیہ نے کہا ہے: وہ نبی کی مثل امامِ معصوم ہوتا ہے تاکہ وہ حق سے تجاوز نہ کرے۔

لیکن ہمارے نزدیک وہ داعی معصوم ہو یا معصوم نہ ہو، قرآن مجید اس کو کج روی سے روکتا ہے اور جب وہ حق سے تجاوز کرے اور حق کو چھوڑ کر گمراہی اختیار کرے تو قرآن اس کو روکتا ہے۔ (تاویلات اہل السنہ، ج ۶ ص ۳۰۱۔۳۱۲، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۶ھ)

علماءِ شیعہ کے نزدیک ''وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ'' کی تفسیر میں اقوال

مشہور شیعہ مفسر ابوجعفر محمد بن الحسن الطوسی المتوفی ۴۶۰ھ، لکھتے ہیں:

اس آیت کی تفسیر میں پانچ اقوال ہیں:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: ہادی وہ ہے جو حق کی طرف دعوت دینے والا ہو۔

(۲) مجاہد اور قتادہ اور ابن زید نے کہا: وہ ہادی ہر امت کا نبی ہے۔

(۳) سعید بن جبیر نے کہا کہ ہادی، وہ اللہ عزوجل ہیں۔

(۴) حسن بصری اور عکرمہ نے کہا: وہ ہادی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور یہی الجبائی کا مختار ہے۔

(۵) از ابوجعفر اور از ابوعبداللہ علیہ السلام ہادی ہر زمانے کا امام ہے جو معصوم ہوتا ہے کہ اس سے کوئی غلط بات کہی جائے یا وہ کسی باطل کا ارادہ کرے۔

اور طبری نے اپنی سند کے ساتھ از حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ''کہ آپ تو صرف عذاب سے ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے لیے ایک ہدایت دینے والا ہوتا ہے'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے سینے پر رکھا اور فرمایا: ''انا المنذر'' میں عذاب سے ڈرانے والا ہوں ''وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ'' اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا: اے علی تم ہادی ہو اور تمہاری وجہ سے میرے بعد ہدایت پانے والے ہدایت پائیں گے۔ (التبیان فی تفسیر

القرآن ج ۶ ص ۲۲۳، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

شیخ اشرف علی تھانوی دیوبندی متوفی ۱۳۶۲ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ہر قوم کے لیے (امم ماضیہ میں) ہادی ہوتے چلے آئے ہیں (ان میں بھی یہی قاعدہ چلا آیا ہے کہ دعویٰ نبوت کے لئے مطلق دلیل کو کافی قرار دیا گیا خاص دلیل کا التزام نہیں ہوا)۔ آیت میں ہادی عام ہے نبی اور نائب نبی کو پس ہند میں مطلق ہادی کے آنے سے اس کا نبی ہونا لازم نہیں البتہ محتمل ہے اس میں زیادہ بحث ضرور نہیں۔ (تفسیر بیان القرآن، ج ۲ ص ۲۷۸، مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار، لاہور)

شیخ تھانوی کی تفسیر پر مصنف کا تبصرہ

شیخ تھانوی نے لکھا ہے کہ "ہند میں مطلق ہادی آنے سے اس کا نبی ہونا لازم نہیں البتہ محتمل ہے"۔ اس عبارت کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہند میں اگر کوئی ہدایت دینے والا آج آ جائے تو اس کے نبی ہونے کا بھی احتمال ہے، حالانکہ ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے نبوت کو ختم فرما دیا ہے اور آپ کے بعد کسی ہادی کا نبی ہونا محال ہے نہ کہ محتمل ہے۔ (سعیدی غفرلہ)

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ؕ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ﴿۸﴾

اللہ جانتے ہیں جو ہر مادہ اپنے پیٹ میں اٹھائے ہوئے ہے، اور رحم جس قدر گھٹتے اور بڑھتے ہیں اس کو بھی جانتے ہیں، اور ہر چیز ان کے نزدیک ایک معین اندازے سے ہے○

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ﴿۹﴾

وہ ہر غیب اور ظاہر کے جاننے والے ہیں، بہت بڑے ہیں، ہر عیب سے پاک ہیں○

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ﴿۱۰﴾

تم میں سے خواہ کوئی آہستہ بات کرے یا بلند آواز سے بات کرے اور جو رات میں چھپا ہوا ہے اور جو دن میں چلنے والا ہے، ان کے علم میں سب برابر ہیں○

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ﴿۱۱﴾

اور اس کے مقرر کردہ فرشتے انسان کے آگے اور اس کے پیچھے ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں، بے شک اللہ کسی

قوم میں کوئی تبدیلی نہیں لاتے جب تک کہ وہ خود اپنی جانوں میں تبدیلی نہ لائیں، اور جب اللہ کسی قوم پر عذاب بھیجنا چاہے تو اس کو کوئی ٹالنے والا نہیں ہے اور اس کے سوا ان کا کوئی کارساز نہیں ہے ○

هُوَ الَّذِي يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿١٢﴾

وہی تم کو ڈرانے کے لیے یا امید دلانے کے لیے بجلی کی چمک دکھاتے ہیں اور بھاری بادلوں کو پیدا فرماتے ہیں ○

وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ ۚ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَشَاءُ وَهُمْ يُجَادِلُونَ فِي اللَّهِ ۚ وَهُوَ شَدِيدُ الْمِحَالِ ﴿١٣﴾

اور بادلوں پر مقرر فرشتہ ان کی حمد کے ساتھ ان کی تسبیح کرتا ہے اور دوسرے فرشتے بھی ان کے خوف سے ان کی ہر عیب سے براءت کو بیان کرتے ہیں اور وہ کڑکتی ہوئی بجلیاں بھیجتے ہیں اور جن پر چاہیں ان بجلیوں کو اس حال میں گرا دیتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے متعلق جھگڑ رہے ہوتے ہیں حالانکہ اللہ شدید گرفت (فرمانے) والے ہیں ○

لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ ۖ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَسْتَجِيبُونَ لَهُمْ بِشَيْءٍ إِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهِ ۚ وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ﴿١٤﴾

دعا کا قبول کرنا انہی کے ساتھ مخصوص ہے، اور کفار اللہ کو چھوڑ کر جن بتوں کو پکارتے ہیں وہ ان کی دعا کو بالکل قبول نہیں کرتے مگر اس شخص کی طرح جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلا دے تاکہ پانی از خود اس کے مونہہ میں پہنچ جائے حالانکہ وہ پانی اس کے مونہہ تک پہنچنے والا نہیں ہے، اور کافروں کا پکارنا صرف گمراہی میں ہے ○

وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَظِلَالُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ ﴿١٥﴾

السجدة ١

اور جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمینوں میں ہیں وہ خوشی اور ناخوشی سے اللہ ہی کے لیے سجدہ کرتے ہیں اور ان کے سائے بھی صبح اور شام سجدہ کرتے ہیں ○

قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ قُلِ اللَّهُ ۚ قُلْ أَفَاتَّخَذْتُمْ مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ لَا يَمْلِكُونَ لِأَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَلَا ضَرًّا ۚ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ أَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمَاتُ وَالنُّورُ ۗ أَمْ جَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ خَلَقُوا كَخَلْقِهِ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ۚ قُلِ اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿١٦﴾

(اے رسولِ اکرم!) آپ ان سے پوچھیے: آسمانوں اور زمینوں کا رب کون ہے؟ آپ خود ہی کہیے کہ اللہ ہیں، پھر آپ کہیے: "کیا تم نے اللہ کو چھوڑ کر ایسے مددگار بنالیے ہیں جو خود اپنے لیے بھی نفع اور نقصان کے مالک نہیں ہیں" آپ کہیے: "کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہو سکتے ہیں؟ یا مختلف اندھیرے اور روشنی برابر ہو سکتی ہے؟" یا انہوں نے اللہ کے لیے ایسے شریک بنا رکھے ہیں جنہوں نے اللہ کی تخلیق کی طرح کچھ پیدا کیا ہے تو ان پر تخلیق مشتبہ ہوگئی، آپ کہیے: "اللہ ہر چیز کے خالق ہیں اور وہی واحد اور سب پر غالب ہیں" O

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۬ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ؕ ﴿۱۷﴾

اللہ نے آسمان سے بارش نازل فرمائی تو اس سے وادیاں بارش کے حساب سے بہنے لگیں، اور جب سیلاب اٹھا تو پانی کی سطح پر جھاگ آگئے، اور ایسے ہی جھاگ ان دھاتوں پر بھی اٹھتے ہیں جنہیں زیور اور برتن بنانے کے لیے لوگ پگھلایا کرتے ہیں، اسی طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان فرماتے ہیں، لیکن جو جھاگ ہے وہ اڑ جاتا ہے اور جو چیز لوگوں کے لیے نفع آور ہوتی ہے وہ زمین میں برقرار رہتی ہے، اسی طرح اللہ مثالوں سے کسی حقیقت کو سمجھاتے ہیں O

لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ؔؕ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ۬ؕ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۸﴾ ع

جن لوگوں نے اپنے رب کے احکام پر عمل کیا ان کے لیے اچھا انجام ہے اور جن لوگوں نے اپنے رب کے احکام پر عمل نہیں کیا اگر ان کی ملکیت میں تمام روئے زمین ہوتی اور اس کے ساتھ اس کی مثل بھی ہوتی تو وہ عذاب سے جان چھڑانے کے لیے اس کو فدیہ میں دے دیتے، انہی سے سخت حساب ہوگا اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اللہ جانتے ہیں جو ہر مادہ اپنے پیٹ میں اٹھائے ہوئے ہے، اور رحم جس قدر گھٹتے اور بڑھتے ہیں اس کو بھی جانتے ہیں، اور ہر چیز ان کے نزدیک ایک معین اندازے سے ہے O" (الرعد:۸)

حافظ اسماعیل بن کثیر الشافعی الدمشقی المتوفی ۷۷۴ھ، الرعد: ۸ تا ۱۸ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى": اس آیت سے اللہ عزوجل نے یہ خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے اور

ان کا علم اس کو محیط ہے جو حیوانات میں سے ہر مادہ اپنے پیٹ میں اٹھائے ہوئے ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ۔۔۔ (لقمان: ۳۴)'' (اور وہ ہر اس چیز (اور اس کی تبدیلی اور کیفیت) کو جانتے ہیں جو ماؤں کے پیٹ میں ہے)۔ یعنی جو مادہ نے اٹھایا ہوا ہے یا جو اچھا کام ہے یا برا کام ہے یا جو نیک بخت ہے یا بد بخت ہے یا جس کی عمر بہت لمبی ہے یا جس کی عمر بہت چھوٹی ہے، وہ سب کو جاننے والے ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث بیان فرمائی اور آپ بہت زیادہ سچے ہیں، آپ نے فرمایا: تم میں سے کسی ایک کی تخلیق (اس کی تخلیق کا نطفہ) اس کی ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک جمع رہتی ہے یا چالیس راتوں تک، پھر وہ اتنے دنوں تک جمع ہوا خون ہو جاتا ہے، پھر وہ اتنی مدت تک گوشت کا ٹکڑا ہو جاتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس کی طرف فرشتہ کو بھیجتے ہیں، پس اس کو چار کلمات لکھنے کا حکم فرماتے ہیں، پس فرشتہ اس کے رزق کو لکھتا ہے اور اس کی مدت حیات کو اور اس کے عمل کو اور اس کے بد بخت یا نیک بخت ہونے کو (لکھتا ہے)، پھر اس میں روح پھونک دیتا ہے، پس بے شک تم میں سے کوئی ایک اہل جنت کے عمل کرتا ہے حتیٰ کہ اس کے اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر اس پر کتاب میں لکھا ہوا مقدم ہو جاتا ہے، سو وہ اہل دوزخ کا عمل کرتا ہے اور دوزخ میں داخل ہو جاتا ہے، اور بے شک تم میں سے کوئی ایک اہل دوزخ کے عمل کرتا ہے حتیٰ کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر اس پر کتاب میں لکھا ہوا سابق ہوتا ہے سو وہ اہل جنت کے عمل کرتا ہے اور جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

(صحیح البخاری: ۳۲۰۸، ۳۳۳۲، ۶۵۹۴، ۷۴۵۴، صحیح مسلم: ۲۶۴۳، سنن ترمذی: ۲۱۳۷، سنن ابوداؤد: ۴۷۰۸، سنن ابن ماجہ: ۷۶، مسند احمد: ۳۶۱۷)

اللہ تعالیٰ کے چار کلمات لکھنے کا حکم دینے سے اللہ تعالیٰ کے کلام کرنے کا ثبوت

علامہ ابی حفص عمر بن علی بن احمد الانصاری الشافعی المعروف بابن ملقن متوفی ۸۰۴ھ، اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

علماء اہلسنت کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ازل میں تمام کلاموں کے ساتھ متکلم تھے، اور اس سے ان لوگوں کا رد ہوتا ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ اگر چاہیں تو اپنی تمام مخلوق کو عذاب دیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں ہے کہ ان کے علم میں تبدیلی ہو، اور اللہ تعالیٰ کو ازل میں علم تھا کہ وہ کن پر رحم فرمائیں گے اور کن کو عذاب دیں گے، اور اہل الحق کا اس پر اتفاق ہے کہ ازل میں اللہ تعالیٰ کا کلام فی نفسہٖ تھا۔ (التوضیح لشرح الجامع الصحیح ج ۳۳ ص ۳۶۸، ملخصاً وملتقطاً، وزارۃ الاوقاف والشؤون الاسلامیہ، قطر، ۱۴۲۹ھ)

''وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ'': اللہ عزوجل فرماتے ہیں کہ ایام حمل میں جو رحم میں زیادتی ہوتی ہے یا جو کمی ہوتی ہے حتیٰ کہ بچہ پورا پیدا ہو جاتا ہے، کیونکہ بعض عورتوں کا دس ماہ کے بعد وضع حمل ہوتا ہے اور بعض عورتوں کا نو ماہ کے بعد وضع حمل ہوتا ہے اور بعض عورتوں کے حمل میں اضافہ ہوتا ہے اور بعض عورتوں کے حمل میں کمی ہوتی ہے، پس یہ کمی اور زیادتی سب اللہ عزوجل کے علم میں ہے۔

الضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ جن عورتوں کے وضع حمل میں نو ماہ سے کمی ہوتی ہے یا اضافہ ہوتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔

''وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ'': یعنی ہر چیز کی مدت اللہ تعالیٰ کے علم میں مقرر ہے۔ وہ اپنی مخلوق کے رزق کی حفاظت فرماتے

ہیں اوران کی مدتِ حیات کی حفاظت فرماتے ہیں۔

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیوں میں سے کسی بیٹی کے بیٹے کی جان نکل رہی تھی، تو انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پیغام بھیجا کہ آپ ان کے پاس تشریف لائیں، آپ نے جواب بھیجا: بے شک اللہ ہی کی ملکیت ہے جو انہوں نے لے لیا اور جو انہوں نے عطاء فرمایا، اور سب ایک میعادِ مقرر تک ہیں، پس اس کو چاہیے کہ صبر کرے اور ثواب کی نیت کرے، پس انہوں نے دوبارہ پیغام بھیجا اور آپ کو آنے کی قسم دی تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور میں بھی آپ کے ساتھ کھڑا ہوا اور حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ابی بن کعب اور حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہم، پس جب ہم گھر میں داخل ہوئے تو لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کی گود میں) وہ بچہ دیا اور اس کا سانس سینے میں اکھڑ رہا تھا اور سینے سے اس کی آواز آرہی تھی، میں نے اس بچے کو یوں گمان کیا جیسا کہ وہ ایک پرانی مشک ہو، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روئے تو حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: کیا آپ رو رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے صرف رحم کرنے والوں پر رحم فرماتے ہیں۔

(صحیح البخاری: ۱۲۸۴، ۵۶۵۵، ۶۶۰۲، ۶۶۵۵، ۷۳۷۷، ۷۴۴۸، صحیح مسلم: ۹۲۳، سنن نسائی: ۱۸۶۸، سنن ابوداؤد: ۳۱۲۵، مسند احمد: ۲۱۲۶۹)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”وہ ہر غیب اور ظاہر کے جاننے والے ہیں، بہت بڑے ہیں، ہر عیب سے پاک ہیں ○“ (الرعد: ۹)

”عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ“: یعنی اللہ ہر چیز کو جاننے والے ہیں خواہ وہ چیزیں بندوں کے مشاہدہ میں ہوں یا بندوں سے مخفی ہوں، اللہ عزوجل سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ ”الْكَبِيْرُ“: یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز سے بڑے ہیں۔ ”الْمُتَعَالِ“ یعنی ہر چیز کو اللہ تعالیٰ کا علم محیط ہے، اور تمام بندے خوشی یا ناخوشی سے انہی کی اطاعت کرتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”تم میں سے خواہ کوئی آہستہ بات کرے یا بلند آواز سے بات کرے اور جو رات میں چھپا ہوا ہے اور جو دن میں چلنے والا ہے، ان کے علم میں سب برابر ہیں ○“ (الرعد: ۱۰)

”سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ“: اس آیت سے اللہ تعالیٰ نے اس کی خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم نے تمام مخلوق کا احاطہ فرمایا ہوا ہے خواہ کوئی چپکے سے بات کرے یا بلند آواز سے بات کرے، اللہ اس کی بات کو سنتے ہیں، کیونکہ ان سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے ”وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ○ (طٰہٰ: ۷)“ (اور اے مخاطب! اگر تو بلند آواز سے بات (ذکر یا دعا) کرے تو جان لے کہ اللہ آہستہ اور دل کی بات کو بھی جانتے ہیں)۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو تمام آوازوں کو سنتے ہیں، اور ایک جھگڑا کرنے والی عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور میں بھی گھر کی ایک جانب میں تھی، وہ اپنے خاوند کی شکایت کر رہی تھی اور میں نہیں سن رہی تھی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ”بے شک اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو اپنے خاوند کے متعلق جھگڑ رہی تھی“۔

(سنن ابن ماجہ: ۱۸۸، مسند احمد: ۲۳۱۹۵، الاسماء والصفات للبیہقی: ۳۸۵، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۱۵۲۳۲، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشر، ج ۱ ص ۷۵)

"وَ مَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّیْلِ": یعنی جو رات کے اندھیروں میں اپنے گھر میں چھپتا ہے۔ "وَ سَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ": اور جو دن کی روشنی میں چلتا ہے۔ تو یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے علم میں برابر ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اس کے مقرر کردہ فرشتے انسان کے آگے اور اس کے پیچھے ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں، بے شک اللہ کسی قوم میں کوئی تبدیلی نہیں لاتے جب تک کہ وہ خود اپنی جانوں میں تبدیلی نہ لائیں، اور جب اللہ کسی قوم پر عذاب بھیجنا چاہیں تو اس کو کوئی ٹالنے والا نہیں ہے اور اس کے سوا ان کا کوئی کارساز نہیں ہے O" (الرعد: ۱۱)

"لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ یَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ": یعنی بندے کے لیے آگے پیچھے آنے والے فرشتے مقرر ہیں جو رات اور دن اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں، جس طرح رات اور دن کے فرشتے آگے پیچھے بندوں کے اعمال کی حفاظت کے لیے آتے ہیں۔ پس دو فرشتے دائیں جانب ہوتے ہیں اور دو فرشتے بائیں جانب ہوتے ہیں اور وہ اعمال کو لکھتے رہتے ہیں۔ دائیں جانب والا فرشتہ اس کی نیکیوں کو لکھتا ہے اور بائیں جانب والا فرشتہ اس کی برائیوں کو لکھتا ہے۔ اور دو فرشتے اور ہیں جو بندے کی حفاظت کرتے ہیں ایک فرشتہ اس کے سامنے ہوتا ہے اور دوسرا فرشتہ اس کے پیچھے ہوتا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے پاس رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں اور وہ عصر کی نماز میں اور صبح کی نماز میں جمع ہو جاتے ہیں، پھر جن فرشتوں نے تمہارے پاس رات گزاری ہے وہ اوپر چڑھتے ہیں، اللہ عزوجل ان سے سوال فرماتے ہیں حالانکہ وہ بہت زیادہ جاننے والے ہیں: تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا؟ پس وہ کہتے ہیں: ہم نے ان کو چھوڑا تو وہ نماز پڑھ رہے تھے اور ہم ان کے پاس آئے تو وہ نماز پڑھ رہے تھے۔

(صحیح البخاری: ۵۵۵، ۳۲۲۳، ۷۴۲۹، ۷۴۸۶، صحیح مسلم: ۶۳۲، سنن نسائی: ۴۸۵، مسند احمد: ۲۷۳۳۶، موطا امام مالک: ۴۳)

"اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ": اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں فرماتے جب تک کہ وہ خود اپنے اندر کوئی تبدیلی نہ کریں۔ جس طرح اُحد کے دن جب مسلمانوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی جگہ کو چھوڑ دیا تو اُن پر کفار غالب آگئے۔ اور کسی شخص کے اوپر کوئی مصیبت اسی وقت آتی ہے جب اس سے پہلے وہ کوئی گناہ کرتا ہے۔ اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں وہ نعمتیں انسان سے اس وقت تک نہیں واپس لیتے جب تک کہ انسان اپنی بداعمالیوں سے اپنے آپ کو ان نعمتوں کا نااہل ثابت نہ کر دے۔

"وَ اِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ": یعنی جب اللہ تعالیٰ بعض لوگوں پر کوئی مصیبت نازل فرماتے ہیں یا بیماریاں نازل فرماتے ہیں تو ان مصائب اور بیماریوں کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ٹالنے والا نہیں ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وہی تم کو ڈرانے کے لیے یا امید دلانے کے لیے بجلی کی چمک دکھاتے ہیں اور بھاری بادلوں کو پیدا فرماتے ہیں O" (الرعد: ۱۲)

"هُوَ الَّذِیۡ یُرِیۡكُمُ الۡبَرۡقَ": اللہ عزوجل نے یہ خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بجلی کے چمکنے کو مسخر فرمایا ہوا ہے۔

"خَوۡفًا وَّ طَمَعًا": قتادہ نے کہا: جب بجلی چمکتی ہے تو مسافر خوف زدہ ہو جاتا ہے اور اس کو یہ امید ہوتی ہے کہ وہ اس بجلی کی چمک کی روشنی میں اپنے ٹھکانے تک پہنچ جائے گا۔

"وَ یُنۡشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ": اور وہ بادل بہت زیادہ پانی کو اٹھانے کی وجہ سے بھاری ہوتے ہیں۔

مجاہد نے کہا: "السَّحَابَ الثِّقَالَ" یہ وہ بادل ہوتے ہیں جن میں پانی ہوتا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور بادلوں پر مقرر فرشتہ ان کی حمد کے ساتھ ان کی تسبیح کرتا ہے اور دوسرے فرشتے بھی ان کے خوف سے ان کی ہر عیب سے براءت کو بیان کرتے ہیں اور وہ کڑکتی ہوئی بجلیاں بھیجتے ہیں اور جن پر چاہیں ان بجلیوں کو اس حال میں گرا دیتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے متعلق جھگڑ رہے ہوتے ہیں حالانکہ اللہ شدید گرفت (فرمانے) والے ہیں O" (الرعد: ۱۳)

"وَ یُسَبِّحُ الرَّعۡدُ بِحَمۡدِهٖ": یہ ایسے ہے جیسے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَ اِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ"۔ (بنی اسرائیل: ۴۴) "(اور کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی حمد کے ساتھ ان کی تسبیح کرتی ہے)۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بادل کے گرجنے اور بجلی کے چمکنے کی آوازیں سنتے تھے تو آپ یہ دعا کرتے: "اے اللہ! ہمیں اپنے غضب سے نہ مار ڈالیں اور نہ اپنے عذاب سے ہمیں ہلاک فرمائیں اور ہمیں اس سے عافیت میں رکھیں"۔

(سنن ترمذی: ۳۴۵۰، مسند احمد: ۵۷۶۳، السنن الکبریٰ للنسائی: ۱۰۶۹۸، مکارم الاخلاق للخرائطی: ۱۰۰۸، عمل الیوم واللیلۃ للنسائی: ۹۲۷، کتاب الدعاء للطبرانی: ۹۸۱، المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۳۲۳۰، المستدرک علی الصحیحین: ۷۷۷۲، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۶۴۷۰، شرح السنۃ للبغوی ج ۳ ص ۴۳۳، الاحادیث المختارۃ ج ۳ ص ۹۳، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشر، ج ۷ ص ۳۸۹)

"وَ الۡمَلٰٓئِكَةُ مِنۡ خِیۡفَتِهٖ": اور دوسرے فرشتے بھی ان کے خوف سے ان کی ہر عیب سے براءت کو بیان کرتے ہیں۔

"وَ یُرۡسِلُ الصَّوَاعِقَ فَیُصِیۡبُ بِهَا مَنۡ یَّشَآءُ": اور وہ کڑکتی ہوئی بجلیاں بھیجتے ہیں اور جن پر چاہیں ان بجلیوں کو اس حال میں گرا دیتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے متعلق جھگڑ رہے ہوتے ہیں حالانکہ اللہ شدید گرفت (فرمانے) والے ہیں۔

قتادہ نے ذکر کیا ہے کہ ایک مرد نے قرآن مجید کا انکار کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی تو اللہ تعالیٰ نے ایک کڑکتی ہوئی بجلی بھیجی جس نے اس کو ہلاک کر دیا۔ ابن جریر نے کہا: جو اللہ تعالیٰ کے سامنے سرکشی کرتا ہے اور عناد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اس کی سرکشی میں ہلاک فرما دیتے ہیں۔ "وَ هُمۡ یُجَادِلُوۡنَ فِی اللّٰهِ": یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے موافق ہے: "وَ مَكَرُوۡا مَكۡرًا وَّ مَكَرۡنَا مَكۡرًا وَّ هُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۵۰﴾ فَانۡظُرۡ كَیۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكۡرِهِمۡ ۙ اَنَّا دَمَّرۡنٰهُمۡ وَ قَوۡمَهُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۵۱﴾" (النمل: ۵۰-۵۱) "(انہوں نے سازش تیار کی اور ہم نے بھی خفیہ تدبیر فرمائی اور وہ بے خبر ہی رہے O آپ دیکھئے کہ ان کی سازش کا انجام کیسا رہا؟ (کیونکہ) ہم نے انہیں اور ان کی قوم سب کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا O)۔

"وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ ": حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ شدید گرفت فرمانے والے ہیں، اور مجاہد نے کہا: وہ شدید طاقت والے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: " دعا کا قبول کرنا انہی کے ساتھ مخصوص ہے، اور کفار اللہ کو چھوڑ کر جن بتوں کو پکارتے ہیں وہ ان کی دعا کو بالکل قبول نہیں کر سکتے، مگر اس شخص کی طرح جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلا دے تا کہ پانی ازخود اس کے مونہہ میں پہنچ جائے حالانکہ وہ پانی اس کے مونہہ تک پہنچنے والا نہیں ہے، اور کافروں کا پکارنا صرف گمراہی میں ہے O" (الرعد: ۱۴)

"لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ ": حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا: "دَعْوَةُ الْحَقِّ " سے مراد توحید ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، قتادہ اور امام مالک نے از محمد بن المنکدر کہا "دَعْوَةُ الْحَقِّ " سے مراد ہے لا الٰہ الا اللہ۔

"وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا ": یعنی اُن لوگوں کی مثال جو اللہ کو چھوڑ کر خود ساختہ خداؤں کی عبادت کرتے ہیں۔

"كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ": حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا: اُن کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو کنویں کی طرف سے اپنے ہاتھوں سے پانی کو اٹھاتا ہے اور وہ اس کو اپنے ہاتھوں سے کبھی بھی نہیں اٹھا پاتا تو اس کے مونہہ تک وہ پانی کیسے پہنچے گا۔ اور مجاہد نے کہا: "كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ " وہ پانی کو اپنی زبان سے بلاتا ہے اور اس کی طرف اشارہ کرتا ہے تو پانی اس کی طرف کبھی بھی نہیں آتا۔

اور اس کلام کا معنی یہ ہے کہ جو اپنا ہاتھ پانی کی طرف پھیلاتا ہے، اس کو پکڑتے ہوئے یا اس کو اٹھاتے ہوئے تو جس طرح وہ کبھی پانی سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتا کہ پانی اس کے مونہہ تک نہیں پہنچے گا جس کو اللہ تعالیٰ نے پینے کا محل بنایا ہے، اسی طرح یہ مشرکین اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں تا کہ اُن سے نفع حاصل کریں، اور وہ اس سے نہ دنیا میں نفع حاصل کر سکتے ہیں اور نہ آخرت میں۔ اسی لیے فرمایا: "وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ " اور کافروں کا پکارنا صرف گمراہی میں ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: " جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمینوں میں ہیں وہ خوشی اور ناخوشی سے اللہ ہی کے لیے سجدہ کرتے ہیں اور ان کے سائے بھی صبح اور شام سجدہ کرتے ہیں O" (الرعد: ۱۵)

"وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا":

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت اور سلطنت کی خبر دی ہے، اور وہ ہر چیز پر قاہر ہیں اور ہر چیز ان ہی کی طرف جھکی ہوئی ہے اسی لیے مومنین ان کو خوشی سے سجدہ کرتے ہیں۔

"وَظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ ": اور صبح کے وقت ان کے سائے سجدہ کرتے ہیں۔

اور "وَالْاٰصَالِ ": یہ اصیل کی جمع ہے اور وہ دن کے آخری وقت کو کہتے ہیں، یعنی دن کے وقت بھی ان کے سائے سجدہ کرتے ہیں۔ یہ آیت اللہ عزوجل کے اس ارشاد کی مثل ہے: " اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَ

اَلْخٰمِا بِلْ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ ۝ (النحل:۴۸)" (کیا انہوں نے اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ سایادار چیز نہیں دیکھی جس کے سائے اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے اور عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے دائیں بائیں جھک جاتے ہیں O)۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "(اے رسولِ اکرم!) آپ ان سے پوچھئے: آسمانوں اور زمینوں کا رب کون ہے؟ آپ خود ہی کہیے کہ اللہ ہیں، پھر آپ کہیے: "کیا تم نے اللہ کو چھوڑ کر ایسے مددگار بنا لیے ہیں جو خود اپنے لیے بھی نفع اور نقصان کے مالک نہیں ہیں"، آپ کہیے: "کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہوسکتے ہیں؟ یا مختلف اندھیرے اور روشنی برابر ہوسکتی ہے؟" یا انہوں نے اللہ کے لیے ایسے شریک بنا رکھے ہیں جنہوں نے اللہ کی تخلیق کی طرح کچھ پیدا کیا ہے تو ان پر تخلیق مشتبہ ہوگئی، آپ کہیے: "اللہ ہر چیز کے خالق ہیں اور وہی واحد اور سب پر غالب ہیں" O" (الرعد:۱۶)

"قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا":

اللہ عزوجل اس کی تاکید فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، کیونکہ مشرکین اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا ہے اور وہ ان کے رب ہیں اور ان کی تدبیر فرمانے والے ہیں، اور مشرکوں نے اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اپنے خود ساختہ معبود بنا رکھے ہیں جن کی وہ عبادت کرتے ہیں، اور یہ ان کے خود ساختہ معبود اپنی جانوں کے لیے بھی کسی نفع اور ضرر کے مالک نہیں ہیں اور نہ اپنی عبادت کرنے والوں کے لیے بہ طریق اولیٰ کسی نفع اور ضرر کے مالک ہیں، لہٰذا ان بتوں کی عبادت کرنے سے ان کو نہ کوئی نفع حاصل ہوتا ہے اور نہ وہ بت ان سے کسی نقصان کو دور کرسکتے ہیں۔

پس جو شخص ان خود ساختہ معبودوں کی اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتا ہے وہ اندھیرے میں ہے اور جو صرف اللہ عزوجل کی عبادت کرتا ہے جن کا کوئی شریک نہیں ہے، پس وہ اپنے رب کی طرف سے نور پر ہے، سو یہ دونوں برابر نہیں ہیں، اس لیے فرمایا: "قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ اَمْ هَلْ تَسْتَوِى الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ۚ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ": یعنی کیا ان مشرکین نے اللہ کو چھوڑ کر ایسے خود ساختہ معبود بنا لیے ہیں جن کا وہ رب کے ساتھ تقابل کرتے ہیں، کیا ان کے خود ساختہ معبودوں نے بھی اللہ عزوجل کی طرح کوئی مخلوق بنائی ہے جس کی وجہ سے ان پر مخلوق مشتبہ ہوگئی حالانکہ ایسا نہیں ہے، اللہ عزوجل کے کوئی بھی مشابہ نہیں ہے اور کوئی ان کے مماثل نہیں ہے، نہ ان کی ضد ہے، نہ اُن کا کوئی وزیر ہے، نہ اُن کی کوئی اولاد ہے، نہ اُن کی کوئی بیوی ہے۔ اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے متعلق جو کچھ کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس سے بہت بلند ہیں۔

یا جیسے اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق خبر دی، وہ کہتے تھے: "مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ـــ (الزمر:۳)" (ہم ان بتوں کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ بت ہمیں اللہ کے قریب کردیں)۔ پس جب کہ تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کی مملوک ہے، پس یہ لوگ بلا دلیل اور بلا برہان محض اپنی رائے اور اختراع سے خود ساختہ بتوں کی عبادت کرتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو اول سے آخر تک بھیجا جو ان کو ان بتوں کی عبادت سے منع کرتے ہیں، پھر مشرکین نے اُن رسولوں کو جھٹلایا اور ان کی مخالفت کی، پس ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آنا برحق ہوگیا۔ "قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَىْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ": آپ کہیے: "اللہ ہر

چیز کے خالق ہیں اور وہی واحد اور سب پر غالب ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اللہ نے آسمان سے بارش نازل فرمائی تو اس سے وادیاں بارش کے حساب سے بہنے لگیں، اور جب سیلاب اٹھا تو پانی کی سطح پر جھاگ آ گئے، اور ایسے ہی جھاگ ان دھاتوں پر بھی اٹھتے ہیں جنہیں زیور اور برتن بنانے کے لیے لوگ پگھلایا کرتے ہیں، اسی طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان فرماتے ہیں، لیکن جو جھاگ ہے وہ اڑ جاتا ہے اور جو چیز لوگوں کے لیے نفع آور ہوتی ہے وہ زمین میں برقرار رہتی ہے، اسی طرح اللہ مثالوں سے کسی حقیقت کو سمجھاتے ہیں O'' (الرعد: ۱۷)

یہ آیت کریمہ دو مثالوں پر مشتمل ہے جن کو حق کی تائید اور اس کے بقاء میں اور باطل کے اضمحلال اور اس کی فناء میں بیان فرمایا گیا ہے۔

''اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ'': یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمان سے بارش کو نازل فرمایا۔

''مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا'': یعنی ہر وادی نے اپنے حساب سے اس سے پانی کو لے لیا اور یہ بڑی وادی ہے جس نے زیادہ پانی کو لے لیا، اور ایک چھوٹی وادی ہے جس نے اپنی گنجائش کے مطابق پانی لے لیا۔

اس آیت میں لوگوں کے مختلف دلوں کی طرف اشارہ ہے، بعض دل ایسے ہیں جو بہت زیادہ علم کے حصول کی گنجائش رکھتے ہیں، اور بعض دل ایسے ہیں جو زیادہ علوم کی گنجائش نہیں رکھتے بلکہ زیادہ علوم سے تنگ ہو جاتے ہیں۔

''فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا'': پھر اسی طرح پانی بہتا ہوا آیا اور اس نے اُن وادیوں میں جھاگ چھوڑ دی۔ یہ ایک مثال ہے اور دوسری مثال اس آیت میں ہے: ''وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ'': یعنی سونے اور چاندی کو آگ میں ڈالا جاتا ہے اور اس سے سونے اور چاندی کے اور تانبے اور پیتل کے اور لوہے کے آلات اور مختلف اوزار اور برتن بنائے جاتے ہیں اور ان کے اوپر جھاگ چڑھ جاتا ہے۔

''كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ'': اسی طرح اللہ تعالیٰ حق اور باطل کی مثال بیان فرماتے ہیں کہ باطل کے لیے کوئی دوام نہیں ہوتا جیسا کہ پانی کے اوپر کوئی جھاگ ہوتا ہے تو اس کے لیے کوئی دوام نہیں ہوتا، اور نہ سونے اور چاندی سے جو چیزیں ڈھالی جاتی ہیں، ان پر جو جھاگ آتا ہے، اس کا ان کے ساتھ کوئی دوام ہوتا ہے بلکہ وہ جھاگ ختم ہو جاتا ہے اور مضمحل ہو جاتا ہے۔

''فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً'': رہا جھاگ تو وہ کوئی نفع نہیں دیتا بلکہ مضمحل ہو جاتا ہے اور پھٹ جاتا ہے اور وادی کی ایک جانب میں بہہ جاتا ہے اور درختوں کے ساتھ چمٹ جاتا ہے۔ اسی طرح سونے، چاندی، لوہے، تانبے اور پیتل وغیرہ کا زنگ نکل کر ختم ہو جاتا ہے اور اس سے کوئی چیز واپس نہیں آتی اور نہ پانی کے ساتھ باقی رہتی ہے اور اس سونے اور چاندی سے نفع حاصل کیا جاتا ہے، اسی لیے فرمایا: ''وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ'': اور جو چیز لوگوں کے لیے نفع آور ہوتی ہے وہ زمین میں برقرار رہتی ہے۔

''كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ'': اسی طرح اللہ مثالوں سے کسی حقیقت کو سمجھاتے ہیں۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے جو ہدایت اور علم دے کر مبعوث فرمایا ہے، اس کی مثال اس زیادہ بارش کی ہے جو کسی زمین پر برسے، پس بعض زمینیں زرخیز ہوتی ہیں جو پانی کو قبول کرتی ہیں اور خشک اور زیادہ تر گھاس اگاتی ہیں اور بعض زمینیں بنجر ہوتی ہیں، وہ پانی کو روک لیتی ہیں، پس اللہ اس سے لوگوں کو نفع دیتے ہیں وہ اس پانی کو پیتے ہیں اور اپنے مویشیوں کو پلاتے ہیں اور اس پانی سے کاشت کاری کرتے ہیں، اور بارش بعض قسم کی زمینوں پر ہوتی ہے جو چکنی ہوتی ہیں، نہ وہ پانی کو روکتی ہیں اور نہ سبزہ اگاتی ہیں، یہ مثال اس شخص کی ہے جو دین کی فقہ (فہم) حاصل کرے اور اللہ نے مجھے جو علم اور ہدایت دے کر بھیجا ہے، وہ اس کو نفع دے، پس وہ پڑھے اور پڑھائے اور یہ اس شخص کی مثال ہے جو اس ہدایت کی طرف توجہ نہ دے اور اللہ تعالیٰ کی اس ہدایت کو بالکل قبول نہ کرے، جس کے ساتھ مجھے بھیجا گیا ہے۔

(صحیح البخاری: ۷۹، صحیح مسلم: ۲۲۸۲، السنن الکبریٰ للنسائی: ۵۸۴۳، مسند ابو یعلیٰ: ۷۳۱۱، صحیح ابن حبان: ۴، مسند احمد: ۱۹۵۷۳)

خلاصہ حدیث اور حدیث میں بیان کی ہوئی مثالوں کی وضاحت

اس حدیث میں زمین کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں: (۱) وہ زمین جو بارش سے نفع حاصل کرتی ہے، پہلے وہ زمین مردہ ہوتی ہے، پھر بارش سے زندہ ہو جاتی ہے، پھر سبزہ اگاتی ہے، جس سے انسان اور مویشی فائدہ حاصل کرتے ہیں، اس کے مقابلہ میں انسانوں کی وہ قسم ہے جس کو ہدایت اور علم پہنچتا ہے تو وہ اس کو یاد کر لیتا ہے، اس سے اپنے دل کو زندہ کرتا ہے، اس پر وہ عمل کرتا ہے اور دوسروں کو تعلیم دیتا ہے، پس وہ خود بھی نفع حاصل کرتا ہے اور دوسروں کو بھی نفع پہنچاتا ہے۔ (۲) زمین کی دوسری قسم وہ ہے جو خود تو بارش سے نفع حاصل نہیں کرتی لیکن وہ اپنے اندر پانی کو جمع کر لیتی ہے اور اس جمع شدہ پانی سے انسان اور مویشی فائدہ حاصل کرتے ہیں، اور اس کے مقابلہ میں انسانوں کی وہ قسم ہے، جن کا حافظہ بہت قوی ہوتا ہے، لیکن ان میں احادیث سے مسائل مستنبط کرنے اور اجتہاد کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، وہ احادیث حفظ کر لیتے ہیں اور ان سے احادیث سن کر فقہاء ان احادیث سے احکام نکالتے ہیں اور (۳) زمین کی تیسری قسم وہ ہے جو چکنی اور شوروالی زمین ہوتی ہے، نہ وہ اپنے اندر پانی کو روکتی ہے اور جمع کرتی ہے اور نہ اس پانی کو قبول کر کے اس سے سبزہ اگاتی ہے اور اس کے مقابلہ میں انسانوں کی وہ قسم ہے جن میں قوت حافظہ ہوتی ہے اور نہ روشن فہم ہوتی ہے اور ان میں قیاس اور مسائل نکالنے کی بالکل صلاحیت نہیں ہوتی، پس جب یہ لوگ علم کی کوئی بات سنتے ہیں تو اس سے کوئی نفع حاصل نہیں کرتے، اور نہ اس کو یاد رکھتے ہیں کہ اس سے کوئی اور فائدہ اٹھا سکے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری مثال اور تمہاری مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے کوئی آگ جلائی، پس پروانے اور حشرات الارض اس آگ پر گرنے لگے اور وہ ان کو دور کر رہا ہے، اسی طرح میں تم کو دوزخ کی آگ سے دور کر رہا ہوں اور تم میرے ہاتھوں سے نکل کر اس آگ میں گر رہے ہو۔

(صحیح مسلم: ۲۲۸۵، الرقم المسلسل: ۵۹۱۷، رقم حدیث الباب: ۱۹)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری مثال اور اس پیغام کی مثال جسے اللہ تعالیٰ نے دے کر مجھے مبعوث فرمایا ہے اس مرد کی مثال ہے جو ایک قوم کے پاس گیا سو ان سے کہا: میں نے اپنی آنکھوں سے ایک لشکر کو دیکھا ہے اور بے شک میں کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں، سو تم جلدی نجات حاصل کرو، جلدی نجات حاصل کرو۔ پس ایک جماعت نے

اس کی اطاعت کی اور وہ راتوں رات تیزی کے ساتھ اس جگہ سے نکل گئے، سو انہوں نے نجات پالی اور دوسری جماعت نے اس ڈرانے والے کی تکذیب کی تو صبح کو اس لشکر نے آکر ان پر حملہ کر دیا اور ان کو بالکلیہ ہلاک کر دیا۔

(صحیح البخاری: ۷۲۸۳، صحیح مسلم: ۲۲۸۳، صحیح ابن حبان: ۱۰۳، الجامع الصحیح للسنن والمسانید ج ۱ ص ۳۶۱، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشر ج ۱ ص ۲۸۳)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''جن لوگوں نے اپنے رب کے احکام پر عمل کیا ان کے لیے اچھا انجام ہے اور جن لوگوں نے اپنے رب کے احکام پر عمل نہیں کیا اگر ان کی ملکیت میں تمام روئے زمین ہوتی اور اس کے ساتھ اس کی مثل بھی ہوتی تو وہ عذاب سے جان چھڑانے کے لیے اس کو فدیہ میں دے دیتے، انہی سے سخت حساب ہوگا اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے O'' (الرعد: ۱۸)

اس آیت میں اللہ عزوجل نیک بختوں اور بدبختوں کے انجام کا ذکر فرما رہے ہیں۔

''لِلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى'': یعنی جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی اور ان کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اور ان کے احکام پر عمل کیا اور ان کی دی ہوئی ماضی اور مستقبل کی خبروں کی تصدیق کی تو ان کے لیے عمدہ جزا ہے۔ اس کی مثال درج ذیل آیت ہے: ''وَ اَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ اِۨالْحُسْنٰى ۚ وَ سَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا یُسْرًا ؕ'' (الکہف: ۸۸) (اور رہا وہ جو ایمان لایا اور اس نے نیک عمل کیے تو اس کے لیے عمدہ جزا ہے اور ہم اسے ایسے کام کا حکم فرمائیں گے جو آسان ہوگا)۔

''وَالَّذِیْنَ لَمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَهٗ'': یعنی جن لوگوں نے اللہ عزوجل کی اطاعت نہیں کی۔

''لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ'': اگر دار آخرت میں ان کے لیے یہ ممکن ہوتا کہ وہ تمام روئے زمین کا سونا اور اس کے ساتھ اس کی مثل دے کر اللہ تعالیٰ کے عذاب سے چھٹکارا پا سکتے تو وہ ضرور روئے زمین کا سونا اور اس کی مثل اللہ تعالیٰ کے عذاب سے چھٹکارا پانے کے لیے دے دیتے، لیکن وہ ان سے قبول نہیں فرمایا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ کسی فرض کو قبول فرمائیں گے اور نہ کسی نفل کو قبول فرمائیں گے۔

''اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ'': اُن سے آخرت میں سختی سے حساب لیا جائے گا، انہوں نے کھجور کے چھلکے کے برابر بھی کسی کا مال چھینا ہوگا تو وہ ان سے وصول فرمایا جائے گا۔ اور جس سے حساب میں مناقشہ کیا جائے گا اسے عذاب میں مبتلا فرمایا جائے گا۔

اسی لیے اللہ عزوجل نے فرمایا: ''وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمِهَادُ'': اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

(تفسیر القرآن العظیم، ج ۲ ص ۵۵۶ ۔ ۵۶۳، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۹ھ)

اَفَمَنْ یَّعْلَمُ اَنَّمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ؕ اِنَّمَا یَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۙ﴿۱۹﴾

کیا جو شخص اس پر یقین رکھتا ہے کہ آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے حق کو نازل فرمایا گیا ہے، کیا وہ اس شخص کی مثل ہو سکتا ہے جو اندھا ہے، صرف عقل والے ہی نصیحت کو قبول کرتے ہیں O

الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ لَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ﴿۲۰﴾

جولوگ اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کرتے ہیں اور مضبوط عہد کو نہیں توڑتے O

وَ الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَ يَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴿۲۱﴾

جولوگ اُن سے میل جول قائم رکھتے ہیں جن سے اللہ نے میل جول قائم رکھنے کا حکم فرمایا ہے اور وہ اپنے رب سے ڈرتے رہتے ہیں اور حساب کی سختی سے ڈرتے ہیں O

وَ الَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً وَّ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۲﴾

اور وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب کی رضا طلب کرتے ہوئے صبر کیا اور نماز قائم رکھی اور ہمارے عطا فرمائے ہوئے مالوں میں سے پوشیدہ طور پر اور ظاہراً خرچ کیا، اور جولوگ برائی کا جواب اچھائی سے دیتے ہیں، انہی کے لیے آخرت میں اچھا انجام ہے O

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾

ہمیشگی کی جنتیں ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے اور ان کے آباء میں سے اور ان کی بیویوں میں سے اور ان کی اولادوں میں سے جو نیک ہوں گے، اور فرشتے ان کے پاس ہر دروازہ سے داخل ہوں گے O

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۴﴾

(وہ یہ کہیں گے:) تم پر سلام ہو کیونکہ تم نے صبر کیا سو آخرت کا یہ گھر کتنا اچھا ہے O

وَ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَ يَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿۲۵﴾

اور جولوگ اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پختہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور جن سے اللہ تعالیٰ نے میل جول رکھنے کا حکم فرمایا ہے ان سے تعلق کو قطع کرتے ہیں اور زمین میں فساد کرتے ہیں، انہی لوگوں پر لعنت ہے اور انہی کے لیے سخت حساب ہے O

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ وَ فَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ مَا الْحَيٰوةُ

اَلدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ۝

اللہ جس کے لیے چاہتے ہیں رزق کو کشادہ فرما دیتے ہیں اور جس کے لیے چاہتے ہیں تنگ فرما دیتے ہیں اور کفار دنیا کی زندگی پر اِترا رہے ہیں، اور آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی صرف معمولی سامان ہے ۝

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "کیا جو شخص اس پر یقین رکھتا ہے کہ آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے حق کو نازل فرمایا گیا ہے، کیا وہ اس شخص کی مثل ہو سکتا ہے جو اندھا ہے، صرف عقل والے ہی نصیحت کو قبول کرتے ہیں ۝" (الرعد: ۱۹)

قرآن مجید کے ماننے والوں کا اور نہ ماننے والوں کا برابر نہ ہونا

علامہ ابو الفرج عبد الرحمن بن علی بن الجوزی الحنبلی المتوفی ۵۹۷ھ، الرعد: ۱۹ تا ۲۶ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اَفَمَنْ یَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ یہ آیت حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ اور ابوجہل بن ہشام کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اے رسول اکرم! وہ دو شخص برابر نہیں ہو سکتے جن میں سے ایک یہ یقین رکھتا ہے کہ آپ کی طرف جو نازل فرمایا گیا ہے وہ حق ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے، نہ کوئی التباس ہے اور نہ کوئی اختلاف ہے، بلکہ وہ کل کا کل حق ہے جس میں سے بعض، بعض کی تصدیق کرتا ہے اور اس میں سے کوئی چیز دوسرے سے متضاد نہیں ہے، پس اللہ کی دی ہوئی تمام خبریں برحق ہیں اور ان کے اوامر اور نواہی عدل پر مبنی ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝" (الانعام: ۱۱۵) "(آپ کے رب کی بات صدق اور عدل کے تقاضے سے پوری ہو چکی ہے اور اللہ کی باتوں کو کوئی تبدیل کرنے والا نہیں ہے، اور وہ سب کچھ سننے والے اور سب کچھ جاننے والے ہیں)۔" یعنی اس قرآن کی دی ہوئی خبریں صادق ہیں اور طلب میں عادل ہیں، پس وہ دو شخص برابر نہیں ہو سکتے جو آپ کے لائے ہوئے پیغام کے صدق پر یقین رکھتا ہے اور جو شخص آپ کے لائے ہوئے پیغام سے اندھا ہے، کسی خیر کی طرف نہیں راہ پاتا اور نہ اس کو سمجھتا ہے، اور اگر سمجھے تو اس کی اطاعت نہیں کرتا اور نہ اس کی تصدیق کرتا ہے اور نہ اس کی اتباع کرتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "لَا یَسْتَوِیْۤ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ؕ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝" (الحشر: ۲۰) "(دوزخ والے اور جنت والے برابر نہیں ہیں، جنت والے ہی کامیاب ہیں ۝)۔"

"اِنَّمَا یَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ": یعنی عقل والے ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ اور "التذکر" کا معنی ہے: نصیحت حاصل کرنا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "جو لوگ اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کرتے ہیں اور مضبوط عہد کو نہیں توڑتے ۝" (الرعد: ۲۰)

"اَلَّذِیْنَ یُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا یَنْقُضُوْنَ الْمِیْثَاقَ": "عهد الله" کی تفسیر میں دو قول ہیں:

(۱) جب اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکال کر جو عہد لیا تھا: "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ" (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں)" قَالُوْا بَلٰی" (سب نے کہا: کیوں نہیں! آپ ہمارے رب ہیں)۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کے کرنے کا بندوں کو حکم فرمایا اور جن کاموں کو اُن پر فرض فرما دیا۔

اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ جو لوگ صفاتِ حمیدہ سے متصف ہوں گے انہی کے لیے دارِ آخرت میں اچھا گھر ہے اور یہ دنیا میں عاقبت محمودہ ہے اور آخرت میں نصرت ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کرتے ہیں اور پختہ عہد کو نہیں توڑتے اور وہ ان منافقین کی طرح نہیں ہیں کہ جب وہ کسی سے عہد کرتے ہیں تو توڑ دیتے ہیں اور جب کسی سے جھگڑا کرتے ہیں تو بدزبانی کرتے ہیں اور جب بات کرتے ہیں تو جھوٹ بولتے ہیں اور جب اُن کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "جو لوگ اُن سے میل جول قائم رکھتے ہیں جن سے اللہ نے میل جول قائم رکھنے کا حکم فرمایا ہے اور وہ اپنے رب سے ڈرتے رہتے ہیں اور حساب کی سختی سے ڈرتے ہیں O" (الرعد: ۲۱)

رشتہ داروں سے میل جول قائم رکھنے کا حکم

علامہ ابواللیث سمرقندی حنفی متوفی ۳۷۵ھ لکھتے ہیں:

"وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہودیوں کو حکم فرمایا گیا تھا کہ وہ تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان لائیں، سو وہ بعض نبیوں پر ایمان لائے اور بعض نبیوں پر ایمان نہیں لائے، اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "جس کو اللہ نے ملانے کا حکم دیا تھا اس کو کاٹ ڈالتے ہیں" اور ان کو حکم فرمایا گیا تھا کہ قرابت داروں کے ساتھ میل جول رکھیں اور وہ قرابت داروں کے رشتوں کو کاٹ دیتے تھے۔ (تفسیر السمرقندی ج ۱ ص ۱۰۵، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۳ھ)

اللہ تعالیٰ نے یہ حکم فرمایا تھا کہ وہ رشتہ داروں سے ملاپ رکھیں اور اُن کے ساتھ حسنِ سلوک کریں اور فقراء کے ساتھ حسنِ سلوک کریں اور ضرورت مندوں پر اُن کی ضرورت کے مطابق خرچ کریں۔ "وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ": اور جن کاموں کو وہ کرتے ہیں اور جن کاموں کو وہ ترک کرتے ہیں اور ان میں اپنے رب سے ڈرتے رہتے ہیں۔ "وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ": اور آخرت میں حساب کی سختی سے ڈرتے ہیں، اسی وجہ سے ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ تمام کاموں میں مستقیم رہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب کی رضا طلب کرتے ہوئے صبر کیا اور نماز قائم رکھی اور ہمارے عطا فرمائے ہوئے مالوں میں سے پوشیدہ طور پر اور ظاہراً خرچ کیا، اور جو لوگ برائی کا جواب اچھائی سے دیتے ہیں، انہی کے لیے آخرت میں اچھا انجام ہے O" (الرعد: ۲۲)

"وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا": یعنی جن لوگوں نے اپنے رب کے حکم پر عمل کرنے میں صبر کیا ہے۔ "ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ": یعنی اپنے رب کی رضامندی کو طلب کرتے ہوئے۔ "وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ": اور تمام نمازوں کو مکمل پڑھا۔

"وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً": اور ہم نے جو ان کو اموال عطا فرمائے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ نماز سے مراد پانچ وقت کی نمازیں ہیں اور خرچ کرنے سے مراد ہے زکوٰۃ کو ادا کرنا۔

یعنی جن لوگوں نے محارم سے اجتناب کیا اور گناہوں سے دور رہے اور اللہ عزوجل کی رضا جوئی کے لیے گناہوں سے بچتے رہے ان کے لیے عظیم ثواب ہے اور انہوں نے نمازوں کو اپنے اوقات میں پڑھا اور رکوع کیا اور سجدہ کیا اور خضوع وخشوع کیا اور شرعی احکام کے مطابق نمازیں پڑھیں اور جن لوگوں پر خرچ کرنے کو ہم نے واجب فرمایا ہے ان پر اپنے اموال کو خرچ کیا اپنی بیویوں پر اور اپنے رشتہ داروں پر اور اجنبی فقراء پر اور محتاجوں اور مسکینوں پر پوشیدہ طور پر بھی خرچ کیا اور ظاہراً بھی خرچ کیا۔ اور کوئی حال ان کو اس خرچ کرنے سے روکتا نہیں تھا۔ "وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ": اس آیت سے مراد میں پانچ اقوال ہیں:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ وہ نیک عمل کر کے برے عمل کو دور کرتے ہیں۔

(۲) سعید بن جبیر نے کہا: وہ بھلائی کر کے برائی کو روکتے ہیں۔

(۳) ابن قتیبہ نے کہا: جو جہالت کا جواب بردباری سے دے، گویا کہ جب ان کے اوپر جہالت سے برا کام کیا گیا تو انہوں نے حلم سے برداشت کیا۔

(۴) ابن کیسان نے کہا: جو گناہ کرنے کے بعد توبہ کرے۔

(۵) جو یبر نے کہا: ان پر کوئی ظلم کرے تو وہ معاف کر دیتے ہیں۔

برائی کا جواب بھلائی سے دینا

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا تو آپ نے مجھ سے فرمایا: اے عقبہ بن عامر! جو تم سے تعلق توڑے، تم اس سے تعلق جوڑو، اور جو تم کو محروم کرے تم اس کو عطا کرو اور جو تم پر ظلم کرے تم اس کو معاف کردو۔

(مسند احمد: ۱۷۳۵۲، شعب الایمان للبیہقی: ۷۵۸۵، الجامع الصحیح للسنن والمسانید: ج ۹ ص ۲۸۰، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشر، ج ۲ ص ۲۲۰)

شیخ سعدی نے کہا ہے۔

بدی را بدی سہل باشد جزا
اگر مردی احسن الی من اسا

ترجمہ: برائی کا جواب برائی سے دینا آسان ہے، اگر تم میں مردانگی ہے تو اس سے اچھا سلوک کرو جس نے تمہارے ساتھ برا سلوک کیا ہے۔

یعنی جو لوگ برائی کو اچھائی سے دور کرتے ہیں، جب کوئی شخص ان کو ایذاء پہنچائے تو وہ اس کے مقابلہ میں صبر کرتے ہیں اور برداشت کرتے ہیں اور درگزر کرتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝" (حم السجدہ: ۳۴-۳۵) (نیکی اور بدی برابر نہیں ہیں، اے مخاطب! برائی کو اچھائی کے ساتھ دور کرو تب وہ شخص جو تمہارا دشمن تھا اس طرح ہو جائے گا جیسے وہ پکا دوست ہو ۝ یہ خصلت صرف صبر کرنے والوں کو عطا فرمائی جاتی ہے اور یہ خوبی صرف بہت بڑے خوش نصیب کو عطا فرمائی جاتی ہے ۝)۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے متعلق فرمایا جو ان صفات محمودہ کے حامل تھے: "اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ"۔ پھر اس کے

بعد والی آیت میں " عُقْبَى الدَّارِ " کی تفسیر فرمائی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: " وہ ہمیشگی کی جنتیں ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے اور ان کے آباء میں سے اور ان کی بیویوں میں سے اور ان کی اولادوں میں سے جو نیک ہوں گے اور فرشتے ان کے پاس ہر دروازہ سے داخل ہوں گے O" (الرعد: ۲۳)

" جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا ": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اُن کے " عُقْبَى الدَّارِ " سے مراد ہے کہ انجام کار اُن کو جنت میں گھر عطا فرمایا جائے گا۔ " وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ ": اور اُن لوگوں کو بھی جو ایمان والے ہیں، اور جن کے آباء و اجداد اور اُن کی بیویاں اور اُن کی اولاد میں سے جو مومنین ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ مومن کے ساتھ اس کے گھر والوں میں سے ایمان والوں کو ملا دیں گے تاکہ مومن کی تعظیم ہو اور اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔

" جنت عدن " کا مصداق

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جنت میں ایک محل ہے جس کو " عدن " کہتے ہیں، اس کے گرد بروج ہیں اور مروج ہیں۔ (بروج کے معنی ہیں: قلعہ، گنبد، محل، مینار، اور مروج کے معنی ہیں: چراگاہیں)۔ اور اس کے پانچ ہزار دروازے ہیں۔ اور انہوں نے کہا: اس جنتِ عدن میں صرف نبی داخل ہوں گے یا صدیق یا شہید۔ اور الضحاک نے کہا کہ " جنات عدن " سے مراد جنت کے شہر ہیں، جس میں رسول ہوں گے اور انبیاء ہوں گے اور شہداء ہوں گے اور ائمہ مجتہدین ہوں گے۔ اور اس کے بعد جو اس کے گرد جنتیں ہیں، اس میں دوسرے مومنین ہوں گے۔ (تفسیر الطبری ج ۱۳ ص ۵۱۲، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۳۴ھ)

" وَالْمَلٰٓىِٕكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: فرشتے ہر دروازہ سے اُن کو سلام پڑھتے ہوئے اور اُن کو ہدیے اور تحفے دیتے ہوئے داخل ہوں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: " (وہ یہ کہیں گے:) تم پر سلام ہو کیونکہ تم نے صبر کیا، سو آخرت کا یہ گھر کتنا اچھا ہے O" (الرعد: ۲۴)

" سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ": " سَلٰمٌ " کی تفسیر میں ابن الانباری نے کہا: اس سے مراد معروف سلام ہے، فرشتہ داخل ہوگا اور اہلِ جنت پر سلام پڑھے گا اور لوٹ جائے گا۔

اور مسلمان جو جواب میں کہے گا: " سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ " اس کی تفسیر میں دو قول ہیں:

(۱) ایک قول یہ ہے کہ السلام کا مصداق اللہ عزوجل ہیں اور اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تمہارے محافظ ہیں۔

(۲) اس کا معنی ہے تم پر سلامتی ہو، پس تم پر ہر طرف سے سلامتی ہو۔ اور اس کا یہ معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو قیامت کے ہولناک مناظر سے محفوظ رکھا اور قیامت کے شر سے تم کو محفوظ رکھا کیونکہ تم نے دنیا میں مصائب پر صبر کیا تھا۔

اور انہوں نے جو صبر کیا تھا، اس کے متعلق پانچ اقوال ہیں:

(۱) سعید بن جبیر نے کہا: انہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنے کی مشقت پر صبر کیا تھا۔ (۲) حسن بصری نے کہا: دنیا کی

فضول چیزوں کے ترک کرنے پر صبر کیا۔ (۳) دین پر صبر کیا۔ (۴) فقر پر صبر کیا، یہ دونوں قول عمران الجونی سے منقول ہیں۔ (۵) ابن زید نے کہا: انہوں نے اپنی پسندیدہ چیز کے گم ہونے پر صبر کیا۔

جن صابرین کو جنت کے ہر دروازہ سے سلام کیا جائے گا، ان کے متعلق احادیث

(۱) حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے سب سے پہلے جنت میں کون داخل ہوگا؟ لوگوں نے کہا: اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ جاننے والے ہیں، آپ نے فرمایا: اللہ عزوجل کی مخلوق میں سے سب سے پہلے جنت میں فقراء مہاجرین داخل ہوں گے جن سے سرحدوں کی حفاظت کی جاتی ہے اور جن سے مصائب دور کیے جاتے ہیں، ان میں سے کوئی ایک شخص مرجاتا ہے اور اس کی حاجت اس کے سینہ میں ہوتی ہے، وہ اپنی اس حاجت کو پورا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، پس اللہ تعالیٰ فرشتوں میں سے جس سے چاہیں فرماتے ہیں: انہیں بلاؤ اور ان کی تعظیم کرو، پس فرشتے کہیں گے: ہم آپ کے آسمانوں میں رہنے والے ہیں اور آپ کی مخلوق میں سب سے افضل ہیں، کیا آپ ہمیں یہ حکم فرماتے ہیں کہ ہم ان لوگوں کے پاس جائیں اور ان کو سلام عرض کریں، تو اللہ عزوجل فرمائیں گے کہ یہ میرے وہ بندے ہیں جو میری عبادت کرتے تھے اور میرے ساتھ بالکل شرک نہیں کرتے تھے، ان سے سرحدوں کی حفاظت کی جاتی تھی اور ان کی وجہ سے مصائب کو دور کیا جاتا تھا اور ان میں سے کوئی اس حال میں مرجاتا کہ اس کی حاجت اس کے سینہ میں ہوتی اور وہ اس کو پورا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا، پھر فرشتے ان کے پاس آئیں گے اور ہر دروازہ سے داخل ہوں گے اور کہیں گے: "سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ"۔

(مسند احمد: ۶۵۷۰، السنۃ لابن ابی عاصم: ۷۵۰، مسند عبد بن حمید "المنتخب": ۳۵۲، حلیۃ الاولیاء لابی نعیم ج ۱ ص ۳۴۷، مسند البزار: ۳۶۶۵، صحیح ابن حبان: ۷۴۲۱، کتاب البعث للبیہقی: ۳۱۴، مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۲۵۹، صحیح مسلم: ۲۹۷۹ میں حضرت عبد اللہ بن عمرو سے منقول ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ فقراء مہاجرین مال داروں سے چالیس سال پہلے قیامت کے دن جنت میں داخل ہوں گے، مسند احمد: ۶۵۷۸)

اس حدیث میں مذکور ہے: ان لوگوں سے سرحدوں کی حفاظت کی جاتی ہے، یعنی مسلمانوں اور کفار کے درمیان جو سرحد ہوتی ہے یہ وہاں پر پہرہ دیتے ہیں حتیٰ کہ کفار بلاد اسلام کی سرحدوں میں داخل نہیں ہوسکتے۔

امام محمد بن عمر الواقدی متوفی ۲۰۷ھ بیان کرتے ہیں:

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال شہداء احد کی قبروں کی زیارت کرتے تھے، جب آپ گھاٹی میں داخل ہوتے تو بآواز بلند فرماتے: "سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ" پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہر سال اسی طرح کرتے تھے، پھر حضرت عمر بن الخطاب ہر سال اسی طرح کرتے تھے، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ۔

(کتاب المغازی ج ۱ ص ۳۱۳، مطبوعہ عالم الکتب، بیروت، ۱۴۰۳ھ، دلائل النبوۃ ج ۳ ص ۳۰۸، مطبوعہ بیروت، شرح الصدور ص ۲۱۰، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۰۳ھ، مصنف عبد الرزاق ج ۳ ص ۵۷۳، طبع قدیم، رقم الحدیث: ۶۷۴۵، عون المعبود و حاشیہ ابن القیم ج ۶ ص ۲۵، عمدۃ القاری ج ۸ ص ۷۰، تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۵۷۹)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور جو لوگ اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پختہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور جن سے

اللہ تعالیٰ نے میل جول رکھنے کا حکم فرمایا ہے ان سے تعلق کو قطع کرتے ہیں اور زمین میں فساد کرتے ہیں، انہی لوگوں پر لعنت ہے اور انہی کے لیے سخت حساب ہےO" (الرعد: ۲۵)

"وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ":

اس آیت کی تفسیر الرعد: ۲۱ میں گزر چکی ہے۔

مقاتل نے کہا: یہ آیت اہل کتاب کے کفار کے متعلق نازل ہوئی ہے اور انہی کے متعلق ہے: "اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ" یعنی اُن کفار پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔

یہ اُن اشقیاء کا اور اُن کی صفات کا حال ہے، اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے کہ آخرت میں اُن کا حال مومنین کے حال کے خلاف ہوگا، جس طرح دنیا میں اُن کی صفات مومنین کی صفات کے خلاف تھیں، پس مومنین اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرتے تھے اور جن کو اللہ تعالیٰ نے ملانے کا حکم فرمایا ہے ان کو ملاتے تھے اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد کو توڑتے تھے۔ اور جن کو اللہ تعالیٰ نے ملانے کا حکم فرمایا ہے ان کو قطع کرتے تھے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ منافق کی تین نشانیاں ہیں: (۱) جب بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے (۲) جب وعدہ کرتا ہے تو اس کے خلاف کرتا ہے (۳) اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو وہ اس میں خیانت کرتا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ جب وہ عہد کرتا ہے تو اس عہد کو توڑ دیتا ہے اور جب جھگڑا کرتا ہے تو بدزبانی کرتا ہے، اسی لیے فرمایا ہے: "اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ": یعنی ان کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور کیا جائے گا۔ "وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ" اور ان کے لیے برا انجام ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اللہ جس کے لیے چاہتے ہیں رزق کو کشادہ فرما دیتے ہیں اور جس کے لیے چاہتے ہیں تنگ فرما دیتے ہیں اور کفار دنیا کی زندگی پر اِترا رہے ہیں، اور آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی صرف معمولی سامان ہےO" (الرعد: ۲۶)

"اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ": یعنی اللہ تعالیٰ جس پر چاہتے ہیں اس پر رزق کو وسیع فرما دیتے ہیں اور جس پر چاہتے ہیں رزق کو تنگ فرما دیتے ہیں۔ "وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد مشرکین مکہ ہیں، ان کو دنیا کا جو مال ملا وہ اس پر خوش ہو گئے، پس انہوں نے سرکشی کی اور رسولوں کی تکذیب کی۔ "وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ": یعنی دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں بہت معمولی ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ وہ جس پر چاہتے ہیں رزق کو وسیع فرما دیتے ہیں اور جس پر چاہتے ہیں رزق کو تنگ فرما دیتے ہیں، اور یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور ان کے عدل کے تقاضا سے ہوتا ہے۔ اور کفار کو دنیا کی زندگی میں ڈھیل دی جاتی ہے اور مہلت دی جاتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ۝ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝ (المؤمنون: ۵۵-۵۶)" (کیا وہ کافر یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم جو مال اور بیٹوں سے ان کی مدد فرما رہے ہیںO تو انہیں جلد از جلد بھلائی پہنچا رہے ہیں؟ بلکہ انہیں اس کی حقیقت کا شعور ہی نہیں ہےO)۔

متاعِ دنیا کے کم حیثیت ہونے کے متعلق احادیث

"وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ": مستورد بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی قسم! دنیا آخرت کے مقابلہ میں اس طرح ہے جیسے تم میں سے کوئی ایک آدمی اپنی اس انگلی کو دریا میں ڈالے، پس دیکھے کہ اس انگلی پر کتنا پانی ہوتا ہے۔

(صحیح مسلم: ۲۸۵۸، مسند احمد: ۱۸۰۰۸، ۱۸۰۰۹، مسند ابن ابی شیبہ: ۷۷۷، شرح السنۃ للبغوی: ۴۰۲۵، مسند الشہاب القضاعی ۱۳۸۶، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشرۃ ج ۳ ص ۳۹)

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بازار میں داخل ہوئے اور لوگوں نے آپ کو گھیرا ہوا تھا، پس آپ ایک چھوٹے کان والے مُردار بکری کے بچے کے پاس سے گزرے، آپ نے اس کو اٹھایا اور اس کا کان پکڑ کر فرمایا: کیا تم میں سے کوئی شخص اس مُردار بکری کے بچے کو ایک درہم کے عوض لینا پسند کرے گا؟ لوگوں نے کہا: ہم اس کو کسی چیز کے عوض لینا پسند نہیں کریں گے اور ہم اس کا کیا کریں گے، آپ نے فرمایا: کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ یہ مردار بکری کا بچہ تمہیں مل جائے، لوگوں نے کہا: اللہ کی قسم! اگر یہ بکری کا بچہ زندہ ہوتا تب بھی اس میں عیب تھا کیونکہ اس کے کان چھوٹے ہیں، تو اس کو کیسے لیا جائے گا جب کہ یہ مرچکا ہے، تو آپ نے فرمایا: اللہ کی قسم! اللہ کے نزدیک دنیا اس سے بھی کم تر ہے جتنا کم تر تمہارے نزدیک یہ چھوٹے کان والا مردار بکری کا بچہ ہے۔

(صحیح مسلم: ۲۹۵۷، کتاب الزہد والرقاق لابن المبارک: ۹۸۳، الادب المفرد: ۹۶۲، سنن ابوداؤد: ۱۸۶، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۶۶۰، شعب الایمان للبیہقی: ۶۲۸۶، کشف المشکل: ۱۳۳۱، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشرۃ ج ۱۸ ص ۲۸۹)

(زاد المسیر فی علم التفسیر ج ۴ ص ۳۹۲۔۳۹۳، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۳۱ھ، ومع تغیرات اخرٰی)

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ﴿۲۷﴾

اور کفار کہتے ہیں: "اس نبی پر اللہ کی طرف سے کوئی معجزہ کیوں نہیں نازل کیا گیا" (اے رسول اکرم!) آپ کہیے: اللہ جس کو چاہتے ہیں اسے گمراہی میں برقرار رکھتے ہیں اور اس کے لیے ہدایت پیدا فرماتے ہیں جو اُن کی طرف رجوع کرتا ہے ○

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾

جو لوگ ایمان لائے اور اُن کے دل اللہ کے ذکر سے مطمئن ہیں، سنو! اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو اطمینان ملتا ہے ○

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ﴿۲۹﴾

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے تو ان کے لیے آخرت میں بہترین زندگی ہے اور اچھا ٹھکانا ہے ○

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا۟ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ

إِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمٰنِ ۚ قُلْ هُوَ رَبِّي لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ مَتَابِ ﴿۳۰﴾

(اے رسول اکرم!) اسی طرح ہم نے آپ کو ایسی امت میں مبعوث فرمایا ہے جس سے پہلے بہت سی امتیں گزر چکی ہیں تاکہ آپ اُن کے سامنے اُن آیات کو پڑھ کر سنائیں جن کی ہم نے آپ کی طرف وحی فرمائی ہے حالانکہ وہ لوگ رحمٰن کا انکار کرتے ہیں، آپ کہیے: وہی میرے رب ہیں، ان کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، انہی پر میں نے توکل کیا ہے اور انہی کی طرف میرا لوٹنا ہے O

وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ أَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتَىٰ ۗ بَلْ لِلّٰهِ الْأَمْرُ جَمِيعًا ۗ أَفَلَمْ يَيْأَسِ الَّذِينَ آمَنُوا أَنْ لَوْ يَشَاءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيعًا ۗ وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا تُصِيبُهُمْ بِمَا صَنَعُوا قَارِعَةٌ أَوْ تَحُلُّ قَرِيبًا مِنْ دَارِهِمْ حَتَّىٰ يَأْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ﴿۳۱﴾

اور اگر کوئی ایسا قرآن نازل فرمایا جاتا جس کی وجہ سے پہاڑ چل پڑتے یا زمین پھاڑ دی جاتی یا مُردوں کی لوگوں سے باتیں کرا دی جاتیں (پھر بھی یہ لوگ ایمان نہ لاتے)، بلکہ تمام معاملات اللہ ہی کے اختیار میں ہیں، کیا ایمان والے اس سے مطمئن نہیں ہوئے کہ اگر اللہ چاہیں تو سب لوگوں کو ہدایت یافتہ بنا دیں، اور کفار پر ہمیشہ اُن کے کرتوتوں کے بدلہ میں مصائب آتے رہیں گے یا اُن کے مکانات کے قریب اترتے رہیں گے حتیٰ کہ اللہ کا وعدہ آ جائے گا، بے شک اللہ وعدہ کے خلاف نہیں فرماتے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور کفار کہتے ہیں: ''اس نبی پر اللہ کی طرف سے کوئی معجزہ کیوں نہیں نازل کیا گیا'' (اے رسول اکرم!) آپ کہیے: اللہ جس کو چاہتے ہیں اسے گمراہی میں برقرار رکھتے ہیں اور اس کے لیے ہدایت پیدا فرماتے ہیں جو اُن کی طرف رجوع کرتا ہے O'' (الرعد: ۲۷)

علامہ ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ، الرعد: ۲۷ تا ۳۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا'': یعنی اہلِ مکہ میں سے کفار نے کہا: ''لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ ۗ قُلْ إِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ'': (اس نبی پر اللہ کی طرف سے کوئی معجزہ کیوں نہیں نازل کیا گیا'' (اے رسول اکرم!) آپ کہیے: اللہ جس کو چاہتے ہیں اسے گمراہی میں برقرار رکھتے ہیں اور اس کے لیے ہدایت پیدا فرماتے ہیں جو اُن کی طرف رجوع کرتا ہے)۔ یعنی اللہ اس کو ہدایت دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا چاہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ اللہ اپنے دین کی طرف اس کو ہدایت دیتے ہیں جو دل سے دین کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

یعنی مشرکین مکہ یہ کہتے ہیں کہ اس نبی کے اوپر ان کے رب کی طرف سے کوئی معجزہ کیوں نہیں نازل کیا گیا، پس جیسا کہ پہلے رسولوں نے معجزات پیش کیے تھے، یہ بھی ہمارے پاس کوئی معجزہ لے کر آتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اُن کے مطالبہ کو پورا کرنے پر اللہ عزوجل قادر ہیں، اور حدیث میں ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل فرمائی جب مشرکین مکہ نے کہا کہ اُن کے لیے صفا پہاڑ کو سونے کا بنا دیا جائے یا اُن کے لیے چشموں کو جاری کر دیا جائے، یا مکہ کے گرد سے پہاڑوں کو اٹھا کر چراگاہ اور باغات بنا دیے جائیں تو اللہ عزوجل نے فرمایا: اے محمد! اگر آپ چاہیں تو ہم ان کو اس سے بھی بڑے معجزات عطا فرما دیں، پھر اگر انہوں نے کفر کیا تو میں اُن کو ایسا عذاب دوں گا کہ تمام جہانوں میں سے کسی کو ایسا عذاب نہیں دیا گیا ہوگا، اور اگر آپ چاہیں تو میں ان کے اوپر توبہ اور رحمت کا دروازہ کھول دیتا ہوں، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلکہ آپ ان کے اوپر توبہ اور رحمت کا دروازہ کھول دیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرمایا: "قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ"، یعنی وہی گمراہی پر برقرار رکھنے والے ہیں اور وہی ہدایت عطا فرمانے والے ہیں خواہ رسول کو اُن کے مطالبہ کے مطابق معجزات دے کر بھیجا جائے یا اُن کے مطالبہ کے مطابق معجزات دے کر نہ بھیجا جائے، کیونکہ ہدایت پانا اور گمراہی پر برقرار رہنا معجزات کے وجود اور عدم پر موقوف نہیں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (یونس:۱۰۱)" (اور ایمان نہ لانے والوں کو عذاب کی وعیدیں کچھ فائدہ نہیں دیں گی ۝)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب قریش مکہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ ہمارے لئے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہمارے لیے صفا پہاڑ کو سونے کا بنا دیں تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے، آپ نے فرمایا: کیا تم ایمان لے آؤ گے؟ انہوں نے کہا: ہاں، پھر آپ کے پاس حضرت جبریل علیہ السلام آئے اور کہا: بے شک آپ کے رب آپ پر سلام بھیجتے ہیں اور فرماتے ہیں: اگر آپ چاہیں تو میں ان کے لیے صفا پہاڑ کو سونے کا بنا دوں گا لیکن اگر انہوں نے پھر کفر کیا تو پھر میں ان پر ایسا عذاب نازل فرماؤں گا کہ کسی کے لیے بھی ایسا عذاب نہیں بھیجا ہوگا، اور اگر آپ چاہیں تو میں ان کے لیے توبہ اور رحمت کا دروازہ کھول دیتا ہوں، آپ نے فرمایا: بلکہ آپ ان کے لیے توبہ اور رحمت کا دروازہ کھول دیجئے۔

(مسند احمد:۲۱۶۶، ۳۲۲۳، ۳۳۳۳، مسند عبد بن حمید:۷۰۰، المعجم الکبیر للطبرانی:۱۲۷۳۶، دلائل النبوۃ للبیہقی ج۲ ص۲۷۲)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "جو لوگ ایمان لائے اور اُن کے دل اللہ کے ذکر سے مطمئن ہیں، سنو! اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو اطمینان ملتا ہے ۝" (الرعد:۲۸)

"اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَىِٕنُّ": یعنی سکون پاتے ہیں۔

"قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ": مقاتل نے کہا: قرآن مجید کی تلاوت سے سکون پاتے ہیں اور سکون یقین سے ہوتا ہے اور اضطراب شک کی وجہ سے ہوتا ہے۔

"اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ": یعنی مومنوں کے دل اللہ تعالیٰ پر یقین کے ساتھ سکون پاتے ہیں۔

الانفال:۲ اور الرعد:۲۸ میں تعارض کا جواب

یہاں پر یہ سوال ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ۝ (الانفال:۲)" (مومن صرف وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو اُن کے دل خوف زدہ ہو جائیں اور جب اُن کے سامنے اللہ کی آیات کی تلاوت کی جائے تو اُن کا ایمان زیادہ ہو جائے اور وہ صرف اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں O)۔

الانفال:۲ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے مومنین کے دل خوف زدہ ہو جاتے ہیں اور الرعد:۲۸ سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ذکر سے مومنوں کے دل سکون پاتے ہیں، تو ایک ہی چیز سے دلوں کو سکون بھی ہو اور دل خوف زدہ بھی ہوں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی وعید اور ان کے عذاب کے نزول کا ذکر ہو تو دل خوف زدہ ہوتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ کے وعدۂ ثواب کا ذکر ہو تو پھر دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ پس جب اللہ تعالیٰ کے عدل کا ذکر کیا جائے اور ان کے حساب کی شدت کا ذکر کیا جائے تو دل خوف زدہ ہو جاتا ہے، اور جب اللہ تعالیٰ کے فضل اور ان کے کرم کا ذکر کیا جائے تو دل پر سکون ہو جاتا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے تو ان کے لیے آخرت میں بہترین زندگی ہے اور اچھا ٹھکانا ہے O" (الرعد:۲۹)

"اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰی لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ":

"طُوْبٰی" کی تفسیر میں متعدد آثار اور احادیث

"طُوْبٰی لَهُمْ" کی تفسیر میں اختلاف ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اُن کے لیے جنت میں خوشی ہوگی اور اُن کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہوگی۔

عکرمہ نے کہا: اُن کا مال بہت اچھا ہوگا۔ قتادہ نے کہا کہ عرب والے جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں "طُوْبٰی لَكَ" یعنی تجھے خیر حاصل ہو۔

اور سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ حبشی زبان میں طوبیٰ جنت کا نام ہے اور الربیع نے کہا: یہ ہند کی زبان میں باغ کا نام ہے۔

اور حضرت ابو امامہ، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہم نے بیان کیا کہ "طُوْبٰی" جنت میں ایک درخت ہے، وہ اتنا بڑا درخت ہے کہ اس کے سائے میں تمام درخت ہوتے ہیں، اور عبید بن عمیر نے کہا: یہ جنت عدن میں ایک درخت ہے، اس کی جڑ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں ہے اور جنت کے ہر گھر میں اور ہر بالا خانہ میں اس کی شاخیں پھیلی ہوئی ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے جو بھی رنگ اور تر و تازگی پیدا فرمائی ہے وہ اس میں ہے سوائے سیاہی کے۔ اور اللہ تعالیٰ نے کوئی میوہ اور کوئی پھل پیدا نہیں فرمایا مگر وہ اس درخت میں ہے، اس کی جڑ سے دو چشمے نکلتے ہیں الکافور اور السلسبیل۔ اور مقاتل نے کہا: اس کا ہر پتا پوری امت پر سایا کرتا ہے، اس کے اوپر ایک فرشتہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی متعدد اقسام کی تسبیح کرتا رہتا ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ "طُوبیٰ" کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: وہ جنت میں ایک بہت بڑا درخت ہے، اس کا سایا ایک سو سال کی مسافت ہے، اور اہل جنت کے کپڑے اس کے غلافوں سے نکلتے ہیں۔ (مسند ابو یعلیٰ: ۱۳۷۴، تاریخ بغداد للخطیب ج ۴ ص ۹۱)

حضرت معاویہ بن قرۃ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "طُوبیٰ" ایک درخت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دست مبارک سے اگایا ہے اور اس میں اپنی پسندیدہ روح ڈال دی ہے، وہ زیورات اور حلّوں کو اگاتا ہے اور اس کی شاخیں جنت کی چار دیواری سے دکھائی دیتی ہیں۔ (اس حدیث کی امام طبری نے روایت کی ہے اور اس کی سند ضعیف ہے۔)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جنت میں ایک ایسا درخت ہے کہ کوئی سوار اس کے سائے میں سو سال تک چلتا رہے، پھر بھی وہ سایا ختم نہیں ہوگا اور اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھو: "وَّ ظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ۝" (الواقعہ: ۳۰) "(اور پھیلے ہوئے لمبے سایوں میں ۝)۔ (صحیح البخاری: ۳۲۵۲، ۴۸۸۱)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "(اے رسول اکرم!) اسی طرح ہم نے آپ کو ایسی امت میں مبعوث فرمایا ہے جس سے پہلے بہت سی امتیں گزر چکی ہیں تاکہ آپ اُن کے سامنے اُن آیات کو پڑھ کر سنائیں جن کی ہم نے آپ کی طرف وحی فرمائی ہے حالانکہ وہ لوگ رحمٰن کا انکار کرتے ہیں، آپ کہیے: وہی میرے رب ہیں، ان کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، انہی پر میں نے توکل کیا ہے اور انہی کی طرف میرا لوٹنا ہے ۝" (الرعد: ۳۰)

"كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ": یعنی جس طرح ہم نے پہلے انبیاء علیہم السلام کو اُن کی امتوں کی طرف مبعوث فرمایا، اسی طرح ہم نے آپ کو بھی امت کی طرف مبعوث فرمایا۔ "قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ": یعنی وہ امتیں گزر چکی ہیں اور اُن سے پہلے بھی امتیں گزر چکی ہیں۔

"رحمٰن" کے انکار کے متعلق متعدد احادیث

"لِّتَتْلُوَا۟ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ": تاکہ آپ اُن پر اُن آیات کی تلاوت کریں جو ہم نے آپ کی طرف نازل فرمائی ہیں حالانکہ وہ لوگ رحمٰن کا کفر اور انکار کرتے ہیں۔

قتادہ، مقاتل اور ابن جریج نے کہا ہے: یہ آیت مدنی ہے، یہ صلح حدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئی، اس کی وجہ یہ ہے کہ سہیل بن عمرو جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور سب نے اس پر اتفاق کر لیا کہ ایک صلح نامہ لکھا جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: "لکھو بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" تو کفار نے کہا: ہم صرف اسی رحمٰن کو جانتے ہیں جو صاحب الیمامہ ہے، ان کی مراد تھی مسیلمہ کذاب، آپ اسی طرح لکھیں جس طرح پہلے لکھتے تھے "باسمك اللهم" اور یہ اس آیت کا معنی ہے: "وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ" یعنی وہ رحمٰن کا کفر اور انکار کرتے ہیں۔

یہ حدیث ضعیف ہے۔ طبری: ۲۰۳۹۶ میں یہ حدیث قتادہ سے مرسلاً مروی ہے، لیکن اس کے اندر جو رحمٰن کے کفر کا ذکر ہے اس کی روایت مجاہد نے مرسلاً کی ہے اور اصل واقعہ حدیث صحیح میں ہے۔

نیز حدیث میں ہے کہ ابوجہل نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا اور آپ مقام حِجر میں یوں دعا فرما رہے تھے:

یااللہ یا رحمٰن تو وہ مشرکین کی طرف گیا اور کہا کہ محمد دو خداؤں کو پکارتے ہیں، ایک اللہ اور دوسرا رحمٰن، اور ہم تو صرف اسی رحمٰن کو جانتے ہیں جو رحمٰن یمامہ ہے، اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی، اور یہ آیت بھی نازل ہوئی: "قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ـــــ (بنی اسرائیل:۱۱۰)" (آپ کہیے: اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو خوب ہے، کیونکہ ان کے بہت سے اچھے اچھے نام ہیں)۔

الضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ یہ آیت کفار قریش کے متعلق اس موقع پر نازل ہوئی جب اُن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسجدوا للرحمن "، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۗ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ۩ (الفرقان:۶۰)" (اور جب کفار مکہ کو کہا جاتا ہے "رحمٰن کو سجدہ کرو" تو کہتے ہیں: "رحمٰن کیا چیز ہے؟ کیا ہم اسے سجدہ کریں جسے سجدہ کرنے کا تم ہمیں حکم دیتے ہو؟ اور اس بات نے ان کی نفرت میں اضافہ کر دیا O)۔

"قُلْ هُوَ رَبِّیْ" اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ ان سے کہیے: اے محمد! رحمٰن وہ ہیں جن کی معرفت کا تم (مشرکین مکہ) انکار کرتے ہو اور وہ میرے رب ہیں۔ "لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَیْهِ مَتَابِ": انہی پر میں نے توکل کیا ہے اور انہی کی طرف میرا لوٹنا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اگر کوئی ایسا قرآن نازل کیا جاتا جس کی وجہ سے پہاڑ چل پڑتے یا زمین پھاڑ دی جاتی یا مُردوں کی لوگوں سے باتیں کرا دی جاتیں (پھر بھی یہ لوگ ایمان نہ لاتے)، بلکہ تمام معاملات انہی کے اختیار میں ہیں، کیا ایمان والے اس سے مطمئن نہیں ہوئے کہ اگر اللہ چاہیں تو سب لوگوں کو ہدایت یافتہ بنا دیں، اور کفار پر ہمیشہ اُن کے کرتوتوں کے بدلہ میں مصائب آتے رہیں گے یا اُن کے مکانات کے قریب اترتے رہیں گے حتیٰ کہ اللہ کا وعدہ آ جائے گا، بے شک اللہ وعدہ کے خلاف نہیں فرماتے O" (الرعد:۳۱)

"وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُیِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ":

یہ آیت مشرکین مکہ کی ایک جماعت کے متعلق نازل ہوئی ہے جن میں ابوجہل بن ہشام اور عبداللہ بن ابی امیہ بھی تھے، وہ لوگ کعبہ کے پیچھے بیٹھ گئے، آپ اُن کے پاس تشریف لائے، پس آپ سے عبداللہ بن ابی امیہ نے کہا: اگر آپ کو ہماری پیروی کرنے کی خوشی ہو تو مکہ کے پہاڑوں کو قرآن کے ساتھ چلا کر دکھائیں اور مکہ کے پہاڑوں کو ہم سے دور کر دیں حتیٰ کہ یہ جگہ وسیع ہو جائے کیونکہ یہ جگہ ہماری کھیتی باڑی کے لیے تنگ ہے اور ہمارے لیے اس سرزمین میں چشمے اور دریا بنا دیں تاکہ ہم اس سے درختوں کو سیراب کریں اور کھیتی باڑی کریں، اور ہمارے لیے باغات بنائیں، پس جیسا کہ آپ کا خیال ہے آپ کا مرتبہ آپ کے رب کے نزدیک حضرت داؤد علیہ السلام سے کم تو نہیں ہے، کیونکہ ان کے لیے پہاڑوں کو مسخر فرما دیا گیا تھا اور پہاڑ ان کے ساتھ تسبیح کرتے تھے، یا آپ ہمارے لیے ہواؤں کو مسخر کر دیں، ہم اُن ہواؤں کے دوش پر شام کے سفر پر جائیں اور اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے جائیں اور ایک ہی دن میں واپس آ جائیں، کیونکہ آپ کا کہنا یہ ہے کہ ہواؤں کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے مسخر فرما دیا گیا تھا، تو آپ کا مرتبہ آپ کے رب کے نزدیک حضرت سلیمان علیہ السلام سے کم تو نہیں ہے، یا ہمارے لیے اپنے دادا قُصَی کو زندہ کر دیں، یا اور

ہمارے آباء میں سے جس کو چاہیں زندہ کردیں اور مزید مردوں کو زندہ کریں تا کہ ہم اُن سے معلوم کریں کہ آپ کا دین حق ہے یا نہیں، کیونکہ آپ نے بتایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے اور آپ کا مرتبہ آپ کے رب کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کم تو نہیں ہے؟ تب اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: ”وَ لَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُیِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰىؕ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِیْعًاؕ اَفَلَمْ یَایْــٴَـسِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِیْعًاؕ وَ لَا یَزَالُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا تُصِیْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِیْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى یَاْتِیَ وَعْدُ اللّٰهِؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ“ (اور اگر کوئی ایسا قرآن نازل کیا جاتا جس کی وجہ سے پہاڑ چل پڑتے یا زمین پھاڑ دی جاتی یا مُردوں کی لوگوں سے باتیں کرادی جاتیں (پھر بھی یہ لوگ ایمان نہ لاتے)، بلکہ تمام معاملات اسی کے اختیار میں ہیں، کیا ایمان والے اس سے مطمئن نہیں ہوئے کہ اگر اللہ چاہتا تو سب لوگوں کو ہدایت یافتہ بنادیں، اور کفار پر ہمیشہ اُن کے کرتوتوں کے بدلے میں مصائب آتے رہیں گے یا اُن کے مکانات کے قریب اترتے رہیں گے حتی کہ اللہ کا وعدہ آجائے گا، بے شک اللہ وعدہ کے خلاف نہیں فرماتے)۔

یعنی یہ لوگ رحمٰن کا کفر کرتے ہیں اور اگر ان کے لیے روئے زمین کو قطع کردیا جاتا یا مُردے بھی ان سے بات کرتے تب بھی یہ رحمٰن کا انکار کرتے اور ایمان نہیں لاتے، کیونکہ ان کے متعلق ہم کو ازل میں علم ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ”وَ لَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَاۤ اِلَیْهِمُ الْمَلٰٓىٕكَةَ وَ كَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَ حَشَرْنَا عَلَیْهِمْ كُلَّ شَیْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ یَجْهَلُوْنَ﴿۱۱۱﴾ (الانعام:۱۱۱)“ (اور اگر ہم اُن کی طرف فرشتے (بھی) نازل فرمادیتے اور (قبروں سے نکل کر) مُردے ان سے باتیں (بھی) کرتے اور ہم ان کے سامنے ہر چیز جمع (بھی) فرمادیتے تو یہ لوگ پھر بھی ایمان نہ لاتے سوا اُن کے جن کا ایمان لانا اللہ چاہے، لیکن ان میں سے اکثر لوگ جاہل ہیں○)۔

پھر فرمایا: ”بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِیْعًا“ یعنی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے قبضہ وقدرت میں ہیں، اگر وہ چاہیں تو کریں اور اگر چاہیں تو نہ کریں۔ (معالم التنزیل ج ۳ ص ۲۰ ـ ۲۳ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

وَ لَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَیْتُ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ۫ فَكَیْفَ كَانَ عِقَابِ﴿۳۲﴾

اور بے شک آپ سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا ہے، سو میں نے کچھ عرصہ کفار کو ڈھیل دی پھر میں نے اُن کی گرفت فرمائی، پس کتنا ہولناک تھا میرا عذاب○

اَفَمَنْ هُوَ قَآىٕمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْۚ وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَؕ قُلْ سَمُّوْهُمْؕ اَمْ تُنَبِّــٴُـوْنَهٗ بِمَا لَا یَعْلَمُ فِی الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِؕ بَلْ زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَ صُدُّوْا عَنِ السَّبِیْلِؕ وَ مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ﴿۳۳﴾

کیا پس اللہ جو ہر شخص کے اعمال کے نگران و نگہبان ہیں (وہ بتوں کی طرح بے علم و بے خبر ہو سکتے ہیں! ہرگز نہیں) اور ان کافروں نے اللہ کے لیے متعدد شریک قرار دیے ہیں، آپ ان سے کہیے: ذرا ان شرکاء کے نام تو بتاؤ، یا تم اللہ کو ایسی چیز کی خبر دے رہے ہو جس کا انہیں زمین میں کہیں بھی علم نہیں، یا تم محض ظاہری جھوٹی بات کہہ رہے ہو، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ کافروں کے لیے اُن کے مکر کو خوشنما بنا دیا گیا ہے اور اُن کو ہدایت کے راستہ سے روک لیا گیا ہے، اور جس کو اللہ گمراہی پر چھوڑ دیں اس کے لیے کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے O

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۳۴﴾

ان کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی عذاب ہے اور آخرت کا عذاب ضرور بہت سخت ہے، اور ان کو اللہ کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں ہے O

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا ؕ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۖ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ﴿۳۵﴾

جس جنت کا متقین سے وعدہ فرمایا گیا ہے اس کے یہ اوصاف ہیں: ان جنتوں کے نیچے سے دریا بہہ رہے ہیں اور ان جنتوں کے پھل اور ان کے سائے ہمیشہ قائم رہنے والے ہیں، یہ اللہ سے ڈرنے والوں کا بہترین انجام ہے اور کافروں کا انجام دوزخ کی آگ ہے O

وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ؕ قُلْ اِنَّمَاۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَاۤ اُشْرِكَ بِهٖ ؕ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ ﴿۳۶﴾

اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب عطا فرمائی ہے وہ اس کتاب سے خوش ہوتے ہیں جو آپ پر نازل فرمائی گئی ہے، اور بعض فرقے اس کتاب کی بعض آیات کو نہیں مانتے، آپ کہیے: مجھے یہ حکم فرمایا گیا ہے کہ میں صرف اللہ کی عبادت کروں اور ان کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤں، میں انہی کی دعوت دیتا ہوں اور انہی کی طرف میرا لوٹنا ہے O

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ﴿۳۷﴾

اور اسی طرح ہم نے اس کتاب کو عربی قرآن کی صورت میں نازل فرمایا ہے، اور اگر بالفرض آپ ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی کریں اس کے باوجود کہ آپ کے پاس علم آ چکا ہے، تو اللہ کے سامنے نہ آپ کا کوئی مددگار ہوگا اور نہ کوئی اُن کے عذاب سے بچانے والا ہوگا O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور بے شک آپ سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا ہے، سو میں نے کچھ عرصہ کفار کو ڈھیل دی پھر میں نے اُن کی گرفت فرمائی، پس کتنا ہولناک تھا میرا عذاب O'' (الرعد: ۳۲)

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ ھ، الرعد: ۳۲ تا ۳۷ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ'': جب کفار مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہ طور استہزاء معجزات طلب کیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن کا یہ مطالبہ بہت دشوار لگتا تھا اور اُن کی ان باتوں سے آپ کو ایذاء پہنچتی تھی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت آپ کی تسلی کے لیے نازل فرمائی اور کفار مکہ کی جہالت ثبت کرنے کے لیے، پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمام نبیوں کی امتیں اُن کے ساتھ استہزاء کرتی رہی ہیں جس طرح کفار مکہ آپ کے ساتھ استہزاء کر رہے ہیں۔

''فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ'': پس میں نے اُن کفار کو ڈھیل دی، یعنی اُن کے اوپر ان کی سزا کو موخر فرمادیا، پھر میں نے اچانک ان کو پکڑ لیا، سو اُن کے لیے میرا یہ عذاب کیسا تھا۔

اور یاد رکھو میں عنقریب ان کافروں سے انتقام لوں گا جیسا کہ میں نے ان سے پہلے لوگوں سے انتقام لیا ہے۔ اور اُن کو ڈھیل دینے اور مہلت دینے کا معنی یہ ہے کہ ایک مدت تک اُن کو اس طرح امن میں رکھا جائے گا جس طرح چوپایوں کو ڈھیل دے کر چراگاہ میں رکھا جاتا ہے۔ اور یہ اُن لوگوں کے متعلق وعید ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہ طور استہزاء معجزات طلب کرتے تھے۔

یعنی میں نے ان کفار کو ڈھیل دے رکھی ہے، پھر اچانک اُن پر میرا عذاب آجائے گا جیسا کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝ (الحج: ۴۸)'' (اور جس طرح میں نے بہت سی بستیوں کو مہلت دی تھی حالانکہ وہ لوگ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے تھے، پھر اچانک میں نے اُن کو پکڑ لیا، اور میری ہی طرف لوٹنے کی جگہ ہے)۔ نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ۭ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ۝ (ہود: ۱۰۲)'' (اور اسی طرح آپ کے رب جب بستیوں کو ان کے ظلم کرنے کے وقت پکڑتے ہیں تو بے شک اُن کی گرفت بہت دردناک اور سخت ہوتی ہے)۔

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ظالم کو ڈھیل دیتے رہتے ہیں حتیٰ کہ جب اس کو پکڑ لیتے ہیں تو اس کو نہیں چھوڑتے، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: ''اور اسی طرح آپ کے رب جب بستیوں کو ان کے ظلم کرنے کے وقت پکڑتے ہیں تو بے شک اُن کی گرفت بہت دردناک اور سخت ہوتی ہے (ہود: ۱۰۲)''۔

(صحیح البخاری: ۴۶۸۶، صحیح مسلم: ۲۵۸۳، سنن ترمذی: ۳۱۱۰، سنن ابن ماجہ: ۴۰۱۸، مسند البزار ج ۸ ص ۱۲۳، السنن الکبریٰ للنسائی: ۱۱۸۱، شعب الایمان ج ۹ ص ۵۳۵، جامع العلوم والحکم ج ۲ ص ۳۶، الجامع الصحیح للسنن والمسانید ج ۶ ص ۲۲۵، السند الموضوعی الجامع للکتب العشر ج ۳ ص ۲۱۰)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''کیا پس اللہ جو ہر شخص کے اعمال کے نگران و نگہبان ہیں (وہ بتوں کی طرح بے علم و بے خبر ہو سکتے ہیں! ہرگز نہیں) اور ان کافروں نے اللہ کے لیے متعدد شریک قرار دیئے ہیں، آپ ان سے کہیے: ذرا ان شرکاء کے نام تو بتاؤ، یا تم اللہ کو ایسی چیز کی خبر دے رہے ہو جس کا انہیں زمین میں کہیں بھی علم

نہیں، یا تم محض ظاہری جھوٹی بات کہہ رہے ہو، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ کافروں کے لیے اُن کے مکر کو خوشنما بنا دیا گیا ہے اور اُن کو ہدایت کے راستہ سے روک لیا گیا ہے، اور جس کو اللہ گمراہی پر چھوڑ دیں اس کے لیے کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے O" (الرعد: ۳۳)

یہ آیت اللہ تعالیٰ نے کفار پر زجر و توبیخ کے لیے اور اُن کی عقلوں پر تعجب کے اظہار کے لیے نازل فرمائی ہے، پس فرمایا: "اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ": اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام ممکنات پر قادر ہیں اور تمام معلومات کے عالم ہیں خواہ کلیات ہوں یا جزئیات ہوں، اور جب وہ تمام کلیات اور جزئیات کے عالم ہیں تو تمام لوگوں کے احوال کے بھی عالم ہیں، اور اُن کے مطالب کو موجود کرنے پر قادر ہیں کہ اُن کے منافع اُن کو دیے جائیں اور اُن سے ان کے ضرر کی چیزوں کو دور کیا جائے، اور تمام عبادت کرنے والوں کو اُن کا ثواب پہنچایا جائے اور تمام نافرمانی کرنے والوں کو اُن کا عذاب پہنچایا جائے۔

یعنی جو ذات ہر نفس کو جاننے والی ہے اور اس کی نگہبان ہے اور جو جانتی ہے جو عمل کرنے والے عمل کرتے ہیں خواہ نیک عمل ہو یا برا عمل ہو اور ان پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے، کیا وہ ذات اُن بتوں کی طرح ہو سکتی ہے جن کی تم عبادت کرتے ہو جو نہ کوئی چیز سنتے ہیں نہ کوئی چیز دیکھتے ہیں، نہ کسی چیز پر غور و فکر کرتے ہیں، اور وہ اپنے لیے کسی نفع کو حاصل نہیں کر سکتے، نہ اپنے عبادت گزاروں کے لیے، نہ اپنے سے کسی ضرر کو دور کر سکتے ہیں نہ اپنے عبادت گزاروں سے کسی ضرر کو دور کر سکتے ہیں۔

"وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ": اس کے باوجود کافروں نے اِن بتوں کو اللہ کا شریک قرار دیا اور وہ ان کی عبادت کرتے ہیں۔

"قُلْ سَمُّوْهُمْ": آپ کہیے کہ تم ہمیں اِن بتوں کے متعلق بتاؤ، ان کے نام بتاؤ تا کہ اِن کا پورا کشف ہو اور یہ پہچان لیے جائیں، کیونکہ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِی الْاَرْضِ" یعنی کیا تم اللہ تعالیٰ کو اس چیز کی خبر دیتے ہو جس کا کوئی وجود نہیں ہے، کیونکہ اگر اس کا زمین میں کوئی وجود ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کو جان لیتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ "اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ": مجاہد نے کہا: یہ تمہارا ظاہری قول ہے، اور مجاہد اور الضحاک نے کہا: یہ تمہارا باطل قول ہے، یعنی تم نے محض اپنے اس گمان سے بتوں کی عبادت کی ہے کہ یہ نفع دیتے ہیں اور ضرر پہنچاتے ہیں اور تم نے ان کا نام "الٰهة" رکھ دیا: "اِنْ هِیَ اِلَّاۤ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ..." (النجم: ۲۳) "(یہ تو صرف نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے، اللہ نے اِن (ناموں) کی کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی، وہ تو صرف گمان اور نفس کی خواہشوں کی پیروی کرتے ہیں)۔

"اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِی الْاَرْضِ": یعنی کیا تم اس پر قادر ہو کہ تم اللہ تعالیٰ کو خبر دو اور ان کو وہ چیز بتلاؤ جس کو تم جانتے ہو اور اللہ نہیں جانتے، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس کو وہ زمین میں نہیں جانتے، اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے شریک کی نفی کرنا ہے، کیونکہ اُن کا یہ دعویٰ تھا کہ زمین میں اللہ تعالیٰ کا شریک ہے۔

"اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ": یعنی جس چیز کی کوئی حقیقت نہیں ہے، اس پر تم ملمع کاری کرتے ہو۔

"بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ": کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کے فاسد ہونے پر دلائل قائم فرما دیے تو گویا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اب دلیل کا ذکر چھوڑو کیونکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے، کیونکہ ان کافروں کے کفر اور مکر کو خوش نما بنا دیا گیا ہے، پس وہ دلائل سے فائدہ حاصل نہیں کریں گے۔

"وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ": اہل سنت و جماعت کے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ کفار کو اُن کے غیر نے اللہ کے راستے سے روک دیا ہے۔ اور معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ شیطان نے اُن کو روک دیا ہے۔

"وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ": یعنی اُن کے لیے اُن کے کاموں کو خوش نما بنانے والے اللہ عزوجل ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اِن کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی عذاب ہے اور آخرت کا عذاب ضرور بہت سخت ہے، اور ان کو اللہ کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں ہے ○" (الرعد: ۳۴)

"لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا": اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کفار کے لیے دنیا کے عذاب کو اور آخرت کے عذاب کو جمع فرما دیا، اور وہ بہت سخت عذاب ہے، کیونکہ نہ دنیا میں ان سے کوئی اس عذاب کو دور کر سکتا ہے اور نہ آخرت میں۔

رہا دنیا کا عذاب تو وہ میدانِ جہاد میں ان کو قتل کرنا ہے اور ان پر لعنت فرمائی جائے گی اور ان کی اہانت فرمائی جائے گی۔ کیا مصائب اور بیماریاں بھی اس میں داخل ہیں، اس میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا کہ مصائب اور بیماریاں بھی اس میں داخل ہیں، اور بعض نے کہا کہ مصائب اور بیماریاں عذاب نہیں ہوتیں کیونکہ ہر شخص جب ان بیماریوں میں مبتلاء ہوتا ہے تو اس کو اُن بیماریوں پر صبر کرنے کا حکم دیا جاتا ہے اور اگر یہ عذاب ہوتا تو ان پر صبر کرنا لازم نہ ہوتا، پس اس آیت سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں جو ان کو عذاب ہوگا ان کو قتل کیا جائے گا، ان کو گرفتار کیا جائے گا، اور ان کے اموال کو مالِ غنیمت بنایا جائے گا اور ان پر لعنت فرمائی جائے گی۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ": کیونکہ یہ عذاب قوت اور شدت کے اعتبار سے بہت زیادہ ہوگا اور اس عذاب کی انواع و اقسام بہت زیادہ ہیں، اور اس عذاب میں کوئی چیز ایسی نہیں ہوگی جو راحت کی موجب ہو اور یہ عذاب دائمی ہوگا، یہ عذاب منقطع نہیں ہوگا۔

"وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ": یعنی اُن کو جو عذاب دیا جائے گا اس سے کوئی بچانے والا نہیں ہوگا۔

اور یہ ایسا ہے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا کے عذاب کی ایک انتہاء ہوتی ہے اور آخرت کا عذاب دائمی ہے، ابدی ہے اور وہ دنیا کے عذاب کے اعتبار سے ستر (۷۰) گنا زیادہ ہے۔ اس عذاب کی کثافت اور شدت کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "جس جنت کا متقین سے وعدہ فرمایا گیا ہے اس کے یہ اوصاف ہیں: ان جنتوں کے نیچے سے دریا بہہ رہے ہیں اور ان جنتوں کے پھل اور ان کے سائے ہمیشہ قائم رہنے والے ہیں، یہ اللہ سے ڈرنے والوں کا بہترین انجام ہے اور کافروں کا انجام دوزخ کی آگ ہے ○" (الرعد: ۳۵)

جب اللہ تعالیٰ نے کفار کے دنیا اور آخرت کے عذاب کا ذکر فرمایا تو اس کے بعد متقین کے ثواب کا ذکر فرمایا۔

"مَثَلُ الْجَنَّةِ": یعنی ہم نے تم پر جو قصہ بیان کیا ہے اس میں جنت کی مثال ہے کہ اس کی صفت یہ ہے کہ اس کے پھل ہمیشہ

رہیں گے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اُكُلُهَا دَآىِٕمٌ وَّ ظِلُّهَا''۔ (جس جنت کا متقین سے وعدہ فرمایا گیا ہے اس کے یہ اوصاف ہیں: ان جنتوں کے نیچے دریا بہہ رہے ہیں اور ان جنتوں کے پھل اور ان کے سائے ہمیشہ قائم رہنے والے ہیں)۔

اللہ تعالیٰ نے جنت کی تین صفات بیان فرمائی ہیں: (۱) اس کے نیچے سے دریا بہتے ہیں۔ (۲) اس کے پھل ہمیشہ باقی رہتے ہیں، اس کا معنی یہ ہے کہ دنیا کے باغات دائمی نہیں رہتے، نہ اُن کے پتے ہمیشہ رہتے ہیں اور نہ اُن کے پھل ہمیشہ رہتے ہیں اور نہ ان کے منافع ہمیشہ رہتے ہیں، لیکن آخرت کے جنات کے پھل دائمی ہیں، منقطع نہیں ہوتے۔ (۳) جنت کا سایا بھی دائمی ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ نہ وہاں پر گرمی ہوگی نہ ٹھنڈک ہوگی، نہ وہاں سورج ہے، نہ چاند ہے، نہ اندھیرا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''مُّتَّكِـِٕیْنَ فِیْهَا عَلَى الْاَرَآىِٕكِ ۚ لَا یَرَوْنَ فِیْهَا شَمْسًا وَّ لَا زَمْهَرِیْرًا ۚ وَ دَانِیَةً عَلَیْهِمْ ظِلٰلُهَا وَ ذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِیْلًا'' (الدہر: ۱۳۔۱۴) (اور اہل جنت، جنت میں اپنے تختوں پر ٹیک لگائے ہوئے ہوں گے، نہ اس میں وہ سخت دھوپ کو دیکھیں گے اور نہ سخت ٹھنڈک کو O اور اس کے درخت ان کے قریب ہوں گے اور اس کے (پھلوں کے) گچھے بہت ہی قریب کر دیے جائیں گے O)۔

پھر جب اللہ تعالیٰ نے جنت کے یہ تین اوصاف بیان فرمائے تو بیان فرمایا: ''تِلْكَ عُقْبَى الَّذِیْنَ اتَّقَوْا ۖۗ وَّ عُقْبَى الْكٰفِرِیْنَ النَّارُ'' یہ بہترین انجام ان لوگوں کا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور ان متقین کے لیے جنت ہے اور کفار کے لیے دائمی دوزخ ہے اور اس کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ متقین کا ثواب نقصان سے خالی ہوگا اور دوام کے ساتھ متصف ہوگا۔

معتزلہ اور اہل سنت کا اس وقت جنت کے مخلوق ہونے میں اختلاف

القاضی ابوالحسن عبد الجبار بن احمد الاسد آبادی المعتزلی المتوفی ۴۱۵ھ، الرعد: ۳۵ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ جنت ابھی تک پیدا نہیں فرمائی گئی، کیونکہ اگر جنت پیدا فرمائی گئی ہوتی تو اس کا فنا ہونا واجب تھا اور اس کے پھلوں کا منقطع ہونا بھی واجب تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''كُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ'' (الرحمٰن: ۲۶) (زمین پر جو کچھ ہے فنا ہونے والا ہے O)۔ اور اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ'' (القصص: ۸۸) (ان کی ذات کے سوا ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے)، لیکن جنت کے پھل منقطع نہیں ہوں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''اُكُلُهَا دَآىِٕمٌ'' (اور ان جنتوں کے پھل)، پس واجب ہے کہ جنت ابھی مخلوق نہ ہوئی ہو، پھر قاضی عبد الجبار نے کہا: ہم اس کا انکار نہیں کرتے کہ اس وقت آسمان میں بہت ساری جنتیں ہیں جن سے فرشتے متمتع ہوتے رہتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام اور شہداء اور دوسروں میں سے جن کو زندہ شمار کیا جاتا ہے وہ بھی ان سے متمتع ہوتے ہیں جیسا کہ احادیث میں مذکور ہے، مگر ہم یہ کہتے ہیں کہ خصوصاً جنت الخلد اس کائنات کو فنا کرنے کے بعد پیدا فرمائی جائے گی۔ (التفسیر الحدید ص ۲۳۶، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۹ء)

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ فرماتے ہیں:

ہم اُن کے استدلال کے جواب میں کہتے ہیں کہ ''كُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ'' میں جو عموم ہے، اس عموم کی ہم دوسرے دلائل سے تخصیص کرتے ہیں، اور دوسرے دلائل سے یہ واجب ہوتا ہے کہ جنت پیدا ہو چکی ہے جیسا کہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''وَ جَنَّةٍ

عَرۡضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ ۙ اُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِيۡنَ ۞ (آل عمران: ۱۳۳)" (اور اس جنت (کے حصول) کی طرف جلدی کرو جس جنت کی چوڑائی تمام آسمان اور زمینیں ہیں، جس کو اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے تیار فرمایا گیا ہے 0)۔

جنت کے پھلوں کے دائمی ہونے کے متعلق احادیث

مسروق بیان کرتے ہیں کہ جنت کی کھجوروں کے درخت کے شگوفے تہہ بہ تہہ خوشے ہوں گے اور اس کے پھل بڑے مٹکوں جتنے ہوں گے، جب بھی ایک پھل اتارا جائے گا تو اس کی جگہ دوسرا پھل لگ جائے گا۔۔۔الحدیث

(تفسیر عبدالرزاق: ۱۰۹: ۳، کتاب الزہد والرقاق: ۱۴۸۹، ۱۴۹۰، المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۴۳۹، صفۃ الجنۃ لابی نعیم الاصفہانی: ۳۱۵)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے صلاۃ الکسوف کی ایک طویل حدیث کے اخیر میں بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں سورج گرہن کی نماز پڑھانے کے بعد ہماری طرف مڑے اور آپ نے فرمایا: سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، ان کو کسی کی موت کی وجہ سے گہن لگتا ہے نہ کسی کی حیات کی وجہ سے، پس جب تم اس کو دیکھو تو اللہ کو یاد کرو، صحابہ نے کہا: یارسول اللہ! ہم نے آپ کو دیکھا ہے کہ آپ نے اپنی جگہ پر کھڑے ہوئے کسی چیز کو پکڑا ہے، پھر ہم نے آپ کو پیچھے ہٹتے ہوئے دیکھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے جنت کو دیکھا، پس میں نے ایک خوشہ کو پکڑا، اگر میں اس کو لے لیتا تو تم اس کو جب تک دنیا باقی رہتی کھاتے رہتے اور مجھے دوزخ دکھائی گئی اور میں نے آج جیسا قبیح منظر کبھی نہیں دیکھا اور میں نے دوزخ والوں میں اکثر عورتوں کو دیکھا۔۔الحدیث۔

(صحیح البخاری: ۲۹، ۴۳۱، ۷۴۸، ۱۰۵۲، ۳۲۰۲، ۵۱۹۷، صحیح مسلم: ۸۸۴، سنن نسائی: ۱۴۹۳، مسند احمد: ۲۷۰۶، موطا امام مالک: ۴۴۵)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب عطا فرمائی ہے وہ اس کتاب سے خوش ہوتے ہیں جو آپ پر نازل فرمائی گئی ہے، اور بعض فرقے اس کتاب کی بعض آیات کو نہیں مانتے، آپ کہیے: مجھے یہ حکم فرمایا گیا ہے کہ میں صرف اللہ کی عبادت کروں اور ان کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤں، میں انہی کی دعوت دیتا ہوں اور انہی کی طرف میرا لوٹنا ہے 0" (الرعد: ۳۶)

"وَالَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ يَفۡرَحُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ وَمِنَ الۡاَحۡزَابِ مَنۡ يُّنۡكِرُ بَعۡضَهٗ":

اس آیت میں الکتاب کے متعلق دو قول ہیں:

(۱) حسن بصری اور قتادہ نے کہا: اس سے مراد قرآن مجید ہے اور مراد یہ ہے کہ اہل قرآن اُن آیات سے خوش ہوتے ہیں جو سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر توحید، عدل، نبوت، بعث، احکام اور یہود و نصاریٰ کے مختلف فرقوں کے متعلق نازل فرمائی گئی ہیں۔

(۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: "اَلَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ" کا مصداق وہ لوگ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اہل کتاب میں سے ایمان لائے جیسے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور کعب احبار اور ان کے اصحاب۔ اور جو لوگ نصاریٰ میں سے اسلام لائے اور وہ اسی (۸۰) مرد تھے، چار (۴) نجران سے تھے، آٹھ (۸) یمن سے تھے اور بتیس (۳۲) حبشہ کے رہنے والے تھے، وہ قرآن مجید سے خوش ہوتے تھے کیونکہ وہ قرآن مجید پر ایمان لائے تھے اور انہوں نے اس کی تصدیق کی تھی۔

(۳) "اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ" سے مراد یہود ہیں جن کو تورات دی گئی اور نصاریٰ ہیں جن کو انجیل دی گئی، وہ اس قرآن کی آیات سے خوش ہوتے ہیں کیونکہ وہ ان کے پاس جو کتابیں ہیں ان کا مصدق ہے، اور "وَمِنَ الْاَحْزَابِ" سے مراد باقی کفار ہیں جو بعض آیات کا انکار کرتے ہیں۔

القاضی ابوالحسن عبدالجبار بن احمد الاسد آبادی المعتزلی المتوفی ۴۱۵ھ، الرعد: ۳۶ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یہ تفسیر صحیح نہیں ہے، کیونکہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "يَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ" اور یہ قرآن مجید کی تمام آیات کو شامل ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ یہود و نصاریٰ قرآن مجید کی نازل کردہ تمام آیات سے خوش نہیں ہوتے تھے۔

(المغنی، تفسیر المحیط، ص ۲۴۶-۲۴۷، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۹ء)

اور ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ "بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ" سے مراد عموم نہیں ہے، کیونکہ اگر اس سے مراد عموم ہوتا تو لفظ کل کا اس پر داخل ہونا تکرار ہوتا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو بیان فرمایا جس کی طرف انسان مبدأ اور معاد کی معرفت میں محتاج ہوتا ہے۔

"قُلْ اِنَّمَاۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ": اور یہ آیت اُن تمام احکام کی جامع ہے جن کے ساتھ مکلف کیا جاتا ہے، اور اس آیت میں درج ذیل فوائد ہیں:

(۱) "اِنَّمَاۤ" کا لفظ حصر کے لیے ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ مجھے اللہ عزوجل کی عبادت کے سوا اور کوئی حکم نہیں فرمایا گیا۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ ہر تکلیف اور ہر امر اور ہر نہی اس میں داخل ہیں۔

(۲) عبادت، اللہ تعالیٰ کی انتہائی تعظیم کرنا ہے اور یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ بندہ کو اللہ تعالیٰ کی انتہائی تعظیم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی عبادت اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک بندہ کو اللہ تعالیٰ کی معرفت نہ ہو، اور اللہ تعالیٰ کی معرفت دلیل سے ہوتی ہے، پس یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ بندہ صانع کی ذات اور صفات میں غور و فکر کرنے اور استدلال کرنے کا مکلف ہے اور اس کا مکلف ہے کہ وہ دلیل سے جانے کہ اس پر کیا واجب ہے اور کیا محال ہے۔

(۴) اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا واجب ہے اور اس سے اُن لوگوں کا قول باطل ہو جاتا ہے جو مکلف کرنے کی نفی کرتے ہیں اور جبر محض کا قول باطل ہو جاتا ہے۔

"وَلَاۤ اُشْرِكَ بِهٖ": یہ آیت تمام شرکاء کی نفی پر دلالت کرتی ہے اور اس سے اُن لوگوں کا قول باطل ہو جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور معبود کو ثابت کرتے ہیں، خواہ وہ معبود سورج ہو، یا چاند ہو، یا ستارے ہوں، یا بت ہوں، یا ارواح علویہ ہوں جیسے یزدان، یا اہرمن ہوں جیسا کہ مجوس کہتے ہیں۔ "اِلَيْهِ اَدْعُوْا": اس سے یہ معلوم ہوا کہ جیسے اللہ تعالیٰ کی تمام عبادات کو انجام دینا واجب ہے، اسی طرح اس پر واجب ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی توحید کی طرف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی طرف دعوت دے۔ "وَاِلَيْهِ مَاٰبِ": اس میں حشر اور نشر کی طرف اشارہ ہے، اور مرنے کے بعد اٹھنے اور قیامت کی طرف اشارہ ہے۔

پس جب بندہ ان چند الفاظ پر غور و فکر کرے گا تو وہ ان تمام مطالب پر واقف ہوگا جو دین میں معتبر ہوتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اسی طرح ہم نے اس کتاب کو عربی قرآن کی صورت میں نازل فرمایا ہے، اور

اگر بالفرض آپ اِن لوگوں کی خواہشوں کی پیروی کریں اس کے باوجود کہ آپ کے پاس علم آچکا ہے، تو اللہ کے سامنے نہ آپ کا کوئی مددگار ہوگا اور نہ کوئی اُن کے عذاب سے بچانے والا ہوگا O" (الرعد: ۳۷)

"وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِیًّا": اللہ تعالیٰ نے اس قرآن کو ان کتابوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے جن کو انبیاء سابقین پر نازل فرمایا گیا ہے، یعنی جس طرح ہم نے انبیاء سابقین پر اُن کی زبانوں میں کتابیں نازل فرمائی ہیں، اسی طرح ہم نے آپ پر قرآن آپ کی زبان میں نازل فرمایا ہے۔ "اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِیًّا": اس کی تفسیر میں کئی وجوہ ہیں:

(۱) "حُكْمًا" سے مراد ہے حکمت عربیہ، جس کو عربی زبان میں منتقل کیا گیا ہے۔

(۲) قرآن تمام اقسام تکالیف پر مشتمل ہے لہٰذا حکم صرف قرآن سے معلوم ہو سکتا ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے تمام مکلفین پر یہ واجب فرمایا ہے کہ قرآن مجید کو قبول کریں اور اس کے تقاضوں پر عمل کریں۔

"وَ لَىٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا وَاقٍ":

روایت ہے کہ مشرکین اپنے آباء و اجداد کی ملت کی پیروی کی دعوت دیتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اتباع کرنے پر وعید سنائی، مثلاً وہ یہ کہتے تھے کہ اُن کے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی جائے جب کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے قبلہ کی تحویل فرمائی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس آیت میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور مراد آپ کی امت ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ بلکہ اس کی غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر برانگیختہ کرنا ہے کہ وہ رسالت کا حق ادا کریں اور آپ کو اس کی مخالفت کرنے سے ڈرانا ہے اور یہ ڈرانا تمام مکلفین کو متضمن ہے، کیونکہ جس کا مرتبہ زیادہ ہو، جب اس کو اس سے ڈرایا گیا، تو جن کا مرتبہ اس سے کم ہے، وہ اس سے ڈرائے جانے کے زیادہ لائق ہیں۔

اور بعض مفسرین نے اس آیت کی اس طرح تفسیر کی ہے:

یعنی جس طرح ہم نے آپ سے پہلے رسولوں کو بھیجا اور اُن کے ساتھ آسمان سے کتاب نازل فرمائی، اسی طرح ہم نے آپ پر قرآن مجید کو نازل فرمایا جو مُحکم ہے، ہم نے آپ کو اس قرآن مجید کے ساتھ اور اس کتاب مبین کی وجہ سے فضیلت عطا فرمائی۔ اور اگر آپ نے اللہ عزوجل کے پاس سے علم آنے کے بعد ان لوگوں کی آراء کی پیروی کی تو آپ کے لیے اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچانے کے لیے کوئی نہیں ہوگا اور نہ کوئی مددگار ہوگا۔

بظاہر یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے، لیکن اس میں اہل علم سے فرمایا گیا ہے کہ اگر انہوں نے گمراہوں کے طریقہ کی پیروی کی جب کہ اُن کے پاس سنت نبویہ اور حجت محمدیہ آچکی ہے تو پھر اُن کو اللہ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں ہوگا۔

(تفسیر کبیر ج ۷ ص ۴۳۔ ۴۹، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ، وتفاسیر الرازی)

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّیَّةً ؕ وَ مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ یَّاْتِیَ بِاٰیَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ (۳۸)

اور بے شک ہم نے آپ سے پہلے بہت رسول بھیجے ہیں اور ہم نے اُن کے لیے ان کی بیویاں اور اُن کے بچے بھی عطا فرمائے تھے اور کسی رسول کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر کوئی معجزہ لے آئے، اور ہر فیصلہ کتاب میں لکھا ہوا ہے ○

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ ۚ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴿۳۹﴾

اللہ جس لکھے ہوئے کو مٹانا چاہیں مٹا دیتے ہیں، اور جس لکھے ہوئے کو ثابت رکھنا چاہیں ثابت رکھتے ہیں، اور انہی کے پاس اصل کتاب (یعنی لوحِ محفوظ) ہے ○

وَ اِنْ مَّا نُرِیَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَیْنَا الْحِسَابُ ﴿۴۰﴾

اور اگر ہم آپ کو اس عذاب کا کچھ حصہ دکھا دیں جس سے ہم اِن (کافروں) کو ڈراتے ہیں یا آپ کی مدتِ حیات پوری فرما دیں تو آپ کے ذمہ تو صرف احکام کا پہنچا دینا ہے اور ہمارا کام حساب لینا ہے ○

اَوَ لَمْ یَرَوْا اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ وَ اللّٰهُ یَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ؕ وَ هُوَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴿۴۱﴾

کیا ان کافروں نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم ہر طرف سے زمین کے رقبہ کو کم کرتے جا رہے ہیں، اور اللہ حکم فرماتے ہیں اور کوئی ان کے حکم کو رد کرنے والا نہیں ہے، اور وہ بہت جلد حساب لینے والے ہیں ○

وَ قَدْ مَكَرَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِیْعًا ؕ یَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ؕ وَ سَیَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۴۲﴾

اور ان سے پہلی امتیں بھی اپنے انبیاء کے خلاف سازشیں کرتی رہی ہیں، سو تمام خفیہ تدبیروں کے اللہ مالک ہیں، ہر شخص جو کام کر رہا ہے وہ اس کو بہ خوبی جانتا ہے اور عنقریب کافروں کو معلوم ہو جائے گا کہ آخرت میں اچھا انجام کس کے لیے ہے ○

وَ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ؕ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًۢا بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ۙ وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ﴿۴۳﴾ ع

اور کفار کہتے ہیں: "آپ اللہ کے رسول نہیں ہیں"، آپ کہیے: "میرے اور تمہارے درمیان اللہ کا گواہ ہونا کافی ہے اور وہ لوگ بھی کافی گواہ ہیں جن کے پاس آسمانی کتاب کا علم ہے" ○

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور بے شک ہم نے آپ سے پہلے بہت رسول بھیجے ہیں اور ہم نے اُن کے لیے ان

کی بیویاں اور اُن کے بچے بھی عطا فرمائے تھے اور کسی رسول کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر کوئی معجزہ لے آئے، اور ہر فیصلہ کتاب میں لکھا ہوا ہے O" (الرعد: ۳۸)

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ ھ، الرعد: ۳۸ تا ۴۳ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اس آیت سے دو مسئلے مستفاد ہوتے ہیں:

(۱) یہود نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عیب نکالا کہ ان کی بیویاں ہیں اور اس سے آپ کی رسالت پر عار دلایا، انہوں نے کہا: ہم اس شخص کی توجہ تو عورتوں اور نکاح کی طرف پاتے ہیں اور اگر یہ نبی ہوتے تو نبوت ان کو عورتوں کے ساتھ مشغول ہونے سے منع کر دیتی، تب اللہ تعالیٰ نے اُن کے رد میں یہ آیت نازل فرمائی اور ان کو حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی یاد دلائی کہ وہ دونوں بھی نبی تھے اور ان کی بیویاں بھی تھیں، لہٰذا فرمایا: "وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً": یعنی ہم نے اُن کو بشر بنایا، اور اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے جو دنیا کی شہوت حلال فرمادی ہے، وہ اس شہوت کو پورا کرتے تھے اور ان کی تخصیص صرف وحی سے تھی۔

(۲) یہ آیت نکاح کی ترغیب پر دلالت کرتی ہے اور اس پر برانگیختہ کرتی ہے اور تجرد کی زندگی سے منع کرتی ہے کہ آدمی نکاح نہ کرے۔ اور نکاح کرنا رسولوں کی سنت ہے جیسا کہ اس آیت میں تصریح ہے، اور سنت بھی اسی معنی کے مطابق وارد ہے۔

نکاح کرنے کی فضیلت کے متعلق احادیث

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو میرے لیے اس چیز کا ضامن ہو جو اس کے دو جبڑوں کے درمیان میں ہے اور اس چیز کا ضامن ہو جو اس کی دو ٹانگوں کے درمیان میں ہے تو میں اس کے لیے جنت کا ضامن ہوں۔
(صحیح البخاری: ۶۸۰۷، سنن ترمذی: ۲۴۰۸، مسند احمد: ۲۲۳۱۶)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ تین مرد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے گھروں میں گئے اور ان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے متعلق سوال کیا، (پس جب ان کو آپ کی عبادت کے متعلق بتایا گیا) تو گویا انہوں نے اتنی عبادت کو کم سمجھا، پس انہوں نے کہا: کہاں ہم کہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم؟ آپ کے تو تمام اگلے اور پچھلے بہ ظاہر خلاف اولیٰ کاموں کی مغفرت فرمادی گئی ہے، ان میں سے ایک نے کہا: رہا میں تو میں ہمیشہ پوری رات نماز پڑھتا رہوں گا اور دوسرے نے کہا: میں ہمیشہ روزہ رکھتا رہوں گا اور روزہ نہیں چھوڑوں گا اور تیسرے نے کہا: میں ہمیشہ عورتوں سے اجتناب کروں گا اور کبھی نکاح نہیں کروں گا، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آگئے تو آپ نے فرمایا: تو تم وہ لوگ ہو جنہوں نے ایسا ایسا کہا تھا؟ سنو! اللہ کی قسم! بے شک میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں اور بے شک میں تم سب سے زیادہ گناہوں سے بچنے والا ہوں، لیکن میں روزہ رکھتا ہوں اور روزہ چھوڑتا ہوں اور نماز پڑھتا ہوں اور رات کو سوتا ہوں اور عورتوں سے نکاح کرتا ہوں، سو جس نے میری سنت سے اعراض کیا تو وہ میرے طریقہ (محمودہ) پر نہیں ہے۔
(صحیح البخاری: ۵۰۶۳، صحیح مسلم: ۱۴۰۱، مسند عبد بن حمید: ۱۳۱۸، صحیح ابن حبان: ۱۴، سنن بیہقی ج ۷ ص ۷۷، مسند احمد ج ۳ ص ۲۴۱، مسند احمد: ۱۳۵۳۴، کنز العمال: ۴۴۵۸۱۳، الطبقات الکبریٰ ج ۲ ص ۹۵، در منثور ج ۴ ص ۲۱۰، کشف الخفاء ج ۲ ص ۳۱۴، سنن نسائی ج ۶ ص ۶۰)

عبدالرحمن بن یزید بیان کرتے ہیں: میں علقمہ اور الاسود کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس گیا تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نوجوان تھے اور ہمارے پاس کوئی چیز نہیں تھی تو ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے جوانوں کے گروہ! تم میں سے جو شخص گھر بسانے کی طاقت رکھتا ہے اس کو نکاح کرنا چاہیے کیونکہ نکاح (محرمات سے) نظر نیچی رکھتا ہے اور شرمگاہ کی حفاظت کرتا ہے اور جو شخص گھر بسانے کی طاقت نہیں رکھتا اس کو روزے رکھنے چاہئیں کیونکہ روزہ اس کے لیے خصی کرنے کے قائم مقام ہے۔

(صحیح البخاری: ۱۹۰۵، ۵۰۶۵، ۵۰۶۶، صحیح مسلم: ۱۴۰۰، سنن ابوداؤد: ۲۰۴۶، سنن ترمذی: ۱۰۸۱، سنن نسائی: ۳۲۰۶۔ ۳۲۲۵، سنن ابن ماجہ: ۱۸۴۵، مسند احمد ج ۱ ص ۳۷۸، مسند احمد: ۳۵۹۲، مصنف عبدالرزاق: ۱۰۳۸۰، مسند الحمیدی: ۱۱۵، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۴ ص ۱۲۶۔ ۱۲۷، سنن کبریٰ: ۲۴۵۴۷، المعجم الکبیر: ۱۰۱۶۸، شرح السنۃ للبغوی: ۲۲۳۶، سنن دارمی: ج ۲ ص ۱۳۲، سنن بیہقی ج ۳ ص ۲۹۶)

کثرتِ اولاد کے حصول کی ترغیب

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مرد آیا، پس اس نے کہا: میں ایسی عورت سے ملا ہوں جس کا حسب بھی عمدہ ہے اور وہ خوبصورت بھی ہے لیکن اس کے ہاں اولاد نہیں ہوتی، کیا میں اس سے نکاح کر لوں؟ آپ نے فرمایا: نہیں! پھر میں دوبارہ آپ کے پاس آیا تو پھر آپ نے اس کے ساتھ نکاح سے منع فرمایا، پھر میں تیسری مرتبہ آیا تو آپ نے فرمایا: ایسی عورتوں سے نکاح کرو جو بچے پیدا کرنے والی ہوں، کیونکہ تمہاری کثرت سے میں امتوں پر فخر کروں گا۔

(سنن ابوداؤد: ۲۰۵۰، سنن ابن ماجہ: ۱۸۴۶، مسند احمد: ۶۵۹۸، سنن سعید بن منصور: ۴۹۰، مسند البزار: ۶۴۵۶، السنن الکبریٰ للنسائی: ۵۳۲۳، سنن نسائی: ۳۲۲۷، مسند الرویانی: ۱۱۸۸، مستخرج ابی عوانہ: ۴۰۱۸، صحیح ابن حبان: ۴۰۲۸، المعجم الاوسط للطبرانی: ۵۰۹۹، المعجم الکبیر للطبرانی ج ۲۰ ص ۲۱۹، مسند الشامیین للطبرانی: ۲۳۷، المستدرک علی الصحیحین: ۲۶۸۵، مسند الشہاب القضاعی: ۶۷۵، السنن الصغریٰ للبیہقی: ۲۳۵۱، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۳۴۵۷، شعب الایمان: ۵۰۹۹، معرفۃ السنن والآثار: ۴۳۵۸، شرح السنۃ للبغوی: ۲۲۳۷، موارد الظمآن: ۱۲۲۸، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشرۃ ج ۱۶ ص ۱۳۳)

اس سوال کا جواب کہ جب اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کوئی معجزہ پیش کرنا ممکن ہی نہیں ہے تو اس سے منع کیوں فرمایا گیا؟

"وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ": اس آیت میں فرمایا ہے "کسی رسول کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی معجزہ پیش کرے" حالانکہ اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی معجزہ پیش کرنا ممکن ہی نہیں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کلام کا ظاہر ممانعت ہے اور اس کا معنی نفی ہے، کیونکہ جس کام پر کسی شخص کو قدرت نہ ہو اس کام سے منع نہیں کیا جا سکتا، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بظاہر ممانعت ہے اور حقیقت میں نفی ہے۔ یعنی کسی رسول کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کوئی معجزہ پیش کرے۔

"لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ": یعنی ہر کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک وقت مقرر فرما دیا ہے۔

اس آیت میں یہ بیان فرمایا ہے کہ امتوں کو یہ نہیں چاہیے کہ وہ عذاب کے نزول کا مطالبہ کریں، بلکہ ہر کام کے لیے ایک وقت

مقرر ہے۔

شہر بن حوشب نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ جب حضرت موسیٰ صلوات اللہ علیہ وسلامہ طور سینا پر چڑھے تو انہوں نے جبار کی انگلی میں انگوٹھی دیکھی، اللہ عزوجل نے پوچھا: اے موسیٰ یہ کیا ہے؟ حالانکہ اللہ عزوجل اس کو بہ خوبی جاننے والے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: یہ مردوں کے زیورات میں سے کوئی چیز ہے، اللہ عزوجل نے فرمایا: کیا اس کے اوپر میرے اسماء میں سے کچھ لکھا ہوا ہے یا کوئی میرا کلام لکھا ہوا ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: نہیں، تو اللہ عزوجل نے فرمایا: اس پر لکھ دیں "لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ" یعنی ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ علامہ الہیثمی نے اس حدیث کو مجمع الزوائد ج ۷، ص ۴۲، میں ذکر کیا ہے اور اس حدیث میں ایک راوی محمد بن جابر الیمامی ہے جو ضعیف ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اللہ جس لکھے ہوئے کو مٹانا چاہیں مٹا دیتے ہیں، اور جس لکھے ہوئے کو ثابت رکھنا چاہیں ثابت رکھتے ہیں، اور انہی کے پاس اصل کتاب (یعنی لوح محفوظ) ہے ○" (الرعد: ۳۹)

"یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ ۖۚ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ":

اللہ عزوجل اس کتاب میں سے جس کو اپنے وقت میں واقع کرنا چاہیں اس کو مٹا دیتے ہیں اور جس کو چاہیں موخر فرما دیتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ عزوجل جس کو چاہیں مٹا دیتے ہیں اور جس کو چاہیں ثابت رکھتے ہیں سوائے چند اشیاء کے الخَلق اور الخُلق، اور زندگی اور رزق، اور سعادت اور شقاوت۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہ ام الکتاب کے سوا دو کتابیں ہیں اللہ عزوجل ان میں سے جس کو چاہتے ہیں مٹا دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں برقرار رکھتے ہیں۔

"وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ": یعنی جس میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ القشیری نے کہا ہے کہ السعادت اور الشقاوت اور الخَلق اور الخُلق میں تغیر نہیں ہوتا۔ اور اس آیت کا تعلق ان کے ماسوا سے ہے اور اس قول میں اپنی رائے سے حکم لگایا گیا ہے۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں: اس قسم کی مثال کا رائے سے اور اجتہاد سے ادراک نہیں کیا جا سکتا، اس پر توقیفاً عمل کیا جاتا ہے۔ اور نہ یہ آیت تمام چیزوں کو شامل ہے اور یہی زیادہ ظاہر ہے۔ اور اس کے معنی میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، اور حضرت ابو وائل رضی اللہ عنہ اور کعب احبار وغیرہم سے روایت ہے۔ اور وہ الکلبی کا قول ہے اور ابو عثمان النہدی سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے رو رہے تھے اور یہ دعا کر رہے تھے: اے اللہ! اگر آپ نے مجھے اہل السعادت میں لکھ دیا ہے تو اس کو ثابت اور برقرار رکھیں اور اگر آپ نے مجھے اہلِ شقاوت اور اہلِ معصیت میں لکھ دیا ہے تو اس کو مٹا دیں اور مجھے اہلِ سعادت میں اور اہلِ مغفرت میں ثابت اور برقرار رکھیں کیونکہ آپ لکھے ہوئے کو مٹا دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں ثابت رکھتے ہیں اور آپ ہی کے پاس ام الکتاب ہے۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ! اگر آپ نے مجھے نیک بختوں میں لکھا ہے تو مجھے ان میں ثابت رکھیں اور اگر آپ نے مجھے بدبختوں میں لکھا ہے تو مجھے اس سے مٹا دیں اور مجھے نیک بختوں میں لکھ دیں، کیونکہ آپ جس لکھے ہوئے کو چاہتے ہیں مٹا دیتے ہیں اور جس لکھے ہوئے کو چاہتے ہیں ثابت اور برقرار رکھتے ہیں اور آپ ہی کے پاس ام الکتاب ہے۔

اور حضرت ابو وائل رضی اللہ عنہ اکثر اوقات یہ دعا کرتے تھے کہ اے اللہ! اگر آپ نے مجھے بدبختوں میں لکھا ہے تو اس کو مٹا دیں اور

نیک بختوں میں مجھے لکھ دیں، اور اگر آپ نے مجھے نیک بختوں میں لکھا ہے تو اس کو ثابت اور برقرار رکھیں، کیونکہ آپ جس لکھے ہوئے کو مٹانا چاہیں اس کو مٹا دیتے ہیں اور جس کو ثابت اور برقرار رکھنا چاہیں اس کو ثابت اور برقرار رکھتے ہیں۔

اور مالک بن دینار نے کہا کہ ایک عورت نے اللہ عزوجل سے دعا کی کہ اے اللہ! اگر میرے پیٹ میں لڑکی ہے تو اس کو لڑکے سے تبدیل فرما دیں، کیونکہ آپ جس لکھے ہوئے کو مٹانا چاہیں اس کو مٹا دیتے ہیں اور جس لکھے ہوئے کو برقرار رکھنا چاہیں برقرار رکھتے ہیں اور آپ ہی کے پاس ام الکتاب ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو اس بات سے خوش ہو کہ اس کے رزق میں کشادگی فرمائی جائے اور اس کی موت کو موخر فرمایا جائے تو وہ صلۂ رحم کرے یعنی رشتہ داروں سے حسن سلوک کرے۔ (صحیح بخاری:۲۰۶۷، ۵۹۸۶، صحیح مسلم:۲۵۵۷، سنن ترمذی:۱۹۷۹، سنن ابن ماجہ:۳۲۸۹، مسند احمد:۳۱۳۲۲، سنن دارمی:۲۰۶۳)

اس اشکال کا جواب کہ زندگی کی مدت تو متعین ہے، پھر صلۂ رحم کی وجہ سے زندگی کی مدت کیسے بڑھے گی؟

اگر تم یہ اعتراض کرو کہ زندگیاں بھی مقدر ہیں اور رزق بھی مقدر ہے، ان میں زیادتی اور کمی نہیں ہوتی، قرآن مجید میں ہے:

فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ۝ (الاعراف:۳۴) جب وہ میعاد پوری ہو جائے گی تو وہ نہ ایک گھڑی پیچھے ہو سکیں گے اور نہ ایک گھڑی آگے ہو سکیں گے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ زیادتی اس فرشتے کے علم کے اعتبار سے ہے جس کو زندگی کے ساتھ مقرر فرما دیا گیا ہے اور جو لوح محفوظ میں ظاہر ہوتا ہے جس کو کتاب المحو والاثبات کہتے ہیں، اس کے اعتبار سے ہے، مثلاً فلاں شخص کی عمر ساٹھ سال ہے لیکن اگر وہ صلۂ رحم کرے گا تو اس کی عمر دس سال زیادہ فرما دی جائے گی اور وہ ستر سال زندہ رہے گا، اور اللہ عزوجل کو یقیناً معلوم ہے کہ وہ صلۂ رحم کرے گا اور اس کی عمر ستر سال ہوگی تو اللہ تعالیٰ کے علم کے اعتبار سے اس میں کوئی زیادتی اور کمی نہیں ہوگی اور اس کو قضائے مبرم کہا جاتا ہے۔ اور یہ زیادتی اس فرشتہ کے اعتبار سے ہے اور اس کو قضائے معلق کہا جاتا ہے۔

اور یہ بھی جواب دیا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اس کے مرنے کے بعد بھی اس کا ذکر جمیل باقی رہے گا گویا کہ وہ نہیں مرا۔ اور یا تو یہ اس وجہ سے ہے کہ اس نے لوگوں کو ایسا علم پہنچایا جس سے ان کو نفع حاصل ہوا یا اس نے صدقۂ جاریہ کیا اور یا اس نے نیک اولاد چھوڑی، تو اس کے مرنے کے بعد بھی اس کی نیکیوں کا سلسلہ جاری رہے گا۔

(عمدۃ القاری ج ۲۲ ص ۱۴۳، دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۲۱ھ)

میں کہتا ہوں: خلاصہ یہ ہے کہ "وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ" سے مراد قضائے مبرم ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ اور جس قضاء میں تبدیلی ہوتی ہے وہ قضائے معلق ہے کہ اگر کسی بندے نے نیک عمل کیے تو اس کی عمر بڑھا دی جائے گی ورنہ نہیں۔ لیکن اللہ عزوجل کو قضائے مبرم کے مرتبہ میں علم ہوتا ہے کہ وہ نیک عمل کرے گا یا نہیں کرے گا اور اس کی عمر بڑھائی جائے گی یا نہیں بڑھائی جائے گی۔ اس لیے اصل چیز قضائے مبرم ہے اور وہی اللہ تعالیٰ کا علم ہے اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی۔ (سعیدی غفرلہ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اگر ہم آپ کو اس عذاب کا کچھ حصہ دکھا دیں جس سے ہم ان (کافروں) کو

ڈراتے ہیں یا آپ کی مدتِ حیات پوری فرمادیں تو آپ کے ذمہ تو صرف احکام کا پہنچا دینا ہے اور ہمارا کام حساب لینا ہے O" (الرعد: ۴۰)

"وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ": اس آیت میں "ما" زائدہ ہے اور اصل عبارت اس طرح ہے کہ اگر ہم آپ کو اس عذاب کا بعض حصہ دکھادیں جس کو ہم نے کفار کے لیے تیار فرما رکھا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ـــ (الرعد: ۳۴)" (ان کے لیے دنیا کی زندگی میں عذاب ہے)۔ یعنی اگر ہم آپ کو اس عذاب کا بعض حصہ دکھادیں جس سے ہم نے ان کو ڈرایا ہے۔

"اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ": یعنی آپ کے ذمہ صرف احکام کو پہنچانا ہے اور جزا اور سزا دینا یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "کیا ان کافروں نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم ہر طرف سے زمین کے رقبہ کو کم کرتے جارہے ہیں، اور اللہ حکم فرماتے ہیں اور کوئی ان کے حکم کو رد کرنے والا نہیں ہے اور وہ بہت جلد حساب لینے والے ہیں O" (الرعد: ۴۱)

"اَوَلَمْ يَرَوْا": یعنی کیا اہلِ مکہ نے یہ نہیں دیکھا۔

"اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا": کہ ہم ہر طرف سے زمین کے رقبہ کو کم کرتے جارہے ہیں۔

زمین میں کمی کرنے کے متعدد محامل

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد نے کہا: یعنی زمین کے کسی حصہ سے ہم وہاں کے علماء اور صلحاء کی روحوں کو قبض فرمادیتے ہیں، القشیری نے کہا: اس بناء پر الاطراف کا معنی الاشراف ہے۔ لیکن یہ قول بعید ہے کیونکہ اس آیت کا مقصود یہ ہے کہ ہم ان کو ان کے معاملات میں کمی کو دکھاتے ہیں تاکہ وہ یہ جان لیں کہ ان سے عذاب کو موخر فرمانا اللہ عزوجل کے عجز کی وجہ سے نہیں ہے۔ یا یہ کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کو اس پر محمول کیا جائے کہ ہم زمین کے بعض حصوں میں سے یہود اور نصاریٰ کے علماء کی روحوں کو قبض فرمالیتے ہیں۔

اور مجاہد، قتادہ اور حسن بصری نے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ مشرکین کے ہاتھوں میں جو مسلمان قید ہیں، ان کو مسلمان چھڑا لیتے ہیں، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ زمین کا ایک حصہ تباہ و برباد ہوجاتا ہے۔ اور مجاہد سے مروی ہے کہ زمین کے ایک حصہ کے لوگ مرجاتے ہیں، اور عطاء بن ابی رباح نے اس آیت کی تفسیر میں کہا کہ زمین کے اس حصہ کے فقہاء اور نیک لوگ فوت ہوجاتے ہیں۔

اور علامہ ابوعمر بن عبدالبر نے کہا ہے کہ اس آیت کی تاویل میں عطاء بن ابی رباح کا قول بہت عمدہ ہے اور اس کو اہلِ علم نے قبول کیا ہے۔ اور دوسروں نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ قریش سے پہلے جو امتیں ہلاک ہوگئیں اور ان کی زمینیں بھی اس کے بعد تباہ ہوگئیں اور آیت کا معنی یہ ہے کہ کیا قریش نے اپنے سے پہلے لوگوں کی ہلاکت کو نہیں دیکھا اور ان کی زمین کی تباہی کو نہیں دیکھا تو وہ

اس بات سے کیوں نہیں ڈرتے کہ اُن پر بھی ایسا ہی عذاب آ جائے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ زمین کی برکات میں، اس کے پھلوں میں اور وہاں کے رہنے والوں میں کمی ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس زمین کے حکمرانوں کے ظلم وستم کی وجہ سے اس زمین کی برکتیں اٹھالی جاتی ہیں۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں: یہ معنی صحیح ہے کیونکہ ظلم وستم شہروں کو تباہ کر دیتا ہے اور زمین سے اس کی برکتوں کو اٹھا لیتا ہے۔

"وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ": یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم میں کوئی کمی نہیں ہوتی اور نہ اس میں کوئی تغیر ہوتا ہے۔

"وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ": اور وہ بہت جلد کافروں سے انتقام لینے والے ہیں اور مومنین کو ثواب عطا فرمانے والے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ان سے پہلی امتیں بھی اپنے انبیاء کے خلاف سازشیں کرتی رہی ہیں، سو تمام خفی تدبیروں کے اللہ مالک ہیں، ہر شخص جو کام کر رہا ہے وہ اس کو بہ خوبی جانتا ہے اور عنقریب کافروں کو معلوم ہو جائے گا کہ آخرت میں اچھا انجام کس کے لیے ہے O" (الرعد: ۴۲)

"وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ": یعنی مشرکین مکہ سے پہلے بھی لوگوں نے اپنے رسولوں کے خلاف سازشیں کی تھیں اور ان کا انکار کیا تھا۔ "فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا" یعنی ہر قسم کی سازش اللہ تعالیٰ کی پیدا فرمائی ہوئی ہے، تو ان کی سازش اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر کسی کو ضرر نہیں پہنچا سکتی، اور اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ ان کے مکر اور ان کی سازش کی اللہ تعالیٰ سزا دیں گے۔

"يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ": یعنی ہر انسان جو بھی اچھا یا برا کام کرتا ہے اس کو اللہ عزوجل جاننے والے ہیں۔

"وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ": کفار جمع کا صیغہ ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد ابوجہل ہے۔

"لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ": یعنی کافروں کو عنقریب پتا چل جائے گا کہ دنیا میں ثواب اور عقاب کس کے لیے ہے اور آخرت میں ثواب اور عقاب کس کے لیے ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دھمکی بھی دی ہے اور عذاب کی وعید بھی ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور کفار کہتے ہیں: "آپ اللہ کے رسول نہیں ہیں"، آپ کہیے: "میرے اور تمہارے درمیان اللہ کا گواہ ہونا کافی ہے اور وہ لوگ بھی کافی گواہ ہیں جن کے پاس آسمانی کتاب کا علم ہے" O" (الرعد: ۴۳)

"وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا": قتادہ نے بیان کیا کہ یہ مشرکین عرب ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ آپ نہ نبی ہیں اور نہ رسول ہیں۔ آپ اپنی طرف سے بیان کرتے ہیں۔ یعنی جب اُن کے فرمائشی معجزات نہیں دکھائے گئے تو انہوں نے اس طرح کہا۔

"قُلْ": یعنی اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپ ان سے کہیے: "كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ" یعنی میرے صدق پر اور تمہارے کذب پر صرف اللہ تعالیٰ کی گواہی کافی ہے۔

"وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ": اور جن کے پاس کتاب کا علم ہے، یہ مشرکین عرب کے خلاف دلیل اور حجت ہے کیونکہ وہ اہل کتاب کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اور اس سے مراد اہل کتاب کے مومنین ہیں جیسے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ، حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ، النجاشی اور اس کے اصحاب۔ (الجامع لاحکام القرآن، ج ۹، ص ۲۷۶-۲۸۶، دارالکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

ابراھیم ۱۴
وما ابرئ ۱۳
ابراھیم (۱۴)
تبیان القرآن
487
جلد سوم
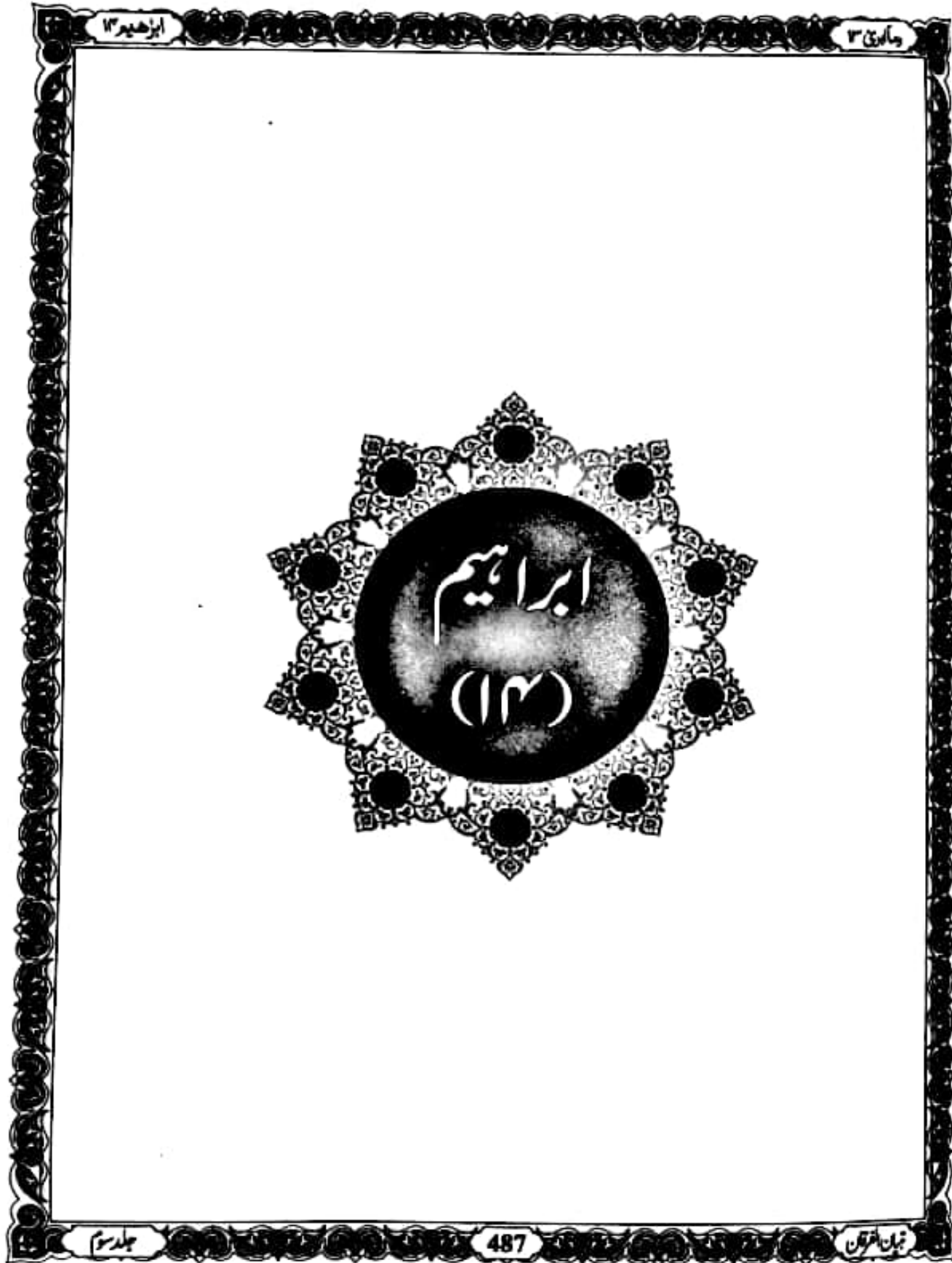
سورۂ ابراہیم کا اجمالی تعارف

سورۂ ابراہیم کی وجہ تسمیہ

اس سورت کا نام سورۂ ابراہیم رکھا گیا ہے، کیونکہ اس سورت میں انبیاء علیہم السلام کے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کچھ قصہ بیان فرمایا گیا ہے جو اُن کی مکہ میں گزاری ہوئی زندگی سے متعلق ہے۔ اور اُن کا عربوں کے ساتھ میل جول کا ذکر ہے، اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کا بھی ذکر ہے، اور یہ کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام دونوں نے "البیت الحرام" کی تعمیر کی، اور یہ کہ وہ دونوں اللہ تعالیٰ سے ہدایت کی دعا کرتے تھے۔ اور یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ انہیں اور ان کے بیٹوں کو بتوں کی عبادت سے محفوظ اور مامون رکھیں، اور یہ کہ اُن کی بیوی کو اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو مکہ کے پھلوں سے رزق عطا فرمائیں اور یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد کو نماز پر قائم رکھنے والا بنائیں۔ ان امور کا ذکر ابراہیم: ۳۵ سے ابراہیم: ۴۱ میں ہے۔

سورۂ ابراہیم کی سورۃ الرعد کے ساتھ مناسبت

سورۃ الرعد میں جن امور کو اجمالاً بیان کیا گیا ہے، اس سورت میں اُن کی تفصیل ہے، پس سورۃ الرعد میں اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو عربی زبان کی صورت میں نازل فرمایا (الرعد: ۳۷)، اور اس سورت میں اس کی حکمت اور غایت بیان فرمائی ہے اور یہ بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قرآن کے ذریعہ لوگوں کو اندھیروں سے نور کی طرف رہنمائی فرمائی۔ (ابراہیم: ۱)

اور ان دونوں سورتوں میں یہ بتایا ہے کہ اللہ عزوجل کے حکم اور اُن کے اذن کے بغیر کوئی معجزہ نہیں پیش کیا جا سکتا۔ سورۃ الرعد میں فرمایا تھا: "وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ ۝ (الرعد: ۳۸)"۔ (اور کسی رسول کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر کوئی معجزہ لے آئے، اور ہر فیصلہ کتاب میں لکھا ہوا ہے) اور سورۂ ابراہیم میں رسولوں کی زبان سے فرمایا ہے: "وَمَا كَانَ لَنَا أَنْ نَأْتِيَكُمْ بِسُلْطَانٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝ (ابراہیم: ۱۱)" (اور ہمارا یہ منصب نہیں ہے کہ ہم اللہ کی اجازت کے بغیر تمہارے سامنے کوئی معجزہ پیش کر دیں اور ایمانداروں کو اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے O)۔

اور ان دونوں سورتوں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ذکر کی گئی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بغیر ستونوں کے آسمانوں کو بلند فرمایا اور زمین کو پھیلا دیا اور سورج اور چاند کو اپنے احکام سے مسخر فرمایا، اور مختلف رنگوں اور مختلف ذائقوں کے پھلوں کو پیدا فرمایا۔

سورۂ ابراہیم کے مضامین

(۱) سورۂ ابراہیم میں عقائد کے اصول کو ثابت فرمایا ہے، یعنی اللہ عزوجل پر ایمان لانا اور ان کے رسولوں پر ایمان لانا اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے پر ایمان لانا اور جزا اور سزا پر ایمان لانا، اور توحید کا اقرار کرنا۔ اور یہ بتلایا ہے کہ آسمانوں اور زمینوں کو برحق پیدا فرمانے والے اللہ عزوجل ہیں۔ اور قرآن مجید کا بنیادی مقصد لوگوں کو اندھیروں سے نور کی طرف لانا ہے۔ اور رسولوں کی دعوت اس لیے ہے کہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف متوجہ کیا جائے اور اُن کو گمراہی سے ہدایت پر لایا جائے۔

(۲) سورۂ ابراہیم میں وعد اور وعید کا ذکر ہے، کافروں کی مذمت فرمائی ہے اور اُن کے کفر پر اصرار کرنے کی وجہ سے اُن کو عذاب کی وعیدیں سنائی ہیں اور ان کو عذاب شدید کی دھمکی دی ہے اور مومنین سے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ نیک اعمال کرتے رہیں گے تو اللہ تعالیٰ

اُن کو جنتیں عطا فرمائیں گے۔(ابراہیم: ۲، ابراہیم: ۲۳، ابراہیم: ۲۸، ۳۱)

(۳) سورۂ ابراہیم میں یہ بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو اُن کی قوموں کی زبانوں میں مبعوث فرمایا ہے تا کہ لوگوں کے لیے شریعت کا سمجھنا آسان ہو۔(ابراہیم: ۴)

(۴) سورۂ ابراہیم میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ اگر یہ آپ کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور آپ کی تبلیغ کو قبول نہیں کرتے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، آپ سے پہلے رسولوں کے ساتھ بھی ایسا ہوا ہے۔قومِ نوح، قومِ عاد، قومِ ثمود اور اُن کے بعد جو قومیں تھیں، ان سب نے اپنے اپنے زمانہ میں اپنے اپنے رسولوں کی تکذیب کی، اور اللہ تعالیٰ نے اُن پر نازل ہونے والے عذاب سے آپ کی قوم کو ڈرایا ہے جیسا کہ ابراہیم: ۹۔۱۲ اور ابراہیم: ۱۳۔۱۸ میں اس کا ذکر ہے۔

(۵) انبیاء متقدمین کے قصوں میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر فرمایا ہے، انہوں نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کی دعوت دی۔(ابراہیم: ۵۔۸)

(۶) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی تعمیر کے بعد جو دعائیں کیں کہ اہلِ مکہ کو اللہ تعالیٰ امان میں رکھیں اور رزق عطا فرمائیں اور لوگوں کے دلوں کو بیت الحرام کی طرف مائل فرما دیں، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اور ان کی اولاد کو بتوں کی عبادت سے محفوظ رکھیں، اور اپنے رب کا اس پر شکر ادا کیا ہے کہ انہیں بڑھاپے میں اولاد عطا فرمائی، اور انہیں اور ان کی اولاد کو نماز قائم کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔اور انہوں نے اپنے لیے اور اپنے والدین کے لیے اور دیگر مومنین کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کو طلب فرمایا۔

(۷) آخرت میں جو اہلِ دوزخ سے مکالمہ ہوگا اس کا ذکر فرمایا ہے۔(ابراہیم: ۱۹۔۲۳)

(۸) کلمۃ الحق اور ایمان کی الشجرۃ الطیبۃ کے ساتھ مثال دی ہے، اور کلمۃ الباطل اور گمراہی کی الشجرۃ الخبیثۃ کے ساتھ مثال دی ہے۔(ابراہیم: ۲۴۔۲۷)

(۹) قیامت کی ہولناکیاں یاد دلائی ہیں اور ظالموں کو مختلف قسم کے عذابوں سے ڈرایا ہے۔(ابراہیم: ۴۲۔۵۲)

(۱۰) کفار سے جو عذاب کو قیامت تک کے لیے موخر فرمایا ہے، اس کی حکمت بیان فرمائی ہے۔(ابراہیم: ۵۱۔۵۲)

(۱۱) سورۂ ابراہیم میں انبیاء کی تاریخ کا ایک قصہ بھی ذکر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: اپنی قوم کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئیں، نیز فرمایا "وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ" اور انہیں تاریخی واقعات یاد دلائیں، "اَيّٰىمِ اللّٰهِ" سے مراد وہ دن ہیں جب اللہ تعالیٰ نے بعض اقوام پر نعمتیں نازل فرمائیں اور بعض پر عذاب نازل فرمایا۔ان کو اصطلاح میں ایام نعیم اور ایام تعذیب بھی کہا جاتا ہے۔ایسے واقعات کے ذکر سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر اور ان کی ناشکری کو بیان فرمایا گیا ہے، اس ضمن میں انبیاء علیہم السلام کے طریقہ تعلیم و تربیت اور ان کی تبلیغ کو بھی بیان فرمایا گیا ہے، اس کے علاوہ مسلمانوں کو یہ بھی سمجھایا گیا ہے کہ کافروں کے ساتھ بحث و مباحثہ کرتے وقت کون سا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

(۱۲) سابقہ سورتوں کی طرح سورۂ ابراہیم کی ابتداء میں بھی حروف مقطعات کا ذکر ہے، قرآن مجید کی انتیس (۲۹) سورتوں کی ابتداء میں حروف مقطعات آئے ہیں۔بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ہر حرف مفرد سے اللہ تعالیٰ کے کسی اسم مفرد کی طرف اشارہ ہوتا ہے، الف سے اللہ کا اسم ذات مراد ہوتا ہے، لام سے لطیف اور راء سے رحمٰن یا رحیم مراد لیا جا سکتا ہے۔

آیاتھا ۵۲ | ۱۴ سُوْرَةُ اِبْرٰهِيْمَ مَكِّيَّةٌ ۷۲ | رکوعاتھا ۷

(سورۃ ابراہیم مکی ہے اور اس میں باون آیات اور سات رکوع ہیں)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ عزوجل کے بابرکت نام سے ہی (ابتداء ہے) جو سب پر رحم فرمانے والے، نہایت مہربان ہیں

الٓرٰ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝۱

الٓرٰ قرآن مجید وہ عظیم کتاب ہے جس کو ہم نے آپ کی طرف نازل فرمایا ہے تاکہ آپ لوگوں کو اُن کے رب کے حکم سے کفر کے اندھیروں سے نکال کر ایمان کی روشنی کی طرف لائیں ان کے راستہ کی طرف جو سب پر غالب، تمام کمالات کے جامع ہیں ○

اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِ ۝۲

اللہ ہی وہ ہیں جن کی ملکیت میں تمام آسمان اور تمام زمینیں ہیں اور کافروں کے لیے سخت عذاب کی تباہی ہے ○

الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ۝۳

وہ کفار جو دنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں اور لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں اور اللہ کے راستہ میں کجی تلاش کرتے ہیں، وہ بہت دور کی گمراہی میں مبتلاء ہیں ○

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۭ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۴

اور ہم نے جس رسول کو بھی مبعوث فرمایا تو اس کو اسی کی قوم کی زبان میں مبعوث فرمایا تاکہ وہ رسول اُن کے سامنے اللہ تعالیٰ کے احکام بیان کریں، پس جس کو اللہ چاہیں اسے گمراہی پر چھوڑ دیتے ہیں اور جس کو ہدایت دینا چاہیں تو وہ سب پر غالب، سب سے زیادہ حکمت والے ہیں ○

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝۵

اور بے شک ہم نے موسیٰ کو اپنے معجزات عطا فرما کر بھیجا کہ وہ اپنی قوم کو کفر کے اندھیروں سے ایمان کی روشنی کی طرف لائیں اور انھیں اُن ایام کی یاد دلائیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اُن پر نعمتیں عطا فرمائی تھیں، اور بے شک اس یاد دہانی میں ہر بہت زیادہ صبر کرنے والے اور بہت زیادہ شکر ادا کرنے والے کے لیے بہت نشانیاں ہیں O

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝۶ ع

اور (اے رسول اکرم!) آپ یاد کیجئے: جب موسیٰ نے اپنی قوم بنی اسرائیل سے کہا: ”تم اپنے اوپر اللہ کے اُن احسانات کو یاد کرو جب اللہ نے تمھیں آلِ فرعون کے مظالم سے نجات عطا فرمائی جو تمھیں بدترین تکلیفیں دیتے تھے، وہ تمہارے بیٹوں کو ذبح کر دیتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے، اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑی آزمائش تھی O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”الٓرٰ قرآن مجید وہ عظیم کتاب ہے جس کو ہم نے آپ کی طرف نازل فرمایا ہے تاکہ آپ لوگوں کو اُن کے رب کے حکم سے کفر کے اندھیروں سے نکال کر ایمان کی روشنی کی طرف لائیں ان کے راستہ کی طرف جو سب پر غالب، تمام کمالات کے جامع ہیں O“ (ابراہیم: ۱)

امام ابو منصور محمد بن محمد ماتریدی المتوفی ۳۳۳ھ، ابراہیم: ۱ تا ۶ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ“: الرٓ حروف مقطعات سے کنایہ ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے ان کو کتاب بنا دیا۔

”اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ“: یعنی ہم نے ان حروف کو جمع فرمایا اور ان کو بہ صورت کتاب نازل فرمایا۔ اور آپ کی طرف ان کو اس وقت نازل فرمایا جب آپ از خود اپنی عقل سے نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا چیز ہے، جیسے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ ...... (الشوریٰ: ۵۲)“ (اس سے پہلے آپ (از خود) نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور احکام شرعیہ کی تفصیل کیا ہے؟)۔ اور فرمایا: ”وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ (العنکبوت: ۴۸)“ (اور (اے رسول اکرم!) قرآن کے نازل ہونے سے پہلے نہ تو آپ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ ہی آپ اس کتاب کو اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتے تھے، ورنہ باطل پرست ضرور شک میں مبتلا ہو جاتے)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نزول قرآن سے پہلے کسی کتاب سے نہ پڑھنا اور کسی کتاب سے نہ لکھنا آپ کا معجزہ ہے،

اسی طرح نزول قرآن کے بعد آپ کا لکھنا اور پڑھنا بھی معجزہ ہے

میں کہتا ہوں: اس آیت میں یہ قید فرمائی ہے کہ قرآن مجید کے نزول سے پہلے آپ نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ کسی کتاب سے لکھتے تھے، کیونکہ اگر آپ پہلے سے کسی کتاب کو پڑھنے والے ہوتے اور لکھنے والے ہوتے تو باطل پرست یہ سمجھتے کہ آپ نے قرآن مجید میں جو واقعات اور قصص بیان فرمائے ہیں وہ پہلی کسی کتاب میں پڑھ لیے تھے اور جب کہ آپ اُمی تھے اور پہلے نہ لکھتے تھے اور نہ پڑھتے تھے تو معلوم ہوا کہ ان تمام واقعات پر اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ آپ کو مطلع فرمایا، سو یہ آپ کی نبوت کے صدق پر دلیل ہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نزول کتاب سے پہلے آپ نہ کسی کتاب کو پڑھتے تھے اور نہ کسی چیز کو لکھتے تھے اور اس قید سے یہ واضح ہوا کہ نزول قرآن کے بعد آپ کتابوں کو پڑھتے بھی تھے اور کتاب سے لکھتے بھی تھے۔ سو آپ کا نزول قرآن سے پہلے نہ کسی کتاب کو پڑھنا اور نہ لکھنا یہ معجزہ ہے، اسی طرح نزول قرآن کے بعد آپ کا کسی کتاب کو پڑھنا اور کسی کتاب سے لکھنا یہ بھی آپ کا معجزہ ہے، کیونکہ بغیر کسی کی تعلیم کے آپ نے لکھا بھی اور پڑھا بھی، جیسا کہ حدیث میں ہے:

"عن البراء بن عازب رضی اللہ عنہ قال: لما صالح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اهل الحديبية كتب علی بینهم كتابا، فكتب محمد رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم فقال المشركون: لا تكتب محمد رسول الله، لو كنت رسولا لم نقاتلك، فقال لعلي: امحه، فقال علي: ما انا بالذي امحاه، فمحاه رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم بيده" (حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل حدیبیہ سے صلح کی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے درمیان مکتوب لکھا، پس لکھا: محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، تو مشرکین نے کہا: "محمد رسول اللہ" نہ لکھو، اگر آپ (ہمارے نزدیک) رسول ہوتے تو ہم آپ سے جنگ نہ کرتے، پس آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اس کو مٹا دو، تب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: میں وہ نہیں ہوں جو آپ (کے نام) کو مٹا دوں، تب اس (نام) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے مٹا دیا)۔

(صحیح البخاری: ۲۶۹۸، صحیح مسلم: ۱۷۸۳، الرقم المسلسل: ۴۵۲۱، سنن ابوداؤد: ۱۸۳۲، سنن ترمذی: ۹۳۸، صحیح ابن حبان: ۴۸۷۳، مسند احمد ج ۴ ص ۲۹۸، طبع قدیم، مسند احمد: ۱۸۶۳۵، ج ۳۰ ص ۵۹۴، مؤسسۃ الرسالہ، بیروت)

اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے صلح نامہ کو پڑھا بھی اور اس میں لکھا بھی۔ اور اس میں یہ واضح ثبوت ہے کہ آپ کو لکھنے اور پڑھنے کا علم تھا۔ (سعیدی غفرلہٗ)

"لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ﺫ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ": کہا گیا ہے کہ آپ لوگوں کو کفر سے ایمان کی طرف لائیں۔ کفر کو جمع کے صیغہ کے ساتھ ظلمات فرمایا، حالانکہ کفر صرف ایک چیز ہے، کیونکہ کفر تمام اعضاء کے منافع کو چھپا دیتا ہے بصر، سمع اور لسان کے منافع کو چھپا دیتا ہے۔ اسی طرح ایمان لانے سے تمام اعضاء پر ایمان کے نور کا ظہور ہوتا ہے، اور ایمان کفر کے تمام حجابات اور پردوں کو کھول دیتا ہے اور ہر مخفی چیز اس کے سامنے روشن ہو جاتی ہے۔

ایمان لانے سے ظلماتِ کفر سے نورِ اسلام کی طرف خروج

اس کی چار صورتیں ہیں:

(۱) آپ اُن کو اسلام کے احکام پر عمل کرنے کا حکم دیتے تھے اور اس کی دعوت دیتے تھے۔

(۲) اسلام کے خلاف اُن کے شکوک و شبہات کو دور فرماتے تھے اور حق کو واضح سے واضح تر بیان فرماتے تھے۔

(۳) انہیں مرغوب چیز کی طرف رغبت دلاتے یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کی طرف رغبت دلاتے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈراتے۔

(۴) اس کی تحقیق کہ جس سے ہدایت حاصل ہوتی ہے، اور وہ صرف اللہ عزوجل کی توفیق سے اور اس کی عصمت سے حاصل ہوتی ہے۔

"الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ" کا معنیٰ

"اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ": یعنی آپ انہیں "الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ" کے راستہ کی طرف ہدایت دیتے۔

"الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ" اللہ عزوجل ہیں، اللہ عزوجل کو "الْعَزِیْزِ" اس لیے فرمایا کہ ہر عزیز کو انہی کی بدولت عزت، دولت اور غلبہ دیا جاتا ہے، یا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بذاتہٖ "الْعَزِیْزِ" ہیں اور مخلوق کی طرح نہیں ہیں، اور "الْعَزِیْزِ" کا معنیٰ ہے جو بھی مغلوب نہ ہو۔ اور "الْحَمِیْدِ" کا معنیٰ ہے: جس کے افعال میں اس کی مدح اور ستائش کی جائے اور اس کی تدبیر میں کوئی خطا نہ ہو۔ اور بعض اہل تاویل نے کہا ہے: "الْعَزِیْزِ" کا معنیٰ ہے المنیع (یعنی ناشائستہ کام کو دور فرمانے والے) اور "الْحَمِیْدِ" کا معنیٰ ہے جو تھوڑی عبادت کو بھی قبول فرمالیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اللہ ہی وہ ہیں جن کی ملکیت میں تمام آسمان اور تمام زمینیں ہیں اور کافروں کے لیے سخت عذاب کی تباہی ہے ○" (ابراہیم:۲)

"اللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ": یہ اس لیے فرمایا تا کہ مخلوق کو معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کو حکم فرماتے ہیں اور اُن کو دینِ حق کی طرف دعوت دیتے ہیں اور مختلف مشقت والے کاموں کا مکلف کر کے ان کی آزمائش فرماتے ہیں، اور یہ سب وہ اپنی ذات کو نفع پہنچانے کے لیے نہیں کرتے اور نہ اپنی کسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کرتے ہیں، بلکہ جن کی آزمائش فرماتے ہیں، ان کو اس کی ضرورت ہوتی ہے، تا کہ اس آزمائش پر پورا اترنے کے بعد ان کو دنیا اور آخرت میں کامیابی حاصل ہو۔

لفظ "وَیْلٌ" کے متعدد معانی اور لفظِ "وَیْلٌ" کا مصداق

"وَوَیْلٌ لِّلْکٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ": الویل کا معنیٰ ہے شدت، اور دوسرا قول یہ ہے کہ "الویل" جہنم کی ایک وادی کا نام ہے۔ الاصم نے کہا: ہر مصیبت زدہ کی پکار کو "وَیل" کہتے ہیں اور جو شدید آزمائش میں لپٹا ہوا ہو، اس کی نداء کو بھی ویل کہتے ہیں۔ حسن بصری کا بھی قول اسی طرح ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وہ کفار جو دنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں اور لوگوں کو اللہ کے

راستہ سے روکتے ہیں اور اللہ کے راستہ میں کجی تلاش کرتے ہیں، وہ بہت دور کی گمراہی میں مبتلاء ہیں O"
(ابراہیم: ۳)

"اَلَّذِیْنَ یَسْتَحِبُّوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا عَلَى الْاٰخِرَةِ": اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ جو لوگ الویل کے مستحق ہیں، وہ کون ہیں۔ فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں، جو دنیا کی زندگی پر مطمئن ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ اطْمَاَنُّوْا بِهَا وَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ O (یونس: ۷)" (بے شک جو لوگ ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے اور وہ دنیا کی زندگی سے راضی ہو گئے اور انہوں نے اسی پر قناعت کر لی اور وہ لوگ جو ہماری آیتوں سے غفلت میں پڑے ہوئے ہیں O)۔ یعنی جن لوگوں نے دنیا کی زندگی کو دنیا کے لیے اختیار کیا اور دنیا کی زندگی کو آخرت کے لیے اختیار نہیں کیا، حالانکہ دنیا کی زندگی کو دنیا کے لیے نہیں بنایا گیا ہے بلکہ اس کو آخرت کے لیے بنایا گیا ہے، پس جس نے دنیا کی زندگی کو اختیار کر لیا نہ اس لیے کہ وہ اس سے آخرت کو حاصل کرے تو وہ راہِ حق سے گمراہ ہو گیا۔ اور اس کا یہ معنی بھی ہے کہ وہ دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں حتیٰ کہ آخرت سے غافل ہو جاتے ہیں۔ ورنہ اہلِ اسلام دنیا کی زندگی کو آخرت کے فوائد کے لیے حاصل کرتے ہیں۔

"وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ": یعنی وہ خود بھی اسلام سے اعراض کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی اللہ کے دین کے راستہ پر چلنے سے روکتے ہیں۔ "وَ یَبْغُوْنَهَا عِوَجًا": وہ اسلام میں طعنہ زن ہوتے ہیں اور اسلام میں عیب نکالتے ہیں۔ اور اس میں یہ دلیل ہے کہ یہ آیت مکہ کے سرداروں کے متعلق نازل ہوئی ہے اور اُن کے پیشواؤں کے متعلق جو لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکتے تھے اور اللہ کے دین میں طعن اور عیب نکالتے تھے۔ اور انہوں نے اللہ کے دین میں نہ کوئی طعن کی وجہ پائی اور نہ عیب کی دلیل پائی۔

"اُولٰٓىِٕكَ فِیْ ضَلٰلٍۭ بَعِیْدٍ": یعنی وہ سب لوگ ہلاک ہوئے اور اس میں ہرگز نجات نہیں ہے۔
اور یہ بھی احتمال ہے کہ وہ سخت حیرت میں مبتلاء ہیں اور ہدایت کا راستہ بالکل نہیں پاتے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "ضَلٰلٍ" کا معنی یہ ہو کہ وہ بہت دور کے بُطلان میں مبتلاء ہیں، حتیٰ کہ ان کی کبھی بھی اصلاح نہیں ہو سکے گی، اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کو ازل میں علم ہے کہ وہ کبھی بھی ہدایت کو نہیں پائیں گے اور ان کا خاتمہ گمراہی پر ہوگا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ہم نے جس رسول کو بھی مبعوث فرمایا تو اس کو اسی کی قوم کی زبان میں مبعوث فرمایا تاکہ وہ رسول اُن کے سامنے اللہ تعالیٰ کے احکام بیان کریں، پس جس کو اللہ چاہیں اسے گمراہی پر چھوڑ دیتے ہیں اور جس کو ہدایت دینا چاہیں تو وہ سب پر غالب، سب سے زیادہ حکمت والے ہیں O" (ابراہیم: ۴)

"وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِیُبَیِّنَ لَهُمْ": کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو بعینہٖ حجت قرار دیا ہے اور اپنی رسالت کی نشانی قرار دیا ہے، کیونکہ جب لوگ اس کی مثال لانے سے عاجز ہو گئے حالانکہ وہ انہی کی زبان میں تھی تو جان لیں گے کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، کیونکہ اگر یہ کتاب رسول کی بنائی ہوئی ہوتی تو وہ بھی اس کی مثل لانے پر قادر ہوتے، کیونکہ اُن کی زبان اس نبی کی زبان کی مثل ہے، پس جب وہ اس کی مثال لانے سے عاجز ہوئے تو معلوم ہوا کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی

طرف سے نازل فرمائی گئی ہے اور مخلوق کی طرف سے نہیں بنائی گئی۔

پھر اس آیت کی تین توجیہات ہیں:

(۱) جب زبانیں مختلف ہو گئیں تو رسول کو اس کی زبان میں مبعوث فرمایا اور اس میں اُن سے پہلے لوگوں کی خبریں ہیں جن کی زبانیں اس نبی کی زبان کے مغایر تھیں اور اُن کی خبریں بھی اس کے مغایر تھیں تا کہ وہ جان لیں کہ یہ خبریں جو اُن کی زبان میں نہیں ہیں تو ان خبروں کو صرف اللہ عزوجل نے بھیجا ہے۔

(۲) اور بعض نے کہا: رسول کو اُن کی قوم کی زبانوں میں مبعوث فرمایا تا کہ وہ یہ اعتراض نہ کر سکیں کہ ہمیں تو اس رسول کی زبان کا علم ہی نہیں ہے تو اس کی باتیں ہمارے لیے کیسے حجت ہوں گی؟

(۳) یہ اللہ عزوجل کی طرف سے مخلوق پر لطف ہے کہ انہوں نے لوگوں کی طرف جو رسول بھیجے وہ انہی کی لغات پر بولنے والے بھیجے، تا کہ وہ سمجھ لیں کہ اللہ عزوجل اُن سے کس چیز کا ارادہ فرماتے ہیں اور اُن کی طرف کس چیز کو بھیجا ہے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جو نبی بھی بھیجا وہ اس کی قوم کی لغت پر بھیجا۔

"فَیُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ": یعنی بیان کے بعد اور حجت قائم فرمانے کے بعد جس کو اللہ تعالیٰ چاہیں گے اس کو گمراہی پر چھوڑ دیں گے اور جس کو چاہیں گے اس کو حق کی طرف ہدایت فرمائیں گے۔

"وَ هُوَ الْعَزِیْزُ": اور وہ سب پر غالب ہیں، وہ جو چاہتے ہیں ہو جاتا ہے اور جو وہ نہیں چاہتے وہ نہیں ہوتا۔

"الْحَكِیْمُ": ان کے تمام افعال حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔ پس جو گمراہ کیے جانے کا مستحق ہو اس کو گمراہ فرما دیتے ہیں اور جو ہدایت دیے جانے کا اہل ہو، اس کو ہدایت عطا فرماتے ہیں۔ اور ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق میں یہی سنت رہی ہے کہ انہوں نے جو نبی بھی کسی امت میں بھیجا، وہ اُن کی لغت کے مطابق بھیجا۔ پس ہر نبی اپنی رسالت کا پیغام اپنی زبان میں پہنچاتا نہ کہ دوسرے کی زبان میں۔ اور سیدنا محمد بن عبد اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا، جیسا کہ حدیث میں ہے:

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے تمام انبیاء پر چھ وجوہ سے فضیلت عطا فرمائی گئی ہے، آپ سے پوچھا گیا: یا رسول اللہ! وہ کونسی وجوہ ہیں؟ آپ نے فرمایا: (۱) مجھے جوامع الکلم عطا فرمائے گئے (۲) رعب کے ساتھ میری مدد فرمائی گئی (۳) اور میرے لیے مال غنیمت کو حلال فرما دیا گیا (۴) اور میرے لیے تمام روئے زمین کو پاکیزہ اور سجدہ گاہ بنا دیا گیا (۵) اور مجھے تمام مخلوق کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا (۶) اور مجھ پر نبیوں کو ختم فرما دیا گیا۔

(صحیح مسلم: ۵۲۳، سنن ابن ماجہ: ۵۶۷، سنن ترمذی: ۱۵۵۳، مسند ابو یعلی: ۶۴۹۱، صحیح ابو عوانہ ج ۱ ص ۳۹۵، مشکل الآثار للطحاوی: ۱۰۲۵، صحیح ابن حبان: ۲۳۱۳، سنن بیہقی ج ۲ ص ۴۳۳، شرح السنہ للبغوی: ۳۶۱۷، مسند احمد: ۹۳۳۷، موسسۃ الرسالہ، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

اور اس کے شواہد بہ کثرت ہیں جیسا کہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعَا" (الاعراف: ۱۵۸) (آپ کہیے: اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں)۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "بے شک ہم نے موسیٰ کو اپنے معجزات عطا فرما کر بھیجا کہ وہ اپنی قوم کو کفر کے

اندھیروں سے ایمان کی روشنی کی طرف لائیں اور انہیں اُن ایام کی یاد دلائیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اُن پر نعمتیں عطا فرمائی تھیں، اور بے شک اس یاد دہانی میں ہر بہت زیادہ صبر کرنے والے اور بہت زیادہ شکر ادا کرنے والے کے لیے بہت نشانیاں ہیں O" (ابراہیم: ۵)

"وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ": (بے شک ہم نے موسیٰ کو اپنے معجزات عطا فرما کر بھیجا)۔

آیات کے مصداق میں متعدد اقوال

(۱) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آیات سے مراد وہ دلائل اور براہین ہوں جن کو اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور وحدانیت پر قائم فرمایا گیا ہے۔

(۲) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اُن آیات اور معجزات کے ساتھ بھیجا گیا جن کو وہ اپنی رسالت پر قائم کریں۔

(۳) اور بعض لوگوں نے کہا کہ "بِاٰيٰتِنَآ" سے مراد ہے: ہم نے اُن کو اپنے دین کے ساتھ بھیجا، یعنی ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے دین کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ لوگوں کو ہمارے دین کی دعوت دیں۔

"اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ": اور اسی طریقہ پر اللہ تعالیٰ نے تمام رسولوں اور انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا ہے تاکہ وہ اپنی قوم کو گمراہی کے اندھیروں سے نکال کر ہدایت کے نور کی طرف لائیں، اور اس کی تفسیر ہم کئی مرتبہ کر چکے ہیں۔

"بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ" کی تفسیر میں متعدد اقوال

"وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ": اس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایام کے ساتھ نصیحت کیجئے۔

اور بعض مفسرین نے کہا: "اَيَّامِ اللّٰهِ" سے مراد اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور اُن کے احسانات ہیں۔

قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ اِن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اُن احسانات کو یاد دلائیں جو اللہ تعالیٰ نے اُن پر انعام فرمائے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے متعدد ایام ہیں۔ کتنی خیر اللہ تعالیٰ نے تم کو عطا فرمائی اور کتنی مصیبتوں سے اللہ تعالیٰ نے تم کو نجات عطا فرمائی اور کتنی تنگیوں کو اللہ تعالیٰ نے کشادگی سے بدل دیا۔

اور بعض مفسرین نے کہا کہ "اَيَّامِ اللّٰهِ" سے مراد گزشتہ امتوں کے واقعات ہیں کہ جب اُن لوگوں نے اپنے رسولوں کی تکذیب کی تو کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو ہلاک فرما دیا۔

یا مکذبین کو یاد دلائیں کہ جب انہوں نے تکذیب کی تو ان کو کس طرح ہلاک فرما دیا گیا۔ یہ اس کے مشابہ ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور بنی اسرائیل کو فرعون کے مظالم سے نجات عطا فرمائی جو انہیں طرح طرح کے عذاب دیتا تھا۔

صبر اور شکر کا معنی اور "صَبَّارٍ شَكُوْرٍ" کا مصداق

"اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ": ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ صبر کا معنی ہے: نفس کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے روکنا اور تمام ممنوعہ کاموں سے روکنا۔ اور شکر کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے میں رغبت کرنا تو اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ جو شخص اپنے نفس کو نافرمانیوں سے روکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں راغب ہوتا ہے، وہ رسولوں کے سامنے تکبر نہیں کرتا اور ان کی دعوت کے قبول کرنے کو ترک نہیں کرتا۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "صَبَّار" اور "شَكُوْر" مومن کے نفس سے کنایہ ہے، کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے اور ان کی توحید پر قائم رہتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے رکے رہنے کا اعتقاد رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے میں رغبت رکھتا ہے اگرچہ کبھی کبھار اس سے معصیت ہوجاتی ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور (اے رسولِ اکرم!) آپ یاد کیجئے: جب موسیٰ نے اپنی قوم بنی اسرائیل سے کہا: "تم اپنے اوپر اللہ کے اُن احسانات کو یاد کرو جب اللہ نے تمہیں آلِ فرعون کے مظالم سے نجات عطا فرمائی جو تمہیں بدترین تکلیفیں دیتے تھے، وہ تمہارے بیٹوں کو ذبح کردیتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے، اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑی آزمائش تھی O" (ابراہیم: ۶)

"وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ":

یہ اس طرح ہے جس طرح دوسری آیت میں فرمایا ہے: "وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِیْكُمْ اَنْۢبِیَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّ اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ یُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ۝" (المائدہ: ۲۰) "(اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! اللہ نے تم پر جو احسانات فرمائے ہیں اُن کو یاد کرو کہ انہوں نے تم میں انبیاء پیدا فرمائے اور تم کو بادشاہ بنایا اور تم کو وہ کچھ عطا فرمایا جو اس زمانہ میں اور کسی کو عطا نہیں فرمایا تھا O)۔

اس آیت میں فرمایا ہے: "یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ": بعض مفسرین نے کہا کہ وہ تم کو بہت سخت عذاب میں مبتلاء کرتے تھے۔ "وَ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ": اس آیت میں "یَسُوْمُوْنَكُمْ" کا لفظ ہے اور السوم کا معنی ہے: چکھانا اور پیش کرنا۔ "سامنی کذا" کا معنی ہے اس نے مجھے چکھایا "وعرضنی" اور مجھے پیش کیا۔

"وَ فِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ": اس کی تفسیر سورۃ البقرہ اور سورۃ الاعراف میں گزر چکی ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو جو ان سخت عذابوں سے چھڑا لیا، اس میں اللہ تعالیٰ کی تمہارے اوپر بہت بڑی نعمت اور بہت بڑا احسان تھا جس کا شکر تم ادا نہیں کر سکتے۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قومِ فرعون جو تمہارے ساتھ یہ سلوک کرتی تھی، اس میں تمہارے لیے بہت بڑی آزمائش تھی۔

(تاویلات اہل السنہ ج ۶ ص ۳۵۸۔۳۶۵، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۶ھ)

اس آیت میں آلِ فرعون کا ذکر ہے اور آل کی تفسیر میں امام محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ لکھتے ہیں:

آلِ فرعون کا معنی ہے: فرعون کے دین کو ماننے والے اور اس کی قوم کے لوگ، آل کی اصل "اهل" ہے کیونکہ اس کی تصغیر "اُهَیل" آتی ہے، دوسرا قول ہے کہ اس کی تصغیر "اُوَیل" بھی آتی ہے۔ (جامع البیان ج ۱۳ ص ۳۸۵، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

بنو اسرائیل پر فرعون کے مظالم

امام عبد الرحمٰن بن محمد بن ادریس الرازی ابن ابی حاتم المتوفی ۳۲۷ھ لکھتے ہیں:

ابو العالیہ نے کہا کہ فرعون بنو اسرائیل پر چار سو سال تک حکومت کرتا رہا، پھر اس کے کاہنوں نے اس کو بتایا کہ عنقریب مصر میں

ایک لڑکا پیدا ہوگا اور اس کے ہاتھوں تم ہلاک ہو جاؤ گے، تب فرعون نے اہلِ مصر کی حاملہ عورتوں کی طرف یہ حکم بھیجا کہ جب کسی عورت سے کوئی لڑکا پیدا ہو تو اس کو فرعون کے پاس لایا جائے، پھر فرعون اس کو قتل کر دیتا تھا، بنو اسرائیل کے بیٹے مارے جا رہے تھے اور بنو اسرائیل کے بوڑھے قضاءِ الٰہی سے مر رہے تھے، ان میں سے کوئی بچہ بڑا نہیں ہوتا تھا، تب قبطیوں نے کہا: بنو اسرائیل کے بچے بڑے نہیں ہو رہے اور بوڑھے مر رہے ہیں، اس طرح ان میں کوئی مرد باقی نہیں رہے گا، پھر ہمارے کام کون کرے گا؟ تب فرعون نے یہ حکم دیا کہ ایک سال بنو اسرائیل کے بیٹے ذبح کر دیے جائیں اور دوسرے سال چھوڑ دیے جائیں، جس سال وہ بنو اسرائیل کے بیٹے ذبح نہیں کرتے تھے اس سال حضرت ہارون علیہ السلام پیدا ہوئے اور ان کو چھوڑ دیا گیا اور جس سال بنو اسرائیل کے بیٹوں کو ذبح کیا جاتا تھا اس سال حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم: ۵۰۵، ج ۱ ص ۱۰۵_۱۰۶، مکتبہ نزار مصطفیٰ، الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ)

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ ⑦

اور (اے بنی اسرائیل!) اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے رب نے تمہیں اس پر مطلع فرما دیا تھا کہ اگر تم (اللہ کا) شکر ادا کرو گے تو میں تمہاری نعمتوں میں ضرور بہ ضرور اضافہ فرماؤں گا اور اگر تم نے ناشکری کی تو بے شک میرا عذاب بہت سخت ہے ○

وَقَالَ مُوسَىٰ إِن تَكْفُرُوا أَنتُمْ وَمَن فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا فَإِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ حَمِيدٌ ⑧

اور موسیٰ نے کہا: ''اگر تم ناشکری کرو اور روئے زمین کے تمام لوگ بھی ناشکری کریں تو بے شک اللہ بے نیاز ہیں، حمد کے مستحق ہیں ○

أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَالَّذِينَ مِن بَعْدِهِمْ لَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا اللَّهُ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَرَدُّوا أَيْدِيَهُمْ فِي أَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوا إِنَّا كَفَرْنَا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ وَإِنَّا لَفِي شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُونَنَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ ⑨

کیا تمہارے پاس تم سے پہلے لوگوں کی خبریں نہیں پہنچیں قومِ نوح کی، عاد کی، ثمود کی اور جو لوگ ان کے بعد آئے جن کا علم صرف اللہ کو ہے، ان کے پاس ان کے رسول واضح دلائل لے کر آئے تو انہوں نے ناگواری سے اپنے ہاتھوں کو اپنے مونہوں میں ڈال لیا اور انہوں نے کہا: ''جس پیغام کو دے کر آپ کو بھیجا گیا ہے ہم اس پیغام کا انکار کرتے ہیں، اور آپ ہمیں جس دین کی دعوت دیتے ہیں ہمیں اس کے متعلق بہت بڑا شک ہے جو ہم کو خلجان میں مبتلا کرتا ہے'' ○

قَالَتْ رُسُلُهُمْ أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَدْعُوكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى قَالُوا إِنْ أَنتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تُرِيدُونَ أَن تَصُدُّونَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا فَأْتُونَا بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ ⑩

اُن کے رسولوں نے کہا: "کیا تمہیں اللہ کے متعلق شک ہے حالانکہ وہ تمام آسمانوں اور زمینوں کے پیدا فرمانے والے ہیں، وہ تم کو دعوت دے رہے ہیں تاکہ تمہارے گناہوں کو معاف فرمائیں اور تم کو ایک معین وقت تک مہلت دیں"۔ کفار نے کہا: "تم تو ہماری ہی مثل بشر ہو تم ہمیں اُن بتوں کی عبادت سے روکنا چاہتے ہو جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے رہے تھے، (اگر تم سچے ہو تو) ہمارے پاس کوئی واضح دلیل لے کر آؤ"O

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ یَمُنُّ عَلٰى مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖؕ وَ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نَّاْتِیَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱﴾

اُن کفار سے اُن کے رسولوں نے کہا: ہم تمہاری ہی مثل بشر ہیں لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتے ہیں احسان فرماتے ہیں، اور ہم اللہ کی اجازت کے بغیر تمہارے سامنے کوئی واضح دلیل نہیں پیش کر سکتے، اور ایمان والوں کو اللہ پر ہی توکل کرنا چاہیے O

وَ مَا لَنَاۤ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَ قَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَاؕ وَ لَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَاۤ اٰذَیْتُمُوْنَاؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۱۲﴾

اور ہم اللہ پر توکل کیوں نہ کریں جب کہ انہوں نے ہمیں نجات کے راستوں کی ہدایت عطا فرمائی ہے، اور تم جو ہمیں ایذائیں پہنچا رہے ہو، ہم ضرور بہ ضرور اُن پر صبر کریں گے، اور توکل کرنے والوں کو اللہ پر ہی توکل کرنا چاہیے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور (اے بنی اسرائیل!) اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے رب نے تمہیں اس پر مطلع فرما دیا تھا کہ اگر تم (اللہ کا) شکر ادا کرو گے تو میں تمہاری نعمتوں میں ضرور بہ ضرور اضافہ فرماؤں گا اور اگر تم نے ناشکری کی تو بے شک میرا عذاب بہت سخت ہے O" (ابراہیم: ۷)

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ، ابراہیم: ۷ تا ۱۲ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ": یہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے جو کچھ کہا تھا، اسی کا ایک جملہ ہے۔ گویا کہ یوں کہا گیا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا: تم پر جو اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور ان کا احسان ہے اس کو یاد کرو، جب تمہارے رب نے تمہیں اچھی طرح مطلع فرما دیا جس سے شکوک وشبہات مٹ جاتے ہیں۔

"لَىٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّكُمْ": اگر تم (اللہ کا) شکر ادا کرو گے تو میں تمہاری نعمتوں میں ضرور بہ ضرور اضافہ فرماؤں گا۔

اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے ساتھ مشغول ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر اپنی نعمتوں کا اضافہ فرماتے ہیں۔ اور یہاں پر یہ جاننا ضروری ہے کہ شکر کی کیا حقیقت ہے، اور وہ کونسی نعمتیں ہیں جو شکر کرنے سے زیادہ ملیں گی۔ رہا شکر تو اس کا معنی یہ ہے کہ مُنعِم کی تعظیم کے ساتھ اس کی نعمت کا اعتراف کیا جائے۔ اور نعمتوں میں اضافہ کی کئی قسمیں ہیں:

بعض روحانی نعمتیں ہیں اور بعض جسمانی نعمتیں ہیں۔ روحانی نعمتیں یہ ہیں کہ شکر کرنے والا ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی اقسام کے مطالعہ میں مشغول رہے اور ان کے فضل و کرم کی اقسام میں مشغول رہے۔ اور جو کسی مرد کی طرف زیادہ احسان کرتا ہے تو مرد اس سے اظہار محبت کرتا ہے، پس نفس کا اللہ تعالیٰ کے فضل اور احسان کے مطالعہ میں مشغول ہونا بندہ کی اللہ تعالیٰ سے محبت کی تاکید کرتا ہے۔ اور محبت کا مقام صدیقین کے مقامات میں سب سے بلند ہے۔ اور کبھی بندہ اس حال سے ترقی کرتا ہے اور اس کی محبت نعمت دینے والے کے ساتھ ہو جاتی ہے، اور وہ نعمت میں غور و فکر کرنے کے بجائے مُنعِم کے متعلق غور و فکر کرتا ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تمام سعادتوں کا منبع اور تمام خیرات کا عنوان اللہ تعالیٰ کی محبت اور اُن کی معرفت ہے۔ پس اس سے واضح ہو گیا کہ شکر کے ساتھ مشغول ہونا روحانی نعمتوں میں اضافہ کو واجب کرتا ہے۔ اور رہا جسمانی نعمتوں میں اضافہ تو مشاہدہ یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں زیادہ مشغول ہوتا ہے تو اس کی طرف اللہ تعالیٰ کی نعمتیں زیادہ واصل ہوتی ہیں۔ پس شکر کرنا بہت اچھا کام ہے، کیونکہ یہ وہ بلند مقام ہے جو دین اور دنیا کی سعادت کو واجب کرتا ہے۔

"وَلَئِنۡ كَفَرۡتُمۡ اِنَّ عَذَابِیۡ لَشَدِیۡدٌ": اور اگر تم نے ناشکری کی تو بے شک میرا عذاب بہت سخت ہے۔

اس آیت میں کفران سے مراد کفرانِ نعمت ہے، کفر باللہ مراد نہیں ہے، کیونکہ جس کفر کا شکر کے مقابلہ میں ذکر کیا جائے اس سے مراد کفرانِ نعمت ہوتی ہے، اور اس کا سبب یہ ہے کہ کفرانِ نعمت اس وقت ہوتا ہے جب بندہ اس چیز سے جاہل ہو کہ نعمت اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ جہالت عذاب کی قسموں میں سے سب سے بڑا عذاب ہے۔

حدیث میں مذکور ہے بندہ جب گناہ کرتا ہے تو اس گناہ کی وجہ سے رزق سے محروم ہو جاتا ہے۔

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندہ جو گناہ کرے اس کی وجہ سے رزق سے محروم ہو جاتا ہے، اور تقدیر کو دعا کے سوا اور کوئی چیز نہیں ٹال سکتی، اور نیکی کے سوا کسی چیز سے عمر میں اضافہ نہیں ہوتا۔

(سنن ابن ماجہ: ۱۸۵۶، مسند احمد: ۲۲۳۳۸، حلیۃ الاولیاء لابی نعیم ج ۱ ص ۱۸۲، تہذیب الکمال ج ۱۵ ص ۱۷۳، المعجم الاوسط للطبرانی: ۲۲۹۵، ۲۳۹۱، ۱۰۶۹۹۶، المعجم الصغیر للطبرانی: ۸۹۰، مسند الرویانی: ۶۳۶، صحیح ابن حبان: ۸۷۲، المستدرک علی الصحیحین: ۶۰۳۸، جامع العلوم والحکم ج ۲ ص ۵۰۲، موارد الظمآن: ۱۰۹۰، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشرہ ج ۳ ص ۱۸۲)

نیز حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک سائل آیا، آپ نے اس کو ایک کھجور عطا فرمانے کا حکم دیا، اس نے وہ کھجور نہیں لی یا اس سے ناراض ہوا، پھر دوسرا سائل آیا، آپ نے اس کے لیے بھی ایک کھجور کا حکم فرمایا، اس نے کہا: سبحان اللہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ کھجور ملی ہے، تو آپ نے باندی سے کہا: ام سلمہ کے پاس جاؤ اور اس کو چالیس درہم دو جو اُن کے پاس رکھے ہیں۔ (مسند احمد: ۱۲۵۷۴، شعب الایمان للبیہقی: ۹۳۰۵)

یعنی جس سائل نے ایک کھجور ملنے پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے چالیس درہم عطا فرمانے کا حکم فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو نعمت پر شکر کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی نعمتوں میں اضافہ فرماتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور موسیٰ نے کہا: "اگر تم ناشکری کرو اور روئے زمین کے تمام لوگ بھی ناشکری کریں تو بے شک اللہ بے نیاز ہیں، حمد کے مستحق ہیں O" (ابراہیم: ۸)

''وَقَالَ مُوْسٰۤى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ حَمِیْدٌ'':

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ بیان فرمایا کہ شکر کے ساتھ مشغول ہونا دنیا اور آخرت کی خیرات میں اضافہ کو واجب کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرنا عذاب شدید کا موجب ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا جاتا ہے یا ان کی ناشکری کی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے بلند ہیں کہ کسی کے شکر ادا کرنے سے انہیں کوئی نفع ہو یا کسی کی ناشکری سے انہیں کوئی نقصان ہو، اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ''اگر تم ناشکری کرو اور روئے زمین کے تمام لوگ بھی ناشکری کریں تو بے شک اللہ بے نیاز ہیں، حمد کے مستحق ہیں''۔ اور اس سے غرض یہ بیان کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو اِن عبادات کا حکم فرمایا ہے تو ان عبادات کے منافع عبادت کرنے والے کو پہنچتے ہیں اور معبود کو وہ منافع نہیں پہنچتے۔ اور یہ واقعہ اسی طرح ہے اس پر دلیل یہ ہے: ''فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ حَمِیْدٌ'' اس کی تقریر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ واجب الوجود لذاتہٖ ہیں، اور اپنی تمام صفات کے اعتبار سے واجب الوجود ہیں۔ اگر وہ واجب الوجود لذاتہٖ نہ ہوتے تو ان کے وجود کو عدم پر ترجیح دینے کے لیے کسی مرجح کی ضرورت ہوتی، لہٰذا وہ غنی نہ ہوتے اور ہم نے فرض کیا ہے کہ اللہ عزوجل غنی ہیں، پس معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا غنی ہونا اس بات کو واجب کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فی ذاتہٖ واجب الوجود ہیں، اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ وہ واجب الوجود لذاتہٖ ہیں تو وہ اپنے تمام کمالات کے اعتبار سے بھی واجب الوجود ہیں، کیونکہ اگر ان کا کوئی کمال واجب نہ ہو تو اس کمال کے حصول کے لیے وہ کسی کے محتاج ہوں گے اور جو کسی کا محتاج ہو وہ واجب الوجود نہیں ہو سکتا، اور ہم نے فرض کیا کہ اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہیں لہٰذا وہ اپنے تمام کمالات کے اعتبار سے بھی واجب الوجود ہیں، ان کی ذات بھی واجب الوجود ہے، لہٰذا جب اس طرح ہو تو وہ اپنی ذات کے اندر محمود ہوں گے۔

اور اس تقریر سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا غنی اور حمید ہونا تقاضا کرتا ہے کہ شکر گزاروں کے شکر سے اس میں کوئی اضافہ نہ ہو اور ناشکروں کی ناشکری سے اس میں کوئی کمی نہ ہو۔ اسی لیے فرمایا: ''اگر تم ناشکری کرو اور روئے زمین کے تمام لوگ بھی ناشکری کریں تو بے شک اللہ بے نیاز ہیں، حمد کے مستحق ہیں''۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے روایت کی کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے بندو! بے شک میں نے اپنی ذات پر ظلم کو حرام قرار فرمایا ہے اور میں نے تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام قرار فرمایا ہے، پس تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو، اے میرے بندو! تم سب گمراہ ہو سوا اس کے جس کو میں ہدایت عطا فرماؤں، تم مجھ سے ہدایت طلب کرو، میں تم کو ہدایت عطا فرماؤں گا، اے میرے بندو! تم سب بھوکے ہو، سوا اس کے کہ جس کو میں کھلاؤں، سو تم مجھ سے کھانا طلب کرو میں تمہیں کھلاؤں گا، اے میرے بندو! تم سب برہنہ تھے، مگر جس کو میں نے کپڑے پہنائے، سو تم مجھ سے کپڑے طلب کرو میں تمہیں کپڑے پہناؤں گا، اے میرے بندو! تم رات اور دن میں خطا کرتے ہو اور میں تمام گناہوں کو معاف فرما دیتا ہوں، سو تم مجھ سے مغفرت طلب کرو، میں تمہاری مغفرت فرماؤں گا، اے میرے بندو! تم مجھے کوئی ضرر پہنچانے پر قادر نہیں ہو، اور نہ تم مجھے کوئی نفع پہنچانے پر قادر ہو، اے میرے بندو! اگر تمہارے اول اور آخر اور تمہارے انسان اور جنات سب کسی ایک ایسے مرد کے دل پر ہوں جو سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہو تو اس سے میرے ملک میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا، اے میرے بندو! اگر تمہارے اول اور آخر اور تمہارے انسان اور جنات کسی ایک ایسے مرد کی طرح ہوں جو سب سے زیادہ بدکار ہو تو اس سے میرے ملک میں کوئی کمی نہیں

ہوگی۔اے میرے بندو! اگر تمہارے اول اور آخر اور تمہارے انسان اور جنات زمین کی کسی ایک جگہ میں کھڑے ہو کر مجھ سے سوال کریں اور میں ہر انسان کو اس کا سوال عطا فرما دوں تو اس سے اس میں کمی نہیں ہوگی جو میرے پاس ہے مگر جیسے سوئی کو سمندر میں ڈبو کر نکال لیا جائے۔اے میرے بندو! یہ تمہارے اعمال ہیں جن کو میں تم پر شمار کرتا ہوں، پھر میں تم کو ان کا پورا پورا اجر عطا فرماؤں گا پس جس کو کوئی خیر مل جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کی حمد کرے اور جس کو خیر کے سوا کچھ اور ملے تو وہ صرف اپنے نفس کو ملامت کرے۔

(صحیح مسلم: ۲۵۷۷، الرقم المسلسل: ۶۵۱۷، رقم حدیث الباب: ۵۵، مسند احمد: ۲۱۳۶۷، الادب المفرد: ۴۹۰، سنن ترمذی: ۲۴۹۵، مسند البزار ج ۹ ص ۴۰۱، کتاب الدعاء للطبرانی: ۱۵۰۱۴، المستدرک علی الصحیحین: ۷۶۰۶، حلیۃ الاولیاء ج ۵ ص ۱۲۵، کتاب الآداب للبیہقی: ۸۴۷، الاسماء والصفات للبیہقی: ۲۲۲، ۵۹، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۱۱۵۰۳، شعب الایمان: ۶۶۸۶، شرح السنۃ للبغوی ج ۵ ص ۷۳، معجم ابن عساکر: ۸۷۰، جامع العلوم والحکم ج ۲ ص ۳۲، الجامع الصحیح للسنن والمسانید ج ۱ ص ۱۰۰، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشر ج ۱ ص ۱۰۰)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''کیا تمہارے پاس تم سے پہلے لوگوں کی خبریں نہیں پہنچیں قوم نوح کی، عاد کی، ثمود کی اور جو لوگ اُن کے بعد آئے جن کا علم صرف اللہ کو ہے، ان کے پاس اُن کے رسول واضح دلائل لے کر آئے تو انہوں نے ناگواری سے اپنے ہاتھوں کو اپنے مونہوں میں ڈال لیا اور انہوں نے کہا: ''جس پیغام کو دے کر آپ کو بھیجا گیا ہے ہم اس پیغام کا انکار کرتے ہیں، اور آپ ہمیں جس دین کی دعوت دیتے ہیں ہمیں اس کے متعلق بہت بڑا شک ہے جو ہم کو خلجان میں مبتلاء کرتا ہے O'' (ابراہیم: ۹)

''اَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُودَ'':

ابو مسلم محمد بن بحر الاصفہانی المعتزلی المتوفی ۳۲۲ھ، ابراہیم: ۹ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یہ بھی احتمال ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قوم سے خطاب ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو ان لوگوں کی ہلاکت کے عذاب سے ڈراتے تھے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے خطاب فرمایا ہو کہ وہ اپنی قوم کو پچھلی امتوں کے احوال سے ڈرائیں اور اس سے مقصود یہ ہے کہ متقدمین کے احوال سے عبرت پکڑی جائے، اور یہ مقصود دونوں تقدیروں پر حاصل ہے مگر اکثر مفسرین اس بات کی طرف گئے ہیں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کو خطاب فرمایا ہے۔(تفسیر ابو مسلم الاصفہانی ص ۱۶۶، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۷ء/۱۴۲۸ھ)

امام رازی فرماتے ہیں:

پھر اللہ تعالیٰ نے تین قوموں کا ذکر فرمایا اور وہ قوم نوح، عاد اور ثمود ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَالَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا اللّٰهُ'': اور ''وَالَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ'' کا عطف قوم نوح، عاد اور ثمود پر ہے۔اور ''لَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا اللّٰهُ'' کی تفسیر میں دو قول ہیں:

(۱) یعنی اُن کی تعداد کی کنہ کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا کیونکہ قرآن مجید میں اجمالاً ذکر ہے۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ اقوام ہیں جن کی خبریں ہم تک بالکل نہیں پہنچیں، انہوں نے بھی اپنے رسولوں کی تکذیب کی

اوراُن کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو نہیں ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلًا مِّنۡ قَبۡلِكَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ قَصَصۡنَا عَلَيۡكَ ..... (المؤمن:۷۸)'' (اور بے شک ہم نے آپ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے، جن میں سے بعض کا قصہ آپ سے بیان فرمایا اور جن میں سے بعض کا قصہ آپ کو بالکل بیان نہیں فرمایا)۔

''جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ فَرَدُّوۡۤا اَيۡدِيَهُمۡ فِيۡۤ اَفۡوَاهِهِمۡ وَقَالُوۡۤا اِنَّا كَفَرۡنَا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِهٖ'':

آیت مذکورہ کے محامل

(۱) کفار نے اپنے مونہوں میں اپنے ہاتھ ڈال لیے اور غیظ و غضب سے اپنے ہاتھوں کو کاٹ لیا، اور یہ اس سے عبارت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں کو دیکھنے سے اور ان کا کلام سننے سے شدید نفرت کرتے تھے۔

(۲) جب انہوں نے انبیاء علیہم السلام کا کلام سنا تو اس پر تعجب کیا اور مذاق اڑاتے ہوئے ہنسے اور اس وقت انہوں نے اپنے ہاتھ اپنے مونہوں میں ڈال لیے جیسا وہ شخص کرتا ہے جس کو بہت زور سے ہنسی آرہی ہو تو وہ اپنا ہاتھ اپنے مونہ پر رکھ لیتا ہے۔

(۳) انہوں نے اپنے ہاتھ اپنے مونہوں پر رکھے اور انبیاء علیہم السلام کی طرف یہ اشارہ کیا کہ وہ اس کلام سے رک جائیں اور ہمیں یہ کلام نہ سنائیں۔

(۴) انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی زبانوں کی طرف اشارہ کیا اور جو کلام انہوں نے کیا تھا اس کی طرف اشارہ کیا کہ آپ جو پیغام لے کر آئے ہیں ہم اس کا انکار کرتے ہیں۔

(۵) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہاتھوں سے مراد اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہوں خواہ ظاہری خواہ باطنی، کیونکہ جب ان کفار نے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کی تو ان پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں پیش فرمائی گئیں تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کیا۔

''وَ اِنَّا لَفِيۡ شَكٍّ مِّمَّا تَدۡعُوۡنَنَاۤ اِلَيۡهِ مُرِيۡبٍ'':

صاحب الکشاف نے کہا ہے کہ ''الریب'' سے مراد نفس کی الجھن ہے کہ وہ کسی چیز کی طرف مطمئن نہیں ہوتا۔

ایک سوال کا جواب

جب کہ یہ بتایا گیا ہے کہ وہ کفار انبیاء علیہم السلام کی رسالت کا انکار کرتے تھے تو پھر اس کے بعد یہ کہنا کس طرح مناسب ہوگا کہ وہ انبیاء علیہم السلام کی رسالت میں شک کرتے تھے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ گویا کہ کفار نے کہا کہ اگر ہمیں آپ کی رسالت پر جزم اور یقین نہیں ہے تو کم از کم یہ بات ہے کہ ہم آپ کی نبوت کے دعویٰ میں شک کرنے والے ہیں، اور ہر دو تقدیر پر ہم آپ کی نبوت کا اعتراف نہیں کرتے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اُن کے رسولوں نے کہا: ''کیا تمہیں اللہ کے متعلق شک ہے حالانکہ وہ تمام آسمانوں اور زمینوں کے پیدا فرمانے والے ہیں، جو تم کو دعوت دے رہے ہیں تا کہ تمہارے گناہوں کو معاف فرمائیں اور تم کو ایک معین وقت تک مہلت دیں''، کفار نے کہا: ''تم تو ہماری ہی مثل بشر ہو، تم ہمیں اُن بتوں کی عبادت سے روکنا چاہتے ہو جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے رہے تھے، (اگر تم سچے ہو تو) ہمارے پاس کوئی

واضح دلیل لے کر آؤ'' O'' (ابراہیم :۱۰)

''قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۖ يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ يُؤَخِّرَكُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۖ قَالُوْۤا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۖ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ'':

جب کفار نے رسولوں سے یہ کہا کہ آپ جس کی عبادت کی طرف ہمیں دعوت دے رہے ہیں، ہمیں اس کے متعلق الجھن میں ڈالنے والا شک ہے، تو رسولوں نے کہا: کیا تمہیں اللہ تعالیٰ کے متعلق شک ہے اور اس کے متعلق شک ہے کہ وہ آسمانوں اور زمینوں کے پیدا فرمانے والے ہیں اور ہماری جانوں کو اور ہماری روحوں کو پیدا فرمانے والے ہیں اور ہمیں رزق عطا فرمانے والے ہیں، اور تمام فوائد اور جو انہوں نے مہیا فرمائے کیا تم ان کا بھی انکار کرتے ہو؟

اللہ عزوجل کو عبادت کا مستحق ماننے کی چار وجوہات

(۱) اس ذات کو ماننے سے جو فاعلِ مختار ہو اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے کو ماننے میں بہت احتیاط ہے، کیونکہ اگر وہ موجود نہ ہو تو اس کے وجود کا اقرار کرنے میں کوئی ضرر نہیں ہے، اور اگر وہ موجود ہو اور پھر اس کا انکار کیا جائے تو پھر اس سے بہت بڑا ضرر ہوگا۔

(۲) اگر اس کے فاعلِ مختار ہونے کا اقرار کیا جائے تو اس اقرار میں کوئی ضرر نہیں ہے اور اگر وہ فاعلِ مختار ہو اور پھر اس کا انکار کیا جائے تو اس میں بہت بڑا ضرر ہوگا۔

(۳) اس بات کا اقرار کرنا کہ اس نے اپنے بندوں کو اپنی عبادت کا مکلف فرمایا ہے، اس اعتقاد میں کوئی ضرر نہیں ہے، اور اگر اس نے واقع میں بندوں کو اپنی عبادت کا مکلف کیا ہے تو پھر اس کا انکار کرنے میں بہت بڑا ضرر ہوگا۔

(۴) مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنا اگر برحق ہو تو اس کا اقرار کرنے میں کوئی ضرر نہیں ہے اور اس کا انکار کرنے میں بہت بڑا ضرر ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:'' اُن کفار سے اُن کے رسولوں نے کہا: ہم تمہاری ہی مثل بشر ہیں لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتے ہیں احسان فرماتے ہیں، اور ہم اللہ کی اجازت کے بغیر تمہارے سامنے کوئی واضح دلیل نہیں پیش کر سکتے، اور ایمان والوں کو اللہ پر ہی توکل کرنا چاہیے O'' (ابراہیم :۱۱)

''قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۖ وَ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۖ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ'':

یعنی کفار نے کہا کہ ہم محض آپ کے کہنے کی وجہ سے آپ کی پیروی کیسے کریں اور ہم نے آپ سے کوئی معجزہ نہیں دیکھا۔

اُن کفار سے اُن کے رسولوں نے کہا: ہم تمہاری ہی مثل بشر ہیں لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتے ہیں احسان فرماتے ہیں، اور ہم اللہ کی اجازت کے بغیر تمہارے سامنے کوئی واضح دلیل نہیں پیش کر سکتے، اور ایمان والوں کو اللہ پر ہی توکل کرنا چاہیے۔ یعنی یہ صحیح ہے کہ ہم تمہاری مثل بشر ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں جس پر چاہیں احسان فرماتے ہیں اور اس کو رسالت اور نبوت سے سرفراز فرماتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:'' اور ہم اللہ پر توکل کیوں نہ کریں جب کہ انہوں نے ہمیں نجات کے راستوں کی

ہدایت عطا فرمائی ہے، اور تم جو ہمیں ایذائیں پہنچا رہے ہو، ہم ضرور بہ ضرور اُن پر صبر کریں گے، اور توکل کرنے والوں کو اللہ پر ہی توکل کرنا چاہیے O" (ابراہیم:۱۲)

"وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَاۤ اٰذَیْتُمُوْنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ":

اور ہمیں اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے سے کیا چیز منع کرے گی حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں نہایت سیدھے راستہ کی ہدایت عطا فرمائی ہے اور تم نے جو بے وقوفی کی باتیں کی ہیں ہم اس پر صبر کرتے ہیں اور توکل کرنے والوں کو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے۔

(تفسیر کبیر ج ۷ ص ۶۶۔۷۶، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ، وتفاسیر اخریٰ)

وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوْحٰۤى اِلَیْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۳﴾

اور کفار نے اپنے اپنے رسولوں سے کہا: "ہم تم کو ضرور بہ ضرور اپنی سرزمین سے نکال دیں گے ورنہ تم ہمارے دین میں داخل ہو جاؤ" پس اُن رسولوں کے رب نے اُن کی طرف وحی فرمائی، ہم ضرور بہ ضرور ان ظالموں کو ہلاک فرما دیں گے O

وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِیْ وَخَافَ وَعِیْدِ ﴿۱۴﴾

اور ہم ضرور بہ ضرور تم کو اُن کے بعد اس سرزمین میں آباد فرمائیں گے، یہ امداد اُس کے لیے ہے جو میرے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا ہو اور میرے عذاب کی وعید سے خوف زدہ ہو O

وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ ﴿۱۵﴾

اور اُن رسولوں نے اللہ سے فتح مندی کی دعا کی اور ہر زور آور معاند نا کام ہو گیا O

مِّنْ وَّرَآىٕهٖ جَهَنَّمُ وَیُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِیْدٍ ﴿۱۶﴾

اس کے آگے جہنم ہے اور اسے پیپ کا پانی پلایا جائے گا O

یَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا یَكَادُ یُسِیْغُهٗ وَیَاْتِیْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَیِّتٍ ؕ وَمِنْ وَّرَآىٕهٖ عَذَابٌ غَلِیْظٌ ﴿۱۷﴾

جسے وہ بہ مشکل گھونٹ بھر بھر کر پیئے گا اور آسانی سے گلے کے نیچے نہیں اتار سکے گا اور ہر جگہ سے موت اس کے پاس آئے گی اور وہ مرے گا نہیں، اور اس کے آگے بھی اس کے لیے سخت عذاب ہو گا O

مَثَلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِ۟اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّیْحُ فِیْ یَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ

لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۸﴾

جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کو اختیار کیا، ان کے اعمال کی مثال راکھ کی طرح ہے جسے آندھی کے دن تیز ہوا کا جھونکا اڑا کر لے جائے، وہ اپنے کیے ہوئے کاموں میں سے کسی کام کا پھل نہیں پا سکیں گے، یہ بہت دور کی گمراہی ہے ○

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۹﴾

اے مخاطب! کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمینوں کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا ہے، اگر وہ چاہے تو تم سب کو فنا فرما دیں اور نئی مخلوق لے آئیں ○

وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿۲۰﴾

اور یہ اللہ پر کچھ دشوار نہیں ہے ○

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿۲۱﴾

اور قیامت کے دن سب لوگ اللہ کے سامنے حاضر ہوں گے تو کمزور لوگ متکبرین سے کہیں گے: ''ہم تمہاری پیروی کرتے رہے، کیا آج تم ہم سے اللہ کے عذاب میں سے کسی چیز کو دور کر سکتے ہو؟'' متکبرین کہیں گے: ''اگر ہمیں اللہ ہدایت عطا فرماتے تو ہم ضرور تم کو ہدایت دیتے، ہم فریاد کریں یا صبر کریں سب ہمارے لیے برابر ہے، ہمارے لیے عذاب سے چھٹکارے کی کوئی جگہ نہیں ہے ○

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور کفار نے اپنے رسولوں سے کہا: ''ہم تم کو ضرور بہ ضرور اپنی سرزمین سے نکال دیں گے ورنہ تم ہمارے دین میں داخل ہو جاؤ''، پس اُن رسولوں کے رب نے اُن کی طرف وحی فرمائی: ہم ضرور بہ ضرور ان ظالموں کو ہلاک فرما دیں گے ○'' (ابراہیم: ۱۳)

علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ، ابراہیم: ۱۳ تا ۲۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ'': ''لَنُخْرِجَنَّكُمْ'' پر جو لام داخل ہے وہ لام قسم ہے، یعنی اللہ کی قسم! ہم ضرور بہ ضرور تم کو اپنی سرزمین سے نکال دیں گے۔ ''اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا'': ابن العربی نے کہا ہے کہ لفظ ''اَوْ'' تخییر کے لیے آتا ہے۔ یعنی کفار نے رسولوں کو یہ اختیار دیا کہ یا تو رسول اُن کے دین میں داخل ہو جائیں ورنہ وہ ان کو اپنی سرزمین سے نکال

دیں گے۔" فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ": پس اُن رسولوں کے رب نے اُن کی طرف وحی فرمائی: ہم ضرور بہ ضرور ان ظالموں کو ہلاک فرمادیں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ہم ضرور بہ ضرور تم کو اُن کے بعد اس سرزمین میں آباد فرمائیں گے، یہ امداد اُس کے لیے ہے جو میرے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا ہو اور میرے عذاب کی وعید سے خوف زدہ ہو O" (ابراہیم: ۱۴)

" وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَ خَافَ وَعِيْدِ ": یعنی جو قیامت کے دن میرے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا ہے۔" ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ ": یعنی جو میرے عذاب سے خوف زدہ ہو۔" وَ خَافَ وَعِيْدِ ": یعنی قرآن مجید میں جو کفر پر عذاب کی وعیدیں سنائی گئی ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اُن رسولوں نے اللہ سے فتح مندی کی دعا کی اور ہر زور آور معاند نا کام ہو گیا O" (ابراہیم: ۱۵)

" وَاسْتَفْتَحُوْا ": یعنی رسولوں نے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کی۔ اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو اجازت عطا فرمائی کہ وہ اپنی قوم کے خلاف ہلاکت کی دعا کریں۔

خالد بن اُسید بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمزور مہاجرین کے وسیلے سے فتح کی دعا کرتے تھے۔

(المعجم الکبیر للطبرانی: ۸۵۷، ۸۵۸، شرح السنۃ للبغوی: ۴۰۶۲، الاحادیث المختارہ: ۱۵۰۷)

"عَنِيْدٍ" کے معانی

" وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ": " جَبَّارٍ " کا معنی ہے جو میانہ روی کے بجائے ظلم کرے۔ اور اسی کو العنود، العنید اور العاند کہتے ہیں۔ امام ابو عبید نے کہا کہ جو شخص عناد کرے اور بغاوت کرے۔ اللیث نے کہا: اونٹوں میں سے عنود وہ ہے جو اونٹوں سے الگ چل کر چرتا رہے اور ہمیشہ الگ سمت میں رہے اور جو اپنے ساتھیوں سے مخالفت کا ارادہ کرے۔ مقاتل نے کہا: العنید کا معنی ہے المتکبر۔ ایک قول یہ ہے کہ العنید وہ ہے جو معصیت کرتا ہو اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہو۔ قتادہ نے کہا: العنید وہ ہے جو لا الٰہ الا اللہ پڑھنے سے انکار کرے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس آیت میں " عَنِيْدٍ " کا مصداق ابوجہل ہے۔

اور الماوردی نے " کتاب ادب الدین والدنیا " میں لکھا ہے کہ ولید بن یزید بن عبد الملک نے ایک دن قرآن مجید سے فال نکالی تو یہ آیت نکلی: " وَاسْتَفْتَحُوْا وَ خَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ " تو اس نے غصہ میں آکر قرآن مجید کو پھاڑ دیا، پھر چند دن کے بعد اس کو بدترین طریقہ سے قتل کر دیا گیا، پھر اس کا سر اس کے محل پر لٹکا دیا گیا، پھر شہر کی دیواروں پر لٹکا دیا گیا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اس کے آگے جہنم ہے اور اسے پیپ کا پانی پلایا جائے گا O" (ابراہیم: ۱۶)

" مِنْ وَّرَآىِٕهٖ جَهَنَّمُ ": یعنی اس کافر کی ہلاکت کے بعد اس کے لیے جہنم ہے۔

الازہری نے کہا: ''وراء'' کا لفظ پیچھے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور آگے کے لیے بھی، اور یہ لغتِ اضداد میں سے ہے۔
اور اس کا اشتقاق اس سے ہے جو چھپ جائے اور مستور ہو جائے، پس دوزخ بھی چھپی ہوئی ہے اور ظاہر نہیں ہے تو گویا وہ اس کے پیچھے ہے دکھائی نہیں دیتی۔ ''وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ'': یعنی اُن کو ایسا پانی پلایا جائے گا جو پیپ کی مثل ہوگا۔ اور یہ تمثیل اور تشبیہ ہے جیسے بہادر آدمی کو شیر کہا جاتا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ پانی ہے جو اہلِ دوزخ کے جسموں سے بہے گا، اس میں پیپ اور خون ہوگا۔ اور محمد بن کعب القرظی اور الربیع بن انس نے کہا: یہ اہلِ دوزخ کا دھوون ہے۔

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ''وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ يَّتَجَرَّعُهٗ'' کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ اس کے منہ کی طرف اس پیپ کو لایا جائے گا تو وہ اس کو ناپسند کرے گا اور جب وہ پیپ اس کے قریب کی جائے گی تو وہ اس کے چہرہ کو جلا دے گی اور جب وہ اس کو پیئے گا تو وہ اس کی انتڑیوں کو کاٹ دے گی حتیٰ کہ وہ اس کی دبر سے نکل آئے گی، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ ۝ (محمد:۱۵)'' (اور ان کو کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا جو اُن کی انتڑیوں کو کاٹ ڈالے گا O)۔ اور اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِی الْوُجُوْهَ ۚ بِئْسَ الشَّرَابُ۔ (الکہف:۲۹)'' (اور اگر وہ پیاس کی وجہ سے فریاد کریں گے تو انہیں پینے کے لئے پگھلے ہوئے تیل جیسا پانی دیا جائے گا جو اُن کے چہروں کو بھون ڈالے گا، وہ مشروب بہت ہی برا ہے)۔ (سنن ترمذی: ۲۵۸۳، مسند احمد: ۲۲۳۴۸، السنن الکبریٰ للنسائی: ۱۱۲۶۳، المستدرک للحاکم: ۳۳۳۹)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''جسے وہ بہ مشکل گھونٹ بھر بھر کر پیئے گا اور آسانی سے گلے کے نیچے نہیں اتار سکے گا اور ہر جگہ سے موت اس کے پاس آئے گی اور وہ مرے گا نہیں، اور اس کے آگے بھی اس کے لیے سخت عذاب ہوگا O'' (ابراہیم:۱۷)

''يَّتَجَرَّعُهٗ'': یعنی اس پانی کی تلخی اور حرارت کی وجہ سے ایک مرتبہ نہیں پی سکے گا، اس کو ایک ایک گھونٹ بھر کر پیئے گا۔
''وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ'': اور اس کو حلق سے ایک ہی بار اتار نہیں سکے گا۔ ''وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ'': حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس پر موت کے اسباب دائیں جانب سے، بائیں جانب سے، اوپر سے، نیچے سے، آگے سے، پیچھے سے اور ہر سمت سے آئیں گے۔ الضحاک نے کہا: اس کی طرف ہر جانب سے موت بڑھے گی حتیٰ کہ اس کے پیروں کی انگلیوں کی طرف سے۔ الاخفش نے کہا: دوزخ میں کافر کو جو مصائب پہنچیں گے ان کا نام موت رکھا گیا ہے اور وہ موت سے زیادہ سنگین ہوں گے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کے اعضاء میں سے کوئی عضو نہیں بچے گا مگر اس پر عذاب کی کوئی ایک قسم ہوگی۔ اور اگر وہ ستر (۷۰) مرتبہ بھی مرجاتا تو دوزخ کے اس عذاب کی نوع سے وہ اس پر آسان ہوتا، اس کو سانپ جھنجوڑ رہے ہوں گے اور بچھو ڈس رہے ہوں گے۔ محمد بن کعب نے کہا: جب جہنم میں کافر پانی کو مانگے گا پھر اس کو دیکھے گا تو اس کو کئی موتیں احاطہ کرلیں گی، اور جب وہ اس کو پیئے گا تو کئی موتوں سے مرے گا۔ ''وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ'': الضحاک نے کہا: وہ مرے گا نہیں تاکہ اس کو راحت مل جائے۔ ابن جریج نے کہا: اس کی روح اس کے حلقوم میں پھنسی ہوئی ہوگی اور اس سے نہیں نکلے گی کہ وہ مر جائے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے جسم کے ہر عضو میں ایسے درد پیدا فرما دیں گے جو موت کے درد کی طرح ہوں گے، اور وہ مرے گا نہیں تاکہ اس پر موت کی سختیاں زیادہ ہوں اور اس کے عذاب

میں اضافہ ہو۔ ''وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِیْظٌ'': یعنی اس کے آگے سخت عذاب ہے جو انواع و اقسام کے دردوں سے ملا ہوا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کو اختیار کیا، ان کے اعمال کی مثال راکھ کی طرح ہے جسے آندھی کے دن تیز ہوا کا جھونکا اڑا کر لے جائے، وہ اپنے کیے ہوئے کاموں میں سے کسی کام کا پھل نہیں پا سکیں گے، یہ بہت دور کی گمراہی ہے O'' (ابراہیم: ۱۸)

''مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ'': الزجاج نے کہا: جن لوگوں نے کفر کو اختیار کیا ان کی مثال وہ ہے جو تم پر تلاوت کی جاتی ہے کہ اُن کے اعمال راکھ کی طرح ہوں گے۔ اور اس کا معنی ہے: جن لوگوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا، ان کے اعمال کی مثال راکھ کی طرح ہے۔ ''فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ'': یوم عاصف کے متعلق تین قول ہیں:

(۱) ایک یہ ہے کہ العصوف اگرچہ آندھی کے لیے بولا جاتا ہے لیکن دن کی بھی اس کے ساتھ صفت کی جاتی ہے، کیونکہ دن میں وہ آندھی چل رہی ہوگی، اس لیے یہ کہنا جائز ہے یومٌ عاصِفٌ جیسے کہا جاتا ہے یوم حار، یوم بارد۔ (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ ''يَوْمٍ عَاصِفٍ'' سے مراد آندھی ہے۔ (۳) اور تیسرا قول یہ ہے کہ یہ آندھی کی صفت ہے۔

''لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ'': یعنی کفار نے اپنے نزدیک دنیا میں جو نیک کام کیے تھے، وہ اُن کے کفر کی وجہ سے زائل ہو جائیں گے۔ ''ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ'' یعنی بہت بڑا نقصان ہے۔ اس کو بہت بڑا نقصان اس لیے فرمایا کہ اس نقصان کا تدارک موت سے نہیں ہو سکتا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اے مخاطب! کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمینوں کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا ہے، اگر وہ چاہیں تو تم سب کو فنا فرما دیں اور نئی مخلوق لے آئیں O اور یہ اللہ پر کچھ دشوار نہیں ہے O''

(ابراہیم: ۱۹۔۲۰)

''اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ'' اس آیت میں آنکھوں سے دیکھنا مراد نہیں ہے بلکہ دل سے دیکھنا مراد ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے: کیا آپ تک اس کا علم نہیں پہنچا۔ ''اِنْ يَّشَاْ'': اے لوگو! جس طرح اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کو فنا فرمانے پر قادر ہیں، اسی طرح تمام چیزوں کو پیدا فرمانے پر بھی قادر ہیں، سو تم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کرو، کیونکہ اگر تم نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی ''يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ'' تو وہ تم کو فنا فرما کر ایک نئی مخلوق لے آئیں گے جو تم سے افضل ہوگی اور تم سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت گزار ہوگی، کیونکہ اگر وہ پہلوں کی طرح ہوتی تو اس کو بدلنے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔

''وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ'': یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے ایسا کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور قیامت کے دن سب لوگ اللہ کے سامنے حاضر ہوں گے تو کمزور لوگ متکبرین سے کہیں گے: ''ہم تمہاری پیروی کرتے رہے، کیا آج تم ہم سے اللہ کے عذاب میں سے کسی چیز کو دور کر سکتے ہو؟'' متکبرین کہیں گے: ''اگر ہمیں اللہ ہدایت عطا فرماتے تو ہم ضرور تم کو ہدایت دیتے، ہم فریاد کریں یا صبر کریں

سب ہمارے لیے برابر ہے، ہمارے لیے عذاب سے چھٹکارے کی کوئی جگہ نہیں ہے O" (ابراہیم: ۲۱)

"وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا": یعنی جب لوگ قیامت کے دن اپنی قبروں سے نکل کر اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوں گے۔ اور البروز کا معنی ہے الظہور، اور براز اس جگہ کو کہتے ہیں جو بہت وسیع ہو۔ پس بروز کا معنی ہے کہ جو لوگ اپنی قبروں سے ظاہر ہوں گے۔ یہاں لفظ ماضی کو ذکر فرمایا گیا ہے اور اس کا معنی استقبال ہے۔ اور یہ "وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ" سے متصل ہے۔

پھر ان لوگوں کو حساب کے لیے پیش کیا جائے گا، اور ان کو کوئی چھپانے والی چیز نہیں ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بروز کا یعنی ظہور کا حکم فرمایا۔ "فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا": یعنی تبعین نے اپنے پیشواؤں سے کہا: "اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا": "تبعًا" کا لفظ مصدر بھی ہوسکتا ہے، اس کا معنی ہے کہ ہم تمہاری اتباع کرنے والے تھے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ تابع کی جمع ہو، جیسے حارس کی جمع حرس ہے، خادم کی جمع خدم ہے، راصد کی جمع رصد ہے اور باقر کی جمع بقر ہے۔

"فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ": یعنی کیا آج تم ہم سے اللہ تعالیٰ کے عذاب میں سے کچھ دور کرسکتے ہو؟ یعنی جو ایذاء ہمیں پہنچی ہے، اس ایذاء کو دور کرسکتے ہو؟ "قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ": وہ پیشوا کہیں گے: اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایمان کی طرف ہدایت دی ہوتی تو ہم تم کو ہدایت دیتے۔ اور یہ بھی اس کا معنی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں جنت کے راستہ کی ہدایت دی ہوتی تو ہم تم کو ہدایت دیتے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم کو اس عذاب سے نجات عطا فرماتے تو ہم تم کو بھی اس عذاب سے نجات دیتے۔ "سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ": یعنی ہمارے لیے دوزخ کی آگ سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اہل دوزخ پر عذاب بہت شدید ہوگا تو وہ کہیں گے: آؤ ہم صبر کریں، پس وہ پانچ سو سال تک صبر کریں گے، پھر جب وہ دیکھیں گے کہ یہ پانچ سو سال تک صبر کرنا ان سے عذاب کو نہیں دور کرسکا تو پھر کہیں گے: آؤ ہم فریاد کریں، پھر وہ پانچ سو سال تک فریاد کریں گے، پھر جب وہ دیکھیں گے کہ پانچ سو سال تک فریاد کرنے سے بھی عذاب ان سے نہیں ٹلا تو وہ کہیں گے: ہم پر برابر ہے ہم فریاد کریں یا ہم صبر کریں، اس عذاب سے ہمارے لیے کوئی چھٹکارا نہیں ہے۔

(المعجم الکبیر للطبرانی ج ۱۹ ص ۸۳، مجمع الزوائد: ۱۱۰۹۷)

(الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، جز ۹ ص ۲۹۶۔ ۳۰۳، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ۗ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۗ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ۗ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ۗ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۲﴾

اور جب قیامت کے دن جزا و سزا کا فیصلہ ہو جائے گا تو شیطان کہے گا: "بے شک اللہ نے تم سے جو وعدہ کیا وہ سچا وعدہ تھا اور میں

نے جو تم سے وعدہ کیا تھا تو میں نے اس کی خلاف ورزی کی، اور میرا تم پر کوئی جبر اور تسلط نہیں تھا سوا اس کے کہ میں نے تمہیں گمراہی کی دعوت دی تو تم نے میری دعوت کو قبول کر لیا، لہٰذا اب مجھے ملامت نہ کرو اور اپنے آپ کو ملامت کرو، آج نہ میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں اور نہ تم میری کوئی مدد کر سکتے ہو، اس سے پہلے تم نے جو مجھے اللہ کا شریک قرار دیا تھا میں اس کا انکار کرتا ہوں" بے شک ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے O

وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ؕ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾

اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے، ان کو ایسی جنتوں میں داخل فرمایا جائے گا جس کے نیچے سے دریا بہہ رہے ہوں گے، وہ اپنے رب کے حکم سے اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، وہاں ملاقات ان کا دعائیہ کلمہ "سلام" ہوگا O

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کی کیسی مثال بیان فرمائی ہے، وہ کلمہ طیبہ ایک پاکیزہ درخت (کھجور) کی مثل ہے جس کی جڑ زمین میں پیوست ہے اور اس کی شاخ آسمان میں پہنچی ہوئی ہے O

تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۵﴾

وہ درخت اپنے رب کے حکم سے ہر فصل میں پھل دیتا ہے، اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان فرماتے ہیں تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں O

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ِۨاجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿۲۶﴾

اور کلمہ خبیثہ یعنی کلمہ کفر کی مثال ایسی ہے جیسے ایک خبیث درخت ہو جس کو زمین کے اوپر سے اکھیڑ دیا گیا ہو اور اس کے لیے کوئی قرار نہ ہو O

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ڐ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴿۲۷﴾

اللہ ایمان والوں کو دنیا میں اور آخرت کی زندگی میں قولِ ثابت (کلمۂ توحید) کے ساتھ برقرار رکھتے ہیں، اور ظالموں کو گمراہی میں چھوڑ دیتے ہیں اور اللہ جو چاہتے ہیں وہ کرتے ہیں O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور جب قیامت کے دن جزا و سزا کا فیصلہ ہو جائے گا تو شیطان کہے گا: ''بے شک اللہ نے تم سے جو وعدہ کیا وہ سچا وعدہ تھا اور میں نے جو تم سے وعدہ کیا تھا تو میں نے اس کی خلاف ورزی کی، اور میرا تم پر کوئی جبر اور تسلط نہیں تھا سوا اس کے کہ میں نے تمہیں گمراہی کی دعوت دی تو تم نے میری دعوت کو قبول کر لیا، لہٰذا اب مجھے ملامت نہ کرو اور اپنے آپ کو ملامت کرو، آج نہ میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں اور نہ تم میری کوئی مدد کر سکتے ہو، اس سے پہلے تم نے جو مجھے اللہ کا شریک قرار دیا تھا میں اس کا انکار کرتا ہوں''، بے شک ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے O'' (ابراہیم:۲۲)

علامہ اسماعیل حقی حنفی متوفی ۱۱۳۷ھ، ابراہیم: ۲۲ تا ۲۷ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ'': اور شیطان جس نے کمزور لوگوں کو اور متکبرین کو گمراہ کیا تھا، اس نے یہ اس وقت کہا جب اللہ تعالیٰ بندوں کا حساب لینے سے فارغ ہو گئے اور اہلِ جنت، جنت میں چلے گئے اور اہلِ دوزخ، دوزخ میں چلے گئے، یا جب اہلِ سعادت کو سعادت کا حکم فرمایا گیا اور اہلِ شقاوت کو شقاوت کا حکم فرمایا گیا۔

الکاشفی نے کہا: جب دوزخ والوں نے ابلیس کے اوپر زبانِ ملامت دراز کی تو ابلیس آگ کے منبر پر اشقیاء انس سے کہنے لگا کہ اے ملامت کرنے والو۔ ''اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ'': اللہ تعالیٰ نے تم کو جو وعید سنائی تھی وہ وعید برحق تھی کہ میدانِ محشر برپا ہوگا اور جزا اور سزا قائم ہوگی تو اللہ تعالیٰ نے تم کو جو وعید سنائی تھی اس کو پورا کر دیا، اور میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا وہ جھوٹا تھا کہ نہ مرنے کے بعد کسی کو اٹھایا جائے گا اور نہ حساب ہوگا، اور اگر حساب ہوا تو وہ بت تمہاری شفاعت کریں گے تو میں نے اپنے وعدہ کا خلاف کیا۔ اور شیطان اپنے وعدہ کو پورا کرنے پر قادر نہیں تھا، وہ کہے گا کہ آج ظاہر ہو گیا کہ میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔

''وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ'': اور میرا تم پر جبر نہیں تھا کہ میں تم کو جبراً کفر اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا مرتکب کرتا۔

بحر العلوم نے کہا ہے: کوئی شخص یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ شیطان کا یہ قول اللہ عزوجل کے اس ارشاد کے خلاف ہے: ''اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ۝ (النحل:۱۰۰)'' (شیطان کا زور تو صرف انہی لوگوں پر چلتا ہے جو اس سے دوستی رکھتے ہیں اور اس کے (وسوسہ کے) سبب سے اللہ کے شریک قرار دیتے ہیں O)۔ تو شیطان کا یہ قول حق ہے یا باطل ہے، علاوہ ازیں شیطان کے اس جھوٹے قول کا اس مقام پر کوئی فائدہ نہیں ہے۔

علامہ اسماعیل حقی اس سوال کے جواب میں لکھتے ہیں کہ اس آیت میں سلطان کی نفی بہ معنی قہر اور غلبہ ہے، اور یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ لوگوں کو وہ گمراہی کی دعوت دے اور اس کو مزین کرے۔ پس قہر اور غلبہ کے معنی میں شیطان کا نہ مومنین پر سلطان ہے اور نہ کافروں پر۔ اور دوسرے معنی کے اعتبار سے وہ کفار کو گمراہی کے وسوسے ڈالتا ہے، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: ''اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ

عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ ـــ (النحل: ۱۰۰)"۔ اور رہے مومنین جو اللہ تعالیٰ کے اولیاء ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ دوستی رکھتے ہیں، اور وہ شیطان کے وسوسہ کی اتباع کے دائرے سے خارج ہیں، جیسا کہ شیطان نے خود کہا: "اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ" یعنی میں صرف تم کو اپنے وسوسہ سے مزین کر کے تمہیں اپنی اطاعت کی دعوت دیتا تھا اور میرا تم پر کوئی زور نہیں تھا اور نہ کوئی ولایت تھی۔ "فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ": تم نے میرے وسوسہ کو اپنی خوشی اور اختیار سے قبول کیا۔

"فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ": پس میں نے تم سے جو جھوٹے وعدے کیے تھے، تم اس پر مجھے ملامت نہ کرو کیونکہ میں اسی لیے پیدا کیا گیا ہوں، اور کیونکہ میں تمہارا کھلا دشمن ہوں اور اللہ تعالیٰ نے تم کو میری دشمنی سے ڈرایا تھا، فرمایا: "اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ (یس: ۶۰)" (اے اولادِ آدم! کیا میں نے تم سے (انبیاء کے ذریعے) یہ عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی عبادت نہیں کرو گے؟ بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے ○)۔ اور جو دشمنی کے درپے ہو جب وہ کسی برے کام کی طرف دعوت دے تو اس کی ملامت نہیں کی جائے گی۔ "وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ": کیونکہ تم نے اپنے اختیار سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کو اختیار کیا اور تم نے ان چیزوں میں میری تصدیق کی جن چیزوں میں، میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا، اور تم نے اللہ تعالیٰ کی تکذیب کی جب کہ اللہ تعالیٰ نے تم سے سچ فرمایا تھا۔ اور یہ اس لیے کہ میرا تمہیں گناہوں کی طرف مائل کرنا تمہاری خواہشات کے مطابق تھا اور اللہ تعالیٰ کا کلام تمہاری خواہشات کے مخالف تھا، تو تم میری بہ نسبت زیادہ ملامت کے مستحق تھے۔

"مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ": جس عذاب میں تم مبتلاء ہو، اس میں، میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ "وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ": اور میں جس حال اور عذاب کی کیفیت میں ہوں، اس میں تم میری فریاد اور مدد کو نہیں پہنچ سکتے۔ یعنی ہم ایک دوسرے کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات نہیں دلا سکتے۔ الاصراخ کا معنی ہے الاغاثہ یعنی کسی کی فریاد پر مدد کرنا، اور مصرخ کا معنی فارسی میں ہے فریادرس۔ اور اس نے یہ بیان کیا کہ جس طرح تم عذاب میں مبتلاء ہو اور عذاب سے نجات کے لیے فریاد کر رہے ہو، اسی طرح میں بھی عذاب میں مبتلاء ہوں، جس طرح تم عذاب میں مبتلاء ہو اور میں بھی فریاد کرنے کا محتاج ہوں، تو میں دوسرے کی فریادرسی کیسے کروں گا۔

"اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ": میں آج اُن کا کفر کر رہا ہوں جن کو تم نے میرے کہنے سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں شریک بنایا تھا۔ "مِنْ قَبْلُ": اس دن سے پہلے، یعنی میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں۔

"اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ": یہ شیطان کے کلام کا تتمہ ہے، یا اللہ تعالیٰ نے ابتداءً فرمایا کہ ظالموں کو دردناک عذاب ہوگا اور ظالمین شیطان ہیں اور انسانوں میں سے جو شیطان کی اتباع کرنے والے ہیں، کیونکہ شیطان نے باطل کی طرف جو دعوت دی وہ غیر محل میں تھی اور تم نے جو میری اتباع کی ہے وہ بھی غیر محل میں ہے، سو تم بھی ظالم ہو اور شیطان بھی ظالم ہے۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ اولین اور آخرین کو جمع فرمائیں گے، پس اُن کے درمیان فیصلہ فرمائیں گے، پس اللہ تعالیٰ کے فیصلہ فرمانے سے لوگ گھبرائیں گے تو مومنین کہیں گے: ہمارے درمیان ہمارے رب نے فیصلہ فرما دیا، پس کون ہماری سفارش کرے گا، پس لوگ کہیں گے: ہم حضرت آدم علیہ السلام کے پاس جائیں گے اور حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کا ذکر کیا، پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے: میں تمہاری رہنمائی النبی الامی کی طرف کرتا ہوں، پس لوگ میرے پاس آئیں گے، سو اللہ عزوجل مجھے اجازت عطا فرمائیں گے کہ میں اُن کی

طرف کھڑا ہوں، پھر میری مجلس سے بہت پاکیزہ خوشبو آئے گی، ایسی خوشبو کسی نے نہیں سونگھی ہوگی حتیٰ کہ میں اپنے رب کے پاس آؤں گا، پس اللہ تعالیٰ مجھے ان کی شفاعت کی اجازت عطا فرمائیں گے اور میرے سر کے بالوں سے لے کر پیروں کے ناخنوں تک نور بھر دیا جائے گا، پھر کفار کہیں گے: مومنین نے تو اپنی سفارش کرنے والے کو پالیا، پس ہماری سفارش کون کرے گا سوائے ابلیس کے جس نے ہمیں گمراہ کیا تھا، پھر کفار ابلیس کے پاس جائیں گے اور کہیں گے: مومنین نے تو ان کو پالیا جو اُن کی سفارش کریں گے، اب تم اٹھو اور ہماری سفارش کرو کیونکہ تم نے ہمیں گمراہ کیا تھا، وہ اٹھے گا اور اس کی مجلس سے ایسی سخت بدبو آئے گی کہ کسی نے ایسی سخت بدبو نہیں سونگھی ہوگی، پھر اس وقت شیطان یہ کہے گا: ''اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ''۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۷ ص ۲۲۳۰، رقم الحدیث: ۱۲۲۳۵، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ)

شیطان کا انسان کے اعضاء پر تصرف کرنے کا بطلان

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ، ابراہیم: ۲۲ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اس آیت کا ظاہر یہ ہے کہ شیطان کو اس پر قدرت نہیں ہے کہ وہ انسان کو مرگی میں مبتلاء کرے اور اس کے اعضاء کو ٹیڑھا کر دے اور اس کی عقل کو ضائع کر دے جیسا کہ عوام اور حشویہ کہتے ہیں کہ انسان پر جن چڑھ جاتا ہے تو وہ اس کے اعضاء پر تصرف کرتا ہے تو اس آیت میں شیطان نے اعتراف کیا ہے کہ اس کو انسان پر تسلط اور تصرف کی قدرت نہیں ہے۔

(تفسیر الکبیر ج ۷ ص ۸۵، دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

صدر الافاضل علامہ سید محمد نعیم الدین مراد آبادی حنفی متوفی ۱۳۶۷ھ، ابراہیم: ۲۲ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اور بغیر حجت و برہان کے تم میرے بہکائے میں آ گئے باوجودیکہ اللہ تعالیٰ نے تم سے فرما دیا تھا کہ شیطان کے بہکائے میں نہ آنا اور اس کے رسول اس کی طرف سے دلائل لے کر تمہارے پاس آئے اور انہوں نے حجتیں پیش کیں اور برہانیں قائم کیں تو تم پر خود لازم تھا کہ تم ان کا اتباع کرتے اور ان کے روشن دلائل اور ظاہر معجزات سے منہ نہ پھیرتے اور میری بات نہ مانتے اور میری طرف التفات نہ کرتے مگر تم نے ایسا نہ کیا۔ (تفسیر خزائن العرفان مع ترجمہ کنز الایمان ص ۴۸۳، مکتبۃ المدینہ، کراچی، ۱۴۳۲ھ)

سید ابوالاعلیٰ مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء، ابراہیم: ۲۲ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یعنی اگر آپ حضرات ایسا کوئی ثبوت رکھتے ہوں کہ آپ خود راہ راست پر چلنا چاہتے تھے اور میں نے زبردستی آپ کا ہاتھ پکڑ کر آپ کو غلط راستے پر کھینچ لیا تو ضرور اسے پیش فرمائیے، جو چور کی سزا سو میری۔ لیکن آپ خود مانیں گے کہ واقعہ یہ نہیں ہے، میں نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ دعوتِ حق کے مقابلے میں اپنی دعوتِ باطل آپ کے سامنے پیش کی، سچائی کے مقابلہ میں جھوٹ کی طرف آپ کو بلایا، نیکی کے مقابلہ بدی کی طرف آپ کو پکارا، ماننے اور نہ ماننے کے جملہ اختیارات آپ ہی حضرات کو حاصل تھے۔ میرے پاس آپ کو مجبور کرنے کی کوئی طاقت نہ تھی۔ اب اپنی اس دعوت کا ذمہ دار تو بلاشبہ میں خود ہوں اور اس کی سزا بھی پا رہا ہوں، مگر آپ نے جو اس پر لبیک کہا، اس کی ذمہ داری آپ مجھ پر کہاں ڈالنے چلے ہیں، اپنے غلط انتخاب اور اپنے اختیار کے غلط استعمال کی ذمہ داری تو آپ کو خود ہی اٹھانی چاہیے۔ (تفہیم القرآن ج ۲ ص ۴۸۲، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور ۲۰۱۲ء)

غلام احمد پرویز کا شیطان کو ایک الگ ہستی قرار دینے سے انکار کرنا اور مصنف کا اس پر تعاقب

غلام احمد پرویز متوفی ۱۴۰۶ھ/ ۱۹۸۵ء، ابراہیم: ۲۲ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یہاں صرف ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ ہم اپنے ہر غلط کام کو شیطان کی طرف منسوب کر کے خود بری الذمہ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں، چونکہ شیطان خود ہمارے اپنے ہی سرکش جذبات کا نام ہے، اس لیے غلط کاموں کے لیے کسی اور کے ذمہ دار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں بغرض تفہیم شیطان کو ایک جداگانہ ہستی قرار دے کر اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ غلط کاموں کا ذمہ دار شیطان نہیں ہوتا، تم خود ہوتے ہو۔ انسان کے سرکش جذبات اسے غلط کاموں کے لیے اکساتے ہیں، اسے اس کی دعوت دیتے ہیں اور یہ اُن کی دعوت پر لبیک کہہ دیتا ہے، بہر حال یہ خود ہی ہوتا ہے اس لیے ان کا خمیازہ بھی خود ہی بھگتتا ہے۔

(مطالب القرآن ج ۷ ص ۱۳۸، ادارہ طلوع اسلام لاہور، ۱۹۸۱ء)

میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر اس آیت میں شیطان کو ایک الگ شخصیت قرار دیا ہے جو انسان سے دشمنی کے سبب اسے برے کام کرنے کی دعوت دیتا ہے، اس لیے یہ کہنا کہ شیطان کوئی جداگانہ ہستی نہیں ہے، قرآن مجید کی اس آیت کا صریح انکار ہے۔ (سعیدی غفرلہٗ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے، ان کو ایسی جنتوں میں داخل فرمایا جائے گا جس کے نیچے سے دریا بہہ رہے ہوں گے، وہ اپنے رب کے حکم سے اس میں ہمیشہ رہیں گے، دورانِ ملاقات ان کا دعائیہ کلمہ ''سلام'' ہوگا ○'' (ابراہیم: ۲۳)

''وَاُدْخِلَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ'': یعنی جن لوگوں نے ایمان کو اور عمل صالح کو جمع کیا اور اُن کو جنات میں داخل کرنے والے ملائکہ ہیں۔ ''تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ'': یعنی جنت کے درختوں کے نیچے سے دریا بہہ رہے ہیں۔ ''خٰلِدِیْنَ فِیْهَا'': اس حالت میں کہ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ''بِاِذْنِ رَبِّهِمْ'': یعنی ملائکہ اپنے رب کے حکم سے ان مومنین صالحین کو جنت میں داخل کریں گے، یا اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اور اُن کی ہدایت سے۔ ''تَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ'': التحیۃ کا معنی ہے: انہیں آباد رکھنے کی دعا کرنا۔ یعنی ملائکہ جنت میں اُن کے لیے سلامتی کی دعا کریں گے کہ مومنین آفات اور بلیات سے سلامت رہیں۔ یا مومنین ایک دوسرے کو یہ سلام تحیت پیش کریں گے۔ اور یہ سلام مومنین کے لیے دنیا میں بھی تھا۔

سلام کی اصل ہمارے باپ حضرت آدم علیہ السلام سے صادر ہوئی جیسا کہ وہب بن منبہ نے روایت کی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے جب ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کی ضیاء دیکھی تو اللہ تعالیٰ سے اس کے متعلق سوال کیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ نبی العربی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نور ہے جو تمہاری اولاد میں سے ہیں، پس تمام انبیاء اُن کے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔ پھر حضرت آدم علیہ السلام اس نور کو دیکھنے کے مشتاق ہوگئے، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نور اُن کی انگشتِ شہادت کی پور میں ظاہر ہوا، تو حضرت آدم علیہ السلام نے اُن کو سلام کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سلام کا جواب دیا، پس یہیں سے سلام کی سنت کی ابتداء ہوئی یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے اور اس کا جواب دینا فرض ہوگیا کیونکہ وہ جواب اللہ تعالیٰ نے دیا تھا۔ اور اس کی نظیر وتر کی رکعات ہیں، کیونکہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت

المقدس میں انبیاء علیہم السلام کی امامت فرمائی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ وصیت کی کہ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اُن کے لیے ایک رکعت پڑھیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''فَلَا تَكُنْ فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ ـــــ (السجدہ: ۲۳)'' یعنی شب معراج آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات کے متعلق شک نہ کریں، پس جب آپ نے ایک رکعت پڑھی تو اس کی طرف دوسری رکعت آپ نے اپنی طرف سے ملا دی، پس جب آپ نے یہ دو رکعت نماز پڑھی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی کہ اس کے ساتھ آپ ایک رکعت اور ملا دیں، سو اس طرح یہ وتر کی نماز مغرب کی طرح ہو گئی۔ پس جب آپ یہ وتر نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو رحمت اور نور سے ڈھانپ لیا، پس آپ کے دونوں ہاتھ بغیر اختیار کے اوپر اٹھ گئے، اسی وجہ سے نماز میں رفع یدین سنت ہو گیا۔ اور اسی کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد سے یہ اشارہ فرمایا ہے: ''ان اللہ زادکم صلاۃ الا وھی الوتر'' یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ایک نماز زیادہ فرما دی ہے، سنو! وہ نماز وتر ہے۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نماز اپنی طرف سے پڑھی وہ سنت ہو گئی اور جو نماز حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے پڑھی وہ واجب ہو گئی اور جو نماز آپ نے اللہ تعالیٰ کے لیے پڑھی وہ فرض ہو گئی، اور جب کہ اس نماز کی اصل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وصیت تھی تو اس وتر کی نماز پر واجب کا اطلاق کیا گیا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کی کیسی مثال بیان فرمائی ہے، وہ کلمہ طیبہ ایک پاکیزہ درخت (کھجور) کی مثل ہے جس کی جڑ زمین میں پیوست ہے اور اس کی شاخ آسمان میں پہنچی ہوئی ہےO'' (ابراہیم: ۲۴)

''اَلَمْ تَرَ'': التاویلات النجمیہ میں مذکور ہے: اے محمد! کیا آپ نے نورِ نبوت سے نہیں دیکھا۔

''كَیْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَیِّبَةً'': یعنی اللہ تعالیٰ نے کلمۂ طیبہ کو جو کلمۂ توحید ہے، یعنی اس بات کی شہادت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، اور اس میں ہر نیک کلمہ داخل ہے جیسا کہ قرآن مجید، تسبیحات، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء، استغفار، توبہ، اسلام کی طرف دعوت دینا یا کسی بھی نیک کام کی طرف دعوت دینا۔ اللہ تعالیٰ نے کلمہ طیبہ کی مثال اس پاکیزہ درخت سے دی ہے۔ ''كَشَجَرَةٍ طَیِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ'': ایک پاکیزہ درخت (کھجور) کی مثل ہے جس کی جڑ زمین میں پیوست ہے اور اس کی شاخ آسمان میں پہنچی ہوئی ہے۔ اس کی تائید درج ذیل حدیث سے ہوتی ہے:

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو مومن قرآن پڑھتا ہے، اس کی مثال سنگترے کی طرح ہے، اس کی خوشبو بھی پسندیدہ ہے اور اس کا ذائقہ بھی پسندیدہ ہے اور جو مومن قرآن پاک کی تلاوت نہیں کرتا، وہ کھجور کی مثل ہے، جس میں خوشبو تو نہیں ہوتی لیکن اس کا ذائقہ میٹھا ہوتا ہے، اور جو منافق قرآن مجید پڑھتا ہے وہ ریحانہ کی طرح ہے، اس کی خوشبو اچھی ہے لیکن اس کا ذائقہ کڑوا ہے، اور جو منافق قرآن مجید نہیں پڑھتا، اس کی مثال اندرائن کی طرح ہے، جس کی خوشبو نہیں ہے اور اس کا ذائقہ کڑوا ہے۔

(صحیح البخاری: ۵۰۲۰، ۵۰۵۹، ۵۴۲۷، ۷۵۶۰، صحیح مسلم: ۷۹۷، سنن ترمذی: ۲۸۶۵، سنن نسائی: ۵۰۳۸، سنن ابوداؤد: ۴۸۲۹، سنن ابن ماجہ: ۲۱۴، مسند احمد: ۱۹۰۵۵، سنن دارمی: ۳۳۶۳)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''وہ درخت اپنے رب کے حکم سے ہر فصل میں پھل دیتا ہے، اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان فرماتے ہیں تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں O'' (ابراہیم: ۲۵)

''تُؤْتِیْۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِیْنٍۭ'': بعض مفسرین نے کہا ہے کہ وہ درخت تمام اوقات میں فائدہ پہنچاتا ہے، کیونکہ کھجور کا پھل ہمیشہ کھایا جاتا ہے، رات میں اور دن میں، گرمی میں اور سردی میں اور ہر ساعت میں۔ یا تو وہ خشک کھجور ہوتی ہے جس کو چھوارا کہتے ہیں یا تازہ کھجور ہوتی ہے یا میٹھی کھجور ہوتی ہے۔ اسی طرح مومن کا عمل دن کے اول میں اور آخر میں آسمانوں کی طرف چڑھتا ہے اور کبھی منقطع نہیں ہوتا، جس طرح اس درخت کا چڑھنا کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ اسی طرح کلمۂ اخلاص اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے جو عبادات ادا کی جاتی ہیں، وہ ہر وقت میں آسمانِ قبولیت کی طرف چڑھتی رہتی ہیں۔ ''بِاِذْنِ رَبِّهَا'': اس کے خالق کے ارادہ سے۔

''وَیَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ'': اور اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے مثالوں کو بیان فرماتے ہیں شاید کہ وہ ان مثالوں سے معنی مقصود کو سمجھیں، کیونکہ مثالوں کو بیان فرمانا زیادہ تفہیم اور تذکیر کے لیے ہوتا ہے، کیونکہ مثال میں معانی کو محسوسات کی صورتوں میں بیان کیا جاتا ہے اور انجیل میں ایک سورت ہے جس کا نام سورۃ الامثال ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور کلمۂ خبیثہ یعنی کلمۂ کفر کی مثال ایسی ہے جیسے ایک خبیث درخت ہو جس کو زمین کے اوپر سے اکھیڑ دیا گیا ہو اور اس کے لیے کوئی قرار نہ ہو O'' (ابراہیم: ۲۶)

''وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِیْثَةٍ'': کلمۂ خبیثہ سے مراد کلمۂ کفر ہے اور اس میں ہر کلمۂ قبیحہ داخل ہے خواہ وہ کفر کی طرف دعوت ہو یا حق کی تکذیب ہو۔ ''كَشَجَرَةٍ خَبِیْثَةٍ'': اس کی مثال ایک خبیث درخت کی طرح ہے اور وہ الحنظل ہے یعنی اندرائن کا درخت یا تھوہر کا درخت، اور اس میں ہر وہ درخت داخل ہے کہ جس کے پھل میں خوشبو نہ ہو، اور اس میں صرف اوپر شاخیں ہوں اور اس کی جڑ زمین میں نہ ہو۔ ''التبیان'' میں مذکور ہے کہ اس درخت کا خبث یہ ہے کہ وہ انتہائی درجہ کڑوا ہے اور بے حد نقصان دہ ہے، اور جو چیز بھی اعتدال سے خارج ہو وہ خبیث ہے۔ اور امام غزالی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ عقل کو شجرۂ طیبہ سے تشبیہ دی ہے اور خواہش نفس کو شجرۂ خبیثہ سے تشبیہ دی ہے۔

پس نفسِ خبیثہ امارہ خبیث درخت کی طرح ہے جس سے کلماتِ خبیثہ نکلتے ہیں، اور یہ وہ کلمات ہیں جو عالم نفسِ خبیثہ کی طرف سے نکلتے ہیں کیونکہ اس کا اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے متعلق اعتقاد صحیح نہیں ہوتا، یا وہ نافرمانیوں کا ارتکاب کرتا ہے۔

''اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ'': یعنی اس کو زمین کے اوپر سے اکھاڑ لیا گیا ہے اور اس کا زمین پر استقرار نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ نے ایمان کے درخت کو ایسے درخت کے ساتھ تشبیہ دی ہے کہ جس کی جڑ مومن کے دل میں ثابت ہوتی ہے اور اس کے اعمال اعلیٰ علیین کی جانب چڑھ رہے ہوتے ہیں، جیسے کھجور کا درخت ہوتا ہے اس کی جڑ زمین میں پیوست ہوتی ہے اور اس کی شاخیں بلندی کی جانب ہوتی ہیں، اور اس کا نفع ہر وقت حاصل ہوتا ہے۔ اور کلمۂ کفر اور بتوں کی عبادت کی مثال دی ہے درخت خبیث کے ساتھ جو کافر کے دل میں ہے۔ اس کا کوئی ثبات نہیں ہے اور وہ درخت حنظل کی طرح ہے جس کو قرار نہیں ہوتا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اللہ ایمان والوں کو دنیا میں اور آخرت کی زندگی میں قولِ ثابت (کلمۂ توحید) کے ساتھ برقرار رکھتے ہیں، اور ظالموں کو گمراہی میں چھوڑ دیتے ہیں اور اللہ جو چاہتے ہیں وہ کرتے ہیں O''

(ابراہیم: ۲۷)

''يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ'': اور وہ کلمۂ توحید ہے کیونکہ وہ مومن کے قلب میں راسخ ہوتا ہے۔

''فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ'' دنیا کی زندگی میں بھی موت سے پہلے۔ اور جب وہ کسی بلاء میں مبتلاء فرمائے جائیں تو ثابت قدم رہتے ہیں اور اپنے دین سے نہیں پھرتے، اور اگر اُن کو مختلف قسم کے عذاب دیے جائیں جیسا کہ انبیاء اور صالحین کو تکالیف اور مشقت میں مبتلاء کیا جاتا ہے جیسے حضرت زکریا، حضرت یحییٰ، علیہما جرجیس، شمعون اور وہ لوگ جن کو اصحاب الاخدود نے قتل کر دیا تھا، اور وہ لوگ جن کے گوشت کو لوہے کی کنگھیوں سے چھیلا جاتا تھا۔

جرجیس کا تذکرہ

سدی الحقی نے بیان کیا کہ جرجیس حواریین میں سے تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے ایسے اسم کا علم عطا فرمایا تھا جس سے وہ مردوں کو زندہ کرتے تھے، اور ارض الموصل میں ایک جبار تھا جو بتوں کی عبادت کرتا تھا، جرجیس نے اس کو اللہ وحدہٗ کی عبادت کی طرف بلایا تو اس جبار نے حکم دیا، پس اُن کے ہاتھ اور پیر باندھ دیے گئے اور لوہے کی کنگھیوں سے اُن کے بدن کو چھیلا گیا۔ پھر اُن پر نمک کا پانی ڈال دیا گیا، اللہ تعالیٰ نے اُن کو صبر پر قائم رکھا، پھر اس نے لوہے کی کیلیں منگوائیں اور اُن کیلوں کو ان کی آنکھوں میں اور کانوں میں ٹھونک دیا، اللہ تعالیٰ نے اُن کو صبر پر قائم رکھا، پھر اس نے تیل کا حوض منگوایا، پھر اس کے نیچے آگ جلائی اور ان کو اس میں ڈال دیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ٹھنڈک اور سلامتی کے ساتھ رکھا، پھر اللہ تعالیٰ نے اُن کو زندہ فرما دیا اور انہوں نے بادشاہ کو ایمان کی دعوت دی، پس اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کی قوم کے ساتھ ہلاک فرما دیا اور شہر کو اس کے اوپر الٹ پلٹ کر دیا اور اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا اوپر کر دیا۔

''وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ'': اور ظالموں کو گمراہی میں چھوڑ دیتے ہیں اور اللہ جو چاہتے ہیں وہ کرتے ہیں۔

یہ آیت قبر کے سوال پر دلیل ہے اور اس پر دلیل ہے کہ مومنین قبر میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے ساتھ ہوتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کو قبر میں قولِ ثابت کے ساتھ قائم رکھتے ہیں اور یہ سب سے بڑی نعمت ہے۔

اور الفقیہ ابواللیث نے کہا ہے کہ علماء نے عذابِ قبر کے متعلق بحث کی ہے۔

بعض مفسرین نے کہا: اس کے جسم میں روح اس طرح ڈال دی جاتی ہے جس طرح وہ دنیا میں تھی اور اس کو بٹھا دیا جاتا ہے حتیٰ کہ دو فرشتے سیاہ رنگ اور نیلی آنکھوں والے آتے ہیں، اُن کی آنکھیں بجلی کی طرح ہوتی ہیں اور ان کی آواز بادل کی گرج کی طرح ہوتی ہے اور اُن کے ساتھ لوہے کے گرز ہوتے ہیں، پس وہ میت کو بٹھا کر اس سے سوال کرتے ہیں اور کہتے ہیں: تمہارا رب کون ہے؟ تمہارا دین کیا ہے اور تمہارا نبی کون ہے؟ پس مومن کہتا ہے: اللہ میرے رب ہیں، اسلام میرا دین ہے اور محمد ﷺ میرے نبی

ہیں، یہی قبر میں ثابت قدم رہتا ہے۔ اور رہا کافر اور منافق تو وہ کہے گا: میں نہیں جانتا۔ پس اُن گرزوں کے ساتھ اس کو مارا جاتا ہے، وہ اس زور سے چیخ مارتا ہے کہ زمین و آسمان میں جو بھی ہیں وہ سب اس کو سنتے ہیں سوائے جن وانس کے۔

مصعب بیان کرتے ہیں کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ پانچ چیزوں کا حکم دیتے تھے اور ان پانچ چیزوں کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کرتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کا حکم فرماتے تھے، آپ دعا کرتے تھے: اے اللہ! میں بخل سے آپ کی پناہ طلب کرتا ہوں اور میں بزدلی سے آپ کی پناہ طلب کرتا ہوں، اور میں اس سے آپ کی پناہ طلب کرتا ہوں کہ میں ارذل عمر کی طرف لوٹایا جاؤں، اور میں دنیا کے فتنہ سے آپ کی پناہ طلب کرتا ہوں، اس سے آپ نے دجال کا فتنہ مراد لیا، اور میں عذاب قبر سے آپ کی پناہ طلب کرتا ہوں۔

(صحیح البخاری: ۲۸۲۲، ۶۳۶۵، ۶۳۷۰، ۶۳۷۴، ۶۳۹۰، سنن ترمذی: ۳۵۶۷، سنن نسائی: ۵۴۴۷، مسند احمد: ۱۶۲۴)

(تفسیر روح البیان، ج ۴ ص ۵۲۹۔۵۳۶، دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۴۲۱ھ)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿۲۸﴾

کیا آپ نے اُن لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جنہوں نے اللہ کی نعمت کو ناشکری کے ساتھ تبدیل کر دیا اور انہوں نے اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر جہنم میں جھونک دیا O

جَهَنَّمَ ۚ یَصْلَوْنَهَا ؕ وَ بِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۲۹﴾

جس جہنم میں وہ جھلستے رہیں گے، اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے O

وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِیْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ﴿۳۰﴾

اور انہوں نے اللہ کے شریک بنائے تاکہ وہ لوگوں کو اللہ کے دین سے دور کر دیں، آپ کہیے: تم کچھ عرصہ فائدہ حاصل کر لو کیونکہ آخر میں تمہارا ٹھکانا دوزخ کی طرف ہے O

قُلْ لِّعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ یُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَ لَا خِلٰلٌ ﴿۳۱﴾

آپ میرے اُن بندوں سے کہیے جو اللہ پر ایمان لائے کہ وہ نماز قائم کریں اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے اس میں سے ہماری راہ میں پوشیدہ طور پر اور ظاہر طور پر خرچ کریں اس دن کے آنے سے پہلے جس دن میں نہ کوئی خرید و فروخت ہوگی اور نہ ہی کوئی دنیاوی دوستی ہوگی O

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ

الْاَنْهٰرَ ﴿۳۲﴾

اللہ ہی وہ ہیں جنہوں نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا اور آسمان سے بارش کا پانی نازل فرمایا، پس اس پانی سے تمہارے رزق کے لیے پھل نکالے اور انہوں نے تمہارے لیے کشتیوں کو مسخر فرما دیا تا کہ وہ کشتیاں سمندر میں اُن کے حکم سے چلیں، اور تمہارے لیے دریاؤں کو مسخر فرما دیا O

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآىِٕبَیْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ﴿۳۳﴾

اور انہوں نے تمہارے لیے سورج اور چاند کو اس طرح مسخر فرما دیا کہ وہ دونوں مسلسل گردش کر رہے ہیں، اور انہوں نے تمہارے لیے رات اور دن کو مسخر فرما دیا O

وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾

اور تم نے جو کچھ اُن سے سوال کیا اس میں سے بہت کچھ تم کو عطا فرمایا، اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو شمار نہیں کر سکتے، بے شک انسان بہت بڑا ظالم اور بہت ناشکرا ہے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''کیا آپ نے اُن لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جنہوں نے اللہ کی نعمت کو ناشکری کے ساتھ تبدیل کر دیا اور انہوں نے اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر جہنم میں جھونک دیا O'' (ابراہیم: ۲۸)

علامہ ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ، ابراہیم: ۲۸ تا ۳۴ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ'':

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''جن لوگوں نے اللہ کی نعمت کو کفر سے بدل ڈالا۔ (ابراہیم: ۲۸)'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بتایا: اللہ کی قسم! وہ کفار قریش ہیں، عمرو نے کہا: وہ قریش ہیں اور (سیدنا) محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی نعمت ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''ان لوگوں نے اپنی قوم کو دوزخ میں جھونک دیا۔۔ (ابراہیم: ۲۸)'' عمرو نے کہا: انہوں نے بدر کے دن اپنی قوم کو آگ میں جھونک دیا۔ (صحیح البخاری: ۳۹۷۷، ۴۷۰۰)

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا اور تمام لوگوں کے لیے آپ نعمت ہیں جنہوں نے آپ کو قبول کیا اور آپ کا شکر ادا کیا وہ جنت میں داخل ہو گئے، اور جنہوں نے آپ کی دعوت کو رد کیا اور آپ کا انکار کیا وہ دوزخ میں داخل ہو گئے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''جس جہنم میں وہ جھلتے رہیں گے، اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے O'' (ابراہیم: ۲۹)

''جَهَنَّمَ ۚ یَصْلَوْنَهَا ؕ وَبِئْسَ الْقَرَارُ'': یعنی اُن کفار نے اللہ تعالیٰ کی نعمت جو سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں اُن کو عطا فرمائی گئی تھی، اس کا انہوں نے کفر کیا اور اپنی قوم کو اور اپنے متبعین کو جہنم میں جھونک دیا۔

اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے روایت ہے کہ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمت کو کفر سے بدل ڈالا وہ کفارِ قریش تھے۔

اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: وہ قریش کے دو فاجر شخص تھے: بنو المغیرہ اور بنو امیہ۔ رہے بنو المغیرہ تو تم نے ان کا غزوۂ بدر کے دن قصہ تمام کر دیا اور رہے بنو امیہ تو وہ کچھ عرصہ تک دنیاوی فوائد حاصل کریں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور انہوں نے اللہ کے شریک بنائے تا کہ وہ لوگوں کو اللہ کے دین سے دور کر دیں' آپ کہیے: تم کچھ عرصہ فائدہ حاصل کر لو کیونکہ آخر میں تمہارا ٹھکانا دوزخ کی طرف ہے O''(ابراہیم: ۳۰)

''وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ'': اور انہوں نے اللہ کے شریک بنائے تا کہ وہ لوگوں کو اللہ کے دین سے دور کر دیں۔ ''قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ'': آپ اُن سے کہیے کہ تم دنیا میں چند روز کا فائدہ اٹھا لو اور آخر کار تمہارا ٹھکانا دوزخ کی طرف ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''آپ میرے اُن بندوں سے کہیے جو اللہ پر ایمان لائے کہ وہ نماز قائم کریں اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے اس میں سے وہ ہماری راہ میں پوشیدہ طور پر اور ظاہر طور پر خرچ کریں اس دن کے آنے سے پہلے جس دن میں نہ کوئی خرید و فروخت ہوگی اور نہ ہی کوئی دنیاوی دوستی ہوگی O''(ابراہیم: ۳۱)

''قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ'': اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اپنی اطاعت کا حکم دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان کی عبادت کا حق ادا کرو اور ان کی مخلوق کی طرف احسان کرو بایں طور کہ نماز کو قائم کرو جو اللہ وحدہٗ کی عبادت ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے، اور جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں مال عطا فرمائے ہیں ان میں سے زکوٰۃ ادا کرو، اور رشتہ داروں پر خرچ کرو اور اجنبی لوگوں کے ساتھ احسان کرو۔ اور نماز کو قائم کرنے سے مراد یہ ہے کہ نماز کی اس کے وقت میں حفاظت کرو اور اس کی حدود کی حفاظت کرو، اس کے رکوع، خشوع اور خضوع کی حفاظت کرو۔ اور اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جو انہوں نے رزق عطا فرمایا ہے، اس میں سے پوشیدہ اور ظاہر طور پر خرچ کرو، اس سے پہلے کہ وہ دن آ جائے یعنی قیامت کا دن جس میں نہ کوئی خرید و فروخت ہوگی اور نہ کوئی دوستی ہوگی، یعنی کسی شخص سے دوسرے کا فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا۔

قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ دنیا میں خرید و فروخت بھی ہوگی اور دوستیاں بھی ہوں گی، لوگ دنیا میں اُن سے فائدہ حاصل کریں گے، پس مرد دیکھے گا کہ کون اس کے ساتھ دوستی نبھاتا ہے، اگر اس نے اللہ کے لیے دوستی رکھی ہوگی تو وہ اسے نفع پہنچائے گی اور اگر غیر اللہ کے لئے دوستی رکھی ہوگی تو وہ اس سے ساقط ہو جائے گی۔ اور اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ خبر دے رہے ہیں کہ کوئی شخص نہ خرید و فروخت سے اس دن فائدہ اٹھا سکے گا، نہ فدیہ دے کر فائدہ حاصل کر سکے گا۔ اور اگر پوری روئے زمین کو سونا بنا کر وہ خرچ کر دے اور عذاب سے چھٹکارے کے لیے اس کو فدیہ کے طور پر دے تو وہ اس کو نفع نہ دے گا، اور نہ کسی کی شفاعت نفع دے گی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اللہ ہی وہ ہیں جنہوں نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا اور آسمان سے بارش کا

پانی نازل فرمایا، پس اس پانی سے تمہارے رزق کے لیے پھل نکالے اور انہوں نے تمہارے لیے کشتیوں کو مسخر فرمادیا تاکہ وہ کشتیاں سمندر میں اُن کے حکم سے چلیں، اور تمہارے لیے دریاؤں کو مسخر فرمادیاO اور انہوں نے تمہارے لیے سورج اور چاند کو اس طرح مسخر فرمادیا کہ وہ دونوں مسلسل گردش کررہے ہیں، اور انہوں نے تمہارے لیے رات اور دن کو مسخر فرمادیاO" (ابراہیم: ۳۲-۳۳)

"اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ":

اللہ تعالیٰ مخلوق پر اپنی نعمتوں کو شمار فرمارہے ہیں بایں طور کہ اُن کے لیے آسمانوں کو محفوظ چھت بنایا اور زمین کو بچھونا بنایا، اور آسمان سے بارش کے پانی کو نازل فرمایا۔ پھر اس پانی سے مختلف پھلوں کو اور کھیتوں کو نکالا جن کے رنگ اور شکلیں مختلف ہیں اور ان کے ذائقے مختلف ہیں اور اُن کی خوشبوئیں مختلف ہیں اور دیگر منافع کو ذکر فرمایا۔

"وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ": اور تمہارے لیے کشتیوں کو مسخر فرمادیا بایں طور کہ وہ سمندر کے پانی پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے چل رہی ہیں اور سمندر کو مسخر فرمادیا تاکہ اس سمندر میں کشتی میں بیٹھ کر لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف جائیں اور اس ملک کے منافع حاصل کریں۔ اور دریاؤں کو مسخر فرمادیا جو ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ تک پہنچتے ہیں۔

"وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآىِٕبَیْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ": اور تمہارے لیے سورج اور چاند کو مسخر فرمادیا جو مسلسل گردش کررہے ہیں رات ہو یا دن ہو، پس سورج اور چاند ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں اور رات اور دن بھی اسی طرح آتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور تم نے جو کچھ اُن سے سوال کیا اس میں سے بہت کچھ تم کو عطا فرمایا، اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو شمار نہیں کرسکتے، بے شک انسان بہت بڑا ظالم اور بہت ناشکرا ہےO" (ابراہیم: ۳۴)

"وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ": یعنی تمہارے لیے تمہاری ضرورت کی ہر چیز مہیا فرمادی جو تم اللہ عزوجل سے سوال کرتے ہو۔ اور بعض سلف نے کہا ہے کہ جن کا تم نے سوال کیا ہے وہ بھی عطا فرمائیں اور جن کا تم نے سوال نہیں کیا اُن کو بھی عطا فرمایا۔

"وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا": اس آیت سے اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ بندے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو گننے سے بھی قاصر ہیں چہ جائیکہ اُن نعمتوں کا شکر ادا کریں۔

خالد بن معدان از ابی اُمامہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب طعام سے فارغ ہوتے اور ایک مرتبہ کہا: جب آپ کا دسترخوان اٹھایا جاتا تو آپ یہ دعا کرتے: "تمام تعریفیں اللہ کیلئے ہیں جنہوں نے ہماری کفایت فرمائی اور ہمیں سیر فرمایا، ہم اس کھانے کا پوری طرح حق ادا نہیں کرسکے، اور نہ ہم اس نعمت کی ناشکری کرتے ہیں" اور ایک مرتبہ یوں دعا کی: "اے ہمارے رب! آپ کے لئے ہی تمام تعریفیں ہیں، ہم اس طعام کا حق ادا نہیں کرسکے اور نہ یہ طعام ہمیشہ کے لیے رخصت کیا گیا ہے (یا اس لیے دعا

کی تاکہ) اس سے ہم کو بے نیازی اور بے پرواہی کا خیال نہ ہو، اے ہمارے رب!"۔

(صحیح البخاری: ۵۳۵۹، سنن ترمذی: ۳۳۵۶، سنن ابوداؤد: ۳۸۴۹، سنن ابن ماجہ: ۳۲۸۳، مسند احمد: ۲۱۶۶۳، سنن دارمی: ۲۰۲۳)

اور آثار میں یہ روایت کی گئی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے کہا: اے میرے رب! میں آپ کا شکر کیسے ادا کروں، اور میرا آپ کا شکر ادا کرنا بھی آپ کی مجھ پر نعمت ہے، تو اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا: اب اے داؤد! تم نے میرا شکر ادا کر لیا، جب تم نے یہ اعتراف کر لیا کہ تم مُنعِم کا شکر ادا کرنے سے قاصر ہو۔

"اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ": بے شک انسان بہت بڑا ظالم اور بہت ناشکرا ہے۔

(معالم التنزیل ج ۳ ص ۳۱۔ ۳۲، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ کی انسان پر غیر متناہی نعمتیں ہیں، ہم ایک لقمہ اپنے مونہہ میں رکھ کر چھوڑ دیتے ہیں اور یہ خیال نہیں کرتے کہ اس لقمہ کو چبانے کے لیے دانتوں کو کس نے طاقت عطا فرمائی ہے، پھر جب وہ لقمہ ہم اپنے گلے سے اتار لیتے ہیں تو پھر اس لقمہ کو ہضم کرنے کے لیے ہمارے اندرونی اعضاء میں کون طاقت فراہم فرما رہا ہے، اسی کھائے ہوئے لقمہ سے ہمارے جسم کی غذا بنتی ہے اور خون بنتا ہے، خون رگوں میں چلا جاتا ہے اور پیشاب بنتا ہے، وہ مثانہ میں چلا جاتا ہے اور فضلات بنتے ہیں، وہ انتڑیوں میں چلے جاتے ہیں تو اس سارے نظام کو دیکھیے، ایک لقمہ میں کتنی نعمتیں ہیں، پھر اس لقمہ کا حصول یا گوشت سے ہوتا ہے یا سبزیوں سے ہوتا ہے اور گوشت اور سبزیاں اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں، اگر وہ آسمان سے پانی نازل نہ فرماتے تو سبزیاں کیسے بنتیں، اور جانوروں کا چارا کیسے بنتا جن جانوروں کا گوشت ہم کھاتے ہیں، تو دیکھیے اس لقمہ کے حصول کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کی غیر متناہی نعمتیں وابستہ ہیں، پھر جب ہم اس لقمہ کو کھا لیتے ہیں تو اس کے اندر بھی غیر متناہی نعمتیں ہیں، تو ہم ایک لقمہ کا بھی شکر ادا نہیں کر سکتے۔ (سعیدی غفرلہ)

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿۳۵﴾

اور یاد کیجئے جب ابراہیم نے عرض کیا: اے میرے رب! اس شہر (مکہ) کو امن والا بنا دیں اور مجھے اور میرے بیٹوں کو بتوں کی عبادت سے بچائیں O

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۶﴾

اے میرے رب! بے شک ان بتوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے، سو جس نے میری پیروی کی تو بے شک وہ میرے طریقہ پر ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو بے شک آپ بہت بخشنے والے بہت زیادہ رحم فرمانے والے ہیں O

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ

لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۷﴾

اے ہمارے رب! بے شک میں نے اپنی اولاد کو آپ کے حرمت والے گھر کے پاس ایک غیر آباد وادی میں بسا دیا ہے، اے ہمارے رب! تاکہ وہ نماز قائم کریں، سو آپ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل فرما دیں اور ان کو کھانے کے لیے کچھ پھل عطا فرمائیں تاکہ وہ آپ کا شکر ادا کریں O

رَبَّنَآ إِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ؕ وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ﴿۳۸﴾

اے ہمارے رب! بے شک آپ ہر اس چیز کو جانتے ہیں جس کو ہم چھپاتے ہیں اور اس چیز کو جانتے ہیں جس کو ہم ظاہر کرتے ہیں، اور اللہ پر نہ زمین میں کوئی چیز پوشیدہ ہے اور نہ آسمان میں O

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ إِسْمٰعِيْلَ وَإِسْحٰقَ ؕ إِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾

اللہ کا بے حد شکر ہے جنہوں نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق (دو بیٹے) عطا فرمائے، بے شک میرے رب ضرور دعا قبول فرمانے والے ہیں O

رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۖ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ ﴿۴۰﴾

اے میرے رب! مجھے اور میری اولاد کو نماز قائم کرنے والا بنا دیں، اے ہمارے رب! میری اس دعا کو قبول فرمائیں O

رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ﴿۴۱﴾ ع

اے ہمارے رب! جس دن حساب قائم ہو اس دن میری مغفرت فرما دیں اور میرے والدین کی مغفرت فرما دیں اور تمام مومنین کی مغفرت فرما دیں O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”اور یاد کیجئے جب ابراہیم نے عرض کیا: اے میرے رب! اس شہر (مکہ) کو امن والا بنا دیں اور مجھے اور میرے بیٹوں کو بتوں کی عبادت سے بچائیں O“ (ابراہیم:۳۵)

علامہ ابوالفرج عبدالرحمن بن علی بن الجوزی الحنبلی المتوفی ۵۹۷ھ، ابراہیم:۳۵ تا ۴۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا“: اس آیت میں اللہ تعالیٰ مشرکین عرب پر استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بلد الحرام مکہ مکرمہ ہے اور وہ سب سے پہلے اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت کے لیے بنایا گیا ہے۔ اور بے شک حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اس کو آباد کیا تو انہوں نے غیر اللہ کی عبادت سے براءت کا اظہار کیا اور انہوں نے مکہ کے لیے امن کی دعا کی۔ ”وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا“ اور اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا

حَرَمًا اٰمِنًا ۔۔۔ (العنکبوت:۶۷)'' (کیا اہل مکہ نے نہیں دیکھا کہ ہم نے مکہ کو امن والا حرم بنایا)۔ نیز اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۔۔۔ (آل عمران:۹۶-۹۷)'' (بے شک لوگوں کی خاطر اللہ کی عبادت کے لیے سب سے پہلا گھر جو بنایا گیا یہ وہی ہے جو مکہ میں ہے (وہ گھر) برکت والا ہے اور تمام جہان والوں کے لیے ہدایت کا سبب ہے اس گھر میں واضح نشانیاں ہیں، ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے، اور جو اس گھر میں داخل ہوا وہ بے خوف ہو گیا O)۔

اور اس قصہ میں فرمایا: ''رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا''۔ اس سے معلوم ہوا کہ انہوں نے اس شہر کو بنانے کے بعد یہ دعا فرمائی، اسی لیے انہوں نے کہا: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ۚ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ ۝ (ابراہیم:۳۹)''۔ اور یہ معلوم ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام سے تیرہ (۱۳) سال عمر میں بڑے تھے۔ پس یہ دعا اس وقت کی جب وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کو مکہ کی ایک جگہ میں چھوڑ کر آئے، اس وقت انہوں نے یہ دعا کی: ''رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا''۔ اور انہوں نے یہ دعا کی: ''وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ''۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر دعا کرنے والے کو چاہیے کہ وہ اپنے لیے دعا کرے اور اپنے والدین کے لیے دعا کرے اور اپنی اولاد کے لیے دعا کرے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اے میرے رب! بے شک اِن بتوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے، سو جس نے میری پیروی کی تو بے شک وہ میرے طریقہ پر ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو بے شک آپ بہت بخشنے والے بہت زیادہ رحم فرمانے والے ہیں O'' (ابراہیم:۳۶)

''رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ'': حقیقت میں بت کسی کو گمراہ نہیں کرتے نہ قول سے نہ فعل سے، لیکن جب کہ لوگ اُن کی عبادت کرنے کے سبب سے گمراہ ہو گئے تو گویا کہ اُن بتوں نے ان کو گمراہ کر دیا۔ سو یہ سبب کی طرف اسناد ہے۔

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ذکر کیا کہ بتوں کی عبادت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے بہت سے لوگ جتلا ہو گئے ہیں اور انہوں نے بتوں کی عبادت سے براءت کا اظہار کیا اور اُن کے معاملہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سپرد کر دیا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو ان کو عذاب دیں اور اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو ان کی مغفرت فرما دیں جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تھی: ''اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (المائدہ:۱۱۸)'' ((اے اللہ!) اگر آپ ان لوگوں کو عذاب دیں تو بے شک یہ سب آپ کے بندے ہیں، اور اگر آپ ان کو معاف فرما دیں تو بے شک آپ ہی بہت غالب، بے حد حکمت والے ہیں O)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی امت کے لیے استغفار کرنا اور رونا

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ عزوجل کی اس آیت کو تلاوت کیا: ''رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (ابراہیم:۳۶)'' (اے میرے رب! بے شک ان بتوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے، سو جس نے میری پیروی کی تو بے شک وہ میرے طریقہ پر ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو بے شک آپ بہت بخشنے والے بہت زیادہ رحم فرمانے والے ہیں O)، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعا کی: ''اِنْ تُعَذِّبْهُمْ

فَاِنَّهُمۡ عِبَادُكَ ۚ وَاِنۡ تَغۡفِرۡ لَهُمۡ فَاِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَكِیۡمُ ۝ (المائدہ: ۱۱۸)"((اے اللہ!) اگر آپ ان لوگوں کو عذاب دیں تو بے شک یہ سب آپ کے بندے ہیں، اور اگر آپ ان کو معاف فرمادیں تو بے شک آپ ہی بہت غالب، بے حد حکمت والے ہیں)۔ پھر آپ نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کئے اور کہا: اے اللہ! میری امت، میری امت، اور آپ روئے تو اللہ عزوجل نے فرمایا: اے جبریل! محمد کے پاس جاؤ اور تمہارے رب بہت زیادہ جاننے والے ہیں، پس ان سے پوچھو، انہیں کیا چیز رلاتی ہے؟ پس حضرت جبریل علیہ السلام آپ کے پاس حاضر ہوئے اور آپ سے پوچھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام کو خبر دی جو انہوں نے کہا تھا، پس اللہ تعالیٰ بہت زیادہ جاننے والے ہیں، پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے جبریل! محمد کے پاس جاؤ اور ان سے کہو: ہم آپ کو آپ کی امت کے متعلق راضی فرمادیں گے اور آپ کو رنجیدہ ہونے نہیں دیں گے۔

(صحیح مسلم: ۲۰۲، مستخرج ابی عوانہ: ۳۱۵، الایمان لابن مندہ: ۹۲۴، الاسماء والصفات للبیہقی: ۳۶۰، شعب الایمان للبیہقی: ۲۹۹، شرح السنۃ للبغوی: ۴۳۲۸، الجامع الصحیح للسنن والمسانید ج ۱ ص ۲۲۷، ج ۱۵ ص ۱۵۶، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشر، ج ۲۰ ص ۲۳۰)

"فَمَنۡ تَبِعَنِیۡ": یعنی جس نے میرے دین اور توحید پر میری موافقت کی۔ "فَاِنَّهٗ مِنِّیۡ": تو وہ میری ملت پر ہے۔

جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نافرمانی کی، اس کی مغفرت کے محامل

"وَمَنۡ عَصَانِیۡ فَاِنَّكَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ": اور جس نے میری نافرمانی کی تو بے شک آپ بہت مغفرت فرمانے والے، بہت رحم فرمانے والے ہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں چار اقوال ہیں:

(۱) السدی نے کہا: جس نے میری نافرمانی کی پھر توبہ کرلی تو بے شک آپ بہت مغفرت فرمانے والے، بہت رحم فرمانے والے ہیں۔

(۲) مقاتل بن حیان نے کہا: جس نے شرک کے علاوہ باقی ہر کام میں میری نافرمانی کی تو اس کے لیے آپ بہت مغفرت فرمانے والے، بہت رحم فرمانے والے ہیں۔

(۳) مقاتل بن سلیمان نے کہا: جس نے میری نافرمانی کی اور کفر کیا تو بے شک آپ بہت مغفرت فرمانے والے، بہت رحم فرمانے والے ہیں کہ اس کی توبہ قبول فرمالیں اور اس کو توحید کی طرف ہدایت دیں۔

(۴) ابن الانباری نے کہا: ہوسکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا اس وقت کی ہو جب اللہ تعالیٰ نے ان کو اس پر مطلع نہیں فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ شرک کی مغفرت نہیں فرمائیں گے جیسا کہ پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے عرفی باپ آزر کے لیے استغفار کیا تھا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اے ہمارے رب! بے شک میں نے اپنی اولاد کو آپ کے حرمت والے گھر کے پاس ایک غیر آباد وادی میں بسادیا ہے، اے ہمارے رب! تاکہ وہ نماز قائم کریں، سو آپ لوگوں کے دلوں کو اُن کی طرف مائل فرمادیں اور اُن کو کھانے کے لیے کچھ پھل عطا فرمائیں تاکہ وہ آپ کا شکر ادا کریں ۝"

(ابراہیم: ۳۷)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی "ذُرِّیَّت" کے محامل

"رَبَّنَاۤ اِنِّیۡۤ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ": اس آیت میں "مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ" کے متعلق دو قول ہیں، الاخفش اور الفراء نے کہا کہ یہ

"مِنْ" تبعیض کے لیے ہے، اور دوسرا قول ہے کہ یہ "مِنْ" تاکید کے لیے ہے، اس کا معنی ہے کہ میں نے اپنی اولاد کو ٹھہرا دیا ہے۔

"بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ": یعنی مکہ مکرمہ میں، اور وہاں پر نہ کھیتی باڑی تھی اور نہ پانی تھا۔

"عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ": اللہ تعالیٰ کے بیت کو یعنی اُن کے گھر کو محرم فرمایا، کیونکہ اس بیت میں اللہ تعالیٰ کے حرمات کو حلال کرنے کو حرام فرما دیا ہے اور اس کے حق میں کمی کرنے کو حرام فرما دیا ہے۔

اگر یہ سوال ہو کہ اس وقت تو وہاں پر کوئی گھر نہیں تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک مدت کے بعد وہاں پر اللہ تعالیٰ کا گھر بنایا تھا، اس سوال کے تین جواب ہیں:

(۱) ابن السائب نے کہا: اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کی جگہ کو اس وقت سے حرم قرار دیا تھا جب سے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا تھا۔ (۲) ابن جریر نے کہا: آپ کے اس بیت کی جگہ جس کو طوفان نوح کے ایام سے پہلے اٹھا لیا گیا تھا۔ (۳) یہ بھی ابن جریر نے کہا کہ آپ کے علم ازلی میں جو جگہ اس بیت کے لیے مقرر تھی۔

ابوسلیمان الدمشقی نے کہا: اس کلام کا ظاہر اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ دعا بیت اللہ کے بنانے کے بعد اور مکہ مکرمہ کو شہر بنانے کے بعد کی گئی۔ اور مفسرین نے اس کے خلاف کہا ہے۔

ابن ابی نجیح نے مجاہد سے یہ روایت کی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام شام سے نکلے اور ان کے ساتھ ان کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ حضرت ہاجر تھیں اور ان کے ساتھ حضرت جبریل علیہ السلام تھے، حتیٰ کہ مکہ میں آئے اور وہاں پر جو لوگ تھے انہیں العمالیق کہا جاتا تھا، وہ مکہ سے باہر رہتے اور بیت اس دن سرخ بلندی پر تھا، پس حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت جبریل علیہ السلام سے کہا: کیا اس جگہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ان کو رکھ دوں؟ تو حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا: ہاں، پس حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجر اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو حجر کی جگہ پر ٹھہرایا اور حضرت ہاجر کو حکم دیا کہ وہ ایک چھپر بنالیں، پھر انہوں نے دعا کی: "رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ ... الآیہ"۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت ہاجر کو وادی "غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ" میں چھوڑ آنا

سعید بن جبیر بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ سب سے پہلے عورتوں میں کمر پر پٹی باندھنے کا رواج حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ سے چلا ہے، سب سے پہلے انہوں نے کمر میں پٹی اس لیے باندھی تھی تاکہ ان کے نشانات کو حضرت سارہ نہ پاسکیں، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کو اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو لے کر آئے اور وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو دودھ پلا رہی تھیں، حتیٰ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان دونوں کو بیت اللہ کے پاس ایک گھنے درخت کے نیچے بٹھا دیا، وہ اس جگہ تھا جہاں زمزم ہے، مسجد کی بلند جانب میں اور ان دنوں مکہ میں کوئی نہیں تھا، نہ وہاں پانی تھا، پس حضرت ابراہیم نے ان کو وہاں بٹھا دیا اور ان کے پاس ایک تھیلا رکھ دیا جس میں کھجوریں تھیں اور ایک مشک رکھ دی جس میں پانی تھا، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام پیٹھ موڑ کر روانہ ہوئے، پس حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ماں ان کے پیچھے گئیں، پس کہا: اے ابراہیم! آپ کہاں جا رہے ہیں؟ اور ہم کو ایسی وادی میں چھوڑ رہے ہیں جس میں کوئی انسان ہے نہ کوئی اور چیز ہے، حضرت ہاجر نے یہ بات کئی مرتبہ کہی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے، تب حضرت ہاجر نے یہ کہا: کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس بات کا حکم فرمایا ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: ہاں!

حضرت ہاجرہ نے کہا: تب اللہ تعالیٰ ہمیں ضائع نہیں ہونے دیں گے، پھر وہ لوٹ گئیں، پس حضرت ابراہیم علیہ السلام روانہ ہو گئے حتیٰ کہ جب وہ ثنیہ (پہاڑی) پر پہنچے جہاں سے لوگ ان کو نہیں دیکھ رہے تھے تو انہوں نے بیت اللہ کی طرف اپنا چہرہ کیا، پھر انہوں نے ان الفاظ کے ساتھ دعا کی اور اپنے دونوں ہاتھ بلند کیے: "اے ہمارے رب! بے شک میں نے اپنی کچھ اولاد کو ایسی وادی میں ٹھہرایا ہے جو بنجر (بے آباد) ہے، آپ کے حرمت والے گھر کے پاس! یہ دعا انہوں نے "یشکرون" تک پڑھی، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ماں، حضرت اسماعیل علیہ السلام کو دودھ پلاتی تھیں اور (مشک سے) پانی پیتی تھیں، حتیٰ کہ جب مشک کا پانی ختم ہو گیا تو وہ بھی پیاسی رہیں اور ان کا بیٹا بھی پیاسا رہا، وہ اپنے بیٹے کی طرف دیکھ رہی تھیں، جو (پیاس کی شدت سے) مضطرب ہو رہا تھا، یا (راوی نے) کہا: وہ زمین پر بل کھا رہا تھا، وہ اس کی طرف دیکھنے سے آزردگی کی وجہ سے وہاں سے ہٹ گئیں، انہوں نے دیکھا کہ ان کے نزدیک ترین صفا پہاڑ ہے، وہ اس پر کھڑی ہو گئیں، پھر وہ وادی کی طرف موتہہ کر کے دیکھنے لگیں کہ شاید کوئی انسان دکھائی دے، سو انہوں نے کسی کو نہیں دیکھا، پھر وہ صفا پہاڑ سے اتریں، حتیٰ کہ جب وہ وادی میں پہنچیں تو انہوں نے اپنی قمیص کے دامن کو اٹھایا (تاکہ اس سے نہ الجھیں) پھر کسی بے کل انسان کی طرح پوری قوت کے ساتھ دوڑیں حتیٰ کہ وادی سے نکل گئیں، پھر مروہ پہاڑ پر آئیں، پھر اس پر کھڑی ہو گئیں اور دیکھنے لگیں کہ شاید کوئی نظر آئے، پس انہیں کوئی نظر نہیں آیا، پس انہوں نے اسی طرح سات بار کیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا: اسی کی اتباع میں لوگ صفا اور مروہ کے درمیان سات مرتبہ دوڑتے ہیں۔ (ساتویں بار) جب انہوں نے مروہ پر چڑھ کر جھانکا تو انہوں نے ایک آواز سنی: انہوں نے کہا: خاموش! یہ انہوں نے اپنے آپ سے کہا: انہوں نے پھر دوبارہ آواز سنی تو انہوں نے کہا: تم نے اپنی آواز سنا دی ہے، اگر تمہارے پاس کوئی مدد ہے (تو مدد کرو)، اچانک جس جگہ زمزم ہے وہاں ایک فرشتہ تھا، اس نے اپنی ایڑی سے گڑھا کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یا اس نے اپنے پر سے گڑھا کیا، حتیٰ کہ پانی نکل آیا۔ وہ اس پانی کو جمع کرنے لگیں اور اپنے ہاتھ سے اس کو اس طرح (حوض کی شکل میں) بنانے لگیں اور چلو سے پانی لے کر اس کو اپنی مشک میں ڈالنے لگیں، اور چلو سے پانی لینے کے بعد وہاں چشمہ ابل پڑا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ماں پر رحم فرمائیں! اگر وہ اس کو یوں ہی چھوڑ دیتیں تو وہ بہتا ہوا چشمہ (دریا) ہوتا، یا فرمایا: اگر وہ پانی کے چلو نہ بھرتیں تو زمزم بہتا ہوا چشمہ ہوتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بتایا: انہوں نے پانی پیا اور اپنے بچہ کو دودھ پلایا، پس ان سے فرشتہ نے کہا: آپ لوگ اپنے ضائع ہونے کا خوف نہ کریں کیونکہ اسی جگہ یہ لڑکا اور اس کا والد بیت اللہ بنائیں گے، اور بے شک اللہ اپنے (خاص) بندوں کو ضائع نہیں فرماتے اور بیت اللہ کی جگہ ٹیلہ کی طرح زمین سے بلند تھی، سیلاب اس کے دائیں اور بائیں سے زمین کاٹ کر لے جاتا تھا، یوں ہی وقت گزرتا رہا، حتیٰ کہ وہاں سے جرہم کا قافلہ گزرا یا جرہم کے گھر والے گزرے، وہ مقام کداء (بلند جگہ) کے راستے سے آ رہے تھے، پھر وہ مکہ کے نشیب میں اتر کر ٹھہرے، انہوں نے چند پرندوں کو اڑتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے کہا: یہ پرندے پانی کے گرد چکر لگا رہے ہیں، ہم اس وادی میں پہلے ٹھہرے تھے اور اس وقت یہاں پر بالکل پانی نہیں تھا، پس انہوں نے ایک آدمی یا دو آدمی بھیجے تو انہوں نے واقعی وہاں پانی دیکھا، وہ واپس آئے اور ان کو پانی کی خبر دی، پھر وہ لوگ وہاں آئے، راوی نے کہا: اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ماں پانی کے پاس بیٹھی تھیں، تو انہوں نے پوچھا: کیا آپ اجازت دیتی ہیں کہ ہم آپ کے پاس ٹھہر جائیں، انہوں نے کہا: ہاں! لیکن تمہارا

پانی میں کوئی حق نہیں ہوگا، انہوں نے کہا: ٹھیک ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت اسماعیل علیہ السلام کو لوگ مل گئے اور وہ (حضرت ہاجرہ) انسانوں کا قرب پسند کرتی تھیں، پس وہ لوگ وہاں ٹھہر گئے اور انہوں نے اپنے گھر والوں کو بھی بلا لیا، پس وہ بھی وہاں ٹھہر گئے حتیٰ کہ وہاں ان کے کئی گھر آباد ہو گئے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام جوان ہو گئے اور انہوں نے ان سے عربی زبان سیکھ لی، حضرت اسماعیل علیہ السلام جب جوان ہوئے تو وہ جرہم میں سب سے زیادہ حسین اور خوبصورت تھے، پس انہوں نے اپنی ایک عورت کی ان سے شادی کر دی، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ فوت ہو گئیں، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شادی کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے چھوڑے ہوئے لوگوں کو دیکھنے کے لیے آئے، تو آپ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو نہ پایا، پس آپ نے ان کی بیوی سے ان کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے بتایا: وہ ہماری روزی کی تلاش میں گئے ہوئے ہیں، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سے ان کی معاشی حالت اور گزارے کے متعلق سوال کیا تو اس نے کہا: ہم بری حالت میں ہیں، اور کہا: ہم بہت تنگی اور سختی میں ہیں اور ان سے شکایت کی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: جب تمہارا خاوند آ جائے تو ان کو میرا سلام کہنا اور ان سے کہنا کہ وہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ کو تبدیل کر لیں، پس جب حضرت اسماعیل علیہ السلام آئے تو گویا انہوں نے کوئی مانوس خوشبو محسوس کی، سو پوچھا: کیا تمہارے پاس کوئی آیا تھا، ان کی بیوی نے کہا: ہمارے پاس اس طرح، اس طرح کے ایک بوڑھے آئے تھے، انہوں نے ہم سے آپ کے متعلق سوال کیا، تو میں نے ان کو بتایا اور انہوں نے مجھ سے پوچھا: تمہارے معاشی حالات کیسے ہیں تو میں نے ان کو بتایا کہ ہم بہت تنگی اور سختی میں ہیں، حضرت اسماعیل علیہ السلام نے پوچھا: کیا انہوں نے تمہیں کوئی اور وصیت کی؟ اس نے کہا: انہوں نے آپ کو سلام کہنے کے لیے کہا اور یہ کہا کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ بدل لیں، حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کہا: وہ میرے والد تھے اور انہوں نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ میں تم کو الگ کر دوں، تم اپنے گھر والوں کے پاس چلی جاؤ، پھر حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اس کو طلاق دے دی اور بنو جرہم کی ایک دوسری لڑکی سے شادی کر لی، پھر جب تک اللہ کو منظور ہوا حضرت ابراہیم علیہ السلام رکے رہے، پھر ان کے پاس گئے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام کو نہ پایا، پس وہ ان کی بیوی کے پاس گئے اور ان کی بیوی سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے متعلق دریافت کیا تو اس نے بتایا: وہ ہماری روزی کی تلاش میں گئے ہوئے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا: تم لوگوں کا کیا حال ہے؟ اور ان کی معاشی حالت اور گزارے کے متعلق پوچھا تو اس نے بتایا: ہم بہت اچھے حال اور کشادگی میں ہیں، اور اس نے اللہ تعالیٰ کی بہت حمد و ثنا کی، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے کھانے کے متعلق دریافت کیا تو اس نے بتایا: ہم گوشت کھاتے ہیں، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے مشروب کے متعلق پوچھا تو اس نے بتایا: ہم پانی پیتے ہیں، پس حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی: اے اللہ! ان کے گوشت اور پانی میں برکت عطا فرما، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان دنوں ان کے ہاں اناج اور غلہ نہیں ہوتا تھا، اور اگر ان کے ہاں اناج ہوتا تو آپ اس کے لیے بھی دعا فرماتے، آپ نے فرمایا: صرف گوشت اور پانی پر زندگی گزارنا مکہ کے علاوہ اور کسی جگہ کے موافق نہیں تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سے فرمایا: جب تمہارے شوہر آئیں تو ان کو میرا سلام کہنا اور ان سے کہنا کہ وہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ کو قائم رکھیں، جب حضرت اسماعیل علیہ السلام آئے تو انہوں نے پوچھا: کیا تمہارے پاس کوئی شخص آیا تھا؟ تو ان کی بیوی نے کہا: ایک خوب صورت بزرگ تشریف لائے تھے اور اس نے ان کی تعریف کی، انہوں نے آپ کے متعلق پوچھا تو میں نے ان کو بتایا،

انہوں نے پوچھا: تمہاری زندگی کیسے گزر رہی ہے تو میں نے ان کو بتایا کہ ہم بہت اچھے حال میں ہیں، حضرت اسماعیل علیہ السلام نے پوچھا: کیا انہوں نے تمہیں کوئی وصیت کی؟ اس نے کہا: ہاں! انہوں نے آپ کو سلام کیا تھا اور آپ کو یہ حکم دیا تھا کہ آپ اپنے دروازہ کی چوکھٹ کو قائم رکھیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا: وہ میرے والد ہیں اور تم دروازہ کی چوکھٹ ہو، انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم کو اپنے نکاح میں برقرار رکھوں، پھر جتنا عرصہ اللہ کو منظور ہوا، اتنا عرصہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان سے دور رہے، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے بعد آئے، اس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام زمزم کے قریب ایک گھنے درخت کے نیچے اپنا تیر درست فرما رہے تھے، جب حضرت اسماعیل علیہ السلام نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا تو کھڑے ہو گئے اور جس طرح باپ بیٹے اور بیٹا باپ سے ملتا ہے، اسی طرح وہ دونوں ایک دوسرے سے ملے، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: اے اسماعیل! بے شک اللہ نے مجھے ایک کام کا حکم فرمایا ہے، حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کہا: آپ کے رب نے آپ کو جو حکم فرمایا ہے، آپ اس کام کو کیجئے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا: تم میری مدد کرو گے؟ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کہا: میں آپ کی مدد کروں گا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ میں یہاں پر ایک گھر بناؤں اور انہوں نے ایک بلند ٹیلہ اور اس کے اردگرد کی طرف اشارہ فرمایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بتایا: پس اس وقت ان دونوں نے بیت اللہ کی بنیادیں بلند کیں، پس حضرت اسماعیل علیہ السلام پتھر لے کر آتے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام تعمیر کرتے تھے، حتیٰ کہ جب اس کی دیوار بلند ہو گئی تو حضرت اسماعیل علیہ السلام اس پتھر کو لے کر آئے اور اس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام تعمیر کرنے لگے، حضرت اسماعیل علیہ السلام انہیں پتھر لا لا کر دیتے تھے اور وہ دونوں یہ دعا کرتے تھے: "اے ہمارے رب! ہم سے (اس کو) قبول فرمائیے، بے شک آپ (سب کچھ) سننے والے (سب کچھ) جاننے والے ہیں۔ (البقرہ: ۱۲۷)"۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بتایا: وہ دونوں تعمیر کرتے رہے اور اس کے گرد طواف کرتے رہے اور وہ دونوں یہ دعا کرتے تھے: "اے ہمارے رب! ہم سے (اس کو) قبول فرمائیے، بے شک آپ (سب کچھ) سننے والے (سب کچھ) جاننے والے ہیں۔ (البقرہ: ۱۲۷)"۔

(صحیح البخاری: ۳۳۶۴، مصنف عبدالرزاق: ۹۱۰۷، اخبار مکۃ للفاکہی: ۱۵۰۷، السنن الکبریٰ للنسائی: ۸۳۲۰، شرح مشکل الآثار: ۱۲۵۲، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۹۳۰۷، شعب الایمان للبیہقی ج ۵ ص ۳۹۴۳، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشرۃ ج ۶ ص ۲۷۳)

"رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ": اس "لام" کے متعلق دو قول ہیں:

(۱) مقاتل نے کہا کہ یہ "لام" اللہ عزوجل کے اس ارشاد کے متعلق ہے: "وَّاجۡنُبۡنِیۡ وَ بَنِیَّ اَنۡ نَّعۡبُدَ الۡاَصۡنَامَ" اور اب معنی یہ ہے کہ ان کو بتوں سے بچا کر رکھیں تاکہ یہ نماز پڑھیں۔

(۲) الماوردی نے کہا: یہ اللہ عزوجل کے قول "اَسۡکَنۡتُ" کے متعلق ہے، اور اس آیت کا معنی اس طرح ہے کہ میں نے ان کو آپ کے گھر کے پاس ٹھہرا دیا تاکہ یہ نماز پڑھیں، کیونکہ بیت اللہ نمازوں کا قبلہ ہے۔

"فَاجۡعَلۡ اَفۡـئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ": اس آیت کے متعلق بھی چار قول ہیں:

(۱) اکثرین نے کہا کہ لوگوں کے دلوں کو اس کی طرف مائل فرما دیں۔

(۲) اور ابن الانباری نے کہا: قلوب کو "الافئدۃ" سے تعبیر فرمایا، کیونکہ قلب دل کے قریب ہوتا ہے۔

(۳) اور "فواد" سے مراد دل لیتے ہیں۔

(۴) اور الزجاج نے کہا: "الافئدۃ" سے مراد ہے لوگوں کی جماعت۔

"تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ":

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل فرمادیں، اور "الی" کلام کی توکید کے لیے ہے۔ اور ابن الانباری نے کہا کہ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل فرمادیں، اور اس میں بھی دو قول ہیں: (۱) اکثرین نے کہا کہ لوگوں کے دلوں کو حج کی طرف مائل فرمادیں۔ (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں کو مکہ کی رہائش کی طرف اور مکہ سے محبت کی طرف مائل فرمادیں۔

سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یوں دعا کی ہوتی کہ "آپ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل فرمادیں" تو مکہ کا حج یہود و نصاریٰ بھی کرتے، لیکن انہوں نے کہا: "مِّنَ النَّاسِ" یعنی بعض لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل فرمادیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور سعید بن جبیر وغیرہ نے کہا: اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام دعا فرماتے کہ "لوگوں کے دلوں کو اس کی طرف مائل فرمادیں" تو فارس، روم اور یہود و نصاریٰ اور تمام لوگ حج کے لیے ٹوٹ پڑتے، لیکن انہوں نے کہا: "مِّنَ النَّاسِ" تو حج کے ساتھ مسلمان مخصوص ہو گئے۔

"وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ":

اور ان کو پھلوں میں سے کچھ رزق عطا فرمائیں، تاکہ آپ کی عبادت کرنے کے لیے وہ پھل ان کے مددگار ہو جائیں، کیونکہ یہ وادی "غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ" تھی نہ یہاں پانی تھا اور نہ کھیتی باڑی تھی، پس ان کے لیے وہاں پر پھل بنادیں جس کو وہ کھائیں، اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا قبول فرمائی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا ــــ (القصص:۵۷)" (کیا ہم نے انہیں امن والے حرم میں جگہ عطا نہیں فرمائی جس کی طرف ہماری طرف سے رزق کے طور پر ہر قسم کے پھل لائے جاتے ہیں)۔

اور یہ اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم ہے اور ان کی رحمت اور برکت ہے کیونکہ البلد الحرام مکہ مکرمہ میں کوئی پھل دار درخت نہیں تھا، اور اب ساری دنیا کے پھل وہاں کھینچ کر لائے جاتے ہیں، اور یہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی دعا کا ثمرہ ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اے ہمارے رب! بے شک آپ ہر اس چیز کو جانتے ہیں جس کو ہم چھپاتے ہیں اور اس چیز کو جانتے ہیں جس کو ہم ظاہر کرتے ہیں، اور اللہ پر نہ زمین میں کوئی چیز پوشیدہ ہے اور نہ آسمان میں O"

(ابراہیم:۳۸)

"رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ": ابوصالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ ہم اسماعیل کی مفارقت سے اپنے دل میں جو رنج پاتے ہیں اس کو بھی آپ جانتے ہیں اور جو ان کی محبت کو ہم ظاہر کرتے ہیں اس کو بھی آپ جانتے

ہیں، یا انہوں نے اس وقت کہا جب انہوں نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو حرم میں ٹھہرایا اور ان سے جدا ہونے کا ارادہ کیا۔ یعنی آپ جانتے ہیں کہ میری اس دعا سے کیا مقصد ہے اور میں نے اس شہر کے رہنے والوں کے لیے دعا سے کیا ارادہ کیا ہے۔ اور وہ قصداً آپ کی رضا ہے اور آپ کے ساتھ اخلاص ہے۔

"وَمَا یَخْفٰی عَلَی اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ": کیونکہ آپ تمام چیزوں کو جانتے ہیں خواہ ظاہر ہوں یا باطن ہوں، اور آپ سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے نہ زمین میں اور نہ آسمان میں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اللہ کا بے حد شکر ہے جنہوں نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق (دو بیٹے) عطا فرمائے، بے شک میرے رب ضرور دعا قبول فرمانے والے ہیں O" (ابراہیم: ۳۹)

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْكِبَرِ": یعنی بڑھاپے کے بعد۔ "اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاں جب حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے، اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ننانوے (۹۹) سال تھی، اور ان کے لیے جب حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے تو اس وقت اُن کی عمر ایک سو بارہ (۱۱۲) سال تھی۔ "اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ": بے شک میرے رب ضرور دعا قبول فرمانے والے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اے میرے رب! مجھے اور میری اولاد کو نماز قائم کرنے والا بنا دیں، اے ہمارے رب! میری اس دعا کو قبول فرمائیں O اے ہمارے رب! جس دن حساب قائم ہو اس دن میری مغفرت فرما دیں اور میرے والدین کی مغفرت فرما دیں اور تمام مومنین کی مغفرت فرما دیں O" (ابراہیم: ۴۰۔۴۱)

"رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ۖ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ ۝ رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ": ابن الانباری نے کہا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والدین کے لیے استغفار کیا اور وہ دونوں اس وقت زندہ تھے، یہ طمع کرتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں کو اسلام کی توفیق عطا فرمائیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ لوالدی سے مراد ان کی حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا تھی۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے "ولولدی" یعنی حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہما السلام، ان کی دلیل یہ ہے کہ ان کا ذکر اس سے پہلے ہے۔ اور مجاہد کی قراءت میں ہے "ولوالدی" یعنی میرے والد کی مغفرت فرمائیں۔ یعنی جس دن اعمال کی جزا ظاہر ہوگی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ جس دن لوگ حساب کے لیے کھڑے ہوں گے۔

(زاد المسیر فی علم التفسیر ج ۴ ص ۵۱۵۔۵۱۷، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۳۱ھ، وتفاسیر اخریٰ)

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا یَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۬ؕ اِنَّمَا یُؤَخِّرُهُمْ لِیَوْمٍ تَشْخَصُ فِیْهِ الْاَبْصَارُ ۝۴۲

اور تم ہرگز ہرگز یہ گمان نہ کرنا کہ اللہ ظالموں کے کاموں سے بے خبر ہیں، وہ تو انہیں اس دن کے لیے مہلت دے رہے ہیں جس دن مارے دہشت کے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی O

مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَ اَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ؕ﴿۴۳﴾

وہ اپنے سروں کو اٹھائے ہوئے آنکھوں کو جھکائے بغیر میدانِ محشر کی طرف اس طرح دوڑیں گے کہ اُن کے دل عقلوں سے خالی ہیں ○

وَ اَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَاۤ اَخِّرْنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَ نَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ اَوَ لَمْ تَكُوْنُوْۤا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ۙ﴿۴۴﴾

اور (اے رسولِ اکرم!) لوگوں کو اس دن کے عذاب سے ڈرائیں جس دن اُن پر عذاب آئے گا، پس جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہوگا وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! ہمیں تھوڑے وقت کے لیے مہلت دے دیں تو ہم آپ کی دعوت کو قبول کریں گے اور رسولوں کی پیروی کریں گے، (ان سے کہا جائے گا:) کیا تم نے اس سے پہلے دنیا میں قسمیں نہیں کھائی تھیں کہ تم پر کوئی زوال نہیں آئے گا ○

وَّ سَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ تَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَ ضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ﴿۴۵﴾

اور تم اُن لوگوں کے گھروں میں رہتے رہے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، اور تم پر یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ ہم نے اُن کے ساتھ کیسا سلوک فرمایا تھا اور ہم نے تمہیں مختلف مثالیں دے کر سمجھایا تھا (پھر بھی تم ایمان نہیں لائے تھے) ○

وَ قَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَ عِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَ اِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿۴۶﴾

اور بے شک ان لوگوں نے اپنی سی سازش کی اور اللہ کو اُن کی سازش اچھی طرح معلوم تھی، اور ان کی سازش ایسی زبردست تھی کہ اس سے پہاڑ بھی زائل ہو جاتے ○

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ؕ﴿۴۷﴾

پس تم ہرگز یہ گمان نہ کرنا کہ اللہ رسولوں سے کیے ہوئے وعدہ کے خلاف فرمائیں گے، بے شک اللہ بہت غالب، بدلہ لینے والے ہیں ○

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۴۸﴾

جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی تبدیل فرما دیے جائیں گے اور سب لوگ (قبروں سے نکل کر) اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہو جائیں گے جو واحد ہیں، سب پر غالب ہیں ○

وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿۴۹﴾

اور (اے رسول اکرم!) آپ اس دن مجرموں کو زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھیں گے ○

سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ﴿۵۰﴾

ان کا لباس تارکول کا ہوگا اور آگ ان کے چہروں کو ڈھانپ لے گی ○

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۵۱﴾

تا کہ اللہ ہر شخص کو اس کے اعمال کی جزا عطا فرمائیں، بے شک اللہ بہت جلد حساب لینے والے ہیں ○

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۵۲﴾

یہ قرآن تمام لوگوں کے لیے اللہ کا پیغام ہے تا کہ لوگ اس کے سبب سے عذاب سے ڈرائے جائیں، اور تا کہ وہ جان لیں کہ بے شک اللہ واحد ہیں جو عبادت کے مستحق ہیں اور عقل والے نصیحت حاصل کریں ○

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور تم ہرگز ہرگز یہ گمان نہ کرنا کہ اللہ ظالموں کے کاموں سے بے خبر ہیں، وہ تو انہیں اس دن کے لیے مہلت دے رہے ہیں جس دن مارے دہشت کے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی ○ وہ اپنے سروں کو اٹھائے ہوئے آنکھوں کو جھپکائے بغیر میدان محشر کی طرف اس طرح دوڑیں گے کہ اُن کے دل عقلوں سے خالی ہیں ○'' (ابراہیم: ۴۲-۴۳)

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ، ابراہیم: ۴۲ تا ۵۲ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ'': جب نبی ﷺ مشرکین کے افعال سے اور دشمن ابراہیم سے ان کی مخالفت کرنے سے غمزدہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی فرمائی کہ آپ اس طرح صبر کریں جس طرح ابراہیم نے صبر کیا تھا اور مشرکین کو بتائیں کہ اُن پر جو عذاب مؤخر ہو رہا ہے، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ عزوجل اُن کے افعال سے راضی ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ نافرمانوں اور سرکشوں کو ایک مدت تک مہلت دیتے ہیں۔ میمون بن مہران نے کہا: اس آیت میں ظالم کے لیے وعید ہے اور مظلوم کے لیے تسلی ہے۔

''اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ'': یعنی اللہ تعالیٰ مشرکین مکہ کو مہلت دے رہے ہیں اور ان سے عذاب کو مؤخر فرما رہے ہیں۔

''لِيَوۡمٍ تَشۡخَصُ فِيۡهِ الۡاَبۡصَارُ'': اس دن تک کے لیے اُن سے عذاب کو مؤخر فرما رہے ہیں جس دن کی ہولناکی کی وجہ سے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تمام مخلوق کی آنکھیں شدت حیرت سے اس دن کھلی کی کھلی رہ جائیں گی اور وہ پلک نہیں جھپکائیں گے۔

''مُهۡطِعِيۡنَ'': اس کا معنی ہے یعنی دوڑ رہے ہوں گے۔

حسن، قتادہ اور سعید بن جبیر نے کہا: یہ لفظ ''اھطع یھطع'' سے ماخوذ ہے، یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی شخص دوڑ رہا ہو۔ دوسرا قول یہ ہے کہ المھطع وہ شخص ہے جو ذلت کے ساتھ اور ڈرتے ہوئے پلک جھپکائے بغیر دوڑ رہا ہو۔

النحاس نے کہا: لغت میں معروف یہ ہے کہ اھطع اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی شخص دوڑ رہا ہو۔

اور ابو عبید نے کہا کہ یہ دونوں وجہیں صحیح ہیں، یعنی وہ مسلسل دیکھتے ہوئے دوڑ رہے ہوں گے۔ اور ابن زید نے کہا: ''المھطع'' اسے کہا جاتا ہے جو اپنا سر نہ اٹھائے۔ ''مُقۡنِعِيۡ رُءُوۡسِهِمۡ'': حسن بصری نے کہا: تمام لوگوں کے چہرے اس دن آسمان کی طرف اٹھے ہوئے ہوں گے اور کوئی شخص دوسرے کی طرف نہیں دیکھ رہا ہوگا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وہ اپنے سر جھکائے ہوئے دوڑ رہے ہوں گے۔ ''لَا يَرۡتَدُّ اِلَيۡهِمۡ طَرۡفُهُمۡ'': پس وہ شدت خوف سے پلکیں نہیں جھپکا رہے ہوں گے۔ ''وَ اَفۡـِٕدَتُهُمۡ هَوَآءٌ'': یعنی خوف کی شدت انہیں کسی چیز سے بے پرواہ نہیں کرے گی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ خیر سے خالی ہوں گے۔ السدی نے کہا: ان کے دل ان کے سینہ سے نکل جائیں گے اور حلقوم میں پنجے گاڑ دیں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور (اے رسولِ اکرم!) لوگوں کو اس دن کے عذاب سے ڈرائیں جس دن اُن پر عذاب آئے گا، پس جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہوگا وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! ہمیں تھوڑے وقت کے لیے مہلت دے دیں تو ہم آپ کی دعوت کو قبول کریں گے اور رسولوں کی پیروی کریں گے، (ان سے کہا جائے گا:) کیا تم نے اس سے پہلے دنیا میں قسمیں نہیں کھائی تھیں کہ تم پر کوئی زوال نہیں آئے گا O'' (ابراہیم: ۴۴)

''وَ اَنۡذِرِ النَّاسَ'': حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بتایا کہ اس سے مراد ہے کہ آپ اہل مکہ کو عذاب سے ڈرائیں۔

''يَوۡمَ يَاۡتِيۡهِمُ الۡعَذَابُ'': جس دن اُن پر قیامت کا عذاب آئے گا، یعنی اُن کو اس دن سے ڈرائیں۔

اس میں خصوصیت کے ساتھ عذاب کے دن کا ذکر فرمایا، اگرچہ قیامت کے دن ثواب بھی عطا فرمایا جائے گا، کیونکہ یہ کلام نافرمان اور ناشکرے کو ڈانٹنے کے لیے لایا گیا ہے۔ ''فَيَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا'': جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، وہ اس دن میں کہیں گے: ''رَبَّنَاۤ اَخِّرۡنَاۤ'': اے ہمارے رب! ہمیں اس عذاب سے مہلت عطا فرمائیں۔ ''اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيۡبٍ'': یعنی انہوں نے یہ سوال کیا کہ انہیں دنیا کی طرف لوٹایا جائے۔ ''نُّجِبۡ دَعۡوَتَكَ'': ہمیں دنیا کی طرف لوٹایا گیا تو ہم اسلام کو قبول کرلیں

گے۔ "وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ": اور رسولوں کے پیغام کو قبول کر لیں گے۔ "اَوَلَمْ تَكُوْنُوْۤا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ": یعنی کیا اس سے پہلے تم نے دنیا میں قسمیں نہیں کھائی تھیں۔ "مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ": مجاہد نے کہا: یہ قریش کی قسم ہے، انہوں نے قسم کھا کر کہا تھا کہ ان کو مرنے کے بعد دوبارہ نہیں اٹھایا جائے گا۔ اور اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ ۙ لَا یَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ یَّمُوْتُ ؕ بَلٰی وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝" (النحل: ۳۸) (اور کافروں نے اللہ کی پکی قسمیں کھا کر کہا: "اللہ مُردوں کو زندہ نہیں فرمائے گا" کیوں نہیں زندہ فرمائیں گے؟ یہ اللہ کا برحق وعدہ ہے جس کو وہ ضرور پورا فرمائیں گے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے)۔

یعنی کیا تم اس حالت سے پہلے یہ قسمیں نہیں کھاتے تھے کہ تم جس حال پر ہو اس حال سے تمہیں کبھی زوال نہیں ہوگا اور نہ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ کر جانا ہے اور نہ کوئی سزا ملے گی۔ اور مجاہد وغیرہ نے کہا: "مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ" کا معنی ہے کہ تم دنیا سے آخرت کی طرف منتقل نہیں ہو گے۔

امام بیہقی نے محمد بن کعب القرظی سے روایت کی ہے، انہوں نے کہا: اہل دوزخ کے لیے پانچ دعائیں ہیں جن میں سے چار دعاؤں کو اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں گے، اور جب وہ پانچویں دعا کریں گے تو اللہ تعالیٰ اُن سے اس کے بعد بالکل کلام نہیں فرمائیں گے۔ (وہ دعائیں یہ ہیں): "رَبَّنَاۤ اَمَتَّنَا اثْنَتَیْنِ وَاَحْیَیْتَنَا اثْنَتَیْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰی خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِیْلٍ ۝" (المؤمن: ۱۱) (اے ہمارے رب! آپ نے ہمیں دومرتبہ موت دی اور دودفعہ زندہ فرمایا، اب ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں، پس کیا دوزخ سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟O)۔ پس اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں فرمائیں گے: "ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗۤ اِذَا دُعِیَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَاِنْ یُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ؕ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِیِّ الْكَبِیْرِ ۝" (المؤمن: ۱۲) (یہ دائمی عذاب ہے، اس لئے کہ جب دنیا میں اللہ وحدہٗ کا ذکر کیا جاتا تھا تو تم ان کی توحید کا انکار کرتے تھے اور اگر ان کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جاتا تو تم اس پر یقین کر لیتے تھے، پس فیصلہ صرف اللہ کا ہے جو سب سے بلند، سب سے بڑے ہیں)۔ پھر وہ دوسری بار دعا کریں گے: "رَبَّنَاۤ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ۝" (السجدہ: ۱۲) (اے ہمارے رب! ہم نے سب کچھ دیکھ اور سن لیا، پس آپ ہمیں (ایک دفعہ) دنیا میں بھیج دیں تا کہ ہم نیک کام کریں، بے شک اب ہم ایمان لے آئے ہیں)۔ اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں فرمائیں گے: "فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِیْتُمْ لِقَآءَ یَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا نَسِیْنٰكُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝" (السجدہ: ۱۴) ((جہنم کے داروغے کہیں گے:) چونکہ تم نے اس دن کی ملاقات کو بھلا دیا تھا، اس لئے یہ عذاب چکھو ہم نے بھی تمہیں بھلا دیا ہے اور جن گناہوں کا تم ارتکاب کیا کرتے تھے ان کے سبب ہمیشہ کا عذاب چکھوO)۔ پھر وہ تیسری بار دعا کریں گے: "رَبَّنَاۤ اَخِّرْنَاۤ اِلٰۤی اَجَلٍ قَرِیْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ــــ" (ابراہیم: ۴۴) (اے ہمارے رب! ہمیں تھوڑے وقت کے لیے مہلت دے دیں تو ہم آپ کی دعوت کو قبول کریں گے اور رسولوں کی پیروی کریں گے)۔ پھر وہ چوتھی بار دعا کریں گے: "رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَیْرَ الَّذِیْ كُنَّا نَعْمَلُ ــــ" (فاطر: ۳۷) (اے ہمارے رب! ہمیں ایک دفعہ یہاں سے نکال دیں ہم جو کام پہلے کیا کرتے تھے، وہ چھوڑ کر نیک کام کریں گے)۔ پس اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں فرمائیں گے: "قَالَ اخْسَـُٔوْا فِیْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ۝" (المؤمنون: ۱۰۸) (دفع ہو جاؤ، اسی میں پڑے رہو اور (آئندہ) مجھ سے کلام بھی نہ کرناO)۔ پھر اس کے بعد اُن کی امید اور دعا

منقطع ہو جائے گی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور تم اُن لوگوں کے گھروں میں رہتے رہے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا اور تم پر یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ ہم نے اُن کے ساتھ کیسا سلوک فرمایا تھا اور ہم نے تمہیں مختلف مثالیں دے کر سمجھایا تھا (پھر بھی تم ایمان نہیں لائے تھے)O'' (ابراہیم: ۴۵)

''وَّسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ'':

اور تم ثمود کے شہروں میں رہے، پس تم نے ان کے گھروں کو دیکھ کر عبرت کیوں نہ پکڑی، جب کہ تم پر یہ ظاہر ہو چکا تھا کہ ہم نے ان کو کیسا عذاب پہنچایا۔ اور اس کے علاوہ ہم نے تمہیں قرآنِ مجید میں امثال بھی بیان فرمائیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور بے شک ان لوگوں نے اپنی سی سازش کی اور اللہ کو اُن کی سازش اچھی طرح معلوم تھی، اور ان کی سازش ایسی زبردست تھی کہ اس سے پہاڑ بھی زائل ہو جاتےO'' (ابراہیم: ۴۶)

''وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ'':

یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا اور رسولوں کی تکذیب کی اور عناد جاری رکھا۔ اور اُن کا مکر یعنی اُن کی سازش ایسی نہ تھی کہ جس سے پہاڑ زائل ہو جائیں کیونکہ اُن کی وہ سازش بہت کمزور تھی۔

کافروں کے مکر کی تفسیر میں متعدد اقوال

اس میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ مَكَرُوْا کی ضمیر کس کی طرف راجع ہے یعنی یہ گہری سازش کرنے والے کون تھے، زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد کفارِ مکہ ہیں جب انہوں نے سیدنا محمد ﷺ کو قتل کرنے کی سازش کی تھی اور آپ کے کاشانۂ اقدس کا محاصرہ کر لیا تھا جیسے ہی آپ گھر سے باہر نکلیں آپ کو (معاذ اللہ) قتل کر دیا جائے، اس کا ذکر اس آیت میں ہے: ''وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ؕ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ۝ (الانفال: ۳۰)'' ((اے رسولِ اکرم!) اس وقت کو یاد کیجئے جب کفار آپ کے خلاف خفیہ تدبیریں کر رہے تھے تاکہ وہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو شہید کر دیں یا آپ کو بے وطن کر دیں، وہ اپنے مکر میں مشغول تھے اور اللہ اپنی خفیہ تدبیر فرما رہے تھے، اور اللہ سب سے بہتر خفیہ تدبیر فرمانے والے ہیں)۔

اور اس کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ مَكَرُوْا کی ضمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ کے کفار کی طرف راجع ہے اور اس سازش سے مراد یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں ایک جابر بادشاہ تھا جس کا نام نمرود تھا، اس نے آسمان تک پہنچنے کی ایک سازش تیار کی۔

اس بادشاہ نے گدھ کے دو بچوں کو پالا، جب وہ خوب تیار اور فربہ ہو گئے تو ایک چھوٹی سی چوکی کے ایک پائے سے ایک کو باندھ دیا اور دوسرے پائے سے دوسرے کو باندھ دیا، خود اپنے ایک وزیر کے ساتھ اس چوکی پر بیٹھ گیا، انہیں کئی دن بھوکا رکھا تھا، پھر ایک لکڑی کے سرے پر گوشت باندھ کر اسے اوپر اٹھایا، بھوکے گدھ اس گوشت کو کھانے کے لیے اوپر کو اڑے اور اپنے زور سے چوکی کو بھی لے اڑے، جب وہ اتنی بلندی پر پہنچ گئے کہ انہیں ہر چیز مکھی کی طرح نظر آنے لگی تو اس نے وہ لکڑی جھکا دی، اب گوشت نیچے

دکھائی دینے لگا، اس لیے اب ان گدھوں نے اپنے پر سمیٹ کر گوشت کے لیے نیچے اترنا شروع کر دیا اور وہ تخت بھی نیچے ہونے لگا حتیٰ کہ وہ تخت زمین پر پہنچ گیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ، ابن کعب اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے کہ یہ نمرود کا قصہ ہے جو کنعان کا بادشاہ تھا، اس نے اس طرح آسمان پر قبضہ کرنے کی احمقانہ سازش کی تھی۔ (بہ ظاہر یہ روایت درایت کے خلاف ہے۔ واللہ اعلم بالصواب)۔ اس کے بعد قبطیوں کے بادشاہ فرعون کو بھی یہی خبط سمایا تھا، اس نے بہت بلند مینار تعمیر کرایا تھا، لیکن دونوں کا ضعف اور عجز ظاہر ہو گیا، اور ذلت اور خواری کے ساتھ وہ دونوں حقیر اور ذلیل ہوئے۔

امام ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ضحاک اور قتادہ سے یہ نقل کیا ہے کہ اس مکر اور سازش سے مراد یہ ہے کہ مشرکین مکہ اور کفار نے اللہ تعالیٰ کے شریک گھڑ لئے اور عیسائیوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف بیٹے کو منسوب کیا، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: "وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا ﴿۸۹﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿۹۰﴾ أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿۹۱﴾ وَمَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمٰنِ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۲﴾ (مریم: ۸۸۔۹۲)" (اور کافروں نے کہا: رحمٰن نے اپنا بیٹا بنا لیا ہےO بے شک تم نے یہ بہت سنگین بات کہیO قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ پڑیں اور زمینیں ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور پہاڑ لرزتے ہوئے گر جائیںO کیونکہ انہوں نے رحمٰن کے لیے بیٹے کا دعویٰ کیاO اور رحمٰن کی شان کے لائق نہیں کہ وہ اپنے لیے بیٹے بنائیںO)۔ (جامع البیان جز ۱۳ ص ۳۲۲، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پس تم ہرگز یہ گمان نہ کرنا کہ اللہ رسولوں سے کئے ہوئے وعدہ کے خلاف فرمائیں گے، بے شک اللہ بہت غالب، بدلہ لینے والے ہیںO" (ابراہیم: ۴۷)

"فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ؕ إِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ":

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم المنتقم ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی تبدیل فرما دیے جائیں گے اور سب لوگ (قبروں سے نکل کر) اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہو جائیں گے جو واحد ہیں، سب پر غالب ہیںO" (ابراہیم: ۴۸)

"يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ":

یعنی اس دن کو یاد کیجئے جب یہ زمین بدل دی جائے گی۔ اور زمین کی تبدیلی کی کیفیت میں اختلاف ہے:

اکثر لوگوں نے یہ کہا ہے کہ زمین کی تبدیلی سے مراد یہ ہے کہ اس کی صفات متغیر ہو جائیں گی، اس کے ٹیلے ہموار ہو جائیں گے اور اس کے پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح دھنکے ہوئے ہوں گے اور زمین پھیلی ہوئی ہوگی۔

زمین کے تبدیل ہونے کے متعلق احادیث اور آثار

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھڑا ہوا تھا، علماء یہود میں سے ایک عالم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا: "السلام علیک یا محمد" میں نے اس کو زور سے دھکا دیا جس سے وہ گرتے

گرتے بچا۔ کہنے لگا: تم نے مجھے کیوں دھکا دیا ہے؟ میں نے کہا: تم نے یا رسول اللہ کیوں نہیں کہا؟ کہنے لگا: ہم ان کو اسی نام سے پکارتے ہیں جو نام ان کے گھر والوں نے رکھا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے گھر والوں نے جو میرا نام رکھا ہے وہ محمد ہی ہے، یہودی نے کہا: میں آپ سے کچھ سوال کرنے آیا ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میں تم کو کچھ بتلا دوں تو تم کو کچھ فائدہ پہنچے گا؟ اس نے کہا: میں غور سے آپ کی بات سنوں گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک تنکے سے زمین کرید رہے تھے، آپ نے فرمایا: پوچھو، یہودی کہنے لگا: جب زمین و آسمان بدل چکے ہوں گے اس وقت لوگ کہاں ہوں گے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ اندھیرے میں پل صراط کے قریب ہوں گے، اس نے پوچھا: سب سے پہلے پل صراط سے کون گذرے گا؟ آپ نے فرمایا: فقراء مہاجرین، اس نے پوچھا: وہ جنت میں داخل ہوں گے تو سب سے پہلے انہیں کیا کھلایا جائے گا؟ آپ نے فرمایا: مچھلی کی کلیجی کا ٹکڑا۔ اس نے پوچھا: اس کے بعد کیا کھلایا جائے گا؟ آپ نے فرمایا: ان کے لیے جنت کا وہ بیل ذبح کیا جائے گا جو جنت میں چرا کرتا تھا، اس نے پوچھا: اس کے بعد انہیں کیا پلایا جائے گا؟ آپ نے فرمایا: انہیں سلسبیل نامی ایک چشمہ سے پانی پلایا جائے گا، اس یہودی عالم نے کہا: آپ نے سچ فرمایا، لیکن میں آپ سے وہ بات پوچھنے آیا ہوں جس کو روئے زمین پر نبی کے سوا صرف ایک آدمی یا دو آدمی جانتے ہیں، آپ نے فرمایا: اگر میں تم کو وہ بات بتلاؤں تو تم کو فائدہ پہنچے گا، اس نے کہا: میں غور سے سنوں گا، اس نے کہا: میں آپ سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ بچہ کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا: مرد کا پانی سفید اور عورت کا پانی زرد رنگ کا ہوتا ہے، جب یہ دونوں پانی جمع ہو جائیں اور مرد کی منی عورت کی منی پر غالب ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے بچہ پیدا ہوتا ہے، اور اگر عورت کی منی مرد کی منی پر غالب ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے بچی پیدا ہوتی ہے، یہودی نے کہا: بلا شبہ آپ نے سچ فرمایا اور آپ حقیقۃً اللہ کے نبی ہیں، پھر وہ یہودی چلا گیا، اس کے جانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس نے جن چیزوں کے بارے میں پوچھا میں ان کی طرف متوجہ نہیں تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے ان چیزوں کی طرف متوجہ فرما دیا۔

(صحیح مسلم: ۳۱۵، الرقم المسلسل: ۷۱۳، رقم حدیث الباب: ۳۴، تحفۃ الاشراف: ۲۱۰۶، صحیح ابن حبان: ۷۴۲۲، المستدرک للحاکم ج ۳ ص ۴۸۱، البعث للبیہقی: ۳۱۵، صحیح ابن خزیمہ: ۲۳۲، المعجم الاوسط للطبرانی: ۲۶۷، المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۴۱۴، مسند الشامیین للطبرانی: ۲۸۶۸، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۷۹۸، الجامع الصحیح للسنن والمسانید ج ۱ ص ۳۵۸، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشرۃ ج ۱ ص ۳۶۴)

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کو سرخی مائل سفید زمین کے اوپر جمع فرمایا جائے گا جو میدے کی ٹکیہ کی طرح ہوگی۔ سہل یا کسی اور نے کہا: اس زمین میں کوئی نشان نہیں ہوگا وہ ہموار اور سیدھی ہوگی۔ (صحیح البخاری: ۶۵۲۱، صحیح مسلم: ۲۷۹۰)

حضرت ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے کہ زمین کو سفید زمین سے بدل دیا جائے گا اور وہ چاندی کی مثل ہوگی جس پر کوئی حرام خون نہیں بہایا ہوگا اور نہ اس پر کوئی گناہ کیا گیا ہوگا۔ (زاد المسیر ج ۴ ص ۳۷۶)

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ بھی روایت ہے کہ زمین کو آگ سے بدل دیا جائے گا اور جنت اس کے پیچھے ہوگی اور جنت کی جوان لڑکیاں اور جنت کے پیالے اس کے پیچھے دکھائی دیں گے۔ (تفسیر الطبری ج ۷ ص ۴۷۰)

اور ابو الجلد جیلان بن فروہ نے کہا: میں نے آسمانی کتابوں میں پڑھا ہے کہ قیامت کے دن زمین آگ کی طرح مشتعل ہوگی

اور بھڑک رہی ہوگی۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ زمین چاندی سے بدل دی جائے گی اور آسمان سونے سے بدل دیا جائے گا۔ (الکشف والبیان ج ۵ ص ۳۳۴)

اور ابو جعفر محمد بن علی بن الحسین (المعروف امام محمد باقر رضی اللہ عنہ) نے کہا ہے: زمین کو روٹی کی طرح بدل دیا جائے گا اور قیامت کے دن مخلوق اس سے کھائے گی۔ (تفسیر القرطبی ج ۹ ص ۳۸۳)

اور سعید بن جبیر اور محمد بن کعب نے کہا: زمین کو سفید روٹی سے بدل دیا جائے گا اور مومن اس کو اپنے قدموں کے نیچے سے کھائے گا۔ (تفسیر طبری ج ۷ ص ۴۸۱)

اور امام ابن المبارک نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو زمین کو چمڑے کی طرح کھینچا جائے گا اور اس کی وسعت میں اضافہ کیا جائے گا اور تمام مخلوق ایک زمین میں ہوگی۔ پھر آسمانوں کو قبض کر لیا جائے گا۔ (کتاب الزہد ص ۳۵۳)

حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہما (زین العابدین) بیان کرتے ہیں کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ زمین کو چمڑے کی طرح کھینچے گا حتی کہ کسی بشر کے لیے صرف اپنے قدموں میں کھڑے ہونے کی جگہ ہوگی۔

(الکشف والبیان ج ۶ ص ۳۳۵، حلیۃ الاولیاء ج ۳ ص ۱۴۵)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور (اے رسول اکرم!) آپ اس دن مجرموں کو زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھیں گے O ان کا لباس تارکول کا ہوگا اور آگ ان کے چہروں کو ڈھانپ لے گی O" (ابراہیم: ۴۹۔۵۰)

"**وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ**": اور وہ مشرکین ہیں۔ "**يَوْمَئِذٍ**": یعنی قیامت کے دن۔ "**مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ**": یعنی وہ طوق اور بیڑیوں میں باندھے ہوئے ہوں گے۔ ایک قول یہ ہے کہ ہر کافر کو شیطان کے ساتھ طوق میں ملایا جائے گا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وہ کفار ہیں جن کو طوق اور بیڑیوں میں باندھا جائے گا، جس طرح دنیا میں وہ گناہوں پر جمع ہوئے تھے۔

"**سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ**": یہ لفظ قطران الابل سے ماخوذ ہے، یعنی اونٹوں پر جو تیل ملا جاتا ہے، وہ اُن کے اوپر ملا جائے گا، اور اس کی وجہ سے اُن میں آگ جلد بھڑکے گی۔

حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت میں زمانہ جاہلیت کی چار چیزیں ہیں جن کو لوگ نہیں چھوڑیں گے، حسب ونسب پر فخر کرنا، دوسرے شخص کو نسب کا طعنہ دینا، ستاروں کو بارش کا سبب جاننا اور نوحہ کرنا۔ نوحہ کرنے والے اگر مرنے سے پہلے توبہ نہ کریں تو انہیں قیامت کے دن گندھک اور خارش کی قمیص پہنائی جائے گی۔

(صحیح مسلم: ۲: ۹۳۴، الرقم المسلسل: ۲۱۵۷، رقم حدیث الباب: ۲۹، مسند ابو یعلیٰ: ۱۵۷۷، مصنف عبدالرزاق: ۶۶۸۶، سنن ابن ماجہ: ۱۵۸۱، المستدرک للحاکم ج ۱ ص ۳۸۳)

"**وَتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ**": یعنی اُن کے چہروں پر آگ ماری جائے گی جو اُن کو ڈھانپ لے گی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "تا کہ اللہ ہر شخص کو اس کے اعمال کی جزا عطا فرمائیں، بے شک اللہ بہت جلد حساب

لینے والے ہیںO" (ابراہیم: ۵۱)

"لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ": تا کہ اللہ ہر شخص کو اس کے اعمال کی جزا دیں، بے شک اللہ بہت جلد حساب لینے والے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "یہ قرآن تمام لوگوں کے لیے اللہ کا پیغام ہے تا کہ لوگ اس کے سبب سے عذاب سے ڈرائے جائیں، اور تا کہ وہ جان لیں کہ بے شک اللہ واحد ہیں جو عبادت کے مستحق ہیں اور عقل والے نصیحت حاصل کریںO" (ابراہیم: ۵۲)

"هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ": تا کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو جان لیں اور ان دلائل سے پہچان لیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت پر حجج اور براہین قائم فرمائے ہیں۔ "وَلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ": اور تا کہ عقل والے نصیحت حاصل کریں۔

یمان بن رباب نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ اور بعض لوگوں سے سوال کیا گیا کہ کیا اللہ تعالیٰ کی کتاب کا کوئی عنوان ہے، تو انہوں نے فرمایا: ہاں، انہوں نے پوچھا: وہ عنوان کہاں ہے، تو فرمایا: اس آیت میں: "هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ"۔ (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی جز ۹ ص ۳۲۱-۳۲۰، دارالکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)
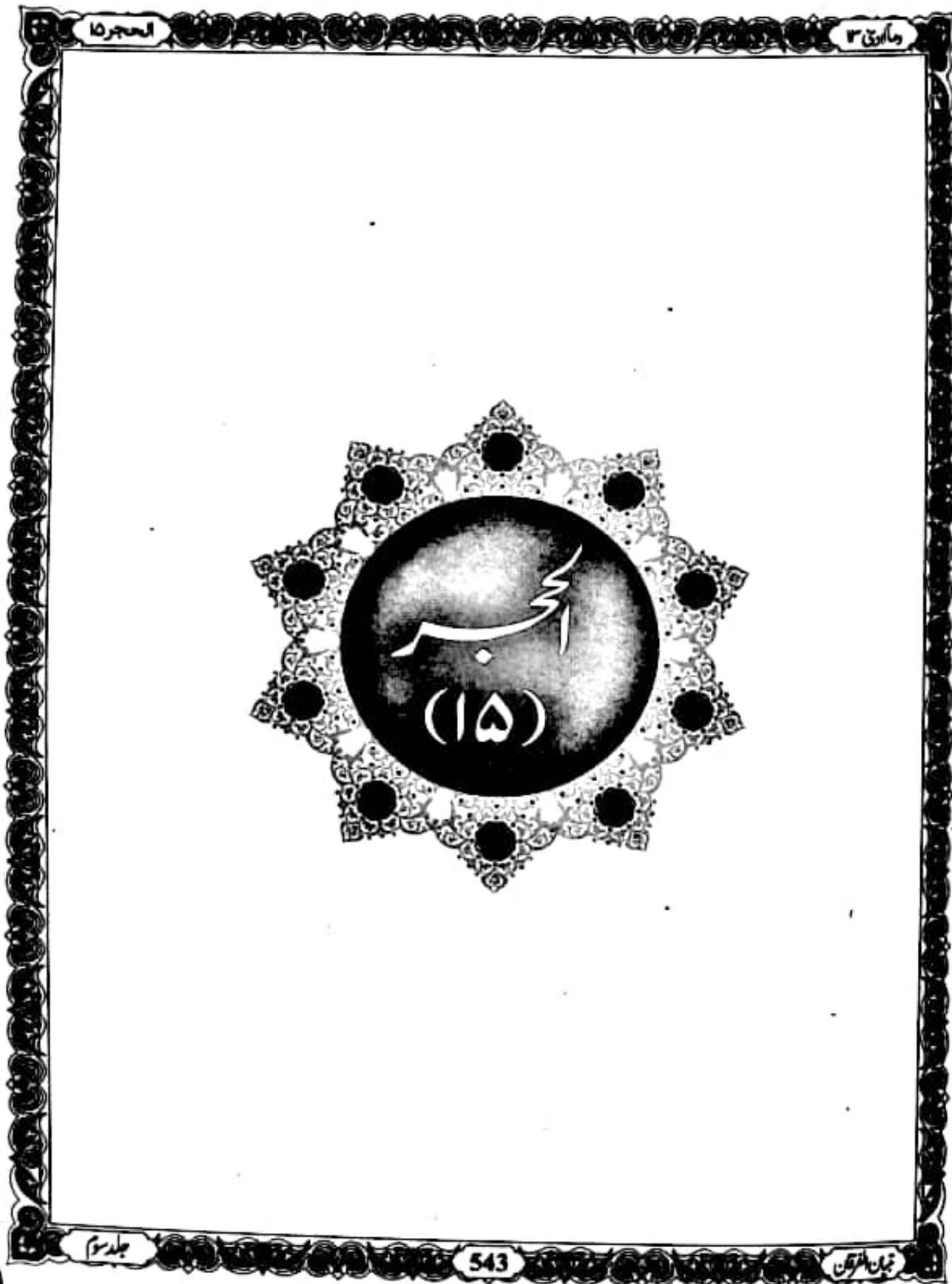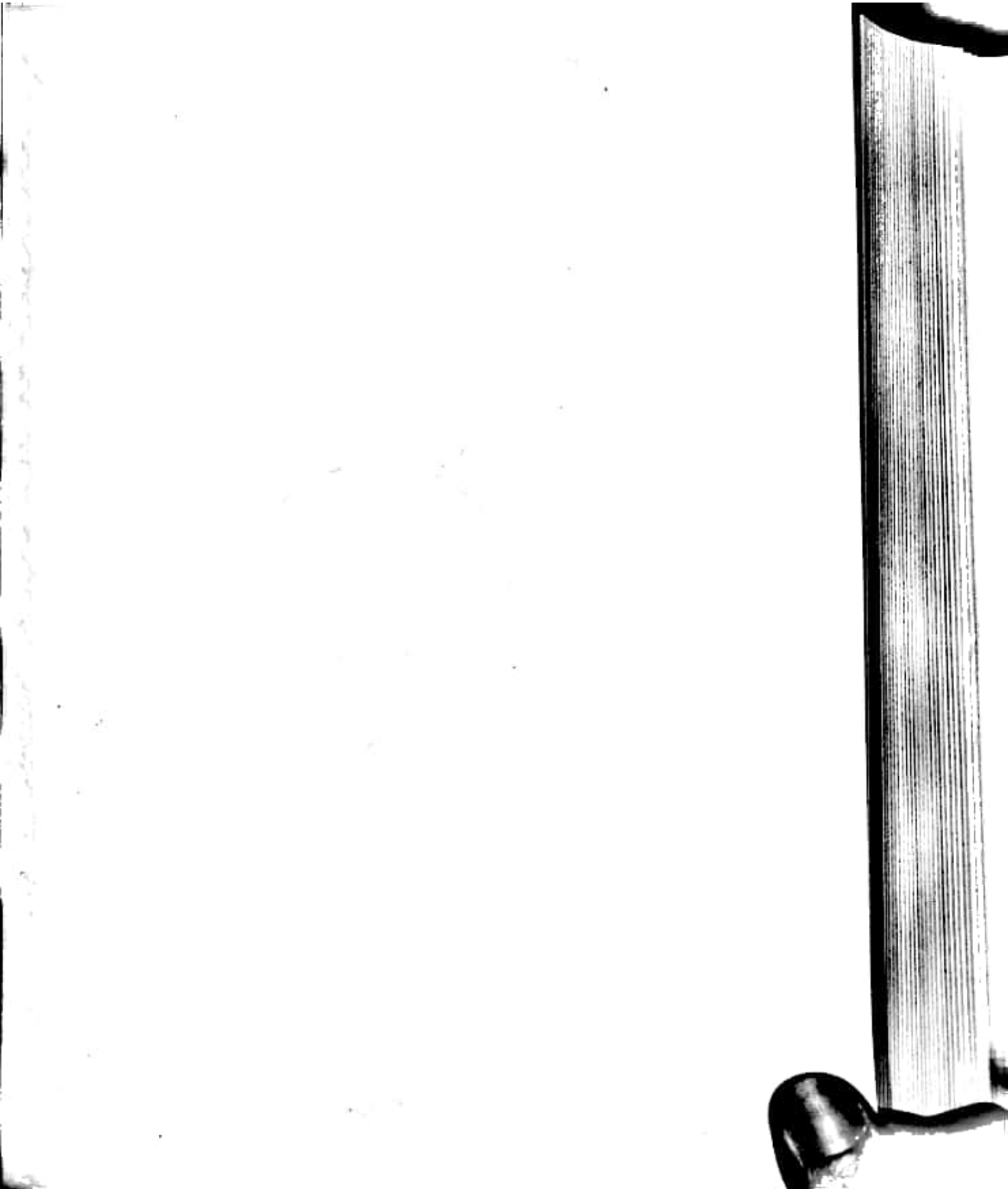
سورۃ الحجر کا اجمالی تعارف

حجر کے معانی

ڈاکٹر غلام جیلانی برق لکھتے ہیں:

حجر: مدینہ شام کے درمیان سواد وادی القریٰ میں قوم ثمود کا وطن یا بستی۔ یہ لوگ پہاڑوں میں جنہیں اثالث کہتے ہیں اپنے گھر کھودا کرتے تھے۔ "وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ۝ (الشعراء: ۱۴۹)" (تم پہاڑوں کو مہارت سے تراش کر کے گھر بناتے ہو ۝)۔ انہی پہاڑوں میں پانی کا وہ چشمہ بھی تھا جس سے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی پانی پیتی تھی اور جس کا ذکر "هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ (الشعراء: ۱۵۵)" (یہ اونٹنی ہے، ایک دن اس کے پانی پینے کی باری ہے اور ایک معین دن تمہارے پینے کی باری ہے ۝) میں ہے۔ نیز کعبہ کا وہ حصہ جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تو کعبہ میں شامل کیا تھا لیکن قریش نے چھوڑ دیا (یعنی حطیم)۔ حضرت ہاجرہ کی قبر اسی حصہ میں ہے، مدینہ کے قریب دیار سُلیم میں ایک بستی کا نام بھی حجر ہے۔

(معجم البلدان (اردو) ص ۱۱۰، شیخ غلام علی اینڈ سنز، کراچی)

الحجر کے مصداق کے متعلق اصحاب لغت کی تحقیق

علامہ سید محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی متوفی ۱۲۰۵ھ لکھتے ہیں:

دیار ثمود کا نام الحجر ہے۔ یہ جگہ شام کی جانب وادی القریٰ کے پاس ہے، یا بلاد ثمود کا نام الحجر ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، کیونکہ ان کے دیار (گھر) ان کے بلاد (شہروں) میں تھے اور ایک قول یہ ہے کہ ان کے درمیان فرق ہے اور یہ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم تھی، اس کا حدیث میں بہ کثرت ذکر ہے، اور قرآن مجید میں ہے: "اور بے شک وادی حجر والوں نے رسولوں کی تکذیب کی۔ (الحجر: ۸۰)"۔ اور مراصد میں مذکور ہے کہ الحجر قوم ثمود کی حویلی کا نام ہے۔ یہ مدینہ اور شام کے درمیان ایک وادی میں شہر ہے۔ اس میں قوم ثمود کے مساکن تھے اور یہ پہاڑوں کے درمیان تراشے ہوئے گھر تھے، جیسے غار ہوتے ہیں۔ ہر پہاڑ دوسرے پہاڑ سے الگ تھا، اور پہاڑوں کے اندر کھدائی کر کے مکانات بنائے گئے تھے۔ پہاڑوں کی تعداد کی مناسبت سے بعض جگہ یہ گھر کم تھے اور بعض جگہ زیادہ تھے۔ یہ گھر کئی طبقات پر مشتمل تھے اور نہایت خوبصورت تھے۔ ان کے درمیان ایک کنواں تھا جس پر حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی پانی پینے کے لیے آتی تھی۔

ہمارے شیخ نے کہا: اور الشہاب الخفاجی نے لکھا ہے کہ "الحجر" میں حاء پر زیر بھی ہے اور حاء پر زبر بھی ہے۔ یہ بلاد ثمود ہیں۔

(تاج العروس من جواہر القاموس، جز ۱۰، ص ۲۸۲، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۳ھ)

علامہ ابو عبد اللہ یاقوت بن عبد اللہ الحموی متوفی ۶۲۶ھ لکھتے ہیں:

قوم ثمود کی بستی یا ان کے وطن کا نام الحجر ہے، یہ جگہ مدینہ اور شام کے درمیان وادی القریٰ میں تھی، یہ لوگ پہاڑوں میں کھدائی کر کے پہاڑوں کے اندر اپنے مکانات بناتے تھے جن کو وہ اثالث کہتے تھے۔ قرآن مجید میں ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے

قوم ثمود کو خطاب کر کے فرمایا: "وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِی الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُیُوْتًا۔۔۔ (الاعراف: ۷۴)" (اور یاد کرو جب اللہ نے قومِ "عاد" کے بعد تم کو ان کا جانشین بنایا اور تمہیں زمین میں ٹھکانا دیا تم اس کی نرم جگہ میں محلات بنا رہے ہو اور پہاڑوں کو تراش کر گھر بنا رہے ہو)۔

انہی پہاڑوں میں وہ کنواں تھا جس سے ایک دن حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی پانی پیتی تھی اور ایک دن وہ پانی پیتے تھے قرآن مجید میں ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے قوم ثمود سے فرمایا: "قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ (الشعراء: ۱۵۵)" (یہ اونٹنی ہے، ایک دن اس کے پینے کی باری ہے اور ایک دن تمہاری باری ہے، اس کا دن مقرر ہے)۔

(معجم البلدان ج ۳ ص ۲۲۰-۲۲۱، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۹۹ھ)

علامہ ابو الفضل جمال الدین محمد بن مکرم ابن منظور افریقی متوفی ۷۱۱ھ، لکھتے ہیں:

حجر شام کی جانب وادی القریٰ کے نزدیک دیار ثمود کو بھی الحِجر کہتے ہیں، اور یہ حضرت صالح نبی علیہ السلام کی قوم ہے اور اس کا حدیث میں بھی بہ کثرت ذکر ہے۔ اور قرآن مجید کی اس آیت میں ذکر ہے: "وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِیْنَ ۝ (الحجر: ۸۰)" (اور بے شک وادی حجر والوں نے رسولوں کی تکذیب کی ۝)۔ (لسان العرب ج ۳ ص ۴۲، دار صادر، بیروت، ۲۰۰۳ء)

لوئیس معلوف الیسوعی نے لکھا ہے:

الحِجر جزائر عرب میں ایک علاقہ ہے، یہ سعودیہ کے جنوبی تیما میں ہے۔ یہاں قومِ ثمود کا وطن تھا، یہ بت پرست تھے۔ آج کل اس وادی میں کنوئیں بہت زیادہ ہیں۔ (المنجد ج ۲ ص ۲۳۰، مطبوعہ بیروت، الطبعۃ العاشرۃ)

دولتِ عثمانیہ کے زمانہ میں اس جگہ ریلوے اسٹیشن تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم تبوک جاتے ہوئے اس جگہ سے گزرے تھے۔

الحِجر کے مصداق کے متعلق سید ابو الاعلیٰ مودودی کی تحقیق

سید ابو الاعلیٰ مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء، لکھتے ہیں:

یہ قومِ ثمود کا مرکزی شہر تھا۔ اس کے کھنڈر مدینے کے شمال مغرب میں موجود شہر العلا سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ مدینہ سے تبوک جاتے ہوئے یہ مقام شہراہ عام سے ملتا ہے اور قافلے اس وادی میں سے ہو کر گزرتے ہیں، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق کوئی یہاں قیام نہیں کرتا۔ آٹھویں صدی ہجری میں ابن بطوطہ حج کو جاتے ہوئے یہاں پہنچا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ "یہاں سرخ رنگ کے پہاڑوں میں قومِ ثمود کی عمارتیں موجود ہیں جو انہوں نے چٹانوں کو تراش تراش کر ان کے اندر بنائی تھیں، ان کے نقش و نگار اس وقت تک ایسے تازہ ہیں جیسے آج بنائے گئے ہوں۔ ان مکانات میں اب بھی سڑی گلی انسانی ہڈیاں پڑی ہوئی ملتی ہیں"۔

(تفہیم القرآن ج ۲ ص ۵۱۵-۵۱۶، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۲۰۱۲ء)

نیز لکھتے ہیں:

اس قوم کا مسکن شمال مغربی عرب کا وہ علاقہ تھا جو آج بھی الحِجر کے نام سے موسوم ہے۔ موجودہ زمانے میں مدینہ اور تبوک کے درمیان حجاز ریلوے پر ایک اسٹیشن پڑتا ہے جسے مدائن صالح کہتے ہیں۔ یہی ثمود کا صدر مقام تھا اور قدیم زمانے میں حجر کہلاتا تھا۔ اب تک وہاں ہزاروں ایکڑ کے رقبے میں وہ سنگین عمارتیں موجود ہیں جن کو ثمود کے لوگوں نے پہاڑوں میں تراش تراش کر بنایا

تھا اور اس شہر خموشاں کو دیکھ کر اندازہ کیا جاتا ہے کہ کسی وقت اس شہر کی آبادی چار پانچ لاکھ سے کم نہ ہوگی۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں حجاز کے تجارتی قافلے ان آثار قدیمہ کے درمیان سے گزرا کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کے موقع پر جب ادھر سے گزرے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو یہ آثار عبرت دکھائے اور وہ سبق دیا جو آثار قدیمہ سے ہر صاحب بصیرت انسان کو حاصل کرنا چاہیے۔ ایک جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کنویں کی نشان دہی کر کے بتایا کہ یہی وہ کنواں ہے جس سے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی پانی پیتی تھی، اور مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ صرف اسی کنویں سے پانی لینا، باقی کنووں کا پانی نہ پینا۔ ایک پہاڑی درّے کو دکھا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ اسی درّے سے وہ اونٹنی پانی پینے کے لیے آتی تھی۔ چنانچہ وہ مقام آج بھی فج الناقہ کے نام سے مشہور ہے۔ ان کے کھنڈروں میں جو مسلمان سیر کرتے پھر رہے تھے، ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمع فرمایا اور ان کے سامنے ایک خطبہ دیا، جس میں ثمود کے انجام پر عبرت دلائی اور فرمایا کہ یہ اس قوم کا علاقہ ہے جس پر خدا کا عذاب نازل ہوا تھا، لہٰذا یہاں سے جلدی گزر جاؤ، یہ سیر گاہ نہیں ہے بلکہ رونے کا مقام ہے۔

ظاہر عبارت سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ پہلے فقرے میں اللہ کی جس کھلی دلیل کا ذکر فرمایا گیا ہے، اس سے مراد یہی اونٹنی ہے جسے اس دوسرے فقرے میں "نشانی" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۂ شعراء آیات: ۱۵۴ تا ۱۵۸ میں تصریح ہے کہ ثمود والوں نے خود ایک ایسی نشانی کا حضرت صالح علیہ السلام سے مطالبہ کیا تھا جو ان کے مامور من اللہ ہونے پر کھلی دلیل ہو، اور اسی کے جواب میں حضرت صالح علیہ السلام نے اونٹنی کو پیش کیا تھا۔ اس سے یہ بات تو قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ اونٹنی کا ظہور معجزے کے طور پر ہوا تھا اور یہ اسی نوعیت کے معجزات میں سے تھا جو بعض انبیاء علیہم السلام نے اپنی نبوت کے ثبوت میں منکرین کے مطالبے پر پیش کیے ہیں۔ نیز یہ بات بھی اس اونٹنی کی معجزانہ پیدائش پر دلیل ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے اسے پیش کر کے منکرین کو دھمکی دی کہ بس اب اس اونٹنی کی جان کے ساتھ تمہاری زندگی معلق ہے۔ یہ آزادانہ تمہاری زمینوں میں چرتی پھرے گی۔ ایک دن یہ اکیلی پانی پیے گی اور دوسرے دن پوری قوم کے جانور پانی پئیں گے۔ اور اگر تم نے اسے ہاتھ لگایا تو یکا یک تم پر خدا کا عذاب ٹوٹ پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ اس شان کے ساتھ وہی چیز پیش کی جاسکتی تھی جس کا غیر معمولی ہونا لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہو۔ پھر یہ بات کہ ایک کافی مدت تک یہ لوگ اس کے آزادانہ چرنے پھرنے کو اور اس بات کو کہ ایک دن تنہا وہ پانی پیے اور دوسرے دن ان سب کے جانور پئیں، بادلِ ناخواستہ برداشت کرتے رہے اور آخر بڑے مشوروں اور سازشوں کے بعد انہوں نے اسے قتل کیا۔ درآں حالے کہ حضرت صالح علیہ السلام کے پاس کوئی طاقت نہ تھی جس کا انہیں کوئی خوف ہوتا، اس حقیقت پر مزید دلیل ہے کہ وہ لوگ اس اونٹنی سے خوف زدہ تھے اور جانتے تھے کہ اس کے پیچھے ضرور کوئی زور ہے جس کے بل پر وہ ہمارے درمیان دندناتی پھرتی ہے۔ مگر قرآن اس امر کی کوئی تصریح نہیں کرتا کہ یہ اونٹنی کیسی تھی اور کس طرح وجود میں آئی۔ کسی حدیثِ صحیح میں بھی اس کے معجزے کے طور پر پیدا ہونے کی کیفیت بیان نہیں کی گئی ہے، اس لیے اُن روایات کو تسلیم کرنا کچھ ضروری نہیں جو مفسرین نے اس کی کیفیتِ پیدائش کے متعلق نقل کی ہیں۔ لیکن یہ بات کہ وہ کسی نہ کسی طور پر معجزے کی حیثیت رکھتی تھی، قرآن سے ثابت ہے۔

ثمود کی یہ صنعت ویسی ہی تھی جیسی ہندوستان میں ایلورا، اجنتا اور بعض دوسرے مقامات پر پائی جاتی ہے، یعنی وہ پہاڑوں کو تراش کر ان کے اندر بڑی بڑی عالی شان عمارتیں بناتے تھے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ مدائنِ صالح میں اب تک ان کی کچھ عمارتیں

جوں کی توں موجود ہیں اور ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس قوم نے انجینئری میں کتنی حیرت انگیز ترقی کی تھی۔
(تفہیم القرآن ج ۲ ص ۴۷-۴۹، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۲۰۱۲ء)

الحِجر کے متعلق احادیث

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان لوگوں پر عذاب دیا گیا تھا۔ ان کے پاس سے صرف روتے ہوئے گزرو، اگر تم رو نہ سکو تو ان کے پاس سے نہ گزرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم پر بھی وہ عذاب آ جائے، جو ان پر آیا تھا۔
(صحیح البخاری: ۴۳۳، ۳۳۸۰، ۳۳۸۱، ۴۴۱۹، ۴۴۲۰، ۴۷۰۲، صحیح مسلم: ۲۹۸۰، السنن الکبریٰ للنسائی: ۱۱۲۷۴، مسند احمد: ۵۲۸۱، ۵۴۰۳، ۵۴۴۱، ۵۹۳۱، ۶۲۱۱، موطا امام مالک ج ۱ ص ۱۰۶، رقم الحدیث: ۲۱۱۹، ۹۶۷، مصنف عبدالرزاق: ۱۶۲۵، المنتخب من مسند عبد بن حمید: ۷۹۸، مسند البزار: ۶۱۱۸، السنن الکبریٰ للنسائی: ۱۱۳۱۰، شرح مشکل الآثار: ۳۷۴۳، صحیح ابن حبان: ۶۲۰۲، المعجم الاوسط للطبرانی: ۳۵۶۵، المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۳۶۵۴، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۴۳۶۷، شرح السنۃ للبغوی: ۴۱۶۶، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشرۃ ج ۲۰ ص ۳۱)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ثمود کی سرزمین الحجر میں ٹھہرے۔ مسلمانوں نے ان کے کنوئیں سے پانی نکالا اور اس پانی سے آٹا گوندھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ حکم فرمایا کہ اس پانی کو پھینک دیں، اور وہ آٹا اونٹوں کو کھلا دیں اور ان کو یہ حکم فرمایا کہ وہ اس کنوئیں سے پانی نکالیں، جس کنوئیں پر اونٹنی آتی تھی۔
(صحیح البخاری: ۳۳۷۸، ۳۳۷۹، صحیح مسلم: ۲۹۸۱، شرح السنۃ للبغوی ج ۱۴ ص ۳۶۳، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشرۃ ج ۱۹ ص ۲۸۵)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الحجر کے پاس سے گزرے تو آپ نے فرمایا: معجزات اور اللہ کی طرف سے نشانیوں کا سوال نہ کیا کرو، کیونکہ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم نے ان کا سوال کیا تھا، پس وہ اونٹنی اس راستے سے آتی تھی اور اس راستے سے جاتی تھی، پھر انہوں نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی اور اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں تو ان کو ایک گرج والی چیخ نے پکڑ لیا۔ سو آسمان کے نیچے جتنے بھی لوگ تھے، اللہ تعالیٰ نے ان سب کو ہلاک فرما دیا ماسوا ایک شخص کے جو اس وقت اللہ عزوجل کے حرم میں تھا۔ کہا گیا: یا رسول اللہ! وہ کون تھا؟ آپ نے فرمایا: وہ ابو رغال تھا، جب وہ حرم سے باہر آ گیا تو اس پر بھی وہی عذاب آ گیا جو اس کی قوم پر آیا تھا۔
(مسند احمد ج ۳ ص ۲۹۶، مسند احمد رقم الحدیث: ۱۴۱۶۰، ۱۳۲۰۷، عالم الکتب، بیروت، مسند احمد رقم الحدیث: ۱۴۰۹۲، دار الحدیث، القاہرہ، المستدرک ج ۲ ص ۳۲۰، حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔ حافظ الہیثمی نے کہا ہے کہ امام احمد کی سند صحیح ہے، مجمع الزوائد ج ۷ ص ۵۰، حافظ ابن حجر عسقلانی نے کہا ہے کہ امام احمد اور حاکم کی سند حسن ہے۔ تفسیر عبدالرزاق: ۹۱۵، صحیح ابن حبان: ج ۹ ص ۳۶۵، ۶۱۹۷، المستدرک علی الصحیحین ۳۲۴۸، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشرۃ ج ۷ ص ۲۲۳)

الحِجر کے مصداق کے متعلق حافظ ابن حجر عسقلانی کی تحقیق

حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ، صحیح البخاری: ۴۳۳ کی شرح میں لکھتے ہیں:
یہ ممانعت اس وقت فرمائی تھی جب تبوک کی طرف جاتے ہوئے صحابہ کرام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ الحِجر کے پاس سے گزرے تھے جو کہ دیارِ ثمود ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا ایک شخص کو الحجر میں معذبین کے مکانوں میں

ایک انگوٹھی پڑی ہوئی ملی تھی۔ وہ اس انگوٹھی کو لے کر آیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے اعراض فرمایا۔ اس نے اس انگوٹھی کو اپنے ہاتھ میں چھپالیا تا کہ آپ نہ دیکھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس انگوٹھی کو پھینک دو تو اس نے وہ انگوٹھی پھینک دی۔ اس حدیث کو حاکم نے "الاکلیل" میں روایت کیا، لیکن اس کی سند ضعیف ہے۔ امام بخاری نے احادیث الانبیاء میں روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ کے پانی پینے سے منع فرمایا ہے، اس حدیث میں غور وفکر کرنے کی ترغیب ہے اور جن پر عذاب دیا گیا ہو، وہاں سے جلد گزرنے کا حکم ہے اور جن لوگوں کو عذاب دیا گیا ہو، وہاں گھر بنانے کی بھی ممانعت ہے، اور قرآن مجید کی اس آیت میں بھی اس طرف اشارہ ہے: "وَّ سَكَنْتُمْ فِیْ مَسٰكِنِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ ۔۔۔ (ابراہیم: ۴۵)" (اور تم اُن لوگوں کے گھروں میں رہتے رہے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا)۔ (فتح الباری ج ۱ ص ۵۳۰-۵۳۱، مطبوعہ لاہور)

سورۃ الحجر کے مشمولات

(۱) سابقہ کی سورتوں کی طرح سورۃ الحجر میں بھی اسلام کے بنیادی عقائد، قرآن مجید کی حقانیت، مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے، انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور اللہ عزوجل کی توحید ہی کا ذکر ہے۔ اس سے پہلی سورتوں میں رسالت کا بیان تفصیل کے ساتھ مذکور تھا جب کہ سورۃ الحجر میں مجرمین کی مہلت کے مسئلہ کو تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ سورۂ ابراہیم میں حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کا تذکرہ تھا اور سورۃ الحجر میں حضرت شعیب اور حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی نافرمانی کا ذکر ہے۔ البتہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر اس سورت میں بھی مذکور ہے۔ توحید باری تعالیٰ کے عقلی اور نقلی دلائل اس سورت میں بھی بیان فرمائے گئے ہیں اور دلائل قیامت اور محاسبہ کا عمل بھی پہلے کی طرح بیان فرمایا گیا ہے، بہرحال سورۃ الحجر میں زیادہ تر بنیادی عقائد ہی بیان فرمائے گئے ہیں۔

(۲) سورۃ الحجر میں اُن کفار اور مشرکین سے مناقشہ کا ذکر ہے جنہوں نے اپنے رسولوں کی تکذیب کی اور حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جو آیات اور نشانیاں نازل فرمائی گئی تھیں، ان کے ساتھ کفار اور مشرکین کے مناقشہ کا ذکر ہے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَ مَا یَاْتِیْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِیْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِیْنَ ۝ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ قَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِیْنَ ۝ (الحجر: ۱۱-۱۳)" (اور اُن کے پاس جو رسول بھی آتا تھا، وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے O اسی طرح ہم مذاق اڑانے کو کے مجرموں کے دلوں میں راستہ دیتے ہیں O وہ ہمارے نبی پر ایمان نہیں لاتے اور پہلے کافروں کا یہی طریقہ چلا آرہا ہے O)۔

(۳) اللہ تعالیٰ کے وجود پر دلائل اور براہین قائم فرمائے گئے ہیں کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا اور انسان کو پیدا فرمایا، اور برسانے والی ہواؤں کے مشاہدہ سے استدلال فرمایا، اور زندگی اور موت سے، اور حشر اور نشر سے استدلال فرمایا، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَ لَقَدْ جَعَلْنَا فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ زَیَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِیْنَ ۝ (الحجر: ۱۶)" (بے شک ہم نے آسمان میں (بارہ) برج بنائے اور اسے دیکھنے والوں کے لئے مزین فرمادیا O)۔ نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَ الْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَ اَلْقَیْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ وَ اَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ مَّوْزُوْنٍ ۝ (الحجر: ۱۹)" (اور ہم نے زمین کو (پانی کے اوپر) پھیلایا، اس میں مضبوط پہاڑوں کے لنگر ڈالے، اس میں ہر چیز مناسب اندازے سے پیدا فرمائی O)۔ نیز فرمایا: "وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ (الحجر: ۲۶)" (بے شک ہم نے آدم کو بجنے والی خشک مٹی سے پیدا فرمایا جو پہلے سیاہ بدبودار گارا تھی O)۔ نیز

فرمایا: ''وَاَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَیْنٰكُمُوْهُۚ وَمَاۤ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِیْنَ۝'' (الحجر: ۲۲) (اور ہم نے بادلوں کو اٹھانے والی ہوائیں بھیجیں، پھر بادل سے بارش برسائی اور تمہیں پینے کے لیے پانی عطا فرمایا، جب کہ اس کے خزانے تمہارے پاس نہیں ہیں O)۔ نیز فرمایا: ''وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْیٖ وَنُمِیْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ۝'' (الحجر: ۲۳) (اور بے شک ہم ہی زندہ فرماتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہم ہی سب کے فنا ہونے کے بعد باقی ہیں O)۔ نیز فرمایا: ''وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ یَحْشُرُهُمْؕ اِنَّهٗ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ۝'' (الحجر: ۲۵) (اور بے شک آپ کے رب ہی انہیں حساب کے لیے جمع فرمائیں گے، بے شک وہ ہی عظیم حکمت اور بڑے علم والے ہیں O)۔

اور سورۃ الحجر میں موجودات کی تخلیق کی حکمت بیان فرمائی اور وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا ہے اور دنیا میں نظام عدل کو قائم کرنا ہے۔

(۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی نازل فرمائی ہے اس کا اثبات اور اس کے صدق کو بیان فرمایا ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓىٕكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْۤا اِذًا مُّنْظَرِیْنَ۝ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۝'' (الحجر: ۸۔۹) ((آپ انہیں بتادیں): ''ہم فرشتے صرف عذاب کے ساتھ بھیجتے ہیں اور اس وقت کافروں کو مزید مہلت نہیں دی جاتی O بے شک یہ قرآن ہم نے ہی نازل فرمایا ہے اور یقیناً ہم ہی اس کے محافظ ہیں O)۔

(۵) درج ذیل آیتوں میں آسمان کی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے: ''وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِیْهِ یَعْرُجُوْنَۙ۝ لَقَالُوْۤا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ۝'' (الحجر: ۱۴۔۱۵) (اور اگر ہم اُن کے لیے آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیں اور یہ لوگ اس میں مسلسل چڑھتے بھی رہیں O پھر بھی یہی کہیں گے: ''ہماری نظریں بند کردی گئی ہیں، بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے''O)

(۶) حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس لعین کا قصہ بیان فرمایا ہے کہ فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کی سجدہ کر کے تعظیم کی اور ابلیس لعین کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کی، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىٕكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ۝ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ۝ فَسَجَدَ الْمَلٰٓىٕكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَۙ۝ اِلَّاۤ اِبْلِیْسَؕ اَبٰۤى اَنْ یَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ۝'' (۲۸۔۳۱) (اور یاد کیجیے! جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا: ''میں کھنکھناتی مٹی سے انسان کو پیدا فرمانے والا ہوں جو دراصل سیاہ اور بدبودار گارا تھی O پھر جب میں اس کی جسمانی ساخت درست فرمادوں اور اس میں اپنی طرف کی معزز روح ڈال دوں تو تم تعظیماً اس کے آگے سجدے میں گر جانا''O تمام فرشتوں نے بیک وقت سجدہ کیا O سوائے ابلیس کے! اس نے سجدہ کرنے والوں کے ساتھ شامل ہونے سے انکار کر دیا O)۔

(۷) بدبختوں کا ذکر فرمایا ہے کہ اُن کا ٹھکانا جہنم ہے اور نیک بختوں کا اور متقین کا ذکر فرمایا ہے کہ اُن کا ٹھکانا جنت ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِیْنَ۝ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِیْنَۙ۝ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍؕ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ۝ اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍؕ۝ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیْنَ۝ وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ۝ لَا یَمَسُّهُمْ فِیْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِیْنَ۝'' (الحجر: ۴۲۔۴۸) (بے

شک میرے ایمان دار بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا، ہاں تیرا زور صرف ان گمراہوں پر چلے گا جو تیرے پیروکار ہوں گے O اور بے شک جہنم ان سب کی وعید کی جگہ ہے O اس کے سات طبقے ہیں، ہر طبقہ کے لیے گمراہوں کا ایک حصہ مخصوص فرمایا گیا ہے O بے شک متقین جنتوں اور چشموں میں رہیں گے O انہیں کہا جائے گا: ان میں سلامتی کے ساتھ بے خطر داخل ہو جاؤ O ہم ان کے سینوں کی (مخلصانہ) رنجشیں نکال دیں گے اور وہ مسہریوں پر بھائیوں کی طرح آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے O انہیں نہ تو وہاں کوئی تکلیف پہنچے گی اور نہ ہی انہیں وہاں سے نکالا جائے گا O)۔

(۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی فرمائی ہے اور نا اُمید ہونے سے منع فرمایا ہے اور آپ کے سامنے حضرت لوط، حضرت شعیب اور حضرت صالح علیہم السلام کے قصوں کا ذکر فرمایا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے اُن کے مخالفین کو ہلاک فرمادیا۔ حضرت لوط علیہ السلام کا قصہ الحجر: ۵۸ سے ۷۷ تک ہے اور حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم الایکہ کا قصہ الحجر: ۷۸ سے ۷۹ تک ہے، اور قوم ثمود اصحاب حجر کا قصہ الحجر: ۸۰ سے ۸۴ تک ہے۔

(۹) اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید کو نازل فرمانے کی صورت میں جو انعام فرمایا، اس کا بیان الحجر: ۸۷ میں ہے۔ اور آپ کے دشمن جو آپ کا مذاق اڑاتے تھے، ان کا ذکر الحجر: ۹۵ میں ہے۔ اور آپ کو مومنین کے سامنے تواضع اور انکسار کا حکم فرمایا ہے، اس کا ذکر الحجر: ۸۸ میں ہے۔ آپ کو بلند آواز کے ساتھ دعوتِ اسلام دینے کا حکم فرمایا ہے، اس کا ذکر الحجر: ۹۴ میں ہے۔ اور جب مشرکین آپ کا مذاق اڑائیں تو آپ کو صبر کرنے کا حکم فرمایا ہے اور تسبیح کرتے رہنے کا اور تاحیات عبادت انجام دیتے رہنے کا حکم فرمایا ہے، اس کا ذکر الحجر: ۹۷ تا ۹۹ میں ہے۔

(۱۰) خلاصہ یہ ہے کہ اس سورت میں توحید کے دلائل ہیں، اور قیامت کے احوال ہیں، اور بدبختوں اور نیک بختوں کی صفات ہیں، اور بعض انبیاء علیہم السلام کے واقعات ہیں اور اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو انعامات فرمائے ہیں، ان کا ذکر ہے۔

سورۃ الحجر کی سورۃ ابراہیم کے ساتھ مناسبت

سورۃ الحجر کی ابتداء میں سورتِ ابراہیم کے ساتھ مناسبت ہے اور اسی طرح اس کے اختتام میں بھی سورتِ ابراہیم کے ساتھ مناسبت ہے۔ ابتداء میں یہ مناسبت اس طرح سے ہے کہ دونوں سورتوں کی ابتداء قرآن مجید کے وصف سے فرمائی گئی ہے۔ اور مضمون کی مناسبت اس طرح سے ہے کہ دونوں سورتوں میں آسمانوں اور زمین کا وصف بیان فرمایا ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ کا ایک حصہ بیان فرمایا ہے، اور بعض گزشتہ رسولوں کے واقعات بھی بیان فرمائے ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو آپ کی قوم کی طرف سے اذیت پہنچتی تھی، اس پر آپ کو تسلی فرمائی ہے کہ آپ سے پہلے انبیاء علیہم السلام کو بھی اُن کی قومیں اذیت دیتی تھیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اُن رسولوں کی مدد فرمائی۔

اور سورۃ الحجر کی سورتِ ابراہیم کے اختتام کے ساتھ مناسبت اس طرح سے ہے کہ سورتِ ابراہیم میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن کفار کے احوال کو بیان فرمایا ہے: "وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ" (ابراہیم: ۴۸) "(اور سب لوگ (قبروں سے نکل کر) اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہو جائیں گے جو واحد ہیں، سب پر غالب ہیں O)۔ اور سورۃ الحجر کے اخیر میں فرمایا: "وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ" (الحجر: ۹۹) "(اور اپنے رب کی عبادت کریں یہاں تک کہ آپ کے پاس ہمارا بلاوا آجائے O)۔

ایاتها ۹۹ — ۱۵ سُوْرَةُ الْحِجْرِ مَكِّيَّةٌ ۵۴ — رکوعاتها ۶

(سورۃ الحجر مکی ہے اور اس میں ننانوے آیات اور چھ رکوع ہیں)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ عزوجل کے بابرکت نام سے ہی (ابتداء ہے) جو سب پر رحم فرمانے والے، نہایت مہربان ہیں

الٓرٰ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ وَ قُرْاٰنٍ مُّبِیْنٍ ۝۱

الٓرٰ یہ اللہ کی کتاب کی آیات ہیں اور واضح قرآن مجید ہے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "الٓرٰ یہ اللہ کی کتاب کی آیات ہیں اور واضح قرآن مجید ہے O" (الحجر:۱)

امام ابومنصور محمد بن محمد ماتریدی المتوفی ۳۳۳ھ، الحجر:۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

حروف مقطعات کو اللہ تعالیٰ کی کتاب اور قرآن مجید قرار دینے کی توجیہ

"الٓرٰ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ": ہم اس سے پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ حروف مقطعہ اللہ عزوجل کی کتاب اور ان کی آیات سے کنایہ ہیں، یا اس سے کنایہ ہیں کہ اس کتاب کی تمام آیات حکمت کے تقاضا کے مطابق ہیں، سو ان آیات کو کتاب قرار دیا۔ یا اس کتاب کی آیات ہیں جس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ یا اس میں پچھلی امتوں کی اُن خبروں اور واقعات سے کنایہ ہے جن خبروں اور واقعات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شاہد نہیں تھے اور اُن واقعات اور خبروں کو کتاب بنا دیا یا کتاب کی آیات بنا دیا تا کہ یہ معلوم ہو کہ یہ کتاب صرف آسمان سے نازل ہوئی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان خبروں اور واقعات کا علم صرف اللہ تعالیٰ کی وحی سے ہوا ہے، اور ہم اس بات کو کئی مرتبہ ذکر کر چکے ہیں۔

"وَ قُرْاٰنٍ مُّبِیْنٍ": قرآن مجید میں یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ کن کاموں کو کرنا چاہیے اور کن کاموں کو نہیں کرنا چاہیے۔ یا "مُّبِیْنٍ" کا معنی یہ ہے کہ یہ قرآن حق اور باطل کو بیان فرماتا ہے۔ (تاویلات اہل السنہ ج ٦ ص ۴۱۹، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۶ھ)

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی شافعی متوفی ٦۰٦ھ، الحجر:۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اس آیت میں فرمایا ہے: "تِلْكَ"، یہ اسم اشارہ ہے، اور اس سے اشارہ اُن آیات کی طرف ہے جن کو سورۃ الحجر متضمن ہے۔ نیز اس میں فرمایا ہے: "الْكِتٰبِ وَ قُرْاٰنٍ مُّبِیْنٍ"۔ "الْكِتٰبِ" سے مراد وہ کتاب ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ فرمایا تھا کہ آپ پر ایک کتاب نازل فرمائیں گے۔ اور "قُرْاٰنٍ مُّبِیْنٍ" کو نکرہ کی صورت میں بیان فرمایا ہے، اور اس میں تنوین تعظیم کے لیے ہے، اور اس کا معنی ہے: اس کامل کتاب کی آیات، اس کے کتاب اور قرآن ہونے میں مفید ہیں۔

(تفسیر کبیر ج ۷ ص ۱۱٦، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ ﴿۲﴾

کسی وقت کفار یہ آرزو کریں گے کہ کاش! ہم مسلمان ہو چکے ہوتے ○

ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿۳﴾

(اے رسولِ اکرم!) آپ ان کافروں کو ان کے حال پر چھوڑ دیجئے کہ وہ کھاتے پیتے رہیں اور دنیاوی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں اور ان کی آرزوئیں ان کو ایمان سے غافل رکھیں، پس عنقریب وہ اپنا انجام جان لیں گے ○

وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَعْلُومٌ ﴿۴﴾

اور ہم نے جس بستی کو بھی ہلاک فرمایا اس کی مدت لوحِ محفوظ میں لکھی ہوئی تھی ○

مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ ﴿۵﴾

کوئی قوم اپنی مدتِ مقررہ سے نہ آگے ہو سکتی ہے اور نہ ہی پیچھے ہو سکتی ہے ○

وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ ﴿۶﴾

اور کفارِ مکہ نے کہا: اے وہ شخص جس پر قرآن نازل فرمایا گیا ہے، بے شک تم ضرور مجنون ہو ○

لَوْ مَا تَأْتِينَا بِالْمَلَائِكَةِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿۷﴾

اگر تم سچے ہو تو تم ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں لے کر آتے؟ ○

مَا نُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوا إِذًا مُنْظَرِينَ ﴿۸﴾

ہم فرشتوں کو صرف برحق عذاب کے ساتھ نازل فرماتے ہیں، اور اس وقت ان (کافروں) کو مہلت نہیں دی جاتی ○

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴿۹﴾

بے شک ہم نے ہی قرآن نازل فرمایا ہے اور بے شک ہم ہی اس کی حفاظت فرمانے والے ہیں ○

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي شِيَعِ الْأَوَّلِينَ ﴿۱۰﴾

اور بے شک ہم نے آپ سے پہلے بھی اگلی امتوں میں رسول بھیجے تھے ○

وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿۱۱﴾

اور اُن کے پاس جو بھی رسول آتا تھا، وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے ○

كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۲﴾

اسی طرح ہم اس استہزاء کو مجرمین کے دلوں میں داخل فرما دیتے ہیں O

لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾

وہ ہمارے نبی پر ایمان نہیں لائیں گے اور پہلے کافروں کا بھی یہی طریقہ چلا آرہا ہے O

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ﴿۱۴﴾

اور اگر ہم ان کے لیے آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیں اور یہ کافر اس میں مسلسل چڑھتے بھی رہیں O

لَقَالُوْۤا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ﴿۱۵﴾

پھر بھی یہی کہیں گے کہ ہم پر نظر بندی کردی گئی ہے بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "کسی وقت کفار یہ آرزو کریں گے کہ کاش! ہم مسلمان ہو چکے ہوتے O" (الحجر: ۲)

امام ابو منصور محمد بن محمد ماتریدی المتوفی ۳۳۳ھ، الحجر: ۲ تا ۱۵ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ": (کسی وقت کفار یہ آرزو کریں گے کہ کاش! ہم مسلمان ہو چکے ہوتے)۔

عام مفسرین کے نزدیک اس آیت کا سبب نزول دوزخ میں کفار کا عذاب میں مبتلاء ہونا ہے

عام اہل تاویل نے یہ کہا ہے کہ جب موحدین میں سے ایک جماعت کو ان کے گناہوں کی وجہ سے دوزخ میں عذاب دیا جائے گا، پھر ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے یا اللہ تعالیٰ کے لطف محض سے یا ان کی رحمت سے دوزخ سے نکال دیا جائے گا، اور مشرکین یہ منظر دیکھیں گے تو اس وقت وہ اسلام کی اور توحید کی آرزو کریں گے کہ اگر ہم بھی اسلام لائے ہوتے اور ہم نے بھی شرک نہ کیا ہوتا تو ہمیں بھی اسی طرح دوزخ کے عذاب سے نکال لیا جاتا۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب دوزخ میں دوزخی جمع ہوں گے اور ان کے ساتھ بعض اہل قبلہ بھی ہوں گے جنہیں اللہ تعالیٰ چاہے گا تو کفار ان سے کہیں گے: کیا تم مسلمان نہیں تھے؟ وہ کہیں گے: کیوں نہیں! کفار کہیں گے: پھر اسلام نے تم سے کون سا عذاب دور کر دیا حالانکہ تم بھی ہمارے ساتھ دوزخ میں ہو؟ وہ کہیں گے: ہمارے کچھ گناہ تھے، ہمیں ان گناہوں کی وجہ سے دوزخ میں ڈال دیا گیا۔ پس کفار ان کی بات سنیں گے، پس اللہ عزوجل ان کے ساتھ جو اہل قبلہ دوزخ میں ہوں گے، ان کو دوزخ سے نکالنے کا حکم فرمائیں گے، پھر جب کفار یہ منظر دیکھیں گے تو کہیں گے: کاش! ہم نے بھی اسلام قبول کیا ہوتا تو ہم بھی اسی طرح دوزخ سے نکال دیے جاتے جس طرح ان موحدین کو نکال دیا گیا ہے، اور اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: "الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱﴾ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴿۲﴾ (الحجر: ۱۔۲)"۔ (السنۃ لابن ابی عاصم: ۸۴۳، الشریعۃ للآجری: ۷۷۳، الجامع الکبیر للسنن والمسانید ج ۱ ص ۶۰، ج ۱۹ ص ۲۸۹)

حماد بیان کرتے ہیں کہ ہم نے ابراہیم سے اس آیت کے متعلق سوال کیا: "رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ۝ (الحجر:۲)" تو انہوں نے بتایا کہ جب موحدین کو دوزخ میں داخل کیا جائے گا تو مشرکین کہیں گے: تم جس خدائے واحد کی عبادت کرتے تھے، اس نے تم کو اس عذاب سے نہیں بچایا؟ تو اللہ عزوجل اُن کے اس قول کی وجہ سے غضب میں آ گئیں گے اور اللہ تعالیٰ فرشتوں اور نبیوں سے فرمائیں گے: آپ شفاعت کریں، پس وہ شفاعت کریں گے، پس اُن کو دوزخ سے نکال لیا جائے گا حتیٰ کہ ابلیس کی آرزو بھی بہت لمبی ہوگی کہ کاش! وہ بھی اُن کے ساتھ نکال دیا جاتا اور اس وقت کفار یہ آرزو کریں گے کہ کاش! وہ بھی مسلمان ہو چکے ہوتے۔ (کتاب الزہد والرقاق لابن المبارک: ۱۲۰۷، ۱۹۰۲، السنۃ لابن ابی عاصم ج ۲ ص ۷۰۴، بحر ابن حیان: ج ۱۶ ص ۳۶۰)

خصیف اور مجاہد بیان کرتے ہیں کہ دوزخی موحدین سے کہیں گے: تمہارے ایمان نے کون سے تمہارے عذاب کو دور کر دیا، پھر جب وہ یہ کہیں گے تو اللہ عزوجل فرمائیں گے کہ جس کے دل میں ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہو تو اس کو دوزخ سے نکال لو۔

(تفسیر الطبری ج ۱۴ ص ۱۰۔ ۱۲، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۳۳ھ، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۶ ص ۱۹۲۱، ج ۷ ص ۲۰۹۸، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ، کتاب الزہد لابن المبارک: ۱۲۰۷، تفسیر عبد الرزاق ج ۱ ص ۳۴۵، کتاب الزہد لھناد ص ۲۰۹، البعث والنشور للبیہقی ص ۵۶، تفسیر مجاہد ص ۴۱۵)

امام ماتریدی کے نزدیک اس آیت کا سبب نزول کفار کا دوزخ کے عذاب میں مبتلاء ہونے سے پہلے موت کے وقت ہے

امام ماتریدی لکھتے ہیں:

لیکن اہل تاویل کی یہ تفسیر بعید ہے۔ کفار یہ تمنا دوزخ میں داخل ہونے سے پہلے کریں گے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: "حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ ۝ لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ ۚ كَلَّا ۚ إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا ۖ وَمِن وَرَائِهِم بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ۝ (المومنون: ۹۹۔ ۱۰۰)" (یہاں تک کہ جب اُن کافروں میں سے کسی پر موت آئے گی تو وہ کہے گا: "اے میرے رب! مجھے واپس دنیا میں بھیج دیجئے ۝ شاید میں اس دنیا میں نیک عمل کروں جسے میں چھوڑ آیا ہوں" ہرگز نہیں! یہ تو محض ایک بات ہے جسے وہ کہتا ہے اور ان کے آگے اٹھائے جانے کے دن (قیامت) تک ایک پردہ ہے ۝)۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ کافر موت کے وقت اسلام کی تمنا کرے گا جب کہ وہ دنیا کی طرف واپس بھیجے کو طلب کرے گا، اس میں یہ دلیل ہے کہ وہ اسلام کی آرزو اس وقت سے پہلے کریں گے جس وقت کا ان اہل تاویل نے ذکر کیا ہے، یا وہ اسلام کی آرزو اس وقت کریں گے جب اُن سے حساب لیا جائے گا، یا اس وقت اسلام کی آرزو کریں گے جب اہل جنت کو جنت کی طرف بھیجا جائے گا اور اُن کو دوزخ کی طرف بھیجا جائے گا، اس وقت وہ عذاب دیے جانے سے پہلے اسلام کی تمنا کرے گا، اور بعض اوقات کافروں میں سے بعض لوگ مختلف احوال میں اور مختلف اوقات میں اسلام کی تمنا کریں گے جب اُن پر حق منکشف ہو جائے گا اور اُن پر حق ظاہر ہو جائے گا، لیکن وہ دنیا کی کچھ چیزوں کے فوت ہونے اور دنیا کی جن چیزوں کی انہوں نے طمع کی تھی، ان کے فوت ہونے کی وجہ سے اسلام کو قبول نہیں کریں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "(اے رسولِ اکرم!) آپ اِن کافروں کو اِن کے حال پر چھوڑ دیجئے کہ وہ کھاتے

پیتے رہیں اور دنیاوی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں اور اِن کی آرزوئیں اِن کو ایمان سے غافل رکھیں، پس عنقریب وہ اپنا انجام جان لیں گے O" (الحجر: ٣)

"ذَرْهُمْ يَأْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا": یہ اللہ تعالیٰ نے حکم نہیں فرمایا کہ اُن کو اسی حال میں چھوڑے رکھیں اور وہ کھاتے پیتے رہیں اور دنیاوی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں، لیکن یہ اللہ تعالیٰ نے وعید فرمائی ہے اور تہدید فرمائی ہے، اور وعید میں مبالغہ فرمایا ہے؛ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا ۭ اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ يَّاْتِيْٓ اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ" (حم السجدہ: ٤٠) "(بے شک وہ لوگ جو ہماری آیات کے متعلق کج روی اختیار کرتے ہیں وہ ہم سے مخفی نہیں ہیں، جو شخص آگ میں ڈالا جائے گا کیا وہ بہتر ہے یا وہ جو قیامت کے دن بے خوف ہو کر آئے گا؟ جو چاہے کرتے رہو، بے شک وہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے O)۔ اسی طرح سے اللہ عزوجل کا ارشاد: "ذَرْهُمْ يَأْكُلُوْا" وعید ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ" "پس عنقریب وہ جان لیں گے"، یہ اس کے مشابہ ہے کہ "ذَرْهُمْ" اُن کی کارروائی کی تائید میں نہ ہو۔ "وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ": الاَمَل کے معنی ہیں: طمع اور خواہش۔

بعض مفسرین نے کہا: اُن کی طمع اور خواہش یہ تھی کہ وہ کفار اور اُن کے آباء واجداد حق پر ہوتے، اور اسی خواہش نے اُن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو قبول کرنے سے باز رکھا اور قرآن مجید کی آیات اور دلائل میں غور وفکر کرنے سے روکے رکھا۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ اُن کی خواہش یہ تھی کہ اُن کی زندگی دراز ہوتی تاکہ اُن کو ریاست اور شرف ملتا، اور یہی چیز اُن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو قبول کرنے سے روکتی تھی اور آپ کی اطاعت کرنے سے اور آیات اور دلائل میں غور وفکر کرنے سے روکتی تھی۔

اور اس کی تیسری تفسیر یہ ہے کہ اُن کی یہ طمع اور خواہش تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہلاک ہو جاتے اور وہ اس کی تمنا کرتے تھے اور آپ کا ملک منقطع ہو جاتا اور اُن کی طرف منتقل ہو جاتا، اور یہی خواہش ان کو آپ کے پیغام کو قبول کرنے سے روکتی تھی۔

"فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ": عنقریب یہ حق پر قائم رہنے والے کو باطل پرست سے ممتاز کر لیں گے اور یہ کہ باطل پرست تم لوگ ہو یا وہ لوگ ہیں۔ یا اس کا معنی ہے کہ عنقریب وہ اس نصیحت کو جان لیں گے جو آپ انہیں فرماتے ہیں اور جو آپ اُن پر شفقت فرماتے ہیں، آپ اُن کی خیر خواہی کرتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں کہ اِن کو ان کے مذاق اڑانے کا عذاب نہ بھگتنا پڑے۔

"ذَرْهُمْ يَأْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا": یہ آیت اُن لوگوں کے متعلق ہے جن کے متعلق اللہ عزوجل کو یہ علم تھا کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے اور رسول اُن کے ایمان لانے سے مایوس ہو گئے تھے، اور یہ اس آیت کی طرح ہے: "وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ" (الانعام: ١١٠) "(اور ہم ان کے دلوں کو اور ان کی آنکھوں کو پھیر دیتے ہیں، (سو وہ ایمان نہیں لائیں گے) جس طرح وہ پہلی بار ایمان نہیں لائے تھے اور ہم اُن کو اُن کی سرکشی میں بھٹکتا ہوا چھوڑے رکھتے ہیں O)۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ہم نے جس بستی کو بھی ہلاک فرمایا اس کی مدت لوحِ محفوظ میں لکھی ہوئی تھی O" (الحجر: ٤)

"وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ": حسن بصری نے اس آیت کی تفسیر میں کہا: ہم نے جس بستی کو بھی عذاب

نازل فرما کر ہلاک فرمایا، ہم نے اس بستی والوں کی طرف پہلے رسول بھیجے تھے جو اُن بستی والوں پر کتاب معلوم کی تلاوت کرتے تھے پس جب اُن بستی والوں نے اُن رسولوں کی تکذیب کی اور رسول اُن کے ایمان لانے سے مایوس ہو گئے تو اس وقت ہم نے اُن پر ایسا عذاب نازل فرمایا جس نے اُن کو ہلاک کر دیا۔ اور یہ آیت اللہ عزوجل کے اس قول کی مثل ہے: "وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْۤ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰۤى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ۝ (القصص:۵۹)" (اور آپ کے رب بستیوں کو اس وقت تک تباہ نہیں فرماتے جب تک اُن کے مرکز میں رسول نہیں بھیج دیتے جو انہیں ہماری آیتیں پڑھ کر سنائے اور ہم بستیوں کو اسی وقت ہلاک فرماتے ہیں جب اُن کے باشندے ظالم ہوں ۝)۔

اور بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں کہا: "وَمَاۤ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ" مگر اس بستی کی میعاد مقرر ہو اور یہ اُن کافروں کے جواب میں ہے جو اُن بستی والوں کے جلد ہلاک ہونے پر اعتراض کرتے تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "کوئی قوم اپنی مدتِ مقررہ سے نہ آگے ہو سکتی ہے اور نہ ہی پیچھے ہو سکتی ہے ۝" (الحجر:۵)

"مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ": یعنی کوئی امت اس میعاد سے بڑھ نہیں سکتی جو اللہ تعالیٰ نے اس کی ہلاکت کے لیے مقدر فرما دی ہے اور نہ کوئی امت اس سے پیچھے ہٹ سکتی ہے جیسے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝ (الاعراف:۳۴)" (اور ہر گروہ کے لئے ایک میعاد مقرر ہے، پھر جب اُن کی مقررہ میعاد آ جائے گی تو نہ وہ ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ ایک گھڑی آگے بڑھ سکیں گے ۝)۔

ہر امت کی مقرر میعاد سے آگے پیچھے ہونے کے متعلق معتزلہ کا اختلاف

یہ آیت معتزلہ کا رد کرتی ہے، انہوں نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے لیے کئی مدتیں مقرر فرمائی ہیں، پھر ایک مدت آتی ہے اور کوئی شخص اس کو اس کی مدتِ مقدرہ سے پہلے قتل کر دیتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝ (الاعراف:۳۴)"۔ نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۗ وَلَوْلَاۤ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ ۗ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ (العنکبوت:۵۳)" (اے رسول اکرم! غیر مسلم آپ سے عذاب کی جلدی کا مطالبہ کرتے ہیں اور اگر عذاب کا وقت مقرر نہ ہوتا تو ان پر ابھی عذاب آ جاتا اور ان پر اس حال میں اچانک عذاب آئے گا کہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا ۝)۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر فرمائی ہے کہ اگر اللہ عزوجل کے نزدیک عذاب کا ایک مقرر وقت نہ ہوتا تو ان پر عذاب آ جاتا، اور اللہ عزوجل نے وعید فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مدت کو پورا فرمائیں گے جس کو اللہ تعالیٰ نے پہلے مقدر فرما دیا ہے۔ اور معتزلہ کے قول کے مطابق اللہ تعالیٰ اپنی وعید کو پورا فرمانے پر قادر نہیں ہیں، کیونکہ ایک آدمی آتا ہے اور اس کو اس کے وقتِ مقررہ سے پہلے قتل کر دیتا ہے، اور یہ العیاذ باللہ، اللہ تعالیٰ کا عجز ہے اور اُن کی وعید کے خلاف ہے، ہم اس قول سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور کفارِ مکہ نے کہا: اے وہ شخص جس پر قرآن نازل فرمایا گیا ہے، بے شک تم ضرور

مجنون ہو○''(الحجر:۶)

''وَقَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ'': حسن بصری نے اس آیت کی تفسیر میں کہا: اے وہ شخص جو یہ دعویٰ کرتے ہو کہ اُن پر قرآن مجید نازل ہوا ہے، بے شک تم ضرور مجنون ہو، تمہارا یہ دعویٰ کہ تم پر قرآن مجید نازل ہوا ہے، یہ جنون کا نتیجہ ہے۔

حسن بصری کی تاویل کے مطابق اس آیت کو محمول کیا جائے گا ورنہ بہ ظاہر اس میں تناقض ہے، کیونکہ وہ یہ نہیں اقرار کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید نازل ہوا ہے، کیونکہ اگر وہ یہ اقرار کرتے کہ آپ پر قرآن مجید نازل ہوا ہے تو ان کا قول فاسد ہو جاتا، اس لیے حسن بصری کی تفسیر کے مطابق یہ تاویل کی جائے گی کہ اے وہ شخص! تم یہ دعویٰ کرتے ہو کہ تم پر قرآن مجید نازل ہوا ہے، اسی لیے تم مجنون ہو۔

''اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ'': انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مجنون قرار دیا۔ اور اُن کے آپ کو مجنون کہنے کی متعدد وجوہ ہیں:

(۱) جب کفار نے یہ دیکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وہ بات کہتے ہیں جو کفار کے عقل مند لوگوں کے خلاف ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے مسلّمات اور عقائد کے خلاف اُن کو دعوت دیتے تھے تو انہوں نے یہ دیکھا کہ جس شخص کا قول عقل مندوں کے خلاف ہو تو وہ مجنون ہوگا، اسی لیے انہوں نے آپ کو مجنون قرار دیا۔

(۲) انہوں نے یہ دیکھا کہ بڑے بڑے جابر بادشاہوں کا یہ طریقہ تھا کہ جو شخص اُن کی کسی دنیاوی بات میں مخالفت کرے وہ اس کو قتل کر دیتے تھے اور ہلاک کر دیتے تھے، تو جو شخص اُن کی دینی مسلّمات کے خلاف کوئی بات کرے گا تو انہوں نے گمان کیا، وہ بھی ہلاک کیے جانے اور قتل کیے جانے کا مستحق ہوگا۔ اور جو شخص اُن کی دینی مسلّمات کے خلاف بات کر کے اپنی جان اور روح کو داؤ پر لگائے گا وہ ضرور مجنون ہوگا۔

(۳) انہوں نے آپ کو مجنون اس لیے کہا کہ انہوں نے دیکھا کہ جب آپ پر وحی نازل ہوتی ہے تو آپ کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے، تو انہوں نے یہ سمجھا کہ آپ پر کوئی بیماری اور مرض ہے اور جو شخص اس کی حقیقت میں غور و فکر کرے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ جو ایسے شخص کو جنون کی طرف منسوب کرے وہ خود مجنون ہے جیسے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ٚ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝'' (الاعراف:۱۸۴) ''(کیا انہوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ اُن کے پیغمبر پر بالکل جنون نہیں ہے وہ محض اللہ کے عذاب سے کھول کھول کر ڈرانے والے ہیں○)۔ نیز اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''مَاۤ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝'' (القلم:۲) ''((اے رسولِ اکرم!) آپ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہیں○)۔ اللہ عزوجل نے یہ خبر دی ہے کہ اگر یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق غور و فکر کرتے تو جان لیتے کہ آپ پر جنون نہیں ہے لیکن وہ عناد اور تکبر سے کہتے تھے اور جہالت سے کہتے تھے، کبھی وہ آپ کو ساحر یعنی جادوگر کہتے اور یہ اُن کے قول میں تناقض ہے، کیونکہ ساحر اُس کو کہا جاتا ہے جس کی بصیرت اور علم زیادہ ہو۔ یعنی آپ جو ہمیں اپنی پیروی کی طرف دعوت دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہمارے آباء و اجداد جس دین اور جس طریقہ پر تھے اس کو ہم چھوڑ دیں تو آپ کا یہ کہنا محض جنون کی وجہ سے ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اگر تم سچے ہو تو تم ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں لے کر آتے ؟○''(الحجر:۷)

"لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ": اس آیت کی تاویل یہ ہے کہ کفار یہ کہتے تھے کہ آپ کا یہ زعم ہے کہ فرشتے آپ کے پاس وحی لے کر آتے ہیں، تو ایسا کیوں نہیں ہوا کہ جب فرشتے آپ کے پاس وحی لے کر آئیں تو آپ ہمیں وہ فرشتے دکھا دیں تا کہ ہم دیکھ لیں کہ آپ کے پاس جو آئے ہیں آیا وہ آپ کے زعم کے مطابق فرشتے ہیں، یا شیاطین ہیں۔

اور بعض مفسرین نے اس آیت کی تاویل میں کہا: اگر آپ ہمارے پاس اُن فرشتوں کو لے آتے جو یہ شہادت دیتے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور آپ کو وہ پیغام دے کر بھیجا گیا ہے جس کا آپ دعویٰ کرتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "ہم فرشتوں کو صرف برحق عذاب کے ساتھ بھیجتے ہیں، اور اس وقت اِن (کافروں) کو مہلت نہیں دی جاتی O" (الحجر: ۸)

"مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ": بعض مفسرین نے کہا: بشر کی طاقت میں یہ نہیں ہے کہ وہ فرشتوں کو ان کی اصل صورت میں دیکھے، اسی لیے یہ فرمایا: "مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ" یعنی ہم فرشتوں کو صرف موت کے وقت نازل فرماتے ہیں، اگر یہ لوگ فرشتوں کو دیکھ لیتے تو ضرور مر جاتے، کیونکہ ان میں یہ طاقت نہیں رکھی گئی کہ فرشتوں کو دیکھ لیں، اور یہ آیت اللہ عزوجل کے اس ارشاد کی طرح ہے: "وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۭ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ O (الانعام: ۸)" (اور انہوں نے کہا کہ اس (رسول) پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں نازل فرمایا گیا، اور اگر ہم فرشتہ نازل فرما دیتے تو ان کا کام تمام ہو چکا ہوتا، پھر اُن کو مہلت نہ دی جاتی O)

اس آیت میں اللہ عزوجل نے یہ خبر دی ہے کہ اگر ان کے اوپر کوئی فرشتہ نازل فرما دیا جاتا تو یہ مر چکے ہوتے، کیونکہ اُن میں یہ طاقت نہیں رکھی گئی کہ وہ فرشتوں کو اُن کی اصل صورت میں دیکھ سکیں، پھر اللہ تعالیٰ نے یہ خبر فرمائی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اس کو فرشتہ بناتے تو اس کو مرد ہی بناتے، اور اُن پر پھر یہ بات مشتبہ ہو جاتی کہ یہ فرشتہ ہے یا نہیں ہے۔

اور بعض مفسرین نے اس آیت "مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ" کی تفسیر میں کہا: یعنی ہم فرشتوں کو صرف حق کے ساتھ بھیجتے ہیں یعنی دلائل کے ساتھ اور آیات کے ساتھ اور رسولوں پر برہان کے ساتھ، اور جو اس کا اہل ہوتا ہے اس کی طرف بھیجتے ہیں نہ کہ ہر ایک پر۔

اور بعض مفسرین نے کہا کہ "اِلَّا بِالْحَقِّ" کا معنی یہ ہے کہ ہم فرشتوں کو صرف عذاب کے ساتھ بھیجتے ہیں، جس عذاب سے ان کفار کو ہلاک فرمایا جاتا ہے، اور اسی طرح فرشتوں کو صرف اس عذاب کے ساتھ بھیجا جاتا ہے جس میں کفار کی ہلاکت ہوتی ہے یا فرشتوں کو دلائل اور براہین کے ساتھ بھیجا جاتا ہے۔

یعنی کفار نے کہا کہ آپ کیوں نہ فرشتوں کو لے کر آئے جو آپ کے قول کی صداقت پر شہادت دیتے جیسا کہ ان سے پہلے کافروں نے کہا تھا: "وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ۭ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا O يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَىِٕذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا O (الفرقان: ۲۱-۲۲)" (اور جو لوگ ہماری بارگاہ میں حاضر ہونے کی توقع نہیں رکھتے انہوں نے کہا: "ہم پر فرشتے کیوں نہیں نازل فرمائے گئے یا ہم اپنے رب کو کیوں نہیں دیکھتے"، بے شک انہوں نے اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھا اور وہ بہت بڑی سرکشی پر اتر آئے O جس دن وہ فرشتوں

کو دیکھیں گے اس دن کافروں کے لئے کوئی خوشی کی خبر نہیں ہوگی، اور فرشتے ان سے کہیں گے: تمہارا جنت میں داخل ہونا قطعاً ممنوع ہےO۔ اور اسی طرح اس آیت میں فرمایا ہے: "مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ"۔

مجاہد نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے: ہم فرشتوں کو صرف حق کے ساتھ نازل فرماتے ہیں یعنی کوئی پیغام دے کر نازل فرماتے ہیں یا عذاب دے کر نازل فرماتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "بے شک ہم نے ہی قرآن نازل فرمایا ہے اور بے شک ہم ہی اس کی حفاظت فرمانے والے ہیںO" (الحجر: ۹)

"اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ": یعنی باطل نہ قرآن کے سامنے سے آسکتا ہے، نہ اس کے پیچھے سے آسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت اپنے ذمہ لی ہوئی ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں طعنہ کرنے والے بہت زیادہ تھے اور وہ اپنی کثرت کے باوجود قرآن مجید میں کوئی طعن کرنے پر قادر نہیں ہوئے، اور یہ اس کی دلیل ہے کہ قرآن مجید آسمان سے نازل ہوا ہے اور محفوظ ہے۔

اور بعض مفسرین نے کہا: "اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" کا معنی یہ ہے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم اس ذکر کے ساتھ حفاظت فرماتے ہیں جو ان کے ساتھ نازل فرمایا گیا ہے، جیسے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ" (المائدہ: ۶۷) "(اور اللہ آپ کو لوگوں (کے ضرر) سے بچائیں گے)۔ اور جیسے اللہ عزوجل کا یہ ارشاد ہے: "قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِيْ ۚ وَاِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِيْٓ اِلَيَّ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ" (سبا: ۵۰) "(آپ کہیے: اگر میں (بالفرض) بھٹک جاؤں تو میرے بھٹکنے کا نقصان میری ذات ہی کے لئے ہوگا اور اگر سیدھی راہ پاؤں تو وہ اس قرآن کی بدولت ہے جو میرے رب مجھے بذریعہ وحی عطا فرماتے ہیں، بے شک وہ خوب سننے والے، نہایت قریب ہیںO)۔

اس آیت میں اللہ عزوجل نے یہ خبر دی ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی نازل فرمائی ہوئی وحی کی وجہ سے ہدایت پر ہیں، اور اس بناء پر اللہ تعالیٰ آپ کی اس قرآن کے ساتھ حفاظت فرماتے ہیں جو آپ پر نازل فرمایا گیا ہے۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ الذکر سے مراد نبوت ہو، یعنی ہم نے نبوت کو نازل فرمایا اور بے شک ہم اپنے رسول کی نبوت اور رسالت کے ساتھ حفاظت فرمانے والے ہیں۔

قرآن مجید کی حفاظت کا ظاہری سبب حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں

قرآن مجید کی حفاظت کا ظاہری سبب اس کا بہت زیادہ چھپنا اور بہت زیادہ حفظ کرنا ہے اور قرآن مجید کو لوگ تراویح میں قرآن مجید سنانے یا سننے کے شوق میں حفظ کرتے ہیں اور جو لوگ تراویح میں قرآن مجید سننا یا سنانا چھوڑ دیتے ہیں، انہیں قرآن مجید بھول جاتا ہے اور جس فرقے کے لوگ تراویح نہیں پڑھتے، ان میں عموماً کوئی حافظ قرآن بھی نہیں ہوتا اور قرآن مجید کو مصحف میں لکھ کر محفوظ کرنے کا مشورہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیا تھا اور تراویح میں قرآن مجید پڑھ کر سنانے کا طریقہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایجاد ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید کے حقیقی محافظ تو اللہ تعالیٰ ہیں لیکن اس کی حفاظت کے ظاہری سبب حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور بے شک ہم نے آپ سے پہلے بھی اگلی امتوں میں رسول بھیجے تھے O''
(الحجر: ۱۰)

''وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِیْ شِیَعِ الْاَوَّلِیْنَ'': اس آیت کی تفسیر میں متعدد اقوال ہیں:

(۱) ہم نے آپ سے پہلے لوگوں میں بھی رسول بھیجے تھے۔

(۲) آپ سے پہلے فرقوں میں بھی رسول بھیجے تھے۔

(۳) اولین کی جماعت میں رسول بھیجے تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور ان کے پاس جو بھی رسول آتا تھا، وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے O'' (الحجر: ۱۱)

''وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ'':

اور رسول اپنی قوم کے مذاق اڑانے پر اور ان کی ایذاء پہنچانے پر صبر کرتے تھے۔

گویا کہ اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں کہ آپ کا جو مذاق اڑایا جاتا ہے یا آپ کو جو ایذاء پہنچائی جاتی ہے تو آپ اس میں منفرد اور مخصوص نہیں ہیں، لیکن اس میں آپ کے اور بھی شرکاء ہیں، یہ اس لیے فرمایا تا کہ آپ کے اوپر ان کا مذاق اڑانا اور ان کا ایذاء پہنچانا آسان ہو جائے، کیونکہ یہ معروف ہے کہ جب لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ اس تکلیف میں اور بھی شرکاء ہیں اور اصحاب ہیں جن کو ایسی سختی اور مصیبت پہنچی ہے تو وہ سختی اور مصیبت ان پر آسان ہو جاتی ہے۔

اور یہ آیت کفار کے اس قول کے ساتھ متصل ہے: ''يٰۤاَيُّهَا الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ'' ، کیونکہ جب آپ نے یہ سنا تو آپ پر بہت شاق گزرا اور آپ کا سینہ بہت تنگ ہوا، اسی لیے اللہ عزوجل نے فرمایا: ''وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِیْ شِیَعِ الْاَوَّلِیْنَ'' تا کہ آپ ان کی ایذاء رسائی پر صبر کریں اور ان کے مذاق اڑانے کو برداشت کریں، اور ان کا ایمان نہ لانا آپ پر اتنا شاق گزرتا تھا کہ اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا: ''لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۞ (الشعراء: ۳)'' ((اے رسولِ اکرم!) کہیں اہل مکہ کے ایمان نہ لانے کے صدمے سے آپ اپنی جان کھو نہ بیٹھیں O)۔ اور اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۞ (فاطر: ۸)'' (لہٰذا ان (کے ایمان نہ لانے) پر افسوس اور رنج میں آپ کی جان نہ چلی جائے، بے شک وہ جو کچھ کرتے ہیں اللہ اسے خوب جانتے ہیں O)۔

یا آپ سے یہ اس لیے ذکر فرمایا گیا جب آپ کی قوم نے اپنے آباء و اجداد کی تقلید کرتے ہوئے آپ کا مذاق اڑایا نہ کہ وہ اپنی طرف سے از خود آپ کا مذاق اڑاتے تھے، اور ان میں سے بعض متقدمین نے اپنے اپنے رسولوں کے ساتھ از خود استہزاء کیا نہ کسی کی تقلید کرتے ہوئے بلکہ اپنی طرف سے یہ استہزاء کیا تو یہ آپ کے اوپر زیادہ آسان تھا جو اپنے رسولوں پر از خود استہزاء کرتے تھے۔

یعنی وہ جو آپ کو برا کہتے تھے وہ آباؤ اجداد کی تقلید کی وجہ سے نہیں کہتے تھے۔ واللہ اعلم

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو تسلی دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کفار قریش جو آپ کی تکذیب کرتے ہیں تو اس سے پہلی امتوں میں بھی جو رسول آتے تھے، ان کے زمانے کے کفار ان کی تکذیب کرتے تھے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اسی طرح ہم اس استہزاء کو مجرمین کے دلوں میں داخل فرما دیتے ہیں O" (الحجر: ۱۲)

"كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِىْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ" :اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کا اختلاف ہے۔

بعض مفسرین نے کہا: ہم اسی طرح اُن مجرمین کے دلوں میں جو ایمان نہیں لاتے تکذیب اور استہزاء کو داخل فرما دیتے ہیں، گویا اللہ عزوجل فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ جو شخص تکذیب کو اختیار کرتا ہے، اس کے دل میں تکذیب کو داخل فرما دیتے ہیں، اور جو شخص تصدیق کو اختیار کرتا ہے تو اس کے دل میں تصدیق کو داخل فرما دیتے ہیں جیسے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۝ (الصف: ۵)" (پھر جب بنی اسرائیل نے بے راہ روی اختیار کی تو اللہ نے اُن کے دل ٹیڑھے فرما دیے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت عطا نہیں فرماتے O)۔ اور جیسے اللہ عزوجل کا یہ ارشاد ہے: "وَ مَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ۝ (البقرہ: ۲۶)" (اور اس سے اللہ صرف فاسقوں کو گمراہی میں مبتلا فرماتے ہیں)۔

اور بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں کہا: اور اسی طرح ہم کفر اور تکذیب کو مجرمین کے دلوں میں اُن کے کفر کی وجہ سے داخل فرما دیتے ہیں جیسے اللہ عزوجل کا یہ ارشاد ہے: "وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّسْتَمِعُ اِلَیْكَ ۚ وَ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ یَّفْقَهُوْهُ وَ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَ اِنْ یَّرَوْا كُلَّ اٰیَةٍ لَّا یُؤْمِنُوْا بِهَا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْكَ یُجَادِلُوْنَكَ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ۝ (الانعام: ۲۵)" (اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو آپ کی طرف کان لگا کر سنتے ہیں، اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں کہ وہ اس کو سمجھ نہ سکیں، اور ان کے کانوں میں ثقل پیدا فرما دیا ہے (کہ وہ سن نہ سکیں)، اور اگر وہ تمام نشانیاں بھی دیکھ لیں تو ان پر ایمان نہیں لائیں گے حتیٰ کہ جب وہ آپ کے پاس آپ سے بحث کرنے کے لیے آتے ہیں تو جن لوگوں نے کفر کو اختیار کیا ہے، وہ کہتے ہیں: یہ (قرآن) صرف پہلے لوگوں کی (جھوٹی) کہانیاں ہیں O)۔

اور جس طرح اللہ عزوجل کا یہ ارشاد ہے: "فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّیْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَ جَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِیَةً ۚ یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَ نَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَ لَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآىٕنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اصْفَحْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (المائدہ: ۱۳)" (سو اُن کے اس عہد کو توڑنے کی وجہ سے ہم نے اُن پر لعنت فرمائی اور ہم نے اُن کے دلوں کو سخت فرما دیا، وہ اللہ کے کلام کو اس کی جگہوں سے تبدیل کر دیتے ہیں، اور جن چیزوں کی اُن کو نصیحت فرمائی گئی تھی اس کے بڑے حصے کو وہ فراموش کر بیٹھے، اور اے رسول اکرم! آپ ہمیشہ اُن کی کسی نہ کسی خیانت پر مطلع ہوتے رہیں گے سوا اُن میں سے چند لوگوں کے، سو آپ اُن کو معاف کر دیں اور اُن سے درگزر کریں، بے شک اللہ احسان کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں O)۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "نَسْلُكُهٗ فِىْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ" یعنی ہم مجرمین کے دلوں میں اپنے دلائل اور آیات کو داخل فرما دیتے ہیں تاکہ اُن کی تکذیب پر وہ آیات اور دلائل اُن کا رد ہوں۔ اور اُن کی تکذیب بہ طور عناد تکذیب ہے اور بہ طور مکابرہ تکذیب ہے اور وہ اس قرآن پر ایمان نہیں لائیں گے۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِىْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ" کا معنی یہ ہو کہ جس طرح ہم نے مومنین کے دلوں میں اپنی آیات اور دلائل کے قبول کرنے کو داخل فرما دیا ہے اور اُن کی تصدیق کرنے کو داخل فرما دیا ہے، کیونکہ اللہ عزوجل کو یہ علم تھا کہ وہ اس کو اختیار کریں گے تو اسی طرح ہم مجرمین کے دلوں میں اپنی آیات اور اپنے دلائل کی تکذیب کو داخل فرما دیتے ہیں، کیونکہ اللہ

عزوجل کو ازل میں علم ہے کہ وہ ان آیات کی تکذیب کریں گے۔ یہ جو ہم نے امور بیان کئے ہیں ان کا بھی احتمال ہے اور ان کے علاوہ دوسرے امور کا بھی احتمال ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وہ ہمارے نبی پر ایمان نہیں لائیں گے اور پہلے کافروں کا بھی یہی طریقہ چلا آرہا ہے ○" (الحجر: ۱۳)

"لَا یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِیْنَ": یعنی اُن سے پہلی امتیں بھی رسولوں کی تکذیب کرتی رہی ہیں اور رسولوں کا رد کرتی رہی ہیں اور عناد کرتی رہی ہیں، اور حُجج اور دلائل کے قائم ہونے کے باوجود تکبر کرتی رہی ہیں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِیْنَ" کا معنی یہ ہو کہ اس سے پہلی امتوں کو بھی ان کی تکذیب کی وجہ سے ہلاک کیا جاچکا ہے، اور جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کے خلاف تکبر اور عناد کیا تو ان کو جڑ سے اکھاڑ دیا گیا۔

اور بعض اہلِ تاویل نے یہ کہا ہے کہ "کَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ" کا معنی یہ ہے کہ ہم اُن کے کفر کی وجہ سے اسی طرح اُن کو عذاب دیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے اور عذاب کی تصدیق نہیں کریں گے۔ "وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِیْنَ" اور اس سے پہلی امتیں بھی اپنے رسولوں کے عذاب کی وعید کی تکذیب کرتی رہی ہیں، تو یہ لوگ بھی انہی کے طریقہ پر عمل کر رہے ہیں۔

ابوعبیدہ نے کہا: "کَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ" یعنی ہم اسی طرح اُن کو داخل فرمائیں گے۔ السالک کو الداخل کہا جاتا ہے اور سلوک کا معنی دخول ہے اور سلکتُ کا معنی ہے میں نے داخل کیا، اور اس کی تصدیق اس آیت میں ہے: "کَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِیْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِیْنَ ○ (الشعراء: ۲۰۰)" (اسی طرح ہم نے قرآن کو جھٹلانا مجرموں کے دلوں میں داخل فرمادیا ہے ○)۔ اور اسی طرح اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اُسْلُكْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ ... (القصص: ۳۲)" (اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں داخل کیجئے)۔ اس آیت میں "اُسْلُكْ" بہ معنی "اَدْخِلْ" ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اگر ہم اِن کے لیے آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیں اور یہ کافر اس میں مسلسل چڑھتے بھی رہیں ○" (الحجر: ۱۴)

"لَوْ فَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ": اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی جہالت اور اُن کے عناد سے خبر دی ہے کہ وہ معجزات کو طلب کرتے تھے، اور فرشتوں کے نزول کو طلب کرتے تھے، وہ کہتے تھے: "لَوْ مَا تَاْتِیْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ○ (الحجر: ۷)" (اگر تم سچے ہو تو تم ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں لے کر آتے ○)۔ اللہ عزوجل فرماتے ہیں کہ اُن کا معجزات کا سوال کرنا، اور انہوں نے یہ سوال صرف سرکشی اور عناد سے کیا، وہ ہدایت کو طلب کرنے والے نہیں تھے، لیکن اہلِ اسلام اُن کی سرکشی اور عناد کو پہچانتے نہیں تھے، کیونکہ انہوں نے کہا: "وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰیَةٌ لَّیُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا یُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ○ (الانعام: ۱۰۹)" (اور ان (مشرکین) نے اللہ کی پکی قسمیں کھائیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نشانی (معجزہ) آجائے تو وہ ضرور بہ ضرور اس پر ایمان لے آئیں گے، آپ کہیے: تمام معجزات اللہ ہی کے قبضہ میں ہیں اور (اے مسلمانو!) تمہیں کیا معلوم کہ معجزہ آنے کے بعد بھی یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے ○)۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ جب وہ معجزات کا سوال کرتے تو مومنین اُن کی سفارش کرتے تھے کہ شاید معجزات کو دیکھنے کے بعد وہ ایمان لے آئیں، تو اللہ تعالیٰ نے خبر فرمائی: "وَمَا يُشْعِرُكُمْ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (الانعام:۱۰۹)" اور (اے مسلمانو) تمہیں کیا معلوم کہ معجزہ آنے کے بعد بھی یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے ۝)۔ اس اعتبار سے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ (الحجر:۱۴)" (اور اگر ہم اِن کے لیے آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیں اور یہ کافر اُس میں مسلسل چڑھتے بھی رہیں ۝)۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ وہ جو فرشتوں کے نزول کا سوال کرتے تھے وہ محض عناد اور تکبر کی وجہ سے تھا، وہ ہدایت کے طلب گار نہیں تھے۔

پھر اس میں اختلاف ہے، بعض مفسرین نے کہا کہ "وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ" کا معنی ہے کہ اگر ہم ملائکہ کا ایک دروازہ کھول دیں حتیٰ کہ یہ مشرکین ملائکہ کو دیکھ لیں کہ وہ آسمان سے اتر رہے ہیں اور آسمان پر چڑھ رہے ہیں، تب بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے اور وہ کہیں گے: "اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا" یعنی ہم پر نظر بندی کر دی گئی ہے، اور کہیں گے: "بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ" بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے، اسی لیے ہم یہی منظر دیکھ رہے ہیں۔

"فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ": یعنی وہ مسلسل چڑھتے رہیں اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کے نزول کا مشاہدہ کریں تب بھی وہ یہی کہیں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پھر بھی یہی کہیں گے کہ ہم پر نظر بندی کر دی گئی ہے بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے ۝" (الحجر:۱۵)

"لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ": اور وہ اپنے رسول کو اور اُن کے اصحاب کو ایمان لانے سے مایوس کریں گے۔ اور اُن کا یہ قول اُن کی سرکشی اور جہالت میں شدت کی وجہ سے ہے کہ وہ مشاہدہ کرنے کے بعد بھی انکار کریں گے۔

اللہ تعالیٰ اُن کے کفر اور عناد اور اُن کے حق کے انکار میں شدت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر ان کے لیے آسمان کا دروازہ کھول دیا جائے اور یہ اس میں چڑھتے رہیں، پھر بھی آپ کی تصدیق نہیں کریں گے بلکہ یہی کہیں گے کہ ہماری نظر بندی کر دی گئی ہے۔ مجاہد، ابن کثیر اور الضحاک نے کہا: ہماری آنکھوں پر بندش کر دی گئی ہے۔ کلبی نے کہا کہ ہماری آنکھوں کو اندھا کر دیا گیا ہے۔ ابن زید نے کہا کہ ہماری آنکھوں کو مخمور کر دیا گیا ہے۔

(تاویلات اہل السنہ، ج ۶ ص ۴۲۰۔ ۴۲۶، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۶ھ وتفاسیر اخریٰ)

سحر کی تعریف اور اس کے متعلق چند اقوال

جس چیز کا سبب مخفی ہو اور اپنی حقیقت کے خلاف اس کا تخیل ہونے لگے، دھوکا دینے اور بے حقیقت خیالات کو پیدا کرنے کو بھی سحر کہتے ہیں۔ ہاتھ کی صفائی اور شعبدہ بازی کو بھی سحر کہتے ہیں۔ نظر بندی کرنے کو بھی سحر کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے: "فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ (الاعراف:۱۱۶)" (پس جب انہوں نے (اپنی چیزیں) ڈالیں تو انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا)۔ شیطان سے کسی قسم کا تقرب حاصل کر کے کفریہ اور شرکیہ کلمات پڑھ کر کسی عجیب و غریب کام کرنے کو بھی سحر کہتے ہیں۔

علامہ ابوالحیان اندلسی متوفی ۷۵۴ھ نے سحر کے متعلق حسب ذیل اقوال لکھے ہیں:

(۱) سحر سے حقائق اشیاء تبدیل ہو جاتی ہیں اور لوگوں کی صورتیں بدل جاتی ہیں جیسے پتھر کو سونا بنا دینا اور انسان کو گدھا بنا دینا اور یہ معجزات اور کرامات کے مشابہ ہے جیسے ہوا میں اڑنا اور قلیل وقت میں کثیر مسافت کو طے کر لینا۔

(۲) بازی گری، ملمع سازی اور شعبدہ بازی جس کی واقع میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی، قرآن مجید میں ہے: "فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَ عِصِیُّهُمْ یُخَیَّلُ اِلَیْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿۶۶﴾ (طٰہٰ: ۶۶)" (پس اچانک ان کے جادو سے موسیٰ کو یہ خیال ہوا کہ ان کی رسیاں اور لاٹھیاں دوڑ رہی ہیں O)۔ اور یہ معتزلہ کا قول ہے جن کی رائے میں سحر کی کوئی حقیقت نہیں ہے، ابواسحاق استرابازی شافعی کا قول بھی انہی کے موافق ہے۔

(۳) سحر کے ساتھ اپنی قوت متخیلہ کو لوگوں کے خیالات پر اثر انداز کیا جاتا ہے اور ان کے خیال میں جو بات ڈال دی جاتی ہے ان کو وہی نظر آتا ہے، اس کو نظر بندی کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے: "سَحَرُوْۤا اَعْیُنَ النَّاسِ" (الاعراف: ۱۱۶)۔

(۴) کوئی محیر العقول کام کرنے کے لیے جنات کی خدمت حاصل کی جاتی ہے اور اس کام کو سحر کہتے ہیں۔

(۵) بعض اجسام کو جلا کر ان کی راکھ پر کچھ کلمات پڑھے جاتے ہیں۔

(۶) ستاروں کے خواص اور ان کی تاثیرات سے یہ عمل کیا جاتا ہے۔

(۷) کچھ کفریہ کلمات پڑھ کر یہ عمل کیا جاتا ہے۔ (البحر المحیط ج ۱ ص ۵۲۵، دارالفکر، بیروت، ۱۴۱۲ھ)

وَ لَقَدْ جَعَلْنَا فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ زَیَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِیْنَ ﴿۱۶﴾

اور بے شک ہم نے آسمان میں (بارہ) بروج بنائے اور انہیں دیکھنے والوں کے لیے مزین فرما دیا O

وَ حَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَیْطٰنٍ رَّجِیْمٍ ﴿۱۷﴾

اور انہیں ہم نے اسے ہر مردود شیطان سے محفوظ فرما دیا O

اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۸﴾

سوا اس کے جو (فرشتوں کی باتیں) چوری چھپے سننا چاہے تو واضح شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے O

وَ الْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَ اَلْقَیْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ وَ اَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ مَّوْزُوْنٍ ﴿۱۹﴾

اور ہم نے زمین کو (پانی کے اوپر) پھیلا دیا، اور اس میں پہاڑوں کے بوجھ ڈال دیئے اور اس میں ہر چیز مناسب انداز ے کے مطابق پیدا فرمائی O

وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ وَ مَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِیْنَ ﴿۲۰﴾

اور اس میں تمہارے لیے زندگی گزارنے کے سامان مہیا فرما دیئے تمہارے لیے بھی اور ان کے لیے بھی جن کو تم رزق نہیں دیتے O

وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآىِٕنُهٗ٘ وَ مَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۱﴾

اور ہمارے پاس ہی ہر چیز کے خزانے ہیں اور ہم اس کو صرف معین مقدار کے مطابق ہی نازل فرماتے ہیں O

وَ اَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَیْنٰكُمُوْهُ ۚ وَ مَاۤ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِیْنَ ﴿۲۲﴾

اور ہم ہی ایسی ہوائیں چلاتے ہیں جو (بادلوں کے پانی سے) بھری ہوئی ہوتی ہیں، پس ہم آسمان سے بارش نازل فرماتے ہیں، سو ہم کو وہ پانی پلاتے ہیں جب کہ تم اس پانی کو جمع کرنے والے نہ تھے O

وَ اِنَّا لَنَحْنُ نُحْیٖ وَ نُمِیْتُ وَ نَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿۲۳﴾

اور بے شک ہم ہی زندہ فرماتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہم ہی سب کے فنا ہونے کے بعد باقی ہیں O

وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِیْنَ مِنْكُمْ وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِیْنَ ﴿۲۴﴾

اور بے شک ہم اُن لوگوں کو بھی جانتے ہیں جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور ہم اُن کو بھی جانتے ہیں جو تمہارے بعد آنے والے ہیں O

وَ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ یَحْشُرُهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۵﴾ ع

اور بے شک آپ کے رب ہی انھیں حساب کے لیے جمع فرمائیں گے، بے شک وہی عظیم حکمت والے سب کچھ جاننے والے ہیں O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور بے شک ہم نے آسمان میں (بارہ) بروج بنائے اور انھیں دیکھنے والوں کے لیے مزین فرمادیا O اور انھیں ہم نے اسے ہر مردود شیطان سے محفوظ فرمادیا O سوا اُس کے جو (فرشتوں کی باتیں) چوری چھپے سننا چاہے تو واضح شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے O'' (الحجر: ۱۶ـ۱۸)

''وَ لَقَدْ جَعَلْنَا فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ زَیَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِیْنَ'':

بروج کے لغوی معانی

علامہ اسماعیل بن حماد الجوہری الشافعی المتوفی ۳۹۸ھ، لکھتے ہیں:

بُرْجُ الحِصن کا معنی ہے: قلعہ کا رُکن، اور اس کی جمع بروج اور ابراج آتی ہے۔ اور بعض اوقات قلعہ کا نام بھی برج رکھا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اَیْنَ مَا تَكُوْنُوْا یُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَ لَوْ كُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ ؕ۔ (النساء: ۷۸)'' (تم جہاں کہیں بھی ہو، موت تم کو پکڑ لے گی خواہ تم مضبوط قلعوں میں ہو)۔ اور برج واحد ہے اور ''بُرُوْجُ السَّمَآءِ''۔ اور ''بُرجان'' چور کا نام ہے، کہا جاتا ہے ''اس نے برجان سے چوری کی''۔ (مجمع الامثال ج ۱ ص ۳۳۲)۔ اور ''تَبَرُّج'' کا معنی ہے: عورت کا اپنی زینت کو اور اپنے محاسن کو مردوں کے لیے ظاہر کرنا۔ (مختار الصحاح ص ۸۳، دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۲۹ھ)

علامہ سید محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی حنفی متوفی ۱۲۰۵ھ، لکھتے ہیں:

البُرج (پیش کے ساتھ) اس کا معنی ہے: رکن اور قلعہ اور اس کی جمع ابراج اور بُروج ہے۔ اور یہ آسمان کے بروج میں سے ایک ہے اور یہ بارہ برج ہیں۔ ہر برج کا الگ الگ نام ہے۔ ابو اسحاق نے اللہ عزوجل کے اس ارشاد کی تفسیر میں کہا: "وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ○ (البروج:۱)" (اور قسم ہے برجوں والے آسمان کی ○)۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد ہے جس میں کواکب ہوں، دوسرا قول ہے کہ جو آسمان میں محلات ہیں۔ (تاج العروس من جواہر القاموس ج۵ ص ۲۳۵، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۳۳ھ)

علامہ جمال الدین محمد بن مکرم ابن منظور افریقی متوفی ۷۱۱ھ، لکھتے ہیں:

دو بھوؤں کے درمیان جو فاصلہ ہے اس کو "التبریج" کہتے ہیں، اور ہر وہ چیز جو ظاہر ہو اور بلند ہو تو وہ بُرج ہے، اور بروج کو بروج اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ وہ ظاہر ہیں اور بلند ہیں۔

اور "التبرج" کا معنی ہے: عورت کا اپنی زینت اور اپنے محاسن مردوں کو دکھانا۔ اور "تبرجت المرأۃ" کا معنی ہے: عورت نے اپنے چہرہ کو ظاہر کیا، جب عورت اپنے چہرے کے محاسن کو ظاہر کرے۔

اور حدیث میں ہے: دس خصال مکروہ ہیں، اُن میں سے ایک غیر محل میں زینت کو دکھانا ہے، اور تبرج کا معنی ہے: اجنبی مردوں کے لیے زینت کو ظاہر کرنا اور یہ مذموم ہے، لیکن اپنے خاوند کے لیے مذموم نہیں ہے۔

البُرج، یہ فلک کے بروج کا واحد ہے اور یہ بارہ برج ہیں۔ ہر برج میں دو اور تہائی منزلیں ہیں، اور تہائی منزل سورج اور چاند کے لیے ہے جن میں تیس درجے ہیں۔ اور ابو اسحاق نے "وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ○ (البروج:۱)" کی تفسیر میں کہا: وہ آسمان جس میں الکواکب ہیں یعنی سیارگان ہیں، دوسرا قول ہے جس آسمان میں محل ہیں، الفراء نے کہا: بروج کے مصداق میں اختلاف ہے، پس کہا گیا کہ یہ ستارے ہیں، اور یہ بھی کہا ہے کہ یہ مشہور بارہ برج ہیں۔ اور انہوں نے کہا ہے کہ یہ آسمان میں محل ہیں، اور اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَ لَوْ كُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ ؕ ... (النساء:۷۸)" یہاں بروج سے مراد قلعے ہیں، الزجاج نے کہا: بروج بڑے بڑے سیارگان کو کہتے ہیں۔ (لسان العرب ج ۲ ص ۵۰، دار صادر، بیروت، ۲۰۰۳ء)

لوئیس معلوف الیسوعی المتوفی ۱۸۶۷ھ/ ۱۹۳۶ء لکھتے ہیں:

یہ بارہ برج ہیں:

(۱) الحمل یا الکبش (مینڈھا) (۲) الثور (بیل) (۳) الجوزاء، یا التوأمان (اخروٹ) (۴) السرطان (کینسر، کیکڑا) (۵) الاسد یا اللیث (شیر) (۶) السنبلہ یا العذراء (گندم کا خوشہ) (۷) المیزان (ترازو) (۸) العقرب (بچھو) (۹) القوس یا الرامی (کمان) (۱۰) الجدی یا التیس (بکری کا بچہ) (۱۱) الدلو، یا الساقی، یا ساکب الماء (ڈول) (۱۲) الحوت یا السمکۃ (مچھلی)۔ (المنجد (عربی) ص ۳۱، انتشارات اسلام، تہران، ایران، ۱۳۷۹ھ)

میں کہتا ہوں: قدیم یونانی علماء ہیئت نے بیان کیا ہے کہ سات آسمانوں میں سے ہر آسمان میں ایک ستارہ نصب ہے:

(۱) فلک القمر (۲) زحل (۳) مشتری (۴) شمس (۵) مریخ (۶) زہرہ (۷) عطارد۔ یہ سب سیارگان ہیں جو اپنے اپنے مدار میں گردش کرتے رہتے ہیں اور آٹھویں آسمان میں ثوابت ہیں، یہ وہ ستارے ہیں جو گردش نہیں کرتے اور اپنی جگہ ثابت رہتے ہیں

اور یہ تمام ستارے آٹھویں آسمان میں ہیں۔ اور نویں آسمان میں وہ صورت ہے جو ان ستاروں کے اجتماع سے منترع ہوتی ہے، یعنی نویں آسمان میں بعض جگہ ان ستاروں کے اجتماع سے بکری کے بچہ کی شکل بن جاتی ہے، کہیں بیل کی شکل بن جاتی ہے، کہیں بکری کی شکل بن جاتی ہے اور کہیں کیکڑے کی شکل بن جاتی ہے علیٰ ھذا القیاس۔ یہ شکلیں رصدگاہ میں قوی دوربین سے نظر آتی ہیں، علماء ہیئت نے اپنی آسانی کے لیے ان شکلوں کے یہ نام رکھ دیے ہیں۔ الحمل اور العقرب مریخ کی منزل ہے، الثور اور المیزان زہرہ کی منزل ہے، الجوزاء اور السنبلہ عطارد کی منزل ہے، اور السرطان، قمر کی منزل ہے۔ الاسد، شمس کی منزل ہے۔ القوس اور الحوت، مشتری کی منزل ہے۔ اور الجدی اور الدلو، الزحل کی منزل ہے۔

(معالم التنزیل ملخصاً وموضحاً، ج ۳ ص ۵۴ ۴، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

عام طور پر لسانِ شرع کے مطابق مشہور یہ ہے کہ آسمان کُل سات ہیں اور قدیم یونانی علماء ہیئت نے اِن میں سے ہر آسمان کا ایک نام رکھ لیا ہے اور ہر آسمان میں ایک سیارہ نصب ہے جو اپنے مدار میں گردش کرتا رہتا ہے جیسے فلک القمر، زحل، مشتری، شمس وغیرہ، یہ سات آسمان ہیں اور یونانی علماء ہیئت نے ایک آٹھواں آسمان بھی مانا ہے جس میں وہ ستارے ہیں جو گردش نہیں کرتے اور عموماً ہمیں رات کو جو ستارے نظر آتے ہیں وہ یہی ستارے ہیں جو ثوابت ہیں، اس کے بعد انہوں نے ایک مزید نواں آسمان مانا ہے جس میں اِن ستاروں کی شکلیں منترع ہو کر نظر آتی ہیں، کہیں یہ شکل شیر سے ملتی ہے، کہیں بکری سے، کہیں ڈول سے، کہیں کیکڑے سے، اور اس طرح بارہ شکلیں منترع ہوتی ہیں اور ہر شکل کے اعتبار سے اس کا نام برج رکھا ہے۔ اور اس طرح بارہ شکلیں منترع ہوتی ہیں اور اس کو وہ بارہ برج کہتے ہیں۔ قاضی بیضاوی نے اس کی تطبیق یوں دی ہے کہ آٹھواں آسمان کرسی ہے اور نواں آسمان عرشِ عظیم ہے۔ (سعیدی غفرلہٗ)

اللہ تعالیٰ کی توحید پر آسمانی دلائل

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ، الحجر ۱۶ تا ۲۵ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے منکرین نبوت کے شبہات کا جواب دیا اور نبوت کا ثبوت اللہ تعالیٰ کی توحید کے ثبوت پر متفرع ہے، اور اللہ تعالیٰ کی توحید پر کچھ دلائل آسمانی ہیں اور کچھ دلائل زمینی ہیں، اس آیت میں آسمانی دلائل کے ذکر سے ابتداء فرمائی ہے، پس ارشاد فرمایا: ”وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ“ (اور بے شک ہم نے آسمان میں (بارہ) بروج بنائے اور انہیں دیکھنے والوں کے لیے مزین فرما دیا)۔

اللیث نے کہا: البُرج فلک کے بروج میں سے واحد ہے اور البُرُوج جمع ہے اور یہ بارہ برج ہیں۔ اور اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ”تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ۝“ (الفرقان: ۶۱) ”(عظیم ہے وہ ذات جنہوں نے آسمان میں (بارہ) برج بنائے اور اس میں سورج کو چراغ بنایا اور چاند کو روشن کرنے والا بنایا ۝)۔

اور اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝ (البروج: ۱)“ (اور قسم ہے برجوں والے آسمان کی ۝)“۔

بُروج کی صانع مختار پر دلالت اس طرح ہے کہ اِن بروج کی طبائع مختلف ہیں جیسا کہ ارباب احکام کے درمیان اس پر اتفاق ہے، اور جب اس طرح ہو تو فلک اِن اجزاء مختلفۃ الماہیت سے مرکب ہے، اور ہر مرکب کے لیے اس کے ایک بنانے والے کی

احتیاج ہوتی ہے جو اپنے اختیار سے اس کے اجزاء کو ایک مجموعی شکل میں ڈھالے، پس ثابت ہو گیا کہ آسمان کا بروج سے مرکب ہونا فاعل مختار پر دلالت کرتا ہے اور یہی مطلوب ہے۔

اللہ عزوجل کا یہ ارشاد: ''وَ حَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۙ﴿۱۷﴾ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸﴾'' (اور انہیں ہم نے ہر مردود شیطان سے محفوظ فرما دیا O سوا اس کے جو (فرشتوں کی باتیں) چوری چھپے سننا چاہے تو واضح شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے O)۔

اور ہم نے اس پر مکمل بحث سورۃ الملک کی درج ذیل آیت کی تفسیر میں کی ہے: ''وَ لَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَ جَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ (الملک: ۵)'' (اور بے شک ہم نے دنیا کے آسمان کو چراغوں سے مزین فرمایا اور انہیں شیطانوں کے مار بھگانے کا ذریعہ بنا دیا)۔ ہم یہاں پر اس میں سے چند ضروری امور کا ذکر کریں گے۔

''وَ زَيَّنّٰهَا'': یعنی ہم نے آسمانِ دنیا کو سورج، چاند اور ستاروں سے مزین فرمایا۔ ''لِلنّٰظِرِيْنَ'': اُن لوگوں کے لیے جو صانع کی توحید پر استدلال کرتے ہیں۔

''وَ حَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ'': (اور انہیں ہم نے ہر مردود شیطان سے محفوظ فرما دیا)۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ شیطانِ رجیم سے آسمانوں کو محفوظ فرمانے کا کیا معنی ہے، کیونکہ شیطان کو اس پر قدرت نہیں ہے کہ آسمان کو منہدم کر دے، پھر آسمان کو شیطان سے محفوظ فرمانے کی کیا ضرورت ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جب شیطان کو آسمان کے قریب جانے سے منع فرما دیا تو اللہ تعالیٰ نے آسمان کو شیطان سے محفوظ فرما دیا، جیسا کہ ہم اپنے گھروں کو اُن لوگوں سے محفوظ کر لیتے ہیں جو ہمارے گھروں کی ٹوہ میں رہتے ہیں اور اُن سے فساد کا خطرہ ہوتا ہے۔

پھر ہم کہتے ہیں کہ لغت میں رجیم کا معنی ہے جس پر پتھر پھینکا جائے، پھر رجم اور پتھروں سے سنگسار کرنے کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے، نیز رجم کا معنی برا کہنا اور گالی دینا بھی ہے، کیونکہ اس میں بری بات کو پھینکا جاتا ہے۔ ''لَاَرْجُمَنَّكَ'' کا معنی ہے: میں تمہیں ضرور برا کہوں گا، اور اسی سے ماخوذ ہے: ''وَ جَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ (الملک: ۵)''۔ یعنی شیاطین کو مارا جاتا ہے، اور رجم کا معنی گمان کے اعتبار سے کوئی بات کہنا بھی ہے جیسے قرآن مجید میں ہے: ''رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ (الکہف: ۲۲)'' (یعنی وہ اپنے گمان کے اعتبار سے اصحاب کہف کی تعداد بیان کرتے تھے)، نیز رجم کا معنی لعنت کرنا اور دھتکارنا بھی ہے اور ''شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ'' کی ان میں سے ہر اعتبار سے تفسیر کی گئی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: شیاطین کو آسمانوں سے محجوب نہیں کیا جاتا تھا، پس وہ آسمانوں میں داخل ہو جاتے اور فرشتوں سے غیب کی خبریں سنتے اور اُن خبروں کو اپنے کاہنوں کے دلوں میں ڈال دیتے، پس جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو اُن کو تین آسمانوں سے روک دیا گیا، پھر جب ہمارے رسول سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو اُن کو تمام آسمانوں میں داخل ہونے سے روک دیا گیا۔ پس شیاطین میں سے ہر ایک جب چوری چھپے فرشتوں سے باتیں سننے کا ارادہ کرتا تو اس کے اوپر آگ کا ایک شعلہ مارا جاتا جیسے قرآن مجید میں ہے: ''اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸﴾'' (سوا اس کے جو (فرشتوں کی باتیں) چوری چھپے سننا چاہے تو واضح شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے)، اور شیاطین کا چوری چھپے فرشتوں کی باتیں سننا آسمان کو محفوظ ہونے

سے نہیں نکالتا، کیونکہ ان کو آسمانوں میں داخل ہونے سے منع فرمایا گیا تھا اور یہ آسمانوں کے قریب پہنچ جاتے۔ کیونکہ سرکش شیاطین اوپر چڑھتے تو اُن پر آگ کا شعلہ مارا جاتا، وہ اُن کو جلا دیتا لیکن ہلاک نہیں کرتا تھا۔ اور شہاب آگ کا ایک چمکدار شعلہ ہے، پھر کواکب کو بھی شہاب فرمایا گیا، اور نیزوں کو بھی شہاب فرمایا گیا، کیونکہ ان میں جو چمک ہوتی ہے وہ آگ کے مشابہ ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غیب کی خبر دینے کے معجزہ ہونے پر ایک قوی اشکال

سنو! اس جگہ کئی دقیق ابحاث ہیں جن کو ہم نے سورۃ الملک میں اور سورۃ الجن میں ذکر کیا ہے، اور یہاں پر ہم ایک اشکال کا ذکر کریں گے اور وہ اشکال یہ ہے کہ جب تم نے اس کو جائز قرار دیا ہے کہ شیاطین آسمانوں کی طرف چڑھ جائیں اور فرشتوں سے خلط ہو جائیں اور اُن سے غیب کی خبروں کو سنیں، پھر وہ نیچے اترتے ہیں اور اُن غیوب کو اپنے کاہنوں کے دلوں میں ڈال دیتے ہیں، اور اس صورت میں لازم آئے گا کہ غیب کی خبریں دینا معجزہ نہ ہوں، کیونکہ ہر غیب کی خبر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے اس میں یہ احتمال ہے کہ یہ کہیں شیطان نے چوری چھپے فرشتوں کی باتیں نہ سُن لی ہوں، اور اس وقت غیب کی خبریں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق پر دلیل اور معجزہ نہیں رہیں گی۔

ایک ضمنی سوال کا جواب

یہ نہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے شیاطین کے متعلق یہ خبر دی ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے بعد اُن کا آسمانوں پر چڑھنا ممنوع ہو گیا ہے، کیونکہ ہم یہ کہیں گے کہ یہ عجز اس وقت ثابت ہو گا جب قطعی طور پر ثابت ہو جائے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی برحق کتاب ہے، اور اس کی قطعیت معجزہ کی وساطت کے بغیر ممکن نہیں ہے، اور غیب کی خبروں کا معجزہ ہونا اس وقت تک ثابت نہیں ہو گا جب تک کہ اس احتمال کو باطل نہ قرار دیا جائے، اور اس صورت میں دور لازم آئے گا اور دور محال ہے۔

مذکورہ قوی اشکال کا جواب

اور ممکن ہے کہ اس اشکال کا یہ جواب دیا جائے کہ ہم سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو باقی معجزات سے ثابت کرتے ہیں، پھر جب آپ کی نبوت کا یقین ہو جائے تو پھر ہم قطعیت سے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے شیاطین کو آسمانوں پر چڑھ کر فرشتوں کی باتیں سننے سے عاجز فرما دیا ہے۔ اور اس صورت میں یہ ثابت ہو جائے گا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا غیب کی خبریں دینا معجزہ ہے اور اس طریقہ سے دور کا اشکال دور ہو جائے گا۔ (تفسیر کبیر ج ۷ ص ۱۲۹-۱۳۰ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

شیاطین کے فرشتوں کی چوری چھپے باتیں سننے کے متعلق حدیث صحیح

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ بے شک اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ آسمان میں کسی چیز کا فیصلہ فرماتے ہیں تو فرشتے عجز کے ساتھ اپنے پروں کو مارتے ہیں، ان کے ارشاد کی ہیبت کی وجہ سے گویا کہ وہ ایک زنجیر ہے جو پتھر پر ماری گئی ہو پس جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہو جاتی ہے تو وہ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں: تمہارے رب نے کیا فرمایا تھا؟ (سبا: ۲۳) تو وہ اس سے کہتے ہیں جس سے فرمایا تھا: انہوں نے حق فرمایا اور وہ بہت بلند اور نہایت بڑے ہیں، پس اس بات کو

چوری چھپے سننے والے شیطان سن کر بھاگتے ہیں، شیطان آسمان کے نیچے یوں اوپر نیچے ہوتے ہیں، سفیان نے اس موقع پر ہتھیلی کو موڑ کر انگلیاں الگ الگ کر کے شیاطین کے جمع ہونے کی کیفیت بتائی کہ اس طرح شیاطین ایک کے اوپر ایک ہوتے ہیں، پھر وہ شیاطین کوئی ایک بات سن لیتے ہیں اور اپنے نیچے والے کو بتاتے ہیں، پھر وہ اپنے سے نیچے والے کو بتاتے ہیں، اس طرح وہ بات ساحر یا کاہن تک پہنچتی ہے، کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ اس سے پہلے کہ وہ یہ بات اپنے سے نیچے والے کو بتائیں آگ کا ایک شعلہ انہیں دبوچ لیتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جب وہ بتاتے ہیں تو آگ کا انگارہ ان پر پڑتا ہے، اس کے بعد کاہن اس میں سو جھوٹ ملا کر لوگوں سے بیان کرتا ہے، (جب اس کاہن کی ایک بات صحیح ہو جاتی ہے تو ان کے ماننے والوں کی طرف سے) کہا جاتا ہے کہ کیا اس، اس طرح ہم سے فلاں دن کاہن نے نہیں کہا تھا، اسی ایک بات کی وجہ سے جو آسمان پر شیاطین نے سنی تھی، کاہنوں اور ساحروں کی بات کو لوگ سچا جاننے لگتے ہیں۔

(صحیح البخاری: ۴۷۰۱، ۴۸۰۰، ۷۴۸۱، سنن ترمذی: ۳۲۲۳، ابن ماجہ: ۱۹۴، مسند الحمیدی: ۱۱۸۵، صحیح ابن حبان: ۳۶، الاسماء والصفات للبیہقی: ۴۳۱، الجامع الصحیح للسنن والمسانید ج ۱ ص ۴۰۳، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشر ج ۲ ص ۲۶۳)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ چند انصاری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے تو ایک ستارہ مارا گیا، پھر وہ چھپ گیا، آپ نے پوچھا: جب زمانہ جاہلیت میں یہ ستارا مارا جاتا تھا تو تم اس کے متعلق کیا کہتے تھے؟ انہوں نے کہا: تو ہم کہتے تھے کہ بہت بڑا آدمی فوت ہو گیا ہے یا کسی بڑے آدمی کا بیٹا فوت ہو گیا ہے، آپ نے فرمایا: یہ ستارہ نہ کسی کی موت کی وجہ سے مارا جاتا ہے اور نہ کسی کی حیات کی وجہ سے، لیکن جب ہمارے رب کسی کام کا فیصلہ فرماتے ہیں تو حاملین عرش ان کی تسبیح کرتے ہیں، پھر حاملین عرش کے نزدیک جو آسمان کے فرشتے ہیں وہ ان کی تسبیح کرتے ہیں حتیٰ کہ یہ تسبیح آسمانِ دنیا تک پہنچتی ہے، پھر وہ حاملین عرش یہ کہتے ہیں: تمہارے رب نے کیا فرمایا۔ الحدیث۔ (فتح الباری ج ۵ ص ۷۹۰-۷۹۱، دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۲۶ھ)

الحجر: ۱۶ کی تفسیر از صدر الافاضل مولانا محمد نعیم الدین مراد آبادی

صدر الافاضل علامہ سید محمد نعیم الدین مراد آبادی حنفی متوفی ۱۳۶۷ھ، الحجر: ۱۶ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

جو کواکب سیارہ کے منازل ہیں، وہ بارہ ہیں: (۱) حمل (۲) ثور (۳) جوزا (۴) سرطان (۵) اسد (۶) سنبلہ (۷) میزان (۸) عقرب (۹) قوس (۱۰) جدی (۱۱) دلو (۱۲) حوت، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: شیاطین آسمانوں میں داخل ہوتے تھے اور وہاں کی خبریں کاہنوں کے پاس لاتے تھے، جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو شیاطین تین آسمانوں سے روک دیے گئے، جب سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی تو تمام آسمانوں سے منع کر دیے گئے۔ شہاب اس ستارے کو کہتے ہیں جو شعلہ کی مثل روشن ہوتا ہے اور فرشتے اس سے شیاطین کو مارتے ہیں۔ (تفسیر خزائن العرفان مع ترجمہ کنز الایمان ص ۴۹۱، مکتبۃ المدینہ، کراچی، ۱۴۳۲ھ)

الحجر: ۱۶ کی تفسیر از شیخ عبد الماجد دریا آبادی دیو بندی

شیخ عبد الماجد دریا آبادی متوفی ۱۳۹۷ھ/ ۱۹۷۷ء، الحجر: ۱۶ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اہل سائنس کا یہ قول کہ فضا میں بڑے وزنی پتھر چکر کھایا کرتے ہیں اور وہ ہوا سے رگڑ کھا کر روشن ہو جاتے ہیں اور کہیں زمین پر ٹوٹ کر گر پڑتے ہیں، قرآن کی بتائی ہوئی حکمت کے ذرا بھی منافی نہیں۔ قرآن کو ان کی ترکیب، ساخت وغیرہ سے مطلق بحث

نہیں، وہ تو اپنے موضوع کے اندر رہ کر صرف اتنا بیان کرتا ہے کہ ان سے کام شیطان کے بھگانے کا بھی لیا جاتا ہے۔

(تفسیر الماجدی ص ۵۷۰، پاک کمپنی لاہور)

الحجر:۱۶ کی تفسیر اور بروج کے مصداق کے متعلق سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحقیق

سید ابوالاعلیٰ مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء، الحجر:۱۶ کی لکھتے ہیں:

برج عربی زبان میں قلعے، قصر اور مستحکم عمارت کو کہتے ہیں۔ قدیم علم ہیئت میں ''برج'' کا لفظ اصطلاحاً ان بارہ منزلوں کے لیے استعمال ہوتا تھا جن پر سورج کے مدار کو تقسیم کیا گیا تھا۔ اس وجہ سے بعض مفسرین نے یہ سمجھا کہ قرآن کا اشارہ انہی بروج کی طرف ہے۔ بعض دوسرے مفسرین نے اس سے مراد سیارے لیے ہیں۔ لیکن بعد کے مضمون پر غور کرنے سے خیال ہوتا ہے کہ شاید اس سے مراد عالم بالا کے وہ خطے ہیں جن میں سے ہر خطے کو نہایت مستحکم سرحدوں نے دوسرے خطے سے جدا کر رکھا ہے۔ اگرچہ یہ سرحدیں فضائے بسیط میں غیر مرئی طور پر کھینچی ہوئی ہیں لیکن ان کو پار کر کے کسی چیز کے ایک خطے سے دوسرے خطے میں چلا جانا سخت مشکل ہے۔ اس مفہوم کے لحاظ سے ہم بروج کو محفوظ خطوں (fortified spheres) کے معنی میں لینا زیادہ صحیح سمجھتے ہیں۔ (تفہیم القرآن ج ۲ ص ۵۰۰، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۲۰۱۲ء)

شہاب ثاقب کے متعلق سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحقیق

''شہاب مبین'' کے لغوی معنی ''شعلۂ روشن'' کے ہیں۔ دوسری جگہ قرآن مجید میں اس کے لیے ''شہاب ثاقب'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، یعنی ''تاریکی کو چھیدنے والا شعلہ''۔ اس سے مراد ضروری نہیں کہ وہ ٹوٹنے والا تارا ہی ہو جسے ہماری زبان میں اصطلاحاً شہاب ثاقب کہا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اور کسی قسم کی شعاعیں ہوں مثلاً کائناتی شعاعیں (cosmic rays)، یا ان سے بھی زیادہ شدید کوئی اور قسم جو ابھی ہمارے علم میں نہ آئی ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہی شہاب ثاقب مراد ہوں جنہیں کبھی کبھی ہماری آنکھیں زمین کی طرف گرتے ہوئے دیکھتی ہیں۔ زمانۂ حال کے مشاہدات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ دوربین سے دکھائی دینے والے شہاب ثاقب جو فضائے بسیط سے زمین کی طرف آتے نظر آتے ہیں، ان کی تعداد کا اوسط ۱۰ کھرب روزانہ ہے، جن میں سے دو کروڑ کے قریب ہر روز زمین کے بالائی خطے میں داخل ہوتے ہیں، اور بمشکل ایک زمین کی سطح تک پہنچتا ہے۔ ان کی رفتار بالائی فضا میں کم و بیش ۲۶ میل فی سیکنڈ ہوتی ہے اور بسا اوقات ۵۰ میل فی سیکنڈ تک دیکھی گئی ہے۔ بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ برہنہ آنکھوں نے بھی ٹوٹنے والے تاروں کی غیر معمولی بارش دیکھی ہے۔ چنانچہ یہ چیز ریکارڈ پر موجود ہے کہ ۱۳ نومبر ۱۸۳۳ء کو شمالی امریکا کے مشرقی علاقے میں صرف ایک مقام پر نصف شب سے لے کر صبح تک ۲ لاکھ شہاب ثاقب گرتے ہوئے دیکھے گئے۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، ۱۹۴۶ء، جلد ۱۵ ص ۳۳۷۔۳۳۹)۔ ہو سکتا ہے کہ یہی بارش عالم بالا کی طرف شیاطین کی پرواز میں مانع ہوتی ہو، کیونکہ زمین کے بالائی حدود سے گزر کر فضائے بسیط میں ۱۰ کھرب روزانہ کے اوسط سے ٹوٹنے والے تاروں کی برسات ان کے لیے اس فضاء کو بالکل ناقابل عبور بنا دیتی ہو گی۔

اس سے کچھ ان ''محفوظ قلعوں'' کی نوعیت کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ بظاہر فضا بالکل صاف شفاف ہے جس میں کہیں کوئی دیوار یا چھت نظر نہیں آتی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی فضا میں مختلف خطوں کو کچھ ایسی غیر مرئی فصیلوں سے گھیر رکھا

ہے جوایک خطے کو دوسرے خطوں کی آفات سے محفوظ رکھتی ہیں۔ یہ انہی فصیلوں کی برکت ہے کہ جو شہاب ثاقب ۱۰ کھرب روزانہ کے اوسط سے زمین کی طرف گرتے ہیں، وہ سب جل کر بھسم ہو جاتے ہیں اور بمشکل ایک زمین کی سطح تک پہنچ سکتا ہے۔ دنیا میں شہابی پتھروں (meteorites) کے جو نمونے پائے جاتے ہیں اور دنیا کے عجائب خانوں میں موجود ہیں، ان میں سب سے بڑا ۶۴۵ پونڈ کا ایک پتھر ہے جو گر کر گیارہ (۱۱) فٹ زمین میں دھنس گیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک مقام پر ساڑھے چھتیس ٹن کا ایک آہنی تودہ پایا گیا ہے جس کے وہاں موجود ہونے کی کوئی توجیہ سائنس دان اس کے سوا نہیں کر سکے ہیں کہ یہ بھی آسمان سے گرا ہوا ہے۔ قیاس کیجئے کہ اگر زمین کی بالائی سرحدوں کو مضبوط حصاروں سے محفوظ نہ کر دیا گیا ہوتا تو ان ٹوٹنے والے تاروں کی بارش زمین کا کیا حال کر دیتی۔ یہی حصار ہیں جن کو قرآن مجید نے ''بروج'' (محفوظ قلعوں) کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

(تفہیم القرآن ج ۲ ص ۵۰۰۔۵۰۲، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۲۰۱۲ء)

الحجر: ۱۶ کی تفسیر از شیخ امین احسن اصلاحی

شیخ امین احسن اصلاحی متوفی ۱۴۱۸ھ/۱۹۹۷ء، الحجر: ۱۶ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''برج'' کے معنی قلعہ اور محل کے ہیں، یہاں اس سے مراد وہ آسمانی قلعے ہیں جو خدا نے آسمانوں میں بنائے ہیں، جن میں اس کے ملائکہ اور کروبیوں کی فوجیں برابر مامور رہتی اور ان حدود اور دائروں کی نگرانی کرتی ہیں جن سے آگے بڑھنے کی اجازت نہ شیاطین انس کو ہے اور نہ شیاطین جن کو، اور اگر کوئی شیطان ملاء اعلیٰ کی باتوں کی کچھ سن گن لینے کی کوشش کرتا ہے تو ایک دہکتا شہاب اس کا تعاقب کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک قلعہ کی برجیوں پر مامور سپاہی دشمن کے آدمیوں پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں، کسی اجنبی کو اپنے حدود کے اندر پھلانگنے کا موقع نہیں دیتے، اسی طرح خدا کے مامور ملائکہ ان شیاطین جن کو شہاب ثاقب کا نشانہ بناتے ہیں جو ان کے حدود میں ٹوہ لگانے کے لیے دراندازی کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے ضمناً اس کہانت کی بالکل بنیاد ہی ڈھے جاتی ہے جس کا عہد جاہلیت میں بڑا رواج تھا، اور جس کی آڑ میں کاہن لوگ غیب دانی کے دعوے کر کے سادہ لوح عوام کو بے وقوف بناتے تھے۔ قرآن نے یہ واضح کر دیا کہ ملاء اعلیٰ کے دائروں تک شیاطین کو رسائی حاصل نہیں ہے اور اگر وہ چوری چھپے کان لگانے کی کوشش کرتے ہیں تو شہاب کی سنگباری کا ہدف بنتے ہیں۔ اسی پہلو سے یہاں شیطان کی صفت رجیم آئی ہے اس لیے کہ رجیم کے معنی سنگسار کردہ کے ہیں، اور لفظ ''کل'' اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ بڑے سے بڑا شیطان بھی بہر حال خدا کے محفوظ کیے ہوئے حدود میں داخل نہیں ہو سکتا۔ (تدبر قرآن ج ۴ ص ۳۵۱، فاران فاؤنڈیشن، لاہور)

الحجر: ۱۶ کی تفسیر از جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری

ضیاء الامت حضرت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری حنفی متوفی ۱۴۱۸ھ، الحجر: ۱۶ تا ۱۸ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوْجًا'':

کفار و منکرین کے سامنے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور عظمت کے مزید تکوینی دلائل پیش کیے جا رہے ہیں، تا کہ وہ ان میں غور و فکر کریں اور اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور وحدانیت کو تسلیم کر کے نور ہدایت سے اپنے قلوب کو روشن کریں، پہلے ان آیات تکوینیہ کا ذکر فرمایا جو بلندی میں پائی جاتی ہیں، بروج کا واحد برج ہے، اس کا ایک لغوی معنی ہے جس میں اہل زبان اس کو استعمال کرتے ہیں اور ایک

اس کا اصطلاحی معنی ہے جس میں یونان کے علماء ہیئت نے اسے استعمال کیا۔ دونوں معنی آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ برج کا لغوی معنی ہے ظاہر ہونا، جب عورت پردہ سے نکل آئے اور اپنی نمائش کرنے لگے تو کہتے ہیں "تبرجت المراۃ اصل البروج الظہور ومنھا تبرجت المراۃ باظہار زینتھا" (قرطبی)۔ اس لغوی معنی کی مناسبت سے اس کا اطلاق ان چیزوں پر ہونے لگا جو دور سے نمایاں ہوتی ہیں مثلاً قلعہ، محل، شاہراہ وغیرہ۔ والبروج جمع برج وھو لغۃ القصر والحصن (روح المعانی)۔ اسی وجہ سے وہ بڑے ستارے جو دور سے نمایاں ہوتے ہیں، انہیں بھی اہل عرب برج کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ المراد بالبروج الکواکب العظام (روح المعانی)۔ اور ابوصالح نے کہا ہے کہ بروج سے مراد سبع سیارات ہیں۔ (قرطبی)۔

علماء ہیئت نے جب یہ مشاہدہ کیا کہ سورج تین ماہ تک شمال کی طرف مائل ہوتا ہے پھر تین ماہ تک ہموار رہتا ہے، اس کے بعد وہ تین ماہ تک جنوب کی طرف مائل ہوتا ہے اور پھر تین ماہ تک ہموار رہتا ہے تو انہوں نے سورج کے مدار حرکت کو بارہ حصوں میں بانٹا اور ہر حصہ کو برج کہا اور مدار کے ہر حصہ میں جو بڑے بڑے ستارے پائے جاتے ہیں، ان کی ایک خیالی شکل اپنے ذہن میں مرتسم کر لی۔ اور اس شکل سے اس برج کا نام رکھ دیا گیا۔ ان برجوں کے نام یہ ہیں: حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو اور حوت۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آیت میں بروج سے کیا مراد ہے، اس میں تو شک نہیں کہ مدار آفتاب کی یہ تقسیم یونانی علماء ہیئت نے کی تھی۔ اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ نزول قرآن سے پہلے عرب اس تقسیم کو جانتے تھے اور اس کو اپنی زبان میں استعمال کرتے تھے تو پھر ان برجوں سے وہی بارہ برج مراد ہوں گے جن کے نام ابھی اوپر لکھے گئے ہیں، اور اگر اس کا قابل اعتماد ثبوت ہم نہ پہنچ تو بھی آیت کا مفہوم سمجھنے میں کوئی دقت نہیں کیونکہ اس وقت بروج سے مراد وہ سات سیارے یا دیگر بڑے بڑے چمکدار ستارے ہوں گے جو کروڑوں چمکتے ہوئے ستاروں میں بھی خوب نمایاں نظر آتے ہیں۔

"وَزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ": یعنی یہ نہیں کہ چمک دار ستارے بنا دیے اور انہیں غیر منظم طور پر بکھیر دیا کہ ان سے روشنی حاصل ہوتی رہے اور ان کی کرنیں اپنی اپنی تاثیرات سے متعلقہ اشیاء کو متاثر کرتی رہیں اور بس۔ بلکہ ان کو ایسے موزوں طور پر سجایا ہے کہ دیکھنے والی آنکھ ان کے حسن ترتیب کو دیکھ کر دنگ رہ جاتی ہے، الغرض یہ کوئی حسن مستور نہیں جس کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت ہو۔ تاروں بھری اندھیری رات ہو یا چودھویں کا چاند اس خاکدان ارضی پر اپنے انوار کی بارش کر رہا ہو، حجلہ عروسی سے نکلنے والی دلہن کی طرح حیاء کی سرخی گالوں پر لیے صبح کے وقت سورج جلوہ نمائی کر رہا ہو یا شام کے وقت مغربی افق کو اپنی حسرتوں کے خون سے سرخ کر کے وہ رات کی تاریکی میں گم ہونے کی تیاری کر رہا ہو۔ کون سا ایسا منظر ہے جس سے ہر شخص اپنے اپنے ذوق کے مطابق لطف اندوز نہیں ہوتا۔ خالق کائنات نے ہر چیز کو جس طرح مفید اور مستحکم بنایا ہے، اتنا ہی اسے حسن و جمال بھی بخشا ہے۔

"وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ": اتنے مفید، حسین اور محیر العقول نظام کو قائم فرما کر اس کی حفاظت کا بندوبست نہ کرنا حکمت ربانی کے خلاف تھا، اس لیے فرمایا کہ ہر شیطان مردود کی دخل اندازی، اس کی تخریبی سرگرمی اور فساد انگیزی سے اس نظام کو اس طرح محفوظ فرما دیا گیا ہے کہ کسی کی مجال نہیں کہ اس میں کوئی گڑبڑ پیدا کر سکے۔ یہ نظام شمسی جس طرح مرتب کیا گیا ہے۔ اس کے ثوابت کے لیے جو جو مقامات متعین کیے گئے ہیں اور اس کے سیارات کے لیے حرکت کرنے کی جو مداریں مقرر کی گئی ہیں۔ کوئی تخریبی قوت بال برابر بھی اس میں فساد برپا نہیں کر سکتی۔ اگر کوئی شیطان مردود قدرت کی طرف سے مقررہ حد بندیوں کو توڑ کر آگے

جانا جاتا ہے تو شہاب ثاقب سے اس کی توضیح کی جاتی ہے۔

"اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِیْنٌ": شہاب کے بھی دو معنی ہیں: ایک لغوی اور ایک اصطلاحی۔ لغت میں شہاب چمکنے والی آگ کو کہتے ہیں۔ الشھاب فی اللغة النار الساطعة، اس کے ساتھ یہاں مبین کی صفت مذکور ہے یعنی ظاہر اور بعض دیگر مقامات پر اس کو ثاقب کی صفت سے موصوف کیا گیا ہے، جس کا معنی ہے چھیدنے والا۔ یعنی ایسی تیز آگ جو ہر چیز میں سے سوراخ کر کے گزر جاتی ہے اور اصطلاح میں اس روشنی کو کہتے ہیں جو فضا میں شام کے بعد لمبی لکیر کی طرح نمودار ہوتی ہے اور پھر آناً فاناً غائب ہو جاتی ہے۔ اس شہاب کی حقیقت کیا ہے۔ جدید علم فلکیات کے ماہرین خود بھی وثوق سے اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔ وہ کہتے ہیں کہ آج تک ہم اپنی تحقیق سے جس نتیجہ پر پہنچے ہیں، وہ یہ ہے کہ نظام شمسی کا کوئی چھوٹا سا تارا ٹوٹتا ہے جس کے اجزاء جب ہوا کے کرہ میں داخل ہوتے ہیں تو رگڑ سے بھڑک اٹھتے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ہے کہ ہم شہاب ثاقب کی ماہیت کے متعلق آج جو بہترین توجیہ بیان کر سکتے ہیں، وہ یہ ہے کہ نظام شمسی کا کوئی چھوٹا سا تارا ٹوٹتا ہے، اس ٹوٹنے والے تارے کا بیشتر حصہ ہماری فضا میں پہنچنے سے پہلے یا تو گرد بن جاتا ہے یا بخارات میں تبدیل ہو کر اڑ جاتا ہے، اور اقل قلیل ہماری فضاؤں میں پہنچ کر دکھائی دیتا ہے اور اس کے کئی ٹکڑے زمین پر بھی گر پڑتے ہیں۔ شہاب ثاقب کے ٹکڑے مختلف عجائب خانوں میں موجود ہیں سب سے بڑے ٹکڑے کا وزن چالیس ٹن تقریباً ۱۱۲۰ من ہے اور یہ ٹکڑا جنوب مغربی افریقہ میں ہے، اس سے کم وزن کا ایک ٹکڑا جو گرین لینڈ میں گرا تھا، اس کا وزن ساڑھے چھتیس ٹن ہے، اسے کمانڈر پیری وہاں سے اٹھوا کر نیویارک لے آئے۔ (انسائیکلو پیڈیا گرولیر (Ency. Grolier) اٹھارھویں صدی میں پیرس کی سائنس اکیڈمی نے شہاب ثاقب کا انکار کر دیا تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ سارے نمونے جو مختلف عجائب گھروں میں ہیں سب فرضی ہیں اور جن لوگوں نے ان کے گرنے کی چشم دید شہادتیں دی ہیں انہوں نے جھوٹ بولا ہے۔

لیکن اٹھارہ سو تین میں پیرس کے قریب ہی تین ہزار شہاب ثاقب کا مینہ برسا، اس طرح قدرت نے ان سائنسدانوں کے غرور کو توڑا اور ان کی کم علمی کا پردہ فاش کر دیا۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ۱۵ ص ۳۴۱)

اسی ضمن میں وہ حجر اسود کے متعلق بھی تسلیم کرتے ہیں کہ وہ زمینی پتھر نہیں ہے بلکہ کوئی آسمان سے اتری ہوئی چیز ہے، انہوں نے اپنی کم علمی کے باعث اسے بھی ایک شہاب ثاقب تصور کیا ہے لیکن یہ ان کی کم علمی ہے، بہر حال اس بات کا تو انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ یہ یہاں کا پتھر نہیں ہے۔

The black stone of the kaba. The Holiest of Holies of the Muhammadans is no doubt a stone meteorite with its strange black crust 341eng.bri.15

جب تک یونانی علم ہیئت کے زیر اثر ہم یہ سمجھتے رہے کہ زمین سے خشک بخارات اٹھتے ہیں اور جب وہ کرۂ ناری کے قریب پہنچتے ہیں تو جل اٹھتے ہیں۔ انہی جلنے والے بخارات کو شہاب ثاقب کہا جاتا ہے تو ہمیں قرآن کریم کی ان آیات کا مفہوم بیان کرنے کے لیے بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا لیکن جدید تحقیقات سے جب یہ ثابت ہو گیا کہ شہاب ثاقب نظام شمسی کے کسی ٹوٹنے والے تارے کا جدا شدہ ٹکڑا ہے تو اب معاملہ بہت حد تک واضح ہو گیا ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ ان شہابوں سے شیطانوں کے روکنے کا کام کیونکر لیا جاتا ہے۔ اگر آپ موجودہ تحقیقات کی روشنی میں اس کی کوئی علمی توجیہ پیش کرنے سے قاصر ہیں تو جلد بازی میں اس کا انکار نہ کیجئے۔ اس پر یقین رکھیے کہ یہ سچ ہے، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اور اس کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد ہے۔ اسے بھی سر دست انہیں مسائل میں سے شمار کیجئے جن کو عقل انسانی ابھی تک نہیں سمجھ سکی اور انتظار کیجئے حتیٰ کہ مستقبل کی دوسری پیچیدہ گرہوں کی طرح اس عقدہ کی بھی گرہ کشائی کر دے۔ اور اگر آپ فزکس کے طالب علم ہیں اور مسلمان ہیں تو آپ ان مسائل کو سلجھانے کی ہرگز کوشش نہ کریں۔ کہیں آپ کے ذہن رسا کو نظر نہ لگ جائے۔ کسی کالج میں لیکچرار بن جائیے پھر بھی مزید مطالعہ یا تحقیق کی طرف راغب ہو کر اپنی آرام دہ زندگی کو بے آرام نہ بنائیے اور اگر کچھ کرنے کے لیے دل مجبور ہی کرے تو کتابوں کے نوٹ اور خلاصے لکھ کر ہاتھ رنگئے تاکہ آپ کے شاگردوں کو بھی اس علم میں صرف اتنی ہی دسترس حاصل ہو جس سے وہ امتحان میں پاس ہو جائیں، مبادا آپ کی کاوش اور تحقیق سے کوئی قرآنی مسئلہ حل ہو جائے۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے — مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

الٰہی ہمارے جوانوں کی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار فرما۔ ان کے دلوں کو حقیقت سے آشنا کر دے۔ انہیں اپنی دینی اور قومی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی لگن بخش دے۔ ان تن آسانوں کو سوز آرزو سے تڑپا دے۔

خرد کو غلامی سے آزاد کر — جوانوں کو پیروں کا استاد کر
جگر سے وہی تیر پھر پار کر — تمنا کو سینوں میں بیدار کر
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے — دل مرتضیٰ سوز صدیق دے

آمین بجاہ طٰہٰ و یٰسین صلی اللہ علیہ وسلم (ضیاء القرآن، ج ۲ ص ۵۲۳-۵۲۶، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور)

الحجر: ۱۶ کی تفسیر از سرسید احمد خان

سرسید احمد خان متوفی ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء الحجر: ۱۶ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"فِي السَّمَاءِ بُرُوْجًا": بروج صیغہ جمع کا ہے اور برج اس کا واحد ہے، برج کے معنی اس شے کے ہیں جو ظاہر اور اپنے ہم شکل چیزوں سے ممتاز ہو۔ عمارت کا وہ حصہ جو ایک خاص صورت پر بنایا جاتا ہے گو وہ جز و اس عمارت کا ہوتا ہے مگر عمارت کے اور جزوں سے ممتاز اور نمایاں ہوتا ہے اس کو برج کہتے ہیں۔

اہل ہیئت نے جب ستاروں پر غور کی اور ان کو دیکھا کہ کچھ ستارے ایسی طرح پر متصل واقع ہوئے ہیں کہ باوجودیکہ وہ اوروں سے بڑے اور اوروں سے کچھ زیادہ روشن نہیں ہیں مگر ایک خاص طرح پر واقع ہونے سے وہ اور سب سے علیحدہ دکھائی دیتے ہیں اور نمایاں ہیں۔ پھر ان کے نمایاں ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ ہوئی کہ انہوں نے دیکھا کہ سورج دولابی چال پر چلتا ہوا انہیں معلوم ہوتا بلکہ حمائلی طور پر چلتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور یہ اس کا چلنا انہیں ستاروں کے نیچے نیچے معلوم ہوتا ہے۔ اس وجہ سے وہ ستارے اور ستاروں سے زیادہ ممتاز و نمایاں ہو گئے۔

اس کے بعد اہل ہیئت نے دیکھا کہ اس طرح پر اور ایسے موقع سے جو اوروں سے ممتاز ہوں متعدد گچھے ستاروں کے واقع ہیں مگر ان میں بارہ مجموعوں کو اس طرح پر پایا کہ وہ ایسی ترتیب سے واقع ہیں کہ اگر ان سب پر ایک دائرہ فرض کیا جاوے تو کرہ پر دائرہ

علیحدہ ہوگا، پھر ان کو سورج بھی اسی طرح پر چلتا ہوا دکھائی دیا اور اسی طرح پر سورج کے چلنے سے اختلاف فصول ان کو تحقق ہوا۔ پس انہوں نے ان ستاروں کے بارہ مجمعوں کی تعداد کے موافق آسمان کے بارہ مساوی حصے فرض کئے اور ہر ایک حصہ ان ستاروں کے ایک ایک مجمع کے لئے قرار دیا اور ہر حصہ کا نام برج رکھا کیونکہ اپنے ستاروں کے خاص مجمع سے وہ علیحدہ ممتاز اور نمایاں تھا۔

اس کے بعد اہل ہیئت نے چاہا کہ ہر ایک برج کے جدے جدے نام رکھے جاویں تاکہ اس نام سے اس حصہ اور ستاروں کے مجمع کو بتا سکیں۔ انہوں نے خیال کیا کہ اگر ان ستاروں کے مجمع میں سے جو ستارے کناروں پر واقع ہیں، اگر ان کو خطوط سے ملا ہوا فرض کریں تو کیا صورت پیدا ہوتی ہے، اس طرح خیال کرنے سے کسی کی صورت انسان کی بن گئی کسی کی کسی جانور کی وغیرہ وغیرہ، اس لئے انہی ناموں سے انہوں نے اس حصے کو اور اس مجمع ستاروں کو موسوم کیا اور اس کے یہ نام قرار دیئے۔

حمل۔ ثور۔ جوزا۔ سرطان۔ اسد۔ سنبلہ۔ میزان۔ عقرب۔ قوس۔ جدی۔ دلو۔ حوت۔

غالباً یہ تفتیش اولاً مصریوں نے کی ہوگی جن کا آسمان ہمیشہ ابر وغیرہ سے صاف رہتا تھا اور ہمیشہ ان کو ستاروں کے دیکھنے کا اور ان کو پہچاننے کا بخوبی موقع ملتا تھا مگر یہ نام اور یہ تقسیم تمام قوموں میں اور بہت قدیم زمانہ کے عرب جاہلیت میں عام ہو گئے تھے اور آسمان کے اس حصہ کو برج سے اور اس کے کل حصوں کو جو تعداد میں بارہ تھے بروج سے نامزد کرتے تھے، اسی کی نسبت خدا نے فرمایا: "وَ لَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ زَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ"۔ مفسرین نے بُرُوْجًا کی تفسیر قصوراسے کی ہے، بلاشبہ یہ ان کا قصور ہے خدا نے تو اسی چیز کو بروج کہا ہے جس کو اہل عرب بلکہ تمام قومیں بروج سمجھتی تھیں۔ اور نہایت نادانی ہے اگر ان بروج کی تفسیر میں سورہ نساء کی یہ آیت پیش کی جاوے کہ "اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَ لَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ"۔ (النساء:۷۸)"۔

"وَ حَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ" اس آیت کے تو یہ معنی ہیں کہ ہم نے اس کو یعنی آسمان کو یا اُن کو یعنی برجوں کو محفوظ رکھا شیطان دھتکارے گئے سے۔ اور سورہ صافات میں اسی کی مانند ایک آیت ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ "اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ الْكَوَاكِبِ ۙ وَ حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۚ (الصافات:۶۔۷)" ہم نے خوشنما کیا دنیا کے آسمان کو ستاروں کی خوشنمائی سے اور محفوظ کیا ہر شیطان سرکش سے۔ شاہ رفیع الدین صاحب نے حِفْظًا جو سورہ صافات میں ہے، مفعول لہٗ قرار دیا ہے زَيَّنَّا کا اور اس کا یہ ترجمہ کیا ہے کہ "واسطے حفاظت کے ہر شیطان سرکش سے"۔ جس کا یہ مطلب ہے کہ ستاروں سے آسمان کو محفوظ کیا ہے۔ یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے اور ابن عباس کے نام سے جو تفسیر مشہور ہے اس میں حِفْظًا کی تفسیر کی ہے کہ "حفظت بالنجوم" یعنی میں نے آسمان کی حفاظت کی ستاروں سے۔ اس تفسیر سے بھی حِفْظًا مفعول لہٗ پایا جاتا ہے، یہ تفسیر بھی صحیح نہیں ہے۔ حِفْظًا کے پہلے واؤ عاطفہ ہے اور عطف جملہ کا جملہ پر ہے۔ مگر باوجود موجود ہونے واؤ کے حِفْظًا کو مفعول لہٗ قرار دینا درحالیکہ اس کے ماقبل کوئی مفعول لہٗ جس پر اس کا عطف ہو سکے نہیں ہے، صحیح نہیں ہو سکتا۔ پس صاف بات ہے کہ یہ جملہ علیحدہ ہے اور بقرینہ علیحدہ ہونے جملہ کے حِفْظًا مفعول ہے فعل محذوف حفظنا کا۔ پس شاہ ولی اللہ صاحب نے جو فارسی ترجمہ کیا ہے وہ صحیح ہے کہ "ونگاہ داشتیم از ہر شیطان سرکش"، مگر انہوں نے اس کے مفعول کو ظاہر نہیں کیا کہ "کرا نگاہ داشتیم" پس اگر اس کا مفعول بتا دیا جاوے تو مطلب صاف ہو جاتا ہے۔ یعنی ونگاہ داشتیم آسمان را یا کواکب را۔ مگر جب ہم قرآن مجید کی ایک آیت کی تفسیر دوسری آیت سے کریں تو صاف یہ تفسیر ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے سورۂ حجر کی آیت میں صاف فرمایا ہے کہ "وَ حَفِظْنٰهَا" پس سورہ صافات میں جو الفاظ حِفْظًا آئے ہیں، ان کی تفسیر اسی

کے مطابق یہ ہے کہ وحفظناها حفظا من کل شیطان مارد یعنی ہم نے آسمان یا ستاروں کو ہر طرح کی حفاظت میں شیطان سرکش سے محفوظ رکھا ہے۔

سورۂ ملک میں جو خدا نے یہ فرمایا ہے کہ "زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَ جَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ۔ (الملک:۵)"۔ رجوما کے معنی مارنے یا پتھر مارنے کے اور شیاطین سے جن یا اور کوئی وجود غیر مرئی سمجھنا رجما بالغیب بات کہنی ہے صاف بات یہ ہے کہ شیاطین سے شیاطین الانس مراد ہیں اور رجوما سے اُن شیاطین کا رجما بالغیب یعنی ان کی اٹکل پچو باتیں بتانا مراد ہے چنانچہ مفسرین نے بھی کہا ہے کہ شیاطین سے مراد شیاطین الانس ہیں جو کہتے تھے کہ ہم کو آسمانی چیزیں مل جاتی ہیں اور ستاروں کے حساب سے اس کو سعد و نحس ٹھہرا کر پیشین گوئی کرتے تھے۔ تفسیر کبیر میں بھی اسی کے مطابق ایک قول نقل کیا ہے کہ ہم نے آسمان کے ستاروں کو ایک ظن اور غیب کی اٹکل پچو بات کہنے کو آدمیوں کے شیطانوں کے لئے بنایا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جو نجوم سے احکام بتاتے ہیں۔

پس خدا تعالیٰ کے اس کلام "وَ حَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ" "وَ حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ" کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے آسمان کے برجوں کو یا آسمان کے ستاروں کو شیاطین الانس سے محفوظ رکھا ہے، اور اسی لئے وہ ان سے کوئی سچی یا پکی پیشین گوئی حاصل نہیں کر سکتے۔ بجز ظن اور رجما بالغیب کے۔

یہ اعتقاد جو کفار عرب کا تھا کہ جن آسمانوں پر جا کر ملاء اعلیٰ کی باتیں سن آتے ہیں اور کاہنوں کو خبر کر دیتے ہیں اس کی نفی خدا تعالیٰ نے سورہ صافات میں فرمائی ہے جہاں کہا ہے: "لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَ يُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝ دُحُوْرًا وَّ لَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۝ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ۝ (الصافات:۸۔۱۰)" نہیں سن سکتے ملاء اعلیٰ کو اور ڈالا جاتا ہے ان پر شہاب ہر طرف سے مردود ہونے کو مگر جس نے اچک لیا، اچک لینا اس کے پیچھے پڑتا ہے شہاب روشن۔

اور اس سورت میں فرمایا ہے "اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ" یعنی ہم نے محفوظ کیا ہے آسمان کے برجوں کو ہر ایک شیطان رجیم سے مگر جو چرا لیوے سننے کو پھر پیچھے پڑتا ہے اس کے شہاب روشن۔ اس آیت کے مطلب میں اور سورہ صافات کی آیت کے مطلب میں کچھ فرق نہیں ہے۔ سورہ صافات میں آیا ہے "خَطِفَ الْخَطْفَةَ" یعنی اچک لیا اچک لینا اور یہ نہیں بتایا کہ کیا اُچکا، اس سے سمع کا اچک لینا تو نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ اس کی نفی کی گئی ہے، نہایت شدت سے سمع کا سین اور میم کو مشدد کر کے پس کسی اور امر کا اُچک لینا سوائے سمع کے مراد ہے۔

مگر سورہ حجر میں استراق سمع بیان کیا ہے تو ظاہر ہے کہ اس جگہ لفظ سمع کا کفار کے خیال کی مناسبت سے بولا گیا ہے نہ حقیقی معنوں میں، اس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ مثلاً لوگ کسی کی نسبت کہیں کہ فلاں شخص بادشاہ کے دربار کی باتیں سن سن کر لوگوں کو بتا دیا کرتا ہے اس کے جواب میں کہا جاوے نہیں، وہ بادشاہ کے دربار تک کب پہنچ سکتا ہے، یوں ہی ادھر ادھر سے کوئی بات اڑا لیتا ہے یا سن لیتا ہے تو اس سے ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ شخص درحقیقت دربار کی باتیں سن لیتا ہے، اسی طرح ان دونوں آیتوں میں الفاظ "خَطِفَ الْخَطْفَةَ" اور "اسْتَرَقَ السَّمْعَ" کے واقع ہوئے ہیں جو کسی طرح واقعی سننے پر دلالت نہیں کرتے خصوصاً ایسی حالت میں کہ نفی سے بتاکید نفی آئی ہے۔ بات یہ ہے کہ کفار پیشین گوئی کرنے کے دو حیلے کرتے تھے۔ ایک یہ کہ جن ملاء اعلیٰ کی باتوں کو سن کر ان کی

خبر کر دیتے تھے دوسرے ستاروں کی حرکت اور ہبوط و عروج اور منازل بروج اور کواکب کے سعد و نحس ہونے سے احکام دیتے تھے۔ وہ سب غلط اور جھوٹ تھے مگر بعض صحیح بھی ہوتے تھے مثلاً کسوف و خسوف کی پیشین گوئی یا کواکب کے اقتران اور ہبوط و عروج کی پیشین گوئی، اسی امر کو جو در حقیقت ایک حسابی امر مطابق علم ہیئت کے ہے خدا تعالیٰ نے دو جگہ ایک جگہ بلفظ "اسْتَرَقَ السَّمْعَ" اور دوسری جگہ بلفظ "خَطِفَ الْخَطْفَةَ" سے تعبیر کیا ہے، اور اسی کے ساتھ "فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ" سے۔ اس سے زیادہ کی پیشین گوئی کو معدوم کر دیا ہے۔

"فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ": شہاب کے معنی ہیں شعلہ آتش کے اور اس انگارے کے جو بھڑکتا ہوا ہو، اس کو خدا نے "شِهَابٌ مُّبِيْنٌ" سے تعبیر کیا ہے جیسا کہ سورۂ نمل میں بیان ہوا ہے۔

شہاب یا شہاب ثاقب یا شہاب مبین کا اس آتشیں شعلہ پر اطلاق ہوتا ہے جو کائنات الجو میں اسباب طبعی سے پیدا ہوتا ہے اور جو کسی جہت میں دور تک چلا جاتا ہے اور جس کو اردو زبان میں تارہ ٹوٹنا بولتے ہیں۔

اب یہ بات دیکھنی چاہیے کہ عرب جاہلیت میں تاروں کے ٹوٹنے سے یعنی جب کہ کائنات الجو میں کثرت سے شہاب ظاہر ہوتے تھے تو ان سے کیا فال لیتے تھے، یا کس بات کی پیشین گوئی کرتے تھے۔ کچھ شبہ نہیں کہ وہ اسے بدفالی اور کسی حادثہ عظیمہ کے واقع ہونے کا یقین کرتے تھے جس طرح کہ تعلیے سے بدفالی سمجھتے تھے۔

تفسیر کبیر میں زہری سے روایت لکھی ہے کہ چند آدمی رسول خدا کے ساتھ بیٹھے تھے کہ ایک تارہ ٹوٹا، آنحضرت نے پوچھا کہ تم زمانہ جاہلیت میں اس میں کیا کہتے تھے، انہوں نے کہا کہ ہم کہتے ہیں کہ کوئی بڑا شخص مر جاوے گا یا حادثہ عظیمہ پیدا ہوگا۔ غرضیکہ اس کو زمانہ جاہلیت میں فال بد یا شگون بد سمجھتے تھے۔ اس زمانہ کے لوگ بھی کثرت سے تاروں کے ٹوٹنے کو شگون بد سمجھتے ہیں۔ پس شیاطین الانس کے اعتقاد کی ناکامی کو ان کے کسی شگون بد سے تعبیر کرنے کے لئے خدا نے فرمایا کہ "فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ" جو نہایت ہی فصیح استعارہ ہے، نجمین کے وبال کو بیان کرنے کو اور جس کا مقصود یہ ہے کہ فاتبعهم الشوم والخسران والحرمان فيما املوا۔

سورۂ جن میں "اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ" کا لفظ ہے، تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ مس سے استعارہ طلب کیا جاتا ہے اور یہ قول نجمین کا ہے، پس معنی یہ ہوئے کہ ہم نے ڈھونڈھا آسمان کو اس کو پایا بھرا ہوا، حارساً یعنی موانع شدید اور شہب یعنی وبال سے جن کے سبب ہم اپنے مقصد کو حاصل نہیں کر سکتے۔ پھر انہوں نے کہا کہ ہم ملاء اعلیٰ کی باتوں کو سننے یعنی دریافت کرنے کو بیٹھتے تھے مگر اب قرآن سننے کے بعد اس کے لئے جو کوئی سنے یعنی دریافت کرنا چاہے، ہم اس کے لئے شہاب یعنی وبال ممکن پاتے ہیں۔ پس ان تمام امور کو اجنہ مظنونہ اور مزعومہ سے منسوب کرنا جن کا وجود بھی قرآن مجید سے ثابت نہیں ہے کس قدر بے اصل اور رجماً بالغیب بات ہے

ملتقطاً۔ (تفسیر القرآن وھو الہدیٰ والفرقان، ج ۲ ص ۲۶۶ ـ ۲۷۳، سر سید ریسرچ اکیڈمی، لاہور، ۲۰۱۰ء)

سر سید احمد خان کی تفسیر پر مصنف کا تبصرہ

میں کہتا ہوں کہ سر سید احمد خان نے شیاطین کے آسمانوں پر چوری چھپے جانے اور فرشتوں کی باتیں سننے اور ان کو کاہنوں کی طرف القاء کرنے کا انکار کیا ہے، حالانکہ یہ چیز بہ کثرت کتب احادیث سے ثابت ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ بے شک اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ آسمان میں کسی چیز کا فیصلہ

فرماتے ہیں تو فرشتے عجز کے ساتھ اپنے پروں کو مارتے ہیں، ان کے ارشاد کی ہیبت کی وجہ سے گویا کہ وہ ایک زنجیر ہے جو پتھر پر ماری گئی ہو، پس جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہو جاتی ہے تو وہ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں: تمہارے رب نے کیا فرمایا تھا؟ (سبا: ۲۳)، تو وہ اس سے کہتے ہیں جس نے فرمایا تھا: انہوں نے حق فرمایا اور وہ بہت بلند اور نہایت بڑے ہیں، پس اس بات کو چوری چھپے سننے والے شیطان سن کر بھاگتے ہیں، شیطان آسمان کے نیچے یوں اوپر نیچے ہوتے ہیں، سفیان نے اس موقع پر ہتھیلی کو موڑ کر انگلیاں الگ الگ کر کے شیاطین کے جمع ہونے کی کیفیت بتائی کہ اس طرح شیاطین ایک کے اوپر ایک ہوتے ہیں، پھر وہ شیاطین کوئی ایک بات سن لیتے ہیں اور اپنے نیچے والے کو بتاتے ہیں، پھر وہ اپنے سے نیچے والے کو بتاتے ہیں، اس طرح وہ بات ساحر یا کاہن تک پہنچتی ہے، کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ اس سے پہلے کہ وہ یہ بات اپنے سے نیچے والے کو بتائیں آگ کا ایک شعلہ انہیں دبوچ لیتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جب وہ بتاتے ہیں تو آگ کا انگارہ ان پر پڑتا ہے، اس کے بعد کاہن اس میں سو جھوٹ ملا کر لوگوں سے بیان کرتا ہے، (جب اس کاہن کی ایک بات صحیح ہو جاتی ہے تو ان کے ماننے والوں کی طرف سے) کہا جاتا ہے کہ کیا اس، اس طرح ہم سے فلاں دن کاہن نے نہیں کہا تھا، اسی ایک بات کی وجہ سے جو آسمان پر شیاطین نے سنی تھی، کاہنوں اور ساحروں کی بات کو لوگ سچا جاننے لگتے ہیں۔

(صحیح البخاری: ۴۷۰۱، ۴۸۰۰، ۷۴۸۱، سنن ترمذی: ۳۲۲۳، ابن ماجہ: ۱۹۳، مسند الحمیدی: ۱۱۸۵، صحیح ابن حبان: ۳۶، ۱۱۰، والسنات للبیہقی: ۴۳۱، الجامع الصحیح للسنن والمسانید ج ۱ ص ۲۰۳، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشر، ج ۲ ص ۲۶۳)

ان متعدد کتب حدیث کے حوالہ جات سے وہ خبر ثابت ہے جس کا سر سید احمد نے انکار کیا ہے۔ (سعیدی غفرلہٗ)

الحجر: ۱۶ کی تفسیر غلام احمد پرویز

غلام احمد پرویز متوفی ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۵ء، الحجر: ۱۳ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ہم نے فضا کی بلندیوں میں، ابھرے ہوئے کرے پھیلا رکھے ہیں اور ان سے روشنی منعکس ہوتی ہے تو دیکھنے والوں کو بڑے خوش نما نظر آتے ہیں۔ اور انہیں ہم نے ہر قسم کی تخریبی قوتوں سے محفوظ رکھا ہے، اسی لیے تو یہ عظیم کارگہ کائنات، اس نظم و ضبط اور حسن و خوبی سے چل رہا ہے۔ یہ ہے ستاروں کی حقیقت جن کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ ان کی گردش سے انسانی مقدرات اور واقعات کے متعلق پیش گوئیاں کی جا سکتی ہیں۔

اور کاہنوں اور منجموں جن کے متعلق کہا کہ ان کے یہ فریب، دورِ جہالت میں تو چل جاتے تھے، اب (نزولِ قرآن سے) علم کی روشنی پھیل رہی ہے۔ اب ان کی دکانیں بند ہو جائیں گی۔ (مطالب الفرقان، ج ۷ ص ۱۷۳۔۱۷۴، ادارہ طلوعِ اسلام، لاہور، ۱۹۸۱ء)

غلام احمد پرویز کی تفسیر پر مصنف کا تبصرہ

غلام احمد پرویز نے بروج اور شہاب ثاقب کے متعلق اپنا کوئی ٹھوس نظریہ نہیں بیان کیا، محض افسانہ نگاری کی ہے۔ اگر وہ اپنا کوئی ٹھوس نظریہ بیان کرتے اور وہ واقع کے خلاف ہوتا تو پھر اس پر رد کیا جاتا۔ (سعیدی غفرلہٗ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ہم نے زمین کو (پانی کے اوپر) پھیلا دیا، اور اس میں پہاڑوں کے بوجھ ڈال

دیئے اور اس میں ہر چیز مناسب انداز ے کے مطابق پیدا فرمائی O'' (الحجر:۱۹)

حقائق ارضیہ سے اللہ تعالیٰ کی توحید پر دلائل

''وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ'':
اس سے پہلے ہم نے آسمانی حقائق سے اللہ تعالیٰ کی توحید پر دلائل پیش کیے، اب اس کے بعد کی آیات میں حقائق ارضیہ سے اللہ تعالیٰ کی توحید پر دلائل پیش کریں گے۔

(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا''۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ہم نے زمین کو پانی پر پھیلا دیا۔
اور اس میں ایک اور احتمال بھی ہے، کیونکہ زمین جسم ہے اور جسم وہ ہوتا ہے جو طول، عرض اور عمق میں پھیلا ہوا ہو۔ اور جب اس طرح ہو تو زمین کا ان تین جہات میں پھیلنا کسی مخصوص مقدار کے ساتھ ہوگا، اور ضروری ہے کہ وہ مقدار متناہی ہو۔ اور جتنی مقدار پر وہ پھیلا ہوا ہے اس سے کم بھی ہو سکتی ہے، اس سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے تو اس کا اس مخصوص مقدار پر پھیلا ہوا ہونا اس کو واجب کرتا ہے کہ اس مخصوص مقدار میں اُس کے پھیلاؤ کو کسی مُخَصِّص اور مُرَجِّح نے کیا ہو، اور وہ مخصص اور مرجح اللہ عزوجل کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

زمین کا پھیلانا اس کے گول ہونے کے منافی نہیں ہے

بعض لوگ کہتے ہیں کہ زمین کا پھیلانا اس کو لازم کرتا ہے کہ زمین سیدھی اور سپاٹ ہے اور وہ ایک کروی جسم نہیں ہے۔
لیکن یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ جب کوئی بہت بڑا گول جسم ہو تو سیدھا اور سپاٹ ہونا اس کے گول ہونے کے منافی نہیں ہوتا۔

(۲) اس آیت میں فرمایا ہے: ''وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ''، اور اس زمین میں ہم نے پہاڑوں کا بوجھ ڈال دیا۔ اور اس کی دو وجہیں ہیں: پہلی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو پانی پر پھیلایا تو زمین اپنے لوگوں کو لے کر ہلنے لگی تو اللہ تعالیٰ نے اس پر بھاری پہاڑوں کا بوجھ ڈال دیا تاکہ زمین اپنے اہل کو لے کر ہل نہ سکے۔
دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم نے زمین پر پہاڑوں کا بوجھ ڈال دیا، تاکہ لوگوں کے لیے زمین کے راستوں پر رہنمائی ہو اور لوگ صحیح راستہ سے اِدھر اُدھر نہ بھٹکتے پھریں۔

''رَوَاسِيَ'' کا معنی

''رَوَاسِيَ'' کا لفظ رُسو سے بنا ہے، اس کا معنی ہے ایک جگہ قائم اور ثابت رہنا۔ راسیات اور رواسی کا استعمال پہاڑوں کے لیے ہوتا ہے جو ایک جگہ قائم رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے زمین کو پھیلایا اور اس پر مضبوط پہاڑ نصب فرما دیے تاکہ زمین اپنے محور پر قائم رہے اور گردش کرنے میں اپنے محور سے متجاوز نہ ہو۔

''وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ'': یہاں پر دو بحثیں ہیں:
بحث اول: یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ ''فِيْهَا'' کی ضمیر زمین کی طرف راجع ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ضمیر الجبال الرواسی کی طرف راجع ہو۔ مگر اس ضمیر کا زمین کی طرف رجوع کرنا زیادہ اولیٰ ہے، کیونکہ نباتات کی جن انواع و اقسام

سے نفع حاصل کیا جاتا ہے وہ زمینوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ رہے وہ پہاڑی پھل جو پہاڑوں میں پیدا ہوتے ہیں، ان کا نفع بہت کم ہوتا ہے۔ اور بعض مفسرین نے کہا کہ ضمیر کا پہاڑوں کی طرف لوٹانا زیادہ اولیٰ ہے، کیونکہ معدنیات پہاڑوں میں پیدا ہوتے ہیں اور عرف اور عادت میں جو اشیاء موزونہ ہیں، وہ معدنیات ہیں نہ کہ نباتات۔

بحث ثانی: ''مَّوْزُوْنٍ'' کے مصداق کے متعلق کئی وجوہ ہیں:

الوجہ الاول: اس سے مراد وہ ہے جس کو بہ قدر حاجت فرض کیا جائے۔ القاضی نے کہا ہے: یہ وجہ زیادہ قریب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اس مقدار کا علم ہے جس مقدار کے لوگ محتاج ہوتے ہیں اور جس مقدار سے لوگ نفع حاصل کرتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ زمین میں ان مقدار کو پیدا فرماتے ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد ارشاد فرمایا ہے: ''وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ'' (اور اس میں تمہارے لیے زندگی گزارنے کے سامان مہیا فرما دیے)۔ کیونکہ جو رزق نباتات سے حاصل ہوتا ہے وہ دو وجہوں سے لوگوں کے لیے معیشت ہے:

(۱) اس کو کھانے کے اعتبار سے اور اس سے معین نفع حاصل کرنے کے اعتبار سے۔

(۲) جو چیزیں زمین سے پیدا ہوتی ہیں، ان کی تجارت کر کے ان سے نفع حاصل کیا جائے۔

اور انہوں نے کہا کہ وزن سے مقدار کی معرفت مراد لی جاتی ہے، پس وزن کے لفظ کا اطلاق مقدار کی معرفت کے ارادہ کے لیے ہے اور یہ اسم سبب کا مسبب پر اطلاق ہے اور اس کی تائید اللہ عزوجل کے اس ارشاد سے ہوتی ہے: ''وَ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ○ (الرعد:۸)'' (اور ہر چیز ان کے نزدیک ایک معین اندازے سے ہے ○)۔ اور اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَ مَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (الحجر:۲۱)'' (اور ہمارے پاس ہی ہر چیز کے خزانے ہیں اور ہم اس کو صرف معین مقدار کے مطابق ہی نازل فرماتے ہیں ○)۔

الوجہ الثانی: اس لفظ کی تفسیر اس طرح ہے کہ یہ عالم (جہان) عالم الاسباب ہے، اور اللہ تعالیٰ معدنیات کو اور نباتات کو اور حیوانات کو اس عالم کی طبائع کی ترکیب کے واسطے سے پیدا فرماتے ہیں، پس ضروری ہوا کہ زمین سے ایک مقدار مخصوص حاصل ہو اور پانی سے اور ہوا سے بھی مقدار مخصوص حاصل ہو، اور سورج اور الکواکب کی تاثیر سے بھی ایک مقدار مخصوص حاصل ہو۔ اور اگر ہم اس مقدار مخصوص سے کم یا زیادہ کو فرض کریں تو یہ معدنیات، نباتات اور حیوانات پیدا نہیں ہوں گے، پس اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک مخصوص مقدار پر اپنے علم اور حکمت کے اعتبار سے پیدا فرمایا ہے، پس اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے میزان سے ان چیزوں کو پیدا فرمایا ہے۔

الوجہ الثالث: اہل عرف یہ کہتے ہیں کہ فلاں چیز موزونُ الحرکات ہے، یعنی اس کی حرکات متناسب ہیں، عمدہ ہیں اور حکمت کے مطابق ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ کلام، کلام موزون ہے جب کہ یہ متناسب حسن ہے اور لغو اور بے فائدہ چیزوں سے دور ہے، پس اس سے مراد یہ ہے کہ یہ کلام حکمت اور عقل کے میزان سے موزون ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ لفظ موزون حُسن اور تناسب سے کنایہ ہے، پس اللہ تعالیٰ کے ارشاد ''وَ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ'' کا معنی یہ ہے کہ ہم نے اس میں ہر چیز متناسب پیدا فرمائی ہے جس پر عقل سلیم حُسن اور لطافت اور مصلحت سے مطابقت کا حکم لگاتی ہے۔

الجواہر: جن چیزوں کو زمین پیدا کرتی ہے، ان کی دو قسمیں ہیں: (۱) المعادن (۲) النباتات۔

رہے معادن تو وہ تمام کے تمام موزون ہیں اور وہ سات قسم کے اجسام ہیں، پتھر ہیں اور پارا وغیرہ ہیں۔

اور رہے نباتات تو اُن کا انجام بھی وزن کی طرف ہے، کیونکہ دانوں کا وزن کیا جاتا ہے، اسی طرح پھلوں کا بھی وزن کیا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ زمین سے جو بھی چیز پیدا ہوتی ہے وہ متناسب ہوتی ہے اور اس کا وزن کیا جاتا ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر فرمایا کہ انہوں نے زمین کو پیدا فرمایا اور اس کو پھیلا دیا اور اس کو وسیع فرما دیا، اور اس کے اندر پہاڑ رکھ دیئے اور وادیاں رکھ دیں، اور زمینیں اور ٹیلے رکھ دیے، اور اس میں نباتات کو پیدا فرمایا اور متناسب پھلوں کو پیدا فرمایا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ": اي معلوم، اسی طرح سعید بن جبیر، عکرمہ، ابو مالک، مجاہد، حکم بن عیینہ، حسن بن محمد، ابو صالح اور قتادہ نے کہا۔

اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ہر چیز اپنی مقدار کے اعتبار سے ہے۔ ابن زید نے کہا: ہر وہ چیز جس کا وزن کیا جاتا ہے اور اس کی مقدار معلوم کی جاتی ہے۔ اور ابن زید نے کہا: جس کو خریدار بازار میں وزن کرتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اس میں تمہارے لیے زندگی گزارنے کے سامان مہیا فرما دیئے، تمہارے لیے بھی اور اُن کے لیے بھی جن کو تم رزق نہیں دیتے O" (الحجر: ۲۰)

"وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ": اس آیت میں دو مسئلے ہیں:

پہلا مسئلہ: ہم نے سورۃ الاعراف میں المعایش کے متعلق دو قول ذکر کئے ہیں:

قولِ اول: اس کا عطف لَكُمْ کے محل پر ہے اور اصل عبارت یوں ہے: ہم نے زمین میں تمہارے لئے سامانِ معیشت رکھے ہیں اور اُن کے لیے بھی جن کو تم رزق دینے والے نہیں ہو۔

قولِ ثانی: اس کا عطف مَعَايِشَ پر ہے اور اصل عبارت اس طرح ہے: ہم نے تمہارے لیے سامانِ معیشت بنا دیا اور اُن کے لیے بھی جن کو تم رزق دینے والے نہیں ہو۔

<u>اس سوال کے متعدد جوابات کہ لفظِ "مَنْ" ذوی العقول کے ساتھ مخصوص ہے اور جن کو تم رزق نہیں دیتے ان میں غیر ذوی العقول بھی ہیں، پس اس آیت کا اطلاق کس طرح درست ہوگا؟</u>

(۱) کلمہ "مَنْ" ذوی العقول کے ساتھ مخصوص ہے، پس ضروری ہوا کہ "وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ" سے مراد عقلاء ہوں، اور وہ انسان کے اہل و عیال ہیں اور اس کے مملوک اور غلام ہیں اور خدام ہیں، اور کلام کی تقریر اس طرح ہے کہ عموماً لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ وہی اپنے اہل و عیال کو رزق دیتے ہیں اور خدام کو اور غلاموں کو، اور اُن کا یہ گمان غلط ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی رزاق ہیں، وہ خادم کو بھی رزق دیتے ہیں اور مخدوم کو بھی، اور مملوک کو بھی رزق دیتے ہیں اور مالک کو بھی، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کھانے اور پینے کی چیزوں کو پیدا نہ فرماتے اور انسان کے اندر غذا کو قبول کرنے کی قوت کو پیدا نہ فرماتے اور ہضم کی قوت پیدا نہ فرماتے تو کسی بھی انسان کو رزق حاصل نہ ہوتا۔

(۲) اور یہی الکلبی کا قول ہے۔ انہوں نے کہا کہ ''وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ'' سے مراد یعنی جن کو تم رزق نہیں دیتے، اس سے مراد وحشی جانور اور پرندے ہیں۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ یہ تاویل کس طرح صحیح ہوگی حالانکہ ''مَنْ'' ذوی العقول کے ساتھ خاص ہے؟

اس کے دو جواب ہیں: (۱) ''مَنْ'' کا لفظ کبھی غیر ذوی العقول کے لیے بھی بولا جاتا ہے اور اس پر دلیل اللہ عزوجل کا یہ ارشاد ہے: ''وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰۤى اَرْبَعٍ ؕ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۞ (النور: ۴۵)'' (اور اللہ نے ہر جانور کو پانی سے پیدا فرمایا، پس اُن میں سے کچھ تو اپنے پیٹ کے بل رینگتے ہیں، کچھ دو پاؤں پر چلتے ہیں اور کچھ چار پاؤں پر، اللہ جو چاہتے ہیں پیدا فرماتے ہیں، بے شک اللہ جو چاہیں اس پر قادر ہیں O)۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے تمام زمین پر چلنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے ذمہ رزق ثابت فرمایا ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۞ (ہود: ۶)'' (اور زمین پر چلنے پھرنے والے تمام جانداروں کا رزق اللہ ہی (کے ذمہ کرم) پر ہے، اللہ اُن کے دنیا میں ٹھہرنے کی جگہ کو اور موت کے بعد ان کو سپرد کیے جانے کی جگہوں کو جاننے والے ہیں، ہر چیز لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہے O)۔ پس گویا کہ ضرورت کے وقت ہر جاندار اپنے خالق سے اپنے رزق کو طلب کرتا ہے، تو اس طرح ہر جاندار اس جہت سے ذوی العقول کے مشابہ ہو گیا ہے، لہٰذا اس کا ذوی العقول کے ساتھ ذکر کرنا بعید نہیں ہے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰۤاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۞ (النمل: ۱۸)'' (یہاں تک کہ جب وہ چیونٹیوں کی وادی کے پاس آئے تو (اُن کی ملکہ) چیونٹی نے کہا: ''اے چیونٹیو! اپنے اپنے بلوں میں گھس جاؤ، کہیں سلیمان اور ان کے لشکر بے خبری میں تمہیں کچل نہ ڈالیں O)۔ چیونٹیاں بھی غیر ذی العقول ہیں لیکن اُن کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذوی العقول کا صیغہ استعمال فرمایا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول بتوں کے متعلق نقل فرمایا ہے: ''فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْۤ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۞ (الشعراء: ۷۷)'' (پس بے شک یہ بت میرے دشمن ہیں لیکن تمام جہانوں کے پالنے والے میرے دوست ہیں O)۔ اور اس آیت میں بھی ''اِنَّهُمْ'' ذوی العقول کے لیے ہے، لیکن اس کا اطلاق بتوں پر فرمایا ہے جو غیر ذوی العقول ہیں، سو اسی طرح یہاں پر بھی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ جو لفظ ذوی العقول کے لیے مختص ہو اس کا اطلاق وحشی جانوروں اور پرندوں پر کرنا بعید نہیں ہے، کیونکہ وہ بھی اس جہت سے عقلاء کے مشابہ ہیں۔ اور میں نے ایک حکایت میں سنا ہے کہ جب وادیوں میں اور پہاڑوں میں پانی کم ہو گیا اور اس سال گرمی بہت زیادہ ہو گئی تو بعض لوگوں نے دیکھا کہ وحشی جانوروں نے پیاس کی شدت سے اپنے سر آسمانوں کی طرف اٹھائے، انہوں نے بیان کیا: پس میں نے دیکھا بادل امڈ آئے اور برسنے لگے، یہاں تک کہ تمام وادیاں پانی سے بھر گئیں۔

(۳) ہم ''وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ'' کو باندیوں اور غلاموں پر محمول کرتے ہیں، اور وحشی جانوروں اور پرندوں پر۔ اسی لیے غیر ذوی العقول پر ذوی العقول کو غلبہ دے کر اُن پر لفظ ''مَنْ'' کا اطلاق کر دیا جو کہ ذوی العقول کے لیے ہے۔

دوسرا مسئلہ: ''وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ'' کا ضمیر مجرور پر عطف کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ ضمیر مجرور پر عطف نہیں کیا جاتا، یہ نہیں کہا

جاءَ "اَخَذْتُ مِنْكَ وَزَیْدٍ" مگر جب کہ حرف جر کو دوبارہ لایا جائے جیسے اَخَذْتُ مِنْكَ وَمِنْ زَیْدٍ جیسے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ وَّ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِیْسَى ابْنِ مَرْیَمَ ۪ وَ اَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّیْثَاقًا غَلِیْظًا ۝ (الاحزاب:۷)" (اور اے رسولِ اکرم! اس وقت کو یاد کیجئے جب ہم نے تمام انبیاء سے (عموماً) اور آپ سے، نوح، ابراہیم، موسیٰ اور مریم کے بیٹے عیسیٰ (سے خصوصاً) وعدہ لیا، اور ہم نے ان سے پختہ وعدہ لیا ۝)۔

اس آیت میں بھی مِنْكَ پر حرف جر کے اعادہ سے عطف کیا گیا ہے، یعنی وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ہمارے پاس ہی ہر چیز کے خزانے ہیں اور ہم اس کو صرف معیّن مقدار کے مطابق ہی نازل فرماتے ہیں ۝" (الحجر:۲۱)

آیاتِ سابقہ سے ارتباط اور توحید کے دلائل کی چوتھی قسم

اس سے پہلے اللہ عزوجل نے بیان فرمایا تھا کہ انہوں نے زمین میں ہر مناسب چیز پیدا فرمائی ہے اور انہوں نے زمین میں اسبابِ معیشت مقرر فرمائے ہیں۔ اب اس کے بعد اس چیز کو ذکر فرمایا جو اس پیدائش کے سبب کے حکم میں ہے، پس فرمایا: "وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآىٕنُهٗ ۤ وَ مَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ"۔ اور یہ توحید کے دلائل مذکورہ میں سے چوتھی قسم ہے۔

الواحدی رحمہ اللہ نے ذکر کیا کہ الخزائن، الخزانۃ کی جمع ہے اور خزانہ اس جگہ کو کہتے ہیں جس میں کسی چیز کو حفاظت کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ نیز خزانہ، خازن کا محل ہوتا ہے، اور عام مفسرین نے کہا ہے کہ "وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآىٕنُهٗ" سے مراد بارش ہے، کیونکہ بارش رزق مہیا فرمانے اور بنوآدم اور دیگر پرندوں اور وحشی جانوروں کے رزق اور معیشت کا سبب ہے، پس جب اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کو سامانِ معیشت عطا فرماتے ہیں تو بیان فرمایا کہ بارش کے خزانے ہی معیشت کا سبب ہیں۔

"وَ مَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ عزوجل اتنی مقدار میں بارش نازل فرماتے ہیں جو لوگوں کے لیے اور حیوانات کے لیے کافی ہو۔ اور حکم نے کہا کہ کسی سال دوسرے سال سے زیادہ بارش نہیں ہوتی لیکن ایک قوم پر بارش ہوتی ہے اور دوسری قوم بارش سے محروم رہتی ہے، اور بسا اوقات بارش سمندروں میں ہوتی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ہر سال ایک معلوم اندازے کے مطابق بارش نازل فرماتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ جس کی طرف چاہتے ہیں، جتنی چاہتے ہیں بارش کو لے جاتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ کسی سال دوسرے سال سے زیادہ بارش نہیں ہوتی لیکن اللہ تعالیٰ جس طرح چاہتے ہیں ایک سال میں بارش کو تقسیم فرماتے ہیں، پھر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی: "وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآىٕنُهٗ ۤ وَ مَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ"۔

(سنن بیہقی ج ۳ ص ۳۶۳، جامع البیان، ج ۳ ص ۳۰، دار عالم الکتب، بیروت، ۱۴۳۲ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ہم ہی ایسی ہوائیں چلاتے ہیں جو (بادلوں کے پانی سے) بھری ہوئی ہوتی ہیں، پس ہم آسمان سے بارش نازل فرماتے ہیں، سو تم کو وہ پانی پلاتے ہیں جب کہ تم اس پانی کو جمع کرنے

والے نہ تھے O" (الحجر: ۲۲)

دلائلِ توحید کی پانچویں قسم

"وَأَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ": (اور ہم ہی ایسی ہوائیں چلاتے ہیں جو (بادلوں کے پانی سے) بھری ہوئی ہوتی ہیں۔

"لَوَاقِحَ" کے متعلق مفسرین کے اقوال

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ہوائیں درختوں اور بادلوں کے لیے پانی مہیا کرنے والی ہوتی ہیں، اور یہی حسن بصری، قتادہ اور الضحاک کا قول ہے۔ اور ان کے قول کی اصل یہ ہے کہ جب اونٹنی میں اس کا نر نطفہ ڈال دے اور وہ اونٹنی حاملہ ہو جائے تو عرب کہتے ہیں "لقحت الناقة" یعنی اونٹنی نر کے پانی سے بوجھل ہو گئی ہے۔ اسی طرح بارش برسانے والی ہوائیں بادلوں کے لیے نر کے قائم مقام ہیں۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: اللہ تعالیٰ بارش برسانے والی ہواؤں کو بھیجتے ہیں تا کہ وہ بادلوں میں پانی ڈال دیں، پس بادلوں میں پانی ڈال دیا جاتا ہے، پھر وہ بادل نچڑتا ہے اور اس پانی کو پھیلاتا ہے اور یہی بادلوں میں پانی ڈالنے کی تفسیر ہے۔ اور رہا درختوں میں پانی ڈالنے کی تفسیر تو اس کی توجیہ یہ ہے کہ عرب کہتے ہیں "ابقل النبت" یعنی سبزہ پھل دار ہو گیا، اور یہ اس پر دلیل ہے کہ ان پر پانی ڈالا جاتا ہے۔

کھجوروں کے درختوں میں پیوند کاری کی تحقیق

موسیٰ بن طلحہ اپنے والد رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ کچھ لوگ کھجوروں کے پاس تھے، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان لوگوں کے پاس سے گزرا، آپ نے فرمایا: یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ انہوں نے کہا: یہ لوگ کھجوروں میں پیوند لگا رہے ہیں۔ یعنی نر کھجوروں کو مادہ کھجور کے ساتھ ملاتے ہیں جس سے وہ پھل دار ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے گمان میں یہ عمل ان کو کسی چیز سے مستغنی نہیں کرے گا۔ جب ان صحابہ کو آپ کے اس ارشاد کی خبر ہوئی تو انہوں نے یہ عمل ترک کر دیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس عمل کی خبر ہوئی تو آپ نے فرمایا: اگر ان کو اس عمل میں فائدہ ہے تو کرتے رہیں۔ میں نے اپنے گمان سے ایک بات کہی تھی سو تم میرے گمان پر عمل مت کرو۔ البتہ جب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکم بیان کروں تو اس پر عمل کرو، کیونکہ میں اللہ پر جھوٹ بولنے والا نہیں ہوں۔ (صحیح مسلم، فضائل: ۱۳۹، رقم الحدیث: ۲۳۶۱، الرقم المسلسل: ۶۰۱۱، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۴۷۰)

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت مدینہ میں تشریف لائے تو صحابہ کرام کھجوروں میں پیوند لگاتے تھے۔ آپ نے فرمایا: تم یہ عمل کس لیے کرتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہم اسی طرح کیا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا: شاید تم نہ کرو تو اس میں زیادہ بہتری ہو۔ انہوں نے اس عمل کو ترک کر دیا تو پھر کھجوروں کی پیداوار کم ہو گئی۔ انہوں نے آپ سے اس کا ذکر کیا، آپ نے فرمایا: میں صرف بشر ہوں (یعنی خدا نہیں ہوں) جب میں تمہارے دین کے متعلق کسی چیز کا حکم دوں تو اس پر عمل کرو اور جب میں اپنی رائے سے تم کو کسی چیز کا حکم دوں تو میں صرف بشر ہوں (خدا نہیں ہوں)۔

(صحیح مسلم، الفضائل: ۱۴۰، رقم بلا تکرار: ۲۳۶۲، الرقم المسلسل: ۶۰۱۲)

اس اشکال کا جواب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ کے مطابق صحابہ نے عمل کیا تو کھجوروں کی پیداوار کم ہوئی

ملا علی بن سلطان محمد القاری المتوفی ۱۰۱۴ھ لکھتے ہیں:

یہاں پر یہ اشکال کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو کھجور کے درختوں میں پیوند لگاتے ہوئے دیکھا، آپ نے فرمایا: کاش! تم یہ طریقہ ترک کردو۔ انصار نے اس کو ترک کر دیا، پھر کوئی پیداوار نہیں ہوئی یا ردی کھجوریں پیدا ہوئیں۔ تب آپ نے فرمایا: تم اپنے دنیاوی معاملات کو خود ہی زیادہ جانتے ہو۔

اس کا ایک جواب یہ ہے کہ آپ نے یہ اپنے گمان سے کہا تھا وحی سے نہیں کہا تھا۔ اور شیخ سیدی محمد سنوسی نے کہا ہے کہ آپ صحابہ کو توکل پر برانگیختہ کرنا چاہتے تھے، جب انہوں نے آپ کے کہنے پر عمل نہیں کیا تو آپ نے فرمایا: تم اپنے دنیاوی معاملات کو خود ہی زیادہ جانتے ہو، اور اگر وہ آپ کے کہنے پر عمل کرتے اور ایک یا دو سال تک نقصان برداشت کرتے تو وہ پیوند کاری کی مشقت سے بچ جاتے۔ یہ جواب انتہائی لطیف ہے۔ (سیدی غوث عبد العزیز دباغ رحمہ اللہ کے جواب کا بھی یہی خلاصہ ہے)۔

(شرح الشفاء علی ہامش نسیم الریاض، ج ۳ ص ۲۶۳، دار الفکر، بیروت)

"فَاَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسۡقَیۡنٰكُمُوۡهُ": اس آیت میں کئی مباحث ہیں:

الاول: بارش کا پانی آسمان سے نازل ہوتا ہے یا بادل کے پانی سے نازل ہوتا ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ وہ پانی بادل سے نازل ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے بادل کے اوپر آسمان کے لفظ کا کیسے اطلاق فرمایا؟

الثانی: بارش کے حصول کا سبب وہ نہیں ہے جو فلاسفہ بیان کرتے ہیں بلکہ بارش کے حصول کا سبب یہ ہے کہ فاعل مختار بارش کو بادل سے زمین کی طرف نازل فرماتے ہیں تاکہ بندوں پر احسان فرمائیں جیسا کہ یہاں فرمایا: "فَاَسۡقَیۡنٰكُمُوۡهُ" یعنی ہم نے تم کو پانی پلایا۔

"وَمَاۤ اَنۡتُمۡ لَهٗ بِخٰزِنِیۡنَ": یعنی جو پانی آسمان سے نازل ہوتا ہے تم اس کو جمع کرنے والے نہیں تھے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے "الریح الجنوب من الجنة" اور یہ وہ ہوا ہے جو پانی سے بوجھل ہوتی ہے، اور یہی وہ ہوا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ذکر فرمایا ہے کہ اس میں لوگوں کے لیے منافع ہیں۔ (ابو الشیخ: ۸۰۳-۸۰۵، تفسیر الطبری، ج ۱۳ ص ۳۶، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۳۲ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور بے شک ہم ہی زندہ فرماتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہم ہی سب کے فنا ہونے کے بعد باقی ہیں O" (الحجر: ۲۳)

دلائل توحید کی چھٹی قسم

"وَاِنَّا لَنَحۡنُ نُحۡیٖ وَ نُمِیۡتُ وَ نَحۡنُ الۡوٰرِثُوۡنَ": (بے شک ہم ہی زندہ فرماتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہم ہی سب کے فنا ہونے کے بعد باقی ہیں)۔ اس آیت سے یہ ثابت فرمایا ہے کہ ان حیوانات کو زندہ کرنا اور ان کو مارنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہاں پر ایک فاعل مختار ہے جو زندہ کرنے اور مارنے پر قادر ہے، اور وہی اللہ عزوجل ہیں۔

بعض مفسرین نے کہا کہ نباتات میں زندہ کرنے اور مارنے کا معنی مجاز ہے، اس لیے اس کی تخصیص حیوانات کو زندہ کرنے اور

حیوانات کے مارنے کے ساتھ کرنی واجب ہے، اور جب کہ دلائل عقلیہ سے یہ ثابت ہے کہ حیات کی تخلیق اللہ عزوجل کے سوا اور کسی کے لیے متصور نہیں ہے تو حیوانات میں حیات کا حصول اللہ تعالیٰ کے وجود پر قطعی دلیل ہے۔ اور اللہ عزوجل نے فرمایا: "وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْیٖ وَنُمِیْتُ" اس سے حصر مستفاد ہوتا ہے، یعنی زندہ فرمانے اور مارنے کی قدرت صرف ہمارے لیے ہے، اور فرمایا: "وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ" اس کا معنی یہ ہے کہ جب تمام مخلوقات مر جائیں گی تو موت کے وقت ہر ایک کی سلطنت زائل ہو جائے گی اور صرف اللہ عزوجل ہی باقی رہیں گے اور وہی تمام مملوکات کے برحق مالک ہیں، اور یہ ایک طرح سے وراثت کے مشابہ ہے، پس گویا کہ سب مخلوق کے ختم ہونے کے بعد صرف اللہ عزوجل ہی وارث باقی رہیں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور بے شک ہم اُن لوگوں کو بھی جانتے ہیں جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور ہم اُن کو بھی جانتے ہیں جو تمہارے بعد آنے والے ہیں O" (الحجر: ۲۴)

"وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِیْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِیْنَ": اس آیت کی تفسیر میں متعدد وجوہ ہیں:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "اَلْمُسْتَقْدِمِیْنَ" سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والے، اور "اَلْمُسْتَاْخِرِیْنَ" سے مراد ہے جو لوگ اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں کرتے تھے۔

(۲) "اَلْمُسْتَقْدِمِیْنَ" سے مراد ہے: نمازیوں کی جماعت میں سے صفِ اول۔ اور "اَلْمُسْتَاْخِرِیْنَ" سے مراد ہے آخری صف۔ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفِ اول میں نماز پڑھنے کی ترغیب فرمائی تو صفِ اول میں بہت زیادہ بھیڑ ہو گئی، پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، اور اس کا معنی یہ ہے کہ ہم لوگوں کو اُن کی نیات کے اعتبار سے اجر و ثواب عطا فرماتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اذان دینے میں اور صف اول میں نماز پڑھنے میں کتنا اجر و ثواب ہوتا ہے، پھر ان کو قرعہ اندازی کے سوا اس میں موقع نہ ملے تو وہ ضرور اس کے لیے قرعہ اندازی کریں گے اور اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ ظہر کی نماز پڑھنے میں کتنا اجر و ثواب ہے تو وہ ہر صورت میں اس کی طرف سبقت کریں گے۔

(صحیح البخاری: ۶۵۳، سنن ترمذی: ۲۲۵، موطا امام مالک: ۱۸۱، مصنف عبد الرزاق: ۲۰۰۷، مسند احمد ج ۲ ص ۲۳۶، مسند ابو عوانہ ج ۱ ص ۳۳۲، صحیح ابن حبان: ۱۶۵۹، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۱ ص ۴۲۸، شرح السنۃ: ۳۸۳)

(۳) الضحاک اور مقاتل نے کہا: یہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کی صفت ہے۔

(۴) ابو الجوزاء نے روایت کی ہے کہ ایک حسین عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھتی تھی اور مسلمانوں میں سے کچھ لوگ پہلی صف میں نماز پڑھتے تھے تاکہ وہ اس عورت کو نہ دیکھیں، اور کچھ لوگ آخری صف میں نماز پڑھتے تھے تاکہ اس عورت کو دیکھیں، پس جب وہ رکوع میں جاتے تو اپنی بغلوں کے نیچے سے دیکھتے تھے، تب اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی۔

(میں کہتا ہوں کہ ابو الجوزاء کی اس روایت کو یہاں نقل کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ اس سے لوگ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق بدگمانی کریں گے کہ وہ نماز میں خوبصورت عورتوں کی طرف دیکھنے کے لیے حیلہ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان مفسرین کی اس لغزش سے درگزر فرمائیں۔ سعیدی غفرلہٗ)

(۵) "اَلْمُسْتَقْدِمِيْنَ" سے مراد ہیں مُردے، اور "اَلْمُسْتَاْخِرِيْنَ" سے مراد ہیں زندہ لوگ۔ اور ایک قول یہ ہے کہ "اَلْمُسْتَقْدِمِيْنَ" سے مراد ہے سابقہ امتیں اور "اَلْمُسْتَاْخِرِيْنَ" سے مراد ہے سیدنا محمد ﷺ کی امت۔ اور عکرمہ نے کہا: "اَلْمُسْتَقْدِمِيْنَ" وہ ہیں جو پیدا ہو چکے ہیں اور "اَلْمُسْتَاْخِرِيْنَ" سے مراد وہ ہیں جو ابھی تک پیدا نہیں ہوئے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور بے شک آپ کے رب ہی انہیں حساب کے لیے جمع فرمائیں گے، بے شک وہی عظیم حکمت والے، سب کچھ جاننے والے ہیں ○" (الحجر: ۲۵)

"وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ۚ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ": اس آیت سے اس پر تنبیہ فرمائی ہے کہ حشر اور نشر اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ فرمانا اور قیامت کا واقع ہونا یہ سب امور واجب ہیں، اور اللہ تعالیٰ حکیم، علیم ہیں یعنی وہ اپنی حکمت کے تقاضے سے حشر اور نشر کو واجب فرماتے ہیں۔ (تفسیر کبیر، ج ۷، ص ۱۲۹۔۱۳۶، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵، وتفاسیر اخری)

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۶﴾

اور بے شک ہم نے انسان کو بجنے والی خشک مٹی سے پیدا فرمایا جو (پہلے) سیاہ بدبودار گارا تھی ○

وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾

اور اس سے پہلے جنات کو دھوئیں کی ملاوٹ سے خالی آگ سے پیدا فرمایا ○

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾

اور (اے رسول اکرم!) یاد کیجئے جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا: "میں بشر کو بجنے والی خشک مٹی سے پیدا فرمانے والا ہوں جو (دراصل) سیاہ بدبودار گارا تھی ○"

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۲۹﴾

پس جب میں اس کو (انسانی صورت میں) ڈھال دوں اور اس میں اپنی پسندیدہ روح سے پھونک دوں، تو تم سب اس کے سامنے تعظیماً سجدہ میں گر جانا ○

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۳۰﴾

پس تمام کے تمام فرشتے سجدہ میں گر گئے ○

اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۱﴾

سوائے ابلیس کے، اس نے سجدہ کرنے والوں کے ساتھ ہونے سے انکار کر دیا ○

قَالَ یٰۤاِبْلِیْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ ﴿۳۲﴾

اللہ نے فرمایا: "اے ابلیس! کیا سبب ہے کہ تو سجدہ کرنے والوں کے ساتھ نہیں ہوا؟" ○

قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۳۳﴾

اس نے کہا: "میں اس بشر کو سجدہ کرنے والا نہیں ہوں جس کو آپ نے بجنے والی خشک مٹی سے پیدا فرمایا ہے جو (دراصل) سیاہ بدبودار گارا تھی" ○

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِیْمٌ ﴿۳۴﴾

اللہ نے فرمایا: "تو اس سے نکل جا! کیونکہ تو مردود ہے" ○

وَّاِنَّ عَلَیْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى یَوْمِ الدِّیْنِ ﴿۳۵﴾

اور بے شک تجھ پر قیامت کے دن تک لعنت رہے گی" ○

قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْۤ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿۳۶﴾

اس نے کہا: "اے میرے رب! پس مجھے اس دن تک مہلت دیجیے جب لوگ (قبروں سے) اٹھائے جائیں" ○

قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ﴿۳۷﴾

فرمایا: "بے شک تو اُن لوگوں میں سے ہے جنہیں مہلت عطا فرمائی گئی ہے" ○

اِلٰى یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۳۸﴾

بے شک تجھے وقتِ معلوم تک مہلت عطا فرمائی گئی ہے ○

قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَغْوَیْتَنِیْ لَاُزَیِّنَنَّ لَهُمْ فِی الْاَرْضِ وَ لَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۳۹﴾

اس نے کہا: "اے میرے رب! کیونکہ آپ نے مجھے گمراہ کردیا ہے تو میں ضرور بہ ضرور اُن (انسانوں) کے لیے گناہوں کو زمین میں خوشنما بنادوں گا اور میں ضرور بہ ضرور اُن سب کو گمراہ کردوں گا" ○

اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ ﴿۴۰﴾

سوائے آپ کے اُن بعض بندوں کے جو مخلص ہیں ○

قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَیَّ مُسْتَقِیْمٌ ﴿۴۱﴾

فرمایا: یہ (اخلاص) ہی مجھ تک (پہنچنے کا) سیدھا راستہ ہے O

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ﴿۴۲﴾

بے شک میرے (مخلص) بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا سوا اُن گمراہوں کے جنہوں نے تیری پیروی کی O

وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۴۳﴾

اور بے شک جہنم ان سب کے لیے ضرور وعید (پوری ہونے) کی جگہ ہے O

لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ؕ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴿۴۴﴾

اس جہنم کے سات دروازے ہیں، اور ہر دروازے کے لیے گمراہوں کا حصہ مخصوص فرمایا گیا ہے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور بے شک ہم نے انسان کو بجنے والی خشک مٹی سے پیدا فرمایا جو (پہلے) سیاہ بدبودار گارا تھی O" (الحجر:۲۶)

الصلصال کے معنی کی تحقیق

علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ، الحجر: ۲۶ تا ۴۴ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ": یعنی حضرت آدم علیہ السلام۔ "مِنْ صَلْصَالٍ": یعنی خشک مٹی سے پیدا فرمایا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے روایت ہے کہ "الصلصال" اس گرم مٹی کو کہتے ہیں جس میں ریت کی آمیزش کی گئی ہو، پس وہ خشک ہو کر بجنے لگتی ہے، اور جب اس کو آگ میں پکایا جائے تو وہ ٹھیکرا بن جاتی ہے۔ اور یہی ابوعبیدہ کا قول ہے اور اکثر مفسرین کا بھی مختار ہے۔ اور مجاہد نے کہا: یہ بدبودار مٹی ہے اور اسی کو الکسائی نے اختیار کیا ہے کہ جب گوشت بدبودار ہو جائے تو کہتے ہیں "صل اللحم واصل" خواہ وہ گوشت پکا ہوا ہو یا کچا ہو۔ اور "طِیْنٌ صَلَّالٌ وصلصال" کہا جاتا ہے جب تم اس میں سوراخ کرو تو اس سے لوہے کی طرح آواز آتی ہے۔

"حَمَاٍ" اور "مَّسْنُوْنٍ" کے معنی

"مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ": پس ابتداء میں وہ متفرق الاجزاء مٹی تھی، پھر جب اس کو بھگویا گیا تو وہ "طِیْن" ہو گئی، پھر جب اس کو چھوڑ دیا گیا حتیٰ کہ وہ بدبودار ہو گئی تو پھر وہ "حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ" ہو گئی، یعنی خشک ہو کر متغیر ہو گئی اور پھر بجنے لگی، یہ جمہور کے قول کے موافق ہے۔ اور سورۃ البقرہ میں اس کی تفسیر گزر چکی ہے۔ اور "الحمأ" سیاہ مٹی کو کہتے ہیں، اسی طرح "الحماة" بھی کہتے ہیں۔ اور "حمئت البئر حماة" کہتے ہیں جب اس کی سیاہی اکھاڑ لی جائے، اور "حَمِئَتِ الْبِئْرُ حَمَأَةً" کہتے ہیں جب اس کی سیاہی زیادہ ہو جائے۔ اور "المسنون" کا معنی ہے المتغیر۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ گیلی مٹی ہے جو بدبودار ہو جائے، پھر وہ خشک ہو کر ٹھیکرے کی طرح بجنے لگی ہے۔ اور مجاہد اور قتادہ دونوں نے کہا: اس کا معنی ہے المتغیر جب پانی متغیر ہو جائے تو کہتے

ہیں "اٰسِنَ السَّائِغُ" اور اسی سے ماخوذ ہے "یَتَسَنَّہْ" (البقرہ:۲۵۹)" اور "مَّآءٍ غَیْرِ اٰسِنٍ" (محمد:۱۵)"۔

اور الفراء نے کہا: اس کا معنی ہے المتغیر اس کی اصل عرب کے اس قول سے ہے "سَنَنْتُ الحجر علی الحجر" جب ایک پتھر کو دوسرے پتھر پر مارا جائے۔

اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: "المسنون" کا معنی ہے المصبوب یعنی جو بہایا گیا ہو۔ یعنی جب تم پانی کو بہاؤ تو عرب کہتے ہیں "سَنَنْتُ السائغ"۔ اور "السَّنّ" کا معنی ہے الصب یعنی بہانا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ المصبوب وہ ہے جو تازہ ہو، اور یہی المصبوب کے معنی میں ہے کیونکہ وہی چیز المصبوب ہو گی جو تر و تازہ ہو۔

اور جس نے کہا کہ الصلصال کا معنی ہے بدبودار، تو اس کی اصل صَلال سے ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اس سے پہلے جنات کو دھوئیں کی ملاوٹ سے خالی آگ سے پیدا فرمایاO" (الحجر:۲۷)

"جنات" کی تخلیق

"وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ": یعنی حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے۔ حسن بصری نے کہا: ابلیس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے پیدا فرمایا اور اس کا نام "جانًا" رکھا گیا، کیونکہ وہ آنکھوں سے چھپا ہوا ہوتا ہے۔ (اور "جنّ" کا معنی ہے: جو آنکھوں سے چھپا ہوا ہو)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی جنت میں صورت بنائی تو جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا اُن کو چھوڑے رکھا، پس ابلیس اُن کے پتلے کے گرد آ کر گھومنے لگا، وہ دیکھ رہا تھا کہ یہ کیا چیز ہے؛ پس جب ابلیس نے دیکھا کہ یہ پتلا کھوکھلا ہے تو اس نے جان لیا کہ یہ ایسی مخلوق ہے جو بے قابو ہو گی۔

(صحیح مسلم:۲۶۱۱، الرقم المسلسل:۶۵۹۳، رقم حدیث الباب:۱۱۱، مسند ابوداؤد والطیالسی:۲۰۲۳، الاسماء والصفات للبیہقی ص ۳۸۶)

"نَّارِ السَّمُوْمِ" کا مصداق

"مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ": حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "نارِ سموم" وہ آگ ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے جنات کو پیدا فرمایا، یہ جہنم کی آگ کے ستر (۷۰) اجزاء میں سے ایک جزو ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "السَّمُوْم" وہ سخت گرم ہوا ہے جو انسانوں کو جھلسا دیتی ہے، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی روایت ہے کہ یہ ایسی آگ ہے جس میں دھواں نہیں ہے۔ اور الصواعق بھی اسی آگ سے بنائے جاتے ہیں۔ یہ وہ آگ ہے کہ آسمان اور اس کے درمیان حجاب ہوتے ہیں، جب اللہ تعالیٰ کوئی چیز پیدا فرماتے ہیں تو حجابات کھل جاتے ہیں اور اس سے صاعقہ نکلتی ہے۔

اور حسن بصری نے کہا: "نَّارِ السَّمُوْمِ" وہ آگ ہے جس کے مقابلہ میں حجاب نہیں ہوتا، اور یہ وہی ہے جو تم بادل کے گرجے کی آواز سنتے ہو۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی روایت ہے کہ ابلیس ملائکہ کی اقسام میں سے ایک قسم ہے جس قسم کو

"الجن" کہا جاتا ہے۔ اُن کو فرشتوں کو "نَارِ السَّمُوْمِ" سے پیدا فرمایا گیا ہے۔ اور قرآن مجید میں جس "جن" کا ذکر فرمایا گیا ہے ایسا ہے جس کو خالص شعلے سے پیدا فرمایا گیا ہے۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں: اس قول پر اعتراض ہے کیونکہ اس کے ثبوت کے لیے ایسی سند کی ضرورت ہے جو عذر کا قلع قمع کر دے، کیونکہ اس قسم کی بات کو رائے سے نہیں کہا جا سکتا۔

جنات کو آگ سے پیدا فرمانے کے متعلق حدیث

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فرشتوں کو نور سے پیدا فرمایا گیا ہے، اور جنات کو آگ کے شعلے سے پیدا فرمایا گیا ہے، اور آدم علیہ السلام کو اس سے پیدا فرمایا گیا ہے جو تمہارے لیے بیان فرمایا گیا ہے۔

(صحیح مسلم: ۲۹۹۶، الرقم المسلسل: ۷۳۲۰، رقم حدیث الباب: ۶۰، تفسیر عبدالرزاق: ۱۶۷۸، مسند اسحاق بن راہویہ: ۷۸۶، مسند احمد: ۲۵۱۹۴، المنتخب من مسند عبد بن حمید: ۱۴۷۹، الاسماء والصفات للبیہقی: ۸۱۸، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۱۷۷۰۹، شعب الایمان للبیہقی: ۱۴۰، معجم ابن عساکر: ۳۶۸، کشف المشکل: ۲۶۲۹، الجامع الصحیح للسنن والمسانید ج ۱ ص ۱۷۲، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشر ج ۲ ص ۸، ج ۲ ص ۳۱۱)

وہب بن منبہ سے سوال کیا گیا کہ "جن" کیا چیز ہیں اور کیا وہ کھاتے ہیں اور کیا پیتے ہیں، یا مرتے ہیں یا نکاح کرتے ہیں؟ تو انہوں نے کہا: اُن کی کئی اجناس ہیں، رہے خالص الجن تو وہ صرف ہوا ہیں، نہ کھاتے ہیں، نہ پیتے ہیں اور نہ مرتے ہیں اور نہ اُن میں توالد اور تناسل ہوتا ہے، اور اُن میں سے بعض اجناس کھاتے ہیں اور پیتے ہیں اور نکاح کرتے ہیں اور مرتے ہیں۔

(کتاب العظمۃ لابی الشیخ: ۱۰۹۵، تفسیر الطبری ج ۱۴ ص ۶۵، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۳۳ھ)

(علامہ ابن الاثیر نے کہا ہے: یہی وہ جنات ہیں جو مختلف صورتوں میں متشکل ہو جاتے ہیں۔ النہایہ ج ۳ ص ۳۹۶)۔

"مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ" کا معنی

علامہ اسماعیل بن حماد الجوہری الشافعی المتوفی ۳۹۸ھ، لکھتے ہیں:

"مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ" کا معنی ہے: ایسی آگ جس میں دھواں نہ ہو، اور اسی سے جنات پیدا فرمائے گئے ہیں۔

(مختار الصحاح ص ۹۷۹، دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۲۹ھ)

"بادِ سموم" کا معنی

اور "سموم" گرم ہوا کو کہتے ہیں، کہا جاتا ہے "سم یومنا فھو یوم مسموم" یعنی آج کا دن گرم ہواؤں والا ہے۔

امام ابوعبیدہ نے کہا: دن کے وقت چلنے والی گرم ہوا کو السموم کہتے ہیں، اور رات کے وقت چلنے والی گرم ہوا کو الحرور کہتے ہیں، القشیری نے کہا: گرم ہوا کو سموم اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ بدن کے مسام میں داخل ہو جاتی ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، ج ۱۰ ص ۲۳، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور (اے رسولِ اکرم!) یاد کیجئے جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا: "میں بشر کو بجنے والی خشک مٹی سے پیدا فرمانے والا ہوں جو (دراصل) سیاہ بدبودار گارا تھی O" (الحجر: ۲۸)

"وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىٕكَةِ": اس کی تفسیر سورۃ البقرہ کی آیت: ۳۰ میں گزر چکی ہے۔

"اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے روایت ہے کہ "الصلصال" اس گرم مٹی کو کہتے ہیں جس میں ریت کی آمیزش کی گئی ہو، پس وہ خشک ہو کر بجنے لگتی ہے، اور جب اس کو آگ میں پکایا جائے تو وہ ٹھیکرا بن جاتی ہے۔

"مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ گیلی مٹی ہے جو بدبودار ہو جائے، پھر وہ خشک ہو کر ٹھیکرے کی طرح بجنے لگی ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پس جب میں اس کو (انسانی صورت میں) ڈھال دوں اور اس میں اپنی پسندیدہ روح سے پھونک دوں، تو تم سب اس کے سامنے تعظیماً سجدہ میں گر جانا O" (الحجر: ۲۹)

"فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ": یعنی جب میں اس کی خلقت اور اس کی صورت بنا دوں۔

روح کی تعریف

"وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ": النفخ کا معنی ہے: کسی چیز میں ہوا کو جاری کرنا۔ اور روح کا معنی ہے: وہ ایک جسم لطیف ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ عادت جاری فرمائی ہے کہ وہ بدن کے جسم میں حیات کو جاری فرما دیتے ہیں۔ پس "روح" اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی اپنی طرف بطور تکریم اور تشریف اضافت فرمائی ہے، جیسے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "ارضی، سمائی، بیتی، ناقۃ اللہ، شہر اللہ" (یعنی اللہ تعالیٰ کا میری زمین فرمانا، زمین کو شرف دینے کے لیے ہے)۔ اور اسی کی مثل ہے "وَ رُوْحٌ مِّنْهُ ۔۔۔ (النساء: ۱۷۱)"، اور اس کا بیان سورۃ النساء میں گزر چکا ہے اور ہم نے "کتاب التذکرۃ" میں ایسی احادیث وارد کی ہیں جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ روح ایک جسم لطیف ہے اور النفس اور الروح ایک مسمیٰ کے دو نام ہیں، اور ان شاء اللہ اس کا بیان آئے گا۔ اور جن مفسرین نے کہا کہ روح ہی حیات ہے تو اُن کی مراد یہ ہے کہ جب میں اس جسم میں حیات ڈال دوں۔

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ، لکھتے ہیں:

جمہور اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ روح ایک جسم لطیف ہے جو دیگر اجسام سے ماہیت اور صفت میں مختلف ہے، وہ روح جب بدن میں حلول کر جائے جیسے زیتون کے تیل کا زیتون میں حلول ہوتا ہے اور جیسے آگ کا حلول انگارے میں ہوتا ہے تو پھر وہ بدن میں تصرف کرتی ہے اور اسی کو "میں" یا "تم" کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ امام الحرمین کا بھی یہی مذہب ہے۔

اللقانی نے کہا ہے کہ جمہور متکلمین کا مذہب یہ ہے کہ روح ایسا جسم ہے جو دیگر اجسام سے ماہیت میں مختلف ہوتا ہے اور اسی سے اعضاء تصرف کرتے ہیں، وہ نورانی علوی ہے اور اپنی ذات میں زندہ ہے اور اعضاء کے جوہر میں نافذ ہے، جس طرح پانی کا سریان گلاب میں ہوتا ہے اور آگ کا سریان انگارے میں ہوتا ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور اس کا اعضاء میں باقی رہنا حیات ہے اور اس کا اعضاء سے منفصل ہو کر عالم ارواح کی طرف منتقل ہو جانا موت ہے۔

اور بعض محققین کا یہ مذہب ہے کہ روح کا اطلاق اس پر ہوتا ہے جو جسم لطیف ہے اور بدن میں اس کا سریان ہے جیسے گلاب کے پانی کا گلاب میں سریان ہوتا ہے، اور اس کا اطلاق امر ربانی پر ہوتا ہے، اور اسی روح کو امری سے تعبیر کیا گیا ہے، اللہ عزوجل کا

ارشاد ہے: "وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ" (بنی اسرائیل:۸۵)"۔ اور روح کا اطلاق نفسِ انسانیہ پر ہوتا ہے اور نفس ناطقہ پر بھی ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ روح ایک جوہر مجرد ہے، نہ جسم ہے اور نہ جسمانی ہے اور نہ متصل ہے اور نہ منفصل ہے اور نہ عالم میں داخل ہے اور نہ عالم سے خارج ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے انوار میں سے ایک نور ہے۔
(روح المعانی، جز ۱۴ ص ۵۸۔۵۹ ملخصا، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۷ھ)

سید ابو الاعلیٰ مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء، لکھتے ہیں:
انسان کے اندر جو روح پھونکی گئی ہے، وہ دراصل صفاتِ الٰہی کا ایک عکس یا پرتو ہے۔ حیات، علم، قدرت، ارادہ، اختیار اور دوسری جتنی صفات انسان میں پائی جاتی ہیں، جن کے مجموعے ہی کا نام روح ہے، یہ دراصل اللہ تعالیٰ ہی کی صفات کا ایک ہلکا سا پرتو ہے۔ (تفہیم القرآن ج ۲ ص ۵۰۵، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۲۰۱۲ء)

فرشتوں کو حضرت آدم علیہ السلام کے لیے سجدہ کرنے کی توجیہات

"فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ": تو تم سب اس کے سامنے سجدہ میں گر جانا۔ اور یہ سجدہ تعظیم اور تکریم ہے نہ کہ سجدہ عبادت۔ اور اللہ مالک ہے کہ جس کو چاہیں فضیلت عطا فرمائیں، پس اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو فرشتوں پر فضیلت عطا فرمائی۔
القفال نے کہا ہے کہ فرشتے حضرت آدم علیہ السلام سے افضل ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اُن کا امتحان لینے کے لیے انہیں حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم فرمایا، تا کہ وہ اُن کو بہت بڑا ثواب عطا فرمائیں، اور یہ المعتزلہ کا مذہب ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ فرشتوں کو حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے اللہ تعالیٰ کے لیے سجدہ کرنے کا حکم فرمایا اور حضرت آدم علیہ السلام اُن کے لیے بہ منزلہ قبلہ تھے۔

ابو الحسن الرمانی علی بن عیسیٰ المعتزلی المتوفی ۳۸۴ھ، الحجر: ۲۸، ۲۹، ۳۰ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:
ایک سوال یہ ہے کہ روح کیا چیز ہے؟
اس کا جواب یہ ہے کہ روح جسم رقیق روحانی ہے، جس میں وہ حیات ہے جس سے وہ زندہ ہے، پس جب روح بدن سے نکل جائے تو بدن حکم میں مردہ ہوتا ہے، اور جب روح سے حیات کی نفی ہو جائے تو وہ حقیقت میں مردہ ہوتی ہے۔
دوسرا سوال یہ ہے کہ "فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ" میں تسویہ سے کیا مراد ہے؟
اس کا جواب یہ ہے کہ ہر دو چیزوں میں سے ایک کو دوسری کے برابر کرنا، پس حضرت آدم علیہ السلام کو صورتِ انسانیہ کے برابر فرمایا گیا۔
تیسرا سوال یہ ہے کہ "نفخ" سے کیا مراد ہے؟
اس کا جواب یہ ہے کہ جب ہوا کو امتداد کے ساتھ پھونکا جائے، پس وہ نفخ ہے، پس جب اللہ عزوجل نے روح کو اس صفت میں انسان کے بدن میں جاری فرمایا تو اس میں روح کو پھونک دیا اور حضرت آدم علیہ السلام کی طرف روح کی نسبت بہ طور تکریم فرمائی ہے۔
چوتھا سوال یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا کیا معنی ہے؟
اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سجدہ تحیت و تکرمہ ہے۔ اور یہ ایسا ہے جیسا کہ قبلہ کی طرف منہ کر کے سجدہ کرتے ہیں۔
(تفسیر ابو الحسن الرمانی المعتزلی ص ۱۹۲۔۱۹۳، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۸ھ)

شیخ امین احسن اصلاحی متوفی ۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۷ء، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:
یہ حکم ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں اور جنوں کے لیے ایک امتحان تھا جس میں فرشتے کامیاب رہے لیکن ابلیس جو جنوں میں سے تھا اپنے غرور اور تکبر کی وجہ سے اس میں ناکام رہا۔ (تدبر قرآن ج ۴ ص ۳۵۸، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۴۲۳ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''پس تمام کے تمام فرشتے سجدہ میں گر گئے ○ سوائے ابلیس کے، اس نے سجدہ کرنے والوں کے ساتھ ہونے سے انکار کر دیا ○'' (الحجر: ۳۰۔ ۳۱)

ابلیس ملائکہ میں سے تھا یا جنات میں سے تھا؟

''فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ'': اس جگہ دو مسئلے ہیں:
پہلا مسئلہ: یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ابلیس کو بھی سجدہ کرنے کا حکم فرمایا گیا تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ''قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ۖ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ○ (الاعراف: ۱۲)'' (اللہ نے) فرمایا: جب میں نے تجھ کو (سجدہ کرنے کا) حکم فرمایا تھا تو کس نے تجھ کو سجدہ کرنے سے روکا؟ (ابلیس نے) کہا: میں آدم سے بہتر ہوں، تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور تو نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا ہے ○)۔
ابلیس کو سجدہ کرنے سے اس کے تکبر نے اور اپنے آپ کو بڑا سمجھنے نے روکا، پھر ایک قول یہ ہے کہ ابلیس ملائکہ سے تھا تو یہ اس کی جنس سے استثناء ہے یعنی استثناء متصل ہے۔ اور دوسرے مفسرین نے کہا کہ وہ ملائکہ سے نہیں تھا تو یہ استثناء منقطع ہے۔ اور اس کی مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: الجان سے مراد جنات کا باپ ہے اور وہ شیاطین نہیں ہیں، شیاطین ابلیس کی اولاد ہیں جو ابلیس کے ساتھ ہی مریں گے۔ اور جنات مرتے رہتے ہیں اور جنات میں سے مومن بھی ہوتے ہیں اور ان میں سے کافر بھی ہوتے ہیں، پس حضرت آدم علیہ السلام انسانوں کے باپ ہیں۔ اور ''الجان'' جنات کا باپ ہے اور ابلیس شیاطین کا باپ ہے۔ یہ تفصیل علامہ الماوردی نے ذکر کی ہے۔
دوسرا مسئلہ: ایک جنس سے دوسری جنس کا استثناء کرنا امام شافعی کے نزدیک صحیح ہے حتیٰ کہ اگر کسی شخص نے کہا: فلاں شخص کے لیے میرے ذمہ ایک کپڑا ہے یا دس کپڑے ہیں یا ایک بوری گندم ہے تو اس کا یہ قول مقبول ہوگا، اور اس کی قیمت میں سے کپڑے کی قیمت اور گندم کی قیمت ساقط کر دی جائے گی۔
''اِلَّآ اِبْلِيْسَ'': اور ابلیس جملہ ملائکہ سے تھا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ۔ (الکہف: ۵۰)'' (وہ جنات میں سے تھا، پس اس نے اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی کی)۔ سو اس آیت میں یہ استثناء منقطع ہے۔
''اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ'': اس نے سجدہ کرنے والوں کے ساتھ ہونے سے انکار کر دیا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اللہ نے فرمایا: ''اے ابلیس! کیا سبب ہے کہ تو سجدہ کرنے والوں کے ساتھ نہیں ہوا؟ ○'' (الحجر: ۳۲)

"قَالَ یٰۤاِبْلِیْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ": یعنی تیرے لیے کیا چیز مانع تھی کہ تو سجدہ کرنے والوں کے ساتھ ہو جاتا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اس نے کہا: "میں اُس بشر کو سجدہ کرنے والا نہیں ہوں جس کو آپ نے بجنے والی خشک مٹی سے پیدا فرمایا ہے جو (دراصل) سیاہ بدبودار گارا تھی O" (الحجر:۳۳)

"قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ": یعنی ابلیس نے اپنے تکبر اور حسد کو بیان کیا اور یہ بتایا کہ وہ آدم سے بہتر ہے، کیونکہ ابلیس آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ مٹی کو کھا جاتی ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اللہ نے فرمایا: "تو اس سے نکل جا! کیونکہ تو مردود ہے O" (الحجر:۳۴)

"قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا": اس میں اختلاف ہے کہ ابلیس کو کہاں سے نکلنے کا حکم فرمایا۔ ایک قول یہ ہے کہ ابلیس کو آسمان سے نکلنے کا حکم فرمایا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ جنت عدن سے نکلنے کا حکم فرمایا۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس کو ملائکہ کی جماعت سے نکلنے کا حکم فرمایا۔

"فَاِنَّكَ رَجِیْمٌ": یعنی تجھ پر آگ کے شعلے مارے جائیں گے۔ دوسرا قول یہ ہے تو ملعون اور منحوس ہے، اور اس کی پوری تفصیل سورۃ البقرہ اور سورۃ الاعراف کی آیت: ۱۲ میں گزر چکی ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور بے شک تجھ پر قیامت کے دن تک لعنت رہے گی"O (الحجر:۳۵)

"وَّاِنَّ عَلَیْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى یَوْمِ الدِّیْنِ": یعنی تجھ پر قیامت تک میری لعنت رہے گی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اس نے کہا: "اے میرے رب! پس مجھے اس دن تک مہلت دیجئے جب لوگ (قبروں سے) اٹھائے جائیں O" (الحجر:۳۶)

"قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْۤ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ": ابلیس نے قیامت تک مہلت کے سوال کرنے سے یہ ارادہ کیا کہ اس پر موت نہ آئے، کیونکہ جس دن لوگوں کو زندہ فرمایا جائے گا نہ اس دن موت ہوگی اور نہ اس کے بعد موت ہوگی۔ اس نے اپنے نفس سے عذاب کی تاخیر کا سوال کیا، جیسے جو شخص سلامتی سے مایوس ہو جائے تو وہ سوال کرتا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "فرمایا: "بے شک تو اُن لوگوں میں سے ہے جنہیں مہلت عطا فرمائی گئی ہے O" (الحجر:۳۷)

"قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ": یعنی تجھے مہلت عطا فرمائی جائے گی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "بے شک تجھے وقتِ معلوم تک مہلت عطا فرمائی گئی ہے O" (الحجر:۳۸)

"اِلٰى یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ":

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد وہ وقت ہے جب پہلی بار صور میں پھونکا جائے گا اور اس وقت تمام مخلوقات مر جائیں گی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ "الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ" سے مراد وہ وقت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ خاص فرمایا ہے، پس ابلیس اس وقت سے جاہل تھا، پس ابلیس بھی اس وقت میں مر جائے گا اور اس کو دوبارہ زندہ فرمایا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

ہے: "كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝" (الرحمٰن: ۲۶-۲۷) "(زمین پر جو کچھ ہے فنا ہونے والا ہے O اور آپ کے عظمت اور بزرگی والے رب کی ذات ہی ہمیشہ باقی رہنے والی ہے O)۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کے ابلیس کے ساتھ کلام فرمانے کا ذکر ہے، سو اللہ تعالیٰ کے کلام فرمانے کے متعلق دو توجیہیں ہیں:

ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے براہ راست کلام نہیں فرمایا بلکہ اپنے کسی رسول کی زبان سے کلام فرمایا۔

دوسری توجیہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے اس کی وعید میں تغلیظ کے طور پر کلام فرمایا۔ اور عزت افزائی اور اپنے سے قریب کرنے کے اعتبار سے کلام نہیں فرمایا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اس نے کہا: "اے میرے رب! کیونکہ آپ نے مجھے گمراہ کر دیا ہے، تو میں ضرور بہ ضرور اُن (انسانوں) کے لیے گناہوں کو زمین میں خوشنما بنا دوں گا اور میں ضرور بہ ضرور اُن سب کو گمراہ کر دوں گا" O (الحجر: ۳۹)

"قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ": شیطان نے جو کہا کہ میں انسانوں کے لیے اُن کے کاموں کو خوشنما بنا دوں گا، اس کے دو محمل ہیں: میں گناہوں کے فعل کو اُن کے لیے خوش نما بنا دوں گا۔ یا دنیا کی زیب و زینت میں انہیں الجھا کر اللہ تعالیٰ کی عبادت سے غافل کر دوں گا۔ اور "وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ" کا معنی ہے: میں اُن سب کو ہدایت کے راستہ سے گمراہ کر دوں گا۔

حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابلیس نے کہا: اے میرے رب! میں ہمیشہ بنو آدم کو گمراہ کرتا رہوں گا جب تک کہ اُن کی روحیں اُن کے جسموں میں ہوں گی، آپ نے فرمایا: جب رب عزوجل نے ارشاد فرمایا: میں ہمیشہ اُن کی مغفرت فرماتا رہوں گا جب تک وہ مجھ سے مغفرت طلب کرتے رہیں گے۔

(مسند احمد: ۱۱۲۷۹، المنتخب من مسند عبد بن حمید: ۹۳۲، المستدرک علی الصحیحین للحاکم: ۷۶۷۲، الاسماء والصفات للبیہقی: ۲۶۵، شرح السنۃ للبغوی: ۱۲۹۳، المقصد العلی فی زوائد ابی یعلی الموصلی: ۱۷۳۹، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشرۃ ج ۱ ص ۱۳۲)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "سوائے آپ کے اُن بعض بندوں کے جو مخلَص ہیں" O (الحجر: ۴۰)

"اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ": ابو ثمامہ نے بیان کیا ہے کہ الحواریون نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے "الْمُخْلَصِيْنَ" کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے فرمایا: مخلص وہ لوگ ہیں جو نیک کام کرتے ہیں اور یہ پسند نہیں کرتے کہ لوگ اُن کی تعریف کریں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "فرمایا: یہ (اخلاص) ہی مجھ تک (پہنچنے کا) سیدھا راستہ ہے" O (الحجر: ۴۱)

"قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ": حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ وہ سیدھا راستہ ہے جو اپنے چلنے والے کو جنت کی طرف لے جائے گا۔ اور اس کا معنی یہ بھی ہے کہ یہ وہ راستہ ہے جو میری طرف پہنچاتا ہے اور جو اس پر عمل کرے گا اس کو میں جزا عطا فرماؤں گا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ وہی سیدھا راستہ ہے جو دلائل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اور تیسرا قول یہ ہے کہ یہ وہی سیدھا راستہ ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اُن کی ہدایت سے ملتا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "بے شک میرے (مخلص) بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا سوا اُن گمراہوں کے جنہوں نے تیری پیروی کی O" (الحجر: ۴۲)

اس اعتراض کا جواب کہ حضرت آدم علیہ السلام بھی مخلصین میں سے ہیں پھر بھی اُن سے خطا ہو گئی

"اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِیْنَ": علماء نے کہا ہے کہ شیطان کا لوگوں کے دلوں پر تصرف نہیں ہے۔ ابن عیینہ نے کہا: یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت پر برقرار رکھا ہے اور اُن کو برگزیدہ فرمایا ہے اور اُن کو مختار فرمایا ہے اور اُن کو پسند فرما لیا ہے۔

اس پر یہ اعتراض ہے کہ البقرہ: ۳۶ میں گزر چکا ہے: "فَاَزَلَّهُمَا الشَّیْطٰنُ" (پھر شیطان نے ان دونوں کو اسی درخت کے سبب سے لغزش دے دی)۔

اس کا جواب یہ ہے کہ شیطان کا اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کے دلوں پر تصرف نہیں ہوتا اور نہ اُن کے ایمان کی جگہ پر تصرف ہوتا ہے اور نہ شیطان اُن کو کسی ایسے گناہ میں مبتلاء کر سکتا ہے جس کی توبہ نہ ہو سکے، بلکہ اگر اُن سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو توبہ اس گناہ کو زائل کر دیتی ہے اور مٹا دیتی ہے۔ اور حضرت آدم علیہ السلام کا جنت سے باہر آنا اُن کی سزا نہیں تھی۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ عزوجل نے جو شیطان سے فرمایا ہے کہ "تیرا اُن مخلص بندوں پر کوئی تصرف نہیں ہوگا" یعنی جن کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ فرما لیا ہے اُن پر تیرا کوئی تصرف نہیں ہوگا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اکثر احوال اور اکثر اوقات میں تیرا اُن پر کوئی تصرف نہیں ہوگا اور بعض اوقات میں شیطان کا بعض مخلص بندوں پر تصرف ہو جاتا ہے جیسا کہ درج ذیل حدیث میں ہے:

عبداللہ بن ابو قتادہ از والد خود روایت کرتے ہیں، انہوں نے کہا: ہم ایک رات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روانہ ہوئے تو بعض لوگوں نے کہا: یارسول اللہ! کاش! آپ ہم کو رات کے آخری حصہ میں ٹھہرا لیں، آپ نے فرمایا: مجھے خطرہ ہے کہ تم نماز کے وقت سوئے رہو گے، حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کہا: میں تم سب کو بیدار کروں گا، پھر وہ سب لیٹ گئے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اپنی سواری کی طرف ٹیک لگا لی، پھر ان کی آنکھوں پر نیند غالب آ گئی، پس وہ سو گئے، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوئے اور اس وقت سورج کا ایک کنارہ طلوع ہو چکا تھا، آپ نے فرمایا: اے بلال! تمہارا وہ قول کہاں گیا؟ انہوں نے کہا: مجھے ایسی گہری نیند آئی کہ اس سے پہلے ایسی گہری نیند نہیں آئی تھی، آپ نے فرمایا: بے شک اللہ جب چاہتے ہیں تمہاری روحوں کو قبض فرما لیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں تمہاری روحوں کو لوٹا دیتے ہیں، اے بلال! کھڑے ہو کر لوگوں کے لیے اذان دو، پھر آپ نے وضو کیا، پھر جب سورج بلند ہو گیا اور سفید ہو گیا تو آپ نے کھڑے ہو کر نماز پڑھائی۔

(صحیح البخاری: ۵۹۵، ۷۴۷۱، سنن ابوداؤد: ۴۳۹، ۴۴۰، سنن نسائی: ۸۴۵، موطا امام مالک: ۲۵، دارالمعرفہ، بیروت، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۶۶۔۶۷، السنن الکبریٰ للنسائی: ۱۱۳۴۸، سنن بیہقی ج ۲ ص ۲۱۶، کتاب الاسماء والصفات للبیہقی ص ۱۳۲، صحیح ابن خزیمہ: ۴۰۹، صحیح ابن حبان: ۱۵۷۹، مسند احمد: ۲۲۶۱۱، موسسۃ الرسالہ، بیروت)

اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ مخلصین اور کاملین پر بھی بعض اوقات شیطان کا تصرف ہو جاتا ہے، کیونکہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ مخلصین اور کاملین میں سے تھے، لیکن ایک رات اُن پر بھی نیند کا غلبہ ہو گیا اور اُن سے نماز فجر رہ گئی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور بے شک جہنم اِن سب کے لیے ضرور وعید (پوری ہونے) کی جگہ ہے O"
(الحجر: ۴۳)

"وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِیْنَ": یعنی ابلیس اور جو اس کے پیروکار ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اس جہنم کے سات دروازے ہیں، اور ہر دروازے کے لیے گمراہوں کا حصہ مخصوص فرمایا گیا ہے O" (الحجر: ۴۴)

"لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ": یعنی ہر طبق کے اوپر طبق۔ "لِكُلِّ بَابٍ": یعنی ہر طبقہ کے لیے۔ "مِنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ": یعنی ہر ایک کے لیے حصہ معلوم ہے۔

جہنم کے سات دروازوں کی ترتیب کے متعلق اقوال

امام ابواسحاق احمد المعروف بالامام الثعلبی المتوفی ۴۲۷ھ، اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: کیا تم جانتے ہو کہ دوزخ کے دروازے کس طرح ہیں؟ ہم نے کہا: جی ہاں جیسے یہ دروازے ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نہیں، لیکن وہ اس طرح ہیں، انہوں نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر مارا اور فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جنتیں زمین پر رکھی ہیں اور دوزخ کی آگ ایک دوسرے کے اوپر رکھی، سب سے نچلی آگ جہنم ہے اور اس کے اوپر لظی ہے اور اس کے اوپر الحطمہ ہے اور اس کے اوپر سقر ہے اور اس کے اوپر الجحیم ہے اور اس کے اوپر السعیر ہے اور اس کے اوپر الھاویہ ہے۔ الضحاک نے "لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ" کی تفسیر میں کہا ہے کہ دوزخ کے سات دروازے ہیں، اور یہ ایک دوسرے کے اوپر ہیں۔

جہنم کے سات دروازوں کے مصادیق

پہلا دروازہ اہلِ توحید کے لیے ہے، اُن کو اُن کے برے اعمال کے اعتبار سے دوزخ میں عذاب دیا جائے گا، اور دنیا میں اُن کی عمروں کے اعتبار سے، پھر اُن کو نکال لیا جائے گا۔ دوسرے دروازے میں یہودی ہیں۔ اور تیسرے دروازے میں نصاریٰ ہیں۔ چوتھے دروازے میں الصابئون ہیں۔ پانچویں دروازے میں المجوس ہیں۔ چھٹے دروازے میں مشرکین عرب ہیں اور ساتویں دروازے میں المنافقون ہیں، جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: "اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِیْرًا ۝ (النساء: ۱۴۵)" (بے شک منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے اور آپ اُن کے لیے کوئی مددگار نہیں پائیں گے O)۔

جہنم کے سات دروازوں کے خوف سے سات غلام آزاد کرنے والی عورت کے لیے بشارت

ابوریاح نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کی ایک مسجد میں تنہا نماز پڑھ رہے تھے، آپ کے پاس سے ایک اعرابیہ عورت گزری، اس نے یہ چاہا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے

دو رکعت نماز پڑھے، پس وہ داخل ہوئی اور اس نے نماز پڑھی اور رسول اللہ ﷺ کی اس کی طرف توجہ نہیں تھی، پھر رسول اللہ ﷺ نے قرآن مجید پڑھا حتیٰ کہ اس آیت پر پہنچے: ''وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ۝ (الحجر: ۴۳-۴۴)'' تو وہ اعرابیہ عورت بے ہوش کر گر گئی، رسول اللہ ﷺ نے اس کے گرنے کی آواز سنی، آپ نماز سے اس کی طرف مڑے اور آپ نے فرمایا: اے بلال! میرے پاس پانی لاؤ، پس حضرت بلال رضی اللہ عنہ پانی لے کر آئے، رسول اللہ ﷺ نے اس کے چہرہ پر پانی ڈالا حتیٰ کہ اس کو ہوش آ گیا اور وہ بیٹھ گئی، پس رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: اے عورت اب تمہارا کیا حال ہے، اس اعرابیہ عورت نے کہا: میں نے آپ کو تنہا نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو میں نے یہ چاہا کہ میں آپ کے پیچھے دو رکعت نماز پڑھوں، پس کیا یہ چیز اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے ہے؟ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کہا: میرا گمان بھی ہے کہ آپ نے فرمایا: اے اعرابیہ! بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی نازل فرمائی ہوئی کتاب ہے (یعنی تقدیر ہے)۔ اس عورت نے کہا: میرے اعضاء میں سے ہر عضو کو دوزخ کے اس دروازہ سے عذاب دیا جائے گا۔ آپ نے فرمایا: اے اعرابیہ! ان میں سے ہر دروازہ کے لیے عذاب کا ایک حصہ مقرر ہے اور ہر ایک کو اس کے برے اعمال کے اعتبار سے عذاب دیا جائے گا۔ اس عورت نے کہا: اللہ کی قسم! میں ایک مسکین عورت ہوں، میرے پاس مال نہیں ہے اور میرا مال میرے سات غلام ہیں، یا رسول اللہ! میں آپ کو گواہ کرتی ہوں کہ اُن میں سے ہر غلام جہنم کے ہر دروازہ پر اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے آزاد کیا گیا ہے۔ پس آپ ﷺ کے پاس حضرت جبریل علیہ السلام آئے، پس انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! اس اعرابیہ عورت کو خوش خبری دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اوپر جہنم کے تمام دروازے حرام فرما دیے ہیں اور اس کے لیے جنت کے تمام دروازے کھول دیے ہیں۔

(الکشف والبیان للثعلبی ج ۵ ص ۳۴۲-۳۴۳، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۲ھ، التخویف من النار لابن رجب حنبلی: ۵۹)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: جہنم کے سات دروازے ہیں، اُن میں سے ہر دروازہ ایسا ہے جیسے کسی شخص نے میری امت پر تلوار سونت لی ہو، یا فرمایا: امتِ محمد پر۔ (سنن ترمذی: ۳۱۲۳، مسند احمد: ۵۶۹۳)

جہنم کے سات اجزاء کے مصادیق

نیز علامہ قرطبی نے ''لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ'' کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ ایک جز وان کے لیے ہے جو اللہ عزوجل کے ساتھ شریک بناتے ہیں، دوسرا جز وان لوگوں کے لیے ہے جو اللہ عزوجل کے وجود میں شک کرتے ہیں، تیسرا جز وان لوگوں کے لیے ہے جو اللہ عزوجل سے غفلت کرتے ہیں، چوتھا جز وان لوگوں کے لیے ہے جو اپنی خواہشات کو اللہ تعالیٰ کے احکام پر ترجیح دیتے ہیں، پانچواں جز وان لوگوں کے لیے ہے کہ جو اللہ کے غضب کے مقابلہ میں اپنے غضب کو ترجیح دیتے ہیں، چھٹا جز وان لوگوں کے لیے ہے جو اپنے حصہ کی رغبت اللہ کے لیے کرتے ہیں اور ساتواں جز وان لوگوں کے لیے ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں سرکشی کرتے ہیں۔ اس کا ذکر ابو عبداللہ الحسین بن الحسن الحلیمی نے اپنی کتاب ''منہاج الدین'' میں کیا ہے۔ اور اس میں انہوں نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کرنے والے الشنویہ ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے متعلق شک کرنے والے وہ لوگ ہیں جو یہ نہیں جانتے کہ اُن کی عبادت کا کوئی مستحق ہے یا اُن کی عبادت کا کوئی مستحق نہیں ہے، اور وہ اس کی شریعت میں شک کرتے ہیں کہ آیا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے یا نہیں ہے، اور اللہ عزوجل سے غفلت کرنے والے وہ لوگ ہیں جو ان کا اصلاً انکار کرتے ہیں اور ان کو ثابت نہیں

مانتے اور وہ دہریہ ہیں، اور جو اپنی خواہشات کو اللہ تعالیٰ کے احکام پر ترجیح دیتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو نافرمانیوں میں مستغرق ہیں، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی تکذیب کرتے ہیں اور ان کے احکام کو نہیں مانتے، اور اللہ کے غضب کے مقابلہ میں اپنے غضب کو ترجیح دینے والے وہ لوگ ہیں جو انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنے والے ہیں اور تمام ان لوگوں کو قتل کرنے والے ہیں جو اللہ عزوجل کی طرف دعوت دینے والے ہیں، اور جو ان کی خیر خواہی کرے یا ان کے مذہب کے علاوہ کسی مذہب کو اختیار کرے اس کو عذاب دینے والے ہیں، اور جو اپنے حصہ کی اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں رغبت دینے والے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے اور حساب و کتاب کا انکار کرنے والے ہیں، پس یہ ان چیزوں کی مدد کرتے ہیں جن کی طرف وہ خود راغب ہیں۔ اور جو اللہ عزوجل کے مقابلہ میں سرکشی کرتے ہیں، جو اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ ان کے پاس جو ہے آیا وہ حق ہے یا باطل ہے، پس وہ غور وفکر نہیں کرتے اور عبرت حاصل نہیں کرتے اور کسی چیز سے استدلال نہیں کرتے، اگر یہ حدیث ثابت ہو تو اللہ عزوجل ہی جاننے والے ہیں کہ ان کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کیا ارادہ فرمایا ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، جز ۱۰ ص ۳۱-۳۱، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ و تفاسیر اخرى)

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ ﴿۴۵﴾

بے شک اللہ سے ہمیشہ ڈرنے والے جنتوں اور چشموں میں ہوں گے ○

اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیْنَ ﴿۴۶﴾

(ان سے کہا جائے گا): ان جنتوں میں سلامتی کے ساتھ بے خوف وخطر داخل ہو جاؤ ○

وَ نَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ ﴿۴۷﴾

اور ہم نے ان کے سینوں سے دنیاوی رنجشوں کو نکال دیا ہے وہ تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے بھائیوں کی طرح بیٹھے ہوں گے ○

لَا یَمَسُّهُمْ فِیْهَا نَصَبٌ وَّ مَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِیْنَ ﴿۴۸﴾

ان کو ان جنتوں میں نہ کوئی مشقت پہنچے گی اور نہ انہیں وہاں سے کبھی نکالا جائے گا ○

نَبِّئْ عِبَادِیْۤ اَنِّیْۤ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿۴۹﴾

میرے بندوں کو یہ خبر دیجئے کہ بے شک میں ہی سب سے زیادہ بخشنے والا سب سے زیادہ رحم فرمانے والا ہوں ○

وَ اَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ ﴿۵۰﴾

اور یہ کہ میرا عذاب ہی دردناک عذاب ہے ○

وَ نَبِّئْهُمْ عَنْ ضَیْفِ اِبْرٰهِیْمَ ﴿۵۱﴾

اور ان کو ابراہیم کے مہمانوں کی خبر سنایئے O

اِذْ دَخَلُوْا عَلَیْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ﴿۵۲﴾

جب وہ ابراہیم کے پاس آئے تو انہوں نے کہا: تم پر سلام ہو، ابراہیم نے کہا: بے شک ہم تم سے خطرہ محسوس کر رہے ہیں O

قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ ﴿۵۳﴾

انہوں نے کہا: آپ کوئی خطرہ محسوس نہ کریں، ہم آپ کو علم والے بیٹے کی بشارت دے رہے ہیں O

قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِیْ عَلٰۤى اَنْ مَّسَّنِیَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ﴿۵۴﴾

ابراہیم نے کہا: کیا تم مجھے یہ خوش خبری دے رہے ہو حالانکہ مجھ پر بڑھاپا طاری ہو چکا ہے، سو تم مجھے کیسی خوش خبری دے رہے ہو! O

قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِیْنَ ﴿۵۵﴾

فرشتوں نے کہا: ہم نے آپ کو برحق خوش خبری دی ہے، سو آپ ناامید ہونے والوں میں سے نہ ہوں O

قَالَ وَمَنْ یَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ﴿۵۶﴾

ابراہیم نے کہا: اپنے رب کی رحمت سے وہی لوگ ناامید ہوتے ہیں جو گمراہ ہوتے ہیں O

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَیُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۷﴾

ابراہیم نے پوچھا: سو اے فرشتو! تم کیا پیغام لے کر آئے ہو؟ O

قَالُوْۤا اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِیْنَ ﴿۵۸﴾ۙ

انہوں نے کہا: ہمیں ایسی قوم کی طرف بھیجا گیا ہے جو مجرمین ہیں O

اِلَّاۤ اٰلَ لُوْطٍ ؕ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۵۹﴾ۙ

سوا لوط کے گھر والوں کے، بے شک ہم اُن سب کو ضرور بچانے والے ہیں O

اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَاۤ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِیْنَ ﴿۶۰﴾ع

سو اُن کی بیوی کے، جس کے متعلق ہم یہ فیصلہ فرما چکے ہیں کہ وہ ضرور عذاب میں رہ جانے والوں میں سے ہے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''بے شک اللہ سے ہمیشہ ڈرنے والے جنتوں اور چشموں میں ہوں گے O''
(الحجر:۴۵)

علامہ اسماعیل حقی حنفی متوفی ۱۱۳۷ھ، الحجر: ۴۵ تا ۶۰ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کی تین قسمیں

" اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ ": الاتقاء (اللہ تعالیٰ سے ڈرنے) کی تین قسمیں ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کے احکام کے سبب سے اللہ تعالیٰ کی حرام فرمائی ہوئی چیزوں کے ارتکاب سے ڈرنا۔

(۲) آخرت اور اس کے درجات کے سبب سے دنیا کی شہوات اور لذیذ چیزوں کے حصول سے باز رہنا۔

(۳) اللہ عزوجل کی ذات اور ان کی صفات کے سبب سے اس کے ماسوا کو ترک کر دینا۔

عوام، خواص اور اخص الخواص کے مراتب کا فرق

میں کہتا ہوں: اتقاء کا پہلا درجہ عوام کا ہے۔ (یعنی جو لوگ شرک اور کفر اور گناہِ کبیرہ کے ارتکاب سے اپنے آپ کو باز رکھتے ہیں)۔ اتقاء کا دوسرا درجہ الخواص کا ہے۔ (یعنی جو لوگ ہر قسم کے صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے اور خلافِ سنت اور خلافِ اولیٰ کاموں کے ارتکاب سے اپنے آپ کو باز رکھتے ہیں)۔

اتقاء کا تیسرا درجہ اخص الخواص کا ہے۔ (یعنی جو اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے سوا کسی چیز کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ رہبانیت اختیار کرتے ہیں اور تارک الدنیا ہو جاتے ہیں بلکہ وہ دنیا میں مشغول رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اُن پر اُن کی دنیا میں جو حقوق اور فرائض عائد کیے ہیں، ان کو پورا پورا ادا کرتے ہیں لیکن اُن کی دنیا میں مشغولیت دنیا کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے ہوتی ہے، ان کا دن میں جاگنا اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے ہوتا ہے اور رات کو سونا اس لیے ہوتا ہے کہ اُن کے بدن کو دن میں عبادت کرنے کے لیے راحت ملے)۔ (سعیدی غفرلہٗ)

" فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ": یعنی وہ جنات میں اور چشموں میں ہمیشہ رہیں گے۔ اُن میں سے ہر ایک کے لیے ایک جنت ہے اور ایک چشمہ ہے جیسا کہ قاعدہ ہے کہ جب جمع کا مقابلہ جمع کے ساتھ ہو تو وہ اُن میں سے ہر ایک کے لیے ہوتا ہے جیسے کہتے ہیں " لَبِسَ الْقَوْمُ ثِيَابَهُمْ " یعنی قوم میں سے ہر شخص نے اپنے اپنے کپڑے پہن لیے۔

علامہ اسماعیل حقی لکھتے ہیں: فقیر کہتا ہے: آخرت میں جو انعامات اُن کو دیے جائیں گے گویا کہ وہ دنیا میں بھی اُن میں مستقر تھے، کیونکہ انہوں نے شدت سے اُن اسباب کو حاصل کیا تھا جو اِن مقامات کی طرف پہنچاتے ہیں، اس کی نظیر دوزخیوں کے متعلق یہ آیت ہے: " اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۔ (النساء: ۱۰) " (بے شک جو لوگ ظلم کر کے یتیموں کے اموال کھاتے ہیں وہ صرف اپنے پیٹوں میں آگ کو بھر رہے ہیں)۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: " (اُن سے کہا جائے گا): اِن جنتوں میں سلامتی کے ساتھ بے خوف و خطر داخل ہو جاؤ ○ " (الحجر: ۴۶)

" اُدْخُلُوْهَا ": یعنی جب وہ دروازے تک پہنچیں گے اور اُن کی توجہ ایک جنت سے دوسری جنت کی طرف ہوگی تو اُن سے فرشتوں کی زبانوں سے کہا جائے گا۔ " بِسَلٰمٍ " کہ اے متقین! اِن جنات میں اس حال میں داخل ہو جاؤ کہ تم پر ہر خوف سے اور ہر

خطرہ سے سلامتی ہوگی۔ یا تم پر اللہ تعالیٰ کا سلام پڑھا جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلام وہ ایک جذبہ الٰہیہ ہے جیسا کہ التاویلات النجمیہ میں مذکور ہے۔ "اٰمِنِیْنَ" اس حال میں کہ تم آفات اور بلیات سے امن میں ہو گے۔

"اٰمِنِیْنَ" کی وضاحت اور "سیر الی اللہ" اور "سیر فی اللہ" کا فرق

اور التاویلات النجمیہ میں مذکور ہے کہ "اٰمِنِیْنَ" کا معنی ہے کہ جنت میں داخل ہونے کے بعد تم جنت سے نکلنے سے امن میں ہو گے۔ اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ "سیر فی اللہ" اللہ کے پہنچنے کے سوا متصور نہیں ہے جیسا کہ نبی ﷺ کا شبِ معراج حال تھا جب آپ سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچے تو جبریل آپ سے پیچھے رہ گئے۔

چناں کرم در تیہ قربت براند — کہ در سدرہ جبریل ازو باز ماند

یعنی اللہ تعالیٰ کے کرم سے آپ پر اس طرح قرب ہوا کہ سدرہ میں جبریل آپ سے پیچھے رہ گئے، اور مقام قاب قوسین میں رفرف بھی آپ سے پیچھے رہ گیا۔ اور رسول اللہ ﷺ مقام او ادنیٰ پر پہنچے جو کمال قرب ہے اور یہ صرف "اُدْنُ مِنِّیْ" (میرے قریب ہو جائیں) کے پہنچنے سے ہوا۔ پس اللہ تعالیٰ کے سلام کی وجہ سے اہلِ جنت، جنت میں داخل ہونے کے بعد جنت سے نکلنے سے محفوظ ہو گئے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ہم نے اُن کے سینوں سے دنیاوی رنجشوں کو نکال دیا ہے وہ تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے بھائیوں کی طرح بیٹھے ہوں گے O" (الحجر: ۴۷)

اہلِ جنت کے دلوں سے دنیاوی رنجشوں کا نکالنا

"وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ": یعنی اہلِ جنت کے سینوں میں دنیا میں ایک دوسرے کے ساتھ عداوت رکھنے کی وجہ سے جو بغض اور کینہ تھا، اس کو ہم نے نکال دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے امید ہے کہ میں اور حضرت عثمان اور حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم انہی لوگوں کا مصداق ہیں۔ (مسند احمد فی فضائل الصحابہ: ۱۲۹۹، الطبقات الکبریٰ لابن سعد ج ۳ ص ۱۱۳، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۵ ص ۲۸۱۔ ۲۸۲، المستدرک للحاکم ج ۲ ص ۳۵۳)

الصلت بن محمد نے کہا: ہمیں یزید بن زریع نے حدیث بیان کی۔ (اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:) "وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ۞ (الحجر: ۴۷)" (اور ہم نے اُن کے سینوں سے دنیاوی رنجشوں کو نکال دیا ہے وہ تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے بھائیوں کی طرح بیٹھے ہوں گے O)۔ انہوں نے کہا: ہمیں سعید نے حدیث بیان کی از قتادہ از ابی المتوکل الناجی، وہ بیان کرتے ہیں کہ بے شک حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مومنین دوزخ سے چھٹکارا پائیں گے، پھر ان کو جنت اور دوزخ کے درمیان ایک پل پر روک لیا جائے گا، پھر انہوں نے دنیا میں ایک دوسرے پر جو مظالم کیے ہوں گے ان کا قصاص لیا جائے گا، حتیٰ کہ جب ان کی کاٹ چھانٹ ہو جائے گی اور وہ پاک صاف ہو جائیں گے تو ان کو جنت میں دخول کی اجازت دی جائے گی۔ پس اس ذات کی قسم کہ محمد (ﷺ) کی جان جس کے قبضہ و قدرت میں ہے! ان میں سے کوئی ایک جنت میں اپنے ٹھکانے کو اس سے زیادہ پہچاننے والا ہوگا جتنا وہ دنیا میں اپنے گھر کو پہچانتا تھا۔

(صحیح البخاری: ۲۴۴۰، ۶۵۳۵، مسند احمد: ۱۱۰۷۱)

علامہ اسماعیل حقی کا حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق یہ لکھنا کہ "ان کے دل میں کینہ تھا"

علامہ اسماعیل حقی فرماتے ہیں: اس میں یہ اشارہ ہے کہ اوصاف بشریہ میں سے جو کینہ ہے وہ نفس کی صفات مذمومہ میں سے ہے اور وہ نفوس میں سے اس وقت تک نہیں نکالا جاتا جب تک کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اُن کے دلوں سے اس کو نہ نکالیں، اور جس کے دل سے کینہ نہ نکالا جائے تو وہ کینہ نکلنے کے بعد دوبارہ کینہ کے داخل ہونے سے مامون نہیں ہوتا، جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کا حال تھا، جب اُن کے نفس کے تزکیہ سے پہلے اُن کو جنت میں داخل فرمایا گیا تو اُن کے دل میں جو کینہ تھا، اس کی وجہ سے اُن کو جنت سے نکال دیا گیا اور اُسی کا نتیجہ تھا کہ آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ۞ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ۞ (طٰہٰ: ۱۲۱-۱۲۲)" (اور آدم نے اپنے رب کی صورتاً نافرمانی کی سو وہ اپنے مطلوب سے بے راہ ہو گئے O پھر اُن کو اُن کے رب نے (اپنے فضل سے) بزرگی عطا فرمائی، سو اُن کی توبہ قبول فرمائی اور اپنے قرب خاص کی راہ دکھائی O)۔

علامہ اسماعیل حقی فرماتے ہیں کہ سینوں سے کینوں کا نکالنا یا تو دنیا میں حاصل ہوتا ہے کہ نفس کا اوصاف قبیحہ سے تزکیہ کیا جائے اور دل کو برے اخلاق سے خالی کر دیا جائے اور یہ کاملین کا مرتبہ ہے، اور یا یہ آخرت میں ہوتا ہے اور یہ ناقصین کے لیے ہے۔

علامہ اسماعیل حقی کی حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق سخت عبارت پر مصنف کا تبصرہ

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ علامہ اسماعیل حقی پر رحم فرمائیں، ان کو یہ نہیں لکھنا چاہیے تھا کہ "حضرت آدم علیہ السلام کے دل میں جو کینہ تھا، اسی کی وجہ سے اُن کو جنت سے نکال دیا گیا"، کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی ہیں اور تمام انبیاء علیہم السلام کے والد ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا نبی معصوم ہوتا ہے اور اس کے متعلق یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ اُن کے دل میں جو کینہ تھا اسی کی وجہ سے اُن کو جنت سے نکال دیا گیا۔ پھر انہوں نے یہ بھی لکھ دیا کہ اسی کے نتائج کی وجہ سے آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی۔ ان کو اس طرح لکھنا چاہیے تھا کہ اسی کے نتائج کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا: "عَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى"، کیونکہ قرآن مجید اور احادیث کے حوالہ کے بغیر یہ لکھنا کہ آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی، نہ صرف یہ کہ یہ درست نہیں ہے بلکہ علامہ ابن الحاج مالکی نے کہا ہے: جس شخص نے قرآن اور حدیث کی تلاوت کے بغیر کہا کہ کسی نبی نے گناہ کیا یا اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کی، وہ کافر ہو گیا۔ (المدخل ج ۲ ص ۱۴)۔ (سعیدی غفرلہٗ)

"اِخْوَانًا": یہ اہلِ جنت کی ضمیر سے حال ہے۔ علامہ اسماعیل حقی فرماتے ہیں: فقیر یہ کہتا ہے کہ جب وہ بھائی بھائی ہو گئے اور اُن کے درمیان حسد باقی نہیں رہا، نہ دنیا میں علوم اور معارف پر اور نہ آخرت میں جنت کے درجات پر اور مراتب قرب پر۔

"عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ": تو وہ بھائیوں کی طرح زر و جواہر سے آراستہ تختوں پر ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے ہوں گے۔

مجاہد نے کہا: وہ تخت اُن کی طرف گھومتے ہوں گے جس طرف کا وہ ارادہ کریں گے، سو وہ اپنے تمام احوال میں ایک دوسرے کے سامنے اور ایک دوسرے کو دیکھتے ہوں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اُن کو اُن جنتوں میں نہ کوئی مشقت پہنچے گی اور نہ انہیں وہاں سے کبھی نکالا جائے گا O" (الحجر: ۴۸)

"لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ": یعنی اہلِ جنت کو جنت میں کوئی رنج، تکلیف اور مشقت نہیں پہنچے گی کیونکہ وہ جگہ نعمت اور راحت کی ہے۔ "وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِينَ": یعنی وہ ابدالآباد تک جنت میں رہیں گے۔

اور "التاویلات النجمیہ" میں مذکور ہے کہ جنت میں وہ ایک دوسرے سے حسد نہیں کریں گے، یعنی جب اہلِ جنت بعض دوسرے جنتیوں کے بلند درجات دیکھیں گے تو اس کی وجہ سے اُن کو اُن پر حسد نہیں ہوگا اور وہ دیگر جنتی بھائیوں کے بلند درجات پر راضی ہوں گے، کیونکہ حسد اور کینہ اُن کے دلوں سے نکالا جا چکا ہوگا۔

اہلِ جنت کی صفات کے متعلق احادیثِ صحیحہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو پہلا گروہ جنت میں داخل ہوگا ان کی صورت چودھویں رات کے چاند پر ہوگی، وہ جنت میں نہ تھوکیں گے نہ ناک سے رینٹ نکالیں گے اور نہ پاخانہ کریں گے، جنت میں ان کے برتن سونے کے ہوں گے، ان کی کنگھیاں سونے اور چاندی کی ہوں گی، ان کی انگیٹھیوں کا ایندھن عود ہوگا، ان کے پسینہ میں مشک کی خوشبو ہوگی اور اہلِ جنت میں سے ہر شخص کی دو بیویاں ہوں گی، ان کے حسن کا یہ عالم ہوگا کہ ان کی پنڈلیوں کا گودا گوشت کے اوپر سے دکھائی دے گا، ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہوگا اور نہ ان کے دلوں میں بغض ہوگا، ان سب کا دل ایک طرح ہوگا، وہ صبح اور شام اللہ تعالیٰ کی تسبیح کریں گے۔

(صحیح البخاری: ۳۲۴۵، ۳۲۴۶، ۳۲۵۴، ۳۳۲۷، صحیح مسلم: ۲۸۳۴، الرقم المسلسل: ۷۰۳۵، سنن ترمذی: ۲۵۳۷، سنن ابن ماجہ: ۴۳۳۳)

"فتح القریب" میں لکھا ہے کہ اہلِ جنت اوقاتِ جنت کے اعتبار سے صبح اور سہ پہر کے وقت اللہ تعالیٰ کی تسبیح کریں گے، اور حقیقی اوقات یہاں مراد نہیں ہیں کیونکہ حقیقی اوقات دن اور رات کے اختلاف سے اور سورج اور چاند کی حرکات سے متحقق ہوتے ہیں اور جنت میں اُن میں سے کوئی چیز نہیں ہوگی۔

علامہ القرطبی نے کہا ہے: یہ تسبیح بہ طور تکلیف نہیں ہوگی، کیونکہ جنت مکلف کرنے کی جگہ نہیں ہے، جنت جزاء کا محل ہے، یہ تسبیح اُن کے دلوں میں الہام کی جائے گی جیسا کہ دوسری روایت میں ہے کہ "ان کو تسبیح، تحمید اور حمد کا الہام کیا جائے گا"۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اہلِ جنت کھائیں گے اور پئیں گے اور نہ وہ تھوکیں گے اور نہ پیشاب کریں گے اور نہ پاخانہ کریں گے اور نہ ناک سے رینٹ نکالیں گے، صحابہ نے پوچھا: پھر اُن کے طعام کا کیا ہوگا؟ تو آپ نے فرمایا: وہ ایک ڈکار لیں گے جس سے مشک کی خوشبو آئے گی اور انہیں اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور تحمید الہام کی جائے گی۔ (صحیح مسلم: ۲۸۳۵، الرقم المسلسل: ۷۰۸۱، رقم حدیث الباب: ۱۸، سنن ابوداؤد: ۴۷۴۱)

اس کی وجہ تشبیہ یہ ہے کہ نفسِ انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کا ذکر ضروری ہے، اور جنت میں وہ اس طرح اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے گا کہ اسے اس میں کوئی مشقت نہیں ہوگی۔ اس کا راز یہ ہے کہ اہلِ جنت کے دل اللہ تعالیٰ کی معرفت سے منور ہوں گے اور اُن کی آنکھیں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو دیکھنے سے متمتع ہوں گی اور ان کے دل اللہ تعالیٰ کی محبت سے معمور ہوں گے، اس لیے وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے رہیں گے، پس جو شخص اس مرتبہ کے حصول کو چاہے وہ اللہ تعالیٰ کا زیادہ سے زیادہ ذکر کرے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "میرے بندوں کو یہ خبر دیجئے کہ بے شک میں ہی سب سے زیادہ بخشنے والا، سب

سے زیادہ رحم فرمانے والا ہوں O" (الحجر: ۴۹)

حضرت جبریل علیہ السلام کا یہ بتانا کہ بندے کس وجہ سے اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہیں

"نَبِّئْ عِبَادِیْ": روایت ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنوشیبہ کے دروازہ سے مسجد الحرام میں داخل ہوئے، آپ نے صحابہ کی ایک جماعت کو دیکھا کہ وہ ہنس رہے تھے، آپ نے پوچھا: کیا وجہ ہے کہ میں تم کو ہنستا ہوا دیکھ رہا ہوں؟ صحابہ کو آپ کی اس بات سے کچھ عتاب کی خوشبو آئی، اس وقت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجرہ میں داخل نہیں ہوئے تھے، آپ واپس آگئے اور آپ نے فرمایا کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے یہ پیغام دیا ہے کہ میرے بندے کس وجہ سے مجھ سے امید رکھتے ہیں۔

(تفسیر الطبری ج ۱۳ ص ۸۲، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۲۳ھ، کتاب الزہد لابن المبارک: ۸۹۴)

"نَبِّئْ عِبَادِیْ": یعنی میرے بندوں کو یہ خبر دیجئے کہ "اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ": میں ہر اس شخص کی مغفرت فرمانے والا ہوں جو مجھ سے مغفرت طلب کرے۔ یعنی اُن کے گناہوں کو میرے سوا نہ کوئی چھپا سکتا ہے اور نہ میرے سوا کوئی مٹا سکتا ہے اور نہ ان کو جنت کی نعمتیں عطا کر سکتا ہے، اور میرے سوا کوئی اس پر قادر نہیں ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور یہ کہ میرا عذاب ہی دردناک عذاب ہے O" (الحجر: ۵۰)

"وَاَنَّ عَذَابِیْ ھُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ": یعنی میرے بندوں کو خبر دیجئے کہ میرا عذاب ہی دردناک عذاب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی صفت بخشنے اور رحمت فرمانے سے فرمائی ہے نہ کہ عذاب دینے کے ساتھ، یہ نہیں فرمایا کہ میں دردناک عذاب دینے والا ہوں، اس میں یہ خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی صفت تو رحمت فرمانا ہے اور گناہوں کو بخشنا ہے اور عذاب جو متحقق ہوتا ہے وہ کسی خارجی امر کی وجہ سے ہوتا ہے، یعنی بندوں کے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے عذاب کے مستحق لوگوں کے مصادیق

اور "التاویلات النجمیہ" میں مذکور ہے کہ اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ وہ لوگ مخصوص ہیں جو دنیا کی خواہشات کی غلامی سے آزاد ہیں اور وہی اللہ تعالیٰ کی صفاتِ لطف اور ان کی رحمت کے مظاہر ہیں اور عذاب اُن کے لیے ہوتا ہے جو اپنی نفسانی خواہشات کی بندگی کرتے ہیں۔ اور اس میں دوسری بار یہ اشارہ ہے کہ جو لوگ عبودیت کی ہوا میں پرواز کرتے ہیں وہ خوف اور امید پر قائم ہوتے ہیں۔ "الروضہ" میں مذکور ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت یحییٰ علیہ السلام کے چہرہ کو دیکھ کر مسکرائے تو انہوں نے پوچھا کہ میں آپ کو مسکراتا ہوا کیوں دیکھ رہا ہوں؟ تو انہوں نے کہا: میرے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ میں اس طرح تیوری چڑھاؤں جیسا کہ میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہوں، پھر ان دونوں نے کہا: ہم آگے نہیں چلیں گے حتیٰ کہ ہم پر وحی نازل ہو، تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی طرف وحی نازل فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے تم دونوں کو آپس میں محبت کرنے والا اس لیے رکھا ہے کہ تم دونوں میرے ساتھ اچھا گمان رکھتے ہو۔ مسروق نے کہا: خوف امید سے پہلے ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جنت اور دوزخ کو پیدا فرمایا، پس تم ہرگز جنت تک نہیں پہنچ سکو گے حتیٰ کہ تمہارا دوزخ کے ساتھ گزر ہو۔

خوف کی رجاء (امید) پر ترجیح کی توجیہ

علامہ اسماعیل حقی فرماتے ہیں: فقیر یہ کہتا ہے کہ بندہ کو چاہیے کہ خوف کو مقدم رکھے کیونکہ وہی اصل ہے اور خوف کی وجہ سے دل بری آرزوؤں سے خالی ہوتا ہے اور اس کے یہ منافی نہیں ہے کہ امید کا متعلق مقدم ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت واسعہ ہے، کیونکہ وہی اصل ہے، اسی وجہ سے حدیث میں وارد ہے:

امام محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ، اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

ہمیں یہ حدیث پہنچی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اگر بندہ کو اللہ تعالیٰ کے معاف فرمانے کی مقدار کا پتا چل جائے تو وہ کسی حرام کام سے اجتناب نہیں کرے گا، اور اگر بندہ کو اللہ تعالیٰ کے عذاب کی مقدار کا پتا چل جائے تو وہ ضرور اپنے نفس کو ہلاک کر ڈالے گا۔

(تفسیر الطبری ج ۱۴ ص ۸۱-۸۲، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۳۲ھ)

نیز علامہ اسماعیل حقی فرماتے ہیں: یاد رکھو! مغفرت کے اسباب بہت زیادہ ہیں اور سب سے بڑا سبب اللہ عزوجل سے محبت ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور جنات کو عبادت کے لیے پیدا فرمایا جو معرفت الٰہیہ تک پہنچاتی ہے اور جذبہ ربانیہ تک پہنچاتی ہے، پس صاحب عقل پر لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے حصول میں کوشش کرے حتیٰ کہ وہ اپنی مراد تک پہنچ جائے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور اِن کو ابراہیم کے مہمانوں کی خبر سنایئے O'' (ابراہیم: ۵۱)

''وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ إِبْرٰهِيْمَ'': ''ضَيْف'' سے مراد اضیاف ہیں، اور وہ حضرت جبریل علیہ السلام تھے اور اُن کے ساتھ گیارہ فرشتے تھے جو خوبصورت لڑکوں کے چہروں پر تھے، ان کو ''ضَيْف'' اس لیے فرمایا کہ وہ مہمانوں کی صورت میں تھے، یا اس لیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُن کو مہمان گمان فرمایا تھا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''جب وہ ابراہیم کے پاس آئے تو انہوں نے کہا: تم پر سلام ہو، ابراہیم نے کہا: بے شک ہم تم سے خطرہ محسوس کر رہے ہیں O'' (الحجر: ۵۲)

''إِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا'': یعنی انہوں نے اپنے دخول کے وقت کہا: ہم سلام پیش کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ﴿ وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ إِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ۖ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ أَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ۝ فَلَمَّا رَآٰ أَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ إِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۚ قَالُوْا لَا تَخَفْ إِنَّآ أُرْسِلْنَآ إِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ۝ ﴾ (ھود: ۶۹-۷۰) ''بے شک ابراہیم کے پاس ہمارے فرشتے خوش خبری لے کر آئے، انہوں نے کہا: ''آپ پر سلام ہو'' ابراہیم نے کہا: تم پر بھی سلام ہو، پھر تھوڑی دیر بعد ابراہیم ایک بھنا ہوا بچھڑا لے کر آ گئے O پھر جب ابراہیم نے دیکھا کہ اُن (فرشتوں) کے ہاتھ اس بھنے ہوئے بچھڑے کی طرف نہیں بڑھ رہے تو انہوں نے اُن فرشتوں کو اجنبی سمجھا اور دل میں ڈر محسوس کیا، اُن فرشتوں نے کہا: ''آپ نہ ڈریں، بے شک ہم قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں'' O۔

''قَالَ إِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ'': یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: ہم تم سے خوف زدہ ہیں، کیونکہ ہمیں خطرہ ہے کہ کوئی آفت یا مصیبت نہ پہنچے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ اس وقت فرمایا جب انہوں نے دیکھا کہ اُن کے مہمان ان کے پیش کیے ہوئے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھا رہے، کیونکہ معروف یہ تھا کہ جب مہمان کے سامنے کھانا رکھا جائے اور وہ اس سے نہ کھائے تو یہ گمان کیا

جاتا ہے کہ وہ کوئی خیر کی خبر لے کر نہیں آیا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:"انہوں نے کہا: آپ کوئی خطرہ محسوس نہ کریں، ہم آپ کو علم والے بیٹے کی بشارت دے رہے ہیں O"(الحجر: ۵۳)

"قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ": اس میں یہ وجہ بیان فرمائی ہے کہ اُن سے خوف کیوں نہیں رکھنا چاہیے، کیونکہ وہ تو بشارت لے کر آئے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کافی عرصہ تک عافیت اور سلامتی کے ساتھ رہیں گے اور بشارت اس خبر کو کہتے ہیں جس خبر سے سرور ظاہر ہو۔"بِغُلٰمٍ": یعنی ہم آپ کو اسحاق نام کے ایک بیٹے کی بشارت دیتے ہیں۔"عَلِیْمٍ": یعنی جس وقت وہ بالغ ہو جائیں گے تو علوم نبوت پر فائز ہوں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:"ابراہیم نے کہا: کیا تم مجھے یہ خوش خبری دے رہے ہو حالانکہ مجھ پر بڑھاپا طاری ہو چکا ہے، سو تم مجھے کیسی خوش خبری دے رہے ہو!O"(الحجر: ۵۴)

"قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِیْ عَلٰۤى اَنْ مَّسَّنِیَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ": یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بہ طور تعجب اور استفہام کے فرمایا کہ مجھے اب بڑھاپا پہنچ چکا ہے، اور اس بڑھاپے میں میرے ہاں اولاد کا ہونا بہت تعجب خیز بات ہے کہ آیا پہلے میرے ہاں لڑکا پیدا ہوگا یا میرے بوڑھے ہونے کے بعد پیدا ہوگا تم کس طرح کی بشارت دے رہے ہو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:"فرشتوں نے کہا: ہم نے آپ کو برحق خوش خبری دی ہے، سو آپ ناامید ہونے والوں میں سے نہ ہوں O"(الحجر: ۵۵)

اللہ تعالیٰ کا بوڑھے مرد اور بانجھ عورت سے بچہ کو پیدا فرمادینے کا زیادہ تعجب خیز امر نہ ہونا

"قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِیْنَ": فرشتوں نے کہا: ہم نے آپ کو برحق بشارت دی ہے، آپ اُن لوگوں میں سے نہ ہو جائیں جو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہوتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہیں کہ بغیر مرد اور عورت کے کسی بشر کو پیدا فرمادیں جیسے حضرت آدم علیہ السلام کو بغیر مرد اور عورت کے پیدا فرمادیا، اور اس پر قادر ہیں کہ بغیر عورت کے کسی کو پیدا فرمادیں جیسے حضرت حواء کو عورت کے بغیر پیدا فرمادیا، اور اس پر قادر ہیں کہ وہ مرد کے بغیر پیدا فرمادیں جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مرد کے بغیر پیدا فرمادیا، تو اُن سے یہ کیسے مستبعد ہوگا کہ وہ ایک بوڑھے مرد اور بوڑھی بانجھ عورت سے بیٹے کو پیدا فرمادیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اس سے مقصد اللہ تعالیٰ کی نعمت کی بڑائی کو بیان کرنا تھا اور اُن کی قدرت کا ذکر کرنا تھا اور انہوں نے کہا:

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:"ابراہیم نے کہا: اپنے رب کی رحمت سے وہی لوگ ناامید ہوتے ہیں جو گمراہ ہوتے ہیں O"(الحجر: ۵۶)

"قَالَ وَمَنْ یَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ": یہ استفہام انکاری ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے وہی لوگ ناامید ہوتے ہیں جو گمراہ ہوں، جن کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی معرفت نہ ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وسعت کو نہ پہچانتے ہوں اور ان کی

کمالِ قدرت کو نہ جانتے ہوں، جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا تھا: ''یٰبَنِیَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ یُّوْسُفَ وَ اَخِیْهِ وَ لَا تَایْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا یَایْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ۝ (یوسف:۸۷)'' (اے میرے بیٹو! جاؤ یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بے شک اللہ کی رحمت سے صرف کفار ہی مایوس ہوتے ہیں''O)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مراد یہ تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہیں ہیں، اور میں نے جو کچھ کہا ہے وہ اس لیے کہا ہے کہ میرا موجودہ حال اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت کے فیضان کے بظاہر منافی ہے۔

آخرِ عمر میں اللہ تعالیٰ کے ذکر و فکر کی طرف متوجہ کرنے کی تلقین

اس میں یہ اشارہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اُن کے بڑھاپے میں اور اُن کی بیوی کے بڑھاپے میں ایک علم والے بیٹے کی بشارت طالبِ صادق کے لیے بشارت ہے، اور بے شک حضرت ابراہیم علیہ السلام اگرچہ زیادہ عمر کے ہو چکے تھے اور اُن کا جسم کمزور ہو چکا تھا اور اُن کے قویٰ بھی کمزور ہو چکے تھے اور جہادِ النفس سے عاجز ہو چکے تھے اور اپنے بدن کو اللہ تعالیٰ کی عبادات میں اور اعمالِ بدنیہ میں خرچ کرنے سے کمزور ہو چکے تھے اور شیطان اُن کو قرب کے درجات کے حصول سے مایوس کر رہا تھا، کیونکہ کمال کے حصول کے اسباب ختم ہو چکے تھے اور اُن کی عمر کا عمدہ حصہ اور شباب گزر چکا تھا، اسی وجہ سے المشائخ نے کہا ہے کہ چالیس سال کے بعد صوفی ٹھنڈا ہو جاتا ہے، پس وہ اپنے رب کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتا اور اعمالِ قلب سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتا ہے، پس اس کی روح کے صلب سے اور اس کے قلب سے ایک بیٹا نکلے جو علومِ لدنیہ اور رسومِ دینیہ کا حامل ہو، اور یہ ہر مومن کے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف ایک نصیحت کرنے والا ہوتا ہے، اور کئی افراد اس عمر میں آ کر نیکی کے درجات کے حصول سے عاجز ہو گئے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ مُّقْتَدِرًا۝ (الکہف:۴۵)'' (اور اللہ ہر اس چیز پر قادر ہیں جسے وہ چاہیں O)۔

پس اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر فرمایا کہ اُن کی قدرت ہر چیز کو شامل ہے، اور یہ بھی چیزوں میں سے ایک چیز ہے، اگر تم یہ ارادہ کرو کہ تم اپنی امیدوں کے پورے ہونے پر اللہ تعالیٰ سے مدد چاہو تو تم اپنے جیسے کسی شخص کے حال پر غور کرو، پھر اللہ تعالیٰ نے اُس کو اُن غموں سے نجات عطا فرمائی جیسا کہ حضرت ابراہیم بن ادہم اور الفضیل بن عیاض اور ابن المبارک اور ذی النون اور مالک بن دینار وغیرہم کی مدد فرمائی۔

تاج العروس میں کہا ہے: جس کی عمر کم ہو جائے، پس اسے چاہیے کہ وہ اذکارِ جامعہ کے ساتھ ذکر کرے مثلاً سبحان اللہ عدد خلقہ، اور اس کی مثل۔ اور عمر کے کم ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کا رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف ہو، وہ بیماریوں میں اور پریشان کن حالات میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''ابراہیم نے پوچھا: سو اے فرشتو! تم کیا پیغام لے کر آئے ہو؟O'' (الحجر:۵۷)

''قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَیُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ'': یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: تم کون سا عظیم پیغام لے کر آئے ہو، شاید کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قرائن سے یہ جان لیا تھا کہ فرشتوں کا آنا صرف بشارت دینے کے لیے نہیں ہے بلکہ اُن کا کوئی اور کام بھی ہے جس کی وجہ سے انہیں بھیجا گیا ہے، تو انہوں نے کہا: اگر تمہارے آنے کا مقصد صرف بشارت دینا نہیں تھا تو پھر تمہارے آنے کا کیا مقصد ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''انہوں نے کہا: ہمیں ایسی قوم کی طرف بھیجا گیا ہے جو مجرمین ہیں O'' (الحجر: ۵۸)

''قَالُوۡۤا اِنَّاۤ اُرۡسِلۡنَاۤ اِلٰی قَوۡمٍ مُّجۡرِمِیۡنَ'': یعنی فرشتوں نے کہا: ہمیں اُن لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہے جو اپنے جرائم پر اصرار کرنے والے ہیں اور اپنی نافرمانیوں میں اور گناہوں میں انتہاء کو پہنچنے والے ہیں اور وہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''سوا لوط کے گھر والوں کے، بے شک ہم اُن سب کو ضرور بچانے والے ہیں O'' (الحجر: ۵۹)

''اِلَّاۤ اٰلَ لُوۡطٍ ؕ اِنَّا لَمُنَجُّوۡهُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ'': یہ آیت مجرمین کی ضمیر سے استثناء متصل ہے، یعنی ہم کو ایسی قوم کی طرف بھیجا گیا ہے جنہوں نے بہت زیادہ جرائم کیے ہیں سوائے حضرت لوط علیہ السلام کے گھر والوں کے، کیونکہ وہ مومنین ہیں۔ اور فرشتوں کا بھیجا اگرچہ مجرمین وغیر مجرمین دونوں کو شامل تھا لیکن اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ہمیں اُن لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہے جنہوں نے بہت بڑے جرائم کیے ہیں سوائے حضرت لوط علیہ السلام کے گھر والوں کے، تاکہ ہم اولین کو ہلاک کردیں اور دوسروں کو نجات دے دیں۔ اور آل کی نجات کے ذکر پر اکتفاء کی، کیونکہ جب وہ نجات پا جائیں گے تو جو اُن کے متبوع ہیں یعنی حضرت لوط علیہ السلام، وہ نجات پانے کے زیادہ لائق ہیں۔

حضرت لوط علیہ السلام کا تذکرہ

حضرت لوط بن ہاران بن تارخ ہیں اور وہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے بھائی کے بیٹے ہیں۔ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ایمان لا چکے تھے اور انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ نمرود کی آگ سے نجات پانے کے بعد شام کی طرف ہجرت کی تھی۔ اور حضرت لوط علیہ السلام نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ترپن (۵۳) سال کی عمر میں ختنہ کیا تھا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر اس وقت اسی (۸۰) سال یا ایک سو بیس (۱۲۰) سال تھی، پس حضرت ابراہیم علیہ السلام فلسطین میں ٹھہرے اور یہ اُن شہروں میں سے ہے جو شام اور مصر کے درمیان ہے، اسی میں سے الرملہ یعنی فلسطین ہے اور غزہ ہے اور عسقلان ہے، حضرت لوط علیہ السلام اردن میں ٹھہرے، اور یہ شام کا ایک علاقہ ہے، پس اللہ تعالیٰ نے حضرت لوط علیہ السلام کو اہل سدوم کی طرف بھیجا، وہاں کے لوگ بدکاری کرتے تھے (وہ ہم جنس پرست تھے اور اپنی نفسانی خواہش کو مردوں سے پورا کرتے تھے) تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی طرف فرشتوں کو انہیں ہلاک کرنے کے لیے بھیجا، فرشتوں نے کہا: ''اِنَّا لَمُنَجُّوۡهُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ'' یعنی جس قوم نے بدکاری کی تھی اُن پر عذاب دے کر بھیجا اور وہ عذاب یہ تھا کہ اُن کے شہروں کو الٹ پلٹ کردیا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''سوا اُن کی بیوی کے، جس کے متعلق ہم یہ فیصلہ کرچکے ہیں کہ وہ ضرور عذاب میں رہ جانے والوں میں سے ہے O'' (الحجر: ۶۰)

''اِلَّا امۡرَاَتَهٗ قَدَّرۡنَاۤ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الۡغٰبِرِیۡنَ'': ''الۡغٰبِرِیۡنَ'' کا معنی ہے: وہ کافروں کے ساتھ باقی رہ جانے والی ہے تاکہ اُن کافروں کے ساتھ ہلاک کردی جائے۔ اور اُن کے ہلاک کرنے کی نسبت فرشتوں کی طرف کی ہے، حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے، کیونکہ اُن فرشتوں کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص قُرب تھا، جیسے بادشاہ کے خواص کہتے ہیں کہ ہمیں اس طرح حکم دیا گیا ہے اور ہم

دینے والا بادشاہ ہوتا ہے۔ (روح البیان، ج ۴، ص ۶۰۳۔ ۶۱۰، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۱ھ)

فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ِۨالْمُرْسَلُوْنَ ﴿۶۱﴾

پھر جب وہ بھیجے ہوئے فرشتے لوط کے گھر والوں کے پاس آئے ○

قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۶۲﴾

لوط نے کہا: بے شک تم لوگ اجنبی ہو ○

قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿۶۳﴾

ان (بھیجے ہوئے) فرشتوں نے کہا: بلکہ ہم آپ کے پاس اس عذاب کو لے کر آئے ہیں جس میں (یہاں کے) لوگ شک کرتے تھے ○

وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۶۴﴾

اور ہم آپ کے پاس برحق حکم لے کر آئے ہیں اور بے شک ہم ضرور صادق ہیں ○

فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۵﴾

(اے لوط!) پس آپ اپنے گھر والوں کو لے کر رات کے آخری حصہ میں یہاں سے چلے جائیں، آپ خود اُن کے پیچھے پیچھے چلیں، آپ لوگوں میں سے کوئی بھی پیچھے مُڑ کر نہ دیکھے اور جہاں جانے کا آپ کو حکم فرمایا گیا ہے، وہیں چلے جائیں ○

وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۶۶﴾

اور ہم نے لوط کو وحی سے اس فیصلہ پر مطلع فرما دیا تھا کہ جب یہ کفار صبح کو اٹھ رہے ہوں گے تو ان لوگوں کی جڑ کٹ چکی ہوگی ○

وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۶۷﴾

اور اتنے میں (سدوم کے) شہری خوشی خوشی آگئے ○

قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ﴿۶۸﴾

لوط نے (ان فرشتوں کے متعلق) کہا: یہ میرے مہمان ہیں، تم مجھے (ان کے سامنے) رسوا نہ کرنا ○

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ﴿۶۹﴾

اور اللہ سے ڈرو اور مجھے شرمندہ نہ کرو○

قَالُوْۤا اَوَ لَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۷۰﴾

اُن شہریوں نے کہا: ''کیا ہم نے آپ کو جہان بھر کے لوگوں کو مہمان بنانے سے منع نہیں کیا تھا؟''○

قَالَ هٰۤؤُلَآءِ بَنٰتِیْۤ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ ﴿۷۱﴾

لوط نے کہا: ''یہ عورتیں میری قوم کی بیٹیاں ہیں، اگر تم نے اپنی خواہش (ضرور) پوری کرنی ہے تو ان سے نکاح کر لو○

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِیْ سَكْرَتِهِمْ یَعْمَهُوْنَ ﴿۷۲﴾

(اے رسولِ اکرم!) آپ کی زندگی کی قسم! یہ لوگ اپنے گناہ کی مستی پوری کرنے میں اندھے ہو چکے تھے○

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّیْحَةُ مُشْرِقِیْنَ ﴿۷۳﴾

پھر سورج کے روشن ہوتے ہی ایک کڑک نے اُن لوگوں کو پکڑ لیا○

فَجَعَلْنَا عَالِیَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّیْلٍ ﴿۷۴﴾

پس ہم نے اُن کی بستیوں کے اوپر والے حصہ کو نیچے کر دیا اور اُن پر پکی ہوئی مٹی کے پتھروں کی بارش برسا دی○

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِیْنَ ﴿۷۵﴾

بے شک اِن واقعات میں عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں○

وَ اِنَّهَا لَبِسَبِیْلٍ مُّقِیْمٍ ﴿۷۶﴾

اور بے شک وہ بستیاں عام شاہراہ پر واقع ہیں○

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۷۷﴾

بے شک اِن واقعات میں مومنین کے لیے ضرور نشانی ہے○

وَ اِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَیْكَةِ لَظٰلِمِیْنَ ﴿۷۸﴾

اور بے شک گھنے جنگل والے لوگ ظلم کرنے والے تھے○

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ وَ اِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِیْنٍ ﴿۷۹﴾

سو ہم نے اُن کو سزا دی اور قوم لوط اور ایکہ کی بستیاں کھلی ہوئی شاہراہ پر واقع ہیں○

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''پھر جب وہ بھیجے ہوئے فرشتے لوط کے گھر والوں کے پاس آئےO'' (الحجر: ۶۱)

حضرت لوط علیہ السلام اور اُن کی قوم کا بقیہ قصہ

علامہ ابوحفص عمر بن علی الدمشقی الحنبلی المتوفی ۸۸۰ھ، الحجر: ۶۱ تا ۷۹ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ الْمُرْسَلُوْنَ'': پورا قصہ اس طرح ہے کہ جب فرشتوں نے حضرت ابراہیم صلوات اللہ وسلامہ علیہ کو علم والے بیٹے کی پیدائش کی خوش خبری دی اور ان فرشتوں نے یہ بتایا کہ اُن کو عذاب دے کر قوم مجرمین کی طرف روانہ فرمایا گیا ہے تو پھر وہ فرشتے حضرت لوط علیہ السلام کی طرف آئے اور حضرت لوط علیہ السلام اور اُن کی قوم کو یہ پتا نہیں چلا تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں، اس لیے انہوں نے کہا:

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''لوط نے کہا: بے شک تم لوگ اجنبی ہوO'' (الحجر: ۶۲)

''قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ'': کیونکہ وہ اچانک ان کے گھر پر ٹوٹ پڑے اور حضرت لوط علیہ السلام اُن کے آنے سے خوف زدہ ہوئے کہ وہ کسی مصیبت کو اُن کی طرف پہنچائیں گے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ وہ فرشتے بے ریش اور خوبصورت چہروں والے تھے، تو حضرت لوط علیہ السلام کو یہ خطرہ ہوا کہ اُن کی قوم آ کر اُن سے اپنی ہم جنس پرستی کی خواہش پوری کرنے کے لیے ٹوٹ پڑے گی، تو انہوں نے کہا: تم اجنبی لوگ ہو۔

تیسرا قول یہ ہے کہ نکرہ معرفہ کی ضد ہے، پس اُن کے اس قول کا معنی یہ ہے کہ میں تم کو نہیں پہچانتا اور نہ میں یہ جانتا ہوں کہ تم کس قوم سے تعلق رکھتے ہو اور تم کس غرض سے اچانک میرے گھر میں داخل ہو گئے ہو، سو کہا: ''اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ'' تم اجنبی لوگ ہو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''ان (بھیجے ہوئے) فرشتوں نے کہا: بلکہ ہم آپ کے پاس اس عذاب کو لے کر آئے ہیں جس میں (یہاں کے) لوگ شک کرتے تھےO'' (الحجر: ۶۳)

''قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ'': اُن بھیجے ہوئے فرشتوں نے کہا: بلکہ ہم آپ کے پاس اس لیے آئے ہیں کہ ان پر وہ عذاب ڈالیں جس میں یہ لوگ شک کرتے تھے کہ آیا وہ عذاب ان پر نازل ہوگا یا نہیں، کیونکہ حضرت لوط علیہ السلام اُن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈراتے تھے اور وہ لوگ حضرت لوط علیہ السلام کی تصدیق نہیں کرتے تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور ہم آپ کے پاس برحق حکم لے کر آئے ہیں اور بے شک ہم ضرور صادق ہیںO'' (الحجر: ۶۴)

پھر اُن فرشتوں نے اپنے قول کو یہ کہہ کر مؤکد فرمایا: ''وَ اَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ'': الکلبی نے کہا: ہم عذاب لے کر آئے ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ہم اس یقینی چیز کو لے کر آئے ہیں جو ثابت ہے اور جس کے واقع ہونے میں کوئی شک نہیں ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے، پھر انہوں نے یہ کہہ کر اس تاکید کی مزید تاکید کی: ''وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ''۔ اور بے شک ہم ضرور صادق ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''(اے لوط!) پس آپ اپنے گھر والوں کو لے کر رات کے آخری حصہ میں یہاں

سے چلے جائیں، آپ خود اُن کے پیچھے پیچھے چلیں، آپ لوگوں میں سے کوئی بھی پیچھے مُڑ کر نہ دیکھے اور جہاں جانے کا آپ کو حکم فرمایا گیا ہے، وہیں چلے جائیں O" (الحجر: ۶۵)

"فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ": (اے لوط!) پس آپ اپنے گھر والوں کو لے کر رات کے آخری حصہ میں یہاں سے چلے جائیں۔ "وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ": یعنی آپ ان کے پیچھے پیچھے چلیں۔

"وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ": تاکہ یہ لوگ کسی عظیم امر سے خوف زدہ نہ ہوں، کیونکہ اُن پر عذاب نازل کیا جاتا تھا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا معنی ہے: آپ جلدی جلدی چلیں اور کسی چیز کی طرف مڑ کر نہ دیکھیں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت لوط علیہ السلام کے گھر والوں کی نجات کے لیے علامت بنا دیا۔

"وَامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یعنی آپ شام کے علاقہ میں چلے جائیں۔

اور المفضل نے کہا: آپ وہاں جائیں جہاں جانے کے لیے آپ سے حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا ہے۔

اور مقاتل نے کہا: یعنی زغر چلے جائیں۔ اور ایک قول یہ ہے کہ آپ الأردن میں چلے جائیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ہم نے لوط کو وحی سے اس فیصلہ پر مطلع فرما دیا تھا کہ جب یہ کفار صبح کو اٹھ رہے ہوں گے تو ان لوگوں کی جڑ کٹ چکی ہوگی O" (الحجر: ۶۶)

"وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ":

"مَقْطُوْعٌ": یعنی اُن تمام کی جڑ کٹ چکی ہوگی حتیٰ کہ صبح کے وقت اُن میں سے کوئی بھی باقی نہیں ہوگا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اتنے میں (سدوم کے) شہری خوشی خوشی آ گئے O" (الحجر: ۶۷)

"وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ": یعنی حضرت لوط علیہ السلام کے شہر سدوم کے لوگ آ گئے۔

"يَسْتَبْشِرُوْنَ": اور وہ حضرت لوط علیہ السلام کے مہمانوں کی وجہ سے خوش ہو رہے تھے اور ایک دوسرے کو بے حیائی کے کام کرنے کی خوش خبری دے رہے تھے اور مبارک باد دے رہے تھے۔ اس سلسلہ میں متعدد اقوال ہیں:

(۱) وہ فرشتے بہت زیادہ حسین اور خوبصورت تھے حتیٰ کہ اُن کے آنے کی خبر مشہور ہو گئی اور پھیل گئی۔

(۲) حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی نے اُن فرشتوں کے آنے کی لوگوں کو خبر دے دی، پھر وہ لوگ حضرت لوط علیہ السلام کے گھر گئے اور اُن بے ریش لڑکوں کو اُن کے حوالے کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "لوط نے (ان فرشتوں کے متعلق) کہا: یہ میرے مہمان ہیں، تم مجھے (ان کے سامنے) رسوا نہ کرنا O" (الحجر: ۶۸)

"قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ": پس اُن سے حضرت لوط صلوات اللہ وسلامہ علیہ نے کہا: یہ لوگ میرے مہمان ہیں اور مرد پر یہ واجب ہے کہ وہ اپنے مہمانوں کی تکریم اور تعظیم کرے تو تم مجھے ان کی وجہ سے رسوا نہ کرو۔

تُفْضَحُوْنِ کا لفظ فضیحۃ سے ماخوذ ہے، جب کسی شخص کے کاموں میں سے ایسا کام ظاہر ہو جائے جس کی وجہ سے اس کو عار اور شرمندگی لاحق ہو تو کہتے ہیں فضحۃ۔ اور الفضیحۃ اس کے ساتھ مختص ہے جس کے ظاہر ہونے سے انسان کو عار لاحق ہو۔

اور اس آیت کا معنی یہ ہے کہ مہمان کی تکریم واجب ہے اور جب تم مہمان کے ساتھ کسی برائی کا قصد کرو گے تو یہ میری اہانت ہوگی، پھر اس معنی کو اس قول سے مؤکد کیا:

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور اللہ سے ڈرو اور مجھے غمزدہ نہ کروO'' (الحجر: ۶۹)

''وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ'': یعنی تم مجھے شرمندہ نہ کرو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اُن شہریوں نے کہا: ''کیا ہم نے آپ کو جہان بھر کے لوگوں کو مہمان بنانے سے منع نہیں کیا تھا؟''O (الحجر: ۷۰)

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم نے اس کے جواب میں کہا: ''قَالُوْۤا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ'': یعنی کیا ہم نے آپ سے یہ نہیں کہا تھا کہ آپ جہان کے لوگوں میں سے کسی کو بھی اپنا مہمان نہ بنائیں۔ دوسرا قول یہ ہے: کیا ہم نے یہ نہیں کہا تھا کہ آپ مسافروں کو شہر میں داخل نہ کریں، کیونکہ ہم مسافروں کے ساتھ بے حیائی کا کام کرتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''لوط نے کہا: ''یہ عورتیں میری قوم کی بیٹیاں ہیں، اگر تم نے اپنی خواہش (ضرور) پوری کرنی ہے تو ان سے نکاح کر لوO'' (الحجر: ۷۱)

آیت مذکورہ کے متعدد محامل

''قَالَ هٰۤؤُلَآءِ بَنٰتِیْۤ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ'': اس آیت کے متعدد محامل ہیں:

(۱) یعنی تم ان سے نکاح کر لو۔ اور ''بَنٰتِیْۤ'' کا لفظ بدل ہے یا بیان ہے۔

(۲) ''هٰۤؤُلَآءِ'' مبتداء ہے اور ''بَنٰتِیْۤ'' خبر ہے۔ اور یہاں پر کسی چیز کو محذوف ماننا ضروری ہے تاکہ فائدہ حاصل ہو اور وہ یہ ہے کہ تم اُن سے نکاح کر لو۔ یعنی یہ (میری قوم کی) بیٹیاں تمہارے مقصد کے حصول کے لیے زیادہ پاکیزہ ہیں۔

آیت مذکورہ کے دیگر متعدد تراجم اور ان پر مصنف کے تبصرے

(۱) اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان فاضل بریلوی متوفی ۱۳۴۰ھ، اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

''کہا یہ قوم کی عورتیں میری بیٹیاں ہیں اگر تمہیں کرنا ہے''۔

صدر الافاضل علامہ سید محمد نعیم الدین مراد آبادی حنفی متوفی ۱۳۶۷ھ، اس کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

''تو ان سے نکاح کرو اور حرام سے باز رہو''۔ (تفسیر خزائن العرفان مع ترجمہ کنز الایمان، ص ۴۹۶، مکتبۃ المدینہ، کراچی، ۱۴۳۲ھ)

میں کہتا ہوں کہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ اور صدر الافاضل کی تفسیر سے مل کر ایک مربوط معنی حاصل ہو گیا ہے۔ (سعیدی غفرلہٗ)

(۲) شیخ محمد جالندھری متوفی ۱۳۸۱ھ/ ۱۸۶۴ء، اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

''(انہوں نے) کہا کہ اگر تمہیں کرنا ہی ہے تو یہ میری (قوم کی) لڑکیاں ہیں (ان سے شادی کرلو)''۔

(ترجمہ قرآن، ص ۳۳۲، بیت القرآن، کراچی)

میں کہتا ہوں: یہ ترجمہ صحیح ہے۔ (سعیدی غفرلہ)

(۳) شیخ اشرف علی تھانوی دیو بندی متوفی ۱۳۶۴ھ، اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

''لوط علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ میری (بہو) بیٹیاں موجود ہیں اگر تم میرا کہنا کرو''۔

(ترجمہ قرآن مع تفسیر بیان القرآن ص ۳۲۰، مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور)

میں کہتا ہوں کہ اپنی بہو بیٹیوں کے متعلق تو کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ تم ان سے اپنی خواہش پوری کرلو، اس لیے یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے۔ (سعیدی غفرلہ)

(۴) شیخ عبدالماجد دریا آبادی متوفی ۱۳۹۷ھ/ ۱۹۷۷ء، اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

''(لوط نے) کہا یہ میری بیٹیاں بھی تو موجود ہیں اگر تمہیں کچھ کرنا ہی ہے''۔

(ترجمہ قرآن مع تفسیر ماجدی ص ۵۷۶، پاک کمپنی لاہور)

میں کہتا ہوں: اپنی بیٹیوں کے متعلق کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ تم ان سے اپنی خواہش پوری کرلو، اس لیے یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے۔ (سعیدی غفرلہ)

(۵) شیخ محمود الحسن دیو بندی متوفی ۱۳۳۹ھ، اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

''بولا یہ حاضر ہیں میری بیٹیاں اگر تم کو کرنا ہے''۔

(القرآن الکریم وترجمۃ معانیہ وتفسیرہ۔ ص ۳۵۱، الملک فہد بن عبدالعزیز آل سعود، المملکۃ العربیۃ السعودیہ)

میں کہتا ہوں: اپنی بیٹیوں کے متعلق کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ تم ان سے اپنی خواہش پوری کرلو، اس لیے یہ ترجمہ بھی صحیح نہیں ہے۔ (سعیدی غفرلہ)

(۶) سید ابوالاعلیٰ مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء، اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

''لوط نے عاجز ہو کر کہا: ''اگر تمہیں کچھ کرنا ہی ہے تو یہ میری بیٹیاں موجود ہیں''۔

(تفہیم القرآن، ج ۲ ص ۵۱۳، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور ۲۰۱۲ء)

میں کہتا ہوں: اپنی بیٹیوں کے متعلق کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ تم ان سے اپنی خواہش پوری کرلو، اس لیے یہ ترجمہ بھی صحیح نہیں ہے۔ (سعیدی غفرلہ)

امام محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ، الحجر: ۷۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اللہ کے نبی حضرت لوط علیہ السلام نے اُن لوگوں سے کہا کہ عورتوں سے نکاح کرو اور اُن کی مراد یہ تھی کہ اُن کی قوم کی بیٹیوں سے نکاح کر کے اپنی خواہش کو پورا کرو اور وہ اپنے مہمانوں کی عزت بچائیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''(اے رسولِ اکرم!) آپ کی زندگی کی قسم! یہ لوگ اپنے گناہ کی مستی پوری کرنے

میں اندھے ہو چکے تھے O" (الحجر:۷۲)

"لَعَمْرُكَ": (اے رسول اکرم!) آپ کی زندگی کی قسم!

ایک قول یہ ہے کہ فرشتوں نے حضرت لوط صلوات اللہ وسلامہ علیہ سے کہا: آپ کی زندگی کی قسم! بے شک یہ لوگ اپنے نشے میں حیران ہیں، اور قتادہ نے کہا: یہ لوگ اپنے نشہ میں کھیل رہے ہیں تو یہ آپ کی بات کو کیسے سمجھیں گے اور آپ کی نصیحت کی طرف کیسے توجہ کریں گے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی حیات کی قسم کھائی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اور کسی کی حیات کی قسم نہیں کھائی۔

ابوالجوزاء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی شخص سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مکرم نہیں پیدا فرمایا، اور اللہ تعالیٰ نے کسی ایک کی بھی زندگی کی قسم نہیں کھائی سوائے آپ کی زندگی کی قسم کے۔

ابن العربی نے کہا ہے کہ تمام مفسرین نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں پر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کی قسم آپ کی تعظیم کے اظہار کے لیے کھائی ہے۔

ابن العربی نے کہا ہے: اس سے کیا چیز مانع ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت لوط علیہ السلام کی زندگی کی قسم کھائیں اور اُن کو وہ تکریم اور تعظیم عطا فرمائیں جو وہ چاہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہر وہ فضیلت جو اللہ تعالیٰ نے حضرت لوط علیہ السلام کو عطا فرمائی، اس کی دگنی چوگنی فضیلت اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے نزدیک حضرت لوط علیہ السلام سے زیادہ مکرم ہیں، کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ سبحانہٗ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو الخلّۃ عطا فرمائی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تکلیم عطا فرمائی، اور یہ سب سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی عطا فرمایا، پس جب اللہ تعالیٰ نے حضرت لوط علیہ السلام کی حیات کی قسم کھائی تو سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کا اس سے زیادہ بلند مرتبہ ہے کہ آپ کی حیات کی قسم کھائی جائے۔

علامہ قرطبی نے کہا ہے کہ علامہ ابن العربی کا یہ کلام بہت عمدہ ہے اور حضرت لوط علیہ السلام کے قصہ میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی قسم کھانا جملہ معترضہ ہے۔

اس سوال کا جواب کہ اللہ تعالیٰ نے اور چیزوں کی بھی قسم کھائی ہے تو آپ کی زندگی کی قسم کھانے سے آپ کو کیا فضیلت حاصل ہوئی ہے؟

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے انجیر کی بھی قسم کھائی ہے اور زیتون کی بھی قسم کھائی ہے اور طور سینین کی بھی قسم کھائی ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی قسم کھانے میں آپ کے لیے کیا فضیلت ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جس چیز کی بھی اللہ عزوجل نے قسم کھائی، اس چیز کو اپنی نوع کی چیزوں پر فضیلت حاصل ہوتی ہے تو اسی طرح جب سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی قسم کھائی تو آپ کی زندگی کے لیے عظمت اور فضیلت حاصل ہوئی۔

مصنف کی طرف سے سوال مذکور کا جواب

ہر چیز کا مقابلہ اس کی جنس سے ہوتا ہے مثلاً یوں نہیں کہا جائے گا کہ آم کا باغ اچھا ہے یا فلاں کوٹھی اور فلاں بنگلہ اچھا ہے، کیونکہ آم کے باغ کا مقابلہ دوسرے پھلوں کے باغات سے ہوگا مثلاً یوں کہا جائے گا کہ آم کا باغ اچھا ہے یا سنگترے کا باغ اچھا ہے، اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے انجیر کی قسم کھائی تو یہ معلوم ہوا کہ پھلوں کی جنس میں انجیر سب سے افضل ہے اور جب زیتون کی قسم کھائی تو اس سے یہ معلوم ہوا کہ درختوں کی جنس میں سب سے افضل زیتون کا درخت ہے اور جب پہاڑ طور کی قسم کھائی تو اس سے یہ معلوم ہوا کہ پہاڑ تو دنیا میں بہت ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک جو پہاڑ عظمت والا ہے وہ پہاڑ طور ہے، اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے "لَعَمۡرُكَ" فرما کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی قسم کھائی تو اس سے یہ واضح فرمایا کہ زندگیاں تو بہت رسولوں نے گزاری تھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان میں سے کسی نبی اور کسی رسول کی زندگی کی قسم نہیں کھائی، صرف سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی گزاری ہوئی زندگی کی قسم کھائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبیوں اور رسولوں کی گزاری ہوئی زندگیوں میں سے جو زندگی اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ پسندیدہ ہے اور ان کی سب سے زیادہ محبوب ہے، وہ صرف سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی گزاری ہوئی زندگی ہے۔

جن خصوصیات کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گزاری ہوئی زندگی پسندیدہ اور محبوب ہے

(۱) عموماً کسی شخص کے دوسرے لوگ تو معتقد اور مداح ہو جاتے ہیں لیکن انسان کی بیوی اس کی معتقد اور مداح نہیں ہوتی، کیونکہ بیوی کے سامنے شوہر کی پوری زندگی کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہوتی ہے، وہ جانتی ہے کہ وہ امتحان کے موقع پر کس طرح جھک جاتا ہے، حرص اور طمع کے موقع پر کس طرح پھسل جاتا ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گزاری ہوئی زندگی کا یہ اعجاز اور کمال ہے کہ سب سے پہلے جو آپ کی نبوت پر ایمان لائیں وہ آپ کی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا تھیں۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے پہلی وحی کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: "اللہ ہرگز آپ کو شرمندہ ہونے نہیں دے گا، کیونکہ آپ رشتہ داروں سے ملاپ رکھتے ہیں، جو لوگ بوجھ نہیں اٹھا سکتے ان کا بوجھ اٹھاتے ہیں، جن کے پاس مال نہیں ہوتا انہیں کما کر لا کر دیتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت فرماتے ہیں، اور حق کے راستہ میں جو مشکلات پیش آتی ہیں، اس میں آپ لوگوں کی مدد فرماتے ہیں"۔ الحدیث۔ (صحیح البخاری: ۳، مسلم: ۱۶۰، ترمذی: ۳۶۳۲، مسند احمد: ۲۶۷۶۹)

(۲) عموماً نوکر، خادم اور غلام اپنے مالک اور آقا کا محب نہیں ہوتا، بلکہ اُن کے درمیان چپقلش اور تناؤ رہتا ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا کمال یہ تھا کہ جب آپ کے غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے ملنے اُن کے باپ اور چچا یمن سے آئے کہ وہ منہ مانگی قیمت دے کر حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو آپ کی غلامی سے چھڑا کر لے جائیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تو بغیر قیمت کے ہی اسے آزاد فرمانے پر راضی ہوں، تم اس سے تو پوچھ لو کہ وہ تمہارے ساتھ جانے پر راضی ہے یا میرے ساتھ رہنے پر؟ ان کے والد اور چچا کو حیرت ہوئی کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص آزادی پر غلامی کو ترجیح دے اور جب حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو انہوں نے کہا: یہ تو ایک آزادی کی بات ہے، اگر کئی آزادیاں بھی میسر ہوں تو میں محمد کی غلامی کو اُن آزادیوں پر ترجیح دوں گا۔

(الاصابہ للحافظ ابن حجر عسقلانی، ج ۲ ص ۴۹۵۔۴۹۶، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۵ھ، اسد الغابہ للجزری، ج ۲ ص ۳۵۲۔۳۵۳، دارالکتب العلمیہ، بیروت)

(۳) رسول اکرم ﷺ نے زندگی باقی رسولوں سے کم پائی اور پیروکار آپ نے سب سے زیادہ چھوڑے تو گویا آپ کی ایسی زندگی ہے کہ اس زندگی کے کمال کا اعتراف سب سے پہلے آپ کی زوجہ محترمہ نے کیا، پھر آپ کے غلام نے کیا، اور پھر اس زندگی کو جس نے قریب سے دیکھا وہ اتنی جلدی مشرف بہ اسلام ہو گیا اور جس نے جتنی دیر سے یا دور سے آپ کی زندگی کو دیکھا تو وہ اتنی دیر سے اسلام لایا۔ (سعیدی غفرلہ)

"اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ": یہ لوگ اپنے گناہ کی مستی پوری کرنے میں اندھے ہو چکے تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پھر سورج کے روشن ہوتے ہی ایک کڑک نے اُن لوگوں کو پکڑ لیاO" (الحجر: ۷۳)

"فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ": اس آیت میں یہ ذکر نہیں فرمایا کہ وہ کڑک کیا چیز تھی، اگر کسی قوی دلیل سے ثابت ہو کہ وہ حضرت جبریل علیہ السلام کی چیخ تھی تو اس کو مانا جائے گا ورنہ اس آیت میں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس آیت سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس ایک ہلاک کرنے والی کڑک کی آواز آئی۔

"مُشْرِقِيْنَ": یعنی جس وقت کہ وہ لوگ صبح کے وقت میں داخل ہوئے تھے اور سورج نے چمکنا شروع کیا تھا، گویا کہ عذاب کی ابتداء اس وقت ہوئی جب سورج کی روشنی پھیل چکی تھی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پس ہم نے اُن کی بستیوں کے اوپر والے حصہ کو نیچے کر دیا اور اُن پر پکی ہوئی مٹی کے پتھروں کی بارش برسا دیO" (الحجر: ۷۴)

"فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ": اس آیت کی مکمل تفسیر الھود: ۸۲ میں گزر چکی ہے۔

مجاہد نے کہا: شروع میں پتھر برسائے اور آخر میں مٹی کے ڈھیلے برسائے۔ حسن بصری نے کہا: پتھروں کی اصل مضبوط مٹی تھی جس کو گوندھا ہوا تھا۔ الضحاک نے کہا: یعنی وہ پکی اینٹیں تھیں۔ ایک قول یہ ہے کہ "سجیل" آسمان دنیا کا نام ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ وہ آسمانوں میں پہاڑ ہے۔ امام ابن جوزی نے لکھا ہے کہ یہ حضرت جبریل علیہ السلام کی چیخ تھی۔ (زاد المسیر ج ۴ ص ۴۰۹)

امام رازی نے فرمایا: اس آیت میں اس پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ حضرت جبریل علیہ السلام کی چیخ تھی، اگر یہ قول کسی دلیل قوی سے ثابت ہو تو اس کو اختیار کیا جائے، ورنہ آیت سے تو صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ایک زبردست اور ہولناک چیخ نے ان کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر تین قسم کے عذاب آئے تھے: ایک تو زبردست ہولناک چنگھاڑ تھی۔ دوسرے ان کی زمین کو پلٹ دیا گیا تھا اور تیسرا ان پر کھنگر کی کنکریاں برسائی تھیں۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ سجیل کا معنی ہے پکی ہوئی مٹی کے پتھر۔ بعض علماء نے کہا کہ ہر پتھر پر ایک شخص کا نام تھا اور اسی پر جا کر یہ پتھر لگتا تھا۔ بعض نے کہا: یہ عذاب الٰہی کے مخصوص پتھر تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "بے شک اِن واقعات میں عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیںO" (الحجر: ۷۵)

"اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِیْنَ": "توسم" کا معنی ہے علامت۔

مختصر یہ کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے ان بستیوں کو اٹھا کر آسمان کے قریب سے نیچے پٹخ دیا اور اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا حصہ اوپر کر دیا، جس طرح یہ اپنے ہم جنس مردوں کو پلٹ کر ان سے لذت کشید کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی طرح ان پر ان کی بستیوں کو پلٹ دیا۔ پھر ان کی ذلت اور رسوائی کے لیے ان کے اوپر کنکر اور پتھر برسائے گئے اور ہر پتھر نشان زدہ تھا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور بے شک وہ بستیاں عام شاہراہ پر واقع ہیں O" (الحجر: ۷۶)

"وَاِنَّهَا لَبِسَبِیْلٍ مُّقِیْمٍ": بظاہر یہ ضمیر مدینہ یعنی شہر یا القریٰ یعنی بستیوں کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ یہ طریق واضح پر تھا۔ مجاہد نے کہا: یہ طریق معلوم پر تھا جو مخفی نہیں ہے۔

سید ابو الاعلیٰ مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء، لکھتے ہیں:

یعنی حجاز سے شام اور عراق سے مصر جاتے ہوئے یہ تباہ شدہ علاقہ راستے میں پڑتا ہے۔ اور عموماً قافلوں کے لوگ تباہی کے ان آثار کو دیکھتے ہیں جو اس پورے علاقے میں آج تک نمایاں ہیں۔ یہ علاقہ بحر لوط (بحیرہ مردار) کے مشرق اور جنوب میں واقع ہے اور خصوصیت کے ساتھ اس کے جنوبی حصے کے متعلق جغرافیہ دانوں کا بیان ہے کہ یہاں اس درجے ویرانی پائی جاتی ہے جس کی نظیر روئے زمین پر کہیں اور نہیں دیکھی گئی۔ (تفہیم القرآن ج ۲ ص ۵۱۵، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۲۰۱۲ء)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "بے شک اِن واقعات میں مومنین کے لیے ضرور نشانی ہے O" (الحجر: ۷۷)

"اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ": یعنی ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہو اور انبیاء اور رسولوں کی تصدیق کرتا ہو تو اس کے لیے اس میں نشانیاں ہیں۔ یہ معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ جاہلوں کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کی بناء پر سزا دیتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور بے شک گھنے جنگل والے لوگ ظلم کرنے والے تھے O" (الحجر: ۷۸)

"وَاِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَیْكَةِ لَظٰلِمِیْنَ": اس آیت میں "اِنْ" مخففہ ہے اور لام تاکید کے لیے ہے اور الایکہ گھنے درختوں کو کہتے ہیں، اس کا واحد الأیک ہے۔

اور "اصحاب الأیکہ" حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کا نام ہے اور یہ لوگ گھنے درختوں میں رہتے تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "سو ہم نے اُن کو سزا دی اور قومِ لوط اور ایکہ کی بستیاں کھلی ہوئی شاہراہ پر واقع ہیں O" (الحجر: ۷۹)

"فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ": روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن پر سات دن سخت گرمی کے مسلط فرمائے، پھر اللہ تعالیٰ نے اُن کی طرف ایک بادل بھیجا، وہ اس بادل کے نیچے ٹھنڈک کے حصول کے لیے پناہ لینے کے لیے آئے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے اوپر آگ بھیجی جس نے اُن کو جلا ڈالا، پس اس دن کو "یوم الظلة" کا عذاب کہا جاتا ہے۔

"وَاِنَّهُمَا": اس آیت میں تثنیہ کی ضمیر کے مصداق کے متعلق متعدد اقوال ہیں:

(۱) زیادہ راجح قول یہ ہے کہ اس سے مراد قوم لوط اور اصحاب الأیکہ ہیں، یعنی حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ یہ ضمیر حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہما السلام کی طرف لوٹ رہی ہے۔

(۳) تیسرا قول یہ ہے کہ یہ ضمیر حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی ہلاکت کی طرف اور حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کی ہلاکت کی طرف لوٹ رہی ہے۔ "لَبِاِمَامٍ مُّبِیْنٍ": یعنی وہ ایک واضح شاہراہ پر ہے۔

الفراء اور الزجاج نے کہا: اس راستہ کو امام فرمایا ہے، کیونکہ وہ راستہ لوگوں کو راہ دکھاتا ہے اور اس کی پیروی کی جاتی ہے۔

اور ابن قتیبہ نے کہا: مسافر اس راستہ سے ہدایت پاتا ہے اور اس جگہ پہنچتا ہے جہاں پہنچنے کا اس نے ارادہ کیا ہو۔

اور اس آیت میں "مُّبِیْنٍ" فرمایا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ وہ راستہ فی نفسہ واضح تھا۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ دوسروں کے لیے مُّبِیْنٍ ہو، کیونکہ راستہ جانے والوں کے مقصد کی طرف ہدایت دیتا ہے۔

(اللباب فی علوم الکتاب، ج ۱۱ ص ۴۷۳۔ ۴۸۳، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۶ھ، وتفاسیر اخریٰ)

وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۸۰﴾

اور بے شک وادیٔ حجر کے رہنے والوں (یعنی قوم ثمود) نے رسولوں کی تکذیب کی O

وَاٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۸۱﴾

اور ہم نے انہیں اپنی نشانیاں عطا فرمائی تھیں سو وہ اُن نشانیوں سے منہ موڑنے والے تھے O

وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ ﴿۸۲﴾

اور وہ بے خوف و خطر پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے تھے O

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ ﴿۸۳﴾

پس صبح ہوتے ہی ایک گرج دار کڑک نے اُن کو پکڑ لیا O

فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۴﴾

پس اُن کے کیے ہوئے کام اُن کو اس عذاب سے بالکل نہ بچا سکے O

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ﴿۸۵﴾

اور ہم نے آسمانوں اور زمینوں کو اور جو کچھ اُن کے درمیان میں ہے صرف حق کے ساتھ پیدا فرمایا ہے، اور بے شک قیامت ضرور آنے والی ہے، پس آپ خوش اسلوبی سے درگزر فرمائیں O

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ ﴿۸۶﴾

بے شک آپ کے رب ہی ہیں جو بہت پیدا فرمانے والے، سب کچھ جاننے والے ہیں O

وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ ﴿۸۷﴾

اور بے شک ہم نے آپ کو (نماز میں) بار بار پڑھی جانے والی سات آیات (سورۂ فاتحہ) اور قرآن عظیم عطا فرمایا ہے O

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿۸۸﴾

(اے رسول اکرم!) آپ اس دنیاوی ساز و سامان کی طرف اپنی آنکھیں اٹھا کر (حسرت سے) نہ دیکھیں جو ساز و سامان ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے کافروں کو عطا فرمایا ہوا ہے، اور نہ اُن کے پر تعیش احوال کو دیکھ کر متاسف ہوں، اور اپنے بازو مومنوں کے لیے جھکائے رکھیں O

وَقُلْ إِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْمُبِينُ ﴿۸۹﴾

اور (اے رسول اکرم!) آپ کہیے: بے شک میں اللہ کے عذاب سے کھلا کھلا ڈرانے والا ہوں O

كَمَا أَنزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِينَ ﴿۹۰﴾

جس طرح ہم نے اُن لوگوں پر عذاب نازل فرمایا تھا جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا تھا O

الَّذِينَ جَعَلُوا الْقُرْآنَ عِضِينَ ﴿۹۱﴾

جن لوگوں نے بعض قرآن کو مان کر اور بعض قرآن کا انکار کر کے حصوں میں تقسیم کر دیا تھا O

فَوَرَبِّكَ لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۹۲﴾

(اے رسول اکرم!) آپ کے رب کی قسم! ہم ضرور بہ ضرور ان سب سے سوال کریں گے O

عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۹۳﴾

ان کاموں کے متعلق جو وہ کیا کرتے تھے O

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ﴿۹۴﴾

(اے رسول اکرم!) آپ کو جو حکم فرمایا جاتا ہے، اس کو علی الاعلان سنا دیجئے اور مشرکین سے اعراض کرتے رہیے O

اِنَّا كَفَیْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِیْنَ ﴿۹۵﴾

ہم آپ کو استہزاء کرنے والوں کے شر سے بچانے کے لیے کافی ہیں O

الَّذِیْنَ یَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾

جو لوگ اللہ کے ساتھ دوسرا عبادت کا مستحق بناتے ہیں، سو وہ عنقریب اپنی سزا کو جان لیں گے O

وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ یَضِیْقُ صَدْرُكَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ ﴿۹۷﴾

اور بے شک ہم خوب جانتے ہیں کہ کفار کے استہزاء سے آپ کا دل تنگ ہوتا ہے O

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ كُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ ﴿۹۸﴾

پس آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے رہیے اور سجدہ کرنے والوں میں سے رہیے O

وَ اعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰی یَاْتِیَكَ الْیَقِیْنُ ﴿۹۹﴾ ع

اور تا حیات اپنے رب کی عبادت کرتے رہیے حتی کہ آپ کے پاس اللہ کا یقینی حکم آجائے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور بے شک وادئ حجر کے رہنے والوں (یعنی قوم ثمود) نے رسولوں کی تکذیب کی O'' (الحجر: ۸۰)

علامہ ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ، الحجر: ۸۰ تا ۹۹ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اَصْحٰبُ الْحِجْرِ'' کا مصداق

''وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ'': اَصْحٰبُ الْحِجْرِ سے مراد وہ لوگ ہیں جو حضرت صالح علیہ السلام کی قوم ثمود کے شہر میں رہنے والے تھے۔ اور یہ مدینہ اور شام کے درمیان ایک شہر ہے۔

''الْمُرْسَلِیْنَ'': اس آیت میں فرمایا ہے کہ ان لوگوں نے رسولوں کی تکذیب کی، حالانکہ ان لوگوں نے صرف حضرت صالح علیہ السلام کی تکذیب کی تھی۔ اور یہاں پر جمع کے صیغہ سے ''الْمُرْسَلِیْنَ'' اس لیے فرمایا کہ جو ایک رسول کی تکذیب کرے وہ در حقیقت تمام رسولوں کی تکذیب کرتا ہے، کیونکہ ایک رسول بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہی پیغام لے کر آتے ہیں جو تمام رسول، اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام لے کر آتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور ہم نے انہیں اپنی نشانیاں عطا فرمائی تھیں سو وہ اُن نشانیوں سے مونہہ موڑنے والے تھے O'' (الحجر: ۸۱)

''وَاٰتَیْنٰهُمْ اٰیٰتِنَا'': یعنی حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی، اور اس اونٹنی کا بچہ اور کنواں۔ یہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے

نشانیاں ہیں، کیونکہ وہ اونٹنی ایک چٹان سے نکلی تھی۔

"فَكَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ": اور حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کے کفار ان نشانیوں سے اعراض کرنے والے تھے۔

حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی نکالنے کا معجزہ

علامہ بدرالدین ابومحمد محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ لکھتے ہیں:

حضرت صالح علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی توحید کی طرف دعوت فرمائی تو انہوں نے اس معجزہ کا مطالبہ کیا کہ وہ اونٹنی نکال کر دکھائیں کیونکہ وہ اونٹ پالنے والے لوگ تھے اور ان کے ہاں اونٹنیاں بہت کمیاب تھیں، انہوں نے کہا: وہ اونٹنی گہری سیاہ ہو اور وہ دس ماہ کی ہو، حضرت صالح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی کہ ان کو کھلی جگہ پر لے جائیں، پس حضرت صالح علیہ السلام ان کو لے گئے، پھر پوچھا: تم کہاں سے چاہتے ہو کہ میں اونٹنی نکالوں، تو انہوں نے ایک چٹان کی طرف اشارہ کیا، حضرت صالح علیہ السلام نے کہا: اللہ کے اذن سے نکل آ! تو وہ چٹان پھٹی اور اس کے اندر سے ایسی ہی اونٹنی نکل آئی جس طرح کی اونٹنی کا انہوں نے مطالبہ کیا تھا، پھر اس کے پیچھے اس کا بچہ بھی نکل آیا، یہ دیکھ کر حاضرین میں سے بہت لوگ ایمان لے آئے، ان کا بادشاہ بھی ایمان لے آیا، اور بعض لوگوں نے تکذیب کی اور بادشاہ کے بھائی نے حضرت صالح علیہ السلام کی تکذیب کی۔

(عمدۃ القاری ج ۱۵ ص ۷۷۔ ۷۸ ۳، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۱ھ)

قوم ثمود کے کنوئیں سے پانی لینے کی ممانعت کے متعلق حدیث صحیح

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوہ تبوک میں وادی الحجر میں پہنچے تو آپ نے صحابہ کو حکم دیا کہ اس کے کنوئیں سے پانی نہ پئیں اور نہ اس سے (اپنے جانوروں کو) پانی پلائیں، صحابہ نے کہا: ہم تو اس کے پانی سے آٹا گوندھ چکے ہیں اور پانی نکال چکے ہیں، تو آپ نے حکم دیا کہ اس آٹے کو پھینک دیں اور اس پانی کو گرا دیں۔ سبرہ بن معبد اور ابی شموس سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طعام کو پھینکنے کا حکم دیا اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اس پانی سے آٹا گوندھا۔ (صحیح البخاری: ۳۳۷۸، ۴۴۳۹، صحیح مسلم: ۲۹۸۱، الرقم المسلسل: ۷۳۶۰)

اس حدیث میں مذکور ہے: جب آپ وادیٔ حجر میں پہنچے۔ اس سے مراد وہ جگہ ہے جہاں ثمود کے مکانات ہیں۔

اس حدیث میں مذکور ہے: اس پانی کو گرا دیں۔ آپ نے یہ حکم اس لیے فرمایا تھا کہ صحابہ اس پانی کو نہ پئیں تاکہ ان میں قوم ثمود کی سنگ دلی نہ پیدا ہو جائے، یا اس سے انہیں کوئی اور ضرر نہ پہنچے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قوم ثمود کے کنوؤں سے پانی لینا مکروہ ہے اور اسی کے حکم میں ان کنوؤں اور چشموں کا پانی ہے جن اقوام کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی وجہ سے عذاب دیا گیا تھا۔ اور اس میں اختلاف ہے کہ یہ کراہت تحریمی ہے یا تنزیہی ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور وہ بے خوف وخطر پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے تھے O" (الحجر: ۸۲)

"وَكَانُوا يَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا آمِنِينَ":

اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں کہ قوم ثمود جو حضرت صالح علیہ السلام کی قوم تھی، وہ پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے تھے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ

کے عذاب سے بچ جائیں۔ دوسرا قول یہ ہے: تاکہ اُن کے گھر تباہ و برباد ہونے سے بچ جائیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''پس صبح ہوتے ہی ایک گرج دار کڑک نے اُن کو پکڑ لیاO'' (الحجر: ۸۳)

''فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ '': یعنی صبح کے وقت اُن کو چیخ کے عذاب نے پکڑ لیا، اور یہ چوتھا دن تھا جس دن اُن پر عذاب بھیجنے کا وعدہ فرمایا گیا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ۝ (ہود: ۶۵)'' (سو صالح کی قوم نے اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں، تب صالح نے کہا: ''تم اپنے اپنے گھروں میں تین دن تک فائدہ اٹھاتے رہو (یعنی تم صرف تین دن تک زندہ رہو گے)، یہ اللہ کا برحق وعدہ ہے اور اس میں جھوٹ نہیں ہےO'')۔

پھر چوتھے دن صبح کے وقت ان کو چیخ کے عذاب نے پکڑ لیا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''پس اُن کے کئے ہوئے کام اُن کو اس عذاب سے بالکل نہ بچا سکےO'' (الحجر: ۸۴)

''فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ '': یعنی قوم ثمود اللہ تعالیٰ کا شریک قرار دیتی تھی اور دوسرے برے کام کرتی تھی۔ پھر جن کو انہوں نے اللہ تعالیٰ کا شریک بنایا تھا اور اُن کے دیگر اعمال خبیثہ اُن سے اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دور نہ کر سکے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور ہم نے آسمانوں اور زمینوں کو اور جو کچھ اُن کے درمیان میں ہے صرف حق کے ساتھ پیدا فرمایا ہے، اور بے شک قیامت ضرور آنے والی ہے، پس آپ خوش اسلوبی سے درگزر فرمائیںO'' (الحجر: ۸۵)

''وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ '':

اس آیت سے اللہ عزوجل نے یہ قصد فرمایا ہے کہ جو پچھلی امتیں گزر چکی ہیں جن کے اس سورت میں واقعات بیان فرمائے تھے اور ان قوموں کو اُن کے کفر اور شرک پر سزا دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آسمان سے عذاب نازل فرمایا، سو یہ عذاب اس لیے نازل فرمایا کہ انہوں نے زمین و آسمان میں بغیر کسی دلیل کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک قرار دیے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، تم ان کے گھروں میں نہ داخل ہونا مگر اس حال میں کہ تم رونے والے ہو، کہیں تم پر بھی ایسا عذاب نازل نہ ہو جائے جو ان پر نازل ہوا تھا۔

(صحیح البخاری: ۴۳۷۹، ۴۳۸۰، ۴۳۸۱، صحیح مسلم: ۲۹۸۰، ۲۹۸۱، شرح السنۃ للبغوی: ۴۰۶۰، مسند احمد ج ۲ ص ۶۶، المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۳۱۷۵، صحیح ابن حبان: ۶۱۹۹، ۶۲۰۱، دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۵ ص ۲۳۳، ج ۵ ص ۲۳۵، السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۲ ص ۴۵۱)

''وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ '': یعنی قیامت ضرور آنے والی ہے۔ اور اس دن نیکوکار کو اس کی نیکیوں پر جزا دی جائے گی اور بدکار کو اس کی برائیوں پر سزا دی جائے گی۔

''فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ '': یعنی آپ اُن سے اعراض کیجئے اور اُن کو معاف کر دیجئے۔ یہ حکم جہاد کی آیت سے منسوخ ہو چکا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو منسوخ فرما دیا اور اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو قتل کرنے کا حکم فرمایا حتیٰ کہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ

عزوجل کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، اور یہ کہ محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، اس کے سوا ان سے اور کوئی چیز قبول نہیں کی جائے گی۔ اور یہ حکم آیت قتال سے منسوخ ہو گیا اور وہ آیت یہ ہے:

"فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَ خُذُوْهُمْ وَ احْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝" (التوبہ: ۵) (پھر جب حرمت والے چار مہینے ختم ہو جائیں تو (اے مسلمانو!) ان مشرکین کو جہاں پاؤ وہیں قتل کر دو اور انہیں گرفتار کر لو اور ان کا محاصرہ کرو اور ان کی تاک میں ہر گھات کی جگہ بیٹھو، پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو اُن کا راستہ چھوڑ دو، بے شک اللہ سب سے زیادہ بخشنے والے، سب سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں ۝)۔

اور مجاہد نے بیان کیا ہے کہ جہاد کے حکم سے پہلے آپ اُن کی بدسلوکیوں پر درگزر فرمائیں۔

اور سفیان بن عیینہ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہ حکم جہاد کا حکم نازل ہونے سے پہلے کا تھا، پس جب جہاد کا حکم نازل ہو گیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین کے خلاف جہاد کا حکم فرمایا گیا، پس آپ نے اُن سے قتال فرمایا اور آپ نے فرمایا: میں نبی الرحمۃ ہوں اور نبی الملحمۃ ہوں یعنی جنگ کا بھی نبی ہوں، اور مجھے کفار سے قتال کا حکم فرمایا گیا ہے اور مجھے کھیتی باڑی کا حکم نہیں فرمایا گیا۔ (طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۰۵، تفسیر طبری، ج ۱۴ ص ۱۰۷، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۳۲ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "بے شک آپ کے رب ہی ہیں جو بہت پیدا فرمانے والے، سب کچھ جاننے والے ہیں ۝" (الحجر: ۸۶)

"اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ": یعنی آپ کے رب تمام مخلوقات کی تدبیر فرمانے والے ہیں اور سب کچھ جاننے والے ہیں کہ کون موافقین میں سے ہیں اور کون نفاق کرنے والے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور بے شک ہم نے آپ کو (نماز میں) بار بار پڑھی جانے والی سات آیات (سورۂ فاتحہ) اور قرآنِ عظیم عطا فرمایا ہے ۝" (الحجر: ۸۷)

"السبع المثانی" کا مصداق

"وَ لَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ":

علماء کا "السبع المثانی" کے متعلق اختلاف ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابو ہریرہ، حضرت الربیع بن انس رضی اللہ عنہم اور ابو العالیہ اور حسن بصری وغیرہم نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد اسانید کے ساتھ ثابت ہے کہ حضرت ابی بن کعب اور حضرت سعید بن المعلی رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اس سے مراد سورۃ الفاتحہ ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ام القرآن ہی السبع المثانی ہے اور قرآن عظیم ہے۔

(صحیح البخاری: ۴۷۰۴، سنن ابو داؤد: ۱۴۵۷، سنن ترمذی: ۳۱۲۴)

سورۂ فاتحہ کو ام القرآن کہنے کی توجیہ

السبع المثانی سے مراد سورۂ فاتحہ ہے اور اس کو ام القرآن اس لئے فرمایا ہے کہ یہ قرآن مجید کے ان معانی پر مشتمل ہے:
اللہ عزوجل کی ثناء، اللہ عزوجل کے احکام پر عمل کرنے کا ذکر، اور وعد اور وعید، اور اس میں اصول ثلاثہ کا ذکر ہے اور وہ مبداء، معاش اور معاد ہیں اور اس حدیث میں ابن سیرین کے اس قول کا رد ہے کہ سورۂ فاتحہ کو ام القرآن نہ کہو کیونکہ ام الکتاب تو صرف لوح محفوظ ہے۔

"وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ":

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ السبع المثانی، یہ فاتحۃ الکتاب ہے اور القرآن العظیم پورا قرآن ہے۔

سورۂ فاتحہ کو مثانی فرمانے کی متعدد توجیہات

(۱) اس میں اختلاف ہے کہ سورۂ فاتحہ کو مثانی کیوں فرمایا گیا ہے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حسن بصری اور قتادہ نے کہا: اس لئے کہ ہر نماز میں سورۂ فاتحہ کو دو مرتبہ پڑھا جاتا ہے۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ اللہ عزوجل اور بندہ کے درمیان نصف نصف تقسیم کر دی گئی ہے۔ سورۃ الفاتحہ کا نصف اللہ عزوجل کی ثناء ہے اور باقی نصف اللہ عزوجل سے دعا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے نماز پڑھی اور اس میں ام القرآن (سورۂ فاتحہ) کو نہیں پڑھا تو آپ نے تین مرتبہ فرمایا: اس کی نماز ناقص ہے مکمل نہیں ہے، پس حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ ہم امام کے پیچھے ہوتے ہیں تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: تم سورۂ فاتحہ کو دل میں پڑھو کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: صلوٰۃ (نماز) میرے اور میرے بندہ کے درمیان آدھی آدھی تقسیم کر دی گئی ہے اور میرے بندہ کے لیے وہ چیز ہے جس کا اس نے سوال کیا، پس جب بندہ کہتا ہے "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝" (الفاتحہ:۱) تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: میرے بندہ نے میری حمد کی، اور جب بندہ کہتا ہے "الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝" (الفاتحہ:۲) تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: میرے بندہ نے میری ثناء کی، اور جب بندہ کہتا ہے: "مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝" (الفاتحہ:۳) تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: میرے بندہ نے میری تعظیم کی، اور کبھی فرمایا: بندہ نے خود کو میرے سپرد کر دیا، پس جب بندہ کہتا ہے "اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۝" (الفاتحہ:۴) تو اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں: یہ آیت میرے اور میرے بندہ کے درمیان ہے اور میرے بندہ کے لیے وہ چیز ہے جس کا اس نے سوال کیا ہے، پس جب بندہ کہتا ہے: "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝" (الفاتحہ:۵) "صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ (الفاتحہ:۶)" "غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّیْنَ (الفاتحہ:۷)" تو اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں: یہ آیت میرے بندہ کے لیے ہے اور میرے بندہ کے لیے وہ چیز ہے جس کا اس نے سوال کیا ہے۔

(صحیح مسلم: ۳۹۵ الرقم المسلسل: ۷۶۴، سنن ابن ماجہ: ۳۷۸۴، سنن ابوداؤد: ۸۲۱، سنن ترمذی: ۲۹۵۳، موطا امام مالک: ۲۷۸، مصنف عبدالرزاق الصنعانی ج ۲ ص ۱۲۸، مسند الحمیدی: ۱۰۰۳، مسند اسحاق بن راہویہ: ۳۲۳، مسند احمد: ۷۲۹۱، ۷۸۳۲، ۹۹۳۲، خلق افعال العباد

للبخاری ج ۱ ص ۴۸ ،القراءۃ خلف الامام للبخاری: ۱۲، ۴۳، ۵، ۴۳ ،مسند البزار: ۸۷۷۹ ،السنن الکبریٰ للنسائی: ۹۰۹ ،صحیح ابن خزیمہ: ۵۰۲ ،حدیث السراج: ۲۵۱۰ ،مستخرج ابی عوانہ: ۱۶۷۳ ،شرح مشکل الآثار: ۵۳۱۱ ،صحیح ابن حبان: ۷۷۶ ،مسند الشامیین للطبرانی: ۱۲۲ ،الاسماء والصفات للبیہقی: ۲۳۶۵ ،شعب الایمان للبیہقی: ۲۱۳۷ ،معرفۃ السنن والآثار: ۳۰۲۳ ،شرح السنۃ للبغوی: ۸۷۸ ،جمع ابن عساکر: ۵۳۱ ،کشف المشکل ج ۳ ص ۵۸۳ ،الجامع الصحیح للسنن والمسانید ج ۱۷ ص ۲۲۱ ،المسند الموضوعی الجامع للکتب العشرۃ ج ۵ ص ۴۳۵)

(۳) الحسین بن الفضل نے کہا: سورۂ فاتحہ کا نام مثانی اس لیے رکھا گیا ہے کہ سورۂ فاتحہ دو مرتبہ نازل ہوئی ہے، ایک مرتبہ مکہ میں اور دوسری مرتبہ مدینہ میں، اور ہر مرتبہ اس کے ساتھ ستر ہزار فرشتے تھے۔

(۴) مجاہد نے کہا: سورۂ فاتحہ کا نام مثانی اس لیے رکھا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا استثناء فرمایا اور اس کو اس امت کے لیے ذخیرہ بنادیا۔ اور اس امت کے سوا کسی اور کو یہ سورت نہیں عطا فرمائی گئی۔

(۵) ابوزید البلخی نے کہا: سورۂ فاتحہ کو مثانی اس لیے فرمایا ہے کہ یہ فساق کو فسق سے موڑتی ہے جس طرح لگام سے سواری کو موڑا جاتا ہے، اور دوسرا قول یہ ہے: کیونکہ اس سورت کے اول میں اللہ عزوجل کی ثناء ہے، اس لیے اس کو مثانی فرمایا ہے۔

(۶) طاؤس نے کہا: پورا قرآن مثانی ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ ﳓ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْۚ ثُمَّ تَلِیْنُ جُلُوْدُهُمْ وَ قُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِؕ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ یَهْدِیْ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُؕ وَ مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ (الزمر: ۲۳)'' (اللہ نے بہت حسین کلام نازل فرمایا، جس کی آیتیں (محاسن میں) ایک دوسری سے ملتی اور بار بار دہرائی جاتی ہیں، اس سے ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، پھر ان کی کھالیں اور ان کے دل اللہ کے ذکر کے وقت نرم ہوجاتے ہیں، یہ اللہ کی ہدایت ہے وہ اس کے ذریعے جسے چاہتے ہیں ہدایت عطا فرماتے ہیں، اور جسے اللہ گمراہی میں چھوڑ دیں اس کے لیے کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے O)۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پورے قرآن مجید کو مثانی فرمایا ہے، کیونکہ پورے قرآن مجید کی آیات بار بار دہرائی جاتی ہیں۔

قرآن مجید کو مثانی اس لیے فرمایا ہے کہ اس میں انبیاء علیہم السلام اور اُن کے واقعات بار بار دہرائے جاتے ہیں۔

(معالم التنزیل ج ۳ ص ۶۴ ۔ ۶۵، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

''السبع المثانی'' کے متعدد مصادیق

شیخ محمد بن علی بن محمد الشوکانی المتوفی ۱۲۵۰ھ، الحجر: ۸۷ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

جمہور مفسرین نے کہا ہے کہ السبع المثانی سے مراد سورۃ الفاتحہ ہے۔ الواحدی نے کہا اور اکثر مفسرین اس پر متفق ہیں کہ السبع المثانی فاتحۃ الکتاب ہے اور یہی حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم کا قول ہے۔

اور حسن بصری، مجاہد، قتادہ، الربیع اور الکلبی کا بھی یہی مختار ہے۔

دوسرا قول یہ ہے السبع المثانی سے مراد ''السبع الطوال'' ہے (یعنی سات لمبی سورتیں) اور وہ یہ ہیں:

(۱) البقرہ (۲) آل عمران (۳) النساء (۴) المائدہ (۵) الانعام (۶) الاعراف اور (۷) الانفال اور التوبہ، کیونکہ یہ دونوں سورتیں ایک سورت کے حکم میں ہیں، کیونکہ ان دونوں سورتوں کے درمیان بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نہیں لکھی جاتی۔

تیسرا قول یہ ہے کہ السبع المثانی سے مراد قرآن مجید پڑھنے کی سات منزلیں ہیں، اور قول اول کی بناء پر سورۂ فاتحہ کو مثانی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا ہر نماز میں تکرار کیا جاتا ہے اور دو مرتبہ پڑھا جاتا ہے۔ اور جس قول میں فرمایا ہے کہ یہ السبع الطوال ہیں تو اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ عبرت آمیز واقعات، احکام اور حدود ان سورتوں میں بار بار ذکر کیے گئے ہیں۔ اور جس قول میں یہ کہا ہے کہ یہ سات منزلیں ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان سات منزلوں میں قرآن مجید کے قصص اور واقعات کو بار بار ذکر کیا گیا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ السبع المثانی سے مراد پورا قرآن ہے جیسا کہ الزمر: ۲۳ میں اس کا بیان ہے۔

چوتھا قول یہ ہے کہ السبع المثانی سے مراد قرآن مجید کی اقسام ہیں اور وہ یہ ہیں:

(۱) امر (جن کاموں کا اللہ عزوجل نے حکم دیا ہے)۔ (۲) نہی (جن کاموں سے اللہ عزوجل نے منع فرمایا ہے)۔

(۳) تبشیر (یعنی نیک کاموں پر ثواب کی بشارت دینا)۔ (۴) الانذار (یعنی برے کاموں پر عذاب سے ڈرانا)۔

(۵) مثالوں کا بیان (۶) نعمتوں کی تعریف (۷) اور گزشتہ امتوں کی خبریں۔

زیاد بن ابی مریم نے کہا کہ سورۃ الفاتحہ کو مثانی کا نام دینا اس کو مستلزم نہیں ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور کا نام مثانی نہ ہو۔
(فتح القدیر، ج ۳ ص ۱۹۵، دار الوفاء، المنصورہ، ۱۴۱۸ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "(اے رسولِ اکرم!) آپ اس دنیاوی ساز وسامان کی طرف اپنی آنکھیں اٹھا کر (حسرت سے) نہ دیکھیں جو ساز وسامان ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے کافروں کو عطا فرمایا ہوا ہے، اور نہ اُن کے پر تعیش احوال کو دیکھ کر متاسف ہوں، اور اپنے بازو مومنوں کے لیے جھکائے رکھیں O" (الحجر: ۸۸)

"لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا": یعنی اے محمد! (صلی اللہ علیک وسلم)۔

یعنی ہم نے ان کافروں کو جو مختلف اقسام کے ساز وسامان عطا فرمائے ہیں، ان کی طرف آپ آنکھیں اٹھا کر نہ دیکھیں۔

"مِّنْهُمْ": یعنی اُن کافروں کو جو ہم نے ساز وسامان عطا فرمائے ہیں، آپ ان ساز وسامان کی طرف ان کی تمنا کرتے ہوئے نہ دیکھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں رغبت کرنے سے منع فرمایا ہے۔

"وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ": اور اس دنیاوی ساز وسامان کے نہ ملنے کی وجہ سے آپ مغموم نہ ہوں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم ہرگز کسی فاسق وفاجر کے پاس کوئی نعمت دیکھ کر اس پر رشک نہ کرنا، کیونکہ تم نہیں جانتے کہ وہ اپنے مرنے کے بعد کس چیز سے ملاقات کرے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کے لیے ایک قاتل ہے جو مرے گا نہیں، ابن ابی مریم نے کہا: اس قاتل سے مراد دوزخ ہے۔
(شرح السنۃ للبغوی: ۳۹۹۸، المعجم الاوسط للطبرانی: ۳۰۷۹، مجمع الزوائد للہیثمی ج ۱۰ ص ۲۵۵، کتاب الزہد لابن المبارک: ۶۲۳، ۶۲۴)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو تم سے کم درجہ کا ہو اس کی طرف دیکھا کرو اور اس کی طرف نہ دیکھا کرو جو تم سے بڑے درجہ کا ہے، کیونکہ توقع ہے کہ اس طرح تم اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو کم نہیں سمجھو گے۔
(صحیح مسلم: ۲۹۶۳، شرح السنۃ للبغوی: ۳۹۹۶، مسند الشہاب للقضاعی: ۷۰۳، سنن ترمذی: ۲۵۱۳، سنن ابن ماجہ: ۴۱۴۲، صحیح ابن حبان: ۷۱۳، مسند

احمد: ۲۳۲۴۷، مسند البزار: ۱۹۳۱، المعجم الاوسط للطبرانی: ۲۳۲۳، المستدرک علی الصحیحین: ۳۲۲۹، شعب الایمان للبیہقی: ۲۲۵۳، کتاب الآداب للبیہقی: ۸۰۶، مسوار دالظمآن: ۲۰۲۰، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشر، ج ۱۸ ص ۲۰۸)

ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت اس سے پچھلی آیات کے ساتھ متصل ہے، کیونکہ اس سے پچھلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ پر قرآن مجید کی صورت میں ملنے والی نعمت پر احسان فرمایا ہے، اور آپ کو دنیا کی طرف رغبت کرنے سے منع فرمایا ہے۔

اور سفیان بن عیینہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: "لیس منا من لم یتغن بالقرآن" (وہ ہم میں سے نہیں ہے جو قرآن کی وجہ سے مستغنی نہ ہو)۔

(مسند الحمیدی: ۷۶، مصنف عبدالرزاق ج ۲ ص ۴۸۳، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۰ ص ۴۶۳، مسند احمد: ۱۵۴۹، سنن دارمی ج ۱ ص ۳۴۹، سنن ابوداؤد: ۱۴۷۰، مسند البزار: ۱۲۳۴، مسند ابویعلیٰ: ۷۴۸، المستدرک للحاکم ج ۱ ص ۵۶۹، سنن بیہقی ج ۱۰ ص ۲۳۰)

"وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ": یعنی آپ اپنے بازوؤں کو مومنین کے لیے جھکا کر رکھیں اور ان کے ساتھ نرمی کریں۔

(معالم التنزیل ج ۳ ص ۶۵۔ ۶۶، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

رسول اللہ ﷺ کو کفار کے دنیاوی ساز و سامان کی طرف دیکھنے کی ممانعت کی توجیہ

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ، الحجر: ۸۸ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اس آیت میں اگرچہ رسول اللہ ﷺ کو یہ حکم فرمایا ہے کہ آپ کفار کے دنیاوی ساز و سامان کی طرف رغبت سے نہ دیکھیں، لیکن مراد آپ کی امت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اس آیت میں مرد کو اس سے منع فرمایا ہے کہ وہ اپنے صاحب کے مال کو دیکھ کر اس کے حصول کی تمنا کرے۔ ہاں اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ اس معاملہ میں بہت زیادہ احتیاط فرماتے تھے، کیونکہ امام ابوعبید اور امام ابن المنذر نے از یحییٰ بن ابی کثیر روایت کی ہے کہ نبی ﷺ بنو المصطلق کے اونٹوں کے پاس سے گزرے تو آپ نے اپنے کپڑوں کو ان کے پیشاب اور ان کی مینگنیوں سے بچایا اور ان اونٹوں کی طرف نظر نہیں فرمائی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: "لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ"۔ اور یہ آیت سد الذرائع کے قبیل سے ہے، تاکہ مسلمان کفار کو دیے ہوئے دنیاوی ساز و سامان کی طرف رغبت اور حسرت سے نہ دیکھیں۔

اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو بہت عظیم نعمت عطا فرمائی گئی ہے جس کے مقابلہ میں دنیا کی ہر نعمت حقیر ہے، آپ کو لازم ہے کہ آپ اس نعمت کی وجہ سے دنیا کی باقی چیزوں سے مستغنی رہیں اور دنیا کے ساز و سامان میں رغبت نہ کریں۔

اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جس شخص کو قرآن عطا فرمایا گیا، پھر اس نے یہ سمجھا کہ کسی ایک کو دنیا کی اس سے افضل چیز دی گئی ہے تو اس نے عظیم نعمت کو کم قرار دیا اور کم نعمت کو عظیم قرار دیا۔ (روح المعانی، جز ۱۴ ص ۱۱۸، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۷ھ)

الحجر: ۸۸ کے دیگر تراجم

(۱) سید ابوالاعلیٰ مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء، اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

"تم اس متاع دنیا کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھو جو ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے، اور نہ ان کے حال

پر اپنا دل کڑھاؤ، انہیں چھوڑ کر ایمان لانے والوں کی طرف جھکو"۔
(تفہیم القرآن، ج ۲ ص ۵۱۷-۵۱۸، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۲۰۱۲ء)

(۲) شیخ اشرف علی تھانوی دیوبندی متوفی ۱۳۶۳ھ، اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:
"آپ اپنی آنکھ اٹھا کر بھی اس چیز کو نہ دیکھیے جو کہ ہم نے مختلف کافروں کو برتنے کے لئے دے رکھی ہے اور ان پر غم نہ کیجئے اور مسلمانوں پر شفقت رکھئے"۔ (تفسیر بیان القرآن مع ترجمہ ج ۲ ص ۳۲۲، مکتبہ رحمانیہ، لاہور)

(۳) شیعہ عالم سید فرمان علی، اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:
"اور ہم نے جو ان کفار میں سے کچھ لوگوں کو (دنیا کی مال و دولت سے) نہال کر دیا ہے تم اس کی طرف ہرگز نظر بھی نہ اٹھانا اور نہ ان کی بے دینی پر کچھ افسوس کرنا اور ایمانداروں سے (اگر چہ غریب ہوں) جھک کر ملا کرو"۔ (ترجمہ قرآن ص ۴۲۳، عمران کمپنی، لاہور)

(۴) اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان فاضل بریلوی متوفی ۱۳۴۰ھ، اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:
"اپنی آنکھ اٹھا کر اس چیز کو نہ دیکھو جو ہم نے ان کے کچھ جوڑوں کو برتنے کو دی اور ان کا کچھ غم نہ کھاؤ اور مسلمانوں کو اپنی رحمت کے پروں میں لے لو"۔ (ترجمہ قرآن مع تفسیر خزائن العرفان، ص ۴۹۸، مکتبۃ المدینہ، کراچی، ۱۴۳۲ھ)

(۵) علامہ عبد الحکیم شرف قادری رحمہ اللہ متوفی ۱۴۲۸ھ، اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:
"ہم نے مختلف قسم کے کافروں کو جو بے تحاشا سامانِ زندگی دے رکھا ہے آپ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھئے، آپ ان کے کفر پر غمگین بھی نہ ہوں اور مسلمانوں کے لئے لطف و کرم کا سلسلہ جاری رکھئے"۔ (ترجمہ قرآن ص ۴۹۷، مکتبہ قادریہ، لاہور)

(۶) مصنف کا ترجمہ حسب ذیل ہے:
"(اے رسولِ اکرم!) آپ اس دنیاوی ساز و سامان کی طرف اپنی آنکھیں اٹھا کر (حسرت سے) نہ دیکھیں جو ساز و سامان ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے کافروں کو عطا فرمایا ہوا ہے، اور نہ اُن کے پر تعیش احوال کو دیکھ کر متاسف ہوں، اور اپنے بازو مومنوں کے لیے جھکائے رکھیں"۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور (اے رسولِ اکرم!) آپ کہیے: بے شک میں اللہ کے عذاب سے کھلا کھلا ڈرانے والا ہوں O" (الحجر: ۸۹)

"وَقُلْ اِنِّیْۤ اَنَا النَّذِیْرُ الْمُبِیْنُ":
یہ آیت اس حکم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے واضح طور پر ڈرانے کا حکم فرمایا گیا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "جس طرح ہم نے اُن لوگوں پر عذاب نازل فرمایا تھا جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا تھا O" (الحجر: ۹۰)

"كَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِیْنَ": الفراء نے کہا: میں تمہیں ایسے عذاب سے ڈراتا ہوں جیسا عذاب "الْمُقْتَسِمِیْنَ" پر نازل فرمایا گیا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ "الْمُقْتَسِمِیْنَ" یہود اور نصاریٰ ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''جن لوگوں نے بعض قرآن کو مان کر اور بعض قرآن کا انکار کر کے حصوں میں تقسیم کر دیا تھا O''(الحجر: ۹۱)

قرآن مجید کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے محامل

''الَّذِیۡنَ جَعَلُوا الۡقُرۡاٰنَ عِضِیۡنَ'': یعنی انہوں نے قرآن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ پس بعض ٹکڑوں پر وہ ایمان لاتے اور بعض ٹکڑوں کا وہ کفر کرتے۔

(۱) مجاہد نے کہا: وہ یہود اور نصاریٰ ہیں جنہوں نے اپنی کتاب کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔

(۲) ایک قول یہ ہے کہ ''الۡمُقۡتَسِمِیۡنَ'' سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے قرآن مجید کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ پس بعض نے قرآن مجید کو کہا کہ یہ جادو ہے، اور بعض نے قرآن مجید کو کہا کہ یہ شعر ہے، اور بعض نے قرآن مجید کو کہا کہ یہ پہلے لوگوں کے افسانے ہیں۔

(۳) یہ بھی کہا گیا ہے کہ اقتسام سے مراد یہ ہے کہ ان کفار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو متفرق کر دیا۔ پس بعض نے کہا کہ یہ جادوگر ہیں، بعض نے کہا: یہ کاہن ہیں، بعض نے کہا: یہ شاعر ہیں۔

(۴) اور مقاتل نے کہا کہ یہ سولہ مرد تھے جن کو الولید بن المغیرہ نے حج کے ایام میں بھیجا، پس وہ مکہ اور اس کے اطراف کی گھاٹیوں میں متفرق ہو گئے اور اُن کے راستوں پر بیٹھ گئے اور جو لوگ حج کرنے کے لیے آتے تو ان سے یہ کہتے تھے کہ اس مرد کی باتوں سے دھوکا نہ کھانا جو ہم سے نکل چکا ہے اور نبوت کا دعویٰ کرتا ہے، اور اُن میں سے ایک جماعت یہ کہتی تھی کہ یہ شخص مجنون ہے اور دوسری جماعت یہ کہتی تھی کہ یہ کاہن ہے اور تیسری جماعت یہ کہتی تھی کہ یہ شاعر ہے۔ اور ولید بن مغیرہ مسجد کے دروازہ پر بیٹھا ہوا تھا، اور جب اس سے ان لوگوں کے اقوال کے متعلق پوچھا جاتا تو وہ کہتا کہ یہ لوگ سچ کہہ رہے ہیں، یعنی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو ان عنوانات پر تقسیم کرتے ہیں۔

''عِضِیۡنَ'' کا معنی

''عِضِیۡنَ'': ایک قول یہ ہے کہ یہ عُضو کی جمع ہے اور یہ اس سے ماخوذ ہے ''عضیت الشیء تعضیة''، عرب والے یہ اس وقت کہتے ہیں جب تم کسی چیز کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ اور اس آیت کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کے کئی اعضاء قرار دیے، پس بعض نے کہا کہ قرآن مجید جادو ہے، اور بعض نے کہا: یہ کہانت ہے، اور بعض نے کہا: یہ پچھلے لوگوں کے قصے ہیں۔ اور ''العضة'' سے مراد کذب اور بہتان ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ ''عِضِیۡنَ'' سے مراد جادو ہے، کیونکہ وہ قرآن مجید کو جادو کہتے تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''(اے رسول اکرم!) آپ کے رب کی قسم! ہم ضرور بہ ضرور ان سب سے سوال کریں گے O''(الحجر: ۹۲)

''فَوَرَبِّكَ لَنَسۡـَٔلَنَّهُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ'': یعنی قیامت کے دن۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''ان کاموں کے متعلق جو وہ کیا کرتے تھے O''(الحجر: ۹۳)

"عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ":

محمد بن اسماعیل نے کہا ہے کہ اکثر اہل علم نے یہ کہا ہے کہ اُن سے لا الٰہ الا اللہ کے متعلق سوال کیا جائے گا۔

قیامت کے دن کے مختلف احوال

یہاں پر یہ سوال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ﴿۳۹﴾ (الرحمٰن: ۳۹)" (پس اس دن کسی انسان اور کسی جن سے اس کے کیے ہوئے گناہ کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا)۔ اور اس آیت (الحجر: ۹۲) میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: "آپ کے رب کی قسم ہم ان سب سے ضرور سوال کریں گے"۔ سو ان دونوں آیتوں کے تعارض میں کس طرح تطبیق ہوگی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اُن سے یہ سوال نہیں فرمائیں گے کہ تم نے کیا عمل کیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ اُن سے زیادہ جاننے والے ہیں کہ انہوں نے کیا عمل کیے بلکہ اللہ عزوجل یہ سوال فرمائیں گے کہ تم نے فلاں فلاں کام کیوں کیا؟ قطرب نے اسی جواب کو معتمد قرار دیا ہے، انہوں نے کہا کہ سوال کی دو قسمیں ہیں: ایک سوال کسی چیز کو معلوم کرنے کے لیے ہوتا ہے، اور ایک سوال ڈانٹ ڈپٹ اور جھڑکنے کے لیے ہوتا ہے۔

سو الرحمٰن: ۳۹ میں جو فرمایا: "لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ"، اس میں اس سوال کی نفی ہے جو کسی چیز کو جاننے کے لیے سوال کیا جاتا ہے، اور "لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ" میں اس سوال کا اثبات ہے جو ڈانٹ ڈپٹ اور زجر و توبیخ کے لیے کیا جاتا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ قیامت کا دن بہت طویل ہوگا اور اس میں مختلف مواقف ہوں گے تو کسی موقف میں انس اور جن سے سوال کیا جائے گا اور کسی دوسرے موقف میں اُن سے سوال نہیں کیا جائے گا۔ اس کی نظیر یہ ہے کہ قرآن مجید کی بعض آیات میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں سے کلام فرمانے کی نفی فرمائی ہے اور دوسری آیات میں اس کا اثبات فرمایا ہے مثلاً ارشاد فرمایا: "هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ (المرسلات: ۳۵)" (یہ وہ دن ہے جس میں مکذبین بات نہیں کر سکیں گے ○)۔ اور دوسری آیت میں فرمایا ہے: "ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ﴿۳۱﴾ (الزمر: ۳۱)" (پھر اے لوگو! تم قیامت کے دن اپنے رب کی بارگاہ میں جھگڑا کرو گے ○)۔

المرسلات: ۳۵ میں قیامت کے دن مکذبین کے بات کرنے کی نفی ہے اور الزمر: ۳۱ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے لوگوں کے جھگڑا کرنے کا اثبات ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "(اے رسولِ اکرم!) آپ کو جو حکم فرمایا جاتا ہے، اس کو علی الاعلان سنا دیجئے اور مشرکین سے اعراض کرتے رہیے ○" (الحجر: ۹۴)

"فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: آپ کو جس چیز کا حکم فرمایا جاتا ہے، اس کو ظاہر کر دیجئے۔ الضحاک نے کہا: آپ کو جس چیز کا حکم فرمایا جاتا ہے، اس پر لوگوں کو مطلع کر دیجئے۔ الاخفش نے کہا: قرآن مجید سے حق اور باطل کے درمیان فرق کر دیجئے۔ اور "الصدع" کا اصل معنی ہے: فصل کرنا اور فرق کرنا۔

اس آیت میں نبی ﷺ کو یہ حکم فرمایا گیا ہے کہ آپ کو جو پیغام دے کر بھیجا گیا ہے، اس کو ظاہر کر دیجئے۔

عبداللہ بن عبیدہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ چھپے ہوئے تھے حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی، پس آپ بھی باہر نکلے اور آپ کے اصحاب بھی۔

"وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ": اس حکم کو آیت القتال نے منسوخ کر دیا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "ہم آپ کو استہزاء کرنے والوں کے شر سے بچانے کے لیے کافی ہیں O" (الحجر: ۹۵)

"اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ": اللہ عزوجل اپنے نبی ﷺ سے ارشاد فرماتے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے حکم کو بلند آواز سے بیان کیجئے اور اللہ عزوجل کے سوا کسی سے نہ ڈریں، کیونکہ جو آپ سے عداوت رکھے گا تو اللہ تعالیٰ آپ کی طرف سے اس سے بدلہ لیں گے جیسا کہ اللہ عزوجل نے آپ کا مذاق اڑانے والوں سے بدلہ لیا ہے۔

آپ کے مذاق اڑانے والوں کا عذاب الٰہی میں گرفتار ہو کر مرنا

سعید بن جبیر اور قتادہ روایت کرتے ہیں کہ رؤسائے قریش میں سے پانچ لوگ تھے: (۱) الولید بن المغیرہ المخزومی (۲) ان کا سردار العاص بن الوائل السہمی تھا (۳) الاسود بن المطلب بن الحارث بن اسد بن عبد العزیٰ بن زمعہ۔ اور رسول اللہ ﷺ نے ان کے خلاف دعا کی تھی، آپ نے کہا: اے اللہ! اس کی آنکھ کو اندھا فرما دیں اور اس کے بیٹے کو مار دیں۔ (۴) اور الاسود بن عبد یغوث بن وہب بن عبد مناف بن زہرہ۔ (۵) اور الحارث بن قیس بن الطلاطلہ۔ پس حضرت جبریل نبی ﷺ کے پاس آئے اور آپ کا مذاق اڑانے والے بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے۔ پس حضرت جبریل علیہ السلام کھڑے ہو گئے اور نبی ﷺ ان کے پہلو میں کھڑے ہو گئے، پس آپ کے پاس سے الولید بن المغیرہ گزرا تو حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا: "اے محمد! آپ اس شخص کو کیسا پاتے ہیں؟" آپ نے فرمایا: یہ اللہ کا بہت برا بندہ ہے، حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا: میں نے اس سے آپ کا بدلہ لے لیا اور الولید کی پنڈلی کی طرف اشارہ کیا، پس ولید خزاعہ کے ایک مرد کے پاس سے گزرا جو اپنے تیر کو درست کر رہا تھا اور اس پر یمن کی بنی ہوئی چادر تھی، اور وہ اپنے تہبند کو گھسیٹ رہا تھا، پھر تیر کا ایک کونہ اس کی تہبند کے ساتھ اٹکا تو ولید بن مغیرہ کو اس کے تکبر نے سر جھکانے سے روکا کہ وہ اس تیر کو نکالے، وہ اپنے پیر کو زمین پر مارتا رہا، پس اس کے پیر میں وہ تیر چبھ گیا اور وہ بیمار ہو کر مر گیا، اور آپ کے ساتھ العاص بن وائل گزرا تو حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا: اے محمد! آپ اس شخص کو کیسا پاتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: یہ اللہ کا بہت برا بندہ ہے، پھر حضرت جبریل علیہ السلام نے اس کے پیروں کے تلوے کی طرف اشارہ کیا اور کہا: میں نے آپ کا بدلہ لے لیا، پس عاص بن وائل اپنی سواری پر بیٹھ کر نکلا اور اس کے ساتھ اس کے دو بیٹے بھی تھے، پھر وہ ان گھاٹیوں میں سے کسی گھاٹی میں اترا، اور اس کے پیر کے تلوے میں ایک کانٹا چبھ گیا، وہ چلایا مجھے ڈس لیا گیا، مجھے ڈس لیا گیا، پس لوگوں نے اس کے پیر کو دیکھا تو کوئی چیز انہیں دکھائی نہیں دی اور اس کی ٹانگ سوج گئی حتیٰ کہ اونٹ کی گردن کی طرح ہو گئی، سو وہ اسی جگہ مر گیا۔ اور آپ کے پاس سے الاسود بن المطلب گزرا تو حضرت جبریل علیہ السلام نے پوچھا: آپ اس کو کیسا پاتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: یہ بہت برا بندہ ہے، پس حضرت جبریل علیہ السلام نے اپنے ہاتھوں سے اس کی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا: میں نے آپ کا بدلہ لے لیا، سو وہ اندھا ہو گیا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے ایک سبز پتہ اسے کھینچ کر مارا تو اس کی بینائی چلی گئی اور اس کی آنکھیں اندھی ہو گئیں، پس وہ اپنے سر

سے دیوار پر ٹکریں مارتا تھا حتیٰ کہ ہلاک ہو گیا۔

اور الکلبی کی روایت میں ہے کہ آپ کے پاس حضرت جبریل علیہ السلام آئے اور وہ شخص درخت کی جڑ میں بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ایک لڑکا تھا تو وہ اپنے سر کو درخت پر مار رہا تھا اور اس کے چہرے میں کانٹے چبھ رہے تھے، اس نے اس لڑکے سے مدد طلب کی، اس لڑکے نے کہا: میں کسی کو نہیں دیکھ رہا جو تمہارے ساتھ ایسا کر رہا ہو سوائے تمہارے خود کے، حتیٰ کہ وہ مر گیا، اور وہ کہتا تھا: مجھے رب محمد نے قتل کر دیا۔

اور آپ کے پاس سے الاسود بن عبد یغوث گزرا تو حضرت جبریل علیہ السلام نے پوچھا: اے محمد! آپ اس شخص کو کیسا پاتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: یہ اللہ کا بہت برا بندہ ہے اور یہ میرے ماموں کا بیٹا ہے، حضرت جبریل علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے اس سے آپ کا بدلہ لے لیا اور اس کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا، اس کے پیٹ میں پیاس لگی رہی اور وہ پیاس کی شدت سے مر گیا اور وہ کہتا تھا کہ مجھے رب محمد نے قتل کر دیا۔

اور آپ کے پاس سے الحارث بن قیس گزرا، پس حضرت جبریل علیہ السلام نے پوچھا: اے محمد! آپ اس شخص کو کیسا پاتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: یہ بہت برا بندہ ہے، حضرت جبریل علیہ السلام نے اس کے سر کی طرف اشارہ کیا اور کہا: میں نے اس سے آپ کا بدلہ لے لیا، تو اس کو خون آلود قے ہوئی اور وہ مر گیا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس نے ایک نمکین مچھلی کھائی جس سے اس کو بہت زبردست پیاس لگی، وہ مسلسل پانی پیتا رہا حتیٰ کہ اس کا پیٹ پھٹ گیا اور وہ مر گیا۔ اور اسی طرح سے وہ پانچوں شخص جو آپ کا مذاق اڑاتے تھے، ایک ایک کر کے عذاب الٰہی میں گرفتار ہو کر مر گئے اور یہ اس آیت کا مصداق ہے: "اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ" یعنی ہم نے آپ کا مذاق اڑانے والوں سے بدلہ لے لیا۔

(المعجم الاوسط للطبرانی: ۴۹۸۳، دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۲ ص ۳۱۷-۳۱۸، مجمع الزوائد ج ۷ ص ۴۶-۴۷)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "جو لوگ اللہ کے ساتھ دوسرا عبادت کا مستحق بناتے ہیں، سو وہ عنقریب اپنی سزا کو جان لیں گے O" (الحجر: ۹۶)

"اَلَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ": اللہ تعالیٰ اپنے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرماتے ہیں: ہم نے آپ کا مذاق اڑانے والوں سے بدلہ لے لیا، سو اب آپ اللہ تعالیٰ کے حکم کو بلند آواز سے بیان کیجئے اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈریے، کیونکہ جو آپ کو ایذاء پہنچائے گا اللہ تعالیٰ اس سے آپ کا بدلہ لیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے مذاق اڑانے والوں سے بدلہ لیا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور بے شک ہم خوب جانتے ہیں کہ کفار کے استہزاء سے آپ کا دل تنگ ہوتا ہے O" (الحجر: ۹۷)

"وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ":

اللہ عزوجل اپنے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہیں: اور اے محمد! (صلی اللہ علیک وسلم)، بے شک ہم کو معلوم ہے کہ آپ کی

قوم میں سے یہ مشرکین جو کچھ آپ کے متعلق کہتے ہیں اور آپ کی تکذیب کرتے ہیں اور آپ کا مذاق اڑاتے ہیں اور جو پیغام آپ لے کر آئے ہیں اس کا مذاق اڑاتے ہیں، اس سب سے آپ کا دل تنگ ہوتا ہے اور آپ کو ایذاء پہنچتی ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''پس آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے رہیے اور سجدہ کرنے والوں میں سے رہیے O''(الحجر:۹۸)

''فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ'': سو جب بھی آپ کو کوئی ناگوار مصیبت پہنچے تو آپ اللہ تعالیٰ کی حمد اور ان کی تسبیح اور ان کا شکر اور ان کی ثناء کی پناہ لیں، اللہ تعالیٰ آپ کو اس پریشانی سے اپنی پناہ میں رکھیں گے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی کوئی پریشانی ہوتی تو آپ نماز کی طرف پناہ لیتے۔

(مسند احمد: ۲۳۳۴۷، سنن ابوداؤد: ۱۳۱۹)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور تاحیات اپنے رب کی عبادت کرتے رہیے حتیٰ کہ آپ کے پاس اللہ کا یقینی حکم آجائے O''(الحجر:۹۹)

''وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ'': اللہ عزوجل اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ آپ اپنے رب کی عبادت کرتے رہیے حتیٰ کہ آپ کے پاس موت آجائے، کیونکہ موت ایک یقینی چیز ہے۔

اس آیت میں موت کو یقینی چیز فرمایا ہے اور اس کے متعلق یہ حدیث ہے:

حضرت ام العلاء رضی اللہ عنہا (اور وہ ان عورتوں میں سے ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی تھی) بیان کرتی ہیں کہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی رہائش کے لیے ہمارے نام قرعہ نکلا جب انصار نے مہاجرین کی رہائش کے لیے قرعہ اندازی کی تھی، پس حضرت عثمان بن مظعون بیمار ہو گئے، سو ہم نے ان کی تیمارداری کی حتیٰ کہ ان کی وفات ہو گئی، پھر ہم نے ان کو ان کے کپڑوں میں لپیٹ کر کفن دیا، پس ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو میں نے (حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی میت سے مخاطب ہو کر) کہا: اے ابوالسائب! آپ پر اللہ کی رحمت ہو! آپ کے متعلق میری یہ شہادت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عزت عطا فرمائی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہیں کس نے بتایا؟ میں نے کہا: میں نہیں جانتی اللہ کی قسم! آپ نے فرمایا: رہے وہ تو ان کے پاس یقینی بات آچکی ہے اور بے شک میں ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے خیر کی امید رکھتا ہوں، اور اللہ کی قسم! میں از خود نہیں جانتا حالانکہ میں اللہ کا رسول ہوں کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا، حضرت ام العلاء نے کہا: پس اللہ کی قسم! اس کے بعد میں نے کسی کی ستائش نہیں کی، اور حضرت ام العلاء نے کہا: اور میں نے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے لیے خواب میں ایک چشمہ دیکھا جو جاری تھا، پس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور میں نے اس خواب کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: یہ ان کا عمل ہے جو جاری ہے۔

(صحیح البخاری: ۱۲۴۳، ۲۶۸۷، ۳۹۲۹، ۷۰۰۳، ۷۰۰۴، ۷۰۱۸، مسند احمد: ۲۶۹۱۱، الاحاد والمثانی: ۳۲۲۳، المعجم الکبیر للطبرانی ج ۲۵ ص ۳۳۸، حلیۃ الاولیاء ج ۱ ص ۱۰۳، مسند الشامیین للطبرانی: ۳۲۱۲، المستدرک ج ۱ ص ۳۸۷، سنن بیہقی ج ۳ ص ۷۶، مسند احمد: ۲۷۴۵۷، ۱۴۱۰ ـــ

(الرسالہ، بیروت)

حضرت جبیر بن نفیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری طرف یہ وحی نہیں فرمائی گئی کہ میں مال جمع کروں اور تاجروں میں سے ہو جاؤں، لیکن میری طرف یہ وحی فرمائی گئی ہے کہ میں اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کروں اور سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جاؤں، اور یہ وحی فرمائی گئی ہے کہ آپ اپنے رب کی تاحیات عبادت کریں حتیٰ کہ آپ کے پاس یقین (یعنی موت) آ جائے۔

(شرح السنہ للبغوی:٤٠٣٩، الوسیط ج ٣ ص ٥٤، الکامل لابن عدی ٢٥٧٥، تخریج الاحیاء للعراقی ج ٣ ص ٢٦٥، الکامل لابن عدی ج ٣ ص ٦٩)

یقین سے موت مراد ہونے پر فقہاء تابعین کے اقوال

حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ: "وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ" اس سے مراد موت ہے۔ مجاہد سے بھی اسی کی مثل مروی ہے، انہوں نے کہا: اس سے مراد موت ہے۔

قتادہ سے بھی یہی مروی ہے کہ یقین سے مراد موت ہے۔

حسن بصری نے بھی کہا کہ اس آیت میں الیقین سے مراد موت ہے۔

ابن زید نے کہا: جب کسی شخص کے پاس موت آتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے جو اس سے آخرت کے متعلق فرمایا ہے، اس کی تصدیق آجاتی ہے۔

(تفسیر مجاہد ص ٤١٩، تفسیر عبدالرزاق ج ١ ص ٣٥٢، کتاب الزہد لابن المبارک:١٩، تفسیر سفیان ثوری ص ١٦٢، تفسیر الطبری ج ١٤ ص ١٥٥، دار عالم الکتب ریاض، ١٤٢٣ھ)(معالم التنزیل ج ٣ ص ٦٣۔ ٧٠، دار احیاء التراث العربی، بیروت وتفاسیر اخریٰ)

الحجر:٩٩ کے دیگر تراجم

(١) شیخ اشرف علی تھانوی دیوبندی متوفی ١٣٦٤ھ، اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

"اور آپ رب کی عبادت کرتے رہیے یہاں تک کہ آپ کو موت آ جائے"۔

(تفسیر بیان القرآن مع ترجمہ ج ٢ ص ٣٢٣، مکتبہ رحمانیہ لاہور)

(٢) شیخ عبدالماجد دریا آبادی متوفی ١٣٩٧ھ/١٩٧٧ء، اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

"اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہیے، یہاں تک کہ آپ کو امر یقین پیش آ جائے"۔

(تفسیر ماجدی ص ٥٧٨، پاک کمپنی، لاہور)

(٣) سید ابوالاعلیٰ مودودی متوفی ١٣٩٩ھ/١٩٧٩ء، اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

"اور اس آخری گھڑی تک اپنے رب کی بندگی کرتے رہو جس کا آنا یقینی ہے"۔

(تفہیم القرآن، ج ٢ ص ٥١٩، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور ٢٠١٢ء)

(٤) شیعہ عالم سید فرمان علی، اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

"اور جب تک تمہارے پاس موت آئے اپنے پروردگار کی عبادت میں لگے رہو"۔ (ترجمہ قرآن ص ٤٢٥، عمران کمپنی، لاہور)

(۵) اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان فاضل بریلوی متوفی ۱۳۴۰ھ، اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

''اور مرتے دم تک اپنے رب کی عبادت میں رہو''۔ (ترجمہ قرآن مع تفسیر خزائن العرفان ص ۴۹۹، مکتبۃ المدینہ کراچی، ۱۴۳۲ھ)

(۶) علامہ عبد الحکیم شرف قادری رحمہ اللہ متوفی ۱۴۲۸ھ، اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

''اور اپنے رب کی عبادت کریں یہاں تک کہ آپ کو ہمارا بلاوا آجائے''۔ (ترجمہ قرآن ص ۳۸۰، مکتبہ قادریہ لاہور)

(۷) اور مصنف نے اس آیت کا اس طرح ترجمہ کیا ہے:

''اور تا حیات اپنے رب کی عبادت کرتے رہیے حتیٰ کہ آپ کے پاس اللہ کا یقینی حکم آجائے''۔

الحمد للہ رب العالمین! آج ۱۷ رجب المرجب/ 6 مئی 2015، بروز بدھ سورۃ الحجر کی تفسیر مکمل ہو گئی۔
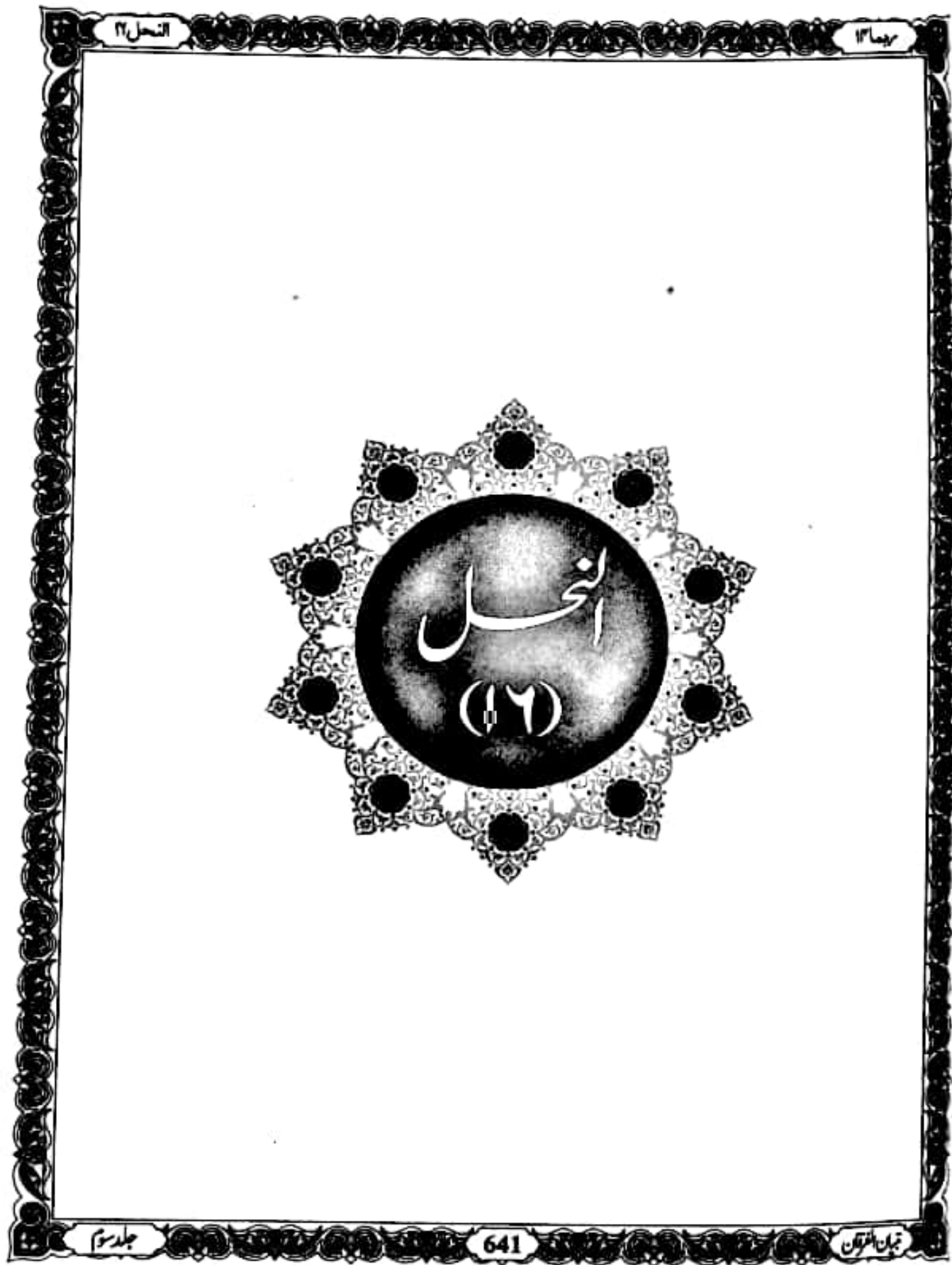
سورۃ النحل کا اجمالی تعارف

نحل کے متعدد لغوی معانی

علامہ سید محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی حنفی متوفی ۱۲۰۵ھ، لکھتے ہیں:

نحل کا معنی ہے: شہد کی مکھی، اس کا اطلاق مذکر اور مؤنث دونوں پر ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مؤنث کا صیغہ استعمال فرمایا ہے، پس ارشاد فرمایا: "وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا۔ (النحل:۶۸)" (اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈالی کہ پہاڑوں میں چھتے بنائے)۔ پس جس نے شہد کی مکھی کو مذکر قرار دیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ مذکر ہے اور جس نے اس کو مؤنث قرار دیا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی جمع نَحْلَة آتی ہے۔ اور الزجاج نے کہا: یہ جائز ہے کہ اس کا نام نحل رکھا جائے، کیونکہ اللہ عزوجل نے لوگوں کو اس کے ذریعہ سے شہد عطا فرمایا جو شہد کی مکھیوں کے پیٹوں سے نکلتا ہے۔ اور الصحاح میں مذکور ہے کہ "النحلُ والنحلَةُ" دونوں کا اطلاق مذکر و مؤنث پر ہوتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہد کی مکھی، چیونٹی، لٹورا (چھوٹا پرندہ) اور الھدھد کو قتل کرنے سے منع فرمایا۔

(مسند احمد: ۳۲۴۲، سنن ابن ماجہ: ۳۲۲۴، معالم السنن ج ۴ ص ۱۵۷، الاحادیث المختارہ: ۳۴۲، الجامع الصحیح للسنن والمسانید ج ۱۷ ص ۱۳۵، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشر، ج ۱۹ ص ۳۲۴)

الحربی نے کہا ہے: اس ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ یہ جانور لوگوں کو ایذاء نہیں پہنچاتے۔ (میں کہتا ہوں: اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ جو جانور لوگوں کو ایذاء پہنچائے ان کو مارنا جائز ہے جیسے سانپ، بچھو اور حشرات الارض میں سے مچھر اور ڈینگی مچھر، کھٹمل، پسو، اسی طرح کے دیگر جانور جو انسانوں کو ایذاء پہنچاتے ہیں ان کو مارنا جائز ہے۔ سعیدی غفرلہ)

نیز النحل کا معنی ہے: بغیر عوض کے عطا کرنا۔

ایوب بن موسیٰ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی والد نے اپنے بیٹے کو نیک ادب سے افضل عطیہ نہیں دیا۔

(مسند احمد: ۱۶۷۱۰، المنتخب من مسند عبد بن حمید: ۳۶۲، المستدرک علی الصحیحین: ۷۶۷۹، مسند الشہاب القضاعی: ۱۲۹۵، شعب الایمان للبیہقی: ۸۲۸۵، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشر، ج ۱۸ ص ۳۳۳)

اور "النحل" کا معنی عطیہ ہے۔ (تاج العروس من جواہر القاموس، جزء ۳۰ ص ۲۵۸۔۲۵۹، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۳۳ھ)

سورۃ النحل کے مضامین

سورۃ النحل مکی سورت ہے اور دیگر مکی سورتوں کی طرح اس سورت میں بھی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید اور وحی الٰہی کی صداقت، توحید باری تعالیٰ، مسئلہ رسالت، وقوع قیامت اور مجرموں کی سزا کا بیان فرمایا ہے۔

اس سورت کا نام "النحل" اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس سورت میں شہد کی مکھی کا ذکر ہے۔

سورۃ النحل کی سورۃ الحجر کے ساتھ مناسبت

سورۃ الحجر کے اخیر میں فرمایا ہے: "وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿۹۹﴾ (الحجر:۹۹)" (اور تاحیات اپنے رب کی عبادت کرتے رہیے حتیٰ کہ آپ کے پاس اللہ کا یقینی حکم آجائے O)۔ یہ آیت موت کے ذکر پر دلالت کرتی ہے اور سورۃ النحل کے اول میں بھی موت کے ذکر کی طرف اشارہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱﴾ (النحل:۱)" ((قیامت یا عذاب کے متعلق) اللہ کا حکم آچکا ہے، پس (اے کافرو!) تم اس کا عجلت سے مطالبہ نہ کرو، اور اللہ مشرکین کے بنائے ہوئے شرکاء سے بہت بلند اور برتر ہیں O)۔

سورۃ النحل کے مشمولات

(۱) اس سورت میں عقائد کے اصول بیان فرمائے گئے ہیں یعنی الالوہیت، الوحدانیت، البعث، الحشر والنشر۔ کیونکہ اس سورت میں ایسے امور بیان فرمائے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی قدرت پر اور ان کی وحدانیت پر دلالت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۳﴾ (النحل:۳)" (انہوں نے آسمانوں اور زمینوں کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا، وہ کفار کے خودساختہ شریکوں سے بلند اور برتر ہیں O)۔

(۲) آسمانوں اور زمینوں میں جو سیارگان ہیں، ستارے ہیں، پہاڑ ہیں، دریا ہیں، نہریں ہیں، نباتات ہیں، حیوانات ہیں اور سمندر میں جو جہاز رواں دواں ہیں، اور پانی سے بوجھل ہوائیں ہیں، یہ تمام امور بارش کے منافع میں غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں، اور حیوانات میں اور کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں میں، اور شہد کی مکھی کے فوائد میں، یہ سب چیزیں انسان کو اللہ تعالیٰ کی ذات اور ان کی توحید میں غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔

(۳) اور اس سورت نے واضح کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بہت زیادہ ہیں، اور یہ کہ انسان اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا نہیں کرتا، اور کفار کے لیے جہنم کے دروازوں کا ذکر فرمایا ہے جن میں کفار ہمیشہ رہیں گے، اور متقین کے لیے ہمیشہ رہنے والی جنات کا ذکر فرمایا ہے، جو لوگ دنیا میں نیک عمل کرتے ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ وہ جنات عطا فرماتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ہر امت میں ایک رسول بھیجا ہے اور تمام رسول، اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کا حکم دیتے تھے اور شیطان کی اطاعت سے منع کرتے تھے۔

(۴) پھر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی ایک جامع آیت کو نازل فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۹۰﴾ (النحل:۹۰)" (بے شک اللہ عدل کرنے، اور لوگوں پر احسان کرنے کا حکم فرماتے ہیں، اور رشتے داروں کو عطا کرنے کا حکم فرماتے ہیں اور بے حیائی کے کاموں سے اور برے کاموں سے اور ظلم سے منع فرماتے ہیں، وہ تمہیں نصیحت فرماتے ہیں تاکہ تم نصیحت قبول کرو O)۔

(۵) اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے عہد پورا کرنے کا حکم فرمایا، اور عہد توڑنے کو حرام قرار دیا۔

(۶) اور اللہ تعالیٰ نے تلاوتِ قرآن کے وقت شیطان سے پناہ طلب کرنے کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۹۸﴾ (النحل:۹۸)" (پس جب آپ قرآن مجید کی تلاوت کریں تو شیطانِ مردود سے اللہ کی پناہ طلب کریں)۔ اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ جب آپ تلاوت قرآن کا قصد کریں۔

آیاتها ۱۲۸ ۱۶ سُوْرَةُ النَّحْلِ مَكِّيَّةٌ ۷۰ رکوعاتها ۱۶

(سورۃ النحل مکی ہے اور اس میں ایک سو اٹھائیس آیات اور سولہ رکوع ہیں)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ عزوجل کے بابرکت نام سے ہی (ابتداء ہے) جو سب پر رحم فرمانے والے، نہایت مہربان ہیں

اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ①

(قیامت یا عذاب کے متعلق) اللہ کا حکم آچکا ہے، پس (اے کافرو!) تم اس کا عجلت سے مطالبہ نہ کرو، اور اللہ مشرکین کے بنائے ہوئے شرکاء سے بہت بلند اور برتر ہیں O

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اَنْ اَنْذِرُوْۤا اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ②

وہی فرشتوں کو اپنے حکم کی وحی کے ساتھ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتے ہیں نازل فرماتے ہیں کہ وہ اُن (بندوں) کو اس سے ڈرائیں کہ میرے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، سو تم سب مجھ سے ہی ڈرو O

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ③

انہوں نے آسمانوں اور زمینوں کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا، وہ کفار کے خودساختہ شریکوں سے بلند اور برتر ہیں O

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ④

انہوں نے انسان کو نطفہ سے پیدا فرمایا، پس اچانک وہ (اپنے خالق کے متعلق) کھلا ہوا جھگڑالو بن گیا O

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ⑤

اور انہوں نے مویشی پیدا فرمائے جن میں تمہارے لیے گرم کپڑے ہیں اور دیگر فوائد بھی ہیں اور انہی میں سے بعض مویشیوں کو تم کھاتے ہو O

وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ⑥

اور تمہارے لیے اُن مویشیوں میں حسن و جمال ہے جب تم انہیں شام کو چراگاہ سے واپس لاتے ہو اور صبح کو انہیں چرانے کے لیے

لے جاتے ہو O

وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ إِلَّا بِشِقِّ الْأَنْفُسِ ۭ إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۷

اور وہ مویشی تمہارے بھاری سامان کو ایسے شہر کی طرف اٹھا کر لے جاتے ہیں جہاں تم اپنے آپ کو مشقت میں ڈالے بغیر نہیں پہنچ سکتے تھے، بے شک تمہارے رب ضرور شفیق ہیں سب سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں O

وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ۭ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۸

اور انہوں نے ہی تمہاری سواری کے لیے گھوڑے، خچر اور گدھے پیدا فرمائے اور وہ مویشی تمہارے لیے زینت بھی ہیں، اور (ان کے علاوہ) بہت چیزیں پیدا فرمائیں جن کو تم از خود نہیں جانتے O

وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ ۭ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ أَجْمَعِيْنَ ۝۹ ع

اور اللہ کے ہی ذمۂ کرم پر سیدھا راستہ بتانا ہے اور کچھ راستے ٹیڑھے بھی ہیں اور اگر وہ چاہتے تو تم سب کو (جبرا) سیدھے راستہ پر چلا دیتے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''(قیامت یا عذاب کے متعلق) اللہ کا حکم آچکا ہے، پس (اے کافرو!) تم اس کا عجلت سے مطالبہ نہ کرو، اور اللہ مشرکین کے بنائے ہوئے شرکاء سے بہت بلند اور برتر ہیں O'' (النحل: ۱)

تحقق وقوع کو بیان کرنے کے لیے مستقبل کو ماضی سے تعبیر فرمانا

ابو اللیث نصر بن محمد بن احمد السمرقندی الحنفی المتوفی ۳۷۵ھ، النحل: ۱ تا ۹ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ہر چند کہ ابھی تک نہ قیامت آئی تھی نہ کفار پر عذاب آیا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قیامت یا عذاب کے متعلق اللہ تعالیٰ کا حکم آچکا ہے، چونکہ قیامت کا آنا یقینی تھا اس لیے اس کے تحقق وقوع کو ظاہر فرمانے کے لیے اس کو ماضی کے صیغہ کے ساتھ تعبیر فرمایا۔

''أَتٰى أَمْرُ اللّٰهِ'': یعنی قیامت کا دن، اور یہ بھی کہا جاتا ہے: عذاب کا دن آچکا ہے، جیسے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''حَتّٰى إِذَا جَآءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ۔ (ہود: ۴۰)'' (حتیٰ کہ جب (کافروں کو غرق کرنے کے متعلق) ہمارا حکم آگیا اور تنور جوش سے ابلنے لگا)۔ اور اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''أَتٰهَآ أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا۔ (یونس: ۲۴)'' (تو اچانک رات کے وقت یا دن کے وقت اس پر ہمارا عذاب نازل ہو گیا)۔ اس آیت میں فرمایا ہے کہ اللہ کا حکم آگیا، اور اس سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آئے گا یعنی اس کا آنا بہت قریب ہے، کیونکہ جو چیز آنے والی ہو وہ گویا کہ آچکی ہے۔ اور یہ کفار کے لیے وعید ہے کہ قیامت یا اللہ تعالیٰ کے عذاب کا آنا اس طرح یقینی ہے گویا کہ وہ آچکا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ''اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ۔ (الانبیاء: ۱)'' (لوگوں کا روز

حساب ان کے قریب آچکا ہے)،اور اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی: "اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ۔ (القمر:۱)" (قیامت قریب ہے)۔ تو مشرکین نے کہا: اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، آپ کا یہ زعم ہے کہ قیامت قریب آگئی ہے اور ہم اس میں سے کسی چیز کو نہیں دیکھتے،تب یہ آیت نازل ہوئی: "اَتٰۤی اَمْرُ اللّٰهِ" یعنی اللہ کا عذاب آگیا ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان کے پاس ان کا عذاب پہنچ گیا ہے،تم عجلت سے عذاب کو طلب نہ کرو۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ گئے۔

"سُبْحٰنَهٗ": پھر اللہ سبحانہٗ نے اپنی ذات سے بیٹے اور شریک کی تنزیہ فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کفار کی بیان کردہ صفات سے بہت بلند اور بہت عظیم ہیں۔ "وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِكُوْنَ": اور یہ کفار جن بتوں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس سے بہت بلند اور برتر ہیں۔

امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ، النحل:۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

بعض لوگوں نے کہا: اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے احکام، حدود اور فرائض کے متعلق فرمایا ہے کہ ان کے نزول کے لیے جلدی نہ کرو۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار پر یہ وعید فرمائی ہے کہ ان کے قریب عذاب آچکا ہے اور ان کی ہلاکت قریب آچکی ہے، جب کہ وہ عذاب کو جلدی طلب کرتے تھے۔ اور ہمیں یہ بات نہیں پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے کسی نے فرائض کے جلد نزول کو طلب کیا ہو، اس لیے اس آیت میں صرف اُن کفار کے لیے وعید ہے جو عجلت سے قیامت یا عذاب کو طلب کرتے تھے۔ (تفسیر طبری ج ۱۴ ص ۱۶۰، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۳۲ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وہی فرشتوں کو اپنے حکم کی وحی کے ساتھ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتے ہیں نازل فرماتے ہیں کہ وہ اُن (بندوں) کو اس سے ڈرائیں کہ میرے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، سو تم سب مجھ سے ہی ڈرو O" (النحل:۲)

"یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ": یعنی اللہ تعالیٰ حضرت جبریل علیہ السلام کو نازل فرماتے ہیں۔

"بِالرُّوْحِ": یعنی وحی، نبوت اور قرآن کے ساتھ نازل فرماتے ہیں۔

"مِنْ اَمْرِهٖ": یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ نازل فرماتے ہیں، جیسے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "یَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ۔ (الرعد:۱۱)" (جو اللہ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں)۔

"عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ": یعنی جن کو اللہ تعالیٰ نبوت اور رسالت کے لیے اختیار فرما لیتے ہیں۔ اور قتادہ نے کہا: اللہ عزوجل فرشتوں کو رحمت اور وحی کے ساتھ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہیں نازل فرماتے ہیں۔ یعنی جو اس کا اہل ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "اَنْ اَنْذِرُوْۤا اَنَّهٗ": یعنی قرآن مجید کے ساتھ کفار کو ڈراؤ اور ان کو یہ بتلاؤ کہ بے شک اللہ واحد ہیں، ان کا کوئی شریک نہیں ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کے اس قول کا مصداق ہے "لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوْنِ"۔ یعنی میری اطاعت کرو اور مجھ کو واحد مانو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "انہوں نے آسمانوں اور زمینوں کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا، وہ کفار کے خود ساختہ شریکوں سے بلند اور برتر ہیں O" (النحل:۳)

"خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ": یعنی اُن کو حق کے لیے پیدا فرمایا، اور ایک قول یہ ہے کہ ان کو زوال اور فنا کے لیے پیدا فرمایا۔ "تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ": یعنی اللہ تعالیٰ ان بتوں سے بلند اور برتر ہیں جن کو یہ کفار اللہ تعالیٰ کا شریک قرار دیتے تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "انہوں نے انسان کو نطفہ سے پیدا فرمایا، پس اچانک وہ (اپنے خالق کے متعلق) کھلا ہوا جھگڑالو بن گیاO" (النحل: ۴)

"خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ": اس سے مراد ہے مرد کا پانی۔

"فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ": یعنی وہ باطل کے ساتھ جھگڑنے لگا۔ وہ ابی بن خلف تھا جس نے ایک پرانی اور بوسیدہ ہڈی اپنے ہاتھ میں پکڑی اور کہنے لگا: محمد پر تعجب ہے، وہ یہ زعم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دوبارہ پیدا فرمائیں گے جب کہ ہم پرانی اور بوسیدہ ہڈیاں ہو چکے ہوں گے اور ہم کو از سر نو تخلیق کے ساتھ پیدا فرمایا جائے گا، تب یہ آیت نازل ہوئی: "خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ"۔

اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں کہ اے لوگو! تم پر اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور وحدانیت کے دلائل میں سے یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو نطفہ سے پیدا فرمایا، پس ایک گندے پانی سے عجیب و غریب مخلوق پیدا فرمائی اور اس کو تخلیق کے تین مختلف مراتب یعنی تین اندھیروں میں گزارا، پھر اس کی تخلیق پوری فرمانے کے بعد اسے دنیا کی روشنی کی طرف نکالا اور اس میں روح پھونک دی، پس اس کو غذا پہنچائی اور اس کو روزی عطا فرمائی، اور اس کو پروان چڑھاتے رہے حتیٰ کہ جب وہ اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا تو اس نے اپنے رب کی نعمت کا کفر کیا اور اپنے مدبر کا انکار کیا اور اس کی عبادت کی جو نہ اس کو ضرر پہنچا سکتا ہے نہ نفع پہنچا سکتا ہے، اور اس نے اپنے رب سے جھگڑا کیا اور کہا: "مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَ هِيَ رَمِيْمٌ ۝ (یٰس: ۷۸)" (جب یہ ہڈیاں بوسیدہ ہو چکی ہوں گی تو ان کو کون زندہ کرے گا؟)۔ اور اس ذات کو بھول گیا جس نے اس کو پیدا فرمایا تھا، اور اس کو ایک گندے پانی سے عمدہ شکل و صورت میں بنایا۔

(تفسیر طبری ج ۱۴ ص ۱۶۵، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۳۲ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور انہوں نے مویشی پیدا فرمائے جن میں تمہارے لیے گرم کپڑے ہیں اور دیگر فوائد بھی ہیں اور انہی میں سے بعض مویشیوں کو تم کھاتے ہوO" (النحل: ۵)

"وَ الْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ": الدفء سے مراد وہ چادریں ہیں جن کو پہن کر آدمی سردی سے محفوظ رہتے ہیں اور جو کپڑے بالوں سے اور اون وغیرہ سے بنائے جاتے ہیں۔ اور "مَنَافِعُ" سے مراد اُن مویشیوں کی قسمیں ہیں جن پر ساز و سامان لادا جاتا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ "الدفء" سے مراد ہے کم عمر اونٹ۔ اور عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ انہوں نے: "لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ" کی تفسیر میں کہا: یعنی ہر چوپائے کی نسل میں تمہارے لیے فوائد ہیں۔

"وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ": اور انہی مویشیوں کے گوشت میں سے تم کھاتے ہو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور تمہارے لیے اُن مویشیوں میں حسن و جمال ہے جب تم انہیں شام کو چراگاہ سے واپس لاتے ہو اور صبح کو انہیں چرانے کے لیے لے جاتے ہوO" (النحل: ۶)

"وَ لَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ": اور اے بنو آدم! تمہارے لیے ان مویشیوں کے اندر حسن اور زیبائش ہے۔

"حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ": جب تم اونٹوں کو چرا کر اپنے گھروں کی طرف لاتے ہو۔

"وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ": اور جب تم دن کے ابتدائی حصہ میں اُن کو چرانے کے لیے لے جاتے ہو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور وہ مویشی تمہارے بھاری سامان کو ایسے شہر کی طرف اٹھا کر لے جاتے ہیں جہاں تم اپنے آپ کو مشقت میں ڈالے بغیر نہیں پہنچ سکتے تھے، بے شک تمہارے رب ضرور شفیق ہیں سب سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں O'' (النحل: ٧)

"وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ": یعنی وہ مویشی تمہارا ساز وسامان اٹھا کر لے جاتے ہیں۔

"اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ": یعنی بدنی مشقت کے بغیر تم از خود نہیں جا سکتے۔

عکرمہ نے اس کی تفسیر میں کہا: اس سے مراد مکہ ہے اور اس آیت میں اہل مکہ سے خطاب ہے، جب وہ شام کی طرف اور یمن کی طرف نکلتے ہیں تو اپنے ساز وسامان کو اونٹ پر لاد کر لے جاتے ہیں۔

پھر فرمایا: ''اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ'': یعنی اللہ تعالیٰ تم کو جلد سزا نہیں دیتے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور انہوں نے ہی تمہاری سواری کے لیے گھوڑے، خچر اور گدھے پیدا فرمائے اور وہ مویشی تمہارے لیے زینت بھی ہیں، اور (ان کے علاوہ) بہت چیزیں پیدا فرمائیں جن کو تم از خود نہیں جانتے O'' (النحل: ٨)

گھوڑوں کا گوشت کھانے کے متعلق فقہاء کا اختلاف

"وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً":

سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ ان سے گھوڑوں کے گوشت کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے اس کے کھانے کو مکروہ قرار دیا اور اس آیت کی تلاوت کی اور کہا کہ گھوڑوں کو، خچروں کو اور گدھوں کو تمہاری سواری کے لیے اور زینت کے لیے بنایا گیا ہے۔ یعنی مویشیوں کی ان تین اقسام کو سواری اور زینت کے لیے بنایا ہے کھانے کے لیے نہیں بنایا ہے اور باقی مویشیوں کو سواری کے لیے بھی بنایا ہے اور کھانے کے لیے بھی بنایا ہے جیسے اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا ہے: ''وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ''، اور اسی کی وجہ سے امام ابو حنیفہ یہ فرماتے ہیں کہ گھوڑے کے گوشت کو کھانا مکروہ ہے۔

اور امام شافعی نے فرمایا کہ گھوڑوں کا گوشت کھایا جائے گا، کیونکہ حدیثِ صحیح میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں گھوڑوں کو ذبح کیا، پس ہم نے ان کا گوشت کھایا۔

نیز حدیث میں ہے: ''حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما بیان کرتی ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں گھوڑوں کو ذبح کیا، پس ہم نے اس کے گوشت سے کھایا، یا ہم نے ان کے گوشت سے پایا''۔

(صحیح البخاری: ٥٥١٢، صحیح مسلم: ١٩٤٢، سنن ابن ماجہ: ٣١٩٠، السنن الکبریٰ للنسائی: ٤٣٨٠، مسند الشافعی ج ١ ص ٣٨٠، مصنف عبدالرزاق:

۱۸۷۳، مسند الحمیدی: ۳۲۳، مصنف ابن ابی شیبہ: ۹۰ ۲۲۳، ۱۵۱۹۳، مسند اسحاق بن راہویہ: ۲۲۲۲، مسند احمد: ۱۴۹۳۲، ۱۴۹۸۳، المنتخب من مسند عبد بن حمید: ۱۰۷۳، شرح معانی الآثار: ۶۳۱۸، صحیح ابن حبان: ۵۲۷۱، المعجم الکبیر للطبرانی: ج ۲۴ ص ۸۰، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۱۹۳۲۲، کشف المشکل: ۲۷۱۳، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشرۃ ج ۱۹ ص ۲۰۱)

گھوڑے کا گوشت کھانے کا بیان

اس حدیث میں امام شافعی، امام ابو یوسف اور امام محمد بن حسن کی دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ گھوڑے کے گوشت کو کھانا جائز ہے اور امام ابو حنیفہ اور امام مالک نے کہا کہ گھوڑے کے گوشت کو کھانا مکروہ تحریمی ہے اور ایک قول یہ ہے کہ مکروہ تنزیہی ہے۔

(عمدۃ القاری ج ۲۱ ص ۱۸۲۔۱۸۳، دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۲۱ھ)

اسود بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے گھوڑے کا گوشت کھایا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۸ ص ۶۹)

ابراہیم بیان کرتے ہیں کہ ہم نے ایک مقام پر گھوڑے کو نحر کیا اور ہم سب نے اس کا گوشت کھایا اور اس میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ (مصنف عبد الرزاق: ۸۷۳۲، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۸ ص ۶۹)

گھوڑوں کے گوشت کے متعلق امام ابو حنیفہ کی وضاحت

میں کہتا ہوں کہ امام ابو حنیفہ اور امام مالک نے گھوڑے کے گوشت کے کھانے کو اس وقت مکروہ تحریمی فرمایا تھا جب گھوڑوں پر سواری کر کے جہاد کیا جاتا تھا اور دوسرے قول میں مکروہ تنزیہی فرمایا ہے اور اب چونکہ گھوڑوں پر سواری کر کے جہاد نہیں کیا جاتا بلکہ جنگی نقل و حمل کے دیگر ذرائع کو استعمال کیا جاتا ہے مثلاً ٹینک، توپ، بکتر بند گاڑی اور جیپ وغیرہ اور میدان جنگ میں گھوڑوں کو استعمال نہیں کیا جاتا، اس لیے اب اگر گھوڑوں کو ذبح کر کے کھایا جائے تو ان کا کھانا مکروہ نہیں ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے علاقوں میں اور ہمارے عرف میں گھوڑوں کے گوشت کو کھانے کا رواج نہیں ہے بلکہ بالعموم اونٹوں کے گوشت کو کھانے کا بھی رواج نہیں ہے، صرف بکریوں، گایوں اور بھینسوں کے گوشت کے کھانے کا رواج ہے، یا پھر مرغیوں کا گوشت کھایا جاتا ہے۔ (سعیدی غفرلہ)

''وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ'': یعنی اللہ تعالیٰ نے ایسی چیزوں کو پیدا فرمایا ہے جن کو تم جانتے ہو، اور ایسی چیزوں کو پیدا فرمایا ہے جن کو تم نہیں جانتے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور اللہ کے ہی ذمہ کرم پر سیدھا راستہ بتاتا ہے اور کچھ راستے ٹیڑھے بھی ہیں اور اگر وہ چاہے تو تم سب کو (جبراً) سیدھے راستہ پر چلا دیتے O'' (النحل: ۹)

''وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ'': یعنی اللہ تعالیٰ پر از روئے کرم ہدایت کا بیان کرنا لازم ہے۔

''وَمِنْهَا جَآئِرٌ'': اور ان راستوں میں سے بعض ظالم ہیں یعنی ہدایت کے طریقہ سے ہٹے ہوئے ہیں اور یہودیت اور نصرانیت کے طریقہ پر ہیں۔

''وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ'': اور اگر اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ ہوتا کہ تمام مخلوق توحید کی اہل ہے تو وہ ضرور ان سب کو توحید کی ہدایت عطا فرماتے۔ اور اس کی تفسیر میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ایسی نشانی نازل فرما دے کہ مخلوق مجبوراً اس پر

ایمان لے آئی۔ (تفسیر السمر قندی، ج ۲ ص ۲۲۷-۲۲۹، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۳ھ)

هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّ مِنْهُ شَجَرٌ فِیْهِ تُسِیْمُوْنَ ﴿۱۰﴾

وہی ہیں جنہوں نے آسمان سے تمہارے نفع کے لیے پانی نازل فرمایا، اسی پانی سے تم پیتے ہو اور اسی پانی سے درخت (اگتے ہیں) جس میں تم اپنے جانوروں کو چراتے ہو O

یُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَ الزَّیْتُوْنَ وَ النَّخِیْلَ وَ الْاَعْنَابَ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۱﴾

وہ تمہارے لیے اس پانی سے مختلف کھیت اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل پیدا فرماتے ہیں، بے شک اس میں غور و فکر کرنے والے لوگوں کے لیے ضرور نشانی ہے O

وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَۙ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَؕ وَ النُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۲﴾

اور انہوں نے ہی تمہارے نفع کے لیے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو اور ستاروں کو اپنے حکم کے تابع بنا رکھا ہے، بے شک اس میں عقل سے کام لینے والوں کے لیے ضرور نشانیاں ہیں O

وَ مَا ذَرَاَ لَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾

اور انہوں نے ہی تمہارے نفع کے لیے زمین میں مختلف انواع و اقسام کی چیزیں پیدا فرمائی ہیں، بے شک اس میں نصیحت حاصل کرنے والے لوگوں کے لیے ضرور نشانی ہے O

وَ هُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَاۚ وَ تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۴﴾

اور انہوں نے ہی تمہارے لیے سمندر کو مسخر فرما دیا ہے تاکہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور تم سمندر سے ان زیورات کو نکالو جن کو تم پہنتے ہو اور اے مخاطب! تم دیکھتے ہو کہ سمندر میں بڑے بڑے جہاز سمندر کا سینہ چیرتے ہوئے رواں دواں ہیں، اور (سمندر کو اس لیے بھی مسخر فرمایا) تاکہ تم سمندر سے اپنے رب کے فضل کو تلاش کرو اور تاکہ تم اللہ کا شکر ادا کرو O

وَ اَلْقٰى فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ وَ اَنْهٰرًا وَّ سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵﴾

اور انہوں نے ہی زمین میں بلند پہاڑ نصب فرمائے تاکہ وہ زمین تمہیں لے کر لرزتی نہ رہے اور انہوں نے ہی دریا اور راستے

بنائے تاکہ تم اپنی منزل کی ہدایت پاؤO

وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجْمِ هُمْ یَهْتَدُوْنَ ﴿۱۶﴾

اور انہوں نے ہی نشانیاں بنائیں، اور ستاروں سے لوگ رہنمائی حاصل کرتے ہیںO

اَفَمَنْ یَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا یَخْلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۷﴾

کیا ہر چیز کو پیدا فرمانے والے اس کی مثل ہو سکتے ہیں جو کچھ پیدا نہ کر سکتا ہو؟ کیا پس تم نصیحت حاصل نہیں کرتےO!

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۸﴾

اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو ان کی نعمتوں کو شمار نہیں کر سکتے، بے شک اللہ بہت زیادہ بخشنے والے، سب سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیںO

وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۱۹﴾

اور اللہ ہر اس چیز کو جانتے ہیں جس کو تم چھپاتے ہو اور جس کو تم ظاہر کرتے ہوO

وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا یَخْلُقُوْنَ شَیْـًٔا وَّهُمْ یُخْلَقُوْنَ ﴿۲۰﴾ ؕ

اور جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کرتے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے بلکہ وہ خود پیدا کیے ہوئے ہیںO

اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ ۚ وَمَا یَشْعُرُوْنَ ۙ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ ﴿۲۱﴾ ع

وہ بے جان مردے ہیں زندہ نہیں ہیں اور ان کو پتا نہیں کہ لوگوں کو کب اٹھایا جائے گاO!

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وہی ہیں جنہوں نے آسمان سے تمہارے نفع کے لیے پانی نازل فرمایا، اسی پانی سے تم پیتے ہو اور اسی پانی سے درخت (اگتے ہیں) اور اسی پانی میں تم اپنے جانوروں کو چراتے ہوO" (النحل:۱۰)

اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور ان کی توحید پر دلائل

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ، النحل: ۱۰ تا ۲۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِیْهِ":

اس جہان میں حیوانات کے بعد اشرف المخلوقات نباتات ہیں، پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے وجود اور اپنی توحید پر حیوانات کے عجیب احوال سے استدلال فرمایا، پھر اس کے بعد اس آیت میں اپنے وجود پر نباتات کے احوال سے استدلال فرمایا۔

آسمان سے جو پانی نازل ہوتا ہے وہ بارش ہے اور وہ بارش یا بادل سے نازل ہوتی ہے یا آسمان سے، اس کا ہم نے اپنی اس کتاب میں کئی مرتبہ ذکر کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ بارش کے پانی کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ قسم ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے

اور ہر زندہ کے لیے مشروب بنا دیا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے "لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ" سے اسی کا ارادہ فرمایا ہے۔

اور دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ نعمت بہت بڑی ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۚ أَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ۝" (الانبیاء: ۳۰) "(اور ہم نے ہر نشوونما پانے والے جسم کو پانی سے پیدا فرمایا، کیا پس وہ پھر بھی ایمان نہیں لاتے؟O)۔

اس سوال کا جواب کہ لوگ جو پانی پیتے ہیں وہ بارش سے بھی حاصل ہوتا ہے اور زمین سے بھی

القاضی ابوالحسن عبدالجبار بن احمد الاسد آبادی المعتزلی المتوفی ۴۱۵ھ، النحل: ۱۰ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

کیا تم یہ کہتے ہو کہ مخلوق صرف بارش کے پانی سے پیتی ہے، یا تم یہ کہتے ہو کہ مخلوق کبھی بارش کے پانی سے پیتی ہے جو اوپر سے نازل ہوتا ہے اور کبھی اس پانی سے پیتی ہے جو زمین کی گہرائی میں موجود ہے؟ جب کہ اس آیت میں صرف بارش کے پانی سے پینے کا ذکر فرمایا ہے۔

قاضی عبدالجبار المعتزلی نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ بارش کا پانی ہمارا مشروب ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کی نفی نہیں فرمائی کہ کوئی اور پانی بھی ہمارا مشروب ہے۔ (تفسیر المحیط ص ۲۵۵، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۹ء)

امام رازی قاضی معتزلی کے اس جواب پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اس آیت کا ظاہر حصر پر دلالت کرتا ہے کیونکہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ" اور یہ آیت حصر کی مفید ہے، کیونکہ اس کا معنی یہ ہے کہ بارش کے پانی سے ہی مشروب حاصل ہوتا ہے نہ کہ اس کے غیر سے، اور جب یہ ثابت ہو گیا تو ہم یہ کہتے ہیں کہ جو میٹھا پانی زمین کی گہرائی میں ہوتا ہے، وہ بھی بارش کے پانی سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَأَسْكَنّٰهُ فِي الْأَرْضِ ۖ وَإِنَّا عَلٰى ذَهَابٍ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ۝" (المومنون: ۱۸) "(اور ہم نے آسمان سے مخلوق کی حاجت کے اندازے سے پانی برسایا، اور پھر اسے زمین میں ٹھہرایا اور بے شک ہم اس پانی کو لے جانے پر بھی قادر ہیں O)۔ اور یہ بھی محال نہیں ہے کہ اس پانی سے وہ پانی مراد ہو جو میٹھا نہیں ہے، اور وہ سمندر کا پانی ہے۔ اور وہ بھی بارش کے پانی کا ہی ایک حصہ ہے۔

"تُسِيْمُوْنَ": اور اسی پانی میں تم اپنے جانوروں کو چراتے ہو۔

اس آیت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ درختوں سے مویشیوں کو چرانا ممکن ہے اور یہ اس وقت صحیح ہوگا اگر درخت سے مراد خشک اور تر گھاس ہو، اور خشک اور تر گھاس پر درخت کے اطلاق کے متعلق دو قول ہیں:

(۱) الزجاج نے کہا: جو چیز بھی زمین پر ثابت ہو وہ شجر یعنی درخت ہے۔ اور ابن قتیبہ نے کہا: اس آیت میں شجر یعنی درخت سے مراد گھاس ہے، اور عکرمہ کی روایت میں ہے کہ درخت کی قیمت نہ کھاؤ، کیونکہ یہ حرام ہے یعنی گھاس۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ اونٹ بڑے بڑے درختوں کے پتے کھا لیتے ہیں، اور اس تقدیر پر پھر درخت سے گھاس مراد لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''وہ تمہارے لیے اس پانی سے مختلف کھیت اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل پیدا فرماتے ہیں، بے شک اس میں غور وفکر کرنے والے لوگوں کے لیے ضرور نشانی ہے O'' (النحل:۱۱)

''یُنۡۢبِتُ لَكُمۡ بِهِ الزَّرۡعَ وَالزَّیۡتُوۡنَ وَالنَّخِیۡلَ وَالۡاَعۡنَابَ'':

زمین میں پانی سے اللہ تعالیٰ جن چیزوں کو پیدا فرماتے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں:

(۱) جو نباتات مویشیوں اور باقی حیوانات کے چرانے کے لیے ہوتی ہیں، اور یہی ''فِیۡهِ تُسِیۡمُوۡنَ'' سے مراد ہے۔

(۲) جس نباتات کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے کھانے کے لیے پیدا فرمایا اور یہی اس ارشاد سے مراد ہے ''یُنۡۢبِتُ لَكُمۡ بِهِ الزَّرۡعَ وَالزَّیۡتُوۡنَ وَالنَّخِیۡلَ وَالۡاَعۡنَابَ''۔ (وہ تمہارے لیے اس پانی سے مختلف کھیت اور زیتون اور کھجور اور انگور پیدا فرماتے ہیں)۔

''النحل:۱۱'' اور ''طٰہٰ:۵۴'' میں تطبیق

اگر یہ سوال کیا جائے کہ اس آیت (النحل:۱۱) میں پہلے اُن نباتات کو ذکر فرمایا ہے جو حیوانات کے چرنے کے لیے ہیں، اور اس کے بعد اُن نباتات کو ذکر فرمایا ہے جو انسان کی غذا کے لیے ہیں۔ اور دوسری آیت میں فرمایا ہے: ''كُلُوۡا وَارۡعَوۡا اَنۡعَامَكُمۡ (طٰہٰ:۵۴)'' (تم خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو بھی کھلاؤ)۔ تو اس ترتیب کو بدلنے کا کیا فائدہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں جو ترتیب ہے اس میں مکارمِ اخلاق پر تنبیہ فرمائی ہے کہ انسان کے ماتحت جو جانور ہیں، ان کو کھلانا پلانا اپنے کھانے پینے سے مقدم ہونا چاہیے۔ اور طٰہٰ:۵۴ میں جو ترتیب ہے اس سے مقصود وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ابدأ بنفسك ثم بمن تعول'' اپنے نفس سے ابتداء کرو، پھر اپنے زیرِ کفالت لوگوں سے۔

اپنے نفس سے ابتداء کرنے کے متعلق احادیث

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: بنو عذرہ میں سے ایک مرد نے اپنے مدبر غلام کو آزاد کر دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ خبر پہنچی تو آپ نے اس سے پوچھا: کیا تمہارے پاس اس کے علاوہ بھی مال ہے؟ اس نے کہا: نہیں، آپ نے فرمایا: اس غلام کو مجھ سے کون خریدے گا؟ تو نعیم بن عبد اللہ العدوی نے اس غلام کو تین سو درہم میں خرید لیا، پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تین سو درہم لائے تو آپ نے اس مرد کو وہ تین سو درہم دے دیے، پھر آپ نے فرمایا: اپنے نفس سے ابتداء کرو اور اپنے نفس پر اس مال کو خرچ کرو، پھر اگر اس مال سے کچھ بچ جائے تو اپنے اہل پر خرچ کرو، پھر اگر تمہارے اہل سے بھی کچھ بچ جائے تو پھر اپنے رشتہ داروں پر خرچ کرو۔ پس اگر رشتہ داروں پر خرچ کرنے سے بھی کچھ بچ جائے تو اس طرح دو اور اس طرح دو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھوں سے دائیں جانب اور بائیں جانب اشارہ فرمایا۔

(صحیح مسلم: ۹۹۷، الرقم المسلسل: ۲۳۱۰، رقم حدیث الباب: ۴۱، سنن نسائی: ۲۵۴۵، ۴۶۶۶، مسند الشافعی: ۲۲۵، السنن الکبریٰ للنسائی: ۲۳۲۸، ۴۹۸۸، مستخرج ابی عوانہ: ۵۸۰۱، حلیۃ الاولیاء ج ۱۰ ص ۱۰۳، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۷۷۵۵، شعب الایمان للبیہقی: ۳۱۴۷، معرفۃ السنن والآثار: ۲۰۵۷۹، الجامع الصحیح للسنن والمسانید ج ۷ ص ۲۳۰، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشر، ج ۵ ص ۳۳۲)

حضرت طارق المحاربی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم مدینہ میں آئے، اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر کھڑے ہوئے لوگوں کو

خطبہ دے رہے تھے اور آپ یہ فرما رہے تھے: دینے والا ہاتھ اوپر والا ہاتھ ہے اور دینے کی ابتداء اپنے عیال سے کرو، ماں سے اور باپ سے اور بہن سے اور بھائی سے، پھر جو قریب ہوں، پھر جو قریب ہوں۔

(سنن نسائی: ۲۵۳۲، سنن دارمی: ۱۶۹۵، السنن الکبریٰ للنسائی: ۲۳۲۳، صحیح ابن حبان: ۳۳۴۱، کتاب الزہد والرقاق: ۱۱۶۳، مسند ابن ابی شیبہ: ۱۳۳، مسند احمد: ۶۴۰۲، المنتخب من مسند عبد بن حمید ج ۲ ص ۱۲۹، المعجم الکبیر للطبرانی: ۳۰۸۲، المستدرک علی الصحیحین: ۳۲۱۹، سنن دارقطنی: ۲۹۴۶، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۱۱۰۹۶، موارد الظمآن: ۸۱۰، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشرۃ ج ۵ ص ۱۹۳)

"وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ": اس آیت میں پھلوں کی تفصیل ذکر نہیں فرمائی، اس پر متنبہ کرنے کے لیے کہ پھلوں کی اجناس اور ان کی اقسام اور ان کی صفات اور ان کے منافع اتنے زیادہ ہیں کہ ان کو کئی جلدوں میں بھی مکمل بیان نہیں کیا جا سکتا، اس لیے اجمال اور اختصار سے صرف پھلوں کا ذکر فرمایا ہے۔

نباتات میں اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور ان کی وحدت پر دلیل

"اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ": یعنی زمین سے جو نباتات پیدا ہوتی ہیں ان میں غور و فکر کیا جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کے وجود پر دلالت کرتی ہیں، کیونکہ ایک دانہ مٹی میں کچھ مدت تک پڑا رہے تو اس دانے میں اجزائے رطوبہ نفوذ کر جاتے ہیں، وہ اس دانے کو چیرتے ہیں، وہ اوپر سے بھی پھٹتا ہے اور نیچے سے بھی پھٹتا ہے، اوپر سے پھٹتا ہے تو اس دانے سے درخت پیدا ہو جاتا ہے اور نیچے سے پھٹتا ہے تو وہ زمین کی گہرائی سے پانی اور غذا کو حاصل کرتا ہے جس سے اس درخت کی نشوونما ہوتی ہے، پھر اس درخت سے پتے نکلتے ہیں اور کلیاں نکلتی ہیں اور پھل نکلتے ہیں، پھر وہ پھل مختلف انواع و اقسام کے ہوتے ہیں مثلاً انگور ہے تو اس کا چھلکا ٹھنڈا ہوتا ہے اور اس کا گودا رطب ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ ایک دانہ سے اتنے عجیب و غریب فوائد پر مشتمل چیزوں کو پیدا فرما دیتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت اور ان کی حکمت پر دلالت کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں: نیز اس دانے سے جو پودا نکلتا ہے اس کا کچھ حصہ اوپر کی جانب جاتا ہے وہ درخت کا تنا ہوتا ہے اور کچھ حصہ نیچے کی جانب جاتا ہے وہ درخت کی جڑیں ہوتی ہیں اور اس دانہ کی طبیعت کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ کچھ حصہ اس کے اوپر جائے اور کچھ حصہ نیچے جائے، یہ سب اللہ واحد قیوم کی قدرت کا تقاضا ہے، وہ دانہ کے جس حصہ کو چاہیں اوپر لے جا کر درخت کا تنا بنا دیتے ہیں اور دانہ کے جس حصہ کو چاہیں نیچے لے جا کر درخت کی جڑیں بنا دیتے ہیں۔ (سعیدی غفرلہ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور انہوں نے ہی تمہارے نفع کے لیے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو اور ستاروں کو اپنے حکم کے تابع بنا رکھا ہے، بے شک اس میں عقل سے کام لینے والوں کے لیے ضرور نشانیاں ہیں O"
(النحل: ۱۲)

جسم اپنی ذات میں نہ متحرک ہے نہ ساکن ہے، اگر وہ اپنی ذات میں متحرک ہوتا تو ہمیشہ حرکت کرتا رہتا، اور اگر وہ اپنی ذات میں ساکن ہوتا تو ہمیشہ ساکن رہتا، معلوم ہوا کہ جسم کی اپنی ذات کا کوئی تقاضا نہیں ہے، اس کا کوئی محرک ہے جو اس کو جب چاہے حرکت میں رکھتا ہے اور جب چاہے ساکن رکھتا ہے۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ افلاک اور کواکب کا محرک ان کی ذات کے علاوہ

ہے، اور یہی اللہ عزوجل کے اس ارشاد سے مراد ہے: ''وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ ۙ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ وَ النُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ'' ۔ یعنی دن اور رات کا ایک دوسرے کے بعد آنا اور سورج اور چاند کی اور ستاروں کی حرکات، ضروری ہے کہ ان سب چیزوں کا حدوث اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور ان کی تسخیر سے ہو، اور جب یہ دلیل پوری ہوگئی تو اس کے بعد فرمایا: ''اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ'': یعنی ہر وہ شخص جو اپنی عقل سے کام لے گا، وہ جان لے گا کہ ان تمام چیزوں کی حرکات کسی محرک واحد پر ختم ہوتی ہیں، ورنہ تسلسل لازم آئے گا۔

ایک سوال کا جواب

التسخیر کا معنی ہے: کسی چیز پر قہر کرنا اور اس پر جبر کرنا، اور یہ اسی کے لیے ممکن ہے جس کا قہر اور جبر کرنا ممکن ہو تو رات اور دن اور جمادات اور شمس اور قمر میں قہر اور جبر کا معنی کس طرح متصور ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان اشیاء کی طریقۂ واحدہ سے تدبیر فرمائی جو بندوں کی مصلحتوں کے مطابق ہے تو یہ چیزیں اس عبد کے مشابہ ہوگئیں جو اطاعت گزار ہوں، اسی وجہ سے اس قسم پر تسخیر کا اطلاق فرمایا۔

دوسرے سوال کا جواب

جب کہ دن اور رات کا وجود سورج کی حرکات کی وجہ سے ہوتا ہے، تو دن اور رات کے ذکر کے بعد سورج کے ذکر کی کیا ضرورت تھی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دن اور رات کا وجود سورج کی حرکات کی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ عزوجل کی مشیت اور ان کے ارادہ کی وجہ سے ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور انہوں نے ہی تمہارے نفع کے لیے زمین میں مختلف انواع واقسام کی چیزیں پیدا فرمائی ہیں، بے شک اس میں نصیحت حاصل کرنے والے لوگوں کے لیے ضرور نشانی ہے O'' (النحل: ۱۳)

''وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّذَّكَّرُوْنَ'':

زمین سے جو نباتات پیدا ہوتی ہیں ان کی صفات مختلف ہیں، ان کے احوال ایک دوسرے کے خلاف ہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ نباتات از خود پیدا نہیں ہوتیں بلکہ کوئی فاعل مختار ہیں جو ان کو پیدا فرماتے ہیں۔ اسی لیے پہلی آیت کا اس پر اختتام فرمایا کہ اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے نشانی ہے، اور دوسری آیت کا اس پر اختتام فرمایا کہ اس میں عقل سے کام لینے والوں کے لیے نشانیاں ہیں، اور تیسری آیت کا اس پر اختتام فرمایا ہے کہ اس میں نصیحت حاصل کرنے والوں لوگوں کے لیے نشانی ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور انہوں نے ہی تمہارے لیے سمندر کو مسخر فرما دیا ہے تاکہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور تم سمندر سے ان زیورات کو نکالو جن کو تم پہنتے ہو، اور اے مخاطب! تم دیکھتے ہو کہ سمندر میں بڑے بڑے جہاز سمندر کا سینہ چیرتے ہوئے رواں دواں ہیں، اور (سمندر کو اس لیے بھی مسخر فرمایا) تاکہ تم سمندر

سے اپنے رب کے فضل کو تلاش کرو اور تا کہ تم اللہ کا شکر ادا کرو O" (النحل: ۱۴)

"وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَ تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ":

مچھلی کے لحم ہونے یا نہ ہونے میں فقہاء کا اختلاف

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: اگر کسی شخص نے یہ قسم کھائی کہ وہ گوشت نہیں کھائے گا، پھر اس نے مچھلی کا گوشت کھالیا تو اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی، کیونکہ مچھلی کا گوشت حقیقت میں گوشت نہیں ہے۔ اور دوسرے ائمہ نے یہ کہا ہے کہ اس کی قسم ٹوٹ جائے گی، کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس کی تصریح فرمائی ہے کہ وہ لحم ہے یعنی گوشت۔ اور اللہ تعالیٰ کے بیان کے اوپر کوئی بیان نہیں ہے۔

مچھلی کے لحم ہونے کے متعلق امام ابوحنیفہ اور سفیان ثوری کا مناظرہ

روایت ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے جب یہ کہا تو سفیان ثوری کا اُن سے مناظرہ ہوا اور انہوں نے امام ابوحنیفہ پر انکار کیا اور اس آیت سے استدلال کیا کہ مچھلی کو اللہ تعالیٰ نے "لحم طری" فرمایا ہے، پھر امام ابوحنیفہ نے ایک مرد کو سفیان ثوری کے پاس بھیجا اور کہا: سفیان ثوری سے یہ سوال کرو کہ ایک آدمی نے قسم کھائی کہ وہ بچھونے پر نماز نہیں پڑھے گا، پھر اس نے زمین پر نماز پڑھ لی تو اس کی قسم ٹوٹے گی یا نہیں؟ تو سفیان ثوری نے کہا: اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی، پھر سائل نے کہا: کیا اللہ عزوجل یہ ارشاد نہیں فرماتے: "وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ۞ (نوح: ۱۹)" (اور اللہ نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا بنایا)۔ تب سفیان ثوری نے یہ جان لیا کہ اس سائل کو امام ابوحنیفہ نے تلقین کر کے بھیجا ہے۔

امام رازی کی امام ابوحنیفہ کے خلاف یہ دلیل کہ قرآن مجید کی نص صریح کے مقابلہ میں عرف اور عادت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا

امام رازی فرماتے ہیں: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی دلیل عرف اور عادت پر مبنی ہے، کیونکہ لوگوں کا عرف اور ان کی عادت یہ ہے کہ جب اللحم کا مطلقاً ذکر کرتے ہیں تو اس سے مچھلی کا گوشت مراد نہیں ہوتا، اور اس کی توجیہ یہ ہے کہ جب کسی شخص نے اپنے نوکر سے کہا کہ جاؤ ان پیسوں کا لحم خرید کر لے آؤ اور وہ مچھلی خرید کر لے آیا تو اس نے اپنے مالک کے حکم پر عمل نہیں کیا۔

نیز امام رازی کہتے ہیں کہ فقہاء احناف نے قسم کے بیان میں یہ لکھا ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنے نوکر سے کہا: ان پیسوں کا گوشت خرید کر لے آؤ اور وہ ایک چڑیا کا گوشت لے کر آ گیا تو وہ بھی انکار کیے جانے کا مستحق ہے، حالانکہ تم کہتے ہو کہ جس آدمی نے قسم کھائی ہو کہ وہ گوشت نہیں کھائے گا اور وہ چڑیا کا گوشت کھالے تو اس کی قسم ٹوٹ جائے گی۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ عرف میں اضطراب ہے۔ اور جب عرف میں اضطراب ہو تو قرآن مجید کی نص صریح کی طرف رجوع کرنا متعین ہے۔ اور قرآن مجید کی نص صریح میں مچھلی پر لحم طری کا اطلاق ہے۔

امام ابوحنیفہ کی طرف سے امام رازی کے دلائل کے جوابات

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ، النحل: ۱۴ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

امام رازی سے معارضہ کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کسی شخص نے یہ قسم کھائی کہ وہ دابہ (چوپایہ) پر سوار نہیں ہوگا، پھر وہ کسی کافر پر سوار ہو گیا تو اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے کافر کو دابہ فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۵﴾ (الانفال: ۵۵)'' (بے شک اللہ کے نزدیک زمین پر چلنے والوں میں بدترین لوگ (یہودی) ہیں جنہوں نے کفر کو اختیار کیا، پس (علم الٰہی میں مقرر ہے کہ) وہ ایمان نہیں لائیں گے O)۔

نیز علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ مچھلی کو لحم مجازاً فرمایا ہے، کیونکہ لحم خون سے بنتا ہے اور مچھلی میں خون نہیں ہوتا۔ اور قرآن مجید میں مجازات ہیں لیکن اُن مجازات سے مسائل فقہیہ مستنبط نہیں کیے جاتے۔ (روح المعانی جز ۱۴ ص ۱۶۶۔۱۶۷، دارالفکر، بیروت، ۱۴۱۷ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور انہوں نے ہی زمین میں بلند پہاڑ نصب فرمائے تا کہ وہ زمین تمہیں لے کر لرزتی نہ رہے اور انہوں نے ہی دریا اور راستے بنائے تا کہ تم اپنی منزل کی ہدایت پاؤ O'' (النحل: ۱۵)

''اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ'' سے پہلے لفظ ''لا'' یا لفظ ''کراھۃ'' کو محذوف ماننا

''وَ اَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ'':

اس آیت کا لفظی ترجمہ اس طرح ہے: ''اور انہوں نے ہی زمین میں بلند پہاڑ نصب فرمائے تا کہ وہ زمین تم کو لے کر لرزے''۔ حالانکہ یہ معنی مراد نہیں ہے۔

اس آیت کی توجیہ اہلِ کوفہ کے نزدیک اس طرح ہے: تا کہ زمین تمہیں لے کر نہ لرزے۔ یعنی ''تَمِيْدَ'' سے پہلے ''لا'' محذوف ہے، یعنی زمین میں بلند پہاڑ اس لیے نصب فرما دیے تا کہ زمین تمہارے ساتھ نہ لرزے۔ اور بصریوں کے نزدیک ''اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ'' سے پہلے لفظ ''کراھۃ'' محذوف ہے۔ یعنی تمہارے ساتھ زمین کے لرزنے کو ناپسند کرنے کے سبب سے اس زمین میں بلند پہاڑ نصب فرما دیے۔

اور اس کی نظیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا (النساء: ۱۷۶)'' (اللہ تمہیں اپنے احکام وضاحت سے بیان فرماتے ہیں تا کہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ)۔ اور اس آیت کا بھی لفظی ترجمہ اس طرح ہے: ''اللہ تعالیٰ اپنے احکام تمہارے لیے اس لیے بیان فرماتے ہیں کہ تم گمراہ ہو جاؤ''۔ اس آیت کی بھی اسی طرح دو توجیہیں ہیں، ایک یہ کہ ''اَنْ تَضِلُّوْا'' سے پہلے لفظ ''لا'' محذوف ہے یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے احکام اس لیے وضاحت سے بیان فرماتے ہیں تا کہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ، اور دوسری توجیہ یہ ہے کہ ''اَنْ تَضِلُّوْا'' سے پہلے ''کراھۃ'' کا لفظ محذوف ہے، یعنی تمہارے گمراہ ہونے کو ناپسند فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنے احکام کو وضاحت سے بیان فرماتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے وجود اور ان کی وحدانیت پر زمین سے مزید دلائل

اس آیت کی تفسیر میں جمہور مفسرین نے یہ کہا ہے کہ جب بحری جہاز یا بڑی کشتی کو سمندر کے پانی پر چھوڑ دیا جائے تو وہ ایک

جانب سے دوسری جانب کی طرف مضطرب ہوتی ہے، پھر جب اس بحری جہاز میں بھاری اجسام رکھ دیے جائیں تو وہ جہاز پانی کی سطح پر ٹھہر جاتا ہے، اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا فرمایا تو وہ بھی ایک جانب سے دوسری جانب مضطرب ہو رہی تھی، پھر جب اللہ تعالیٰ نے اس کے اوپر بھاری پہاڑ رکھ دیے تو وہ پر سکون ہو کر ٹھہر گئی۔

اور اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اللہ تعالیٰ کی قدرت پر دلیل ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ زمین کے اوپر بھاری پہاڑ نصب نہ فرماتے تو زمین کا پر سکون ہو کر ٹھہرنا اور لوگوں کا اس میں رہنا مشکل ہو جاتا۔

اس آیت میں الالقاء سے مراد خلق ہونے کی توجیہ

"وَاَنْهٰرًا": اس آیت کا عطف "وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ" پر ہے، اس لیے اس کا ظاہر معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں دریا اور راستے ڈال دیے ہیں، اور یہ معنی یہاں پر درست نہیں ہے، کیونکہ القاء کا معنی ہے کسی چیز کو اوپر سے نیچے ڈالنا اور دریا اور راستے زمین میں اوپر سے نیچے نہیں ڈالے جاتے، لہٰذا اس آیت میں الالقاء سے مراد الخلق ہے یعنی زمین میں دریا اور راستے پیدا فرما دیے، اس لئے اس آیت میں القاء سے مراد خلق ہے، اور اس کی نظیر یہ ہے، قرآن مجید میں ہے: "وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّىْ ۚ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِىْ ۞ (طٰہٰ:۳۹)" (اور میں نے آپ پر اپنی طرف سے محبت ڈال دی اور میں نے چاہا کہ آپ کی پرورش میری حفاظت میں کی جائے ۝)۔

پہاڑوں کے ساتھ دریاؤں کے ذکر کی توجیہ

علوم عقلیہ میں یہ ثابت ہے کہ اکثر دریاؤں کا منبع پہاڑوں میں ہوتا ہے، اس وجہ سے جب اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کا ذکر فرمایا تو اس کے بعد چشموں کے نکلنے اور دریاؤں کے جاری ہونے کا ذکر فرمایا۔

اس کے بعد "وَسُبُلًا" کا ذکر فرمایا، اور اس کا بھی عطف "وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ" پر ہے۔ یعنی زمین میں اللہ تعالیٰ نے راستے ڈال دیے۔ اس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں راستوں کو ظاہر فرما دیا اور ان کو اس لیے بیان فرما دیا تاکہ تم اپنے سفر میں ان راستوں سے ہدایت حاصل کرو۔ اور اس کی نظیر درج ذیل آیت میں ہے:

"وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا ۔ (طٰہٰ:۵۳)" (اور اس میں تمہارے لیے راستے جاری فرما دیے)۔ اور "لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ" کا معنی ہے: تاکہ تم ہدایت حاصل کرو۔ اور اس آیت کی وضاحت اس طرح سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں بھاری پہاڑ نصب فرما دیے اور اس میں دریاؤں اور راستوں کو پیدا فرما دیا اور اس میں ایسی علامات پیدا فرما دیں جن سے تم راستوں کی نشانیاں مقرر کر لو اور یہ علامات پہاڑ ہیں اور دریا ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور انہوں نے ہی نشانیاں بنائیں، اور ستاروں سے لوگ رہنمائی حاصل کرتے ہیں ۝" (النحل:۱۶)

"وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ": (اور انہوں نے ہی نشانیاں بنائیں، اور ستاروں سے لوگ رہنمائی حاصل کرتے ہیں)

آیتِ مذکورہ میں خطاب سے غیبوبت کی طرف التفات کی توجیہ

''اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ'' میں حاضرین سے خطاب ہے، اور ''وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ'' میں غائبین سے خطاب ہے۔
خطاب کے اس طرز میں تبدیلی کی توجیہ درج ذیل ہے:
قریشِ مکہ مال کی طلب کے لیے اور تجارت کے حصول کے لیے بہ کثرت سفر کرتے تھے اور جو بہ کثرت سفر کرے تو وہ اپنے سفر میں ستاروں سے رہنمائی حاصل کرتا ہے، سو اس آیت میں قریش کے سفر کی طرف اشارہ ہے۔
بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ''وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ'' سمندری سفر کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سمندر کی صفت ذکر فرمائی اور اس کے منافع بیان فرمائے اور یہ بیان فرمایا کہ اس سفر میں لوگ ستاروں سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں، اس لیے اس آیت کو سمندری سفر کے ساتھ مخصوص کرنا چاہیے۔ اور دوسرے مفسرین نے کہا: اس آیت میں مطلقاً سفر مراد ہے خواہ خشکی میں ہو یا سمندر میں ہو۔ اور یہی قول زیادہ اولیٰ ہے، کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کی نعمت کا زیادہ عام ہونا معلوم ہوتا ہے، کیونکہ ستاروں سے ہدایت حاصل کرنا سمندری سفر میں بھی متحقق ہوتا ہے اور خشکی کے سفر میں بھی۔

جب کسی نمازی پر قبلہ مشتبہ ہو جائے تو اس کے متعلق امام رازی کا بیان کردہ حل

اور بعض فقہاء نے کہا کہ یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ مسافر کو جب قبلہ کا پتا نہ چلے تو اس پر واجب ہے کہ وہ ستاروں سے استدلال کرے اور زمین میں نصب علامات سے استدلال کرے اور وہ پہاڑ اور دریا وغیرہ ہیں، کیونکہ جس طرح ان علامات سے راستوں کی معرفت حاصل ہوتی ہے، اسی طرح ان علامات سے قبلہ کی معرفت کا حاصل ہونا بھی ممکن ہے۔
جب کسی مسلمان پر قبلہ مشتبہ ہو جائے تو یا تو وہاں پر قبلہ کی علامات ہوں گی یا نہیں ہوں گی، اگر وہاں پر قبلہ کی علامات ہوں تو اس پر واجب ہے کہ وہ اجتہاد کرے اور جس طرف اس کا غالب گمان ہو اسی کو قبلہ قرار دے۔ اگر اس کی خطاء ظاہر ہو جائے تو اس پر اعادہ واجب ہے کیونکہ اس نے اجتہاد میں تقصیر کی۔
اور اگر وہاں پر کوئی علامات نہ ہوں، تو پھر دو صورتیں ہیں:
(۱) اس کو اختیار ہے کہ جس طرف چاہے منہ کر کے نماز پڑھ لے، کیونکہ جب تمام جہات مساوی ہوں اور ترجیح ناممکن ہو تو پھر اس کے لیے یہی صورت باقی رہ جاتی ہے۔
(۲) جب نمازی پر قبلہ مشتبہ ہو جائے تو اس پر واجب ہے کہ وہ تمام جہات کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے اور تبھی وہ یقین کے ساتھ نماز کو ادا کرنے کے ذمہ سے عہدہ برا ہو سکتا ہے۔ اور یہ ایسا ہے جیسا کہ فقہاء کہتے ہیں کہ کسی شخص پر ایک نماز پڑھنی واجب تھی اور وہ بھول گیا کہ کون سی نماز اس پر واجب تھی تو اس پر واجب ہے کہ وہ پانچوں نمازیں پڑھے تاکہ یقین کے ساتھ اس نماز کی ادائیگی کے ذمہ سے نکل جائے جسے وہ بھول گیا ہے۔

صورتِ مذکورہ میں مصنف کا بیان کردہ حل

میں کہتا ہوں کہ امام رازی نے اس مشکل کا جو حل بیان فرمایا ہے، اس پر لوگوں کا عمل کرنا بہت بعید ہے۔ آج کل لوگ ایک نماز

مشکل سے پڑھتے ہیں تو ایک نماز کی جگہ پانچ نمازیں کیسے پڑھیں گے، اس کا صحیح حل یہ ہے کہ وہ غور وفکر کرے اور جس نماز کے متعلق اس کا ظن غالب ہو کہ یہ نماز اس نے نہیں پڑھی ہے اسی نماز کو وہ پڑھ لے تو وہ اس نماز کو پڑھنے کے ذمہ سے بری ہو جائے گا، اور جہاں تک قبلہ کے مشتبہ ہونے کی صورت میں امام رازی نے فرمایا ہے کہ وہ ہر سمت کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے یہ بھی بہت مشکل اور بعید ہے، اس نمازی کے لیے یہ کافی ہے کہ جس سمت کے متعلق اس کا ظن غالب ہو کہ یہ قبلہ ہے وہ اسی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لے تو وہ اس نماز کی ادائیگی کے ذمہ سے بری ہو جائے گا۔ (سعیدی غفرلہ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "کیا ہر چیز کو پیدا فرمانے والے اس کی مثل ہو سکتے ہیں جو کچھ پیدا نہ کر سکتا ہو؟ کیا پس تم نصیحت حاصل نہیں کرتے!O" (النحل:۱۷)

اللہ تعالیٰ کی توحید پر یہ دلیل کہ جو منعم اعظم ہوں وہی عبادت کے مستحق ہیں

"اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ۗ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ":

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں القادر الحکیم کے وجود پر دلائل ذکر فرمائے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے بندوں کو جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں، ان کو تفصیل سے بیان فرمایا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے احسانات کا ذکر فرمایا ہے اور ان احسانات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ عبادت کے مستحق ہیں، اور چونکہ اللہ کے غیر نے ان میں سے کوئی نعمت پیدا نہیں کی اور انسانوں پر کوئی احسان نہیں کیا تو پھر اللہ تعالیٰ کے غیر کی عبادت کرنا باطل ہے۔ اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ہی تمام نعمتوں کے عطا فرمانے والے ہیں اور تمام اچھائیوں کے پیدا فرمانے والے ہیں تو پھر ان کو چھوڑ کر اس کی عبادت کرنا جس نے کسی چیز کو پیدا نہیں کیا، وہ قطعاً خلاف عقل اور باطل ہے۔

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جو ان نعمتوں کے پیدا فرمانے والے ہیں کیا وہ اس کی مثل ہو سکتے ہیں جس نے کسی چیز کو پیدا نہیں کیا، بلکہ وہ کسی چیز کے پیدا کرنے پر قادر نہیں ہیں، سو تم نصیحت کیوں نہیں حاصل کرتے۔ اور اس میں یہ تنبیہ ہے کہ عبادت صرف اسی کی کرنی چاہیے جو منعم اعظم ہو، اور جن کی یہ کفار عبادت کرتے ہیں یہ محض بت ہیں اور جمادات ہیں، نہ ان کی عقل ہے نہ قدرت ہے نہ اختیار ہے، سو تم ان بتوں کی عبادت کو کیوں اختیار کرتے ہو اور ان کی عبادت میں مشغول ہو کر اللہ عزوجل کی عبادت کو کیوں ترک کرتے ہو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور استحقاق عبادت پر اس طرح استدلال فرمایا ہے جس طرح اس آیت میں استدلال ہے: "اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۗ قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۱۹۵﴾ (الاعراف:۱۹۵)" (کیا ان بتوں کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلیں، یا ان کے ہاتھ ہیں جس سے وہ کسی چیز کو پکڑیں، یا ان کی آنکھیں ہیں جس سے وہ کسی چیز کو دیکھیں، یا ان کے کان ہیں جن سے وہ کسی چیز کو سنیں، (اے رسول اکرم!) آپ کہیے: تم اپنے (خود ساختہ) شرکاء کو پکارو، پھر مجھ پر اپنا داؤ چلاؤ اور اس کے بعد مجھے مہلت نہ دوO)۔

ان آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ جس کے چلنے کے لیے پاؤں ہوں وہ اس سے افضل ہے جس کے پاس چلنے کے لیے پاؤں نہ ہوں۔ اسی طرح جس کے دیکھنے اور سننے کے لیے آنکھیں اور کان ہیں، وہ اس سے افضل ہے جس کی آنکھیں اور کان نہیں ہیں۔ تو

ان بتوں کی عبادت اس لیے باطل ہے کہ یہ تم سے افضل نہیں ہیں۔ عبادت اس کی ہونی چاہیے جو سب سے افضل ہو لہٰذا جس نے کسی چیز کو پیدا نہیں کیا، اس کی عبادت میں مشغول ہونا اور اس کے مقابلہ میں اس کی عبادت کو ترک کر دینا جس نے سب چیزوں کو پیدا فرمایا ہے کس طرح درست ہو سکتا ہے!

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو ان کی نعمتوں کو شمار نہیں کر سکتے، بے شک اللہ بہت زیادہ بخشنے والے، سب سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں O'' (النحل:۱۸)

اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں کا شکر ادا کرنا کس طرح ممکن ہے؟

''وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ'':

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ غیر اللہ کی عبادت میں مشغول ہونا باطل ہے اور خطا ہے، اور اس آیت میں یہ بیان فرمایا ہے کہ بندہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا اور ان کی تمام نعمتوں کا شکر بجالانا، اور ان کے کرم کے تمام حقوق کو بر طریق کمال و تمام انجام دینا ممکن نہیں ہے، بلکہ بندہ اگر اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادات کرنے میں تھکائے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے میں انتہائی مبالغہ کرے، پھر بھی وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے میں کمی کرنے والا ہو گا، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کا شکر ادا کرنا اس پر موقوف ہے کہ بندہ کو اس کی تمام نعمتوں کا بر طریق تفصیل علم ہو، کیونکہ جو نہ متصور ہو اور نہ مفہوم ہو اور نہ معلوم ہو تو اس کے شکر ادا کرنے میں مشغول ہونا محال ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کا بر طریق تفصیل علم بندہ کو حاصل نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بہت زیادہ ہیں اور ان کی قسمیں بہت زیادہ ہیں، اور مخلوق کی عقول ان نعمتوں کے مبادی کا احاطہ کرنے سے بھی قاصر ہیں چہ جائیکہ وہ نعمتوں کی غایات کا احاطہ کرے، وہ نعمتیں بر طریق تفصیل کسی کو معلوم نہیں ہیں، اور جب حال یہ ہو تو اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کا شکر ادا کرنا ممتنع ہو گا، اور یہی اس آیت کا مفہوم ہے: ''وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا'' ۔یعنی تم اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کو تمام و کمال پہچانتے نہیں ہو، اور جب تم اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کو تمام و کمال نہیں پہچانتے تو ان کا شکر کیسے ادا کرو گے۔

اور یہ تقریر اس پر دلالت کرتی ہے کہ تمام مخلوق کا شکر بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا حق شکر ادا کرنے سے قاصر ہے، اور اس پر عقلی دلیل یہ ہے کہ انسان کے بدن کے اجزاء میں سے کسی جزو میں بھی اگر کوئی خلل واقع ہو جائے تو انسان کا عیش مکدر ہو جائے گا، اور وہ یہ تمنا کرے گا کہ وہ پوری دنیا کو خرچ کر دے حتیٰ کہ اس سے وہ خلل دور ہو جائے۔ پھر اللہ تعالیٰ انسان کے بدن کے احوال کی اکمل ترین طریقہ سے تدبیر فرماتے ہیں، اس کے باوجود کہ انسان کو یہ علم بھی نہیں ہوتا کہ کس جزو میں کیا تکلیف ہوئی ہے اور اس کی اصلاح کی کیا تدبیر ہے اور کس طرح اس کے مفاسد کو دور کرے گا۔ پس چاہیے کہ تم اپنے ذہن میں یہ مثال حاضر رکھو اور پھر غور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے اس جہان میں جو معدنیات، نباتات اور حیوانات پیدا فرمائے ہیں اور ان سب کو تمہارے نفع کے لیے تمہیں مہیا فرما دیا ہے حتیٰ کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ تمام مخلوق کی عقلیں رحمٰن کی حکمت کی معرفت سے قاصر ہیں، چہ جائیکہ اللہ تعالیٰ نے اس پر جتنی وجوہ سے احسان فرمائے ہیں، ان سب کا اسے ادراک ہو جائے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ جب تم نے یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا اس پر موقوف ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کا علم ہو جائے اور تم نے یہ بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کا علم حاصل ہونا محال ہے یا واقع نہیں ہے تو پھر اللہ تعالیٰ نے کیونکر مخلوق کو اپنی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا حکم فرمایا۔ یعنی جب ان کی نعمتوں کا شکر ادا ہو ہی نہیں سکتا تو پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا ہمیں کیوں حکم فرمایا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ بندہ یہ کہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہوں خواہ وہ نعمتیں مفصل ہوں یا مجمل ہوں، اور اس طریقہ سے بندہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے سے بری ہو سکتا ہے۔

کفار پر بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے یا نہیں؟

بعض علماء نے کہا ہے کہ کافر پر اللہ تعالیٰ کی کوئی نعمت نہیں ہے۔ اور جمہور علماء نے یہ کہا ہے کہ کافر پر اور مومن پر دونوں پر اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہیں، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرما کے انعام اور احسان فرمایا ہے، اور نطفہ سے انسان کو پیدا فرما کے احسان فرمایا ہے، اور مویشیوں کو پیدا فرما کے احسان فرمایا ہے، اور گھوڑوں، خچروں اور گدھوں کو پیدا فرما کے احسان فرمایا ہے، اور زمین سے زیتون کو، کھجور کے درختوں کو اور انگور کی بیلوں کو پیدا فرما کے احسان فرمایا ہے، اور سمندر کو مسخر کر کے انسان پر احسان فرمایا تاکہ وہ تازہ مچھلیاں کھائے اور سمندر کے موتیوں سے زیورات حاصل کرے، اور یہ تمام وہ نعمتیں ہیں جن میں مومن اور کافر دونوں مشترک ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے اس ارشاد سے مؤکد فرمایا: "وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا"۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ نے کل انسانوں کو عطا فرمائی ہیں، اور یہ اس پر قوی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں کفار کو بھی پہنچی ہوئی ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اللہ ہر اس چیز کو جانتے ہیں جس کو تم چھپاتے ہو اور جس کو تم ظاہر کرتے ہو O" (النحل: ۱۹)

"وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ": اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے بتوں کی عبادت کی مذمت فرمائی، کیونکہ بتوں کو کسی چیز کی تخلیق پر قدرت نہیں ہے، اور اس آیت میں بھی بتوں کی عبادت کی مذمت فرمائی ہے، کیونکہ خدا وہ ہے جس کو ہر چھپی ہوئی اور ظاہر چیز کا علم ہو اور وہی عبادت کے مستحق ہیں، اور یہ بت جمادات ہیں، انہیں کسی چیز کی بالکل معرفت نہیں ہے تو ان کی عبادت کس طرح مستحسن ہوگی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کرتے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے بلکہ وہ خود پیدا کئے ہوئے ہیں O" (النحل: ۲۰)

"وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ": اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتوں کی یہ حقیقت بیان فرمائی ہے کہ یہ بت کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے بلکہ یہ خود پیدا کئے گئے ہیں۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: "اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ" اور اس آیت کا بھی یہی

معنی ہے کہ بت کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے، تو اب دوبارہ اس کو ذکر کرنا محض تکرار ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے صرف یہ ذکر تھا کہ بت کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے، اور یہاں پر یہ ذکر ہے کہ وہ بت کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے اور وہ خود بھی پیدا کیے ہوئے ہیں۔ اس اعتبار سے اس میں تکرار نہیں رہا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''وہ بے جان مردے ہیں زندہ نہیں ہیں، ان کو پتا نہیں کہ لوگوں کو کب اٹھایا جائے گا O'' (النحل:۲۱)

''اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ'': اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اگر یہ بت حقیقت میں خدا ہوتے تو پھر یہ زندہ ہوتے اور مردہ نہ ہوتے یعنی اُن پر موت کا آنا محال ہوتا، اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ زندہ ہیں اور اُن پر موت کا آنا محال ہے اور ان بتوں کا حال اس کے برعکس ہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے کہ وہ ''اَمْوَاتٌ'' ہیں، تو اس کا یہی معنی ہے کہ وہ زندہ نہیں ہیں، پھر دوبارہ ''غَیْرُ اَحْیَآءٍ'' ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے۔ اس سوال کے دو جواب ہیں:

(۱) خدا وہ ہو سکتا ہے جو زندہ ہو اور اس کی حیات کے بعد اس پر موت نہ آئے، اور یہ بت تو ابتداءً مردہ ہیں اور ان کی موت کے بعد حیات نہیں ہے۔

(۲) یہ کلام کفار کے ساتھ ہے جو بتوں کی عبادت کرتے ہیں اور وہ انتہائی جاہل اور گمراہ ہیں۔ اور جو کسی جاہل اور غبی سے کلام کرے وہ ایک معنی کو متعدد الفاظ کے ساتھ تعبیر کرتا ہے اور اس سے اس کی غرض یہ خبر دینی ہوتی ہے کہ اس کا مخاطب انتہائی کند ذہن ہے، اور وہ ان کلمات کو اس لیے بار بار ذکر کرتا ہے کہ اس کے کلام کو سننے والا انتہائی جاہل ہے، اور وہ ایک جملہ سے معنی مقصود کو نہیں سمجھ سکتا۔

''وَمَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ'':

''وَمَا یَشْعُرُوْنَ'' کی ضمیر بتوں کے عبادت گزاروں کی طرف لوٹتی ہے یا بتوں کی طرف لوٹتی ہے۔ اگر یہ ضمیر بتوں کے عبادت گزاروں کی طرف لوٹتی ہو تو پھر مقصود یہ ہے کہ بتوں کے عبادت گزار اس بات کو نہیں جانتے کہ وہ مرنے کے بعد کب اٹھائے جائیں گے۔ اور اس میں مشرکین اور اُن کے خداؤں پر قوی رد ہے کیونکہ وہ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ اُن بتوں کے عبادت کرنے والے مرنے کے بعد کس وقت اٹھائے جائیں گے تو ان کو یہ کیسے پتا ہوگا کہ عبادت گزار جو بتوں کی عبادت کرتے ہیں، ان کو اس کی کیا جزا یا سزا ملے گی۔ اور اگر یہ ضمیر بتوں کی طرف لوٹتی ہو تو معنی یہ ہے کہ وہ بت نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ اُن کو کب اٹھائیں گے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ بتوں کو اٹھائیں گے اور ان کی روحیں ہوں گی اور ان کے ساتھ ان کے شیاطین ہوں گے، پھر ان سب کو جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔

ایک سوال یہ ہے کہ بت جمادات ہیں اور جمادات کے متعلق یہ کہنا کس طرح درست ہوگا کہ وہ اموات ہیں اور یہ کہنا کس طرح درست ہوگا کہ وہ نہیں جانتے؟ اس سوال کے کئی جواب ہیں:

(۱) کبھی جماد کو بھی میت کہا جاتا ہے جیسے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ'' (الروم:۱۹) ''وہ زندہ کو مردہ سے

نکالتے ہیں)۔

(۲) چونکہ کفار ان بتوں کو معبود اور خدا کہتے تھے تو ان کے اعتقاد کے موافق ان کا رد فرمایا ہے کہ واقع اس طرح نہیں ہے بلکہ وہ بت مردہ ہیں، وہ کسی چیز کو نہیں جانتے۔ (تفسیر کبیر ج ۷، ص ۱۷۹۔۱۹۲، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۲۲﴾

تمہاری عبادت کے مستحق خدائے واحد ہیں، سو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل (اس کی) توحید کے منکر ہیں اور وہ تکبر کرنے والے ہیں O

لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَ مَا یُعْلِنُوْنَ ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِیْنَ ﴿۲۳﴾

حقیقت یہ ہے کہ بے شک اللہ ہر اس چیز کو جانتے ہیں جس کو یہ چھپاتے ہیں اور ہر اس چیز کو جانتے ہیں جس کو یہ ظاہر کرتے ہیں، اور بے شک اللہ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے O

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ مَّا ذَاۤ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْۤا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۲۴﴾

اور جب ان کافروں سے پوچھا جاتا ہے کہ تمہارے رب نے (اس نبی پر) کیا نازل فرمایا ہے؟ تو وہ کہتے ہیں: "یہ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں" O

لِیَحْمِلُوْۤا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ ۙ وَ مِنْ اَوْزَارِ الَّذِیْنَ یُضِلُّوْنَهُمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ ؕ اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ ﴿۲۵﴾

تاکہ انجام کار قیامت کے دن یہ کفار اپنے گناہوں کے پورے بوجھ کو اٹھائیں اور ان لوگوں کے گناہوں کے بوجھ کو بھی اٹھائیں جن کو یہ بغیر علم کے گمراہ کرتے ہیں، سنو! یہ بہت برا بوجھ ہے جسے وہ اٹھا رہے ہیں O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "تمہاری عبادت کے مستحق خدائے واحد ہیں، سو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل (اس کی) توحید کے منکر ہیں اور وہ تکبر کرنے والے ہیں O" (النحل: ۲۲)

اللہ تعالیٰ کی توحید کا بیان

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ، النحل: ۲۲ تا ۲۵ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ": اس سے پہلی آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا شریک محال ہے، پس اب یہ بیان فرمایا کہ مستحق عبادت واحد ہے، اور اس کے سوا کوئی رب نہیں ہے، اور ان کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے۔

"فَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ": یعنی جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے وہ کسی وعظ اور نصیحت کو قبول نہیں کرتے اور نہ کوئی نصیحت ان کے لیے سودمند ہوتی ہے، اس آیت میں القدریہ کا رد ہے۔

"وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ": اور یہ لوگ تکبر کرنے والے ہیں، اپنے آپ کو حق قبول کرنے سے بڑا سمجھتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "حقیقت یہ ہے کہ بے شک اللہ ہر اس چیز کو جانتے ہیں جس کو یہ چھپاتے ہیں اور ہر اس چیز کو جانتے ہیں جس کو یہ ظاہر کرتے ہیں، اور بے شک اللہ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے O" (النحل:۲۳)

"لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَ مَا یُعْلِنُوْنَ": یعنی اللہ تعالیٰ ضرور جانتے ہیں جو باتیں یہ کرتے ہیں اور جو کام یہ کرتے ہیں۔

الخلیل نے کہا: "لَا جَرَمَ" کا کلمہ، کلمۂ تحقیق ہے۔ یعنی تحقیق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن باتوں کو جانتے ہیں جو یہ کرتے ہیں اور اُن کاموں کو جانتے ہیں جو یہ کرتے ہیں۔ اور "لَا جَرَمَ" کا کلمہ کسی بات کا جواب ہوتا ہے، کہا جاتا ہے کہ انہوں نے یہ کام کیا، تو اس کے جواب میں کہا جائے گا "لا جرم سیندمون" یعنی وہ ضرور نادم ہوں گے اور حق یہ ہے کہ اُن کے لیے دوزخ کی آگ ہے۔

"اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِیْنَ": یعنی اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں کو ثواب نہیں عطا فرمائیں گے اور نہ اُن کی دنیا میں تحسین فرمائیں گے۔

تکبر کی مذمت اور تواضع کی تحسین میں آثار

الحسین بن علی رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ اُن کا چند مسکینوں کے پاس سے گزر ہوا جو ایک روٹی کا ٹکڑا کھا رہے تھے، انہوں نے کہا: اے ابوعبد اللہ! یہ ہماری غذا ہے تو حضرت حسین بن علی ان کے ساتھ بیٹھ گئے اور کہا: اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے، جب وہ روٹی کا ٹکڑا کھا کر فارغ ہوئے تو ان مسکینوں سے کہا: میں نے تمہاری دعوت قبول کر لی اب تم بھی میری دعوت قبول کرو، پس وہ مسکین ان کے ساتھ اٹھ کر ان کے گھر گئے تو حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما نے ان کو کھانا کھلایا اور مشروب پلایا اور ان پر عطا اور نوازش کی اور وہ واپس چلے گئے۔

علماء نے کہا ہے کہ تکبر کے سوا ہر گناہ کو چھپانا چاہیے، کیونکہ تکبر کرنا فسق ہے، اس کو ظاہر کرنا چاہیے اور تکبر کرنا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اصل ہے۔

تکبر کی تعریف اور اس کی مذمت میں احادیث

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا کہ جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی تکبر ہو، پس ایک مرد نے کہا کہ مرد یہ چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں، اس کی جوتی اچھی ہو، آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ حسین ہیں اور حسن کو پسند فرماتے ہیں، تکبر حق کا انکار کرنا ہے اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔

(صحیح مسلم:۹۱، سنن ترمذی:۱۹۹۹، المستدرک للحاکم ج ۱ ص ۲۶، المعجم الاوسط للطبرانی:۶۹۰۶، مسند الشامیین للطبرانی:۲۲۲۰، مسند الشہاب

القتال: ۱۰۶۷، شعب الایمان للبیہقی: ۵۷۹۰، الجامع الصحیح للسنن والمسانید ج ۱۹ ص ۱۵۱)

عمرو بن شعیب اپنے والد سے وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن تکبر کرنے والوں کا حشر چیونٹیوں کی جسامت میں مردوں کی صورتوں میں کیا جائے گا۔ ہر طرف سے ذلت اُن کو ڈھانپ لے گی، پھر اُن کو دوزخ کے ایک قید خانہ میں لے جایا جائے گا جس کا نام بولس ہے اور ان پر دوزخ کی آگوں میں سے آگ بلند کی جائے گی اور دوزخیوں کی پیپ سے اُن کو پلایا جائے گا۔ (یہ حدیث حسن ہے)۔

(سنن ترمذی: ۲۴۹۲، مسند احمد: ۶۶۷۷، الادب المفرد: ۵۵۷، السنن الکبریٰ للنسائی: ۱۱۸۴۷، مسند الحمیدی: ۶۰۹، کتاب الزہد والرقائق: ج ۲ ص ۵۲، شرح السنۃ للبغوی: ۳۵۹۱، المستدرک علی الصحیحین: ۳۲۵۷، کتاب العظمۃ: ۳۸۶)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ عزوجل نے تم سے جاہلیت کے حصہ کو دور فرما دیا ہے اور اپنے باپ دادا پر فخر کرنے کو دور فرما دیا ہے، تمام لوگ آدم کے بیٹے ہیں اور آدم مٹی سے پیدا فرمائے گئے ہیں، مومن اللہ سے ڈرنے والا ہے اور فاجر بدبخت ہے، لوگ مردوں پر فخر کرنے سے رک جائیں، کیونکہ جن پر وہ فخر کرتے ہیں وہ جہنم کے کوئلے میں سے کوئلہ ہیں، یا اللہ کے نزدیک ان کا شمار اس سیاہ بھونرے سے آسان ہوگا جس کی بدبو کی وجہ سے لوگ اپنے ناک پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں۔

(سنن ابوداؤد: ۵۱۱۶، سنن ترمذی: ۳۹۵۵، کتاب الآداب للبیہقی: ۳۲۲، مسند احمد: ۸۷۳۶، فضائل اعمال العباد ج ۱ ص ۴۴، مسند البزار: ۸۵۲۶، شرح مشکل الآثار: ۳۴۵۸، معالم السنن ج ۴ ص ۱۳۸، التوحید لابن مندہ: ۱۱۰، الاسماء والصفات للبیہقی: ۸۳۳، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۲۱۰۶۲، شرح السنۃ للبغوی: ج ۳ ص ۱۲۴، معجم ابن عساکر: ۵۵، موارد الظمآن: ۱۹۴۳، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشرۃ ج ۲ ص ۳۶۸)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”اور جب اِن کافروں سے پوچھا جاتا ہے کہ تمہارے رب نے (اس نبی پر) کیا نازل فرمایا ہے؟ تو وہ کہتے ہیں: ”یہ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں“O (النحل: ۲۴)

”وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوْآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ“:

ایک قول یہ ہے کہ یہ قائل النضر بن الحارث تھا اور یہ آیت اسی کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ نضر بن الحارث الحیرہ کی طرف گیا اور وہاں سے چند کہانیوں کی کتابیں (کلیلہ ودمنہ) خریدیں، وہ قریش کے سامنے ان کہانیوں کو پڑھ کر سناتا تھا اور کہتا تھا کہ محمد اپنے اصحاب کو جو سناتے ہیں وہ اولین کی کہانیاں اور ان کے افسانے ہیں، یعنی وہ ہمارے رب عزوجل کا نازل فرمایا ہوا کلام نہیں ہے۔

اور الاساطیر کا معنی ہے: باطل اور جھوٹی کہانیاں۔

اور ”اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ“ خبر ہے اور اس کا مبتداء محذوف ہے، یعنی جو آپ پر نازل ہوئی ہیں وہ جھوٹی کہانیاں ہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ مومنین جب کفار سے پوچھتے کہ بتاؤ ہمارے رب عزوجل نے کیا نازل فرمایا ہے تو کفار یہ کہتے کہ وہ جھوٹی کہانیاں ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”تا کہ انجامِ کار قیامت کے دن یہ کفار اپنے گناہوں کے پورے بوجھ کو اٹھائیں اور ان لوگوں کے گناہوں کے بوجھ کو بھی اٹھائیں جن کو یہ بغیر علم کے گمراہ کرتے ہیں، سنو! یہ بہت برا بوجھ ہے

جسے وہ اٹھا رہے ہیں O" (النحل: ۲۵)

"لِيَحْمِلُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۙ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ أَلَا سَاءَ مَا يَزِرُونَ":

"لِيَحْمِلُوا" میں لام "لامِ کَی" ہے اور اس کو لام عاقبت بھی کہا جاتا ہے، یعنی تاکہ انجام کار یہ کفار اپنے گناہوں کے پورے بوجھ کو اٹھائیں۔ اس لام کی مثال اس آیت میں ہے: "فَالْتَقَطَهُ آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَزَنًا۔" (القصص: ۸) "(پس فرعون کے کارندوں نے موسیٰ کو اٹھا لیا تاکہ انجام کار موسیٰ ان کے لئے دشمن ہو جائیں اور غم کا باعث ہو جائیں)۔ یعنی ان کفار نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید کے متعلق جو زہر افشانی کی تاکہ ان کا یہ قول ان کے گناہوں کے پورے بوجھ اٹھانے کا باعث ہو جائے۔

مجاہد نے کہا: وہ اپنے گناہوں کا بوجھ بھی اٹھائیں گے اور جن کو انہوں نے گمراہ کیا ہے ان کے گناہوں کا بوجھ بھی اٹھائیں گے۔

نیکی اور بدی کے طریقوں پر عمل کرنے کی جزا اور سزا کے متعلق احادیث

حضرت جریر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اسلام میں کوئی نیک کام ایجاد کیا، اسے اپنی نیکی کا اجر بھی ملے گا اور جو لوگ بعد میں اس نیکی پر عمل کرتے رہیں گے ان کی نیکیوں کا اجر بھی اس کو ملے گا اور ان لوگوں کی نیکیوں کے اجر میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ اور جس نے اسلام میں کوئی برا طریقہ ایجاد کیا تو اس پر اپنی برائی کا بھی بوجھ ہوگا اور جو لوگ اس کے بعد اس برائی پر عمل کرتے رہیں گے ان کی برائیوں کا بوجھ بھی اس پر ہوگا اور ان کی برائیوں کے بوجھ سے کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔

(صحیح مسلم: ۱۰۱۷، الرقم المسلسل: ۲۳۳۸، رقم حدیث الباب: ۶۹، سنن نسائی: ۲۵۵۳، سنن ابن ماجہ: ۲۰۳، مسند ابوداؤد الطیالسی: ۷۰۵، مسند احمد: ۱۹۱۵۶، ۱۹۱۷۴، ۱۹۱۸۳، مسند البزار: ۹۸۶۳، مستخرج ابی عوانہ: ۳۳۲۲، شرح مشکل الآثار: ۲۴۳، صحیح ابن حبان: ۳۳۰۹، المعجم الاوسط للطبرانی: ۸۹۳۶، المعجم الکبیر للطبرانی: ۲۲۴۳، مسند الشامیین للطبرانی: ۲۷۱۶، السنن الصغیر للبیہقی: ۱۲۴۷، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۷۷۳۱، شعب الایمان للبیہقی: ۳۰۴۸)

اس آیت کی نظیر یہ آیتیں ہیں: "وَلَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَأَثْقَالًا مَعَ أَثْقَالِهِمْ ۖ وَلَيُسْأَلُنَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَمَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝" (العنکبوت: ۱۳) "(بے شک وہ اپنے بوجھوں کے ساتھ کئی دوسرے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور جو افترا پردازیاں وہ کیا کرتے تھے ان کے بارے میں ان سے قیامت کے دن ضرور پوچھا جائے گا O)۔

یہ وعید اُن لوگوں کے متعلق ہے جو لوگوں سے قرآن مجید کا تعارف "أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ" کہہ کر کراتے تھے، آخرت میں یہ اپنے انکار کا مزا بھی چکھیں گے اور دوسروں کو گمراہ کرنے کا عذاب بھی بھگتیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ جب مشرکین لوگوں کو قرآن عظیم کے متعلق گمراہ کرتے ہیں اور ان کو اسلام لانے سے روکتے ہیں تو ان پر ان کے اپنے کفر پر قائم رہنے کے گناہ کا بوجھ بھی ہوگا اور جو لوگ ان کے گمراہ کرنے کی وجہ سے اسلام نہیں لائیں گے ان کے کفر کے گناہ کا بوجھ بھی ان پر ہوگا، کیونکہ جو شخص کسی کے گناہ کا سبب ہوتا ہے تو اس کے گناہ کا بوجھ بھی اس شخص پر ہوتا ہے اور اس سے دوسرے شخص کے گناہ میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کو بھی ظلماً قتل کیا جائے گا آدم کے پہلے

بیٹے پر اس کا خون ہوگا، کیونکہ وہ پہلا شخص تھا جس نے قتل کا طریقہ ایجاد کیا۔

(صحیح البخاری: ۳۳۳۵، صحیح مسلم: ۱۶۷۷، سنن ترمذی: ۲۶۷۳، سنن نسائی: ۳۹۸۵، سنن ابن ماجہ: ۲۶۱۶، السنن الکبریٰ للنسائی: ۱۱۱۳۲)

نیز اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝ (الانعام: ۱۶۴)“ (اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا پھر تم سب نے آخرت میں اللہ کی طرف لوٹنا ہے اور اللہ تعالیٰ اُن چیزوں میں فیصلہ فرمائیں گے اور تمھیں حقیقت کی خبر دیں گے جن چیزوں میں تم دنیا میں اختلاف کرتے تھے ۝)۔(الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، جزء ۱۰، ص ۸۸۔۸۹، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۶﴾

بے شک اُن سے پہلے لوگوں نے بھی (اسی طرح) سازشیں کی تھیں، پس اللہ کے عذاب نے اُن کی سازشوں کی عمارت کی بنیادیں منہدم فرما دیں، سو اُن کے اوپر اُن کی سازشوں کی عمارت کی چھت گر گئی اور ان پر وہاں سے عذاب آیا جہاں سے ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا ۝

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۷﴾

پھر قیامت کے دن اللہ اُن کو ذلیل کریں گے اور فرمائیں گے: ”میرے وہ شرکاء کہاں ہیں جن کے متعلق تم جھگڑا کرتے تھے“، اور جن لوگوں کو دنیا میں علم عطا فرمایا گیا ہے وہ کہیں گے: ”آج کے دن کافروں پر رسوائی اور عذاب ہے“ ۝

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۠ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ۭ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾

جن لوگوں کی روحیں فرشتے اس حال میں قبض کریں گے کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے تھے، تب وہ بطورِ صلح کہیں گے: ”ہم کوئی برا کام نہیں کرتے تھے“، فرشتے کہیں گے: کیوں نہیں! (تم شرک کرتے تھے)، بے شک اللہ تمہارے ان کرتوتوں کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں ۝

فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۲۹﴾

پس تم جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، جس جہنم میں تم ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہو گے، پس جہنم تکبر کرنے والوں کا بہت برا ٹھکانا ہے ۝

وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوْا خَيْرًا ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ؕ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۰﴾ۙ

اور متقین سے کہا جائے گا: "تمہارے رب نے کیا نازل فرمایا؟" وہ کہیں گے: "بہترین کلام نازل فرمایا" جن لوگوں نے اس دنیا میں نیک کام کئے ان کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور آخرت کا گھر اُن کے لیے بہت بہتر ہے اور متقین کا گھر ضرور بہت عمدہ ہے O

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ ؕ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۱﴾ۙ

وہ اُن دائمی جنّات میں داخل ہوں گے جن کے نیچے سے دریا بہتے ہیں، اور وہاں اُن کو وہ سب کچھ ملے گا جس کو وہ چاہیں گے، اللہ متقین کو اسی طرح جزا عطا فرماتے ہیں O

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۲﴾

اور جن لوگوں کی روحیں فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ کفر و شرک سے پاک ہوتے ہیں، فرشتے کہتے ہیں: "تم پر سلام ہو تم دنیا میں جو نیک کام کرتے تھے اس کے عوض میں جنت میں داخل ہو جاؤ" O

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۳۳﴾

کفار صرف یہ انتظار کر رہے ہیں کہ اُن کی روحیں قبض کرنے کے لیے فرشتے آجائیں یا ان کے پاس آپ کے رب کا عذاب آجائے، اسی طرح ان سے پہلے لوگوں نے بھی کیا تھا اور اللہ نے ان پر بالکل ظلم نہیں کیا، وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے O

فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۴﴾ع

سو اُن کو اُن کے برے اعمال کی سزا مل گئی اور اس عذاب نے اُن کا احاطہ کر لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "بے شک اُن سے پہلے لوگوں نے بھی (اسی طرح) سازشیں کی تھیں، پس اللہ کے عذاب نے اُن کی سازشوں کی عمارت کی بنیادیں منہدم فرما دیں، سو اُن کے اوپر اُن کی سازشوں کی عمارت کی چھت گر گئی اور ان پر وہاں سے عذاب آیا جہاں سے ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا O" (النحل: ۲۶)

علامہ اسماعیل حقی حنفی متوفی ۱۱۳۷ھ، النحل: ۲۶ تا ۳۴ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ":

المکر کا معنی ہے الخدیعہ یعنی دھوکا اور فریب۔ اور اہلِ مکہ نے اس طرح سازش کی تھی جس طرح اُن سے پہلے لوگوں نے سازش کی تھی اور اُن کی وہ سازش اُن کی ہی ہلاکت کا سبب بن گئی، نہ کہ کسی اور کی ہلاکت کا سبب بنی، کیونکہ جو شخص اپنے بھائی کے لیے کنواں کھودتا ہے وہ خود اس میں اوندھے منہ گرتا ہے۔

علامہ ابو البرکات احمد بن محمد نسفی حنفی متوفی ۷۱۰ھ، النحل: ۲۶ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اس آیت میں ایک مثال بیان فرمائی ہے، یعنی کفار نے کچھ منصوبے تیار کیے تاکہ اللہ کے رسولوں کے خلاف سازشیں کریں، اللہ تعالیٰ نے ان منصوبوں میں ان کافروں کو ہی ہلاک فرمادیا، جیسے کسی قوم نے کوئی عمارت بنائی اور اس میں ستون قائم کردیے۔ پھر اس عمارت کے ستون گرادیے گئے اور ان پر چھت گرگئی اور وہ ہلاک ہوگئے۔

اور جمہور کا موقف یہ ہے کہ اس سے مراد نمرود بن کنعان ہے جس نے بابل میں ایک قلعہ بنایا تھا جس کا طول پانچ ہزار ذراع (ہاتھ) تھا۔ دوسرا قول ہے کہ دو فرسخ تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے ایک آندھی بھیجی اور وہ قلعہ نمرود پر اور اس کی قوم پر گر گیا، سو وہ سب ہلاک ہوگئے جیسے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: "فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَ اَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ"۔ (پس اللہ کے عذاب نے اُن کی سازشوں کی عمارت کی بنیادیں منہدم فرمادیں، سو اُن کے اوپر اُن کی سازشوں کی عمارت کی چھت گرگئی اور ان پر وہاں سے عذاب آیا جہاں سے ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا)۔ (مدارک التنزیل وحقائق التاویل ج ۲ ص ۲۰۹، دار ابن کثیر، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

علامہ علاؤ الدین علی بن محمد البغدادی الشہیر بالخازن المتوفی ۷۲۵ھ، النحل: ۲۶ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یعنی کفار قریش سے پہلے نمرود بن کنعان الجبار تھا، وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں زمین کے بادشاہوں میں سب سے بڑا بادشاہ تھا اور اس کا مکر اور اس کی سازش یہ تھی کہ اس نے بابل میں ایک قلعہ بنایا تاکہ اس قلعہ سے آسمان کی طرف چڑھ جائے اور اپنے زعم میں آسمان والوں سے جنگ کرے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ آسمانوں کی جانب اس قلعہ کا طول پانچ ہزار ہاتھ تھا۔ اور کعب اور مقاتل نے کہا: اس کا طول دو فرسخ تھا۔ پس ایک آندھی آئی جس نے اس قلعہ کو گرادیا اور اس قلعہ کا اوپر کا حصہ سمندر میں گر گیا اور نچلا حصہ اس قلعہ میں رہنے والوں کے اوپر گر گیا، پھر وہ سب اس قلعہ کے نیچے ہلاک ہوگئے۔ پھر جب وہ قلعہ گر گیا تو لوگوں کی زبانیں گھبراہٹ کی وجہ سے تختِ قلم میں مبتلا ہوگئیں، پس اس دن انہوں نے تہتر (۷۳) زبانوں سے کلام کیا، اسی وجہ سے اس جگہ کا نام بابل رکھا گیا۔ اور اس سے پہلے لوگوں کی زبان سریانی تھی۔

علامہ خازن فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں: یہ قصہ البغوی نے بیان کیا ہے اور اس قصہ پر یہ اعتراض ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام اُن سے پہلے تھے اور وہ عربی زبان میں بات کرتے تھے اور اہلِ یمن کی زبان عربی تھی اور انہی میں سے جرہم تھے جن میں حضرت اسماعیل علیہ السلام نے نشو و نما پائی تھی اور اُن سے عربی زبان سیکھی تھی اور عرب کے قبائل حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بھی قدیم ہیں، جیسے طسم

اور جدیس (یہ قبائل کے نام ہیں) اور یہ سب عرب قبائل ہیں جو قدیم زمانہ سے عربی زبان بولتے تھے۔

اور دوسرا قول یہ ہے کہ "قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ" کو عموم پر محمول کیا جائے، پس یہ آیت تمام مکر کرنے والوں کے متعلق عام ہوگی جو دوسروں کو ضرر پہنچانے کا ارادہ کرتے تھے۔ اور اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ" یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی عمارتوں کی جڑ کو منہدم کر دیا۔ اور یہ اس طرح ہوا کہ ایک سخت آندھی آئی جس نے اُن کی بنیادوں کو اوپر سے نیچے گرا دیا اور اُن پر زلزلے آئے جس نے اُن کی عمارت کی بنیادوں کو اکھاڑ ڈالا۔ یہ اس صورت میں ہے جب ہم اس آیت کی پہلے قول کے موافق تفسیر کریں۔ اور اگر اس آیت کی دوسرے قول کے موافق تفسیر کریں یعنی عموم پر تو معنی یہ ہوگا کہ کفار نے انبیاء علیہم السلام کے خلاف منصوبے تیار کیے، تا کہ انبیاء علیہم السلام کے خلاف اور اہل حق کے خلاف سازشیں کریں تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو ہلاک فرما دیا اور اُن کی ہلاکت ایسے ہوئی جیسے کوئی مضبوط عمارت گر جائے۔ (لباب التاویل فی معانی التاویل، ج ۳ ص ۷۳، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۱۰ء)

شیخ صدیق بن حسن بن علی القنوجی متوفی ۱۳۰۷ھ، نے بھی اس آیت کی تفسیر میں تفسیر خازن کا خلاصہ بیان کیا ہے۔

(فتح البیان، ج ۴ ص ۲۱۔ ۲۲، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

شیخ اشرف علی تھانوی دیو بندی متوفی ۱۳۶۴ھ، النحل: ۲۶ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

جو لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں انہوں نے (انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ اور مخالفت میں) بڑی تدبیریں کیں سو اللہ تعالیٰ نے ان (کی تدبیروں) کا بنا بنایا گھر جڑ بنیاد سے ڈھا دیا، پھر (وہ ایسے ناکام ہوئے جیسے گویا) اوپر سے ان پر (اس گھر کی) چھت (آپڑی ہو، یعنی جس طرح چھت آپڑنے سے سب دب کر رہ جاتے ہیں اسی طرح وہ لوگ بالکل خائب وخاسر ہوئے) اور (علاوہ ناکامی کے) ان پر (خدا کا) عذاب ایسی طرح آیا کہ ان کو خیال بھی نہ تھا۔ (تفسیر بیان القرآن، ج ۲ ص ۳۳۳، مکتبہ رحمانیہ، لاہور)

صدر الافاضل علامہ سید محمد نعیم الدین مراد آبادی حنفی متوفی ۱۳۶۷ھ، النحل: ۲۶ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یہ ایک تمثیل (مثال) ہے کہ پچھلی امتوں نے اپنے رسولوں کے ساتھ مکر کرنے کے لیے کچھ منصوبے بنائے تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں خود انہیں کے منصوبوں میں ہلاک فرمایا اور ان کا حال ایسا ہوا جیسے کسی قوم نے کوئی بلند عمارت بنائی پھر وہ عمارت ان پر گر پڑی اور وہ ہلاک ہو گئے، اسی طرح کفار اپنی مکاریوں سے خود برباد ہوئے۔ مفسرین نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اس آیت میں اگلے مکر کرنے والوں سے نمرود بن کنعان مراد ہے جو زمانہ ابراہیم علیہ السلام میں روئے زمین کا سب سے بڑا بادشاہ تھا۔ اس نے بابل میں بہت اونچی ایک عمارت بنائی تھی جس کی بلندی پانچ ہزار گز تھی اور اس کا مکر یہ تھا کہ اس نے یہ بلند عمارت اپنے خیال میں آسمان پر پہنچنے اور آسمانوں والوں سے لڑنے کے لیے بنائی تھی، اللہ تعالیٰ نے ہوا چلائی اور وہ عمارت ان پر گر پڑی اور وہ لوگ ہلاک ہو گئے۔

(تفسیر خزائن العرفان مع ترجمہ کنز الایمان، ص ۵۰۳، مکتبۃ المدینہ، کراچی، ۱۴۳۲ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پھر قیامت کے دن اللہ اُن کو ذلیل کریں گے اور فرمائیں گے: "میرے وہ شرکاء کہاں ہیں جن کے متعلق تم جھگڑا کرتے تھے"، اور جن لوگوں کو دنیا میں علم عطا فرمایا گیا ہے وہ کہیں گے: "آج کے دن کافروں پر رسوائی اور عذاب ہے"○ (النحل: ۲۷)

"ثُمَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ": یعنی یہ عذاب اُن کے دنیا میں کیے ہوئے کرتوتوں کی سزا ہے۔ اور قیامت کے دن "یُخْزِیْهِمْ" اللہ تعالیٰ ان افتراء پردازوں کو اور مکاروں کو تمام لوگوں کے سامنے ذلیل کرنے والا عذاب دیں گے۔ اور "الخزی" کا معنی ہے: ایسی ذلت جس سے لوگ حیاء کرتے ہوں۔ اور ان دونوں سزاؤں کے درمیان بہت فرق ہے۔

"وَ یَقُوْلُ": اللہ تعالیٰ اُن کو ذلیل و رسوا کرنے کے لیے زجر و توبیخ سے فرمائیں گے: "اَیْنَ شُرَكَآءِیَ" تمہارے زعم میں جو میرے شریک تھے وہ آج کہاں ہیں؛ "الَّذِیْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ" جن کی وجہ سے تم انبیاء علیہم السلام اور مومنین سے جھگڑا کرتے تھے۔ "فِیْهِمْ" یعنی اُن کے متعلق یہ جھگڑا کرتے تھے کہ یہ اللہ کے شریک ہیں، اور یہ زیادہ حق دار ہیں، اور اس استفہام سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کے خود ساختہ شرکاء کو اُن کی سفارش کے لیے حاضر فرمائیں گے، یا بر طریق استہزاء اُن کی مدافعت کے لیے طلب فرمائیں گے اور وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے شرکاء نہیں ہیں بلکہ اُن کا کوئی بھی شریک نہیں ہے۔ اور جب وہ حاضر نہیں ہو سکیں گے تو اُن کے متعلق مشرکین کا دعویٰ باطل ہو جائے گا۔

"قَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ": میدانِ حشر میں جو انبیاء علیہم السلام ہوں گے اور مومنین کرام ہوں گے جن کو توحید کے دلائل کا علم دیا گیا ہوگا اور وہ دنیا میں مشرکین کو توحید کی دعوت دیتے تھے، پس یہ مشرکین اُن سے جھگڑا کریں گے اور اُن کے سامنے تکبر کریں گے۔ اور وہ انبیاء علیہم السلام اور مومنین اُن سے کہیں گے: "اِنَّ الْخِزْیَ الْیَوْمَ وَ السُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ" یعنی فضیحت، ذلت، خواری، توہین اور عذاب آج کے دن صرف کافروں پر ہے، یعنی جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کو اختیار کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ اور اُن کے رسولوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔ اور بعض گناہ گار مسلمانوں کو جو عذاب ہوگا وہ اس جنس سے نہیں ہوگا، کیونکہ اُن کو عارضی عذاب ہوگا اور جب وہ گناہوں سے پاک صاف ہو جائیں گے تو اُن کو جنت میں داخل فرما دیا جائے گا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "جن لوگوں کی روحیں فرشتے اس حال میں قبض کریں گے کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے تھے، تب وہ بہ طور صلح کہیں گے: "ہم کوئی برا کام نہیں کرتے تھے"، فرشتے کہیں گے: کیوں نہیں! (تم شرک کرتے تھے)، بے شک اللہ تمہارے ان کرتوتوں کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں O" (النحل: ۲۸)

"الَّذِیْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓىٕكَةُ": رسوائی اور عذاب اُن کے ساتھ مخصوص ہے جو موت تک کفر پر برقرار رہے نہ کہ وہ لوگ جو ایمان لائے تھے خواہ آخر عمر میں ایمان لائے ہوں۔ سو جن لوگوں کو ملائکہ اس حال میں وفات دیں گے کہ وہ فرشتوں سے ملاقات کے وقت تک کفر پر برقرار ہوں گے۔ یعنی مَلَكُ الموت حضرت عزرائیل علیہ السلام اور ان کے مددگار فرشتے اُن کی جانوں سے روح نکالیں گے۔

"ظَالِمِیْۤ اَنْفُسِهِمْ": اس حال میں کہ وہ دائما کفر پر قائم رہنے والے ہوں گے اور تکبر کر کے اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہوں گے۔ اور جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی فطرت کو (اپنی دانست میں) تبدیل کر دیا ہوگا، "فَاَلْقَوُا السَّلَمَ": تو وہ کفار فرشتوں کو سلام کریں گے، یعنی وہ اب اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کرلیں گے اور موت کے وقت اطاعت کو ظاہر کریں گے۔ وہ فرشتوں کے سامنے آخرت میں اطاعت اور فرمانبرداری کو ظاہر کریں گے جب وہ عذاب کو دیکھ لیں گے اور انبیاء اور مومنین کے ساتھ جو جھگڑا کر رہے

تھے اس کو چھوڑ دیں گے اور دنیا میں جس تکبر پر وہ قائم تھے اس کو ترک کر دیں گے اور یہ کہہ رہے ہوں گے: "مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ" یعنی شدت خوف کی وجہ سے وہ دنیا میں کیے ہوئے انکار، تکذیب اور شرک کا انکار کر دیں گے، اور اس کا ایک محمل یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اعتقاد میں اور اپنے گمان کے مطابق شرک نہیں کیا تھا۔ اور یہ قصد کریں گے کہ اس طرح سے وہ عذاب سے بچ جائیں گے۔ "بَلٰٓى" یہ اُن پر رد ہے، یعنی کیوں نہیں! تم دنیا میں شرک کرتے تھے اور برے کام کرتے تھے۔

"اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ": تم دنیا میں جو کچھ بھی کرتے تھے، اللہ تعالیٰ اس کو بہت زیادہ جاننے والے ہیں، سو وہ تم کو تمہارے دنیا میں کیے ہوئے کاموں پر سزا دیں گے اور اب اس کا وقت آ گیا ہے، لہٰذا اب تمہارا دنیا میں شرک کا انکار کرنا اور اپنی تکذیب کرنا مفید نہیں ہوگا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پس تم جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، جس جہنم میں تم ہمیشہ رہنے والے ہو گے، پس جہنم تکبر کرنے والوں کا بہت برا ٹھکانا ہے O" (النحل:۲۹)

"فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ": یعنی کفار میں سے ہر قسم کے لیے عذاب کا ایک دروازہ تیار کیا ہوا ہوگا، اُن سے کہا جائے گا: اس دروازہ میں داخل ہو جاؤ۔ "خٰلِدِيْنَ فِيْهَا" اس حال میں کہ تم جہنم میں ہمیشہ رہنے والے ہو گے۔

"فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ": المثوی کا معنی ہے المنزل اور المقام، اور یہ مخصوص بالذم ہے اور وہ جہنم ہے۔ اور متکبرین کا یہ برا ٹھکانا ہے۔

تکبر کی اقسام

تکبر کی تین قسمیں ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کے سامنے تکبر کرنا، اور یہ تکبر کی سب سے خبیث اور سب سے قبیح قسم ہے۔ اور اس کا منشاء جہلِ محض ہے۔

(۲) رسولوں کے سامنے تکبر کرنا، یعنی جو لوگ انبیاء علیہم السلام کو اپنے جیسا بشر کہتے تھے تو اپنے جیسے بشر پر ایمان لانا اور اس کو رسول ماننا اس سے اُن کا تکبر روکتا تھا، اور یہ اللہ تعالیٰ کے سامنے قیامت کے دن تکبر کرنے کی مثل ہے جس کی وجہ سے انسان دائمی عذاب کا مستحق ہوتا ہے۔

(۳) بندوں کے سامنے تکبر کرنا، اور وہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو عظیم سمجھے اور دوسروں کو حقیر سمجھے اور اُن کی برابری کو برا جانے۔ اور یہ بھی قبیح ہے، اور یہ تکبر کرنے والا بہت بڑا جاہل ہے جو اللہ تعالیٰ کی عظیم ناراضگی کو برداشت کرتا ہے۔ اگرچہ یہ تکبر پہلی تکبر کی دو قسموں سے کم ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، پس آپ کے پاس دیہاتیوں میں سے ایک مرد آیا، اس پر سیجان کا جبہ تھا اور ریشم کے بٹن لگے ہوئے تھے، اور اس نے کہا: تمہارے اس پیغمبر نے ہر فارس ابن فارس کو پست کر دیا اور ہر چرواہے ابن چرواہے کو بلند کر دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جبہ کو سنبھالا اور فرمایا: کیا میں تم پر اُن لوگوں کا لباس نہیں دیکھ رہا جو بے عقل ہیں، پھر فرمایا کہ جب اللہ کے نبی حضرت نوح علیہ السلام پر وفات کا وقت آیا تو انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو

بلایا، پس فرمایا: میں تمہیں دو چیزوں کا حکم دیتا ہوں اور دو چیزوں سے روکتا ہوں، میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ لا الٰہ الا اللہ پر قائم رہنا، پس اگر سات آسمان اور سات زمینیں ترازو کے ایک پلڑے میں رکھی جائیں اور لا الٰہ الا اللہ کو دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو یہ دوسرا پلڑا اس پلڑے پر راجح ہوگا۔ اور اگر سات آسمان اور سات زمینیں کسی مبہم حلقے میں ہوں تو لا الٰہ الا اللہ اُن کو توڑ دے گا اور میں تمہیں سبحان اللہ وبحمدہ پڑھنے کا حکم دیتا ہوں، کیونکہ یہ ہر نبی کی صلوٰۃ ہے، اسی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مخلوق کو رزق عطا فرماتے ہیں، اور میں تمہیں دو چیزوں سے منع کرتا ہوں، اللہ کے ساتھ کفر کرنے سے اور تکبر کرنے سے۔

(مسند احمد: ۷۱۰۱، جامع العلوم والحکم ج ۲ ص ۱۹، السند الموضوعی الجامع للکتب العشر ، ج ۱۵ ص ۲۸، الادب المفرد للبخاری: ۵۴۸، مسند البزار: ۲۹۹۸، مجمع الزوائد، ج ۳ ص ۲۱۹ ـ ۲۲۰، سنن ابوداؤد: ۳۰۹۲)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور متقین سے کہا جائے گا: ''تمہارے رب نے کیا نازل فرمایا؟'': وہ کہیں گے: ''بہترین کلام نازل فرمایا''، جن لوگوں نے اس دنیا میں نیک کام کئے ان کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور آخرت کا گھر اُن کے لیے بہت بہتر ہے اور متقین کا گھر ضرور بہت عمدہ ہے O'' (النحل: ۳۰)

''وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا'': یعنی جن لوگوں نے کفر اور شرک سے اجتناب کیا اور وہ مومنین مخلصین ہیں، ان متقین سے کہا جائے گا: ''مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ'' کہ تمہارے رب نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر کیا نازل فرمایا ہے؟ ''قَالُوْا'' تو وہ اس کے جواب میں کہیں گے: ''خَيْرًا'': بہت عمدہ کلام نازل فرمایا ہے۔ الکاشفی نے کہا: خیر سے مراد قرآن مجید ہے جو تمام خیرات کو جامع ہے اور تمام حسنات اور برکات پر مشتمل ہے اور دین اور دنیا کی تمام ظاہری اور باطنی نعمتوں کو محیط ہے۔

''لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا'': یعنی جن لوگوں نے اچھے عمل کئے اور انہوں نے کہا: لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ، کیونکہ یہ کلمہ تمام نیکیوں سے زیادہ حسین ہے، اور یہ مستقل کلام ہے جو متقین کی مدح کے لیے لایا گیا ہے۔

''فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ'': یعنی اُن سے کہا جائے گا: تمہارے لیے اس دنیا کے اندر بھی اچھائیاں ہیں اور دنیا کے اندر بھی تمہارے اعمال کی اچھی جزاء ہے، یعنی تم نے دنیا میں جو مسلمانوں کی جانوں اور مالوں کی حفاظت کی، اس کی وجہ سے تم مدح اور ثناء کے مستحق ہو گئے ہو، اور تمہارے لیے مکاشفات اور مشاہدات کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں۔ اور جس کو یہ امور دیے جائیں تو وہ بڑی کامیابی کو حاصل کرتا ہے۔

اور ''التاویلات النجمیہ'' میں مذکور ہے کہ جس نے نیک اعمال کئے اور جس کے اخلاق محمود تھے اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اچھائی ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں واصلین اور کاملین کے مقام پر رکھیں گے۔

''وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ'': اور آخرت میں جو اُن کو ثواب عطا فرمایا جائے گا، وہ دنیا میں دی گئی اچھائیوں سے بہت بہتر ہوگا۔ یا معنی یہ ہے کہ ''دَارُ الْاٰخِرَةِ'' دنیا سے علی الاطلاق افضل ہے، کیونکہ آخرت جوہر کی مثل ہے اور دنیا ٹھیکری کی مثل ہے، اور جوہر کی قیمت ٹھیکری سے بہت اعلیٰ اور افضل ہوتی ہے۔

اور ''التاویلات النجمیہ'' میں مذکور ہے کہ اس میں یہ اشارہ ہے کہ متقین کے لیے آخرت میں دنیا کے ٹھکانے سے افضل ٹھکانا ہوتا

ہے اور دَارُ الْاٰخِرَةِ مقصد صادق ہے، اور وہ بہت اچھا دار ہے۔

''وَ لَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِیْنَ'': یعنی متقین کے لیے جو دار ہے وہ بہت اچھا دار ہے، اور دنیا ایک اعتبار سے ممدوح ہے اور دوسرے اعتبار سے مذموم ہے، دنیا اس اعتبار سے ممدوح ہے کہ اس سے آخرت کا دار حاصل کیا جائے، اور اگر دنیا سے صرف اس کی رنگینیوں کا قصد کیا جائے تو وہ مذموم ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''وہ اُن دائمی جنّات میں داخل ہوں گے جن کے نیچے سے دریا بہتے ہیں، اور وہاں اُن کو وہ سب کچھ ملے گا جس کو وہ چاہیں گے، اللہ متقین کو اسی طرح جزا عطا فرماتے ہیں O'' (النحل: ۳۱)

''جَنّٰتُ عَدْنٍ'': عدن اُن جنّات کے لیے علَم ہے، یعنی اُن جنتوں میں دائمی باغات ہیں۔

''یَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ'': یعنی اُن جنتوں کے نیچے سے چار دریا بہتے ہیں، اور اُن دریاؤں کا منبع جنات عدن میں ہے۔ ''لَهُمْ فِیْهَا مَا یَشَآءُوْنَ'': یعنی جن چیزوں سے وہ محبت رکھتے ہوں گے، وہ اُن کو اس میں ملیں گی۔

علامہ بیضاوی نے کہا ہے: اس آیت میں حصر ہے، کیونکہ ''لَهُمْ'' خبر مقدم ہے اور خبر مقدم مفید حصر ہوتی ہے۔ اور اس میں یہ تنبیہ ہے کہ انسان جن تمام چیزوں کا ارادہ کرے، ان کو صرف جنت میں پا سکتا ہے۔

اہلِ جنت کے دلوں میں بری خواہشوں کا نہ ہونا

اگر کوئی مرد جنت میں لواطت کی خواہش کرے تو کیا وہ جنت میں لواطت کر سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اہلِ جنت کے دلوں میں ایسی ناپاک خواہشیں نہیں ہوں گی، کیونکہ ایسی خواہشیں اللہ عزوجل کی حکمت کے خلاف ہیں، اور اگر یہ جائز ہو تو ماؤں کے ساتھ نکاح کرنا بھی جائز ہوگا۔ اور کوئی عاقل اس کے باطل ہونے میں شک نہیں کر سکتا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ زنا کرنا اور لواطت کرنا اور جھوٹ بولنا ایسے امور ہیں جو دنیا میں تمام ادیان میں دائماً حرام ہیں کیونکہ یہ وہ امور ہیں جو حکمت کے خلاف ہیں، اس کے برخلاف خمر وغیرہ ہے، کیونکہ جنت میں جو خمر ہوگی وہ عقل کو ماؤف نہیں کرے گی، ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اُن لوگوں میں سے رکھیں جو خبیث چیزوں کو اچھا نہیں سمجھتے۔

الکاشفی نے اس کے جواب میں کہا ہے کہ اگر کوئی شخص یہ خواہش کرے کہ وہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام اور شہداء عظام کے درجے پر پہنچ جائے تو یہ بھی باطل ہے، کیونکہ جنت میں ایسی خواہشیں نہیں ہوں گی، کیونکہ ایسی خواہشوں کا منشاء اور منبع حسد ہے اور جنت میں کینہ اور حسد نہیں ہوگا۔ ''كَذٰلِكَ یَجْزِی اللّٰهُ الْمُتَّقِیْنَ'': جس طرح اللہ تعالیٰ متقین کو مکمل جزا عطا فرمائیں گے، اسی طرح ہر وہ شخص جو شرک سے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے اجتناب کرے گا، اس کو بھی مکمل جزا عطا فرمائیں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور جن لوگوں کی روحیں فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ کفر و شرک سے پاک ہوتے ہیں، فرشتے کہتے ہیں: ''تم پر سلام ہو، تم دنیا میں جو نیک کام کرتے تھے اس کے عوض میں جنت میں داخل ہو جاؤ'' O (النحل: ۳۲)

اہل جنت کا تقویٰ پر ثابت قدم رہنا

"اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ": اس آیت میں متقین کی صفت ہے، یعنی مَلَکُ الموت اور اُن کے مددگار فرشتے اُن متقین کی روحوں کو قبض کریں گے۔ "طَيِّبِيْنَ" یعنی جو ظلم کے میل کچیل سے پاک ہوں گے۔ اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ تمام امور کا مدار تقویٰ پر ہے، یعنی آدمی اخیر وقت تک تقویٰ پر قائم رہے، اور جب اس کو موت آئے تو وہ تقویٰ پر قائم ہو۔

اس آیت میں مومنین کو تقویٰ پر ثابت قدم رہنے کی ترغیب ہے اور دوسروں کو تقویٰ کی تحصیل پر برانگیختہ فرمایا ہے۔

اور "التاویلات النجمیہ" میں مذکور ہے کہ اُن کے اعمال شہوات اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی مخالفات کے میل سے پاکیزہ ہوں گے۔ اور وہ مذموم کام جن کو انسان طبیعت کے مقتضی سے کرتا ہے نہ کہ شریعت کے مقتضی سے، سو ایسے کاموں سے وہ پاک ہوں گے۔

جنت میں متقین کی تعظیم اور تکریم

"يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ": یعنی فرشتے اُن کی تعظیم کے طور پر کہیں گے اور انہیں بشارت دینے کے لیے کہیں گے کہ تم ہر ناپسندیدہ چیز سے سلامت رہو گے۔ اور بعض مفسرین نے کہا ہے: جب فرشتے مومنین کی جانوں سے روح قبض کریں گے تو کہیں گے: السلام علیک یا ولی اللہ۔ اللہ آپ پر سلام پڑھتے ہیں اور آپ کو جنت کی بشارت دیتے ہیں۔

"اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ": یعنی تم جنات عدن میں داخل ہو جاؤ، اور مراد یہ ہے کہ اسی وقت میں داخل ہو جاؤ۔

اور قبر جنت کے باغات میں سے ایک باغ ہے اور جنت کی نعمتوں کا مقدمہ ہے، جو قبر میں اچھے حال اور اچھے اعمال کے ساتھ داخل ہوا، پس گویا کہ وہ جنت میں داخل ہو گیا اور وہ وہاں پر ایسی نعمتیں پائے گا جو ہمیشہ رہیں گی اور کبھی زائل نہیں ہوں گی۔

"بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ": کیونکہ تم تقویٰ پر ثابت قدم رہے اور نیک عمل اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے رہے، اگرچہ یہ نیک کام جنت میں دخول کو واجب نہیں کرتے، کیونکہ جنت میں دخول محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہوتا ہے، لیکن "بِمَا كُنْتُمْ" میں "باء" درجات پر داخل ہے، یعنی جنت میں دخول تو صرف اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہو گا اور درجات اُن کے اعمال کے اعتبار سے ملیں گے۔

جنت میں دخول کا سبب صرف اللہ تعالیٰ کا فضل ہے نہ کہ نیک اعمال

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کسی شخص کو ہرگز اس کا عمل نجات نہیں دے گا، صحابہ نے پوچھا: آپ کو بھی یا رسول اللہ؟ آپ نے فرمایا: اور مجھ کو بھی، سوا اس کے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ لیں، تم درست کام کرو اور درمیانی کام کرو، اور صبح کے وقت میں عمل کرو اور شام کے وقت میں عمل کرو، اور کچھ رات کے اندھیرے کے وقت میں اور میانہ روی کو لازم رکھو، میانہ روی کو لازم رکھو۔ (صحیح مسلم: ۲۸۱۶، سنن ابن ماجہ: ۴۲۰۱، مسند احمد: ۷۱۶۲)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "کفار صرف یہ انتظار کر رہے ہیں کہ اُن کی روحیں قبض کرنے کے لیے فرشتے آ جائیں یا ان کے پاس آپ کے رب کا عذاب آ جائے، اسی طرح ان سے پہلے لوگوں نے بھی کیا تھا اور اللہ نے ان پر بالکل ظلم نہیں کیا، وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے O" (النحل: ۳۳)

"هَلْ يَنْظُرُوْنَ": یعنی کفار مکہ صرف اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ "اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ": کہ ان کے پاس ملک الموت

آجائے اور اس کے مددگار فرشتے آجائیں تاکہ وہ ان کی روحوں کو عذاب کے ساتھ قبض کریں، کیونکہ وہ ایسے کام کرتے ہیں جن کی وجہ سے اُن کو عذاب دیا جائے۔ "اَوْ یَاْتِیَ اَمْرُ رَبِّكَ": یا اُن پر کوئی دنیا کا عذاب آجائے جیسا کہ یوم بدر میں اہل مکہ پر عذاب آیا تھا۔ "كَذٰلِكَ": یعنی جس طرح ان اہل مکہ نے شرک کیا ہے اور ظلم کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی تکذیب کی ہے اور ان کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا استہزاء کیا ہے۔ "فَعَلَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ": اسی طرح اُن سے پہلی امتوں کے لوگوں نے کیا تھا۔

"وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ": اور اُن پر جس عذاب کی تلاوت کی جائے گی، وہ عذاب نازل فرما کر اللہ تعالیٰ نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے، وہ کفر کرتے تھے اور نافرمانیاں کرتے تھے جو اس عذاب تک پہنچاتی ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "سو اُن کو اُن کے برے اعمال کی سزا مل گئی اور اس عذاب نے اُن کا احاطہ کر لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے O" (النحل: ۳۴)

"فَاَصَابَهُمْ سَیِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا": پس اللہ تعالیٰ کے عدل کے تقاضا سے ان کو ان کے کیے ہوئے برے کاموں کی سزا مل گئی۔
"وَ حَاقَ بِهِمْ": اور اُن پر اس عذاب نے احاطہ کر لیا۔ "مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ": جس عذاب کا وہ پہلے مذاق اڑایا کرتے تھے۔

(روح البیان ج ۵ ص ۳۵۔۳۱، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۱ھ)

وَ قَالَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ نَّحْنُ وَ لَاۤ اٰبَآؤُنَا وَ لَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴿۳۵﴾

اور مشرکین نے کہا: اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کی عبادت کرتے اور نہ ہمارے آباء و اجداد کسی اور کی عبادت کرتے اور نہ ہم اللہ کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام قرار دیتے، اسی طرح ان سے پہلے لوگوں نے بھی (شرک پر) عذر پیش کیے تھے، پس رسولوں کے ذمہ صرف اللہ کے احکام کو صاف صاف پہنچا دینا ہے O

وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَ مِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَیْهِ الضَّلٰلَةُ ؕ فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ ﴿۳۶﴾

اور بے شک ہم نے ہر امت میں رسول کو یہ پیغام دے کر بھیجا کہ تم لوگ اللہ کی عبادت کرو اور بتوں کی عبادت سے اجتناب کرو، سو ان میں سے بعض وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت عطا فرمائی ہے اور بعض وہ لوگ ہیں جن پر ازل میں گمراہی ثابت ہو چکی ہے، سو اے کافرو! تم اللہ کی زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کا کیسا انجام ہوا تھا O

اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۳۷﴾

(اے رسول اکرم!) اگر آپ ایسے لوگوں کے ہدایت یافتہ ہونے پر حریص ہیں (تو سن لیں) بے شک اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت نہیں عطا فرماتے جس کو وہ گمراہی میں مبتلا فرما دیں، اور ان لوگوں کے لیے کوئی مددگار نہیں ہے O

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ؕ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾

اور کافروں نے اللہ کی پختہ قسمیں کھائیں کہ اللہ مردوں کو زندہ نہیں کرے گا، کیوں نہیں! یہ اللہ تعالیٰ کا برحق وعدہ ہے لیکن اکثر لوگ اس پر یقین نہیں رکھتے O

لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ ﴿۳۹﴾

(اللہ مردوں کو اس لیے زندہ فرمائیں گے) تاکہ کفار کے لیے اس حق کو بیان فرما دیں جس میں وہ اختلاف کرتے تھے، اور تاکہ کفار یہ جان لیں کہ وہ دنیا میں جھوٹ بولتے تھے O

اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَاۤ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۰﴾

ہم جب کسی چیز کو پیدا فرمانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ہمیں صرف اتنا کہنا ہوتا ہے کہ "ہوجا" سو وہ چیز فوراً ہو جاتی ہے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور مشرکین نے کہا: اگر اللہ چاہتے تو نہ ہم اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کی عبادت کرتے اور نہ ہمارے آباء و اجداد کسی اور کی عبادت کرتے اور نہ ہم اللہ کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام قرار دیتے، اسی طرح ان سے پہلے لوگوں نے بھی (شرک پر) عذر پیش کیے تھے، پس رسولوں کے ذمہ صرف اللہ کے احکام کو صاف صاف پہنچا دینا ہے O" (النحل: ۳۵)

مشرکین کے معارضات کے جوابات

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ، النحل: ۳۵ تا ۴۰ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَاۤ اٰبَآؤُنَا":

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے ایک معارضہ کا جواب دیا ہے اور اس طرح کے معارضات مشرکین نے پہلے بھی کیے تھے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشْرَكْنَا وَلَاۤ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ﴿۱۴۸﴾ (الانعام: ۱۴۸)" (عنقریب مشرکین کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتے تو نہ ہم شرک کرتے نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کسی

چیز کو حرام قرار دیتے، اسی طرح اُن سے پہلے لوگوں نے بھی (ہمارے عذاب کی) تکذیب کی تھی حتیٰ کہ انہوں نے ہمارے عذاب کا ذائقہ چکھا، آپ کہیے: کیا تمہارے پاس اس پر کوئی علمی دلیل ہے؟ (اگر ہے) تو اس دلیل کو ہمارے سامنے لاؤ، تم صرف گمان کی پیروی کرتے ہو، اور تم محض غلط اندازے لگاتے ہو O)۔

نیز اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "إِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنۢ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا تَعْبُدُوٓا إِلَّا ٱللَّهَ ۖ قَالُوا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَأَنزَلَ مَلَـٰٓئِكَةً فَإِنَّا بِمَآ أُرْسِلْتُم بِهِۦ كَـٰفِرُونَ ⊙ (حم السجدہ: ۱۴)" (وہ عذاب اس وقت آیا جب ان کے رسول ان کے آگے پیچھے پھرتے تھے اور کہتے تھے: "اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو" انہوں نے کہا: "اگر ہمارا رب چاہتا تو فرشتے نازل کر دیتا، پس جو پیغام دے کر آپ کو بھیجا گیا ہے ہم اسے نہیں مانتے" O)۔

"وَلَا حَرَّمْنَا مِن دُونِهِۦ مِن شَىْءٍ": یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر جو ہم نے السوائب، الوصائل اور البحائر وغیرہ کو حرام قرار دیا۔

مشرکین کے معارضہ کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول کہتے ہیں کہ غیر اللہ کی عبادت نہ کرو اور جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام نہیں قرار دیا ان کو حرام نہ قرار دو، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے یہ کام چاہے تھے، اور جو اللہ چاہتے ہیں وہ ہو جاتا ہے اور جو نہیں چاہتے وہ نہیں ہوتا، پس جب ہم سے غیر اللہ کی عبادت واقع ہوئی اور ہم نے اُن چیزوں کو حرام قرار دیا جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام نہیں قرار دیا تھا تو یہ اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسی طرح چاہا تھا۔

مشرکین کی اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ عدم کے لیے مشیت کی ضرورت نہیں ہوتی، جیسے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"ما شاء اللہ کان وما لم یشأ لم یکن" (جس کو اللہ نے چاہا وہ ہو گیا اور جس کو اللہ نے نہیں چاہا وہ نہیں ہوا)۔

(احیاء علوم الدین علی ہامش اتحاف السادۃ المتقین، ج ۶ ص ۴۰۳، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۳ھ، کتاب عمل الیوم واللیلۃ: ۴۲، موسسۃ الکتب الثقافیہ، بیروت، ۱۴۰۸ھ)

کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ جس کو اللہ نے چاہا وہ ہو گیا اور جس کے نہ ہونے کو چاہا تو وہ نہیں ہوا۔ بلکہ کسی چیز کے نہ ہونے کے لیے اس کے ہونے کی مشیت کا عدم کافی ہے، اسی وجہ سے علماء کہتے ہیں "علۃ العدم عدم علۃ الوجود" یعنی کسی چیز کے عدم کی علت یہ ہے کہ اس کے وجود کی علت نہ ہو۔

اور کفار نے شرک اور تحریم کی نفی کی تخصیص کی، کیونکہ یہ دونوں وہ کام ہیں جو بہت سنگین جرائم تھے اور ان کے اس قول سے غرض یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کی جائے اور آپ کی رسالت پر طعن کیا جائے، کیونکہ خلاصہ یہ ہے کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ چاہیں اس کا ہونا واجب ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ نہ چاہیں اس کا ہونا ممتنع ہے، پس اللہ تعالیٰ ہم سے یہ چاہتے ہیں کہ ہم اللہ کو واحد مانیں اور ان کے ساتھ کسی کو شریک نہ قرار دیں، اور ہم انہی چیزوں کو حلال قرار دیں جن کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے، اور کسی ایسی چیز کو حرام قرار نہ دیں جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار نہیں دیا، تو اسی طرح ہو جاتا ہے۔ اور اس سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے وہی چاہا ہے جو ہم کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس قول کا رد فرمایا: "كَذَٰلِكَ فَعَلَ ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى ٱلرُّسُلِ إِلَّا ٱلْبَلَـٰغُ ٱلْمُبِينُ": (اسی طرح ان سے پہلے لوگوں نے بھی (شرک پر) عذر پیش کیے تھے، پس رسولوں کے ذمہ صرف اللہ کے احکام کو صاف صاف پہنچا دینا ہے)۔

یعنی رسولوں کے ذمہ صرف یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیغام کی اچھی طریقہ سے تبلیغ کردیں۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ آج تم اللہ تعالیٰ کی مشیت کو اپنی گمراہی اور شرک پر حجت قرار دے رہے ہو، اس سے پہلے بھی مشرکین اسی طرح کے عذر پیش کرتے رہے ہیں۔

النحل: ٣٥ سے معتزلہ کا جبریہ کے مذہب پر استدلال

علامہ ابوالقاسم محمود بن عمر الزمخشری الخوارزمی المتوفی ٥٣٨ھ، النحل: ٣٥ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اس آیت میں کفار کے تمام اصناف اور اقسام کفر اور ان کے عناد کو بیان فرمایا ہے جو وہ اللہ عزوجل کے ساتھ شرک کرتے ہیں، دلائل قائم ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا انکار کرتے ہیں، اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے کا انکار کرتے ہیں اور قیامت کو اور عذاب کو استہزاء اور رسول کی تکذیب کی وجہ سے جلد طلب کرتے ہیں۔ اور حق کے قبول کرنے سے ان کے تکبر کو بیان فرمایا، یعنی انہوں نے اللہ عزوجل کے ساتھ کسی کو شریک بنایا اور جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حلال فرمایا تھا یعنی البحیرہ اور السائبہ وغیرہ ان کو حرام قرار دیا، پھر انہوں نے اپنے ان افعال کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا اور یہ کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم ایسا نہ کرتے، اور یہ بعینہٖ جبریہ کا مذہب ہے۔ (الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل، ج ٢ ص ٥٦٣، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ١٤١٧ھ)

علامہ زمخشری کے قول کا رد

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ١٢٧٠ھ، علامہ زمخشری کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہ آیت الزمخشری کے رد کو متضمن ہے جنہوں نے اس مقام پر گفتگو میں غلو کیا ہے، پس انہوں نے ذکر کیا کہ مشرکین نے قبیح کام کئے پھر ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا اور کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا ہم ایسا نہ کرتے، اور یہ بعینہٖ جبریہ کا مذہب ہے، اور اسی طرح ان کے باپ دادا نے بھی کیا تھا، جب اُن کو ان کے افعال کے قبح پر تنبیہ کی گئی تو انہوں نے اپنے رب کی طرف اس کی نسبت کردی اور رسولوں پر تو صرف حق کی تبلیغ کرنا واجب ہے اور اللہ سبحانہٗ شرک اور نافرمانیوں کو نہیں چاہتے، اور اللہ سبحانہٗ نے شرک کے بُطلان پر مطلع فرمایا ہے، اور بندوں کے افعال سے برات کا اظہار فرمایا ہے اور بندوں نے جو کچھ کیا ہے وہ اپنے قصد اور ارادہ اور اختیار سے کیا ہے، اور زمخشری نے ان آیات کی تفسیر اپنی خواہش کے مطابق کی ہے اور متعدد محققین نے زمخشری کا رد کیا ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ یہ آیت معتزلہ کے مذہب سے بہت دور ہے چہ جائیکہ معتزلہ کے مذہب پر دلیل ہوتی۔ پھر مشرکین کی اس سے غرض رسولوں کی تکذیب ہے۔ (روح المعانی، جز ١٣ ص ٢٠١، دارالفکر، بیروت، ١٤١٧ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور بے شک ہم نے ہر امت میں رسول کو یہ پیغام دے کر بھیجا کہ تم لوگ اللہ کی عبادت کرو اور بتوں کی عبادت سے اجتناب کرو، سو ان میں سے بعض وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت عطا فرمائی ہے اور بعض وہ لوگ ہیں جن پر ازل میں گمراہی ثابت ہو چکی ہے، سو اے کافرو! تم اللہ کی زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کا کیسا انجام ہوا تھا O'' (النحل: ٣٦)

''وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ'': یعنی ہم نے گزری ہوئی امتوں میں سے ہر امت میں ایک رسول کو یہ

پیغام دے کر مبعوث فرمایا ہے کہ تم لوگ صرف اللہ واحد کی عبادت کرو۔

"وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ": اور طاغوت سے اجتناب کرو۔ طاغوت سے مراد ہر وہ شخص ہے جو گمراہی کی طرف دعوت دے۔ حسن بصری نے کہا: اس سے مراد شیطان ہے۔ اور اجتناب سے مراد یہ ہے کہ وہ جن چیزوں کی دعوت دیتے ہیں اس سے اجتناب کرو۔ "فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ": یعنی اُن گزری ہوئی امتوں میں سے بعض وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے حق کی طرف ہدایت دی ہے وہ اللہ عزوجل کی عبادت کرتے ہیں اور طاغوت سے اجتناب کرتے ہیں۔

"وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ": اور ان میں سے بعض وہ ہیں جن کی ہدایت کا اللہ تعالیٰ نے ارادہ نہیں فرمایا۔

کسی قبیح کام کا ارادہ کرنا بھی قبیح ہوتا ہے، پس اللہ سبحانہٗ کی طرف کسی قبیح کام کی نسبت کرنا جائز نہیں ہے۔ اور یہاں اللہ تعالیٰ کے ارادہ کا ذکر ہے، کیونکہ کسی قبیح کام کا کسب کرنا قبیح ہوتا ہے، اس کا ارادہ کرنا اور اس کو پیدا کرنا قبیح نہیں ہوتا۔

امام رازی نے کہا ہے: مشرکین کی اس قول سے مراد یہ تھی کہ جب تمام کام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں، تو پھر اللہ تعالیٰ کا انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمانا عبث ہوگا۔

علامہ آلوسی اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض ہے، اور یہ درست نہیں ہے کیونکہ اللہ سبحانہٗ اپنے ملک میں اور اپنی سلطنت میں جو چاہیں کریں، اور یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کہا جائے کہ آپ نے یہ کام کیوں کیا اور آپ نے فلاں کام کیوں نہیں کیا۔

اللہ تعالیٰ نے ان قائلین کی مذمت فرمائی ہے، کیونکہ ان کا اعتقاد یہ تھا کہ جب سب کام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کا رسولوں کو بھیجنا عبث ہوگا۔

"فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ": یعنی اے مشرکو! جو یہ کہتے ہو کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرتے، تم زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کی تکذیب کرنے والوں کا کیا انجام ہوا، یعنی عاد اور ثمود جو اللہ تعالیٰ کی تکذیب کرتے تھے، ان کی بستیوں کو کس طرح تہ و بالا کر دیا گیا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "(اے رسول اکرم!) اگر آپ ایسے لوگوں کے ہدایت یافتہ ہونے پر حریص ہیں (تو سن لیں) بے شک اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت نہیں عطا فرماتے جس کو وہ گمراہی میں مبتلا فرما دیں، اور ان لوگوں کے لیے کوئی مددگار نہیں ہے ○" (النحل: ۳۷)

"إِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ": اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے اور حرص کا معنی ہے: بہت زیادہ ارادہ کرنا۔

"فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ": اور اس آیت سے مراد قریش ہیں، اور اس میں بتایا ہے کہ ان کے اوپر گمراہی ازل میں ثابت ہو چکی ہے، اور اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جبراً ہدایت کو پیدا نہیں فرماتے، سو جس نے اپنے غلط اختیار سے گمراہی کو اختیار کر لیا تو اللہ تعالیٰ اس میں جبراً ہدایت پیدا نہیں فرمائیں گے۔

"وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ": یعنی اُن کے لیے ایسا کوئی نہیں ہے جو اُن کی مدد کر کے انہیں ہدایت دے دے، یا اُن سے عذاب

کو دور کردے۔ اور اس میں مشرکین کے اس گمان کو باطل فرمایا ہے کہ ان کے خودساختہ خدا اُن کو نفع پہنچائیں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور کافروں نے اللہ کی پختہ قسمیں کھائیں کہ اللہ مُردوں کو زندہ نہیں کرے گا، کیوں نہیں! یہ اللہ تعالیٰ کا برحق وعدہ ہے لیکن اکثر لوگ اس پر یقین نہیں رکھتے O'' (النحل: ۳۸)

''وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ'': اس آیت سے اُن کے باطل نظریات کا رد کرنا شروع فرمایا، جیسا کہ کشاف وغیرہ میں ذکر ہے کہ وہ لوگ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے کا انکار کرتے تھے۔ ''جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ'' اس لیے انہوں نے پکی قسمیں کھا کر کہا کہ جو لوگ مر چکے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں دوبارہ زندہ نہیں فرمائیں گے، کیونکہ معدوم کا اعادہ کرنا محال ہے اور یونانی فلاسفہ نے یہ کہا ہے کہ اعادۂ معدوم محال ہے، اور ان کے اس دعویٰ کی الکرامیہ کے سوا متکلمین میں سے کسی نے موافقت نہیں کی۔ اور ابوالحسین البصری نے معتزلہ میں سے اُن کی موافقت کی ہے۔

اور تم کو معلوم ہے کہ جب اعادۂ معدوم کو جائز قرار دیا جائے جیسا کہ جمہور متکلمین کی رائے ہے تو مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

اور امام ابن الجوزی اور ابوالعالیہ وغیرہما نے کہا ہے کہ یہ آیت مسلمانوں میں سے ایک مرد کے متعلق نازل ہوئی ہے جن کا مشرکین میں سے کسی مرد کے اوپر قرض تھا، جب انہوں نے اس سے اپنے قرض کا مطالبہ کیا تو اس مشرک نے کہا: بے شک تم مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جاؤ گے (تو میں وہیں تمہارا قرض ادا کردوں گا)، اور اللہ کی قسم کھا کر کہا: جو مر گیا اللہ اس کو دوبارہ نہیں اٹھائے گا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے دکھایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ابن آدم نے مجھے گالی دی اور اس کو نہیں چاہیے تھا کہ وہ مجھے گالی دیتا، اور مجھے جھٹلاتا ہے اور یہ اس کو نہیں چاہیے تھا، رہا اس کا گالی دینا تو وہ اس کا یہ کہنا ہے کہ میرا بیٹا ہے اور رہا اس کا جھٹلانا تو وہ اس کا یہ کہنا ہے کہ اللہ مجھے دوبارہ پیدا نہیں فرمائیں گے جیسا کہ انہوں نے مجھے ابتداءً پیدا فرمایا ہے۔ (صحیح البخاری: ۳۱۹۳، ۳۹۷۴، ۳۹۷۵، مسند احمد: ۸۲۲۷)

''بَلٰى'': یعنی کیوں نہیں، اللہ تعالیٰ ان کو ضرور اٹھائیں گے۔

''وَعْدًا عَلَيْهِ'': یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کا وعدے کے خلاف کرنا محال ہے۔

''حَقًّا'': اس لیے اللہ تعالیٰ کے وعدہ کا پورا ہونا ضروری ہے۔

''وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ'': لیکن چونکہ زیادہ تر لوگ اللہ تعالیٰ کی صفات سے جاہل ہیں اور ان کے علم اور قدرت کا ادراک نہیں رکھتے اور نہ ان کی حکمت کو جانتے ہیں تو اس لیے وہ اس کا انکار کرتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''(اللہ مردوں کو اس لیے زندہ فرمائیں گے) تا کہ کفار کے لیے اس حق کو بیان فرما دیں جس میں وہ اختلاف کرتے تھے، اور تا کہ کفار یہ جان لیں کہ وہ دنیا میں جھوٹ بولتے تھے O'' (النحل: ۳۹)

''لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ'':

یعنی اللہ تعالیٰ مُردوں کو زندہ فرمائیں گے تا کہ منکرین مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا مشاہدہ کرلیں اور جس چیز میں وہ دنیا

میں اختلاف کرتے تھے، اس کا حق ہونا ان پر واضح ہو جائے۔ اور جو یہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو مرنے کے بعد زندہ نہیں فرمائیں گے، اس کا جھوٹا ہونا اس پر واضح ہو جائے گا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''ہم جب کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ہمیں صرف اتنا کہنا ہوتا ہے کہ ''ہو جا'' سو وہ چیز فوراً ہو جاتی ہے O'' (النحل: ۴۰)

معدوم پر ''شے'' کا اطلاق اور اس سے خطاب کی توجیہ

''اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ'': اس جگہ یہ بحث ہے کہ اس آیت میں کسی معدوم چیز کے اوپر شے کا اطلاق فرمایا ہے اور شیخ ابراہیم الکورانی نے ایک رسالہ لکھا ہے جس میں یہ بیان کیا ہے کہ معدوم کے اوپر شے کا اطلاق کرنا جائز ہے۔ اور علامہ ابن عطیہ نے معدوم پر شے کے اطلاق کی دو توجیہیں ذکر کی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ جس چیز کا وجود حتمی اور یقینی ہو اس کو حالت عدم میں بھی شے قرار دینا جائز ہے اور دوسری یہ ہے کہ وہ چیز پہلے موجود نہیں تھی لیکن وہ مراد تھی تو اس اعتبار سے اس کو فرمایا ''ہو جا'' سو وہ ہو گئی۔

نیز اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا ہے: ''اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ (یس: ۸۲)'' (جب وہ کسی چیز کا ارادہ فرماتے ہیں تو ان کی شان یہی ہے کہ وہ اسے فرماتے ہیں: ''ہو جا'' تو وہ موجود ہو جاتی ہے O)۔

رہا یہ سوال کہ جب وہ چیز موجود نہیں تھی تو اس سے خطاب کرنا کیسے متصور ہو گا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ خطاب تکوینی ہے، اور اس میں معدوم کی طرف توجہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ جو چیز واقع میں معدوم ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ثابت ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کے وجود علمی کے اعتبار سے خطاب فرمایا۔ (روح المعانی جز۱۴ ص ۲۰۰-۲۱۳ دارالفکر، بیروت، ۱۴۱۷ھ)

وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا فِی اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً ؕ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾

اور جن لوگوں نے ظلم سہنے کے بعد اللہ کی راہ میں ہجرت کی ہم ان کو ضرور بہ ضرور دنیا میں اچھا ٹھکانا عطا فرمائیں گے اور آخرت کا اجر ضرور بہت بڑا ہے، کاش! لوگ ہجرت کرنے کی اہمیت کو جانتے O

الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۴۲﴾

جن لوگوں نے ہجرت پر صبر کیا اور وہ اپنے رب پر ہی بھروسا کرتے ہیں O

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۳﴾

اور ہم نے آپ سے پہلے صرف مردوں کو رسول بنا کر بھیجا جن کی طرف ہم نے وحی نازل فرمائی، سو اے کافرو! اگر تم نہیں جانتے تو علم والوں سے پوچھ لو○

بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ؕ وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۴﴾

ہم نے رسولوں کو واضح دلائل اور کتابیں دے کر بھیجا اور (اے رسولِ اکرم!) ہم نے آپ کی طرف قرآن مجید کو نازل فرمایا تا کہ آپ لوگوں کو وہ احکام بیان کریں جو اُن کی طرف نازل فرمائے گئے ہیں اور تا کہ وہ اس قرآن میں غور و فکر کریں○

اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۴۵﴾

جن لوگوں نے اسلام کے خلاف سازشیں کی ہیں کیا وہ اس سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو زمین میں دھنسا دیں، یا اُن پر ایسی جگہ سے عذاب لائیں جہاں سے ان کا گمان بھی نہ ہو○

اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۴۶﴾

یا اُن کو چلتے پھرتے پکڑ لیں، کیونکہ وہ اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہیں○

اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ ؕ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۷﴾

یا اُن کو عذاب کے خوف کی حالت میں پکڑ لیں، بے شک آپ کے رب بہت زیادہ مہربان، سب سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں○

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ ﴿۴۸﴾

کیا اُن لوگوں نے اللہ کی پیدا فرمائی ہوئی اُن چیزوں کو نہیں دیکھا جن کے سائے دائیں اور بائیں جانب سے جھکتے ہوئے اللہ کو سجدہ کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ عاجزی کرنے والے ہوتے ہیں○

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۹﴾

اور آسمانوں میں اور زمینوں میں جو بھی جاندار ہیں اور فرشتے ہیں وہ سب اللہ کے لیے سجدہ کرتے ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے○

يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝

وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں جو اُن پر غالب ہیں اور وہ وہی کام کرتے ہیں جن کاموں کا انہیں حکم فرمایا جاتا ہے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور جن لوگوں نے ظلم سہنے کے بعد اللہ کی راہ میں ہجرت کی ہم ان کو ضرور بہ ضرور دنیا میں اچھا ٹھکانا عطا فرمائیں گے اور آخرت کا اجر ضرور بہت بڑا ہے، کاش! لوگ ہجرت کرنے کی اہمیت کو جانتے O'' (النحل: ۴۱)

مہاجرین کے لیے دنیا اور آخرت کا اجر

علامہ ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ، النحل: ۴۱ تا ۵۰ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ'':

یہ آیت حضرت بلال، حضرت صہیب، حضرت خباب، حضرت عمار، حضرت عابس، حضرت جبیر اور حضرت ابوجندل بن سہیل رضی اللہ عنہم کے متعلق نازل ہوئی ہے، مشرکین نے ان صحابہ کرام کو مکہ میں پکڑ لیا اور ان کو سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے۔

اور قتادہ نے کہا: یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں، جن پر اہلِ مکہ نے ظلم کے پہاڑ توڑے اور ان کو ان کے گھروں سے نکال دیا حتیٰ کہ ان میں سے بعض سرزمین حبشہ میں چلے گئے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مدینہ منورہ میں ٹھکانا بنا دیا اور مدینہ ان کے لیے دارِ ہجرت بنا دیا۔ اور مومنین میں سے انصار کو ان کا مددگار بنا دیا۔

''لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً'': یعنی ان کو مدینہ منورہ میں ٹھہرایا۔

روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ جب مہاجرین میں سے کسی مرد کو کوئی وظیفہ عطا کرتے تو یہ فرماتے تھے کہ ''یہ لیں، اللہ آپ کو اس میں برکت عطا فرمائیں، یہ وہ عطا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے دنیا میں آپ سے وعدہ فرمایا ہے، اور جس اجر کو آپ کے لیے آخرت میں ذخیرہ رکھا ہے، وہ بہت بڑا ہے'' اور پھر اس آیت کی تلاوت کرتے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ ہم ضرور بہ ضرور ان کی طرف دنیا میں اچھائی مہیا کریں گے۔

اور تیسرا قول یہ ہے کہ دنیا میں اچھائی سے مراد نیک کاموں کی توفیق اور ہدایت ہے۔

''وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ'': اور اللہ عزوجل کا قول ''لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ'' یہ مشرکین کی طرف راجع ہے، کیونکہ مومنین کو تو یقین تھا کہ آخرت میں ہجرت کا اجر بہت زیادہ ہے۔

''لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً'': حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حسن بصری، شعبی اور قتادہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کو مدینہ میں ٹھہرائیں گے۔ اور وہاں اُن کو عمدہ رزق عطا فرمائیں گے۔ اور الضحاک نے کہا ہے کہ اُن مہاجرین کو اُن کے دشمنوں کے خلاف مدد عطا فرمائیں گے۔

اور ایک قول یہ ہے کہ اُن کو ایسا غلبہ عطا فرمائیں گے جس کی وجہ سے وہ کافروں کے شہروں کو فتح کریں گے اور اُن مہاجرین کو

اُن شہروں میں ولایات حاصل ہوں گی۔ اور ایک قول یہ ہے کہ دنیا میں اُن کی جو تحسین کی جائے گی جس کی وجہ سے اُن کی اولاد کو شرف حاصل ہوگا۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس آیت میں یہ تمام امور مراد ہوں۔

"وَ لَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ": اور اگر مہاجرین ثواب آخرت کو دیکھ لیں اور اس کا معائنہ اور مشاہدہ کر لیں تو وہ ضرور جان لیں گے کہ دنیا میں جو اُن کو اچھائی دی گئی تھی اور مدینہ میں اُن کو ٹھہرایا گیا تھا تو یہ آخرت کا اجر اس سے بہت زیادہ بڑا ہے۔

امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ، النحل: ۴۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اس آیت کا مصداق سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں جن پر اہلِ مکہ نے ظلم کیا، پس اُن کو اُن کے گھروں سے نکال دیا حتیٰ کہ اُن میں سے ایک جماعت سرزمین حبشہ میں چلی گئی، پھر اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس کے بعد مدینہ منورہ میں ٹھکانا دیا اور اُن کے لیے مومنین میں سے انصار بنا دیے۔

اور مجاہد نے "لَنُبَوِّئَنَّهُمْ" کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ ہم ان کو دنیا میں عمدہ رزق عطا فرمائیں گے۔ اور آخرت میں اُن کے لیے اس سے بہت بڑا اجر تیار فرما رکھا ہے، یعنی اُن کی ہجرت کا ثواب آخرت میں بہت زیادہ ہے، کیونکہ آخرت کی نعمتیں ہمیشہ باقی رہتی ہیں اور کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ (تفسیر الطبری، ج ۱۳ ص ۲۲۳۔۲۲۵، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۳۳ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "جن لوگوں نے ہجرت پر صبر کیا اور وہ اپنے رب پر ہی بھروسا کرتے ہیں O" (النحل: ۴۲)

علامہ نظام الدین الحسن بن محمد بن حسین القمی النیشاپوری المتوفی ۷۲۸ھ، النحل: ۴۲ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اَلَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ": اس سے مراد یہ ہے کہ جنہوں نے کفار کی دی ہوئی ایذاؤں پر صبر کیا اور اپنے وطن سے جدائی پر صبر کیا اور وطن سے مراد اللہ تعالیٰ کا حرم یعنی مکہ مکرمہ ہے۔ دوسرا محمل یہ ہے کہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرنے پر صبر کیا۔

محققین نے کہا ہے: صبر کا معنی ہے دنیاوی لذات اور دنیاوی خواہشات کے حصول کو پورا نہ کرنے پر اپنے نفس کو روکنا۔ اور یہ سلوک کی ابتداء ہے۔

اور اس آیت میں توکل کا بھی لفظ ہے، اور توکل کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے بالکلیہ منقطع ہو جانا۔ اور یہ سلوک کا آخری طریقہ ہے، اور اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمانے کے مالک ہیں، کیونکہ عارفین صبر کر کے اللہ تعالیٰ کی راہ میں چلتے ہیں اور توکل کر کے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اڑتے ہیں، پھر وہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں سرگرم ہوتے ہیں۔

(تفسیر غرائب القرآن ورغائب الفرقان، ج ۴ ص ۲۶۴، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۶ھ)

شیخ صوفی عبدالحمید سواتی متوفی ۱۴۲۹ھ/۲۰۰۸ء، النحل: ۴۲ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

فرمایا: یہ اجر مہاجرین کے لیے ہے۔ "اَلَّذِیْنَ صَبَرُوْا" جنہوں نے صبر کا دامن تھامے رکھا۔ ہر تکلیف کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور زبان پر حرف شکایت نہ لائے۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ ہجرت کر کے مدینہ جانا چاہتے تھے مگر کافر اُن کے راستے میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے اور انہیں مکہ سے نکلنے نہیں دیتے تھے۔ پھر آپ نے کافروں سے سودا کیا کہ اپنا سارے کا سارا اثاثہ ان

کے سپرد کر کے بے سروسامانی کی حالت میں مدینہ منورہ پہنچے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو فرمایا کہ صہیب نے سب کھو کر بھی بڑا نفع کمایا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ صہیب وہ شخص ہے "لولم یخف اللہ لم یعصہ" یعنی اگر اسے اللہ کا خوف نہ بھی ہوتا، تب بھی وہ نافرمانی نہ کرتا۔

(تدریب الراوی ج ۲ ص ۶۲۳، الوسیط فی علوم مصطلح الحدیث: ج ۱ ص ۳۵۶، تیسیر مصطلح الحدیث ج ۱ ص ۳۳)

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ بہت پاکیزہ دل انسان تھے، بہرحال مہاجرین نے کفار کے ہاتھوں بڑے دکھ سہے، بعض کے بچے رکھ لیے گئے اور بعض کی بیویوں کو روک لیا گیا، مگر اسلام کے ان شیدائیوں نے ہر قسم کی مالی، جسمانی اور ذہنی تکالیف برداشت کیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اور اس کے دین کی سربلندی کے لیے ہجرت کی اور پھر ان تکالیف پر صبر کیا۔ فرمایا: "وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ" انہوں نے بھروسا بھی اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہی کیا۔ اگر اللہ پر بھروسا نہ ہوتا تو اتنی تکالیف کیسے برداشت کر سکتے۔ انہوں نے صبر کیا اور اللہ پر بھروسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی قدردانی کی اور انعامات سے نوازا۔

(معالم العرفان فی دروس القرآن، ج ۱۱ ص ۵۲۸۔۵۲۹، مکتبہ دروس القرآن، گوجرانوالہ، ۱۴۲۴ھ)

حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کا تذکرہ

حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی شافعی متوفی ۸۵۲ھ، لکھتے ہیں:

حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کا نام صہیب بن سنان بن مالک ہے، اور ان کی ماں بنو مالک بن عمرو بن تمیم سے تھیں اور وہ رومی تھے۔ ان کو رومی اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ رومیوں نے اُن کو بچپن میں قید کر لیا تھا۔

امام محمد بن سعد نے کہا ہے: ان کے والد اور ان کے چچا کسریٰ کی جہت میں رہتے تھے اور ان کے گھر الموصل میں دریائے دجلہ کے قریب تھے۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے روم میں نشوونما پائی، پھر اُن کو بنو کلب کے ایک مرد نے خرید لیا اور مکہ میں فروخت کر دیا، ان کو عبداللہ بن جدعان تیمی نے خرید کر آزاد کر دیا۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ روم سے بھاگ کر مکہ میں آ گئے تھے اور ابن جدعان کے ساتھ انہوں نے اخوت کا حلف اٹھایا۔

اور ابن سعد نے روایت کی ہے کہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے اس وقت اسلام قبول کیا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دار الارقم میں تھے۔

اور امام ابن عدی نے متعدد سندوں کے ساتھ روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے میں (حضرت صہیب رضی اللہ عنہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں رہا اور کہا جاتا ہے کہ جب حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے ہجرت کی تو مشرکین نے ان کا پیچھا کیا، پس حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے کہا: اے قریش کے لوگو! میں تم سب سے بڑھ کر تیر انداز ہوں، اور تم میرے قریب اس وقت تک نہیں پہنچ سکو گے حتیٰ کہ میں تم سب پر تیر مار دوں، اور جب میرے تیر ختم ہو جائیں گے تو پھر میں اپنی تلوار کے ساتھ تم پر لڑوں گا، اور اگر تم میرے مال کا ارادہ کرتے ہو تو میں تمہیں اپنے مال پر رہنمائی کرتا ہوں، سو قریش راضی ہو گئے اور انہوں نے معاہدہ کر لیا اور حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے اپنے مال کی طرف ان کی رہنمائی کر دی، پھر قریش نے جا کر وہ مال لے لیا، پھر جب حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے تو آپ نے فرمایا: تم نے اپنی تجارت میں نفع کمایا ہے، پھر اللہ عزوجل نے ان کے متعلق یہ آیت نازل فرمائی:

"وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡرِىۡ نَفۡسَهُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوۡفٌۢ بِالۡعِبَادِ ۝ (البقرہ: ۲۰۷)" (اور بعض وہ لوگ ہیں جو اللہ کی رضاجوئی کے عوض اپنی جان کو فروخت کر دیتے ہیں اور اللہ (اپنے) بندوں پر نہایت مہربان ہیں O)۔

امام ابن عدی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اور امام طبرانی نے حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چار مرد سبقت کرنے والے ہیں، میں تمام عرب سے سبقت کرنے والا ہوں اور صہیب رومیوں میں سے سبقت کرنے والے ہیں اور بلال حبشہ میں سے سبقت کرنے والے ہیں، اور سلیمان فارسیوں میں سے سبقت کرنے والے ہیں۔

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات ہوگئی تو انہوں نے وصیت کی تھی کہ ان کی نماز جنازہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ پڑھائیں، اور حضرت صہیب رضی اللہ عنہ اس وقت تک لوگوں کو نماز پڑھاتے رہیں جب تک کہ مسلمانوں کا کسی امام پر اتفاق نہ ہو جائے۔ حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کی وفات ۳۸، یا ۳۹ ہجری میں ہوئی اور اس وقت ان کی عمر ستر (۷۰) سال تھی۔

(الاصابہ فی تمییز الصحابہ ج ۳ ص ۳۶۴۔۳۶۶، ملخصاً وملتقطاً، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ہم نے آپ سے پہلے صرف مردوں کو رسول بنا کر بھیجا جن کی طرف ہم نے وحی نازل فرمائی، سوائے کافرو! اگر تم نہیں جانتے تو علم والوں سے پوچھ لو O" (النحل: ۴۳)

"وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ": یہ آیت مشرکین مکہ کے متعلق نازل ہوئی جب انہوں نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کیا اور کہا کہ اللہ اس سے بہت بلند ہیں کہ وہ کسی بشر کو رسول بنائیں، پس کیوں نہیں اللہ نے ہماری طرف کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجا۔ "فَسۡـَٔلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّكۡرِ اِنۡ كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ": یعنی اگر تم لوگ نہیں جانتے تو اہل کتاب کے مومنین سے معلوم کرلو۔ (معالم التنزیل ج ۳ ص ۸۰، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ، النحل: ۴۳ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اس آیت میں قریش کا رد ہے، کیونکہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے کا انکار کیا اور کہا: اللہ تعالیٰ اس سے بہت بلند ہیں کہ وہ کسی بشر کو رسول بنا کر بھیجیں، تو کیوں نہ اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجا۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت جاریہ ہے کہ وہ عام تبلیغ کے لیے غالباً صرف بشر کو رسول بنا کر بھیجتے ہیں اور اس بشر کی طرف وہ فرشتہ کی وساطت سے احکام کی تبلیغ کے لیے وحی نازل فرماتے ہیں۔ اور عام تبلیغ کی قید اس لیے لگائی ہے کہ اس سے احتراز ہو جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کو بشارت دینے کے لیے حضرت جبریل علیہ السلام کو بھیجا، کیونکہ انہیں عام تبلیغ کے لیے نہیں بھیجا تھا۔ اور غالباً کی قید اس لیے لگائی ہے کہ وحی کی بعض اقسام ایسی ہیں جن میں فرشتہ کا واسطہ نہیں ہوتا جیسا کہ اس آیت میں ارشاد ہے: "وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحۡيًا اَوۡ مِنۡ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوۡ يُرۡسِلَ رَسُوۡلًا فَيُوۡحِىَ بِاِذۡنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِىٌّ حَكِيۡمٌ ۝ (الشوریٰ: ۵۱)" (اور کسی بشر کا اللہ سے (بے حجاب) کلام کرنا ممکن نہیں ہے سوائے الہام یا اشارہ کے، یا وہ پردہ کی اوٹ سے اللہ سے کلام کرے یا اللہ اس کی طرف کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجیں، پھر فرشتہ اللہ کی اجازت سے جو چاہے اس کی طرف وحی کرے، بے شک وہ بڑی بلندی، عظیم حکمت والے ہیں O)۔

میں کہتا ہوں کہ عام لوگوں میں یہ مشہور ہے کہ انبیاء علیہم السلام صرف صورتاً بشر ہوتے ہیں حقیقت میں ان کا مادہ خلقت نور ہے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن کو رسول بنا کر مبعوث فرمایا وہ صرف مرد تھے، یعنی وہ نہ فرشتے تھے نہ نور تھے۔ اور دوسری بات جو اس آیت سے واضح ہوئی وہ یہ کہ منکرین حدیث یہ کہتے ہیں کہ ہمارے لیے صرف ذکر (قرآن) کافی ہے، نبی کی تشریح کی کوئی ضرورت نہیں، اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ منصب نہ عطا فرماتے کہ وہ لوگوں کے سامنے یہ بیان کریں کہ قرآن مجید نے اُن سے کیا مطالبہ کیا ہے۔ (سعیدی غفرلہٗ)

''فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ'': حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حسن بصری اور السدی وغیرہم نے کہا: پس تم لوگ اہل کتاب میں سے یہود اور نصاریٰ سے سوال کرو۔

علامہ ابوالحیان الاندلسی نے ''البحر المحیط'' میں لکھا ہے کہ اہل ذکر سے مراد وہ لوگ ہیں جو اہل کتاب میں سے اسلام نہیں لائے تھے، کیونکہ انہی لوگوں کی خبر اہل مکہ کے نزدیک معتبر تھی، یعنی یہ خبر کہ اللہ کے رسول مرد ہوتے ہیں، پس اُن اہل کتاب کا یہ خبر دینا مشرکین مکہ پر حجت ہوگا اور اس سے مراد اُن پر حجت قائم کرنا ہے ورنہ یہ بات فی نفسہٖ واضح ہے کہ اللہ کے رسول مرد ہوتے ہیں، اور یہ اہل کتاب کی خبر دینے پر موقوف نہیں ہے۔ اور اس آیت کے نازل ہونے کے بعد مشرکین نے اہل یثرب کی طرف لوگ بھیج کر ان سے اس کے متعلق سوال کیا۔ اور الاعمش، ابن عیینہ اور ابن جبیر وغیرہ نے کہا کہ اہل کتاب سے مراد وہ ہیں جو اسلام لا چکے تھے جیسے حضرت عبداللہ بن سلام اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہما اور دوسرے۔

ابوجعفر اور ابن زید وغیرہ نے کہا کہ اس آیت میں ذکر سے مراد قرآن مجید ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر قرآن مجید کو ذکر سے تعبیر فرمایا ہے۔ اور اس قول کی وجہ سے قطعی طور پر اہل ذکر سے مراد مسلمان ہیں۔ اور بعض امامیہ نے اُن کو ائمہ اہل بیت کے ساتھ مخصوص کیا ہے، کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوجعفر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: ہم اہل ذکر ہیں لیکن اس پر یہ اعتراض ہے کہ کفار مکہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو حجت نہیں مانتے تھے، وہ آپ کے اہل بیت کو حجت کیسے مانیں گے۔

عام لوگوں کے لیے ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک امام کی تقلید کرنے کا ثبوت

علامہ سیوطی نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ عام لوگوں کے لیے فروعی مسائل میں ائمہ کی تقلید کرنا جائز ہے، کیونکہ اس آیت سے ظاہر عموم ہے، اور علامہ جلال الدین محلی نے لکھا ہے کہ جو شخص غیر مجتہد ہو خواہ وہ عام لوگوں میں سے ہو یا نہ ہو، اس کے لیے مجتہد کی تقلید کرنا جائز ہے، کیونکہ اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا ہے: ''فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ''، اور صحیح یہ ہے کہ مسائل فرعیہ میں تقلید کی شرط لگانا درست نہیں ہے، کیونکہ یہ آیت عام ہے کہ مسائل اعتقادیہ میں تقلید کی جائے یا مسائل فرعیہ میں تقلید کی جائے۔ اور اس سے بھی عام ہے کہ جس مجتہد کی تقلید کی جائے وہ زندہ ہو یا فوت ہو چکا ہو۔

اور ان کی عبارات کا تقاضا یہ ہے کہ مذاہب اربعہ کے ائمہ ہوں یا دوسرے مجتہدین ہوں، ان میں سے کسی کی تقلید کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، ہاں! علامہ ابن حجر وغیرہ نے یہ ذکر کیا ہے کہ دوسرے کی تقلید کرنے میں شرط یہ ہے کہ اس کا مذہب کتابوں میں مدوّن ہو اور اس کی تمام شرائط محفوظ ہوں، اور علامہ سبکی نے کہا ہے کہ مذاہب اربعہ کا مخالف ایسا ہے جیسے اجماع کا مخالف ہو۔

پھر غیر کی تقلید میں شرط یہ ہے کہ وہ عمل میں ہو، رہا فتویٰ دینا اور قضاء کرنا تو مذاہب اربعہ میں سے کوئی ایک متعین ہے۔ (روح

المعانی، جز ۱۴ ص ۲۱۷ ـ ۲۱۹، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۷ ھ)

عام لوگوں کے لیے تقلید کی ضرورت

جو چیزیں قرآن و سنت میں صراحتاً مذکور ہیں، ان پر تو من و عن عمل کرنا ضروری ہے اور وہاں کسی تقلید کی ضرورت نہیں ہوتی۔ البتہ جن مسائل کے متعلق قرآن و حدیث میں صراحت موجود نہ ہو، ان کو معلوم کرنا ہر آدمی کا کام نہیں بلکہ وہ صرف مجتہد حضرات ہی کر سکتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی استعداد اور صلاحیت عطا فرمائی ہے، اسی طرح بعض چیزوں میں تعارض پایا جاتا ہے اور اس کو دور کرنا بھی ہر ایک کا کام نہیں ہے بلکہ یہ بھی مجتہد ہی کر سکتا ہے۔ غرضیکہ ایسے مسائل میں کسی مجتہد کی طرف رجوع کرنا ہی تقلید کہلاتا ہے۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ عوام کے لیے اس قسم کی تقلید وجوب کا درجہ رکھتی ہے کیونکہ وہ خود ایسے مسائل کے حل کی استعداد نہیں رکھتے، اور بعض اوقات بڑے بڑے صاحب علم لوگ بھی بعض مسائل کے حل کرنے میں عاجز آ جاتے ہیں۔ وہ کسی تعارض کو دور نہیں کر سکتے یا کسی مسئلے میں استنباط سے عاجز آ جاتے ہیں، مثلاً امام رازی، امام غزالی، امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی وغیرہم قرآن و سنت کو بخوبی جاننے کے باوجود فروعات میں ائمہ اربعہ میں سے کسی نہ کسی کے مقلد تھے۔ کہتے تھے کہ ہم بھی قرآن و سنت کو جانتے ہیں مگر جو کچھ ائمہ سلف جانتے تھے، ہماری رسائی وہاں تک نہیں ہے، اور جس طرح وہ اجتہاد کر سکتے تھے، ہماری وہ طاقت نہیں۔ چنانچہ یہ بزرگ بھی ائمہ سلف پر اعتماد کرتے تھے۔ امام شاہ ولی اللہ حنفی مسلک رکھتے تھے، جب کہ امام رازی اور امام غزالی شافعی تھے، اسی طرح شیخ ابن تیمیہ حافظ الحدیث ہونے کے باوجود امام احمد کے مقلد تھے۔ غرضیکہ یہ تقلید مذموم نہیں ہے بلکہ جس اندھی تقلید کی مذمت قرآن میں کی گئی ہے، وہ مشرکانہ تقلید ہے جو اللہ تعالیٰ کے صریح حکم کے خلاف ہو اور مقلدین محض آباء و اجداد کی رسم کے طور پر اسے سینے سے لگائے ہوئے ہوں اور اس کے مقابلے میں صریح حکم بھی ٹھکرا دیں، ایسی تقلید حرام ہے۔

فروعی اختلاف کی مثال حرمت سود کے متعلق دی جا سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ سود کی حرمت قرآن مجید سے ثابت ہے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ضمن میں صرف چھ چیزوں کا ذکر کیا ہے، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان چھ چیزوں کے علاوہ بھی کوئی چیز سود میں آتی ہے یا نہیں، پھر ائمہ کرام اس بات پر بھی بحث کرتے ہیں کہ سود کی حرمت مذکورہ چھ چیزوں کی ذات تک محدود ہے یا یہ حرمت ان میں موجود کسی علت کی وجہ سے پائی جاتی ہے، اب اگر وجہ حرمت علت ہے تو اس کی تلاش کی جائے گی، اب علت کی جستجو میں چاروں ائمہ کا آپس میں اختلاف ہے، کسی نے کسی چیز کو علت قرار دیا ہے اور کسی نے کسی چیز کو، مگر سود کی حرمت کے متعلق سارے متفق ہیں اور اس میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں۔ (معالم العرفان فی دروس القرآن، ج ۱۱ ص ۵۳۱ ـ ۵۳۳، مکتبہ دروس القرآن، گوجرانوالہ، ۱۴۲۴ ھ)

تقلید شخصی کے متعلق مصنف کی تحقیق

تقلید کا لغوی معنی

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ ھ، لکھتے ہیں:

گردن میں ہار ڈالنے کو تقلید کہتے ہیں۔ کسی شخص پر کسی منصب کی ذمہ داری ڈالنے کو بھی تقلید کہتے ہیں، کسی چیز کے احاطہ کو بھی

تقلید کہتے ہیں، قرآن مجید میں ہے: "لَهُ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ (الزمر: ۶۳)" (اللہ تعالیٰ کے لیے ہی آسمان اور زمین کا احاطہ ہے)۔ (المفردات ج ۲ ص ۵۳۲، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ)

علامہ جمال الدین ابن منظور افریقی متوفی ۷۱۱ھ، لکھتے ہیں:

ہدی کے گلے میں شعار (پرانا جوتا) ڈالنے کو بھی تقلید کہتے ہیں، قرآن مجید میں ہے: "وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ (المائدہ: ۲)" ہدی اس جانور کو کہتے ہیں جس کو ذبح کرنے کے لیے حرم میں بھیجا جائے، تلوار لٹکانے کو بھی تقلید کہتے ہیں، حکام اور والیوں کے منصب سونپنے کو بھی تقلید کہتے ہیں، جو گھوڑا دوڑ میں اول آئے اس کے گلے میں جیت کی علامت کے طور پر کسی چیز کے ڈالنے کو بھی تقلید کہتے ہیں اور تقلید فی الدین بھی مستعمل ہے۔ (لسان العرب ج ۱۲ ص ۱۷۳، دار صادر، بیروت، ۲۰۰۳ء)

علامہ محمد بن اثیر الجزری متوفی ۶۰۶ھ، لکھتے ہیں:

گھوڑے کے گلے میں ہار ڈالنے کو تقلید کہتے ہیں، حدیث شریف میں ہے: "قلدوا الخيل ولا تقلدوها الاوتار" یعنی دین کے دشمنوں کو طلب کرنے کے لیے گھوڑوں کے گلوں میں ہار ڈالو، اور زمانہ جاہلیت کے کاموں کے لیے گھوڑوں کے گلوں میں ہار مت ڈالو۔ تقلید کے معنی پلانے کے بھی ہیں، قلدت الزرع کہا جاتا ہے: "میں نے کھیت میں پانی دیا"۔ حدیث شریف میں ہے "قلدتنا السماء قلدا" آسمان سے ہم پر وقت مقرر میں بارش ہوئی، اقلید کے معنی چابی بھی ہیں، حدیث شریف میں ہے: قلفت ال الاقاليد فاخذتها۔ میں نے اٹھ کر چابیاں لے لیں۔ (نہایہ ج ۳ ص ۸۷، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۸ھ)

تقلید کا اصطلاحی معنی

علامہ یحییٰ بن شرف نووی متوفی ۶۷۶ھ، لکھتے ہیں:

"التقليد قبول قول المجتهد والعمل به" تقلید مجتہد کے قول کو قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا ہے۔ قفال نے کہا کہ یہ جانے بغیر کہ قائل نے یہ بات کہاں سے کہی اس کے قول کو قبول کرنا تقلید ہے۔ شیخ ابو اسحاق نے کہا: بلا دلیل قول کو قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا تقلید ہے۔ قفال کہتے ہیں کہ گویا کہ مقلد نے امام کے قول کا قلادہ اپنے گلے میں ڈال لیا۔

(تہذیب الاسماء واللغات ج ۳ ص ۱۰۱، دار الکتب العلمیہ، بیروت)

بعض علماء نے لکھا ہے: "التقليد عبارة عن العمل بقول الغير من غير حجة ملزمة" عمل کو واجب کرنے والی دلیل جانے بغیر کسی کے قول پر عمل کرنا تقلید ہے، جیسے عام آدمی کسی مجتہد کے قول پر عمل کرے تو یہ تقلید ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی طرف رجوع کرنا یا مجتہدین کے اجماع کی طرف رجوع کرنا یا عام آدمی کا مفتی کی طرف رجوع کرنا یا قاضی کا گواہوں کے قول پر فیصلہ کرنا تقلید نہیں ہے کیونکہ رسول کے قول کو معجزہ کی وجہ سے مانا جاتا ہے جو رسول کی تصدیق کو واجب کرتا ہے اور اجماع کی حجیت حدیث رسول کی وجہ سے ہے، اور مفتی اور گواہوں کی حجیت اجماع کی وجہ سے ہے، اس کے باوجود اگر کوئی شخص ان چیزوں کو تقلید کہے تو خلاف اصطلاح ہے لیکن اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ (الاحکام فی اصول الاحکام ج ۳ ص ۱۶۶۔ ۱۶۷، مطبع محمد علی واولادہ، مصر، ۱۳۴۷ھ)

بحر العلوم نے بھی تقلید کا اصطلاحی معنی بیان کرتے ہوئے یہی لکھا ہے۔

(فواتح الرحموت، عبد العلی خلی متوفی ۱۲۲۵ھ، ج ۲ ص ۴۰۰، مطبع کبری، بولاق، مصر، ۱۳۲۲ھ)

امام ابوحامد محمد بن محمد غزالی متوفی ۵۰۵ھ، لکھتے ہیں:

"التقلید ھو قبول قول بلا حجۃ" تقلید کسی قول کو بلا دلیل قبول کرنا ہے۔

(المستصفیٰ ج ۲ ص ۳۸۹، مطبع کبری بولاق، مصر، ۱۳۲۲ھ)

شیخ محمد بن علی شوکانی متوفی ۱۲۵۵ھ، لکھتے ہیں:

علامہ ابن ہمام نے تحریر میں فرمایا: جس شخص کا قول فی نفسہٖ دلیل نہ ہو اس کے قول پر بلا دلیل عمل کرنا تقلید ہے۔ اور شیخ ابوحامد اور استاذ ابومنصور نے کہا: کسی قول کی دلیل جانے بغیر اس قول پر عمل کرنا تقلید ہے اور اولیٰ یہ ہے کہ جس شخص کا قول دلیل نہ ہو، اس کی رائے کو بلا دلیل قبول کرنا تقلید ہے۔ (ارشاد الفحول الی تحقیق الحق من علم الاصول ص ۲۴۷، مکتبہ اثریہ سانگلہ ہل، پاکستان)

تقلید کی ضرورت

یہ صحیح ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اصولی طور پر تمام احکام بیان فرمادیے ہیں لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہر شخص کے لیے یہ عادۃً ممکن نہیں ہے کہ وہ بذاتِ خود تمام احکامِ شرعیہ قرآن مجید کی آیات سے مستنبط کر سکے، کیونکہ اول تو قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے لغت عربی، صرف ونحو اور علم بلاغت کو حاصل کرنا ایک طویل اور صبر آزما کام ہے، پھر قرآن مجید میں بعض جگہ تو احکام صراحۃً امر اور نہی کے صیغہ سے بیان فرمائے گئے ہیں اور بعض جگہ امر اور نہی کا صیغہ استعمال نہیں کیا گیا بلکہ مختلف اسالیب سے کسی چیز کا وجوب یا تحریم سمجھ میں آتی ہے، جس کو جاننے کے لیے بہت باریک بینی اور دقتِ نظری کی ضرورت ہے مثلاً قرآن مجید میں شراب اور جوئے کو صراحۃً حرام نہیں فرمایا بلکہ ایک خاص اسلوب سے فرمایا: "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ وَیَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝ (المائدہ: ۹۰-۹۱)" (اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور جوئے کے تیر محض ناپاک ہیں، شیطانی کاموں سے ہیں، سو تم اُن سے اجتناب کرو تا کہ تم اخروی کامیابی حاصل کرو○ شیطان صرف یہ ارادہ کرتا ہے کہ وہ تمہارے درمیان شراب اور جوئے کے سبب سے عداوت ڈال دے اور تمہیں اللہ کے ذکر اور نماز پڑھنے سے روک دے، تو کیا تم ان کاموں سے باز آنے والے ہو؟○)۔

قرآن مجید بعض اوقات کسی مسئلہ کی لِم اور علت بیان کر دیتا ہے اور اس کی شرائط اور موانع ذکر نہیں کرتا، نہ اس کی تمام جزئیات بیان کرتا ہے مثلاً خمر (انگور کی شراب) کے بیان میں اس کے نشہ آور ہونے کا ذکر فرمایا ہے لیکن یہ نہیں فرمایا کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے نہ یہ بیان فرمایا کہ نشہ آور چیز کو مقدار نشہ تک پینا حرام ہے یا اس کا مطلقاً پینا حرام ہے؟ نشہ آور چیز پر حد ہے یا نہیں؟ اگر حد ہے تو کتنی ہے؟ ان تمام جزئیات اور تفصیلات کو جاننا ایک عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔

قرآن مجید میں کبھی کوئی حکم اجمالاً بیان کیا جاتا ہے جس کی تفصیل متعین کرنے کے لیے دلائل کی چھان بین کرنا عام آدمی کی استطاعت سے باہر ہے مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ۔ (المائدہ: ۶)" (اپنے سروں کا مسح کرو)، اس آیت سے یہ پتا نہیں چلتا کہ پورے سر کا مسح کرنا فرض ہے یا چوتھائی سر کا مسح فرض ہے یا ایک بال پر مسح کرنے سے بھی فرض ادا ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید میں کہیں ایک حکم کو مطلقاً بیان کیا جاتا ہے اور کہیں وہی حکم مقید اذکر ہوتا ہے مثلاً قرآن مجید میں ہے: "اِنَّمَا حَرَّمَ

عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ۔ (البقرہ: ۱۷۳)" (اللہ نے تم پر صرف مردار اور خون اور خنزیر کے گوشت کو حرام فرمایا ہے اور اس جانور کو (حرام فرمایا ہے) جس کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو)۔ اس آیت میں مطلقاً خون کو حرام قرار دیا ہے اور ایک جگہ یوں ہے: "إِلَّا أَن يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَّسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خِنزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ۔ (الانعام: ۱۴۵)" (سوا اس کے کہ وہ کھانا مردار ہو یا بہتا ہوا خون ہو یا خنزیر کا گوشت ہو، سو بے شک وہ نجس ہے یا جس جانور پر ذبح کے وقت بہ طور نافرمانی غیر اللہ کا نام پکارا جائے (وہ بھی نجس ہے))۔ اس آیت میں مطلقاً خون نہیں بلکہ بہنے والا خون حرام فرمایا ہے۔ اسی طرح کفارۂ ظہار میں غلام آزاد کرنے اور دو ماہ کے مسلسل روزوں کے ساتھ قبل از مباشرت کی قید ہے اور کھانا کھلانے کے ساتھ یہ قید نہیں ہے۔ ان صورتوں میں کیا مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا یا نہیں، یہ ایک بہت مشکل اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔

قرآن مجید کی بعض آیات کا حکم منسوخ ہو گیا مثلاً بیوہ عورت کی عدت اس آیت میں ایک سال بیان فرمائی گئی ہے: "وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِم مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ۔ (البقرہ: ۲۴۰)" (اور تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں وہ (وفات سے پہلے) ان بیویوں کو نکالے بغیر سال بھر تک خرچ دینے کی وصیت کر جائیں)، اور ایک اور آیت میں بیوہ عورت کی عدت چار ماہ دس دن بیان فرمائی ہے: "وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا۔ (البقرہ: ۲۳۴)" (اور (اے مسلمانو!) تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں اور اپنی بیویاں چھوڑ جائیں، وہ بیویاں اپنے آپ کو چار ماہ دس دن انتظار میں رکھیں)، اب یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ان میں کون سی آیت ناسخ ہے اور کون سی منسوخ ہے، یہ عام آدمی کے بس سے باہر ہے، اس قسم کی علمی باریکیاں اور فقہی پیچیدگیاں بہت زیادہ ہیں، ان چند مثالوں سے باقی مشکلات کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

احادیث سے احکام مستنبط کرنے میں ایک اور دشواری یہ ہے کہ احادیث مختلف اسانید سے مروی ہیں جن میں سند متواتر سے لے کر سند غریب تک اور سند صحیح سے لے کر سند ضعیف تک احادیث ذخیرہ کتب میں موجود ہیں، بلکہ موضوع روایات بھی ہیں جس طرح ایک جیسے شیشیوں میں ایک جیسا سفید رنگ کا مائع مادہ ہو اور ہر مادہ کی تاثیر الگ الگ ہو، کوئی مادہ کسی مرض میں مفید ہو اور دوسرا مادہ اس میں مضر ہو تو ان مادوں اور دواؤں کو باہم متمیز کرنے کے لیے کیمسٹری کے کسی بہت بڑے ماہر کی ضرورت ہوگی، جو مختلف کیمیائی تجربات کے بعد یہ فیصلہ کرے گا کہ کون سی شیشی میں کون سی دوا ہے، اسی طرح جب کوئی شخص علم حدیث میں مہارت حاصل کیے بغیر احادیث پر عمل کرے گا تو اس بات کا خطرہ ہے کہ وہ صحیح حدیث کے مقابلہ میں کسی ضعیف یا منسوخ روایت پر عمل کرے گا۔

احادیث سے احکام مستنبط کرنے میں ایک اور ضرورت یہ ہے کہ احادیث سے احکام شرعیہ حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ احکام سے متعلق تمام احادیث پر اس کو عبور ہو، کیونکہ جس حدیث پر وہ عمل کر رہا ہے ہو سکتا ہے دوسری جگہ اس کے خلاف حدیث ہو جس سے وہ حکم منسوخ ہو گیا ہو یا اس حدیث کے حکم کی کوئی تفصیل دوسری حدیث میں موجود ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی مسئلہ میں حدیث نہ ملنے کی بناء پر وہ قیاس کر رہا ہو حالانکہ اس مسئلہ میں حدیث موجود ہو، اس لیے احادیث سے احکام حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ احکام سے متعلق تمام احادیث اس کی نظر میں ہوں، اور یہی حال قرآن مجید سے احکام حاصل کرنے کا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اور حدیث سے احکام حاصل کرنے کے لیے جس وسعت علم اور دقت نظری کی ضرورت ہے، یہ عام

آدمی کے بس کی بات نہیں ہے اور صرف ائمہ مجتہدین ہی اس پر آشوب گھاٹی کے پار اتر سکتے ہیں۔ اس لیے عام آدمی کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ وہ ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک امام کی تقلید کرے۔

تقلید پر دلائل

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''فَلَوۡلَا نَفَرَ مِنۡ كُلِّ فِرۡقَةٍ مِّنۡهُمۡ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوۡا فِى الدِّيۡنِ وَلِيُنۡذِرُوۡا قَوۡمَهُمۡ اِذَا رَجَعُوۡۤا اِلَيۡهِمۡ لَعَلَّهُمۡ يَحۡذَرُوۡنَ۝ (التوبہ: ۱۲۲)'' (تو مسلمانوں کی جماعت میں سے ایک گروہ کیوں نہ روانہ ہوا تا کہ وہ دین کے احکام کو سمجھتے اور جب اُن کی قوم کے لوگ اُن کے پاس آتے تو وہ انہیں اس لیے اللہ کے عذاب کی وعید سناتے تا کہ وہ اللہ کے عذاب سے بچیں)۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صرف بعض مسلمانوں پر یہ ذمہ داری ڈالی ہے کہ وہ علم حاصل کرنے کے بعد اپنی پوری قوم کو احکام پہنچائیں، یعنی صرف بعض مسلمان تفقہ حاصل کریں اور باقی تمام مسلمان ان کے اقوال پر عمل کریں۔ اس آیت میں فقہاء کے اقوال کو واجب العمل قرار دیا ہے کیونکہ اس پر گناہوں سے بچنا موقوف ہے اور یہی تقلید ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ''فَسۡـئَلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّكۡرِ اِنۡ كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ۝ (النحل: ۴۳)'' (جس چیز کو تم نہ جانتے ہو، اس کا جاننے والوں سے سوال کرو)۔ اس آیت سے یہ پتا چلتا ہے کہ عام آدمی جو احکام شرعیہ کو بذات خود حاصل نہیں کر سکتا، اس پر لازم ہے کہ وہ عمل کے لیے اہل ذکر اور اہل علم یعنی ائمہ مجتہدین سے سوال کرے کیونکہ وہی براہ راست تمام احکام شرعیہ اصل مآخذ سے حاصل کرتے ہیں۔

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

علامہ سیوطی نے اکلیل میں اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ عام آدمی کے لیے مسائل فرعیہ میں مجتہد کی تقلید ضروری ہے۔ (روح المعانی، جز ۱۴ ص ۱۴۸، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

امام غزالی نے عام آدمی کی تقلید پر دو دلیلیں قائم کی ہیں: ایک یہ ہے کہ صحابہ کرام کا اس بات پر اجماع تھا کہ وہ عام آدمی کو مسائل بتلاتے تھے اور اس سے یہ نہیں کہتے تھے کہ وہ درجۂ اجتہاد کا علم حاصل کرے، اور دوسری دلیل یہ قائم کی ہے کہ اس پر اجماع ہے کہ عام آدمی احکام شرعیہ کا مکلف ہے اور اگر ہر آدمی درجۂ اجتہاد کا علم حاصل کرنے کا مکلف ہو تو زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت بلکہ دنیا کے تمام کاروبار معطل ہو جائیں گے، کیونکہ ہر شخص مجتہد بننے کے لیے دن رات علم کے حصول میں لگا رہے گا اور نہ کسی کے لیے کچھ کھانے کو ہو گا نہ پہننے کو اور دنیا کا نظام برباد ہو جائے گا، اور حرج عظیم واقع ہو گا اور یہ بداہۃً باطل ہے، اور یہ بطلان اس بات کے ماننے سے لازم آیا کہ عام آدمی درجۂ اجتہاد کا مکلف ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ عام آدمی درجۂ اجتہاد کا مکلف نہیں ہے اور عام آدمی پر مجتہدین کی تقلید لازم ہے۔ (المستصفیٰ ج ۲ ص ۳۸۹، مطبع بولاق، مصر، ۱۳۲۴ھ)

امام غزالی کی اس تقریر سے یہ اور واضح ہو گیا کہ سورۂ توبہ: ۱۲۲ میں اللہ تعالیٰ نے تفقہ فی الدین صرف ایک جماعت پر لازم فرمایا ہے اور تمام مسلمانوں پر تفقہ فی الدین حاصل کرنا لازم نہیں فرمایا، ورنہ وہی حرج لازم آتا جس کا امام غزالی نے ذکر کیا ہے۔ اور وہ جماعت مجتہدین کی جماعت ہے۔ تفقہ فی الدین میں وسعت اور گہرائی اور گیرائی حاصل کرنا ان کی ذمہ داری ہے باقی تمام عام لوگوں پر صرف ان کی تقلید لازم ہے۔

فقہ حنفی کی ترجیح

فقہ حنفی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس فقہ میں سب سے زیادہ احتیاط ہے اور یہ خدا خوفی کے سب سے زیادہ قریب ہے۔ مثلاً امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ شیر خوار بچہ ایک قطرہ بھی کسی عورت کا دودھ پی لے تو رضاعت ثابت ہو جائے گی جب کہ امام شافعی اور دیگر ائمہ پانچ قطرے پینے کے بعد رضاعت ثابت کرتے ہیں، اسی طرح امام شافعی چار دنوں تک قربانی کی اجازت دیتے ہیں جب کہ امام ابوحنیفہ تین دن کے بعد قربانی کی اجازت نہیں دیتے اور اسی میں احتیاط ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جب کسی مسئلہ میں متعدد اور مختلف احادیث وارد ہوں تو باقی ائمہ کسی ایک حدیث پر عمل کر کے باقی احادیث کو چھوڑ دیتے ہیں اور امام ابوحنیفہ ان مختلف احادیث میں تطبیق دے کر سب حدیثوں پر عمل کرتے ہیں مثلاً بعض احادیث میں ہے کہ جس کو نماز کی رکعات میں تردد اور شک ہو وہ نماز دوبارہ پڑھے بعض میں ہے کہ غور کرے اور جس طرف ظن غالب ہو اس پر عمل کرے اور بعض میں ہے کہ جب مثلاً دو اور تین رکعت میں شک ہو تو ان کو دو رکعت (یعنی کم از کم رکعات جو یقینی ہیں) قرار دے۔ امام اوزاعی کہتے ہیں ایسا شخص ہمیشہ دوبارہ نماز پڑھے، ائمہ ثلاثہ کہتے ہیں کہ ہمیشہ کم والی جانب کو اختیار کرے، کسی امام نے ایک حدیث پر عمل کیا کسی نے دوسری پر اور کسی نے تیسری پر۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: اگر پہلی بار شک واقع ہو تو دوبارہ نماز پڑھ لے اور اگر بار بار شک واقع ہوتا ہو تو غور کرے اور اگر غور کرنے سے کوئی جانب ترجیح پائے تو اس پر عمل کرے ورنہ جتنی رکعات کم از کم ہیں اتنی رکعات قرار دے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ باقی ائمہ اقوال صحابہ کو اہمیت نہیں دیتے اور امام ابوحنیفہ مختلف احادیث میں اقوال صحابہ کو فیصل مان کر ان کو ترجیح دیتے ہیں۔

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ درجات اور مراتب کا اعتبار کرتے ہیں، وہ قرآن کریم کے مقابلہ میں احادیث کو موخر کر دیتے ہیں۔

پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ نے احکام میں بہت زیادہ باریک بینی، دقت نظری، درجہ بندی اور وسعت سے کام لیا ہے جو باقی ائمہ میں نہیں ہے کیونکہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک فرض اور واجب اور اسی طرح حرام اور مکروہ تحریمی کے الگ الگ حکم ہیں جب کہ دوسرے ائمہ کے نزدیک ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔

چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ فقہ حنفی میں دستوری اساس بننے کی صلاحیت باقی ائمہ کی فقہ سے زیادہ ہے، یہی وجہ ہے کہ فقہ حنفی صدیوں تک اسلامی مملکتوں کا قانون اور دستور بنی رہی، مثلاً سلطنت بنو عباس جو دنیا کے تین براعظموں افریقہ، یورپ اور ایشیا تک پھیلی ہوئی تھی اس کا دستور اور قانون یہی فقہ تھی، اس کے بعد صدیوں تک سلطنت عثمانیہ کا دستور یہی فقہ رہی، برصغیر میں افغانستان، ماوراء النہر اور ہندوستان میں مسلمانوں کی ریاستوں میں اسی فقہ کا قانون چلتا تھا۔

ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ فقہ حنفی کے پیروکار ہر عہد میں مسلمانوں کی دو تہائی سے زیادہ اور غالب اکثریت میں رہے ہیں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی باقی امتوں سے زیادہ ہیں، اسی طرح امام ابوحنیفہ کے مقلدین باقی ائمہ کے مقلدین سے زیادہ ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت کی ایک سو بیس صفوں میں سے اسی (۸۰) صفیں میری امت کی ہوں گی۔ (حلیۃ الاولیاء ج ۵

ص ۲۹۹)،اور میں کہتا ہوں کہ ان اسی (۸۰) صفوں میں دو تہائی اکثریت ان شاء اللہ احناف کی ہوگی۔

آٹھویں خصوصیت یہ ہے کہ احناف میں جس قدر اولیاء اللہ کا ظہور ہوا کسی اور امام کے مقلدین میں اتنے اولیاء اللہ نہیں ہوئے۔ حضرت ابراہیم بن ادہم، حضرت شقیق بلخی، حضرت عبداللہ بن مبارک، حضرت معروف کرخی حضرت بایزید بسطامی، حضرت فضیل بن عیاض، حضرت داؤد طائی، حضرت ابو حامد لفاف، حضرت خلف بن ایوب، حضرت وکیع بن جراح، حضرت ابوبکر وراق، حضرت حاتم اصم، حضرت محمد شاذلی، حضرت علی ہجویری، حضرت میراں حسین زنجانی، حضرت معین الدین اجمیری، خواجہ بختیار کاکی، حضرت شاہ ابوالمعالی، حضرت مجدد الف ثانی رحمہم اللہ وقدس اسرارہم، یہ سب حنفی تھے، ان کے علاوہ اور بہت اولیاء اللہ ہیں جو حدود شمار سے باہر ہیں۔

نویں خصوصیت یہ ہے کہ تمام ائمہ اور مجتہدین امام ابوحنیفہ کے فیض یافتہ ہیں، امام مالک نے فقہ کی تدوین میں امام ابوحنیفہ سے فیض حاصل کیا، امام شافعی، امام اعظم کے شاگرد کے شاگرد تھے، امام احمد بن حنبل نے بھی امام اعظم کے علوم سے فائدہ اٹھایا اور وہ امام شافعی کے شاگرد تھے۔ اسی لیے امام شافعی کہا کرتے تھے کہ "الفقهاء كلهم عيال ابي حنيفه" "تمام فقہاء ابوحنیفہ کے پروردہ ہیں۔

دسویں خصوصیت یہ ہے کہ باقی ائمہ امام اعظم کے سامنے اپنے موقف کو ترک کر دیتے تھے۔ چنانچہ امام شافعی جب امام اعظم کے مزار پر جاتے تو قنوت نازلہ پڑھتے نہ رفع یدین کرتے۔

مذہب احناف کی ترجیح مخالفین کو بھی مسلم ہے۔

نواب صدیق حسن خاں بھوپالی لکھتے ہیں:

وہ مذاہب مشہورہ جن کو تمام امت نے قبول کر لیا ہے اور اہل اسلام کا ان کی صحت پر اتفاق ہے چار مذاہب ہیں جو چاروں اماموں کی طرف منسوب ہیں۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل، اور ان مذاہب میں سب سے زیادہ حق اور صحیح امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک ہے کیونکہ امام ابوحنیفہ کا مذہب باقی مذاہب میں کتاب وسنت کی کثرت معرفت، علم الاحکام میں رائے کی صحت، استنباط مسائل میں رائے کی قوت اور پختگی کے لحاظ سے سب میں قوی ہے اور جو شخص کسی مذہب معین کی تقلید کرے اس پر لازم ہے کہ اس طرح گمان کرے کہ اس کا مذہب صحیح ہے لیکن خطاء کا احتمال رکھتا ہے اور مخالف کا مذہب غلط ہے اور صحت کا احتمال رکھتا ہے۔ (ابجد العلوم، ج ۳ ص ۴۰۲، مکتبہ قدوسیہ لاہور، ۱۴۰۳ھ)

احادیث سے تقلید پر استدلال

ابوجمرہ بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور لوگوں کے درمیان ترجمانی کے فرائض ادا کیا کرتا تھا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ عبدالقیس کا وفد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، آپ نے فرمایا: یہ کون سا وفد ہے یا فرمایا: یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے کہا: ہم ربیعہ ہیں، آپ نے فرمایا: اس قوم کو یا اس وفد کو خوش آمدید ہو، یہ رسوا ہوں گے نہ شرمندہ ہوں گے، انہوں نے کہا: ہم آپ کے پاس بہت دور سے آئے ہیں اور ہمارے اور آپ کے درمیان کفار مضر کا قبیلہ حائل ہے اور ہم سوا حرمت والے مہینوں کے آپ کے پاس آنے کی طاقت نہیں رکھتے، آپ ہمیں ایسے احکام بتائیے جن کی ہم ان کو خبر دیں جو ہمارے پیچھے ہیں اور اس وجہ سے جنت میں داخل ہو جائیں، سو آپ نے ان کو چار چیزوں کا حکم دیا اور چار چیزوں سے روکا، آپ نے ان کو صرف اللہ عزوجل وحدہ پر

ایمان لانے کا حکم فرمایا، پھر فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ اللہ وحدہٗ پر ایمان لانے کا کیا معنی ہے؟ انہوں نے کہا: اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ جاننے والے ہیں، آپ نے فرمایا: اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا، اور مال غنیمت میں سے پانچواں حصہ ادا کرنا اور ان کو خشک کھوکھلے کدو، سبز گھڑے اور تارکول ملے ہوئے برتنوں کے استعمال سے منع فرمایا اور بسا اوقات آپ نے ان کو کھوکھلی لکڑی کے برتن کے استعمال سے بھی منع فرمایا، آپ نے فرمایا: ان احکام کو یاد کرو اور جو لوگ تمہارے پیچھے ہیں ان کو ان احکام کی خبر دو۔

(صحیح البخاری: ۸۷، صحیح مسلم: ۱۷، سنن ابوداؤد: ۳۶۹۲، سنن ترمذی: ۱۵۹۹، ۲۶۱۱)

یہ صحابہ کرام جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے دین سیکھ کر گئے تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ حکم فرمایا کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں جا کر دین کی تبلیغ کریں اور اپنی قوم کو دین کی تعلیم دیں اور نیک کاموں کے احکام دیں اور اب ان کے علاقہ کے لوگ ان کے اقوال پر عمل کریں گے، اس اعتماد پر کہ یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے دین سیکھ کر آئے ہیں اور جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں وہ کتاب اور سنت کے مطابق کہہ رہے ہیں اور کسی شخص کے قول پر اس اعتماد سے عمل کرنا کہ وہ کتاب اور سنت کے مطابق کہہ رہا ہے، یہی تقلید ہے۔

آثار صحابہ اور اقوال تابعین سے تقلید پر استدلال

عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ اہل مدینہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ سوال کیا کہ جس عورت نے طواف (زیارت) کر لیا ہو پھر اس کو حیض آ جائے (تو آیا وہ طواف وداع کیے بغیر واپس جا سکتی ہے؟) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جا سکتی ہے، اہل مدینہ نے کہا: ہم آپ کے قول کی وجہ سے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے قول کو ترک نہیں کریں گے، (حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ وہ طواف وداع کیے بغیر نہیں جا سکتی) ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب تم مدینہ جاؤ تو اس مسئلہ کی تحقیق کر لینا، جب وہ مدینہ گئے تو انہوں نے اس کی تحقیق کی، اور حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا سے بھی پوچھا، انہوں نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی (یہ) حدیث بیان کی: (کہ ایسی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو طواف وداع کیے بغیر جانے کی اجازت دی تھی)۔ جب اہل مدینہ کو حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی حدیث مل گئی تو انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس جا کر حق کا اعتراف کر لیا۔ (صحیح البخاری: ۱۷۵۸، ۱۷۵۹)

اس حدیث میں تقلید شخصی کا بھی ثبوت ہے کہ اہل مدینہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے فتویٰ کی تقلید کرتے تھے اور یہ بھی دلیل ہے کہ اگر امام کے قول کے خلاف دلیل مل جائے تو حدیث پر عمل کرنا تقلید شخصی کے خلاف نہیں ہے۔

صحابہ اور تابعین کے تقریباً ایک سو آثار مروی ہیں کہ لوگوں نے ان سے متعدد معاملات اور مختلف مسائل میں سوالات کیے اور انہوں نے ان کے جوابات میں قرآن مجید اور احادیث کی تصریحات کے بجائے اپنے اقوال پیش کیے۔ ہرچند کہ ان کے اقوال قرآن و سنت پر ہی مبنی تھے اور سائلین کا یہ عقیدہ تھا کہ یہ لوگ کتاب اور سنت کے ماہر ہیں اور اس کے خلاف نہیں بتائیں گے اور اسی کا نام تقلید ہے، اور مقلدین بھی اپنے ائمہ کی اسی معنی میں تقلید کرتے ہیں۔

(۱) عبدالرحمٰن الاعرج بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ محرم اپنی چادر میں گٹھن لگا سکتا ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں! (مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۴۶۶۲، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۶ھ)

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے سائل کو قرآن اور حدیث بیان کرنے کے بجائے صرف اپنا قول بیان کیا اور سائل نے اس پر عمل کیا اور یہی تقلید ہے۔

(۲) جابر بن زید سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص کھڑا ہوا نماز پڑھ رہا ہے اور دوسرا شخص اس کے قریب کھڑا ہوا نماز پڑھ رہا ہے، اس نے آیت سجدہ پڑھی تو پہلے شخص نے اس آیت کو سن لیا تو کیا وہ سجدہ کرے گا؟ انہوں نے کہا: نہیں! (مصنف ابن ابی شیبہ: ۴۳۰۸)

(۳) جابر بن زید سے سوال کیا گیا کہ حائضہ عورت کے کپڑے پر خون لگ جائے وہ اس کو دھولے اور اس میں خون کا نشان باقی رہے تو کیا وہ نماز پڑھ سکتی ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! (مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۰۲۰)

ان مذکورہ تینوں آثار میں تصریح ہے کہ حضرت ابی بن کعب اور حضرت جابر بن زید رضی اللہ عنہما نے سائل کے سوال کے جواب میں صرف اپنا قول ذکر کیا اور قرآن مجید یا حدیث شریف کو پیش نہیں کیا اور نہ سائل نے اس کا مطالبہ کیا بلکہ ان کے قول پر عمل کیا اور اسی کا نام تقلید ہے۔

ہم نے "فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝" (النحل: ۴۳) میں یہ بیان کیا ہے کہ صحابہ کرام تابعین اور ان کے متبعین سب یہ سمجھتے ہیں کہ اس آیت کا یہی معنی ہے۔ اور تابعین اور تبع تابعین اپنے اپنے پیش آمدہ مسائل میں صحابہ اور تابعین کی طرف رجوع کرتے تھے اور ان سے کتاب وسنت سے دلائل دینے کا مطالبہ نہیں کرتے تھے، کیونکہ انہیں اُن پر اعتماد تھا کہ وہ اپنے اجتہاد سے جو بھی فتویٰ دیں گے وہ کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہوگا، اور اسی معنی میں مقلدین اپنے ائمہ کی تقلید کرتے ہیں۔

غیر مقلدین کے معمولات سے تقلید شخصی پر استدلال

ظاہر ہے کہ غیر مقلدین عوام میں سے ہر شخص قرآن وسنت سے براہ راست مسائل کا استخراج نہیں کر سکتا اور وہ پیش آمدہ مسائل میں اپنے علماء کی طرف رجوع کرتا ہے اور ان سے فتوے طلب کرتا ہے اور وہ بھی ہر فتویٰ میں قرآن وحدیث سے دلائل پیش نہیں کرتے بلکہ اس کو مسئلہ کا حکم بتاتے ہیں، سو غیر مقلدین بھی اپنے علماء کی تقلید کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان غیر مقلدین علماء کا علم امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک اور امام احمد کے پائے کا نہیں ہوتا، تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ان عام علماء کے بجائے ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کی تقلید کر لی جائے!

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "ہم نے رسولوں کو واضح دلائل اور کتابیں دے کر بھیجا اور (اے رسول اکرم!) ہم نے آپ کی طرف قرآن مجید کو نازل فرمایا تا کہ آپ لوگوں کو وہ احکام بیان کریں جو اُن کی طرف نازل فرمائے گئے ہیں اور تا کہ وہ اس قرآن میں غور وفکر کریں ۝" (النحل: ۴۴)

"بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ۗ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ":

اس آیت کی تاویل یہ ہے کہ ہم نے آپ سے پہلے "بَيِّنٰت" اور "زُبُر" کے ساتھ جن کو رسول بنا کر بھیجا، وہ صرف مرد تھے جن کی طرف وحی فرمائی جاتی تھی اور ہم نے فرشتوں کو نہیں بھیجا تھا۔

اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس آیت کی تاویل یہ ہے کہ ہم نے آپ سے پہلے جن کو رسول بنا کر بھیجا اور اُن کی طرف وحی فرمائی، اُن

کو ہم نے واضح دلائل اور کتابوں کے ساتھ بھیجا اور اُن کی طرف ذکر کو نازل فرمایا تاکہ وہ رسول یہ بیان فرمائیں کہ اُن کی طرف کیا نازل فرمایا گیا ہے۔ اس آیت میں ذکر سے مراد اللہ تعالیٰ کی وحی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے بیان فرمانے والے تھے اور کتاب کے بیان فرمانے والے تھے جس کو احادیث سے طلب کیا جاتا ہے۔

"وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ": اور تاکہ وہ اس قرآن میں غور وفکر کریں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "جن لوگوں نے اسلام کے خلاف سازشیں کی ہیں کیا وہ اس سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو زمین میں دھنسا دیں، یا اُن پر ایسی جگہ سے عذاب لائیں جہاں سے ان کا گمان بھی نہ ہو O" (النحل: ۴۵)

"اَفَاَمِنَ الَّذِیْنَ مَكَرُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ یَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ یَاْتِیَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَیْثُ لَا یَشْعُرُوْنَ": اس سے مراد اہل مکہ ہیں جو مدینہ کے گرد تھے۔ الکلبی نے کہا: اس مکر سے مراد اُن کا غیر اللہ کی عبادت میں مشغول ہونا ہے اور زیادہ قریب یہ ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے اصحاب کرام کو خفیہ تدبیروں اور سازشوں سے ایذاء پہنچانے کا قصد کرتے تھے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کیا یہ لوگ اس سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو زمین میں دھنسا دیں، جس طرح قارون کو زمین میں دھنسا دیا تھا، یا آسمان سے فرشتے ان پر عذاب لے آئیں اور ان کو پتا بھی نہ چلے، جیسا کہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کو عذاب آیا تھا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "یا ان کو چلتے پھرتے پکڑ لیں، کیونکہ وہ اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہیں O" (النحل: ۴۶)

"اَوْ یَاْخُذَهُمْ فِیْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِیْنَ": مفسرین نے اس تقلب کے کئی محامل بیان کئے ہیں:

(۱) جب وہ مختلف اغراض سے سفر کر رہے ہوں اور تجارت کے لیے جا رہے ہوں تو اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہیں کہ ان کو سفر میں ہلاک فرما دیں، جس طرح اس پر قادر ہیں کہ ان کو ان کے شہروں میں ہلاک فرما دیں، اور وہ دور دراز کے شہروں میں جا کر اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بھاگ نہیں سکتے۔

(۲) اللہ تعالیٰ اُن کو رات اور دن میں اُن کے ان احوال میں پکڑ لیں جب وہ کہیں جا رہے ہوں یا واپس آ رہے ہوں، اور جن کاموں میں وہ تصرف کر رہے ہوں تو ان کاموں میں اُن کو پکڑ لیں۔

(۳) جب وہ اپنے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے کہیں جا رہے ہوں تو اللہ تعالیٰ اُن کے مقاصد کو پورا ہونے سے پہلے انہیں پکڑ لیں۔ اور اس آیت کی نظیر یہ ہے: "لَا یَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِی الْبِلَادِ" (آل عمران: ۱۹۶) "(اے رسول اکرم!) شہروں میں کافروں کا (خوش حالی کے ساتھ) جھومتے ہوئے پھرنا آپ کو (بالفرض) غلط فہمی میں مبتلا نہ کر دے O"۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "یا اُن کو عذاب کے خوف کی حالت میں پکڑ لیں، بے شک آپ کے رب بہت زیادہ

مہربان، سب سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں اس حال میں کہ وہ عاجزی کرنے والے ہوتے ہیں O"
(النحل: ۴۷)

"اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ": یعنی جس حال میں وہ ڈر رہے ہوں اور ان کو یہ خطرہ ہو کہ اُن پر کوئی مصیبت آئے گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے ایک قوم کو عذاب سے ہلاک فرمادیا تھا تو اس خوف کا اثر اُن پر باقی تھا۔
دوسرا قول یہ ہے کہ خوف سے مراد ہے نقص، اور معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کو کسی چیز کے نقصان میں مبتلاء کر کے پکڑ لیں، ان کے گھروں میں نقصان ہو جائے یا ان کے مالوں میں یا اُن کی جانوں میں حتیٰ کہ سب فنا ہو جائے۔
"فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ": مفسرین نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اکثر معاملات میں ڈھیل دیتے رہتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ بہت زیادہ شفیق ہیں سب سے زیادہ مہربان ہیں اور جلدی عذاب نازل نہیں فرماتے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "کیا ان لوگوں نے اللہ کی پیدا فرمائی ہوئی اُن چیزوں کو نہیں دیکھا جن کے سائے دائیں اور بائیں جانب سے جھکتے ہوئے اللہ کو سجدہ کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ عاجزی کرنے والے ہوتے ہیں O" (النحل: ۴۸)

"اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ":
اس آیت میں "يَتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ" کا ذکر ہے، یعنی سائے ایک جانب سے دوسری جانب جھکتے ہیں، صبح کے وقت وہ ایک حال میں ہوتے ہیں اور پھر دن کے آخر میں وہ دوسرے حال میں ہوتے ہیں، پس اُن کا جھکنا اور اُن کا دَور کرنا یہ اللہ عزوجل کے لیے سجدہ کرنا ہے۔ دوپہر کے بعد جو سایا ہوتا ہے اس کو "فيء" کہا جاتا ہے، کیونکہ اس نے مغرب سے مشرق کی طرف رجوع کیا۔ اور السجود کا معنی ہے جھکنا، جب کھجور کا درخت ایک جانب کو جھکے تو کہتے ہیں "سجدت النخلة"۔
اور الکلبی نے کہا: سورج کے طلوع ہونے سے پہلے سایا تمہاری دائیں جانب، بائیں جانب اور سامنے اور پیچھے ہوتا ہے، اسی طرح جب سورج غروب ہو جائے۔ اور پھر جب سورج طلوع ہو تو تمہارے سامنے ہوتا ہے اور جب سورج بلند ہو جائے تو وہ تمہاری دائیں جانب ہوتا ہے اور پھر اس کے بعد وہ تمہارے پیچھے ہوتا ہے اور غروب ہونے سے پہلے وہ سایا تمہاری بائیں جانب ہوتا ہے، تو یہ سائے کا رجوع کرنا ہے اور اس کا پلٹنا ہے اور یہی سجدہ کرنا ہے۔
مجاہد نے کہا: جب سورج زوال پذیر ہوتا ہے تو ہر چیز اللہ تعالیٰ کے لیے سجدہ کرتی ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور آسمانوں میں اور زمینوں میں جو بھی جاندار ہیں اور فرشتے ہیں وہ سب اللہ کے لیے سجدہ کرتے ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے O" (النحل: ۴۹)

"وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ":
السجود کا معنی ہے الطاعة، اور تمام چیزیں خواہ وہ حیوانات ہوں یا جمادات ہوں، سب اللہ عزوجل کی اطاعت کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں ہے: "قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ⊙ (حم السجدہ: ۱۱)" (آسمان اور زمین دونوں نے عرض کی: ہم خوشی حاضر ہیں O)۔

دوسرا قول یہ ہے کہ چیزوں کا سجدہ کرنا اُن کا اللہ تعالیٰ کے سامنے تذلل ہے اور اللہ تعالیٰ اُن سے جس کام کا ارادہ فرمائیں، اس کام کے لیے اُن کا مسخر ہونا ہے۔ اس میں غافلین کو اللہ تعالیٰ کے لیے سجدہ کرنے کی تنبیہ ہے۔

اور جمادات اور غیر ذوی العقول کا سجدہ اُن میں اُن چیزوں کا ظہور ہے جن چیزوں کے لیے اُن کو پیدا فرمایا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۗ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ ⊙ (حم السجدہ: ۵۳)" (عنقریب ہم انہیں اطرافِ عالم میں اور خود ان کی جانوں میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ اُن پر ظاہر ہو جائے کہ قرآن حق ہے، اے رسولِ اکرم! کیا آپ کے رب کا ہر چیز پر گواہ ہونا کافی نہیں ہے؟O)۔

"وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ": ملائکہ کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا، حالانکہ وہ بھی آسمانوں اور زمینوں میں سے ہیں، یعنی جب تمام آسمانوں اور زمینوں کی چیزیں سجدہ کرتی ہیں تو ملائکہ بھی اُن میں داخل ہیں، پھر اُن کا خصوصیت سے اُن کو شرف عطا فرمانے کے لیے ذکر فرمایا ہے اور اُن کا مرتبہ بلند کرنے کے لیے اُن کا ذکر فرمایا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ وہ اُن سے خارج ہیں جو زمین پر چلتے ہیں، کیونکہ فرشتوں کے پَر ہیں اور وہ فضا میں اڑتے ہیں، اور ایک قول یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے یہ ارادہ فرمایا کہ آسمانوں میں سے ملائکہ اس کے لیے سجدہ کرتے ہیں اور زمین پر چلنے والے اس کے لیے سجدہ کرتے ہیں، اور ملائکہ اللہ تعالیٰ کے لیے سجدہ کرتے ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں جو اُن پر غالب ہیں اور وہ وہی کام کرتے ہیں جن کاموں کا انہیں حکم فرمایا جاتا ہے O" (النحل: ۵۰)

"يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ":

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اُن چیزوں کو دیکھتا ہوں جن کو تم نہیں دیکھتے اور میں اُن باتوں کو سنتا ہوں جن کو تم نہیں سنتے، آسمان چرچراتا ہے اور اس کا چرچرانا برحق ہے، اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! آسمان میں چار اُنگل کی بھی جگہ نہیں ہے مگر وہاں پر ایک فرشتہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی بزرگی بیان کرتا ہے۔ اور اگر تم اُن چیزوں کو جان لو جن کو میں جانتا ہوں تو تم کم ہنسو گے اور زیادہ روؤ گے، اور تم بستروں پر اپنی بیویوں کے ساتھ لذت نہیں لو گے، اور تم چیختے چلاتے ہوئے جنگلوں کی طرف نکل جاؤ گے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا: کاش کہ میں ایک درخت ہوتا جس کو کاٹ دیا جاتا۔

(سنن ترمذی: ۲۳۱۲، سنن ابن ماجہ: ۴۱۹۰، سنن بیہقی ج ۷، ص ۵۲، شرح السنۃ للبغوی: ۴۱۷۲)

(معالم التنزیل، ج ۳ ص ۷۹۔ ۸۲، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ و تفاسیر اخری)

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ⊙

اور اللہ نے فرمایا: عبادت کے دو مستحق نہ قرار دو، عبادت کے مستحق صرف ایک ہیں، پس تم مجھ سے ہی ڈرتے رہو O

وَلَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ۗ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ⊙

اور جو کچھ آسمانوں میں اور زمینوں میں ہے، سب انہی کی ملکیت ہے اور انہی کی اطاعت دائمی ہے، کیا پس تم اللہ کے غیر سے ڈرتے ہو؟ O

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْـَٔرُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور تمہارے پاس جو بھی نعمت ہے سو وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے، پھر جب تمہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو تم انہی کی طرف فریاد کرتے ہو O

ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾

پھر جب اللہ تم سے اس مصیبت کو دور فرما دیتے ہیں تو اچانک تم میں سے ایک فریق اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے لگتا ہے O

لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۭ فَتَمَتَّعُوْا ۣ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾

تا کہ وہ ان نعمتوں کی ناشکری کریں جو ہم نے اُن کو عطا فرمائی ہیں، سو تم کچھ عرصہ نفع حاصل کر لو، پس عنقریب تم اپنا انجام معلوم کر لو گے O

وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ۭ تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔــلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۶﴾

اور وہ ہماری دی ہوئی نعمتوں میں سے اُن بتوں کا ایک حصہ مقرر کرتے ہیں جن کو وہ جانتے ہی نہیں، اللہ کی قسم! تم سے تمہاری افتراء پردازیوں کے متعلق ضرور بہ ضرور سوال فرمایا جائے گا O

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۵۷﴾

اور وہ اللہ کے لیے بیٹیاں قرار دیتے ہیں، حالانکہ اللہ اس سے پاک ہیں، اور اپنے لیے بیٹے قرار دیتے ہیں جن کو وہ چاہتے ہیں O

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۵۸﴾

اور جب اُن میں سے کسی ایک کو بیٹی پیدا ہونے کی بشارت دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ غم و غصہ سے سیاہ پڑ جاتا ہے، اور وہ اپنے خون کا سا گھونٹ پیتا ہے O

يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْۗءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ۭ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰي هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۵۹﴾

اسے جس بیٹی کی پیدائش کی بشارت دی جاتی ہے اس کو برا جاننے کی وجہ سے وہ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے، (اور وہ یہ سوچتا ہے

کر) آیا وہ اس بیٹی کو ذلت کے ساتھ رکھے یا اس کو زندہ مٹی میں دبا دے، سنو وہ لوگ بہت ہی برا فیصلہ کرتے ہیں O

لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ۗ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۰﴾

جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے، ان کے لیے بہت ہی بری مثال ہے اور اللہ ہی کے لیے بلند صفات ہیں، اور وہ سب پر غالب، سب سے زیادہ حکمت والے ہیں O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور اللہ نے فرمایا: عبادت کے دو مستحق نہ قرار دو، عبادت کے مستحق صرف ایک ہیں، پس تم مجھ سے ہی ڈرتے رہو O'' (النحل: ۵۱)

ابو اللیث نصر بن محمد بن احمد السمرقندی الحنفی المتوفی ۳۷۵ھ، النحل: ۵۱ تا ۶۰ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ'': یعنی یہ نہ کہو کہ خدا دو ہیں، یعنی ایک تو اللہ عزوجل خدا ہیں اور دوسرے بت خدا ہیں، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ آیت مجوس کے متعلق نازل ہوئی ہے، کیونکہ وہ کہتے تھے کہ دو خدا ہیں، خیر کا خالق یزدان ہے اور شر کا خالق اہرمن ہے۔

اس سوال کا جواب کہ ''اِلٰهَيْنِ'' کے بعد ''اثْنَيْنِ'' کا اضافہ کیوں فرمایا؟

اس جگہ یہ سوال ہے کہ ''اِلٰهَيْنِ'' تو خود تثنیہ کا صیغہ ہے تو اس کے بعد ''اثْنَيْنِ'' کا اضافہ کیوں فرمایا ہے؟
زمخشری نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ تاکید کیلئے ہے، اور دوسرا جواب یہ ہے کہ ''اثْنَيْنِ'' کا اضافہ اس لیے ہے تاکہ معلوم ہو کہ ممانعت تعدد کی طرف راجع ہے نہ کہ الوہیت کی طرف، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی الوہیت تو سب کے نزدیک مسلم ہے، اور اس وہم کو دور کرنا ہے کہ اس سے مراد الوہیت کا اثبات ہے نہ کہ وحدت کا، حالانکہ الوہیت تو اللہ سبحانہ کی فی نفسہا مسلم ہے، مشرکین سے اختلاف اس کی وحدانیت میں ہے۔

اللہ عزوجل نے فرمایا: ''اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ'': یعنی مجھ سے ہی ڈرو اور مجھ ہی کو واحد مانو اور میری ہی اطاعت کرو اور میرے غیر کی عبادت نہ کرو۔ یعنی اگر تم کسی چیز سے ڈرنا چاہتے ہو تو صرف مجھ سے ڈرو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور جو کچھ آسمانوں میں اور زمینوں میں ہے، سب انہی کی ملکیت ہے اور انہی کی اطاعت دائمی ہے، کیا پس تم اللہ کے غیر سے ڈرتے ہو؟ O (النحل: ۵۲)

''وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ'': یعنی آسمان میں جو فرشتے ہیں۔ ''وَالْاَرْضِ'': یعنی زمین میں جو مخلوقات ہیں، جنات ہوں یا انسان، سب اللہ تعالیٰ کے بندے اور ان کی بندیاں ہیں۔

''وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا'': یعنی خالص اطاعت اللہ ہی کے لیے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ الالوھیۃ اور الربوبیۃ خالص اللہ ہی کے لیے ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ ان کی اطاعت ہمیشہ واجب ہے، اور کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت چھوڑ کر کسی اور

کی طرف مائل ہو، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ انہی کے لیے دین اور اطاعت ہے خواہ بندہ کو جس کام کا حکم فرمایا جائے وہ اس پر راضی ہو یا راضی نہ ہو۔ اور لغت میں "الواصب" کا معنی ہے: شدت اور تھکاوٹ۔

"وَاصِبًا" کا لغوی معنی

میں کہتا ہوں: علامہ سمرقندی نے الواصب کا لغوی معنی صحیح نہیں لکھا، صحیح معنی درج ذیل ہے:

علامہ اسماعیل بن حماد الجوہری الشافعی المتوفی ۳۹۸ھ، لکھتے ہیں:

الوصب کا معنی ہے المرض، اور المُوْصِب کا معنی ہے: جس کو بہت زیادہ درد ہوں۔ اور "وَصَبَ الشيئُ وُصُوبًا" کا معنی ہے: جو چیز دائمی ہو، جب کوئی شخص کسی کام کو دوامًا کرے تو کہتے ہیں "وَصَبَ الرَّجُلُ عَلَى الْأَمْرِ"۔ قرآن مجید میں ہے: "وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۝" (الصافات: ۹) "(اور ان کے لیے ہمیشہ کا عذاب ہے ۝)۔ نیز قرآن مجید میں ہے: "وَ لَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا۔" (النحل: ۵۲) "(اور انہی کی اطاعت دائمی ہے)۔ الفراء نے کہا: اس آیت میں "وَاصِبًا" کا معنی ہے دائمًا۔

(مختار الصحاح ص ۱۱۳۲، دارالمعرفہ، بیروت، ۱۴۲۹ھ)

"اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ": یعنی کیا تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی اور کی عبادت کرتے ہو؟

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور تمہارے پاس جو بھی نعمت ہے سو وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے، پھر جب تمہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو تم انہی کی طرف فریاد کرتے ہو ۝" (النحل: ۵۳)

"وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ": یعنی تمہارے پاس جو خوشحالی ہے اور تم کو جو جسمانی صحت حاصل ہے، یہ ساری نعمتیں تمہیں اللہ تعالیٰ سے ملی ہیں۔

"ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ": پھر جب تمہارے بدن میں کوئی بیماری ہو جائے یا تم تنگدست ہو جاؤ۔ "فَاِلَيْهِ تَجْــَٔرُوْنَ": تو تم اللہ ہی کی طرف فریاد کرتے ہو اور انہی سے گڑگڑا کر دعا کرتے ہو، تاکہ اللہ تعالیٰ تم سے اس تکلیف اور مصیبت کو دور فرما دیں، جیسا کہ سورۃ الدخان میں فرمایا: "رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ۝ (الدخان: ۱۲)" (اے ہمارے رب! یہ عذاب ہم سے دور فرما دیں، بے شک ہم ایمان لاتے ہیں ۝)۔

"الجوار" کا معنی

علامہ اسماعیل بن حماد الجوہری الشافعی المتوفی ۳۹۸ھ، لکھتے ہیں:

"الجوار" "الخوار" کی مثل ہے، کہا جاتا ہے "جار الثور" یعنی بیل چلایا، اور قرآن مجید میں ہے: "عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ (الاعراف: ۱۴۸)" (جس سے بیل کی طرح آواز نکلتی تھی)۔

اور الاخفش نے حکایت کی ہے کہ "جار الرجل الی اللہ عزوجل" اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا مانگے۔ (مختار الصحاح ص ۱۳۹، دارالمعرفہ، بیروت، ۱۴۲۹ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پھر جب اللہ تم سے اس مصیبت کو دور فرما دیتے ہیں تو اچانک تم میں سے ایک فریق

اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے لگتا ہے O" (النحل: ۵۴)

"ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ": پھر جب اللہ تعالیٰ تم سے اس مصیبت کو دور فرما دیتے ہیں۔

"اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ": یعنی کفار۔ "بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ": یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے غیر کی عبادت کرتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "تا کہ وہ ان نعمتوں کی ناشکری کریں جو ہم نے اُن کو عطا فرمائی ہیں، سوتم کچھ عرصہ نفع حاصل کرلو، پس عنقریب تم اپنا انجام معلوم کرلو گے O" (النحل: ۵۵)

"لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۚ فَتَمَتَّعُوْا": تا کہ ہم نے ان کو جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں، ان کا وہ انکار کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو دھمکانے کے لیے فرمایا: "فَتَمَتَّعُوْا"، بہ ظاہر یہ امر ہے لیکن حقیقت میں اُن کو دھمکایا ہے کہ تم کچھ عرصہ ان نعمتوں سے فائدہ اٹھالو، جیسے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ (حم السجدہ: ۴۰)" (جو چاہے کرتے رہو، بے شک وہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے O)۔

"فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ": عنقریب آخرت میں تم کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم تمہارے ساتھ کیا کرتے ہیں۔

یعنی اُن کا شرک کرنا ان کے کفر کے سبب سے ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ "لِيَكْفُرُوْا" میں لام، لام صیرورت ہے۔ اور تیسرا قول یہ ہے کہ یہ لام امر ہے اور زمخشری کا بھی یہی قول ہے۔ اور چوتھا قول ہے کہ یہ لام عاقبت ہے، یعنی انہوں نے اللہ عزوجل کے ساتھ شرک کیا تو اس کا انجام یہ تھا تا کہ وہ ہماری دی ہوئی نعمتوں کی ناشکری کریں، اور وہ نعمت ان سے مصیبتوں کا دور فرمانا ہے۔ یعنی انہیں چاہیے تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے مصیبت کو دور فرما دیا، لیکن ان کی بہت زیادہ سرکشی اور عناد یہ تھا کہ بجائے شکر ادا کرنے کے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ناشکری کی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور وہ ہماری دی ہوئی نعمتوں میں سے اُن بتوں کا ایک حصہ مقرر کرتے ہیں جن کو وہ جانتے ہی نہیں، اللہ کی قسم! تم سے تمہاری افتراء پردازیوں کے متعلق ضرور بہ ضرور سوال فرمایا جائے گا O" (النحل: ۵۶)

"وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا": اور وہ اپنے بتوں کے لیے کھیتوں میں سے اور مویشیوں میں سے حصہ رکھتے ہیں، پس وہ کہتے ہیں کہ اُن کے زعم میں یہ چیز اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور یہ چیز ہمارے شرکاء کے لیے ہے۔ بعض مفسرین نے کہا: یعنی کفار اپنے بتوں کے لیے حصہ رکھتے ہیں اور اُن کو اپنے بتوں کے متعلق علم نہیں ہوتا کہ یہ کوئی ضرر پہنچا سکتے ہیں یا کوئی نفع دے سکتے ہیں۔ اور بعض مفسرین نے کہا: اس کا معنی ہے کہ وہ اپنے اُن بتوں کے لیے حصہ رکھتے ہیں جن کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے۔

"مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ": ان کھیتوں میں سے اور ان مویشیوں میں سے جو ہم نے ان کو عطا فرمائے۔

"تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ": یعنی تم اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے ہو، کیونکہ مشرکین یہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم فرمایا ہے کہ کچھ حصہ ہم اللہ تعالیٰ کے لیے رکھیں اور کچھ حصہ ہم بتوں کے لیے رکھیں۔

مسلمانوں کے ایصالِ ثواب پر مشرکین کے افعال کو منطبق کرنا

شیخ صوفی عبدالحمید سواتی متوفی ۱۴۲۹ھ/ ۲۰۰۸ء، النحل: ۵۶ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اس طرح وہ غیر اللہ کے تقرب کے لیے ان کی نذر و نیاز کرتے ہیں۔ گائے بھینس کا دودھ تو اللہ تعالیٰ دیتا ہے، مگر مشرک لوگ اسے شیخ عبدالقادر جیلانی کے نام پر دیتے ہیں، بکرا یا دنبہ بھی خدا تعالیٰ کا پیدا کردہ ہے، وہ داتا صاحب کی نیاز کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ روزی میں سے غیر اللہ کا حصہ نکالنے والی بات ہے، اللہ تعالیٰ نے ایسے مشرکانہ عقیدہ کی سخت تردید فرمائی ہے۔ (معالم العرفان فی دروس القرآن، ج ۱۱ ص ۵۵۱۔ ۵۵۲، مکتبہ دروس القرآن، گوجرانوالہ، ۱۴۳۴ھ)

میں کہتا ہوں کہ مسلمان حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کو ثواب پہنچانے کے لیے دودھ کا صدقہ کرتے ہیں، یا گیارہ تاریخ کو ایصالِ ثواب کے لیے بکرے یا دنبے کو صدقہ کرتے ہیں اور بزرگوں کے لیے اور فوت شدہ مسلمانوں کے لیے ایصالِ ثواب کرنا جائز ہے۔ مسلمانوں کے اس جائز فعل پر مشرکانہ افعال کو منطبق کرنا بہت بڑا ظلم ہے اور بدگمانی اور تعصب کی انتہاء ہے، خود شیخ سواتی لکھتے ہیں:

فوت شدگان کے لیے صدقہ خیرات اور استغفار کرنا تو جائز ہے تاکہ اللہ تعالیٰ ان چیزوں کا ثواب مرنے والوں کو پہنچائیں اور یہ ملتِ ابراہیمی کا مسلّمہ اصول ہے مگر نذر و نیاز کی مروجہ شکلیں شرک ہیں یا بدعت ہیں۔

(معالم العرفان فی دروس القرآن، ج ۱۱ ص ۵۵۳۔ ۵۵۴، مکتبہ دروس القرآن، گوجرانوالہ، ۱۴۳۴ھ)

میں کہتا ہوں: جب شیخ سواتی نے یہ تسلیم کر لیا کہ فوت شدگان کے لیے صدقہ وخیرات کا ایصالِ ثواب کرنا جائز ہے، تو پھر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے لیے دودھ کا صدقہ کیا جائے، اس کو شرک اور بدعت قرار دینے کی کیا دلیل ہے؟ اور مسلمانوں کے عمل کے اوپر مشرکین کے عمل کو منطبق کرنا محض بے جا تعصب نہیں ہے تو اور کیا ہے! (سعیدی غفرلہ)

کفار کے متعلق نازل شدہ آیات کو مومنین پر چسپاں کرنا خوارج کا طریقہ ہے

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ نظریہ تھا کہ خوارج اللہ تعالیٰ کی بدترین مخلوق ہیں اور انہوں نے کہا: کیونکہ جو آیات کفار کے متعلق نازل ہوئی ہیں، وہ ان آیات کا مومنین پر اطلاق کرتے ہیں۔ (صحیح البخاری، باب قتل الخوارج والملحدین، ص ۱۵۱۹، دار العلم والحدیث، ۱۴۳۶ھ)

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ نے "تہذیب الآثار" کی مسند علی میں اس اثر کی سند موصول کے ساتھ روایت کی ہے از بکیر بن عبداللہ بن الاشج، وہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے نافع سے سوال کیا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی الحروریہ (الخوارج) کے متعلق کیا رائے تھی؟ تو انہوں نے بتایا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی رائے یہ تھی کہ حروریہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے بدترین لوگ ہیں جو آیات کفار کے متعلق نازل ہوئی ہیں وہ ان کا مومنین پر اطلاق کرتے ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں: اس اثر کی سند صحیح ہے اور صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے خوارج کے وصف کے متعلق کہا: وہ بدترین مخلوق ہیں اور امام احمد نے بھی سند جید کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اسی کی مثل مرفوعاً روایت کی ہے۔ اور امام بزار نے از مسروق از حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے خوارج کا ذکر کیا گیا تو آپ

فرمایا: وہ میری امت کے بدترین لوگ ہیں اور میری امت کے بہترین لوگ ان کو قتل کریں گے۔ اس حدیث کی سند حسن ہے۔
(فتح الباری ج ۸ ص ۸۵، دار المعرفہ بیروت، ۱۴۲۶ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور وہ اللہ کے لیے بیٹیاں قرار دیتے ہیں، حالانکہ اللہ اس سے پاک ہیں، اور اپنے لیے بیٹے قرار دیتے ہیں جن کو وہ چاہتے ہیں O'' (النحل: ۵۷)

''وَيَجْعَلُونَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ'': یعنی مشرکین اللہ تعالیٰ کی صفت بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔

''سُبْحٰنَهٗ'': اللہ تعالیٰ اولاد سے منزہ ہیں۔

''وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ'': یعنی اُن کے لیے مذکر اولاد ہے، وہ دوسروں کے لیے بیٹیاں مانتے ہیں اور اپنے لیے بیٹے مانتے ہیں۔ پھر بیان فرمایا کہ وہ اپنے لیے بیٹیوں کو بہت ناپسند کرتے ہیں، پس فرمایا:

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور جب اُن میں سے کسی ایک کو بیٹی پیدا ہونے کی بشارت دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ غم وغصہ سے سیاہ پڑ جاتا ہے، اور وہ اپنے خون کا سا گھونٹ پیتا ہے O'' (النحل: ۵۸)

''وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا'': یعنی جب کفار میں سے کسی ایک کے لیے بیٹی کی بشارت دی جائے تو اس کا چہرہ شرمندگی اور غم سے متغیر ہو جاتا ہے۔ ''وَهُوَ كَظِيْمٌ'': یعنی وہ غم سے پریشان ہوتا ہے اور اپنے غم کو اپنے پیٹ میں گھونٹ بھر بھر کر پیتا ہے۔

اہل المعانی نے کہا ہے کہ چہرہ کا سیاہ پڑنا غم اور افسوس سے کنایہ ہے، اس لیے کہ جب انسان کی خوشی زیادہ ہوتی ہے تو اس کے دل میں کشادگی ہوتی ہے اور اس کی خوشی چاروں طرف پھوٹتی ہے خاص طور پر اس کے چہرہ پر، کیونکہ دل اور دماغ میں شدید تعلق ہے، پس اس کا چہرہ روشن اور چمک دار ہو جاتا ہے اور جب اس کا غم قوی ہوتا ہے تو اس کی روح قلب میں داخل ہو جاتی ہے اور اس کے چہرہ پر کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا، پس اس کا چہرہ زرد یا سیاہ ہو جاتا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اسے جس بیٹی کی پیدائش کی بشارت دی جاتی ہے اس کو برا جاننے کی وجہ سے وہ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے، (اور وہ یہ سوچتا ہے کہ) آیا وہ اس بیٹی کو ذلت کے ساتھ رکھے یا اس کو زندہ مٹی میں دبا دے، سنو! وہ لوگ بہت ہی برا فیصلہ کرتے ہیں O'' (النحل: ۵۹)

''يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ'': اس کے دل میں جو رنج ہے اس کی وجہ سے وہ قوم سے چھپتا ہے، کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنا منہ قوم سے چھپا لیا۔ ''مَا بُشِّرَ بِهٖ'': یعنی اس کو جو بیٹی کی بشارت دی جاتی ہے، اس کی وجہ سے اس کے چہرہ پر کراہیت کے آثار ہوتے ہیں اور وہ اپنے دل میں تدبیریں کرتا ہے کہ اب وہ کیا کرے۔

''اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ'': یعنی وہ جو بیٹی پیدا ہوئی ہے اس کو اپنے پاس ذلت کے ساتھ رکھ لے۔ ''اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ'': یا اس کو مٹی میں دبا دے۔ ''اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ'': سنو! تمہارے دل میں جو یہ منصوبے ہیں، یہ بہت برے ہیں۔ تم اپنے لیے تو

بیٹوں کو پسند کرتے ہو اور اللہ کی طرف بیٹیوں کو منسوب کرتے ہو۔

وہ بدنصیب جو بیٹی کی پیدائش پر پریشان ہوتا ہے، اس سے گلوخلاصی کے لیے طرح طرح کے منصوبے بناتا ہے، اپنے دل میں سوچتا ہے کیا میں ذلت برداشت کرتے ہوئے بیٹی کو روک لوں یا میں اس کو مٹی میں دبا دوں، وہ لوگ بیٹی کو اس لیے باعث ذلت سمجھتے تھے کہ بڑی ہوگی تو اس کی شادی ہوگی، پھر لوگ کہیں گے کہ یہ فلاں کا داماد ہے، وہ یہ نہیں سوچتا کہ وہ بھی تو کسی عورت سے پیدا ہوا ہے، اگر عورت نہ ہوتی تو اس کی پیدائش کب ممکن ہوتی، یہ لوگ خود ساختہ جاہلانہ غیرت کو سینے سے لگائے بیٹھے تھے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ سارا عرب بچیوں کے ساتھ یہ وحشیانہ سلوک نہیں کرتا تھا بلکہ چند قبائل بنو خزاعہ، بنو کنانہ، مضر اور بنو تمیم تھے جو عام طور پر بچیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: قیس بن عاصم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: میں نے زمانۂ جاہلیت میں آٹھ بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیا تھا، آپ نے فرمایا: ہر بیٹی کی طرف سے ایک غلام آزاد کرو، انہوں نے کہا: یارسول اللہ! میرے پاس تو اونٹ ہیں، آپ نے فرمایا: ہر بیٹی کی طرف سے ایک اونٹ نحر (ذبح) کرو۔

(المعجم الکبیر ج ۱۸ ص ۳۳۷، رقم الحدیث: ۸۶۳، مسند البزار: ۲۲۸۰، السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۸ ص ۱۶، کنز العمال رقم الحدیث: ۳۶۹۰، حافظ الہیثمی نے کہا ہے کہ امام بزار کی سند صحیح ہے، سوا حسین بن مہدی کے اور وہ بھی ثقہ ہے، مجمع الزوائد ج ۷ ص ۱۳۴)

روایت ہے کہ ایک شخص نے کہا: یارسول اللہ! میں نے جب سے اسلام قبول کیا ہے میں نے اسلام کی مٹھاس نہیں محسوس کی، زمانۂ جاہلیت میں میری ایک بیٹی تھی، میں نے اپنی بیوی سے کہا: اس کو بناؤ سنگھار کر کے مزین کرو، پھر میں اس کو بہت دور دراز وادی میں لے گیا جہاں ایک گہرا کنواں تھا، میں نے اس کو اس کنویں میں ڈال دیا، اس بیٹی نے کہا: اے ابا جان! آپ نے مجھے قتل کر دیا، مجھے اس کی جب بھی یہ بات یاد آتی ہے مجھے کسی چیز سے راحت نہیں ملتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زمانۂ جاہلیت میں جو گناہ ہوئے تھے ان کو اسلام نے منہدم کر دیا اور جو گناہ اسلام میں ہوں گے ان کو استغفار منہدم کر دے گا۔

(تفسیر کبیر ج ۷ ص ۲۲۵۔۲۲۶، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ، تفسیر خازن، ج ۳ ص ۸۲، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۱۰ء، روح المعانی جز ۱۴ ص ۲۵۰، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۷ھ، تفسیر غرائب القرآن ورغائب الفرقان ج ۴ ص ۲۷۱، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۶ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے، ان کے لیے بہت ہی بری مثال ہے اور اللہ ہی کے لیے بلند صفات ہیں، اور وہ سب پر غالب، سب سے زیادہ حکمت والے ہیں O'' (النحل:۶۰)

''لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ'': یعنی مشرکین۔ ''مَثَلُ السَّوْءِ'': یعنی اُن کے برے کاموں کی جزا آخرت میں دوزخ ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اُن کے برے کاموں کا انجام آخرت میں دوزخ ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اُن کے خود ساختہ معبودوں کی بری صفت ہے، وہ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں۔

''وَلِلَّهِ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ'': اور اللہ تعالیٰ کی بلند صفات ہیں اور وہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ۔ اور ''لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۖ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ⊙ (الشوریٰ:۱۱)'' (ان کی مثل کوئی چیز نہیں ہے اور وہ سب کچھ سننے والے، سب کچھ دیکھنے والے ہیں۔ ''لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ۞ وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ ⊙ (اخلاص:۳۔۴)'' (نہ ان کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ

کسی کی اولاد ہیں O اور کوئی ان کے برابر نہیں O)۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بلند صفات ہیں۔

"وَهُوَ الْعَزِيْزُ": اور وہ اپنی سلطنت میں سب پر غالب ہیں۔

"الْحَكِيْمُ" یعنی اُن کے تمام احکام حکمت پر مبنی ہیں۔ (تفسیر السمرقندی ج ۲ ص ۲۳۸۔۲۳۹، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۳ھ)

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۶۱﴾

اور اگر اللہ لوگوں کو اُن کے ظلم کی وجہ سے (فوراً) پکڑتے تو وہ روئے زمین پر کسی جاندار کو نہ چھوڑتے، لیکن اللہ لوگوں کو اُن کی مقرر مدت تک مہلت دیتے ہیں، پھر جب اُن کا وقتِ مقرر آ جائے گا تو وہ ایک لمحہ بھی پیچھے نہیں ہو سکیں گے اور نہ وہ اس وقتِ مقرر سے پہلے (دنیا سے) جا سکتے ہیں O

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ۗ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ﴿۶۲﴾

اور یہ مشرکین اللہ کے لیے (اس اولاد کو) ثابت کرتے ہیں جس کو اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں، اور اُن کی زبانیں یہ جھوٹ بولتی ہیں کہ انہی کے لیے آخرت میں اچھائی ہے، یقیناً اُن کے لیے آخرت میں دوزخ کی آگ ہے اور ان کو سب سے پہلے اس میں بھیجا جائے گا O

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾

اللہ کی قسم! ہم نے آپ سے پہلے متعدد امتوں کی طرف رسول بھیجے، پس شیطان نے اُن امتوں کے اعمال اُن کے لیے خوش نما بنا دیے، سو آج وہی ان کا دوست ہے اور انہی کے لیے دردناک عذاب ہے O

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۶۴﴾

اور (اے رسولِ اکرم!) ہم نے آپ پر قرآن صرف اس لیے نازل فرمایا ہے تاکہ آپ لوگوں کو وہ چیزیں بیان کر دیں جن میں لوگ اختلاف کرتے ہیں، اور اس لیے کہ وہ قرآن ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے O

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۗ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ

لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿٦٥﴾

اور اللہ نے آسمان سے بارش نازل فرمائی، پس اس بارش سے زمین کو مُردہ ہونے کے بعد سبزہ سے زندہ فرما دیا، بے شک اس (طریقہ) میں غور سے سننے والے لوگوں کے لیے ضرور اللہ کی قدرت پر نشانی ہے ۝

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور اگر اللہ لوگوں کو اُن کے ظلم کی وجہ سے (فوراً) پکڑتے تو وہ روئے زمین پر کسی جاندار کو نہ چھوڑتے، لیکن اللہ لوگوں کو اُن کی مقرر مدت تک مہلت دیتے ہیں، پھر جب اُن کا وقتِ مقرر آجائے گا تو وہ ایک لمحہ بھی پیچھے نہیں ہو سکیں گے اور نہ وہ اس وقتِ مقرر سے پہلے (دنیا سے) جا سکتے ہیں ۝'' (النحل: ٦١)

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی شافعی متوفی ٦٠٦ھ، النحل: ٦١ تا ٦٥ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ'': اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے کفار کے سنگین جرائم بیان فرمائے اور اُن کے قبیح ترین اقوال بیان فرمائے، اب یہ بیان فرما رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم اور اپنی رحمت کے اظہار کے لیے اُن کفار کو مہلت دیتے ہیں اور اُن کے جرائم پر عجلت سے گرفت نہیں فرماتے۔ اور اس آیت میں متعدد مسائل ہیں:

انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے خلاف معتزلہ کی دلیل

(١) ان طعنہ زن لوگوں نے کہا: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو ظالم قرار دیا ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ظلم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے، اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر انسان گناہ اور معصیت کا مرتکب ہے اور انبیاء علیہم السلام بھی انسانوں میں سے ہیں، پس ضروری ہوا کہ وہ بھی گناہ اور معصیت کرنے والے ہوں۔

(٢) اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ فوراً گرفت فرماتے تو زمین پر کسی جاندار کو نہ چھوڑتے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہر جاندار جو زمین پر ہے وہ ظلم اور گناہ کرنے والا ہے حتیٰ کہ ہر ظالم کو فنا کرنے سے تمام انسانوں کا فنا کرنا لازم آئے، لیکن جب ہم یہ کہیں کہ انبیاء علیہم السلام سے کوئی گناہ صادر نہیں ہوا تو پھر اُن کا فنا کرنا لازم نہیں ہوگا، اور اس وقت ہر ظالم کے فنا کرنے سے تمام انسانوں کا فنا کرنا لازم نہیں آئے گا، اور روئے زمین کے اوپر کوئی جاندار باقی نہیں رہے گا۔ اور جب یہ لازم ہے یعنی کسی وقت میں زمین پر کوئی جاندار باقی نہیں رہے گا تو ہم نے جان لیا کہ ہر بشر ظالم ہے خواہ وہ انبیاء میں سے ہوں یا نہ ہوں۔

ہر بشر کا ظالم ہونا قرآن مجید کی اُن آیات کے خلاف ہے جن میں یہ تصریح ہے کہ بعض انسان نیکوکار بھی ہوتے ہیں

دلیل سے ثابت ہے کہ تمام انسان ظالم نہیں ہیں، کیونکہ اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا ہے: ''ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿٣٢﴾

(فاطر: ۳۲) "(پھر ہم نے (آپ کی امت میں سے) اُن لوگوں کو قرآن کا وارث بنایا جنھیں ہم نے اپنے بندوں میں سے منتخب فرما لیا، پس ان میں سے کوئی تو اپنی جان پر ظلم کرنے والا ہے، کوئی میانہ روی اختیار کرنے والا اور کوئی اللہ کے حکم سے نیکیوں کی طرف سبقت کرنے والا ہے، اس قرآن کا عطا فرمانا عظیم احسان ہے O)۔ یعنی بعض ایسے بندے ہیں جو اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض ایسے بندے ہیں جو درمیانہ روش پر چلنے والے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو نیکیوں میں سبقت کرنے والے ہیں، اور اگر میانہ روی پر چلنے والے اور نیکیوں میں سبقت کرنے والے بھی ظالم ہوتے تو پھر یہ تقسیم فاسد ہو جاتی، پس ہم کو معلوم ہو گیا کہ میانہ روی پر چلنے والے اور نیکیوں پر سبقت کرنے والے ظالم نہیں ہیں، پس اس دلیل سے ثابت ہو گیا کہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ تمام مخلوق ظالم ہے۔

اور جب یہ ثابت ہو گیا تو "وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ" میں جو "النَّاسَ" کا ذکر ہے، اس سے مراد ہر نافرمانی کرنے والا اور عذاب کا مستحق ہے۔ یا وہ لوگ مراد ہیں جن کا پہلے مشرکین میں سے ذکر ہو چکا ہے، جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹیوں کو ثابت کیا ہے، اور اس لحاظ سے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی عصمت پر جو طعن کیا ہے وہ ساقط ہو جائے گا۔

ظلم اور معصیت کا اللہ تعالیٰ کا فعل نہ ہونے پر معتزلہ کی دلیل

المعتزلہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ ظلم اور معصیت اللہ تعالیٰ کا فعل نہیں ہے بلکہ یہ بندوں کے فعل ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے ظلم کو بندوں کی طرف منسوب فرمایا ہے اور اپنی طرف منسوب نہیں فرمایا، پس فرمایا: "وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ" (اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو اُن کے ظلم کی وجہ سے پکڑ لیتے)۔ پس اگر یہ ظلم اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہوتا تو اس ظلم پر بندوں کا مواخذہ کرنا اللہ تعالیٰ کا ظلم ہوتا، اور جب اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کو ظلم کرنے سے منع فرمایا ہے تو اللہ تعالیٰ کا ظلم سے منزہ ہونا بہ طریق اولیٰ ہوگا۔ اور یہ آیت اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ بندوں کے اعمال ثواب اور عذاب کے وجود میں مؤثر ہوتے ہیں۔ ہم نے ان مسائل پر متعدد مرتبہ بحث کی ہے، لہٰذا اب ہم اس کا اعادہ نہیں کریں گے۔

مصنف کی طرف سے معتزلہ کی دلیل کا جواب

ہر چند کہ امام رازی نے یہاں پر معتزلہ کے اعتراض کا جواب نہیں دیا، لیکن میں کہتا ہوں کہ معتزلہ کا جواب آسان ہے، کیونکہ معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ اگر ظلم اور معصیت اللہ تعالیٰ کا فعل ہو تو لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ ظلم اور معصیت کو پیدا فرماتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اس سے منزہ ہیں کہ وہ ظلم اور معصیت کو پیدا فرمائیں، اس لیے یہ ماننا ضروری ہے کہ ظلم اور معصیت اللہ تعالیٰ کا فعل نہیں ہے بلکہ بندوں کا فعل ہے، اور بندے خود اس فعل کو صادر کرتے ہیں، لیکن معتزلہ کا یہ کہنا غلط ہے، کیونکہ ہر چیز کے خالق اللہ تعالیٰ ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ" ۔۔۔ (الانعام: ۱۰۲) "(یہ ہیں اللہ جو تمہارے رب ہیں، ان کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، وہ ہر چیز کے پیدا فرمانے والے ہیں)۔ نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ۝" (الصافات: ۹۶) "(اور اللہ نے تمھیں بھی پیدا فرمایا ہے اور تمہارے اعمال کو بھی پیدا فرمایا ہے O)۔

اب رہا یہ سوال کہ اعمال نیک ہوں یا بد، اچھے ہوں یا برے، سب کے خالق اللہ عزوجل ہیں تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں برے اعمال کی مذمت فرماتے ہیں اور آخرت میں برے اعمال پر سزا دیں گے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تمام اعمال کے خالق تو اللہ عزوجل ہیں، لیکن اعمال کا کسب بندے کرتے ہیں، کسب کا معنی یہ ہے کہ بندہ جس کام کو کرنا چاہتا ہے اللہ تعالیٰ اس میں وہ کام پیدا فرما دیتے ہیں، پس خلق اللہ عزوجل کا ہے اور کسب بندے کا ہے اور دنیا میں برے کاموں پر جو مذمت ہوتی ہے اور آخرت میں جو اُن پر عذاب ہوگا، وہ بندوں کے کسب کے اعتبار سے ہوگا۔ لہٰذا یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ بندے اپنے افعال کے خود خالق ہوتے ہیں، کیونکہ یہ قول قرآن مجید کی آیت الانعام:۱۰۲ اور الصافات:۹۶ کے خلاف ہے۔ (سعیدی غفرلہ)

لوگوں کے ظلم اور نافرمانی کرنے کی وجہ سے تمام چوپایوں کو ہلاک کرنے پر اعتراض

"وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ": (اور اگر اللہ لوگوں کو اُن کے ظلم کی وجہ سے (فوراً) پکڑتے تو روئے زمین پر کسی جاندار کو نہ چھوڑتے)۔

اس آیت کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے ظلم کرنے کی وجہ سے تمام دواب (چوپایوں) کو ہلاک کر دیا جائے گا، اور یہ جائز نہیں ہے، کیونکہ دابۃ (چوپائے) سے کوئی گناہ صادر نہیں ہوا، پس لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے تمام چوپایوں کو ہلاک کرنا کس طرح جائز ہوگا؟

لوگوں کی نافرمانی کی وجہ سے تمام چوپایوں کو ہلاک کرنے کی توجیہات

(۱) ابوعلی الجبائی المعتزلی نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اس آیت سے مراد یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کے کفر اور معصیت کی وجہ سے فوراً اُن کو ہلاک فرما دیتے تو اس وقت اُن کی نسل باقی نہ رہتی۔ اور یہ معلوم ہے کہ ہر شخص کے آباء واجداد میں ضرور کوئی نہ کوئی ایسا تھا جو عذاب کا مستحق تھا، اور جب وہ سب ہلاک ہو جاتے تو اُن کی نسل باطل ہو جاتی۔ اور اس سے یہ لازم آتا کہ اس جہان میں انسانوں میں سے کوئی باقی نہ رہتا۔ اور جب انسان باقی نہ رہتے تو پھر چوپائے بھی باقی نہ رہتے، کیونکہ چوپایوں کو انسانوں کے منافع اور مصالح کی وجہ سے پیدا فرمایا ہے۔ اور جب انسان ہی نہ رہے تو اُن کے منافع کے لیے چوپایوں کی بھی ضرورت نہیں رہے گی، لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کے کفر اور معصیت کی وجہ سے اُن کو فوراً ہلاک فرما دیتے تو پھر زمین کے اوپر کوئی چوپایہ باقی نہ رہتا، اور یہ بہت لطیف اور حسین جواب ہے۔

(۲) جب ظالموں کو ہلاک کیا جاتا تو تمام لوگ اور چوپائے بھی ہلاک ہو جاتے، تو ظالموں کے حق میں یہ ہلاکت عذاب ہے اور دوسروں کے حق میں یہ ہلاکت امتحان ہے اور حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں ایسا ہی واقع ہوا۔

(۳) اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کی معصیت کی وجہ سے فوراً اُن کو پکڑ لیتے تو پھر بارش نہ ہوتی، اور جب بارش نہ ہوتی تو سبزہ پیدا نہ ہوتا، اور جب سبزہ پیدا نہ ہوتا تو چوپائے بھوک سے مر جاتے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک مرد کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ظالم صرف اپنی جان کو نقصان پہنچاتا ہے، تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: کیوں نہیں! (اس کے ظلم کی وجہ سے دوسروں کو بھی نقصان پہنچتا ہے)۔ اللہ کی قسم! سرخاب (ایک پرندہ) ظالم کے ظلم کی وجہ سے اپنے گھونسلے میں بھوک سے مر جاتا ہے۔ (شعب الایمان للبیہقی: ۷۰۷۵)

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عنقریب ابن آدم کے گناہ کی وجہ سے سیاہ بھونرا اپنے بل میں ہلاک ہو جائے گا۔
(تفسیر عبدالرزاق:۲۳۵۲)

یہ تینوں جواب اس پر مبنی ہیں کہ دوآب سے مراد تمام جاندار ہیں۔

(۴) "مَا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ": اس آیت میں "دَآبَّةٍ" سے مراد کافر ہیں، یعنی اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کی معصیت کی وجہ سے فوراً پکڑ لیتے تو وہ روئے زمین پر کسی کافر کو نہ چھوڑتے۔ اور "دَآبَّةٍ" سے کافر مراد ہونے پر یہ آیت دلیل ہے: "اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ" (الاعراف:۱۷۹) "(یہ لوگ چوپایوں کی مثل ہیں بلکہ ان سے (بھی) زیادہ گمراہ ہیں اور یہی لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں O)۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کو چوپائے قرار فرمایا ہے۔

"وَلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى": (لیکن اللہ لوگوں کو اُن کی مقرر مدت تک مہلت دیتے ہیں)۔ تاکہ لوگوں میں توالد اور تناسل ہوتا رہے۔

"اَجَلٍ مُّسَمًّى" کے مصداق میں مفسرین کے اقوال

(۱) عطاء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے کہا: اس "اجل" سے مراد قیامت کی مدت ہے۔

(۲) اس اجل سے مراد عمر کی انتہاء ہے۔

پہلے قول کی توجیہ یہ ہے کہ سب سے بڑا عذاب قیامت کے دن آئے گا اور دوسرے قول کی توجیہ یہ ہے کہ مشرکین کو اس وقت سزا دی جائے گی جب اُن کی عمر پوری ہو جائے گی اور وہ دنیا سے چلے جائیں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور یہ مشرکین اللہ کے لیے (اس اولاد کو) ثابت کرتے ہیں جس کو اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں، اور اُن کی زبانیں یہ جھوٹ بولتی ہیں کہ انہی کے لیے آخرت میں اچھائی ہے، یقیناً اُن کے لیے آخرت میں دوزخ کی آگ ہے اور ان کو سب سے پہلے اس میں بھیجا جائے گا O" (النحل:۶۲)

"وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ": یعنی جن بیٹیوں کو وہ اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں، ان کی اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ "وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى": "الْحُسْنٰى" کے مصداق کے متعلق تین اقوال ہیں:

(۱) اس سے مراد بیٹے ہیں، کیونکہ انہوں نے کہا کہ اللہ کے لیے بیٹیاں ہیں اور ہمارے لیے بیٹے ہیں۔

(۲) وہ اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹیوں کی نسبت کرنے کے باوجود اپنی یہ صفت بیان کرتے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے ساتھ کامیاب ہو گئے اور اس قول کی وجہ سے وہ سمجھتے تھے کہ وہ دینِ حق اور مذہبِ حسن پر ہیں۔

(۳) انہوں نے اپنے نفسوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت اور ثواب کو ثابت کیا۔

اگر یہ کہا جائے کہ مشرک یہ کیسے کہہ سکتے تھے حالانکہ وہ تو قیامت کے منکر ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ تمام مشرکین قیامت کے منکر نہیں تھے، کیونکہ کہا گیا ہے کہ عرب میں بعض وہ لوگ ہیں جو مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے اور قیامت کا اقرار کرتے ہیں، اسی وجہ سے وہ مردہ اونٹ کو میت کی قبر کے پاس باندھ دیتے تھے اور اس اونٹ کو مرنے

تک وہیں چھوڑے رکھتے تھے اور وہ کہتے تھے کہ اس میت کا جب حشر ہوگا تو وہ اس اونٹ پر سوار ہو کر میدانِ حشر میں جائے گا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ مشرکین قیامت کے منکر تھے تو ہو سکتا ہے انہوں نے اس لیے کہا ہو کہ اگر (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے کے دعویٰ میں سچے ہیں تو جس دین پر ہم قائم ہیں اس دین کی وجہ سے ہم کو جنت ملے گی اور ثواب ملے گا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کا رد فرمایا: ''لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ'': پس اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس قول کا رد فرمایا کہ اُن کو جنت ملے گی اور اُن کے لیے دوزخ کی آگ کو ثابت فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ انہوں نے از خود یہ دعویٰ کیا تھا کہ اُن کو جنت ملے گی۔

''وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ'': الفراء نے کہا: اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنی جانوں پر زیادہ گناہ کر کے افراط کرنے والے ہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھ کر افراط کیا۔

یہ اس صورت میں ہے کہ اس آیت میں راء کے نیچے زیر ہو یعنی وہ افراط کرنے والے ہیں۔

اور اگر راء کے اوپر زبر ہو یعنی ''مُفْرَطُوْنَ'' تو اس کا معنی ہے: اُن کو سب سے پہلے دوزخ میں بھیجا جائے گا۔

الواحدی نے کہا: اس کا معنی ہے انہیں عجلت کے ساتھ دوزخ میں بھیجا جائے گا۔ اس تقدیر پر معنی یہ ہے کہ ان کفار کو دوزخ کی طرف بھیجا جائے گا تو وہ بعد میں دوزخ میں بھیجے جانے والوں کے لیے پیشوا ہوں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اللہ کی قسم! ہم نے آپ سے پہلے متعدد امتوں کی طرف رسول بھیجے، پس شیطان نے اُن امتوں کے اعمال اُن کے لیے خوش نما بنا دیے، سو آج وہی ان کا دوست ہے اور انہی کے لیے دردناک عذاب ہے O'' (النحل: ۶۳)

''تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ'': اللہ تعالیٰ نے یہ بتلایا ہے کہ مشرکین قریش نے جو کچھ کیا ہے، انبیاء سابقین کے ساتھ بھی اس قسم کے کفار کا معاملہ ہو چکا ہے، اور یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے قائم مقام ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قوم کی جہالات کی وجہ سے رنج اور غم ہوتا تھا۔

''فَزَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ'': (پس شیطان نے اُن امتوں کے اعمال اُن کے لیے خوش نما بنا دیے)۔

المعتزلہ نے کہا ہے کہ یہ آیت المجبرہ کے قول کے فساد پر کئی وجوہ سے دلالت کرتی ہے:

(۱) اگر اللہ تعالیٰ بندوں کے اعمال کے خالق ہوں تو شیطان کے بندوں کے افعال کو خوش نما بنانے کا کیا فائدہ ہے؟

(۲) اگر بندوں کے اعمال کو خوش نما بنانا اللہ تعالیٰ کا فعل ہے تو پھر شیطان کی تزئین کے سبب سے مذمت کی کیا وجہ ہے؟

(۳) یہ تزئین ہی بندے کو فعل کے کرنے کی دعوت دیتی ہے، اور جب بندوں کے افعال اللہ تعالیٰ کی تخلیق سے ہیں تو ان افعال کا واقع ہونا ضروری ہوگا، پھر اُن افعال کی تزئین کر کے دعوت دینے کی کوئی وجہ نہیں۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے اس تزئین کی نسبت شیطان کی طرف فرمائی ہے، اور اگر مزین اللہ تعالیٰ ہوں تو پھر شیطان کی طرف اس کی اضافت جھوٹ ہوگی۔

برے کاموں کو خوش نما بنانے کے اعتراض پر امام رازی کا جواب

اس کا جواب یہ ہے کہ کفار کی آنکھوں میں برے کاموں کو خوش نما بنانے والا شیطان ہے، تو شیطان کی آنکھوں میں ان برے کاموں کو خوشنما بنانے والا کون ہے، اگر وہ کوئی اور شیطان ہے تو اس کی آنکھوں میں کس نے برے کاموں کو خوش نما بنایا ہے، پھر تسلسل لازم آئے گا، اس لیے کہنا پڑے گا کہ ان برے کاموں کو خوش نما بنانے والے اللہ تعالیٰ ہیں اور یہی مطلوب ہے۔

برے کاموں کو خوش نما بنانے کے اعتراض پر مصنف کا جواب

میں کہتا ہوں کہ حقیقت میں ان برے کاموں کو بدکاروں کی آنکھوں میں خوش نما بنانے والے اللہ تعالیٰ ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کے خالق ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کا بدکاروں کے لیے ان برے کاموں کو خوش نما بنانا قابل اعتراض نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ مالک ہیں اور مالک اپنی سلطنت میں جو کارروائی کریں ان پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ ۝ (الانبیاء: ٢٣)" (اللہ جو کچھ کرتے ہیں اس پر ان سے باز پرس نہیں ہو سکتی جب کہ مخلوق سے برے کیے ہوئے کام کے متعلق پوچھا جائے گا O)۔ نیز میں کہتا ہوں کہ اگر یہ سوال کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ بدکاروں کی آنکھوں میں برے کاموں کو خوش نما بناتے ہیں، اس کی کیا حکمت ہے؟ تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی حکمت یہ ہے کہ لوگوں کو اس آزمائش میں ڈالا جائے کہ برے کام جب بہ ظاہر خوش نما ہوں تو بندے اُن کی ظاہری خوش نمائی سے متاثر ہو کر ان کاموں کو ترک کرتے ہیں یا اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے اُن کاموں کو ترک کر دیتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بہر حال اُن کاموں سے منع فرمایا ہے۔ اس کی ایک نظیر یہ ہے کہ جو شخص شوگر کا مریض ہو تو انواع واقسام کی لذیذ مٹھائیاں اس کو کھانے کی دعوت دیتی ہیں لیکن جس کو یہ معلوم ہو کہ شوگر کے مرض میں ان مٹھائیوں کا کھانا انجام کار سخت نقصان دہ ہے تو وہ ان مٹھائیوں کو نہیں کھائے گا، تو اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بدکاروں کی آنکھوں میں برے کاموں کو خوش نما بنا دیا ہے کہ آیا لوگ اِن کی ظاہری خوش نمائی کو دیکھ کر ان کا ارتکاب کرتے ہیں یا اللہ عزوجل کے خوف کی وجہ سے اُن برے کاموں کو ترک کر دیتے ہیں، پھر جو اُن برے کاموں کو خوف الٰہی کی وجہ سے ترک کرے، اس کی اللہ تعالیٰ دنیا میں تحسین فرماتے ہیں اور آخرت میں اجر وثواب عطا فرماتے ہیں۔ اور جو اِن برے کاموں کا ارتکاب کر لیتا ہے تو اس کی دنیا اور آخرت میں مذمت ہے اور آخرت کے عذاب کا خطرہ ہے۔ (سعیدی غفرلہ)

"فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ": اس آیت کے متعلق دو احتمال ہیں:

(١) ان سے مراد کفار مکہ ہیں اور ان کے ولی سے مراد شیطان ہے، شیطان ان کو بہکاتا ہے اور ان کو ہدایت سے دور کر دیتا ہے جیسے اس سے پہلی امتوں کے کفار نے ایسا ہی کیا، اس تقریر پر یہ آیت گزشتہ امتوں سے لے کر کفار مکہ تک کے متعلق ہے۔

(٢) اس آیت میں "اَلْيَوْمَ" سے مراد قیامت کا دن ہے، یعنی جن کفار کے لیے شیطان اُن کے اعمال کو خوش نما بناتا ہے وہ اُن لوگوں کا قیامت کے دن ولی (دوست) ہو گا۔ اور "اَلْيَوْمَ" سے قیامت کا دن مراد لینا اس وجہ سے ہے کہ "اَلْيَوْمَ" سے مشہور مراد قیامت کا دن ہے۔ اور اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ کفار کے لیے قیامت کے دن کوئی ولی نہیں ہو گا یعنی کوئی مددگار نہیں ہو گا، کیونکہ جب کفار عذاب کا معائنہ کریں گے اور شیطان بھی انہی کے ساتھ نازل کیا جائے گا اور کفار دیکھ لیں گے کہ آج شیطان اُن کو اس عذاب سے

نجات نہیں دے سکتا تو بہ طور توبیخ فرمایا کہ آج کے دن یہ تمہارا ولی ہے؟ پھر اس شدید وعید کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حجت قائم فرمائی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور (اے رسولِ اکرم!) ہم نے آپ پر قرآن صرف اس لیے نازل فرمایا ہے تاکہ آپ لوگوں کو وہ چیزیں بیان کر دیں جن میں لوگ اختلاف کرتے ہیں، اور اس لیے کہ وہ قرآن ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے O'' (النحل: ۶۴)

''وَمَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ'': اس آیت کی تفسیر میں کئی مسائل ہیں:

جن مسائل میں مختلف مذاہب والے اختلاف کرتے تھے ان میں اللہ تعالیٰ کے حکم اور ان کے منشاء کو بیان فرمانا

ہم نے اس قرآن کو آپ پر اس لیے نازل فرمایا ہے تاکہ آپ لوگوں کو قرآن مجید کے بیانات کے واسطہ سے اُن چیزوں کو بیان کریں جن میں یہ لوگ اختلاف کرتے تھے، اور اختلاف کرنے والے اهل الملل والاهواء ہیں، اور جس چیز میں انہوں نے اختلاف کیا وہ دین ہے مثلاً توحید، شرک، الجبر، القدر، اور مرنے کے بعد اٹھنا اور اس کی نفی کرنا، اور احکام میں اس کی مثال ہے کہ انہوں نے کئی حلال چیزوں کو حرام قرار دیا جیسے البحیرہ اور السائبہ وغیرہ، اور کئی حرام چیزوں کو حلال قرار دیا جیسے مردار کے کھانے کو انہوں نے حلال قرار دیا۔

میں کہتا ہوں کہ لوگ عقائد میں بھی اختلاف کرتے تھے اور اعمال فرعیہ میں بھی اختلاف کرتے تھے۔ عقائد میں اُن کا اختلاف یہ تھا کہ بعض توحید کا اقرار کرتے تھے اور بعض توحید کی نفی کرتے تھے اور اعمال فرعیہ میں اختلاف یہ تھا کہ جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے ان کو یہ حرام قرار دیتے تھے جیسے السائبہ وغیرہ، اور جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے جیسے مردار کو کھانا، ان کو یہ حلال قرار دیتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر قرآن مجید کے ذریعہ ان کی اختلاف کی ہوئی چیزوں میں اللہ تعالیٰ کے حکم کو بیان فرمایا۔ (سعیدی غفرلہٗ)

''وَهُدًى وَّرَحۡمَةً لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ'':

اس آیت میں فرمایا ہے کہ قرآن مجید ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے اور جب کہ دوسری جگہ فرمایا ہے: ''هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الۡهُدٰى وَالۡفُرۡقَانِ ۔ (البقرہ: ۱۸۵)'' (جو لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور (اس میں) ایسے واضح دلائل ہیں جو حق اور باطل کے درمیان فرق کرتے ہیں)۔ بہ ظاہر ان دونوں آیتوں میں تعارض ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ فی نفسہٖ قرآن مجید تمام لوگوں کے لیے ہدایت ہے لیکن اس ہدایت سے چونکہ فائدہ ایمان والے اٹھاتے تھے اس لیے یہاں فرمایا کہ یہ قرآن ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور اللہ نے آسمان سے بارش نازل فرمائی، پس اس بارش سے زمین کو مُردہ ہونے کے بعد سبزہ سے زندہ فرما دیا، بے شک اس (طریقہ) میں غور سے سننے والے لوگوں کے لیے ضرور اللہ کی قدرت پر نشانی ہے O'' (النحل: ۶۵)

"وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَاؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ":
ہم نے کئی دفعہ ذکر کیا ہے کہ اس قرآن عظیم سے مقصود اعظم چار اصولوں کو ثابت کرنا ہے:
(۱) الٰہیات (۲) نبوات (۳) معاد (۴) قضاء اور قدر کا اثبات۔
یہی وجہ ہے کہ جب کسی بحث میں کفار کی وعید کا ذکر کیا جائے تو اللہ تعالیٰ پھر الٰہیات کی تقریر کی طرف رجوع فرماتے ہیں، اور ہم نے اس سورت کی ابتداء میں بتایا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ الٰہیات کے دلائل ذکر فرماتے ہیں تو اجرام فلکیہ سے ابتدا فرماتے ہیں، پھر دوسری بار انسان کا ذکر فرماتے ہیں اور تیسری بار حیوان کا ذکر فرماتے ہیں اور چوتھی بار زمین کی پیداوار کا ذکر فرماتے ہیں، اور پانچویں بار سمندر اور زمین کے احوال ذکر فرماتے ہیں، پس یہاں پر جب اللہ عزوجل الٰہیات کے دلائل کی طرف لوٹے تو پہلے فلکیات کا ذکر فرمایا، پس فرمایا: "وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا"، اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان کو ایسے طریقے سے پیدا فرمایا کہ اس سے بارش نازل ہوتی ہے اور اس بارش کو زمین کی حیات کا سبب بنادیا اور زمین کی حیات سے مراد اس میں کھیتیوں کا پیدا فرمانا ہے اور درختوں کا اور کلیوں کا اور پھلوں کا پیدا فرمانا ہے۔ اور ان دلائل کی تقریر ہم کئی بار ذکر کر چکے ہیں۔
"اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ": یعنی جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات کو انصاف کے ساتھ سنیں اور اس میں تدبر کریں، کیونکہ جس نے اپنے دل سے نہیں سنا تو وہ گویا کہ بہرہ ہے، اس نے نہیں سنا۔

(التفسیر الکبیر، ج ۷، ص ۲۲۷-۲۳۱، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

وَاِنَّ لَكُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةًؕ نُسْقِیْكُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَیْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآىٕغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ (۶۶)

اور بے شک تمہارے لئے چوپایوں میں (ہماری قدرت پر) ضرور نشانی ہے، ہم تمہیں اُن کے پیٹوں میں گوبر اور خون کے درمیان سے (نکال کر) خالص دودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کے گلوں سے آسانی سے اترنے والا ہے۔

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِیْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًاؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (۶۷)

اور کھجور کے درختوں کے پھلوں سے اور انگوروں کی بیلوں کے پھلوں سے تم نشہ آور مشروب بناتے ہو اور پاکیزہ رزق بھی بناتے ہو، بے شک اس میں عقل سے کام لینے والوں کے لیے ضرور نشانی ہے۔

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَۙ (۶۸)

اور (اے رسول اکرم!) آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈالی کہ تو پہاڑوں میں اور درختوں میں اور چھپروں میں

گھر (چھتہ) بنانا ○

ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۶۹﴾

پھر تو ہر قسم کے پھلوں کا رس چوس، پس اپنے رب کے بنائے ہوئے ہموار راستوں پر چلتی رہ ان کے پیٹوں میں سے مختلف رنگ کے شروب نکلتے ہیں جن میں لوگوں کے لیے شفاء ہے، بے شک اس میں غور وفکر کرنے والے لوگوں کے لیے ضرور نشانی ہے ○

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ ۛ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْــًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴿۷۰﴾ ع

اور اللہ نے تم کو پیدا فرمایا، پھر وہ تمہاری روح قبض فرما کر تم کو وفات دیں گے، اور تم میں سے کسی کو ناقص ترین عمر (بڑھاپے) کی طرف لوٹایا جاتا ہے تاکہ وہ بہت کچھ جاننے کے باوجود کچھ نہ جان سکے، بے شک اللہ سب سے زیادہ جاننے والے سب سے زیادہ قدرت رکھنے والے ہیں ○

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور بے شک تمہارے لئے چوپایوں میں (ہماری قدرت پر) ضرور نشانی ہے، ہم تمہیں اُن کے پیٹوں میں گوبر اور خون کے درمیان سے (نکال کر) خالص دودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کے گلوں سے آسانی سے اترنے والا ہے ○'' (النحل: ۶۶)

امام ابو منصور محمد بن محمد ماتریدی المتوفی ۳۳۳ھ، النحل: ۶۶ تا ۷۰ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً'': العبرۃ کا معنی ہے الآیۃ، یعنی نشانی۔

تمہارے لیے مویشیوں کو پیدا فرمایا جن میں نشانی ہے۔ اور یہ آیت اس سے پہلے والی آیت کے ساتھ مربوط ہے اور وہ یہ ہے: ''وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا۔ (النحل: ۶۵)'' یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمان سے بارش نازل فرمائی اور چوپایوں کو پیدا فرمایا جن میں تمہارے لیے نشانی ہے۔

ان مویشیوں میں دودھ ہے جو اولاد کی اس وقت میں غذا ہے جس وقت میں وہ چبا کر نہیں کھا سکتے۔ اور چوپایوں کے مالکوں کے لیے بھی اس دودھ میں نفع پیدا فرمایا ہے، اور جن جانوروں کا گوشت نہیں کھایا جاتا ان میں اُن کے مالکوں کے لیے نفع نہیں رکھا جو دودھ سے زائد ہو۔ اور اُن جانوروں میں اُن کی ضرورت سے زیادہ دودھ نہیں رکھا۔

''نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ'': اس آیت میں ''بُطُوْنِهٖ'' فرمایا ہے اور مذکر کی ضمیر ذکر فرمائی ہے، بہ ظاہر مؤنث کی ضمیر ہونی چاہیے تھی، کیونکہ یا تو اس سے جانوروں کی وہ مائیں مراد ہیں جن سے دودھ نکالا جاتا ہے، یا نر جانوروں کی ایک جماعت مراد ہے۔ اور بعض علماء نے یہ جواب دیا ہے کہ مذکر کی ضمیر اس لیے لوٹائی کہ جس سے دودھ حاصل ہوتا ہے وہ اصل میں مذکر ہے۔ اور اس میں

امام ابوحنیفہ اور اُن کے اصحاب رحمہم اللہ کی دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ "لبن الفحل" سے بھی حرمت رضاعت ثابت ہو جاتی ہے۔ یعنی نر جانور کے مادہ کا جفتی کرنے سے جو دودھ حاصل ہوتا ہے۔

"وَمِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ":

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: گوبر اور خون کے درمیان سے دودھ کو نکالنا اس طرح واقع ہوتا ہے کہ جب چارہ جانور کے معدے یا اوجھڑی میں پہنچتا ہے تو گوبر نیچے رہ جاتا ہے اور خون اوپر ہوتا ہے اور دودھ اس کے درمیان ہوتا ہے۔ پھر اُن پر جگر کا عمل جاری ہوتا ہے، وہ خون کو رگوں میں بھیج دیتا ہے اور دودھ کو جانور کے تھن میں بھیج دیتا ہے اور اوجھڑی میں گوبر رہ جاتا ہے۔

اور بعض فلاسفہ نے کہا ہے کہ چارہ جب اوجھڑی میں پہنچتا ہے تو وہ گوبر بن جاتا ہے، پھر اسی چارہ سے خون بنتا ہے، پھر وہ خالص دودھ بن جاتا ہے، جیسے انسان کا نطفہ رحم میں واقع ہوتا ہے، پھر وہ جما ہوا خون بن جاتا ہے، پھر وہ گوشت کی بوٹی بن جاتی ہے، اسی طرح دودھ کا معاملہ ہے۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح بعض فلاسفہ نے کہا ہے کہ چارہ گوبر بن جاتا ہے، پھر وہ چارہ خون بن جاتا ہے، پھر وہ چارہ دودھ بن جاتا ہے۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے صاف ستھرا پاکیزہ دودھ بھی چیزوں کے درمیان سے نکالا ہے، اور اسی طرح کھجور کے درختوں کے پھلوں سے اور انگوروں کی بیلوں سے میٹھا مشروب نکالا جاتا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر دلیل ہے، کیونکہ جو چیز پہلے سوکھی ہوئی لکڑی ہے، اس سے اللہ تبارک وتعالیٰ میٹھے مشروبات نکال لیتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور کھجور کے درختوں کے پھلوں سے اور انگوروں کی بیلوں کے پھلوں سے تم نشہ آور مشروب بناتے ہو اور پاکیزہ رزق بھی بناتے ہو، بے شک اس میں عقل سے کام لینے والوں کے لیے ضرور نشانی ہے O" (النحل: ٦٧)

"وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا": بعض مفسرین نے کہا ہے کہ "السکر" وہ مشروب ہے جو حرام ہے اور "الرزق الحسن" پھلوں کا وہ مشروب ہے جو حلال ہے۔

اور بعض مفسرین نے کہا: "السکر" سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کو پیا جاتا ہے اور الرزق الحسن سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کو کھایا جاتا ہے جیسے کھجور یا انگور۔ اور بعض مفسرین نے کہا: "السکر" حبشیوں کی خمر ہے اور "الرزق الحسن" سے مراد ہے کہ کھجوروں کو پانی میں ڈال کر نبیذ بناتے ہیں۔ اور بعض احادیث میں ہے کہ السکر حرام ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں، آپ نے فرمایا: ہر وہ مشروب جو نشہ آور ہو، حرام ہے۔
(صحیح البخاری: ۲۴۲، ۵۵۸۵، ۵۵۸۶، صحیح مسلم: ۲۰۰۱، الرقم المسلسل: ۵۱۱۳، سنن ابوداؤد: ۳۶۸۲، سنن ترمذی: ۱۸۶۳، سنن نسائی: ۵۵۹۲، سنن ابن ماجہ: ۳۳۸۶، السنن الکبریٰ للنسائی: ۶۸۱۳، مسند ابوداؤد الطیالسی: ۱۴۷۸، مسند الحمیدی: ۲۸۱، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۷ ص ۱۰۰، المنتقی: ۸۵۵، مسند ابویعلیٰ: ۴۵۲۳، صحیح ابن حبان: ۵۳۹۷، سنن بیہقی ج ۱ ص ۸، ج ۸ ص ۲۹۳، شرح السنہ: ۳۰۰۹، مسند احمد ج ۶ ص ۳۶ طبع قدیم، مسند احمد: ۲۳۰۸۲، ج ۴۰ ص ۹۹، مؤسسۃ الرسالہ، بیروت، ۱۴۲۱ھ)

اصمعی نے کہا ہے: الفرث (گوبر) وہ ہے جو اوجھڑی میں ہو، کیونکہ دودھ طعام ہے تو اس طعام سے خون کو علیحدہ کر دیا گیا اور باقی اوجھڑی میں گوبر رہ گیا۔ اور خون سے دودھ کو خالص کر لیا گیا جو پینے میں سہل ہے۔

"اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ": بے شک اس میں عقل سے کام لینے والوں کے لیے ضرور نشانی ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور (اے رسولِ اکرم!) آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈالی کہ تو پہاڑوں میں اور درختوں میں اور چھپروں میں گھر (چھتے) بنا O" (النحل:۶۸)

وحی، الہام اور وسوسہ کی تحقیق

"اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ": بعض مفسرین نے کہا کہ "اَوْحٰى" کا معنی ہے کہ شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات القا فرما دی کہ وہ اُن کاموں کو کرے جن کا ذکر اس کے بعد فرمایا گیا ہے۔ اور الوحی کا معنی ہے: کسی چیز کا ڈالنا، اس کو وحی اس کے سرعتِ وقوع کی وجہ سے کہتے ہیں، اور اس وجہ سے کہ اس کا دلوں میں نفاذ ہو جاتا ہے۔ اور جو چیز دل میں ڈالی جاتی ہے اس کا شعور نہیں ہوتا۔ اور یہ وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے شیطان پر قدرت دی ہے کہ وہ دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ اسی طرح ملائکہ جن چیزوں کا بنی آدم کو الہام کرتے ہیں، بغیر اس کے کہ وہ اس کو جان لیں اور ملحدین کی ایک جماعت ہے جو شیطان کے ڈالے ہوئے وسوسوں کا اور فرشتوں کے ڈالے ہوئے الہام کا انکار کرتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ انسانوں کے اپنے دلوں میں ایسی خواہشات اور آرزوئیں ہیں جو انہیں بعض کاموں پر ابھارتی ہیں اور یہ شیطان کا وسوسہ نہیں ہوتا۔

ان کے رد میں یہ کہا جاتا ہے کہ انسان بعض اوقات ایسی چیزوں کو حاصل کرتا ہے جن کے مطابق وہ پہلے غور و فکر نہیں کرتا ہے نہ پہلے اس کی خواہش ہوتی ہے، پس یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ کسی غیر نے اس کے دل میں کوئی چیز ڈال دی۔ اور نیز یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بشر میں یہ لطف ہے کہ وہ ان کو عبادات کی توفیق عطا فرماتے ہیں اور عبادات پر برانگیختہ فرماتے ہیں، اور بشر کو یہ علم نہیں ہوتا کہ کوئی شخص اُن میں یہ کارروائی کر رہا ہے، اور اسی طرح سے وہ نافرمانیاں اور جرائم ہیں جن کا انسان قصد کرتا ہے۔

شہد کی مکھی کی وحی کے ساتھ خصوصیت

اگر یہ سوال کیا جائے کہ جب کہ تمام حیوانات الہام میں اور وحی میں مشترک ہیں تو شہد کی مکھی کو وحی کے ساتھ خاص کرنے کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ شہد کی مکھی کو وحی کے ساتھ اس لیے خاص فرمایا ہے کہ شہد کی مکھی کے علاوہ جو چیزیں ہیں، وہ اُن منافع کو نہیں جاری کرتیں جو اُن میں رکھے گئے ہیں، اور شہد کی مکھی اُن منافع کو بغیر کسی ریاضت اور سیکھنے کے جاری کرتی ہے۔

"اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ": بظاہر یہ امر ہے لیکن اس کی حقیقت یہ ہے کہ شہد کی مکھی کو ان چیزوں پر قدرت عطا فرمائی ہے اور اس کے لیے اِن چیزوں کو آسان فرما دیا ہے، جیسے کہا جاتا ہے "سیدوالی کذا" بظاہر یہ امر ہے اور حقیقت میں اس کو چلنے کی طاقت دینا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد: "وَاِنَّ لَكُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِیْكُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِهٖ"، اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد: "وَمِنْ

ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا"، ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں اور اُن کے علم اور اُن کی تدبیر کی دلیل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اِن جواہر مختلفہ سے اُن چیزوں کو نکالا جو اُن کی جنس سے نہیں ہیں، جیسے شہد، اس کو اللہ تعالیٰ نے پھلوں سے نکالا، اور دودھ، اس کو اللہ تعالیٰ نے چارہ سے نکالا، اور شیرہ اور نشہ آور مشروبات، ان کو اللہ تعالیٰ نے انگوروں سے نکالا۔ اس میں یہ دلیل ہے کہ یہ اس ذات کا فعل ہے جو علیم ہیں اور جس چیز کو چاہیں اس کو بنانے پر قادر ہیں۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ کے علم کی اور ان کی تدبیر کی اور ان کی حکمت کی دلیل ہے، کیونکہ اس دودھ کو پیٹ میں پیدا فرمانا جو اس جوہر کے رنگ کے خلاف ہے، اس میں یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم اور ان کی تدبیر کو مخلوق کے علم کے ساتھ قیاس نہیں کیا جا سکتا، اور ان کی حکمت کو مخلوق کی حکمت کے ساتھ قیاس نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح ان کی قدرت کو مخلوق کی قدرت کے ساتھ قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پھر تو ہر قسم کے پھلوں کا رس چوس، پس اپنے رب کے بنائے ہوئے ہموار راستوں پر چلتی رہ! ان کے پیٹوں میں سے مختلف رنگ کے مشروب نکلتے ہیں جن میں لوگوں کے لیے شفاء ہے، بے شک اس میں غور و فکر کرنے والے لوگوں کے لیے ضرور نشانی ہے O" (النحل: ۶۹)

"ثُمَّ كُلِي مِن كُلِّ الثَّمَرٰتِ": بہ ظاہر اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھی کو حکم فرمایا ہے کہ تو ہر قسم کے پھلوں سے کھا، لیکن حقیقت میں یہ شہد کی مکھی کو ہر قسم کے پھلوں کو کھانے کی طاقت دینا ہے اور اس کے لیے اس کو آسان فرمانا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "سِيْرُوْا" یہ بھی حقیقت میں چلنے کی طاقت فراہم فرمانا ہے۔

پھر اس آیت میں اور جو اس سے پہلی آیتیں ہیں: "يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ" اور "وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ" اور اس آیت میں: "وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا"، ان تمام آیات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر دلائل ہیں کہ وہ عدم سے ان چیزوں کو پیدا فرما دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے علم اور اُن کی تدبیر پر دلیل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان جواہر مختلفہ سے دوسرے جواہر کو پیدا فرمایا، اور جیسے شہد ہے اس کو اُن پھلوں سے نکالا جنہیں کھایا گیا، اور دودھ کو اس چارہ سے نکالا جو کھایا گیا تھا، اور میٹھے مشروب اور نشہ آور مشروب انگوروں کی بیلوں سے پیدا فرمائے، یہ تمام امور اس پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ اُس ذات کا فعل ہیں جو چیزوں کو بغیر کسی چیز کے اور بغیر کسی سبب کے پیدا فرمانے پر قادر ہیں، اور اس میں اُن کے علم، ان کی تدبیر اور ان کی حکمت پر دلیل ہے۔

"فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا": ایک قول یہ ہے کہ تم اپنے رب کے راستوں پر آسانی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہوئے رفق اور ملائمت کے ساتھ چلو۔

"مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ": حسن بصری نے کہا: اس سے مراد شہد ہے۔ اور دوسرے مفسرین نے کہا: اس کے ذائقے مختلف ہیں، اور ایک قول یہ ہے کہ اس کے رنگ مختلف ہیں، شہد سفید رنگ کا بھی ہوتا ہے اور سرخ رنگ کا بھی ہوتا ہے اور پیلے رنگ کا بھی ہوتا ہے۔

"فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ": بعض مفسرین نے کہا: اس میں لوگوں کے لیے ہر بیماری سے شفاء ہے حتیٰ کہ پھوڑے پھنسیوں کے لیے بھی شفاء ہے۔ اور بعض مفسرین نے کہا: اس میں ہر قسم کی بیماری کے لیے شفاء ہے۔

اور مجاہد وغیرہ نے کہا: یعنی قرآن مجید میں دلوں کی شفاء ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جسموں کی شفاء ہو۔

میں کہتا ہوں: اب میڈیکل سائنس سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ جو ذیابیطس یعنی شوگر کا مریض ہو، اس کے لیے شہد مضر ہے، اس لیے اس آیت میں تخصیص کرنی ہوگی کہ جس کو شوگر کا مرض نہیں ہے اور دیگر بیماریاں ہوں تو اُن کے لیے شہد شفاء ہے۔
(سعیدی غفرلہٗ)

علاج کرنے کے متعلق احادیث

(۱) حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر بیماری کی دوا ہے، پس جب دوا صحیح ہو تو (مریض) اللہ عزوجل کے حکم سے شفاء پا جاتا ہے۔ (صحیح مسلم: ۲۲۰۴، السنن الکبریٰ للنسائی: ۷۵۵۶)

(۲) عمر بن قتادہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما نے خود پہنچے ہوئے شخص کی عیادت کی، پھر فرمایا: میں اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک تم پچھنے نہ لگوالو کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اس میں شفاء ہے۔
(صحیح البخاری: ۵۶۸۳، صحیح مسلم: ۲۲۰۵، السنن الکبریٰ للنسائی: ۵۶۸۳)

(۳) عاصم بن عمرو بن قتادہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ ہمارے گھر آئے اور ہمارے گھر میں ایک آدمی کو زخم سے تکلیف تھی، حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: تم کو کیا تکلیف ہے؟ اس نے کہا: مجھ کو ایک زخم سے بہت تکلیف ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کہا: ایک فصد لگانے والے لڑکے کو بلاؤ، اس شخص نے کہا: اے ابو عبد اللہ! آپ فصد لگانے والے کو کیوں بلا رہے ہیں؟ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں اس زخم پر فصد لگوانا چاہتا ہوں! اس نے کہا: پھر میرے زخم پر مکھیاں بیٹھیں گی یا میرے زخم پر کپڑا لگے گا جس سے مجھے تکلیف ہوگی، جب حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھا کہ یہ شخص فصد لگوانے سے گھبرا رہا ہے تو انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے: اگر تمہاری دواؤں میں سے کسی دوا میں خیر ہے تو فصد لگوانے میں ہے یا شہد کے ایک گھونٹ میں ہے یا لوہے کی آگ سے گرم کر کے داغ لگوانے میں ہے، آپ نے فرمایا: میں داغ لگوانے کو پسند نہیں کرتا، پھر ایک فصد لگانے والا آیا اور اس کو فصد لگائی اس سے اس کی تکلیف ختم ہوگئی۔ (صحیح مسلم: باب السلام: ۷۱، الرقم المسلسل: ۲۲۰۵)

میں کہتا ہوں: قدیم زمانہ میں فصد لگانا بھی علاج کا ایک طریقہ تھا اور اس زمانے میں جو ماہر طبیب تھے وہ اپنے تجربہ سے جان لیتے تھے کہ اس کے جسم کے فلاں حصہ میں فاسد خون ہے اور اس فاسد خون کو نکال لیا جائے تو یہ صحت مند ہو جائے گا، اور اس زمانہ میں یہ طریقہ متروک ہو چکا ہے، اب ایسے آلات ایجاد ہو چکے ہیں جن کی مدد سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جسم میں کس جگہ فاسد خون ہے یا نہیں ہے مثلاً الٹرا ساؤنڈ سے معلوم ہو جاتا ہے، پھر اگر معلوم ہو جائے کہ جسم میں فلاں جگہ فاسد خون ہے تو ماہر سرجن مختلف آلات کے ذریعہ سے وہ خون نکال لیتے ہیں۔ (سعیدی غفرلہٗ)

پرہیز کرنے کے متعلق شرعی احکام

کسی بیماری میں جس چیز سے نقصان کا خطرہ ہو، اس چیز سے پرہیز کرنا لازم ہے۔ تیمم کو اسی لیے مشروع فرمایا ہے کہ اگر کسی انسان کو پانی کے استعمال کرنے سے زکام، کھانسی یا نمونیہ کا خطرہ ہو تو وہ پانی سے وضو نہ کرے اور اس کے بجائے تیمم کرے اور جس

شخص کو کھانسی، زکام یا نمونیہ ہو اور وہ پانی سے وضو کرے اور اس کی بیماری بڑھ جائے تو وہ شخص گنہگار ہوگا۔

ہم اس جان کے مالک نہیں ہیں اور نہ ہم اس بدن کے مالک ہیں، ہمارے پاس یہ جسم اور جان اللہ تعالیٰ کی امانت ہے، ہمارے لیے اس جسم کو ضائع کرنا یا نقصان پہنچانا جائز نہیں ہے، اسی لیے شوگر کے مریض کو میٹھی اور نشاستہ والی چیزوں سے پرہیز کرانا ضروری ہے، اور ہائی بلڈ پریشر کے مریض کو نمکین اور چکنائی والی چیزوں سے پرہیز کرانا ضروری ہے، اور جس کے معدہ میں السر ہو اس کو گائے کے گوشت، تیز مصالحہ جات اور بھنی ہوئی چیزوں سے پرہیز کرانا ضروری ہے، اور جس کو یرقان ہو اس کو چکنائی اور گائے کے گوشت سے پرہیز کرانا ضروری ہے، اور جس کو عارضہ قلب ہو، اس کو انڈے، گائے کے گوشت اور چکنائی سے پرہیز کرانا ضروری ہے، اور جس کے مسوڑھوں میں ورم ہو اس کو بھی گائے کے گوشت سے پرہیز کرانا ضروری ہے، اور تمام مہلک بیماریوں میں بسیار خوری سے پرہیز کرانا اشد ضروری ہے۔ پرہیز کے متعلق درج ذیل احادیث ہیں:

پرہیز کے متعلق احادیث

(۱) حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو اس کو دنیا سے اس طرح پرہیز کراتے ہیں جس طرح تم میں سے کوئی شخص استسقاء کے مریض کو پانی سے پرہیز کراتا ہے۔

(سنن ترمذی: ۲۰۳۶، مسند احمد ج ۳ ص ۴۲۷، صحیح ابن حبان: ۶۶۹، المعجم الکبیر ج ۱۹ ص ۱۷، المستدرک ج ۴ ص ۲۰۷)

(۲) حضرت ام المنذر رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میرے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپ کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تھے اور ہمارے پاس ادھ پکی (گدری) کھجوروں کا ایک خوشہ تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کھجوروں کو تناول فرمانے لگے، حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی آپ کے ساتھ کھانے لگے، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: رک جاؤ، رک جاؤ اے علی! تم کمزور ہو، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ بیٹھے رہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کھاتے رہے، حضرت ام المنذر رضی اللہ عنہا نے کہا: پھر میں ان کے لیے چقندر اور جو لائی، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے علی! اس میں سے کھاؤ، یہ تمہارے مزاج کے موافق ہے۔

(سنن ابوداؤد: ۳۸۵۶، سنن ترمذی: ۲۰۳۷، سنن ابن ماجہ: ۳۴۴۲)

"إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ": بے شک ان چیزوں میں غور و فکر کرنے والے لوگوں کے لیے ضرور نشانی ہے جو اللہ تعالیٰ کی تدبیر اور ان کی قدرت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اللہ نے تم کو پیدا فرمایا، پھر وہ تمہاری روح قبض فرما کر تم کو وفات دیں گے، اور تم میں سے کسی کو ناقص ترین عمر (بڑھاپے) کی طرف لوٹایا جاتا ہے تاکہ وہ بہت کچھ جاننے کے باوجود کچھ نہ جان سکے، بے شک اللہ سب سے زیادہ جاننے والے، سب سے زیادہ قدرت رکھنے والے ہیں O" (النحل: ۷۰)

"وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ ۗ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا": اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا اس میں ہم پر کونسا احسان ہے کہ انہوں نے ہمیں پیدا فرمایا، پھر وہ ہم کو وفات دیں گے اور ہم کو ایسے حال کی طرف لوٹا دیں گے جو جہالت کا حال ہوگا حتیٰ کہ ہمیں کسی چیز کا علم نہیں ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو یاد دلا رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی نے تم کو پیدا فرمایا ہے، وہی تمہیں وفات دیں گے اور وہی تمہیں اس حال کی طرف لوٹا دیں گے جس حال میں تمہیں کسی چیز کا علم نہ ہو، اور تم اللہ تعالیٰ کی مملکت اور سلطنت میں ہی ایک حال سے دوسرے حال میں منتقل ہوتے رہتے ہو، پھر تم نے کیوں بتوں کی عبادت کی، اُن پتھر کی مورتیوں کی پوجا کی جو تمہارے لیے ان احوال میں سے کسی حال کے مالک نہیں ہیں اور تم نے اُن بے جان بتوں کو اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور ان کی عبادت میں شریک قرار دیا۔ یا اللہ تعالیٰ یہ یاد دلاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا فرمایا اور تم کچھ نہ تھے، معدوم محض تھے، پھر اللہ تعالیٰ تمہیں زندہ فرمانے کے بعد وفات دیں گے، پھر تمہیں اس حال کی طرف لوٹا دیں گے کہ تم کسی چیز کا تعقل نہ کر سکو۔ سو جو اس پر قادر ہوں، وہ موت کے بعد زندہ کرنے پر اور لوگوں کو فناء کرنے کے بعد دوبارہ زندہ اٹھانے پر کیوں قادر نہیں ہوں گے۔

"ارذل عمر" کا معنی اور مصداق

علامہ ابو الفرج عبد الرحمٰن بن علی بن الجوزی الحنبلی المتوفی ۵۹۷ھ، النحل: ۷۰ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ابن قتیبہ نے کہا: ارذل عمر کا معنی یہ ہے کہ جن چیزوں کا اسے پہلے علم تھا بڑھاپے کی شدت کی وجہ سے اس کا وہ علم زائل ہو جائے گا۔ زجاج نے کہا: اس کا معنی یہ ہے کہ تم میں سے بعض لوگ اس قدر بوڑھے ہو جائیں گے کہ ان کی عقل فاسد اور خراب ہو جائے گی اور وہ عالم ہونے کے بعد جاہل ہو جائیں گے تا کہ اللہ تم کو اپنی قدرت دکھائیں کہ جس طرح وہ مارنے اور زندہ فرمانے پر قادر ہیں، اسی طرح وہ عالم بنانے کے بعد جاہل بنانے پر قادر ہیں۔

ارذل عمر کے متعلق احادیث اور آثار

عطاء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت مسلمانوں کے متعلق نہیں ہے، مسلمان کی عمر جس قدر زیادہ ہوتی جاتی ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی عزت اور کرامت بڑھتی جاتی ہے اور اس کی عقل اور معرفت بھی زیادہ ہوتی جاتی ہے اور عکرمہ نے کہا: جو شخص قرآن عظیم پڑھتا رہتا ہے وہ ارذل عمر کی طرف نہیں لوٹایا جاتا۔

(زاد المسیر فی علم التفسیر ج ۴ ص ۴۷۰-۴۷۱، دار الکتاب العربی بیروت، ۱۴۲۲ھ)

ارذل عمر سے پناہ طلب کرنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ کثرت دعاؤں میں ارذل عمر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کی ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب کرتے تھے اور یوں دعا کرتے تھے: اے اللہ! میں سستی سے آپ کی پناہ میں آتا ہوں اور میں بزدلی سے آپ کی پناہ میں آتا ہوں اور میں ارذل عمر سے آپ کی پناہ میں آتا ہوں اور میں بخل سے آپ کی پناہ میں آتا ہوں۔ (صحیح البخاری: ۲۸۲۳، ۴۷۰۷، ۶۳۶۷، ۶۳۷۱، صحیح مسلم: ۲۷۰۶، سنن ترمذی: ۳۴۸۵، سنن نسائی: ۵۴۵۲، سنن ابوداؤد: ۱۵۴۰، مسند احمد: ۱۲۷۰۳)

انسان کی عمر کے پانچ مراتب

پہلا مرتبہ اس کی عمر کا وہ زمانہ ہے جب اس کے بچپن اور نوجوانی کا زمانہ ہوتا ہے، اور اس کی نشوونما ہوتی ہے۔ اور یہ ولادت

سے لے کر بیس سال تک کی عمر ہے۔ اور دوسرا مرتبہ وہ ہے جب اس کی عمر اپنے شباب کو پہنچ جاتی ہے، اور یہ بیس سال سے چالیس سال تک کی عمر ہے۔ اور تیسرا مرتبہ دورِ انحطاط ہے، جب اس کی عمر ڈھل جاتی ہے اور وہ ادھیڑ عمر کو پہنچ جاتا ہے، یہ چالیس سال سے ساٹھ سال تک کی عمر کا زمانہ ہوتا ہے، اس کو کہولت کہتے ہیں۔ اور چوتھا مرتبہ انحطاط کبیر کا ہے، یہ بڑھاپے کا زمانہ ہے، یہ ساٹھ سال سے لے کر ستر (۷۰)، اسی (۸۰) سال کی عمر تک کا زمانہ ہے۔ اور پانچواں مرتبہ موت اور قبر کا ہے۔

مصنف کا دورِ انحطاطِ کبیر

میں کہتا ہوں کہ چودہ نومبر انیس سو سینتیس عیسوی (۱۹۳۷ء) میں میری پیدائش ہوئی ہے اور اب مئی ۲۰۱۵ء ہے، اس حساب سے چودہ نومبر ۲۰۱۵ء کو میری عمر کے اٹھتر سال پورے ہو جائیں گے اور اناسیواں (۷۹) سال شروع ہو جائے گا، اور چاند کے حساب سے میری پیدائش ۱۰ رمضان المبارک ۱۳۵۶ھ میں ہوئی ہے، لہٰذا اب ۱۰ رمضان المبارک ۱۴۳۶ھ میں میری عمر کے اسی (۸۰) سال پورے ہو جائیں گے، اور یہ انحطاط کبیر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بے حد فضل و کرم اور ان کا شکر ہے کہ اس بڑھاپے میں بھی اللہ تعالیٰ نے مجھے احادیث پڑھانے کے قابل بنایا ہوا ہے اور تفسیر تبیان الفرقان کو کمپوز کرانے کی صلاحیت عطا فرمائی ہوئی ہے، مجھے تیس سال سے زائد عرصہ سے شوگر کا مرض لاحق ہے اور شوگر کے مریض کی کبھی بینائی چلی جاتی ہے، کبھی انفیکشن کی وجہ سے اس کے پیر یا پنڈلی کو کاٹ دیا جاتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا مجھ پر بے حد کرم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ان عوارض سے محفوظ رکھا ہوا ہے، میرے دونوں گھٹنوں کی ہڈیوں میں تین سال سے گیپ آ چکا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس کے باوجود میں حسبِ ضرورت چل پھر لیتا ہوں اور کرسی پر بیٹھ کر نمازوں کی ادائیگی کر لیتا ہوں، اور اعصاب اور حافظہ کی کمزوری کے باوجود اللہ تعالیٰ مجھ سے یہ دین کا کام کرا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آخری سانس تک مجھے دین کے کام کے قابل بنائے رکھیں اور اللہ تعالیٰ ایمان اور اعمالِ صالحہ پر میرا خاتمہ فرمائیں۔ آمین

"اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ": اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں جو تدبیر فرمائی ہے، اس کو وہ بہت زیادہ جاننے والے ہیں، جس سے اُن کے خالق کی قدرت کو وہ جان لیں، اور اللہ تعالیٰ کی عطا فرمائی ہوئی جس قدرت کی وجہ سے وہ حکماء اور علماء بن جاتے ہیں۔ اور اس میں حکمت یہ ہے کہ بندے ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہیں اور ان سے امید قائم رکھتے رہیں۔

"قَدِيْرٌ": یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والے ہیں۔

(تاویلات اہل السنہ ج ۶ ص ۵۲۶-۵۲۵، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۶ھ)

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِى الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّىْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ۗ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝

اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض دوسروں پر رزق میں فضیلت عطا فرمائی ہے، پس جن کو رزق میں فضیلت عطا فرمائی ہے وہ اپنے فاضل رزق کو اپنے نوکروں اور ماتحتوں کو دینے والے نہیں ہیں کہ وہ سب اس میں برابر ہو جائیں، تو کیا وہ اللہ کی اس نعمت کا انکار کریں گے؟ ○

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ۝۷۲

اور اللہ نے تمہارے لیے تمہی میں سے بیویاں پیدا فرمائیں، اور تمہارے لیے تمہاری بیویوں سے بیٹے، پوتے اور نواسے پیدا فرمائے اور تمہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق عطا فرمایا، کیا پس مشرکین بتوں پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا کفر کرتے ہیں O

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝۷۳

اور وہ (مشرکین) اللہ کے سوا ان بتوں کی عبادت کرتے ہیں جو ان کو آسمانوں اور زمینوں سے کچھ بھی رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتے، اور وہ کچھ بھی نہیں کرسکتے O

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۷۴

سو تم اللہ کے لیے مثالیں نہ بیان کرو، بے شک اللہ سب کچھ جانتا ہے اور تم کچھ بھی نہیں جانتے O

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰي شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ۭ هَلْ يَسْتَوٗنَ ۭ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۷۵

اللہ ایک مثال بیان فرماتا ہے، ایک ایسا غلام ہے جو کسی چیز پر بھی قدرت نہیں رکھتا، اور دوسرا ایسا غلام ہے جس کو ہم نے عمدہ روزی عطا فرمائی ہے، پس وہ اس روزی میں سے پوشیدہ طور پر اور ظاہراً خرچ کرتا ہے، کیا وہ دونوں برابر ہیں؟ تمام تعریفوں کے اللہ ہی مستحق ہیں، بلکہ اکثر لوگ علم نہیں رکھتے O

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰي شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰي مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ۭ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۷۶

ع ۱۰

اور اللہ دو مردوں کی مثال بیان فرماتا ہے، ان میں سے ایک وہ ہے جو گونگا ہے جو کوئی کام نہیں کرسکتا اور وہ اپنے مالک پر بوجھ ہے مالک اسے جہاں بھی بھیجے وہ کوئی بھلائی لے کر نہیں آتا، کیا وہ گونگا اور دوسرا وہ شخص برابر ہو سکتا ہے جو لوگوں کو انصاف کا حکم دیتا ہے اور خود سیدھے راستہ پر قائم ہے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض دوسروں پر رزق میں فضیلت عطا فرمائی ہے،

پس جن کو رزق میں فضیلت عطا فرمائی ہے وہ اپنے فاضل رزق کو اپنے نوکروں اور ماتحتوں کو دینے والے نہیں ہیں کہ وہ سب اس میں برابر ہو جائیں، تو کیا وہ اللہ کی اس نعمت کا انکار کریں گے؟O (النحل: ۷۱)

مشرکین کے شرک اور ان کی ناشکری کا ابطال

علامہ ابو الفرج عبد الرحمن بن علی بن الجوزی الحنبلی المتوفی ۵۹۷ھ، النحل: ۷۱ تا ۷۶ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ": یعنی اللہ تعالیٰ نے مالکوں کو مملوکوں پر رزق میں فضیلت عطا فرمائی ہے۔

"فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ": اس آیت کا معنی یہ ہے کہ مالک اپنے مملوک پر اس فاضل رزق کو واپس کرنے والا نہیں ہے حتیٰ کہ مالک اور مملوک مال میں برابر ہو جائیں۔ اس مثال کو اللہ تعالیٰ نے ان مشرکین کے لیے بیان فرمایا ہے جنہوں نے بتوں کو اللہ کا شریک قرار دیا، حالانکہ بت اللہ کی ملکیت ہیں، اللہ عزوجل فرماتے ہیں: جب تمہارے مملوک ملک میں تمہارے ساتھ برابر نہیں ہیں تو تم میرے بندوں کو میرے ساتھ برابر کیوں قرار دیتے ہو اور تم میرے لیے اس چیز پر کیوں راضی ہوتے ہو جس چیز کو تم اپنے لیے باعث عار سمجھتے ہو۔

العوفی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ مشرکین اپنے غلاموں کو اپنے اموال میں اور اپنی عورتوں میں شریک کرنے والے نہیں ہیں، تو وہ میرے غلاموں کو میری سلطنت میں کیوں شریک قرار دیتے ہیں۔

اور ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ یہ آیت نجران کے نصاریٰ کے متعلق نازل ہوئی ہے جب انہوں نے کہا تھا کہ عیسیٰ، اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔

"اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ": تو کیا وہ اللہ کی اس نعمت کا انکار کریں گے؟

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اللہ نے تمہارے لیے تمہی میں سے بیویاں پیدا فرمائیں، اور تمہارے لیے تمہاری بیویوں سے بیٹے، پوتے اور نواسے پیدا فرمائے اور تمہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق عطا فرمایا، کیا پس مشرکین بتوں پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا کفر کرتے ہیںO" (النحل: ۷۲)

"وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا": یعنی اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو بنایا۔ اور "مِّنْ اَنْفُسِكُمْ" کی تفسیر میں دو قول ہیں:

(۱) قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا، پھر انہی سے ان کی بیوی کو پیدا فرمایا۔ (۲) ابن زید نے کہا: یعنی بنو آدم کی جنس سے تمہارے لیے عورتوں کو پیدا فرمایا۔

"وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً": "حَفَدَةً" کی تفسیر میں پانچ اقوال ہیں:

(۱) حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے کہا: اس سے مراد سسرالی رشتہ دار ہیں۔

(۲) مجاہد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ اس سے مراد خدام ہیں، اور اس میں دو احتمال ہیں: خدام سے مراد اولاد ہے، پس معنی یہ ہوگا کہ اولاد خدمت کرتی ہے، اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس سے مراد مملوک ہیں۔ اور آیت کا معنی اس طرح ہے

کہ تمہارے لیے تمہاری بیویوں سے بیٹے بنائے اور تمہارے لئے بیویوں کے علاوہ خدام بنائے۔

(۳) العوفی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ اس سے مراد ہے مرد کی بیوی کی دوسرے شخص سے اولاد۔

(۴) مجاہد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ اس سے مراد بیٹے کے بیٹے یعنی پوتے ہیں۔

(۵) ابن السائب نے کہا: اس سے مراد بڑی اولاد ہے اور البنون سے مراد چھوٹی اولاد ہے۔ مقاتل نے کہا: زمانہ جاہلیت میں اولاد لوگوں کی خدمت کرتی تھی۔ الزجاج نے کہا: اس کلام کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیویوں سے بیٹے بنائے جو عزت کے ساتھ اطاعت کرتے ہیں اور ضرورت کے کاموں میں مدد کرتے ہیں۔

"وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد پھلوں اور غلہ کے دانوں اور حیوانات کی اقسام ہیں۔ "اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ": اس کی تفسیر میں تین قول ہیں:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: باطل سے مراد بت ہیں۔

(۲) عطاء نے کہا: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے لیے بنایا ہوا شریک ہے اور بیوی ہے اور بیٹا ہے، یعنی وہ تصدیق کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ان کا شریک ہے، ان کی بیوی ہے اور ان کا بیٹا ہے۔

(۳) باطل سے مراد شیطان ہے، جس نے مشرکین کو حکم دیا کہ وہ البحیرہ اور السائبہ کو حرام قرار دیں تو انہوں نے اس کی تصدیق کی۔

"وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ": اس کی تفسیر میں تین قول ہیں:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ "بِنِعْمَتِ اللّٰهِ" سے مراد اللہ تعالیٰ کی توحید ہے۔ (۲) "بِنِعْمَتِ اللّٰهِ" سے مراد قرآن اور رسول ہیں۔ (۳) "بِنِعْمَتِ اللّٰهِ" سے مراد وہ حلال کام ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے حلال فرمایا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور وہ (مشرکین) اللہ کے سوا اُن بتوں کی عبادت کرتے ہیں جو اُن کو آسمانوں اور زمینوں سے کچھ بھی رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتے، اور وہ کچھ بھی نہیں کرسکتے O" (النحل: ۷۳)

"وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا": "مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" کی تفسیر میں دو قول ہیں:

(۱) قتادہ نے کہا: اس سے مراد بت ہیں۔ (۲) مقاتل نے کہا: اس سے مراد ملائکہ ہیں۔

"مِّنَ السَّمٰوٰتِ": یعنی وہ بت آسمان سے بارش نازل کرنے کے مالک نہیں ہیں۔ "وَالْاَرْضِ": اور زمین سے سبزہ اور پھل پیدا کرنے کے مالک نہیں ہیں۔ "شَيْئًا": یعنی وہ بت نہ کم رزق کو پیدا کرنے پر قادر ہیں نہ زیادہ رزق کو پیدا کرنے پر قادر ہیں۔ "وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ": یعنی وہ کسی چیز پر قادر نہیں ہیں۔

الفراء نے کہا: اس کلام کے اول میں فرمایا: وہ کسی چیز کے مالک نہیں ہیں اور اس کلام کے آخر میں فرمایا: وہ کسی چیز کی طاقت نہیں رکھتے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "سو تم اللہ کے لیے مثالیں نہ بیان کرو، بے شک اللہ سب کچھ جانتے ہیں اور تم کچھ بھی نہیں جانتے O" (النحل: ۷۴)

"فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ": یعنی اللہ تعالیٰ کو ان کی مخلوق کے مشابہ نہ قرار دو، کیونکہ کوئی چیز اُن کے مشابہ نہیں ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شریک نہ قرار دو۔

"اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ": اس آیت کی تفسیر میں چار قول ہیں:

(۱) ابن السائب نے کہا: اللہ تعالیٰ مثال بیان کرنے کو جانتے ہیں اور تم اس کو نہیں جانتے۔ (۲) مقاتل نے کہا: اللہ عزوجل جانتے ہیں کہ اُن کا کوئی شریک نہیں ہے اور تم نہیں جانتے کہ اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ (۳) اللہ تعالیٰ تمہاری بیان کی ہوئی مثالوں میں خطا کو جانتے ہیں اور تم اپنی مثالوں کی خطا کو نہیں جانتے۔ (۴) جو کچھ ہو چکا اور جو کچھ ہوگا، اس سب کو اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اور تم نہیں جانتے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اللہ ایک مثال بیان فرماتے ہیں، ایک ایسا غلام ہے جو کسی چیز پر بھی قدرت نہیں رکھتا، اور دوسرا ایسا غلام ہے جس کو ہم نے عمدہ روزی عطا فرمائی ہے، پس وہ اس روزی میں سے پوشیدہ طور پر اور ظاہراً خرچ کرتا ہے، کیا وہ دونوں برابر ہیں؟ تمام تعریفوں کے اللہ ہی مستحق ہیں، بلکہ اکثر لوگ علم نہیں رکھتے O" (النحل: ۷۵)

"ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا": اللہ تعالیٰ دو مثالیں بیان فرماتے ہیں، ایک مثال مومن کی ہے اور دوسری مثال کافر کی ہے۔ "لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ": (۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ نے کہا: یہ کافر کی مثال ہے جس کے پاس کوئی خیر نہیں ہے۔ (۲) مجاہد اور السدی نے کہا: یہ مثال اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے اور بتوں کے لیے بیان فرمائی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کے مالک ہیں اور بت کسی چیز کے مالک نہیں ہیں۔

"وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا": اور جو صاحب رزق ہے وہ مومن ہے کیونکہ اس کے پاس خیر ہے۔

اور تفسیر میں ذکر کیا گیا ہے کہ یہ مثال اُن لوگوں کی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھے، اور اُن کے متعلق دو قول ہیں:

(۱) عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ مملوک سے مراد ابو الجوار ہے۔ اور رزق حسن کے مالک سے مراد اس کا سردار ہشام بن عمرو ہے۔ اور مقاتل نے کہا: مملوک سے مراد ابو الحواجر ہے۔ (۲) ابن جریج نے کہا: کہ مملوک سے مراد ابو جہل بن ہشام ہے اور الرزق الحسن والے سے مراد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔

"هَلْ يَسْتَوٗنَ": کیا وہ دونوں برابر ہیں۔

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ": یعنی اللہ تعالیٰ ہی حمد کے مستحق ہیں، کیونکہ وہی انعام عطا فرمانے والے ہیں اور بتوں نے کوئی انعام نہیں عطا کیا۔ "بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ": بلکہ اکثر لوگ نہیں جانتے کہ تمام تعریفوں کے مستحق اللہ عزوجل ہیں۔

علماء نے کہا: یہاں پر اکثر لوگوں کا ذکر فرمایا ہے اور مراد یہ ہے کہ تمام لوگ نہیں جانتے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اللہ دو مردوں کی مثال بیان فرماتے ہیں، اُن میں سے ایک وہ ہے جو گونگا ہے جو

کوئی کام نہیں کر سکتا اور وہ اپنے مالک پر بوجھ ہے مالک اسے جہاں بھی بھیجے وہ کوئی بھلائی لے کر نہیں آتا، کیا وہ گونگا اور دوسرا وہ شخص برابر ہو سکتا ہے جو لوگوں کو انصاف کا حکم دیتا ہے اور خود سیدھے راستہ پر قائم ہے O"
(النحل: ۷۶)

"وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ": "ابکم" کی تفسیر میں تین اقوال ہیں:
(۱) مقاتل اور ابو عبیدہ نے کہا: اس سے مراد ہے گونگا۔ (۲) اس سے مراد زبان میں ایک عیب ہے جس کی وجہ سے وہ بولنے پر قادر نہ ہو سکے۔ (۳) یہ دل میں کوئی نقص ہے جس کی وجہ سے وہ ایسی چیز محفوظ نہ کر سکے جس کو سمجھ سکے پس محل فہم میں بھی فساد ہوتا ہے اور محل نطق میں بھی فساد ہوتا ہے۔

"لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ": یعنی وہ کسی بات کے کرنے پر قادر نہ ہو، نہ وہ خود کوئی بات سمجھتا ہو اور نہ دوسرے کو سمجھا سکتا ہو۔

"وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ": اور وہ اپنے مالک پر بوجھ ہو۔

اس مثال سے اللہ تعالیٰ نے کیا ارادہ فرمایا ہے، اس کے متعلق چار اقوال ہیں:
(۱) العوفی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ اس مثال کو اللہ تعالیٰ نے مومن اور کافر کے لیے بیان فرمایا ہے، پس کافر گونگا ہے اور جو عدل کے ساتھ بات کرتا ہے وہ مومن ہے۔
(۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے متعلق نازل ہوئی ہے جو عدل کے ساتھ حکم کرتے تھے۔ اور ان کا غلام وہ تھا جو اسلام کو ناپسند کرتا تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتا تھا، گونگے سے مراد وہی شخص ہے۔
(۳) ابن السائب اور مقاتل نے کہا: یہ مثال اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے اور بتوں کے لیے بیان فرمائی ہے، پس بت گونگے ہیں اور اللہ تعالیٰ عدل کے ساتھ حکم فرمانے والے ہیں۔
(۴) عطاء نے کہا: گونگے سے مراد اُبی بن خلف ہے اور جو عدل کے ساتھ حکم دیتے ہیں ان سے مراد حضرت حمزہ، حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہم ہیں۔

"اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ": اس کی تفسیر میں دو قول ہیں:
(۱) اگر ہم یہ کہیں کہ اس سے مراد مرد ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ اس کا مالک اسے جہاں بھی بھیجتا ہے۔ (۲) اور اگر ہم کہیں کہ اس سے مراد بت ہیں تو پھر اس کی تفسیر میں دو قول ہیں: (۱) تم جہاں سے بھی اس کو پکارو وہ تمہاری پکار کا جواب نہیں دیں گے۔ (۲) تم ان بتوں سے جو امید بھی رکھو، وہ پوری نہیں ہوگی۔

"لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ" اگر ہم کہیں کہ وہ مرد ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کوئی بات سمجھتا نہیں ہے تو وہ کوئی کام نہیں کر سکتا۔ اور اس کے انکار کی وجہ سے اس کی کوئی بات سمجھ نہیں آتی، اور اگر ہم کہیں کہ وہ بت ہیں تو چونکہ وہ جماد ہیں، اس لیے وہ کوئی کام نہیں کر سکتے۔

"هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ": یعنی کیا یہ گونگا اور جو عدل اور انصاف کے ساتھ حکم دیتا

ہے، وہ برابر ہو سکتے ہیں۔ یعنی گونگا اور جو بولنے پر قادر ہو، وہ دونوں کیا برابر ہو سکتے ہیں؟

(زاد المسیر فی علم التفسیر ج ۴ ص ۵۷۱ ـ ۵۷۳، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۱ھ)

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَاۤ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۷۷﴾

اور آسمانوں اور زمینوں کا (علم) غیب (بالذات) اللہ ہی کے ساتھ مخصوص ہے، اور قیامت کا وقوع صرف پلک جھپکنے کی مقدار میں یا اس سے بھی جلدی ہوگا، بے شک اللہ جو چاہیں اس پر قادر ہیں O

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾

اور اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے، اور اس نے تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل بنائے تاکہ تم اللہ کا شکر ادا کرو O

اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِیْ جَوِّ السَّمَآءِ ؕ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۷۹﴾

کیا ان لوگوں نے آسمان کی فضاء میں پرندوں کو اڑتے ہوئے نہیں دیکھا؟ اللہ کے سوا ان کو گرنے سے کوئی بچا نہیں سکتا، بے شک ان چیزوں میں ایمان والوں کے لیے ضرور نشانیاں ہیں O

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَاۤ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿۸۰﴾

اور اللہ نے تمہارے چند گھروں کو تمہارے لئے رہائش کی جگہ بنا دیا اور انہوں نے تمہارے لیے مویشیوں کی کھالوں سے خیمے بنا دیئے جو تمہیں سفر کے دنوں میں اور اقامت کے دنوں میں ہلکے محسوس ہوتے ہیں، اور ان مویشیوں کے اون سے اور ان کے پشم سے اور بالوں سے تم گھریلو سامان بناتے ہو جو ایک مدت تک تمہارے کام آتے ہیں O

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ

تُسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾

اور اللہ نے تمہارے (آرام کے) لئے اپنی مخلوق میں سے سائے پیدا فرمائے، اور تمہارے لئے پہاڑوں میں غاروں کو پیدا فرمایا، اور تمہارے لیے ایسے لباس پیدا فرمائے جو تمہیں گرمی سے بچاتے ہیں اور ایسے لباس پیدا فرمائے جو تمہیں دوران جنگ (اسلحہ) کے ضرر سے محفوظ رکھتے ہیں، اسی طرح اللہ تم پر اپنی نعمت کو مکمل فرماتے ہیں تا کہ تم اسلام قبول کرلو O

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴿۸۲﴾

(اے رسول اکرم!) پس اگر یہ کفار آپ سے منہ موڑ لیں تو آپ پر تو صرف احکام کو وضاحت سے پہنچا دینا ہے O

یَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ یُنْكِرُوْنَهَا وَ اَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۳﴾

یہ لوگ اللہ کی نعمت کو پہچانتے ہیں پھر (اس کے باوجود) اس نعمت کا انکار کرتے ہیں، اور ان میں سے اکثر ناشکرے ہیں O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور آسمانوں اور زمینوں کا (علم) غیب (بالذات) اللہ ہی کے ساتھ مخصوص ہے، اور قیامت کا وقوع صرف پلک جھپکنے کی مقدار میں یا اس سے بھی جلدی ہوگا، بے شک اللہ جو چاہیں اس پر قادر ہیں O" (النحل: ۷۷)

علامہ نظام الدین الحسن بن محمد بن حسین القمی النیشاپوری المتوفی ۷۲۸ھ، النحل: ۷۷ تا ۸۳ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَلِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ": یعنی جو چیزیں بندوں سے غائب ہیں، ان کا علم اللہ عزوجل ہی کے ساتھ مخصوص ہے، یا آسمانوں اور زمینوں کے غیب سے مراد قیامت کا دن ہے، کیونکہ قیامت کے دن کا علم اللہ تعالیٰ کے غیر سے غائب ہے اور اس تفسیر کی تائید اس ارشاد سے ہوتی ہے: "وَمَاۤ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ"۔ اللمح کا معنی ہے: سرعت کے ساتھ پلک جھپکنا، جب کہ اس میں اتنا وقت ضروری ہے جس وقت میں آنکھ کا ڈھیلا دکھائی دینے والی چیز کی طرف متوجہ ہو۔

"اَوْ هُوَ اَقْرَبُ": اور یہ بہ طور مبالغہ نہیں ہے، یہ انتہائی صدق کو بیان کرتا ہے، کیونکہ خطاب اور قیامت کے قائم ہونے کے درمیان کا وقت متناہی ہے۔ اور قیامت سے لے کر ابد تک کا وقت غیر متناہی ہے۔ اور متناہی کی غیر متناہی کی طرف کوئی نسبت نہیں ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ قیامت کے دن زندہ لوگوں کو مارنا اور مردہ لوگوں کو زندہ کرنا یہ سب بہت جلد اور بہت قلیل وقت میں ہو جائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کو اس سے مؤکد فرمایا: "اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ"۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے، اور اس نے تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل بنائے تا کہ تم اللہ کا شکر ادا کرو O" (النحل: ۷۸)

"وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ": اس آیت میں بھی انسان کی ایک حالت سے اللہ تعالیٰ کی بے پناہ قدرت اور انسانوں پر بے انداز شفقت کی دلیل ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس حال میں پیدا فرمایا کہ وہ اپنے اوپر مُنعِم کے حق کو نہیں

بچانا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کس طریقہ سے انسان کو اُن کی ماؤں کے پیٹ میں پیدا فرمایا اور اُن کے جسم کی ساخت بنائی اور اُن کی صورت بنائی، پھر اُن کو تنگی سے فراخی کی طرف نکالا۔

"لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا": یعنی اس وقت علم کا اثر تم پر ظاہر نہیں ہوتا۔ پھر وہ حواسِ ظاہرہ اور باطنہ سے علوم کو حاصل کرتا ہے۔

"وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ": یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے اجسام میں یہ آلات بنائے ہیں تاکہ تم سے جہالت کا ازالہ ہو اور تم علم کو حاصل کرو اور اس کے تقاضوں پر عمل کرو اور اپنے منعم کا شکر بجالاؤ اور ان کی عبادت کرو، اور اُن کے حقوق ادا کرو۔

جمہور حکماء کا یہ زعم ہے کہ انسان اپنی فطرت کی ابتداء میں معارف اور علوم سے خالی تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے اُس میں سماعت پیدا فرمائی اور بصارت پیدا فرمائی اور دل پیدا فرمایا اور باقی اعضاء مدرکہ پیدا فرمائے حتیٰ کہ اس کے دماغ میں ان ماہیات کے حقائق مرتسم ہو گئے اور اس کے ذہن میں ان کی صورتیں حاضر ہو گئیں۔ اور پھر انسان میں علوم اور معارف کو کسب کرنے کی صلاحیت پیدا فرمائی۔ اور اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم میں حواس اور قوتِ مدرکہ پیدا فرمائی۔ اور جب بچہ اپنی ماں کے پیٹ سے نکلتا ہے تو اس کا بدن بہت کمزور ہوتا ہے۔ اس وقت وہ ان چیزوں کو حاصل نہیں کر سکتا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "کیا اِن لوگوں نے آسمان کی فضاء میں پرندوں کو اڑتے ہوئے نہیں دیکھا؟ اللہ کے سوا اِن کو گرنے سے کوئی بچا نہیں سکتا، بے شک اِن چیزوں میں ایمان والوں کے لیے ضرور نشانیاں ہیں O" (النحل: ۷۹)

"اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ ۭ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ":
یعنی جب پرندے آسمان اور زمین کے درمیان فضاء میں پرواز کر رہے ہوتے ہیں تو وہ کس طرح اپنے بازو پھیلا کر ہوا میں اڑ جاتے ہیں، اِن پرندوں میں کس نے ایسی طاقت رکھی ہے جو انہیں اڑا کر ہوا میں لے جاتی ہے۔ اور ثقیل جسم کا طبعی تقاضا یہ ہے کہ وہ زمین کی کشش سے فوراً بلندی سے نیچے گر جاتا ہے، پس دورانِ پرواز اِن پرندوں کو فضاء میں کون قائم رکھتا ہے اور نیچے گرنے سے کون روکتا ہے۔ کیا پتھر کے بنائے ہوئے بت ان پرندوں کو بناتے ہیں اور ان کو دورانِ پرواز گرنے سے روکتے ہیں۔ جب یہ بت نہیں بنائے گئے تھے، تب بھی پرندوں کے اڑنے اور فضاء میں قائم رہنے کا یہی نظام تھا۔

اس سے معلوم ہوا اس نظام کے موجب صرف اللہ عزوجل ہیں نہ بت ہیں نہ دیوی اور دیوتا ہیں نہ چاند اور سورج ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اللہ نے تمہارے چند گھروں کو تمہارے لئے رہائش کی جگہ بنا دیا اور انہوں نے تمہارے لیے مویشیوں کی کھالوں سے خیمے بنا دیئے جو تمہیں سفر کے دنوں میں اور اقامت کے دنوں میں ہلکے محسوس ہوتے ہیں، اور اُن مویشیوں کے اون سے اور اُن کے پشم سے اور بالوں سے تم گھریلو سامان بناتے ہو جو ایک مدت تک تمہارے کام آتے ہیں O" (النحل: ۸۰)

"وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُیُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُیُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا یَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَ یَوْمَ اِقَامَتِكُمْۙ وَ مِنْ اَصْوَافِهَا وَ اَوْبَارِهَا وَ اَشْعَارِهَاۤ اَثَاثًا وَّ مَتَاعًا اِلٰى حِیْنٍ ": اس آیت میں "سَكَنًا" کا لفظ ہے، اس سے مراد وہ جگہ ہے جہاں سکونت اختیار کی جائے۔ نیز اس آیت میں فرمایا: "وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُیُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا یَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَ یَوْمَ اِقَامَتِكُمْ" یعنی حویشیوں کی کھالوں سے تمہارے لیے خیمے بنائے جو ہلکے پھلکے ہوتے ہیں اور تم اپنے سفر کے دنوں میں اور اقامت کے دنوں میں اُن میں آسانی سے رہائش اختیار کرتے ہو۔

"وَ مِنْ اَصْوَافِهَا وَ اَوْبَارِهَا وَ اَشْعَارِهَاۤ اَثَاثًا وَّ مَتَاعًا اِلٰى حِیْنٍ ": "اَصْوَافِهَا" سے مراد دنبوں سے حاصل شدہ اون ہے اور "اَوْبَارِهَا" سے مراد اونٹوں سے حاصل شدہ اون ہے۔ اور "اَشْعَارِهَاۤ" سے مراد بکری کے بال ہیں۔ "اَثَاثًا" کا معنی ہے گھر کا سامان۔ الفراء نے کہا: اثاث کا کوئی واحد نہیں ہے اور ابوزید نے کہا: الاثاث کا معنی ہے: وہ مال جو اونٹوں سے اور بکریوں سے اور غلاموں سے حاصل ہوتا ہے۔ اور متاع واحد کو اثاث کہتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد چادریں، بستر اور کپڑے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اللہ نے تمہارے (آرام کے) لئے اپنی مخلوق میں سے سائے پیدا فرمائے، اور تمہارے لئے پہاڑوں میں غاروں کو پیدا فرمایا، اور تمہارے لیے ایسے لباس پیدا فرمائے جو تمہیں گرمی سے بچاتے ہیں اور ایسے لباس پیدا فرمائے جو تمہیں دورانِ جنگ (اسلحہ) کے ضرر سے محفوظ رکھتے ہیں، اسی طرح اللہ تم پر اپنی نعمت کو مکمل فرماتے ہیں تاکہ تم اسلام قبول کرلو O" (النحل: ۸۱)

"وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا": اور اللہ نے تمہارے (آرام کے) لئے اپنی مخلوق میں سے سائے پیدا فرمائے۔

"وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا": اکنان، کن کی جمع ہے، یہ پہاڑوں کے اندر بنائے ہوئے وہ غار ہیں جن میں انسان بارش سے بچنے کے لیے رہتا ہے۔ "وَّ جَعَلَ لَكُمْ سَرَابِیْلَ تَقِیْكُمُ الْحَرَّ": اس سے مراد اُونی اور سوتی کپڑے ہیں، جن کو انسان گرمی میں اور سردی میں استعمال کرتا ہے۔ "وَ سَرَابِیْلَ تَقِیْكُمْ بَاْسَكُمْ": جیسے "زرہیں" ہیں جن کو انسان حالتِ جنگ میں پہنتا ہے۔ "كَذٰلِكَ یُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْكُمْ": یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو تمہارے نفع کے لیے پیدا فرمایا اور تم پر ان چیزوں کا انعام فرمایا، اسی طرح اللہ تعالیٰ تم پر دین اور دنیا کی نعمتوں کو مکمل فرماتے ہیں۔

"لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تاکہ اے اہلِ مکہ! تم اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کو اخلاص سے مانو اور تم یہ یقین رکھو کہ ان انعامات کو عطا فرمانے پر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی قادر نہیں ہے۔ اور تم اپنے دلوں سے شرک کو نکال دو، یا تم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو تاکہ تم عذاب سے چھٹکارا پاؤ۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "(اے رسولِ اکرم!) پس اگر یہ کفار آپ سے منہ موڑ لیں تو آپ پر تو صرف احکام کو وضاحت سے پہنچا دینا ہے O" (النحل: ۸۲)

"فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ": پس اگر یہ کفار اعراض کریں تو اس وجہ سے آپ پر کوئی عتاب نہیں ہوگا اور نہ اس

میں آپ کی کوئی تقصیر ہے، کیونکہ آپ پر تو صرف احکام کو پہنچا دینا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''یہ لوگ اللہ کی نعمت کو پہچانتے ہیں پھر (اس کے باوجود) اس نعمت کا انکار کرتے ہیں، اور ان میں سے اکثر ناشکرے ہیں O'' (النحل: ۸۳)

''یَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ'': السدی نے کہا: نعمت سے مراد ہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ ''ثُمَّ یُنْكِرُوْنَهَا'': پھر وہ آپ کی تکذیب کرتے ہیں۔ اور دوسرے مفسرین نے کہا: اس نعمت سے مراد اسلام ہے۔

مجاہد اور قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں جو اپنی نعمتیں گنوائی ہیں، وہ اس کا اقرار کرتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، پھر جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدقہ کرو اور اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کرو تو وہ اس کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں: ہم کو تو یہ مال و دولت ہمارے آباء و اجداد سے وراثت میں ملی۔ اور الکلبی نے کہا: جب اُن کے لیے ان نعمتوں کا ذکر فرمایا تو انہوں نے کہا: یہ نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں لیکن ہمارے بتوں نے اللہ تعالیٰ سے ان نعمتوں کے لیے شفاعت کی تھی۔

''وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ'': اور ان میں سے اکثر نعمت کا انکار کرنے والے ہیں اور ناشکرے ہیں۔

(تفسیر غرائب القرآن ورغائب الفرقان، ج ۴ ص ۲۹۰۔ ۲۹۳، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۶ھ، وغاسیر (فزل))

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۸۴﴾

اور جس دن ہم ہر امت سے (اس کے نبی کو بطور) گواہ پیش فرمائیں گے، پھر کفار کو بات کرنے کی بھی اجازت نہیں دی جائے گی اور نہ اُن کا عذر قبول فرمایا جائے گا O

وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۵﴾

اور جب کفار (دوزخ کے) عذاب کو دیکھیں گے تو اُن سے عذاب میں کوئی تخفیف نہیں فرمائی جائے گی اور نہ اُن کو مہلت عطا فرمائی جائے گی O

وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ ۚ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۸۶﴾

اور جب مشرکین اپنے خود ساختہ شرکاء کو دیکھیں گے تو کہیں گے: ''اے ہمارے رب! یہ ہیں ہمارے وہ شرکاء جن کی ہم آپ کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے''، بت اُن سے یہ کہیں گے: ''تم بے شک ضرور جھوٹے ہو'' O

وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِ ِۨالسَّلَمَ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۸۷﴾

اور اس دن مشرکین اللہ کے سامنے سرِ اطاعت جھکا دیں گے اور وہ دنیا میں جو بہتان تراشتے تھے وہ اُن سے غائب ہو جائیں گے O

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ﴿۸۸﴾

جن لوگوں نے از خود کفر کو اختیار کیا اور دوسروں کو اللہ کے راستے سے روکا، ہم اُن کے اس فساد کی وجہ سے اُن کو دگنا عذاب دیں گے O

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۸۹﴾

اور جس دن ہم ہر امت میں انہی میں سے اُن کے نبی کو ان کے خلاف بہ طور گواہ لائیں گے، اور (اے رسولِ اکرم!) ہم آپ کو اُن سب پر گواہ بنا کر لائیں گے اور ہم نے آپ پر قرآن مجید نازل فرمایا ہے جو ہر چیز کا واضح بیان ہے اور ہدایت اور رحمت ہے اور مسلمانوں کے لیے بشارت ہے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور جس دن ہم ہر امت سے (اس کے نبی کو بہ طور) گواہ پیش فرمائیں گے، پھر کفار کو بات کرنے کی بھی اجازت نہیں عطا فرمائی جائے گی اور نہ اُن کا عذر قبول فرمایا جائے گا O'' (النحل: ۸۴)

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ ھ، النحل: ۸۴ تا ۸۹ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا'': اس آیت کی نظیر یہ آیت ہے: ''فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿﴾ (النساء: ۴۱)'' (پس اس وقت کیسا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لے کر آئیں گے اور (اے رسولِ اکرم!) ہم آپ کو اُن سب پر گواہ بنا کر لائیں گے O)۔

کفار کو آخرت میں توبہ اور استغفار کا موقع نہ دیا جانا

''ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا'': پھر کفار کو اللہ تعالیٰ سے بات کرنے اور عذر پیش کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی، جیسے یہ آیت ہے: ''هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿﴾ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴿﴾ (المرسلات: ۳۵۔۳۶)'' (یہ وہ دن ہے جس دن میں کفار نہ بات کر سکیں گے O اور نہ انہیں عذر پیش کرنے کی اجازت دی جائے گی O)۔ اور یہ اس وقت ہوگا جب اُن پر دوزخ کو منطبق کر دیا جائے گا۔

''وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ'': اور نہ اُن کو اس کا مکلف کیا جائے گا کہ وہ اپنے رب کو راضی کریں، کیونکہ آخرت دارِ تکلیف نہیں ہے۔ اور نہ اُن کو دنیا کی طرف لوٹ کر جانے دیا جائے گا کہ وہاں توبہ کر لیں۔ اور اس کا معنی ہے کہ جس پر عتاب کیا گیا ہے وہ عتاب کرنے والے کو راضی کرے، یعنی اُن کو اس کا موقع نہیں دیا جائے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو راضی کریں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور جب کفار (دوزخ کے) عذاب کو دیکھیں گے تو اُن سے عذاب میں کوئی تخفیف

نہیں فرمائی جائے گی اور نہ اُن کو مہلت دی جائے گی O" (النحل: ۸۵)

"وَإِذَا رَاَ الَّذِينَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ": یعنی جب مشرکین جہنم میں دخول کے وقت جہنم کے عذاب کو دیکھیں گے۔

"فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ": تو ان کو مہلت نہیں دی جائے گی، کیونکہ آخرت توبہ کی جگہ نہیں ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور جب مشرکین اپنے خود ساختہ شرکاء کو دیکھیں گے تو کہیں گے: "اے ہمارے رب! یہ ہیں ہمارے وہ شرکاء جن کی ہم آپ کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے"، بت اُن سے یہ کہیں گے: "تم بے شک ضرور جھوٹے ہو" O (النحل: ۸۶)

"وَإِذَا رَاَ الَّذِينَ اَشْرَكُوا شُرَكَآءَهُمْ": یعنی جب مشرکین آخرت میں اپنے اُن بتوں کو دیکھیں گے جن کی انہوں نے عبادت کی تھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ اُن کے معبودوں کو بلائیں گے، پس مشرکین اپنے معبودوں کی پیروی کریں گے حتیٰ کہ وہ معبود اُن کو دوزخ میں داخل کر دیں گے۔

مشرکین کی اپنے معبودوں کی پیروی کرنے کے متعلق احادیث

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو قیامت کے دن جمع فرمائیں گے، پس اللہ عزوجل ارشاد فرمائیں گے: جو شخص جس کی عبادت کرتا تھا اس کے پیچھے جائے، پس جو سورج کی عبادت کرتے تھے وہ سورج کے پیچھے جائیں گے اور جو چاند کی عبادت کرتے تھے وہ چاند کے پیچھے جائیں گے اور جو الطواغیت یعنی بتوں کی عبادت کرتا تھا وہ بتوں کے پیچھے جائے گا اور یہ امت باقی رہے گی۔ الحدیث۔ (صحیح البخاری: ۸۰۶، ۶۵۷۳، ۷۴۳۷، صحیح مسلم: ۱۸۲، سنن نسائی: ۱۱۴۰، مسند احمد: ۷۷۲۰، سنن دارمی: ۲۸۰۱)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمام لوگوں کو ایک زمین میں جمع فرمائیں گے، پھر اُن پر رب العالمین متوجہ ہوں گے، پس اللہ عزوجل فرمائیں گے: سنو! ہر انسان اس کے پیچھے جائے جس کی وہ دنیا میں عبادت کرتا تھا، پس صلیب کی عبادت کرنے والوں کے لیے صلیب کو متشکل کر دیا جائے گا اور تصویروں کی عبادت کرنے والوں کے لیے تصویروں کو مجسم کر دیا جائے گا اور آگ کی عبادت کرنے والوں کے لیے آگ کو کھڑا کر دیا جائے گا۔ پس ہر شخص اس کے پیچھے جائے گا جس کی وہ عبادت کرتا تھا اور مسلمان باقی رہیں گے۔ الحدیث (سنن ترمذی: ۲۵۵۷، ۲۵۶۶، مسند احمد: ۸۸۲۵)

"قَالُوا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِينَ كُنَّا نَدْعُوا مِنْ دُوْنِكَ": یعنی یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے آپ کا شریک بنایا تھا۔

"فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ" پھر اُن سے اُن کے بت کہیں گے کہ ہم ان کے خدا نہ تھے اور نہ ہم نے ان کو اپنی عبادت کرنے کا حکم دیا تھا، اللہ تعالیٰ اُن بتوں میں کلام پیدا فرما دیں گے حتیٰ کہ اس سے کفار کی رسوائی ظاہر ہو جائے گی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد بت نہیں ہیں بلکہ فرشتے ہیں جن کی مشرکین عبادت کرتے تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اس دن مشرکین اللہ کے سامنے سرِ اطاعت جھکا دیں گے اور وہ دنیا میں جو بہتان تراشتے تھے وہ اُن سے غائب ہو جائیں گے O" (النحل: ۸۷)

"وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِ ۨ السَّلَمَ": یعنی اُس دن مشرکین عذاب کو تسلیم کر لیں گے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ عابد اور معبود دونوں

اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیں گے۔ ''وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ'': اور شیطان نے اُن کے لیے جو اعذار خوشنما بنائے تھے وہ ان سے غائب ہو جائیں گے اور وہ جو اپنے بتوں کی شفاعت کا اعتقاد رکھتے تھے، وہ اُن سے غائب ہو جائے گا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''جن لوگوں نے از خود کفر کو اختیار کیا اور دوسروں کو اللہ کے راستہ سے روکا، ہم اُن کے اس فساد کی وجہ سے اُن کو دگنا عذاب دیں گے O'' (النحل: ۸۸)

گمراہ کرنے والے مشرکین کے دگنے عذاب کی کیفیت

''اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ'':

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: وہ عذاب ایسے بچھو ہوں گے جن کی ڈاڑھیں اونچے کھجور کے درخت کی مانند ہوں گی، اور ایسے سانپ ہوں گے جن کی گردنیں اونٹوں کی گردنوں کی طرح ہوں گی۔ اور وہ بچھو اور سانپ اُن کافروں کو ڈسیں گے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اُن کو دوزخ سے نکال کر الزمہریر کی طرف لایا جائے گا۔ زمہریر کی شدید ٹھنڈک کو دیکھ کر پھر وہ دوزخ کی طرف بھاگیں گے، اور تیسرا قول یہ ہے کہ مشرکین کے جو پیش رو ہوں گے، ان کو اُن کے پیروکاروں سے زیادہ عذاب دیا جائے گا۔ ایک عذاب اُن کے کفر کی وجہ سے ہوگا اور دوسرا عذاب اُن کے لوگوں کو گمراہ کرنے کی وجہ سے ہوگا۔

''بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ'': کیونکہ وہ دنیا میں کفر اور نافرمانی کرتے تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور جس دن ہم ہر امت میں انہی میں سے اُن کے نبی کو ان کے خلاف بہ طور گواہ لائیں گے، اور (اے رسولِ اکرم!) ہم آپ کو اُن سب پر گواہ بنا کر لائیں گے اور ہم نے آپ پر قرآن مجید نازل فرمایا ہے جو ہر چیز کا واضح بیان ہے اور ہدایت اور رحمت ہے اور مسلمانوں کے لیے بشارت ہے O'' (النحل: ۸۹)

ہر زمانہ کے شہید کے متعلق اقوال

''وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ'': اور وہ انبیاء ہیں، جو قیامت کے دن اپنی امتوں پر گواہ ہوں گے اور کہیں گے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا پیغام اپنی امتوں کو پہنچا دیا اور اُن کو ایمان کی دعوت دی تھی۔ ہر زمانہ میں شہید ہوتا ہے خواہ وہ نبی نہ ہو، اور اُن کے متعلق دو قول ہیں:

ایک قول یہ ہے کہ وہ ہدایت یافتہ ائمہ ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے خلفاء ہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ وہ علماء ہیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں کو محفوظ فرمایا ہے۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں: جب ہر زمانہ میں انبیاء علیہم السلام کے خلفاء ہوتے ہیں تو اس تقدیر پر لازم آئے گا کہ زمانۂ فترت میں ایسے لوگ ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کو واحد مانیں گے جیسے قس بن ساعدہ اور زید بن عمرو بن نفیل، جن کے متعلق یہ حدیث ہے:

زمانہ فترت میں زید بن عمرو بن نفیل اور ورقہ بن نوفل کا موحد ہونا

سعید بن زید بن عمرو بن نفیل اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور زید بن حارثہ مکہ میں تھے، پس ان دونوں کے پاس سے زید بن عمرو بن نفیل گزرے، پس آپ نے اور زید بن حارثہ نے اُن کو اپنے دسترخوان پر کھانے کی دعوت دی، پس زید بن عمرو بن نفیل نے کہا: اے میرے بھتیجے! میں اس جانور کا گوشت نہیں کھاتا جس کو بتوں کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، انہوں نے بیان کیا: پھر اس کے بعد نبی ﷺ کو کبھی نہیں دیکھا گیا کہ آپ نے اس جانور کا گوشت کھایا ہو جس کو بتوں کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، زید بن عمرو بن نفیل کے بیٹے نے کہا: یا رسول اللہ! میرے والد ایسے ہی تھے جیسا کہ آپ نے دیکھا اور آپ کو اُن کی خبر پہنچی، اگر وہ آپ کا زمانہ پا لیتے تو ضرور آپ پر ایمان لاتے اور ضرور آپ کی پیروی کرتے، آپ اُن کے لیے استغفار کیجئے، آپ نے فرمایا: ہاں! میں اُن کے لیے استغفار کروں گا، کیونکہ وہ قیامت کے دن تنہا ایک امت کے طور پر اٹھائے جائیں گے۔

(مسند احمد: ۱۶۴۸، مسند ابویعلیٰ: ۹۷۳، مسند البزار ج ۳ ص ۱۶۶، الاحاد والمثانی: ۱۷۷، السنن الکبریٰ للنسائی: ۸۰۰، کتاب الشریعۃ للآجری: ۷۸۵، المسند للشاشی: ۲۲۷، المعجم الکبیر للطبرانی: ۳۵۰، کتاب التوحید لابن مندہ: ۱۴۸، المستدرک علی الصحیحین للحاکم: ۴۹۵۶، الجامع الصحیح للسنن والمسانید ج ۱۶ ص ۳۶۷، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشرہ ج ۲۱ ص ۱۶۳)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے زید بن عمرو بن نفیل کے متعلق سوال کیا، پس ہم نے کہا: یا رسول اللہ! وہ قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے اور کہتے تھے کہ میرا دین، دینِ ابراہیم ہے اور میرا معبود وہ ہے جو ابراہیم کا معبود ہے اور وہ نماز پڑھتے تھے اور سجدہ کرتے تھے، آپ نے فرمایا: وہ تنہا ایک امت ہیں، اور اُن کا میرے اور عیسیٰ بن مریم کے درمیان حشر کیا جائے گا، اور آپ سے ورقہ بن نوفل کے متعلق سوال کیا گیا اور کہا گیا: یا رسول اللہ! وہ قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے اور کہتے تھے: میرا خدا اور زید بن عمرو بن نفیل کا خدا واحد ہے اور میرا دین اور زید بن عمرو بن نفیل کا دین واحد ہے، آپ نے فرمایا: میں نے اُن کو دیکھا کہ وہ جنت کے وسط میں چل رہے تھے اور اُن پر سندس ریشم کا حلّہ تھا۔

(مسند البزار: ۲۷۵۲، مجمع الزوائد: ۱۶۱۷۸)

حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ، لکھتے ہیں:

جب ورقہ بن نوفل فوت ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے القس کو جنت میں دیکھا اور ان پر ریشم کے کپڑے تھے، کیونکہ وہ مجھ پر ایمان لائے تھے اور انہوں نے میری تصدیق کی تھی۔ (دلائل النبوۃ ج ۲ ص ۱۵۸)

ابن السکن نے روایت کی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: میں نے ورقہ کو جنت کے دریاؤں میں دیکھا، کیونکہ وہ کہتے تھے: میرا دین اور زید کا دین اور میرا معبود اور زید کا معبود واحد ہے۔

اور امام بزار نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے نبی ﷺ سے ورقہ بن نوفل کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا: میں نے اُن کو خواب میں دیکھا، اُن پر سفید لباس تھا، پس میں نے گمان کیا کہ اگر وہ اہلِ دوزخ سے ہوتے تو اُن پر سفید لباس نہ ہوتا۔ (الاصابہ ج ۶ ص ۴۷۷، ملخصاً وملتقطاً، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

"وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ": اور اے محمد! (صلی اللہ علیک وسلم)، ہم آپ کو ان پر گواہ بنا کر لائیں گے، یعنی آپ کی امت پر گواہ بنا کر لائیں گے، آپ امت کی شہادت کی تصدیق کریں گے کیونکہ آپ کی امت گزشتہ ان امتوں کے خلاف گواہی دے گی جو انبیاء علیہم السلام کے پیغام پہنچانے کی تکذیب کرتی تھیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ گزشتہ امتوں سے فرمائیں گے: "کیا تمہیں رسولوں نے میرا پیغام پہنچایا تھا؟" وہ لوگ کہیں گے: نہیں، پھر رسل علیہم السلام کہیں گے: ہم نے آپ کا پیغام پہنچایا تھا اور ہمارے پاس اس پر گواہ موجود ہیں، اللہ عزوجل فرمائیں گے کہ تمہارے پاس گواہ کون ہیں؟ تو وہ کہیں گے: سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت، پھر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو لایا جائے گا، پس وہ گواہی دیں گے کہ ان رسولوں نے وہ پیغام پہنچادیا جس کی ان پر ان کے رب کی طرف سے ان کی کتاب میں وحی فرمائی گئی تھی، پس گزشتہ امتیں کہیں گی: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں تو زنا کرنے والے بھی تھے، شراب پینے والے بھی تھے، پس ان کی شہادت نہیں قبول کی جائے گی، اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کا تزکیہ فرمائیں گے، تب مشرکین کہیں گے: اللہ کی قسم جو ہمارا رب ہے! ہم مشرک نہ تھے، پھر ان کے مونہوں پر مہر لگادی جائے گی اور ان کے ہاتھ اور ان کے پیر اُن کے کیے ہوئے کاموں کی گواہی دیں گے۔

"وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ": اس آیت کی نظیر اللہ عزوجل کا یہ ارشاد ہے: "مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (الانعام: ۳۸)" (اور ہم نے کتاب (لوح محفوظ) میں کسی چیز کو نہیں چھوڑا)۔ سو اس کا معنی یہ ہے کہ ان ہزار احکام کے بعد مزید احکام کا مکلف کرنا اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے اس مفہوم کو اس آیت سے مؤکد فرمایا: "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ ـــــ (المائدہ: ۳)" (آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل فرمادیا ہے) سو یہ ان علماء کے مذہب کا بیان ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۳ ص ۵۲۷-۵۲۸، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

ابن زید نے اس آیت (الانعام: ۳۸) کی تفسیر میں لکھا ہے: یعنی ہم نے اس کتاب میں کسی چیز سے غفلت نہیں فرمائی اور ہر چیز الکتاب میں مذکور ہے۔ (تفسیر ابن جریر ج ۹ ص ۲۳۴، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۳۴، تفسیر امام ابن ابی حاتم: ۷۲۹۰)

میں کہتا ہوں: ظاہر ہے کہ ابن زید کی یہ تفسیر درست نہیں ہے کیونکہ ہر جزئی، جزئی چیز کا بعینہٖ قرآن مجید میں ذکر نہیں ہے مثلاً برطانیہ کے بحری جہاز ٹائی ٹینک (Titanic)، اسی طرح ایٹم بم، ہائیڈروجن بم، ٹینک اور میزائلوں کا قرآن مجید میں ذکر نہیں ہے، اسی طرح دنیا کے مشہور ممالک مثلاً امریکا، روس، فرانس اور برطانیہ کا قرآن مجید میں ذکر نہیں ہے، ہاں ایسی جامع آیات کا ذکر ہے جن سے ان چیزوں کو مستنبط کیا جاسکتا ہے۔ (سعیدی غفرلہ)

(الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، جز ۱۰ ص ۱۳۵-۱۳۷، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ، وتفاسیر اخرٰی)

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝۹۰

بے شک اللہ عدل کرنے اور فضل کرنے اور رشتہ داروں کو عطا کرنے کا حکم فرماتے ہیں، اور بے حیائی کے کاموں سے اور ناجائز کاموں سے اور ظلم کرنے سے منع فرماتے ہیں، وہ تمہیں نصیحت فرماتے ہیں تا کہ تم نصیحت قبول کرو۔

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْكِیْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَیْكُمْ كَفِیْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۹۱﴾

اور جب تم عہد کرو تو اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کرو، اور قسموں کو پختہ کرنے کے بعد نہ توڑو، حالانکہ تم اللہ تعالیٰ کو اپنے اوپر ضامن قرار دے چکے ہو، بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے ان کاموں کو خوب جانتے ہیں جو تم کرتے ہو O

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ؕ تَتَّخِذُوْنَ اَیْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَیْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِیَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ؕ اِنَّمَا یَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ؕ وَلَیُبَیِّنَنَّ لَكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۲﴾

اور تم اس عورت کی مثل نہ ہو جانا جس نے اپنا دھاگا مضبوطی سے کاتنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تم اپنی قسموں کو آپس میں دھوکا دینے کا ذریعہ بناتے ہو تاکہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے والا ہو جائے، اللہ تمہیں اس فائدہ سے آزماتے ہیں اور اللہ قیامت کے دن تم کو ضرور بہ ضرور وہ چیزیں بیان فرمادیں گے جن میں تم اختلاف کرتے تھے O

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ یُّضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَیَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

اور اگر اللہ (ازل میں) چاہتے تو ضرور تم کو ایک ہی امت بنا دیتے لیکن وہ جسے چاہتے ہیں گمراہی میں چھوڑ دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں ہدایت عطا فرماتے ہیں اور تم سے اُن کاموں کے متعلق ضرور بہ ضرور سوال فرمایا جائے گا جو تم دنیا میں کرتے رہتے تھے O

وَلَا تَتَّخِذُوْۤا اَیْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَیْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَتَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۚ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۹۴﴾

اور تم اپنی قسموں کو ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کا ذریعہ نہ بناؤ تاکہ کچھ لوگوں کے قدم (ہدایت پر) جمنے کے بعد پھسل جائیں اور تم کو اللہ کے راستہ سے روکنے کی وجہ سے عذاب بھگتنا پڑے اور تمہارے لیے بہت سخت عذاب ہوگا O

وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۵﴾

اور اللہ کی کھائی ہوئی قسموں کو تھوڑی قیمت کے عوض فروخت نہ کرو، بے شک (قسم پوری کرنے کا) جو ثواب اللہ کے پاس ہے وہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو O

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ۗ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْۤا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

جو دنیاوی مال تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو اجر اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہے گا اور جن لوگوں نے (قسم پوری کرنے پر) صبر کیا، (ان کے صبر کا) ہم ضرور بہ ضرور اجر عطا فرمائیں گے، ہم اُن کے نیک اعمال کا بہترین اجر عطا فرمائیں گے ○

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۷﴾

جو لوگ نیک اعمال کریں گے خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں بہ شرطیکہ وہ ایمان رکھنے والے ہوں، تو ہم ان کو ضرور بہ ضرور پاکیزہ زندگی عطا فرمائیں گے اور ہم ضرور بہ ضرور اُن کو ایسا اجر عطا فرمائیں گے جو اُن کے کئے ہوئے کاموں میں سب سے بہترین اجر ہوگا ○

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۹۸﴾

پس (اے رسولِ اکرم!) جب آپ قرآن کی تلاوت کا قصد کریں تو شیطان مردود (کے شر) سے اللہ کی پناہ طلب کریں ○

اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۹۹﴾

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور وہ اللہ پر ہی توکل کرتے ہیں ان پر شیطان کا کوئی غلبہ نہیں ہے ○

اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ ع

شیطان کا غلبہ صرف اُن لوگوں پر ہے جو اس سے دوستی رکھتے ہیں اور جو لوگ اس کی وجہ سے اللہ کا شریک قرار دیتے ہیں ○

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”بے شک اللہ عدل کرنے اور فضل کرنے اور رشتہ داروں کو عطا کرنے کا حکم فرماتے ہیں، اور بے حیائی کے کاموں سے اور ناجائز کاموں سے اور ظلم کرنے سے منع فرماتے ہیں، وہ تمہیں نصیحت فرماتے ہیں تاکہ تم نصیحت قبول کرو ○“ (النحل: ۹۰)

”اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ“: (بے شک اللہ عدل کرنے اور فضل کرنے کا حکم فرماتے ہیں)۔

عدل کا معنی

علامہ اسماعیل بن حماد الجوہری الشافعی المتوفی ۳۹۸ھ، لکھتے ہیں:

العدل کا معنی ہے خلاف الجور، یعنی جو چیز ظلم اور بے انصافی کے خلاف ہو، وہ عدل ہے۔ اور العِدل (عین کی زیر کے ساتھ)، اس کا معنی ہے مثل، جب تمہارے پاس ایک غلام ہو جو مخاطب کے غلام کی مثل ہو تو کہا جاتا ہے ”عِندی عِدلُ غلامِک“۔

اور العدل کا معنی الفدیہ بھی ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا یُؤْخَذْ مِنْهَا۔ (الانعام: ۷۰)'' (اور اگر وہ ہر برے کام کے بدلہ میں معاوضہ دے تو اس سے وہ معاوضہ قبول نہیں کیا جائے گا)۔

(المعجم الصحاح، ص ۶۸۰، دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۲۹ھ)

علامہ سید محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی حنفی متوفی ۱۲۰۵ھ، لکھتے ہیں:

عدل اس کام کو کہتے ہیں جس کے متعلق دل میں یہ ہو کہ یہ کام مستقیم ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ جو کام افراط (زیادتی) اور تفریط (کمی) کے درمیان متوسط ہو، اس کو عدل کہتے ہیں۔

امام راغب اصفہانی نے کہا ہے: عدل کی دو قسمیں ہیں: ایک مطلق عدل ہے جس کام کے حسن کا عقل تقاضا کرتی ہے اور وہ کام کسی زمانہ میں منسوخ نہ ہو اور اس کو کسی اعتبار سے بھی حد سے تجاوز نہ کہا جا سکے، جیسے جو شخص تمہارے ساتھ اچھا سلوک کرے تم اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اور جو شخص تم سے ایذاء روک لے، تم اس سے ایذاء روک لو۔ اور دوسری قسم عدل شرعی ہے جس کا کسی زمانہ میں منسوخ ہونا ممکن ہو جیسے قصاص اور جرائم کے تاوان، اور مرتد کے مال کو چھین لینا، اس لیے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَیْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَیْكُمْ۔ (البقرۃ: ۱۹۴)'' (پس اگر تم پر کوئی زیادتی کرے تو تم بھی اس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اس نے تم پر زیادتی کی ہے)۔

اور اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ۝ (الشوریٰ: ۴۰)'' (اور برائی کی کا بدلہ اتنی ہی برائی ہے، پس جو شخص معاف کر دے اور باہمی تعلق درست کر لے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ (کرم) پر ہے، بے شک اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتے۝)۔ پس برائی کے بدلہ کو اس اعتبار سے صورتاً برائی فرمایا ہے ورنہ حقیقت میں برائی کا بدلہ عدل ہے اور اچھائی ہے۔

نیز اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ۔۔۔۔ (النحل: ۹۰)'' (بے شک اللہ عدل کرنے اور فضل کرنے کا حکم فرماتے ہیں)، کیونکہ عدل کا معنی ہے: بدلہ میں مساوات۔ اگر کسی نے اچھا کام کیا ہے تو اس کے ساتھ اتنا ہی اچھا کام کیا جائے اور اگر کسی نے برا کیا ہے تو اس کے ساتھ اتنی ہی برائی کی جائے۔ اور الاحسان کا معنی ہے: کسی شخص کی نیکی کے مقابلہ میں اس سے زیادہ نیکی کرنا، اور اس کی برائی کے بدلہ میں اس سے کم برائی کرنا۔

(تاج العروس من جواہر القاموس، جز ۲۹ ص ۲۵۸۔۲۵۹، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۳۳ھ)

احسان کا معنی

علامہ سید محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی حنفی متوفی ۱۲۰۵ھ، لکھتے ہیں:

احسان اور انعام میں یہ فرق ہے کہ احسان خود انسان کے اپنے لیے بھی ہوتا ہے اور دوسروں کے لیے بھی اور انعام صرف دوسروں کے لیے ہوتا ہے۔

امام راغب اصفہانی نے ''اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ۔۔۔۔ (النحل: ۹۰)'' کی تفسیر میں کہا ہے کہ احسان کا مرتبہ عدل سے اوپر ہے، کیونکہ عدل یہ ہے کہ جتنا کسی نے اس کو دیا ہے اتنا ہی اس کو دیا جائے اور جتنا کسی نے اس سے لیا ہے اتنا ہی اس سے لیا

جائے،اور احسان کا معنی یہ ہے کہ جتنا کسی نے اس کو دیا ہے اس سے زیادہ اس کو عطا کیا جائے اور جتنا کسی نے اس سے لیا ہے اس سے کم اس سے لیا جائے۔ پس احسان کا مرتبہ عدل پر زائد ہے، پس کسی کے ساتھ عدل کرنا واجب ہے اور احسان کرنا مستحب ہے اور نفل ہے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''وَ مَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ۔ (النساء:۱۲۵)'' (اور جس نے اپنا منہ اللہ کے لیے جھکا دیا اور وہ نیکی کرنے والا ہو، اس سے اچھا دین کس کا ہو سکتا ہے)۔ اور اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ۔ (البقرہ:۱۷۸)'' (اور قاتل (مقتول کے ورثاء کو) نیکی کے ساتھ معاف کردہ حصہ ادا کرے)۔ اور اسی وجہ سے اللہ عزوجل نے محسنین کا ثواب بہت زیادہ بیان فرمایا ہے۔

اور حدیث میں ہے، حضرت جبریل نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ ایمان کیا ہے اور احسان کیا ہے؟، اور احسان سے مراد اخلاص ہے اور اخلاص ایمان اور اسلام دونوں کی صحت میں شرط ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ احسان سے مراد اچھے طریقہ سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ۔ (التوبہ:۱۰۰)'' (اور جو لوگ نیکی کے ساتھ ان کے متبعین ہیں) یعنی صحابہ کرام کے ساتھ وہ لوگ لاحق ہیں جو نیک کام کرتے رہتے ہیں۔ اور اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (یوسف:۳۶)'' (بے شک ہم آپ کو نیک لوگوں میں سے خیال کرتے ہیں)، یعنی آپ اُن لوگوں میں سے ہیں جو خواب کی تعبیر بہت اچھے طریقہ سے بیان کرتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ حضرت یوسف کمزور کی مدد فرماتے تھے اور مظلوم کی حمایت فرماتے تھے اور مریض کی عیادت فرماتے تھے اور یہی اُن کا احسان تھا۔

(تاج العروس من جواہر القاموس، جز ۳۴ ص ۴۳۱۔۴۳۲، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۳۳ھ)

النحل: ۹۰ کی فضیلت میں احادیث اور آثار

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ، النحل: ۹۰ تا ۱۰۰ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ۔ (النحل:۹۰)'': (بے شک اللہ عدل کرنے اور فضل کرنے کا حکم فرماتے ہیں)۔

(۱) حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو میں نے اس آیت کی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے سامنے تلاوت کی تو وہ اس پر بہت متعجب ہوئے اور کہا: اے آلِ غالب! اس آیت پر عمل کرو تو تم دنیا اور آخرت میں کامیاب ہو جاؤ گے، پس اللہ کی قسم! بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہارے پاس ایسے رسول بھیجے ہیں جو تمہیں مکارمِ اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں۔

(۲) جب ابو طالب سے یہ کہا گیا کہ آپ کے بھتیجے کا یہ زعم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر قرآن مجید کو نازل فرمایا ہے اور اس میں یہ آیت ہے: ''اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ'' تو ابو طالب نے کہا: میرے بھتیجے کی اتباع کرو، پس اللہ کی قسم! وہ صرف محاسنِ اخلاق کا حکم دیتے ہیں۔

(۳) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے الولید بن المغیرہ پر یہ آیت تلاوت فرمائی: ''اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ'' تو اس نے کہا: اے میرے بھتیجے! اس کو دوبارہ پڑھو، آپ نے دوبارہ پڑھا تو ولید بن مغیرہ نے کہا: اس آیت میں بہت مٹھاس ہے، اور یہ کسی بشر کا کلام نہیں ہے۔

(۴) حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے کہا: میں ابتداءً اسلام نہیں لایا کیونکہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حیاء آتی تھی حتیٰ کہ یہ آیت

نازل ہوئی، اور میں اس وقت آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو میرے دل میں ایمان نے جگہ پکڑ لی، میں نے اس آیت کی الولید بن المغیرہ پر تلاوت کی تو اس نے کہا: اے میرے بھتیجے دوبارہ یہ آیت پڑھو، پس میں نے یہ آیت دوبارہ پڑھی تو اس نے کہا: اس آیت میں بہت مٹھاس ہے۔

(۵) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: قرآن مجید کی یہ آیت ہر خیر کو شامل ہے اور ہر شر سے اجتناب کا اس میں حکم ہے۔

(۶) نقاش نے کہا: عدل کی زکوٰۃ احسان ہے اور قدرت کی زکوٰۃ معاف کرنا ہے اور مال دار کی زکوٰۃ معروف ہے۔ (یعنی جس کے پاس بہ قدر نصاب مال ضرورت سے زائد ہو وہ اس میں سے ڈھائی فیصد زکوٰۃ ادا کرے)۔

العدل اور الاحسان کی متعدد تاویلات

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: عدل سے مراد ہے لا الٰہ الا اللہ اور احسان سے مراد ہے فرائض کا ادا کرنا۔

(۲) دوسرا قول ہے کہ العدل سے مراد ہے فرض اور الاحسان سے مراد ہے نفل۔

(۳) سفیان بن عیینہ نے کہا: عدل سے مراد یہ ہے کہ باطن کا حال ظاہر کے مطابق ہو، اور احسان سے مراد یہ ہے کہ باطن ظاہر سے افضل ہو۔

(۴) حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا: عدل کا معنی ہے انصاف اور احسان کا معنی ہے فضل کرنا۔

(۵) ابن عطیہ نے کہا: عدل سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کو عقائد میں اور احکام شرعیہ میں فرض کیا گیا ہو جیسے امانات کو ادا کرنا اور ظلم کو ترک کرنا اور انصاف کرنا اور حق دار کو اس کا حق ادا کرنا۔ اور احسان سے مراد ہر وہ کام ہے جو مستحب ہو، کیونکہ بعض کام ایسے ہیں جو مطلوب اور مستحب ہیں اور بعض کام ایسے ہیں جو فرض ہیں۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جو عدل کا معنی لا الٰہ الا اللہ بیان کیا ہے، اس پر اعتراض ہے، کیونکہ فرائض کا ادا کرنا یہی اسلام ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل کے سوال میں بتایا اور یہی عدل ہے۔ اور احسان فرائض کی تکمیلات ہیں۔ علامہ قرطبی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما پر اعتراض کرنے کے لیے صحیح مسلم کی حدیث سے احسان کا معنی نقل کیا ہے کہ احسان کا معنی ہے ''ان تعبد اللہ کانک تراہ'' (تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو)۔ ہم پوری وضاحت کے لیے اس حدیث کا متن پیش کر رہے ہیں:

امام مسلم اپنی مکمل سند کے ساتھ یحییٰ بن یعمر سے روایت کرتے ہیں کہ یحییٰ نے بیان کیا کہ جس شخص نے سب سے پہلے تقدیر کا انکار کیا وہ معبد جہنی نام کا ایک شخص تھا جو بصرہ میں رہتا تھا۔ یحییٰ بن یعمر کہتے ہیں کہ میں اور حمید بن عبدالرحمٰن حمیری حج یا عمرہ کی غرض سے گئے اور ہم نے آپس میں کہا: کاش! ہماری ملاقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے کسی صحابی سے ہو جائے اور ہم ان سے تقدیر کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ اتفاقاً ہماری ملاقات حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اس وقت ہوئی، جس وقت وہ مسجد کے اندر موجود تھے، میں اور میرے ساتھی ہم دونوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو اپنے حلقہ میں لے لیا، ایک نے دائیں جانب سے اور دوسرے نے بائیں جانب سے، میرا خیال تھا کہ میرا ساتھی مجھے بات کرنے کا موقع دے گا، لہٰذا میں نے کہا: اے ابو عبدالرحمٰن! ہمارے ہاں کچھ ایسے لوگ ظاہر ہوئے ہیں جو قرآن پڑھتے ہیں اور علمی بحثیں کرتے ہیں (راوی نے ان کی علمی

فضیلت بیان کی) اور ان کا اعتقاد یہ ہے کہ تقدیر کوئی چیز نہیں ہے اور جو کچھ بھی دنیا میں وقوع پذیر ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے علم سابق کے بغیر ابتداءً ظہور میں آتا ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب تم ان لوگوں سے ملو تو ان سے کہنا کہ میں ان سے لاتعلق ہوں اور وہ مجھ سے اور عبداللہ بن عمر حلفیہ کہتا ہے کہ اگر ان لوگوں میں سے کوئی شخص احد پہاڑ جتنا سونا بھی خیرات کر دے تو اللہ تعالیٰ اس کے اس عمل کو اس وقت تک قبول نہیں فرمائیں گے جب تک کہ وہ تقدیر پر ایمان نہ لے آئے۔

پھر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: میرے والد حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایک دن ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے، اچانک ایک شخص آیا جس کا لباس انتہائی سفید اور بال گہرے سیاہ تھے۔ اس شخص کی حالت سے آثار سفر ظاہر نہیں ہوتے تھے اور ہم میں سے ہر شخص کے لیے وہ اجنبی تھا، وہ آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دوزانو بیٹھ گیا، اس نے اپنے گھٹنوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنوں کے ساتھ ملایا اور اپنی ہتھیلیاں اپنی رانوں پر رکھ لیں (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس طرح بیٹھا جیسے شاگرد اپنے استاد کے سامنے باادب بیٹھتا ہے) اور کہنے لگا: یا محمد! مجھ کو اسلام کے بارے میں بتلائیے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام یہ کہتا ہے کہ تم اللہ کی توحید اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رسول ہونے کی گواہی دو، نماز پڑھو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے (مہینے کے) روزے رکھو اور اگر توفیق ہو تو حج کرو، اس اجنبی نے کہا: آپ نے سچ فرمایا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہمیں تعجب ہوا کہ یہ شخص پوچھتا بھی ہے اور بعد میں اس کی تصدیق بھی کرتا ہے، اس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: مجھے ایمان کے بارے میں بتلائیے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اللہ تعالیٰ، ان کے فرشتوں، ان کے صحیفوں، ان کے رسولوں، قیامت اور ہر خیر اور شر کو اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے وابستہ مانو، اس شخص نے کہا: آپ نے سچ فرمایا ہے، اب مجھے (مرتبہ) احسان کے بارے میں بتلائیے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس حال میں کرو گویا کہ تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو اور اگر تم اس حال کو نہ پا سکو تو اللہ تعالیٰ تو تم کو یقیناً دیکھ رہے ہیں، اس نے کہا: مجھے قیامت کے بارے میں بتلائیے! آپ نے فرمایا: اس کے بارے میں جواب دینے والا سوال کرنے والے سے زیادہ جاننے والا نہیں ہے، اس شخص نے کہا: پھر مجھے قیامت کی علامتیں بتلائیے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب باندیوں سے ان کے آقا پیدا ہوں، اور جب تم دیکھو کہ برہنہ تن، برہنہ پا، تنگ دست چرواہے اونچی اونچی عمارتیں بنانے لگیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: پھر وہ شخص چلا گیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں تھوڑی دیر تک بیٹھا رہا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عمر! کیا تم جانتے ہو یہ شخص کون تھا؟ میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ جبرائیل تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے کے لیے تمہارے پاس آئے تھے۔

(صحیح مسلم: ۸، الرقم المسلسل: ۹۳، رقم حدیث الباب: ۱، سنن ابوداؤد: ۴۶۹۵، سنن ترمذی: ۲۶۱۰، سنن نسائی: ۵۰۰۵، ابن ماجہ: ۸۳، تحفۃ الاشراف: ۱۰۵۷۲، صحیح ابن حبان: ۱۶۸)

میں کہتا ہوں کہ علامہ قرطبی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول پر رد کرنے کے لیے اس حدیث کا حوالہ دیا ہے۔ علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ احسان فرائض کی تکمیلات کے لیے ہے، حالانکہ حدیث میں احسان کی تفسیر اس طرح فرمائی گئی ہے کہ ''حضرت جبریل نے کہا: اب مجھے (مرتبہ) احسان کے بارے میں بتلائیے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم

اللہ تعالیٰ کی عبادت اس حال میں کرو گویا کہ تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو اور اگر تم اس حال کو نہ پا سکو تو اللہ تعالیٰ تو تم کو یقیناً دیکھ رہا ہے"۔ پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ نقل صحیح ہو تو ان کے قول کا معنی یہ ہے کہ فرائض دین کی تکمیل کرنے والے ہیں۔

(٦) علامہ ابن العربی نے کہا ہے: عدل بندے اور رب کے درمیان معاملہ ہے اور بندے کا اللہ تعالیٰ کے حق کو اپنے حق پر ترجیح دینا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کو اپنی خواہش پر مقدم کرنا ہے، اور ممنوعہ کاموں سے اجتناب کرنا ہے اور جن کاموں کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے ان کو بجا لانا ہے، اور جو بندے اور اس کے نفس کے درمیان عدل ہے اس کے متعلق اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ (النازعات: ٤٠)" (اور اس نے اپنے نفس کو بری خواہش سے روکا O)۔ اور بندے اور مخلوق کے درمیان عدل کا معنی یہ ہے کہ وہ پوری پوری نصیحت کرے اور خیانت کو ترک کردے خواہ کم ہو یا زیادہ، اور اپنے نفس کے ساتھ مکمل طریقہ سے انصاف کرے۔ اور تمہاری طرف سے کسی کے لیے کوئی برائی نہ ہو، نہ قول میں اور نہ فعل میں، نہ پوشیدہ طور پر اور نہ ظاہر طور پر، اور تم پر جو مصائب اور آفات آئے ہیں ان پر صبر کرو، اور کسی کو ایذاء نہ پہنچاؤ۔

احسان کے متعلق علامہ قرطبی کی تحقیق

علامہ قرطبی فرماتے ہیں: عدل کی تعریف میں یہ تفسیر عمدہ ہے، رہا احسان تو ہمارے علماء نے کہا ہے کہ اس کے دو معنی ہیں: ایک معنی وہ ہے جو بنفسہٖ متعدی ہے جیسے تم کہو "اَحْسَنْتُ كَذَا" میں نے ایسا اچھا کام کیا، اور دوسرا معنی وہ ہے جو حرف جر کے ساتھ متعدی ہوتا ہے جیسے تم کہو "اَحْسَنْتُ اِلٰى فُلَانٍ" یعنی میں نے فلاں شخص کے ساتھ احسان کیا۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں: اس آیت میں یہ دونوں معنی مراد ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتے ہیں کہ لوگ ایک دوسرے کی طرف احسان کریں۔ اور حدیث جبریل میں احسان معنی اول کے ساتھ ہے یعنی جو بنفسہٖ متعدی ہوتا ہے، کیونکہ معنی اول عبادت کو اس کے تمام آداب کے ساتھ ادا کرنے کا تقاضا کرتا ہے اور حق کا مراقبہ کرنے پر دلالت کرتا ہے اور اللہ عزوجل کی عظمت کو عبادت کے شروع کرنے سے لے کر عبادت کے استمرار تک کا تقاضا کرتا ہے، اور یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے مراد ہے: "حضرت جبریل نے کہا: اب مجھے (مرتبہ) احسان کے بارے میں بتلایئے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس حال میں کرو گویا کہ تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو اور اگر تم اس حال کو نہ پا سکو تو اللہ تعالیٰ تو تم کو یقیناً دیکھ رہا ہے"۔

اور ارباب القلوب کے اس مراقبہ میں دو حال ہیں: ایک یہ ہے کہ بندہ پر حق کا مشاہدہ کرنا غالب ہو تو گویا وہ حق کو دیکھ رہا ہے، اور اسی کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث سے اشارہ فرمایا ہے:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہاری دنیا کی تین چیزوں کی محبت میرے دل میں ڈالی گئی ہے: عورتیں، خوشبو اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

(السنن الکبریٰ للنسائی: ٥٣ ٩٣٩، الاحتذکار ج ا ص ٣٦٥، جامع العلوم والحکم ج ٢ ص ١٩٢)

میں کہتا ہوں: اس حدیث کو وارد کرنے سے مقصود یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احسان کے اس مرتبہ پر فائز ہیں کہ آپ اللہ عزوجل کی تجلیات کا مطالعہ اور مشاہدہ کرتے رہتے ہیں، اسی وجہ سے فرمایا: میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں بنادی گئی ہے، کیونکہ آپ نماز اس طرح پڑھتے ہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں اور تجلیات کا مشاہدہ کرنے کی وجہ سے آپ

کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں۔ (سعیدی غفرلہ)

اور دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ بندہ کے احوال پر مطلع ہیں اور اس کا مشاہدہ کرتے ہیں، اور اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے: "اَلَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿﴾ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴿﴾ (الشعراء: ۲۱۸۔۲۱۹)" (جو آپ کو نماز میں قیام کی حالت میں دیکھتے رہتے ہیں O اور آپ کو سجدہ کرنے والوں کے ساتھ سجدہ کرتے ہوئے دیکھتے رہتے ہیں O)۔

"وَ اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى": یعنی قرابت داروں کو دینا اور عطا کرنا، جیسے اللہ عزوجل نے فرمایا: "وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ۔ (بنی اسرائیل: ۲۶)" (اور رشتہ داروں کو اُن کا حق اور مسکینوں اور مسافروں کو ان کا حق دو)۔

اور اس آیت میں مستحب کا عطف واجب پر فرمایا ہے، کیونکہ فرائض کو ادا کرنا واجب ہے اور قرابت داروں کو اُن کی ضرورت کے مطابق دینا مستحب ہے۔ اس آیت میں دینے اور عطا کرنے کو قرابت داروں کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے، کیونکہ اُن کے حقوق مؤکد ہیں اور اُن کے ساتھ صلۂ رحم کرنا زیادہ واجب ہے، اور رحم کا حق اس لیے مؤکد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رحم کو اپنے نام رحمٰن سے بنایا ہے، حدیث صحیح میں رحم کے رشتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کے متعلق اس طرح فرمایا ہے:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا، حتیٰ کہ جب ان کی تخلیق سے فارغ ہو گئے تو رحم نے عرض کیا کہ یہ اس شخص کی جگہ ہے جو قطع رحم سے آپ کی پناہ طلب کرے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں! کیا تم اس سے راضی نہیں ہو کہ میں اس کے ساتھ وصل فرماؤں جو تمہارے ساتھ وصل کرے، اور میں اس سے قطع تعلق فرماؤں جو تم کو قطع کرے، رحم نے عرض کی: کیوں نہیں اے میرے رب! اللہ تعالیٰ نے فرمایا: پس یہ تمہارے لیے ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھو: "فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ ﴿﴾ (محمد: ۲۲)" (تم سے یہ بعید نہیں ہے کہ اگر تم کو حکومت مل جائے تو تم زمین میں فساد کرو گے اور (رحم کے) رشتے توڑ ڈالو گے O)

(صحیح بخاری: ۴۸۳۰، ۴۸۳۱، ۴۸۳۲، ۵۹۸۷، ۷۵۰۲، صحیح مسلم: ۲۵۵۴، مسند احمد: ۸۱۷۶)

"الفحشاء" کے لغوی معنی

علامہ سید محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی حنفی متوفی ۱۲۰۵ھ، لکھتے ہیں:

علامہ اسماعیل بن حماد الجوہری اور علامہ ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ الفاحشۃ کا معنی ہے الزنا۔ اور قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ۔ (النساء: ۱۹)"۔ اس آیت میں "بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ" کی تفسیر زنا کے ساتھ کی گئی ہے، مفسرین نے کہا ہے: وہ فاحشہ یہ ہے کہ کوئی عورت زنا کرے، پھر اس پر حد قائم کرنے کے لیے اس کو نکالا جائے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ جو عورت اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر گھر سے نکلے وہ فاحشہ ہے۔ اور امام شافعی نے کہا ہے: جو عورت اپنے رشتہ داروں کے ساتھ بدزبانی کرے اور اُن کو ایذاء پہنچائے تو وہ فاحشہ ہے۔ اور الفحش اور الفاحشۃ اور الفواحش کا احادیث میں بہ کثرت ذکر ہے۔ اور یہ ہر وہ گناہ یا معصیت ہے جس کا قبیح ہونا بہت زیادہ ہو۔

اور ایک قول یہ ہے کہ جس کام سے اللہ عزوجل نے منع فرمایا اس کا ارتکاب فاحشہ ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ ہر ایسا قول اور فعل جو قبیح ہو، وہ فاحشہ ہے۔ اور تیسرا قول یہ ہے کہ جو کام حق اور تقدیر کے موافق نہ ہو وہ فاحش ہے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

''اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَ یَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَ اللّٰهُ یَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَ فَضْلًا ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۝'' (البقرہ: ۲۶۸) (شیطان تم کو تنگدستی سے ڈراتا ہے اور تم کو بے حیائی (یعنی بخل) کا حکم دیتا ہے اور اللہ تم سے اپنی مغفرت اور فضل کا وعدہ فرماتے ہیں اور اللہ بہت وسعت والے، سب کچھ جاننے والے ہیں ۝)۔ مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ شیطان تم کو فقر سے ڈرا کر یہ حکم دیتا ہے کہ تم صدقہ نہ کرو۔ اور ایک قول یہ ہے کہ فحشاء سے مراد ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے میں بخل کرنا اور اسی اعتبار سے بخیل کو فاحش فرمایا ہے۔ اور کبھی الفاحش کا معنی الکثیر ہوتا ہے جیسا کہ بعض لوگوں نے پسو کے خون کے متعلق کہا: اگر وہ فاحش نہ ہو تو کوئی حرج نہیں، یعنی اگر پسو کا خون زیادہ نہ ہو اور اپنے محل سے متجاوز نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اور کبھی الفحش کا معنی جواب میں حد سے تجاوز کرنا ہوتا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہودی آتے اور وہ کہتے ''السام علیک'' تو آپ جواب میں فرماتے ''وعلیکم'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اُن کی مراد کو سمجھ گئیں تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کی مذمت کی، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رکو اے عائشہ! کیونکہ اللہ تعالیٰ فحش اور تفحش کو ناپسند فرماتے ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! انہوں نے اس طرح اور اس طرح کہا ہے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک میں نے ان کو جواب دے دیا۔

(سنن ابوداؤد: ۴۰۸۹، مسند ابوداؤد طیالسی: ۲۳۸۶، مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۹۵۲۴، کتاب الزہد والرقائق: ۸۵۴، مسند احمد: ۲۳۸۴۷، المنتخب من مسند عبد بن حمید ج ۲ ص ۳۸۰، مسند البزار: ۸۴۸۶، صحیح ابن خزیمہ: ۵۷۴، صحیح ابن حبان: ۵۱۷۲، المعجم الاوسط للطبرانی: ۶۷۵۰، المعجم الکبیر للطبرانی ج ۶ ص ۹۳، معالم السنن ج ۳ ص ۱۰۹، المستدرک علی الصحیحین: ۷۱۷۳، کتاب الآداب للبیہقی: ۳۸۹، الاسماء والصفات للبیہقی: ۱۰۳۹، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۲۱۱۳۹، شعب الایمان للبیہقی ج ۸ ص ۲۶۶، موارد الظمآن: ۱۵۶۶، الجامع الصحیح للسنن والمسانید ج ۱۰ ص ۲۶۶، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشرۃ، ج ۲۰ ص ۱۹۹)

ہر چند کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہودیوں کو جو جواب دیا تھا، وہ حقیقت میں الفحش یا الفحشاء نہیں تھا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سدِ باب کے لیے جواب میں شدت اختیار کرنے سے منع فرمایا۔

(تاج العروس من جواہر القاموس، جز ۱۷ ص ۱۵۳۔ ۱۵۴، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۳۳ھ)

''المنکر'' کے لغوی معنی

علامہ سید محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی حنفی متوفی ۱۲۰۵ھ، لکھتے ہیں:

المنکر، المعروف کی ضد ہے، اور ہر وہ کام جس کی شریعت نے مذمت کی ہو، وہ منکر ہے۔ البصائر میں مذکور ہے: ہر وہ فعل جس کے متعلق عقول صحیحہ یہ حکم لگائیں کہ وہ کام قبیح ہے یا جس کے قبیح ہونے کے متعلق عقول توقف کریں اور شریعت میں وہ کام مذموم ہو سو وہ کام منکر ہے۔ المنکر کے متعلق اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (التوبہ: ۱۱۲)'' (نیکی کا حکم دینے والے ہیں اور برے کاموں سے منع کرنے والے ہیں)۔ اور منکر اور نکیر یہ محسن اور کریم کی مثل ہیں اور یہ دو فرشتوں کے نام ہیں۔ ابن سیدہ نے کہا: یہ وہ فرشتے ہیں جو قبروں میں آزمائش کرتے ہیں۔

(تاج العروس من جواہر القاموس، جز ۱۴ ص ۱۵۸، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۳۳ھ)

"الفحشاء" اور "المنکر" کا وہ معنی جو علامہ قرطبی نے بیان کیا ہے

"وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ": الفحشاء اور الفُحش کا معنی ہے: ہر قبیح قول یا ہر قبیح فعل۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ الفحشاء سے مراد زنا ہے، اور المنکر سے مراد یہ ہے کہ جس کام کے ارتکاب سے شریعت نے منع کیا ہو۔ اور یہ معنی تمام معاصی، رذائل اور الدناءات (برے کاموں) کو شامل ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد شرک ہے۔ اور "الْبَغْيِ" سے مراد تکبر، ظلم اور کینہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی حدود سے تجاوز کرنا ہے اور یہ تمام اُمور منکر کی تفسیر میں داخل ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا کیونکہ ان کا ضرر بہت شدید ہے۔

اور "بغی" کے متعلق درج ذیل احادیث ہیں:

(١) حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی گناہ پر اللہ تعالیٰ دنیا میں جلد سزا نہیں دیتے جب کہ آخرت میں بھی اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے سزا رکھی ہو سوا بغاوت اور قطع رحم کے۔

(سنن ابوداؤد: ٤٩٠٢، سنن ترمذی: ٢٥١١، سنن ابن ماجہ: ٤٢١١، الادب المفرد للبخاری: ٢٩)

(٢) "الباغی مصروع" اور جس شخص کے خلاف بغاوت کی گئی ہو، اللہ تعالیٰ نے اس کی مدد کا وعدہ فرمایا ہے اور بعض نازل شدہ کتابوں میں ہے کہ اگر ایک پہاڑ دوسرے پہاڑ کے خلاف بغاوت کرے تو بغاوت کرنے والے پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا۔

میں کہتا ہوں: اس حدیث کی احادیثِ مرفوعہ میں کوئی اصل نہیں ہے۔ (سعیدی غفرلہ)

نیز علامہ قرطبی فرماتے ہیں: امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری نے اپنی صحیح میں یہ باب قائم کیا ہے: "باب قول اللّٰہ تعالٰی: إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ (النحل: ٩٠)، وقوله: "إِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓى أَنْفُسِكُمْ ـــــ (یونس: ٢٣)، وقوله: "ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ـــــ (الحج: ٦٠)"۔

میں کہتا ہوں کہ صحیح البخاری کے ابواب میں ان آیات کا ذکر نہیں ہے۔

پھر علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ مسلم یا کافر کے اوپر شر پھیلانے کو ترک کرنا چاہیے، اور اس کے ثبوت میں یہ حدیث لکھی ہے:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا گیا حتیٰ کہ آپ یہ خیال کرتے تھے کہ آپ اپنی ازواج کے پاس گئے ہیں حالانکہ آپ نہیں گئے ہوتے تھے، سفیان نے کہا: یہ سب سے شدید جادو کا اثر ہے جب کہ اس طرح ہو، پس آپ نے فرمایا: اے عائشہ! کیا تم کو معلوم ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے اس چیز کا جواب عطا فرما دیا جس کا میں نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا تھا میرے پاس دو مرد آئے، پس ایک میرے سر کے پاس بیٹھ گیا اور دوسرا میرے پیروں کے پاس بیٹھ گیا، پس جو میرے سر کے پاس بیٹھا تھا اس نے دوسرے مرد سے کہا: اس مرد کا کیا حال ہے؟ اس نے کہا: ان پر جادو کیا گیا ہے، اس نے کہا: کس نے جادو کیا ہے؟ اس نے کہا: بنو زریق کے ایک مرد نے جو یہود کا حلیف ہے اور وہ منافق تھا، کہا: کس چیز میں جادو کیا ہے، اس نے کہا: کنگھی میں اور بالوں میں۔ اس نے کہا: وہ کہاں ہے، اس نے کہا کہ وہ نر کھجور کے کھوکھلے شگوفہ میں ہے ذروان کے کنویں میں کنویں کے پتھر کے نیچے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کنویں پر گئے، حتیٰ کہ آپ نے اس کو (کنگھی اور بالوں کو) نکال لیا، پس آپ نے فرمایا: یہی وہ کنواں ہے جو مجھے دکھایا گیا تھا اور گویا کہ اس کا پانی مہندی کا گل چھٹ تھا اور اس کھجور کے

درخت گویا کہ شیاطین کے سر تھے۔ آپ نے فرمایا: پھر وہ جادو کنویں سے نکالا گیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بتایا: پس میں نے پوچھا: آپ نے نُشرہ کیوں نہیں کرایا، یعنی جادو کا توڑ کیوں نہیں کرایا، آپ نے فرمایا: سنو! اللہ تعالیٰ نے مجھے شفاء عطا فرمادی ہے اور میں ناپسند کرتا ہوں کہ میں لوگوں میں سے کسی ایک کے اوپر شر کو پھیلاؤں۔

(صحیح البخاری: ۵۷۶۵، صحیح مسلم: ۲۱۸۹، سنن ابن ماجہ: ۳۵۴۵، مسند احمد: ۲۴۳۴۹)

علامہ قرطبی نے عام علماء کی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیے جانے کی حدیث کا ذکر کیا ہے اور ہم نے اس حدیث کا پورا متن تخریج کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، جز ۱۰ ص ۱۵۰، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

لیکن ہمارے نزدیک تحقیق یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر نہیں ہوا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیے جانے کے متعلق مصنف کا نظریہ

ہمارے نزدیک حسب ذیل وجوہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر کیے جانے کی روایات صحیح نہیں ہیں:

(۱) بعض روایات میں ہے کہ کنگھی اور جن بالوں پر جادو کیا گیا تھا، ان کو کنویں سے نکال لیا گیا تھا۔ (صحیح بخاری: ۵۷۶۵)

(۲) اور بعض روایات میں ہے کہ آپ نے اس کو کنویں سے نہیں نکالا۔ (صحیح بخاری: ۵۷۶۶)

(۳) بعض روایات میں ہے کہ جادو کے اثر سے آپ کو یہ خیال ہوتا کہ آپ نے کوئی کام کر لیا ہے، حالانکہ آپ نے وہ کام نہیں کیا تھا۔ (صحیح البخاری: ۵۷۶۵)

(۴) بعض احادیث میں ہے کہ آپ کی نظر متاثر ہو گئی تھی اور آپ دیکھتے کچھ تھے اور آپ کو نظر کچھ آتا تھا۔

(طبقات کبریٰ ج ۲ ص ۱۵۲)

(۵) بعض احادیث میں ہے کہ جادو کے اثر سے آپ کی مردانہ قوت متاثر ہو گئی تھی، یحییٰ بن یعمر کی روایت میں ہے کہ آپ ایک سال تک حضرت عائشہ سے رکے رہے یعنی مقاربت نہیں کر سکے۔ (العیاذ باللہ)۔ (مصنف عبدالرزاق: ۱۹۷۶۵)

(۶) بعض احادیث میں ہے: کنویں سے جب شگوفہ نکالا گیا تو اس میں گیارہ گرہیں تھیں، اس وقت آپ پر سورۃ الفلق اور سورۃ الناس نازل ہوئیں، آپ ان میں سے ایک ایک آیت پڑھتے جاتے تھے اور گرہیں کھلتی جاتی تھیں۔

(طبقات کبریٰ ج ۲ ص ۱۵۳، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۸ھ)

(۷) جس حدیث کا متن اتنی وجوہ سے مضطرب ہو اس سے احکام میں بھی استدلال کرنا جائز نہیں ہے، چہ جائیکہ اس سے عقائد میں استدلال کیا جائے۔

(۸) جو خبر واحد صحیح ہو، وہ بھی قرآن مجید کے مزاحم نہیں ہو سکتی، جب کہ یہ حدیث سنداً صحیح نہیں ہے، حدیث صحیح وہ ہوتی ہے جو غیر معلل ہو اور یہ حدیث معلل ہے کیونکہ اس میں علل خفیہ قادحہ ہیں، یہ حدیث منصب نبوت کے منافی ہے۔

(۹) اس حدیث میں مذکور ہے کہ آپ جادو کے اثر سے جماع پر قادر نہ ہوئے اور ایک سال تک حضرت عائشہ سے رکے رہے اور نامرد ہونا ایسی بیماری ہے جو لوگوں میں معیوب سمجھی جاتی ہے، نیز اس میں مذکور ہے کہ آپ کی نظر میں فرق آ گیا تھا اور بھینگا ہونا لوگوں میں معیوب سمجھا جاتا ہے اور نامردی اور بھینگے پن سے لوگ عار محسوس کرتے ہیں اور نبی کی شرائط میں سے یہ ہے کہ اس کو کوئی ایسی

بیماری نہ ہو جو لوگوں میں معیوب اور باعثِ عار سمجھی جاتی ہو اور لوگوں کو اس بیماری سے گھن آتی ہو۔

علامہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی متوفی ۷۹۳ھ لکھتے ہیں:

نبوت کی شرائط یہ ہیں: وہ مرد ہو، اس کی عقل کامل ہو، اس کی رائے قوی ہو، وہ ان چیزوں سے سلامت ہو جن کو لوگ برا جانتے ہیں، مثلاً اس کے آباء و اجداد زنا نہ کرتے ہوں اور اس کے سلسلۂ نسب میں مائیں بدکار نہ ہوں اور وہ ایسی بیماریوں سے محفوظ ہو جن کو لوگ برا جانتے ہیں، مثلاً برص اور جذام وغیرہ اور کم تر پیشوں سے اور ہر اس چیز سے جو مروت اور حکمت بعثت میں مخل ہو۔

(شرح المقاصد ج ۵ ص ۶۱، مطبوعہ منشورات الرضی، ایران، ۱۴۰۹ھ)

علامہ محمد بن احمد السفارینی متوفی ۱۱۸۸ھ لکھتے ہیں:

نبوت کی شرائط میں سے یہ ہے کہ نبی ہر اس چیز سے سلامت ہو جس سے لوگ متنفر ہوں، جیسے ماں باپ کی بدکاری اور ایسے عیوب جن سے لوگ نفرت کرتے ہوں جیسے برص اور جذام وغیرہ۔ (لوامع الانوار ج ۲ ص ۲۷۰، مطبوعہ مکتب اسلامی، بیروت ۱۴۱۱ھ)

اس پر دلیل قرآن مجید کی یہ آیتیں ہیں:

وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ۝ (ص: ۴۷) — اور بے شک وہ سب (نبی) ہمارے نزدیک پسندیدہ اور بہترین لوگ ہیں ○

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (آل عمران: ۳۳) — بے شک اللہ نے آدم کو اور نوح کو اور آلِ ابراہیم کو اور آلِ عمران کو (ان کے زمانہ میں) تمام جہان والوں پر فضیلت عطا فرمائی ○

اور جس شخص کو ایسی بیماری ہو جائے جس سے ایک سال تک وہ اپنی ازواج سے مقاربت نہ کر سکے اور جس کو صحیح نظر نہ آئے، وہ تمام لوگوں سے پسندیدہ نہیں ہو سکتا، سو اس قسم کی وضعی روایات سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی بنیاد ہی منہدم کر دیتی ہیں۔

(۱۰) اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ آپ پر جادو کیا گیا تھا تو جادوگر آپ کو نقصان پہنچانے میں اور آپ کے حواس اور قُویٰ معطل کرنے میں کامیاب ہو گیا، حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى ۝ (طٰہٰ: ۶۹) — اور جادوگر کہیں سے بھی آئے وہ کامیاب نہیں ہو سکتا ○

اور اللہ تعالیٰ نے شیطان سے فرمایا:

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝ (الحجر: ۴۲) — بے شک میرے (مُخلِص) بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا سوا اُن گمراہوں کے جنہوں نے تیری پیروی کی ○

(۱۱) یہ درست ہے کہ یہ روایات صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں موجود ہیں، اور صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی عظمت اور حرمت ہمارے دلوں میں بجا ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور حرمت ہمارے دلوں میں ان سے کہیں زیادہ ہے بلکہ تمام مخلوق سے زیادہ ہے، یہ احادیث اضطراب اور تعارض سے قطع نظر معلل ہیں، ان میں متعدد علل خفیہ قادحہ ہیں جن کا مخالف قرآن اور منافی عظمت رسول ہونا سب سے زیادہ نمایاں ہے، ہمارے لیے یہ زیادہ آسان ہے کہ ہم ایک سال یا چھ ماہ تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر ہونے کے بجائے یہ مان لیں کہ اس حدیث کی صحت میں امام بخاری سے چوک ہو گئی، اور اس حدیث میں امام بخاری اور امام مسلم صحت

حدیث میں اپنے مقرر کردہ معیار کو برقرار نہیں رکھ سکے، ہوسکتا ہے کہ یہ حدیث روایتاً صحیح ہو لیکن یہ حدیث درایتاً صحیح نہیں ہے۔ اس سے پہلے ہم لکھ چکے ہیں کہ امام بخاری اور امام مسلم نے یہ روایت کیا ہے کہ جب قریش نے کعبہ کی تعمیر کی تو عباس اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی کندھے پر پتھر لا کر رکھ رہے تھے، عباس نے آپ کا تہبند اتار کر آپ کے کندھے پر رکھ دیا، تا کہ پتھر کندھے میں نہ چبھے، آپ بے لباس ہو گئے اور بے ہوش ہو کر گر گئے اور ہوش میں آ کر فرمایا: میرا تہبند، میرا تہبند۔ یہ اعلان نبوت سے پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے، اس وقت آپ کی عمر شریف ۳۵ سال تھی، ہم نے اس جگہ بھی لکھا تھا: یہ حدیث معلل ہے اور درایتاً صحیح نہیں ہے؛ کسی کم عمر کے بچے کے متعلق تو یہ بات متصور ہو سکتی ہے کہ وہ اپنا تہبند کندھے پر رکھ لے، لیکن ۳۵ سال کے مرد کے لیے یہ قرین قیاس نہیں ہے اور اس عمر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بے لباس ہو جانا ہمارے نزدیک لائق قبول نہیں ہے، اور یہ ناموس رسالت کے منافی ہے اور ہر ایسی حدیث لائق قبول نہیں ہے۔

(۱۲) اس حدیث کی زیادہ سے زیادہ تاویل یہ ہو سکتی ہے جو علامہ ابوبکر جصاص نے کی ہے کہ یہودیوں نے اپنے منصوبہ کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کرایا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے منصوبہ کو ناکام بنا دیا اور آپ پر جادو کا کوئی اثر نہیں ہوا اور جن احادیث میں یہ جملے مذکور ہیں کہ آپ کو خیال ہوتا تھا کہ میں نے یہ بات کہہ دی ہے، حالانکہ آپ نے نہیں کہی تھی یا آپ کو خیال ہوتا تھا کہ آپ نے یہ کام کر لیا ہے اور آپ نے وہ کام نہیں کیا تھا، اسی طرح اور دوسری خرافات بیان کی ہیں، یہ سب کسی بے دین راوی کا اضافہ ہے اور حضرت ام المومنین پر بہتان ہے، یہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ واقعہ صلح حدیبیہ کے بعد کا ہے اور اس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغی، تعلیمی اور فتوحات کے اعتبار سے بہت معروف سال گزارا ہے، اگر جادو کے اثر سے آپ کے حواس اور قوٰی ایک سال تک معطل رہے ہوتے تو اس سال یہ تمام کام کس طرح انجام دیے جا سکتے تھے، نیز اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ اس وقت سورۃ الفلق اور الناس نازل ہوئیں جب کہ یہ دونوں کی سورتیں ہیں مدنی نہیں ہیں، حدیث کی صحت کی تحقیق کرنے میں امام بخاری اور امام مسلم کی شخصیت مسلم ہے، لیکن وہ بہر حال انسان ہیں نبی یا فرشتے نہیں ہیں، یہ ہو سکتا ہے کہ راویوں کی چھان پھٹک میں بعض اوقات ان سے کوئی سہو ہو گیا ہو، اور کسی ایک آدھ جگہ سہو ہو جانے سے ان کی عظمت اور مہارت میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر ہونے کے متعلق مصنف کا آخری قول

اب تک میں نے دلائل سے یہی سمجھا ہے کہ یہود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر ڈالنے میں کامیاب نہیں ہوئے اور یہ غلط ہے کہ چالیس راتوں تک آپ پر جادو کا اثر رہا یا چھ ماہ تک آپ پر جادو کا اثر رہا یا ایک سال تک آپ پر جادو کا اثر رہا۔ لیکن چونکہ علماء امت کی عظیم اکثریت کا یہ مذہب ہے کہ آپ پر جادو کا اثر ہوا تھا تو میں یہ سوچتا ہوں کہ علماء امت کی عظیم اکثریت کے مقابلہ میں میری منفرد رائے کیا حیثیت رکھتی ہے، ہو سکتا ہے یہاں پر ایسے دلائل ہوں جو مجھ پر منکشف نہ ہوئے ہوں اور ان دلائل کے اعتبار سے آپ پر جادو کا اثر ہوا ہو، سو اگر واقع میں ایسا ہے تو میں اپنی تحقیق سے رجوع کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور توبہ کرتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ ہو سکتا ہے کہ میرے مطالعہ میں کمی ہو اور میری فکر میں نقص ہو اور میں اس معاملہ کی حقیقت تک نہ پہنچ سکا ہوں، اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے، میں نے وہی لکھا جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب نبوت اور آپ کی عظمت اور شان کے مطابق سمجھا، لیکن میں بہت گناہ گار انسان ہوں اور میری فکر اور عقل بھی نارسا ہے، ہو سکتا ہے جس طرح جمہور

علماء نے کہا ہے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اور آپ کی عظمت ہو اور میں اس کی حقیقت تک نہ پہنچ سکا ہوں، سو اگر ایسا ہے تو میں اپنی اس تحقیق سے رجوع کرتا ہوں۔ (سعیدی غفرلہ)

اگر کوئی عامل عدل کرے اور احسان نہ کرے تو اس کو معزول کرنے کا جواز

نیز علامہ قرطبی اس بحث کے اخیر میں لکھتے ہیں کہ اس آیت میں نیکی کا حکم دینے اور برائی سے منع کرنے کا ذکر ہے، ایک جماعت نے اپنے عامل کو ابوجعفر المنصور العباسی کے سامنے پیش کیا اور اس جماعت نے عامل پر غلبہ پایا، کیونکہ اس جماعت نے اس عامل کے خلاف بہت بڑا ظلم ثابت نہیں کیا تھا، تو قوم میں سے ایک نوجوان نے کہا: اے امیر المومنین! اللہ تعالیٰ نے عدل کرنے اور احسان کرنے کا حکم فرمایا ہے، اس عامل نے عدل تو کیا ہے اور احسان نہیں کیا، تو ابوجعفر اس شخص کی رائے کی اصابت سے متعجب ہوا اور عامل کو معزول کر دیا۔

"يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ": وہ تمہیں نصیحت فرماتے ہیں تاکہ تم نصیحت قبول کرو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور جب تم عہد کرو تو اللہ سے کئے ہوئے عہد کو پورا کرو، اور قسموں کو پختہ کرنے کے بعد نہ توڑو، حالانکہ تم اللہ تعالیٰ کو اپنے اوپر ضامن قرار دے چکے ہو، بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے ان کاموں کو خوب جانتے ہیں جو تم کرتے ہو O" (النحل:۹۱)

اللہ عزوجل سے کئے ہوئے عہد یا ان کی کھائی ہوئی قسم کے پورا کرنے کا وجوب

"وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ": "عَهْدِ اللّٰه" کا لفظ عام ہے، انسان زبان سے جو عہد کرتا ہے یا جس کام کا خرید و فروخت سے التزام کرتا ہے تو ان سب کو یہ شامل ہے۔ اور یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو بھی متضمن ہے: "اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ (النحل:۹۰)"، کیونکہ اس کا معنی ہے اس طرح کرو، اور اس طرح کرنے سے رک جاؤ۔ قتادہ، مجاہد اور ابن زید نے کہا: یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسلام پر بیعت لے رہے تھے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں جو حلف اٹھایا جاتا تھا، اس کے التزام کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی ہے اور اسلام کے احکام آگئے اور اس عہد کو پورا کرنے کا حکم دیا اور اس کا عموم ہر قسم کے عہد کو شامل ہے۔

اسلام میں حلف اٹھانے کی تحقیق

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام میں کوئی حلف نہیں ہے، حلف جاہلیت میں ہوتا تھا اور اسلام نے اس میں اور شدت کا حکم دیا۔ (صحیح مسلم: ۲۵۳۰، الرقم المسلسل: ۶۳۱۱، رقم حدیث الباب: ۲۰۶، سنن ابوداؤد: ۲۹۲۵)

عاصم نے بیان کیا کہ میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کیا آپ کو یہ حدیث پہنچی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام میں کوئی معاہدہ نہیں ہے؟ تو انہوں نے کہا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے گھر میں قریش اور انصار کے درمیان معاہدہ کرایا۔
(صحیح بخاری: ۲۲۹۳، ۶۰۸۳، ۷۳۴۰، صحیح مسلم: ۲۵۲۹، سنن ابوداؤد: ۲۹۲۶، مسند احمد: ۱۳۵۷۳)

اس حدیث میں مذکور ہے "لا حِلْفَ فِي الاسلام" کیونکہ حلف باہمی اتفاق کے لیے ہوتا ہے، اور اسلام نے مسلمانوں کو باہم

جمع فرمادیا تھا اوران کے درمیان دلوں میں الفت ڈال دی تھی، پس ان کے لیے کسی اور معاہدہ کی ضرورت نہیں تھی۔ اور لوگ زمانہ جاہلیت میں حلف اٹھا کر معاہدہ کرتے تھے کیونکہ وہ لوگ آپس میں منتشر اور متفرق تھے۔

اس حدیث میں مذکور ہے "قد حالف النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کیونکہ ان دونوں حدیثوں میں تعارض ہے، ایک حدیث میں ہے کہ اسلام میں حلف نہیں ہے، اور دوسری حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش اور انصار کے درمیان معاہدہ فرمایا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جو نفی ہے وہ زمانہ جاہلیت کا معاہدہ ہے اور جو مثبت ہے وہ مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی بنانا ہے۔ علامہ نووی نے کہا ہے "لا حلف فی الاسلام" کا معنی ہے کہ ایک دوسرے کے وارث بننے کا معاہدہ، یا جو چیز شرعاً ممنوع ہو، اس کا معاہدہ اسلام میں جائز نہیں ہے، لیکن مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی بنانا اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور نیکی کے کاموں میں تعاون کرنے کا جو معاہدہ ہو وہ منسوخ نہیں ہوا، منسوخ وہ ہوا ہے جس کا تعلق زمانہ جاہلیت کے ساتھ تھا۔

(عمدۃ القاری ج ۲۲ ص ۲۳۰-۲۳۱، دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۲۱ھ)

زمانہ جاہلیت کے معاہدہ کو منسوخ کرنے کی توجیہ

میں کہتا ہوں کہ زمانہ جاہلیت میں معاہدہ اس طرح ہوتا تھا کہ ایک فریق دوسرے فریق سے معاہدہ کرتا کہ اسے ہر حال میں دوسرے فریق کی مدد کرنا ہوگی خواہ دوسرا فریق حق پر ہو یا باطل پر ہو، حتیٰ کہ اگر دوسرے فریق نے کسی کو قتل کردیا ہو تو اسے قاتل کی بھی مدد کرنا پڑتی تھی، اسلام نے ایسے معاہدہ کو منسوخ کردیا اور فرمایا: "لَا حِلْفَ فِي الْإِسْلَامِ"۔ البتہ نیکی اور احکام شرعیہ کی پیروی میں ایک دوسرے کی مدد کا جو معاہدہ کیا جائے، وہ اب بھی باقی ہے۔ (سعیدی غفرلہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلف کو برقرار رکھنا

طلحہ بن عبداللہ بن عوف بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں عبداللہ بن جدعان کے گھر میں اس وقت موجود تھا جب وہ حلف اٹھا رہے تھے اور اگر اس حلف کے بدلہ میں مجھے سرخ اونٹ بھی مل جائیں تو وہ مجھے پسند نہیں ہیں۔ اور اگر اس حلف کے ساتھ اسلام میں مجھے دعوت دی جائے تو میں اس کو قبول کروں گا۔ القتبی نے کہا: اس حلف کا سبب یہ تھا کہ قریش حرم میں ایک دوسرے پر ظلم کرتے تھے تو عبداللہ بن جدعان اور زبیر بن عبدالمطلب نے ان کو بلایا اور ان کو اس پر حلف کی دعوت دی کہ وہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور مظلوم کا حق ظالم سے وصول کریں گے، تو ان دونوں نے اس دعوت کو قبول کرلیا۔

(السنن الکبریٰ للبیہقی: ۱۳۰۸۰، صحیح ابن حبان: ج ۱۰ ص ۲۱۸، معرفۃ السنن والآثار: ۴۲۲۳)

صحابہ کرام کا حلف کو برقرار رکھنا

اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

ابن اسحاق نے کہا: الولید بن عتبہ نے حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے مال پر قبضہ کرلیا، اس وقت ولید بن عتبہ مدینہ پر گورنر تھا تو اس سے حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما نے کہا: میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم ضرور میرے حق میں سے آدھا دے دو، ورنہ میں اپنی تلوار پکڑوں گا اور پھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں کھڑا ہوں گا، پھر میں حلف فضول کی دعوت دوں گا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر

بعض نے کہا: اور میں بھی حلف اٹھاتا ہوں اور میں اپنی تلوار پکڑتا ہوں حتیٰ کہ ہم اپنا حق وصول کریں یا ہم مرجائیں، اور المسور بن مخرمہ کو یہ خبر پہنچی تو انہوں نے بھی اس کی مثل کہا۔ اور عبدالرحمٰن بن عثمان بن عبیداللہ تیمی کو یہ خبر پہنچی تو انہوں نے بھی اس کی مثل کہا۔ جب ولید کو یہ خبر پہنچی تو اس نے انصاف کیا اور وہ آدھا مال حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما کو دے دیا۔ علماء نے کہا: یہ وہ حلف (معاہدہ) تھا جو زمانہ جاہلیت میں ہوتا تھا اور اسلام نے اس کو اور مضبوط کیا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنے اس ارشاد سے مستثنیٰ فرمالیا کہ اسلام میں حلف نہیں ہے۔ اور اس کی حکمت یہ ہے کہ شریعت نے حکم دیا ہے کہ ظالم سے مظلوم کا حق وصول کیا جائے اور مظلوم تک وہ حق پہنچایا جائے۔

ظالم کو ظلم سے روکنے کے متعلق احکام

اور ظالموں کے متعلق قرآن مجید کی یہ آیت ہے: ''اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَى الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ اُولٰٓىٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝ (الشوریٰ: ۴۲)'' (گرفت تو صرف ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق فساد پھیلاتے ہیں، ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے ۝)۔ اور اس کی تائید میں حسب ذیل احادیث ہیں:

(۱) حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے بھائی کی مدد کر خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو، پس ایک مرد نے کہا: یارسول اللہ! جب وہ مظلوم ہوگا تو میں اس کی مدد کروں گا، آپ یہ بتائیے کہ جب وہ ظالم ہوگا تو میں اس کی مدد کیسے کروں گا؟! آپ نے فرمایا: تم اس کو ظلم سے باز رکھو یا منع کرو تو بے شک یہ بھی اس کی مدد ہے۔

(صحیح البخاری: ۲۴۴۳، ۲۴۴۴، ۶۹۵۲، سنن ترمذی: ۲۲۵۵، مسند احمد: ۱۳۶۶۶)

ظالم کو ظلم سے نہ روکنے پر عام عذاب کے نزول کا خطرہ

(۲) قیس بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اللہ عزوجل کی حمد و ثنا کرنے کے بعد فرمایا: اے لوگو! تم اس آیت ''عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا یَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ ؕ (المائدہ: ۱۰۵)'' (تم اپنی جانوں کی فکر کرو جب تم ہدایت پر قائم ہو گے تو کوئی گمراہ تمہیں ضرر نہیں پہنچا سکے گا) کو پڑھتے ہو اور اس آیت کو اس کے غیر محل میں رکھتے ہو، اور خالد نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے تھے کہ جب لوگ کسی ظالم کو دیکھیں اور اس کے ہاتھوں کو نہ پکڑیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن سب کے اوپر عام عذاب لے آئیں گے۔
اور عمرو نے ہشیم سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جن لوگوں میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں کی جاتی ہوں اور وہ لوگ اُن نافرمانیوں کو بدلنے پر قادر ہوں پھر وہ اُن نافرمانیوں کو نہ بدلیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن سب پر عام عذاب لے آئیں گے۔

(سنن ابوداؤد: ۴۳۳۸، سنن ترمذی: ۲۱۶۸، سنن ابن ماجہ: ۴۰۰۵، مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۷۵۸۳، مسند احمد: ۳۱۰۲۸، ۱۱، الآحاد والمثانی: ۶۳، شرح مشکل الآثار: ۱۱۶۸، ۱، المعجم الکبیر للطبرانی: ۲۳۸۴، ۱، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۲۰۱۸۹، موارد الظمآن: ۱۸۳۸، ۱، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشر ۲، ج ۳ ص ۳۲۸)

پکی قسموں کو توڑنے کی ممانعت

''وَ لَا تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْكِیْدِهَا'': یعنی تم اپنی قسموں کو پکا کرنے کے بعد نہ توڑو۔
''وَ قَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَیْكُمْ كَفِیْلًا'': حالانکہ تم اپنی قسموں پر اللہ تعالیٰ کو شہید بنا چکے ہو۔ اور کہا جاتا ہے: اللہ تعالیٰ کو حافظ

بنا چکے ہو، اور کہا جاتا ہے: اللہ تعالیٰ کو ضامن بنا چکے ہو۔ اور اس آیت میں فرمایا ہے: "اپنی قسموں کو پکا کرنے کے بعد" تا کہ ان پکی قسموں کا لغو قسموں سے امتیاز ہو، پکی قسم وہ ہے جو قسم کے عزم کے ساتھ موکد کی جاتی ہے اور لغو قسمیں وہ ہیں جو کوئی شخص بات بات پر لا واللہ، بلیٰ واللہ کہتا ہے۔

ابن وہب اور ابن القاسم نے امام مالک سے روایت کی ہے کہ قسم کی تو کید یہ ہے کہ انسان کسی چیز میں بار بار قسم اٹھائے تین مرتبہ یا چار مرتبہ قسم اٹھا کر کوئی بات کہے، جیسے کوئی شخص کہے: اللہ کی قسم! میں اس میں بالکل کمی نہیں کروں گا، اللہ کی قسم! میں اس میں بالکل کمی نہیں کروں گا، اللہ کی قسم! میں اس میں بالکل کمی نہیں کروں گا، پھر اگر وہ اس قسم کو توڑ دے تو اس کا کفارہ ایک ہی ہوتا ہے جیسے قسم کا کفارہ ہوتا ہے۔ اور یحییٰ بن سعید نے کہا: یہ عہود ہیں اور عہود قسم ہیں، جب کہ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ عہد شکنی میں کفارہ نہیں ہوتا اور قسم کا کفارہ ہوتا ہے۔ اور عہد شکنی کے متعلق نبی ﷺ کی یہ وعید ہے:

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ہر عہد شکن کے لیے اس کی عہد شکنی کی وجہ سے ایک جھنڈا گاڑ دیا جائے گا۔ (صحیح البخاری: ۳۱۸۸، ۶۱۷۷، ۶۱۷۸، ۶۹۶۶، ۷۱۱۱، صحیح مسلم: ۱۷۳۵، الرقم المسلسل: ۴۴۲۰)

فقہائے احناف کے نزدیک یمین لغو کی تعریف

شمس الائمہ امام ابوبکر محمد بن احمد بن ابی سہیل السرخسی الحنفی المتوفی ۴۸۳ ھ لکھتے ہیں:

علماء کا یمین اللغو کی صورت میں اختلاف ہے۔ اور یمین اللغو میں گرفت کا نہ ہونا قرآن مجید میں منصوص ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ" (البقرہ: ۲۲۵) "(اور اللہ تمہاری بلا قصد کھائی ہوئی قسموں پر گرفت نہیں فرمائیں گے)۔

پس ہمارے نزدیک یمین اللغو کی صورت یہ ہے کہ ماضی کی کسی بات پر حلف اٹھایا جائے یا حال کی کسی بات پر حلف اٹھایا جائے اور حلف اٹھانے والا یہ سمجھتا ہو کہ وہ حق پر ہے، پھر واقع میں اس کے خلاف ظاہر ہو، یہ تعریف حضرت زرارۃ بن ابی اوفیٰ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کی دو روایتوں میں سے ایک روایت میں منقول ہے۔

(المبسوط، جز ۸ ص ۱۳۶-۱۳۷، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۱ھ)

قسم توڑنے کا کفارہ

اور جو شخص اللہ کی قسم کھائے تو اللہ سبحانہ نے اس میں کفارہ کو مشروع فرمایا ہے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ" (المائدہ: ۸۹) "(تمہاری بے مقصد کھائی ہوئی قسموں پر اللہ گرفت نہیں فرمائے گا لیکن تمہاری پختہ کھائی ہوئی قسموں پر اللہ تعالیٰ تمہارا مواخذہ فرمائیں گے، سو ایسی قسموں کا کفارہ دس مسکینوں کو ایسا کھانا کھلانا ہے جس قسم کا درمیانی کھانا تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو، یا دس مسکینوں کو کپڑے دینا ہے یا ایک غلام آزاد کرنا ہے، پس جو شخص ان میں سے کسی چیز کو نہ پائے تو وہ تین دن کے روزے رکھے، یہ تمہاری اُن قسموں کا کفارہ ہے جن قسموں کو تم کھاؤ (اور ان کو توڑ

بیٹھو) اور تم اپنی قسموں کی ٹوٹنے سے حفاظت کرو، اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی آیات کو کھول کھول کر بیان فرماتے ہیں تاکہ تم اللہ کا شکر ادا کرو(O)۔

"اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ": بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے ان کاموں کو خوب جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور تم اس عورت کی مثل نہ ہو جانا جس نے اپنا دھاگا مضبوطی سے کاتنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، تم اپنی قسموں کو آپس میں دھوکا دینے کا ذریعہ بناتے ہو تاکہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے والا ہو جائے، اللہ تمہیں اس فائدہ سے آزماتے ہیں اور اللہ قیامت کے دن تم کو ضرور بہ ضرور وہ چیزیں بیان فرما دیں گے جن میں تم اختلاف کرتے تھے O" (النحل: ۹۲)

"وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا":

"النقض" اور "النکث" دونوں کا معنی واحد ہے اور اس کی جمع الانکاث ہے، اس آیت میں اس شخص کو تشبیہ دی ہے جو حلف اٹھا کر عہد کرتا ہے اور اپنے عہد کو مضبوط کر دیتا ہے، پھر اس عہد کو توڑ دیتا ہے، پس اس شخص کو اس عورت کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو سوت کات کر مضبوط دھاگا بناتی ہے اور پھر اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔

روایت ہے کہ مکہ میں ایک بے وقوف عورت تھی جس کا نام ریطہ بنت عمرو بن کعب تھا، وہ اسی طرح کرتی تھی، اور اسی کے ساتھ تشبیہ واقع ہوئی ہے۔ الفراء نے کہا: اس کی حکایت عبداللہ بن کثیر اور السدی نے کی ہے اور ان دونوں نے اس عورت کا نام نہیں لیا۔ اور مجاہد اور قتادہ نے کہا: یہ ضرب المثل ہے اس سے کوئی معین عورت مراد نہیں ہے۔

"تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ": الدَّخَل اور الدَّخَل دونوں کا معنی ہے: کسی کو دھوکا دینا، امام ابوعبیدہ نے کہا: جو کام صحیح نہ ہو وہ دَخَل ہے۔ "اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ": مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت عرب کے اُن لوگوں کے متعلق نازل ہوئی ہے کہ جب اُن میں سے ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ سے حلف اٹھا کر معاہدہ کرتا ہے، پھر اُن میں سے ایک کے پاس کوئی اور قبیلہ آتا جو زیادہ قوی ہوتا تو وہ اس کو اس عہد میں داخل کر لیتے اور پہلے قبیلہ کے ساتھ عہد شکنی کرتے اور اس کے عہد کو توڑ دیتے۔

مجاہد نے کہا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم عہود کو نہ توڑو، اس وجہ سے کہ کوئی گروہ دوسرے گروہ سے زیادہ طاقت ور ہوگا یا کوئی گروہ دوسرے گروہ سے زیادہ مال دار ہوگا، پھر جب تم دوسرے گروہ کی زیادہ قوت یا زیادہ مال کو دیکھو تو تم اپنے عہود کو توڑ دو۔ اور اس سے مقصود ہے کہ کفار کی کثرت یا اُن کے اموال کی کثرت کی وجہ سے کفر کی طرف نہ لوٹ جاؤ۔ اور الفراء نے کہا کہ کسی قوم کی قلت کی وجہ سے اور اپنی کثرت کی وجہ سے تم عہد نہ توڑو، یا تم اپنی قلت کی وجہ سے اور ان کی کثرت کی وجہ سے عہد نہ توڑو، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ایمان کے ساتھ عزت اور غلبہ عطا فرمایا ہے۔

"اَرْبٰى": اس کا معنی ہے اکثر، جب کوئی چیز زیادہ ہو جائے تو کہتے ہیں "ربا الشیء یربو" اور "بہ" کی ضمیر میں یہ احتمال ہے کہ اس کا رجوع اس چیز کی طرف ہو جس کو پورا کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے۔

"اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ": اللہ تمہیں اس فائدہ سے آزماتے ہیں۔

”وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ“: اور اللہ قیامت کے دن تم کو ضرور بہ ضرور وہ چیزیں بیان فرمادیں گے جن میں تم اختلاف کرتے تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:” اور اگر اللہ (ازل میں) چاہتے تو ضرور تم کو ایک ہی امت بنادیتے لیکن وہ جسے چاہتے ہیں گمراہی میں چھوڑ دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں ہدایت عطا فرماتے ہیں اور تم سے اُن کاموں کے متعلق ضرور بہ ضرور سوال فرمایا جائے گا جو تم دنیا میں کرتے رہتے تھےO“ (النحل: ۹۳)

”وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً“: یعنی اگر اللہ چاہتے تو تم کو ضرور ملت واحدہ پر فرمادیتے۔

”وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ“: لیکن اللہ تعالیٰ جن کو چاہتے ہیں گمراہی پر چھوڑ دیتے ہیں، اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے متعلق عدل ہے۔”وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ“: اور جس کو اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں تو اس کو اپنے فضل سے توفیق عطا فرماتے ہیں۔

”وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ“: اور اللہ تعالیٰ سے یہ سوال نہیں کیا جائے گا کہ اللہ عزوجل کیا کرتے ہیں، بلکہ تم سے سوال کیا جائے گا۔ اور یہ آیت منکرین تقدیر پر رد کرتی ہے۔ یعنی اللہ کی قسم! تم سے ضرور سوال فرمایا جائے گا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:” اور تم اپنی قسموں کو ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کا ذریعہ نہ بناؤ تاکہ کچھ لوگوں کے قدم (ہدایت پر) جمنے کے بعد پھسل جائیں اور تم کو اللہ کے راستہ سے روکنے کی وجہ سے عذاب بھگتنا پڑے اور تمہارے لیے بہت سخت عذاب ہوگاO“ (النحل: ۹۴)

”وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا ۢ بَيْنَكُمْ“: اس آیت کو اللہ تعالیٰ نے دوبارہ تاکید کے لیے ذکر فرمایا ہے۔

”فَتَزِلَّ قَدَمٌ ۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا“: اس آیت میں ممانعت میں مبالغہ ہے، کیونکہ دین میں دھوکا دینا بہت سنگین بات ہے، یعنی تم اپنی قسموں کو دھوکا دہی اور فساد کے لیے نہ بناؤ ورنہ تمہارا قدم ثابت ہونے کے بعد پھسل جائے گا، یعنی تم اللہ تعالیٰ کی معرفت کے بعد ایمان سے پھسل جاؤ گے۔ پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے دنیا کے عذاب اور آخرت کے عذاب سے ڈرایا، اور یہ وعید اس شخص کے لیے ہے جس نے رسول اللہ ﷺ سے کیے ہوئے عہد کو توڑا، کیونکہ جس نے رسول اللہ ﷺ سے عہد کرنے کے بعد توڑ دیا تو وہ ایمان سے نکل گیا۔

”وَتَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ“: کیونکہ تم لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکتے تھے، اس لیے دنیا میں تم کو عذاب ہوگا، اور آخرت میں اس سے بڑا عذاب ہوگا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:” اور اللہ کی کھائی ہوئی قسموں کو تھوڑی قیمت کے عوض فروخت نہ کرو، بےشک (قسم پوری کرنے کا) جو ثواب اللہ کے پاس ہے وہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہوO“ (النحل: ۹۵)

”وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ“: اس آیت میں رشوت لینے کی ممانعت ہے، اور مال لے کر عہد توڑنے کی ممانعت ہے، یعنی تم دنیا کے قلیل سامان کی وجہ سے اپنے کیے ہوئے عہدوں کو نہ توڑو، اور اس کو قلیل فرمایا کیونکہ اگر اس کا معاوضہ کثیر بھی ہو تو وہ زائل ہو جائے گا، سو وہ حقیقت میں قلیل ہی ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "جو دنیاوی مال تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو اجر اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہے گا اور جن لوگوں نے (قسم پوری کرنے پر) صبر کیا، (ان کے صبر کا) ہم ضرور بہ ضرور اجر عطا فرمائیں گے، ہم اُن کے نیک اعمال کا بہترین اجر عطا فرمائیں گے O" (النحل:۹۶)

"مَاعِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ": اس آیت میں دنیا کے حال اور آخرت کے حال کا فرق بیان فرمایا ہے، بایں طور کہ دنیا کا مال ختم ہو جائے گا اور ختم ہو جائے گا اور جو اللہ تعالیٰ کے پاس ان کے فضل سے عطائیں ہیں اور جنت کی نعمتیں ہیں وہ ثابت ہیں وہ کبھی زائل نہیں ہوں گی۔ اور یہ اجر اس کے لیے ہے جس نے عہد کو پورا کیا اور اپنے معاہدہ پر قائم رہا۔

"وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ": اور جو لوگ اسلام پر ثابت قدم رہے اور نافرمانیوں سے رکے رہے، ان کو اللہ تعالیٰ اُن کی طاعت سے بہتر اجر عطا فرمائیں گے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت یعنی "وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا۔۔۔ (النحل:۹۵)" امریٔ القیس بن عابس الکندی اور اس کے مخالف ابن اسوع یعنی عبدان بن اسوع کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ ان دونوں کا ایک زمین کے متعلق جھگڑا ہوا، پس امریٔ القیس نے ارادہ کیا کہ وہ اس زمین کے متعلق قسم اٹھا لے، پھر جب اس نے یہ آیت سنی تو اس نے رجوع کر لیا اور عبدان بن اسوع کے حق کا اعتراف کر لیا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "جو لوگ نیک اعمال کریں گے خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں بہ شرطیکہ وہ ایمان رکھنے والے ہوں، تو ہم ان کو ضرور بہ ضرور پاکیزہ زندگی عطا فرمائیں گے اور ہم ضرور بہ ضرور اُن کو ایسا اجر عطا فرمائیں گے جو اُن کے کئے ہوئے کاموں میں سب سے بہترین اجر ہوگا O" (النحل:۹۷)

"الحياة الطيبة" کے متعلق اقوال

"مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً": الحياة الطيبة میں پانچ اقوال ہیں:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، سعید بن جبیر، عطاء اور الضحاک نے کہا: اس سے مراد ہے رزق حلال۔

(۲) الحسن البصری، زید بن وہب اور وہب بن منبہ نے کہا: اس سے مراد ہے القناعت۔ اور یہی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

(۳) الضحاک نے کہا: بندہ کو عبادات کی توفیق، کیونکہ عبادات کی توفیق بندہ کو اللہ تعالیٰ کی رضا تک پہنچاتی ہے۔ نیز الضحاک نے کہا: جس نے نیک عمل کئے اور وہ تنگی اور خوش حالی میں مومن ہو تو اس کی حیات طیبہ ہے۔ اور جس نے اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اعراض کیا اور اپنے رب پر ایمان نہیں لایا اور نہ اس نے کوئی نیک عمل کیا تو اس کی دنیاوی زندگی تنگ ہوگی اور اس میں کوئی خیر نہیں ہوگی۔

(۴) مجاہد، قتادہ اور ابن زید نے کہا: الحياة الطيبه سے مراد جنت ہے۔ حسن بصری کا بھی یہی قول ہے۔ اور انہوں نے کہا: کسی بندہ کی حیات جنت کے سوا پاکیزہ نہیں ہوگی۔

(۵) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت ہے کہ اس سے مراد سعادت ہے، اور ابوبکر الوراق نے کہا: اس سے مراد عبادت کی مٹھاس ہے۔ اور سہل بن عبداللہ التستری نے کہا کہ بندہ سے اس کی تدبیر نکال لی جائے اور اس کی تدبیر حق کی طرف راجع کر دی

جائے، اور جعفر الصادق نے کہا: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے اور اللہ عزوجل کے سامنے صدق کے ساتھ کھڑا ہونا ہے۔ اور ایک قول ہے کہ اس سے مراد خلق سے مستغنی ہونا ہے اور حق کی طرف محتاج ہونا ہے۔ اور ایک قول ہے کہ اس سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کی قضاء پر راضی ہونا۔

"وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ": یعنی ہم ان کو آخرت میں ضرور ان کا اجر عطا فرمائیں گے۔

"بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ": ابو صالح نے کہا: اہلِ تورات میں سے کچھ لوگ بیٹھے اور بت پرستوں میں سے کچھ لوگ بیٹھے پس ان لوگوں نے کہا کہ ہم افضل ہیں، اور ہر ایک نے اپنے آپ کو افضل کہا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پس (اے رسولِ اکرم!) جب آپ قرآن کی تلاوت کا قصد کریں تو شیطان مردود (کے شر) سے اللہ کی پناہ طلب کریں O" (النحل: ۹۸)

آیا قرآن مجید کی تلاوت سے پہلے شیطان مردود کے شر سے پناہ طلب کی جائے یا تلاوت کے بعد؟

"فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ": یہ آیت اس آیت کے ساتھ متصل ہے: "وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ" (النحل: ۸۹)، یعنی جب آپ قرآن کی تلاوت شروع کریں تو اللہ عزوجل سے اس کی پناہ طلب کریں کہ شیطان آپ کو عارض ہو اور آپ کو قرآن مجید میں تدبر اور تفکر کرنے سے روک دے اور قرآن مجید کی آیات کے تقاضا پر عمل کرنے سے روک دے۔ اور اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ تلاوت کے بعد آپ اللہ تعالیٰ سے شیطان کے شر سے پناہ طلب کریں، بلکہ یہ اس طرح ہے جیسے کہتے ہیں: جب تم کھانا کھاؤ تو بسم اللہ پڑھو۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم کھانا کھانے کا ارادہ کرو تو بسم اللہ پڑھو، اسی طرح اس آیت کا معنی ہے کہ جب آپ قرآن مجید کی تلاوت کا قصد کریں تو شیطان مردود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کریں۔

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے سنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع فرماتے تو یہ دعا کرتے: "اللهم انی اعوذبك من الشیطان من همزه و نفخه و نفثه"۔ (اے اللہ! میں شیطان کے ٹھونگ مارنے سے اور اس کے وسوسہ ڈالنے سے اور اس کے پھونک مارنے سے آپ کی پناہ میں آتا ہوں)۔

(سنن ابوداؤد: ۷۶۴، سنن ابن ماجہ: ۸۰۷، صحیح ابن حبان: ۱۷۷۹، سنن بیہقی ج ۲ ص ۳۵، المستدرک للحاکم ج ۱ ص ۲۳۵، صحیح ابن خزیمہ: ۴۶۸، سنن ترمذی: ۲۴۲، سنن ابوداؤد: ۷۷۵)

ھمز کا معنی ہے شیطان کا ٹھونگ مارنا اور نفخ کا معنی ہے شیطان کا وسوسہ ڈالنا۔ ابن الاثیر نے کہا ہے: اس حدیث میں "النفث" کا معنی ہے: شعر۔ (النہایہ ج ۵ ص ۸۸)

امام اسماعیل بن حماد الجوہری المتوفی ۳۹۸ھ، لکھتے ہیں:

النفث پھونک مارنے کے مشابہ ہے جس میں تھوک کی تھوڑی چھینٹیں شامل ہوں۔ اور سانپ زہر کی پھونک مارتا ہے۔

(الصحاح ص ۱۰۵۶، دار المعرفہ بیروت، ۱۴۲۹ھ)

بعض متقدمین سے منقول ہے کہ قراءت کے بعد اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم پڑھے، جیسا کہ ظاہر قرآن میں ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس آیت کے ظاہر کا یہی تقاضا ہے کہ قرآن مجید پڑھنے کے بعد اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم

پڑھے جیسا کہ قرآن مجید کی یہ آیت ہے: "فَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا ـ (النساء: ۱۰۳)" (پس جب تم نماز ادا کر چکو تو کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے اللہ کا ذکر کرتے رہو)۔ مگر یہاں دوسرے معنی کی بھی گنجائش ہے اور جس طرح اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا ـ (الانعام: ۱۵۲)" (اور جب تم کوئی بات کہو تو حق کہو)۔ اور اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَ اِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ـ (الاحزاب: ۵۳)" (اور جب تم نبی کی بیویوں سے استعمال کی کوئی چیز مانگو تو اُن سے پردے کے پیچھے سے مانگو)۔ اس آیت سے یہ مراد نہیں ہے کہ پہلے کوئی سوال کیا جائے پھر اس کے بعد پردے کی اوٹ سے اُن سے کسی چیز کا سوال کیا جائے۔ اور اسی کی مثل میں کہا جاتا ہے: جب تم بات کرو تو سچ بولو، اور کہا جاتا ہے: جب تم احرام باندھو تو غسل کرو، یعنی احرام باندھنے سے پہلے غسل کرو۔ اور ان تمام صورتوں میں معنی یہ ہے کہ جب تم اس کام کا ارادہ کرو، اسی طرح النحل: ۹۸ میں بھی مراد ہے کہ جب تم قرآن مجید پڑھنے کا ارادہ کرو تو شیطان مردود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "بے شک جو لوگ ایمان لائے اور وہ اللہ پر ہی توکل کرتے ہیں ان پر شیطان کا کوئی غلبہ نہیں ہے ○" (النحل: ۹۹)

"اِنَّهٗ لَیْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ": یعنی شیطان کو اس پر قدرت نہیں ہے کہ وہ مومنین کو گمراہ کرے اور اُن کو کفر میں مبتلاء کرے، اور اس کو اس پر قدرت نہیں ہے کہ وہ مومنین کو کسی ایسے گناہ پر برانگیختہ کرے جس کی مغفرت نہ ہو۔ مجاہد نے کہا: شیطان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں کی طرف دعوت دیتا ہے مگر اس کو اس پر قدرت نہیں ہے کہ وہ مومنین سے کفر صادر کرائے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ شیطان کو مومنین پر کسی حال میں بھی کوئی تصرف اور غلبہ نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے شیطان سے اس کے تصرف اور غلبہ کو اس وقت پھیر دیا جب اللہ تعالیٰ کے دشمن ابلیس لعنہ اللہ نے کہا: "قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَغْوَیْتَنِیْ لَاُزَیِّنَنَّ لَهُمْ فِی الْاَرْضِ وَ لَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ ۙ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ ۞ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَیَّ مُسْتَقِیْمٌ ۞ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ۞ ـ (الحجر: ۳۹ـ۴۲)" (اس نے کہا: "اے میرے رب! کیونکہ آپ نے مجھے گمراہ کر دیا ہے، تو میں ضرور بہ ضرور اُن (انسانوں) کے لیے گناہوں کو زمین میں خوشنما بنا دوں گا اور میں ضرور بہ ضرور اُن سب کو گمراہ کر دوں گا ○ سوائے آپ کے اُن بعض بندوں کے جو مخلَص ہیں" ○ فرمایا: یہ (اخلاص) ہی مجھ تک (پہنچنے کا) سیدھا راستہ ہے ○ بے شک میرے (مخلَص) بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا سوا اُن گمراہوں کے جنہوں نے تیری پیروی کی ○)۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں: ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ اس عام میں تخصیص داخل ہے، کیونکہ ابلیس لعین نے حضرت آدم اور حضرت حواء کو اپنے وسوسے سے بہکا دیا تھا۔

بعض اوقات مخلصین اور صالحین پر بھی شیطان کا اثر ہونا

میں کہتا ہوں: علامہ قرطبی کی مراد یہ ہے کہ یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے کہ کسی بھی نیک اور مخلص مرد کو شیطان نہیں بہکا سکتا، کیونکہ بعض صالحین اور مخلصین کو شیطان کا بہکانا ثابت ہے جیسا کہ علامہ قرطبی نے حضرت آدم اور حواء کی مثال دی ہے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد

ہے: "فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ" (البقرہ: ۳۶) "پھر شیطان نے ان دونوں کو اسی درخت کے سبب سے لغزش دے دی اور جس جنت میں وہ رہتے تھے وہاں سے ان کو نکلوا دیا)۔ اور اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک کھانے کے متعلق اللہ کی قسم کھائی کہ میں اس کو نہیں کھاؤں گا، لیکن جب انہوں نے یہ دیکھا کہ یہ کھانا تو برکت والا ہے تو انہوں نے اپنی قسم توڑ دی اور اس کھانے سے کھایا اور کہا: میں نے جو قسم کھائی تھی وہ شیطان کی طرف سے تھی، اس سے معلوم ہوا کہ کبھی صالحین سے بھی شیطان کوئی غلط کام سرزد کرا دیتا ہے اور ہم نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے اس کا متن حسب ذیل ہے:

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے چند لوگوں کو مہمان بنایا، پس حضرت عبدالرحمٰن سے کہا: تم اپنے ان مہمانوں کا خیال رکھو، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جا رہا ہوں، پس تم میرے آنے سے پہلے ان کو کھانا کھلا کر فارغ ہو جانا، پس حضرت عبدالرحمٰن مہمانوں کے پاس گئے اور جو گھر میں کھانا تھا وہ ان کے سامنے پیش کیا اور ان سے کہا کہ آپ لوگ یہ کھانا کھائیں، انہوں نے پوچھا: گھر کے مالک کہاں ہیں؟ حضرت عبدالرحمٰن نے کہا: آپ لوگ کھانا کھائیں، انہوں نے کہا: ہم کھانا اس وقت تک نہیں کھائیں گے حتیٰ کہ اس گھر کے مالک آ جائیں۔ حضرت عبدالرحمٰن نے کہا: آپ ہماری طرف سے کھانا قبول کر لیں، کیونکہ اگر وہ آئے اور آپ لوگوں نے کھانا نہ کھایا ہو تو ہمیں ان کی ناراضگی کا سامنا ہوگا، سو انہوں نے پھر بھی انکار کیا، پس میں نے جان لیا کہ مجھے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ناراضگی کا سامنا ہوگا، پس جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے تو میں ایک طرف ہو گیا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: آپ لوگوں نے کیا کیا؟ تو مہمانوں نے بتا دیا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے عبدالرحمٰن! سو میں خاموش رہا، پھر کہا: اے عبدالرحمٰن! میں پھر بھی خاموش رہا، پھر کہا: اے ملامت زدہ! میں نے قسم کھائی ہے کہ اگر تم میری آواز سن رہے ہو (تو باہر آ جاؤ)، سو میں باہر نکلا اور عرض کیا: آپ اپنے مہمانوں سے پوچھیں، تو مہمانوں نے کہا: یہ سچ کہہ رہے ہیں، یہ ہمارے پاس کھانا لائے تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تم لوگ میرا انتظار کرتے رہے، اللہ کی قسم! میں آج رات کھانا نہیں کھاؤں گا، اور مہمانوں نے بھی قسم کھائی کہ اللہ کی قسم ہم بھی کھانا نہیں کھائیں گے حتیٰ کہ آپ ہمارے ساتھ کھائیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے آج رات کی مثل خرابی کو نہیں دیکھا تھا، تم پر افسوس ہے، تم لوگ کیوں ہماری میزبانی کو قبول نہیں کر رہے، پھر حضرت عبدالرحمٰن کھانا لے کر آئے، پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس پر ہاتھ رکھا اور کہا: بسم اللہ، پہلے جو میں نے قسم کھائی تھی وہ شیطان کے اثر کی وجہ سے تھی، پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی کھایا اور انہوں نے بھی کھایا۔

(صحیح بخاری: ۶۰۲، ۳۵۸۱، ۶۱۴۰، ۶۱۴۱، صحیح مسلم: ۲۰۵۷، مسند احمد: ۱۷۰۳، ۱۷۱۲، مستخرج ابی عوانہ: ۸۳۹۸، السنہ الموضوعی الجامع للکتب العشرۃ ج ۱۹ ص ۴۵)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "شیطان کا غلبہ صرف اُن لوگوں پر ہے جو اس سے دوستی رکھتے ہیں اور جو لوگ اس کی وجہ سے اللہ کا شریک قرار دیتے ہیں O" (النحل: ۱۰۰)

"إِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ": یعنی جو لوگ شیطان کی اطاعت کرتے ہیں۔ "وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ": اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔ یہ مجاہد اور الضحاک کا قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ "بِهٖ" شیطان کی طرف راجع ہے، یہ الربیع بن انس اور القتبی کا قول ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ جو لوگ شیطان کی وجہ سے شرک کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے "كَفَرْتَ بِهٰذِهِ الْكَلِمَةِ" یعنی تم اس بات کے کہنے کی وجہ سے کافر ہو گئے۔ یعنی جنہوں نے شیطان سے دوستی رکھی وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک

کرنے والے ہیں۔ (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، جز ۱۰، ص ۱۴۷۔۱۵۷، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَكَانَ آيَةٍ ۙ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مُفْتَرٍ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٠١﴾

اور جب ہم ایک آیت کو تبدیل فرما کے اس کی جگہ دوسری آیت لاتے ہیں اور اللہ (اس کی حکمت کو) خوب جانتے ہیں جس کو وہ نازل فرماتے ہیں، تو کفار کہتے ہیں: "آپ صرف اللہ پر بہتان باندھنے والے ہیں" بلکہ ان میں سے اکثر تو جانتے ہی نہیں ہیں O

قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِينَ آمَنُوا وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ ﴿١٠٢﴾

(اے رسول اکرم!) آپ کہیے: آیت ناسخ کو روح القدس نے آپ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل فرمایا ہے تاکہ مومنین کو ثابت قدم رکھیں اور یہ قرآن مسلمانوں کے لیے ہدایت اور بشارت ہے O

وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّهُمْ يَقُولُونَ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ ۗ لِسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجَمِيٌّ وَهَٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُبِينٌ ﴿١٠٣﴾

اور بے شک ہم جانتے ہیں کہ کفار مکہ یہی کہتے ہیں: "اس نبی کو کوئی بشر ہی قرآن کی تعلیم دیتا ہے"، حالانکہ جس بشر کی طرف وہ قرآن کی تعلیم دینے کی نسبت کرتے ہیں وہ عجمی ہے، اور یہ قرآن فصیح و بلیغ عربی زبان میں نازل فرمایا گیا ہے O

إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ لَا يَهْدِيهِمُ اللَّهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٠٤﴾

بے شک جو لوگ اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے، ان کو اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں عطا فرمائیں گے اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے O

إِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَاذِبُونَ ﴿١٠٥﴾

بے شک جھوٹا بہتان وہی تراشتے ہیں جو اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے اور وہی لوگ جھوٹے ہیں O

مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ وَلَٰكِنْ مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِنَ اللَّهِ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٠٦﴾

اور جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر کو اختیار کیا سوا ان لوگوں کے جن کو کفر پر مجبور کیا گیا حالانکہ ان کا دل ایمان پر مطمئن تھا لیکن جن لوگوں نے شرح صدر کے ساتھ کفر کو اختیار کیا، پس ان پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لیے بہت بڑا

عذاب ہے O

ذٰلِكَ بِأَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۷﴾

اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی اور بے شک اللہ کفر اختیار کرنے والے لوگوں کو ہدایت عطا نہیں فرماتے O

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ سَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾

یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں اور کانوں پر اور آنکھوں پر اللہ نے (کفر کی) مہر لگا دی ہے، اور یہی لوگ غافل ہیں O

لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

یقیناً یہی لوگ آخرت میں نقصان اٹھانے والے ہیں O

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَ صَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾ ع

بے شک جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد ہجرت کی، پھر جہاد کیا اور ثابت قدم رہے، بے شک آپ کے رب ان آزمائشوں کے بعد ان لوگوں کے لیے ضرور بخشنے والے، رحمت فرمانے والے ہیں O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور جب ہم ایک آیت کو تبدیل فرما کے اس کی جگہ دوسری آیت لاتے ہیں اور اللہ (اس کی حکمت کو) خوب جانتے ہیں جس کو وہ نازل فرماتے ہیں، تو کفار کہتے ہیں: "آپ صرف اللہ پر بہتان باندھنے والے ہیں" بلکہ ان میں سے اکثر تو جانتے ہی نہیں ہیں O" (النحل: ۱۰۱)

نسخ پر مشرکین کے اعتراض کا جواب

علامہ ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ، النحل: ۱۰۱ تا ۱۱۰ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَ اِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ": یعنی جب ہم ایک آیت کو منسوخ فرما دیتے ہیں، پھر اس کے بدلہ میں دوسرا حکم نازل فرما دیتے ہیں۔ "وَّ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ": اور اللہ خوب جانتے ہیں کہ ان کی مخلوق کے لیے کون سا حکم زیادہ مناسب ہے، پھر جو حکم مناسب ہو اس کو وہ نازل فرما دیتے ہیں۔

"قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ": اور مشرکین نے کہا کہ اے محمد! آپ اپنی طرف سے آیات کو بناتے ہیں، کیونکہ مشرکین یہ کہتے تھے کہ بے شک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے اصحاب کے ساتھ مذاق کرتے ہیں، آج انہیں کسی کام کا حکم دیتے ہیں اور اگلے دن انہیں اس

کام سے منع کردیتے ہیں۔ اور یہ کام وہ صرف اپنی طرف سے کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھتے ہیں۔

"بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ": بلکہ ان کافروں میں سے اکثر نہ قرآن کی حقیقت کو جانتے ہیں اور نہ ناسخ اور منسوخ کو جانتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "(اے رسولِ اکرم!) آپ کہیے: آیت ناسخہ کو روح القدس نے آپ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل فرمایا ہے تاکہ مومنین کو ثابت قدم رکھیں اور یہ قرآن مسلمانوں کے لیے ہدایت اور بشارت ہے O" (النحل: ۱۰۲)

"قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ": آپ کہیے: اس قرآن کو روح القدس یعنی جبریل نے نازل فرمایا ہے۔

"مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ": یعنی صدق کے ساتھ۔ "لِیُثَبِّتَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا": تاکہ مومنین کے دلوں کو ایمان پر ثابت قدم رکھیں اور ان کا اللہ پر ایمان اور یقین زیادہ ہو۔

"وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِیْنَ": اور یہ قرآن مسلمانوں کے لیے ہدایت اور بشارت ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور بے شک ہم جانتے ہیں کہ کفار مکہ یہی کہتے ہیں: "اس نبی کو کوئی بشر ہی قرآن کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ جس بشر کی طرف وہ قرآن کی تعلیم دینے کی نسبت کرتے ہیں وہ عجمی ہے، اور یہ قرآن فصیح و بلیغ عربی زبان میں نازل فرمایا گیا ہے O" (النحل: ۱۰۳)

مشرکین مکہ کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ افتراء کہ آپ کسی بشر سے قرآن سیکھتے ہیں

"وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا یُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ": یعنی اس نبی کو جو قرآن مجید کی تعلیم دیتا ہے وہ ایک بشر اور آدمی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہے۔ اور اس بشر کے مصداق میں اُن کے درج ذیل اقوال ہیں:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مکہ میں ایک لوہار تھا جس کا نام بلعام تھا اور وہ شخص نصرانی تھا اور اس کی زبان عجمی تھی، سو مشرکین دیکھتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس آتے اور جاتے ہیں تو انہوں نے یہ افتراء باندھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بلعام قرآن مجید کی تعلیم دیتا ہے۔ (جامع البیان للطبری: ۲۱۹۳۳، اسباب النزول للواحدی: ٦٦٦)

(۲) عکرمہ نے بیان کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بنو مغیرہ کے ایک لڑکے کو پڑھاتے تھے جس کا نام یعیش تھا اور وہ لڑکا آسمانی کتابوں کو پڑھتا تھا تو قریش نے کہا: ان کو یعیش پڑھاتا ہے۔ (جامع البیان للطبری: ۲۱۹۳۴)

افتراء نے کہا کہ مشرکین نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عائش سے قرآن سیکھتے ہیں اور عائش حویطب بن عبد العزیٰ کا غلام تھا اور وہ مسلمان ہو چکا تھا اور اس نے اسلام میں اچھے کام کیے تھے اور اس کی زبان عجمی تھی۔

(۳) ابن اسحاق نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روم کے ایک نصرانی غلام کے پاس بیٹھا کرتے تھے اور وہ آسمانی کتابوں کو پڑھتے تھے تو مشرکین نے کہا کہ آپ اس سے قرآن مجید سیکھتے ہیں۔

(۴) عبد اللہ بن مسلم الحضرمی نے کہا کہ ہمارے ہاں عین التمر کے اہل سے دو غلام تھے، اُن میں سے ایک کا نام یسار تھا اور اس کی

کنیت ابو فکیہہ تھی اور دوسرے کو جبر کہا جاتا تھا۔ یہ دونوں مکہ میں تلواریں بناتے تھے اور یہ دونوں تورات اور انجیل پڑھتے تھے، بسا اوقات نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں کے پاس سے گزرتے اور وہ تورات پڑھ رہے ہوتے تھے تو آپ ٹھہر کر ان کا کلام سنتے تھے۔

اور الضحاک نے کہا کہ جب کفار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذاء پہنچاتے تو آپ اُن دونوں کے پاس بیٹھتے اور اُن کی باتوں سے راحت حاصل کرتے، تب مشرکین نے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان دونوں سے قرآن سیکھتے ہیں، تب یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ان مشرکین کے اقوال کی تکذیب فرمائی اور ان کو جھوٹا قرار دیا۔ (جامع البیان للطبری:۸:۲۱۹۳)

"لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ": یعنی جس بشر کی طرف یہ قرآن سکھانے کی نسبت کررہے ہیں۔ وہ عجمی ہے، فصیح زبان نہیں بولتا۔ اور عجمی عجم کی طرف منسوب ہے خواہ فصیح ہو۔ اور اعرابی دیہاتی ہے اور عربی وہ ہے جو عرب کی طرف منسوب ہو اگرچہ فصیح نہ ہو۔ "وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ": یعنی یہ قرآن تو فصیح عربی زبان میں ہے۔

اور روایت ہے کہ جس مرد کی طرف مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم دینے کی نسبت کی تھی وہ مسلمان ہو گیا تھا اور اس نے اسلام میں اچھے کام کیے تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "بے شک جو لوگ اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے، ان کو اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں عطا فرمائیں گے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے O" (النحل:۱۰۴)

"اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ": اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت نہیں عطا فرمائیں گے۔

"وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ": اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ کفار ہی افتراء باندھنے والے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "بے شک جھوٹا بہتان وہی تراشتے ہیں جو اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے اور وہی لوگ جھوٹے ہیں O" (النحل:۱۰۵)

جھوٹ کا سب سے بڑا گناہ ہونا

"اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ":

صفوان بن سلیم بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: کیا مومن بزدل ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! پوچھا: کیا مومن بخیل ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں!، پھر آپ سے پوچھا گیا: کیا مومن کذاب ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں!

(موطا امام مالک ج ۲ ص ۹۹۰)

عبداللہ بن جراد بیان کرتے ہیں، میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا مومن زنا کرتا ہے؟ آپ نے فرمایا: کبھی کرتا ہے، پھر میں نے پوچھا: کیا مومن چوری کرتا ہے؟ آپ نے فرمایا: کبھی کرتا ہے، میں نے پوچھا: کیا مومن جھوٹ بولتا ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں! اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں: "اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ" (النحل:۱۰۵) (بے شک جھوٹا بہتان وہی تراشتے ہیں جو اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے اور وہی لوگ جھوٹے ہیں)۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر کو اختیار کیا سوا اُن لوگوں کے جن کو کفر پر مجبور کیا گیا حالانکہ اُن کا دل ایمان پر مطمئن تھا لیکن جن لوگوں نے شرح صدر کے ساتھ کفر کو اختیار کیا، پس اُن پر اللہ کا غضب ہے اور اُن کے لیے بہت بڑا عذاب ہے O'' (النحل:۱۰۶)

حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے والدین کی شہادت

''مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ'':

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ یہ آیت حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے متعلق نازل ہوئی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ مشرکین نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو اور ان کے والد حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کو اور ان کی والدہ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو اور حضرت صہیب کو، حضرت بلال کو اور حضرت خباب کو اور حضرت سالم رضی اللہ عنہم کو گرفتار کر لیا اور اُن کو سخت عذاب دیا۔ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو دو اونٹوں کے ساتھ باندھ دیا اور اُن کی شرمگاہ پر نیزہ مارا، سو اُن کو شہید کر دیا اور اُن کے شوہر حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کو بھی شہید کر دیا، اور یہ دونوں اسلام میں پہلے شہید تھے رضی اللہ عنہما۔ اور رہے حضرت عمار رضی اللہ عنہ، تو انہوں نے مجبوراً اپنی زبان سے وہ کلمہ پڑھ دیا جو مشرکین چاہتے تھے۔

قتادہ نے بیان کیا کہ بنو المغیرہ نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو پکڑ لیا اور ان کو بئر میمون میں ڈال دیا اور ان سے کہا: تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کفر کرو، تو انہوں نے ایسا ہی کیا اور اُن کے دل میں اس سے ناگواری تھی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی گئی کہ عمار نے کفر کو اختیار کر لیا ہے، آپ نے فرمایا: ہرگز نہیں! بے شک عمار اپنے سر سے قدم تک ایمان سے بھرے ہوئے ہیں اور اُن کے گوشت اور خون میں ایمان رچ چکا ہے، پھر حضرت عمار رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس روتے ہوئے آئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے پوچھا: تمہارے پیچھے کیا خبر ہے؟ انہوں نے کہا: بری خبر ہے یا رسول اللہ! میں نے اُن کے کہنے سے آپ کے متعلق بری باتیں کہیں اور اُن کے خداؤں کے متعلق اچھی باتیں کہیں، آپ نے پوچھا: تم نے اس وقت اپنے دل کو کیسا پایا؟ حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے کہا: میرا دل ایمان کے ساتھ مطمئن تھا، تب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا کہ اگر وہ دوبارہ تمہارے ساتھ ایسا کریں تو تم پھر دوبارہ ان کے ساتھ اسی طرح کرنا، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

اور مجاہد نے کہا: یہ آیت مکہ کے اُن لوگوں کے متعلق نازل ہوئی ہے جو ایمان لا چکے تھے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اصحاب نے اُن کی طرف لکھا کہ تم ہماری طرف ہجرت کر کے مدینہ آ جاؤ، ہم تم کو اپنے لوگوں میں سے اس وقت تک شمار نہیں کریں گے جب تک کہ تم ہجرت کر کے ہماری طرف نہ آ جاؤ، پھر وہ لوگ مدینہ منورہ کا ارادہ کر کے نکلے، قریش نے اُن کو راستہ میں پکڑ لیا اور اُن کو فتنہ میں مبتلاء کیا اور انہوں نے جبراً کفریہ کلمات کہے۔

(جامع البیان للطبری: ۱۶۴۳۵، المستدرک للحاکم ج ۲ ص ۳۵۷، تفسیر عبدالرزاق: ۱۵۰۹)

اور مقاتل نے کہا: یہ آیت عامر بن الحضرمی کے آزاد شدہ غلام کے متعلق نازل ہوئی ہے، جس کو اس کے مالک نے کفریہ کلمات کہنے پر مجبور کیا تو اس نے مجبوری سے کفریہ کلمات کہے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن تھا۔ پھر بعد میں اس کا مالک بھی مسلمان ہو گیا اور اس نے اس غلام کے ساتھ ہجرت کی۔

"وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا": یعنی جس نے اپنا سینہ کفر کو قبول کرنے کے لیے اور اختیار کرنے کے لیے کھول لیا ہو۔ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ جس کو کلمۂ کفر پڑھنے پر مجبور کیا گیا تو اس کے لیے زبان سے کلمۂ کفر پڑھنا جائز ہے، اور جب کہ اس کا دل اس کلمۂ کفریہ کا معتقد نہ ہو تو پھر اس کلمۂ کفریہ کا پڑھنا کفر نہیں ہوگا۔ اور اگر اس نے کلمۂ کفریہ پڑھنے سے انکار کر دیا حتیٰ کہ اس کو قتل کر دیا گیا تو یہ زیادہ افضل ہے، اور جس کو طلاق دینے پر مجبور کیا جائے اور وہ طلاق دے دے تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے اور اکثر فقہاء کا مختار یہ ہے کہ وہ طلاق واقع نہیں ہوگی۔

میں کہتا ہوں: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک وہ طلاق واقع ہو جائے گی۔ (سعیدی غفرلہٗ)

"فَعَلَیْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ": پس اُن پر اللہ کا غضب ہے اور اُن کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی اور بے شک اللہ کفر اختیار کرنے والے لوگوں کو ہدایت عطا نہیں فرماتے O" (النحل: ۱۰۷)

"ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ": اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی اور بے شک اللہ کفر اختیار کرنے والے لوگوں کو ہدایت عطا نہیں فرماتے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں اور کانوں پر اور آنکھوں پر اللہ نے (کفر کی) مہر لگا دی ہے، اور یہی لوگ غافل ہیں O" (النحل: ۱۰۸)

"اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ": یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں اور کانوں پر اور آنکھوں پر اللہ نے (کفر کی) مہر لگا دی ہے، اور یہی لوگ غافل ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "یقیناً یہی لوگ آخرت میں نقصان اٹھانے والے ہیں O" (النحل: ۱۰۹)

"لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ": یقیناً یہی لوگ آخرت میں نقصان اٹھانے والے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "بے شک جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد ہجرت کی پھر جہاد کیا اور ثابت قدم رہے، بے شک آپ کے رب ان آزمائشوں کے بعد ان لوگوں کے لیے ضرور بخشنے والے، رحمت فرمانے والے ہیں O" (النحل: ۱۱۰)

"ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِیْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا": جن لوگوں کو عذاب دیا گیا اور ان کو اسلام لانے سے روکا گیا اور مشرکین نے اُن کو فتنہ میں مبتلا کیا۔

"ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا": پھر انہوں نے ان آزمائشوں پر صبر کیا، ایمان، ہجرت اور جہاد پر برقرار رہے۔

"اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ": بے شک آپ کے رب ان آزمائشوں کے بعد ان لوگوں کے لیے ضرور بخشنے والے، رحمت فرمانے والے ہیں۔

ان صحابہ کرام کے اسماء جنہوں نے آزمائشوں پر صبر کیا

یہ آیت عیاش بن ابی ربیعہ کے متعلق نازل ہوئی جو ابوجہل کے رضاعی بھائی تھے، اور ابوجندل بن سہیل بن عمرو اور الولید بن المغیرہ اور سلمہ بن ہشام اور عبداللہ بن ابی اسید الثقفی کے متعلق نازل ہوئی جن کو مشرکین نے فتنہ میں مبتلاء کیا تو اُن میں سے بعض نے مشرکین کے منشاء کے مطابق کلام کہہ دیا تاکہ اُن کے شر سے سلامت رہیں، پھر بعد میں انہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا۔

اور حسن اور عکرمہ نے کہا کہ یہ آیت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے متعلق نازل ہوئی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی وحی کو لکھتے تھے، پس شیطان نے ان کو لغزش دے دی، وہ کفار سے جا کر مل گئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن مکہ میں اس کو قتل کرنے کا حکم دیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو پناہ دی، وہ ان کا ماں شریک رضاعی بھائی تھا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پناہ دے دی، پھر انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور اسلام میں اچھے اور نیک کام کیے تو ان کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔

(معالم التنزیل ج ۳ ص ۹۶-۹۹، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

يَوْمَ تَاْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

اس دن کو یاد کیجئے جب ہر شخص اپنی ذات کی طرف سے مدافعت کرتا ہوا آئے گا اور ہر شخص کو اس کے کیے ہوئے کاموں کی پوری پوری جزا عطا فرمائی جائے گی اور اُن پر بالکل ظلم نہیں فرمایا جائے گا O

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

اور اللہ ایک بستی کی مثال بیان فرماتے ہیں جو پر امن اور پر سکون تھی، اس بستی کے پاس ہر جگہ سے وافر مقدار میں رزق آتا تھا سو اس بستی والوں نے اللہ کے انعامات کی ناشکری کی تو اللہ نے اس بستی والوں کو اُن کے کرتوتوں کے بدلے بھوک اور خوف کا لباس پہنا دیا O

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

اور بے شک اس بستی میں ان کے پاس ان ہی میں سے ایک عظیم رسول آئے، سو انہوں نے اس رسول کی تکذیب کی تو ان کو اللہ کے عذاب نے پکڑ لیا، کیونکہ وہ ظلم کرنے والے تھے O

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾

پس تم اللہ کے عطا فرمائے ہوئے رزق میں سے حلال پاکیزہ چیزوں کو کھاؤ اور تم اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرو اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو O

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَاۤ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

انہوں نے تم پر صرف مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت حرام فرمایا ہے اور جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو سو جو شخص ان میں سے کسی چیز کے کھانے پر مجبور ہو جائے جب کہ وہ شخص مزا لینے کی خاطر نہ کھا رہا ہو اور نہ حد ضرورت سے زیادہ کھا رہا ہو، پس بے شک اللہ تعالیٰ بہت زیادہ بخشنے والے، سب سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں O

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ؕ

اور تمہاری زبانیں جن چیزوں کا جھوٹا حکم بیان کرتی ہیں، ان کے متعلق (اپنی طرف سے) یہ نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے، تا کہ تم اللہ پر افترا باندھو، بے شک جو لوگ اللہ پر جھوٹا بہتان تراشتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوں گے O

مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۪ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾

ان کے لیے دنیا میں تھوڑا سا فائدہ ہے اور آخرت میں ان کے لیے دردناک عذاب ہے O

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

اور ہم نے صرف یہودیوں پر ان چیزوں کو حرام فرمایا تھا جن کو ہم اس سے پہلے آپ پر تلاوت فرما چکے ہیں اور ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں فرمایا وہ خود اپنی جانوں پر (اللہ کی نافرمانی کرکے) ظلم کرتے تھے O

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْۤا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۹﴾ع

پھر جن لوگوں نے جہالت کی وجہ سے کوئی برا کام کیا، پھر اس کے بعد انہوں نے توبہ کر لی اور اپنی اصلاح کر لی، بے شک آپ کے رب اس کے بعد بہت بخشنے والے، سب سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اس دن کو یاد کیجئے جب ہر شخص اپنی ذات کی طرف سے مدافعت کرتا ہوا آئے گا اور ہر شخص کو اس کے کیے ہوئے کاموں کی پوری پوری جزا عطا فرمائی جائے گی اور ان پر بالکل ظلم نہیں فرمایا جائے گا O" (النحل:۱۱۱)

مجادل کا معنی

علامہ اسماعیل بن حماد الجوہری الشافعی المتوفی ۳۹۸ھ، لکھتے ہیں:

جَادَلَهُ کا معنی ہے خَاصَمَهُ یعنی اس سے جھگڑا کیا اور اس کا اسم الجَدَل ہے، مجادل اس کو کہتے ہیں جو بہت زیادہ جھگڑا کرتا ہو۔ (الجم الصحاح ص ۱۶۰، دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۲۹ھ)

علامہ ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی بن الجوزی الحنبلی المتوفی ۵۹۷ھ، النحل: ۱۱۱ تا ۱۱۹ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''یَوْمَ تَاْتِیْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا '': یعنی آپ کے رب اُس دن بہت زیادہ بخشنے والے ہیں جس دن ہر شخص اپنی طرف سے مدافعت کرتا ہوا آئے گا۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ اے رسول اکرم! آپ اس دن کو یاد کیجئے جس دن ہر شخص اپنی طرف سے دفاع کرتا ہوا آئے گا، اور اس آیت سے مراد یہ ہے کہ ہر انسان اپنے نفس کی طرف سے مدافعت کرے گا۔ اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کعب الاحبار سے کہا: اے کعب! ہمیں اللہ تعالیٰ کا خوف دلایئے! تو کعب احبار نے کہا: بے شک جہنم گرم اور لمبا سانس لے گی اور ہر مقرب فرشتہ اور ہر نبی مرسل اپنے گھٹنوں کے بل اوندھا پڑا ہوگا حتیٰ کہ ابراہیم خلیل الرحمٰن (علیہ السلام) اپنے خلیل ہونے کا ذکر کریں گے، پس کہیں گے: اے میرے رب! میں آپ کا خلیل ابراہیم ہوں، میں آپ سے صرف اپنے نفس کی نجات کا سوال کرتا ہوں۔ اور اس روایت کی تصدیق اللہ تعالیٰ کی کتاب کی اس آیت میں ہے: ''یَوْمَ تَاْتِیْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا ''۔ اور اس کی تفسیر میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس دن ہر انسان کو صرف اپنی نجات کی فکر ہوگی اور کسی دوسرے کی فکر نہیں ہوگی۔ اور المجادل کا معنی یہ ہے کہ ہر انسان اپنی طرف سے عذر پیش کرے گا جیسا کہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِیْنَ ۝ (الانعام: ۲۳)'' (پھر ان کا کوئی عذر نہیں ہوگا مگر وہ یہ کہیں گے: اللہ کی قسم جو ہمارا پروردگار ہے! ہم شرک کرنے والے نہ تھے)۔

ہر انسان نے دنیا میں جو اچھے یا برے کام کیے ہوں گے، یا ایمان یا کفر میں سے کسی کو اختیار کیا ہوگا تو اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کے سامنے عذر پیش کرے گا۔ ''وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ '': اور ہر شخص کو اس کے کیے ہوئے کاموں کی پوری پوری جزا عطا فرمائی جائے گی اور اُن پر بالکل ظلم نہیں فرمایا جائے گا۔ اور دنیا میں ہر شخص نے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی ہوگی یا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی ہوگی، اس کے متعلق اس کو جزا عطا فرمائی جائے گی اور اُن کے ساتھ وہی فرمایا جائے گا جس کے وہ اپنے اعمال کی وجہ سے مستحق ہوں گے۔ اور کسی نیکوکار کو سزا نہیں دی جائے گی اور کسی بدکار کو اچھی جزا نہیں دی جائے گی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور اللہ ایسی بستی کی مثال بیان فرماتے ہیں جو پُرامن اور پرسکون تھی، اس بستی کے پاس ہر جگہ سے وافر مقدار میں رزق آتا تھا، سو اس بستی والوں نے اللہ کے انعامات کی ناشکری کی تو اللہ نے اس بستی والوں کو اُن کے کرتوتوں کے بدلے بھوک اور خوف کا لباس پہنا دیا O'' (النحل: ۱۱۲)

''وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْیَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً یَّاْتِیْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ '': اس بستی کے متعلق دو قول ہیں:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، قتادہ اور الجمہور نے کہا: اس بستی سے مراد مکہ مکرمہ ہے اور یہی صحیح قول ہے۔ (تفسیر مجاہد ص ۴۲۶،

تفسیر عبدالرزاق ج ۱ ص ۳۶۰، ۱۰، البحر المحیط، ج ۵ ص ۵۴۲)

(۲) حسن بصری نے کہا: یہ وہ بستی ہے جس کے رہنے والوں پر اللہ تعالیٰ نے بہت کشادگی عطا فرمائی تھی حتیٰ کہ وہ لوگ روٹی سے استنجا کرتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اُن پر بھوک مسلط فرمادی حتیٰ کہ وہ لوگ اپنا پاخانہ کھالیتے تھے۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اس بستی سے مراد مدینہ ہے، پس یہ بہ طور مثال ہے اور تفسیر نہیں ہے، اس کا بیان سلیم بن عتر کی روایت میں ہے، انہوں نے کہا کہ ہم حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ حج پر گئے اور اُن ایام میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مدینہ میں محصور تھے، پس حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے دو سواروں کو دیکھا اور اُن دو سواروں سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق پوچھا، پس اُن دونوں سواروں نے بتایا: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کردیا گیا ہے، تب حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے کہا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے! یہ تو وہ بستی ہے اُن کی مراد تھی مدینہ جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے: ''وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً''۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی مراد یہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے ایام میں وہ بستی امن والی تھی۔

(البحر المحیط ج ۵ ص ۵۴۲، تفسیر ابن کثیر، ج ۲ ص ۶۵۰، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۹ھ)

''فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ'': یعنی اس بستی والوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرکے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا کفر کیا اور ''كَانَتْ اٰمِنَةً'' کا معنی ہے: وہ لوگ اس سے مامون تھے کہ کوئی دوسرے لوگ آکر اُن پر حملہ کرتے۔ اور ''مُّطْمَئِنَّةً'' کا معنی ہے: اس بستی کے لوگ اس بستی میں پرسکون رہتے تھے اور کسی خوف یا خطرہ کی وجہ سے انہیں اس بستی سے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ''مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ'': یعنی ہر شہر سے پھل اور دوسری نعمتیں اس بستی میں لائی جاتی تھیں۔

''فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ'': پھر اس بستی والوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرکے ان نعمتوں کی ناشکری کی۔

''فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ'': مفسرین نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ان کو سات سال بھوک کے عذاب میں مبتلا فرمایا حتیٰ کہ انہوں نے مردار اور جلی ہوئی ہڈیاں کھائیں۔ اور رہا اُن کا خوف تو وہ اُن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خوف تھا اور آپ کے لشکروں کا خوف تھا۔ ''بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ'': اس سے مراد یہ ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرتے تھے اور آپ کو مکہ سے نکالنے کا ارادہ کرتے تھے اور آپ کو قتل کرنے کے در پے تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور بے شک اس بستی میں ان کے پاس ان ہی میں سے ایک عظیم رسول آئے، سو انہوں نے اس رسول کی تکذیب کی تو ان کو اللہ کے عذاب نے پکڑلیا، کیونکہ وہ ظلم کرنے والے تھےO''

(النحل: ۱۱۳)

''وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ'': اور اہلِ مکہ کے پاس انہی میں سے ایک عظیم رسول آگئے یعنی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ ''فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ'': پس اہلِ مکہ نے آپ کی تکذیب کی تو اُن کو عذاب نے پکڑلیا، اس عذاب کی تفسیر میں دو قول ہیں: (۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ بھوک کا عذاب تھا (۲) مجاہد نے کہا: یہ وہ عذاب تھا جو وادیٔ بدر میں کفار کو قتل کرنے کی صورت میں دیا گیا۔ ''وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ'': یعنی وہ اس وقت کافر تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پس تم اللہ کے دیے ہوئے رزق میں سے حلال پاکیزہ چیزوں کو کھاؤ اور تم اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرو اگر تم انہی کی عبادت کرتے ہو O" (النحل: ۱۱۴)

"فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا": اس آیت میں کن سے خطاب فرمایا گیا ہے، اس کے متعلق دو قول ہیں:

(۱) جمہور کا قول یہ ہے کہ اس کے مخاطبین مسلمان ہیں۔ (۲) الثعلبی نے کہا کہ اس سے مراد مشرکین مکہ ہیں، کیونکہ جب اُن پر بھوک بہت سخت ہو گئی تو اُن کے سرداروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اگر آپ کو مردوں سے دشمنی ہے تو عورتوں اور بچوں کو بھوک کے عذاب میں مبتلاء کرنے کی کیا وجہ ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اجازت دی کہ اُن کی طرف کھانا لے جایا جائے۔

امام ابو اسحاق احمد بن محمد المعروف بالامام الثعلبی المتوفی ۴۲۷ھ، لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے اُن کو سات سال بھوک کے عذاب میں مبتلاء رکھا اور عرب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ذخیرہ کی ہوئی خوراک کو ان سے منقطع کر دیا حتیٰ کہ وہ سخت تکلیف میں مبتلاء ہو گئے، پھر انہوں نے جلی ہوئی ہڈیاں کھائیں اور مردار کھائے اور مردہ کتے کھائے۔ پھر مکہ کے سرداروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یہ تو مردوں کے لیے عذاب ہے تو عورتوں اور بچوں کا کیا قصور ہے؟ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی طرف کھانا لے جانے کی اجازت عطا فرمائی اور وہ اس کے بعد بھی شرک پر قائم رہے۔

(الکشف والبیان، ج ۶ ص ۴۸، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۲ھ)

"وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ": اور تم اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرو اگر تم انہی کی عبادت کرتے ہو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "انہوں نے تم پر صرف مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت حرام فرمایا ہے اور جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو، سو جو شخص اِن میں سے کسی چیز کے کھانے پر مجبور ہو جائے جب کہ وہ شخص مزا لینے کی خاطر نہ کھا رہا ہو اور نہ حدِ ضرورت سے زیادہ کھا رہا ہو، پس بے شک اللہ تعالیٰ بہت زیادہ بخشنے والے، سب سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں O" (النحل: ۱۱۵)

"اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ جب تم ایمان لے آئے اور تم نے کفر کو ترک کر دیا تو جو خالص حلال ہو اس کو کھاؤ اور وہ مالِ غنیمت ہے اور خبیث چیزوں کو چھوڑ دو اور وہ مردار اور خون ہے۔ یہاں اللہ سبحانہٗ نے اِن چیزوں کے حرام ہونے کا دوبارہ ذکر فرمایا ہے اور اس سے پہلے المائدہ اور الانعام میں بھی ان چیزوں کی حرمت کو بیان فرمایا تھا۔

مسلمانوں کے ایصالِ ثواب کرنے کے متعلق شیخ محمود الحسن دیوبندی کی رائے

شیخ محمود الحسن دیوبندی متوفی ۱۳۳۹ھ "وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ" کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ" کا یہ مطلب ہے کہ ان جانوروں پر اللہ کے سوا بت وغیرہ کا نام پکارا جائے یعنی اللہ کے سوا کسی بت یا جن یا کسی روح خبیث یا پیر یا پیغمبر کے نامزد کر کے اور اس جانور کی جان ان کی نذر کر کے ان کے تقرب یا رضا جوئی کی نیت سے ذبح کیا جائے اور محض ان کی خوشنودی کی غرض سے اس کی جان نکالنی مقصود ہو کہ ان سب جانوروں کا کھانا حرام ہے گو بوقتِ ذبح

تکبیر پڑھی ہو اور اللہ کا نام لیا ہو، کیونکہ جان کو جان آفرین کے سوا کسی دوسرے کے لئے نذر و نیاز کرنا ہرگز درست نہیں، اس لیے جس جانور کی جان غیر اللہ کی نذر کی جائے تو اس کی خباثت مردار کی خباثت سے بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ مردار میں تو یہی خرابی تھی کہ اس کی جان اللہ کے نام پر نہیں نکلی اور اس کی جان تو غیر اللہ کے نامزد کردی گئی جو عین شرک ہے سو جیسے خنزیر اور کتے پر بوقت ذبح تکبیر کہنے سے حلت نہیں آسکتی اور مردار پر اللہ کا نام لینے سے کوئی نفع نہیں ہوسکتا ایسے ہی جس جانور کی جان غیر اللہ کی نذر اور ان کے نامزد کردی ہو اس پر ذبح کے وقت نام الٰہی لینے سے ہرگز ہرگز کوئی نفع اور حلت اس میں نہیں آسکتی۔

نیز لکھتے ہیں: البتہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ جانور کو اللہ کے نام پر ذبح کرکے فقراء کو کھلایا جائے اور اس کا ثواب کسی قریب یا پیر اور بزرگ کو پہنچادے یا کسی مردہ کی طرف سے قربانی کرکے اس کا ثواب اس کو دینا چاہیے کیونکہ یہ ذبح غیر اللہ کے لئے ہرگز نہیں۔

(ترجمہ قرآن مع تفسیر ص ۳۲، الملک فہد بن عبدالعزیز ال سعود، المملکۃ العربیۃ السعودیہ)

شیخ محمود الحسن کی تفسیر پر مصنف کا تبصرہ

تمام عالم اسلام میں اہل سنت وجماعت جو انبیاء علیہم السلام اور بزرگانِ دین کے لیے مقررہ تاریخوں میں ایصالِ ثواب کرتے ہیں، اس میں ان کی وہی نیت ہوتی ہے جس کو شیخ محمود الحسن نے اخیر میں لکھا ہے کہ "البتہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ جانور کو اللہ کے نام پر ذبح کرکے فقراء کو کھلایا جائے اور اس کا ثواب کسی قریب یا پیر اور بزرگ کو پہنچادے"۔ اور جو شیخ محمود الحسن نے یہ لکھا ہے کہ "اس جانور کی جان ان کی نذر کرکے ان کے تقرب یا رضا جوئی کی نیت سے ذبح کیا جائے" سو یہ کسی کی نیت نہیں ہوتی اور ایصالِ ثواب کرنے والوں کی نیت صرف یہ ہوتی ہے کہ کسی جانور کو ذبح کرکے اس کے گوشت کا صدقہ کیا جائے اور اس کا ثواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ کو پہنچادیا جائے۔ مسلمانوں کے کسی عمل پر بدگمانی کرنا اور اُن کے عمل کو رد کرنے کے لیے ان کے عمل کی من مانی تفسیر کرنا سخت ناجائز اور گناہ ہے جس کے یہ مانعین مرتکب ہوتے ہیں۔ (سعیدی غفرلہ)

صدر الافاضل علامہ سید محمد نعیم الدین مرادآبادی حنفی متوفی ۱۳۶۷ھ، "وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ" کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

مسئلہ: جس جانور پر وقتِ ذبح غیر خدا کا نام لیا جائے خواہ تنہا یا خدا کے نام کے ساتھ عطف سے ملا کر (مثلاً: بسم اللہ و محمد رسول اللہ) وہ حرام ہے۔ مسئلہ: اور اگر نام خدا کے ساتھ غیر کا نام بغیر عطف ملایا (مثلاً: بسم اللہ محمد رسول اللہ) تو مکروہ ہے۔ مسئلہ: اگر ذبح فقط اللہ کے نام پر کیا اور اس سے قبل یا بعد غیر کا نام لیا مثلاً یہ کہا کہ عقیقہ کا بکرا، ولیمہ کا دنبہ، یا جس کی طرف سے وہ ذبیحہ ہے اسی کا نام لیا، یا جن اولیاء کے لیے ایصالِ ثواب منظور ہے ان کا نام لیا تو یہ جائز ہے اس میں کچھ حرج نہیں۔ (تفسیر احمدی)

(تفسیر خزائن العرفان مع ترجمہ ص ۵۶، مکتبۃ المدینہ، کراچی، ۱۴۳۲ھ)

ضیاء الامت حضرت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری حنفی متوفی ۱۴۱۸ھ "وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ" کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

آیت کا جو مفہوم سلف صالحین اور علماء محققین نے خود سمجھا ہے اور ہمیں سمجھایا ہے، وہ تو یہ ہے کہ اگر کسی جانور کو اللہ تعالیٰ کے اسم کسی اور کا نام لے کر ذبح کیا جائے تو وہ جانور حرام ہے جس طرح مشرکین باسم اللات والعزیٰ کہہ کر جانوروں کو ذبح کیا کرتے تھے۔ امام ابوبکر جصاص حنفی رحمہ اللہ اپنی شہرۂ آفاق تفسیر احکام القرآن میں اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: "سب مسلمان اس پر متفق ہیں کہ اس سے مراد وہ ذبیحہ ہے جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیا جائے"۔ بیضاوی، قرطبی، رازی اور دیگر

مفسرین اسلاف نے اس آیت کی یہی تفسیر بیان کی ہے۔

لیکن علماء متاخرین میں سے بعض لوگوں نے اسلاف اور قدماء مفسرین کی متفقہ رائے سے اختلاف کیا اور اس آیت سے ایک نیا مفہوم اخذ کیا جس سے تکفیر کا دروازہ کھل گیا۔ غیروں کو اپنا بنانے کی توفیق سے جو لوگ محروم تھے انہوں نے اپنوں کو بیگانہ بنانے کا شغل اختیار فرمایا اور اس فن میں وہ جدت طرازیاں اور موشگافیاں کیں کہ عقل دنگ رہ گئی اور دل لرز اٹھا۔ آیئے پہلے ان کے دلائل کو سنیے تاکہ ان کی اس غلط فہمی کا ماخذ آپ کو معلوم ہو جائے، پھر ان میں غور فرمایئے، ان دلائل کی بے سروپائی آپ پر واضح ہو جائے گی۔

وہ اس آیت کا یہ معنی بیان کرتے ہیں کہ جس جانور پر غیر اللہ کا نام لے دیا جائے اور وہ اس غیر کے نام سے مشہور ہو جائے تو ایسے جانور کو اگر اللہ تعالیٰ کا نام لے کر بھی ذبح کیا جائے تو وہ حلال نہیں ہوگا بلکہ حرام ہوگا۔ جس طرح کتے اور خنزیر کو اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ذبح کیا جائے تو وہ ناپاک ہی رہتا ہے۔ وہ اپنے اس مفہوم کی تائید کے لیے کہتے ہیں کہ لغت عرب اور عرف میں اہل کا معنی ذبح کرنا نہیں ہے، کوئی شعر، کوئی عبارت ایسی پیش نہیں کی جاسکتی جس میں کسی فصیح وبلیغ نے اہل کو ذبح کرنے کے معنی میں استعمال کیا ہو بلکہ اہل لغت کے نزدیک اہل کا معنی آواز بلند کرنا ہے اور کسی چیز کو شہرت دینا ہے۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ اگر مان بھی لیا جائے کہ اہل کا معنی ذبح کرنا ہے تو بھی آیت کا یہ معنی ہوگا کہ وہ جانور جسے غیر اللہ کے لیے ذبح کیا جائے اور اس کا جو معنی تم نے کیا ہے کہ "وہ جانور جسے غیر اللہ کے نام سے ذبح کیا جائے" تو یہ کسی طرح مراد نہیں ہو سکتا، اس لیے آیت کا جو معنی تم نے کیا ہے وہ تو صراحۃً تحریف آیت ہے۔ یہ ان کا استدلال ہے جو آپ نے پڑھ لیا۔

اب ہم بصد ادب ان کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ اہل کا معنی اگر وہ لیا جائے جو تم نے لیا ہے کہ آواز بلند کرنا یا شہرت دینا تو چاہیے یہ کہ تمام ایسے جانور جن پر غیر اللہ کا نام لے دیا جائے یا انہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے لیے نامزد کیا جائے تو وہ ابدی حرام ہو جائیں اور اگر تکبیر پڑھ کے ان کے گلے پر چھری پھیری جائے تب بھی وہ حلال نہ ہوں، حالانکہ ایسا نہیں۔ کیونکہ بحیرہ، سائبہ وغیرہا جانور وہ اپنے بتوں کے لیے نذر مانتے تھے۔ اور ان سے کسی طرح کا فائدہ اٹھانا اپنے اوپر حرام کر دیتے تھے۔ حالانکہ اگر کوئی مسلمان ان کو اللہ کا نام لے کر ذبح کرے تو وہ حلال ہیں۔ ان جانوروں کو بتوں کے نام پر نامزد بھی کیا گیا، انہیں کے نام سے وہ مشہور ہوئے حالانکہ انہیں اگر تکبیر پڑھ کر ذبح کیا جائے تو وہ اس کے باوجود حلال ہیں۔

(تفسیر ضیاء القرآن، ج ۲ ص ۶۰۹-۶۱۰، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور)

"وَمَاۤ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ" کی تفسیر میں شیخ سواتی کا مروّجہ ایصال ثواب کا رد کرنا

شیخ صوفی عبد الحمید سواتی متوفی ۱۴۲۹ھ/ ۲۰۰۸ء، النحل: ۱۱۵ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

چوتھی حرام چیز نذر لغیر اللہ ہے۔ "وَمَاۤ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ" جو جانور اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی کے تقرب اور خوشنودی کے لیے مشہور کیا گیا ہو، وہ بھی حرام ہے۔ اگر کوئی جانور یا دیگر کوئی چیز لات، منات، یا عزیٰ وغیرہ کی نذر کی گئی تو وہ حرام ہو گئی۔ اسی طرح شیخ سدو کی گائے یا داتا کا بکرا اسی تعریف میں آتا ہے۔ اہلال کا معنی ہی آواز بلند کرنا یا تشہیر کرنا ہوتا ہے، مقصد یہ کہ اگر کوئی چیز غیر اللہ کے نام پر منسوب کی گئی تو حرام ہو جائے گی۔ البتہ ایصال ثواب مختلف چیز ہے۔ کوئی شخص اس نیت سے اللہ کے نام پر جانور ذبح کرے کہ اس کا ثواب فلاں بزرگ یا فلاں شخص کو ایصال کرنا مقصود ہے تو اس میں کوئی جھگڑا نہیں، پیران پیر کی گیارہویں کا بھی یہی

تصور بھی ہے۔ اور اگر عقیدہ یہ ہو کہ پیران پیر یا کسی دوسرے بزرگ کے لیے قربانی نہیں کریں گے تو وہ ناراض ہو جائے گا اور جان ومال میں نقصان کا خطرہ ہوگا تو بھی چیز نذر لغیر اللہ ہے۔ غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کیا جائے یا چاول پکائے جائیں یا مٹھائی تقسیم کی جائے، تو اگر چہ بظاہر تو اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی مگر محققین فرماتے ہیں کہ ایسی چیز میں روحانی نجاست پائی جاتی ہے۔ ایسا مال کھانے والوں کی روح ناپاک ہو جاتی ہے اور ان کا باطن مسخ ہو جاتا ہے۔ ان میں اچھے جذبات کی بجائے غلیظ جذبات جنم لیتے ہیں، اس نجاست اور برے اخلاق کو صاحب روحانیت لوگ بخوبی محسوس کرتے ہیں۔

یہاں پر ایک اور مسئلہ بھی توجہ طلب ہے۔ جس شخص کا عقیدہ گندا ہے اگر وہ اللہ کا نام لے کر بھی ذبح کرے گا تب بھی اس کا ذبیحہ مردار کی طرح حرام ہی ہوگا۔ ذبیحہ ان کا پاک ہوتا ہے جن کا عقیدہ صحیح ہو۔ البتہ اہل کتاب کو یہ رعایت دی گئی کہ اگر وہ اللہ کا نام لے کر ذبح کریں تو وہ جائز ہوگا، کیونکہ وہ اپنی نسبت آسمانی کتاب کی طرف کرتے ہیں، البتہ کسی بت پرست مجوسی یا مرتد کا ذبیحہ حلال نہیں ہوگا، خواہ وہ ہزار دفعہ اللہ کا نام لے کر ذبح کرے، بہر حال اللہ نے ان چار چیزوں کا ذکر کیا ہے کہ یہ حرام ہیں ان کے قریب نہ جاؤ۔ (معالم العرفان فی دروس القرآن، ج ۱۱ ص ۱۰۔۱۱، مکتبہ دروس القرآن، گوجرانوالہ)

شیخ سواتی کی تفسیر پر مصنف کا تبصرہ

"وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ" کا صاف اور سیدھا معنی یہ ہے کہ جس جانور پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام پکارا جائے وہ جانور حرام ہے، لہٰذا شیخ امین احسن اصلاحی متوفی ۱۴۱۸ھ/۱۹۹۷ء نے بھی لکھا ہے:

"یا پھر خدا کی نافرمانی کرتے ہوئے کسی چیز کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کر دیا جائے"۔ (تدبر قرآن، ج ۱ ص ۳۱۴)

اور شیخ سواتی نے اپنے مذہبی تعصب کی بناء پر لکھا ہے: "اس طرح شیخ سدو کی گائے یا داتا کا بکرا اسی تعریف میں آتا ہے"۔ ان کا یہ قول بالکل واقع کے خلاف ہے، اہل سنت میں سے میں کوئی بھی شیخ سدو کی گائے یا داتا کے بکرے کا اس طرح قائل نہیں ہے، پھر اس کے بعد انہوں نے لکھا ہے: "البتہ ایصال ثواب مختلف چیز ہے، کوئی شخص اس نیت سے اللہ کے نام پر جانور ذبح کرے کہ اس کا ثواب فلاں بزرگ یا فلاں شخص کو ایصال کرنا مقصود ہے تو اس میں کوئی جھگڑا نہیں"، حالانکہ اہل سنت اسی طریقہ سے ایصال ثواب کرتے ہیں اور ان کا یہ عقیدہ نہیں ہوتا کہ اگر کسی بزرگ کے لیے ایصال ثواب نہیں کریں گے تو بزرگ ناراض ہو جائیں گے، یہ اپنی طرف سے اہل سنت کے متعلق بدگمانی کر کے عقائد کا افتراء ہے، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ہدایت عطا فرمائیں۔ (سعیدی غفرلہ)

"فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ": اس مغفرت کے لیے یہ شرط ہے کہ جو شخص مجبوری کی حالت میں جان بچانے کے لیے حرام کو کھائے تو نہ اس حرام کو دل سے چاہنے والا ہو اور نہ اتنا زیادہ کھائے جو سدِ رمق کی حد سے متجاوز ہو، یعنی یہ نہ کرے کہ اضطرار کو حرام خوری کا بہانا بنائے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور تمہاری زبانیں جن چیزوں کا جھوٹا حکم بیان کرتی ہیں، ان کے متعلق (اپنی طرف سے) یہ نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے، تاکہ تم اللہ پر افتراء باندھو، بے شک جو لوگ اللہ پر جھوٹا بہتان تراشتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوں گے O" (النحل:۱۱۶)

"وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ": ابن الانباری نے کہا: یعنی تم یہ نہ کہو کہ یہ مردار حلال ہے اور یہ بحیرہ حرام ہے، کیونکہ تم جھوٹ بولتے ہو اور اپنی طرف سے جھوٹے احکام شرعیہ بیان کرتے ہو۔

مفسرین نے کہا ہے: اس آیت کا معنی یہ ہے کہ تمہارا چیزوں کو حلال کرنا یا حرام کرنا جھوٹ کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اور اسی کی طرف اللہ عزوجل نے اس قول سے اشارہ فرمایا ہے: "هٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ" ، کیونکہ وہ لوگ اس تحلیل اور تحریم کو اللہ عزوجل کی طرف منسوب کرتے تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "ان کے لیے دنیا میں تھوڑا سا فائدہ ہے اور آخرت میں ان کے لیے دردناک عذاب ہے ○" (النحل: ۱۱۷)

"مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۠ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ": یعنی جو کام ان لوگوں نے کیے ہیں، اس کے عوض وہ دنیا کا تھوڑا فائدہ حاصل کریں گے اور آخرت میں اُن کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ہم نے صرف یہودیوں پر ان چیزوں کو حرام فرمایا تھا جن کو ہم اس سے پہلے آپ پر تلاوت فرما چکے ہیں اور ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں فرمایا وہ خود اپنی جانوں پر (اللہ کی نافرمانی کر کے) ظلم کرتے تھے ○" (النحل: ۱۱۸)

"وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ": یعنی ہم نے سورۃ الانعام: ۱۴۶ میں بیان فرما دیا ہے کہ ہم نے یہودیوں پر ہر ناخن والے جانور کو حرام فرما دیا۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ ـــ (الانعام: ۱۴۶)" (اور یہودیوں پر ہم نے ہر ناخن والے جانور کو حرام فرما دیا تھا، اور گائے اور بکری کی چربی ہم نے اُن پر حرام فرما دی تھی)۔ "ذِيْ ظُفُرٍ " کی تفسیر میں حسب ذیل اقوال ہیں:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن جبیر وغیرہ نے کہا: یہ وہ جانور ہیں جن کے پنجوں میں کشادگی نہ ہو جیسے اونٹ، شتر مرغ اور بطخ وغیرہ۔ (۲) ابن زید نے کہا: اس سے مراد فقط اونٹ ہیں۔ (۳) ابن قتیبہ نے کہا: پیر کو ناخن والا مجازاً فرمایا ہے۔ "اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ ": (۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد وہ چربی ہے جو پیٹھ کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے۔ (۲) ابو صالح اور السدی نے کہا: اس سے مراد کولہا ہے۔ (۳) قتادہ نے کہا: جو چربی پشت اور پہلو کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے۔ "اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ": (۱) السدی نے کہا: اس سے مراد پیٹ اور کولہے کی چربی ہے، کیونکہ پیٹ اور کولہا ہڈی پر ہوتا ہے۔ (۲) ابن جریج نے کہا کہ پیروں میں اور پہلو میں اور سر میں اور دونوں آنکھوں میں اور دونوں کانوں میں جو چربی ہو وہ بھی اس میں داخل ہے کیونکہ وہ بھی ہڈی کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے۔ "ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۫ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ": یعنی ان چیزوں کو ہم نے یہود کی بغاوت اور سرکشی کی بناء پر حرام فرمایا ہے

"وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ ": اور ہم نے جو اُن پر ناخن والے جانوروں کو حرام فرمایا ہے، یہ ہمارا ظلم نہیں ہے۔ "وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ

يَظْلِمُوْنَ": وہ خود اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے اور ان کے احکام سے بغاوت کر کے اس کے مستحق ہوتے تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: " پھر جن لوگوں نے جہالت کی وجہ سے کوئی برا کام کیا، پھر اس کے بعد انہوں نے توبہ کر لی اور اپنی اصلاح کر لی، بے شک آپ کے رب اس کے بعد بہت بخشنے والے، سب سے زیادہ رحم فرمانے والے ہیں O" (النحل:۱۱۹)

"ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ"

توبہ کے مقبول ہونے کا محمل

"اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ": یعنی توبہ کا قبول کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز بھی واجب نہیں ہے لیکن یہ قبول توبہ کا مؤکد وعدہ ہے۔ "لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ": یعنی یہ توبہ اُن کے لیے ہے جو نادانی سے کوئی صغیرہ یا کبیرہ گناہ کر بیٹھیں اور اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ بے علمی سے کوئی گناہ کریں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ آخرت میں اس گناہ کے عذاب پر غور وفکر کیے بغیر گناہ کا کوئی کام کر بیٹھیں، پھر موت آنے سے پہلے توبہ کر لیں۔

"فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ": سو جو لوگ ان صفات مذکورہ سے متصف ہوں تو اللہ تعالیٰ اُن کی توبہ قبول فرمائیں گے۔

حسن بصری نے کہا: جس توبہ کو اللہ قبول فرماتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی نادانی سے کی ہوئی نافرمانی ہے، اس کو "سوء" یعنی برا کام اس لیے فرمایا ہے کہ اس کا انجام برا ہے۔ "بِجَهَالَةٍ": مجاہد نے کہا: ہر اللہ کی نافرمانی کرنے والا اپنی معصیت سے جاہل ہوتا ہے اور حسن بصری، عطاء، قتادہ، السدی اور دوسروں نے کہا: ان لوگوں کو ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے جاہل قرار دیا، یہ مراد نہیں ہے کہ اُن میں نیکی اور بدی کی تمیز کی طاقت نہیں تھی۔

الزجاج نے کہا: اس آیت کا یہ معنی نہیں ہے کہ انہیں اس نافرمانی کے برائی ہونے کا علم نہیں تھا، اس کے دو محمل ہیں:

(۱) انہوں نے اس کام کو کیا اور وہ اس سے ناواقف تھے کہ یہ کام اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔

(۲) انہوں نے اس ناجائز کام کو پوری بصیرت اور علم کے ساتھ کیا، اور انہیں معلوم تھا کہ اس کا انجام ناپسندیدہ ہے، لیکن انہوں نے دنیاوی خواہش پوری کرنے کو آخرت پر ترجیح دی، اس وجہ سے اُن کو جاہل فرمایا، کیونکہ انہوں نے تھوڑی سی راحت کو زیادہ راحت پر ترجیح دی۔ (زاد المسیر فی علم التفسیر، دار الکتاب العربی بیروت، ۱۴۳۱ھ)

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱۲۰

بے شک ابراہیم (اپنی ذات میں تنہا) ایک امت تھے، اللہ کے بہت فرمانبردار، ہر باطل سے اعراض کر کے دینِ حق پر قائم رہنے والے اور مشرکین میں سے نہ تھے O

شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۱۲۱

اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والے تھے، اللہ نے ان کو پسند فرما لیا اور انہیں سیدھے راستہ پر چلایا O

وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ؕ﴿۱۲۲﴾

اور ہم نے ان کو دنیا میں اچھائی عطا فرمائی اور بے شک وہ آخرت میں بھی نیکو کاروں میں سے ہوں گے ○

ثُمَّ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۲۳﴾

(اے رسول اکرم!) پھر ہم نے آپ کی طرف وحی فرمائی کہ آپ ملتِ ابراہیم کی پیروی کیجیے جو ہر باطل دین سے اعراض کرنے والے تھے اور مشرکین میں سے نہ تھے ○

اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

ہفتہ کے دن کی تعظیم صرف اُن لوگوں پر فرض کی گئی تھی جنھوں نے اس دن کی تعیین میں اختلاف کیا تھا، اور بے شک آپ کے رب قیامت کے دن ضرور اس چیز کا فیصلہ فرما دیں گے جس میں وہ اختلاف کرتے تھے ○

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۲۵﴾

(اے رسول اکرم!) آپ لوگوں کو اپنے رب کے دین کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ دعوت دیجیے اور عمدہ طریقہ کے ساتھ ان سے بحث کریں، بے شک آپ کے رب ان کو خوب جاننے والے ہیں جو اس کے دین کے راستہ سے بھٹک گئے اور وہ ان کو بھی خوب جاننے والے ہیں جو ہدایت پانے والے ہیں ○

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ؕ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۲۶﴾

اور اے مسلمانو! اگر تم کفار کو سزا دو تو اتنی ہی سزا دینا جتنی انہوں نے تمھیں تکلیف پہنچائی تھی، اور اگر تم صبر کرو تو وہ (صبر) صبر کرنے والوں کے لیے بہت ہی اچھا ہے ○

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

اور (اے رسول اکرم!) آپ صبر کیجیے! اور آپ کا صبر کرنا صرف اللہ ہی کی توفیق سے ہے اور آپ کفار کے متعلق غمگین نہ ہوں اور اُن کی سازشوں سے تنگ دل نہ ہوں ○

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ ع

بے شک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں اور ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو نیکو کار ہیں ○

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''بے شک ابراہیم (اپنی ذات میں تنہا) ایک امت تھے، اللہ کے بہت فرمانبردار، ہر باطل سے اعراض کر کے دین حق پر قائم رہنے والے اور مشرکین میں سے نہ تھے O'' (النحل: ۱۲۰)

حضرت ابراہیم کے فضائل

القاضی مجیر الدین بن محمد العلیمی المقدسی الحنبلی المتوفی ۹۲۸ھ، النحل: ۱۲۰ تا ۱۲۸ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''إِنَّ إِبْرٰهِيمَ'': ہشام نے از ابن عامر ابراہیم کو ابراہام پڑھا ہے۔ ''كَانَ أُمَّةً'': یعنی حضرت ابراہیم تنہا امتوں میں سے ایک امت تھے، کیونکہ وہ تمام نیکی کی صفات کے جامع تھے۔ ''قَانِتًا لِّلّٰهِ'': اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار تھے۔ ''حَنِيفًا'': وہ ہر باطل دین سے اعراض کرنے والے تھے۔ ''وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ'': مشرکین کا یہ زعم تھا کہ حضرت ابراہیم ان کی ملت پر تھے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا کہ وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والے تھے، اللہ نے ان کو پسند فرمالیا اور انہیں سیدھے راستہ پر چلایا O'' (النحل: ۱۲۱)

''شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهِ'': روایت ہے کہ حضرت ابراہیم بغیر مہمان کے کھانا نہیں کھاتے تھے، سو اُن کے پاس فرشتوں کی ایک فوج بشر کی خراب حالت میں آئی۔ حضرت ابراہیم نے اُن کو کھانا پیش فرمایا۔ پس انہوں نے حضرت ابراہیم کے دل میں یہ خیال ڈالا کہ اُن فرشتوں کو جذام کی بیماری ہے تو حضرت ابراہیم نے فرمایا: اب مجھ پر واجب ہے کہ میں تمہارے ساتھ کھانا کھاؤں اور اللہ تعالیٰ کا اس بات پر شکر ادا کروں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس مرض سے عافیت میں رکھا ہے جس مرض میں تم کو مبتلا فرمایا ہے۔

کسی مہلک مرض میں مبتلاء شخص کو دیکھ کر عافیت کی دعا کرنا

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو کسی مرض یا مصیبت میں مبتلاء شخص کو دیکھ کر گھبرائے تو وہ یہ دعا کرے: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي عَافَانِي مِمَّا ابْتَلَاكَ بِهِ، وَفَضَّلَنِي عَلٰى كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِيلًا'' (اللہ تعالیٰ کی حمد ہے جنہوں نے مجھے اس بیماری سے عافیت میں رکھا جس میں تم کو مبتلا کیا ہے اور اپنی بہت ساری مخلوق پر مجھے فضیلت عطا فرمائی ہے) تو جو شخص یہ دعا کرے گا وہ اس بیماری سے عافیت میں رہے گا خواہ وہ جو بیماری بھی ہو، جب تک وہ زندہ رہے گا۔

(سنن ترمذی: ۳۴۳۱، سنن ابن ماجہ: ۳۸۹۲، مصنف ابن ابی شیبہ: ۲۹۷۳۶، المنتخب من مسند عبد بن حمید: ۸۳۰، مسند البزار: ۶۲۱۷، کتاب الدعاء للطبرانی: ۷۹۷، المعجم الاوسط للطبرانی: ۵۳۲۴، عمل الیوم واللیلۃ لابن السنی: ۳۰۸، حلیۃ الاولیاء ج ۶ ص ۲۶۵، الدعوات الکبیر: ۵۶۷، شعب الایمان للبیہقی: ۴۱۳۹، شرح السنۃ للبغوی: ۱۳۳۷، الجامع الصحیح للسنن والمسانید ج ۳۳ ص ۱۸۹، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشر ج ۱۵ ص ۱۲۳)

''اِجْتَبٰهُ'': اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو نبوت کے لیے اختیار فرمالیا۔

''وَهَدٰهُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ'': اور ان کو دین اسلام کی ہدایت عطا فرمائی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور ہم نے ان کو دنیا میں اچھائی عطا فرمائی اور بے شک وہ آخرت میں بھی نیکوکاروں

میں سے ہوں گے O" (النحل: ۱۲۲)

"وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً": دنیا میں اچھائی یہ ہے کہ اُن کے ذکر کو بلند فرمایا، کیونکہ ہر دین دار اپنے آپ کو ان کی طرف منسوب کرتا ہے۔ "وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ": اور وہ آخرت میں اہلِ جنت میں سے ہوں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "(اے رسولِ اکرم!) پھر ہم نے آپ کی طرف وحی فرمائی کہ آپ ملتِ ابراہیم کی پیروی کیجئے جو ہر باطل دین سے اعراض کرنے والے تھے اور مشرکین میں سے نہ تھے O" (النحل: ۱۲۳)

"ثُمَّ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ": یا محمد! ہم نے آپ کی طرف وحی فرمائی۔ "اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ": یعنی حضرت ابراہیم مشرکین میں سے نہ تھے، بلکہ موحدین کے پیشوا اور امام تھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "ہفتہ کے دن کی تعظیم صرف اُن لوگوں پر فرض فرمائی گئی تھی جنہوں نے اس دن کی تعیین میں اختلاف کیا تھا، اور بے شک آپ کے رب قیامت کے دن ضرور اس چیز کا فیصلہ فرمادیں گے جس میں وہ اختلاف کرتے تھے O" (النحل: ۱۲۴)

"اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ": یعنی یہودیوں پر یہ فرض فرمایا گیا تھا کہ وہ ہفتہ میں ایک دن میں اللہ تعالیٰ کی زیادہ تعظیم کریں اور اس دن سب کام چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے جمع ہوں۔

"عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ": اور یہودیوں نے اس دن کی تعیین میں اختلاف کیا، حضرت موسیٰ نے ان کو حکم دیا تھا کہ وہ جمعہ کے دن عبادت کے لیے فارغ ہوں تو انہوں نے اس کا انکار کیا اور کہا: ہم ہفتہ کے دن کا ارادہ کرتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمانے سے ہفتہ کے دن فارغ ہوگئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ہفتہ کی دن کی تعظیم کو لازم فرمادیا اور ان پر اس معاملہ میں سختی فرمائی۔

اور دوسرا قول یہ ہے کہ جو لوگ اس دن کی تعیین میں اختلاف کررہے تھے، ان پر ہفتہ کے دن کی تعظیم نہ کرنے کا وبال مسلط فرمادیا گیا۔ اور جو لوگ اس دن میں اختلاف کررہے تھے کہ کبھی اس دن میں مچھلیوں کے شکار کو جائز قرار دیتے اور کبھی حرام قرار دیتے، ان پر مسخ کو لازم فرمادیا، یعنی ان کی صورتیں تبدیل فرمادیں۔

بنی اسرائیل کی شکلوں کو مسخ کرکے بندر بنادینا

امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ لکھتے ہیں:

یہ بنی اسرائیل "ایلہ" اور "الطور" کے درمیان مدین نامی بستی میں رہتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ہفتہ کے دن شکار کرنا ان پر حرام قرار دیا تھا اور ساحلِ سمندر پر ہفتہ کے دن مچھلیاں بہت بڑی تعداد میں آتی تھیں اور ہفتہ کا دن گزرنے کے بعد وہ کسی مچھلی کو نہیں دیکھتے تھے نہ چھوٹی مچھلی کو اور نہ بڑی کو اور جب ہفتہ کا دن گزر جاتا تو پھر مچھلیاں آجاتیں، اسی طرح عرصہ دراز تک ہوتا رہا، پھر ایک مردنے چپکے سے ایک مچھلی پر ڈوری باندھ دی اور اس کو ساحلِ سمندر سے کھینچ کر ایک نالہ میں لے آیا حتیٰ کہ جب اگلا دن آیا یعنی

اتوار تو اس نے اس ڈوری کے ذریعہ اس مچھلی کو پکڑ لیا اور دل میں کہا: میں نے اس مچھلی کو ہفتہ کے دن نہیں پکڑا پھر اس کو لے گیا اور اس کو کھا لیا، پھر اگلے ہفتہ کو بھی یہی عمل کرتا رہا اور لوگوں نے مچھلیوں کی خوشبو پائی تو پھر اس شہر کے لوگ اس مرد کے طریقہ پر مطلع ہوئے تو انہوں نے بھی اس مرد کے عمل کی مثل عمل کیا اور ایک زمانہ تک چپکے چپکے ان مچھلیوں کو کھاتے رہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے اس فعل پر ان کی کوئی گرفت نہیں فرمائی حتیٰ کہ وہ کھلم کھلا ہفتہ کے دن مچھلیوں کا شکار کرنے لگے اور ان کو بازاروں میں بیچنے لگے، اور بنی اسرائیل کے ایک دوسرے گروہ نے ان سے کہا کہ اللہ سے ڈرو اور ان کو ان کی اس کارروائی سے منع کیا، اور تیسرے گروہ نے نہ مچھلیاں کھائیں اور نہ لوگوں کو ان کی اس کارروائی سے منع کیا، پھر اللہ تعالیٰ نے ان نافرمانی کرنے والوں کو مسخ کر کے بندر بنا دیا، وہ صرف تین دن تک زمین پر زندہ رہے، نہ کھاتے تھے اور نہ پیتے تھے اور نہ ان کی نسل چلی۔

(جامع البیان ج ۱ ص ۳۶۹-۳۷۰، ملخصاً وملتقطاً، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

"وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ": یعنی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ہر فریق کو اس کے جرم کی سزا دیں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "(اے رسولِ اکرم!) آپ لوگوں کو اپنے رب کے دین کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ دعوت دیجئے اور عمدہ طریقہ کے ساتھ ان سے بحث کریں، بے شک آپ کے رب ان کو خوب جاننے والے ہیں جو اس کے دین کے راستہ سے بھٹک گئے اور وہ ان کو بھی خوب جاننے والے ہیں جو ہدایت پانے والے ہیں O" (النحل: ۱۲۵)

"اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ": یعنی اسلام۔ "بِالْحِكْمَةِ": یعنی مضبوط گفتگو کے ساتھ۔

"وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ": یعنی ان کو طعن وتشنیع دیے بغیر لطف کے ساتھ اسلام کی دعوت دیں۔ حدیث میں ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہمیں حکم فرمایا گیا ہے کہ ہم لوگوں سے ان کی عقلوں کے اعتبار سے کلام کریں۔

(مسند الفردوس للدیلمی: ۱۶۱۱، اس حدیث کی سند بہت ضعیف ہے جیسا کہ العجلونی نے کشف الخفاء ج ۱ ص ۲۲۶ میں بیان کیا ہے)

"وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ": یعنی نرمی اور ملائمت کے ساتھ ان سے بحث کیجئے۔

"اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ": یعنی اللہ تعالیٰ ہی ان کو جزا عطا فرمانے والے ہیں۔ اور اس آیت کا حکم جہاد کی آیت کے حکم سے منسوخ ہو چکا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اے مسلمانو! اگر تم کفار کو سزا دو تو اتنی ہی سزا دینا جتنی انہوں نے تمہیں تکلیف پہنچائی تھی، اور اگر تم صبر کرو تو وہ (صبر) صبر کرنے والوں کے لیے بہت ہی اچھا ہے O" (النحل: ۱۲۶)

"وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ": جب غزوۂ احد کے دن مشرکین نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو مثلہ کر دیا یعنی ان کے جسم کے اعضاء کاٹ ڈالے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے ان پر فتح یاب فرما دیا تو میں ان میں سے ستر (۷۰)

کافروں کو مثلہ فرماؤں گا۔

(کتاب الشریعۃ للآجری: ۱۰۱۷۲۵، المعجم الکبیر للطبرانی: ۲۹۳۷، سنن دار قطنی: ۴۲۰۹، شرح معانی الآثار: ۵۰۲۳، المستدرک علی الصحیحین: ۴۸۹۴، شعب الایمان للبیہقی: ۹۲۵۳، معرفۃ السنن والآثار: ۱۷۹۳۰)

تب یہ آیت نازل ہوئی اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ جب کسی قوم سے بدلہ لیا جائے تو برابر برابر بدلہ لیا جائے۔

"وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ": اور اگر تم نے بدلہ لینے کو ترک کر کے صبر کیا تو معاف کر دینا انتقام لینے سے بہت بہتر ہے تب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلکہ میں صبر کروں گا اور آپ نے جو ستر (۷۰) کافروں کو مثلہ کرنے کا ارادہ فرمایا تھا، اس کو پورا کرنے سے رک گئے۔

(الطبقات الکبریٰ لابن سعد ج ۳ ص ۱۳، شرح معانی الآثار للطحاوی: ج ۳ ص ۱۸۳، المعجم الکبیر للطبرانی: ۲۹۳۷، المستدرک علی الصحیحین: ۴۸۹۴، اسباب النزول للواحدی ص: ۱۹۱، تخریج احادیث الکشاف الزیلعی ج ۲ ص ۲۵۰)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور (اے رسول اکرم!) آپ صبر کیجئے! اور آپ کا صبر کرنا صرف اللہ ہی کی توفیق سے ہے اور آپ کفار کے متعلق غمگین نہ ہوں اور ان کی سازشوں سے تنگ دل نہ ہوں O" (النحل: ۱۲۷)

"وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ":
پھر اللہ تعالیٰ نے صراحت کے ساتھ آپ کو صبر کرنے کا حکم فرمایا، اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ آپ صبر کریں اور اگر یہ ایمان نہ لائیں تو آپ غم نہ کریں اور آپ کے خلاف جو یہ سازشیں کرتے ہیں، اس پر آپ تنگ دل نہ ہوں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "بے شک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو اللہ سے ڈرتے رہے ہیں اور ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو نیکوکار ہیں O" (النحل: ۱۲۸)

"اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا": یعنی بے شک اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہیں جو نافرمانیوں کے ارتکاب سے ڈریں۔

"وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ": اور جو نہایت اچھا عمل کرنے والے ہیں۔

(فتح الرحمٰن ج ۳ ص ۶۵۔۶۸، دار النوادر، بیروت، ۱۴۳۰ھ وتفاسیر اخریٰ)

الحمد للہ رب العالمین! آج ۲۹ رجب المرجب ۱۴۳۶ھ/ 19 مئی 2015ء بروز منگل سورۃ النحل کی تفسیر مکمل ہو گئی۔

بنی اسرائیل ١٧
سبحن الذی ١٥
بنی اسرائیل
(١٧)
جلد سوم
787
تبیان القرآن

سورۂ بنی اسرائیل کا اجمالی تعارف

سورۂ بنی اسرائیل کی وجہ تسمیہ

اس سورت میں یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے زمین میں دو مرتبہ فساد کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر بخت نصر کو مسلط فرما دیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَ قَضَیْنَاۤ اِلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ فِی الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ وَ لَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِیْرًا۝ (بنی اسرائیل: ۴)'' (اور ہم نے بنی اسرائیل کو توریت میں بذریعہ وحی بتا دیا تھا کہ تم زمین میں ضرور بہ ضرور دو مرتبہ فساد کرو گے اور تم ضرور بہ ضرور ظلم اور سرکشی کی تمام حدیں عبور کر جاؤ گے O)۔

نیز اس سورت کا نام سورۃ الاسراء بھی ہے اور اسراء کا معنی ہے: رات کو سفر کرنا، کیونکہ اس سورت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رات کو مکہ سے مسجد اقصیٰ کی طرف سفر کا بیان فرمایا ہے، اس لیے اس سورت کا نام سورۃ الاسراء بھی رکھا گیا ہے۔

ابولبابہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک نہیں سوتے تھے حتیٰ کہ بنی اسرائیل اور الزمر کی تلاوت کر لیں۔ (سنن ترمذی: ۲۹۲۰، مسند احمد: ۲۸۹۲، صحیح ابن خزیمہ: ۱۱۶۳، المستدرک ج ۲ ص ۴۳۴)

سورۂ بنی اسرائیل کے مشمولات

(۱) اس سورت میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عظیم معجزہ کا بیان ہے کہ آپ رات کے قلیل وقت میں مکہ مکرمہ سے روانہ ہو کر مسجد اقصیٰ تک پہنچ گئے، اور اس میں اللہ عزوجل کی قدرت پر بہت واضح دلیل ہے۔

(۲) اس سورت میں بنی اسرائیل کی نیک روش اور گمراہی کے دو احوال بیان فرمائے ہیں، کیونکہ جب وہ نیک روش پر قائم تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو مال اور اولاد کی کثرت سے نوازا، اور جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور زمین میں دو مرتبہ فساد کیا۔

(۳) اس سورت میں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر اور ان کی عظمت اور وحدانیت پر دلائل پیش کیے ہیں، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: وَ جَعَلْنَا الَّیْلَ وَ النَّهَارَ اٰیَتَیْنِ فَمَحَوْنَاۤ اٰیَةَ الَّیْلِ وَ جَعَلْنَاۤ اٰیَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَؕ وَ كُلَّ شَیْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِیْلًا۝ (بنی اسرائیل: ۱۲)'' (اور ہم نے رات اور دن کو اپنی قدرت کی دو نشانیاں بنایا، پھر رات والی نشانی کا اجالا ہلکا رکھا اور دن والی نشانی کو دیکھنے کے لئے معاون بنایا تاکہ تم اپنے رب کا رزق طلب کرو اور ان (دن رات) کی آمد و رفت سے سالوں کی گنتی اور دوسری چیزوں کا حساب جان لو اور ہم نے تمہاری ضرورت کی ہر چیز کو تفصیل کے ساتھ بیان فرما دیا ہے)۔

(۴) اس سورت میں اُن مشرکین کا رد فرمایا ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹیاں قرار دیتے تھے اور ان کا یہ زعم تھا کہ یہ بیٹیاں فرشتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: '' اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِیْنَ وَ اتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓىٕكَةِ اِنَاثًاؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِیْمًا۝ (بنی اسرائیل: ۴۰)'' (اے مشرکو! کیا تمہیں تمہارے رب نے بیٹوں کے لئے چن لیا ہے اور اپنے لئے فرشتوں میں سے بیٹیاں بنالی ہیں؟ بے شک تم بہت ہی سنگین بات کہتے ہو O)۔

اس کے علاوہ بہت سے فقہی مسائل اس سورت سے مستنبط کیے جاتے ہیں۔

آیاتہا ۱۱۱ — ۱۷ سُوْرَۃُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مَکِّیَّۃٌ ۵۰ — رکوعاتہا ۱۲

(سورۃ بنی اسرائیل مکی ہے اور اس میں ایک سو گیارہ آیات اور بارہ رکوع ہیں)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ عزوجل کے بابرکت نام سے ہی (ابتداء ہے) جو سب پر رحم فرمانے والے، نہایت مہربان ہیں

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَاؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ①

وہ ذات ہر نقص اور عیب سے پاک ہے جنہوں نے اپنے عبد مکرم کو رات کے ایک لمحہ میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک سفر کرایا، تاکہ ہم انہیں اپنی بعض عظیم نشانیاں دکھائیں، بے شک وہ سب کچھ سننے والے، سب کچھ جاننے والے ہیں O

وَ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ جَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَكِیْلًاؕ ②

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب (توریت) عطا فرمائی اور ہم نے اس کتاب کو بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنادیا کہ تم مجھے چھوڑ کر کسی کو کارساز نہ بناؤ O

ذُرِّیَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍؕ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ③

اے ان لوگوں کی اولاد! جن کو ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا (تم بھی شکر کیا کرو)، بے شک نوح بہت بڑے شکرگزار بندے تھے O

وَ قَضَیْنَآ اِلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ فِی الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ وَ لَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِیْرًا ④

اور ہم نے بنی اسرائیل کو توریت میں بذریعہ وحی بتادیا تھا کہ تم زمین میں ضرور بہ ضرور دو مرتبہ فساد کرو گے اور تم ضرور بہ ضرور ظلم اور سرکشی کی تمام حدیں عبور کر جاؤ گے O

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَیْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ

اَلدِّیَارِ ؕ وَ كَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝۵

پھر (اے بنی اسرائیل!) جب تمہارے پہلے فساد کے وقت عذاب کی وعید آئی تو ہم نے تم پر سخت جنگجو بندے مسلط فرما دیے، سو وہ تمہاری تلاش میں شہروں کے اندر پھیل گئے اور یہ وعید پوری ہی ہونی تھی ○

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَیْهِمْ وَ اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِیْنَ وَ جَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِیْرًا ۝۶

پھر تمہاری توبہ کے بعد ہم نے تمہیں ان پر دوبارہ غلبہ عطا فرما دیا اور ہم نے مال و دولت اور بیٹوں کے ساتھ تمہاری مدد فرمائی اور ہم نے تمہاری تعداد میں کثرت عطا فرمائی ○

اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۫ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ؕ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِیَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَ لِیَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ لِیُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِیْرًا ۝۷

(اور ہم نے فرمایا:) اگر تم نیک کام کرو گے تو ان کا فائدہ تم کو ہی ملے گا، اور اگر تم برے کام کرو گے تو اس کا ضرر بھی تم ہی کو پہنچے گا، پھر جب دوسرے فساد کی وعید کا وقت آیا (تو پھر ہم نے دوسرے دشمنوں کو تم پر مسلط فرما دیا) تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں، اور تاکہ وہ مسجد (بیت المقدس) میں اسی طرح داخل ہو جائیں جس طرح وہ پہلی مرتبہ بیت المقدس میں داخل ہوئے تھے اور اس کو ویران کر دیں اور جس چیز پر غلبہ پائیں اسے تباہ و برباد کر دیں ○

عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ یَّرْحَمَكُمْ ۚ وَ اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَ جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِیْنَ حَصِیْرًا ۝۸

عنقریب تمہارے رب تم پر رحم فرمائیں گے اور اگر تم نے دوبارہ وہی روش اختیار کی تو ہم تم کو دوبارہ سزا دیں گے اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے قید کرنے کی جگہ بنا دیا ○

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ وَ یُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِیْرًا ۝۹

بے شک یہ قرآن اس راستہ کی ہدایت عطا فرماتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھا ہے اور ایمان لانے والوں کو خوش خبری دیتا ہے کہ جو لوگ نیک کام کرتے ہیں ان کے لیے بہت بڑا اجر و ثواب ہے ○

وَّ اَنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۝۱۰

اور قرآن یہ خبر دیتا ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے، ہم نے ان کے لیے دردناک عذاب تیار فرما رکھا ہے ○

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''وہ ذات ہر نقص اور عیب سے پاک ہے جنہوں نے اپنے عبدِ مکرم کو رات کے ایک لمحہ میں مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک سفر کرایا، تاکہ ہم انہیں اپنی بعض عظیم نشانیاں دکھائیں، بے شک وہ سب کچھ سننے والے، سب کچھ جاننے والے ہیںO'' (بنی اسرائیل:۱)

ہم اس آیت کی تفسیر میں متعدد مقامات اپنی تصنیفات میں سے شرح صحیح مسلم، تبیان القرآن اور نعمۃ الباری شرح صحیح البخاری میں لکھ چکے ہیں، اب ہمارا مقصد معراج کے متعلق بعض آزاد منش مفکرین کی آراء کو ذکر کر کے ان پر تبصرہ کرنا ہے، تاہم ضروری یہ ہے کہ پہلے اس آیت کی ہم مختصر تفسیر نقل کریں اور معراج کے متعلق حدیث کو پیش کریں۔

بنی اسرائیل:۱ کی تفسیر کے متعلق مفسرین کی تصریحات اور حدیثِ معراج

علامہ امام ابو اللیث نصر بن محمد بن احمد السمرقندی الحنفی المتوفی ۳۷۵ھ، بنی اسرائیل:۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''سُبْحٰنَ'': حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت میں لفظ ''سُبْحٰنَ'' کی تفسیر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے کاموں میں سے شبِ معراج کو ایک لمحہ میں آپ کو بیت المقدس تک کا سفر کرانا بہت تعجب خیز ہے۔

اور کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک لمحہ میں اتنا طویل سفر کرانے کے عجز سے ''سُبْحٰنَ'' ہیں، یعنی بلند اور برتر ہیں۔

موسیٰ بن طلحہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ''سُبْحٰنَ'' کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی نقص اور عیب سے تنزیہہ بیان فرمائی۔ (کتاب الدعاء للطبرانی: ۱۷۶۳، تفسیر طبری، ج ۱۴ ص ۳۱۲، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۲۳ھ، لسان العرب ج ۷ ص ۱۰۳، دار صادر، بیروت، ۲۰۰۳ء)

اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ابن ابی الکوّاء نے اُن سے ''سُبْحٰنَ'' کے متعلق سوال کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ کلمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نفس کے لیے فرمایا ہے۔

اور کہا جاتا ہے کہ اس کا معنی ہے: اللہ عزوجل کی تسبیح کرو۔

''الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا'': یعنی اللہ تعالیٰ اپنے عبدِ مکرم کو رات میں لے گئے۔

''مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ'': یعنی مکہ سے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ام ہانی کے گھر سے لے گئے۔

''اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا'': یعنی بیت المقدس تک۔ یعنی جو مسجد دور کی مسافت پر واقع ہے اور وہ مسجد ایلیاء ہے اور وہی بیت المقدس ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رات کے متعلق خبر دی جس رات میں آپ کو مسجد الاقصیٰ تک سفر کرایا گیا تھا، آپ نے فرمایا: میرے پاس ایک چوپایا لایا گیا جو خچر کے مشابہ تھا اور وہی براق ہے اور یہ وہی چوپایا ہے جس پر انبیاء علیہم السلام سوار ہوتے تھے، وہ براق مجھ کو لے گیا اور وہ اپنا اگلا پیر منتہائے بصر پر رکھتا تھا۔

پھر میں نے اپنی دائیں جانب سے ایک آواز سنی: اے محمد! ٹھہر جاؤ، میں چلتا رہا اور اس کی طرف میں نے توجہ نہیں کی، پھر میں البیت المقدس تک پہنچا، یا فرمایا: مسجد تک پہنچا۔ پس میں اس براق سے اترا اور میں نے اس براق کو اس حلقہ میں باندھ دیا جہاں

انبیاء علیہم السلام اپنی سواریوں کو باندھتے تھے، پھر میں مسجد میں داخل ہوا اور میں نے نماز پڑھی، پس میں نے حضرت جبریل علیہ السلام سے کہا: میں نے اپنی دائیں جانب سے ایک آواز سنی تھی، حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا: یہ یہودیت کا داعی تھا، اگر آپ اس کے بلانے پر ٹھہر جاتے تو آپ کی امت یہودی ہو جاتی، آپ نے فرمایا: اور میں نے اپنی بائیں جانب سے بھی آواز سنی، تو حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا: وہ نصاریٰ کا دعوت دینے والا تھا، اگر آپ ٹھہر جاتے تو آپ کی امت نصرانی ہو جاتی، اور وہ عورت تو وہ دنیا ہے جو آپ کے لیے مزین کی گئی تھی، اور اگر آپ ٹھہر جاتے تو آپ کی امت دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتی، آپ نے فرمایا: پھر میرے پاس دو برتن لائے گئے، ان میں سے ایک میں دودھ تھا اور دوسرے میں خمر (انگوری شراب) تھی، پس مجھ سے کہا: آپ ان میں سے جس کو چاہیں پئیں تو میں نے دودھ کو لے لیا اور اسے پی لیا، پس حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا: آپ نے فطرت کو پالیا، یعنی آپ کی امت کو دین اسلام پر قائم رکھا جائے گا، اور اگر آپ انگوری شراب کو لے لیتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی۔

پھر معراج کو یعنی ایک سیڑھی کو لایا گیا جس سے بنو آدم کی روحیں چڑھتی ہیں اور وہ تمہاری دیکھی ہوئی چیزوں میں سب سے زیادہ حسین تھی، پھر ہم کو اس سیڑھی سے معراج کرائی گئی اور ایک طویل قصہ کا ذکر کیا۔ الحدیث

علامہ سمرقندی نے یہ حدیث حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت سے ذکر کی ہے، تاہم اس کے قریب حدیث حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے از حضرت مالک بن صعصعہ روایت کی ہے۔ (صحیح البخاری: ۳۲۰۷، ۳۸۸۷، ۳۳۹۳، ۳۴۳۰، صحیح مسلم: ۱۶۴، الرقم المسلسل: ۳۱۵، رقم حدیث الباب: ۲۶۴، سنن ترمذی: ۳۳۴۶، سنن نسائی: ۴۴۷)

"الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ": یعنی اس مسجد کے گرد پانی ہے اور درخت ہیں اور اس کے گرد دیگر شہر ہیں جیسے دمشق، اردن اور فلسطین۔ "لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا": تا کہ ہم آپ کو اپنی بعض نشانیاں دکھائیں۔ اس رات اللہ تعالیٰ نے آپ کو آسمانوں اور زمینوں کے عجائبات دکھائے۔ "اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ": اللہ عزوجل اہل مکہ کی باتوں کو اور ان کے انکار کو سننے والے ہیں۔ "الْبَصِيْرُ": یعنی اُن کو خوب جاننے والے ہیں۔

اس کی تفسیر یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو اس رات کے واقعہ کی خبر فرمائی تو انہوں نے انکار کیا۔

زہری نے عروہ سے روایت کی ہے کہ جب صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قصہ بیان فرمایا تو کئی لوگ جو پہلے آپ کی تصدیق کر چکے تھے وہ مرتد ہو گئے اور انہوں نے اس کی تکذیب کی، اور مشرکین میں سے کئی لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے، پس ان سے کہا کہ تمہارے یہ پیغمبر کہتے ہیں کہ آج رات ان کو بیت المقدس میں لے جایا گیا اور اسی رات کو وہ بیت المقدس سے واپس آ گئے ہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیا انہوں نے ایسا کہا ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: پس میں گواہی دیتا ہوں کہ انہوں نے سچ کہا ہے۔ قریش نے کہا: کیا تم اس کی تصدیق کرتے ہو کہ وہ رات کے ایک مختصر وقت میں شام تک گئے اور پھر صبح سے پہلے واپس آ گئے؟ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں! میں اس سے بھی بعید خبروں میں ان کی تصدیق کرتا ہوں، وہ صبح اور شام آسمان کی خبریں بیان کرتے ہیں، اسی وجہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نام "الصدیق" رکھا گیا۔

اور الزہری نے کہا کہ مجھے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے خبر دی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر شب اسراء پچاس نمازیں فرض فرمائی گئیں، پھر وہ پچاس کم کر کے پانچ فرما دی گئیں، پھر یہ ندا کی گئی کہ اے محمد! میرے قول میں تبدیلی نہیں ہوتی، یہ تمہارے لیے پانچ نمازیں

ہیں جن کا اجر پچاس نمازیں ہیں۔ (تفسیر السمرقندی ج ۲ ص ۲۵۷۔۲۵۹، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۳ھ)

(صحیح البخاری: ۳۴۹، ۱۶۳۶، ۳۳۴۲، صحیح مسلم: ۱۶۳، الرقم المسلسل: ۴۱۴، ۴۱۳، ۴۱۲، سنن ترمذی: ۲۱۳، سنن نسائی: ۴۵۰، مسند احمد: ۲۰۷۸۱، مستخرج ابی عوانہ: ۳۵۴، صحیح ابن حبان: ۷۴۰۶، کتاب الشریعۃ للآجری: ۱۰۲۶، شرح السنۃ للبغوی ج ۳ ص ۳۴۴، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشرۃ ج ۲۷ ص ۳۴۷)

قاضی ابو الخیر عبد اللہ بن عمر بیضاوی شافعی متوفی ۶۸۵ھ، بنی اسرائیل: ۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

معراج ہجرت سے ایک سال پہلے ہوئی اور اس میں اختلاف ہے کہ یہ نیند میں تھی یا بیداری میں، روح کے ساتھ تھی یا جسم کے ساتھ تھی۔ اکثر علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ کو آپ کے جسم کے ساتھ بیت المقدس کی طرف رات کو لے جایا گیا، (اسی کو "اسراء" کہتے ہیں) ۔ پھر آپ کو آسمانوں کی طرف معراج کرائی گئی حتیٰ کہ آپ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے۔ اسی لیے قریش نے اس پر تعجب کیا اور اس کو محال قرار دیا۔ اور علم کلام میں اس پر برہان پیش کی گئی ہے کہ تمام اجسام اعراض کے قبول کرنے میں مساوی ہیں اور اللہ تعالیٰ تمام ممکنات پر قادر ہیں، پس یہ فرض کیا جائے گا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن مبارک میں بہت تیز حرکت پیدا فرمادی گئی ہے اور اس پر تعجب کرنا لوازم معجزات سے ہے۔

"اَلَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ": یعنی جس کے ارد گرد دین اور دنیا کی برکتیں ہیں، کیونکہ یہ وحی نازل ہونے کی جگہ ہے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لے کر اب تک متعدد انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر وحی نازل ہونے کا مقام ہے۔

"لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا": تاکہ ہم آپ کو اپنی نشانیاں دکھائیں، جیسے رات کے ایک لمحہ میں ایک ماہ کی مسافت پر لے جانا اور بیت المقدس کا مشاہدہ کرانا اور انبیاء علیہم السلام کا وہاں پر متمثل ہونا (اور آپ کا اس رات تمام نبیوں کی امامت فرمانا)۔

(انوار التنزیل واسرار التاویل، ج ۳ ص ۴۳۰۔۴۳۱، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۶ھ)

معراج کے متعلق اہل سنت کا عقیدہ

امام مسعود بن عمر بن عبد اللہ الشہیر سعد الدین تفتازانی متوفی ۷۹۳ھ، لکھتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیداری میں اپنے جسم کے ساتھ آسمان تک معراج، پھر جہاں تک اللہ تعالیٰ نے آپ کو بلندی پر لے جانا چاہا وہ حق ہے، یعنی خبر مشہور کے ساتھ ثابت ہے حتیٰ کہ اس کا منکر بدعتی ہے اور معراج کا انکار کرنا اور اس کو محال قرار دینا یا اصول فلاسفہ پر مبنی ہے ورنہ آسمانوں میں خرق اور التیام یعنی آسمانوں کا پھٹنا اور ان کا جڑ جانا ممکن ہے اور تمام اجسام ایک دوسرے کی مثل ہیں، ہر جسم پر وہ کام جائز ہے جو دوسرے جسم پر صحیح ہے اور اللہ تعالیٰ تمام ممکنات پر قادر ہیں۔ ہم نے کہا "بیداری میں"۔ اس میں ان لوگوں کے رد کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے یہ زعم کیا کہ معراج نیند میں واقع ہوئی تھی جیسا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ان سے معراج کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا: یہ سچا خواب تھا۔ (جامع البیان: ۱۶۶۲۸)

میں کہتا ہوں: علامہ ابو محمد عبد الحق بن عطیہ الاندلسی المتوفی ۵۴۱ھ، نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: رہے معاویہ تو وہ اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے اور کافر تھے، اور انہوں نے اس حال کا مشاہدہ نہیں کیا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس کے متعلق کوئی حدیث بیان نہیں فرمائی تھی۔ (المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز ص ۱۱۲۹، دار ابن حزم، بیروت، ۱۴۲۳ھ)

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، انہوں نے کہا: سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم معراج کی شب گم نہیں ہوا۔ (جامع البیان: ۱۶۶۴۳)

میں کہتا ہوں کہ علامہ ابو محمد عبدالحق بن عطیہ الاندلسی المتوفی ۵۴۱ھ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بہت کم سن تھیں اور انہوں نے ان احوال کا مشاہدہ نہیں کیا تھا اور نہ انہوں نے اس حدیث کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ (المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز ص ۱۱۲۶، دار ابن حزم، بیروت، ۱۴۲۳ھ)

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِیْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ۔۔۔ (بنی اسرائیل: ۶۰)" (اور ہم نے جو جلوہ آپ کو (شب معراج) دکھایا تھا وہ صرف لوگوں کے لیے آزمائش تھا)۔

اس کا یہ جواب ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جو کہا ہے کہ "معراج رؤیائے صالحہ تھی" اس سے مراد ہے جو آپ کو آنکھ سے دکھایا گیا تھا۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا جسم آپ کی روح سے الگ نہیں ہوا بلکہ آپ کا جسم آپ کی روح کے ساتھ تھا اور معراج روح اور جسم دونوں کے ساتھ تھی۔ اور ہم نے جو کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے جسم کے ساتھ معراج ہوئی اس میں ان لوگوں کے رد کی طرف اشارہ ہے جو کہتے ہیں کہ معراج صرف روح کے ساتھ ہوئی۔

اور یہ بات مخفی نہ رہے کہ معراج نیند میں ہو یا روح کے ساتھ ہو تو اس کا کفار کو اس قدر انکار کرنے کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ انہوں نے معراج کا بہت زیادہ انکار کیا بلکہ اکثر مسلمان اسلام سے مرتد ہو گئے، اور ہم نے جو کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج جسم کے ساتھ آسمانوں تک ہوئی، اس میں ان لوگوں کا رد ہے جن کا یہ زعم ہے کہ بیداری میں معراج صرف بیت المقدس تک ہوئی تھی جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔ پھر ہم نے کہا: "ثم الی ما شاء اللہ" اس میں سلف صالحین کے اختلاف کی طرف اشارہ ہے، پس ایک قول یہ ہے کہ جنت تک آپ کو لے جایا گیا، دوسرا قول ہے کہ عرش تک آپ کو لے جایا گیا، اور تیسرا قول ہے کہ عرش سے اوپر تک لے جایا گیا، اور چوتھا قول ہے کہ عالم کی طرف تک لے جایا گیا۔ پس "اسراء" مسجد حرام سے بیت المقدس تک ہے اور یہ قطعی الثبوت ہے، کیونکہ قرآن مجید میں اس کی تصریح ہے اور زمین سے آسمان کی طرف معراج یہ مشہور ہے۔ اور آسمان سے جنت تک یا عرش تک یہ اخبار احاد سے ثابت ہے اور صحیح یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو اپنے دل کے ساتھ دیکھا تھا نہ کہ آنکھوں کے ساتھ۔ (شرح العقائد النسفیہ ص ۱۰۴-۱۰۵، سکندر علی بہادر علی، تاجران کتب دستگیر، کراچی)

اس میں اختلاف کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج اپنے رب کو اپنے دل سے دیکھا تھا یا اپنی آنکھوں سے؟

"مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝ (النجم: ۱۱)" کی تفسیر میں ابو محمد عبدالحق بن عطیہ الاندلسی المتوفی ۵۴۱ھ، لکھتے ہیں:

جمہور قراء نے کہا ہے کہ "مَا كَذَبَ" میں ذال پر تشدید نہیں ہے، اور اس کا معنی ہے کہ حضرت محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دل نے اس چیز کی تکذیب نہیں کی جس کو انہوں نے آنکھوں سے دیکھا تھا بلکہ اس کی تصدیق کی۔ اور اہل التاویل نے کہا اور ان میں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابو صالح ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دل سے اپنے رب کو دیکھا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میری بصر کے نور کو میرے دل میں رکھ دیا، پس میں نے اللہ عزوجل کی طرف اپنے دل سے دیکھا۔ اور دوسرے متاولین نے کہا کہ جس کو آپ کی آنکھوں نے دیکھا تھا، اس کی آپ کے دل نے تکذیب نہیں کی بلکہ اس کی تصدیق کی اور اس کو ثابت کیا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، عکرمہ اور کعب احبار نے کہا کہ بے شک سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب عزوجل کو اپنے سر کی دونوں آنکھوں سے

دیکھا۔ اور الزہراوی نے یہاں بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا تھا؟ تو آپ نے فرمایا: وہ نور ہی نور تھے میں جہاں سے ان کو دیکھتا، اور یہی جمہور کا قول ہے۔

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کا انکار کیا ہے اور انہوں نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان آیات کے متعلق سوال کیا تھا تو آپ نے مجھ سے فرمایا: وہ جبریل تھے (یعنی آپ نے حضرت جبریل کو دیکھا تھا)۔

اور کعب احبار نے کہا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے کلام کو اور دیدار کو حضرت موسیٰ اور حضرت محمد علیہما الصلوٰۃ والسلام میں تقسیم فرما دیا، پس حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دو مرتبہ کلام فرمایا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب عزوجل کو دو مرتبہ دیکھا۔

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس کو سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، میں کہتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ؗ (الانعام: ۱۰۳)''۔ (آنکھیں ان کا ادراک نہیں کر سکتیں)۔

(المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز ص: ۱۰۷۹، دار ابن حزم، بیروت، ۱۴۲۳ھ)

سفر معراج کے پانچ مراحل

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ، بنی اسرائیل: ۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

علامہ علائی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ شب معراج نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر کے پانچ مرحلے تھے، پہلا مرحلہ براق پر سوار ہو کر مسجد اقصیٰ تک، دوسرا مرحلہ معراج (سیڑھی) پر چڑھ کر آسمان دنیا تک، تیسرا مرحلہ فرشتوں کے پروں پر سوار ہو کر ساتویں آسمان تک، چوتھا مرحلہ حضرت جبریل علیہ السلام کے پروں پر سوار ہو کر سدرۃ المنتہیٰ تک، پانچواں مرحلہ رفرف پر سوار ہو کر قاب قوسین تک، آپ کو براق، معراج، فرشتوں کے پروں اور حضرت جبریل علیہ السلام کے پروں پر سوار کرانے کی حکمت یہ تھی کہ آپ کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزت، وجاہت اور کرامت کو ظاہر فرمایا جائے، ورنہ اللہ سبحانہٗ اس پر قادر ہیں کہ آپ کو پلک جھپکنے سے پہلے جہاں چاہیں بغیر کسی سواری کے ذریعہ پہنچا دیں، ایک قول یہ ہے کہ براق صرف مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک تھا اور مسجد اقصیٰ سے لے کر جہاں تک اللہ تعالیٰ نے چاہا معراج (سیڑھی) تھی اور اس نورانی سیڑھی کے آسمانوں تک سات ڈنڈے تھے، آٹھواں ڈنڈا ساتویں آسمان سے لے کر سدرۃ المنتہیٰ تک تھا، اور نواں ڈنڈا مقام مستوی تک تھا جہاں پر قلم چلنے کی آواز سنائی دیتی ہے اور دسواں ڈنڈا صریف الاقلام سے لے کر عرش تک تھا۔ (روح المعانی جز ۱۵ ص ۱۴، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۷ھ)

بعض آزاد منش مفکرین کا بیداری میں معراج جسمانی کا انکار

سر سید احمد خان متوفی ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء، اس موضوع کے متعلق لکھتے ہیں:

جن روایتوں میں اسرا کو علیحدہ اور معراج کو علیحدہ دو چیزیں قرار دیا ہے، ان کو ہم تسلیم نہیں کر سکتے، بلکہ اسرا اور معراج کو ایک دوسرے کا متحد المعنی یا مرادف تصور کرتے ہیں، اس لیے کہ قرآن مجید میں صرف لفظ اسریٰ واقع ہوا ہے، جہاں خدا نے فرمایا ہے: ''سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا'' مگر اس کے بعد فرمایا ہے ''لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ'' یہ آخری فقرہ ایک قسم کے عروج پر دلالت کرتا ہے جس کے سبب لفظ معراج مستعمل ہو گیا ہے۔ (تفسیر القرآن وھو الہدیٰ والفرقان، ج ۲ ص ۳۰۸۔۳۰۹، امر سید ریسرچ اکیڈمی، لاہور ۲۰۱۰ء)

میں کہتا ہوں: ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک رات کے ایک لمحہ میں لے جانا "اسراء" ہے، یہ قطعی الثبوت ہے کیونکہ قرآن مجید میں اس کی تصریح ہے اور اس کا انکار کفر ہے اور "لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا" میں رسول اللہ ﷺ کی معراج کا ذکر ہے اور یہ احادیث سے ثابت ہے، رسول اللہ ﷺ کا مسجدِ اقصیٰ میں انبیاء علیہم السلام کی امامت کرانا بھی اسی میں داخل ہے اور مسجدِ اقصیٰ سے آسمانوں تک معراج کے ذریعہ جانا جو ایک نورانی سیڑھی تھی اس کا ثبوت ظنی ہے اور اس کا انکار کفر نہیں ہے، سو اسراء میں اور معراج میں فرق ہے، اسراء قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ ہے یعنی مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک رات کے ایک لمحہ میں جانا اور پھر واپس آنا اور اس کے بعد آسمانوں کی سیر کرنا یہ معراج ہے اور یہ اخبارِ احاد سے ثابت ہے اور ظنی ہے۔ (سعیدی غفرلہٗ)

نیز سرسید احمد خان لکھتے ہیں:

خدا کا یہ فرمانا کہ "سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا" یعنی رات کو خدا اپنے بندہ کو لے گیا، اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ خواب میں یہ امر واقع ہوئے تھے جو عام طور پر انسانوں کے سونے کا ہے ورنہ "لَیۡلًا" کی قید لگانے کی ضرورت نہ تھی۔

(تفسیر القرآن وھو الہدیٰ والفرقان، ج ۲ ص ۳۸۳، سرسید ریسرچ اکیڈمی، لاہور ۲۰۱۰ء)

میں کہتا ہوں: یہ سرسید احمد خان کا نہایت غلط استدلال ہے، کیونکہ اس آیت میں آگے ارشاد ہے "لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا" تو کیا اللہ عزوجل اپنی نشانیاں رسول اللہ ﷺ کو صرف خواب میں دکھا سکتے ہیں، بیداری میں نہیں دکھا سکتے؟۔ (سعیدی غفرلہٗ)

نیز سرسید احمد خان لکھتے ہیں:

تیسری حدیث کے شروع میں یہ الفاظ ہیں "بینما انا نائم رایتنی اطوف بالکعبۃ" یعنی جب کہ میں سوتا تھا میں نے دیکھا کہ میں کعبہ کا طواف کرتا ہوں۔ انہی الفاظ کے مثل وہ الفاظ ہیں جو بعض حدیثوں میں جن کو ہم لکھ چکے ہیں معراج کی نسبت آئے ہیں اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کو خواب نہ سمجھیں۔

چوتھی حدیث کے شروع میں یہ الفاظ ہیں "ارانی لیلۃ فی المنام عند الکعبۃ" یعنی ایک رات مجھ کو کعبہ کے پاس خواب میں دکھائی دیا۔ اس حدیث میں بالکل تصریح خواب کی اس واقعہ کی نسبت موجود ہے جس سے کسی کو اس میں کلام نہیں رہتا کہ وہ قصہ خواب میں دیکھا تھا پس ہم کو اس باب میں شک کرنے کی کہ معراج کا واقعہ خواب میں ہوا تھا کوئی وجہ نہیں ہے۔

(تفسیر القرآن وھو الہدیٰ والفرقان، ج ۲ ص ۳۹۰، سرسید ریسرچ اکیڈمی، لاہور ۲۰۱۰ء)

میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے کئی مرتبہ خواب میں اپنے آپ کو کعبہ کا طواف کرتے ہوئے دیکھا، اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جو معراج ہوئی اور جس کی تفصیل صحیح البخاری اور صحیح مسلم اور دیگر کتب احادیث میں موجود ہے، وہ بھی خواب ہی کا واقعہ تھا؟ (سعیدی غفرلہٗ)

نیز سرسید احمد خان لکھتے ہیں:

سوائے صحاح کے اور کتب حدیث میں جو حدیثیں ہیں ان پر بھی ہم نے سرسری طور سے نظر ڈالی ہے سوائے ایک حدیث کے جو نقل میں ہے اور جس میں یہ الفاظ ہیں: "بینما انا نائم عشاء فی المسجد الحرام اذا اتانی ات فایقظنی فاستیقظت" یعنی

میں عشاء کے وقت مسجد الحرام میں سوتا تھا کہ ایک آنے والا آیا اس نے مجھ کو جگایا اور میں جاگا۔ اور کسی حدیث میں جاگنے یا سونے کا کچھ ذکر نہیں ہے، پس ایسی حدیثوں سے اس بات پر استدلال کرنا کہ ان کے راویوں کا مذہب یہ ہے کہ معراج بجسدہ اور فی الیقظۃ ہوئی تھی کسی طور پر صحیح نہیں ہے۔ (تفسیر القرآن وھو الہدیٰ والفرقان، ج ۳ ص ۳۰۴، سرسید ریسرچ اکیڈمی لاہور ۲۰۱۰ء)

میں کہتا ہوں: کسی اور حدیث میں جاگنے یا سونے کا ذکر نہ آنا اس بات کو کب مستلزم ہے کہ پورا واقعہ معراج جو کتب حدیث میں مربوط مذکور ہے، وہ صرف خواب کا واقعہ ہے؟ (سعیدی غفرلہٗ)

نیز سرسید احمد خان لکھتے ہیں:

اب ہم غور کرتے ہیں کہ احادیث معراج پر جن میں صاف پایا جاتا ہے کہ وہ ایک واقعہ ہے جو سوتے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تھا اور دلالۃ النص سے بھی پایا جاتا ہے اور صحاح کی کسی حدیث سے نہیں پایا جاتا کہ حالت بیداری میں آتے دیکھا اور بجسدہ آپ بیت المقدس اور آسمانوں پر تشریف لے گئے بلکہ برخلاف اس کے چند حدیثوں میں سونے کی حالت پائی جاتی ہے تو ہمارا اور ہر ذی عقل کا بلکہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کو ایک واقعہ خواب کا تسلیم کریں۔

(تفسیر القرآن وھو الہدیٰ والفرقان، ج ۳ ص ۳۲۰، سرسید ریسرچ اکیڈمی لاہور ۲۰۱۰ء)

میں کہتا ہوں: اگر یہ صرف خواب کا واقعہ ہوتا تو مشرکین اس کا رد نہ کرتے، کیونکہ خواب میں کسی عجیب و غریب چیز کو دیکھنے پر کسی کو حیرت نہیں ہوتی اور نہ کوئی اس کا انکار کرتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا براق پر سوار ہونا بھی اس کا تقاضا کرتا ہے کہ جسمانی معراج تھی، کیونکہ سواری پر سوار ہونا جسم کا تقاضا ہے نہ کہ روح کا۔ نیز اگر یہ خواب کا واقعہ ہوتا تو اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی نشانی اور معجزہ نہ ہوتا اور آپ سے حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا یہ نہ کہتیں کہ آپ لوگوں سے یہ واقعہ بیان نہ فرمائیں وہ آپ کی تکذیب کریں گے، اور نہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے تصدیق کرنے میں کوئی فضیلت ہوتی اور نہ قریش کے طعن و تشنیع اور تکذیب کی کوئی وجہ ہوتی، حالانکہ جب آپ نے معراج کی خبر فرمائی تو قریش نے آپ کی تکذیب کی اور کئی مسلمان مرتد ہو گئے، اور اگر یہ خواب ہوتا تو اس کا انکار نہ کیا جاتا اور نیند میں جو واقعہ ہوا ہو اس کے لیے اسریٰ نہیں فرمایا جاتا۔ (سعیدی غفرلہٗ)

نیز سرسید احمد خان لکھتے ہیں:

چند حدیثیں ایسی ہیں جن میں شق صدر کا ہونا معراج کے ساتھ بیان ہوا ہے، ایسا ہونا البتہ تسلیم ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ ہماری تحقیق میں واقعہ معراج ایک خواب تھا جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تھا، اسی خواب میں یہ بھی دیکھنا کہ جبریل نے آپ کا سینہ چیرا اور اس کو آب زمزم سے دھویا قابل انکار نہیں ہے اور نہ اس سے انکار کرنے کی کوئی وجہ ہے۔

(تفسیر القرآن وھو الہدیٰ والفرقان، ج ۳ ص ۳۲۸، سرسید ریسرچ اکیڈمی لاہور ۲۰۱۰ء)

میں کہتا ہوں کہ سرسید احمد خان نے معراج کے موقع پر شق صدر کو تسلیم کر لیا ہے اور اس کو بھی خواب کا واقعہ قرار دیا ہے اور حسب سابق اس کے خواب ہونے پر کوئی دلیل قائم نہیں کی، جبکہ ہم اس واقعہ کے خواب نہ ہونے پر متعدد دلائل قائم کر چکے ہیں۔ (سعیدی غفرلہٗ)

جن آزاد منش مفکرین نے واقعہ معراج کا انکار کیا ہے ان میں سب سے پہلے تو سرسید احمد خان متوفی ۱۸۹۸ء ہیں اور دوسرے

غلام احمد پرویز متوفی ۱۴۰۶ھ/ ۱۹۸۵ء ہیں، سرسید احمد خان کے واقعہ معراج کے انکار کی تصریحات ہم نقل کر چکے ہیں اور اب غلام احمد پرویز کے واقعہ معراج کے انکار سے متعلق تصریحات کو ذکر کر رہے ہیں۔

غلام احمد پرویز متوفی ۱۴۰۶ھ/ ۱۹۸۵ء کا واقعہ معراج کا انکار کرنا

غلام احمد پرویز بنی اسرائیل: ۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

میں نے عرض کیا تھا کہ اس کے متعلق آج تک ہمارے ہاں یہی تصور چلا آ رہا ہے، یہی مانا جاتا ہے اور یہی عقیدہ ہے کہ یہ شب معراج کا بیان ہے اور اس بیان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے بیت المقدس براق پر تشریف لے گئے۔ وہاں تمام انبیاء کرام جمع تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی جماعت کی امامت کرائی۔ پہلا حصہ تو یہ تھا۔ اور دوسرا حصہ یہ ہے کہ وہاں ایک سیڑھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی اور اس پر حضرت جبریل کے ہمراہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آسمانوں کی سیر کے لیے تشریف لے گئے۔ عرش اعظم پر پہنچے، باری تعالیٰ سے ملاقات ہوئی، اس شرف سے نوازے گئے۔ وہاں سے پھر واپس تشریف لائے، پھر بیت المقدس میں اور وہاں سے پھر واپس مکہ تشریف لے آئے۔ یہ واقعہ شب معراج کا بیان کیا جاتا ہے۔ پہلا حصہ ہے مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف جانا۔ اس کے متعلق تو پھر بھی یہ بات زبان زد عام ہے کہ مسجد حرام سے مراد مکہ اور مسجد اقصیٰ سے مراد یروشلم میں یہودیوں کا ہیکل سلیمانی ہے۔ آپ وہاں تشریف لے گئے تھے اور دوسرے حصے میں اس زمین سے عرش اعظم تک خدا کے حضور جانے کی بات ہے اور یہ بھی مانا جاتا ہے گو کہ شروع میں ہی کچھ حضرات کی روایات میں ہے کہ وہ کہتے تھے کہ یہ سارا قصہ یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب کا تھا یا روحانی تھا لیکن ان چند کے علاوہ متفقہ طور پہ یہی مانا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ آپ کے اس جسد عنصری کے ساتھ طبعی جسم کے ساتھ ہوا۔ اسی کے ساتھ آپ بیت المقدس تشریف لے گئے۔ اسی کے ساتھ آسمانوں کی طرف تشریف لے گئے۔

(مطالب الفرقان فی دروس القرآن تفسیر سورۂ بنی اسرائیل ص ۵۱۔ ۵۲، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، ۲۰۰۳ء)

غلام احمد پرویز کا واقعہ معراج کا انکار کرنا تمام مسلمانوں کے اتفاق کے خلاف ہے

میں کہتا ہوں: غلام احمد پرویز نے اس عبارت میں یہ اعتراف اور اقرار کر لیا ہے کہ تمام مسلمانوں کا متفقہ طور پر یہی عقیدہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس جسد عنصری کے ساتھ طبعی جسم کے ساتھ رات کے ایک لمحہ میں بیت المقدس تشریف لے گئے اور اسی جسم کے ساتھ آسمانوں کی طرف تشریف لے گئے۔ اور تمام مسلمانوں کے اجماعی عقیدے یا عمل کے خلاف کوئی نئی فکر یا نیا عقیدہ ایجاد کرنے کے متعلق قرآن مجید میں سخت وعید ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَیَتَّبِـعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَؕ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ۝ (النساء: ۱۱۵)'' (اور جو کوئی راہ ہدایت کھل جانے کے بعد رسول کی مخالفت کرے گا اور مومنین کے راستہ کے علاوہ (کسی اور راستہ کی) پیروی کرے گا (تو) ہم اسے اسی طرف پھیر دیں گے جس طرف وہ پھرا ہے اور اس کو جہنم میں جھونک دیں گے اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے ۝)۔

سو غلام احمد پرویز اور اُن کے متبعین کے لیے یہ آیت جائے عبرت ہے۔ (سعیدی غفرلہ)

شب معراج رسول اللہ ﷺ کی اللہ تعالیٰ سے ملاقات پر غلام احمد پرویز کے اعتراض کا جواب

غلام احمد پرویز لکھتے ہیں:

جو چیز اس میں قابل اعتراض ہے وہ یہ ہے کہ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ حضور ﷺ اس جسد مبارک کے ساتھ آسمان پر گئے اور وہاں خدا تعالیٰ سے اس طرح ملاقات ہوئی تو خدا کی طرف سے معجزہ یا قدرت تو رہی ایک طرف، اس سے ماننا یہ پڑے گا کہ خدا بھی کسی Space کے اندر، کسی مکان کے اندر، کسی جگہ کے اندر ہے، جہاں ایک شخص نے Physically اپنے جسم کے ساتھ ملاقات کے لیے جاتا ہے، تو یہ تصور خدا کے اس تصور کے خلاف ہے جو قرآن نے دیا ہے۔

(مطالب الفرقان فی دروس القرآن، تفسیر سورۂ بنی اسرائیل ص ۵۲، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، ۲۰۰۳ء)

میں کہتا ہوں کہ اہل اسلام میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ رسول اللہ ﷺ کی اللہ تعالیٰ سے ملاقات کسی مخصوص جگہ پر ہوئی، اہل اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لامکان میں ہیں، یعنی کوئی مکان یا کوئی جگہ ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی جلوہ گاہ ہو، اللہ تعالیٰ اپنے علم اور قدرت کے اعتبار سے ہر جگہ کو محیط ہیں اور عرش عظیم پر اللہ تعالیٰ کا غلبہ ہے۔

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ ھ، لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے عرش کو پیدا فرمایا اور اس پر مستوی ہوئے، بغیر اس کے کہ عرش ان کا مکان ہو یا وہ عرش کو مس کر رہے ہوں، وہ عرش پر اپنی شان کے لائق جلوہ افروز ہوئے اور تمام مخلوق میں کوئی چیز ان کے مماثل نہیں ہے، اور اس تقریر پر برابر ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کو زمین پر بٹھائیں یا عرش پر، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کا یہ معنی نہیں ہے کہ وہ ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہوتے ہیں یا کھڑے ہوتے ہیں یا بیٹھتے ہیں، اور نبی ﷺ کو عرش پر بٹھانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ عبدیت کی صفت سے نکل گئے اور ربوبیت کی صفت میں داخل ہو گئے، بلکہ اس میں نبی ﷺ کی تمام مخلوق پر شرف، عزت اور وجاہت کو ظاہر فرماتا ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن، ج ۱۰ ص ۲۸۰، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

مسجد اقصیٰ کے متعلق غلام احمد پرویز کا نظریہ

غلام احمد پرویز لکھتے ہیں:

تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے اور اب تو اس کو تسلیم کرنے کے لیے یہ بھی مجبور ہو گئے ہیں کہ حضور ﷺ کے زمانے میں وہاں کوئی مسجد ہی نہیں تھی۔ اقصیٰ کے معنی ہیں 'بہت دور'۔ میں نے پچھلے درس میں یہ عرض کیا تھا کہ یہ شب ہجرت کا بیان ہے۔

(مطالب الفرقان فی دروس القرآن، تفسیر سورۂ بنی اسرائیل ص ۴۳، ادارہ طلوع اسلام لاہور، ۲۰۰۳ء)

میں کہتا ہوں کہ غلام احمد پرویز کا یہ نظریہ بالکل نیا اور ایجاد بندہ ہے۔ غلام احمد پرویز نے اپنے اس نظریہ پر کوئی حوالہ پیش نہیں کیا اور تمام دنیائے اسلام کے مفسرین اور محققین کے خلاف یہ کہا کہ مسجد اقصیٰ سے مراد بہت دور کی مسجد ہے اور اب تک مسلمان جس کو مسجد اقصیٰ قرار دیتے آئے ہیں وہ غلط ہے۔ آیئے ہم آپ کو تاریخی شہادات سے بتاتے ہیں کہ مسجد اقصیٰ کا مصداق کیا ہے:

مسجد اقصیٰ کے مصداق کے متعلق تاریخی شہادات

اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب میں مذکور ہے:

مسجد الاقصیٰ کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل: ۱ میں آیا ہے، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر شب اور معراج سے متعلق ہے۔

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۲۰ ص ۶۰۵، زیر اہتمام: دانش گاہ پنجاب، پاکستان)

اسی کتاب میں معراج کی تحقیق میں مذکور ہے:

بنی اسرائیل: ۱ کی تفسیر و تعبیر کئی طرح سے کی گئی ہے، بعض اس سفر آسمانی کو محض رؤیا کہتے ہیں لیکن علماء محققین اسے جسمانی اور بیداری کی حالت میں قرار دیتے ہیں۔ مسلمانوں کی جملہ ادبیات میں معراج ایک مقبول موضوع رہا ہے، لیکن اصطلاحاً معراج کا جس واقعہ پر اطلاق ہوتا ہے اس کا تعلق قریش کے شدید سماجی مقاطعے اور شعب ابی طالب کے محاصرے کے بعد اور اولین بیعت عقبہ سے قبل سے ہے۔

جمہور کے نزدیک اسراء اور معراج کا واقعہ ایک ہی شب میں پیش آیا اور وہ ستائیس رجب کی رات تھی۔

(دیکھیے الزرقانی شرح مواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۳۵۵)۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۲۱ ص ۷۴۳، زیر اہتمام: دانش گاہ پنجاب، پاکستان)

مسجد اقصیٰ کے متعلق شیخ امین احسن اصلاحی کی تصریح

شیخ امین احسن اصلاحی متوفی ۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۷ء، بنی اسرائیل: ۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

مسجد حرام سے تو ظاہر ہے کہ خانہ کعبہ مراد ہے۔ رہی دوسری مسجد تو اس کا تعارف دو صفتوں سے کرایا ہے۔ ایک ''اقصیٰ'' اور دوسری ''الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ''۔ ''اقصیٰ'' کے معنی ہیں دور والی۔ یہ مسجد، حرم مکہ کے باشندوں سے، جو اس کلام کے مخاطب اول ہیں کم و بیش ۴۰ دن کی مسافت پر یروشلم میں تھی، اس وجہ سے اس کو اقصیٰ کی صفت سے موصوف فرمایا تا کہ ذہن آسانی سے اس کی طرف منتقل ہو سکے۔ پھر ''الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ'' کی صفت اس کے ساتھ لگا کر اس سرزمین کی طرف بھی اشارہ کر دیا جس میں یہ مسجد واقع ہے۔ یہ اس سرزمین کی روحانی اور مادی دونوں قسم کی زرخیزیوں کی طرف اشارہ ہے۔ قدیم صحیفوں میں اس سرزمین کو دودھ اور شہد کی سرزمین کہا گیا ہے، جو اس کی انتہائی زرخیزی کی تعبیر ہے۔ روحانی برکات کے اعتبار سے اس کا جو درجہ تھا اس کا اندازہ کرنے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ جتنے انبیاء کا مولد و مدفن ہونے کا شرف اس سرزمین کو حاصل ہوا، کسی دوسرے علاقے کو حاصل نہیں ہوا۔

(تدبر قرآن، ج ۴ ص ۴۷۳، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۴۲۳ھ)

واقعہ معراج کے خواب نہ ہونے پر شیخ امین احسن اصلاحی کے دلائل

شیخ امین احسن اصلاحی متوفی ۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۷ء، بنی اسرائیل: ۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

رہا یہ سوال کہ یہ جو کچھ آپ کو دکھایا گیا رؤیا میں دکھایا گیا یا بیداری میں تو اس سوال کا جواب اسی سورہ میں آگے قرآن نے خود دے دیا ہے، فرمایا ہے: ''وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْیَا الَّتِیْۤ اَرَیْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ'' (بنی اسرائیل: ۶۰)۔ (اور ہم نے اس رؤیا کو جو ہم نے تمہیں دکھائی لوگوں کے لیے فتنہ ہی بنا دی)۔

ظاہر ہے کہ یہاں جس رویا کی طرف اشارہ ہے اس سے اس رویا کے سوا کوئی اور رویا مراد لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے جس کا ذکر آیت زیر بحث میں "لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا" کے الفاظ سے ہوا ہے۔ لفظ "اراءت" قرآن میں متعدد مقامات میں رویا میں دکھانے کے لیے آیا بھی ہے اور مفسرین نے اس سے یہی رویا مراد بھی لی ہے۔ اس وجہ سے اس کا رویا ہونا تو اپنی جگہ پر واضح بھی ہے اور مسلم بھی، لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ "رویا" کو خواب کے معنی میں لینا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ خواب تو خواب پریشان بھی ہوتے ہیں لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام کو جو رویا دکھائی جاتی ہے وہ رویائے صادقہ ہوتی ہے، اس کے متعدد امتیازی پہلو ہیں جو ذہن میں رکھنے کے ہیں۔

پہلی چیز تو یہ ہے کہ رویائے صادقہ وحی الٰہی کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں اور رسولوں پر جس طرح فرشتے کے ذریعے سے کلام کی صورت میں اپنی وحی نازل فرماتا ہے اسی طرح کبھی رویا کی صورت میں بھی ان کی رہنمائی فرماتا ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ یہ رویا نہایت واضح، غیر مبہم اور روشن صورت میں "کفلق الصبح" ہوتی ہے جس پر نبی کو پورا شرح صدر اور اطمینان قلب ہوتا ہے۔ اگر اس میں کوئی چیز تمثیلی رنگ میں بھی ہوتی ہے تو اس کی تعبیر بھی اللہ تعالیٰ اپنے نبی پر واضح فرما دیتا ہے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ جہاں واقعات وحقائق کا مشاہدہ کرانا مقصود ہو وہاں یہی ذریعہ نبی کے لیے زیادہ اطمینان بخش ہوتا ہے اس لیے کہ اس طرح واقعات کی پوری تفصیل مشاہدہ میں آجاتی ہے اور وہ معانی وحقائق بھی متمثل ہو کر سامنے آجاتے ہیں جو الفاظ کی گرفت میں مشکل ہی سے آتے ہیں۔

چوتھی چیز یہ ہے کہ رویا کا مشاہدہ چشم سر کے مشاہدہ سے زیادہ قطعی، زیادہ وسیع اور اس سے ہزارہا درجہ عمیق اور دور رس ہوتا ہے۔ آنکھ کو مغالطہ پیش آسکتا ہے لیکن رویائے صادقہ مغالطہ سے پاک ہوتی ہے۔ آنکھ ایک محدود دائرہ ہی میں دیکھ سکتی ہے لیکن رویا بیک وقت نہایت وسیع دائرہ پر محیط ہو جاتی ہے، آنکھ حقائق رسانی کے مشاہدے سے قاصر ہے، اس کی رسائی مرئیات ہی تک محدود ہے۔ لیکن رویا معانی وحقائق اور انوار وتجلیات کو بھی اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تجلی الٰہی اپنی آنکھوں سے دیکھنی چاہی لیکن وہ اس کی تاب نہ لا سکے۔ برعکس اس کے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج میں جو مشاہدے کرائے گئے وہ سب آپ نے کیے اور کہیں بھی آپ کی نگاہیں خیرہ نہیں ہوئیں۔ (تدبر قرآن ج ۴ ص ۴۷۵-۴۷۶، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۴۲۳ھ)

جسمانی معراج پر سید ابوالاعلیٰ مودودی کی دلیل

سید ابوالاعلیٰ مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء، لکھتے ہیں:

پھر یہ الفاظ بھی کہ "ایک رات اپنے بندے کو لے گیا" جسمانی سفر پر صریحاً دلالت کرتے ہیں۔ خواب کے سفر، یا کشفی سفر کے لیے یہ الفاظ کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا ہمارے لیے یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ یہ محض ایک روحانی تجربہ نہ تھا بلکہ ایک جسمانی سفر اور عینی مشاہدہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کرایا۔

منکرین حدیث کے اعتراضات کے جوابات از سید مودودی

منکرین حدیث کی طرف سے متعدد اعتراضات کیے جاتے ہیں، مگر ان میں سے صرف دو ہی اعتراضات ایسے ہیں جو کچھ وزن

رکھتے ہیں۔

ایک یہ کہ اس سے اللہ تعالیٰ کا کسی خاص مقام پر مقیم ہونا لازم آتا ہے، ورنہ اس کے حضور بندے کی پیشی کے لیے کیا ضرورت تھی کہ اسے سفر کرا کے ایک مقام خاص تک لے جایا جاتا؟

یہ اعتراض اس لیے غلط ہے کہ خالق اپنی ذات میں تو بلاشبہ اطلاق شان رکھتا ہے، مگر مخلوق کے ساتھ معاملہ کرنے میں وہ اپنی کسی کمزوری کی بناء پر نہیں بلکہ مخلوق کی کمزوریوں کی بناء پر محدود وسائط اختیار کرتا ہے۔ مثلاً جب وہ مخلوق سے کلام کرتا ہے تو کلام کا وہ محدود طریقہ استعمال کرتا ہے جسے ایک انسان سن اور سمجھ سکے، حالانکہ بجائے خود اس کا کلام ایک اطلاقی شان رکھتا ہے۔ اسی طرح جب وہ اپنے بندے کو اپنی سلطنت کی عظیم الشان نشانیاں دکھانا چاہتا ہے تو اسے لے جاتا ہے اور جہاں جو چیز دکھائی ہوتی ہے اسی جگہ دکھاتا ہے، کیونکہ وہ ساری کائنات کو بیک وقت اس طرح نہیں دیکھ سکتا جس طرح خدا دیکھتا ہے۔ خدا کو کسی چیز کے مشاہدے کے لیے کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہوتی، مگر بندے کو ہوتی ہے۔ یہی معاملہ خالق کے حضور باریابی کا بھی ہے کہ خالق بذات خود کسی مقام پر متمکن نہیں ہے، مگر بندہ اس کی ملاقات کے لیے ایک جگہ کا محتاج ہے جہاں اس کے لیے تجلیات کو مرکوز کیا جائے۔ ورنہ اس کی شان اطلاق میں اس سے ملاقات بندۂ محدود کے لیے ممکن نہیں ہے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دوزخ اور جنت کا مشاہدہ اور بعض لوگوں کے مبتلائے عذاب ہونے کا معاینہ کیسے کرا دیا گیا جب کہ ابھی بندوں کے مقدمات کا فیصلہ ہی نہیں ہوا ہے؟ یہ کیا سزا و جزا کا فیصلہ تو ہونا ہے قیامت کے بعد، اور کچھ لوگوں کو سزا دے ڈالی گئی ابھی سے؟

یہ اعتراض اس لیے غلط ہے کہ معراج کے موقع پر بہت سے مشاہدات جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کرائے گئے تھے ان میں بعض حقیقتوں کو متمثل کرکے دکھایا گیا تھا۔ مثلاً ایک فتنہ انگیز بات کی یہ تمثیل کہ ایک ذرا سے شگاف میں سے ایک موٹا سا بیل نکلا اور پھر اس میں واپس نہ جا سکا۔ یا زناکاروں کی یہ تمثیل کہ ان کے پاس تازہ نفیس گوشت موجود ہے مگر وہ اسے چھوڑ کر سڑا ہوا گوشت کھا رہے ہیں۔ اسی طرح برے اعمال کی جو سزائیں آپ کو دکھائی گئیں وہ بھی تمثیلی رنگ میں عالم آخرت کی سزاؤں کا پیشگی مشاہدہ تھیں۔

(تفہیم القرآن، ج ۲ ص ۵۸۹۔۵۹۰، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، مئی ۲۰۱۲ء)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”اور ہم نے موسیٰ کو کتاب (تورات) عطا فرمائی اور ہم نے اس کتاب کو بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنا دیا کہ تم مجھے چھوڑ کر کسی کو کارساز نہ بناؤ O“ (بنی اسرائیل: ۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج سے نوازنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات سے نوازنے کا ذکر

”وَآتَيْنَا مُوسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ أَلَّا تَتَّخِذُوا مِن دُونِي وَكِيلًا“:

یعنی ہم نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کے ساتھ مکرم فرمایا اور ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا فرمائی اور اس کے ساتھ مکرم فرمایا، اور وہ کتاب تورات ہے۔ اور ہم نے اس کتاب کو بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنا دیا کہ تم مجھے چھوڑ کر کسی کو وکیل نہ بناؤ، یعنی مجھے چھوڑ کر کسی اور کی عبادت کرکے اس کو میرا شریک نہ بناؤ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تم اپنے معاملات کا میرے سوا کسی کو کفیل نہ بناؤ۔ اور یہ

بھی کہا گیا: یہ کہ میرے سوا کسی کو رب نہ بناؤ جس پر اپنے معاملات میں توکل کیا جائے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اے ان لوگوں کی اولاد! جن کو ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں سوار فرمایا تھا (تم بھی شکر کیا کرو)، بے شک نوح بہت بڑے شکر گزار بندے تھے O'' (بنی اسرائیل: ۳)

حضرت نوح علیہ السلام کے شکر گزار بندے ہونے کے متعلق احادیث

''ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ ۚ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا'':

عمران بن سلیم بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو اس لیے عبد شکور فرمایا کہ جب وہ کھانا کھاتے تو یہ دعا کرتے: تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جنہوں نے مجھے کھانا کھلایا اور اگر وہ چاہتے تو مجھے بھوکا رکھتے۔ اور جب وہ لباس پہنتے تو یہ دعا کرتے: تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں اور اگر وہ چاہتے تو مجھے برہنہ رکھتے۔ اور جب جوتی پہنتے تو دعا کرتے: تمام تعریفیں اللہ عزوجل کے لیے ہیں جنہوں نے مجھے جوتی پہنائی اور اگر وہ چاہتے تو مجھے ننگے پیر رکھتے۔ اور جب وہ قضائے حاجت کرتے تو یہ دعا کرتے: تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جنہوں نے مجھ سے یہ گھناؤنی چیز دور فرما دی اور اگر وہ چاہتے تو اس کو میرے پیٹ میں ہی روک لیتے۔

(تاریخ ابن عساکر، ج ۱۷ ص ۲۶۸ (مخطوط)، جامع البیان رقم الحدیث: ۱۶۶۳۹، تفسیر عبدالرزاق ج ۱ ص ۳۷۳، ۳۷۴، تفسیر الطبری، ج ۱۴ ص ۳۵۳-۳۵۴، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۲۴ھ)

امام بیان کرتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام یہ دعا کرتے تھے: ''الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي أَذَاقَنِي لَذَّتَهُ وَأَبْقَىٰ فِيَّ مَنْفَعَتَهُ وَأَذْهَبَ عَنِّي أَذَاهُ'' (تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جنہوں نے مجھے کھانے کی لذت چکھائی اور میرے اندر اس کی منفعت باقی رکھی اور مجھ سے اس کا فضلہ باہر فرما دیا)۔

(مصنف ابن ابی شیبہ: ۲۹۹۰۶،۹، کتاب الدعاء للطبرانی: ۳۷۰، عمل الیوم واللیلہ لابن السنی: ۲۵، شعب الایمان للبیہقی: ۴۱۵۳)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن لوگ حضرت نوح علیہ السلام کے پاس جائیں گے، پس کہیں گے: اے نوح! آپ زمین والوں کی طرف پہلے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کا نام عبد شکور رکھا ہے آپ اپنے رب کے پاس ہماری سفارش کیجئے۔

(صحیح البخاری: ۳۳۴۰، صحیح مسلم: ۱۹۴، سنن ترمذی: ۲۴۳۴، مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۱۶۷۴، مسند احمد: ۹۶۲۳، السنۃ لابن ابی عاصم: ۸۱۱، السنن الکبریٰ للنسائی: ۱۱۲۸۶، مستخرج ابی عوانہ: ۳۳۸، الایمان لابن مندہ: ۸۷۹، الجامع الصحیح للسنن والمسانید ج ۱ ص ۲۹۷، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشرۃ، ج ۳ ص ۳۸۰، تاریخ دمشق لابن عساکر: ۱۳۰۵۲، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۱ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور ہم نے بنی اسرائیل کو تورات میں بہ ذریعہ وحی بتا دیا تھا کہ تم زمین میں ضرور بہ ضرور دو مرتبہ فساد کرو گے اور تم ضرور بہ ضرور ظلم اور سرکشی کی تمام حدیں عبور کر جاؤ گے O'' (بنی اسرائیل: ۴)

بنی اسرائیل کا دو مرتبہ فساد کرنا

"وَ قَضَیْنَاۤ اِلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ فِی الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ وَ لَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِیْرًا":

علامہ محمود بن عمر الزمخشری الخوارزمی المتوفی ۵۳۸ھ، بنی اسرائیل: ۴ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

گویا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ہم نے یہ قسم کھائی ہے کہ تم ضرور زمین میں دو مرتبہ فساد کرو گے۔ اُن دو فسادوں میں سے پہلا فساد حضرت زکریا علیہ السلام کو قتل کرنا تھا اور ارمیاء نبی کو قید کرنا تھا جب انہوں نے بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کی ناراضی سے ڈرایا۔ اور دوسرا فساد حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کو قتل کرنا تھا اور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو قتل کرنے کا قصد کرنا تھا۔

(الکشاف، ج ۲ ص ۶۰۷، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۷ھ)

بنی اسرائیل کے زمین میں دو مرتبہ فساد کا علم ازل میں مقرر ہونا

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے علم ازلی کو بیان فرمایا، یعنی ازل میں اللہ تعالیٰ کو یہ علم تھا کہ بنی اسرائیل زمین میں دو مرتبہ فساد کریں گے، یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے بنی اسرائیل نے زمین میں دو مرتبہ فساد کیا، بلکہ چونکہ ایسا ہونا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی خبر فرمائی ہے، کیونکہ علم معلوم کے مطابق ہوتا ہے، معلوم علم کے مطابق نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَ كُلُّ شَیْءٍ فَعَلُوْهُ فِی الزُّبُرِ ۝" (القمر: ۵۲) "(لوگوں نے جس قدر کام کیے وہ سب آسمانی کتابوں میں لکھا ہوا ہے O)۔ یعنی لوگوں نے اپنی قدرت اور اختیار سے جس قدر کام کیے وہ سب آسمانی کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں، یہ مطلب نہیں ہے کہ جو کچھ آسمانی کتابوں میں لکھا ہوا تھا وہی کام لوگوں نے کیے ہیں۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ چونکہ بنی اسرائیل نے اپنی قدرت اور اختیار سے سرزمین مصر میں دو مرتبہ فساد کرنا تھا، سو اللہ عزوجل کو اس کا پیشگی علم تھا اور اس علم ازلی کے مطابق اللہ تعالیٰ نے خبر فرمائی کہ بنی اسرائیل زمین میں دو مرتبہ فساد کریں گے۔ (سعیدی غفرلہ)

علامہ ابو الفرج عبد الرحمٰن بن علی بن الجوزی الحنبلی المتوفی ۵۹۷ھ، بنی اسرائیل: ۴ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ": یعنی مصر کی سرزمین میں۔ "مَرَّتَیْنِ": اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں کر کے اور تورات کی مخالفت کر کے تم ضرور دو مرتبہ زمین میں فساد کرو گے۔ پہلے فساد کے متعلق دو قول ہیں:

(۱) السدی نے اپنے مشائخ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے حضرت زکریا علیہ السلام کو قتل کیا۔

(۲) ابن اسحاق نے کہا کہ انہوں نے حضرت شعیاء علیہ السلام کو قتل کیا۔

اور دوسرے فساد میں جو انبیاء علیہم السلام قتل کیے گئے، وہ یحییٰ بن زکریا علیہما السلام ہیں، مقاتل نے کہا: ان دونوں فسادوں کے درمیان دو سو اور دس سال کا عرصہ ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام کو قتل کرنے کا سبب یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت زکریا کو حضرت مریم کے ساتھ متہم کیا اور کہا کہ مریم زکریا سے حاملہ ہوئی ہیں۔ حضرت زکریا علیہ السلام بنی اسرائیل سے بھاگے تو ان کے لیے ایک درخت اندر سے کھل گیا، حضرت زکریا علیہ السلام اس درخت کے اندر داخل ہو گئے اور ان کی چادر کا ایک پلو درخت سے باہر رہ گیا، پس بنی اسرائیل کے پاس شیطان آیا اور اس نے اس درخت اور ان کے پلو کی طرف ان کی رہنمائی کی، پس انہوں نے اس درخت کو آری سے کاٹ ڈالا اور حضرت زکریا علیہ السلام اس درخت میں تھے۔

اور حضرت شعیاء علیہ السلام کو قتل کرنے کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے بنی اسرائیل کے سامنے تورات کے احکام پڑھ کر سنائے اور بتایا کہ اللہ تعالیٰ اُن کو نافرمانیوں سے منع فرماتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک قول یہ ہے کہ بنی اسرائیل کا بادشاہ اپنی بیوی کی بیٹی پر عاشق ہوگیا اور حضرت یحییٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ آیا وہ اس سے نکاح کر سکتا ہے؟ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے منع فرمایا، اس کی ماں کو جب پتا چلا تو اس نے اپنی بیٹی کو بنا سنوار کر بادشاہ کے پاس اس وقت بھیجا جب وہ شراب پی رہا تھا اور اس سے کہا: جب بادشاہ اس سے اپنی خواہش پوری کرنا چاہے تو وہ انکار کردے اور کہے کہ یہ تب ہوگا جب تم یحییٰ بن زکریا کا سر کاٹ کر مجھے تھال میں رکھ کر پیش کرو گے، اس لڑکی نے ایسا ہی کیا، بادشاہ نے کہا: تم پر افسوس ہے تم کسی اور چیز کا سوال کرلو، اس نے کہا: نہیں میرا یہی سوال ہے، پھر بادشاہ کے حکم سے حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر کاٹ کر تھال میں لایا گیا، اس وقت بھی وہ سر کہہ رہا تھا: "یہ لڑکی تمہارے لیے حلال نہیں ہے، یہ لڑکی تمہارے لیے حلال نہیں ہے"۔

علماء سیر نے کہا ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا خون مسلسل بہتا رہا اور خون جوش مارتا رہا حتیٰ کہ ستر ہزار بنی اسرائیل قتل کردیے گئے تب جا کر وہ خون ٹھنڈا ہوا۔ (زاد المسیر فی علم التفسیر ج ۳ ص ۱۰، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۳۱ھ)

موجودہ بائبل میں بھی مذکور ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو ناحق قتل کر دیا تھا۔

مرقس کی انجیل میں ہے:

کیونکہ ہیرودیس نے آپ آدمی بھیج کر یوحنا کو پکڑوایا اور اپنے بھائی فلپس کی بیوی ہیرودیاس کے سبب اسے قید خانہ میں باندھ رکھا تھا کیونکہ ہیرودیس نے اس سے بیاہ کرلیا تھا○ اور یوحنا نے اس سے کہا تھا کہ اپنے بھائی کی بیوی رکھنا تجھے روا نہیں○ پس ہیرودیاس اس سے دشمنی رکھتی اور چاہتی تھی کہ اسے قتل کرائے مگر نہ ہوسکا○ کیونکہ ہیرودیس یوحنا کو راست باز اور مقدس آدمی جان کر اس سے ڈرتا اور اسے بچائے رکھتا تھا اور اس کی باتیں سن کر بہت حیران ہوجاتا تھا مگر سنتا خوشی سے تھا○ اور موقع کے دن جب ہیرودیس نے اپنی سالگرہ میں اپنے امیروں اور فوجی سرداروں اور گلیل کے رئیسوں کی ضیافت کی○ اور اسی ہیرودیاس کی بیٹی اندر آئی اور ناچ کر ہیرودیاس اور اس کے مہمانوں کو خوش کیا تو بادشاہ نے اس لڑکی سے کہا: جو چاہے مجھ سے مانگ میں تجھے دوں گا○ اور اس سے قسم کھائی کہ جو تو مجھ سے مانگے گی اپنی آدھی سلطنت تک تجھے دوں گا○ اور اس نے باہر جا کر اپنی ماں سے کہا کہ میں کیا مانگوں؟ اس نے کہا: یوحنا بپتسمہ دینے والے کا سر○ وہ فی الفور بادشاہ کے پاس جلدی سے اندر آئی اور اس سے عرض کی: میں چاہتی ہوں کہ تو یوحنا بپتسمہ دینے والے کا سر ایک تھال میں ابھی مجھے منگوا دے○ بادشاہ بہت غمگین ہوا مگر اپنی قسموں اور مہمانوں کے سبب اس سے انکار نہ کرنا چاہا○ پس بادشاہ نے فی الفور ایک سپاہی کو حکم دے کر بھیجا کہ اس کا سر لائے۔ اس نے جا کر قید خانہ میں اس کا سر کاٹا○ اور ایک تھال میں لا کر لڑکی کو دیا اور لڑکی نے اپنی ماں کو دیا○ پھر اس کے شاگرد سن کر آئے اور اس کی لاش اٹھا کر قبر میں رکھی○ (مرقس کی انجیل باب:۶، آیت:۱۷-۲۹، متی کی انجیل، باب:۱۴ آیت:۳-۱۲، نیا عہد نامہ ص ۱۸)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پھر (اے بنی اسرائیل!) جب تمہارے پہلے فساد کے وقت عذاب کی وعید آئی تو ہم نے تم پر سخت جنگ جو بندے مسلط فرما دیے، سو وہ تمہاری تلاش میں شہروں کے اندر پھیل گئے اور یہ وعید

پوری ہی ہونی تھیO" (بنی اسرائیل: ۵)

"فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا":

(پھر (اے بنی اسرائیل!) جب تمہارے پہلے فساد کے وقت عذاب کی وعید آئی تو ہم نے تم پر سخت جنگ جو بندے مسلط فرما دیے، سو وہ تمہاری تلاش میں شہروں کے اندر پھیل گئے اور یہ وعید پوری ہی ہونی تھی)۔

بنی اسرائیل کے مسلسل فساد کی وجہ سے ان پر سخت دشمن کو مسلط فرمانا

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے متعلق دو پیشگوئیاں فرمائی ہیں۔ پہلی پیش گوئی یہ ہے کہ وہ ضرور زمین پر فساد کریں گے اور سرکشی کریں گے، پھر اللہ تعالیٰ اُن کے اس فساد اور سرکشی کی سزا میں اُن پر اُن کے ایسے دشمن کو مسلط فرما دیں گے جو اُن کو ڈھونڈ کر قتل کر دیں گے، پھر اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کی مدد فرمائیں گے اور اُن کو غلبہ عطا فرمائیں گے، پھر جب انہوں نے دوبارہ فساد اور سرکشی کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو دوبارہ سزا دی اور ان کے دشمنوں کو ان پر مسلط فرما دیا۔ ان دونوں پیشگوئیوں کی تصدیق بائبل میں بھی موجود ہے جس کا ہم عنقریب باحوالہ ذکر کر رہے ہیں۔

بنی اسرائیل کی مسلسل کج روی اور ہٹ دھرمی پر اللہ تعالیٰ کے نزول غضب کے متعلق موجودہ بائبل میں تصریح

حضرت داؤد علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

انہوں نے ان قوموں کو ہلاک نہ کیا، جیسا کہ خداوند نے ان کو حکم دیا تھاO بلکہ ان قوموں کے ساتھ مل گئے اور ان کے سے کام سیکھ گئےO اور ان کے بتوں کی پرستش کرنے لگے جو ان کے لیے پھندہ بن گئےO انہوں نے اپنے بیٹے بیٹیوں کو شیاطین کے لیے قربان کیاO اور معصوموں کا یعنی اپنے بیٹے بیٹیوں کا خون بہایا جن کو انہوں نے کنعان کے بتوں کے لیے قربان کر دیا اور ملک خون سے ناپاک ہو گیاO یوں وہ اپنے ہی کاموں سے آلودہ ہو گئے اور اپنے فعلوں سے بے وفا بنےO اس لیے خداوند کا قہر اپنے لوگوں پر بھڑکا اور اسے اپنی میراث سے نفرت ہو گئی، اور اس نے ان قوموں کے قبضہ میں کر دیاO اور ان سے عداوت رکھنے والے ان پر حکمران ہو گئےO ان کے دشمنوں نے ان پر ظلم کیا اور وہ ان کے محکوم ہو گئےO اس نے تو بار بار ان کو چھڑایاO لیکن ان کا مشورہ باغیانہ ہی رہاO اور وہ اپنی بدکاری کے باعث پست ہو گئے۔

(زبور، باب: ۱۰۶، آیت: ۳۴-۴۳، کتاب مقدس ص ۵۹۲، مطبوعہ لاہور، ۱۹۹۲ء)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد آنے والے انبیاء کا بنی اسرائیل کو ان کی سرکشی پر عذاب سے ڈرانا

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد جتنے انبیاء تشریف لائے سب نے بنی اسرائیل کو آنے والے عذاب سے ڈرایا۔ حضرت یسعیاہ کا صحیفہ اس قسم کی تنبیہات سے بھرا ہوا ہے، وہ بنی اسرائیل کی بدکاریوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

لوگوں میں سے ہر ایک دوسرے پر اور ہر ایک اپنے ہمسایہ پر ستم کرے گا اور بچے بوڑھوں کی اور رذیل شریفوں کی گستاخی کریں گےO جب کوئی آدمی اپنے باپ کے گھر میں اپنے بھائی کا دامن پکڑ کر کہے کہ تو پوشاک والا ہے۔ آ تو ہمارا حاکم ہو اس اجڑے دیس پر قابض ہو جاO اس روز وہ بلند آواز سے کہے گا کہ مجھ سے انتظام نہیں ہو گا کیونکہ میرے گھر میں نہ روٹی ہے نہ کپڑا

مجھے لوگوں کا حاکم نہ بناؤ○ کیونکہ یروشلم کی بربادی ہوگئی اور یہوداہ گر گیا، اس لیے ان کی بول چال اور چال چلن خداوند کے خلاف ہیں کہ اس کی جلالی آنکھوں کو غضب ناک کریں○ ان کے منہ کی صورت ان پر گواہی دیتی ہے، وہ اپنے گناہوں کو سدوم کی مانند ظاہر کرتے ہیں اور چھپاتے نہیں، ان کی جانوں پر واویلا ہے! کیونکہ وہ آپ اپنے اوپر بلا لاتے ہیں○ راست بازوں کی بابت کہو کہ بھلا ہوگا، کیونکہ وہ اپنے کاموں کے پھل کھائیں گی○ شریروں پر واویلا ہے! کہ ان کو بدی پیش آئے گی کیونکہ وہ اپنے ہاتھوں کا کیا پائیں گے○ (یسعیاہ باب: ۳ آیت: ۶۔ ۱۲، کتاب مقدس ص ۶۲۲، مطبوعہ لاہور، ۱۹۹۲ء)

حضرت یرمیاہ نبی نے بنی اسرائیل کو اس کی بدکاریوں پر اس طرح سرزنش فرمائی:

کہتے ہیں کہ اگر کوئی مرد اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور وہ اس کے ہاں سے جا کر کسی دوسرے مرد کی ہو جائے تو کیا وہ پہلا پھر اس کے پاس جائے گا؟ کیا وہ زمین نہایت ناپاک نہ ہوگی؟ لیکن تو نے تو بہت سے یاروں کے ساتھ بدکاری کی ہے۔ کیا اب بھی تو میری طرف پھرے گی؟ خداوند فرماتا ہے○ پہاڑوں کی طرف اپنی آنکھیں اٹھا اور دیکھ کون سی جگہ ہے جہاں تو نے بدکاری نہیں کی؟ تو راہ میں ان کے لیے اس طرح بیٹھی جس طرح بیابان میں عرب، تو نے اپنی بدکاری اور شرارت سے زمین کو ناپاک کیا○ اس لئے بارش نہیں ہوتی اور آخری برسات نہیں ہوئی، تیری پیشانی فاحشہ کی ہے اور تجھ کو شرم نہیں آتی○ کیا تو اب سے مجھے پکار کر نہ کہے گی اے میرے باپ! تو میری جوانی کا راہبر تھا؟○ کیا اس کا قہر ہمیشہ رہے گا؟ کیا وہ اسے ابد تک رکھ چھوڑے گا؟ دیکھ تو ایسی باتیں تو کہہ چکی لیکن جہاں تک تجھ سے ہو سکا تو نے برے کام کئے○

اور یوسیاہ بادشاہ کے ایام میں خداوند نے مجھ سے فرمایا کیا تو نے دیکھا برگشتہ اسرائیل نے کیا کیا ہے؟ وہ ہر ایک اونچے پہاڑ پر اور ہر ایک ہرے درخت کے نیچے گئی اور وہاں بدکاری کی○ اور جب وہ یہ سب کچھ کر چکی تو میں نے کہا وہ میری طرف واپس آئے گی پر وہ نہ آئی اور اس کی بے وفا بہن یہوداہ نے یہ حال دیکھا○ پھر میں نے دیکھا کہ جب برگشتہ اسرائیل کی زناکاری کے سبب سے میں نے اس کو طلاق دے دی اور اسے طلاق نامہ لکھ دیا تو بھی اس کی بے وفا بہن یہوداہ نہ ڈری بلکہ اس نے بھی جا کر بدکاری کی○ اور خداوند فرماتا ہے کہ باوجود اس سب کے اس کی بے وفا بہن یہوداہ سچے دل سے میری طرف نہ پھری بلکہ ریاکاری سے○ اور خداوند نے مجھ سے فرمایا برگشتہ اسرائیل نے بے وفا یہوداہ سے زیادہ اپنے آپ کو صادق ثابت کیا ہے○ جا اور شمال کی طرف یہ بات پکار کر کہہ دے کہ خداوند فرماتا ہے اے برگشتہ اسرائیل! واپس آ۔ میں تجھ پر قہر کی نظر نہیں کروں گا کیونکہ خداوند فرماتا ہے میں رحیم ہوں میرا قہر دائمی نہیں○ صرف اپنی بدکرداری کا اقرار کر کہ تو خداوند اپنے خدا سے عاصی ہوگئی اور ہر ایک ہرے درخت کے نیچے غیروں کے ساتھ ادھر ادھر آوارہ پھری۔ خداوند فرماتا ہے تم میری آواز کے شنوا نہ ہوئے○ خداوند فرماتا ہے اے برگشتہ بچو واپس آؤ! کیونکہ میں خود تمہارا مالک ہوں اور میں تم کو ہر ایک شہر میں سے ایک اور ہر ایک گھرانے میں سے دو لے کر صیون میں لاؤں گا○ اور میں تم کو اپنے خاطر خواہ چرواہے دوں گا اور وہ تم کو دانائی اور ہوشمندی سے چرائیں گے○

(یرمیاہ، باب: ۳ آیت: ۱۔ ۱۶، کتاب مقدس ص ۶۱۳، ۷۱۴، مطبوعہ لاہور، ۱۹۹۲ء)

یسعیاہ نبی اور یرمیاہ نبی کے ان مواعظ سے بنی اسرائیل پر جو انہوں نے سرزنشیں کی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت سے رشتہ بالکل منقطع کر لیا تھا۔ احکام الٰہی کی اطاعت،

اخلاق کی بلندی، معاملات میں دیانت وصداقت ایسے تمام امور جن کی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو تعلیم دی تھی، ان کو ترک کر دیا تھا۔ اب یہ جاننا چاہیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ امت بلندی سے ایسی پستی میں کیسے گرگئی، اس کا کیا سبب تھا۔

بنی اسرائیل کے قعر مذلت میں گرنے کا سبب

ضیاء الامت حضرت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری حنفی متوفی ۱۴۱۸ھ، اس کے سبب پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں جب بنی اسرائیل بحر احمر کو عبور کر کے وادیٔ سینا میں پہنچے جو ایک بے آب وگیاہ ریگستان تھا تو انہیں حکم خداوندی ملا کہ آگے بڑھو اور فلسطین جو تمہارا آبائی وطن ہے اس میں جو مشرک قومیں آباد ہیں ان کے ساتھ جہاد کرو، ان کو مغلوب ومقہور کر کے فاتحانہ شان سے فلسطین میں داخل ہو۔ یہ علاقہ جو صدیوں سے گوناگوں گمراہیوں کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا ہے نور توحید سے اسے ایک بار پھر بقعۂ نور بنا دو لیکن انہوں نے انتہائی بزدلی کا مظاہرہ کیا اور بڑی بے باکی سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہہ دیا: "قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَاۤ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۝ (المائدہ: ۲۴)" (اے موسیٰ ہم اس میں کبھی بھی داخل نہیں ہوں گے جب تک وہ زور آور لوگ اس میں موجود ہیں، پس آپ اور آپ کا رب جائیں، آپ دونوں اُن سے قتال کریں، بے شک ہم تو یہیں بیٹھنے والے ہیں۝)

چالیس سال تک اس لق ودق صحرا کی خاک چھاننے کے بعد جب وہ فلسطین میں داخل ہوئے تو یہ علاقہ مختلف قوموں حتی، اموری، کنعانی، فریذی، فلستی وغیرہا نے آپس میں بانٹ رکھا تھا اور اپنی الگ الگ ریاستیں قائم کر رکھی تھیں۔ یہ سب قومیں مشرک تھیں۔ ان کے سب سے بڑے بت کا نام ایل تھا۔ اس کی ایک بیوی بھی تھی جس کا نام عشیرہ تھا۔ ان کی نسل سے خداؤں کا ایک پورا کنبہ پیدا ہوا تھا۔ اس کنبہ کا ہر فرد زندگی کے مختلف شعبوں کا سربراہ تھا۔ سب سے زیادہ بااختیار بعل تھا، خداؤں کے اس کنبہ کے افراد سے باہمی عشق بازی اور فسق وفجور کے ایسے قصے منسوب تھے جن کو بیان کرنے سے زبان قلم عاجز ہے۔

ایسے مشرکانہ اور اخلاق باختہ ماحول میں جب بنی اسرائیل کا خاندان فروکش ہوا تو انہیں چاہیے تھا کہ حق کی جو شمع فروزاں انہیں مرحمت کی گئی تھی اس کی کرنوں سے اس ظلمت کدہ کو منور کرتے اور معبودانِ باطل کی بندگی کی زنجیروں کو کاٹ کر انہیں اللہ تعالیٰ کی توحید کا حلقہ بگوش بناتے۔ لیکن ان کے تو اپنے قدم بھی ڈگمگانے لگے اور اپنے ماحول سے اتنے متاثر ہوئے کہ مشرک اور اخلاق باختہ اقوام کی جملہ خرابیاں بدرجۂ اتم ان میں سرایت کر گئیں۔ اگر سمندر کی جانب سے فلسطین کے حملوں نے کنعانیوں کو پراگندہ نہ کر دیا ہوتا تو وہ بنی اسرائیل کے منتشر قبائل کو نگل جاتے۔ آخر طالوت کی سرکردگی میں ۱۰۲۰ قبل مسیح تخت سلطنت پر متمکن ہوئے۔ اتنے مدبر اور حسن انتظام سے سارے ملک میں امن وامان قائم کیا۔ ان کے بعد ان کے فرزند حضرت سلیمان علیہ السلام سریر آرائے حکومت ہوئے۔ آپ کا عہد ۹۶۱ تا ۹۲۲ قبل مسیح بنی اسرائیل کے لیے ایک زریں عہد تھا۔ حضرت سلیمان کے انتقال کے بعد ان کا شیرازہ منتشر ہو گیا اور یہ دن بدن راہ ہدایت سے دور ہوتے چلے گئے۔ ہر عہد کے نبی نے ان کو راہ راست پر لانے کی انتہائی کوشش کی لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔ حضرت موسیٰ، حضرت یسعیاہ، حضرت یرمیاہ اور حزقیئل نے انہیں عذاب الٰہی سے ڈرایا لیکن یہ اپنی بے راہ روی سے باز نہ آئے۔ جب ان کی مہلت کی گھڑیاں ختم ہوئیں، اللہ تعالیٰ کا عذاب بابل کے جابر اور سفاک بادشاہوں کے حملوں کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ۵۹۸ اور ۵۹۹ قبل مسیح میں بابلیوں نے ان پر حملے کر کے ان کے ملک میں تباہی مچائی۔ ان کے بڑے بڑے

شہروں کو پیوند خاک کر دیا۔لیکن یہ بدبخت پھر بھی بیدار نہ ہوئے۔اگست ۵۸۷ قبل مسیح میں بخت نصر ایک لشکر جرار کے ساتھ ان پر حملہ آور ہوا۔اس نے یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ہیکل سلیمانی کو مسمار کر کے رکھ دیا۔بے شمار یہودی مرد و زن، بوڑھے جوان بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر دیے گئے۔ان کے شاندار محلات کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا، جو یہودی زندہ بچ گئے تھے انہیں پابہ زنجیر بابل لایا گیا اور وہاں کی رعایا میں ان کو غلاموں کی حیثیت سے اس طرح تقسیم کر دیا گیا کہ کبھی یہ متحد ہونے کا خواب بھی نہ دیکھ سکیں۔اس طرح پہلے فساد اور اس کی پاداش میں ان کی مکمل بربادی کی پیشگوئیاں جو ان کے انبیاء نے کی تھیں، پوری ہوئیں۔اس آیت کریمہ میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔(ضیاء القرآن، ج ۲ ص ۶۳۶ ـ ۶۳۷، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پھر تمہاری توبہ کے بعد ہم نے تمہیں ان پر دوبارہ غلبہ عطا فرما دیا اور ہم نے مال و دولت اور بیٹوں کے ساتھ تمہاری مدد فرمائی اور ہم نے تمہاری تعداد میں کثرت عطا فرمائی ○" (بنی اسرائیل:۶)

"ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝":

بنی اسرائیل کے مصائب کا خاتمہ

حضرت ضیاء الامت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری حنفی متوفی ۱۴۱۸ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

بخت نصر کی موت کے بعد حالات نے پلٹا کھایا اور بابل کی سلطنت زوال پذیر ہوئی۔سیرس دوم شاہ فارس (CYRUS II) جسے بائبل میں خورس لکھا گیا ہے، نے لیڈیا اور بابل پر ۵۳۹ قبل مسیح حملہ کیا اور اس کو فتح کر لیا۔سب سے پہلے اس نے یہود کی سلطنت کو بحال کرنے اور یروشلم سے ہیکل کو دوبارہ تعمیر کرنے کا فرمان صادر کیا۔بے شمار یہودی جو بابل میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے، انہیں فلسطین واپس جانے کی اجازت دی۔چنانچہ کتاب عزرا میں مرقوم ہے:

"اور شاہ فارس خورس کی سلطنت کے پہلے سال میں اس لیے کہ خداوند کا کلام جو یرمیاہ کی زبانی آیا تھا پورا ہو۔خداوند نے شاہ فارس خورس کا دل ابھارا۔سو اس نے اپنی تمام مملکت میں منادی کرائی۔اور اس مضمون کا فرمان بھی لکھا کہ شاہ فارس خورس یوں فرماتا ہے کہ خداوند آسمان کے خدا نے زمین کی سب مملکتیں مجھے بخشی ہیں اور مجھے تاکید کی ہے کہ میں یروشلم میں جو یہوداہ میں ہے اس کے لیے ایک مسکن بناؤں۔پس تمہارے درمیان جو کوئی اس کی ساری قوم میں سے ہو اس کا خدا اس کے ساتھ ہو اور وہ یروشلم کو جو یہوداہ میں ہے جائے اور خداوند اسرائیل کے خدا کا گھر جو یروشلم میں ہے بنائے"۔(عزرا: باب: ۱، آیت: ۱، ۲، ۳، کتاب مقدس ص ۴۶۲)

بنی اسرائیل کے قافلے جب طویل جلاوطنی کے بعد فلسطین واپس پہنچے اور انہوں نے ہیکل کی تعمیر شروع کی تو وہاں کی مقامی آبادی نے مزاحمت کی لیکن جب دارا اول (DARIUS I) فارس کا بادشاہ بنا تو اس نے حجی نبی اور زکریا نبی کے اصرار پر فرمان صادر کیا کہ منہدم شدہ ہیکل سلیمانی کے مقام پر فوراً دوسرا ہیکل تعمیر کیا جائے۔چنانچہ ۵۱۵ قبل مسیح میں اس ہیکل کی تعمیر کا کام ختم ہوا۔اس کے باوجود ۴۴۵ قبل مسیح تک وہاں کے حالات بنی اسرائیل کے لیے تشویشناک ہی بنے رہے۔یہاں تک کہ کسی کی کوششوں سے ۴۵۸ قبل مسیح میں شاہ فارس کے حکم سے ایک وفد یروشلم بھیجا گیا اور حضرت عزیر علیہ السلام کو دین موسوی کی ترویج اور تنفیذ کا کام سپرد کیا گیا۔آپ نے یروشلم پہنچ کر اپنی مساعی جمیلہ سے سیاسی استحکام کے ساتھ ساتھ اصلاح عقائد اور تربیت اخلاق کی

نصرت سے ایک بار پھر بنی اسرائیل کو بہرہ اندوز کیا۔اس طرح غم والم کے ایک طویل دور کا خاتمہ ہوا۔اور بنی اسرائیل کو چین کا سانس لینا نصیب ہوا۔(انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا صفحات:۳۹۶، ۷، ۱۲، ج ۱۷)۔(ضیاء القرآن، ج ۲ ص ۶۳۷-۶۳۸ ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:" (اور ہم نے فرمایا:) اگر تم نیک کام کرو گے تو ان کا فائدہ تم کو ہی ملے گا، اور اگر تم برے کام کرو گے تو اس کا ضرر بھی تم ہی کو پہنچے گا، پھر جب دوسرے فساد کی وعید کا وقت آیا (تو پھر ہم نے دوسرے دشمنوں کو تم پر مسلط فرمادیا) تا کہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں، اور تا کہ وہ مسجد (بیت المقدس) میں اسی طرح داخل ہو جائیں جس طرح وہ پہلی مرتبہ بیت المقدس میں داخل ہوئے تھے اور اس کو ویران کر دیں اور جس چیز پر غلبہ پائیں اسے تباہ و برباد کر دیں O" (بنی اسرائیل:۷)

علامہ ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی بن الجوزی الحنبلی المتوفی ۵۹۷ھ، بنی اسرائیل:۷ تا ۱۰ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ": یعنی ہم نے بنی اسرائیل سے فرمایا: اگر تم نیک کام کرو گے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو گے تو یہ نیکی تم اپنے ہی ساتھ کرو گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے کا ثواب تم کو ملے گا۔"وَ اِنْ اَسَاْتُمْ": اور اگر تم نے فساد پھیلا کر اور نافرمانیوں کا ارتکاب کر کے برے کام کیے۔"فَلَهَا": تو اس کا ضرر بھی تم کو پہنچے گا۔"فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ": یعنی جب ان کے دوسری بار فساد کرنے کا وقت آیا اور وہ فساد حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کو قتل کرنا تھا اور ان کا ارادہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی قتل کرنے کا تھا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھالیا گیا اور بنی اسرائیل پر فارس اور روم کے بادشاہوں کو مسلط فرمادیا گیا، پس انہوں نے بنی اسرائیل کو قتل کیا اور ان کو قید کر لیا جیسا کہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:"لِیَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ"۔یعنی تا کہ وہ تمہیں ذلیل کر دیں اور تمہارے چہروں کو رسوا کر دیں۔اور دوسرے فساد کے وقت ان پر جن کو مسلط فرمایا گیا تھا، اس کے متعلق دو قول ہیں:

(۱) مجاہد اور قتادہ نے کہا کہ وہ بخت نصر تھا، اور اکثر راویوں نے اس قول کا انکار کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ بخت نصر نے جب بیت المقدس کو تباہ کیا تھا اور اس کو کھنڈر بنادیا تھا، اس وقت اور حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کی ولادت میں بہت لمبا زمانہ ہے۔

(۲) مقاتل نے کہا: وہ انطیاخوس رومی تھا۔

اور"لِیَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ" کا معنی یہ ہے کہ تا کہ تمہارے پہلے کیے ہوئے کاموں کے سبب سے تمہارے چہروں پر غم کے آثار چھا جائیں، کیونکہ تم نے پہلے انبیاء علیہم السلام کو ناحق قتل کیا تھا اور ان کو قید کیا تھا۔

"وَلِیَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ": اور تا کہ وہ بیت المقدس میں داخل ہو جائیں۔"كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ": جس طرح وہ پہلی بار بیت المقدس میں داخل ہوئے تھے۔"وَّلِیُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِیْرًا": اور بیت المقدس کو تباہ و برباد کر کے ویران اور کھنڈر بنادیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:"عنقریب تمہارے رب تم پر رحم فرمائیں گے اور اگر تم نے دوبارہ وہی روش اختیار کی تو ہم تم کو دوبارہ سزا دیں گے اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے قید کرنے کی جگہ بنادیا O" (بنی اسرائیل:۸)

"عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ یَّرْحَمَكُمْ"۔یہ وہ چیز ہے جس کا تورات میں ان سے وعدہ کیا گیا تھا۔پس اللہ تعالیٰ نے ان سے انتقام

لینے کے بعد ان پر رحم فرمایا اور ان کے شہروں کو آباد فرما دیا اور ستر سال کے بعد ان کی نعمتیں ان پر لوٹا دیں۔

"وَ اِنْ عُدْتُّمْ": اور اگر تم نے دوبارہ ہماری معصیت کی۔ "عُدْنَا": تو ہم دوبارہ تم سے انتقام کے لیے لوٹیں گے۔

مفسرین نے بیان کیا ہے کہ پھر انہوں نے دوبارہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر فارس اور روم کے بادشاہوں کو مسلط فرما دیا۔ قتادہ نے کہا: پھر اس کا آخر یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ پھر وہ قیامت تک اس عذاب میں مبتلاء ہیں کہ وہ اپنے ہاتھ سے ذلت کے ساتھ مسلمانوں کو جزیہ ادا کریں گے۔

"وَ جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِیْنَ حَصِیْرًا": اس کی تفسیر میں دو قول ہیں:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، الضحاک، قتادہ اور مجاہد نے کہا: ان کو اس جہنم میں قید کر دیا جائے گا۔ اور ابوعبیدہ اور ابن قتیبہ نے کہا کہ جہنم کو ان کے لیے قید خانہ بنا دیا جائے گا۔ (۲) حسن بصری نے کہا: یعنی جہنم کو ان کے لیے بستر اور بچھونا بنا دیا جائے گا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "بے شک یہ قرآن اس راستہ کی ہدایت عطا فرماتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھا ہے اور ایمان لانے والوں کو خوش خبری دیتا ہے کہ جو لوگ نیک کام کرتے ہیں ان کے لیے بہت بڑا اجر و ثواب ہے O" (بنی اسرائیل: ۹)

"اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ": ابن الانباری نے کہا: یعنی یہ قرآن ایسے خصال اور ایسے اوصاف کی طرف رہنمائی فرماتا ہے جو بہت عمدہ ہیں۔ اور مفسرین نے کہا: یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی توحید اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی طرف ہدایت دیتا ہے۔ "وَ یُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِیْرًا": اور مومنین کو یہ بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے آخرت میں جنت ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور قرآن یہ خبر دیتا ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے، ہم نے ان کے لیے دردناک عذاب تیار فرما رکھا ہے O" (بنی اسرائیل: ۱۰)

"وَّ اَنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا": اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ان کو عذاب کی بشارت دیتا ہے، کیونکہ مومنین دنیا میں مشرکین سے ایذائیں اٹھاتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ بشارت دی کہ ان کے دشمنوں کو آخرت میں عذاب میں مبتلاء فرمایا جائے گا۔ (زاد المسیر فی علم التفسیر، ج ۳ ص ۱۰-۱۲، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۳۱ھ، وتفاسیر الرازی)

وَ یَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَیْرِ ؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ﴿۱۱﴾

اور (کبھی) انسان (تنگ دلی سے) خیر کی دعا کی طرح شر کی دعا کرتا ہے، اور انسان بہت عجلت پسند ہے O

وَ جَعَلْنَا الَّیْلَ وَ النَّهَارَ اٰیَتَیْنِ فَمَحَوْنَاۤ اٰیَةَ الَّیْلِ وَ جَعَلْنَاۤ اٰیَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ وَ كُلَّ شَیْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِیْلًا ﴿۱۲﴾

اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنادیا، پس ہم نے رات کی نشانی کو مٹادیا اور دن کی نشانی کو روشن بنایا تاکہ تم اپنے رب کے فضل سے رزق کو طلب کرو اور تاکہ تم سالوں کی گنتی شمار اور حساب کو جان لو، اور ہم نے تمہاری ضرورت کی ہر چیز کو تفصیل سے بیان فرمادیا ہے O

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ؕ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ﴿۱۳﴾

اور ہم ہر انسان کی تقدیر کو اس کے گلے میں ڈال دیا ہے اور قیامت کے دن ہم اس کے صحیفہ اعمال کو نکالیں گے جسے وہ کھلا ہوا پائے گا O

اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ﴿۱۴﴾

(اس سے کہا جائے گا:) اپنا صحیفہ اعمال پڑھ لے، آج تو خود ہی اپنے حساب کے لیے کافی ہے O

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ؕ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾

جو شخص ہدایت پر چلتا ہے سو وہ اپنے ہی فائدہ کے لیے ہدایت پر چلتا ہے اور جس نے گمراہی کو اختیار کیا تو وہ گمراہ ہو کر صرف اپنا ہی نقصان کرتا ہے، اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور ہم کسی کو عذاب دینے والے نہیں ہیں حتیٰ کہ رسول کو مبعوث فرمادیں O

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ﴿۱۶﴾

اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک فرمانے کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس بستی کے مال دار لوگوں کو (اطاعت کا) حکم فرماتے ہیں، پھر وہ اس حکم کی نافرمانی کرتے ہیں تو ان پر ہمارے عذاب کا فیصلہ ثابت ہو جاتا ہے اور ہم اس بستی کو تباہ و برباد فرمادیتے ہیں O

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا ﴿۱۷﴾

اور ہم نے نوح کے بعد بہت سی بستیوں کو ہلاک فرمادیا، اور آپ کے رب اپنے بندوں کے گناہوں کی خوب خبر رکھنے والے، دیکھنے والے ہیں O

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾

جو لوگ (صرف) دنیا کا ارادہ کرتے ہیں ہم ان کو دنیا میں جسے چاہتے ہیں اور جتنا چاہتے ہیں جلد دے دیتے ہیں، پھر ہم نے ان کے لیے جہنم مقرر فرما دیے ہیں جس میں وہ ذلت سے اور اللہ کی رحمت سے محروم ہو کر جائیں گے O

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾

اور جس نے آخرت کا ارادہ کیا اور اس کے حصول کے لیے خوب کوشش کی جب کہ وہ مومن ہو، سو یہی وہ لوگ ہیں جن کی کوشش مقبول ہوگی O

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿۲۰﴾

خواہ دنیا پرست ہو یا آخرت کا طالب، ہم آپ کے رب کی عطاء سے ہر ایک کی مدد فرماتے ہیں اور آپ کے رب کی عطاء کسی سے روکی ہوئی نہیں O

اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴿۲۱﴾

(اے رسول اکرم!) آپ دیکھیے! ہم نے کس طرح لوگوں کو ایک دوسرے پر فضیلت عطا فرمائی ہے اور ضرور آخرت کے درجات بہت بڑے ہیں اور فضیلت میں بہت بڑھ کر ہیں O

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ﴿۲۲﴾ ع

(اے مخاطب!) تم اللہ کے ساتھ دوسرا عبادت کا مستحق مقرر نہ کرو ورنہ تم مذموم ناکام ہو کر بیٹھے رہو گے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور (کبھی) انسان (تنگ دلی سے) خیر کی دعا کی طرح شر کی دعا کرتا ہے، اور انسان بہت عجلت پسند ہے O" (بنی اسرائیل: ۱۱)

علامہ ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ، بنی اسرائیل: ۱۱ تا ۲۲ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ": اس آیت کا معنی یہ ہے کہ انسان اپنی جان اور اپنے مال اور اپنی اولاد کے خلاف بربادی کی دعا کرتا ہے، پس غصہ میں کہتا ہے: اے اللہ! اس پر لعنت فرمائیں، اے اللہ! اس کو ہلاک فرما دیں، جس طرح وہ خیر کے حصول کے لیے دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو نعمت اور عافیت عطا فرمائیں۔ اور اگر اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو اس کے نفس کے خلاف قبول فرما لیں تو وہ ہلاک ہو جائے گا، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کی دعا کو قبول نہیں فرماتے۔

"وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا": یعنی انسان عجلت پسند ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس کی دعا جلد قبول کر لی جائے۔

غصہ اور غضب میں اپنے یا اپنی اولاد کے خلاف دعا کی جائے تو اس سے حقیقت کا مراد نہ ہونا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (مکہ سے) کوچ کا ارادہ فرمایا تو آپ نے دیکھا کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا خیمہ کے دروازہ پر افسردہ اور مغموم کھڑی ہیں، کیونکہ ان کو حیض آ گیا تھا تو آپ نے فرمایا: تم زخمی ہو جاؤ، تمہارے حلق میں درد ہو جائے۔۔۔الحدیث

(صحیح بخاری: ۲۹۴، ۳۰۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۹، ۳۲۸، ۱۵۱۶، ۱۵۱۸، ۱۵۵۶، ۱۵۶۰، ۱۵۶۱، ۱۵۶۲، ۱۶۳۸، ۱۶۵۰، ۱۷۰۹، ۱۷۲۰، ۱۷۳۳، ۱۷۵۷، ۱۷۶۲، ۱۷۷۱، ۱۷۷۲، ۱۷۸۳، ۱۷۸۶، ۱۷۸۷، ۱۷۸۸، ۲۹۵۲، ۲۹۸۴، ۴۳۹۵، ۴۴۰۱، ۴۴۰۸، ۵۳۲۹، ۵۵۴۸، ۵۵۵۹، ۶۱۵۷، ۷۲۲۹، صحیح مسلم: ۱۲۱۱، سنن ترمذی: ۹۳۵، سنن نسائی: ۲۹۰، سنن ابوداؤد: ۱۷۸۲، مسند احمد: ۲۵۳۱۰، کتاب الآثار لابی یوسف: ۵۶۱، مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۳۱۷۵، مسند اسحاق بن راہویہ: ۱۵۲۵، سنن دارمی: ۱۹۵۸، مستخرج ابی عوانہ: ۳۳۰۲، صحیح ابن حبان: ۱۷۲۵، السنن الکبریٰ للنسائی: ۴۱۷۸، مسند البزار: ۳۲۲، معالم السنن ج ۱ ص ۶۸، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۸۸۲۲، شرح السنہ للبغوی: ۱۹۷۴، کشف المشکل: ۵۶۳، المسند الجامع للکتب العشرہ، ج ۶ ص ۳۳۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے متعلق کہا کہ "تم زخمی ہو جاؤ، تمہارے حلق میں درد ہو جائے" یہ بھی ان کلمات میں سے ہے جن کی حقیقت مراد نہیں ہوتی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہی کلمات کے متعلق فرمایا ہے کہ "اے اللہ! محمد صرف بشر ہے بشر کی طرح غضب ناک ہوتا ہے"۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: اے اللہ! محمد صرف بشر ہے بشر کی طرح غضب ناک ہوتا ہے اور میں آپ سے یہ عہد کرتا ہوں اور آپ اس عہد کے خلاف نہ فرمانا کہ میں جس مومن کو بھی اذیت دوں یا برا کہوں یا اس کو ماروں تو اس چیز کو اس کے گناہوں کا کفارہ فرما دیں اور اس کو اس کی ایسی عبادت فرما دیں جس کی وجہ سے وہ قیامت کے دن آپ کا قرب حاصل کرے۔

(صحیح مسلم: ۲۶۰۱، الرقم المسلسل: ۶۵۶۵، رقم حدیث الباب: ۹۱، مسند اسحاق بن راہویہ: ۱۱۳۵، مسند احمد: ۱۰۳۰۳، مسند البزار: ۹۸۱۳، المسند الجامع للکتب العشرہ، ج ۱ ص ۳۳۱)

اسی طرح ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے حضرت عبدالرحمٰن کے لیے کہا کہ "یا اللہ! اس کی ناک کاٹ دے"۔ (صحیح البخاری: ۶۰۲)۔

سو یہ بھی اسی طرح ہے کہ جب انسان غصہ میں آ کر اپنے نفس کے خلاف کوئی دعا کرے یا اپنی اولاد کے خلاف کوئی دعا کرے تو اس کی حقیقت مراد نہیں ہوتی، اسی طرح ماں باپ غصہ میں آ کر اپنے لیے یا اپنی اولاد کے لیے بددعائیہ کلمات کہیں تو ان کی بھی حقیقت مراد نہیں ہوتی۔ اسی کی نظیر یہ حدیث ہے:

ابوقلابہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ایک مرد کے پاس سے گزرے جو کوئی آسمانی کتاب پڑھ رہا تھا، وہ اس سے تھوڑی دیر تک سنتے رہے، پھر اس کی تحسین کی، پھر اس مرد سے کہا: کیا تم اس آسمانی کتاب سے لکھتے ہو؟ اس نے کہا: ہاں! تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک چمڑے کا ٹکڑا اپنے لیے خریدا، پھر اس کے اوپر اس کتاب کی آیات لکھیں، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وہ لے

کر آئے اور اس کو پڑھنے لگے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک غصہ سے متغیر ہو رہا تھا، اس انصاری مرد نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے وہ کتاب چھین لی اور کہا "ثَكِلَتْكَ اُمُّكَ" "اے خطاب کے بیٹے! تم پر تمہاری ماں روئے، کیا تم نہیں دیکھ رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک کس طرح متغیر ہو رہا ہے اور تم یہ کتاب پڑھ رہے ہو، تب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں فاتح اور خاتم بنا کر بھیجا گیا ہوں (یعنی مجھ سے نبوت کی ابتداء ہے اور مجھ پر ہی نبوت کی انتہاء ہے) اور مجھے جوامع الکلم عطا فرمائے گئے ہیں، تمہیں بے وقوف لوگ ہلاک نہ کر دیں۔ (مصنف عبد الرزاق: ۱۰۱۶۳، شعب الایمان للبیہقی: ۴۸۳۷)

اس حدیث میں مذکور ہے "اے خطاب کے بیٹے! تم پر تمہاری ماں روئے" یعنی تم مر جاؤ تا کہ تمہاری ماں تم پر روئے۔ تو ان الفاظ سے بھی حقیقت کا ارادہ نہیں کیا گیا۔ (سعیدی غفرلہ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنا دیا، پس ہم نے رات کی نشانی کو مٹا دیا اور دن کی نشانی کو روشن بنایا تا کہ تم اپنے رب کے فضل سے رزق کو طلب کرو اور تا کہ تم سالوں کی گنتی شمار اور حساب کو جان لو، اور ہم نے تمہاری ضرورت کی ہر چیز کو تفصیل سے بیان فرما دیا ہے O" (بنی اسرائیل: ۱۲)

"وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ": یعنی رات اور دن کو دو ایسی علامتیں بنا دیا ہے جو ہمارے وجود پر اور ہماری وحدانیت پر اور ہماری قدرت پر دلالت کرتی ہیں۔ "فَمَحَوْنَا اٰيَةَ الَّيْلِ": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سورج کے نور کے ستر (۷۰) حصے بنائے اور چاند کے نور کے بھی ستر (۷۰) حصے بنائے، پھر چاند کے نور میں سے انہتر (۶۹) حصے مٹا دیے اور اس کو سورج کے نور کے ساتھ رکھا۔

حکایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو حکم فرمایا تو انہوں نے اپنا پَر چاند کے چہرے پر تین مرتبہ پھیلا دیا تو اس کی روشنی مٹ گئی اور اس کا نور باقی رہا۔ اور ابن الکواء نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس سیاہی کے متعلق سوال کیا جو چاند میں دکھائی دیتی ہے تو انہوں نے کہا: وہ چاند کی روشنی کو مٹانے کا نشان ہے۔

"وَجَعَلْنَا اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً": یعنی ہم نے دن کو روشن بنا دیا جس سے چیزیں دکھائی دیں۔ الکسائی نے کہا: جب دن روشن ہو جائے تو عرب کہتے ہیں "ابصر النهار"۔ "لِتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ": یعنی اگر اللہ تعالیٰ سورج اور چاند کو اسی طرح چھوڑ دیں جس طرح ان کو پیدا فرمایا ہے تو رات اور دن میں تمیز نہ ہو سکے۔ اور روزہ دار کو پتا نہ چلے کہ وہ کس وقت روزہ افطار کرے گا اور نہ حج کا ارادہ کرنے والے کو حج کا وقت پتا چلے۔ اور نہ مدتوں کے پورے ہونے کا علم ہو، اور نہ سکون اور راحت کے وقت کا علم ہو۔ "وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا": اور ہم نے تمہاری ضرورت کی ہر چیز کو تفصیل سے بیان فرما دیا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ہر انسان کی تقدیر کو اس کے گلے میں ڈال دیا ہے اور قیامت کے دن ہم اس کے صحیفۂ اعمال کو نکالیں گے جسے وہ کھلا ہوا پائے گا O" (بنی اسرائیل: ۱۳)

"وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس سے مراد انسان کا عمل ہے، یعنی جو

اعمال اس کے لیے مقدر فرمائے گئے ہیں خواہ وہ کہیں بھی ہو۔ اور الکلبی اور مقاتل نے کہا ہے کہ ہر انسان کی خیر اور اس کا شر اس کے ساتھ ہے جو اس سے کبھی الگ نہیں ہوتے۔ اور حسن بصری نے کہا: اس کی برکت اور اس کی نحوست اس کے ساتھ ہے۔ اور مجاہد نے کہا: جو بھی انسان پیدا ہوتا ہے اس کے گلے میں ایک پرچہ ہوتا ہے جس میں لکھا ہوتا ہے کہ وہ بدبخت ہے یا نیک بخت ہے۔

اہل معانی نے کہا ہے کہ "طائر" سے مراد وہ چیز ہے کہ جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ وہ اس کے موافق عمل کرے گا اور جس کی طرف وہ رجوع کرے گا سعادت سے یا شقاوت سے۔ اس کو "طائر" اس لیے فرمایا کہ عرب کی عادت تھی کہ جس چیز کی نیک فال نکالنی ہوتی یا بد فال نکالنی ہوتی تو وہ ایک پرندہ اڑا دیتے، اگر وہ دائیں جانب اڑ کر جاتا تو اس سے نیک فال کا ارادہ کرتے اور بائیں جانب اڑ کر جاتا تو اس سے بری فال کا ارادہ کرتے۔

اس آیت میں گردن یا گلے کو باقی اعضاء میں سے ممتاز فرمایا ہے، کیونکہ گردن یا گلے میں ہی ہار ڈالے جاتے ہیں یا طوق ڈالے جاتے ہیں۔ اور گردن اور گلے میں ہی یا زینت کی چیزیں لٹکائی جاتی ہیں یا مذمت کی چیزیں لٹکائی جاتی ہیں، سو یہ کلام عرب کے اسلوب کے مطابق ہے۔

اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں: "وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا": اور ہم اس کو قیامت کے دن نکالیں گے۔ اور اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جو طائر اس کے گلے میں لٹکایا جاتا ہے تو اسے قیامت کے دن ایک لکھی ہوئی کتاب کی صورت میں نکالا جائے گا، اور انسان کو اس کا صحیفۂ اعمال دیا جائے گا جس کو وہ کھلا ہوا پائے گا۔ اور آثار میں لکھا ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتے کو حکم فرماتے ہیں کہ صحیفۂ اعمال کو لپیٹ دیا جائے، پھر جب بندہ کی عمر پوری ہو جاتی ہے تب بھی وہ صحیفہ لپٹا ہوا ہوتا ہے اور قیامت سے پہلے اس صحیفے کو نہیں کھولا جاتا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "(اس سے کہا جائے گا:) اپنا صحیفۂ اعمال پڑھ لے، آج تو خود ہی اپنے حساب کے لیے کافی ہے O" (بنی اسرائیل: ۱۴)

"اِقْرَاْ كِتٰبَكَ": یعنی انسان سے کہا جائے گا کہ تو اپنے صحیفۂ اعمال کو پڑھ لے۔

"كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا": حسن بصری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے تیرے متعلق عدل فرمایا ہے کہ تجھے خود اپنے نفس کا حسیب بنا دیا ہے۔ قتادہ نے کہا: وہ اس دن پڑھے گا خواہ وہ دنیا میں پڑھنے والا نہ ہو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "جو شخص ہدایت پر چلتا ہے سو وہ اپنے ہی فائدہ کے لیے ہدایت پر چلتا ہے اور جس نے گمراہی کو اختیار کیا تو وہ گمراہ ہو کر صرف اپنا ہی نقصان کرتا ہے، اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور ہم کسی کو عذاب دینے والے نہیں ہیں حتیٰ کہ رسول کو مبعوث فرما دیں O" (بنی اسرائیل: ۱۵)

"مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِىْ لِنَفْسِهٖ": یعنی اس ہدایت پر چلنے کا ثواب اسی کو ملے گا۔ "وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا": اور جس نے گمراہی کو اختیار کیا تو اس گمراہی کا وبال اسی پر ہوگا۔ "وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى": یعنی کسی شخص کو دوسرے کے گناہوں کے اٹھانے کا مکلف نہیں فرمایا جائے گا۔ اور کسی کے گناہ کا مواخذہ دوسرے سے نہیں فرمایا جائے گا۔

''وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيۡنَ حَتّٰى نَبۡعَثَ رَسُوۡلًا'': یعنی ہم حجت پوری فرمانے کے لیے اور عذر کو قطع کرنے کے لیے اس وقت تک لوگوں کو عذاب نہیں دیں گے جب تک کہ ان میں رسول کو نہ مبعوث فرما دیں۔ اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ جو احکام واجب ہوتے ہیں وہ دلیل سمعی سے واجب ہوتے ہیں عقل سے واجب نہیں ہوتے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس بستی کے مال دار لوگوں کو (اطاعت کا) حکم فرماتے ہیں، پھر وہ اس حکم کی نافرمانی کرتے ہیں تو اُن پر ہمارے عذاب کا فیصلہ ثابت ہو جاتا ہے اور ہم اس بستی کو تباہ و برباد فرما دیتے ہیں O'' (بنی اسرائیل: ۱۶)

''وَاِذَآ اَرَدۡنَآ اَنۡ نُّهۡلِكَ قَرۡيَةً اَمَرۡنَا مُتۡرَفِيۡهَا'': یعنی ہم اس بستی کے خوش حال لوگوں کو اطاعت کا حکم فرماتے ہیں، سو وہ نافرمانی کرتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس بستی کے خوش حال لوگوں کو اطاعت کا حکم فرماتے ہیں۔ ''فَفَسَقُوۡا فِيۡهَا فَحَقَّ عَلَيۡهَا الۡقَوۡلُ'': وہ اس حکم کی نافرمانی کرتے ہیں تو ان پر عذاب واجب ہو جاتا ہے۔ ''فَدَمَّرۡنٰهَا تَدۡمِيۡرًا'': تو ہم اس بستی کو تباہ و برباد فرما دیتے ہیں۔

حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس ایک دن گھبرائے ہوئے اور خوف زدہ یہ فرماتے ہوئے آئے: اللہ کے سوا کوئی عبادت کے مستحق نہیں ہیں، عرب کے لیے شر سے ہلاکت ہو جو قریب آ چکا ہے، آج یاجوج اور ماجوج کی دیوار سے اتنی مقدار کھل چکی ہے، اور آپ نے انگوٹھے اور اس کے قریب والی انگلی سے حلقہ بنایا، حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا نے کہا: میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا ہم ہلاک ہو جائیں گے اور ہم میں صالحین بھی ہیں، آپ نے فرمایا: ہاں! جب بدکاری بہت زیادہ ہو جائے گی۔

(صحیح البخاری: ۳۳۴۶، ۳۵۹۸، ۷۰۵۹، ۷۱۳۵، صحیح مسلم: ۲۸۸۰، سنن ترمذی: ۲۱۸۷، سنن ابن ماجہ: ۳۹۵۳، مسند احمد: ۲۶۸۷۰، شرح السنہ للبغوی: ۴۰۹۶، مصنف عبدالرزاق: ۲۰۷۴۹، صحیح ابن حبان: ۳۲۷، سنن بیہقی ج ۱۰ ص ۹۳، صحیح ابن حبان: ۶۸۳۱، السنن الکبریٰ للنسائی: ۱۱۳۱۱، ۱۱۳۳۳، مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۹۰۶۱)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور ہم نے نوح کے بعد بہت سی بستیوں کو ہلاک فرما دیا، اور آپ کے رب اپنے بندوں کے گناہوں کی خوب خبر رکھنے والے، دیکھنے والے ہیں O'' (بنی اسرائیل: ۱۷)

''وَكَمۡ اَهۡلَكۡنَا مِنَ الۡقُرُوۡنِ مِنۡۢ بَعۡدِ نُوۡحٍ'': یعنی ہم نے حضرت نوح علیہ السلام کے بعد کتنی ہی تکذیب کرنے والی امتوں کو ہلاک فرما دیا۔ اس آیت سے اللہ تعالیٰ نے کفارِ مکہ کو ڈرایا ہے۔

قرن کے معنی میں متعدد اقوال

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ نے کہا: القرن ایک سو بیس سال کے عرصہ کو کہتے ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قرن کے اول میں مبعوث ہوئے تھے اور اس قرن کے آخر میں یزید بن معاویہ فرمانروائے سلطنت ہوا تھا۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ قرن ایک سو سال کا زمانہ ہے۔

عبداللہ بن بسر بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سر پر اپنا ہاتھ رکھا اور فرمایا: یہ لڑکا ایک قرن تک زندہ رہے گا، سو وہ ایک سو سال تک زندہ رہے، اور ان کے چہرہ پر کچھ نشانات تھے، آپ نے فرمایا: یہ لڑکا اس وقت تک نہیں مرے گا حتیٰ کہ یہ نشانات مٹ جائیں، پس وہ اسی وقت فوت ہوئے جب ان کے چہرہ سے وہ نشانات مٹ گئے۔

(مسند الشامیین للطبرانی: ۸۳۶، السنن لابی بکر: ۷۷۳-۷۷۵، المستدرک علی الصحیحین: ۶۰۱۶، ۴، ۸۵۲۲، ۸۵۲۵، الجامع الصحیح للسنن والمسانید ج ۱۲ ص ۳۸)

اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ ایک سو سال کے عرصہ کو قرن کہتے ہیں۔ (میں کہتا ہوں: اس حدیث میں یہ بھی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ علم عطا فرمایا تھا کہ کون کب تک زندہ رہے گا جیسے آپ نے حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا کہ وہ ایک قرن تک زندہ رہیں گے۔ سعیدی غفرلہ)۔ اور الکلبی نے کہا کہ القرن اسی (۸۰) سال کے زمانہ کو کہتے ہیں۔ اور دوسرا قول ہے کہ چالیس (۴۰) سال کے عرصہ کو قرن کہتے ہیں۔ "وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا": اور آپ کے رب اپنے بندوں کے گناہوں کو جاننے کے لیے کافی ہیں، خوب خبر رکھنے والے، دیکھنے والے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "جو لوگ (صرف) دنیا کا ارادہ کرتے ہیں ہم اُن کو دنیا میں جسے چاہتے ہیں اور جتنا چاہتے ہیں جلد عطا فرما دیتے ہیں، پھر ہم نے ان کے لیے جہنم مقرر فرما دیتے ہیں جس میں وہ ذلت سے اور اللہ کی رحمت سے محروم ہو کر جائیں گے O" (بنی اسرائیل: ۱۸)

"مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ": یعنی دنیا الدار العاجلۃ ہے۔ "عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ": یعنی ہم اس پر تنگی یا کشادگی جو مقرر فرمانا چاہیں فرما دیتے ہیں۔ "لِمَنْ نُّرِيْدُ": یعنی ہم جس کے لیے چاہیں تنگی یا فراخی مقرر فرما دیتے ہیں یا جس کو چاہیں ہلاک فرما دیتے ہیں۔ "ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا": یعنی وہ دوزخ میں داخل ہو جائے گا۔ "مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا": یعنی وہ مذمت کیا ہوا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دھتکارا ہوا ہوگا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور جس نے آخرت کا ارادہ کیا اور اس کے حصول کے لیے خوب کوشش کی جب کہ وہ مومن ہو، سو یہی وہ لوگ ہیں جن کی کوشش مقبول ہوگی O" (بنی اسرائیل: ۱۹)

"وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا": یعنی جس نے آخرت کے لیے نیک عمل کیے۔ "وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا": اور نیک اعمال کے ساتھ شرط یہ ہے کہ وہ صاحب ایمان ہو، کیونکہ ایمان کے بغیر کوئی نیک عمل قبول نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ" (المائدہ: ۵)" (اور جس نے ایمان لانے کے مقابلہ میں کفر کو اختیار کیا تو بے شک اس کا عمل ضائع ہو گیا)۔ نیز اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ۝ (الفرقان: ۲۳)" (اور ان مجرموں نے جو بزعم خویش نیک عمل کیے ہیں ہم ان کی طرف توجہ کریں گے اور انہیں غبار کے باریک ذروں کی طرح فضا میں بکھیر دیں گے)۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "خواہ دنیا پرست ہو یا آخرت کا طالب، ہم آپ کے رب کی عطاء سے ہر ایک کی مدد

فرماتے ہیں اور آپ کے رب کی عطاء کسی سے روکی ہوئی نہیں O" (بنی اسرائیل: ۲۰)

"كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ": یعنی ہم ہر دو فریق کی مدد فرماتے ہیں خواہ وہ دنیا کا طالب ہو یا آخرت کا طالب ہو۔

"مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ": یعنی اللہ تعالیٰ ان دونوں فریقوں کو رزق عطا فرماتے ہیں۔ پھر دنیا اور آخرت میں ان کے احوال مختلف ہوتے ہیں۔ "وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا": یعنی آپ کے رب کا رزق ان کے بندوں سے روکا ہوا نہیں ہے۔ پس عطاء سے مراد دنیا میں عطا ہے، کیونکہ کفار کے لیے آخرت میں اللہ تعالیٰ کی عطا سے کوئی حصہ نہیں ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: " (اے رسولِ اکرم!) آپ دیکھیے! ہم نے کس طرح لوگوں کو ایک دوسرے پر فضیلت عطا فرمائی ہے اور ضرور آخرت کے درجات بہت بڑے ہیں اور فضیلت میں بہت بڑھ کر ہیں O" (بنی اسرائیل: ۲۱)

"اُنْظُرْ": یعنی اے محمد! (صلی اللہ علیک وسلم) آپ دیکھیے۔ "كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ": یعنی ہم نے رزق میں اور عمل صالح میں ان کو ایک دوسرے پر کس طرح فضیلت عطا فرمائی ہے، یعنی طالب دنیا کو اور طالب آخرت کو۔ "وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا": اور ضرور آخرت کے درجات بہت بڑے ہیں اور فضیلت میں بہت بڑھ کر ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: " (اے مخاطب!) تم اللہ کے ساتھ دوسرا عبادت کا مستحق مقرر نہ کرو ورنہ تم مذموم ناکام ہوکر بیٹھے رہو گے O" (بنی اسرائیل: ۲۲)

"لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا": اس آیت میں بہ ظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے لیکن مراد آپ کا غیر ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اے انسان! تو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کوئی اور مستحق عبادت نہ بنا، ورنہ تو مذمت کیا ہوا اور بغیر کسی کی مدد کے ناکام بیٹھا رہے گا۔ (معالم التنزیل، ج ۳ ص ۱۲۳۔ ۱۲۶، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾

اور (اے مخاطب!) تمہارے رب نے یہ حکم فرمایا ہے کہ تم ان کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، اگر اُن میں سے کوئی ایک تمہارے پاس بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائے یا دونوں بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں تو اُن سے اُف تک نہ کہو اور نہ اُن کو جھڑکو اور اُن دونوں سے ادب کے ساتھ بات کرو O

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ؕ ﴿۲۴﴾

اور ادب اور رحمت سے اُن کے سامنے انکسار کا بازو جھکائے رکھو اور ان کے لیے یہ دعا کرو: اے میرے رب! ان دونوں پر رحم فرمائیں جس طرح ان دونوں نے میرے بچپن میں میری پرورش کی تھی O

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ﴿۲۵﴾

تمہارے رب اُن باتوں کو خوب جاننے والے ہیں جو تمہارے دلوں میں ہیں، اگر تم ان کے اطاعت گزار رہے تو بے شک وہ توبہ کرنے والوں کے لیے بہت مغفرت فرمانے والے ہیں O

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿۲۶﴾

اور رشتہ داروں کو اُن کا حق ادا کرو اور مسکین اور مسافر کو (بھی)، اور ناجائز کاموں میں خرچ نہ کرو O

اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۷﴾

بے شک ناجائز کاموں میں خرچ کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے رب کا بہت بڑا ناشکرا ہے O

وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ﴿۲۸﴾

اور (اے مخاطب!) اگر تو اپنے رب کی متوقع رحمت کی طلب کی وجہ سے ان سے اعراض کرے تو ان سے نرمی سے عذر پیش کرنا O

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴿۲۹﴾

اور تو اپنا ہاتھ اپنی گردن تک بندھا ہوا نہ رکھ اور نہ اپنے ہاتھ کو بالکل کھول دے ورنہ تو ملامت کیا ہوا حسرت زدہ بیٹھا رہے گا O

اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۳۰﴾ ع

بے شک آپ کے رب جس کے لیے چاہیں رزق کو کشادہ فرما دیتے ہیں، اور (جس کے لیے چاہیں) تنگ فرما دیتے ہیں، بے شک وہ اپنے بندوں کی بہت خبر رکھنے والے ہیں، خوب دیکھنے والے ہیں O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”اور (اے مخاطب!) تمہارے رب نے یہ حکم فرمایا ہے کہ تم ان کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، اگر اُن میں سے کوئی ایک تمہارے پاس بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائے یا دونوں بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں تو اُن سے اُف تک نہ کہو اور نہ اُن کو جھڑکو اور اُن دونوں سے ادب کے ساتھ بات کرو O“ (بنی اسرائیل: ۲۳)

قضاء کے معنی کی تحقیق اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے وجوب پر دلیل

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ ھ، بنی اسرائیل: ۲۳ تا ۳۰ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ“: میمون بن مہران، الضحاک اور سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے

روایت کی ہے کہ "وَقَضٰى رَبُّكَ" اصل میں "وَوَصّٰى رَبُّكَ" تھا، یعنی آپ کے رب نے یہ وصیت فرمائی ہے کہ ان کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کی جائے۔ اور وصیت سے مراد مؤکد حکم ہے، انہوں نے کہا کہ اگر اس کا معنی یہ ہوتا کہ آپ کے رب نے یہ قضا فرمائی ہے کہ ان کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کی جائے تو پھر کسی شخص کا اللہ تعالیٰ کے غیر کی عبادت کرنا ممکن نہ ہوتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قضاء کے خلاف کسی کام کا ہونا محال ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ یہ قول بہت بعید ہے، کیونکہ اس سے قرآن مجید میں تحریف اور تغییر کا دروازہ کھلتا ہے، اور اگر ہم اس کو جائز قرار دیں تو قرآن مجید سے امان اٹھ جائے گی اور قرآن مجید حجت نہیں رہے گا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دین میں بہت بڑا طعن ہے۔

پس قضاء کا معنی یہاں پر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک قطعی حکم فرمایا ہے جو نسخ کو قبول نہیں کرتا، یعنی اللہ تعالیٰ نے جو یہ حکم فرمایا ہے کہ ان کے سوا غیر کی عبادت نہ کی جائے، یہ قطعی حکم ہے اور یہ منسوخ نہیں ہوگا۔

نیز اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا واجب ہے کیونکہ عبادت کا معنی ہے ایسا کام کرنا جو انتہائی تعظیم پر دلالت کرتا ہو اور انتہائی تعظیم اسی کی کی جائے گی جو انتہائی نعمت دینے والا ہو۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی انتہائی نعمت دینے والا نہیں ہے، اس لیے اس کے سوا کسی اور کی عبادت کرنا جائز نہیں ہے۔

"وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا": اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کا حکم دینے کے بعد ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے کا حکم فرمایا۔ اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بعد ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے کے حکم میں دو وجوں سے مناسبت ہے:

(۱) انسان کے وجود کا سبب حقیقی تو اللہ عزوجل کی تخلیق ہے اور سبب ظاہری انسان کے ماں باپ ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے بعد ماں باپ کی تعظیم کا حکم فرمایا ہے۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی اس اصل کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعظیم کی جائے اور مخلوق پر شفقت کی جائے۔ (حاشیۃ السیوطی علی سنن النسائی ج ۷ ص ۶۲)، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے حکم کے بعد ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے کا حکم فرمایا۔

والد کا احسان اولاد پر زیادہ ہے یا استاذ کا؟

امام رازی لکھتے ہیں:

اسکندر سے پوچھا گیا کہ تمہارے استاذ کا تم پر زیادہ احسان ہے یا تمہارے والد کا؟ تو اس نے کہا: استاذ کا زیادہ احسان ہے کیونکہ استاذ نے مجھے تعلیم دینے کے لیے مختلف قسم کے مصائب اور مشقتیں اٹھائیں اور مجھے نور علم تک پہنچایا۔ رہا والد تو اس نے اپنے نفس کے لیے جماع کی لذت کے حصول کا ارادہ کیا اور مجھے اس جہان کے مصائب کی طرف نکال دیا۔

میں کہتا ہوں: یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ والد نے صرف جماع کی لذت کے حصول کے لیے اولاد کو نکالا، کیونکہ اگر صرف جماع کی لذت کا حصول مقصود ہوتا تو اس کا والد جماع کرنے کے بعد عزل کر لیتا (اور اس دور میں مانع حمل ادویہ استعمال کر لیتا)۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کا مقصود اولاد کا حصول تھا، پھر والد اپنے بیٹے کے بالغ ہونے تک خود مشقتیں جھیل کر بیٹے کی پرورش کرتا رہا، خود بھوکا

رو کر بیٹے کو کھلاتا رہا، بیماری میں اس کا علاج کرتا رہا، اس لیے والد کا احسان بھی بیٹے پر بہت بڑا ہے۔ (سعیدی غفرلہ)

والدین کے ساتھ حسن سلوک کے مقدم ہونے کے متعلق احادیث

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرد نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: کون سا عمل کرنا سب سے افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: نماز کو اپنے وقت میں پڑھنا اور والدین کے ساتھ نیکی کرنا پھر اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنا۔

(صحیح البخاری: ۵۲۷، ۲۷۸۲، ۵۹۷۰، ۷۵۳۴، صحیح مسلم: ۸۵، سنن ترمذی: ۱۸۹۸، سنن نسائی: ۶۱۰، مسند احمد: ۳۸۸۰، سنن دارمی: ۱۲۲۵)

ماں کا درجہ بلند ہونے کے متعلق احادیث

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جس کو امام طبرانی نے الاوسط میں روایت کیا ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، سو اس نے کہا: میں جہاد کرنا چاہتا ہوں اور مجھے اس پر قدرت نہیں ہے، آپ نے فرمایا: کیا تمہارے والدین میں سے کوئی ایک باقی ہے، اس نے کہا: ہاں! میری ماں ہے، آپ نے فرمایا: تم اللہ تعالیٰ کی مدد سے اپنی ماں کے ساتھ نیکی میں قتال کرو، پس جب تم نے یہ کر لیا تو تم حج کرنے والے اور عمرہ کرنے والے اور جہاد کرنے والے ہو گے۔

اور حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جس کو امام طبرانی نے المعجم الصغیر میں روایت کیا ہے، کہ ایک مرد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اس نے کہا: یا رسول اللہ! میں نے اپنی ماں کو اپنی گردن پر سخت گرمی میں دو فرسخ تک سوار کیا، وہ اتنی گرمی تھی کہ اگر میں گوشت کا ٹکڑا زمین پر ڈالتا تو وہ پک جاتا، پس کیا میں نے اپنی ماں کا شکر ادا کر دیا؟ آپ نے فرمایا: شاید کہ یہ ماں کے ایک مرتبہ تمہیں مسکرا کر دیکھنے کے برابر ہو۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے جس کی تمام نے روایت کی ہے کہ ایک مرد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، پس اس نے کہا: میں نے نذر مانی ہے کہ اگر اللہ عزوجل نے آپ کے لیے مکہ فتح فرما دیا تو میں بیت اللہ کے پاس آ کر اس کی نچلی چوکھٹ کو بوسہ دوں گا، آپ نے فرمایا: تم اپنی ماں کے قدم کو بوسہ دو تو تمہاری نذر پوری ہو جائے گی۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جس کو امام طبرانی نے الاوسط میں روایت کیا ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اس نے کہا: یا رسول اللہ! میرے گھر والے ہیں اور میرے والد ہیں اور میری ماں ہے، پس ان میں سے کون زیادہ میرے نیک سلوک کا حقدار ہے؟ آپ نے فرمایا: تمہاری ماں اور تمہارا باپ، تمہاری بہن، تمہارا بھائی اور پھر جو اس سے کم ہو اور پھر جو اس سے کم ہو۔

اور حضرت معاویہ بن جاہمہ کی حدیث ہے جس کی امام نسائی اور امام ابن ماجہ نے روایت کی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، پس میں نے کہا: یا رسول اللہ! میں آپ کے ساتھ جہاد پر جانے کا ارادہ کرتا تھا اور میں اس سے اللہ کی رضا حاصل کرنا چاہتا تھا اور دار آخرت کو حاصل کرنا چاہتا تھا، آپ نے فرمایا: تم پر افسوس ہے، کیا تمہاری ماں زندہ ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں! آپ نے فرمایا: جاؤ تم اپنی ماں کے ساتھ نیکی کرو، پھر میں آپ کے پاس دوسری جانب سے آیا، پھر میں نے اپنا سوال دوبارہ ذکر کیا، آپ نے فرمایا: جاؤ اور اپنی ماں کے ساتھ نیکی کرو، اس نے پھر تیسری مرتبہ سوال کیا، تو آپ نے فرمایا: تم پر افسوس ہے تم اپنی ماں کے پیروں کو لازم پکڑ لو اور سو گھسو، وہیں جنت ہے۔ (سنن ابن ماجہ: ۲۷۸۱، مسند الشہاب القضاعی: ۱۱۱۹، المعجم الکبیر

للسنن والمسانید ج ۷ ص ۱۳۳۱، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشر ، ج ۵ ص ۲۰۰)

اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ ماں کے ساتھ محبت اور ماں پر شفقت، باپ کے ساتھ محبت سے کئی درجہ زیادہ ہونی چاہیے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ سوال کے جواب میں ماں کا ذکر کیا اور باپ کا ذکر صرف چوتھی مرتبہ میں کیا، اور جب تم اس پر غور کرو گے تو تم پر واضح ہوگا کہ حمل کی مشقت اور وضع حمل کی تکلیف اور دودھ پلانے اور پرورش کرنے کی ذمہ داری میں ماں منفرد ہے، اور یہ ساری سختی ماں اٹھاتی ہے باپ نہیں اٹھاتا، پس یہ تین مرتبے ایسے ہیں جس میں صرف ماں پرورش کی سختی کو اٹھاتی ہے۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ ماں کی اطاعت کرنا مقدم ہے۔

اور محاسبی نے کہا ہے کہ ماں کی فضیلت باپ کے اوپر نیکی کرنے میں اور اطاعت کرنے میں زیادہ ہے، اس پر علماء کا اجماع ہے۔

حسن بصری سے پوچھا گیا کہ والدین کے ساتھ نیکی کس طرح کی جائے، تو انہوں نے کہا: تم والدین کے لیے ہر اس چیز کو خرچ کرو جو تمہاری ملکیت میں ہے اور والدین تمہیں جس بات کا حکم دیں تم اس پر عمل کرو جب تک کہ وہ اللہ کی معصیت نہ ہو۔

(عمدۃ القاری ج ۲۲ ص ۱۲۹، دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۲۱ھ)

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما بیان کرتی ہیں کہ میرے پاس میری ماں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں آئیں حالانکہ وہ اس وقت اسلام سے اعراض کرنے والی تھیں، میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کیا میں ان کے ساتھ حسن سلوک کروں؟ آپ نے فرمایا: ہاں! ابن عیینہ نے کہا: پس اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق یہ آیت نازل فرمادی: ''لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ (الممتحنہ: ۸)'' (اللہ تم کو ان کے ساتھ نیکی کرنے اور تھوڑا تھوڑا دینے سے نہیں روکتا جنہوں نے تم سے دین میں جنگ نہیں کی)۔

(صحیح بخاری: ۲۶۲۰، ۳۱۸۳، ۵۹۷۸، ۵۹۷۹، صحیح مسلم: ۱۰۰۳، سنن ابوداؤد: ۱۶۶۸، مسند احمد: ۲۳۳۹۹)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا ان کے مسلمان ہونے پر موقوف نہیں ہے، بلکہ اگر ماں باپ کافر ہوں پھر بھی ان کے ساتھ نیکی کرنا لازم ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس شخص کی ناک خاک آلودہ ہو جس کے سامنے میرا ذکر کیا گیا، پس اس نے مجھ پر درود نہیں پڑھا، اس شخص کی ناک خاک آلودہ ہو جس نے اپنے ماں اور باپ کو بڑھاپے میں پایا یا اُن میں سے کسی ایک کو بڑھاپے میں پایا پس ان کو جنت میں داخل نہیں کیا، اور اس آدمی کی ناک خاک آلودہ ہو جس نے رمضان کا مہینہ پایا پھر اس کی بخشش ہونے سے پہلے رمضان کا مہینہ ختم ہو گیا۔

(سنن ترمذی: ۳۵۴۵، مسند احمد: ۷۴۵۱، ۸۵۵۷، السنۃ لابن ابی عاصم ج ۳ ص ۶۳، المسند الشاشی: ۱۲۷۰، صحیح ابن حبان: ۹۰۸، کتاب الشریعہ للآجری: ۱۴۶۷، المستدرک علی الصحیحین: ۲۰۱۶، کتاب الاسماء والصفات للبیہقی: ۷۵۵، الدعوات الکبیر: ۱۷۲، شعب الایمان للبیہقی: ۷۵۰۰، شرح السنۃ للبغوی: ۶۸۹، موارد الظمآن: ۲۳۸۸، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشر، ج ۵ ص ۲۰۳)

ماں باپ کو ''اُف'' کہنے سے منع کرنے کے مسائل

''اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا'':

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جب دونوں ماں باپ کمزوری اور عجز کے درجہ پر اخیر عمر میں پہنچ جائیں جیسا کہ تم کمزوری اور عجز کے

درجہ میں اپنی عمر کی ابتداء میں تھے۔ الزجاج نے کہا ہے: "اُفّ" کا معنی ہے بدبو، یعنی ماں باپ سے گھن آنے کی وجہ سے ان کو "اُف" نہ کہو۔ اور بے شک یہ لفظ اس پر دلالت کرتا ہے کہ ماں باپ کو کسی قسم کی ایذاء نہ پہنچائی جائے۔

اور جب تم کو یہ معلوم ہو گیا تو ہم یہ کہتے ہیں کہ ماں باپ کو "اُف" کہنے سے منع فرمانا ظاہر قیاس سے اس پر دلالت کرتا ہے کہ ماں باپ کو مارنا بھی ممنوع ہے۔

"وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا": جب انسان کو اس سے منع فرما دیا گیا کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کہے جو ماں باپ کو ایذاء پہنچانے والی ہو تو پھر ضروری ہوا کہ اُن کے سامنے عجز کے ساتھ بات کرے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ "یا ابتاہ، یا اماہ" کہتے تھے۔

اور سعید بن المسیب سے القول الکریم کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: یہ کسی خطا کار غلام کا اپنے آقا سے خطاب ہے۔

عطاء نے کہا: اپنے ماں باپ کے ساتھ کلام کرے اور شرط یہ ہے کہ اس کی آواز بلند نہ ہو اور نہ ماں باپ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے کیونکہ یہ دونوں فعل بھی قولِ کریم کے منافی ہیں۔

جب ماں باپ کو ایذاء پہنچانا منع ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آزر کو گمراہ فرما کر اسے ایذاء کیسے پہنچائی؟

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سب سے زیادہ حلیم اور کریم تھے تو انہوں نے اپنے باپ آزر کے لیے کیسے کہا: "اِنِّیْۤ اَرٰىكَ وَ قَوْمَكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۞ (الانعام: ۷۴)" (بے شک میں تمہیں اور تمہاری قوم کو کھلی گمراہی میں مبتلا دیکھتا ہوں O)۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر کو اُن کا نام لے کر پکارا اور یہ بھی ان کو ایذاء پہنچانا ہے، پھر اپنے باپ اور ان کی قوم کو گمراہی کی طرف منسوب کیا اور یہ ایذاء پہنچانے کی شدید قسم ہے۔

میں کہتا ہوں: امام رازی نے تو اس اعتراض کا کوئی جواب ذکر نہیں کیا۔ لیکن میرے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ آزر کو جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ کہا گیا ہے، یہ بہ طورِ حقیقت نہیں ہے بلکہ بہ طورِ عرف ہے۔ یعنی آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عرفی باپ تھا، حقیقی باپ نہ تھا، اُن کے حقیقی باپ تارخ تھے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے نسب میں کفر نہیں ہوتا۔ (سعیدی غفرلہٗ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ادب اور رحمت سے اُن کے سامنے انکسار کا بازو جھکائے رکھو اور ان کے لیے یہ دعا کرو: اے میرے رب! ان دونوں پر رحم فرما جس طرح ان دونوں نے میرے بچپن میں میری پرورش کی تھی O" (بنی اسرائیل: ۲۴)

"وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ": اس آیت سے مقصود ماں باپ کے سامنے تواضع کرنے میں مبالغہ ہے۔

قفال نے کہا ہے کہ پرندہ جب اڑنے کا ارادہ کرتا ہے تو اپنے بازو کھول دیتا ہے اور جب اڑنے کو ترک کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اپنے بازو جھکا لیتا ہے، پس بازوؤں کا جھکانا تواضع کے فعل سے کنایہ ہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ بازو کی طرف ذلت کی اضافت کیسے فرمائی اور ذلت کا کوئی بازو نہیں ہوتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بازو کی ذلت کی طرف اضافت فرمائی جیسے کہا جاتا ہے "حاتم الجود"، پس جیسا کہ اس سے مراد "حاتم

الجواد" ہے تو اسی طرح یہاں بھی "جَنَاحَ الذُّلِّ" سے مراد ہے وہ بازو جو ذلت سے جھکایا گیا ہو۔

"وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا": قفال نے کہا ہے کہ بندوں کو اپنے ماں باپ کے لیے رحمت کی دعا کرنے کی تعلیم اور تلقین فرمائی ہے، کیونکہ رحمت کا لفظ دین اور دنیا کی تمام خیرات کو شامل ہے۔ پھر فرمایا: "كَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا" یعنی اے میرے رب اس قسم کا احسان میرے ماں باپ پر فرمائیں جس قسم کا احسان انہوں نے مجھ پر فرمایا تھا۔

آیا مشرک ماں باپ کے لیے بھی حصولِ رحمت کی دعا کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

اب یہاں پر یہ سوال ہے کہ اگر کسی کے ماں باپ مشرک ہوں تو کیا وہ اُن کے لیے بھی یہ دعا کرسکتا ہے؟

اس سوال کا ایک جواب یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "مَا كَانَ لِلنَّبِیِّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ یَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِیْنَ وَلَوْ كَانُوْۤا اُولِیْ قُرْبٰی مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ ۝" (التوبہ: ۱۱۳) "(اللہ کے نبی اور جو لوگ ایمان لائے ہیں اُن کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ مشرکین کے لیے مغفرت طلب کریں، خواہ وہ ان کے قریبی رشتہ دار ہوں جب کہ ان پر یہ واضح ہو چکا ہے کہ مشرکین دوزخ میں رہنے والے ہیں ۝)۔

لہٰذا کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ جب اس کے والدین مشرک ہوں تو ان کے لیے یہ دعا کرے "رَّبِّ ارْحَمْهُمَا"۔

اور اس سوال کا دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے لیکن مخصوص ہے، گویا مشرکین ماں باپ کے علاوہ مومن ماں باپ کے لیے یہ دعا کی جائے۔

اور اس سوال کا تیسرا جواب یہ ہے کہ نہ یہ آیت منسوخ ہے اور نہ مخصوص ہے، اس لیے کہ جب کسی انسان کے ماں باپ کافر ہوں تو اس کو چاہیے کہ ان کے لیے ہدایت کی دعا کرے اور ان کے ایمان لانے کے بعد ان کے حق میں رحمت کے حصول کی دعا کرے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "تمہارے رب اُن باتوں کو خوب جاننے والے ہیں جو تمہارے دلوں میں ہیں، اگر تم ان کے اطاعت گزار رہے تو بے شک وہ توبہ کرنے والوں کے لیے بہت مغفرت فرمانے والے ہیں ۝"

(بنی اسرائیل: ۲۵)

"رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِیْ نُفُوْسِكُمْ": اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ہم نے تم کو اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کا حکم فرمایا ہے اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے کا حکم فرمایا ہے، اور تم جو کچھ اپنے دلوں میں اطاعت میں اخلاص یا عدمِ اخلاص کو چھپاتے ہو تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کے احوال پر مطلع ہیں بلکہ تم سے زیادہ ان احوال کو جاننے والے ہیں، کیونکہ بشر کے علم میں کبھی سہو اور نسیان آجاتا ہے اور بشر کا علم ہر چیز کو احاطہ نہیں کرسکتا، لیکن اللہ عزوجل کا علم ان تمام عوارض سے منزہ ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کے احوال پر اچھی طرح مطلع ہیں اور اس سے مقصود اخلاص کو ترک کرنے سے ڈراتا ہے۔

"اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِیْنَ": اگر تم اپنے دلوں کے احوال میں جہاتِ فساد سے بری ہو تو پھر تم اوّابین ہو۔ یعنی ہر چیز سے منقطع ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے ہو۔

"فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِیْنَ غَفُوْرًا": "الاوّابین" کے متعلق اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو بہت بخشنے والے ہیں اور اُن

کے صغیرہ گناہوں کو مٹانے والے ہیں۔ اور "الاواب" اس شخص کو کہتے ہیں جس کی عادت اللہ تعالیٰ کے احکام کی طرف رجوع کرنا ہو اور اللہ تعالیٰ کے فضل کی پناہ میں آتا ہو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور رشتہ داروں کو اُن کا حق ادا کرو اور مسکین اور مسافر کو (بھی)، اور ناجائز کاموں میں خرچ نہ کروO" (بنی اسرائیل:۲۶)

"وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ": اس میں بحث ہے کہ اس آیت میں کس کے ساتھ خطاب فرمایا گیا ہے۔ اس کے متعلق دو قول ہیں:

(۱) اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ حکم فرمایا ہے کہ آپ کے رشتہ داروں کے جو حقوق مال فئے اور مال غنیمت سے متعلق ہیں، آپ اُن کو اُن کے وہ حقوق ادا کیجئے۔ اور آپ پر یہ بھی واجب فرمایا کہ آپ مساکین اور مسافروں کا حق بھی اس مال میں سے ادا کیجئے۔

(۲) اس آیت میں سب سے خطاب ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کا عطف اس آیت پر ہے: "وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ" (بنی اسرائیل:۲۳)۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ جب ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے سے تم فارغ ہو جاؤ تو پھر ضروری ہے کہ باقی رشتہ داروں کے ساتھ نیکی کرنے میں مشغول ہو، جو جتنا قریب ہو اس کے ساتھ اتنی نیکی کرو، پھر جب اس سے مال بچ جائے تو مساکین اور مسافروں میں خرچ کرو۔

تبذیر کے معنی کی تحقیق

"وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا": (اور ناجائز کاموں میں خرچ نہ کرو)۔

علامہ اسماعیل بن حماد الجوہری الشافعی المتوفی ۳۹۸ھ، لکھتے ہیں:

جو شخص اپنے مال کو فاسد کرے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ اپنے مال کی تبذیر کرتا ہے۔

(مختار الصحاح، ص ۸۰، دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۲۹ھ)

علامہ سید محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی حنفی متوفی ۱۲۰۵ھ، لکھتے ہیں:

"تبذیر" کا معنی ہے: بیج کو زمین میں متفرق جگہ ڈال دینا، اور اسی سے ماخوذ ہے کہ جہاں خرچ نہ کرنا چاہیے وہاں مال کو خرچ کرنا۔ اور یہ عرف اور لغت میں اسراف کو شامل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ "تبذیر" کا معنی ہے: حق کی جگہوں سے تجاوز کرنا۔ اور اسراف کا معنی ہے: مقدار میں تجاوز کرنا۔ اور وہ حقوق کی مقدار سے جہالت ہے۔

(تاج العروس من جواہر القاموس، جز ۱۰، ص ۹۷، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۳۳ھ)

امام رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

لغت میں "تبذیر" کا معنی ہے: مال کو فاسد کرنا اور ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا۔ عثمان بن اسود بیان کرتے ہیں کہ میں مجاہد کے ساتھ کعبہ کے گرد گھوم رہا تھا، انہوں نے اپنی نظر ابو قبیس پہاڑ کی طرف اٹھائی اور کہا: اگر کوئی مرد اس پہاڑ کے برابر بھی اللہ تعالیٰ

کی اطاعت میں خرچ کرے تو وہ مُسرفین میں سے نہیں ہے، اور اگر کوئی مرد ایک درہم بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں خرچ کرے تو وہ مسرفین میں سے ہے۔ اور بعض صالحین نے نیکی کے کام میں بہت زیادہ خرچ کیا تو اُن سے کہا گیا: زیادہ خرچ کرنے میں کوئی خیر نہیں ہے تو انہوں نے جواب دیا: خیر میں اسراف نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے اور وہ اس وقت وضو کر رہے تھے تو آپ نے فرمایا: اے سعد! یہ کیسا اسراف ہے؟ انہوں نے عرض کیا: کیا وضو کرنے میں بھی اسراف ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! اگرچہ تم جاری دریا پر ہو۔ (سنن ابن ماجہ: ۴۲۵، مسند احمد: ۷۰۶۵، شعب الایمان للبیہقی: ۲۵۴۳، الجامع الکبیر للسنن والمسانید ۹ ص ۴۰۳، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشرۃ ج ۲ ص ۳۵۹)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''بے شک ناجائز کاموں میں خرچ کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے رب کا بہت بڑا ناشکرا ہے O'' (بنی اسرائیل: ۲۷)

''اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ'': اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ناجائز کاموں میں خرچ کرنے والوں کی مذمت فرمائی ہے اور یہ فرمایا کہ مبذرین شیاطین کے بھائی ہیں۔ اور شیاطین کے بھائی سے مراد یہ ہے کہ وہ شیاطین کے مشابہ ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَ مَنْ یَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَیِّضْ لَهٗ شَیْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِیْنٌ ۝ (الزخرف: ۳۶)'' (اور جو لوگ اللہ کے ذکر (قرآن) سے اعراض کرتے ہیں تو ہم ان کے لیے شیاطین مقرر فرمادیتے ہیں، پس وہ ان کے ہم نشین ہوتے ہیں O)۔

''وَ كَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا'': پھر شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے تو اس سے لازم آئے گا کہ مبذر بھی اپنے رب کی نعمتوں کا ناشکرا ہو۔ اور شیطان کے اپنے رب کے ناشکرا ہونے کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے بدن کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں میں استعمال کرتا ہے اور زمین میں فساد کرنے میں اور لوگوں کو گمراہ کرنے میں۔

اسی طرح جس کو اللہ تعالیٰ نے مال اور عزت عطا فرمائی ہو، پس وہ اس مال کو اللہ تعالیٰ کی ناراضی میں خرچ کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرنے والا ہے۔ اور مبذرین کا شیاطین کے بھائی ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ صفت اور فعل میں شیاطین کے موافق ہیں۔

زیادہ خرچ کرنے اور اسراف کی مذمت میں احادیث

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تم پر یہ کام حرام فرمادیئے ہیں: ماؤں کی نافرمانی کرنا، بیٹیوں کو زندہ در گور کرنا، حق نہ دینا، ناحق مانگنا، اور تین کام مکروہ فرمائے ہیں: فضول بحث کرنا، بہ کثرت سوال کرنا اور مال ضائع کرنا۔ (صحیح البخاری: ۷۲۹۲، صحیح مسلم: ۱۷۱۵، السنن الکبریٰ للنسائی: ۱۱۷۸۶)

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کھاؤ اور پیو اور صدقہ کرو اور لباس پہنو، بغیر تکبر اور اسراف کے۔ (مسند احمد: ۶۶۹۵، سنن ابن ماجہ: ۳۶۰۵، سنن ترمذی: ۲۸۱۹، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۸ ص ۲۱۷)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اپنی ہر پسندیدہ چیز کھاؤ، یہ بھی اسراف

ہے۔(سنن ابن ماجہ: ۳۳۵۲، مسند ابویعلیٰ: ۷۶۵ ۲، حلیۃ الاولیاء ج ۱۰ ص ۲۱۳)

حضرت حمزہ بن صہیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت صہیب کی کنیت ابویحییٰ تھی اور وہ اپنے آپ کو عرب کہتے تھے اور وہ لوگوں کو بہت زیادہ طعام کھلاتے تھے، ان سے ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے صہیب! تم نے ابویحییٰ کنیت کیوں رکھی ہے، حالانکہ تمہارا کوئی بیٹا نہیں ہے اور تم اپنے آپ کو عرب کہتے ہو اور تم بہت زیادہ طعام کھلاتے ہو اور یہ مال میں اسراف ہے۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری کنیت ابویحییٰ رکھی تھی اور رہا نسب کے متعلق آپ کا اعتراض! تو میں اہل موصل کے نمر بن قاسط کے خاندان سے ہوں، جب میں کم عمر تھا تو مجھے قیدی بنا لیا گیا، لیکن مجھے اپنے گھر والوں کا اور اپنی قوم کا شعور تھا اور رہا آپ کا یہ اعتراض کہ تم کھانا زیادہ کھلاتے ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں بہتر شخص وہ ہے جو کھانا کھلائے اور سلام کا جواب دے تو اس ارشاد نے مجھ کو اس پر ابھارا کہ میں زیادہ کھانا کھلاؤں۔(مسند احمد: ۲۳۹۴۲، عالم الکتب، بیروت، سنن ابن ماجہ: ۳۷۳۸)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور (اے مخاطب!) اگر تو اپنے رب کی متوقع رحمت کی طلب کی وجہ سے ان سے اعراض کرے تو ان سے نرمی سے عذر پیش کرنا ۝" (بنی اسرائیل: ۲۸)

"وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا": اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اگر تم فقر اور مال کی قلت کی وجہ سے قرابت داروں اور دوسروں کو نہ دے سکو تو اُن سے اچھی بات اور اچھے کلام کو ترک نہ کرنا، بلکہ تم اُن سے خوبصورتی کے ساتھ وعدہ کرنا اور اُن کے سامنے عذر بیان کرنا اور وہ قلت ہے اور مال کا نہ ہونا ہے۔ یا تم اُن سے کہو کہ اللہ تعالیٰ عنقریب آسانی فرما دیں گے۔ اس آیت میں "قَوْلًا مَّيْسُوْرًا" فرمایا ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ سائل کے سوال کو اچھے طریقے سے رد کرنا۔ یا نرمی اور سہولت کے ساتھ اپنا عذر بیان کرنا، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَ اللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ۝ (البقرۃ: ۲۶۳)" (نیک بات کہنا اور (لوگوں کو) معاف کر دینا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے بعد (طعنہ دے کر) ایذاء پہنچائی جائے، اور اللہ (سب سے) غنی ہیں، بے حد حلم والے ہیں ۝)۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور تو اپنا ہاتھ اپنی گردن تک بندھا ہوا نہ رکھ اور نہ اپنے ہاتھ کو بالکل کھول دے ورنہ تو ملامت کیا ہوا حسرت زدہ بیٹھا رہے گا ۝" (بنی اسرائیل: ۲۹)

"وَ لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ": اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کے خرچ کرنے کی اس طرح صفت بیان فرمائی ہے: "وَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَ لَمْ يَقْتُرُوْا وَ كَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا (الفرقان: ۶۷)" (اور جو خرچ کرتے وقت نہ تو گناہ کے کاموں میں خرچ کرتے ہیں اور نہ ہی اللہ کا حق ادا کرنے سے ہاتھ روکتے ہیں ان کا خرچ دونوں کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے)۔

"وَ لَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ۝": اسی طرح یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرمایا کہ آپ اپنے اوپر اور اپنے اہل و عیال پر اور اپنے رشتہ داروں پر خرچ کرنے سے اپنا ہاتھ نہ روکے رکھیں، اور نہ خرچ کرنے میں اتنا کھلا ہاتھ رکھیں کہ آپ کے پاس کچھ نہ رہے۔

حکماء نے کہا ہے ہر خُلق کی دو طرفیں ہیں: افراط اور تفریط، اور یہ دونوں مذموم ہیں۔ پس بُخل کرنا خرچ نہ کرنے میں افراط ہے اور تبذیر خرچ کرنے میں افراط ہے اور یہ دونوں مذموم ہیں۔ اور جو خُلق عمدہ ہے وہ عدل اور متوسط ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا۔ (البقرہ: ۱۴۳)'' (اور (اے مسلمانو!) اسی طرح ہم نے تم کو بہترین امت بنایا ہے)۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''بے شک آپ کے رب جس کے لیے چاہیں رزق کو کشادہ فرما دیتے ہیں، اور (جس کے لیے چاہیں) تنگ فرما دیتے ہیں، بے شک وہ اپنے بندوں کی بہت خبر رکھنے والے ہیں، خوب دیکھنے والے ہیں O'' (بنی اسرائیل: ۳۰)

''اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ'': اس سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ آپ کے رب ہیں اور رب وہ ہیں جو مخلوق کی مہمات کی اصلاح فرماتے ہیں اور ان کی ضروریات کو پورا فرماتے ہیں، پس بعض کو رزق وسعت کے ساتھ دیتے ہیں اور بعض کو رزق تنگی کے ساتھ دیتے ہیں۔ اور ''القدر'' کا معنی لغت میں تنگی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ۔ (الطلاق: ۷)'' (اور جس پر اس کا رزق تنگ کیا گیا وہ اسی میں سے خرچ دے جو اللہ نے اسے عطا فرمایا)۔

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۝ (الفجر: ۱۶)'' (اور جب اسے آزمائیں اور اس کا رزق اس پر تنگ فرما دیں تو کہتا ہے: میرے رب نے مجھے ذلیل کیا O)۔

اور اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ۝ (الشوریٰ: ۲۷)'' (اور اگر اللہ اپنے سب بندوں کو وسیع رزق عطا فرماتے تو وہ ضرور زمین میں سرکشی کرتے لیکن وہ جتنا چاہتے ہیں تنگی سے نازل فرماتے ہیں، بے شک وہ اپنے بندوں (کی ضروریات) سے خبردار ہیں اور انہیں خوب دیکھتے ہیں)۔

''اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا'': یعنی اللہ تعالیٰ ہر انسان کی مصلحت کو جاننے والے ہیں اور اس کی مصلحت کے مطابق اس کو اندازے سے عطا فرماتے ہیں، اس لیے بندوں کو رزق عطا فرمانے میں جو تفاوت اور اختلاف ہے وہ بخل کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ مصلحتوں کی رعایت کی وجہ سے ہے۔ (التفسیر الکبیر، ج ۷، ص ۳۳۱-۳۳۰، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝۳۱

اور تم اپنی اولاد کو تنگدستی کے خطرہ سے قتل نہ کرو، ہم ہی ان کو اور تم کو رزق عطا فرماتے ہیں، بے شک اُن کو قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے O

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝۳۲

اور زنا کے قریب نہ جاؤ، بے شک وہ بے حیائی کا کام ہے اور بہت ہی برا طریقہ ہے O

وَ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَ مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ﴿۳۳﴾

اور جس شخص کے قتل کو اللہ نے حرام فرما دیا ہے، اس کو ناحق قتل نہ کرو، اور جس شخص کو ظلماً قتل کیا جائے تو ہم نے اس کے وارث کے لیے (قصاص لینے کا) تصرف عطا فرمایا ہے، پس وہ قصاص لینے میں (اس لیے) حد سے تجاوز نہ کرے کہ اس کی مدد کی ہوئی ہے○

وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ حَتّٰی یَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۪ وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۴﴾

اور عمدہ طریقہ کے سوا یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ حتیٰ کہ وہ یتیم اپنی جوانی کو پہنچ جائے، اور عہد پورا کیا کرو بے شک عہد کے متعلق سوال فرمایا جائے گا○

وَ اَوْفُوا الْكَیْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَ زِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ ؕ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ﴿۳۵﴾

اور جب تم ناپ کرو تو پوری طرح ناپ کرو اور درست ترازو کے ساتھ وزن کیا کرو، یہ انجام کے اعتبار سے بہت بہتر ہے○

وَ لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۶﴾

اور (اے مخاطب!) اس چیز کے درپے نہ ہو جس کا تجھے علم نہیں ہے، بے شک کان اور آنکھ اور دل، ان میں سے ہر ایک کے متعلق قیامت میں سوال فرمایا جائے گا○

وَ لَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَ لَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴿۳۷﴾

اور تم زمین میں اکڑ اکڑ کر نہ چلو، بے شک نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ تم لمبائی میں پہاڑوں کے برابر پہنچ سکتے ہو○

كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَیِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ﴿۳۸﴾

ان میں سے ہر صفت آپ کے رب کے نزدیک بری ہے سخت ناپسندیدہ ہے○

ذٰلِكَ مِمَّاۤ اَوْحٰۤی اِلَیْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ وَ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰی فِیْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۳۹﴾

(اے رسول اکرم!) یہ وہ ہدایات ہیں جو آپ کے رب نے حکمت سے آپ کی طرف وحی فرمائی ہیں، اور (اے مخاطب!) تم اللہ کے ساتھ دوسرا مستحق عبادت نہ بناؤ، ورنہ تمہیں جہنم میں ملامت زدہ دھتکارا ہوا جھونک دیا جائے گا O

اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ۟

(اے مشرکو!) کیا تمہارے رب نے تم کو بیٹوں کے ساتھ خاص فرمالیا ہے اور (اپنے لیے) فرشتوں میں سے بیٹیاں بنالی ہیں، بے شک تم بہت سنگین بات کہتے ہو O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور تم اپنی اولاد کو تنگدستی کے خطرہ سے قتل نہ کرو، ہم ہی ان کو اور تم کو رزق عطا فرماتے ہیں، بے شک اُن کو قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے O" (بنی اسرائیل: ۳۱)

امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ، بنی اسرائیل: ۳۱ تا ۴۰ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ": (اور تم اپنی اولاد کو تنگدستی کے خطرہ سے قتل نہ کرو)۔

املاق کا لغوی معنی

علامہ اسماعیل بن حماد الجوہری الشافعی المتوفی ۳۹۸ھ، لکھتے ہیں:

الاملاق کا معنی ہے الافتقار، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ۔ (الانعام: ۱۵۱)" (اور اپنی اولاد کو تنگدستی کے باعث قتل نہ کرو)۔ (معجم الصحاح، ص ۱۰۰۲، دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۲۹ھ)

امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ، لکھتے ہیں:

اللہ جل شانہٗ نے یہ عربوں کے لیے فرمایا، کیونکہ وہ اپنی اولاد میں سے لڑکیوں کو فقر اور فاقہ کے خوف سے قتل کردیتے تھے، اور قتادہ نے اس آیت کی تفسیر میں کہا کہ تم فاقہ کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔ اور اہل جاہلیت اپنی اولاد کو فاقہ کے خوف سے قتل کردیتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو نصیحت فرمائی اور یہ خبر دی کہ اُن کا رزق اور ان کی اولاد کا رزق اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔

اور "اِمْلَاقٍ" کا لفظ مصدر ہے، جب کسی شخص کا زادِ راہ ختم ہوجائے تو وہ کہتا ہے "املقت من الزاد"۔ اور گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم اپنی اولاد کو زندہ درگور نہ کرو، پس تم فقر کے خوف سے اُن کو قتل نہ کرو، یعنی تمہیں یہ خوف ہو کہ تم اُن کا خرچ نہیں اٹھاسکو گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے بھی رازق ہیں اور اُن کے بھی رازق ہیں، اور تم پر ان کے رزق کی ذمہ داری نہیں ہے کہ تم ان کے زندہ رہنے سے ڈرو کہ اگر یہ اولاد زندہ رہی تو ہم ان کو رزق فراہم نہیں کرسکیں گے۔

"نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ": (ہم ہی ان کو اور تم کو رزق عطا فرماتے ہیں)۔

قدیم زمانہ میں فقر کے خوف سے اولاد کو قتل کیا جاتا تھا اور اس زمانہ میں ضبطِ تولید سے کام لیا جاتا ہے

فقر و فاقہ اور افلاس کا خوف قدیم زمانہ میں بھی اولاد کو قتل کرنے اور اسقاطِ حمل کا محرک ہوا کرتا تھا اور اس زمانہ میں اس کی ایک اور تدبیر لوگوں نے اختیار کرلی ہے، وہ مختلف دواؤں کے ذریعے حمل کو روکنے کی تدبیر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ

کھانے والوں کو کم کرنے کی کوشش نہ کریں اس کے بجائے اپنی توتیں اور قابلیتیں ان کاموں میں صرف کریں جن کی وجہ سے رزق میں افزائش ہوا کرتی ہے، یہ آیت انسان کو اس پر متنبہ فرماتی ہے کہ رزق کو پہنچانے کا انتظام انسان کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ اس ذات کے دستِ قدرت میں ہے جنہوں نے زمین میں تمہیں پیدا فرمایا ہے، جس طرح وہ پہلے آنے والوں کو روزی دیتے رہے ہیں اسی طرح بعد میں آنے والوں کو بھی روزی دیتے رہیں گے، دنیا کے مختلف ملکوں میں کھانے والوں کی آبادی جتنی بڑھتی گئی ہے اتنے ہی بلکہ اس سے بہت زیادہ معاشی ذرائع وسیع ہوتے چلے گئے ہیں، بنگلہ دیش کا رقبہ پاکستان سے کم ہے اور آبادی پاکستان سے زیادہ ہے، اس کے باوجود بنگلہ دیش کی کرنسی کی قدر (Value) پاکستان سے ڈیڑھ گنا زیادہ ہے، پہلے لوگوں کو شہر میں آمد ورفت کے لیے سائیکل بہ مشکل میسر ہوتی تھی اب بے تحاشا موٹر سائیکلیں ہیں، کاریں ہیں اور ان کی مقدار اتنی زیادہ ہے کہ اب ٹریفک کی روانی مشکل ہوگئی ہے، تعلیمی ادارے پہلے سے بہت زیادہ بن گئے ہیں، کاروباری مراکز بھی پہلے سے بہت زیادہ ہیں، سوجوں جوں انسانی آبادی بڑھتی گئی ہے، رزق کے وسائل بھی بڑھتے گئے ہیں۔

"اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِیْرًا": (بے شک اُن کو قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے)۔

یعنی اولاد کو قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے، کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ بندہ کو اللہ تعالیٰ کی رزاقی پر ایمان اور اعتماد نہیں ہے، یہ لفظ "خِطْاً" خاء کے زیر کے ساتھ اور "خَطَأً" خاء کی زبر کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ نیز اگر اولاد کو قتل کرنا اس وجہ سے ہو کہ ان کو کھلانے کے لیے رزق میسر نہیں ہوگا تو یہ اللہ تعالیٰ کی رزاقی کے ساتھ بدگمانی ہے، اور اگر اولاد کو اس وجہ سے قتل کیا جائے کہ بیٹیوں کی وجہ سے انسان کو عار ہوگا، تو اگر سب لوگ اپنی اپنی بیٹیوں کو قتل کردیں تو پھر توالد اور تناسل کا انتظام قائم نہیں ہوگا۔ اور پہلی صورت اللہ تعالیٰ کی تعظیم کے خلاف ہے اور دوسری صورت مخلوق پر شفقت کے خلاف ہے، نیز اولاد ماں باپ کا جزو ہوتی ہے اور یہ ایک دوسرے سے محبت کا قوی سبب ہے، اور یہ فطری اور طبعی محبت ہے اور اولاد کو قتل کرنا اس طبعی محبت کے خلاف ہے۔

جس طرح پہلے زمانے میں تنگیٔ رزق کے خوف سے اولاد کو پیدا ہونے کے بعد لوگ قتل کردیتے تھے، اسی طرح اس زمانے میں لوگ تنگیٔ رزق کے خوف سے اولاد کو پیدا ہونے سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں اور ضبطِ تولید اور خاندانی منصوبہ بندی وغیرہا کے طریقوں سے اولاد کو پیدا ہونے سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں، بعض لوگ اس سلسلہ میں عزل سے بھی استدلال کرتے ہیں، اس لیے ہم یہاں پر اختصار کے ساتھ عزل کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔

عزل کی تحقیق

ابن محیریز بیان کرتے ہیں کہ میں اور ابو صرمہ دونوں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے پاس گئے، ابو صرمہ نے ان سے پوچھا کہ اے ابو سعید خدری! کیا آپ نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عزل کے بارے میں سنا ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ بنو مصطلق میں گئے اور ہم نے عرب کی معزز عورتوں کو قید کرلیا، ہمیں عورتوں سے الگ ہوئے کافی دن گزر چکے تھے، ہم نے چاہا کہ مشرکین سے فدیہ لے کر ان عورتوں کو چھوڑ دیں اور ہم نے یہ بھی چاہا کہ ان عورتوں سے (جسمانی) فائدہ بھی حاصل کریں اور عزل کرلیں، (یعنی انزال کے وقت عضوِ تناسل باہر نکال لیں تاکہ حمل قائم نہ ہو)، پھر ہم نے سوچا کہ ہم عزل کر رہے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان موجود ہیں تو کیوں نہ آپ سے اس کا حکم معلوم کریں۔ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

پوچھا تو آپ نے فرمایا: تم ایسا نہ کرو پھر بھی کوئی حرج نہیں، کیونکہ قیامت تک اللہ تعالیٰ نے جس روح کے پیدا ہونے کے بارے میں لکھ دیا ہے وہ پیدا ہو کر رہے گی۔

(صحیح مسلم: ۱۴۳۸، الرقم المسلسل: ۳۵۲۹، رقم حدیث الباب: ۱۲۵، صحیح البخاری: ۲۲۲۹، ۲۵۴۲، ۴۱۳۸، ۷۴۰۹، ۶۶۰۳، ۵۲۱۰، سنن ابوداؤد: ۲۱۷۲)

ضبطِ تولید کے طریقوں پر عمل کرنے کا عدمِ جواز

موجودہ دور میں ضبطِ تولید اور خاندانی منصوبہ بندی کے جو طریقے رائج ہیں ان میں سے کوئی طریقہ بھی قتل ولد کی تعریف میں نہیں آتا کیونکہ ولد تو نطفہ کے استقرار کے نو ماہ بعد وجود میں آتا ہے اور ضبطِ تولید کا عمل استقرارِ نطفہ کے وقت کیا جاتا ہے جب ولد کا کسی قسم کا وجود نہیں ہوتا، پس جب ولد ہی نہیں ہے تو قتل ولد کا کیسے تحقق ہوگا! لیکن اللہ تعالیٰ نے قتل ولد کی حرمت کی جو علت بیان فرمائی ہے وہ تنگی رزق کا ڈر ہے، پس جو شخص ضبطِ تولید کا عمل تنگی رزق کی بناء پر کرتا ہے اس کا یہ فعل بلاشبہ حرام ہے کیونکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے قتلِ اولاد کو حرام کرنے کی یہی علت بیان فرمائی ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی والے ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کو کم کرنے کے لیے تنگی رزق سے ڈرا کر ضبطِ تولید کی ترویج کرتے ہیں اور ان کے تمام تر اشتہارات اور ترغیبات کا حاصل یہی ہوتا ہے کہ بچے کم ہوں گے تو خوش حال گھرانہ ہوگا اور یہ فکر قرآن مجید کے بیان کردہ حکم کے یکسر خلاف ہے۔

تاہم دینِ اسلام انسانوں کی تمام ضروریات کا کفیل ہے، بعض اوقات بچہ عام معروف طریقہ سے پیدا نہیں ہوتا اس کے لیے سرجری ناگزیر ہوتی ہے اور سرجری کے ذریعے بچہ کو ماں کے پیٹ سے نکالا جاتا ہے اور اگر متعدد بار یہ عمل ہو تو اس سے عورت کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے تو اس کا ایک حل یہ ہے کہ عورت کے بیضہ دانی والی نس (رگ) کو کاٹ کر باندھ دیا جاتا ہے جس سے پھر آئندہ ولادت ممکن نہیں رہتی، تاہم بلا ضرورت یہ عمل جائز نہیں ہے اور عورت کو بانجھ کرنے کے مترادف ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”اور زنا کے قریب نہ جاؤ، بے شک وہ بے حیائی کا کام ہے اور بہت ہی برا طریقہ ہے O“ (بنی اسرائیل: ۳۲)

جو کام ممنوع ہو اس کے قرب کا بھی ممنوع ہونا

”وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِیْلًا“: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ زنا نہ کرو، بلکہ یہ فرمایا ہے کہ زنا کے قریب بھی مت جاؤ، اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کو شجرِ ممنوعہ سے کھانے سے منع نہیں فرمایا بلکہ اس کے قریب جانے سے بھی منع فرمایا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ..... (البقرہ: ۳۵)“ (اور اس درخت کے قریب نہ جانا)۔ اسی طرح اللہ عزوجل نے فرمایا: ”وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ..... (الانعام: ۱۵۲)“ (اور عمدہ طریقہ کے سوا یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ)۔ اس آیت میں بھی ناجائز طریقہ سے مالِ یتیم کو کھانے سے منع کرنے کے بجائے فرمایا کہ تم عمدہ طریقہ کے سوا مالِ یتیم کے قریب نہ جاؤ۔ ان آیات سے یہ معلوم ہوا کہ جو کام ممنوع اور ناجائز ہو اس کے قریب جانا بھی ممنوع اور ناجائز ہوتا ہے۔

اجنبی عورتوں کے ساتھ آزادانہ میل جول اور اختلاط کا عدم جواز

اجنبی عورتوں کے ساتھ آزادانہ میل جول اور اختلاط اور ان سے بوس و کنار کرنا یہ گویا زنا کے قریب جانا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہی فرمایا ہے کہ تم زنا کے قریب بھی مت جاؤ۔

اجنبی عورتوں سے تعلق پیدا کرنا، ان سے خلوت میں ملاقات کرنا، ان سے ہنسی اور دل لگی کی باتیں کرنا اور ان سے ہاتھ ملانا اور بوس و کنار کرنا، مغربی تہذیب میں یہ تمام امور عام ہیں اور زندگی کے معمولات میں داخل ہیں، اسی وجہ سے وہاں زنا بھی عام ہے، ساحل سمندر پر اور پارکوں میں یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے اور آئے دن سڑکوں پر نا جائز بچے ملتے رہتے ہیں۔ جس طرح ہمارے ہاں کوئی شخص کثیر الاولاد ہوتا ہے اسی طرح ان کے ہاں کوئی شخص کثیر الولدیت ہوتا ہے۔

حرمت زنا کے اسباب

حسب ذیل وجوہ سے ارتکاب زنا کو نا جائز قرار دیا جاتا ہے:

(۱) زنا سے نسب مختلط اور مشتبہ ہو جاتا ہے اور انسان کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ زانیہ سے جو بچہ پیدا ہوا ہے وہ اس کے نطفہ سے ہے یا کسی اور کے نطفہ سے، اس لیے اس کے دل میں اس بچہ کی پرورش کی کوئی امنگ ہوتی ہے اور نہ کوئی جذبہ ہوتا ہے، اور نہ وہ اس کی حفاظت کرتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ بچہ ضائع ہو جاتا ہے، اس سے نسل منقطع ہوتی ہے۔

(۲) زانیہ عورت کسی ایک مرد کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتی، اس کے پاس متعدد مرد آتے ہیں، پھر بعض اوقات ان مردوں میں رقابت اور حسد پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے قتل و غارت اور فساد کی نوبت آجاتی ہے۔

(۳) اگر زنا عام ہو جائے تو نہ مرد کسی عورت کے ساتھ مخصوص ہوگا اور نہ عورت کسی مرد کے ساتھ مخصوص ہوگی، اور ہر عورت ہر مرد سے اور ہر مرد ہر عورت سے اپنی جنسی خواہش پوری کر سکے گا، پھر انسان میں اور جانور میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔

(۴) شادی شدہ عورت کا خاوند اس کی روٹی، کپڑے اور مکان کا ذمہ دار ہوتا ہے اور اس کی دیگر ضروریات کا کفیل ہوتا ہے، اور اس کی بیوی دکھ سکھ کی ساتھی ہوتی ہے، اس کے بچوں کی ماں ہوتی ہے، شوہر مر جائے تو اس کے ترکہ کی وارث ہوتی ہے اور اس کا مستقبل محفوظ ہوتا ہے، اس کے برخلاف زانیہ کے ساتھ صرف وقتی اور عارضی تعلق ہوتا ہے، اس کے کھانے، کپڑے اور زندگی کی دیگر ضروریات کا نہ کوئی کفیل ہوتا ہے اور نہ کوئی ذمہ دار ہوتا ہے اور نہ اسے اپنے مستقبل کا کوئی تحفظ حاصل ہوتا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور جس شخص کے قتل کو اللہ نے حرام فرما دیا ہے، اس کو ناحق قتل نہ کرو، اور جس شخص کو ظلماً قتل کیا جائے تو ہم نے اس کے وارث کے لیے (قصاص لینے کا) تصرف عطا فرمایا ہے، پس وہ قصاص لینے میں (اس لیے) حد سے تجاوز نہ کرے کہ اس کی مدد کی ہوئی ہے O'' (بنی اسرائیل: ۳۳)

حرمت زنا کی حرمت قتل پر تقدیم کی توجیہ

''وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ '': (اور جس شخص کے قتل کو اللہ نے حرام فرما دیا ہے، اس کو ناحق قتل نہ کرو)۔

اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلی آیت میں حرمت زنا کا ذکر فرمایا ہے، اور اس آیت میں حرمت قتل کا ذکر فرمایا ہے، اس پر یہ اعتراض ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کفر کرنے کے بعد سب سے بڑا گناہ قتل ناحق ہے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے حرمت زنا کو بیان فرمایا اور اس کے بعد قتل ناحق کی حرمت کو بیان فرمایا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر زنا کا دروازہ کھول دیا جائے تو انسان کا صحیح نسب کے ساتھ وجود ممکن نہیں ہوگا اور قتل ناحق انسان کے وجود کے بعد اس کو باطل کرتا ہے۔ اس لیے زنا کا پہلے ذکر فرمایا کیونکہ اگر زنا عام ہو جائے تو انسان کا صحیح نسب کے ساتھ وجود حاصل نہیں ہو سکے گا اور وجود حاصل ہونے کے بعد پھر اس کو ناحق قتل کرنا یہ بعد کا مرتبہ ہے، اس لیے حرمت زنا کے بعد قتل ناحق کی حرمت کو بیان فرمایا ہے۔

قتل کو حرام قرار دینے کی وجوہ

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ ھ، لکھتے ہیں:

قتل میں اصل حرمت مغلظہ ہے، اور قتل کا حلال ہونا کسی عارضی سبب سے ثابت ہوتا ہے اور جب اس طرح ہو تو ضروری ہے کہ قتل کرنے کو مطلقاً منع فرمایا جائے، تاکہ اصل کے اوپر حکم مبنی ہو۔ پھر ان بعض صورتوں کا استثناء فرمایا جن میں قتل کرنا حلال ہوتا ہے اور وہ عارضی اسباب کے حصول کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس لیے ارشاد فرمایا: ''اِلَّا بِالْحَقِّ''۔ پس اس وجہ سے ضروری ہے کہ ہم بیان کریں کہ قتل میں اصل تحریم ہے اور اس پر حسب ذیل وجوہ دلالت کرتی ہیں:

(۱) قتل کے ارتکاب میں کسی کو ضرر پہنچانا ہے اور ضرر پہنچانے میں اصل تحریم ہے، اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں: ''وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ۔ (الحج: ۷۸)'' (اور اللہ تعالیٰ نے دین کے احکام میں تم پر کوئی تنگی نہیں فرمائی)۔ نیز اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا: ''وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ۔ (البقرہ: ۱۸۵)'' (اور اللہ تعالیٰ تم کو مشکل میں ڈالنے کا ارادہ نہیں فرماتے)۔ حدیث میں ہے:

حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ ''اَنْ لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ'' کوئی شخص اپنے صاحب کو نقصان نہ پہنچائے اور نہ دو مردوں میں سے کوئی دوسرے کو ضرر پہنچائے یہ گمان کرتے ہوئے کہ یہ تبادلہ ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(سنن ابن ماجہ: ۲۳۴۰، موطا امام مالک: ۲۹۸۲،۳۱، ۲۷۵۸، مسند الشافعی: ۵۷۵، مسند احمد: ۲۸۶۵، الاحاد والمثانی: ۲۲۰۰، المعجم الاوسط للطبرانی: ۱،۲۷۷، المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۱۵۷۶، سنن دارقطنی: ۳۰۷۹، السنن الصغیر للبیہقی: ۲۰۸۸، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۱۳۸۵، معرفۃ السنن والآثار: ۱۱۹۷۹، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشرۃ، ج ۱۷ ص ۸)

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے ''الآدمی بنیان الرب ملعون من ھدم بنیان الرب'' آدمی رب کی بنیاد ہے اور جس نے رب کی بنیاد کو منہدم کیا وہ ملعون ہے۔

امام رازی نے حسب عادت بغیر کسی حوالہ کے یہ حدیث ذکر کی ہے اور بسیار تلاش کے باوجود ہم کو یہ حدیث، حدیث کی کسی کتاب میں نہیں مل سکی۔ (سعیدی غفرلہ)

(۳) آدمی کو اس لیے پیدا فرمایا گیا ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہے، کیونکہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''وَمَا خَلَقْتُ

الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ (الذاریات:۵۶)" (میں نے جن اور انسان اسی لیے پیدا فرمائے کہ وہ میری عبادت کریں O)۔ نیز حدیث میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ کا بندوں پر یہ حق ہے کہ وہ ان کی عبادت کریں"۔

امام رازی نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے اس کی تفصیل حسب ذیل حدیث میں ہے:

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں سواری پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا، آپ نے فرمایا: اے معاذ! میں نے کہا: "لبیک وسعدیک" (میں حاضر ہوں اور آپ کی اطاعت کے لیے مستعد ہوں)۔ پھر اس کی مثل تین مرتبہ آپ نے فرمایا اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اسی طرح جواب دیا۔ پھر آپ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ اللہ کا بندوں پر کیا حق ہے؟ میں نے کہا: نہیں! آپ نے فرمایا: اللہ کا بندوں پر یہ حق ہے کہ بندے ان کی عبادت کریں اور ان کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں، پھر آپ چلتے رہے، اور پھر تھوڑی دیر بعد کہا: اے معاذ! میں نے کہا: "لبیک وسعدیک" آپ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ بندوں کا اللہ پر کیا حق ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرلیں یعنی جب وہ ان کی عبادت کرلیں، میں نے کہا: نہیں! آپ نے فرمایا: بندوں کا اللہ پر حق یہ ہے کہ جب وہ یہ کرلیں (یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرلیں) تو اللہ تعالیٰ ان کو عذاب نہ دیں۔

(صحیح البخاری:۲۸۵۶، ۵۹۶۷، ۶۲۶۷، ۶۵۰۰، ۷۳۷۳، صحیح مسلم:۳۰، سنن ترمذی:۲۶۴۳، سنن ابوداؤد:۲۵۵۹، سنن ابن ماجہ:۴۲۹۶، مسند احمد:۲۱۳۸۶)

(میں کہتا ہوں: اس سے مراد یہ ہے کہ بندوں کا اللہ پر وہ حق ہے جس کو خود اللہ عزوجل نے اپنے فضل و کرم سے اپنے اوپر لازم فرمالیا ہے، یہ ایسا حق نہیں ہے جیسے کوئی شخص مزدوری کرے تو اس کا مزدوری کرانے والے پر اجرت لینے کا حق ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ انسان کو اس کے بالغ ہونے تک انواع و اقسام کی نعمتیں عطا فرماتے رہے اور اس سے کسی عبادت کا مطالبہ نہیں فرمایا، اور بالغ ہونے کے بعد اللہ عزوجل نے اس کو عبادات کا مکلف فرمایا ہے، اب بندہ جو بعد میں عبادات بجالائے گا یہ تو اللہ تعالیٰ کی عطا فرمائی ہوئی پچھلی نعمتوں کا بھی بدل نہیں ہے، سو اگر اللہ تعالیٰ اس سے پہلے سے عطا فرمائی ہوئی نعمتوں کے مقابلہ میں عبادات کا مطالبہ نہ فرمائیں تو یہ ان کا بہت بڑا کرم ہے۔ سعیدی غفرلہ)

امام رازی فرماتے ہیں: اور عبادت میں مشغول ہونا اسی وقت متحقق ہوگا کہ جب لوگوں کو قتل نہ کیا جائے۔

(۴) قتل کرنا فساد پھیلانا ہے، پس ضروری ہوا کہ قتل کرنا حرام ہو کیونکہ اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا ہے: "وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (الاعراف:۸۵)" (اور زمین کی اصلاح کے بعد اس میں فساد نہ کرو)۔

(۵) جب تحریم کی دلیل میں اور اباحت کی دلیل میں تعارض ہو تو تحریم کو ترجیح دی جاتی ہے، اس لیے قتل کی تحریم کو ترجیح دی جائے گی۔

(۶) ہم کو انسان کی صفات میں سے یہ معلوم ہے کہ انسان صاحب عقل ہے، اس لیے ہم نے اس کو قتل کرنے کی تحریم کی ترجیح دی ہے، اور ان چھ وجوہ سے معلوم ہو گیا کہ قتل میں اصل تحریم ہے اور قتل کا حلال ہونا کسی عارضی سبب کی وجہ سے ہوتا ہے۔

اور جب یہ ثابت ہو گیا تو ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم فرمایا کہ اصل قتل میں تحریم ہے، لہٰذا ارشاد فرمایا: "وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ"۔ پس اللہ تعالیٰ کا ارشاد "وَلَا تَقْتُلُوْا" یہ نہی اور تحریم ہے، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد "حَرَّمَ اللّٰهُ" بہ طور تاکید تحریم کا دوبارہ ذکر فرمایا ہے، پھر عارضی اسباب کی وجہ سے اس حرمت کا استثناء فرمایا ہے۔ اور وہ عارضی اسباب یہ ہیں کہ کسی شخص کو قصاص میں قتل کیا جائے۔

مسلمان کوقتل کرنے کے جواز کے متعلق اتفاقی اسباب

حضرت عبداللہ (ابن مسعود) رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو مسلمان لا الٰہ الا اللہ اور بے شک میں اللہ کا رسول ہوں، اس کی شہادت دیتا ہو، اس کا خون کرنا تین خصلتوں کے سوا جائز نہیں ہے: (۱) جان کا بدلہ جان (۲) شادی شدہ زانی (۳) دین کو ترک کرنے والا اور جماعت مسلمین کو چھوڑنے والا۔

(صحیح مسلم: ۱۶۷۶، سنن ترمذی: ۱۴۰۲، سنن نسائی: ۴۰۱۶، سنن ابوداؤد: ۴۳۵۲، سنن ابن ماجہ: ۲۵۳۴، مسند احمد: ۳۶۱۴، سنن دارمی: ۲۲۹۸)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تین صورتوں کے سوا کسی مسلمان کو قتل کرنا جائز نہیں ہے۔

مسلمان کوقتل کرنے کے جواز کا چوتھا سبب

اور قرآن مجید کی ایک اور آیت سے قتل کرنے کا ایک چوتھا سبب بھی معلوم ہوا، وہ آیت یہ ہے: "اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝ (المائدہ: ۳۳)" (جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں دہشت گردی کرتے ہیں، ان کی سزا یہی ہے کہ ان کو چن چن کر قتل کیا جائے یا اُن کو سولی پر چڑھایا جائے یا اُن کے ہاتھ اور اُن کے پیر مخالف جانبوں سے کاٹ دیے جائیں، یا اُن کو اُن کے وطن سے نکال دیا جائے، یہ اُن کی دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں اُن کے لیے بڑا عذاب ہے O)۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ڈاکوؤں کو قتل کرنے یا اُن کو سولی پر چڑھانے کا حکم فرمایا ہے، ہمارے ملک میں ڈاکوؤں کو پھانسی پر چڑھایا جاتا ہے، اگر ڈاکوؤں کو قتل کر دیا جائے یا سولی پر چڑھا دیا جائے تو امید کی جا سکتی ہے کہ اس شرعی قانون کے نافذ ہونے سے ڈاکہ ڈالنے کا رجحان بہت کم ہو جائے گا۔ (سعیدی غفرلہٗ)

مسلمان کوقتل کرنے کے جواز کا پانچواں سبب

مسلمان کو قتل کرنے کے جواز کا پانچواں سبب کسی شخص کا کفر کو اختیار کرنا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (التوبہ: ۲۹)" ((اے مسلمانو!) اُن لوگوں سے لڑتے رہو جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے)۔ کسی مسلمان کو قتل کرنے کے یہ پانچ اسباب فقہاء کے نزدیک بالاتفاق ہیں اور بعض صورتوں میں مسلمان کو قتل کرنے کے متعلق فقہاء کا اختلاف ہے۔

مسلمان کوقتل کرنے کے جواز کے متعلق فقہاء کی بیان کردہ اختلافی صورتیں

مسلمان کو قتل کرنے کے جواز کی بعض صورتیں فقہاء کے درمیان مختلف ہیں، ان کا ذکر حسب ذیل ہے:

(۱) جو مسلمان عمداً نماز کو ترک کر دے، امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اس کو قتل کیا جائے گا اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس کو قتل نہیں کیا جائے گا۔

(۲) امام شافعی کے نزدیک لواطت کرنے والے کو قتل کرنا واجب ہے اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک واجب نہیں ہے۔

(۳) جب جادوگر یہ اعتراف کرے کہ میں نے فلاں شخص کو اپنے جادو سے قتل کیا ہے تو امام شافعی کے نزدیک اس جادوگر کو قتل کرنا واجب ہے اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک واجب نہیں ہے۔

(۴) کسی بھاری ہتھیار سے قتل کرنے سے امام شافعی کے نزدیک قصاص میں قتل کرنا واجب ہے اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک تلوار کے سوا اور کسی صورت میں قتل کرنے سے قصاص واجب نہیں ہوتا۔

(۵) زکوٰۃ کے ادا نہ کرنے سے قتل واجب ہوتا ہے یا نہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اس میں اختلاف ہوا۔

(۶) اگر کوئی شخص کسی جانور سے بدفعلی کرے تو آیا اس سے قتل واجب ہوتا ہے یا نہیں؟ اکثر فقہاء کے نزدیک اس صورت میں قتل واجب نہیں ہوتا۔ اور بعض فقہاء کے نزدیک اس صورت میں بھی اس شخص کو قتل کرنا واجب ہے۔

(تفسیر الکبیر ج ۷ ص ۳۳۲۔ ۳۳۳، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

"وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطٰنًا": یعنی جس شخص کو ان وجوہ کے بغیر ناحق قتل کیا گیا جن کا ہم نے ذکر کیا ہے تو ہم نے مقتول کے ولی کے لیے یہ اختیار اور تصرف رکھا ہے کہ اگر چاہے تو وہ قاتل سے قصاص لے اور مقتول کا ولی قاتل کو قتل کردے، اور اگر چاہے تو قاتل کو معاف کردے، اور اگر چاہے تو اس سے دیت وصول کرلے۔ مقتول کے ولی کے لیے قصاص لینے کا ثبوت درج ذیل حدیث میں ہے:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے سال خزاعہ نے زمانہ جاہلیت میں اپنے ایک مقتول کے بدلہ میں بنولیث کے ایک مرد کو قتل کردیا، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے، سو آپ نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے مکہ سے ہاتھیوں کو روک دیا ہے اور اہل مکہ پر اپنے رسول کو اور مومنین کو مسلط فرمادیا، سنو اور بے شک مکہ نہ مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال تھا اور نہ میرے بعد کسی کے لیے حلال ہوگا، سنو یہ میرے لیے صرف دن کی ایک ساعت میں حلال فرمایا گیا ہے، سنو! بے شک یہ اس وقت حرام ہے نہ اس کا کانٹا اکھاڑا جائے گا اور نہ اس کا درخت کاٹا جائے گا اور سوائے اعلان کرنے والے کے اس میں گری ہوئی چیز کو نہیں اٹھایا جائے گا، اور جس شخص کا کوئی مقتول قتل کیا گیا تو اس کو دو چیزوں میں سے ایک کا اختیار ہے، یا اس کو دیت ادا کی جائے گی یا اس کا قصاص لیا جائے گا، پھر اہل یمن سے ایک مرد کھڑا ہوا جس کو ابوشاہ کہا جاتا تھا، پس اس نے کہا: یارسول اللہ! اس کو میرے لیے لکھ دیجئے، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کو ابوشاہ کے لیے لکھ دو، پھر ایک مرد قریش میں سے کھڑا ہوا، اس نے کہا: یارسول اللہ! سوائے اذخر (خشک گھاس) کے کیونکہ ہم اس کو اپنے گھروں میں رکھتے ہیں اور اپنی قبروں میں رکھتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سوا اذخر کے۔

(صحیح البخاری: ۱۱۲، ۲۴۳۴، ۶۸۸۰، صحیح مسلم: ۱۳۵۵، سنن ابوداؤد: ۲۰۱۷، مسند احمد: ۷۲۰۱، سنن دارمی: ۲۶۰۰، سنن نسائی: ۴۷۹۹، ۴۸۰۰)

"فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ": اس آیت کا معنی یہ ہے کہ مقتول کا ولی قاتل کے علاوہ کسی اور شخص کو ظلماً قتل نہ کرے، کیونکہ اہل جاہلیت اس طرح کرتے تھے، جب کوئی مرد دوسرے مرد کو قتل کردیتا تو مقتول کا ولی قاتل کے قبیلہ کے معزز مرد کو پکڑ کر اس کو قتل کردیتا اور قاتل کو چھوڑ دیتا، پس اللہ عزوجل نے اپنے بندوں کو اس فعل سے منع فرمایا اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: مقتول کے بدلہ میں قاتل کے غیر کو قتل کرنا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے اور حد سے تجاوز ہے۔ پس مقتول کے بدلہ میں اس کے قاتل کے غیر کو قتل نہ کیا

جائے۔ اور اگر تم نے مقتول کے بدلہ میں قاتل کو قتل کر دیا تو اس کو مُثلہ نہ کیا جائے یعنی اس کے اعضاء نہ کاٹے جائیں۔

سعید بن جبیر سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ ایک کے بدلہ میں دو مردوں کو قتل نہ کریں۔

(تفسیر سفیان ثوری ص ۱۷۳، سنن بیہقی ج ۸ ص ۲۵، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۹ ص ۳۲۳، تفسیر عبدالرزاق ج ۱ ص ۳۷۷)

الضحاک نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے: یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تھے اور یہ پہلی آیت ہے جو قتل ناحق کے متعلق نازل ہوئی۔ اور اہلِ مکہ میں سے مشرکین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذاء پہنچاتے تھے، تو اللہ عزوجل نے فرمایا: مشرکین نے تم میں سے جس کو قتل کیا ہو تو اس کا قتل تمہیں اس پر برانگیختہ نہ کرے کہ تم قاتل کے باپ کو یا بھائی کو یا اس کے قبیلہ میں سے کسی اور کو قتل کر دو خواہ وہ مشرک ہوں، پس تم قاتل کے سوا کسی اور کو قتل نہ کرو۔ یہ حکم سورۂ توبہ کے نازل ہونے سے پہلے نازل ہوا اور مشرکین کو قتل کرنے کے حکم سے پہلے نازل ہوا۔ اور اللہ عزوجل نے جو فرمایا ہے: "فَلَا يُسۡرِفۡ فِّي الۡقَتۡلِ" یعنی قصاص لینے میں اسراف نہ کیا جائے اور قاتل کے سوا کسی اور کو قتل نہ کیا جائے۔ اور مسلمانوں کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ قاتل کے سوا کسی اور کو قتل کریں۔ قتادہ نے "فَلَا يُسۡرِفۡ فِّي الۡقَتۡلِ" کی تفسیر میں کہا ہے کہ جس شخص کو لوہے کے ہتھیار سے قتل کیا گیا تھا اس کے قاتل کو لوہے کے ہتھیار سے قتل کیا جائے۔ اور جس کو لاٹھی سے قتل کیا گیا تھا تو اس کے قاتل کو لاٹھی سے قتل کیا جائے۔ اور جس کو پتھر مار کر ہلاک کیا گیا تھا تو اس کے قاتل کو پتھر مار کر ہلاک کیا جائے۔ اور اگر اس کے سوا کسی طریقہ سے قتل کیا گیا تو یہ قصاص لینے میں اسراف ہے۔ (تفسیر الطبری، ج ۱۳ ص ۵۸۶)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک یہودی نے ایک لڑکی کا سر دو پتھروں کے درمیان کچل دیا، اس لڑکی سے پوچھا گیا: تمہارے ساتھ یہ ظلم کس نے کیا ہے، فلاں شخص نے یا فلاں شخص نے؟ حتیٰ کہ اس یہودی کا نام لیا گیا، پھر اس (یہودی) کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا، پھر آپ اس سے سوال کرتے رہے حتیٰ کہ اس نے قتل کا اقرار کر لیا، پس اس کا سر بھی پتھروں سے کچل دیا گیا۔

(صحیح البخاری: ۲۴۱۳، ۲۷۴۶، ۵۲۹۵، ۶۸۷۶، ۶۸۷۹، ۶۸۸۴، ۶۸۸۵، صحیح مسلم: ۱۶۷۲، سنن ترمذی: ۱۳۹۴، سنن نسائی: ۴۷۴۲، سنن ابوداؤد: ۴۵۲۷، سنن ابن ماجہ: ۲۶۶۵، مسند احمد: ۱۲۵۹۴، سنن دارمی: ۲۳۵۵)

قصاص لینے کی کیفیت میں فقہاء کے اقوال

امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ قاتل کو اسی کیفیت سے قتل کیا جائے گا جس کیفیت سے اس نے مقتول کو قتل کیا ہے، پس اگر اس نے مقتول کو لاٹھی مار کر قتل کیا ہے یا پتھر مار کر قتل کیا ہے یا اس کا گلا گھونٹ کر قتل کیا ہے یا اس کو غرق کر کے قتل کیا ہے تو اس کو اسی کیفیت سے قتل کیا جائے گا۔ امام شافعی اور امام احمد اور ابوثور اور اسحاق اور ابن المنذر کا بھی یہی قول ہے۔ امام شافعی نے کہا: اگر اس نے مقتول کو عمداً آگ میں ڈال دیا حتیٰ کہ وہ مر گیا تو قاتل کو بھی آگ میں ڈال دیا جائے گا حتیٰ کہ وہ مر جائے۔ اور ابراہیم النخعی، عامر الشعبی، حسن البصری، سفیان ثوری، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے کہا کہ تمام صورتوں میں قاتل کو صرف تلوار سے قتل کیا جائے گا اور ان کی دلیل یہ ہے کہ امام طحاوی نے یہ حدیث بیان کی ہے:

امام طحاوی نے کہا: ہمیں ابن مرزوق نے حدیث بیان کی، انہوں نے کہا: ہمیں ابو عاصم نے حدیث بیان کی، انہوں نے کہا:

ہمیں سفیان ثوری نے حدیث بیان کی از حضرت جابر از ابی عازب از النعمان، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قصاص صرف تلوار سے لیا جائے گا۔ اور ابوعاصم الضحاک بن مخلد امام بخاری اور جابر الجعفی کے شیخ ہیں۔ اور ابو عازب مسلم بن عمرو یا مسلم بن عراک ہیں اور نعمان سے مراد حضرت النعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما ہیں۔

امام ابوداؤد نے اور الطیالسی نے اس حدیث کی ان الفاظ سے روایت کی ہے "لا قود الا بحدیدۃ" یعنی قصاص صرف لوہے کے ہتھیار سے لیا جائے۔ اور فقہاء احناف نے اس باب کی حدیث کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے جیسا کہ مثلہ کرنا منسوخ ہو گیا جو کہ رسول اللہ ﷺ نے عرنیین کے ساتھ کیا تھا، سو اس طرح بغیر تلوار کے قتل کرنا بھی منسوخ ہو گیا۔

(عمدۃ القاری ج ۲۳ ص ۵۸)

"اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا": یعنی ہم نے مقتول کے ولی کے لیے سلطان مقرر فرما دیا ہے جو اس کی مدد کرے گا اور اس کے حق کے ساتھ انصاف کرے گا۔ (سنن بیہقی ج ۸ ص ۲۵)

مجاہد نے کہا کہ مقتول کی مدد کی ہوئی ہے۔ یعنی اللہ عزوجل نے قاتل کے اوپر مقتول کے ولی کو مسلط فرما دیا ہے اور اس کو یہ اختیار دیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو مقتول کو قتل کر دے اور چاہے تو اس سے دیت لے لے اور چاہے تو اس کو معاف کر دے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی نصرت ہے، اس لیے وہ منصور ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور عمدہ طریقہ کے سوا یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ حتیٰ کہ وہ یتیم اپنی جوانی کو پہنچ جائے، اور عہد پورا کیا کرو بے شک عہد کے متعلق سوال فرمایا جائے گا O" (بنی اسرائیل: ۳۴)

"وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ": یعنی تم عمدہ طریقہ کے سوا یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ اور ایسا نہ کرو کہ یتیم کے جوان ہونے سے پہلے اس کا مال جلد از جلد کھا لو۔ قتادہ بیان کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: "وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ" تو صحابہ کرام پر بہت سخت گزری، تو وہ یتیم کے مال کے کھانے میں شریک نہیں ہوتے تھے، جب اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: "وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (البقرۃ: ۲۲۰)" (اور (اے رسول اکرم!) لوگ آپ سے یتیموں کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ کہیے: ان کے اموال میں مصلحت سے کام لینا بہتر ہے، اگر تم ان کے اموال کو اپنے اموال کے ساتھ ملا لو تو وہ تمہارے (دینی) بھائی ہی ہیں، اور اللہ اُن کے اموال میں بے محل خرچ کرنے والوں کو اُن سے جدا جانتے ہیں جو اُن کے اموال میں مصلحت سے کام لیتے ہیں، اور اگر اللہ چاہتے تو وہ ضرور تم کو مشکل میں ڈال دیتے، بے شک اللہ بہت غالب بے حد حکمت والے ہیں)۔ "وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا": یعنی مسلمان جو اہل حرب کے ساتھ صلح کرنے کا معاہدہ کرتے تھے اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ خرید و فروخت میں اور کسی چیز کو کرائے پر دینے میں جو عقد کرتے تھے تو اس کے متعلق حکم فرمایا کہ جو تم نے عہد یا عقد کیا ہے اس کو پورا کرو۔ اور اگر کسی نے عہد کرنے کے بعد اس کو توڑ دیا تو اس سے اس کے متعلق پوچھا جائے گا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور جب تم ناپ کر دو تو پوری طرح ناپ کر دو اور درست ترازو کے ساتھ وزن کیا

کرو، یہ انجام کے اعتبار سے بہت بہتر ہے O" (بنی اسرائیل:۳۵)

"وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَ زِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ": مجاہد نے بیان کیا کہ "القسطاس" کے معنی رومی زبان میں عدل کرنا ہے۔ (تفسیر مجاہد ص:۳۳۶، تفسیر سفیان ص ۱۷۳، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۰ ص ۴۷۱-۴۷۲)

اور دوسروں نے کہا "القسطاس" کے معنی ہیں ترازو خواہ چھوٹی ہو یا بڑی ہو۔ اور یہاں پر دو لغتیں ہیں: "القِسطاس" قاف کے زیر کے ساتھ اور "القُسطاس" قاف پر پیش کے ساتھ، جیسے القِر طاس اور القُر طاس ہے۔ اور عام قراء اہل کوفہ اس لفظ کو القِر طاس (قاف کے زیر کے ساتھ) پڑھتے ہیں اور قاری جس طریقہ سے بھی پڑھے تو وہ درست ہے کیونکہ یہ دونوں قراءتیں مشہور ہیں۔ "ذٰلِكَ خَيْرٌ": یعنی تمہارا پورا پورا تول کر دینا یا پورا پورا ناپ کر دینا یہ تمہارے لیے اس میں کمی کرنے سے بہتر ہے۔ "وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا": اور اس کا انجام تمہارے لیے بہتر ہے، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ تمہارے اس فعل سے راضی ہوں گے اور تمہیں اس کی اچھی جزا عطا فرمائیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ اے غلام رکھنے والو! تم دو چیزوں کے والی بنائے گئے ہو تم سے پہلے ان میں ہلاک ہو گئے ایک مکیال ہے یعنی ناپنے کا آلہ اور ایک میزان ہے یعنی ترازو۔ اور یہ بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص کسی حرام کے ارتکاب پر قادر ہو، پھر صرف اللہ عزوجل کے خوف سے اس حرام کو ترک کر دے تو اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں اس سے بہتر عوض عطا فرماتے ہیں۔ قتادہ نے کہا: "وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا" کا معنی ہے کہ اس کو آخرت میں اچھا اجر ملے گا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور (اے مخاطب!) اس چیز کے درپے نہ ہو جس کا تجھے علم نہیں ہے، بے شک کان اور آنکھ اور دل، ان میں سے ہر ایک کے متعلق قیامت میں سوال فرمایا جائے گا O" (بنی اسرائیل:۳۶)

"وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ": قتادہ نے بیان کیا کہ تم یہ نہ کہو کہ میں نے دیکھا ہے، حالانکہ تم نے نہ دیکھا ہو۔ اور یہ نہ کہو کہ میں نے سنا ہے، حالانکہ تم نے نہ سنا ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ ان تمام امور کے متعلق تم سے سوال فرمائیں گے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے "وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ" کی تفسیر میں کہا: جس شخص کے متعلق تمہیں علم نہ ہو اس شخص کے متعلق تم بہتان نہ باندھو۔ "اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا": اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ عزوجل ان اعضاء سے سوال فرمائیں گے جو اس کے صاحب نے کہا ہوگا۔ اور اس کے اعضاء حق بات کی شہادت دیں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور تم زمین میں اکڑ اکڑ کر نہ چلو، بے شک نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ تم لمبائی میں پہاڑوں کے برابر پہنچ سکتے ہو O" (بنی اسرائیل:۳۷)

"وَ لَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَ لَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا": یعنی تم زمین میں تکبر کے ساتھ اکڑ کر نہ چلو، کیونکہ تم زمین کو پھاڑ نہیں سکتے۔ اور نہ تم اپنے فخر اور تکبر سے لمبائی میں پہاڑوں کے برابر ہو سکتے ہو۔ اور اللہ عزوجل نے اپنے بندوں کو تکبر کرنے سے اور فخر کرنے سے منع فرمایا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "ان میں سے ہر صفت آپ کے رب کے نزدیک بری ہے سخت ناپسندیدہ ہے O" (بنی اسرائیل:۳۸)

"کُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَیِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا": ان میں سے ہر کام آپ کے رب کے نزدیک برا ہے اور ناپسندیدہ ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "(اے رسولِ اکرم!) یہ وہ ہدایات ہیں جو آپ کے رب نے حکمت سے آپ کی طرف وحی فرمائی ہیں، اور (اے مخاطب!) تم اللہ کے ساتھ دوسرا مستحقِ عبادت نہ بناؤ، ورنہ تمہیں جہنم میں ملامت زدہ دھتکارا ہوا جھونک دیا جائے گاO" (بنی اسرائیل:۳۹)

"ذٰلِكَ مِمَّاۤ اَوْحٰۤى اِلَیْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ": یعنی اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم)، ہم نے آپ کو ان اخلاقِ جمیلہ کا حکم فرمایا ہے اور آپ کو اخلاقِ قبیحہ سے منع فرمایا ہے، یہ ہدایات وہ ہیں جو آپ کے رب نے آپ پر حکمت کے ساتھ وحی فرمائی ہیں۔ "وَ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِیْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا": یعنی آپ اپنی عبادت میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہ بنائیں اور خالص اللہ عزوجل کی عبادت کریں۔ اس آیت میں تعریض ہے، خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور سنایا دوسرے لوگوں کو ہے کہ اگر تم نے اپنی عبادت میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک بنایا تو تم کو جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "(اے مشرکو!) کیا تمہارے رب نے تم کو بیٹوں کے ساتھ خاص فرما لیا ہے اور (اپنے لیے) فرشتوں میں سے بیٹیاں بنالی ہیں، بے شک تم بہت سنگین بات کہتے ہوO" (بنی اسرائیل:۴۰)

"اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِیْنَ وَ اتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓىٕكَةِ اِنَاثًاؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِیْمًا": مشرکین عرب کہتے تھے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں، اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں: اے لوگو! کیا اللہ نے تم کو بیٹوں کے ساتھ خاص فرمالیا ہے اور اپنے لیے فرشتوں میں سے بیٹیاں بنالی ہیں، حالانکہ تم خود اپنے لیے بیٹیوں پر راضی نہیں ہوتے بلکہ تم بیٹیوں کو زندہ درگور کردیتے ہو اور ان کو قتل کردیتے ہو، تو تم نے اللہ تعالیٰ کے لیے اس چیز کو بنایا ہے جس کو تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے اور تم بہت سنگین بات کہتے ہو۔ اور قتادہ نے کہا کہ یہود کہتے تھے کہ فرشتے جنات کی بیٹیاں ہیں۔

(تفسیر الطبری، ج ۱۳ ص ۵۸۲۔۶۰۲، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۲۴ھ، وتفاسیر اخری)

وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِیَذَّكَّرُوْاؕ وَ مَا یَزِیْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴿۴۱﴾

اور ہم نے اس قرآن میں مختلف طریقوں سے خطاب فرمایا ہے تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں، اور اس طریقہ نے ان میں متنفر ہوکر بھاگنے کے سوا اور کوئی اضافہ نہیں کیاO

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا یَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِی الْعَرْشِ سَبِیْلًا ﴿۴۲﴾

(اے رسولِ اکرم!) آپ کہیے: اگر اللہ کے ساتھ (بالفرض) دیگر معبود بھی ہوتے جس طرح یہ مشرکین کہتے ہیں تو وہ معبودان باطلہ عرش والے تک پہنچنے کا ضرور کوئی راستہ نکالتےO

سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا یَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِیْرًا ﴿۴۳﴾

جو کچھ یہ لوگ (اللہ کے متعلق) کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس سے پاک اور بہت بلند و برتر ہیں O

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۴﴾

ساتوں آسمان اور زمینیں اور جو کچھ اُن میں ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں، اور ہر چیز اللہ کی حمد کے ساتھ ان کی تسبیح کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو، بے شک وہ بہت بردبار، بہت بخشنے والے ہیں O

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿۴۵﴾

اور (اے رسولِ اکرم!) جب آپ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں تو ہم آپ کے اور منکرینِ آخرت کے درمیان ایک چھپا ہوا پردہ حائل فرما دیتے ہیں O

وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ﴿۴۶﴾

اور ہم نے ان کے دلوں پر غلاف ڈال دیے ہیں تاکہ وہ قرآن کو سمجھ نہ سکیں اور ان کے کانوں میں ثقل پیدا فرما دیا، اور جب آپ قرآن میں اپنے ربِ واحد کا ذکر کرتے ہیں تو یہ مشرکین اپنی پیٹھوں کو موڑتے ہوئے بھاگ جاتے ہیں O

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖۤ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ وَاِذْ هُمْ نَجْوٰۤى اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۴۷﴾

ہم خوب جانتے ہیں جب یہ مشرکین آپ کی باتیں کان لگا کر سنتے ہیں تو حقیقت میں یہ کیا سنتے ہیں، اور جب وہ ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے ہیں تو ظالم لوگ کہتے ہیں: تم صرف ایک سحر زدہ شخص کی پیروی کر رہے ہو O

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۴۸﴾

(اے رسولِ اکرم!) آپ دیکھئے کہ ان مشرکین نے آپ کے لیے کیسی مثالیں گھڑی ہیں سو یہ (اس طرح) گمراہ ہو گئے کہ اب ہدایت کا کوئی راستہ نہیں پا سکتے O

وَقَالُوْۤا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۴۹﴾

اور ان مشرکین نے کہا: کیا جب ہم ہڈیاں اور مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہمیں از سر نو پیدا کر کے اٹھایا جائے گا؟ O

قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ۝۵۰

(اے رسولِ اکرم!) آپ کہیے: تم خواہ پتھر بن جاؤ یا لوہا بن جاؤ (تم کو ضرور دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا) O

اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ۭ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ۝۵۱

یا ایسی چیز بن جاؤ جس کا زندہ ہونا تمہارے نزدیک بہت مشکل ہو، پس وہ عنقریب کہیں گے کہ ہمیں دوبارہ کون پیدا کرے گا؟ آپ کہیے: تمہیں وہی دوبارہ پیدا فرمائیں گے جنہوں نے تم کو پہلی بار پیدا فرمایا تھا، پس وہ آپ کی طرف دیکھ کر (استہزاء سے) سر ہلائیں گے اور کہیں گے: ایسا کب ہوگا؟ آپ کہیے کہ شاید وہ وقت قریب آ پہنچا ہے O

يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۵۲

جس دن اللہ تمہیں بلائیں گے پس تم (بے ساختہ) ان کی حمد کرتے ہوئے آ جاؤ گے اور تم یہ گمان کرو گے کہ تم دنیا میں صرف تھوڑا عرصہ رہے ہو O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ہم نے اس قرآن میں مختلف طریقوں سے خطاب فرمایا ہے تا کہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں، اور اس طریقہ نے ان میں متنفر ہو کر بھاگنے کے سوا اور کوئی اضافہ نہیں کیا O" (بنی اسرائیل: ۴۱)

اللہ تعالیٰ کا مختلف طریقوں سے وحی نازل فرمانا

علامہ ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ، بنی اسرائیل: ۴۱ تا ۵۲ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ": یعنی ہم نے اس قرآن میں عبرت انگیز واقعات بیان فرمائے ہیں اور پہلی قوموں کی مثالیں بیان فرمائی ہیں، اور احکام شرعیہ اور ان کے دلائل بیان فرمائے ہیں۔ "لِيَذَّكَّرُوْا" تا کہ وہ ان سے نصیحت حاصل کریں۔

"وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا": اور ہمارا مختلف طریقوں سے تمہیں خطاب فرمانا صرف تمہاری نفرت میں اضافہ کا سبب ہوا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "(اے رسولِ اکرم!) آپ کہیے: اگر اللہ کے ساتھ (بالفرض) دیگر معبود بھی ہوتے جس طرح یہ مشرکین کہتے ہیں تو وہ معبودانِ باطلہ عرش والے تک پہنچنے کا ضرور کوئی راستہ نکالتے O جو کچھ یہ لوگ (اللہ کے متعلق) کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس سے بہت بلند، برتر ہیں O" (بنی اسرائیل: ۴۲۔ ۴۳)

"قُلْ": اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان مشرکین سے کہیے۔ "لَوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ": اگر اللہ کے ساتھ دیگر معبود ہوتے جیسا کہ یہ مشرکین کہتے ہیں "اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا" تو وہ معبود ضرور عرش والے پر غلبہ پانے

کے لیے کوئی راستہ نکالتے، تا کہ اللہ تعالیٰ کی سلطنت کو زائل کر دیں جیسا کہ دنیا کے بادشاہ ایک دوسرے پر غلبہ پانے کے لیے اس طرح کرتے ہیں۔ اور اس کی تفسیر میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ضرور عرش والے کے قریب پہنچنے کا کوئی راستہ نکالتے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی تنزیہ فرمائی اور فرمایا: ''سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا'' یعنی جو کچھ یہ لوگ (اللہ کے متعلق) کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس سے بہت بلند، برتر ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''ساتوں آسمان اور زمینیں اور جو کچھ اُن میں ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں، اور ہر چیز اللہ کی حمد کے ساتھ ان کی تسبیح کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو، بے شک وہ بہت بردبار، بہت بخشنے والے ہیں O'' (بنی اسرائیل: ۴۴)

حقائق کائنات کا تسبیح کرنا

''تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ'':

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہر زندہ چیز اللہ تعالیٰ کی حمد کے ساتھ ان کی تسبیح کرتی ہے اور قتادہ نے کہا: یعنی حیوانات اور اشجار وغیرہ۔ عکرمہ نے کہا: درخت بھی ان کی تسبیح کرتے ہیں اور ستون بھی ان کی تسبیح کرتے ہیں۔ اور مقدام بن معدیکرب نے کہا: مٹی بھی ان کی تسبیح کرتی ہے جب تک کہ وہ گیلی نہ ہو، اور جب مٹی گیلی ہو جائے تو وہ تسبیح کو ترک کر دیتی ہے۔ اور ٹھیکری بھی اس کی تسبیح کرتی ہے جب تک کہ اس کو اس کی جگہ سے اٹھا نہ لیا جائے، اور جب اس اٹھا لیا جائے تو وہ تسبیح کو ترک کر دیتی ہیں۔ اور پتے بھی ان کی تسبیح کرتے ہیں جب تک وہ درخت پر ہوں، اور جب وہ درخت سے گر جائیں تو وہ تسبیح کو ترک کر دیتے ہیں۔ اور نیا کپڑا بھی ان کی تسبیح کرتا ہے جب تک میلا نہ ہو جائے، اور جب کپڑا میلا ہو جائے تو وہ تسبیح کو ترک کر دیتا ہے۔ اور پانی جب تک جاری ہو وہ ان کی تسبیح کرتا ہے اور پانی جب ٹھہر جائے تو وہ ان کی تسبیح کو ترک کر دیتا ہے۔ اور وحشی جانور جب وہ چلاتے ہیں تو ان کی تسبیح کرتے ہیں اور جب وہ پرسکون ہو جاتے ہیں تو وہ ان کی تسبیح کو ترک کر دیتے ہیں۔

بعض صحابہ کا طعام کی تسبیح کو سننا

اور ابراہیم النخعی نے کہا: جمادات میں سے ہر چیز ان کی تسبیح کرتی ہے حتیٰ کہ دروازہ کی چوکھٹ اور چھت بھی ان کی تسبیح کرتی ہے۔ اور مجاہد نے کہا: ہر چیز ان کی تسبیح کرتی ہے خواہ زندہ ہو یا مردہ ہو۔ اور ان کی تسبیح ہے ''سبحان اللہ وبحمدہٖ''۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کو برکت قرار دیتے تھے اور تم اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کو خوف کا ذریعہ قرار دیتے ہو۔ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھے، پس پانی کم ہو گیا، آپ نے فرمایا: فاضل پانی لاؤ۔ تو صحابہ کسی برتن میں تھوڑا سا پانی لے کر آئے، آپ نے اپنا ہاتھ اس برتن میں داخل کیا پھر فرمایا: اس مبارک پاک کرنے والے پانی اور برکت کی طرف آؤ، پس میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں کے درمیان سے پانی پھوٹ رہا تھا۔ اور جب کھانا کھایا جاتا تھا تو ہم کھانے کی تسبیح کو سنتے تھے۔

(صحیح البخاری: ۳۵۷۹، سنن ترمذی: ۳۶۳۳، شرح السنۃ للبغوی: ۳۶۰۷، دلائل النبوۃ لابی نعیم: ۳۱۲، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۱ ص ۴۷۴، مجمع ابن

حبان: ۶۵۴۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ کی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ پر برتری

میں کہتا ہوں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا کہ انہوں نے پتھر پر لاٹھی ماری تو اس سے پانی نکل آیا، یہ بھی بہت حیرت انگیز واقعہ ہے لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں کے درمیان سے پانی چشمہ کی طرح پھوٹ پڑا، کیونکہ پتھر اور زمین کی گہرائی میں پانی ہوتا ہے اور اگر اس گہرائی تک پتھر یا زمین کو کھودا جائے تو پانی نکل آئے گا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے اتنی گہرائی تک کھودے بغیر پتھر سے پانی نکال لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال اس سے بڑھ کر ہے، کیونکہ انگلیوں میں عادتاً پانی ہوتا ہی نہیں، سو آپ نے وہاں سے پانی جاری فرمایا جہاں پر عادتاً پانی نہیں ہوتا۔

کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا تخلیق ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے

نیز اس حدیث میں مذکور ہے کہ آپ نے پانی منگوایا، پھر اس میں اپنا ہاتھ رکھا تو آپ کی انگلیوں کے درمیان سے پانی پھوٹ پڑا، اس میں غور طلب بات یہ ہے کہ آپ نے ایسا برتن منگوایا جس میں پہلے سے پانی موجود تھا، ایسا کیوں نہ ہوا کہ آپ کسی خالی برتن میں اپنا ہاتھ رکھتے اور پھر آپ کی انگلیوں سے پانی جاری ہو جاتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو لازم آتا کہ آپ عدم سے پانی کو وجود میں لے آئے اور کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا یہ اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے اور اسی کو تخلیق کہتے ہیں، تو تھوڑے سے پانی کو زیادہ کر دینا یہ برکت ہے اور اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام میں برکت رکھی ہے۔ (سعیدی غفرلہ)

بعض اہل المعانی نے کہا ہے کہ عقلاء کے سوا آسمانوں، زمینوں، جمادات اور حیوانات کی تسبیح اس طرح ہے کہ ہر چیز اپنی لطیف ترکیب اور عجیب ہیئت کے ساتھ اپنے خالق پر دلالت کرتی ہے اور یہ گویا اُن کی تسبیح ہے۔ اور یہ جو ہم نے پہلے لکھا تھا کہ ہر چیز "سبحان اللہ وبحمدہٖ" کہتی ہے تو یہ متقدمین سے منقول ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے جمادات میں اس طرح علم رکھا ہے کہ جس پر جمادات کے علاوہ اور کوئی واقف نہیں ہے، پس اس علم کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا جائے۔

"وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ": یعنی تم اسی تسبیح کو جانتے ہو جو تمہاری لغت اور تمہاری زبانوں سے کی جائے اور جمادات کی تسبیح کو تم نہیں جانتے۔

"اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا": بے شک وہ بہت بردبار، بہت بخشنے والے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور (اے رسولِ اکرم!) جب آپ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں تو ہم آپ کے اور منکرین آخرت کے درمیان ایک چھپا ہوا پردہ حائل فرما دیتے ہیں O" (بنی اسرائیل: ۴۵)

"وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا":

یعنی ایسا حجاب ڈال دیتے ہیں جو اُن کے دلوں کو قرآن کے سمجھنے اور اس سے نفع حاصل کرنے کو ڈھانپ لیتا ہے۔ اور اس کی تفسیر میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ حجاب لوگوں کی آنکھوں سے چھپا ہوا ہوتا ہے تم اس کو نہیں دیکھتے۔ پس اس کی تفسیر یہ بھی کی ہے کہ وہ ظاہری آنکھوں سے حجاب ہوتا ہے۔

حجاب مستور کی ایک نظیر

جس طرح رسول اللہ ﷺ کے قرآن مجید کی تلاوت کرنے اور کفار کے درمیان حجاب مستور ہے اسی کی نظیر یہ اثر ہے کہ ابولہب کی بیوی بھاری پتھر لے کر رسول اللہ ﷺ کے سر پر مارنے کے لیے آئی مگر وہ آپ کو دیکھ نہیں سکی، کیونکہ آپ کے اور اس کے درمیان حجاب مستور تھا۔

سعید بن جبیر نے کہا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: "تَبَّتْ يَدَا اَبِيْ لَهَبٍ۔ (اللھب:۱)" (ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے)۔ تو ابولہب کی بیوی آئی اور اس کے پاس ایک پتھر تھا اور نبی ﷺ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے، ابولہب کی بیوی نے آپ کو نہیں دیکھا، تو اس نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا: تمہارے پیغمبر کہاں ہیں مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ انہوں نے میری ہجو کی ہے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کی قسم! وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتے اور نہ شعر پڑھتے ہیں اور نہ شعر بناتے ہیں، ابولہب کی بیوی لوٹ گئی اور وہ یہ کہہ رہی تھی کہ میں یہ پتھر لے کر آئی تھی تاکہ ان کا سر توڑ دوں، پس حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس نے آپ کو نہیں دیکھا؟ آپ نے فرمایا: نہیں! ایک فرشتہ میرے اور اس کے درمیان مستقل حائل رہا اور اس نے مجھ کو چھپائے رکھا۔

(مسند ابو یعلیٰ:۲۵، صحیح ابن حبان:۶۵۱۱، مسند البزار:۲۲۹۴، مجمع الزوائد للہیثمی:۱۱۵۲۹، المستدرک للحاکم ج ۲ ص ۵۲۶، مسند الحمیدی:۳۲۳، الوسیط ج ۳ ص ۱۱۰)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ہم نے ان کے دلوں پر غلاف ڈال دیے ہیں تاکہ وہ قرآن کو سمجھ نہ سکیں اور ان کے کانوں میں ثقل پیدا فرما دیا، اور جب آپ قرآن میں اپنے رب واحد کا ذکر کرتے ہیں تو یہ مشرکین اپنی پیٹھوں کو موڑتے ہوئے بھاگ جاتے ہیں O" (بنی اسرائیل:۴۶)

"وَّجَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً": اغطیتہ۔ یعنی پردے۔ "اَنْ يَّفْقَهُوْهُ": یعنی اس کو ناپسند کرتے ہوئے کہ وہ قرآن مجید کو سمجھیں۔ دوسرا قول یہ ہے تاکہ وہ قرآن مجید کو نہ سمجھ سکیں۔

"وَفِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا": اور ان کے کانوں میں ثقل ہے تاکہ وہ قرآن مجید کی تلاوت کو نہ سن سکیں۔

"وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ": یعنی جب آپ قرآن مجید میں لا الٰہ الا اللہ کو پڑھتے ہیں اور اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ "وَلَّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا": تو یہ مشرکین اپنی پیٹھوں کو موڑتے ہوئے بھاگ جاتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "ہم خوب جانتے ہیں جب یہ مشرکین آپ کی باتیں کان لگا کر سنتے ہیں تو حقیقت میں یہ کیا سنتے ہیں، اور جب وہ ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے ہیں تو ظالم لوگ کہتے ہیں: تم صرف ایک سحر زدہ شخص کی پیروی کر رہے ہو O" (بنی اسرائیل:۴۷)

"نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖۤ": اس کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ کس چیز کے سننے کو طلب کرتے ہیں۔

"اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ": جس وقت آپ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔

"وَاِذْ هُمْ نَجْوٰۤى": اس وقت یہ آپ کے معاملہ میں آپس میں سرگوشی کرتے ہیں۔ پس ان میں سے بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ

دیوانے ہیں اور بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ کاہن ہیں اور بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ جادوگر ہیں اور بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہیں۔

"اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ": یعنی الولید بن المغیرہ اور اس کے اصحاب کہتے ہیں۔

"اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا": کہ تم لوگ صرف سحر زدہ شخص کی پیروی کرتے ہو۔

مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہے "مخدوعا" یعنی جس شخص کو دھوکا دیا ہوا ہے، دوسرا قول ہے: جس شخص کو حق سے پھیرا ہوا ہے۔

اور ابوعبیدہ نے کہا: ایسا مرد جو جادو کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ کہنا کہ آپ پر جادو کیا گیا ہے، یہ کفار کا عقیدہ تھا، اس لیے صحیح یہ ہے کہ آپ پر جادو نہیں کیا گیا، اور جن بعض روایات میں یہ ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا گیا تھا، اس کے متعلق ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ ان محدثین کا تسامح ہے، کیونکہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا جاتا تو جادوگر کامیاب ہو جاتے اور قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴿۶۹﴾ (طٰہٰ: ۶۹)" (اور جادوگر کہیں سے بھی آئے وہ کامیاب نہیں ہو سکتا)۔ اس پر تحقیق کے لیے النحل: ۹۰ کا مطالعہ کریں۔ (سعیدی غفرلہ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "(اے رسولِ اکرم!) آپ دیکھئے کہ ان مشرکین نے آپ کے لیے کیسی مثالیں گھڑی ہیں سو یہ (اس طرح) گمراہ ہو گئے کہ اب ہدایت کا کوئی راستہ نہیں پا سکتے O" (بنی اسرائیل: ۴۸)

"اُنْظُرْ": اے محمد! آپ دیکھیے۔ "كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ": آپ کے متعلق یہ مشرکین کیسی مثالیں گھڑتے ہیں، سو یہ آپ کو شاعر اور ساحر اور کاہن اور مجنون کہتے ہیں۔ "فَضَلُّوْا": پس یہ صراطِ مستقیم سے منحرف ہو گئے۔

"فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا": پس یہ صراطِ مستقیم تک پہنچنے کی طاقت نہیں رکھتے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اِن مشرکین نے کہا: کیا جب ہم ہڈیاں اور مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہمیں از سرِ نو پیدا کر کے اٹھایا جائے گا؟ O" (بنی اسرائیل: ۴۹)

"وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا": اور یہ کہتے ہیں کہ جب ہم مرنے کے بعد ہڈیاں ہو جائیں گے یا مٹی ہو جائیں گے۔ رفات کا معنی ہے: ہر وہ چیز جو ٹوٹ پھوٹ کر بوسیدہ ہو جائے۔ "ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا": تو کیا ہمیں از سرِ نو پیدا کر کے اٹھایا جائے گا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "(اے رسولِ اکرم!) آپ کہیے: تم خواہ پتھر بن جاؤ یا لوہا بن جاؤ (تم کو ضرور دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا) O" (بنی اسرائیل: ۵۰)

"قُلْ": اے محمد! آپ ان سے کہیے: "كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا": تم شدت اور قوت میں خواہ پتھر بن جاؤ یا لوہا بن جاؤ۔ اس آیت میں ان کو پتھر یا لوہا بننے کا حکم نہیں فرمایا بلکہ ان کے عجز کو ظاہر کرنے کے لیے فرمایا ہے کہ تمہارے دلوں میں پتھر یا لوہا بہت قوی اور مضبوط ہوتا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "یا ایسی چیز بن جاؤ جس کا زندہ ہونا تمہارے نزدیک بہت مشکل ہو، پس وہ عنقریب کہیں گے کہ ہمیں دوبارہ کون پیدا کرے گا، آپ کہیے: تمہیں وہی دوبارہ پیدا فرمائیں گے جنہوں نے تم کو پہلی بار پیدا فرمایا تھا، پس وہ آپ کی طرف دیکھ کر (استہزاء سے) سر ہلائیں گے اور کہیں گے: ایسا کب ہوگا؟ آپ کہیے کہ شاید وہ وقت قریب آپہنچا ہے O" (بنی اسرائیل: ۵۱)

"اَوْ خَلْقًا مِّمَّا یَكْبُرُ فِیْ صُدُوْرِكُمْ": یا ایسی چیز بن جاؤ جس کا زندہ ہونا تمہارے نزدیک بہت مشکل ہو۔

ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد آسمان، زمین اور پہاڑ ہیں۔ اور مجاہد اور عکرمہ نے کہا: اکثر مفسرین اس پر متفق ہیں کہ اس سے مراد موت ہے، کیونکہ بنو آدم کے دل میں موت سے بڑی کوئی چیز نہیں ہے۔ یعنی اگر تم بعینہٖ موت بن جاؤ تب بھی ہم تم کو ضرور ماریں گے اور ضرور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائیں گے۔ "فَسَیَقُوْلُوْنَ مَنْ یُّعِیْدُنَا": تو وہ یہ ضرور کہیں گے کہ موت کے بعد ہمیں دوبارہ کون زندہ کرے گا۔ "قُلِ الَّذِیْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ": آپ ان سے کہیے کہ جس ذات نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا فرمایا تھا، وہی ذات تمہیں دوبارہ پیدا فرمائے گی۔ اور جو ایک بار زندہ فرمانے پر قادر ہیں وہ دوبارہ زندہ فرمانے پر بھی قادر ہیں۔

"فَسَیُنْغِضُوْنَ اِلَیْكَ رُءُوْسَهُمْ": جب آپ اس طرح کہیں گے تو یہ استہزاء کرتے ہوئے اپنے سروں کو ہلائیں گے۔

"وَ یَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ": اور یہ کہیں گے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا یا قیامت کا واقع ہونا کب ہوگا۔ "قُلْ عَسٰۤى اَنْ یَّكُوْنَ قَرِیْبًا": آپ کہیے کہ وہ عنقریب واقع ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں عسیٰ کا معنی واجب ہے، اس کی نظیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَ مَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِیْبًا" (الاحزاب: ۶۳) "(اے مخاطب! تجھے کون سی چیز قیامت کی خبر دے گی؟ یقیناً قیامت قریب ہے O)۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "جس دن اللہ تمہیں بلائیں گے پس تم (بے ساختہ) ان کی حمد کرتے ہوئے آجاؤ گے اور تم یہ گمان کرو گے کہ تم دنیا میں صرف تھوڑا عرصہ رہے ہو O" (بنی اسرائیل: ۵۲)

"یَوْمَ یَدْعُوْكُمْ": جس دن اللہ عزوجل تمہیں تمہاری قبروں سے میدان حشر کی طرف لے جانے کے لیے اٹھائیں گے۔

"فَتَسْتَجِیْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تم اللہ تعالیٰ کے حکم سے جاؤ گے۔ اور قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہوئے جاؤ گے۔ اور ایک تفسیر یہ ہے کہ تم یہ اقرار کرتے ہوئے جاؤ گے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی ان کو پیدا فرمایا ہے اور وہی ان کو قبروں سے اٹھانے والے ہیں۔ اور اللہ عزوجل کی حمد و ثنا کریں گے اور اس وقت ان کی حمد و ثنا انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گی۔

اور ایک تفسیر یہ ہے کہ اس آیت میں مومنین کے ساتھ خطاب ہے، یعنی ان کو جب قبروں سے اٹھایا جائے گا تو وہ اللہ عزوجل کی حمد کرتے ہوئے اٹھیں گے۔ "وَ تَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا": اور تم یہ گمان کرو گے کہ تم دنیا میں یا قبروں میں صرف تھوڑا عرصہ رہے تھے، کیونکہ انسان اگر دنیا میں ہزاروں سال بھی رہے یا قبروں میں ہزاروں سال بھی رہے تو قیامت کی مدت اور دوام کے مقابلہ میں یہ قلیل ہے۔ قتادہ نے کہا: وہ قیامت کے مقابلہ میں دنیا کی مدت کو بہت حقیر اور کم قرار دیں گے۔

(معالم التنزیل، ج ۳ ص ۱۳۵-۱۳۸، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ﴿۵۳﴾

اور (اے رسول اکرم!) آپ میرے بندوں سے کہیں کہ وہ (لوگوں سے) وہی بات کہا کریں جو سب سے بہتر ہو، بے شک شیطان لوگوں کے درمیان فساد ڈال دیتا ہے، بے شک شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے ○

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْؕ اِنْ یَّشَاْ یَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ یَّشَاْ یُعَذِّبْكُمْؕ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ وَكِیْلًا ﴿۵۴﴾

تمہارے رب تمہیں خوب جاننے والے ہیں، اگر وہ چاہیں تو تم پر رحم فرمائیں یا اگر وہ چاہیں تو تم کو عذاب میں مبتلا فرما دیں، اور ہم نے آپ کو ان کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا ○

وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِؕ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِیّٖنَ عَلٰی بَعْضٍ وَّاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۵۵﴾

اور آپ کے رب آسمانوں اور زمینوں والوں کو خوب جاننے والے ہیں، اور بے شک ہم نے بعض نبیوں کو ایک دوسرے پر فضیلت عطا فرمائی ہے اور ہم نے داؤد کو زبور عطا فرمائی ہے ○

قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا یَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِیْلًا ﴿۵۶﴾

(اے رسول اکرم!) آپ کہیے: اللہ کے سوا جن بتوں کے متعلق تمہارا زعم ہے (کہ وہ تمہارے کارساز ہیں) ان کو بلاؤ، پس وہ تم سے تمہاری تکلیف کو دور کر سکیں گے اور نہ اس تکلیف کو کسی اور طرف منتقل کر سکیں گے ○

اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّهِمُ الْوَسِیْلَةَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ وَیَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَیَخَافُوْنَ عَذَابَهٗؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ﴿۵۷﴾

جن نیک بندوں کی یہ کفار عبادت کرتے ہیں وہ خود اپنے رب کی طرف تقرب کا وسیلہ تلاش کرتے ہیں کہ کون سا وسیلہ اللہ کے زیادہ قریب ہے اور وہ اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور ان کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں، بے شک آپ کے رب کا عذاب اس کا مستحق ہے کہ اس سے ڈرا جائے ○

وَاِنْ مِّنْ قَرْیَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ یَوْمِ الْقِیٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِیْدًاؕ كَانَ ذٰلِكَ فِی الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ﴿۵۸﴾

اور ہم ہر بستی کو قیامت کے دن سے پہلے ہلاک کرنے والے ہیں یا اس کو سخت عذاب دینے والے ہیں، یہ لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے O

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰیٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ؕ وَاٰتَیْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ؕ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰیٰتِ اِلَّا تَخْوِیْفًا ﴿۵۹﴾

اور ہم نے کافروں کے مطلوبہ معجزات کو بھیجنے سے اسی لیے منع فرمایا تھا کہ پہلے لوگ ان مطلوبہ معجزات کی تکذیب کر چکے ہیں، اور ہم نے قومِ ثمود کو اونٹنی عطا فرمائی جو ان کی آنکھیں کھولنے والی تھی، سو انہوں نے اس اونٹنی پر ظلم کیا اور ہم اس قسم کے معجزات صرف لوگوں کو ڈرانے کے لیے بھیجتے ہیں O

وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْیَا الَّتِیْٓ اَرَیْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِی الْقُرْاٰنِ ؕ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا یَزِیْدُهُمْ اِلَّا طُغْیَانًا كَبِیْرًا ﴿۶۰﴾

اور جب ہم نے آپ سے فرمایا کہ بے شک آپ کے رب نے (اپنی قدرت سے) سب لوگوں کا احاطہ فرمایا ہوا ہے اور قدرت کی جو نشانیاں ہم نے آپ کو (شبِ معراج) دکھائی تھیں اور قرآن مجید میں (تھوہر کے) جس درخت پر لعنت فرمائی گئی ہے ان کو ہم نے صرف لوگوں کے لیے آزمائش بنایا تھا، اور ہم ان مشرکین کو ان نشانیوں سے اور تھوہر کے درخت سے ڈراتے ہیں، سو اس ڈرانے نے ان میں بہت بڑی سرکشی کا اضافہ کیا O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور (اے رسولِ اکرم!) آپ میرے بندوں سے کہیں کہ وہ (لوگوں سے) وہی بات کہا کریں جو سب سے بہتر ہو، بے شک شیطان لوگوں کے درمیان فساد ڈال دیتا ہے، بے شک شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے O'' (بنی اسرائیل: ۵۳)

عام لوگوں کے ساتھ نرم گفتگو کرنے کا حکم یا مسلمانوں کے ساتھ

علامہ ابوالفرج عبدالرحمن بن علی بن الجوزی الحنبلی المتوفی ۵۹۷ھ، بنی اسرائیل: ۵۳ تا ۶۰ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ'': اس آیت کے سببِ نزول میں دو قول ہیں:

(۱) ابوصالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ مشرکین مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو قول اور فعل سے ایذاء پہنچاتے تھے، سو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی شکایت کی تو یہ آیت نازل ہوئی۔

(۲) مقاتل نے کہا کہ کفار میں سے ایک مرد نے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی مذمت کی اور ان کو برا کہا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس

کو سزا دینے کا ارادہ کیا، تب یہ آیت نازل ہوئی۔

اس کا معنی یہ ہے کہ آپ اپنے مومن بندوں سے کہیے کہ ایسی بات کہا کریں جو بہت بہتر ہو۔ اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مسلمانوں کو یہ حکم فرمایا گیا ہے کہ وہ مشرکین کے ساتھ بھی اچھے طریقہ سے بات کیا کریں، یہ حکم مشرکین کے خلاف قتال کرنے کے حکم سے پہلے نازل ہوا تھا، پھر جب مشرکین کو قتل کرنے کا حکم نازل ہوا تو یہ آیت منسوخ ہو گئی۔ اور ابن جریر نے کہا ہے کہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ آپ میرے بندوں سے کہیے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بہتر طریقہ سے بات کیا کریں مثلاً یہ کہا کریں کہ اللہ تم پر رحم فرمائیں یا اللہ تمہاری مغفرت فرمائیں۔ ''اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ'': بے شک شیطان ان کے درمیان فساد ڈال دیتا ہے۔

''اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا'': اور شیطان مسلمانوں کا کھلا ہوا دشمن ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''تمہارے رب تمہیں خوب جاننے والے ہیں، اگر وہ چاہیں تو تم پر رحم فرمائیں یا اگر وہ چاہیں تو تم کو عذاب میں مبتلا فرما دیں، اور ہم نے آپ کو ان کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا O'' (بنی اسرائیل: ۵۴)

''رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ'': اس آیت میں کس سے خطاب ہے، اس کے متعلق دو قول ہیں:

(۱) ایک قول یہ ہے کہ اس کے مخاطب مومنین ہیں۔

''اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ'': اس کی تفسیر میں بھی دو قول ہیں:

(۱) ایک یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہیں گے تو تم کو اہل مکہ سے نجات عطا فرما دیں گے۔

''اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ'': یا اگر وہ چاہیں گے تو اہل مکہ کو تم پر مسلط فرما دیں گے۔

اور ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ اگر وہ چاہیں گے تو تمہاری توبہ قبول فرما کر تم پر رحم فرمائیں گے، یا اگر وہ چاہیں گے تو تم کو تمہارے گناہوں پر برقرار رکھیں گے۔

مشرکین سے خطاب کے دو محمل

(۲) مقاتل نے کہا اس آیت میں مشرکین سے خطاب ہے اور ان سے جو کلام فرمایا ہے اس کے دو محمل ہیں:

ایک یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہیں گے تو تم پر رحم فرمائیں گے اور تمہیں ایمان کی ہدایت عطا فرمائیں گے۔ یا اللہ تعالیٰ چاہیں گے تو تم کو عذاب میں مبتلا فرمائیں گے، پس تم کو کفر پر موت دیں گے۔ دوسرا محمل یہ ہے کہ جب مشرکین پر قحط کو مسلط فرمایا گیا تو انہوں نے دعا کی اے ہمارے رب! ہم سے اس عذاب کو دور فرما دیں، ہم ایمان لانے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ'' یعنی اللہ تعالیٰ خوب جاننے والے ہیں کہ تم میں سے کون ایمان لائے گا اور کون ایمان نہیں لائے گا۔ ''اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ'' اگر اللہ تعالیٰ چاہیں گے تو تم سے قحط کو دور فرما دیں گے۔ ''اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ'' اور اگر اللہ تعالیٰ چاہیں گے تو تم کو قحط میں مبتلا رکھیں گے۔

''وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا'': اس آیت کی تفسیر میں تین اقوال ہیں:

(۱) ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ ہم نے آپ کو ان پر کفیل اور ضامن بنا کر نہیں بھیجا۔

(۲) الفراء نے کہا: ہم نے آپ کو ان کا محافظ بنا کر نہیں بھیجا۔ (۳) ابن الانباری نے کہا: ہم نے آپ کو ان کی ہدایت کا کفیل بنا کر

نہیں بھیجا اور ان کے دلوں کی اصلاح پر قادر بنا کر نہیں بھیجا۔ بعض مفسرین نے کہا کہ یہ آیت مشرکین کو قتل کرنے کے حکم کی آیت سے منسوخ ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور آپ کے رب آسمانوں اور زمینوں والوں کو خوب جاننے والے ہیں، اور بے شک ہم نے بعض نبیوں کو ایک دوسرے پر فضیلت عطا فرمائی ہے اور ہم نے داؤد کو زبور عطا فرمائی ہے O'' (بنی اسرائیل:۵۵)

''وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ '': کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سب کے خالق ہیں، پس وہ جسے چاہتے ہیں ہدایت عطا فرماتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں گمراہی پر برقرار رکھتے ہیں۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بعض نبیوں کو دوسرے نبیوں پر فضیلت عطا فرمائی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور ان کے علم کا تقاضا ہے۔

''وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ '': پس اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنے دستِ قدرت سے پیدا فرمایا، حضرت ادریس علیہ السلام کو آسمانوں پر اٹھا لیا، اور حضرت نوح علیہ السلام کو ذرّیت عطا فرمائی، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنا کلیم بنایا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی پسندیدہ روح بنایا، اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو عظیم ملک عطا فرمایا، اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام آسمانوں پر بلندی عطا فرمائی، اور آپ کے تمام اگلے اور پچھلے بہ ظاہر خلافِ اولیٰ کاموں کی مغفرت فرمادی۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جن کو فضیلت عطا فرمائی یہ وہ انبیاء علیہم السلام ہیں جو صاحبِ کتاب ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس قول پر اپنے کلام کو ختم فرمایا ہے:

''وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا '': ابن قتیبہ نے کہا: الزبور، فعول کے وزن پر مفعول کے معنی میں ہے جیسے تم حلوب اور رکوب کہتے ہو، وہ محلوب اور مرکوب کے معنی میں ہے، اور اس کا معنی ہے: لکھی ہوئی کتاب۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''(اے رسولِ اکرم!) آپ کہیے: اللہ کے سوا جن بتوں کے متعلق تمہارا زعم ہے (کہ وہ تمہارے کارساز ہیں) ان کو بلاؤ، پس نہ وہ تم سے تمہاری تکلیف کو دور کرسکیں گے اور نہ اس تکلیف کو کسی اور طرف منتقل کرسکیں گے O'' (بنی اسرائیل:۵۶)

''قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ '': اس آیت کے سببِ نزول کے متعلق دو قول ہیں:

(۱) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ عرب کی ایک قوم بعض جنات کی عبادت کرتی تھی، پس وہ جنات اسلام لے آئے۔ اور جو عرب جنات کی عبادت کرتے تھے ان کو اس کا پتا نہیں چلا تب یہ آیت اور اس کے بعد کی آیتیں نازل ہوئیں۔

اپنے رب کی طرف وسیلہ تلاش کرنے والوں کا مصداق

ابو معمر از حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے اس آیت کی تفسیر میں کہا: ''جن لوگوں کی یہ (مشرکین) عبادت کرتے ہیں وہ خود ہی اپنے رب کی طرف قریب ترین وسیلہ تلاش کرتے ہیں (بنی اسرائیل:۵۷)''، انہوں نے بیان کیا کہ جنات میں سے ایک جماعت کی عبادت کی جاتی تھی، پس وہ اسلام لے آئے۔

(صحیح البخاری: ۴۷۱۴، ۴۷۱۵، صحیح مسلم: ۳۰۳۰، سنن نسائی: ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، تفسیر الطبری: ۷۶، ۲۲۳۸۰، ۲۲۳، تفسیر قرطبی: ۳۰۳۱)

(۲) مشرکین فرشتوں کی عبادت کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ یہ فرشتے اللہ کے پاس ہماری شفاعت کریں گے، پس جب وہ سات سال قحط میں مبتلاء کیے گئے تو ان سے کہا گیا: ''قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ'' اور اس کا معنی یہ ہے کہ اب تم ان کو بلاؤ جن کے متعلق تمہارا زعم تھا کہ وہ تمہارے معبود ہیں۔ ''فَلَا یَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِیْلًا'': پس وہ تم سے تمہاری تکلیف کو دور کرنے پر قادر نہیں ہوں گے اور نہ اس تکلیف کو کسی اور کی طرف منتقل کرنے پر قادر ہوں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''جن نیک بندوں کی یہ کفار عبادت کرتے ہیں وہ خود اپنے رب کی طرف تقرب کا وسیلہ تلاش کرتے ہیں کہ کون سا وسیلہ اللہ کے زیادہ قریب ہے اور وہ اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور ان کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں، بے شک آپ کے رب کا عذاب اس کا مستحق ہے کہ اس سے ڈرا جائے O''

(بنی اسرائیل: ۵۷)

''اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ'': جن کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے، ان کے متعلق تین اقوال ہیں:

(۱) یہ وہ جن ہیں جو اسلام لے آئے تھے (۲) اس سے مراد فرشتے ہیں (۳) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد حضرت مسیح اور حضرت عزیر علیہما السلام اور ملائکہ اور سورج اور چاند ہیں۔ اور ''یَدْعُوْنَ'' کے معنی میں بھی دو قول ہیں:

(۱) جن کو وہ خدا کہتے تھے اور یہ اکثرین کا قول ہے (۲) اس کا معنی ہے: وہ اللہ تعالیٰ سے وسیلہ کو طلب کرنے کے لیے گڑگڑا کر دعا کرتے ہیں۔

''یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّهِمُ الْوَسِیْلَةَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ'': (۱) زجاج نے کہا: اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی طرف وسیلہ کو تلاش کرتے تھے اور یہ دیکھتے تھے کہ کون سا وسیلہ اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہے تو اس کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں۔

(۲) اس آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف قریب ترین وسیلہ کو تلاش کرتے تھے، یعنی نیک اعمال کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتے تھے۔ ''وَیَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَیَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا'': اور وہ اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور ان کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں، بے شک آپ کے رب کا عذاب اس کا مستحق ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور ہم ہر بستی کو قیامت کے دن سے پہلے ہلاک کرنے والے ہیں یا اس کو سخت عذاب دینے والے ہیں، یہ لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے O'' (بنی اسرائیل: ۵۸)

''وَاِنْ مِّنْ قَرْیَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ یَوْمِ الْقِیٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِیْدًا'': اور نیک لوگوں کی بستی کی ہلاکت موت سے ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والی بستی کی ہلاکت عذاب سے ہوگی۔ ''كَانَ ذٰلِكَ فِی الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا'': کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے اور ''مَسْطُوْرًا'' سے مراد ہے لکھا ہوا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور ہم نے کافروں کے مطلوبہ معجزات کو بھیجنے سے اسی لیے منع فرمایا تھا کہ پہلے لوگ ان مطلوبہ معجزات کی تکذیب کر چکے ہیں، اور ہم نے قوم ثمود کو اونٹنی عطا فرمائی جو ان کی آنکھیں کھولنے والی

تھی، سوانہوں نے اس اونٹنی پر ظلم کیا اور ہم اس قسم کے معجزات صرف لوگوں کو ڈرانے کے لیے بھیجتے ہیں O"
(بنی اسرائیل:۵۹)

کافروں کے مطلوبہ معجزات عطا نہ فرمانے کا سبب

"وَمَا مَنَعَنَاۤ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰیٰتِ اِلَّاۤ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ": اس آیت کے سبب نزول کے متعلق دو قول ہیں:

(۱) اہل مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ آپ اُن کے لیے صفا پہاڑ کو سونا بنادیں اور مکہ کے پہاڑ کو دور دور کردیں تاکہ وہ اس جگہ کھیتی باڑی کرسکیں، تو ان سے کہا گیا: اگر آپ چاہیں تو ہم یہ معجزات عطا فرمادیتے ہیں پھر بھی اگر یہ لوگ ایمان نہیں لائے تو ان تمام لوگوں کو اس طرح ہلاک فرمادیا جائے گا جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو ہلاک فرمادیا گیا تھا، آپ نے فرمایا: نہیں! بلکہ میں انتظار کرتا ہوں تاکہ یہ لوگ ایمان لے آئیں۔

(سنن نسائی: ۳۱۰، تفسیر الطبری: ۲۲۳۹۸، المستدرک للحاکم ج ۲ ص ۳۶۲، دلائل النبوۃ للبیہقی: ج ۲ ص ۲۷۱، اسباب النزول للواحدی: ۵۷۹، مسند البزار: ۲۲۲۴، دلائل النبوۃ للبیہقی: ج ۲ ص ۲۷۲، مجمع الزوائد للہیثمی ج ۷ ص ۵۰، مسند احمد: ۲۳۳۳)

(۲) اس آیت کا معنی یہ ہے کہ کفار کے فرمائشی اور مطلوبہ معجزات کو عطا فرمانے سے ہم نے صرف اس لیے منع فرمایا ہے کہ اس سے پہلے بھی کفار نے فرمائشی معجزات طلب کیے تھے اور جب وہ معجزات عطا فرمادیے گئے اور وہ لوگ پھر بھی ایمان نہیں لائے تو ان سب لوگوں کو ہلاک فرمادیا گیا۔ یعنی ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزات کا سوال کیا جس کی تکذیب کی وجہ سے پہلے لوگوں کو عذاب دیا گیا تھا، پس اس لیے کفار مکہ کے یہ فرمائشی معجزات نہیں دیے گئے کہ یہ لوگ ان کی تکذیب کریں گے تو ان سب لوگوں کو ہلاک فرمادیا جائے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو ہلاک فرمادیا گیا تھا۔ اور امتوں میں اللہ تعالیٰ کی عادت جاریہ یہی ہے کہ جب وہ معجزات کا سوال کریں پھر معجزات آنے کے بعد ان کی تکذیب کریں تو اللہ تعالیٰ ان سب پر عذاب نازل فرماتے ہیں۔

"وَاٰتَیْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً": ابن قتیبہ نے کہا: ایسی اونٹنی دی گئی جو واضح تھی اور آنکھیں کھول دینے والی تھی۔ اور ابن الانباری نے کہا: یعنی وہ اس اونٹنی کا مشاہدہ کرنے والے تھے۔ "فَظَلَمُوْا بِهَا": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: انہوں نے اس اونٹنی کو دیکھنے کے باوجود حضرت صالح علیہ السلام کی نبوت کا انکار کیا۔ "وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰیٰتِ اِلَّا تَخْوِیْفًا": یعنی ہم ان نشانیوں سے بندوں کو ڈراتے ہیں تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ مفسرین نے کہا: اس آیت سے مراد میں چار اقوال ہیں:

(۱) حسن بصری نے کہا کہ عام موت آجاتی ہے (۲) اللہ تعالیٰ رسولوں کے معجزات کو مکذبین کے ڈرانے کے لیے بھیجتے ہیں (۳) یہ معجزات لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ڈرانے کے لیے ہیں کہ اگر لوگ اب بھی ایمان نہیں لائے تو اللہ تعالیٰ ان سے انتقام لیں گے (۴) اس سے مراد یہ ہے کہ انسان ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہوتا ہے، بچپن سے جوانی کی طرف، پھر ادھیڑ عمر کی طرف، پھر بڑھاپے کی طرف، تاکہ وہ اپنے احوال کے بدلنے سے نصیحت حاصل کرے اور اپنے انجام سے ڈرے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور جب ہم نے آپ سے فرمایا کہ بے شک آپ کے رب نے (اپنی قدرت سے) سب لوگوں کا احاطہ فرمایا ہوا ہے اور قدرت کی جو نشانیاں ہم نے آپ کو (شب معراج) دکھائی تھیں اور قرآن

مجید میں (تھوہر کے) جس درخت پر لعنت فرمائی گئی ہے ان کو ہم نے صرف لوگوں کے لیے آزمائش بنایا تھا، اور ہم ان مشرکین کو ان نشانیوں سے اور تھوہر کے درخت سے ڈراتے ہیں، سو اس ڈرانے نے ان میں بہت بڑی سرکشی کا اضافہ کیاO'' (بنی اسرائیل: ٦٠)

''وَ اِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ '': اس کی تفسیر میں تین قول ہیں:

(١) ابوصالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم تمام لوگوں کو محیط ہے۔

(٢) مجاہد نے کہا: اللہ تعالیٰ کی قدرت تمام لوگوں کو محیط ہے، پس تمام لوگ ان کے قبضہ وقدرت میں ہیں۔

(٣) حسن اور قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ آپ کے اور لوگوں کے درمیان حائل ہیں تاکہ لوگ آپ کو قتل نہ کردیں۔

''وَ مَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِیْۤ اَرَیْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ '': اس ''الرؤیا'' کے متعلق دو قول ہیں:

(١) اس سے مراد آنکھ سے دیکھنا ہے اور اس سے مراد وہ عجائب اور نشانیاں ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج دکھائی گئی تھیں۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے: یہ آنکھ سے دیکھنا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج دکھایا گیا تھا۔ حسن بصری اور سعید بن جبیر، مجاہد، عکرمہ، مسروق، نخعی، قتادہ، ابو مالک، ابن جریج، ابو زید اور دوسروں کا بھی یہی قول ہے۔ اس قول کی بناء پر یہاں فتنہ کا معنی آزمائش ہے، کیونکہ کچھ لوگ شب معراج نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دعویٰ سن کر ایمان لے آئے تھے اور کچھ لوگ مرتد ہو گئے تھے۔ ابن الانباری نے کہا کہ مختار قول یہ ہے کہ یہ وہ رؤیت ہے جو بیداری میں ہوئی تھی۔ اور کوئی کہنے والا کہے ''رأیت فلانا رؤیۃ'' اور کہے ''رأیتہ رؤیا'' ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مگر یہ کہ ''الرؤیۃ'' کا استعمال نیند میں بہت کم ہوتا ہے اور ''الرؤیا'' کا استعمال نیند میں بہت زیادہ ہوتا ہے۔

(٢) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خواب دکھایا گیا تھا کہ آپ اور آپ کے اصحاب مکہ میں داخل ہوں گے اور ان دنوں آپ مدینہ منورہ میں تھے۔ پس آپ مکہ کی طرف روانہ ہوئے تو مشرکین نے آپ کو واپس کر دیا اور لوگوں نے کہا: آپ کو واپس کر دیا گیا ہے حالانکہ آپ نے ہمیں یہ حدیث بیان کر دی تھی کہ عنقریب آپ مکہ میں داخل ہوں گے، سو آپ کا یہ خواب لوگوں کے لیے فتنہ کا باعث بن گیا۔ اور العوفی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ یہ واقعہ حدیث معراج کے منافی نہیں ہے، کیونکہ یہ واقعہ مدینہ میں ہوا تھا اور معراج مکہ میں ہوئی تھی۔

''الشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ'' کے متعلق اقوال

''وَ الشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِی الْقُرْاٰنِ '': اس درخت کے متعلق تین قول ہیں:

(١) عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ یہ الزقوم یعنی تھوہر کا درخت ہے۔ اور مجاہد، سعید بن جبیر، عکرمہ، مسروق، نخعی اور جمہور کا بھی یہی قول ہے۔

مقاتل نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے زقوم کے درخت کا ذکر فرمایا تو ابوجہل نے کہا: اے قریش کی جماعت! بے شک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم کو زقوم کے درخت سے ڈراتے ہیں، کیا تم نہیں جانتے کہ آگ درخت کو جلا دیتی ہے اور محمد کا یہ زعم ہے کہ آگ درخت

کو اگاتی ہے، کیا تم جانتے ہو کہ زقوم کیا ہے؟ تو عبداللہ بن الزبعری نے کہا کہ بربر کی زبان میں زقوم کھجور اور مکھن کو کہتے ہیں، تو ابوجہل نے کہا: اے لڑکی! ہمارے لیے کھجور اور مکھن لاؤ، سو وہ لے کر آئی، پس اس نے اپنے ارد گرد لوگوں سے کہا: لو کھاؤ، یہ وہ چیز ہے جس سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم کو ڈراتے تھے تو اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: ”وَ نُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا یَزِیْدُهُمْ اِلَّا طُغْیَانًا كَبِیْرًا“ (اور ہم ان مشرکین کو ان نشانیوں سے اور تھوہر کے درخت سے ڈراتے ہیں، سو اس ڈرانے نے ان میں بہت بڑی سرکشی کا اضافہ کیا)۔

ابن قتیبہ نے کہا: ان کا فتنہ ”رؤیا“ سے تھا، وہ کہتے تھے کہ وہ ایک رات میں کیسے بیت المقدس تک گئے اور واپس آ گئے اور درخت کا فتنہ تھا، وہ کہتے تھے کہ آگ میں درخت کیسے ہوگا؟

”شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ“ کی تحقیق

اور ”الْمَلْعُوْنَةَ“ کے متعلق علماء کے تین اقوال ہیں: (۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کا معنی ہے المذمومة۔ (۲) الزجاج نے کہا: اس کا معنی ہے اس درخت سے کھانے والا ملعون ہے، اور عرب ہر ناپسندیدہ اور نقصان دہ طعام کو ملعون کہتے ہیں، قرآن مجید میں ارشاد ہے: ”اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ﴿۴۳﴾ طَعَامُ الْاَثِیْمِ ﴿۴۴﴾“ (الدخان: ۴۳-۴۴) (بے شک تھوہر کا درخت ۝ بڑے گناہگار (ابوجہل) کی خوراک ہے ۝)۔ (۳) ابن الانباری نے کہا: ”الْمَلْعُوْنَةَ“ کا معنی ہے: جو اصحاب فضیلت کے مراتب سے دور کیا گیا ہو۔

(۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے دوسرا قول مروی ہے کہ ”الشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ“ وہ درخت ہے جس کی شاخیں آپس میں لپٹی ہوئی ہوتی ہیں اور اس میں کانٹے ہوتے ہیں۔

(۳) اس درخت کے ساتھ چند مردوں سے کنایہ کیا گیا ہے جیسا کہ سعید بن المسیب کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھایا گیا کہ منبروں پر بنو امیہ ہیں تو آپ کو اس سے رنج ہوا، پس آپ کو بتایا گیا کہ یہ دنیا ہے جو بنو امیہ کو دی جائے گی، پھر آپ کا غم دور ہو گیا۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم: ۱۳۳۲۴، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ)

اس حدیث کی تحقیق کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبروں پر بنو امیہ کو دیکھ کر غمگین ہوئے“

اس حدیث کی سند میں محمد بن الحسن بن زبالہ ہیں اور یہ بہت ضعیف راوی ہیں اور اس کا شیخ عبدالمہیمن بن عباس بالکلیہ ضعیف ہے۔ اور اس کا متن منکر ہے اور اس باب میں کوئی حدیث صحیح نہیں ہے۔ اور اس کی تمام اسانید ضعیف ہیں۔

شیخ محمد بن علی بن محمد الشوکانی المتوفی ۱۲۵۰ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

امام ابن جریر نے از سہل بن سعد روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ بنو فلاں آپ کے منبر کے اوپر بندروں کی طرح اچھل کود رہے ہیں تو آپ اس سے غمگین ہوئے اور پھر آپ کی وفات تک آپ کو ہنستا ہوا نہیں دیکھا گیا، تب اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: ”وَ مَا جَعَلْنَا الرُّءْیَا الَّتِیْۤ اَرَیْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ“۔

اور ابن کثیر نے اس حدیث کو سند کے ساتھ روایت کرنے کے بعد کہا کہ یہ سند بہت ضعیف ہے، اس کی سند میں ایک راوی الحسن بن زبالہ ہے اور وہ متروک ہے اور اس کا شیخ عبدالمہیمن بن عباس بن سہل بن سعد بہت زیادہ ضعیف ہے۔

اور امام ابن ابی حاتم نے از حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے حکم بن ابی العاص کے بیٹوں کو (یعنی مروان وغیرہ) منبروں پر دیکھا گویا کہ وہ بندروں کی طرح ہیں تو اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: "وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِیْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ"۔ اور "الشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ" سے مراد حکم اور اس کا بیٹا یعنی مروان ہے۔

اور امام ابن ابی حاتم نے یعلی بن مرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے بنو امیہ کو زمین کے منبروں پر دیکھا، وہ عنقریب تمہارے حکمران ہو جائیں گے، پس تم اُن کو بدترین حکمران پاؤ گے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے رنج ہوا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

امام ابن مردویہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ انہوں نے مروان بن حکم سے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے کہ آپ تمہارے باپ اور تمہارا دادا کے متعلق فرماتے تھے کہ تم لوگ وہ درخت ہو جس پر قرآن مجید میں لعنت فرمائی گئی ہے۔ اور اس روایت میں یہ سقم ہے کہ مروان کے دادا نے نبوت کا زمانہ نہیں پایا تھا۔ (فتح القدیر ج ۳ ص ۳۳۳۔۳۳۴)

"وَنُخَوِّفُهُمْ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا": (اور ہم ان مشرکین کو ان نشانیوں سے اور تھوہر کے درخت سے ڈراتے ہیں سو اس ڈرانے نے ان میں بہت بڑی سرکشی کا اضافہ کیا)۔

ابن الانباری نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ ہم ان کو عذاب سے ڈراتے ہیں اور اس ڈرانے سے ان میں صرف سرکشی کا اضافہ ہوا۔

اس آیت میں "طغیان" کا لفظ ہے، اور جب سمندر کی موجوں میں تلاطم ہو تو اس کو "طغیان" کہا جاتا ہے۔ اور "طغی السیل" کا معنی ہے جب بہت زیادہ پانی آجائے۔ اور جمہور نے کہا کہ کفار کے طغیان سے مراد اُن کا کفر ہے۔ اور ابن قتیبہ نے کہا: اس سے مراد ان کی سرکشی اور تکبر ہے۔ (زاد المسیر ج ۳ ص ۳۰۔۳۶، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۲ھ)

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۚ﴿۶۱﴾

اور یاد کیجئے جب ہم نے فرشتوں سے فرمایا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں تو ابلیس کے سوا سب فرشتوں نے سجدہ کیا، ابلیس نے کہا: کیا میں اس کو سجدہ کروں جس کو آپ نے مٹی سے پیدا فرمایا ہے O

قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِیْ كَرَّمْتَ عَلَیَّ ؗ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۲﴾

ابلیس نے کہا: یہ بتایئے کہ جس کو آپ نے مجھ پر فضیلت عطا فرمائی ہے اگر آپ نے مجھے قیامت کے دن تک کی مہلت عطا فرمائی تو میں چند قلیل کے سوا اس کی تمام اولاد کی ضرور بہ ضرور جڑ کاٹ ڈالوں گا O

قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴿۶۳﴾

اللہ نے فرمایا: "جا" پس ان میں سے جو تیری پیروی کرے گا تو بے شک جہنم تم سب کی مکمل سزا ہے O

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ۗ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۶۴﴾

اور تو ان میں سے جن کو اپنی آواز کے ساتھ گمراہ کر سکتا ہو گمراہ کر، اور اپنے سواروں اور پیادوں کے ساتھ ان پر چڑھائی کر، اور ان کے اموال اور اولاد میں شریک ہو جا اور ان سے وعدے کرتا رہ! اور واقعہ یہ ہے کہ شیطان جو ان سے وعدے کرتا ہے وہ سب دھوکا ہیں O

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ۗ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ﴿۶۵﴾

بے شک میرے مخلص بندوں پر تیرا کوئی تسلط نہیں ہوگا اور تیرے رب اُن کی حفاظت کے لیے کافی ہیں O

رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ۗ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۶۶﴾

تمہارے رب وہ ہیں جو تمہارے نفع کے لیے سمندر میں کشتیاں چلاتے ہیں تاکہ تم ان کے فضل کو تلاش کرو، بے شک وہ تم پر مہربان ہیں O

وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ۗ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ﴿۶۷﴾

اور جب تمہیں سمندر میں کوئی ضرر پہنچتا ہے تو اللہ کے سوا تم جن کی عبادت کرتے ہو وہ سب تمہارے دماغ سے نکل جاتے ہیں، پھر جب اللہ تمہیں خشکی کی طرف لے آتے ہیں تو تم اللہ سے منہ موڑ لیتے ہو، اور انسان ہے ہی ناشکرا O

اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا ﴿۶۸﴾

کیا تم اس سے بے خوف ہو کہ اللہ تمہیں خشکی کی زمین میں دھنسا دیں یا تم پر پتھراؤ کرنے والی آندھی بھیج دیں، پھر تمہیں کوئی بچانے والا نہیں ملے گا O

اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا ﴿۶۹﴾

یا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو کہ وہ دوبارہ تمہیں سمندر میں لے جائیں پھر تم پر سمندری جہازوں کو توڑنے والی آندھی بھیج دیں پھر تمہارے کفر کے سبب سے تم کو سمندر میں غرق فرما دیں، پھر تم اپنے لیے ہم سے کوئی باز پرس کرنے والا نہیں پاؤ گے O

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝۷۰ ع

اور بے شک ہم نے اولادِ آدم کو عزت عطا فرمائی اور ان کو خشکی اور سمندر میں سواریوں پر سوار فرمایا اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے روزی عطا فرمائی اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوق پر فضیلت عطا فرمائی O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور یاد کیجئے جب ہم نے فرشتوں سے فرمایا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں تو ابلیس کے سوا سب فرشتوں نے سجدہ کیا، ابلیس نے کہا: کیا میں اس کو سجدہ کروں جس کو آپ نے مٹی سے پیدا فرمایا ہے O'' (بنی اسرائیل: ۶۱)

ابلیس لعین کی حضرت آدم علیہ السلام سے عداوت

حافظ اسماعیل بن کثیر الشافعی الدمشقی المتوفی ۷۷۴ھ، بنی اسرائیل: ۶۱ تا ۷۰ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ قَالَ'': اللہ تبارک وتعالیٰ ابلیسِ لعین کی حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی ذریت سے عداوت کو یاد دلاتے ہیں کہ یہ عداوت قدیم ہے جب سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تھا، کیونکہ اللہ عزوجل نے فرشتوں کو حکم فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں، سو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، اس نے تکبر کیا اور سجدہ کرنے سے انکار کیا اور اپنے اوپر فخر کیا اور حضرت آدم علیہ السلام کو حقیر قرار دیا، اس لیے اس نے کہا: ''ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِیْنًا'': یعنی کیا میں اس کو سجدہ کروں جس کو آپ نے مٹی سے پیدا فرمایا ہے۔ اور دوسری آیت میں فرمایا ہے: ''اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ ۝ (الاعراف: ۱۲)'' (میں آدم سے بہتر ہوں، تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور آپ نے آدم کو مٹی سے پیدا فرمایا ہے O)۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''ابلیس نے کہا: یہ بتائیے کہ جس کو آپ نے مجھ پر فضیلت عطا فرمائی ہے اگر آپ نے مجھے قیامت کے دن تک کی مہلت عطا فرمائی تو میں چند قلیل کے سوا اس کی تمام اولاد کی ضرور بہ ضرور جڑ کاٹ ڈالوں گا O'' (بنی اسرائیل: ۶۲)

''قَالَ اَرَءَیْتَکَ هٰذَا الَّذِیْ کَرَّمْتَ عَلَیَّ ۫ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَاَحْتَنِکَنَّ ذُرِّیَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِیْلًا'':

ابلیس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے جرأت اور کفر کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ''یہ بتائیے کہ جس کو آپ نے مجھ پر فضیلت عطا فرمائی ہے اگر آپ نے مجھے قیامت کے دن تک کی مہلت عطا فرمائی تو میں چند قلیل کے سوا اس کی تمام اولاد کی ضرور بہ ضرور جڑ کاٹ

ڈالوں گا"۔ اور اللہ عزوجل حلیم ہیں، وہ اس کو مہلت عطا فرمار ہے تھے۔

علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ ابلیس لعین کہہ رہا تھا کہ میں آدم کی تمام ذریت پر سوا چند قلیل لوگوں کے سب پر غلبہ پالوں گا۔ مجاہد نے کہا: میں ان سب کو جڑ سے اکھاڑ ڈالوں گا۔ اور ابن زید نے کہا: میں ان سب کو گمراہ کردوں گا اور ان کا معنی متقارب ہے۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ یہ بتائیں کہ آپ نے جس کو مجھ پر بزرگی عطا فرمائی ہے اگر آپ نے مجھے قیامت تک کی مہلت عطا فرمائی تو میں اس کی تمام ذریت کو چند قلیل لوگوں کے سوا گمراہ کردوں گا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اللہ نے فرمایا: "جا" پس ان میں سے جو تیری پیروی کرے گا تو بے شک جہنم تم سب کی مکمل سزا ہے O" (بنی اسرائیل: ۶۳)

"قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا": جب ابلیس نے اللہ تعالیٰ سے مہلت کا سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اذْهَبْ" اب تو جا، پس بے شک میں نے تجھے مہلت عطا فرمادی ہے جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا: "قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ﴿۳۷﴾ اِلٰى یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۳۸﴾ (الحجر: ۳۷-۳۸)" (فرمایا: "بے شک تو اُن لوگوں میں سے ہے جنہیں مہلت عطا فرمائی گئی ہے O بے شک تجھے وقتِ معلوم تک مہلت عطا فرمائی گئی ہے O)۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ابلیس لعین اور اس کے پیروکاروں کو یہ وعید سنائی "قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا"۔ مجاہد نے کہا: تم سب کو اس کی وافر جزا عطا فرمائی جائے گی۔ قتادہ نے کہا: تم سب کو اس کی پوری پوری جزا عطا فرمائی جائے گی اور اس میں کمی نہیں فرمائی جائے گی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور تو ان میں سے جن کو اپنی آواز کے ساتھ گمراہ کرسکتا ہو گمراہ کر، اور اپنے سواروں اور پیادوں کے ساتھ ان پر چڑھائی کر، اور ان کے اموال اور اولاد میں شریک ہوجا اور ان سے وعدے کرتا رہ! اور واقعہ یہ ہے کہ شیطان جو ان سے وعدے کرتا ہے وہ سب دھوکا ہیں O" (بنی اسرائیل: ۶۴)

"وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ": (اور تو ان میں سے جن کو اپنی آواز کے ساتھ گمراہ کرسکتا ہو گمراہ کر)۔

"الاِسْتِفْزَاز" کا لغوی معنی

علامہ اسماعیل بن حماد الجوہری الشافعی المتوفی ۳۹۸ھ، لکھتے ہیں:

اِسْتَفَزَّهُ: الخوف۔ یعنی کسی چیز کے خوف نے اس کو ڈرا کر بٹھا دیا۔ اور "مُسْتَفِزًّا" یعنی جو غیر مطمئن ہو۔ اور "اَفْزَزْتُهُ" یعنی میں نے اس کو گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا۔ (مجم الصحاح ص ۸۱۱، دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۲۹ھ)

علامہ سید محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی حنفی متوفی ۱۲۰۵ھ، لکھتے ہیں:

"اِسْتَفَزَّ" کا معنی ہے: اس پر خوف طاری ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ (بنی اسرائیل: ۶۴)" الفراء نے کہا: اس آیت کا معنی ہے: تو اپنی آواز کے ساتھ اور اپنے بلانے کے ساتھ ڈرا۔ اور اسی طرح اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَاِنْ كَادُوْا لَیَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ۔ (بنی اسرائیل: ۷۶)" یعنی عنقریب یہ کفار آپ کو ڈرائیں گے، اور دوسرا

قول ہے کہ یا آپ کو گھبراہٹ میں مبتلا کریں گے اور آپ کو نکل بھاگنے پر برانگیختہ کریں گے۔

(تاج العروس من جواہر القاموس، جز ۱۵ ص ۱۳۶، دار الکتب العلمیہ بیروت)

"الاِسْتِفْزَاز" کا عرفی معنی

الاستفزاز کے معنی میں کہا گیا ہے کہ اس سے مراد الغناء ہے، مجاہد نے کہا: تو لہو اور غناء کے ساتھ ان لوگوں کو ڈرا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر میں کہا: اس سے مراد ہر وہ داعی ہے جو اللہ عزوجل کی نافرمانی کی طرف دعوت دے۔

"وَاَجْلِبْ عَلَیْهِمْ بِخَیْلِكَ وَرَجِلِكَ": قتادہ نے کہا: تو لوگوں پر اپنے لشکروں کے ساتھ حملہ کر خواہ وہ سوار ہوں یا پیادہ، کیونکہ رجل، راجل کی جمع ہے جیسے رَکب، راکب کی جمع ہے اور صَحب، صاحب کی جمع ہے۔ اور اس آیت کا معنی یہ ہے کہ تو لوگوں پر ان کو مسلط کر دے جن پر تو قادر ہے اور یہ تقدیری امر ہے، جیسے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اَلَمْ تَرَ اَنَّاۤ اَرْسَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ۝ (مریم: ۸۳)" (کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ہم نے کافروں پر شیطان مسلط فرمائے جو انہیں گناہوں پر ابھارتے رہتے ہیں ۝)۔ یعنی شیاطین کفار کو گناہوں پر ابھارتے رہتے ہیں۔ قتادہ نے کہا کہ ابلیس کے لیے جنات اور انسانوں میں سے سوار اور پیادے ہیں، اور یہ وہ لوگ ہیں جو ابلیس کی پیروی کرتے ہیں اور اس کا معنی آواز بلند کرنا ہے۔

"وَشَارِكْهُمْ فِی الْاَمْوَالِ": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد نے کہا: اس سے مراد وہ ہے جو شیطان نے ان کو حکم دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں میں اپنے مالوں کو خرچ کرو، اور عطاء نے کہا: اس سے مراد ربا یعنی سود ہے۔ حسن بصری نے کہا: اس سے مراد حرام کاموں میں خرچ کرنا ہے۔ "وَالْاَوْلَادِ": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد سے روایت ہے یعنی زنا کی اولاد۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی روایت ہے کہ اس سے مراد وہ اولاد ہے جس کو انہوں نے بغیر علم کے جہالت سے قتل کر دیا تھا۔ اور قتادہ نے حسن بصری سے روایت کی ہے کہ اس سے مراد وہ اولاد ہے جو مجوسی ہو گئی تھی یا یہودی ہو گئی تھی یا نصرانی ہو گئی تھی اور اسلام کے علاوہ کسی اور فرقہ میں سے ہو گئی تھی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم میں سے کوئی مرد اپنی بیوی کے پاس جانے کا ارادہ کرے تو کہے: اللہ کے نام سے، اے اللہ! ہم سے شیطان کو دور رکھیں اور شیطان کو اس سے دور رکھیں جو آپ ہمیں اولاد عطا فرمائیں، اس طرح اگر ان کے درمیان اس عمل کے سبب سے کوئی اولاد مقدر فرمائی جائے تو پھر شیطان اس کو کبھی ضرر نہیں پہنچا سکے گا۔

(صحیح البخاری: ۱۴۱، ۳۲۷۱، ۳۲۸۳، ۵۱۶۵، ۶۳۸۸، ۷۳۹۶، صحیح مسلم: ۱۴۳۴، سنن ترمذی: ۱۰۹۲، سنن ابوداؤد: ۲۱۶۱، سنن ابن ماجہ: ۱۹۱۹، مسند احمد: ۱۹۱۱، سنن دارمی: ۲۲۱۲)

گویا ابلیس جن لوگوں کی اولاد میں شریک ہو گیا، یہ وہ لوگ ہیں جن سے لوگ اپنی بیوی سے مقاربت کے وقت اللہ کا نام نہ لیں۔

"وَعِدْهُمْ وَمَا یَعِدُهُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا": اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے خبر دی ہے کہ وہ قیامت کے دن کہے گا: "اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ۔۔۔ (ابراہیم: ۲۲)" (بے شک اللہ نے تم سے جو وعدہ کیا وہ سچا وعدہ تھا اور میں نے جو تم سے وعدہ کیا تھا تو میں نے اس کی خلاف ورزی کی)۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "بے شک میرے مخلص بندوں پر تیرا کوئی تسلط نہیں ہوگا اور تیرے رب اُن کی

حفاظت کے لیے کافی ہیں O" (بنی اسرائیل: ۶۵)

"اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ": اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کی تائید کی خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو شیطان مردود سے حفاظت میں رکھیں گے، اسی لیے اللہ عزوجل نے فرمایا: "وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا" یعنی اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرمانے والے ہیں اور ان کی مدد فرمانے والے ہیں اور ان کی تائید فرمانے والے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مومن اپنے شیاطین کو لاغر اور کمزور کر دیتا ہے جیسے تم میں سے کوئی شخص اپنے اونٹ کو سفر میں لاغر اور کمزور کر دیتا ہے۔ (مسند احمد: ۸۹۳۰، ۹۰۷۷، ۱۰۵۳۹)

اس حدیث میں "النضو" کا لفظ ہے، علامہ سندھی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اپنی سواری کو کمزور کر دینا اور اس کا گوشت گھلا دینا، اور اس سے مراد یہ ہے کہ مومن کی شان یہ ہے کہ وہ شیاطین کی مخالفت کرے اور ان کو کمزور کر دے۔ اور اس تشبیہ سے مقصود یہ ہے کہ مومن کا حق یہ ہے کہ وہ اپنے شیطان پر غالب ہو حتیٰ کہ شیطان اس کا اس طرح ماتحت اور مطیع ہو جائے جیسا کہ سواری، سوار کی ماتحت اور مطیع ہوتی ہے۔ (النہایہ لابن الاثیر الجزری، ج ۵ ص ۲۲، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۸ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "تمہارے رب وہ ہیں جو تمہارے نفع کے لیے سمندر میں کشتیاں چلاتے ہیں تاکہ تم ان کے فضل کو تلاش کرو، بے شک وہ تم پر مہربان ہیں O" (بنی اسرائیل: ۶۶)

"رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ": اس آیت میں اللہ عزوجل یہ خبر دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر یہ لطف و کرم ہے کہ انہوں نے اپنے بندوں کے لیے سمندر میں کشتیوں کو مسخر فرما دیا ہے اور اپنے بندوں کی سہولت کے لیے ان میں سفر کو آسان بنا دیا ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل کو تجارت میں تلاش کریں اور ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف سفر کریں، اسی لیے فرمایا: "اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا": یعنی انہوں نے اپنے فضل اور اپنی رحمت سے تمہارے لیے سمندروں میں کشتیوں کو رواں فرمایا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تم پر بہت رحم فرمانے والے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور جب تمہیں سمندر میں کوئی ضرر پہنچتا ہے تو اللہ کے سوا تم جن کی عبادت کرتے ہو وہ سب تمہارے دماغ سے نکل جاتے ہیں، پھر جب اللہ تمہیں خشکی کی طرف لے آتے ہیں تو تم اللہ سے مونہہ موڑ لیتے ہو، اور انسان ہے ہی ناشکرا O" (بنی اسرائیل: ۶۷)

اس آیت میں اللہ عزوجل یہ خبر دے رہے ہیں کہ لوگوں کو جب بھی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اخلاص کے ساتھ اللہ عزوجل کو پکارتے ہیں، اسی لیے فرمایا: "وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ": یعنی تمہارے دلوں سے ہر وہ باطل معبود نکل جاتا ہے جس کی تم اللہ عزوجل کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے۔

عکرمہ کے قبول اسلام کا سبب

ایسا ہی اتفاق عکرمہ بن ابی جہل کو پیش آیا جب مکہ فتح ہونے کے بعد وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ڈر کر بھاگے، پس سمندر کے سفر

ہم کسی کشتی میں سوار ہوئے تا کہ حبشہ پہنچ جائیں، پھر زبردست تند و تیز آندھی آئی اور کشتی میں سوار لوگوں نے ایک دوسرے سے کہا: آج تم کو اس طوفان سے اللہ واحد ہی نجات عطا فرما سکتے ہیں، تب عکرمہ نے اپنے دل میں کہا: اللہ کی قسم! جو ذات سمندر میں نفع پہنچا سکتی ہے تو خشکی میں بھی وہی ذات نفع پہنچائے گی، اے اللہ! میں آپ سے یہ عہد کرتا ہوں کہ اگر آپ نے مجھے اس طوفان سے نجات عطا فرمادی تو میں ضرور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤں گا اور اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ دوں گا، اور مجھے توقع ہے کہ میں ان کو شفیق اور مہربان پاؤں گا۔ پھر وہ سمندر کے طوفان سے نجات پا گئے، پھر عکرمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹ کر آئے، پس اسلام قبول کر لیا اور اسلام میں اچھے عمل کیے، اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوں اور ان کو راضی فرمائیں۔

حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی شافعی متوفی ۸۵۲ھ، لکھتے ہیں:

مصعب بن سعد اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام لوگوں کو امان دے دی سوائے چار مردوں اور دو عورتوں کے۔۔۔ الحدیث۔ اور رہے عکرمہ تو وہ سمندر میں سوار ہو کر حبشہ کی طرف بھاگ گئے، پس وہاں ایک زوردار آندھی آئی اور کشتی والوں نے کہا: اخلاص سے دعا کرو، کیونکہ تمہارے معبود آج تمہیں اس طوفان سے نہیں بچا سکتے، تب عکرمہ نے اپنے دل میں کہا: اللہ کی قسم! اگر سمندر میں مجھے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اخلاص نجات دے سکتا ہے تو خشکی میں بھی وہی نجات عطا فرمائیں گے، اے اللہ! میں آپ سے یہ عہد کرتا ہوں کہ اگر آپ نے مجھے اس طوفان سے بچالیا تو میں سیدھا سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤں گا حتیٰ کہ اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ دوں گا، پس میں ان کو ضرور معاف فرمانے والا اور کریم پاؤں گا، پس وہ آئے اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔

(الاصابہ ج ۴ ص ۴۴۳، رقم: ۵۶۵۴، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۵ھ، اسد الغابہ رقم: ۳۷۴۱، الاستیعاب: رقم: ۱۸۵۷، طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۳۲۹، التاریخ الکبیر ج ۷ ص ۴۸، ابن عساکر ج ۱۱ ص ۵۷۴، تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۵۷، کنز العمال ج ۱۳ ص ۵۴۰)

''فَلَمَّا نَجّٰىكُمۡ اِلَى الۡبَـرِّ اَعۡرَضۡتُمۡ'': یعنی تم بھول جاتے ہو کہ تم نے سمندر میں توحید کا کس طرح اقرار کیا تھا، اور پھر بھی اللہ وحدہٗ لاشریک کو پکارنے سے اعراض کرتے ہو۔ ''وَكَانَ الۡاِنۡسَانُ كَفُوۡرًا'': یعنی انسان اللہ تعالیٰ کی عطا فرمائی ہوئی نعمتوں کو بھول جاتا ہے اور ان کا انکار کرتا ہے سوا ان کے جن کو اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''کیا تم اس سے بے خوف ہو کہ اللہ تمہیں خشکی کی زمین میں دھنسا دیں یا تم پر پتھراؤ کرنے والی آندھی بھیج دیں، پھر تمہیں کوئی بچانے والا نہیں ملے گا O'' (بنی اسرائیل: ۶۸)

''اَفَاَمِنۡتُمۡ اَنۡ يَّخۡسِفَ بِكُمۡ جَانِبَ الۡبَرِّ اَوۡ يُرۡسِلَ عَلَيۡكُمۡ حَاصِبًا'': اللہ عزوجل فرماتے ہیں کہ جب تم سمندر سے خشکی کی طرف نکل آتے ہو تو کیا تم اللہ تعالیٰ کے انتقام سے بے خوف ہو جاتے ہو کہ وہ تم کو خشکی کی طرف دھنسا دیں یا تم پر پتھر برسا دیں۔

''ثُمَّ لَا تَجِدُوۡا لَـكُمۡ وَكِيۡلًا'': پھر تم اپنے لیے کسی مددگار کو نہ پاؤ جو تم کو اس عذاب سے بچالے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''یا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو کہ وہ دوبارہ تمہیں سمندر میں لے جائیں پھر تم پر سمندری جہازوں کو توڑنے والی آندھی بھیج دیں، پھر تمہارے کفر کے سبب سے تم کو سمندر میں غرق فرما دیں،

پھر تم ہم سے کوئی باز پرس کرنے والا نہیں پاؤ گے O" (بنی اسرائیل: ۶۹)

"اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ": اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں: اے ہم سے اعراض کرنے والو! جب تم نے سمندر میں ہماری توحید کا اعتراف کرلیا ہے اور تم خشکی کی طرف نکل آئے ہو، کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو کہ دوبارہ تم سمندر کے اس طوفان کے اندر مبتلاء ہو جاؤ، پھر اللہ تمہارے اوپر تیز آندھی بھیجیں جس کی وجہ سے تمہاری سواریاں یا کشتیاں سمندر میں غرق ہو جائیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا: القاصف سمندر کی اس تیز ہوا کو کہتے ہیں جو جہازوں کو توڑ کر غرق کر دیتی ہے۔

"فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ": پھر اللہ عزوجل تمہارے کئے ہوئے کفر اور تمہارے اللہ سے اعراض کے سبب سے تم کو غرق فرما دیں۔ "ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: پھر تم کوئی مددگار نہیں پاؤ گے۔ اور قتادہ نے کہا کہ ہم کو کسی سے یہ خوف اور خطرہ نہیں ہے کہ وہ ہم سے باز پرس کرے گا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور بے شک ہم نے اولادِ آدم کو عزت عطا فرمائی اور ان کو خشکی اور سمندر میں سواریوں پر سوار فرمایا اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے روزی عطا فرمائی اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوق پر فضیلت عطا فرمائی O" (بنی اسرائیل: ۷۰)

"وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ": اللہ عزوجل بنی آدم کو مکرم فرمانے اور ان کو کامل ہیئت میں پیدا فرمانے کی خبر فرما رہے ہیں، جیسے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ (التین: ۴)" (بے شک ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا فرمایا O)۔ یعنی انسان اپنے دونوں پیروں پر سیدھا کھڑا ہوتا ہے اور اپنے دونوں ہاتھوں سے کھاتا ہے، اور دیگر حیوانات چاروں پیروں پر چلتے ہیں اور اپنے مونہہ سے کھاتے ہیں، یعنی انسان کھانے کو اپنے مونہہ تک لے جاتا ہے اور دیگر حیوانات اپنا مونہہ اپنی خوراک تک لے جاتے ہیں۔ اور ہم نے انسان کے لیے کان، آنکھیں اور دل بنائے جن سے وہ تمام چیزوں کا ادراک کرتا ہے اور نفع حاصل کرتا ہے اور چیزوں کے منافع اور ان کے خواص کو اور ان کے دین اور دنیا میں مضر اثرات کو پہچانتا ہے۔

"وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ": اور ہم نے انسان کو خشکی میں سواریوں پر مثلاً خچروں پر اور گھوڑوں پر سوار فرمایا، اور سمندر میں بحری جہازوں اور کشتیوں پر سوار فرمایا۔ "وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ": اور ہم نے انسان کو غلہ سے اور پھلوں سے اور گوشت سے اور دودھ سے اور تمام اقسام کے طعام سے رزق عطا فرمایا۔ "وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا": یعنی انسان کو تمام حیوانات پر اور مخلوقات کی تمام اقسام پر فضیلت عطا فرمائی۔

انسانوں کے فرشتوں سے افضل ہونے کے متعلق احادیث

اس آیت کریمہ سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ جنسِ بشر جنسِ ملائکہ سے افضل ہے۔

ابن عساکر نے روایت کی ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فرشتوں نے عرض کیا: اے ہمارے رب! آپ نے ہمیں بھی پیدا فرمایا اور آپ نے بنو آدم کو بھی پیدا فرمایا اور آپ نے بنو آدم کو اس طرح بنایا کہ وہ

طعام کھاتے ہیں اور مشروب پیتے ہیں اور کپڑے پہنتے ہیں اور عورتوں سے نکاح کرتے ہیں اور سواریوں پر سوار ہوتے ہیں اور سوتے ہیں اور آرام حاصل کرتے ہیں اور ہمارے لیے آپ نے اس میں سے کوئی چیز نہیں بنائی، پس ان کے لیے آپ دنیا بنا دیں اور ہمارے لیے آخرت بنا دیں، تو اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا: جس کو میں نے اپنے ہاتھوں سے پیدا فرمایا ہے اور جس میں، میں نے اپنی پسندیدہ روح ڈالی ہے اس کو میں اس کی طرح نہیں کروں گا جس کے متعلق میں نے کہا "ہو جا" تو وہ ہو گئی۔

امام طبرانی نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن کوئی مخلوق ابن آدم سے افضل نہیں ہو گی، عرض کیا گیا یا رسول اللہ! فرشتے بھی نہیں ہوں گے؟ آپ نے فرمایا: فرشتے بھی نہیں ہوں گے، فرشتے تو سورج اور چاند کی طرح مجبور ہیں۔

(المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۳۵۰۹، مجمع الزوائد للہیثمی ج ۱ ص ۸۲، تاریخ بغداد للخطیب ج ۳ ص ۳۵، شعب الایمان للبیہقی: ۱۵۱، ۱۵۲، المعجم الاوسط: ۶۰۸۴، ۵۶۰۸۳، المعجم الصغیر للولید بن بشر ص ۵۹۵)۔ (تفسیر القرآن العظیم، ج ۳ ص ۵۶۔۵۸، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۹ھ)

يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْۚ فَمَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَاُولٰٓىٕكَ یَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَ لَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا (۷۱)

(اس دن کے متعلق غور کرو) جس دن ہم تمام لوگوں کو ان کے پیشواؤں کے ساتھ بلائیں گے، پس جن کو ان کا صحیفۂ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ اپنے صحیفۂ اعمال کو پڑھ رہے ہوں گے اور ان پر ذرہ برابر ظلم نہیں فرمایا جائے گا ○

وَ مَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَ اَضَلُّ سَبِیْلًا (۷۲)

اور جو شخص دنیا میں دل کا اندھا ہو گا وہ آخرت میں بھی نجات کی راہ سے اندھا ہو گا اور ہدایت کے راستہ سے بہت دور ہو گا ○

وَ اِنْ كَادُوْا لَیَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ لِتَفْتَرِیَ عَلَیْنَا غَیْرَهٗ ۗۖ وَ اِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِیْلًا (۷۳)

(اے رسول اکرم!) قریب تھا کہ یہ کفار آپ کو لغزش دے کر ضرور اس وحی سے پھیر دیتے جو وحی ہم نے آپ کی طرف نازل فرمائی تھی تاکہ آپ اس وحی کے علاوہ کوئی اور چیز ہماری طرف منسوب کر دیتے اور اس وقت یہ کفار ضرور آپ کو اپنا دوست بنا لیتے ○

وَ لَوْ لَاۤ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَیْهِمْ شَیْــٴًـا قَلِیْلًا (۷۴)

اور اگر ہم آپ کو اس وحی پر مضبوطی سے جمائے نہ رکھتے تو قریب تھا کہ ضرور آپ ان کفار کی طرف کچھ نہ کچھ مائل ہو جاتے ○

اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَیٰوةِ وَ ضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَیْنَا نَصِیْرًا (۷۵)

(اور اگر آپ بالفرض ایسا کرتے) تو ہم ضرور آپ کو دنیا میں بھی دوہرا عذاب چکھاتے اور آخرت میں بھی دوہرا عذاب چکھاتے، پھر آپ ہمارے مقابلہ میں کوئی مددگار نہ پاتے ○

وَاِنْ كَادُوْا لَیَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِیُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا یَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۷۶﴾

اور قریب تھا کہ یہ کفار مکہ کی سرزمین سے آپ کے قدم اکھاڑ دیتے تا کہ آپ کو مکہ سے جلاوطن کر دیتے، اور اگر ایسا ہوتا تو آپ کے بعد وہ کفار خود بھی وہاں پر تھوڑی مدت ہی ٹھہرتے O

سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِیْلًا ﴿۷۷﴾

ہم نے آپ سے پہلے جن رسولوں کو بھیجا ہے، ان میں ہماری یہی سنت رہی ہے اور آپ ہماری سنت میں کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''(اس دن کے متعلق غور کرو) جس دن ہم تمام لوگوں کو ان کے پیشواؤں کے ساتھ بلائیں گے، پس جن کو ان کا صحیفۂ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ اپنے صحیفۂ اعمال کو پڑھ رہے ہوں گے اور اُن پر ذرہ برابر ظلم نہیں فرمایا جائے گاO'' (بنی اسرائیل: ۷۱)

قیامت کے دن لوگوں کے اماموں کے متعلق اقوال

القاضی مجیر الدین بن محمد العلیمی المقدسی الحنبلی المتوفی ۹۲۸ھ، بنی اسرائیل: ۷۱ تا ۷۷ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''یَوْمَ '': یعنی اس دن کو یاد کیجئے۔ ''نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ '': جس دن ہم تمام لوگوں کو ان کے اماموں کے ساتھ بلائیں گے جن کی وہ دنیا میں اقتداء کرتے تھے، خواہ وہ نبی ہوں یا کوئی اور۔ ''فَمَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ '': جن لوگوں کو بلایا جائے گا، ان میں سے جس کو اس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہی لوگ کامیاب ہیں۔

''فَاُولٰٓىِٕكَ یَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ '': یعنی وہ لوگ اپنے اپنے صحیفۂ اعمال میں اپنی نیکیوں کو پڑھیں گے۔ اور اس آیت میں اشقیاء یعنی بدبختوں کا ذکر نہیں فرمایا، اگرچہ وہ بھی اپنے اپنے صحائفِ اعمال کو پڑھیں گے، کیونکہ جب وہ اپنے اعمال کو پڑھیں گے تو ان اعمال کو خوف اور حیاء سے ظاہر نہیں کریں گے، اس کے برخلاف السعداء (کامیاب لوگ) جب اپنے صحائفِ اعمال کو پڑھیں گے تو وہ اپنے اعمال کو ظاہر اور مشہور کریں گے اور دوسروں کو بھی خوشی سے پڑھوائیں گے۔

''وَلَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا'': اور تمام ان لوگوں پر جنہیں بلایا جائے گا کھجور کے چھلکے کے برابر بھی ظلم نہیں فرمایا جائے گا۔

مجاہد اور قتادہ نے کہا کہ لوگوں کو اُن کے نبی کے ساتھ بلایا جائے گا۔ اور ابوصالح اور الضحاک نے کہا: ان کو اس کتاب کے ساتھ بلایا جائے گا جو اُن کی طرف نازل فرمائی گئی ہے۔ اور الحسن اور ابوالعالیہ نے کہا: اُن کو ان کے اعمال کے ساتھ بلایا جائے گا۔ اور قتادہ نے یہ بھی کہا ہے کہ اُن کو اُن کے صحائفِ اعمال کے ساتھ بلایا جائے گا۔ اس آیت میں کتاب کو امام فرمایا ہے جیسا کہ اللہ عزوجل نے اس ارشاد میں کتاب کو امام فرمایا ہے: ''وَكُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ فِیْۤ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ ﴿۱۲﴾ (یٰس: ۱۲)'' (اور ہم نے ایک روشن کتاب (لوح محفوظ) میں ہر چیز کا احاطہ فرمالیا)۔

سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ لوگوں کو اُن کے زمانہ کے امام کے ساتھ بلایا جائے گا جس امام نے ان کو دنیا میں گمراہی کی طرف بلایا تھا یا ہدایت کی طرف بلایا تھا، اور اس کی نظیر یہ آیتیں ہیں: ''وَ جَعَلْنٰهُمْ اَىٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا (الانبیاء: ۷۳)'' (اور ہم نے انہیں ایسے ائمہ بنایا جو ہمارے حکم سے ہمارے دین کی طرف بلاتے تھے)۔ اس آیت میں اس امام کا ذکر ہے جو ہدایت دیتا ہے، نیز ارشاد فرمایا: ''وَ جَعَلْنٰهُمْ اَىٕمَّةً یَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ۔ (القصص: ۴۱)'' (اور ہم نے انہیں (دنیا میں) کفر کے ائمہ بنا دیے جو لوگوں کو آگ کی طرف بلاتے ہیں)۔ اس آیت میں اس امام کا ذکر فرمایا ہے جو گمراہی کی طرف بلاتا ہے۔ (معالم التنزیل ج ۳ ص ۱۳۶، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور جو شخص دنیا میں دل کا اندھا ہوگا وہ آخرت میں بھی نجات کی راہ سے اندھا ہوگا اور ہدایت کے راستہ سے بہت دور ہوگا O'' (بنی اسرائیل: ۷۲)

''وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَ اَضَلُّ سَبِيْلًا'': اور جو اس دنیا میں ہدایت سے اندھا ہوگا تو وہ آخرت میں بھی حجت قائم کرنے سے اندھا ہوگا اور صحیح طریقہ سے گمراہ ہوگا۔ اور ''اَعْمٰى'' سے مراد ہے جو دل سے اندھا ہوگا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''(اے رسول اکرم!) قریب تھا کہ یہ کفار آپ کو لغزش دے کر ضرور اس وحی سے پھیر دیتے جو وحی ہم نے آپ کی طرف نازل فرمائی تھی تاکہ آپ اس وحی کے علاوہ کوئی اور چیز ہماری طرف منسوب کر دیتے اور اس وقت یہ کفار ضرور آپ کو اپنا دوست بنا لیتے O'' (بنی اسرائیل: ۷۳)

''وَ اِنْ كَادُوْا لَیَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ لِتَفْتَرِیَ عَلَیْنَا غَیْرَهٗ ۖ وَ اِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِیْلًا'':

جب مشرکین نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ رحمت کی آیت کو عذاب کی آیت کی جگہ رکھ دیں یا عذاب کی آیت کو رحمت کی آیت کی جگہ رکھ دیں، اور ان کے خداؤں کا تعریف سے ذکر کریں اور اپنے پاس سے ضعفاء اور مساکین کو اٹھا دیں۔

مفسرین نے کہا ہے کہ آپ کے دل میں ان کی اس فرمائش کو پورا کرنے کا خیال آیا اور یہ آپ کا عزم نہیں تھا۔ اور دل میں جو غیر اختیاری طور پر خیال آتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا ہے، تب یہ آیت نازل ہوئی: ''وَ اِنْ كَادُوْا لَیَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ لِتَفْتَرِیَ عَلَیْنَا غَیْرَهٗ'' یعنی قریب تھا کہ یہ آپ کو دھوکا دے کر اللہ تعالیٰ کی نازل فرمائی ہوئی وحی سے پھیر دیتے، تاکہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف اس بات کو منسوب کرتے جو اللہ تعالیٰ نے نازل نہیں فرمائی تھی۔ اور اگر آپ ان کے مطالبہ کے مطابق کر لیتے تو وہ ضرور آپ کو اپنا سچا دوست بنا لیتے۔

امام احمد رضا خان قادری متوفی ۱۳۴۰ھ، اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

''اور وہ تو قریب تھا کہ تمہیں کچھ لغزش دیتے ہماری وحی سے جو ہم نے تم کو بھیجی کہ تم ہماری طرف کچھ اور نسبت کر دو اور ایسا ہوتا تو وہ تم کو اپنا گہرا دوست بنا لیتے''۔

صدر الافاضل علامہ سید محمد نعیم الدین مراد آبادی حنفی متوفی ۱۳۶۷ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

شانِ نزول: (قبیلہ) ثقیف کا ایک وفد سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر کہنے لگا کہ اگر آپ تین باتیں منظور کر لیں تو ہم آپ کی

بیعت کرلیں، ایک تو یہ کہ نماز میں جھکیں گے نہیں یعنی رکوع اور سجدہ نہیں کریں گے، دوسری یہ کہ ہم اپنے بت اپنے ہاتھوں سے نہ توڑیں گے، تیسرے یہ کہ لات کو پوجیں گے تو نہیں مگر ایک سال اس سے نفع اٹھالیں کہ اس کے پوجنے والے جونذریں چڑھاوے لائیں اس کو وصول کرلیں۔ سید عالم ﷺ نے فرمایا: اس دین میں کچھ بھلائی نہیں جس میں رکوع اور سجدہ نہ ہو اور بتوں کو توڑنے کی بابت تمہاری مرضی اور لات وعزیٰ سے فائدہ اٹھانے کی اجازت میں ہرگز نہ دوں گا۔ وہ کہنے لگے: یارسول اللہ (ﷺ) ہم چاہتے یہ ہیں کہ آپ کی طرف سے ہمیں ایسا اعزاز ملے جو دوسروں کو نہ ملا ہوتا کہ ہم فخر کرسکیں، اس میں اگر آپ کو اندیشہ ہو کہ عرب شکایت کریں گے تو آپ ان سے کہہ دیجئے گا کہ اللہ کا حکم ہی ایسا تھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

(تفسیر خزائن العرفان مع ترجمہ کنزالایمان، ص ۵۴۰، مکتبۃ المدینہ، کراچی، ۱۴۳۲ھ)

علامہ ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ، نے بھی اس آیت کی تفسیر میں اس شان نزول کا ذکر کیا ہے:

(معالم التنزیل، ج ۳ ص ۱۴۷، دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۲۰ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”اور اگر ہم آپ کو اس وحی پر مضبوطی سے جمائے نہ رکھتے تو قریب تھا کہ ضرور آپ ان کفار کی طرف کچھ نہ کچھ مائل ہوجاتے O“ (بنی اسرائیل: ۷۴)

”وَلَوْلَاۤ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ“: اور اگر ہم آپ کو اپنی عصمت سے حق پر جمائے نہ رکھتے۔ ”لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ“: تو آپ ضرور ان کے قول کے قریب ہوجاتے۔ ”شَیْــٴًـا قَلِیْلًا“: اس میں یہ دلیل ہے کہ نبی ﷺ کی عصمت سے حفاظت فرمائی گئی اور آپ اُن کی طرف بالکل مائل نہیں ہوئے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”(اور اگر آپ بالفرض ایسا کرتے) تو ہم ضرور آپ کو دنیا میں بھی دوہرا عذاب چکھاتے اور آخرت میں بھی دوہرا عذاب چکھاتے، پھر آپ ہمارے مقابلہ میں کوئی مددگار نہ پاتے O“ (بنی اسرائیل: ۷۵)

”اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَیٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ“: اور اگر آپ بالفرض ان کی طرف مائل ہوجاتے تو ہم آپ کو دنیا کا عذاب بھی دگنا چکھاتے اور آخرت میں بھی دگنا عذاب چکھاتے۔ یعنی ہم آپ کو دنیا اور آخرت میں دگنا عذاب دیتے۔

”ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَیْنَا نَصِیْرًا“: پھر آپ ہمارے عذاب سے کوئی بچانے والا نہ پاتے۔

امام احمد رضا خان قادری متوفی ۱۳۴۰ھ اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

”اور ایسا ہوتا تو ہم تم کو دونی عمر اور دوچند موت کا مزہ دیتے پھر تم ہمارے مقابل اپنا کوئی مددگار نہ پاتے“۔

(تفسیر خزائن العرفان مع ترجمہ کنزالایمان، ص ۵۴۰، مکتبۃ المدینہ، کراچی، ۱۴۳۲ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”اور قریب تھا کہ یہ کفار مکہ کی سرزمین سے آپ کے قدم اکھاڑ دیتے تا کہ آپ کو مکہ سے جلاوطن کردیتے، اور اگر ایسا ہوتا تو آپ کے بعد وہ کفار خود بھی وہاں پر تھوڑی مدت ہی ٹھہرتے O“ (بنی اسرائیل: ۷۶)

”وَ اِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا“: اور قریب تھا کہ یہ جلد آپ کے قدم مدینہ کی سرزمین سے اکھاڑ دیتے۔ یہود نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ مدینہ انبیاء کی سرزمین نہیں، انبیاء کی سرزمین شام ہے اور وہی ارضِ مقدسہ ہے لیکن آپ روم سے ڈرتے ہیں۔ پس اگر آپ واقعی نبی ہیں تو روم کی طرف چلے جائیں، بے شک اللہ تعالیٰ آپ کی عنقریب حفاظت فرمائیں گے جس طرح اللہ تعالیٰ نے دوسرے نبیوں کی حفاظت فرمائی ہے، تب یہ آیت نازل ہوئی۔

”وَ اِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا“: اور اگر آپ مدینہ سے نکل جاتے تو آپ کے نکلنے کے بعد وہ صرف تھوڑا عرصہ مدینہ میں رہتے، ہم ان کو ہلاک فرما دیتے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”ہم نے آپ سے پہلے جن رسولوں کو بھیجا ہے، ان میں ہماری یہی سنت رہی ہے اور آپ ہماری سنت میں کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے O“ (بنی اسرائیل: ۷۷)

”سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَ لَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا“: یعنی تمام امتوں میں ہماری یہی سنت رہی ہے کہ جب انہوں نے اپنے نبی کو ان کے علاقہ سے جلا وطن کر دیا یا ان کو قتل کر دیا تو ان امتوں کو عذاب سے ہلاک فرما دیا جاتا ہے، اور آپ ہماری اس سنت میں کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے۔

(فتح الرحمٰن فی تفسیر القرآن، ج ۳ ص ۱۱۹۔ ۱۲۲، دار النوادر، بیروت، ۱۴۳۲ھ، وتفاسیر اخریٰ)

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴿۷۸﴾

سورج کے زوال سے لے کر رات کی تاریکی تک نماز قائم کیا کریں اور فجر کی نماز میں قرآن مجید پڑھا کریں، بے شک فجر کی نماز میں قرآن پڑھتے وقت فرشتے حاضر ہوتے ہیں O

وَ مِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾

اور رات کے کچھ حصہ میں تہجد پڑھا کریں، یہ نماز آپ کے لیے خصوصیت سے زائد ہے، عنقریب آپ کے رب آپ کو مقامِ محمود پر فائز فرمائیں گے O

وَ قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ﴿۸۰﴾

اور (اے رسولِ اکرم!) آپ دعا کیجئے کہ اے میرے رب! مجھے سچائی کے ساتھ داخل کی جگہ میں داخل فرمائیں اور سچائی کے ساتھ نکلنے کی جگہ سے نکالیں، اور اپنے پاس سے زور و قوت کو میرا مددگار بنا دیں O

وَ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾

اور (اے رسولِ اکرم!) آپ کہہ دیجئے کہ برحق دین آ گیا اور باطل دین مٹ گیا، بے شک باطل دین ہے ہی مٹنے والا O

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾

اور ہم قرآن نازل فرماتے ہیں جو مومنین کے لیے شفاء اور رحمت ہے، اور وہ قرآن کافروں کے صرف نقصان میں ہی اضافہ کرتا ہے O

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا ﴿۸۳﴾

اور جب ہم انسان کو نعمت عطا فرماتے ہیں تو وہ شکر کی ادائیگی سے منہ موڑ لیتا ہے اور پہلو تہی کرتا ہے، اور جب اس کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ مایوس ہو جاتا ہے O

قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ۭ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ﴿۸۴﴾ ع

(اے رسولِ اکرم!) آپ کہیے: ہر شخص اپنے طریقہ کے مطابق عمل کرتا ہے، پس تمہارے رب ہی اس کو خوب جانتے ہیں جو سب سے زیادہ سیدھے راستہ پر ہے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''سورج کے زوال سے لے کر رات کی تاریکی تک نماز قائم کیا کریں اور فجر کی نماز میں قرآنِ مجید پڑھا کریں، بے شک فجر کی نماز میں قرآن پڑھتے وقت فرشتے حاضر ہوتے ہیں O''
(بنی اسرائیل: ۷۸)

دلوک الشمس کے مصداق میں فقہاء کے اقوال

علامہ ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ، بنی اسرائیل: ۷۸ تا ۸۴ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ۭ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا'':

دُلوک کے معنی میں اختلاف ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ دُلوک کا معنی سورج کا غروب ہے۔ اور ابراہیم النخعی، مقاتل بن حیان، الضحاک اور السدی کا بھی یہی قول ہے۔ اور حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم نے کہا: دُلوک کا معنی ہے سورج کا زوال، اور یہی عطاء، قتادہ، مجاہد، حسن بصری اور اکثر تابعین کا قول ہے۔ اور یہ لفظ دونوں معنوں کو شامل ہے، کیونکہ دلوک کا اصل معنی ہے ایک طرف مائل ہونا۔ اور سورج جب زوال پذیر ہو یا غروب ہو تو وہ ایک طرف مائل ہوتا ہے۔ اور دُلوک کو زوال کے معنی پر محمول کرنا زیادہ بہتر ہے کیونکہ اکثر کا قول یہی ہے۔ اور اس لیے کہ جب ہم دلوک کو زوال پر محمول کریں گے تو یہ آیت نماز کے تمام اوقات کو شامل ہو جائے گی، پس سورج کا زوال ہونا یہ ظہر اور عصر کی نمازوں کو شامل ہے۔ ''اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ'' یعنی رات کی تاریکی تک تو یہ مغرب اور عشاء کو شامل ہے۔ اور ''وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ'' اس سے مراد صبح کی نماز ہے۔

فجر کی نماز کو قرآن اس لیے فرمایا کیونکہ فجر کی نماز قرآن کے پڑھے بغیر جائز نہیں ہے۔ اور "قُرْاٰنَ الْفَجْرِ" پر زبر اس لیے ہے کہ اس کا "اَقِمِ الصَّلٰوةَ" پر عطف ہے، یعنی آپ فجر کے وقت قرآن پڑھیے۔ یہ فراء کا قول ہے اور اہل بصرہ نے کہا: "وعليك قرآن الفجر" یعنی آپ پر فجر کے وقت قرآن پڑھنا لازم ہے۔

فجر کی نماز میں تلاوت قرآن کے دوران فرشتوں کا حاضر ہونا

"اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا": یعنی جب فجر کے وقت قرآن پڑھا جائے تو رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے حاضر ہوتے ہیں، یعنی رات کے فرشتے جا رہے ہوتے ہیں اور دن کے فرشتے آرہے ہوتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا تم میں سے کسی ایک کی اکیلے نماز پڑھنے پر پچیس درجہ فضیلت رکھتا ہے، رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے فجر کی نماز میں جمع ہو جاتے ہیں، پھر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھو: "اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا"۔

(صحیح البخاری: ۶۴۸، ۴۷۱۷، صحیح مسلم: ۶۴۹، ۲۳۶، ۲۲۳، مصنف عبدالرزاق: ۲۰۰۱، صحیح ابن حبان: ۲۰۵۱، موطا امام مالک: ۲۹۱، سنن ترمذی: ۲۱۶، صحیح ابن حبان: ۲۰۵۳، مستخرج ابی عوانہ ج ۲ ص ۲، سنن بیہقی ج ۳ ص ۶۰، شرح السنہ للبغوی: ۷۸۷)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور رات کے کچھ حصہ میں تہجد پڑھا کریں، یہ نماز آپ کے لیے خصوصیت سے زائد ہے، عنقریب آپ کے رب آپ کو مقام محمود پر فائز فرمائیں گے O" (بنی اسرائیل: ۷۹)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر تہجد کی نماز کی فرضیت کی تحقیق

"وَ مِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ": یعنی آپ سونے کے بعد اٹھیے اور تہجد کا وقت نیند سے اٹھنے کے بعد ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص سونے کے بعد اٹھے تو کہا جاتا ہے "تَهَجَّدَ" اور جب سوئے تو کہا جاتا ہے "هَجَدَ"، اور اس آیت سے مراد نماز کے لیے رات کو قیام کرنا ہے اور ابتداء میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر تہجد کی نماز پڑھنا فرض تھی اور امت پر بھی فرض تھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ" (المزمل: ۱-۲) "(اے رسول اکرم!) جو کپڑے میں لپٹے ہوئے ہیں O رات کو قیام کیا کیجئے مگر تھوڑی رات O"۔ پھر احکام میں تخفیف نازل ہوئی اور امت کے حق میں پانچ نمازوں کی وجہ سے تہجد کی نماز کا وجوب منسوخ ہو گیا اور اس کا استحباب باقی رہا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ" (المزمل: ۲۰) "(پس اے مسلمانو!) تم جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکتے ہو، اس کو پڑھو)۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں تہجد کا وجوب باقی رہا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین چیزیں مجھ پر فرض ہیں اور وہ تین چیزیں تمہارے لیے سنت ہیں۔ الوتر، (کی نماز پڑھنا) مسواک کرنا اور رات کا قیام کرنا۔

(معجم الاوسط للطبرانی: ۳۲۹۰، مجمع الزوائد للہیثمی ج ۸ ص ۲۶۴، المستدرک للحاکم ج ۱ ص ۳۰۰، نصب الرایہ ج ۲ ص ۱۱۵)

ابو اللیث نصر بن محمد بن احمد السمرقندی الحنفی المتوفی ۳۷۵ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ تہجد کی نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خصوصیت کے ساتھ نفل تھی۔ اور مجاہد نے کہا کہ

تہجد کی نماز صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نفل تھی، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اگلے اور پچھلے بہ ظاہر خلاف اولیٰ کاموں کی مغفرت فرمادی گئی ہے، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "نَافِلَةً لَّكَ" کا معنی ہے کہ یہ نماز آپ کے لیے زائد ہے، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ خصوصیت سے آپ کے لیے زائد ہے۔ (تفسیر السمرقندی، ج ۲ ص ۲۸۰، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۳ھ)

"نَافِلَةً لَّكَ": یعنی تہجد کی نماز کی فرضیت آپ کے لیے باقی فرائض پر زائد ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو آپ پر فرض فرمایا ہے۔ مجاہد اور قتادہ نے کہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں بھی تہجد کی نماز کی فرضیت اس طرح منسوخ ہو گئی جس طرح امت کے حق میں تہجد کی نماز کی فرضیت منسوخ ہو گئی ہے، پس آپ کے لیے بھی تہجد کی نماز نفل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ آپ کے لیے نفل ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تہجد کی نماز کے نفل ہونے کی خصوصیت کی توجیہ

اگر یہ سوال کیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تہجد کی نماز کے نفل ہونے کی خصوصیت کی کیا وجہ ہے حالانکہ یہ نماز آپ کے لیے بھی زائد ہے جس طرح باقی مسلمانوں کے لیے زائد ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ بندوں کے نوافل ان کے گناہوں کا کفارہ ہوتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اگلے اور پچھلے بہ ظاہر خلاف اولیٰ کاموں کی مغفرت فرمادی گئی ہے، تو آپ کے نوافل گناہوں کے کفارہ کے لیے نہیں ہوتے اور ان سے صرف آپ کے درجات بلند ہوتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی نمازوں کے متعلق احادیث

حضرت المغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تہجد کی نماز میں اتنا زیادہ قیام فرمایا حتیٰ کہ آپ کے دونوں پیر (مبارک) سوج گئے، آپ سے عرض کیا گیا: آپ اتنی مشقت کیوں اٹھا رہے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے تمام اگلے اور پچھلے بہ ظاہر خلاف اولیٰ کاموں کی مغفرت فرمادی ہے؟ آپ نے فرمایا: کیا میں اللہ تعالیٰ کا زیادہ شکر ادا کرنے والا بندہ نہ بنوں؟

(صحیح البخاری: ۱۱۳۰، ۴۸۳۶، ۶۴۷۱، صحیح مسلم: ۲۸۱۹، سنن بیہقی ج ۷ ص ۳۹، سنن ابن ماجہ: ۱۴۱۹، مصنف عبد الرزاق: ۴۷۴۶، مسند الحمیدی: ۷۵۹، صحیح ابن حبان: ۳۱۱، سنن بیہقی ج ۳ ص ۱۶، شمائل الترمذی: ۲۵۸)

حضرت زید بن خالد الجہنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، انہوں نے کہا: میں آج رات ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کو دیکھوں گا تو انہوں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو کھڑے ہوئے اور آپ نے دو خفیف رکعات نماز پڑھی، پھر آپ نے دو طویل رکعات نماز پڑھی، پھر آپ نے دو رکعت نماز پڑھی جو پہلی نمازوں سے کم تھی، پھر آپ نے دو رکعت نماز پڑھی جو پہلی دو رکعتوں سے کم تھی، پھر آپ نے دو رکعت نماز پڑھی جو ان سے پہلی نمازوں سے کم تھی، پھر آپ نے تین رکعت وتر نماز پڑھی، تو یہ تہجد کی تیرہ رکعات ہیں جو آپ نے پڑھیں۔

(صحیح مسلم: ۷۶۵، سنن ابوداؤد: ۱۳۶۶، سنن ابن ماجہ: ۱۳۶۲، السنن الکبریٰ للنسائی: ۱۳۳۶، ۳۹۶، شرح السنہ للبغوی: ۹۰۳، موطا امام مالک ج ۱ ص ۱۲۲، مصنف عبد الرزاق: ۴۷۱۲، صحیح ابن حبان: ۲۶۰۸، المعجم الکبیر للطبرانی: ۵۲۳۵، سنن بیہقی ج ۳ ص ۸)

ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں کس طرح

نماز پڑھتے تھے، وہ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان ہو یا غیر رمضان ہو گیارہ رکعات سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے، آپ چار رکعت نماز پڑھتے تم ان کے حسن اور طول کے متعلق نہ پوچھو، پھر آپ چار رکعات نماز پڑھتے تم ان کے حسن اور طول کے متعلق نہ پوچھو، پھر آپ تین رکعت نماز پڑھتے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا آپ وتر کی نماز پڑھنے سے پہلے سو جاتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: اے عائشہ! میری دونوں آنکھیں سوتی ہیں اور میرا دل نہیں سوتا۔

(صحیح البخاری: ۱۱۴۷، ۲۰۱۳، ۳۵۶۹، صحیح مسلم: ۷۳۸، ۱۲۵، سنن ابوداؤد: ۱۳۴۱، سنن نسائی ج ۳ ص ۲۳۴، سنن ترمذی: ۴۳۹، مصنف عبدالرزاق: ۴۷۱۱، صحیح ابن خزیمہ: ۱۱۶۶، صحیح ابن حبان: ۲۴۳۱، مسند ابی عوانہ ج ۲ ص ۳۲۷، سنن بیہقی ج ۱ ص ۱۲۲، ج ۲ ص ۴۹۵، ج ۳ ص ۶، دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۱ ص ۳۷۱۔ ۳۷۲، شرح السنۃ للبغوی: ۸۹۳)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کی نماز سے فراغت کے بعد سے لے کر فجر کی نماز تک گیارہ رکعات پڑھتے، ہر دو رکعت کے بعد سلام پھیرتے (اور آخری دوگانہ کے ساتھ ملا کر) ایک رکعت وتر پڑھتے اور اتنا طویل سجدہ کرتے جتنی دیر میں تم میں سے کوئی ایک پچاس آیات کی تلاوت کرتا ہے، پھر آپ سجدہ سے سر اٹھاتے، پھر جب موذن فجر کی اذان سے فارغ ہو جاتا اور فجر ظاہر ہو جاتی پھر آپ کھڑے ہو کر دو خفیف رکعت نماز پڑھتے، پھر آپ دائیں کروٹ پر لیٹ جاتے حتیٰ کہ موذن اقامت پڑھنے کے لیے آتا، پھر آپ نماز پڑھانے کے لیے گھر سے نکلتے۔

(صحیح البخاری: ۹۹۴، صحیح مسلم: ۷۳۶، ۱۲۲، سنن ابن ماجہ: ۱۳۵۸، سنن ابوداؤد: ۱۳۳۷، شرح السنۃ للبغوی: ۸۹۶)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رات کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھنا چاہتے تو ہم آپ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے تھے اور جب ہم آپ کو رات کے وقت سویا ہوا دیکھنا چاہتے تو آپ کو سویا ہوا دیکھتے اور آپ ایک مہینہ میں روزے رکھتے حتیٰ کہ ہم کہتے کہ اب آپ کوئی روزہ نہیں چھوڑیں گے اور آپ کسی مہینہ میں روزے چھوڑتے تھے حتیٰ کہ ہم کہتے تھے کہ اب آپ روزہ نہیں رکھیں گے۔ (گویا کہ آپ کا ہر عمل دائمی ہوتا تھا)۔

(صحیح البخاری: ۱۱۴۱، ۱۹۷۲، ۱۹۷۳، سنن ترمذی: ۷۶۹، صحیح ابن خزیمہ: ۲۱۳۴، صحیح ابن حبان: ۲۶۱۷، مسند ابویعلیٰ: ۳۸۵۲، شرح السنۃ للبغوی: ۹۲۷، صحیح ابن حبان: ۲۶۱۸، سنن بیہقی ج ۳ ص ۱۷)

"عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا": اللہ تعالیٰ کے کلام میں جب "عَسٰی" کا لفظ آئے تو وہ واجب کے معنی میں ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو وہ چیز عطا کیے بغیر نہیں چھوڑتے جس کی انہوں نے ان کو طمع دلائی ہو۔ اور "مقام محمود" سے مراد ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی امت کے لیے شفاعت کا مقام، کیونکہ اس مقام میں اولین و آخرین آپ کی حمد کریں گے۔

مقام محمود کے متعلق احادیث

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم موذن سے اذان کے کلمات سنو تو تم بھی اس کی مثل کلمات کہو، پھر مجھ پر صلوٰۃ (درود) پڑھو، کیونکہ جس نے مجھ پر ایک صلوٰۃ پڑھی تو اللہ تعالیٰ اس پر دس صلوٰتیں پڑھتا ہے، پھر میرے لیے الوسیلہ کا سوال کرو، کیونکہ الوسیلہ جنت میں ایک ایسا مقام ہے جو اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے صرف

ایک بندے کو ملے گا اور مجھے امید ہے کہ میں وہ بندہ ہوں گا، پس جس نے میرے لیے الوسیلہ کا سوال کیا تو اس کے حق میں میری شفاعت واجب ہو جائے گی۔

(صحیح مسلم: ۳۸۴، سنن ترمذی: ۳۶۱۴، سنن ابوداؤد: ۵۲۳، شرح السنۃ للبغوی: ۴۲۲، صحیح ابن خزیمہ: ۴۱۸، صحیح ابن حبان: ۱۶۹۰، ۱۶۹۲، سنن بیہقی ج ۱ص ۴۱۰، مستخرج ابی عوانہ ج ۱ص ۳۳۶، شرح معانی الآثار للطحاوی ج ۱ص ۱۴۳، عمل الیوم واللیلۃ لابن السنی ص ۴۴)

(۲) حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے اذان سنتے وقت یہ دعا کی: "اے اللہ! اس دعوت کامل کے رب اور اس کے بعد کھڑی ہونے والی نماز کے رب، حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو الوسیلہ اور الفضیلہ عطا فرمائیں اور آپ کو اس مقام محمود پر قائم فرمائیں جس کا آپ نے اُن سے وعدہ فرمایا ہے" تو اس شخص کے لیے قیامت کے دن میری شفاعت واجب ہو جائے گی۔

(صحیح البخاری: ۶۱۴، ۴۷۱۹، سنن ابوداؤد: ۵۲۹، سنن ترمذی: ۲۱۱، سنن ابن ماجہ: ۷۲۲، صحیح ابن خزیمہ: ۴۲۰، شرح السنۃ للبغوی: ۴۲۱، شرح معانی الآثار للطحاوی: ج ۱ص ۱۴۶، صحیح ابن حبان: ۱۶۸۹، عمل الیوم واللیلۃ لابن عاصم: ۸۲۶، عمل الیوم واللیلۃ لابن السنی ص ۳۵، سنن بیہقی ج ۱ص ۴۱۰)

(۳) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر نبی کی ایک دعا ہوتی ہے جو مستجاب ہوتی ہے اور میں نے اپنی دعا کو قیامت کے دن اپنی امت کی شفاعت کے لیے چھپا کر رکھا ہے اور ان شاء اللہ یہ دعا تم میں سے اس کو ملنے والی ہے جو اس حال میں مرا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بالکل شرک نہ کیا ہو۔

(صحیح بخاری: ۶۳۰۴، ۷۴۷۴، صحیح مسلم: ۱۹۸، سنن ترمذی: ۳۶۰۲، سنن ابن ماجہ: ۴۳۰۷، مسند احمد: ۷۶۵۷، موطا امام مالک: ۴۹۲، سنن دارمی: ۲۸۰۵، مصنف عبد الرزاق: ۲۰۸۶۴، صحیح ابن حبان: ۶۴۶۱، المعجم الاوسط للطبرانی: ۱۷۴۸، مسند الشہاب القضاعی: ۱۰۳۹، ۱۰۳۰، مستخرج ابی عوانہ ج ۱ص ۹۰، کتاب الایمان لابن مندہ: ۹۱۲، ۹۱۳)

(۴) حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ بے شک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ مومنین کو قیامت کے دن اسی طرح جمع فرمائیں گے، پس لوگ کہیں گے: کاش! کوئی ہمارے رب کی طرف ہماری سفارش کرے حتیٰ کہ ہمارے رب ہمیں اس جگہ سے راحت میں پہنچائیں، پس وہ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے، پس وہ کہیں گے: اے آدم! کیا آپ لوگوں کو نہیں دیکھ رہے؟ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے دستِ قدرت سے پیدا فرمایا اور آپ کے لیے فرشتوں سے سجدہ کرایا اور آپ کو ہر چیز کے نام کا علم دیا، آپ ہمارے لیے اپنے رب کے پاس شفاعت کیجئے حتیٰ کہ وہ ہم کو اس جگہ سے راحت میں لائیں، پس حضرت آدم علیہ السلام کہیں گے: میں اس مرتبہ کا نہیں ہوں، اور وہ ان سے اپنی اس خطاء کا ذکر کریں گے جس کو وہ کر چکے تھے لیکن تم نوح کے پاس جاؤ، پس بے شک وہ پہلے رسول ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے زمین والوں کی طرف بھیجا، پھر مومنین حضرت نوح علیہ السلام کے پاس آئیں گے تو وہ کہیں گے: میں اس مرتبہ کا نہیں ہوں اور وہ اپنی اس خطاء کو یاد کریں گے جو وہ کر چکے ہیں، لیکن تم ابراہیم خلیل الرحمٰن کے پاس جاؤ، پس مومنین حضرت ابراہیم کے پاس آئیں گے تو وہ کہیں گے: میں اس مرتبہ کا نہیں ہوں اور وہ ان سے اپنی ان خطاؤں کا ذکر کریں گے جو وہ کر چکے ہیں، لیکن تم موسیٰ کے پاس جاؤ، وہ ایسے بندے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے تورات عطا فرمائی اور ان سے کلام فرمایا، پس مومنین حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے تو وہ کہیں گے: میں اس مرتبہ کا نہیں ہوں اور ان سے اپنی اس خطاء کا ذکر کریں گے جو وہ کر چکے ہیں، لیکن تم عیسیٰ

کے پاس جاؤ جو اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور ان کا کلمہ اور اس کی روح ہیں، پس مومنین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے تو وہ کہیں گے: میں اس مرتبہ کا نہیں ہوں، لیکن تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ وہ ایسے بندے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام اگلے اور پچھلے بہ ظاہر خلاف اولیٰ کاموں کی مغفرت فرمادی ہے، پس مومنین میرے پاس آئیں گے، پس میں چل پڑوں گا، میں اپنے رب سے اجازت طلب کروں گا، پس میرے لیے اجازت عطا فرمائی جائے گی، پس جب میں اپنے رب کو دیکھوں گا تو ان کے لیے سجدہ میں گر جاؤں گا تو جب تک اللہ تعالیٰ چاہیں گے مجھے سجدہ میں چھوڑے رکھیں گے، پھر مجھ سے فرمایا جائے گا: اے محمد! (اپنا سر) اٹھائیے، آپ کہیے آپ کی بات سنی جائے گی اور آپ سوال کیجئے آپ کو عطا فرمایا جائے گا اور آپ شفاعت کیجئے آپ کی شفاعت قبول فرمائی جائے گی، پس میں اپنے رب کی ایسے کلمات حمد کے ساتھ حمد کروں گا جن کی اللہ نے مجھے (اسی وقت) تعلیم دی، پھر میں شفاعت کروں گا تو میرے لیے ایک حد مقرر فرمائی جائے گی، میں ان کو جنت میں داخل کردوں گا، پھر میں رجوع کروں گا، پس جب میں اپنے رب کو دیکھوں گا تو سجدہ میں گر جاؤں گا، پھر اللہ تعالیٰ جب تک چاہیں گے مجھے سجدہ میں چھوڑے رکھیں گے، پھر فرمایا جائے گا: اے محمد! (اپنا سر) اٹھائیے! آپ کہیے آپ کی بات سنی جائے گی، آپ سوال کیجئے آپ کو عطا فرمایا جائے گا، آپ شفاعت کیجئے، آپ کی شفاعت قبول فرمائی جائے گی، پس میں اپنے رب کی ایسے کلمات حمد کے ساتھ حمد کروں گا جن کی میرے رب نے (اسی وقت) تعلیم دی تھی، پھر میں شفاعت کروں گا، پس میرے لیے ایک حد مقرر فرمائی جائے گی سو میں ان کو جنت میں داخل کردوں گا، پھر میں رجوع کروں گا پس جب میں اپنے رب کو دیکھوں گا تو سجدہ میں گر جاؤں گا، پس اللہ تعالیٰ جب تک چاہیں گے مجھے (سجدہ میں) چھوڑے رکھیں گے، پھر کہا جائے گا: اے محمد! (اپنا سر) اٹھائیے اور سوال کیجئے آپ کو عطا فرمایا جائے گا اور آپ شفاعت کیجئے آپ کی شفاعت قبول فرمائی جائے گی، پس میں اپنے رب کی ایسے کلمات حمد کے ساتھ حمد کروں گا جن کی اللہ نے مجھے (اسی وقت) تعلیم دی ہے، پھر میں شفاعت کروں گا، پس میرے لیے ایک حد مقرر کی جائے گی، سو میں ان کو جنت میں داخل کردوں گا، پھر میں رجوع کروں گا، پس میں کہوں گا اے میرے رب! دوزخ میں اب صرف وہی باقی رہ گئے ہیں جن کو قرآن مجید نے روک رکھا ہے اور جن پر خلود اور دوام واجب ہو چکا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دوزخ سے ان کو نکال دیا جائے گا جنہوں نے لا الٰہ الا اللہ کہا، اور جن کے دلوں میں جَو کے برابر بھی نیکی اور خیر ہو پھر دوزخ سے ان کو نکال دیا جائے گا جنہوں نے لا الٰہ الا اللہ کہا، اور ان کے دل میں گندم کے برابر بھی خیر ہو، پھر دوزخ سے ان کو نکال دیا جائے گا جنہوں نے لا الٰہ الا اللہ کہا اور ان کے دل میں جوار کے برابر بھی خیر ہو۔

(صحیح البخاری: ۴۴، ۴۴۷۶، ۶۵۶۵، ۷۴۱۰، ۷۴۴۰، ۷۵۰۹، ۷۵۱۰، ۷۵۱۶، صحیح مسلم: ۱۹۳، سنن ترمذی: ۲۵۹۳، سنن ابن ماجہ: ۴۳۱۲، مسند احمد: ۱۲۳۶۱، صحیح ابن حبان: ۶۴۶۴، السنۃ لابن ابی عاصم: ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، کتاب الایمان لابن مندہ: ۸۶۴، مستخرج ابی عوانہ ج ۱ ص ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، الاعتقاد للبیہقی ص ۸۹، ۱۹۲)

(۵) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب لوگوں کو قبروں سے اٹھایا جائے گا تو میں سب سے پہلے اٹھوں گا، اور جب وہ وفد بنا کر جائیں گے تو میں ان کا قائد ہوں گا، اور جب وہ خاموش ہوں گے تو میں ان کا خطیب ہوں گا، اور جب انہیں میدانِ محشر میں روک لیا جائے گا تو میں ان کی شفاعت کرنے والا ہوں گا، اور جب وہ مایوس ہو جائیں گے تو

میں ان کو بشارت دینے والا ہوں گا، اور اس دن تمام چابیاں میرے ہاتھ میں ہوں گی اور اس دن حمد کا جھنڈا میرے ہاتھ میں ہوگا، اور میں اپنے رب کے نزدیک آدم کی اولاد میں سب سے زیادہ مکرم ہوں گا، ایک ہزار خادم میرے گرد طواف کریں گے گویا کہ وہ سفید چھپے ہوئے موتی ہیں یا بکھرے ہوئے موتی ہے۔ (سنن ترمذی: ۳۶۱۰، شرح السنۃ للبغوی: ۳۵۱۸، سنن دارمی ج ۱ ص ۲۶۔۲۷)

(۶) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تمام اولاد آدم کا قیامت کے دن سردار ہوں گا، اور میں سب سے پہلے قبر سے نکلوں گا اور میں سب سے پہلے شفاعت کرنے والا ہوں گا اور میری شفاعت سب سے پہلے قبول فرمائی جائے گی۔

(صحیح مسلم: ۲۲۷۸، سنن ترمذی: ۳۶۰۵، سنن ابن ماجہ: ۴۳۰۸، شرح السنۃ للبغوی: ۳۵۱۹، صحیح ابن خزیمہ: ۱۶۶، السنۃ لابن ابی عاصم: ۷۹۲، صحیح ابن حبان: ۶۲۴۲، مسند ابویعلیٰ: ۷۱۸۰)

شفاعت کے متعلق احادیث متواترہ کثیرہ ہیں، سب سے پہلے جس نے شفاعت کا انکار کیا وہ عمرو بن عبید تھا اور اہل سنت کا اتفاق ہے کہ وہ بدعتی تھا۔

(۷) یزید بن صہیب الفقیر بیان کرتے ہیں کہ مجھے خوارج کی رائے نے پریشان کر رکھا تھا اور میں نوجوان مرد تھا، ہم ایک جماعت کے ساتھ حج کرنے کے لیے گئے، ہم مدینہ منورہ کے پاس سے گزرے، اس وقت حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کر رہے تھے اور اس حدیث میں انہوں نے جہنمیوں کا ذکر کیا، پس میں نے ان سے کہا: اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی! یہ آپ کیسی حدیث بیان کر رہے ہیں اور اللہ عزوجل تو ارشاد فرماتے ہیں: "رَبَّنَاۤ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ۔ (آل عمران: ۱۹۲)" (اے ہمارے رب! بے شک آپ نے جس کو دوزخ میں ڈال دیا تو آپ نے اس کو رسوا فرما دیا)۔ نیز اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں: "كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَاۤ اُعِیْدُوْا فِیْهَا۔ (السجدہ: ۲۰)" (جب بھی وہ اس (آگ) سے نکلنے کا ارادہ کریں گے انہیں اس میں واپس جھونک دیا جائے گا)۔ تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے کہا: اے نوجوان! کیا تم قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہو؟ میں نے کہا: جی ہاں! انہوں نے کہا: کیا تم نے مقام محمود کے متعلق سنا ہے جس پر اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فائز فرمائیں گے؟ میں نے کہا: جی ہاں! حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کہا: یہی مقام محمد ہے جو محمود ہے، اللہ تعالیٰ آپ کے وسیلے سے دوزخ سے ان کو نکال لیں گے جن کو نکالیں گے، پھر انہوں نے پل صراط کا بیان کیا اور لوگوں کے اس پر سے گزرنے کا بیان کیا، اور کچھ لوگ دوزخ سے نکال لیے جائیں گے جب کہ پہلے وہ دوزخ میں ہوں گے، پھر ہم لوٹ آئے اور ہم نے کہا: کیا تمہارا خیال ہے کہ یہ شیخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھتا ہوگا؟ (کتاب الشریعۃ للآجری: ۷۸۷، تفسیر ابن مردویہ ج ۶ ص ۳۶۰)

(۸) حضرت عبداللہ بن مسعود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ بے شک اللہ عزوجل نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا اور بے شک تمہارے پیغمبر اللہ کے خلیل ہیں اور تمام مخلوق میں سب سے زیادہ مکرم ہیں، پھر انہوں نے اس آیت کی تلاوت کی: "عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا"۔ (المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۰۲۵۶، مجمع الزوائد للہیثمی ج ۸ ص ۲۵۵)

مجاہد "عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا" کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو عرش پر بٹھائیں گے۔ اور حضرت عبداللہ بن سلام نے کہا: آپ کو اپنی کرسی پر بٹھائیں گے۔

(عبدالرزاق المہدی نے کہا: حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے اس خبر کی کوئی اصل نہیں ہے اور رہا مجاہد کا اثر تو اس کا اہل علم نے انکار کیا ہے، اور مجاہد کی اس سلسلہ میں کوئی دلیل نہیں ہے)۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور (اے رسولِ اکرم!) آپ دعا کیجئے کہ اے میرے رب! مجھے سچائی کے ساتھ داخلہ کی جگہ میں داخل فرمائیں اور سچائی کے ساتھ نکلنے کی جگہ سے نکالیں، اور اپنے پاس سے زور وقوت کو میرا مددگار بنادیں O" (بنی اسرائیل: ۸۰)

"وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ":

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، الحسن اور قتادہ نے کہا: مجھے مدینہ میں صدق کی جگہ میں داخل فرمائیں اور مجھے مکہ سے صدق کے راستے سے باہر لائیں۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کا حکم فرمایا گیا۔ الضحاک نے کہا: مجھے مکہ سے سچائی کے راستے سے مشرکین سے امن کے ساتھ باہر لائیں اور مجھے مکہ میں صدق کے ساتھ غلبہ حاصل کرتے ہوئے داخل فرمائیں۔ اور مجاہد نے کہا: مجھے اپنے اس امر میں داخل فرمائیں جس کے ساتھ آپ نے مجھے نبوت عطا فرما کر بھیجا ہے جو سچائی کے ساتھ داخل ہونے کی جگہ ہے یعنی جنت۔ اور مجھے دنیا سے سچائی کے ساتھ نکالیں۔

حسن بصری نے کہا: مجھے سچائی کے ساتھ جنت میں داخل فرمادیں اور مجھے سچائی کے ساتھ مکہ سے باہر لائیں۔ اور ایک قول ہے کہ آپ مجھے اپنی اطاعت میں داخل فرمائیں اور جن کاموں سے آپ نے منع فرمایا ہے، ان سے مجھے باہر لائیں۔

"وَاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا": اور اپنے پاس سے زور وقوت کو میرا مددگار بنادیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور (اے رسولِ اکرم!) آپ کہہ دیجئے کہ برحق دین آگیا اور باطل دین مٹ گیا، بے شک باطل دین ہے ہی مٹنے والا O" (بنی اسرائیل: ۸۱)

"وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ": اور آپ کہیے کہ حق آگیا ہے یعنی قرآن۔ "وَزَهَقَ الْبَاطِلُ": یعنی شیطان چلا گیا ہے۔

السدی نے کہا: حق سے مراد اسلام ہے اور باطل سے مراد شرک ہے۔ دوسرا قول ہے کہ حق اللہ عزوجل کی عبادت ہے اور باطل بتوں کی عبادت ہے۔ "اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا": حضرت عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دن مکہ میں داخل ہوئے اور بیت اللہ کے گرد تین سو ساٹھ بت تھے، آپ کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی، آپ وہ لکڑی ان بتوں پر مارتے اور فرماتے: "جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ"۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ہم قرآن نازل فرماتے ہیں جو مومنین کے لیے شفاء اور رحمت ہے، اور وہ قرآن کافروں کے صرف نقصان میں ہی اضافہ کرتا ہے O" (بنی اسرائیل: ۸۲)

"وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ": کہا گیا ہے کہ اس آیت میں "مِنْ" تبعیض کے لیے نہیں ہے اور اس کا معنی ہے کہ ہم قرآن میں اس چیز کو نازل فرماتے ہیں جو پورا کا پورا شفاء ہے، یعنی جس سے گمراہی اور جہالت متمیز ہو جاتی ہے اور

شبہات زائل ہو جاتے ہیں اور یہ دلوں کی شفاء ہے، کیونکہ اس سے جہل زائل ہو جاتا ہے اور مومنین کے لیے رحمت ہے۔

"وَلَا یَزِیْدُ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا خَسَارًا": کیونکہ ظالم اس سے نفع حاصل نہیں کر سکتا اور مومن اس سے نفع حاصل کرتا ہے، پس یہ مومن کے لیے رحمت ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ ظالم کے لیے خسارا اس لیے ہے کہ ہر جو آیت نازل ہوتی ہے تو ظالم اس کی تکذیب کرتا ہے اور اس سے اس کا خسارہ زیادہ ہو جاتا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور جب ہم انسان کو نعمت عطا فرماتے ہیں تو وہ شکر کی ادائیگی سے مونہہ موڑ لیتا ہے اور پہلوتہی کرتا ہے، اور جب اس کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ مایوس ہو جاتا ہے O" (بنی اسرائیل: ۸۳)

"وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ": یعنی وہ ہمارے ذکر سے مونہہ موڑتا ہے اور ہم سے دعا کرنے سے اعراض کرتا ہے۔

"وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ": اور اپنے آپ کو ہم سے دور کرتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ سے دعا اور تقرب کے حصول کو ترک کرتا ہے۔

"وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا": اور جب اسے کوئی مصیبت اور تکلیف پہنچتی ہے تو وہ مایوس اور ناامید ہو جاتا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ انسان مصیبت اور تنگی میں گڑگڑا کر دعا کرتا ہے، اور جب اس کی دعا قبول ہونے میں دیر ہو جائے تو وہ مایوس ہو جاتا ہے اور مومن کو اللہ تعالیٰ سے مایوس نہیں ہونا چاہیے خواہ اس کی دعا کے قبول ہونے میں تاخیر ہو، وہ دعا کرنے کو ترک نہ کرے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "(اے رسول اکرم!) آپ کہیے: ہر شخص اپنے طریقہ کے مطابق عمل کرتا ہے، پس تمہارے رب ہی اس کو خوب جانتے ہیں جو سب سے زیادہ سیدھے راستہ پر ہے O" (بنی اسرائیل: ۸۴)

"قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ہر انسان اپنی جہت پر عمل کرتا ہے۔ حسن اور قتادہ نے کہا: اپنی نیت پر عمل کرتا ہے۔ مقاتل نے کہا: اپنی تخلیق کے موافق عمل کرتا ہے۔ الفراء نے کہا: جس طریقہ پر اسے پیدا فرمایا گیا ہے اس پر عمل کرتا ہے۔ القتبی نے کہا: اپنی طبیعت اور جبلت پر عمل کرتا ہے۔ اور یہ سب لغات متقارب ہیں۔

"فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا": پس تمہارے رب ہی اس کو خوب جانتے ہیں جو سب سے زیادہ سیدھے راستہ پر ہے۔ (معالم التنزیل، ج ۳ ص ۱۴۸-۱۵۸، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۵﴾

اور (اے رسول اکرم!) لوگ آپ سے روح کی حقیقت کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ کہیے کہ روح میرے رب کے امر سے ہے، اور تمہیں جو علم عطا فرمایا گیا ہے وہ بہت تھوڑا ہے O

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ﴿۸۶﴾

اور اللہ کی قسم اگر ہم چاہیں تو ہم ضرور اس وحی کو لے جائیں جس کو ہم نے آپ کی طرف نازل فرمایا ہے، پھر آپ اس کے متعلق اپنے لیے ہمارے خلاف کوئی سفارش کرنے والا نہیں پائیں گے O

اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ﴿۸۷﴾

سوائے آپ کے رب کی رحمت کے، بے شک اللہ کا آپ پر بہت بڑا فضل ہے ○

قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓي اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿۸۸﴾

آپ کہیے: اگر تمام انسان اور جنات اس قرآن کی مثل لانے پر جمع ہو جائیں تو وہ اس قرآن کی مثل نہیں لا سکیں گے خواہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی ہوں ○

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۡ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۸۹﴾

اور بے شک ہم نے اس قرآن میں لوگوں کی ہدایت کے لیے ہر قسم کی مثالوں کو بار بار بیان فرمایا ہے، پس اکثر لوگوں نے سوا ناشکری کے کسی چیز کو قبول نہیں کیا ○

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ﴿۹۰﴾

اور ان کافروں نے کہا: ہم آپ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے حتیٰ کہ آپ ہمارے لیے زمین سے ایک چشمہ جاری نہ کر دیں ○

اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ﴿۹۱﴾

یا آپ کے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو جائے اور آپ اس کے درمیان سے دریا جاری کر دیں ○

اَوْ تُسْقِطَ السَّمَاۗءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ قَبِيْلًا ﴿۹۲﴾

یا آپ اپنے زعم کے مطابق ہم پر آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرا دیں، یا آپ اللہ کو اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آئیں ○

اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَاۗءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۭ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۳﴾ ع ۱۰

یا آپ کے لیے سونے کا گھر ہو یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں اور ہم آپ کے آسمان پر چڑھنے پر بھی ایمان نہیں لائیں گے حتیٰ کہ آپ ہم پر ایسی کتاب نازل کریں جس کو ہم پڑھیں، آپ کہیے: میرے رب سبحان ہیں، میں صرف بشر ہوں اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں ○

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور (اے رسول اکرم!) لوگ آپ سے روح کی حقیقت کے متعلق سوال کرتے

ہیں، آپ کہیے کہ روح میرے رب کے امر سے ہے، اور تمہیں جو علم عطا فرمایا گیا ہے وہ بہت تھوڑا ہے O"
(بنی اسرائیل: ۸۵)

روح کے علم کی تحقیق

القاضی مجیر الدین بن محمد العلیمی المقدسی الحنبلی المتوفی ۹۲۸ھ، بنی اسرائیل: ۸۵ تا ۹۳ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ": حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، پس آپ مدینہ کے کھیتوں کے پاس سے گزرے اور اس وقت ان میں یہود کی ایک جماعت تھی، پس انہوں نے ایک دوسرے سے کہا: ان سے روح کے متعلق سوال کرو، پس اگر انہوں نے ایسا جواب دیا جس کو تم پہچانتے ہو تو یہ نبی نہیں ہیں، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہود کے نزدیک تورات میں یہ مقرر تھا کہ روح کے علم کے ساتھ اللہ تعالیٰ منفرد ہیں اور اپنے بندوں میں سے کسی کو بھی روح کی حقیقت پر مطلع نہیں فرماتے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ان میں سے بعض نے کہا: ان سے روح کے متعلق نہ پوچھو، کہیں یہ ایسا جواب نہ دیں جو تم کو ناپسند ہو، لیکن انہوں نے کہا: ان سے سوال کرو، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی لاٹھی پر ٹیک لگائے ہوئے کھڑے ہوئے تھے، میں نے یہ گمان کیا کہ آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: "وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ"۔
(صحیح البخاری: ۴۷۲۱، صحیح مسلم: ۲۷۹۴)

جمہور نے کہا: یہ سوال ان ارواح کے متعلق تھا جو جاندار انسانوں میں ہوتی ہیں کہ وہ روح کیا ہے؟ پس اس اعتبار سے روح اسم جنس ہے، جمہور متکلمین نے روح کی تفسیر میں کہا ہے کہ روح ایک جسم لطیف ہے اور اس کا بدن میں اس طرح حلول ہے جس طرح پانی کا سبز پتے میں حلول ہوتا ہے اور ان میں سے اکثر نے کہا: روح عرض ہے اور یہی وہ حیات ہے جس کے وجود کی وجہ سے بدن زندہ ہوتا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ روح جبریل ہے یا اس سے بھی بڑا فرشتہ ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ روح حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور تیسرا قول یہ ہے کہ روح "القرآن" ہے۔ ابن عطیہ نے کہا کہ پہلا قول زیادہ ظاہر اور زیادہ درست ہے۔

الکواشی نے کہا کہ روح کی حقیقت میں علماء کا اختلاف ہے اور کسی شخص نے بھی اپنے دعویٰ پر دلیل قطعی پیش نہیں کی سوا اس کے کہ روح ایسی چیز ہے کہ اس کے بدن سے نکلنے سے انسان مر جاتا ہے اور جب روح بدن میں ہو تو انسان باقی رہتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے روح کی معرفت کے مشکل ہونے کی طرف یوں اشارہ فرمایا: "قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ" یعنی روح اللہ تعالیٰ کے علم سے ہے۔ "وَمَآ اُوْتِيْتُمْ": یعنی اے مومنو اور کافرو! "مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا": تمہیں جو علم عطا فرمایا گیا ہے، پس اللہ تعالیٰ کے سامنے وہ علم بہت کم ہے۔

حکایت ہے کہ روم کے سردار نے امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی طرف مکتوب لکھا اور ان سے روح کے متعلق سوال کیا، پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس آیت کو لکھا: "وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا"، پھر روم کے سردار نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف لکھا کہ یہ جواب مجھے کافی نہیں ہے، میں ایسے جواب کا ارادہ کرتا ہوں جس کو میں سمجھ سکوں، پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں اس سے زیادہ نہیں جانتا، اور یہ واقعہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش آیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے روم کے سردار کے جواب میں ان سے مشورہ کیا، پس انہوں نے لکھا: "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، روح ایک

لطیفہ ربانیہ ہے جو خزائن رحمانیہ سے نازل ہوئی ہے اور اس کو جسموں میں رکھا گیا ہے اور اللہ اس کے رزق کے ضامن ہیں اور اس کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے پاس رہن رکھا ہے"۔

میں کہتا ہوں: یہاں دو عالم ہیں، ایک عالم خلق ہے جس میں اللہ تعالیٰ چیزوں کو مادے سے پیدا فرماتے ہیں اور ایک عالم امر ہے جس میں اللہ تعالیٰ چیزوں کو محض اپنے ارشاد "کن" سے پیدا فرماتے ہیں، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ "قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ" یعنی روح عالم امر سے ہے، یعنی روح کو مادے سے نہیں پیدا فرمایا گیا بلکہ صرف لفظ "کن" سے پیدا فرمایا ہے۔ (سعیدی غفرلہٗ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اللہ کی قسم! اگر ہم چاہیں تو ہم ضرور اس وحی کو لے جائیں جس کو ہم نے آپ کی طرف نازل فرمایا ہے، پھر آپ اس کے متعلق اپنے لیے ہمارے خلاف کوئی سفارش کرنے والا نہیں پائیں گے ○" (بنی اسرائیل: ۸۶)

"وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ": ہم نے آپ پر جو وحی نازل فرمائی ہے یعنی قرآن مجید، اگر ہم چاہیں تو اس کو آپ کے سینہ سے نکال کر لے جائیں جس طرح ہم نے روح کے علم کو آپ سے روک لیا ہے۔

اس آیت کا معنی یہ ہے: اور اللہ کی قسم! اگر ہم چاہیں تو قرآن مجید کو لے جائیں اور اس کو سینوں سے اور مصاحف سے مٹا دیں۔

"ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا": پھر آپ کوئی ایسا وکیل نہ پائیں جو قرآن مجید کو واپس آپ کی طرف لے آئے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "سوائے آپ کے رب کی رحمت کے، بے شک اللہ کا آپ پر بہت بڑا فضل ہے ○" (بنی اسرائیل: ۸۷)

"اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا": یہ استثناء منقطع ہے، یعنی ہم ایسا نہیں چاہتے۔ اور یہ آپ کے رب کی آپ پر رحمت ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے آپ پر قرآن مجید نازل فرمایا اور اس کو آپ کے حافظہ میں باقی رکھا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "آپ کہیے: اگر تمام انسان اور جنات اس قرآن کی مثل لانے پر جمع ہو جائیں تو وہ اس قرآن کی مثل نہیں لا سکیں گے خواہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی ہوں ○" (بنی اسرائیل: ۸۸)

"قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓي اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ": اگر تمام انسان اور جنات ایک دوسرے کی مدد کریں کہ فصاحت و بلاغت اور وجوہ اعجاز میں اس قرآن کی مثل لے آئیں۔ "لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ": تو وہ اس کی مثل لانے پر قادر نہیں ہوں گے۔ "وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا": خواہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہوں۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب کفار نے کہا: "لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ" (الانفال: ۳۱) (اگر ہم چاہیں تو ہم بھی اس کی مثل آیتیں کہیں)۔ سو اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب فرمائی، کیونکہ قرآن مجید بلاغت کے اعلیٰ طبقات میں ہے اور مخلوق کا کلام اس کے مشابہ نہیں ہے، کیونکہ قرآن مجید غیر مخلوق ہے، اگر قرآن مجید مخلوق ہوتا تو وہ ضرور اس کی مثل لے آتے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور بے شک ہم نے اس قرآن میں لوگوں کی ہدایت کے لیے ہر قسم کی مثالوں کو بار بار بیان فرمایا ہے، پس اکثر لوگوں نے سوا ناشکری کے کسی چیز کو قبول نہیں کیاO'' (بنی اسرائیل:۸۹)

''وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ'': اور ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کی مثالیں بیان فرما دی ہیں جو لوگوں کے دلوں میں واقع ہو جاتی ہیں۔ ''فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا'': پھر لوگوں نے حق کا انکار کرتے ہوئے ان مثالوں کا انکار کر دیا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور ان کافروں نے کہا: ہم آپ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے حتیٰ کہ آپ ہمارے لیے زمین سے ایک چشمہ جاری نہ کر دیںO'' (بنی اسرائیل:۹۰)

''وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا'': اور مشرکین نے سرکشی اور ہٹ دھرمی سے مزید معجزات کو طلب کیا، جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر قرآن مجید کے معجز ہونے کی حجت قائم فرما دی تھی اور اس کے ساتھ دیگر معجزات بھی عطا فرمائے تھے۔ انہوں نے کہا: اے محمد (ﷺ) ہم آپ پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ آپ زمین سے چشمے نہ نکال لیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''یا آپ کے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو جائے اور آپ اس کے درمیان سے دریا جاری کر دیںO'' (بنی اسرائیل:۹۱)

''اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا'': یا آپ کے لیے کھجوروں اور انگوروں کے باغات ہوں جن کی ایک جانب سے دریا بہہ رہے ہوں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''یا آپ اپنے زعم کے مطابق ہم پر آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرا دیں، یا آپ اللہ کو اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آئیںO'' (بنی اسرائیل:۹۲)

''اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا'': یا آپ اللہ کو اور فرشتوں کو ہمارے روبرو ضامن بنا کر لائیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''یا آپ کے لیے سونے کا گھر ہو یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں اور ہم آپ کے آسمان پر چڑھنے پر بھی ایمان نہیں لائیں گے حتیٰ کہ آپ ہم پر ایسی کتاب نازل کریں جس کو ہم پڑھیں، آپ کہیے: میرے رب سبحان ہیں، میں صرف بشر ہوں اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوںO'' (بنی اسرائیل:۹۳)

''اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ'': یا آپ کے لیے سونے کا ایک گھر ہو، یا آپ آسمان میں چڑھ جائیں، اور ہم آپ کے آسمان پر چڑھنے کی وجہ سے بھی ایمان نہیں لائیں گے حتیٰ

کہ آپ ہم پر ایسی کتاب نازل کریں جس کو ہم خود پڑھیں اور اس کتاب میں آپ کی تصدیق ہو۔ "قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ": اے محمد (صلی اللہ علیک وسلم)! آپ ان سے کہیے: میرے رب سبحان ہیں، اس میں اللہ تعالیٰ کی تنزیہ بیان فرمائی ہے کہ ان پر کوئی حکم لگایا جائے، یا ان کے مطالبات پر تعجب کا اظہار فرمایا ہے۔

"هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا": جن چیزوں کا تم نے مطالبہ کیا ہے، یہ بشر کی طاقت میں نہیں ہیں اور کسی بشر اور کسی رسول کے لیے اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کوئی معجزہ پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔

(فتح الرحمٰن فی تفسیر القرآن، ج ۴ ص ۱۲۹۔ ۱۳۲، دار النوادر بیروت، ۱۴۳۰ھ)

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰۤى اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۴﴾

اور جب لوگوں کے پاس ہدایت آگئی تو ان کو اس پر ایمان لانے سے صرف اس چیز نے روکا کہ انہوں نے کہا: کیا اللہ تعالیٰ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟

قُلْ لَّوْ كَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰٓىٕكَةٌ یَّمْشُوْنَ مُطْمَىٕنِّیْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿۹۵﴾

(اے رسول اکرم!) آپ کہیے: اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم ضرور ان پر آسمان سے فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتے○

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًۢا بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِیْرًۢا بَصِیْرًا ﴿۹۶﴾

آپ کہیے کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ ہی کافی گواہ ہیں، بے شک وہ اپنے بندوں کی مکمل خبر رکھنے والے، انہیں دیکھنے والے ہیں○

وَ مَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَ مَنْ یُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ وَ نَحْشُرُهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْیًا وَّ بُكْمًا وَّ صُمًّا ؕ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِیْرًا ﴿۹۷﴾

اور جس کو اللہ ہدایت عطا فرمائیں تو وہی ہدایت یافتہ ہے، اور جس کو اللہ گمراہی پر چھوڑ دیں تو آپ اللہ کے سوا ہرگز اس کا کوئی مددگار نہیں پائیں گے، اور ہم قیامت کے دن ان کو مونہوں کے بل اندھا اور گونگا اور بہرا اٹھائیں گے، ان کا ٹھکانا جہنم ہے، جب بھی جہنم بجھنے لگے گی تو ہم ان کے لیے اس کو بھڑکا دیں گے○

ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ قَالُوْۤا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِیْدًا ﴿۹۸﴾

یہ ان کی سزا ہے کیونکہ انہوں نے ہماری آیتوں کے ساتھ کفر کیا اور انہوں نے کہا: کیا جب ہم (بوسیدہ) ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو ہم کو دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا؟O

اَوَ لَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَ جَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَیْبَ فِیْهِ ؕ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۹۹﴾

یا انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ جنہوں نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا ہے، وہ اس پر قادر ہیں کہ ان لوگوں کی مثل دوبارہ پیدا فرما دیں اور انہوں نے اس کے لیے ایک مدت مقرر فرمائی ہے جس کے وقوع میں کوئی شک نہیں ہے، پس ظالموں نے سوائے ناشکری کرنے کے ہر چیز سے انکار کر دیاO

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّیْۤ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْیَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ﴿۱۰۰﴾ ع

آپ کہیے: اگر تم میرے رب کی رحمتوں کے خزانوں کے مالک ہوتے تو تم خرچ ہو جانے کے خوف سے ضرور ان خزانوں کو روک رکھتے، اور انسان بہت بخیل ہےO

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”اور جب لوگوں کے پاس ہدایت آ گئی تو ان کو اس پر ایمان لانے سے صرف اس چیز نے روکا کہ انہوں نے کہا: کیا اللہ تعالیٰ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہےO“ (بنی اسرائیل: ۹۴)

علامہ ابو الفرج عبد الرحمٰن بن علی بن الجوزی الحنبلی المتوفی ۵۹۷ھ، بنی اسرائیل: ۹۳ تا ۱۰۰ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْۤا“: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس آیت میں ”النَّاس“ سے مراد اہلِ مکہ ہیں۔ مفسرین نے کہا: اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ان کو ایمان لانے سے صرف اس چیز نے منع کیا کہ ”اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰۤى اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا“ جب ان کے پاس قرآن سے ہدایت آئی تو وہ تعجب اور انکار سے کہتے: ”اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا“ کیا اللہ تعالیٰ نے بشر کو رسول بنایا ہے۔ اور اس آیت میں اختصار ہے، اصل معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی فرشتہ کو رسول کیوں نہیں بنایا تو ان کو اللہ عزوجل نے اس ارشاد سے جواب دیا:

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”(اے رسولِ اکرم!) آپ کہیے: اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم ضرور ان پر آسمان سے فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتےO“ (بنی اسرائیل: ۹۵)

"قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا": یعنی اگر زمین پر فرشتے سکونت پذیر ہوتے، اور مراد یہ ہے کہ ہر ایک کی طرف رسول اسی کی جنس سے بھیجا جاتا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "آپ کہیے کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ ہی کافی گواہ ہیں، بے شک وہ اپنے بندوں کی مکمل خبر رکھنے والے، انہیں دیکھنے والے ہیں O" (بنی اسرائیل: ۹۶)

"قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ": آپ کہیے کہ اللہ تعالیٰ میرے اور تمہارے درمیان شاہد ہیں، کیونکہ انہوں نے معجزات کو ظاہر فرمایا ہے اور میری نبوت کے اوپر دلائل پیش فرمائے ہیں۔ "اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا": مقاتل نے کہا: بے شک اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو رسالت کے ساتھ مخصوص فرمایا، کیونکہ وہ اپنے بندوں کی خبر رکھنے والے، بہ خوبی دیکھنے والے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور جس کو اللہ ہدایت عطا فرمائیں تو وہی ہدایت یافتہ ہے، اور جس کو اللہ گمراہی پر چھوڑ دیں تو آپ اللہ کے سوا ہرگز اس کا کوئی مددگار نہیں پائیں گے، اور ہم قیامت کے دن ان کو مونہوں کے بل اندھا اور گونگا اور بہرا اٹھائیں گے، ان کا ٹھکانا جہنم ہے، جب بھی جہنم بجھنے لگے گی تو ہم ان کے لیے اس کو بھڑکا دیں گے O" (بنی اسرائیل: ۹۷)

"وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جن کی ہدایت کا ارادہ فرمائیں تو ان کو ہدایت عطا فرماتے ہیں۔ "وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ": اور جس کو اللہ گمراہی پر چھوڑ دیں تو آپ اللہ کے سوا ہرگز اس کا کوئی مددگار نہیں پائیں گے۔ "وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ": اس آیت کی تفسیر میں تین اقوال ہیں:

(۱) ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کفار کو مونہوں کے بل چلائیں گے اور اس کی تائید درج ذیل حدیث سے ہوتی ہے:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرد نے کہا: یا نبی اللہ! کافر کا مونہہ کے بل کس طرح حشر کیا جائے گا؟ آپ نے فرمایا: کیا جس نے انسان کو دنیا میں دو ٹانگوں پر چلایا ہے وہ اس پر قادر نہیں ہیں کہ قیامت کے دن اس کو مونہہ کے بل چلائیں، قتادہ نے کہا: کیوں نہیں ہمارے رب کی عزت کی قسم۔

(صحیح البخاری: ۴۷۶۰، صحیح مسلم: ۲۸۰۶، ۶۵۲۳، مسند احمد: ۱۲۹۷۹، السنن الکبریٰ للنسائی: ۱۱۳۶۷، مسند ابویعلیٰ: ۳۰۴۶، حلیۃ الاولیاء لابی نعیم ج ۲ ص ۳۴۳، صحیح ابن حبان: ۷۳۲۳)

(۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ "ہم ان کو مونہہ کے بل گھسیٹتے ہوئے لاکر ان کا حشر فرمائیں گے"۔

(۳) ابن الانباری نے کہا: ہم بہت جلد ان کا حشر فرمائیں گے، اور مونہہ کے بل کا ذکر فرمانا ان کی جلدی سے عبارت ہے۔ "عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا": اس کی تفسیر میں دو قول ہیں:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "عُمْيًا" کا معنی یہ ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز نہیں دیکھیں گے جس سے ان کو خوشی ہو اور "بُكْمًا" کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنی حجت کے مطابق بول نہیں سکیں گے اور "صُمًّا" کا معنی یہ ہے کہ وہ کوئی ایسی بات نہیں سنیں گے جس

سے ان کو خوشی ہو۔ اور ایک روایت یہ ہے کہ "عُمْيًا" کا معنی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء کی طرف نہیں دیکھ سکیں گے اور "بُكْمًا" کا معنی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے خطاب اور کلام کرنے سے گونگے ہوں گے اور "صُمًّا" کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو اپنے اولیاء کی مدح فرمائی ہے، وہ اس کو نہیں سن سکیں گے اور یہ اکثرین کا قول ہے۔

(۲) مقاتل نے کہا: بعض احوالِ قیامت میں ان کا یہ حشر پہلے حشر کے بعد ہوگا، اور یہ اس وقت ہوگا جب ان سے کہا جائے گا: "اخْسَئُوْا فِيْهَا۔ (المومنون:۱۰۸)" (دفع ہوجاؤ اسی دوزخ میں پڑے رہو)، پس وہ اندھے، گونگے اور بہرے ہوجائیں گے، نہ کسی چیز کو دیکھیں گے اور نہ سنیں گے اور نہ اس کے بعد بات کرسکیں گے۔

"مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ": ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔

"كُلَّمَا خَبَتْ": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب بھی دوزخ کی آگ ساکن ہوگی۔ مفسرین نے کہا کہ دوزخ کی آگ ان کو کھائے گی اور جب ان میں کوئی چیز باقی نہیں رہے گی حتیٰ کہ وہ جلے ہوئے کوئلے ہوجائیں گے اور دوزخ اس میں کھانے کے لیے کوئی چیز نہیں پائے گی تو دوزخ ٹھنڈی ہوجائے گی، پھر ان کو دوبارہ پیدا فرمایا جائے گا۔ اور ابن قتیبہ نے کہا: جب آگ کے شعلے مدھم پڑ جائیں تو کہا جاتا ہے "خَبَتِ النَّار" پس دوزخ کی آگ کے شعلے مدھم ہوجائیں گے۔

"زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا": یعنی ہم دوزخ کی آگ کے شعلوں کو بھڑکائیں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "یہ ان کی سزا ہے کیونکہ انہوں نے ہماری آیتوں کے ساتھ کفر کیا اور انہوں نے کہا: کیا جب ہم (بوسیدہ) ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہوجائیں گے تو ہم کو دوبارہ زندہ کرکے اٹھایا جائے گا؟O" (بنی اسرائیل:۹۸)

"ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا":

حشر اور نشر کے منکرین کہتے تھے کہ مرنے کے بعد جب ہمارا جسم مٹی میں مل کر مٹی ہوجائے گا اور ہڈیاں بوسیدہ ہوکر گل جائیں گی اور ریزہ ریزہ ہوجائیں گی اور زمانے کے گزرنے سے ہمارے ذرات دوسرے ذرات میں مختلط ہوجائیں گے تو وہ ذرات ایک دوسرے سے کس طرح ممتاز ہوکر پھر جمع ہوں گے، اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جو تمام آسمانوں اور زمینوں کے خالق ہیں اور وہ عدمِ محض سے ان کو وجود میں لاچکے ہیں تو ان کے لیے ان کی مثل کو دوبارہ پیدا فرمانا کیا مشکل ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "یا انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ جنہوں نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا ہے، وہ اس پر قادر ہیں کہ ان لوگوں کی مثل دوبارہ پیدا فرمادیں اور انہوں نے اس کے لیے ایک مدت مقرر فرمائی ہے جس کے وقوع میں کوئی شک نہیں ہے، پس ظالموں نے سوائے ناشکری کرنے کے ہر چیز سے انکار کردیاO" (بنی اسرائیل:۹۹)

"اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ": یعنی اُن کو دوبارہ پیدا فرمادیں۔ اور

"مِثْلَهُمْ" سے مراد وہی لوگ ہیں، کیونکہ کسی چیز کی مثل اس کے مساوی ہوتی ہے، پس یہ جائز ہے کہ اس سے اسی چیز کو تعبیر کیا جائے۔ کہا جاتا ہے "مِثْلُكَ لَا يَفْعَلُ هٰذَا" یعنی تم جیسا شخص ایسا نہیں کر سکتا۔ اور اسی کی مثل اللہ عزوجل کا یہ ارشاد ہے: "فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَاۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ۔ (البقرۃ: ۱۳۷)" (پھر اگر وہ (اہل کتاب) اس طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لائے ہو)۔

"وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَیْبَ فِیْهِ": اور اُن کے لیے اُن کے دوبارہ پیدا فرمانے کی مدت مقرر فرما دی۔

"فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا": پس ظالموں نے اس مدت کا انکار کیا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "آپ کہیے: اگر تم میرے رب کی رحمتوں کے خزانوں کے مالک ہوتے تو تم خرچ ہو جانے کے خوف سے ضرور اُن خزانوں کو روک رکھتے، اور انسان بہت بخیل ہے O" (بنی اسرائیل: ۱۰۰)

"قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّیْۤ": ان خزانوں کی دو تفسیریں ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کے رزق کے خزانے (۲) اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے خزانے۔

"اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْیَةَ الْاِنْفَاقِ": یعنی اگر تم ان خزانوں کے مالک ہوتے جن کے اللہ عزوجل مالک ہیں تو تم فقر و فاقہ کے خوف سے اُن خزانوں کو خرچ نہ کرتے۔

"وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا": یعنی کافر بخیل اور خرچ کو روکنے والا ہے۔ قَتَّرَ يُقَتِّرُ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص خرچ کرنے میں کمی کرے۔ اور الماوردی نے کہا: اگر مخلوق میں سے کوئی ایک اللہ تعالیٰ کے خزانوں کا مالک ہوتا تو جس طرح اللہ تعالیٰ ان خزانوں کی سخاوت فرماتے ہیں وہ سخاوت نہ کرتا تو پھر ضرور وہ خرچ کرنے سے رک جاتا اور وہ فقر کے خوف سے رک جاتا اور اللہ تعالیٰ اپنی سخاوت میں ان دونوں چیزوں سے منزہ ہیں۔ (زاد المسیر فی علم التفسیر، ج ۳ ص ۵۴۔۵۶، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۲ھ)

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ فَسْــٴَـلْ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا (۱۰۱)

اور بے شک ہم نے موسیٰ کو نو (۹) واضح نشانیاں عطا فرمائیں، پس آپ بنی اسرائیل سے پوچھیے جب موسیٰ ان کے پاس آئے تو ان سے فرعون نے کہا کہ اے موسیٰ! بے شک میں تم کو جادو کیا ہوا گمان کرتا ہوں O

قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَاۤ اَنْزَلَ هٰۤؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآىِٕرَۚ وَاِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا (۱۰۲)

موسیٰ نے کہا: بے شک تجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ ان بصیرت افروز نشانیوں کو آسمانوں اور زمینوں کے رب نے ہی نازل فرمایا ہے اور اے فرعون! بے شک میں ضرور گمان کرتا ہوں کہ تو ہلاک کیا جانے والا ہے O

فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِیْعًا (۱۰۳)

پس فرعون نے ارادہ کیا کہ موسیٰ (اور بنی اسرائیل) کو سرزمین مصر سے نکال دے، پس ہم نے فرعون کو اور اس کے ساتھیوں کو (سمندر میں) غرق فرما دیا O

وَّ قُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِیْفًا ﴿۱۰۴﴾

اور اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے فرمایا کہ تم اس سرزمین میں رہو، پھر جب آخرت کا وعدہ آ جائے گا تو ہم تم سب کو جمع فرما کر لے آئیں گے O

وَ بِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ﴿۱۰۵﴾

اور ہم نے قرآن مجید کو حق کے ساتھ نازل فرمایا ہے اور وہ حق کے ساتھ نازل ہوا ہے، اور ہم نے آپ کو صرف ثواب کی خوش خبری دینے والا اور عذاب سے ڈرانے والا ہی بنا کر بھیجا ہے O

وَ قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّ نَزَّلْنٰهُ تَنْزِیْلًا ﴿۱۰۶﴾

اور ہم نے قرآن مجید کو متفرق طور پر نازل فرمایا تا کہ آپ اسے لوگوں کے سامنے وقفے وقفے سے پڑھیں اور ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل فرمایا ہے O

قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ﴿۱۰۷﴾

آپ کہیے: اے کافرو! تم اس قرآن پر ایمان لاؤ یا ایمان نہ لاؤ (اس سے اللہ کو کوئی فرق نہیں پڑے گا)، بے شک جن لوگوں کو اس کو نازل فرمانے سے پہلے علم عطا فرمایا گیا تھا جب ان پر اس قرآن (مجید) کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ اپنی ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر جاتے ہیں O

وَّ یَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿۱۰۸﴾

اور کہتے ہیں: ہمارے رب سبحان ہیں، بے شک ہمارے رب کا وعدہ ضرور پورا ہی ہونے والا تھا O

وَ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْكُوْنَ وَ یَزِیْدُهُمْ خُشُوْعًا ﴿۱۰۹﴾

وہ روتے ہوئے اپنی ٹھوڑیوں کے بل گر جاتے ہیں اور قرآن اُن کے خوف میں اضافہ فرماتا ہے O

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ وَ لَا تَجْهَرْ

بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًا ﴿۱۱۰﴾

آپ کہیے: تم اللہ کو پکارو یا رحمٰن کو پکارو، تم جس نام سے بھی پکارو گے تو اللہ کے لیے سب عمدہ نام ہیں، اور آپ نماز میں نہ بہت بلند آواز سے قرآن پڑھیں اور نہ بالکل آہستہ، اور ان دونوں کے درمیان طریقہ تلاش کریں O

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا ﴿۱۱۱﴾

اور آپ کہیے: تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جنہوں نے نہ اپنے لیے اولاد بنائی ہے اور نہ ہی ان کا کوئی سلطنت میں شریک ہے اور نہ کوئی کمزوری کی بنا پر ان کا مددگار ہے، اور آپ ان کی بڑائی بیان کرتے ہوئے اللہ اکبر پڑھیں O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور بے شک ہم نے موسیٰ کو نُو (۹) واضح نشانیاں عطا فرمائیں، پس آپ بنی اسرائیل سے پوچھیے جب موسیٰ ان کے پاس آئے تو ان سے فرعون نے کہا کہ اے موسیٰ! بے شک میں تم کو جادو کیا ہوا گمان کرتا ہوں O'' (بنی اسرائیل:۱۰۱)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائی ہوئی نُو (۹) واضح نشانیاں

علامہ ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ، بنی اسرائیل: ۱۰۱ تا ۱۱۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی تِسْعَ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ'': یعنی دلالات واضحہ ۔ اور نشانیاں نُو (۹) ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور الضحاک نے کہا: وہ نُو (۹) نشانیاں یہ ہیں:

(۱) العصا (۲) الید البیضاء (۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں گرہ تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے کھول دیا (۴) سمندر کو چیر کر آپ کے لیے راستہ بنا دینا (۵) طوفان (۶) ٹڈیاں (۷) جوئیں (۸) مینڈک (۹) خون۔

عکرمہ، قتادہ، مجاہد اور عطاء نے کہا: وہ نُو (۹) نشانیاں یہ ہیں:

(۱) طوفان (۲) ٹڈیاں (۳) جوئیں (۴) مینڈک (۵) خون (۶) العصا (۷) الید البیضاء (۸) قحط کے سال (۹) پھلوں کی کمی ہونا۔ اور محمد بن کعب القرظی نے قحط کے سال اور پھلوں میں کمی کے بجائے کہا: ان کے اموال کو مٹا دینا اور سمندر۔ اور انہوں نے کہا کہ ایک مرد ان میں سے اپنے اہل کے ساتھ بستر پر ہوتا تو وہ دونوں پتھر ہو جاتے اور ان کی عورت کھڑی ہوئی روٹی پکا رہی ہوتی اور وہ پتھر ہو چکی ہوتی۔

اور بعض مفسرین نے کہا: وہ نُو (۹) نشانیاں کتاب کی آیات ہیں جیسا کہ اس حدیث میں ہے:

عبد اللہ بن سلمہ از صفوان بن عسال المرادی نے بیان کیا کہ ایک یہودی نے اپنے صاحب سے کہا: آؤ اس نبی سے سوال کریں، دوسرے نے کہا: ان کو نبی نہ کہو، اگر انہوں نے سن لیا تو ان کی چار آنکھیں ہو جائیں گی، پس وہ دونوں آئے اور آپ سے

اس آیت کے متعلق سوال کیا: "وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ" تو آپ نے فرمایا: (۱) تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ (۲) اور جس کے قتل کرنے کو اللہ نے حرام قرار فرمایا ہے اس کو حق کے سوا قتل نہ کرو (۳) اور تم زنا نہ کرو (۴) اور تم سود نہ کھاؤ (۵) اور تم جادو نہ کرو (۶) اور تم کسی بے قصور کو سلطان کے پاس قتل کرنے کے لیے نہ لے جاؤ (۷) اور کسی پاک دامن عورت کو زنا کی تہمت نہ لگاؤ (۸) اور میدانِ جنگ سے نہ بھاگو (۹) اور تم خاص طور پر یہودیو! ہفتہ کے دن حد سے تجاوز نہ کرو۔ تو ان دونوں نے نبی ﷺ کے ہاتھوں کو بوسا دیا اور ان دونوں نے کہا: ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے نبی ہیں، آپ نے فرمایا: پھر تم کو میری پیروی کرنے سے کیا چیز مانع ہے؟ تو ان دونوں نے کہا کہ بے شک حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی تھی کہ ہمیشہ ان کی اولاد میں نبی ہوتا رہے، اور ہمیں خطرہ ہے کہ اگر ہم نے آپ کی پیروی کی تو یہود ہم کو قتل کر دیں گے۔

(سنن ترمذی: ۳۱۴۴، السنن الکبریٰ للنسائی: ۳۵۴۱، ۸۶۵۶، المستدرک للحاکم ج ۱ ص ۹، سنن ابن ماجہ: ۳۷۰۵، الکشاف ج ۲ ص ۶۹۷)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ

"فَسْــٴَـلْ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِذْ جَآءَهُمْ": اے محمد (صلی اللہ علیک وسلم)! بنی اسرائیل سے پوچھیے کہ جب ان کے پاس موسیٰ آئے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خطاب رسول اللہ ﷺ سے ہو اور مراد آپ کا غیر ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نبی ﷺ نے ان سے خطاب کیا ہو اور کسی کو حکم دیا ہو کہ وہ بنی اسرائیل سے سوال کرے تاکہ بنی اسرائیل کا کذب ظاہر ہو جائے۔

"فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا": پس فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: تم پر جادو کر دیا گیا ہے اور تم جو عجیب و غریب چیزیں دکھا رہے ہو، یہ تمہارے جادو کی وجہ سے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "موسیٰ نے کہا: بے شک تجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ ان بصیرت افروز نشانیوں کو آسمانوں اور زمینوں کے رب نے ہی نازل فرمایا ہے اور اے فرعون! بے شک میں ضرور گمان کرتا ہوں کہ تو ہلاک کیا جانے والا ہے O" (بنی اسرائیل: ۱۰۲)

"قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ": بعض مفسرین نے کہا: اس خبیث فرعون کو یہ علم نہیں تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام برحق نبی ہیں، اور اگر اس کو علم ہوتا تو وہ ایمان لے آتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: فرعون کو آپ کے برحق نبی ہونے کا علم تھا لیکن اس نے عناداً ایسا کہا۔

"مَاۤ اَنْزَلَ هٰۤؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآىٕرَ": حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ان نو نشانیوں کو آسمانوں اور زمین کے رب نے بصیرت افروز بنایا ہے۔

"وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے فرعون! میں گمان کرتا ہوں کہ تو ملعون ہے۔ اور مجاہد نے کہا: تو ہلاک ہونے والا ہے۔ الفراء نے کہا: تو خیر سے روکا ہوا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پس فرعون نے ارادہ کیا کہ موسیٰ (اور بنی اسرائیل) کو سرزمینِ مصر سے نکال دے، پس ہم نے فرعون کو اور اس کے ساتھیوں کو (سمندر میں) غرق فرما دیا O" (بنی اسرائیل: ۱۰۳)

"فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ": یعنی فرعون نے ارادہ کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور بنی اسرائیل کو سرزمین مصر سے

قال دے۔ "فَاَغْرَقْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ جَمِیْعًا": سو ہم نے موسیٰ کو اور ان کی قوم کو فرعون سے نجات عطا فرمادی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے فرمایا کہ تم اس سرزمین میں رہو، پھر جب آخرت کا وعدہ آجائے گا تو ہم تم سب کو جمع فرما کر لے آئیں گے O" (بنی اسرائیل: ۱۰۴)

"وَقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ": یعنی ہم نے فرعون کے ہلاک ہونے کے بعد بنی اسرائیل سے فرمایا:

"اسْكُنُوا الْاَرْضَ": یعنی مصر اور شام کی سرزمین میں رہو۔ "فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ": پھر جب قیامت کا وعدہ پورا ہوگا۔

"جِئْنَا بِكُمْ لَفِیْفًا": تو ہم تم سب کو قیامت کے موقف میں لے آئیں گے۔

"اللفیف" کا معنی

"اللفیف" الجمع الکثیر ہے، جب کہ وہ مختلف انواع سے ہوں۔ جب لشکر مختلط ہو جائیں تو کہا جاتا ہے "لفت الجیوش" اور قیامت کے دن اسی طرح ہوگا کہ مختلف لوگ جمع ہوں گے، ان میں مومن بھی ہوں گے کافر بھی ہوں گے اور بدکار بھی ہوں گے اور نیکوکار بھی ہوں گے۔ اور الکلبی نے کہا: پس جب آخرت کا وعدہ پورا ہوگا، یعنی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے آئیں گے تو ہم تم سب کو ہر قوم سے جمع کر کے یہاں لے آئیں گے، اور یہاں تم سب جمع فرمادیے جاؤ گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ہم نے قرآنِ مجید کو حق کے ساتھ نازل فرمایا ہے اور وہ حق کے ساتھ نازل ہوا ہے، اور ہم نے آپ کو صرف ثواب کی خوش خبری دینے والا اور عذاب سے ڈرانے والا ہی بنا کر بھیجا ہے O" (بنی اسرائیل: ۱۰۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید کے متعلق آیات

"وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ": یعنی قرآنِ مجید کو ہم نے حق کے ساتھ نازل فرمایا ہے اور وہ حق کے ساتھ نازل ہوا ہے۔

"وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا": یعنی ہم نے اطاعت کرنے والوں کے لیے آپ کو خوش خبری دینے والا بنا کر بھیجا ہے۔ "وَّ نَذِیْرًا": اور نافرمانی کرنے والوں کے لیے آپ کو عذاب سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ہم نے قرآنِ مجید کو متفرق طور پر نازل فرمایا تاکہ آپ اسے لوگوں کے سامنے وقفے وقفے سے پڑھیں اور ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل فرمایا ہے O" (بنی اسرائیل: ۱۰۶)

"وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ": ایک قول یہ ہے کہ ہم نے قرآنِ مجید کو قسط وار نازل فرمایا ہے، ایک ہی مرتبہ پورا قرآن نازل نہیں فرمایا۔ حسن بصری نے کہا: ہم نے اس کو حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والا بنادیا ہے۔

"لِتَقْرَاَهٗ عَلَی النَّاسِ عَلٰی مُكْثٍ": یعنی تاکہ آپ قرآن مجید کو تیئیس (۲۳) سال کے اندر مکمل پڑھیں۔

"وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِیْلًا": یعنی ہم نے اس کو ترتیل کے ساتھ نازل فرمایا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "آپ کہیے: اے کافرو! تم اس قرآن پر ایمان لاؤ یا ایمان نہ لاؤ (اس سے اللہ کو

کوئی فرق نہیں پڑے گا)، بے شک جن لوگوں کو اس کو نازل فرمانے سے پہلے علم عطا فرمایا گیا تھا جب ان پر اس قرآن (مجید) کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ اپنی ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر جاتے ہیں O"
(بنی اسرائیل: ۱۰۷)

"قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا": اس آیت میں وعید ہے اور تہدید ہے یعنی ڈرایا ہے اور دھمکایا ہے۔

"اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ": ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد اہلِ کتاب کے مومنین ہیں، اور یہ وہ لوگ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے دینِ حق کی تلاش میں تھے، پھر آپ کے مبعوث ہونے کے بعد انہوں نے اسلام قبول کرلیا جیسے زید بن عمرو بن نفیل اور حضرت سلمان فارسی اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہما، وغیرہم۔

"اِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا": جب ان کے سامنے قرآن مجید پڑھا جاتا ہے تو یہ اپنی ٹھوڑیوں کے بل گر جاتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ وہ چہروں کے بل سجدہ میں گر جاتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور کہتے ہیں: ہمارے رب سبحان ہیں، بے شک ہمارے رب کا وعدہ ضرور پورا ہی ہونے والا تھا O" (بنی اسرائیل: ۱۰۸)

"وَّ یَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا": وہ کہتے ہیں کہ بے شک ہمارے رب سبحان ہیں اور انہوں نے جو وعدہ فرمایا تھا، بے شک وہ پورا ہونے والا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وہ روتے ہوئے اپنی ٹھوڑیوں کے بل گر جاتے ہیں اور قرآن اُن کے خوف میں اضافہ فرماتا ہے O" (بنی اسرائیل: ۱۰۹)

"یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْكُوْنَ وَ یَزِیْدُهُمْ خُشُوْعًا": یعنی وہ چہروں کے بل روتے ہوئے گر جائیں گے اور قرآن مجید کی تلاوت کے وقت رونا مستحب ہے۔ اور قرآن مجید کے نزول سے ان کے دلوں میں اپنے رب کا خوف زیادہ ہوگا۔ اس آیت کی نظیر یہ آیت ہے: "اِذَا تُتْلٰى عَلَیْهِمْ اٰیٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ بُكِیًّا۔ (مریم: ۵۸)" (جب ان کے سامنے رحمٰن کی آیتیں پڑھی جاتی تھیں تو وہ سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے زمین پر گر جاتے تھے)۔

خوفِ خدا سے رونے کی فضیلت میں احادیث

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص دوزخ میں داخل نہیں ہوگا جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے رویا حتیٰ کہ دودھ تھن میں لوٹ جائے۔ اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں چلنے سے جس پر گرد و غبار پڑا، وہ گرد و غبار اور جہنم کا دھواں کسی مسلمان کے نتھنوں میں کبھی بھی جمع نہیں ہوگا۔

(سنن ترمذی: ۲۳۱۱، ۱۶۳۳، المستدرک للحاکم ج ۴ ص ۲۵۹، شرح السنۃ للبغوی: ۳۰۶۳، صحیح ابن حبان: ۳۶۰۷)

بہز بن حکیم اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ

تین آنکھوں پر دوزخ کی آگ حرام فرما دی گئی ہے: ایک وہ آنکھ جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے روئی، دوسری وہ آنکھ جو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں بیدار رہی، اور تیسری وہ آنکھ جو اللہ تعالیٰ کے محارم کو دیکھنے سے جھکی رہی۔

(شرح السنۃ للبغوی: ۲۶۴۳، المعجم الکبیر للطبرانی ج ۱۹ ص ۴۱۶، مجمع الزوائد للہیثمی ج ۴ ص ۲۸۸، حلیۃ الاولیاء لابی نعیم ج ۵ ص ۲۰۹، الترغیب والترہیب للمنذری ج ۴ ص ۲۰۷۔۲۰۹)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''آپ کہیے: تم اللہ کو پکارو یا رحمٰن کو پکارو، تم جس نام سے بھی پکارو گے تو اللہ کے لیے سب عمدہ نام ہیں، اور آپ نماز میں نہ بہت بلند آواز سے قرآن پڑھیں اور نہ بالکل آہستہ، اور ان دونوں کے درمیان طریقہ تلاش کریں O'' (بنی اسرائیل: ۱۱۰)

اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء کا عمدہ ہونا

''قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِادْعُوا الرَّحْمٰنَ '': (آپ کہیے: تم اللہ کو پکارو یا رحمٰن کو پکارو)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں سجدہ کیا، تو آپ رو رہے تھے اور آپ سجدہ میں کہہ رہے تھے: یا اللہ یا رحمٰن، تو ابوجہل نے کہا: بے شک محمد ہم کو ہمارے خداؤں کو پکارنے سے روکتے ہیں اور خود دو خداؤں کو پکارتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

''اَيًّا مَّا تَدْعُوْا'': اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ اور رحمٰن ایک ذات کے دو اسم ہیں، تم ان دو اسموں میں سے جس اسم کو بھی پکارو۔ ''فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى '': سو اس کے تمام اسماء عمدہ ہیں۔

معتدل آواز کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کے متعلق احادیث

''وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا'': اور آپ نماز میں نہ بہت بلند آواز سے قرآن پڑھیں اور نہ بالکل آہستہ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں چھپے ہوئے تھے، آپ اپنے اصحاب کو نماز پڑھا رہے تھے اور آپ نے قرآن کی تلاوت میں اپنی آواز بلند کی، پس جب مشرکین نے سنا تو انہوں نے قرآن مجید کو برا کہا اور اس کے نازل فرمانے والے کو برا کہا اور جو اس کو لے کر آیا اس کو برا کہا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: ''وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ '' یعنی جب آپ قرآن پڑھیں تو آواز بلند نہ کریں کہ مشرکین سنیں اور پھر اس کو برا کہیں، ''وَلَا تُخَافِتْ بِهَا'' اور اتنا آہستہ نہ پڑھیں کہ آپ کے اصحاب سن نہ سکیں۔ ''وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا'': اور ان دونوں کے درمیان طریقہ تلاش کریں۔

(صحیح البخاری: ۴۷۲۲، ۷۴۹۰، ۷۵۲۵، ۷۵۴۷، صحیح مسلم: ۴۴۶، سنن ترمذی: ۳۱۴۶، سنن نسائی: ۱۰۱۱، مسند احمد: ۱۵۶، اسباب النزول للواحدی: ۵۹۶، صحیح ابن حبان: ۶۵۶۳، سنن بیہقی ج ۲ ص ۱۸۴، تفسیر الطبری: ۲۲۸۲۵)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ یہ آیت ''وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا'' دعا کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ (صحیح البخاری: ۴۷۲۳، ۶۳۲۷، ۷۵۲۶، صحیح مسلم: ۴۴۷، موطا امام مالک: ۵۰۵)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور آپ کہیے: تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جنہوں نے نہ اپنے لیے اولاد بنائی

ہے اور نہ ہی ان کا کوئی سلطنت میں شریک ہے اور نہ کوئی کمزوری کی بناء پر ان کا مددگار ہے، اور آپ ان کی بڑائی بیان کرتے ہوئے اللہ اکبر پڑھیں O" (بنی اسرائیل: ۱۱۱)

اللہ عزوجل کی حمد وثناء کے متعلق احادیث

"وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ": اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو یہ حکم فرمایا کہ وہ اللہ عزوجل کی توحید پر حمد کریں۔ اور "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" کا معنی ہے: اللہ عزوجل کی ایسی تعریف کرنا جس کے وہ اہل ہیں۔ الحسین بن الفضل نے کہا: اس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے حمد ہے جنہوں نے مجھے یہ تعلیم عطا فرمائی کہ انہوں نے کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا، اور ان کی سلطنت میں ان کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اور نہ کوئی کمزوری کی بناء پر ان کا مددگار ہے۔ مجاہد نے کہا: وہ کمزور نہیں ہیں حتیٰ کہ کسی مددگار کے محتاج ہوں جو ان کو غلبہ عطا فرمائے۔ "وَ كَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا": اور ان کی تعظیم کیجئے کہ ان کا کوئی شریک ہو یا ولی ہو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سب سے پہلے جن لوگوں کو جنت کی طرف بلایا جائے گا وہ الحمادون ہیں جو خوشی اور تکلیف میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے ہیں۔

(شرح السنۃ للبغوی: ۱۲۶۴، المستدرک للحاکم ج ۱ ص ۵۰۲، سنن بیہقی: ۸۸۷، المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۲۳۴۵، مسند البزار: ۳۱۱۳، ۱، المعجم الصغیر للطبرانی: ۲۸۸، صفۃ الجنۃ لابی نعیم: ۸۲، حلیۃ الاولیاء لابی نعیم: ج ۵ ص ۶۹، کتاب الزہد لابن المبارک: ۲۰۶)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" شکر کی اصل ہے اور جس بندے نے اللہ تعالیٰ کی حمد نہیں کی، اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کیا۔

(شرح السنۃ للبغوی: ۱۲۶۳، شعب الایمان للبیہقی: ۵۳۹۵، کتاب الآداب للبیہقی: ۸۸۸)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: افضل الدعاء اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ہے، اور افضل الذکر لا الہ الا اللہ ہے۔

(سنن ترمذی: ۳۳۸۳، سنن ابن ماجہ: ۳۸۰۰، عمل الیوم واللیلۃ للنسائی: ۸۳۱، صحیح ابن حبان: ۸۴۶، شرح السنۃ للبغوی: ۱۲۶۲، المستدرک للحاکم ج ۱ ص ۵۰۳، شعب الایمان للبیہقی: ۴۳۷۱)

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ کلام چار ہیں: (۱) لا الہ الا اللہ (۲) اللہ اکبر (۳) سبحان اللہ (۴) والحمد للہ، اور تم پر کوئی حرج نہیں ہے کہ تم ان میں سے جس کے ساتھ بھی ابتداء کرو۔

(صحیح مسلم: ۲۱۳۷، سنن ابن ماجہ: ۳۸۱۱، مسند ابوداؤد الطیالسی: ۸۹۹، عمل الیوم واللیلۃ للنسائی: ۸۴۶، ۸۴۷، المعجم الکبیر للطبرانی: ۶۷۹۱، صحیح ابن حبان: ۸۳۵، ۸۳۹)۔ (معالم التنزیل، ج ۳ ص ۱۶۵ ـ ۱۷۱، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

الکہف ١٨
سبحٰن الذی ١٥
الکہف
(١٨)
جلد سوم
897
تبیان القرآن

سورۃ الکہف کا اجمالی تعارف

سورۃ الکہف کی وجہ تسمیہ

اس سورت کا نام سورۃ الکہف اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس سورت میں "الکہف: ۹ سے الکہف: ۲۶ تک" اصحاب الکہف کا عجیب و غریب قصہ بیان فرمایا ہے جو اللہ تعالیٰ کی قدرت باہرہ پر دلیل قطعی ہے۔

سورۃ الکہف کی سورۂ بنی اسرائیل کے ساتھ مناسبت

سورۂ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کی تسبیح کے ساتھ شروع کیا گیا ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ۔ (بنی اسرائیل: ۱)" اور اس سورت کو بھی اللہ تعالیٰ کی حمد کے ساتھ شروع فرمایا گیا ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا۔ (الکہف: ۱)" اور اللہ عزوجل کی تسبیح اور ان کی تحمید اکثر جگہ ملی ہوئی ہوتی ہے جیسے قرآن مجید میں ہے: "فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ۔ (الحجر: ۹۸)" اور حدیث میں ہے:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دو کلمے (دو لفظ) رحمٰن کو محبوب ہیں اور زبان پر پڑھنے میں ہلکے ہیں اور میزان میں بھاری ہیں: "سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم"۔

(صحیح البخاری: ۶۴۰۶، ۶۶۸۲، ۷۵۶۳، صحیح مسلم: ۲۶۹۴، سنن ترمذی: ۳۴۶۷، سنن ابن ماجہ: ۳۸۰۶، مسند احمد: ۷۱۲۷)

نیز یہودیوں نے مشرکین سے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تین چیزوں کے متعلق سوال کرو: الروح کے متعلق، اصحاب الکہف کے قصہ کے متعلق اور ذوالقرنین کے قصہ کے متعلق۔ سورۂ بنی اسرائیل کے اخیر میں یہودیوں کے پہلے سوال کا ذکر ہے اور روح کے متعلق فرمایا: "وَیَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا ۝ (بنی اسرائیل: ۸۵)"۔ اور دوسرے دو سوالوں کا جواب سورۃ الکہف میں مذکور ہے۔

سورۃ الکہف کے مشمولات

(۱) سورۃ الکہف کی آیت: ۹ سے آیت: ۲۶ تک اصحاب الکہف کا قصہ بیان فرمایا ہے، اس قصہ میں ان لوگوں کے لیے مثال ہے جو اپنے عقیدے کی حفاظت کے لیے اپنے وطن، اپنے اہل اور اپنے رشتہ داروں اور اپنے مال و دولت کی قربانی دیتے ہیں۔

(۲) سورۃ الکہف کی آیت: ۶۰ سے آیت: ۸۲ تک حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کا قصہ بیان فرمایا ہے، اس میں علماء کے لیے طلب علم میں تواضع کرنے اور طلب علم کے لیے سفر کرنے کی مثال ہے۔

(۳) سورۃ الکہف کی آیت: ۸۳ سے آیت: ۹۹ تک ذوالقرنین کا قصہ بیان فرمایا ہے، اس میں حکام اور سلاطین کے لیے عبرت اور نصیحت ہے کہ ذوالقرنین مشرق سے مغرب تک کے علاقہ کا حکمران تھا، اس کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا تھا اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتا تھا۔ اور ان تینوں قصوں کے درمیان اللہ تعالیٰ نے حکمت اور نصیحت کی بہت سی باتیں بیان فرمائی ہیں۔ اور آیت: ۴۷ سے آیت: ۴۹ تک قیامت میں حشر کی کیفیت بیان فرمائی ہے اور آیت: ۵۰ سے آیت: ۵۳ تک حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کا قصہ بیان فرمایا ہے۔

آیاتھا ١١٠ — ١٨ سُوْرَۃُ الْکَھْفِ مَکِّیَّۃٌ ٦٩ — رکوعاتھا ١٢

(سورۃ الکہف کی ہے اور اس میں ایک سو دس آیات اور بارہ رکوع ہیں)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ عزوجل کے بابرکت نام سے ہی (ابتداء ہے) جو سب پر رحم فرمانے والے، نہایت مہربان ہیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۜ (١)

تمام تعریفیں اللہ کے ساتھ مخصوص ہیں جنہوں نے اپنے عبدِ مکرم پر الکتاب کو نازل فرمایا اور اس میں کوئی کجی نہیں چھوڑی O

قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۙ (٢)

وہ مستقیم کتاب ہے تاکہ اللہ کی طرف سے آنے والے سخت عذاب سے ڈرائے اور جو مومنین نیک عمل کرتے ہیں ان کو یہ بشارت دے کہ ان کے لیے اچھا اجر ہے O

مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ۙ (٣)

جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہیں O

وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۗ (٤)

اور ان لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائے جنہوں نے کہا کہ اللہ نے اپنے لیے بیٹا بنا لیا ہے O

مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ ۭ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۭ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا (٥)

اس کے متعلق نہ انہیں کوئی علم ہے نہ ان کے باپ دادا کو علم تھا، یہ بہت سخت بات ہے جو ان کے مونہوں سے نکل رہی ہے، وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ صرف جھوٹ ہے O

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓي اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا (٦)

اگر وہ اس کتاب پر ایمان نہ لائے تو شاید آپ شدتِ غم سے ان کے پیچھے اپنی جان دے دیں گے O

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ﴿٧﴾

بے شک جو کچھ زمین پر ہے اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے، تاکہ ہم لوگوں کو آزمائیں کہ کس کا عمل سب سے اچھا ہے O

وَإِنَّا لَجَاعِلُونَ مَا عَلَيْهَا صَعِيدًا جُرُزًا ﴿٨﴾

اور بے شک جو کچھ زمین پر ہے ہم اس کو بنجر زمین بنانے والے ہیں O

أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحَابَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيمِ كَانُوا مِنْ آيَاتِنَا عَجَبًا ﴿٩﴾

اے مخاطب! کیا تم نے یہ گمان کیا ہے کہ بے شک غار والے اور کتبہ والے ہی ہماری عجیب نشانیوں میں سے تھے؟ O

إِذْ أَوَى الْفِتْيَةُ إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوا رَبَّنَا آتِنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا ﴿١٠﴾

یاد کیجئے جب چند جوانوں نے غار میں پناہ لی تو انہوں نے دعا کی: اے ہمارے رب! آپ ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرمائیں اور ہمارے کاموں میں درستی مہیا فرمائیں O

فَضَرَبْنَا عَلَىٰ آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا ﴿١١﴾

پس ہم نے غار میں کئی سال تک اُن کے کانوں پر نیند کو مسلط فرما دیا O

ثُمَّ بَعَثْنَاهُمْ لِنَعْلَمَ أَيُّ الْحِزْبَيْنِ أَحْصَىٰ لِمَا لَبِثُوا أَمَدًا ﴿١٢﴾

ع ۱۲ / ۱۴

پھر ہم نے ان کو (نیند سے) اٹھا دیا تاکہ ہم یہ ظاہر فرمائیں کہ غار میں ان کے ٹھہرنے کی مدت کو دو فریقوں میں سے کس نے زیادہ یاد رکھا؟ O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "تمام تعریفیں اللہ کے ساتھ مخصوص ہیں جنہوں نے اپنے عبدِ مکرم پر الکتاب کو نازل فرمایا اور اس میں کوئی کجی نہیں چھوڑی O" (الکہف: ۱)

امام ابو منصور محمد بن محمد ماتریدی المتوفی ۳۳۳ھ، الکہف: ۱ تا ۱۲ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ": یعنی تم یوں کہو کہ حمد اور ثناء اللہ عزوجل کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ اللہ ہی نے تمام نعمتیں عطا فرمائی ہیں جیسے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ" (الانعام: ۱) "(تمام تعریفیں اللہ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا اور تاریکیوں اور روشنی کو پیدا فرمایا)، اور اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ... (فاطر: ۱)" (تمام تعریفیں اللہ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں جو تمام آسمانوں اور زمینوں کو پیدا

فرمانے والے ہیں)، اسی طرح یہاں ارشاد ہے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ۔ (الکہف: ۱)" (تمام تعریفیں اللہ کے ساتھ مخصوص ہیں جنہوں نے اپنے عبدِ مکرم پر الکتاب کو نازل فرمایا)۔

"الَّذِیْۤ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ": اللہ عزوجل نے مخلوق پر انعام فرمانے کی وجہ سے اپنی حمد وثناء فرمائی اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصیت سے ذکر فرمایا، کیونکہ قرآن مجید کا نازل فرمانا ان پر خصوصی نعمت ہے اور باقی لوگوں پر یہ بالعموم نعمت ہے۔

"وَ لَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا": اس آیت کے دو محمل ہیں (۱) یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے عبدِ مکرم پر مستقیم کتاب نازل فرمائی اور اس میں کوئی کجی نہیں رکھی۔ (۲) یہاں پر "بَلْ" کا لفظ محذوف ہے یعنی بلکہ اپنے عبدِ مکرم پر مستقیم کتاب نازل فرمائی اور اس میں کوئی کجی نہیں رکھی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وہ مستقیم کتاب ہے تاکہ اللہ کی طرف سے آنے والے سخت عذاب سے ڈرائے اور جو مومنین نیک عمل کرتے ہیں ان کو یہ بشارت دے کہ ان کے لیے اچھا اجر ہے O" (الکہف: ۲)

"قَیِّمًا لِّیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَ یُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا":

اس آیت میں فرمایا ہے کہ وہ کتاب "قیم" ہے یعنی مستقیم ہے، اور جب اس کے اندر کوئی کجی نہیں ہے تو پھر وہ قیم اور مستقیم ہی ہوگی، تو جب پہلے فرمادیا کہ اس کتاب میں کوئی کجی نہیں ہے تو پھر دوبارہ اس کتاب کو "قیم" فرمانے کی کیا توجیہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ عرب کی عادت ہے کہ وہ کلام میں تکرار کرتے ہیں اور تاکید کے لیے دوبارہ ذکر کرتے ہیں جیسے قرآن مجید میں ہے: "مُحْصَنٰتٍ غَیْرَ مُسٰفِحٰتٍ۔ (النساء: ۲۵)" (جب کہ وہ باندیاں نکاح کی قید میں آنے والی ہوں بدکاری کرنے والی نہ ہوں)، "غَیْرَ مُسٰفِحٰتٍ" کا معنی ہے: وہ بدکاری کرنے والی نہ ہوں، اور "مُحْصَنٰتٍ" کا معنی ہے: وہ پاک دامن ہوں اور ان دونوں لفظوں کا معنی واحد ہے، پس "مُحْصَنٰتٍ" کے بعد "غَیْرَ مُسٰفِحٰتٍ" کا ذکر فرمانا بھی بہ طور تاکید ہے اسی طرح اس آیت میں فرمایا ہے: "لِّیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا" اور "بأس" کا معنی بھی شدید ہے، سو "بأس" کے بعد "شدید" کا ذکر فرمانا بھی بہ طور تاکید ہے۔

لفظ "قیم" کے متعدد معانی

(۱) "قیم" کا معنی ہے شاہد، کیونکہ یہ کتاب پچھلی کتابوں پر شاہد اور گواہ ہے، یعنی یہ کتاب اس کی شہادت دیتی ہے کہ پچھلی کتابوں میں زیادتی اور کمی کی گئی ہے اور تغییر اور تحریف کی گئی ہے اور کچھ باتوں کا اضافہ کیا گیا ہے اور کچھ باتوں کی کمی کی گئی ہے، جیسے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ یَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَیْدِیْهِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِیَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا فَوَیْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَیْدِیْهِمْ وَ وَیْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا یَكْسِبُوْنَ ۞ (البقرہ: ۷۹)" (پس اُن لوگوں کے لیے خسارا ہے جو اپنے ہاتھوں سے (اللہ کی) کتاب میں لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں: یہ (لکھا ہوا) اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس کے عوض وہ قلیل معاوضہ حاصل کریں، پس اُن کے لیے اس پر خسارا ہے جس کو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا اور اُن کے لیے اُس پر خسارا ہے جو اس سے وہ کمائی حاصل کرتے ہیں O)۔

(۲) بعض مفسرین نے کہا کہ "قیم" کا معنی ہے کہ جو ہمیشہ ثابت اور قائم رہے اس میں کوئی تبدیلی نہ ہو اور نہ اس میں تغیر ہو، اس میں نہ اضافہ ہو اور نہ کمی ہو۔ اور قرآن مجید اسی طرح ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "لَا يَأْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (حم السجدہ: ۴۲)" (باطل اس کتاب کے پاس نہ تو آگے سے آسکتا ہے اور نہ پیچھے سے، یہ حکمت والے اور ہر تعریف کے مستحق کی نازل فرمائی ہوئی کتاب ہےO)۔

(۳) بعض مفسرین نے کہا کہ "قَيِّمًا" کا معنی ہے مستقیما، اور مستقیم کا معنی یہ ہے کہ جس کتاب کا بعض دوسرے بعض کی تصدیق کرے اور اس کا اول اور آخر موافق ہو، جیسے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (النساء: ۸۲)" (اور اگر یہ قرآن اللہ کے غیر کی طرف سے نازل ہوتا تو لوگ اس میں ضرور بہت اختلاف پاتے)۔ یعنی اگر یہ قرآن غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت اختلاف ہوتا اور تناقض ہوتا اور اول آخر کے خلاف ہوتا۔

"لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا": یعنی اللہ عزوجل نے اپنے عبدِ مکرم پر کتاب نازل فرمائی تاکہ یہ کتاب تم کو اللہ تعالیٰ کے سخت عذاب سے ڈرائے۔ "مِّنْ لَّدُنْهُ": تاکہ یہ کتاب کفار کو اللہ تعالیٰ کے سخت عذاب سے ڈرائے جو عذاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوگا۔

"وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا": پورے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے بشارتِ مطلقہ کو صرف ان مومنین کے لیے ذکر فرمایا ہے جنہوں نے نیک عمل کیے، رہے وہ مومنین جنہوں نے نیک عمل نہیں کیے وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ہیں، اگر اللہ تعالیٰ چاہیں گے تو ان کو معاف فرما دیں گے اور اگر چاہیں گے تو ان کے برے اعمال کے حساب سے ان کو عذاب دیں گے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہیں گے تو ان کی نیکیوں اور برائیوں کا وزن کریں گے، اگر ان کی نیکیاں ان کی برائیوں پر زائد ہوگیں تو اللہ تعالیٰ ان کی برائیوں کو نیکیوں سے بدل دیں گے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ۔ (الفرقان: ۷۰)" (اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دیں گے)۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہیںO" (الکہف: ۳)

"مَّا كِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا": یعنی اس اجر میں وہ ہمیشہ رہیں گے، انہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی اور وہ وہاں سے کسی اور جگہ نکلنے کا ارادہ نہیں کریں گے، جیسے اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا: "خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا۔ (النساء: ۵۷)" (وہ اُن میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہوں گے)۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ان لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائے جنہوں نے کہا کہ اللہ نے اپنے لیے بیٹا بنالیا ہےO" (الکہف: ۴)

"وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا": ان مشرکین کو بھی علم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو اپنا بیٹا نہیں بنایا، لیکن وہ علم کے باوجود جھوٹ بول کر کہتے ہیں: "تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ۔ (مومن: ۴۲)" (تم مجھے اللہ کے انکار کی دعوت دیتے ہو اور کہتے ہو کہ ان کے ساتھ ایسی چیز کو شریک قرار دوں جس کے رب ہونے کا مجھے کوئی علم نہیں ہے)۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اس کے متعلق نہ انہیں کوئی علم ہے نہ ان کے باپ دادا کو علم تھا، یہ بہت سخت بات ہے جو ان کے مونہوں سے نکلی ہے، وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ صرف جھوٹ ہے O'' (الکہف: ۵)

''مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ'': مشرکین کو یہ علم نہیں تھا کہ اللہ کا کوئی بیٹا نہیں ہے اور وہ جو اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹا قرار دیتے تھے وہ اپنے باپ دادا کی تقلید کی وجہ سے کہتے تھے، کیونکہ مشرکین اہل کتاب نہیں تھے جو کتاب میں پڑھ کر جان لیتے اور نہ رسولوں پر ایمان رکھنے والے تھے کہ رسولوں سے سن کر جان لیتے کہ اللہ کا کوئی بیٹا نہیں ہے، اور علم کا سبب دو چیزیں ہیں کتاب اور رسول۔

اور اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ جو شخص جہالت کی وجہ سے بھی کوئی غلط بات کہے تو اس سے مواخذہ کیا جائے گا۔

''كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا'':

یہ بہت سخت بات ہے جس کو وہ کہتے ہیں، اور وہ صرف جھوٹ کہتے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اگر وہ اس کتاب پر ایمان نہ لائے تو شاید آپ شدتِ غم سے ان کے پیچھے اپنی جان دے دیں گے !O'' (الکہف: ۶)

''فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا'': القتبی نے کہا: یعنی آپ اپنی جان کو ہلاک کرنے والے ہیں۔ اور ابوعبیدہ نے کہا: بخع نفسه یعنی جان کو نکالا، اور ان دونوں نے کہا: ''الاسف'' کا معنی ہے: غم۔ اور دوسروں نے کہا: ''الاسف'' کا معنی ہے: غضب، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ''فَلَمَّاۤ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۙ'' (الزخرف: ۵۵)'' (پھر جب قوم فرعون ہمیں غضب میں لائی تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان سب کو غرق کر دیا O)، اس آیت میں ''اٰسَفُوْنَا'' کا معنی ہے: وہ ہم کو غضب میں لائے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''بے شک جو کچھ زمین پر ہے اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے، تا کہ ہم لوگوں کو آزمائیں کہ کس کا عمل سب سے اچھا ہے O'' (الکہف: ۷)

''اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا'': بے شک جو کچھ زمین پر ہے اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ زمین میں سانپ اور بچھو بھی ہیں اور شیاطین بھی ہیں، ان میں زمین کی کونسی زینت ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ سانپ اور بچھو بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلالت کرتے ہیں۔ اور مجاہد نے کہا: اس سے مراد خصوصیت کے ساتھ مرد ہیں اور وہ زمین کی زینت ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد علماء اور صلحاء ہیں۔ اور ایک قول یہ ہے کہ زینت سے مراد زمین کا سبزہ اور درخت اور دریا ہیں، جیسا کہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَاۤ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَاۤ ۙ اَتٰىهَاۤ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (یونس: ۲۴)'' (دنیا کی زندگی کی مثال بارش کے اس پانی کی طرح ہے جس کو ہم نے آسمان سے نازل فرمایا، اس کے سبب سے زمین کی پیداوار حاصل ہوئی جس کو انسان اور مویشی کھاتے ہیں، حتیٰ کہ جب زمین کی وہ پیداوار خوش نما ہوگئی اور اس کے

کاشتکاروں کو یہ یقین ہوگیا کہ یہ زمین مکمل طور پر اُن کی دسترس میں ہے، تو اچانک رات کے وقت یا دن کے وقت اس پر ہمارا عذاب نازل ہوگیا، سو ہم نے اس خوش نما پیداوار کو کٹے ہوئے بھوسے کی شکل بنا دیا جیسے کل یہاں اس خوش نما پیداوار کا نام ونشان تک نہیں تھا، اور ہم غور وفکر کرنے والے لوگوں کے لیے اپنی آیات کو اسی طرح تفصیل سے سمجھاتے ہیں O)۔

"لِنَبْلُوَهُمْ اَیُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا": تاکہ ہم بندوں کا امتحان لیں کہ ان میں کون زیادہ اچھے عمل کرنے والا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ان میں سے کون دنیا کو ترک کرنے والا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور بے شک جو کچھ زمین پر ہے ہم اس کو بنجر زمین بنانے والے ہیں O" (الکہف: ۸)

"وَ اِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَیْهَا صَعِیْدًا جُرُزًا": پس "الصعید" سے مراد ہے روئے زمین۔ اور دوسرا قول ہے کہ اس سے مراد ہے مٹی۔ اور "جُرُزًا" کا معنی ہے خشک اور بنجر زمین جو کچھ نہ اگائے۔ جب زمین کا سبزہ ختم ہوجائے تو کہا جاتا ہے "جرزت الارض"۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اے مخاطب! کیا تم نے یہ گمان کیا ہے کہ بے شک غار والے اور کتبہ والے ہی ہماری عجیب نشانیوں میں سے تھے؟ O" (الکہف: ۹)

"اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِیْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰیٰتِنَا عَجَبًا": ہم متعدد آیات کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حرف استفہام ایجاب اور الزام کے معنی میں ہوتا ہے، لہٰذا اس آیت کا معنی ہے: تم جان لو کہ غار اور کتبہ والے ہماری عجیب نشانیوں میں سے تھے۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ تم یہ گمان نہ کرو کہ غار اور کتبہ والے ہماری عجیب نشانیوں میں سے ہیں اور ان سے بڑھ کر کوئی عجیب نشانی نہیں ہے، بلکہ اے مخاطب! تمہارے پاس اس سے زیادہ عجیب وغریب نشانیاں آچکی ہیں۔

"رقیم" کے متعدد معانی

(۱) بعض مفسرین نے کہا: "رقیم" کا معنی ہے الکتاب، جیسے قرآن مجید میں ہے: "كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۔ (المطففین: ۹)" (یعنی وہ لکھی ہوئی کتاب ہے)۔

(۲) "رقیم" سے مراد وہ تختی ہے جس میں غار والے جوانوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔

(۳) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ "رقیم" سے مراد وہ بستی ہے جس سے وہ جوان نکلے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: میں از خود نہیں جانتا تھا کہ "رقیم" کیا چیز ہے، لیکن میں نے کعب احبار سے سوال کیا تو ان کا زعم یہ تھا کہ "رقیم" وہ بستی ہے جس سے وہ جوان نکلے تھے۔

(۴) "رقیم" اس کتے کا نام ہے جو ان کے ساتھ تھا۔

اور ہمارے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم الکہف اور الرقیم کے معنی کو جانیں۔ اور صحابہ نے الکہف اور الرقیم کے معنی کا سوال نہیں کیا، انہوں نے صرف اصحاب الکہف والرقیم کی تعداد کے متعلق سوال کیا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کے ان شاء اللہ نہ کہنے کی تحقیق

پھر مفسرین نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اصحاب الکہف والرقیم اور ان کی خبروں کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: میں تمہیں کل اس کی خبردوں گا اور آپ نے ان شاء اللہ نہیں کہا تو اس پر اللہ تعالیٰ نے عتاب فرمایا اور اتنے اور اتنے دنوں تک وحی کے نزول کو روک لیا، پھر یہ آیت نازل ہوئی: " وَلَا تَقُوۡلَنَّ لِشَایۡءٍ اِنِّیۡ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰهُ ۫ وَاذۡكُرۡ رَّبَّكَ اِذَا نَسِیۡتَ وَقُلۡ عَسٰۤی اَنۡ یَّهۡدِیَنِ رَبِّیۡ لِاَقۡرَبَ مِنۡ هٰذَا رَشَدًا ۝ (الکہف: ۲۳۔۲۴)" (اور (اے رسول اکرم!) آپ کسی کام کے متعلق ہرگز ہرگز یہ نہ کہیں کہ میں یہ کل کرنے والا ہوں ○ مگر (اس کے ساتھ کہیں:) اگر اللہ نے چاہا، اور جب آپ بھول جائیں تو اپنے رب کو یاد کرلیا کریں اور آپ کہیے: عنقریب میرے رب مجھے اس سے بھی زیادہ (یعنی اصحاب کہف سے زیادہ) ہدایت کی باتیں بتائیں گے ○)۔

علامہ ماتریدی اس تفسیر کا رد کرتے ہیں کہ ان مفسرین نے رسول اللہ ﷺ کے متعلق جو ہم کیا ہے یہ محال ہے، کیونکہ آپ یہ کہیں کہ میں کل بتاؤں گا اور پھر نہ بتائیں تو یہ جھوٹ ہے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر یہ کہیں کہ میں تمہیں کل خبردوں گا۔ یا رسول اللہ ﷺ یہ کہیں اور آپ نے ان شاء اللہ نہ کہا ہو اور اس وجہ سے اللہ تعالیٰ آپ سے چند دن کے لیے آپ سے وحی کے نزول کو روک دیں۔ اور آپ کو اس وقت کے متعلق خبر نہ دیں جس وقت میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو خبر دی ہو، اس سے آپ کا کذب لازم آئے گا جب کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو رسالت کے لیے پسند فرمالیا ہے اور آپ کو وحی کے لیے منتخب فرمالیا ہے، یہ فاسد اور محال ہے۔ (تاویلات اہل السنہ ج ۷ ص ۱۳۲۔۱۴۰، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۶ھ)

اصحاب الکہف اور اصحاب الرقیم کا تذکرہ

علامہ ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ، الکہف: ۹ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اس میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ کس سبب سے وہ جوان غار میں گئے تھے۔ پس محمد بن اسحاق بن یسار نے کہا: انجیل کے ماننے والوں میں گناہ بہت زیادہ ہو گئے تھے اور ان کے بادشاہ بھی سرکشی کر رہے تھے حتیٰ کہ انہوں نے بتوں کی عبادت کی اور بتوں کا تقرب حاصل کرنے کے لیے جانوروں کو ذبح کیا اور ان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو حضرت مسیح علیہ السلام کے دین پر قائم تھے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت اور ان کی توحید پر برقرار تھے۔ پس جس بادشاہ نے ان کے ساتھ ایسے کام کیے وہ روم کا بادشاہ تھا اور اس کو دقیانوس کہا جاتا تھا، اس نے بتوں کی عبادت کی اور بتوں کا تقرب حاصل کرنے کے لیے جانوروں کو ذبح کیا، اور جس نے ان کی مخالفت کی ان کو قتل کر دیا۔ اور وہ روم کی بستیوں میں جاتا تھا اور روم کی بستیوں میں سے کسی ایسے شخص کو نہیں چھوڑتا تھا جو اس کے فتنہ میں مبتلا نہ ہوتا حتیٰ کہ وہ بتوں کی عبادت کرتا اور بتوں کے لیے جانوروں کو ذبح کرتا ورنہ وہ ان کو قتل کر دیتا، حتیٰ کہ وہ اصحاب کہف کے شہر میں آیا، اس شہر کا نام "افسوس" تھا۔

پس جب وہ وہاں آیا تو مومنین پر اس کا وجود بہت سخت ہوا، وہ اس سے ڈرے اور اس سے بھاگے اور دقیانوس جب اس شہر میں آیا تو اس نے حکم دیا کہ مومنین کا پیچھا کیا جائے، اور کفار سے سپاہی مقرر کیے کہ جو اہل ایمان کا ان کے گھروں میں پیچھا کریں

اوران کو دقیانوس کے پاس لائیں، پھر دقیانوس ان کو اختیار دیتا یا ان کو قتل کر دیا جائے اور یا وہ بتوں کی عبادت کریں اور بتوں کے لیے جانور ذبح کریں، پس ان میں سے بعض دنیا کی زندگی میں رغبت کرتے اور بتوں کی عبادت کرتے اور ان میں سے بعض اس کا انکار کرتے کہ غیر اللہ کی عبادت کی جائے تو وہ ان کو قتل کر دیتا۔ جب ان نوجوانوں نے یہ حال دیکھا تو وہ بہت غمگین ہوئے اور انہوں نے کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت شروع کی، وہ نماز پڑھتے، روزہ رکھتے، صدقہ دیتے، تسبیح پڑھتے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے، اور وہ روم کے معزز لوگوں میں سے تھے، اور وہ اٹھارہ (۱۸) تھے، پس وہ روئے اور اللہ تعالیٰ کی طرف گڑ گڑائے اور وہ یہ دعا کرتے تھے کہ اے ہمارے رب! اور آسمانوں اور زمینوں کے رب! ہم آپ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے، اور اگر ہم ایسا کریں اور آپ کے غیر کی عبادت کریں تو ہم یقیناً حق کے خلاف بات کہیں گے۔ اے اللہ! آپ مومنین سے اس فتنہ کو اٹھالیں اور ان سے اس مصیبت کو دور فرما دیں حتیٰ کہ وہ برسر عام آپ کی عبادت کریں۔

جب وہ اسی حال پر تھے تو وہ اپنی نماز کی جگہ میں داخل ہوئے تو ان کو دقیانوس کے سپاہیوں نے پکڑ لیا اور ان کو اس حال میں پایا کہ وہ اللہ عزوجل کو سجدہ کر رہے تھے اور رو رہے تھے اور اس سے فریاد کر رہے تھے۔ سپاہیوں نے ان سے پوچھا: تم کیوں بادشاہ کے حکم کی خلاف ورزی کر رہے ہو؟ پھر وہ پکڑ کر دقیانوس کی طرف لے گئے، سپاہیوں نے کہا: آپ لوگوں کو اس لیے جمع کرتے ہیں کہ آپ اپنے معبودوں کے لیے جانوروں کو ذبح کریں اور آپ کے شہر کے یہ جوان اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور آپ کی نافرمانی کرتے ہیں۔ دقیانوس نے ان سے پوچھا کہ تم کو ہمارے معبودوں کے لیے ذبح کرنے سے کیا چیز روکتی ہے؟ اس نے کہا: یا تو تم ہمارے معبودوں کے لیے جانوروں کو ذبح کرو ورنہ میں تم کو قتل کر دوں گا تو ان میں سے بڑی عمر کے جوان مکسلمینا نے کہا: ہمارے معبود وہ ہیں جنہوں نے آسمانوں اور زمینوں کو اپنی عظمت سے بھرا ہوا ہے، ہم ان کے سوا کسی کی ہرگز عبادت نہیں کریں گے، انہی کے لیے حمد ہے اور انہی کے لیے بڑائی ہے اور ہم ہمیشہ انہی کی تسبیح کرتے ہیں، ہم انہی کی عبادت کریں گے اور انہی سے نجات اور خیر کا سوال کریں گے۔ اور رہے یہ بت تو ہم ان کی ہرگز عبادت نہیں کریں گے تو ہمارے ساتھ جو کرنا چاہتا ہے وہ کر لے۔

پھر وہ جوان دقیانوس ظالم کے ملک سے بھاگے، انہیں یہ خطرہ تھا کہ وہ ان کو ان کے دین سے آزمائش میں مبتلا کرے گا، پھر وہ اس غار میں داخل ہو گئے۔ (معالم التنزیل ج ۳ ص ۱۷۳۔ ۱۸۱، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

الکہف کا معنی

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی شافعی متوفی ۵۰۲ھ، لکھتے ہیں:

الکہف کے معنی ہیں پہاڑ میں ایک غار۔ (المفردات ج ۲ ص ۵۷۰، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ)

علامہ سید محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی حنفی متوفی ۱۲۰۵ھ، لکھتے ہیں:

کہف کا معنی ہے ایسا گھر جس کو پہاڑ میں تراش کر بنایا گیا ہو یا وہ غار کی مثل ہو مگر وہ بہت کشادہ ہو۔

اصحاب الکہف کا مصداق

قرآن مجید میں جن اصحاب الکہف کا ذکر فرمایا ہے ان کے ناموں کے متعلق پانچ اقوال ہیں:

پہلا قول: (۱) مکسلمینا (۲) املیخا (۳) مرطونش (۴) نوالس (۵) سائیونس (۶) بطنیونس (۷) کشفوطط

دوسرا قول: (۱) ملیخا (۲) مکسلمینا (۳) مرطوس (۴) نوانس (۵) اربطانس (۶) اذنوس (۷) کند سلططنوس
تیسرا قول: (۱) مکسلمینا (۲) ملیخا (۳) مرطونس (۴) بینونس (۵) ساریونس (۶) کفشطیوس (۷) ذوانواس
چوتھا قول: (۱) مکسلمینا (۲) املیخا (۳) مرطونس (۴) یوانس (۵) ساریتوس (۶) اطنیوس (۷) کشفوطط
پانچواں قول: (۱) مکسلمینا (۲) یملیخا (۳) مرطونس (۴) بینونس (۵) دوانوانس (۶) کشفطط (۷) نونس

علامہ زمخشری نے الکشاف میں صرف آخری قول کا ذکر کیا ہے اور بعض اسماء میں تغیر کیا ہے۔

اہل الحروف اور المتکلمون نے ان اسماء کے خواص میں ذکر کیا ہے کہ جس شخص نے ان اسماء کو کسی کاغذ پر لکھا اور اس کاغذ کو گھر میں لٹکا دیا تو وہ گھر آگ لگنے سے محفوظ رہے گا اور اس کا کئی مرتبہ تجربہ کیا گیا ہے۔ اور ایک اور نام ہے "قطمیر" یہ ان کے کتے کا نام ہے، وہ اس نام کو کسی مکتوب کی طرف پر لکھتے تھے۔ (تاج العروس من جواہر القاموس، ج ۲۳ ص ۱۸۹، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۳۳۳ھ)

الرقیم کا معنی

علامہ اسماعیل بن حماد الجوہری الشافعی المتوفی ۳۹۸ھ، لکھتے ہیں:

الرقم کا معنی ہے لکھنا اور مہر لگانا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "كِتٰبٌ مَّرۡقُوۡمٌ ۝ (المطففین: ۹)" (یعنی وہ لکھی ہوئی کتاب ہے)۔ اور "الرقیم" کا معنی ہے الکتاب، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اَنَّ اَصۡحٰبَ الۡكَهۡفِ وَالرَّقِيۡمِ۔ (الکہف: ۹)"۔ کہا جاتا ہے کہ "الرقیم" ایک تختی ہے جس میں اصحاب کہف کے نام اور ان کے قصے لکھے ہوئے ہیں۔ اور عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ میں نہیں جانتا کہ الرقیم کیا چیز ہے، آیا وہ کتاب ہے یا عمارت ہے۔

(مجم الصحاح، ص ۴۲۳، دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۲۹ھ)

علامہ سید محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی حنفی متوفی ۱۲۰۵ھ، لکھتے ہیں:

ثعلب نے کہا: رقیم کا معنی ہے: اللوح یعنی تختی۔ اور قرآن مجید کی آیت میں جو رقیم کا لفظ ہے اس کی تفسیر تختی کے ساتھ کی گئی ہے۔ اور الجوہری نے ذکر کیا ہے کہ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے، انہوں نے کہا کہ میں نہیں جانتا کہ رقیم کیا چیز ہے، آیا یہ کتاب ہے یا کوئی عمارت ہے، اور علامہ کلبی نے کہا ہے: میں قرآن کے ہر لفظ کا معنی جانتا ہوں سوائے "الرقیم، غسلین، حنانا اور اواہا" کے۔ اور الضحاک اور قتادہ نے کہا ہے کہ یہ فعیل بہ معنی مفعول ہے یعنی لکھا ہوا۔

(تاج العروس من جواہر القاموس، ج ۳۲ ص ۱۳۲، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۳۳۳ھ)

علامہ ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ، الرقیم کے متعلق لکھتے ہیں:

الرقیم کے معنی میں اختلاف ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا: یہ ایک تختی ہے جس میں اصحاب الکہف کے اسماء لکھے ہوئے ہیں اور ان کے قصے لکھے ہوئے ہیں اور یہ سب سے ظاہر قول ہے۔ پھر اس تختی کو لوگوں نے غار کے دروازے پر رکھ دیا اور یہ تختی رانگ یا سیسہ کی تھی، دوسرا قول ہے کہ یہ تختی پتھر کی تھی۔ اور ایک قول یہ ہے کہ "الرقیم" اس پہاڑ کا نام ہے جس میں اصحاب الکہف تھے۔

(معالم التنزیل ج ۳ ص ۱۷۳، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

اصحاب الکہف کا قصہ

علامہ محمد بن یوسف ابوالحیان اندلسی متوفی ۷۵۴ھ لکھتے ہیں:

اصحاب کہف کے اسماء عجمی زبان میں ہیں، ان کو شکل اور نقطوں میں منضبط کرنا مشکل ہے اور ان کا قصہ بیان کرنے میں راویوں کے بیان مختلف ہیں کہ وہ کس طرح غار میں داخل ہوئے اور کس طرح غار سے نکلے، کسی صحیح حدیث میں اس واقعہ کا بیان نہیں ہے اور نہ قرآن مجید میں اس کا ذکر ہے سوا اُن آیتوں کے جن کا اس سورت میں ذکر فرمایا ہے۔

روایت ہے کہ جس کافر بادشاہ کے زمانے میں اصحاب الکہف اس کے ملک سے نکل گئے تھے اس بادشاہ کا نام دقیانوس تھا اور یہ لوگ روم کے رہنے والے تھے، اور ایک قول یہ ہے کہ یہ لوگ شام کے رہنے والے تھے، اور شام میں ایک غار ہے جس میں چند مردے پڑے ہوئے ہیں اور اس غار کے مجاور کا زعم یہ ہے کہ یہی اصحاب کہف ہیں۔ اس غار پر ایک مسجد بھی بنی ہوئی ہے جس کا نام "الرقیم" ہے، ان کے ساتھ ایک بوسیدہ کتا بھی ہے۔ اور اندلس میں غرناطہ کی جانب ایک بستی ہے جس کا نام لوشہ ہے۔ وہاں ایک غار ہے جس میں چند مردے ہیں اور ایک پرانا اور بوسیدہ کتا ہے، ان کا گوشت پوست گل چکا ہے اور صرف ہڈیوں کے ڈھانچے ہیں، اور ہم کو کوئی ایسا شخص نہیں ملا جس کو ان کے متعلق صحیح علم ہو، اور لوگوں کا گمان یہ ہے کہ یہی اصحاب کہف ہیں۔

علامہ ابن عطیہ نے کہا: میں ان کے غار میں داخل ہوا اور میں نے ان کو دیکھا تقریباً ساڑھے پانچ سو سال سے وہ اسی حال میں ہیں، اس غار کے اوپر ایک مسجد بھی بنی ہوئی ہے اور اس کے قریب ایک رومی عمارت بنی ہوئی ہے جس کا نام "الرقیم" ہے۔

علامہ ابوالحیان اندلسی لکھتے ہیں: جس وقت ہم اندلس میں تھے تو لوگ اس غار کی زیارت کرنے کے لیے آتے تھے اور وہ یہ بتاتے تھے کہ جب بھی ہم ان مردوں کو گنتے تھے تو ان کے گننے میں ہمارا اختلاف ہو جاتا تھا اور ان کے ساتھ ایک کتا بھی تھا، غرناطہ کے قریب دقیوس نام کا ایک شہر ہے، میں اس میں اَن گنت مرتبہ گیا ہوں اور میں نے وہاں بڑے بڑے پتھر دیکھے ہیں، اور جس چیز سے یہ رائے راجح قرار پاتی ہے کہ اصحاب کہف اندلس کے رہنے والے تھے وہ یہ ہے کہ اندلس میں عیسائی بہت کثرت کے ساتھ آباد تھے حتیٰ کہ عیسائیوں کی بڑی مملکت اندلس میں تھی۔ (البحر المحیط ج ۷ ص ۱۴۲۔ ۱۴۳، دارالفکر، بیروت، ۱۴۱۲ھ)

اصحاب الکہف کے متعلق دیگر مفسرین کی رائے

اصحاب الکہف کے زمانے کے بادشاہ کا نام دقیانوس تھا، اور اصحاب کہف بڑے لوگوں کے بیٹے تھے، ان کی قوم کی عید کے دن ایک اجتماع میں انہوں نے دیکھا کہ ان کی قوم بتوں کی تعظیم اور ان کو سجدے کر رہی ہے، انہوں نے نظر بصیرت سے دیکھا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں سے غفلت کے حجاب دور کر دیئے اور ان کے دلوں میں ہدایت ڈال دی اور ان کو یہ یقین ہو گیا کہ ان کی قوم کے عقائد باطل ہیں، تو انہوں نے اپنی قوم کے دین کو ترک کیا اور اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک کی عبادت پر کمر بستہ ہو گئے، ان میں سے ہر ایک جب سے توحید کا معتقد ہوا تھا، وہ باقی لوگوں سے الگ ہو گیا۔ اور یہ تمام نوجوان ایک جگہ پر مجتمع ہو گئے۔ پھر ہر نوجوان نے دوسرے نوجوان سے اس کے حالات اور کوائف کے متعلق سوال کیا اور اپنے عقائد سے اس کو خبر دی، پھر ان سب کا اس پر اتفاق ہو گیا کہ وہ اپنے دین کو بچانے کے لیے اس قوم کے درمیان سے نکل جائیں اور شر کے ظہور اور فتنہ کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ کا بھی یہی حکم ہے۔

انہوں نے کہا: ”وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَ مَا یَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ یَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَ یُهَیِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا (الکہف: ۱۶)“ (جب تم ان سے اور اللہ کے سوا ان کے معبودوں سے کنارہ کش ہو چکے ہو تو اب تم کسی غار میں پناہ لو تمہارا رب تم پر اپنی رحمت کو کھول دے گا اور تمہارے مشن میں تمہارے آسانی مہیا فرما دیں گے O)۔

اللہ تعالیٰ نے اس غار کے متعلق فرمایا ہے: ”اور اس کا دروازہ شمال کی طرف تھا اور اس کا عرض قبلہ کی طرف تھا اور گویا گرمیوں کے زمانہ میں سورج کے طلوع کی پہلی شعاعیں غار کی مغربی جانب میں پڑتی تھیں، پھر آہستہ آہستہ وہ شعاعیں باہر کی جانب نکلتی تھیں، اور جب سورج مغرب کی طرف غروب ہوتا تو سورج کی شعاعیں آہستہ آہستہ غار کی مشرق کی طرف سے نکلتیں اور سورج کی شعاعوں کو غار میں داخل فرمانے کی حکمت یہ ہے تاکہ غار کی ہوا خراب نہ ہو۔

اصحاب کہف ایک طویل زمانہ تک اسی کیفیت پر رہے، وہ نہ کھاتے تھے اور نہ پیتے تھے اور نہ ان کا جسم غذا حاصل کرتا تھا، اور اتنی مدت تک ان کا کھائے پیئے بغیر رہنا اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نشانی تھی، دیکھنے والے ان کو بیدار سمجھتے تھے حالانکہ وہ سوئے ہوئے تھے، اور ہر سال وہ ایک جانب سے دوسری جانب کروٹ بدلتے تھے۔ ان کا کتا بھی ان کی چوکھٹ پر ہاتھ پھیلائے ہوئے تھا، اس سے مراد یہ ہے کہ ان کا کتا جب قوم سے الگ ہوتے وقت ان کے ساتھ رہا تھا وہ ان کے ساتھ لگا رہا اور غار کے اندر داخل نہیں ہوا، بلکہ ان کی حفاظت کے لیے غار کے منہ پر بیٹھا رہا۔

اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کو اس چیز کی نشانی قرار دیا ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا برحق ہے، کیونکہ جب لوگوں کو یہ یقین ہو گیا کہ اصحاب کہف تین سو سال سے زیادہ تک سوتے رہے ہیں، پھر بغیر کسی تغیر اور تبدل کے وہ اٹھ کھڑے ہوئے، سو جو ذات اس پر قادر ہے کہ اصحاب کہف کو تین سو سال سلا کر پھر ان کو اسی طرح اٹھا دے، وہ اس پر بھی قادر ہے کہ مردوں کو زندہ فرما دے خواہ ان کے جسم کو کیڑے کھا چکے ہوں۔ (البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۸۔۲۱ ملخصاً دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۸ھ)

ضیاء الامت جسٹس حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری حنفی متوفی ۱۴۱۸ھ، انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

اصحاب الکہف کو اس غار میں ایک سو ستاسی برس کا عرصہ گزر گیا، جب حکمت الٰہی نے چاہا تو ان سونے والوں کو بیدار کر دیا، وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھے، انہیں بھی یہ خیال آیا کہ وہ آج معمول سے کچھ زیادہ ہی سوئے ہیں لیکن یہ بات ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ ان کو یہاں بے سدھ پڑے دو صدیاں بیت چکی ہیں، اسی لیے وہ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ کتنی دیر سوئے ہیں۔

ان کی آنکھیں کیا کھلیں بشری تقاضے بھی بیدار ہو گئے، انہیں بھوک نے ستانا شروع کر دیا، انہوں نے اپنے ایک ساتھی یملیخا کو بستی کی طرف بھیجا کہ ان کے لیے کھانا خرید لائے، جب وہ غار سے نکل کر شہر کی طرف روانہ ہوا تو وادی و کہسار وہی تھے لیکن پورا ماحول اجنبی تھا، شہر میں گئے تو در و دیوار، گلی کوچے زبانِ حال سے کچھ اور ہی داستان سنا رہی تھیں، یملیخا سوچ رہے تھے کہ یا خدا آٹھ پہر میں یہ کیا انقلاب ہو گیا، ایک نانبائی کی دکان پر گئے اور اسے کھانا دینے کے لیے کہا، اس نے کھانا دیا۔ انہوں نے وہی پرانا سکہ جو یہاں سے جاتے ہوئے وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے اس کی طرف بڑھا دیا، دکان دار اس سکہ کو دیکھ کر حیران ہو گیا، دیگر دکاندار بھی اکٹھے ہو گئے۔ یملیخا پر الزام لگایا گیا کہ اسے کوئی پرانا شاہی خزانہ ہاتھ آ گیا ہے، معاملہ حاکم شہر تک پہنچا، یہاں آ کر حقیقتِ حال سے پردہ اٹھا، انہیں پتا چلا کہ یہ ان نوجوانوں میں سے ایک ہے جو دقیانوس کے مظالم سے بھاگ کر ایک غار میں پناہ

گزیں ہو گئے تھے۔ جب لوگ حاکم شہر کی قیادت میں وہاں پہنچے تب اصحاب کہف کو معلوم ہوا کہ انہیں یہاں ٹھہرے دو صدیاں گزر چکی ہیں۔ مؤرخین کے بیان کے مطابق یہ واقعہ ۴۳۷ء میں پیش آیا جب کہ روما کے تخت پر تھیوڈوسیس (Dheosius) متمکن تھا۔ (ضیاء القرآن ج ۳ ص ۱۳۔ ۱۴ ملخصا ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور)

شیخ عبد الماجد دریا آبادی متوفی ۱۳۹۷ھ/ ۱۹۷۷ء، لکھتے ہیں:

مفسرین قدیم وجدید کی اکثریت نے اسے مسیحی دور کی حکایت قرار دیا ہے، رومی شہنشاہ دقیانوس (متوفی ۲۵۱ء) اپنے مذہب بت پرستی میں غلو رکھتا تھا، مسیحی مذہب نیا نیا اسی کے زمانے میں سلطنت روم میں پھیل رہا تھا، اس نے عیسائی موحدین پر سختی شروع کی، اس سے تنگ آ کر چند شریف نوجوان شہر سے نکل کھڑے ہوئے اور قریب کی ایک پہاڑی غار میں جا کر پناہ لی، وہاں ان پر ایک غیر طبعی بلکہ خارق عادت نیند مسلط ہو گئی اور وہ کچھ اوپر تین سو سال تک سوتے رہے، اور جب ایک اعجازی انداز سے جاگے تو خود رومی حکومت کا مذہب اسی درمیان میں شرک سے مسیحیت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ (تفسیر الماجدی ص ۶۲۸، پاک کمپنی، لاہور)

صدر الافاضل علامہ سید محمد نعیم الدین مراد آبادی حنفی متوفی ۱۳۶۷ھ، لکھتے ہیں:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد اہل انجیل کی حالت ابتر ہو گئی، وہ بت پرستی میں مبتلا ہوئے اور دوسروں کو بت پرستی پر مجبور کرنے لگے، ان میں دقیانوس بڑا جابر تھا، جو بت پرستی پر راضی نہ ہوتا اس کو قتل کر ڈالتا، اصحاب کہف شہر افسوس کے شرفاء و معززین میں سے ایماندار لوگ تھے۔ دقیانوس کے جبر و ظلم سے اپنا ایمان بچانے کے لیے بھاگے اور قریب کے پہاڑ میں ایک غار اندر پناہ گزیں ہوئے، وہاں سو گئے، تین سو برس سے زیادہ عرصہ تک اسی حال میں رہے۔

(خزائن العرفان مع ترجمہ کنز الایمان ص ۵۴۹، مکتبۃ المدینہ، کراچی، ۱۴۳۲ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "یاد کیجئے جب چند جوانوں نے غار میں پناہ لی تو انہوں نے دعا کی: اے ہمارے رب! آپ ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرمائیں اور ہمارے کاموں میں درستی مہیا فرمائیں O"

(الکہف: ۱۰)

علامہ ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ، الکہف: ۱۰، ۱۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"إِذْ أَوَى الْفِتْيَةُ إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوا رَبَّنَا آتِنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا": جب بادشاہ نے اصحاب کہف کا قصہ سنا تو وہ قوم کے ساتھ روانہ ہوا اور وہ لوگ الکہف کے دروازے پر پہنچے۔ تملیخا نے کہا: مجھے چھوڑو میں اپنے اصحاب کے پاس جاتا ہوں اور ان کو بشارت دیتا ہوں، کیونکہ اگر انہوں نے تم لوگوں کو میرے ساتھ دیکھا تو تم ان کو مرعوب کرو گے، پھر وہ غار میں داخل ہوئے اور ان کو بشارت دی، اللہ تعالیٰ نے ان کی روحوں کو قبض فرما لیا اور ان کے آثار دیکھنے سے ان کو اندھا فرما دیا۔ اور یہ اللہ عزوجل کا یہ ارشاد ہے "إِذْ أَوَى الْفِتْيَةُ إِلَى الْكَهْفِ" کہ جب وہ نوجوان غار میں پہنچے تو انہوں نے یہ دعا کی: "فَقَالُوا رَبَّنَا آتِنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا" کہ اللہ تعالیٰ اپنے پاس سے ان کو ہدایت اور رحمت عطا فرمائیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: "رَشَدًا" کا معنی ہے: سلامتی کے ساتھ غار سے نکلنے کا طریقہ۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''پس ہم نے غار میں کئی سال تک اُن کے کانوں پر نیند کو مسلط فرمادیا O''
(الکہف:۱۱)

''فَضَرَبْنَا عَلٰۤى اٰذَانِهِمْ فِی الْكَهْفِ سِنِیْنَ عَدَدًا'': یعنی ہم نے ان کو سلا دیا اور ان پر نیند ڈال دی۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ ہم نے آوازوں کو ان کے کانوں تک پہنچنے سے روک دیا، کیونکہ سونے والا جب آواز کو سنے تو بیدار ہو جاتا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''پھر ہم نے ان کو (نیند سے) اٹھا دیا تاکہ ہم یہ ظاہر فرمائیں کہ غار میں ان کے ٹھہرنے کی مدت کو دو فریقوں میں سے کس نے زیادہ یاد رکھا؟ O'' (الکہف:۱۲)

''ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ'': یعنی ہم نے انہیں کئی سال تک سلائے رکھا، پھر ہم نے ان کو (نیند سے) اٹھا دیا۔ ''لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْۤا اَمَدًا'': تاکہ ہم یہ ظاہر فرمائیں کہ غار میں ان کے ٹھہرنے کی مدت کو دو فریقوں میں سے کس نے زیادہ یاد رکھا، کیونکہ بستی والے ان کے غار میں رہنے کی مدت کے متعلق بحث کر رہے تھے، اور اس میں ان کا اختلاف تھا کہ وہ کتنی مدت تک غار میں سوتے رہے ہیں۔ ''الْحِزْبَیْنِ'' دو گروہوں سے مراد یا تو وہی اصحاب کہف کے اندر کے دو گروہ ہیں، یا ایک طرف وہ جاگنے والے اصحاب کہف اور دوسری طرف ان کے معاصر اہل شہر، اور جمہور اسی طرف گئے ہیں۔

(معالم التنزیل ج ۳ ص ۱۸۲، دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۲۰ھ)

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّؕ اِنَّهُمْ فِتْیَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنٰهُمْ هُدًىۗ ﴿۱۳﴾

ہم آپ کے سامنے (اصحاب کہف کا) قصہ صحیح خبر کے ساتھ بیان فرماتے ہیں، بے شک وہ چند جوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے اُن کی ہدایت میں اضافہ فرمایا تھا O

وَّ رَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا ﴿۱۴﴾

اور ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط فرما دیا تھا جب انہوں نے (ظالم بادشاہ کے سامنے) کھڑے ہو کر کہا: ہمارے رب آسمانوں اور زمینوں کے رب ہیں، ہم ان کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے، اگر ہم نے ایسا کہا تو وہ ناحق بات ہوگی O

هٰۤؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةًؕ لَوْ لَا یَاْتُوْنَ عَلَیْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَیِّنٍؕ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًاؕ ﴿۱۵﴾

ہماری اس قوم نے اللہ کے سوا اور معبود بنا رکھے ہیں، یہ لوگ اُن کے معبود ہونے کے ثبوت پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے، پس اس سے بڑا کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹا بہتان باندھے O

وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَ مَا یَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ یَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَ یُهَیِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ﴿۱۶﴾

اور (ان جوانوں نے ایک دوسرے سے کہا:) جب تم ان مشرکین سے اور جن کی یہ اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں الگ ہو چکے ہو تو غار میں پناہ لو تمہارے رب تمہارے لیے اپنی رحمت کو وسیع فرما دیں گے اور تمہارے لیے تمہاری مہم میں آسانی مہیا فرما دیں گے O

وَ تَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْیَمِیْنِ وَ اِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَ هُمْ فِیْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَ مَنْ یُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِیًّا مُّرْشِدًا ﴿۱۷﴾

اور اے مخاطب! تم دیکھو گے کہ جب سورج نکلتا ہے تو دھوپ ان کے غار سے دائیں جانب جھک جاتی ہے، اور جب سورج غروب ہوتا ہے تو دھوپ ان سے بائیں جانب اعراض کرتی ہے اور وہ جوان غار کی کشادگی میں ہوتے ہیں، یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، جس کو اللہ ہدایت فرماتے ہیں سو وہی ہدایت یافتہ ہے اور جس کو اللہ گمراہی پر چھوڑ دیتے ہیں تو اے مخاطب! تم اس کے لیے کوئی کارساز راستہ بتانے والا نہیں پاؤ گے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''ہم آپ کے سامنے (اصحابِ کہف کا) قصہ صحیح خبر کے ساتھ بیان فرماتے ہیں، بے شک وہ چند جوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے اُن کی ہدایت میں اضافہ فرمایا تھا O'' (الکہف:۱۳)

علامہ ابوالبرکات احمد بن محمد نسفی حنفی متوفی ۷۱۰ھ، الکہف: ۱۳ تا ۱۷ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّهُمْ فِتْیَةٌ'': (ہم آپ کے سامنے (اصحابِ کہف کا) قصہ صحیح خبر کے ساتھ بیان فرماتے ہیں۔ ''فِتْیَةٌ'' فتی کی جمع ہے، یہ وہ جوان تھے جو محارم سے اجتناب کرتے تھے اور مکارم یعنی نیک کاموں کو استعمال کرتے تھے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ الفتی اس کو کہتے ہیں جو کام کرنے سے پہلے اس کا دعویٰ نہیں کرتا اور اپنے نفس کی پاکیزگی بیان نہیں کرتا۔

''اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنٰهُمْ هُدًى'': یہ جوان اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کے یقین میں اضافہ فرمایا تھا۔

یہ دقیانوس کے خواص تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان پیوست فرما دیا تھا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط فرما دیا تھا جب انہوں نے (ظالم بادشاہ کے

سامنے) کھڑے ہو کر کہا: ہمارے رب آسمانوں اور زمینوں کے رب ہیں، ہم ان کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے، اگر ہم نے ایسا کہا تو وہ ناحق بات ہوگی O" (الکہف: ۱۴)

"وَّ رَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ": اور ہم نے ترکِ وطن کے صبر پر ان کے دلوں کو مضبوط فرما دیا تھا، اور دین کے سبب سے ان کو غار کی طرف بھاگنے پر ثابت قدم فرما دیا تھا اور حق بات کہنے کی ان کو ہمت عطا فرمائی تھی۔

"اِذْ قَامُوْا": جب وہ ظالم بادشاہ کے سامنے کھڑے ہوئے اور اس کا نام دقیانوس تھا، اور انہوں نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی کہ وہ بتوں کی عبادت کے ترک پر ان سے ناراض ہوگا اور ان پر غضب ناک ہوگا۔

"فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا": پس انہوں نے فخر سے کہا: ہمارے رب وہ ہیں جو آسمانوں اور زمینوں کے رب ہیں اور ہم اُن کو چھوڑ کر کسی اور خدا کی عبادت نہیں کریں گے۔ اور اگر ہم نے ان کو خدا قرار دیا۔ "لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا" تو یہ ایسا قول ہوگا جو بہت بڑا ظلم ہوگا اور حق سے بعید ہوگا۔ "شَطَّ یَشُطُّ" کا معنی ہے: جب کوئی چیز بعید ہو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "ہماری اس قوم نے اللہ کے سوا اور معبود بنا رکھے ہیں، یہ لوگ اُن کے معبود ہونے کے ثبوت پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے، پس اس سے بڑا کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹا بہتان باندھے O"
(الکہف: ۱۵)

"هٰۤؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً": یہ ہماری قوم ہے جس نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر خود ساختہ معبود بنا رکھے ہیں، یہ خبر بطور انکار ہے۔ "لَوْ لَا یَاْتُوْنَ عَلَیْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَیِّنٍ": پس یہ لوگ اپنی عبادت کے ثبوت پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لائے۔ "فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا": پس اس سے بڑا کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹا بہتان باندھے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور (ان جوانوں نے ایک دوسرے سے کہا:) جب تم ان مشرکین سے اور جن کی یہ اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں الگ ہو چکے ہو تو غار میں پناہ لو، تمہارے رب تمہارے لیے اپنی رحمت کو وسیع فرما دیں گے اور تمہارے لیے تمہاری مہم میں آسانی مہیا فرما دیں گے O" (الکہف: ۱۶)

"وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ": ان جوانوں نے ایک دوسرے سے اس وقت کہا جب اپنے دین کو بچانے کی خاطر ان کا بھاگنے پر عزم پختہ ہو گیا۔ "وَ مَا یَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ": یہ استثناء متصل ہے، کیونکہ ان کی قوم کے لوگ خالق کا اقرار کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں دوسروں کو شریک کرتے تھے جیسے اہلِ مکہ تھے، اور یا استثناء منقطع ہے، یعنی جب تم نے کفار کو چھوڑ دیا اور ان بتوں کو چھوڑ دیا جن کی کفار اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کرتے تھے، یا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جملہ معترضہ ہے کہ وہ جوان اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے تھے۔ "فَاْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ": سو اب تم غار میں پناہ لو۔ "یَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ": تمہارے رب اپنی رحمت سے تمہیں رزق عطا فرمائیں گے۔ "وَ یُهَیِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا": اور وہ تمہاری مہم میں آسانی فرما دیں گے، ان جوانوں نے اللہ تعالیٰ کے فضل پر اعتماد کرتے ہوئے اس طرح کہا، اور اُن کی اللہ تعالیٰ سے امید قوی تھی، کیونکہ ان کا اللہ تعالیٰ پر توکل

تھا، یا اس زمانے کے نبی نے اُن کو اس بات کی خبر دی تھی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”اور اے مخاطب! تم دیکھو گے کہ جب سورج نکلتا ہے تو دھوپ ان کے غار سے دائیں جانب جھک جاتی ہے، اور جب سورج غروب ہوتا ہے تو دھوپ ان سے بائیں جانب اعراض کرتی ہے اور وہ جوان غار کی کشادگی میں ہوتے ہیں، یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، جس کو اللہ ہدایت فرماتے ہیں سو وہی ہدایت یافتہ ہے اور جس کو اللہ گمراہی پر چھوڑ دیتے ہیں تو اے مخاطب! تم اس کے لیے کوئی کارساز راستہ بتانے والا نہیں پاؤ گے O“ (الکہف: ۱۷)

”وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ“: (اور اے مخاطب! تم دیکھو گے کہ جب سورج نکلتا ہے)۔

”تَّزٰوَرُ“ یہ لفظ اصل میں ”تتزاور“ تھا۔ یہ لفظ ”زور“ سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی میلان کرنا اور جھکنا ہے۔ اور ”الازور“ صدق سے اعراض کرنے کو کہتے ہیں۔ ”عَنْ كَهْفِهِمْ“: یعنی دھوپ ان کے غار سے اعراض کرتی ہے اور سورج کی شعاعیں ان پر نہیں پڑتیں۔ ”ذَاتَ الْيَمِيْنِ“: یعنی دائیں جانب۔ ”وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ“: اور جب سورج غروب ہوتا تو دھوپ ان کو چھوڑ دیتی ہے۔ ”ذَاتَ الشِّمَالِ“ اور ان سے بائیں جانب اعراض کرتی ہے۔ ”وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ“: اور وہ جوان غار کی کشادگی میں ہوتے ہیں۔

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ جوان پورا دن سائے میں ہوتے، سورج کے طلوع کے وقت بھی ان پر دھوپ نہیں ہوتی تھی اور نہ غروب کے وقت ان پر دھوپ ہوتی تھی، جب کہ وہ کھلی جگہ میں تھے اور دھوپ وہاں آسکتی تھی۔ اور ایک قول یہ ہے کہ وہ غار کی کھلی جگہ میں تھے اور ان کو تازہ ہوائیں اور ٹھنڈک پہنچتی تھی، اور وہ غار کی تکلیفوں کو محسوس نہیں کرتے تھے۔ ”ذٰلِكَ“: یعنی اللہ تعالیٰ نے جوان کے ساتھ کیا کہ دھوپ ان سے سورج کے طلوع اور غروب کے وقت اعراض کرتی تھی۔ ”مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ“ یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں۔

”مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا“: جس کو اللہ ہدایت فرماتے ہیں سو وہی ہدایت یافتہ ہے اور جس کو اللہ گمراہی پر چھوڑ دیتے ہیں تو اے مخاطب! تم اس کے لیے کوئی کارساز راستہ بتانے والا نہیں پاؤ گے۔

(مدارک التنزیل وحقائق التاویل، ج ۲ ص ۲۸۸۔ ۲۹۰، دار ابن کثیر، بیروت، ۱۴۳۲ھ)

وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ۖ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ؕ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ﴿۱۸﴾

اور تم ان کو بیدار گمان کرو گے حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں، اور ہم ان کو دائیں طرف اور بائیں طرف کروٹ بدلاتے ہیں، اور ان کا کتا چوکھٹ پر دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے تھا، اگر تم ان کو جھانک کر دیکھ لیتے تو ضرور پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے اور تمہارا دل ان کی

دہشت سے بھر جاتا O

وَ كَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِیَتَسَآءَلُوْا بَیْنَهُمْؕ-قَالَ قَآىٕلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْؕ-قَالُوْا لَبِثْنَا یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍؕ-قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْؕ-فَابْعَثُوْۤا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖۤ اِلَى الْمَدِیْنَةِ فَلْیَنْظُرْ اَیُّهَاۤ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْیَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَ لْیَتَلَطَّفْ وَ لَا یُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا(۱۹)

اور اسی طرح ہم نے (ایک عرصہ کے بعد) ان کو بیدار فرمایا تا کہ وہ ایک دوسرے کے حال کے متعلق سوال کریں، ان میں سے ایک شخص نے کہا: تم کتنا عرصہ یہاں ٹھہرے رہے؟ بعض نے کہا: ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرے ہیں، دوسروں نے کہا: تمہارے رب ہی خوب جاننے والے ہیں کہ تم کتنا عرصہ یہاں ٹھہرے رہے ہو، پس تم اپنے کسی ساتھی کو چاندی کا یہ سکہ دے کر شہر بھیجو پس وہ دیکھے کہ کون سا کھانا زیادہ پاکیزہ ہے سو اس میں سے وہ تمہارے لیے کھانا لے آئے، اور وہ احتیاط کے ساتھ جائے اور تمہارے متعلق کسی کو ہرگز نہ بتائے O

اِنَّهُمْ اِنْ یَّظْهَرُوْا عَلَیْكُمْ یَرْجُمُوْكُمْ اَوْ یُعِیْدُوْكُمْ فِیْ مِلَّتِهِمْ وَ لَنْ تُفْلِحُوْۤا اِذًا اَبَدًا(۲۰)

بے شک اگر وہ تمہارے حال پر مطلع ہو گئے تو وہ تمہیں سنگسار کر دیں گے یا تم کو جبراً اپنے دین کی طرف لوٹا لیں گے اور اس صورت میں تم کبھی کامیاب نہیں ہو گے O

وَ كَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَیْهِمْ لِیَعْلَمُوْۤا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَیْبَ فِیْهَاۚۤ-اِذْ یَتَنَازَعُوْنَ بَیْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَیْهِمْ بُنْیَانًاؕ-رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْؕ-قَالَ الَّذِیْنَ غَلَبُوْا عَلٰۤى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَیْهِمْ مَّسْجِدًا(۲۱)

اور اسی طرح ہم نے (شہر کے لوگوں کو) ان پر مطلع فرما دیا تا کہ وہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ برحق ہے، اور قیامت کے وقوع میں کوئی شک نہیں ہے، جب لوگ ان آپس میں ان کے متعلق جھگڑ رہے تھے تو بعض لوگوں نے کہا: ان کے غار کے اوپر کوئی عمارت بنا دو، ان کے متعلق ان کے رب ہی خوب جانتے ہیں، اور جو لوگ ان جوانوں کے معاملہ پر غالب رہے تھے انہوں نے کہا: ہم ضرور اس عمارت پر مسجد بنائیں گے O

سَیَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْۚ-وَ یَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَیْبِۚ

وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۬ۙ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۠ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾

اب جھگڑنے والے عنقریب اٹکل پچو سے کہیں گے کہ یہ جوان تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا، اور بعض کہیں گے: وہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا، اور بعض کہیں گے کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا، (اے رسول اکرم!) آپ کہیے: میرے رب ہی ان کی صحیح تعداد کو جاننے والے ہیں، لوگوں میں سے ان کو صرف قلیل لوگ ہی جانتے ہیں، اس لیے آپ ان کے معاملہ میں بحث نہ کریں صرف سرسری گفتگو کریں اور نہ اُن کے متعلق کسی سے کچھ دریافت کریں O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور تم ان کو بیدار گمان کرو گے حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں، اور ہم ان کو دائیں طرف اور بائیں طرف کروٹ بدلاتے ہیں، اور ان کا کتا چوکھٹ پر دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے تھا، اگر تم ان کو جھانک کر دیکھ لیتے تو ضرور پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے اور تمہارا دل ان کی دہشت سے بھر جاتا O'' (الکہف: ۱۸)

علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ ھ، الکہف: ۱۸ تا ۲۲ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ'': مفسرین نے بیان کیا ہے کہ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ سوئے ہوئے تھے۔ پس اسی طرح دیکھنے والا ان کو بیدار گمان کرتا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ چونکہ وہ بہ کثرت اپنی لیٹنے کی جگہ پر کروٹیں بدلتے تھے تو اس لیے دیکھنے والا ان کو بیدار گمان کرتا تھا۔ ''اَيْقَاظًا'' کا لفظ ''يقظ'' اور ''يقظان'' کی جمع ہے اور اس کا معنی ہے بیدار۔

''وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ'': حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ان کو کروٹیں اس لیے بدلائی جاتی تھیں تاکہ زمین ان کا گوشت نہ کھالے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ وہ ہر سال میں دو مرتبہ کروٹیں بدلتے تھے۔ دوسرا قول ہے کہ وہ ہر سال میں ایک مرتبہ کروٹیں بدلتے تھے۔ اور مجاہد نے کہا: وہ ہر سات سال کے بعد کروٹ بدلتے تھے۔ اور ایک جماعت نے کہا کہ وہ آخری نو سال میں کروٹیں بدلتے تھے اور تین سو سال میں انہوں نے کروٹیں نہیں بدلیں۔ اور مفسرین کا ظاہر کلام یہ ہے کہ ان کا کروٹیں بدلنا اللہ عزوجل کا فعل تھا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ عزوجل کے حکم سے فرشتہ ان کو کروٹیں بدلواتا ہو، پھر اس کی نسبت اللہ عزوجل کی طرف کر دی گئی۔

''وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ'': عمرو بن دینار نے کہا کہ کتے سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ رات ہو یا دن وہ کسی کو ضرر نہیں پہنچائے گا، اور کتے سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ جو شخص اس پر حملہ کرتے وقت یہ کہے ''وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ'' تو کتا اس کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔ (الکشف والبیان، ج ۶ ص ۱۶۰، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۲ ھ)

بعض علماء نے کہا ہے کہ عمرو بن دینار سے یہ کہنا متصور نہیں ہے۔ اور حق کے قریب بات یہ ہے کہ یہ کعب الاحبار یا دیگر ان لوگوں کا قول ہے جو اسرائیلیات سے روایت کرتے ہیں۔

اصحاب کہف کے کتے کے متعلق علماء کے اقوال

امام ابو اسحاق احمد بن محمد المعروف بالامام الثعلبی المتوفی ۴۲۷ھ، لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کا رنگ ایک درخت کے رنگ کی طرح تھا، دوسرا قول ہے کہ اس کا رنگ پتھر کی مثل تھا، تیسرا قول ہے کہ اس کا رنگ آسمان کی طرح تھا۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا: اس کتے کا نام "ریان" تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس کا نام "قطمیر" تھا۔ امام اوزاعی نے کہا: اس کا نام "متوی" تھا۔ اور شعیب الجبائی نے کہا: اس کا نام "حمران" تھا۔ عبداللہ بن کثیر نے کہا: اس کتے کا نام "قطمور" تھا۔ السدی نے کہا: اس کا نام "تون" تھا۔ حضرت عبداللہ بن سلام نے کہا: اس کا نام "بسیط" تھا۔ کعب احبار نے کہا: اس کا نام "صہب" تھا۔ اور ایک قول ہے کہ اس کا نام "قطفیر" تھا۔

(الکشف والبیان، ج ٦ ص ١٦٠، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۲ھ)

کتے کو رکھنے کے متعلق مذاہب فقہاء اور احادیث

امام ثعلبی نے کہا ہے کہ اصحاب کہف کے دور میں کتے کا رکھنا جائز تھا جیسا کہ ہمارے دور میں بھی اور ہماری شریعت میں بھی کتے کا رکھنا جائز ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ اصحاب کہف رات کے وقت بھاگے تھے اور وہ سات افراد تھے، ان کا ایک چرواہے کے پاس سے گزر ہوا جس کے ساتھ اس کا کتا تھا۔ اور کعب احبار نے کہا: اصحاب کہف ایک کتے کے پاس سے گزرے سو وہ بھونکا، انہوں نے اس کو بھگا دیا، وہ پھر بھونکا، انہوں نے پھر بھگا دیا، کئی بار اس طرح ہوا تو وہ کتا اپنی دونوں ٹانگوں پر کھڑا ہوا اور اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کئے جیسے وہ دعا کر رہا ہو اور پھر اس نے یہ کلام کیا کہ تم مجھ سے مت ڈرو، میں اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں سے محبت کرتا ہوں، پس جب تم سو جاؤ گے تو میں تمہاری حفاظت کروں گا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے شکاری کتے یا مویشیوں کی حفاظت کے سوا کوئی کتا رکھا تو اس کے عمل میں سے ہر روز دو قیراط کم ہوتے رہیں گے۔

(صحیح البخاری: ۲۳۲۳، ۳۳۲۵، ۵۴۸۰، ۵۴۸۲، صحیح مسلم: ۱۵۷۴، سنن ابن ماجہ: ۳۲۰۴، ۳۲۰۵، سنن ترمذی: ۱۴۸۷، الاحاد والمثانی: ۱۵۹۸، مسند البزار: ۶۰۷۴، ۶۱۳۱، السنن الکبریٰ للنسائی: ۴۷۷۸، سنن نسائی: ۴۲۸۴، مستخرج ابی عوانہ: ۵۴۰۰، شرح مشکل الآثار: ۱۲۵۷، شرح معانی الآثار: ۵۷۰۶، صحیح ابن حبان: ۵۶۵۰، المعجم الاوسط للطبرانی: ۴۷۳۷، المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۳۴۱۳، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۱۱۸۴، موطا امام مالک: ۳۵۵۳، ۳۵۵۴، مسند الشافعی ۳۶۲، مسند الحمیدی: ۶۳۵، ۶۳۶، مسند ابن ابی شیبہ: ۷۷۶، مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۹۹۴۰، ۱۹۹۴۱، مسند احمد: ۴۴۷۹، ۴۵۴۹، سنن دارمی: ۲۰۴۷، شعب الایمان للبیہقی: ۴۳، معرفۃ السنن والآثار: ۱۱۵۴۲، شرح السنۃ للبغوی: ۲۷۷۵، کشف المشکل: ۱۰۷۷، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشر، ج ۱۵ ص ۲۵۵)

اس حدیث میں دو قیراط کا ذکر ہے اور ایک اور حدیث میں ایک قیراط کا ذکر ہے، ان میں تطبیق

علامہ بدرالدین ابو محمد محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ، اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

ایک حدیث میں ذکر ہے کہ جس نے ایسا کتا رکھا جو نہ شکار کے لیے ہو اور نہ مویشیوں کی حفاظت کے لیے ہو، اس کے نیک

اعمال میں سے ہر روز ایک قیراط کم ہوتا رہے گا۔ اور یہاں اس حدیث میں ہے کہ اس کے نیک اعمال میں سے ہر روز دو قیراط کم ہوتے رہیں گے۔ علامہ ابن بطال نے کہا ہے کہ دو قیراط کا ذکر تغلیظ کے لیے ہے، کیونکہ لوگوں کو اس سے منع کیا گیا اور وہ نہیں مانے تو پھر فرمایا کہ جو ایسا کتا رکھیں گے تو ان کے نیک اعمال میں سے ہر روز دو قیراط کم ہوتے رہیں گے۔ اور تغلیظ میں ایک قیراط کی جگہ دو قیراط کا ذکر کر دیا۔

اس کا بیان کہ اس کی کن نیکیوں میں سے ایک قیراط روز کم ہوگا اور قیراط کی مقدار

علامہ ابن الملقن نے اپنی شرح التوضیح میں لکھا ہے کہ ایک قیراط اس کے گزشتہ اعمال میں سے کم ہوگا یا آئندہ اعمال میں سے کم ہوگا یا ایک قیراط دن کے اعمال میں سے کم ہوگا اور ایک قیراط رات کے اعمال میں سے کم ہوگا۔ یا ایک قیراط فرائض میں سے کم ہوگا یا ایک قیراط اس کے نوافل میں سے کم ہوگا۔ اس کی تفسیر میں علماء کا اختلاف ہے۔ اور قیراط کا وزن نصف دانق یعنی نصف دمڑی کے برابر ہے۔ اور اس سے مراد وہ مقدار ہے جو اللہ عزوجل کے نزدیک معلوم ہے یعنی اس کے عمل میں سے دو جزء ہر روز کم کر دیے جائیں گے، جب تک کہ وہ ایسے کتے کے رکھنے کو ترک نہیں کرے گا۔ (عمدۃ القاری ج ۱۲ ص ۱۳۶، دارالکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۲۱ھ)

الشیخ محمد علی الصابونی حدیث مذکور کی شرح میں لکھتے ہیں:

اس حدیث میں کلبا ضاریا کا ذکر ہے، یعنی جس کتے کو شکار کرنے کا عادی بنایا گیا ہو۔ اور اس حدیث میں قیراطان کا ذکر ہے، قیراط اصل میں نصف دینار کو کہتے ہیں اور یہاں اس سے مراد ہے: اس کے عمل صالح کی ایک مقدار۔

اور یہ جو ارشاد ہے کہ اس کے نیک اعمال میں سے دو قیراط روز کم کر دیے جائیں گے، یہ تغلیظ کے لیے ہے اور اس سے مقصود کتوں کو گھروں اور مکانوں میں رکھنے سے منع کرنا ہے۔

گھروں اور مکانوں میں کتوں کو رکھنے کی مذمت

جن لوگوں کے ذوق فاسد ہوتے ہیں اور ان کی عقول ساقطہ ہوتی ہیں، وہ اپنے گھروں میں اور مکانوں میں کتوں کو رکھتے ہیں، کیونکہ کتا قبیح المنظر ہے، وہ اپنا منہ کھولتا ہے اور زبان باہر نکالتا ہے اور اس کی صورت ایسی ہوتی ہے جیسے وہ ہانپ رہا ہو۔ قرآن مجید میں ہے:

فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَیْهِ یَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ یَلْهَثْ (الاعراف: ۱۷۶) سو اس کی مثال کتے کی سی ہے، اگر تم اس پر مشقت کا بوجھ ڈالو تو وہ ہانپے گا اور زبان لٹکائے گا، یا اس کو چھوڑ دو تو پھر بھی وہ ہانپے گا اور زبان نکالے گا۔

اور یہ مثال ان انتہائی قبیح مثالوں میں سے ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے بیان فرمایا ہے جو علم اور معرفت کے باوجود ہدایت کے راستہ کو گم کر دیں اور دنیا کو ترجیح دیں اور ظالم حکام کی خواہشوں کی پیروی کریں تو وہ اسفل سافلین میں گر جاتے ہیں۔ یعنی ان کی مثال خسیس ہونے میں اور گھٹیا ہونے میں کتے کی طرح ہے، تم اس کو جھڑکو یا بھگاؤ یا دوڑاؤ تو اپنی زبان باہر نکالتے ہیں اور اگر ان کو چھوڑ دو تو پھر بھی زبان باہر نکالتے ہیں۔

اور جب کتے کا کھانا حرام ہے، تو اس کا لعاب بھی حرام ہے جو اس کے گوشت سے پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ کتے کا لعاب نجس ہے، پس جب کتا اپنی زبان اور لعاب سے کسی شخص کو چاٹے تو اس پر واجب ہے کہ اس کپڑے کو پاک کرے جہاں پر کتے کا لعاب لگ گیا ہے، اس لیے اسلام نے کتے کے پالنے سے منع فرمایا ہے، کیونکہ کتے کو پالنے سے طہارت خطرے میں پڑ جاتی ہے اور کتے کے لعاب سے کئی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، اسی لیے حدیث میں ہے کہ جب کتا تمہارے برتن میں منہ ڈال دے تو اس کو سات دفعہ دھوؤ اور ایک دفعہ مٹی سے صاف کرو۔

اور تعجب ہے کہ غیر مسلم لوگ کتے کے پالنے میں بہت مبالغہ کرتے ہیں اور کتوں کو اپنے گھروں میں داخل کرتے ہیں اور کتوں کے ساتھ اپنے بیٹوں کا معاملہ کرتے ہیں اور بسا اوقات ان کو اپنے دسترخوان پر بٹھا کر ساتھ کھلاتے ہیں اور ان کو اپنے بستروں پر سلاتے ہیں۔ اور اس چیز سے دہشت اور حیرت پیدا ہوتی ہے کہ وہ کتوں کی کیوں اتنی تعظیم کرتے ہیں اور کیوں اس کا اہتمام کرتے ہیں، شاید کہ یہ ان کی حیوانی مٹی کا ثمرہ ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے" ہر چیز اپنی جنس کی طرف میلان کرتی ہے"۔

اور اسلام نے کتوں کے پالنے کو حرام قرار دیا اور اس سے ان کتوں کو مستثنیٰ فرما دیا جو شکار کے لیے ہوں یا کھیتوں کی حفاظت کے لیے ہوں یا بکریوں کی حفاظت کے لیے ہوں اور جب اس نے ان مصلحتوں کے بغیر کتے کو پالا تو اس کے نیک اعمال میں سے ہر روز دو قیراط اجر کم ہوتے رہیں گے۔ اور یہ سخت نقصان ہے، عقلمند مسلمان کو چاہیے کہ وہ بغیر کسی ضرورت کے کتوں کو نہ پالے۔ اور اس کے مقابلہ میں وہ حدیث ہے کہ جس نے نماز جنازہ پڑھی اور دفن تک ساتھ رہا تو اس کو دو قیراط اجر ملے گا اور ہر قیراط پہاڑ کے برابر ہے اور مقصود یہ ہے کہ کتوں کے پالنے سے احتراز اور اجتناب کیا جائے، سوائے شکاری کتوں کے یا مویشیوں کی حفاظت کے کتوں کے۔ (الشرح المیسر لصحیح البخاری المسمی الدرر والملالی بشرح صحیح البخاری ج ۵ ص ۱۹۰، المکتبۃ العصریہ، ۱۴۳۲ھ)

صالحین سے محبت رکھنے کا ثمرہ

ابو محمد عبد الحق بن عطیہ الاندلسی المتوفی ۵۴۱ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ایک قول یہ ہے کہ یہ کتا کسی چرواہے کا تھا، وہ اصحاب کہف کے ساتھ چل پڑا اور اُن کی پیروی کی۔ علامہ ابن عطیہ کہتے ہیں: میں نے جامع مصر کے خطیب ابو الفضل بن الجوہر سے سنا، وہ چار سو انہتر ہجری (۴۶۹ھ) میں اپنے وعظ میں کہہ رہے تھے کہ جو شخص اہل خیر سے محبت رکھے وہ ان کی برکت کو پاتا ہے، اصحاب کہف کے کتے نے ان سے محبت رکھی تو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کا ذکر فرمایا۔ (المحرر الوجیز ص ۱۱۸۲، دار ابن حزم، بیروت، ۱۴۲۳ھ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ دیہاتیوں میں سے ایک مرد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، پس اس نے کہا: یا رسول اللہ! قیامت کب قائم ہوگی؟ آپ نے فرمایا: تم پر افسوس ہے، تم نے قیامت کے لیے کیا تیاری کی ہے؟، اس نے کہا: میں نے قیامت کے لیے کوئی تیاری نہیں کی مگر یہ کہ میں اللہ اور ان کے رسول سے محبت کرتا ہوں، آپ نے فرمایا: بے شک تم اس کے ساتھ ہو گے جس سے تم محبت کرتے ہو۔ پس ہم نے کہا: اور ہم بھی اسی طرح ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں! پس اس دن ہم بہت زیادہ خوش ہوئے، پھر حضرت مغیرہ کا ایک لڑکا وہاں سے گزرا جو میرا ہم عمر تھا، پس آپ نے فرمایا: اگر یہ زندہ رہا تو اس کے بڑھاپے سے پہلے قیامت آجائے گی۔

(صحیح بخاری: ۳۶۸۸، ۶۱۶۷، ۶۱۷۱، ۷۱۵۳، صحیح مسلم: ۲۶۳۹، سنن ترمذی: ۲۳۸۵، مسند احمد: ۱۳۹۵۸، صحیح ابن حبان: ۵۶۳۰۸)

"لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَیْهِمْ لَوَلَّیْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّ لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا": یعنی اگر تم غار میں جھانک کر دیکھو تو مرعوب ہو کر اور خوف زدہ ہو کر بھاگ جاؤ گے، کیونکہ اُن کی وجہ سے تم پر ہیبت طاری ہو جائے گی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس جگہ کی وحشت کی وجہ سے گویا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو ایسی جگہ میں پناہ عطا فرمائی تھی جس سے توحش ہوتا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اُن کے بال اور ناخن بہت لمبے تھے، لیکن یہ قول بعید ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اسی طرح ہم نے (ایک عرصہ کے بعد) ان کو بیدار فرمایا تا کہ وہ ایک دوسرے کے حال کے متعلق سوال کریں، ان میں سے ایک شخص نے کہا: تم کتنا عرصہ یہاں ٹھہرے رہے؟ بعض نے کہا: ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرے ہیں، دوسروں نے کہا: تمہارے رب ہی خوب جاننے والے ہیں کہ تم کتنا عرصہ یہاں ٹھہرے رہے ہو، پس تم اپنے کسی ساتھی کو چاندی کا یہ سکہ دے کر شہر بھیجو پس وہ دیکھے کہ کون سا کھانا زیادہ پاکیزہ ہے سو اس میں سے وہ تمہارے لیے کھانا لے آئے، اور وہ احتیاط کے ساتھ جائے اور تمہارے متعلق کسی کو ہرگز نہ بتائے O" (الکہف:۱۹)

"وَ كَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِیَتَسَآءَلُوْا بَیْنَهُمْ": یعنی ہم نے ان کو نیند سے بیدار فرمایا اور وہ اسی طرح کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

"قَالَ قَآىٕلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ": انہوں نے ایک دوسرے سے غار میں اپنے ٹھہرنے کی مدت کے متعلق سوال کیا:

"قَالُوْا لَبِثْنَا یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ": انہوں نے کہا: ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ رہے ہیں، کیونکہ وہ صبح کے وقت غار میں داخل ہوئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو دن کے آخری حصہ میں بیدار فرمایا تھا۔ "قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ": ان کے رئیس تملیخا یا مکسلمینا نے کہا: اللہ تعالیٰ ہی اس مدت کو زیادہ جاننے والے ہیں۔

"فَابْعَثُوْۤا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖۤ اِلَى الْمَدِیْنَةِ": روایت ہے کہ وہ بھوکے بیدار ہوئے تھے اور انہوں نے کھانا لینے کے لیے تملیخ کو بھیجا تھا اور وہ اُن میں سب سے چھوٹا تھا، اس شہر کا نام افسوس ہے، دوسرا قول ہے کہ طرسوس ہے، زمانہ جاہلیت میں اس کا نام افسوس تھا، پھر جب اسلام آیا تو اس کا نام طرسوس رکھ دیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ اُن کے پاس دراہم تھے جن پر اس زمانہ کے بادشاہ کی صورت نقش تھی۔

"فَلْیَنْظُرْ اَیُّهَاۤ اَزْكٰى طَعَامًا": حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: پس غور سے دیکھنا کہ کون سا ذبیحہ حلال ہے؟ کیونکہ اس شہر کے لوگ بتوں کے نام پر جانور کو ذبح کرتے تھے، اور اُن میں ایسی قوم تھی جو اپنے ایمان کو چھپاتی تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس شہر کے عام لوگ مجوسی تھے۔ اور "اَزْكٰى طَعَامًا" کا معنی یہ بھی ہے کہ دیکھنا کون سا کھانا برکت والا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ انہوں نے تملیخ سے یہ کہا تھا کہ وہ دو یا تین آدمیوں کا کھانا خریدے تا کہ وہ لوگ اصحاب کہف پر مطلع نہ ہو جائیں۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ کھانا چاول تھے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وہ انگور تھے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ وہ کھجوریں تھیں۔ "اَزْكٰى" کا ایک معنی یہ بھی کیا گیا ہے کہ جو زیادہ سستا ہو۔ "فَلْیَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ": یعنی وہ تمہارے پاس اس میں سے روزی لے کر آئے۔

"وَ لْیَتَلَطَّفْ": اور شہر میں جانے اور کھانا خریدنے کے لیے احتیاط کے ساتھ جائے۔

"وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا": اور کسی کو بھی تمہاری خبر نہ دے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "بے شک اگر وہ تمہارے حال پر مطلع ہو گئے تو وہ تمہیں سنگسار کر دیں گے یا تم کو جبراً اپنے دین کی طرف لوٹا ئیں گے اور اس صورت میں تم کبھی کامیاب نہیں ہو گے ○" (الکہف: ۲۰)

"اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ": الزجاج نے کہا: اس کا معنی یہ ہے کہ وہ تمہیں پتھر مار مار کر ہلاک کر دیں گے اور یہ قتل کرنے کی سب سے بھیانک صورت ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وہ تمہیں برا کہیں گے اور تمہاری مذمت کریں گے، اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ بادشاہ اُن کو قتل کرنے کے درپے تھا۔ اور جو شخص لوگوں کے دین کے مخالف ہوتا اس کو سزا میں سنگسار کر دیا جاتا تھا۔

"اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ": یا تم کو وہ جبراً اپنے دین میں داخل کر دیں گے۔

"وَلَنْ تُفْلِحُوْا اِذًا اَبَدًا": اور اس صورت میں تم کبھی بھی کامیاب نہیں ہو گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور اسی طرح ہم نے (شہر کے لوگوں کو) ان پر مطلع فرما دیا تا کہ وہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ برحق ہے، اور قیامت کے وقوع میں کوئی شک نہیں ہے، جب لوگ آپس میں اُن کے متعلق جھگڑ رہے تھے تو بعض لوگوں نے کہا: ان کے غار کے اوپر کوئی عمارت بنا دو، ان کے متعلق ان کے رب ہی خوب جانتے ہیں، اور جو لوگ ان جوانوں کے معاملہ پر غالب رہے تھے انہوں نے کہا: ہم ضرور اس عمارت پر مسجد بنائیں گے ○" (الکہف: ۲۱)

"وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ": یعنی ہم نے شہر کے لوگوں کو اُن کے حال پر مطلع فرما دیا۔

"لِيَعْلَمُوْا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ": تا کہ امتِ مسلمہ جان لے کہ اصحابِ کہف کو غار میں بھیجنا اُن کے عہد کے مطابق تھا۔ اور دقیانوس کو مرے ہوئے کئی صدیاں گزر چکی تھیں، اور اب اس شہر کا حکمران ایک نیک مرد تھا اور اس شہر کے لوگ حشر و نشر میں اور قبر سے مردوں کے اٹھنے میں اختلاف کرتے تھے۔ بعض لوگ اس میں شک کرتے تھے اور اس کو بعید قرار دیتے تھے، وہ کہتے تھے کہ روحوں کا حشر کیا جائے گا اور جسم کو تو زمین کھا چکی ہو گی۔

اور بعض کہتے تھے کہ روح اور جسم دونوں کو اٹھایا جائے گا تو بادشاہ پر یہ اختلاف بہت دشوار گزرا اور وہ کافی مدت تک حیران رہا کہ کس طرح حقیقتِ حال لوگوں پر ظاہر ہو، حتیٰ کہ اس نے ٹاٹ کا لباس پہنا اور راکھ پر بیٹھ گیا اور اللہ عزوجل سے رو رو کر فریاد کی کہ وہ اس معاملہ کو بیان فرما دیں، پس اللہ تعالیٰ نے اصحابِ کہف کے ذریعہ اس معاملہ کو حل فرمایا۔

کہا جاتا ہے کہ جب اصحابِ کہف نے اپنے میں سے ایک شخص کو چاندی کا سکہ دے کر شہر کی طرف بھیجا تا کہ وہ ان کے لیے کھانا لائے تو اس کی ہیئت کذائی کو اور اس کی حالت کو لوگوں نے عجیب و غریب جانا اور وہ دقیانوس کے بعد نا معلوم عرصہ گزرنے کے بعد نا ہوس ہو چکے تھے، پھر اس کو بادشاہ کی طرف لے جایا گیا اور وہ نیک مرد تھا اور ایمان لا چکا تھا اور اس کے اصحاب بھی ایمان لا چکے تھے۔

پس جب اس نے اس سکہ کی طرف دیکھا تو کہا کہ شاید یہ وہی جوان ہیں جو دقیانوس بادشاہ کے عہد میں نکل گئے تھے اور میں اللہ تعالیٰ

سے دعا کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان کو دکھائیں، اور اس نے اس نوجوان یعنی تملیخ سے سوال کیا تو اس نے خبر دی، بادشاہ یہ سن کر خوش ہوا اور کہا: شاید کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ایک نشانی بنا کر بھیجا ہے، ہمیں اس غار کی طرف جانا چاہیے، پس وہ شہر والوں کے ساتھ اصحاب کہف کے پاس گیا، جب وہ غار کے قریب پہنچے تو تملیخ نے کہا: پہلے غار میں، میں داخل ہوتا ہوں کہیں وہ مرعوب نہ ہو جائیں، پس وہ غار میں اصحاب کہف کے پاس گئے اور ان کو واقعہ کی خبر دی اور بتایا کہ یہ لوگ مسلمان ہیں، پس روایت ہے کہ اصحاب کہف ان سے مل کر بہت خوش ہوئے اور بادشاہ کی طرف نکلے اور اس کو تعظیم دی، پھر اپنے غار کی طرف لوٹ آئے۔ اور اکثر روایات اس پر متفق ہیں کہ جب تملیخ نے ان سے بات کی تو اسی وقت وہ فوت ہو گئے۔ اور جو لوگ مردوں کے زندہ ہونے کے متعلق شک میں تھے، ان کو مردوں کے زندہ ہونے پر یقین ہو گیا۔

"وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيۡبَ فِيۡهَا": اور ان کو یقین ہو گیا کہ قیامت برحق ہے اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنا برحق ہے۔

"اِذۡ يَتَنَازَعُوۡنَ بَيۡنَهُمۡ اَمۡرَهُمۡ": جب کہ وہ اس عقیدہ کے متعلق آپس میں اختلاف کرتے تھے۔

"فَقَالُوا ابۡنُوۡا عَلَيۡهِمۡ بُنۡيَانًا": پس بادشاہ نے کہا: اس غار پر ایک عمارت کی تعمیر کرو۔ اور جو لوگ اصحاب کہف کے دین پر تھے، انہوں نے کہا: اس غار کے اوپر مسجد بنا دو۔

"رَبُّهُمۡ اَعۡلَمُ بِهِمۡ": ان کے متعلق ان کے رب ہی خوب جانتے ہیں۔

"قَالَ الَّذِيۡنَ غَلَبُوۡا عَلٰٓى اَمۡرِهِمۡ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيۡهِمۡ مَّسۡجِدًا": روایت ہے کہ ایک جماعت کافرہ تھی، انہوں نے کہا: ہم اس جگہ ایک گرجا بنا دیں گے۔ پس مسلمانوں نے ان کو منع کیا اور کہا کہ ہم ضرور بہ ضرور اس غار کے اوپر مسجد بنائیں گے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس غار کی جگہ سے اندھا فرما دیا تھا، اس وجہ سے انہوں نے چاہا کہ اس غار کے اوپر ایک عمارت بنا دیں تاکہ وہ اصحاب کہف کی نشانی ہو جائے۔

اس قصہ میں مذکور ہے کہ اس بادشاہ نے کہا تھا کہ اس غار کے اوپر ایک عمارت بنا دی جائے، اور جو مسلمان اصحاب کہف کے دین پر تھے انہوں نے کہا: اس غار کے اوپر ایک مسجد بنا دی جائے۔

اس جگہ یہ مسئلہ ہے کہ قبروں کے اوپر مسجد کا بنانا اور ان پر نماز پڑھنا اور ان پر عمارت بنانا یہ جائز ہے، یا جائز نہیں ہے؟

بعض علماء نے کہا: یہ جائز نہیں ہے، ان کی دلیل یہ حدیث ہے:

قبروں پر مساجد بنانے کے عدم جواز کے متعلق احادیث

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے اور ان پر لعنت فرمائی ہے جو قبروں کو سجدہ گاہ بناتے ہیں اور وہاں پر چراغ رکھتے ہیں۔

(سنن ابوداؤد: ۳۲۳۶، سنن ترمذی: ۳۲۰، سنن نسائی: ۲۰۴۳، سنن ابن ماجہ: ۱۵۷۵، مسند احمد: ۳۱۱۸، مصنف عبدالرزاق: ۶۷۰۴، المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۲۷۲۵، ۱۰۵۶، ۸۳۴۹، ۱۵۷۴، ۳۵۹۱)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس بیماری میں فرمایا جس سے آپ صحت یاب نہیں ہوئے: اللہ یہود اور نصاریٰ پر لعنت فرمائیں جنہوں نے انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا، اگر یہ خطرہ نہ ہوتا تو میں آپ کی قبر کو ظاہر کر دیتی لیکن یہ خطرہ ہے کہ آپ کی قبر کو سجدہ گاہ بنا لیا جائے گا۔ (صحیح البخاری: ۱۳۳۰، ۴۴۴۱، ۱۳۹۰)

علامہ قرطبی لکھتے ہیں: ہمارے علماء نے کہا ہے کہ مسلمانوں پر حرام ہے کہ وہ انبیاء اور علماء کی قبروں کو مساجد بنائیں، کیونکہ حدیث میں ہے:

ابو مرثد الغنوی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قبروں پر نہ بیٹھو اور نہ ان کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو۔
(سنن ابوداؤد: ۳۲۲۷، صحیح مسلم: ۹۷۲)

علامہ قرطبی لکھتے ہیں: اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ قبروں کو قبلہ نہ بناؤ کہ تم قبروں پر نماز پڑھو یا قبروں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو جیسا کہ یہود اور نصاریٰ کا فعل ہے۔ یہ عمل ان کی عبادت کی طرف پہنچائے گا جو قبروں میں ہیں، جس طرح بتوں کی عبادت سے منع فرمایا ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا اور جو ذرائع اس تک پہنچاتے ہیں اس سے منع فرمایا۔

عبید اللہ بن عبد اللہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے کہا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزع کی کیفیت طاری ہوئی تو آپ بار بار اپنے چہرۂ مبارک پر اپنی چادر ڈال لیتے، پھر جب شدت ہوتی تو اپنا چہرہ کھول لیتے، پھر آپ نے اسی حالت میں فرمایا: یہود اور نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو! انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا، آپ ان کے کاموں سے ڈرا رہے تھے۔ (صحیح البخاری: ۳۴۵۳، ۳۴۵۴، صحیح مسلم: ۵۳۱، صحیح ابن حبان: ۶۶۱۹)

قبروں پر مساجد بنانے کے جواز کے دلائل

تابوت میں دفن کرنا جائز ہے خاص طور پر جس جگہ کی زمین نرم ہو۔

روایت ہے کہ حضرت دانیال صلوات اللہ علیہ کو پتھر کے تابوت میں رکھا گیا تھا، اور حضرت یوسف علیہ السلام نے وصیت کی تھی کہ ان کے لیے ایک شیشے کا تابوت بنایا جائے اور اس تابوت کو کنویں میں رکھ دیا جائے، اس خوف سے کہ کہیں ان کی عبادت نہ کی جائے۔ پھر حضرت یوسف علیہ السلام کا جسم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تک اس تابوت میں رہا، پھر ایک بوڑھی عورت نے اس تابوت پر رہنمائی کی تو اس تابوت کو وہاں سے اٹھایا اور حضرت اسحاق علیہ السلام کے پہلو میں اس تابوت کو رکھ دیا گیا۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے عامر بیان کرتے ہیں کہ جس مرض میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فوت ہو گئے، انہوں نے کہا: میرے لیے لحد بناؤ اور میرے اوپر کچی اینٹیں ڈال دینا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لحد بنائی گئی تھی۔
(صحیح مسلم: ۹۶۶، الرقم المسلسل: ۲۲۳۷، رقم حدیث الباب: ۹۰، سنن نسائی: ۲۰۰۷، سنن ابن ماجہ: ۱۵۵۶)

لحد کا معنی یہ ہے کہ زمین کو شق کیا جائے، پھر قبلہ کی جانب زمین کو شق کیا جائے اور قبر بنائی جائے۔ اور ہمارے نزدیک لحد بنانا شق سے افضل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لحد کو اختیار فرمایا ہے اور یہی امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ انہوں نے کہا کہ سنت لحد ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، جز ۱۰ ص ۳۲۹-۳۳۲)

بعض احادیث سے صالحین کے قرب میں مسجد بنانے پر استدلال

علامہ ابن عبد البر القرطبی المتوفی ۴۶۳ھ لکھتے ہیں کہ صالحین کے قرب میں مسجد بنانے کے جواز کی دلیل یہ ہے کہ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمام روئے زمین کو میرے لیے مسجد بنا دیا گیا ہے۔
(صحیح البخاری: ۳۳۵، صحیح مسلم: ۵۲۱، سنن نسائی: ۳۳۶)

اور تمام روئے زمین میں وہ جگہ بھی داخل ہے جو صالحین کے قرب و جوار میں ہے، لہٰذا اس جگہ مسجد بنانا بھی جائز ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ جن احادیث میں صالحین کے قرب میں مسجد بنانے کی ممانعت ہے، ان سے یہ حدیث منسوخ ہو جائے گی تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل میں ہے اور فضائل منسوخ نہیں ہوتے اور نہ فضائل میں تخصیص ہوتی ہے اور نہ فضائل میں استثناء ہوتا ہے۔ نسخ صرف امر اور نہی میں جاری ہوتا ہے۔ پس واضح ہو گیا کہ صحیح البخاری کی اس حدیث میں آپ نے فرمایا ہے کہ تمام روئے زمین کو میرے لیے مسجد بنا دیا گیا ہے، یہ ان تمام احادیث کی ناسخ ہے جن میں صالحین کے پاس مسجد بنانے کی ممانعت ہے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! زمین پر سب سے پہلے کون سی مسجد بنائی گئی تھی؟ آپ نے فرمایا: مسجد حرام، میں نے پوچھا: اس کے بعد؟ آپ نے فرمایا: مسجد اقصیٰ۔ میں نے پوچھا: ان دونوں کے درمیان کتنا عرصہ ہے؟ آپ نے فرمایا: چالیس سال، اور تم جس جگہ بھی نماز کا وقت پاؤ تم وہیں نماز پڑھ لو وہی تمہارے لیے مسجد ہے۔ (یعنی اگر تمہیں صالحین کے قرب میں بھی نماز کا وقت آجائے تو وہاں نماز پڑھ لو)۔

(صحیح البخاری: ۳۳۶۶، صحیح مسلم: ۵۲۰، سنن نسائی: ۶۹۰، سنن ابن ماجہ: ۷۵۳)

اس حدیث سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ صالحین کے قرب میں مسجد بنانا جائز ہے۔

(التمہید ج ۱ ص ۳۳۶۔۳۳۷، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۹ھ)

صالحین کے قرب میں مسجد بنانے کی ممانعت کی توجیہ

قاضی عیاض بن موسیٰ اندلسی متوفی ۵۴۴ھ، لکھتے ہیں:

ائمہ مسلمین نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی جگہ کو قبلہ بنانے سے منع کیا ہے، کیونکہ جب نماز میں نمازیوں کا منہ آپ کی طرف ہو گا تو وہ نماز صورۃً آپ کی عبادت ہو جائے گی۔ اس وجہ سے صحابہ نے قبر مبارک کی بائیں جانب ایک دیوار بنا دی تھی کہ اب جو شخص وہاں نماز پڑھے گا، اس کے لیے نماز میں آپ کی طرف منہ کرنا ممکن نہیں ہو گا۔

(اکمال المعلم بفوائد مسلم، ج ۲ ص ۴۵۱، دارالوفاء، بیروت، ۱۴۱۹ھ)

اس حدیث سے یہ واضح ہو گیا کہ صالحین کی قبر کے پاس نماز پڑھنا، اس وقت منع ہے جب نمازی اور قبر کے درمیان کوئی حائل نہ ہو، اور جب نمازی اور قبر کے درمیان دیوار ہو یا اور کوئی حائل ہو تو پھر قبر کے پاس نماز پڑھنا ممنوع نہیں ہے۔ لہٰذا صالحین کی قبروں کے جوار میں مساجد کا بنانا بھی جائز ہے کیونکہ جب قبر کے پاس مسجد بنائی جائے گی تو مسجد کی دیوار قبر اور نمازی کے درمیان حائل ہو جائے گی، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے ساتھ مسجد نبوی بنی ہوئی ہے اور اس کی دیواریں قبلہ اور نمازی کے درمیان حائل ہیں۔

علامہ شرف الدین حسین بن محمد الطیبی المتوفی ۷۴۳ھ لکھتے ہیں:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خطرہ تھا کہ مسلمان آپ کی قبر کی اس طرح تعظیم کریں گے جس طرح یہود اور نصاریٰ نے اپنے نبیوں کی قبروں کی تعظیم کی تھی، اس لیے آپ نے یہود و نصاریٰ اور ان کے کاموں پر لعنت کی تاکہ مسلمان آپ کی قبر انور کے ساتھ ان کی طرح معاملہ

نہ کریں کیونکہ یہود ونصاریٰ اپنے نبیوں کی تعظیم کے لیے ان کی قبروں کو سجدہ کرتے تھے، اور ان کی قبروں کو قبلہ بناتے تھے اور نماز میں ان کی قبروں کی طرف منہ کرتے تھے اور انہوں نے ان کی قبروں کو بت بنا لیا تھا، اس لیے آپ نے ان پر لعنت فرمائی اور مسلمانوں کو اس کام سے منع فرمایا۔

لیکن جس شخص نے کسی مرد صالح کے قرب اور جوار میں مسجد بنائی یا اس کے مقبرہ میں نماز پڑھی اور اس کی روح سے فیض حاصل کرنے کا قصد کیا یا یہ ارادہ کیا کہ اس مرد صالح کی عبادات کا اثر اس تک پہنچے، اور نماز میں اس مرد صالح کی تعظیم اور اس کی طرف توجہ کرنے کا ارادہ نہیں کیا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیا تم یہ نہیں دیکھتے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قبر مسجد حرام میں حطیم کے پاس ہے، اس کے باوجود یہ مسجد نماز پڑھنے کی روئے زمین میں سب سے افضل جگہ ہے اور قبروں کے پاس نماز پڑھنے کی ممانعت کھدی ہوئی قبروں کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ وہ نجاست کے ساتھ ملوث ہوتی ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادہ تاکید کے لیے مکرر فرمایا: انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو مساجد نہ بناؤ، میں تم کو اس سے منع فرماتا ہوں۔ (مسلم)۔ مقبرہ میں نماز پڑھنے کے متعلق اہل علم کا اختلاف ہے۔ بعض علماء نے اس کو مکروہ کہا ہے خواہ وہاں کی مٹی بھی پاک ہو اور جگہ بھی پاک ہو۔ ان کا استدلال اس حدیث سے ہے اور بعض علماء نے کہا: مقبرہ میں نماز پڑھنا جائز ہے اور اس حدیث کی یہ تاویل کی ہے کہ غالب حال یہ ہے کہ قبرستان کی زمین مردوں کے جسموں اور ان کی آلائش وغیرہ سے مخلوط اور ملوث ہوتی ہے، اور یہ ممانعت اس جگہ کی نجاست کی وجہ سے ہے، اگر جگہ پاک ہو تو پھر وہاں نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔

(الکاشف عن حقائق السنن (شرح الطیبی) ج ۲ ص ۲۳۵، ادارۃ القرآن، کراچی، ۱۴۱۳ھ)

حافظ شہاب الدین احمد بن علی ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ اور علامہ احمد قسطلانی متوفی ۹۱۱ھ نے لکھا ہے:

جو شخص کسی مرد صالح کے جوار میں مسجد بنائے اور اس کے قرب سے برکت حاصل کرنے کا ارادہ کرے نہ کہ اس کی تعظیم اور نماز میں اس کی طرف توجہ کا تو وہ اس وعید میں داخل نہیں ہے۔ (فتح الباری ج ۱ ص ۵۲۵، مطبوعہ لاہور، ۱۴۰۱ھ)

ملا علی قاری متوفی ۱۰۱۴ھ نے علامہ طیبی کی عبارت نقل کی ہے اور مزید لکھا ہے:

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قبر کی صورت حطیم میں میزاب کے نیچے ہے اور حطیم میں اور حجر اسود اور میزاب کے درمیان ستر نبیوں کی قبریں ہیں۔ (مرقات ج ۲ ص ۲۰۲، مکتبہ امدادیہ، ملتان، ۱۳۹۰ھ)

شیخ انور شاہ کشمیری متوفی ۱۳۵۲ھ نے اس حدیث کی شرح میں علامہ الطیبی کی عبارت نقل کی ہے۔

(فیض الباری ج ۲ ص ۴۳، مطبع حجازی، قاہرہ، ۱۳۵۷ھ)

شیخ شبیر احمد عثمانی متوفی ۱۳۶۹ھ نے اس حدیث کی شرح میں حافظ عسقلانی کی عبارت نقل کی ہے۔

(فتح الملہم ج ۲ ص ۱۲۱، مکتبۃ الحجاز، کراچی)

ان تمام حوالہ جات سے روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ صالحین کی قبروں کے پاس مسجد بنانا جائز ہے۔

صالحین کے قرب میں مسجد بنانے پر مفسرین کی تصریحات

علامہ محمود بن عمر زمخشری خوارزمی متوفی ۵۳۸ھ، الکہف: ۲۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

مسلمانوں میں سے جو اصحابِ کہف کے معاملات میں غالب دخل رکھتے تھے، انہوں نے کہا: ہم غار کے دروازہ پر مسجد بنائیں گے تاکہ مسلمان اس مسجد میں نماز پڑھیں اور اس جگہ سے برکت حاصل کریں۔

(الکشاف ج ۲ ص ۵۳۳، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۸ھ)

قاضی احمد بن محمد خفاجی حنفی متوفی ۱۰۶۹ھ لکھتے ہیں:

غار کے دروازہ پر مسلمانوں کا مسجد بنانا اس پر دلالت کرتا ہے کہ صالحین کی قبروں کے پاس مسجد بنانا جائز ہے، جیسا کہ کشاف میں اس طرف اشارہ ہے اور اس میں نماز پڑھنا جائز ہے۔ (حاشیۃ القاضی ج ۶ ص ۱۰۵، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۷ھ)

علامہ ابو البرکات عبد اللہ بن محمود النسفی الحنفی المتوفی ۷۱۰ھ لکھتے ہیں:

مسلمان اور ان کا بادشاہ جو اصحابِ کہف کے معاملہ پر غالب تھے، انہوں نے کہا کہ ہم غار کے منہ پر مسجد بنائیں گے اور اس جگہ سے برکت حاصل کریں گے۔ (مدارک التنزیل وحقائق التاویل، ج ۲ ص ۲۹۳، دار ابن کثیر، بیروت، ۱۴۳۰ھ)

قاضی محمد ثناء اللہ نقشبندی متوفی ۱۲۲۵ھ لکھتے ہیں:

یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ اولیاء اللہ کے مقابر کے پاس مسجد بنانا جائز ہے تاکہ ان سے برکت حاصل کی جائے (الی قولہ) جن احادیث میں قبروں کے پاس نماز پڑھنے کی ممانعت آئی ہے ان کا محمل یہ ہے کہ قبروں کی طرف منہ کر کے نماز نہ پڑھو جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے۔ (التفسیر المظہری، ج ۵ ص ۳۶۹، مکتبہ عثمانیہ، کانسی روڈ، کوئٹہ)

صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی متوفی ۱۳۶۷ھ لکھتے ہیں:

اس (آیت) سے معلوم ہوا کہ بزرگوں کے مزارات کے قریب مسجدیں بنانا اہلِ ایمان کا قدیم طریقہ ہے، اور قرآن کریم میں اس کا ذکر فرمانا اور اس کو منع نہ کرنا، اس فعل کے درست ہونے کی قوی ترین دلیل ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بزرگوں کے جوار سے برکت حاصل ہوتی ہے۔ اسی لیے اہل اللہ کے مزارات پر لوگ حصولِ برکت کے لیے جایا کرتے ہیں اور اسی لیے قبروں کی زیارت سنت اور موجبِ ثواب ہے۔ (تفسیر خزائن العرفان مع ترجمہ کنز الایمان ص ۵۵۲، مکتبۃ المدینہ، کراچی، ۱۴۳۲ھ)

ان تمام دلائل اور حوالہ جات کے ہوتے ہوئے سید ابو الاعلیٰ مودودی کی یہ عبارت لائقِ صد افسوس ہے:

مسلمانوں میں سے بعض لوگوں نے قرآن مجید کی اس آیت کا بالکل الٹا مفہوم لیا ہے۔ وہ اسے دلیل ٹھہرا کر مقابرِ صلحا پر عمارتیں اور مسجدیں بنانے کو جائز قرار دیتے ہیں، حالانکہ یہاں قرآن ان کی اس گمراہی کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جو نشانی ان ظالموں کو بعث بعد الموت اور امکانِ آخرت کا یقین دلانے کے لیے دکھائی گئی تھی، اسے انہوں نے ارتکابِ شرک کے لیے ایک خداداد موقع سمجھا اور خیال کیا کہ چلو، کچھ اور ولی پوجا پاٹ کے لیے ہاتھ آ گئے۔ (تفہیم القرآن، ج ۳ ص ۱۸، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۲۰۱۲ء)

میں کہتا ہوں: اولیاء اللہ کے مزارات پر عام مسلمان جا کر قرآن مجید کی تلاوت سے ایصالِ ثواب کرتے ہیں اور اولیاء اللہ کے توسل سے اپنی دعاؤں کے مقبول ہونے کے لیے دعا کرتے ہیں، اور کوئی صحیح العقیدہ مسلمان اولیاء اللہ کے مزارات پر جا کر پوجا پاٹ نہیں کرتا اور بعض جہلاء قبروں پر سجدہ کرتے ہیں اور جہلاء کے افعال کو اہلِ سنت پر چسپاں کرنا انتہائی ظلم ہے۔ (سعیدی غفرلہ)

امام احمد رضا خان فاضل بریلوی المتوفی ۱۳۴۰ھ لکھتے ہیں:

روضۂ انور کا نہ طواف کرو نہ سجدہ نہ اتنا جھکنا کہ رکوع کے برابر ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم ان کی اطاعت میں ہے۔

(فتاویٰ رضویہ، ج ۴ ص ۲۴ ۷، دارالعلوم امجدیہ مکتبہ رضویہ آرام باغ روڈ، کراچی، ۱۴۱۰ھ)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اب جھگڑنے والے عنقریب اٹکل پچو سے کہیں گے کہ یہ جوان تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا، اور بعض کہیں گے وہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا، اور بعض کہیں گے کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا، (اے رسول اکرم!) آپ کہیے: میرے رب ہی ان کی صحیح تعداد کو جاننے والے ہیں، لوگوں میں سے ان کو صرف قلیل لوگ ہی جانتے ہیں، اس لیے آپ ان کے معاملہ میں بحث نہ کریں صرف سرسری گفتگو کریں اور نہ اُن کے متعلق کسی سے کچھ دریافت کریں O" (الکہف: ۲۲)

اصحابِ کہف کی تعداد میں مختلف اقوال

"سَيَقُولُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ":

"سَيَقُولُوْنَ" کی ضمیر اہلِ تورات کی طرف اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصرین کی طرف راجع ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اصحابِ کہف کی تعداد میں اختلاف ہے اور یہ اختلاف صریح قرآن میں مذکور ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد نصاریٰ ہیں، کیونکہ نصاریٰ کے کچھ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نجران سے حاضر ہوئے اور اصحابِ کہف کا ذکر ہوا تو الیعقوبیہ نے کہا: اصحابِ کہف تین تھے اور چوتھا اُن کا کتا تھا، اور النسطوریہ نے کہا: اصحابِ کہف پانچ تھے اور چھٹا اُن کا کتا تھا، اور مسلمانوں نے کہا کہ اصحابِ کہف سات تھے اور آٹھواں اُن کا کتا تھا۔

امام ابواسحاق احمد بن محمد المعروف بالامام الثعلبی المتوفی ۴۲۷ھ، لکھتے ہیں:

"وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ": اللہ تعالیٰ نے ان کے عدد کا اختلاف یہاں تک ذکر فرمایا اور وہ کہتے ہیں کہ اصحابِ کہف سات تھے، پھر یہ حکم لگایا کہ آٹھواں اُن کا کتا تھا اور آٹھواں ساتویں کے بعد ہی ہوگا، یہ مسلمانوں کے قول کی تحقیق ہے۔

اصحابِ کہف کی تعداد کو اللہ تعالیٰ کے علم کی طرف راجع کرنا

"قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ": قتادہ نے کہا کہ کم لوگ اُن کی تعداد کو جانتے ہیں۔

عطاء نے کہا کہ "قَلِيْلٌ" سے مراد اہلِ کتاب ہیں۔

اور الضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ میں اُن "قَلِيْلٌ" میں سے ہوں۔

(الکشف والبیان، ج ۶ ص ۱۶۳، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۲ھ)

"فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا": یعنی اصحابِ کہف کے متعلق ان سے بحث نہ کریں سوا اُن باتوں کے جن کی ہم نے آپ کی طرف وحی فرمائی ہے۔ اور اس میں یہ بتایا ہے کہ اصحابِ کہف کی تعداد کو اللہ تعالیٰ کی طرف مفوض کر دیں۔

دینی مسائل کے متعلق اہلِ کتاب سے سوال کرنے کی ممانعت

"وَلَا تَسْتَفْتِ فِیْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا": روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کے عیسائیوں سے اصحاب کہف کے متعلق سوال کیا تھا تو آپ کو اس سوال سے منع فرما دیا، اور اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ مسلمانوں کو کسی معاملہ میں بھی علم حاصل کرنے کے لیے اہلِ کتاب کی طرف رجوع نہیں کرنا چاہیے۔ (الجامع لاحکام القرآن، جز ۱۰ ص ۳۲۱-۳۲۲، دارالکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾

اور (اے رسول اکرم!) آپ کسی کام کے متعلق ہرگز یہ نہ کہیں کہ میں اس کام کو کل کروں گا ○

اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ؗ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِیْتَ وَقُلْ عَسٰۤی اَنْ یَّهْدِیَنِ رَبِّیْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾

مگر یہ کہ اللہ چاہے اور جب آپ (ان شاء اللہ کہنا) بھول جائیں تو یاد آنے پر ان شاء اللہ کہیں، اور آپ کہیے کہ عنقریب میرے رب مجھے اس معاملہ میں اس سے زیادہ قریب ہدایت عطا فرمائیں گے ○

وَلَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿۲۵﴾

اور (کچھ لوگ یہ کہیں گے کہ) اصحاب کہف اپنے غار میں تین سو سال رہے اور بعض لوگوں نے (اس مدت میں) نو سال کا اضافہ کیا ○

قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ ؗ وَّلَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾

(اے رسول اکرم!) آپ کہیے: اللہ ہی زیادہ جاننے والے ہیں کہ وہ کتنی مدت تک غار میں رہے، تمام آسمانوں اور زمینوں کا غیب انہی کے ساتھ مخصوص ہے، وہ کس قدر زیادہ دیکھنے والے اور کس قدر زیادہ سننے والے ہیں، اور ان کے سوا لوگوں کا کوئی کارساز نہیں ہے اور وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں فرماتے ○

وَاتْلُ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۷﴾

اور آپ اپنے رب کی کتاب سے اس کی تلاوت کیجیے جس کی آپ کی طرف وحی فرمائی گئی ہے، اللہ کے کلمات کو کوئی بدلنے والا نہیں ہے اور آپ ان کے سوا کوئی پناہ کی جگہ نہیں پائیں گے ○

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾

اور آپ اُن لوگوں کے ساتھ صبر کرتے رہیں جو صبح اور شام اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں اور ان کی رضا کو طلب کرتے ہیں، اور آپ اپنی آنکھوں سے انہیں چھوڑ کر دوسروں کی طرف نہ دیکھیں، آپ دنیا کی زندگی کی خوش نمائی کا ارادہ کرتے ہیں اور آپ اس کی اطاعت نہ کریں جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل فرما دیا ہے اور جو اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے، اور اس کے کام حد سے تجاوز ہیں O

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۚ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۭ وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ۭ بِئْسَ الشَّرَابُ ۭ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۲۹﴾

اور آپ کہیے: یہ قرآن تمہارے رب کی طرف سے برحق ہے، پس جو چاہے اس پر ایمان لائے اور جو چاہے اس کا کفر کرے، بے شک ہم نے ظالموں کے لیے ایسی آگ تیار فرما رکھی ہے جس کی قناتیں ان کا احاطہ کرلیں گی، اور اگر وہ (پیاس کی شدت سے) فریاد کریں گے تو انہیں پگھلے ہوئے تانبے کی شکل پانی دیا جائے گا جو ان کے چہروں کو جلا دے گا، وہ بہت برا مشروب ہے اور (دوزخ) بہت بری ٹھہرنے کی جگہ ہے O

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ﴿۳۰﴾

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے، بے شک ہم نیک کام کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں فرماتے O

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۭ نِعْمَ الثَّوَابُ ۭ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۳۱﴾

یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے دائمی جنتیں ہیں جن کے نیچے سے دریا جاری ہیں، انہیں وہاں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے، وہ وہاں دبیز اور باریک ریشم کے سبز کپڑے پہنیں گے، اور مسہریوں پر ٹیک لگائے ہوئے ہوں گے، یہ بہت عمدہ ثواب ہے اور بہت اچھی آرام کی جگہ ہے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور (اے رسولِ اکرم!) آپ کسی کام کے متعلق ہرگز یہ نہ کہیں کہ میں اس کام کو کل کروں گا ○" (الکہف: ۲۳)

الکہف: ۲۳ کا شانِ نزول

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ، الکہف: ۲۳ تا ۳۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا":

مفسرین نے کہا ہے کہ جب لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تین چیزوں کے متعلق سوال کیا: (۱) روح کی حقیقت کے متعلق سوال کیا (۲) اصحاب کہف کی تعداد کے متعلق سوال کیا (۳) ذوالقرنین کے متعلق سوال کیا، آپ نے وحی پر اعتماد کرتے ہوئے کہا کہ میں تمہیں اس کی کل خبر دوں گا اور ان شاء اللہ نہیں کہا، پھر چند دن تک وحی نازل نہیں ہوئی۔ ایک قول یہ ہے کہ پندرہ دن تک وحی نازل نہیں ہوئی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ چالیس دن تک وحی نازل نہیں ہوئی، پھر اس کے بعد آپ پر وحی نازل ہوئی۔

اس اعتراض کا جواب کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے باوجود ان شاء اللہ نہ کہنا معصیت ہے

اس کا جواب یہ ہے کہ اولیٰ اور افضل یہی ہے کہ آپ آئندہ کسی کام کو کرنے سے پہلے ان شاء اللہ کہیں، مگر بعض اوقات آپ کسی وجہ سے ان شاء اللہ کہنا بھول جاتے ہیں، لہٰذا یہ ترکِ اولیٰ اور ترکِ افضل کے باب سے ہے اور معصیت نہیں ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خلافِ اولیٰ کا صدور نہ صرف جائز ہے بلکہ واقع ہے اور قرآن مجید کی جن آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ذنب کی نسبت کی گئی ہے اس سے مراد بھی خلافِ اولیٰ کا صدور ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "مگر یہ کہ اللہ چاہیں اور جب آپ (ان شاء اللہ کہنا) بھول جائیں تو یاد آنے پر ان شاء اللہ کہیں، اور آپ کہیے کہ عنقریب میرے رب مجھے اس معاملہ میں اس سے زیادہ قریب ہدایت عطا فرمائیں گے ○" (الکہف: ۲۴)

"اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ": اس کا سبب یہ ہے کہ کسی کام کو کرنے سے پہلے ان شاء اللہ کہنا اس لیے ضروری ہے، کیونکہ جب انسان یہ کہے کہ میں فلاں کام کو کل کروں گا تو ہوسکتا ہے کہ وہ کل کا دن آنے سے پہلے فوت ہو جائے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ زندہ رہے لیکن اس کام کے کرنے سے اسے کوئی مانع پیش آ جائے، پھر جب وہ ان شاء اللہ نہیں کہے گا تو اپنے اس وعدہ میں جھوٹا ہوگا اور جھوٹ انبیاء علیہم السلام کے لیے جائز نہیں ہے، اس لیے یہ واجب قرار دیا کہ مستقبل میں کوئی کام کرنے سے پہلے آپ ان شاء اللہ کہیں۔

"وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِیْتَ": اس آیت کی اصل یہ ہے کہ جب آپ ان شاء اللہ کہنا بھول جائیں تو جب آپ کو یاد آئے تو ان شاء اللہ پڑھ لیں، اور ان شاء اللہ کہنا کسی وقت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر وقت میں ان شاء اللہ کہنا جائز ہے، جب بھی انسان کو یاد آئے تو ان شاء اللہ کہہ لے۔

استثناء منفصل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور امام ابوحنیفہ کا اختلاف

اگر استثناء متصل ہو تو مستثنیٰ کو اسی مجلس میں کہنا ضروری ہے اور اگر استثناء منفصل ہو تو مستثنیٰ کو بعد میں ذکر کرنا بھی جائز ہے۔

حکایت ہے کہ خلیفہ منصور کو یہ خبر پہنچی کہ امام ابوحنیفہ استثناء منفصل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اختلاف کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ فرماتے تھے کہ استثناء منفصل میں بھی مستثنیٰ کو متصلاً ذکر کرنا ضروری ہے، اور امام ابوحنیفہ یہ فرماتے تھے کہ استثناء منفصل میں مستثنیٰ کو کلام کے ساتھ متصل ذکر کرنا ضروری نہیں ہے، تو منصور نے امام ابوحنیفہ کو بلایا اور ان سے کہا کہ آپ ہمارے دادا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے مسلک کی مخالفت کیوں کرتے ہیں؟ امام ابوحنیفہ نے جواب دیا: یہ مسلک تو تمہارے لیے مضر ہے، کیونکہ جب لوگ قسم کھا کر تمہاری اطاعت کی بیعت کریں گے تو کیا تم اس کو پسند کرو گے کہ تمہارے پاس سے جانے کے بعد وہ ان شاء اللہ کہہ لیں، تو منصور نے اس جواب کو پسند کیا۔

(الکشاف، ج ۲ ص ۶۶۸-۶۶۹، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۷ھ تفسیر کبیر، ج ۷ ص ۴۵۲، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

"وَقُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا": اس میں اصحاب کہف کی خبر کی طرف اشارہ ہے، اور اس کا معنی یہ ہے کہ عنقریب اللہ تعالیٰ مجھے ایسے دلائل القاء فرمائیں گے جو میری نبوت کے صدق پر دلالت کریں گے اور وہ دلائل اصحاب کہف کی خبر سے زیادہ قریب ہوں گے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی فرمایا جب کہ آپ کو انبیاء علیہم السلام کے قصے بیان فرمائے اور غیب کی خبروں کا علم عطا فرمایا، ان چیزوں کا علم آپ کو اللہ تعالیٰ کی وحی سے ہوا اور اللہ تعالیٰ کی وحی نبی پر نازل ہوتی ہے، سو اس سے آپ کی نبوت پر دلائل قائم ہو گئے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور (کچھ لوگ یہ کہیں گے کہ) اصحاب کہف اپنے غار میں تین سو سال رہے اور بعض لوگوں نے (اس مدت میں) نو سال کا اضافہ کیا O" (الکہف: ۲۵)

اصحاب کہف کی غار میں قیام کی مدت

"وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا": بعض مفسرین نے کہا: یہ اہل کتاب کی دی ہوئی خبر ہے کہ اصحاب کہف غار میں تین سو سال رہے اور بعض نے اس میں نو سال کا اضافہ کیا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی خبر نہیں ہے، کیونکہ اگر یہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی خبر ہوتی تو اللہ تعالیٰ یہ نہ ارشاد فرماتے: "قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا۔ (الکہف: ۲۶)" ((اے رسول اکرم!) آپ کہیے: اللہ ہی زیادہ جاننے والے ہیں کہ وہ کتنی مدت تک غار میں رہے)۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "(اے رسول اکرم!) آپ کہیے: اللہ ہی زیادہ جاننے والے ہیں کہ وہ کتنی مدت تک غار میں رہے، تمام آسمانوں اور زمینوں کا غیب انہی کے ساتھ مخصوص ہے، وہ کس قدر زیادہ دیکھنے والے اور کس قدر زیادہ سننے والے ہیں، اور اُن کے سوا لوگوں کا کوئی کارساز نہیں ہے اور وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں فرماتے O" (الکہف: ۲۶)

"قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ۫ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا":

ضیاء الامت حضرت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری حنفی متوفی ۱۴۱۸ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

امام ابن جریر نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ حضرت قتادہ کا مذہب یہ ہے کہ تین سو نو سال کی یہ مدت یہودیوں کا قول ہے، یہ قرآن کی بیان کردہ مدت نہیں ورنہ بعد میں یہ نہ فرمایا جاتا: "قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا۔ (الکہف:۲۶)" کہ اللہ بہتر جانتا ہے جتنی مدت وہ ٹھہرے، اور قتادہ کے اس قول کی تائید حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت سے ہوتی ہے۔ "وقالوا ولبثوا فی الکہف" یعنی یہودیوں نے کہا کہ وہ غار میں اتنی مدت رہے تھے۔ (ضیاء القرآن، ج ۳ ص ۲۴، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور)

تین سورتوں کا باہمی ارتباط

امام رازی فرماتے ہیں: یہ تین سورتیں یعنی سورۂ بنی اسرائیل، سورۂ کہف اور سورۂ مریم ایک دوسرے کے بعد نازل ہوئی ہیں اور ان تینوں سورتوں میں ایک عجیب و غریب اور نادر صورت کا ذکر فرمایا ہے، پس سورۂ بنی اسرائیل میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جاگتے میں مکہ سے شام تک رات کے ایک لمحہ میں سفر کرانے اور اسی لمحہ میں واپس لانے کا ذکر ہے اور یہ حالت عجیبہ ہے، اور سورۃ الکہف میں تین نوجوانوں کا تین سو سال یا اس سے کم و بیش عرصہ تک سونے کا ذکر ہے اور یہ بھی حالت عجیبہ ہے، اور سورۂ مریم میں بغیر باپ کے ولد کی پیدائش کا ثبوت ہے اور یہ بھی حالت عجیبہ ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور آپ اپنے رب کی کتاب سے اس کی تلاوت کیجئے جس کی آپ کی طرف وحی فرمائی گئی ہے، اللہ کے کلمات کو کوئی بدلنے والا نہیں ہے اور آپ ان کے سوا کوئی پناہ کی جگہ نہیں پائیں گے O"

(الکہف: ۲۷)

"وَاتْلُ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ": اس آیت کا معنی یہ ہے کہ آپ اس کتاب کے تقاضوں کے مطابق عمل کو لازم رکھیے۔ "وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا": اس پر اتفاق ہے کہ "ملتحد" کا معنی ہے "ملجأ"۔ اور اس آیت کا معنی ہے کہ آپ احکام کے متعلق قرآن کے سوا اور کوئی "ملجأ" نہیں پائیں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور آپ اُن لوگوں کے ساتھ صبر کرتے رہیں جو صبح اور شام اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں اور ان کی رضا کو طلب کرتے ہیں، اور آپ اپنی آنکھوں سے انہیں چھوڑ کر دوسروں کی طرف نہ دیکھیں، آپ دنیا کی زندگی کی خوش نمائی کا ارادہ کرتے ہیں اور آپ اس کی اطاعت نہ کریں جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل فرما دیا ہے اور جو اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے، اور اس کے کام حد سے متجاوز ہیں O"

(الکہف: ۲۸)

"وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ": اکابر کفار قریش نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپ پر

ایمان لائیں تو آپ اپنے پاس سے ان فقراء کو اٹھا دیں جو آپ پر ایمان لا چکے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان فقراء کے اٹھانے سے منع فرمایا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهٗ ۖ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظّٰلِمِينَ ﴿۵۲﴾ (الانعام: ۵۲)'' (اور ان (مسکین مسلمانوں) کو (اپنے سے) دور نہ کیجئے جو صبح اور شام اپنے رب کو پکارتے ہیں، جو صرف اپنے رب کی رضا چاہتے ہیں، اور ان کے حساب سے آپ کے ذمہ کچھ نہیں، اور نہ آپ کے حساب سے ان کے ذمہ کوئی چیز ہے، پھر (بھی اگر بالفرض) آپ انہیں خود سے دور کریں گے تو (معاذ اللہ) آپ ناانصافی کرنے والوں میں سے ہو جائیں گے ○)۔

پس اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ ان فقراء کو اپنی مجلس سے اٹھانا آپ کے لیے جائز نہیں ہے، آپ کفار کے اقوال کی طرف توجہ نہ کریں اور ان کی بات کو اہمیت نہ دیں خواہ وہ غائب ہوں یا حاضر ہوں۔

''بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهٗ'': اس کے دو محمل ہیں: ایک محمل یہ ہے کہ جو ہر وقت اللہ عزوجل کی عبادت کرتے رہتے ہیں۔ دوسرا محمل یہ ہے کہ جو فجر کی نماز سے عصر کی نماز تک اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔

''وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ'': اور اپنی آنکھوں کو ان سے دوسروں کی طرف تجاوز نہ کریں۔ اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے منع فرمایا ہے کہ وہ فقراء مومنین کی تحقیر کریں اور ان سے نظریں تجاوز کر کے مالدار لوگوں کی طرف دیکھیں۔

میں کہتا ہوں: یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس آیت میں ذکر آپ کا فرمایا ہو اور بہ طور تعریض اس سے مراد آپ کی امت ہو، یعنی آپ کی امت کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ان فقراء مسلمین کو نظر انداز کر کے کفار مال داروں کی طرف دیکھیں، کیونکہ آپ سے یہ متصور نہیں ہے کہ آپ فقراء مسلمین کے مقابلہ میں مال دار کفار کی طرف نظر اٹھا کر دیکھیں گے۔ (سعیدی غفرلہ)

''تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا'': یعنی اگر آپ نے بالفرض ایسا کیا تو آپ کا یہ اقدام محض دنیا کی زندگی کی خوشنمائی کی وجہ سے ہوگا۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے فقراء مسلمین کی مجلس کے ساتھ رہنے کے لیے مبالغہ فرمایا تو مال داروں کے اقوال کی طرف التفات کرنے سے بھی منع فرمایا، پس ارشاد فرمایا: ''وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ''۔

انسان کا بدترین حال یہ ہے کہ اس کا دل اللہ تعالیٰ کے ذکر سے خالی ہو اور دنیاوی خواہشات اور لذات سے بھرا ہوا ہو، اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر نور ہے اور دوسروں کا ذکر ظلمت ہے اور جب انسان کا دل مخلوق کی طرف متوجہ ہوا تو اس میں ظلم اور ظلمت پیدا ہوگئی، اسی وجہ سے اس کا دل حق سے اعراض کرتا رہا اور مخلوق کی طرف متوجہ ہوتا رہا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ اس کی طرف توجہ نہ کریں جس کا دل ہمارے ذکر سے خالی ہے اور اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے۔

مذکورہ آیتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کا بہ طور تعریض ہونا

میں کہتا ہوں: اس آیت میں بھی بہ طور تعریض خطاب آپ سے ہے اور مراد آپ کی امت ہے، یعنی آپ کی امت کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ جس کا دل اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہو وہ اس کی خواہش کی پیروی کرے، کیونکہ آپ سے یہ متصور نہیں ہے کہ آپ اس کی اطاعت کریں گے جس کا دل اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہوگا۔ (سعیدی غفرلہ)

''وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا'': اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جس چیز کی حفاظت اور اہتمام کرنا چاہیے وہ دین کے احکام پر عمل کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان فقراء کی یہ صفت بیان فرمائی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے غیر سے اعراض کرتے ہیں۔

فقراء مسلمین کی معیت کو لازم رکھنے کے متعلق حدیث

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دن ضعفاء مہاجرین کے پاس مجلس میں بیٹھا ہوا تھا اور ان میں سے بعض اپنی برہنگی کو کپڑوں سے چھپا رہے تھے، اور بعض قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے، آپ نے پوچھا: تم کیا کر رہے تھے؟ تو انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! ہم میں سے ایک اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تلاوت کر رہا تھا اور ہم سن رہے تھے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے لیے تمام تعریفیں ہیں جنہوں نے میری امت میں سے ایسے لوگ پیدا فرمائے کہ جن کے ساتھ رہنے کا مجھے حکم فرمایا، پھر آپ ہمارے درمیان بیٹھ گئے اور آپ نے فرمایا: اے فقراء مہاجرین! قیامت کے دن اس مکمل نور کی خوش خبری لو تم مال داروں سے پچاس ہزار سال پہلے جنت میں داخل ہو گے۔

(سنن ابوداؤد: ۳۶۶۶، سنن ترمذی: ۲۳۵۱، سنن ابن ماجہ: ۴۱۲۳، شرح السنۃ للبغوی: ۳۹۹۲، مسند ابو یعلیٰ: ۱۱۵۱، المعجم الاوسط للطبرانی: ۸۳، مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۲۵۹، مسند احمد: ۱۱۶۰۴، المسند الموضوعی الجامع للکتب العشرۃ ج ۳ ص ۱۵۳، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۳ ص ۲۳۴)

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ فقراء مہاجرین مال داروں سے قیامت کے دن چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ (صحیح مسلم: ۲۹۷۹، مسند احمد: ۶۵۷۸)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور آپ کہیے: یہ قرآن تمہارے رب کی طرف سے برحق ہے، پس جو چاہے اس پر ایمان لائے اور جو چاہے اس کا کفر کرے، بے شک ہم نے ظالموں کے لیے ایسی آگ تیار فرما رکھی ہے جس کی قناتیں ان کا احاطہ کر لیں گی، اور اگر وہ (پیاس کی شدت سے) فریاد کریں گے تو انہیں پگھلے ہوئے تانبے کی مثل پانی دیا جائے گا جو ان کے چہروں کو جلا دے گا، وہ بہت برا مشروب ہے اور (دوزخ) بہت بری ٹھہرنے کی جگہ ہے O'' (الکہف:۲۹)

گزشتہ آیت کے ساتھ ارتباط

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم فرمایا تھا کہ وہ مال داروں کی طرف توجہ نہ کریں جنہوں نے کہا تھا کہ اگر آپ نے ان فقراء مومنین کو اپنے پاس سے اٹھا لیا تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ اس کے بعد فرمایا: ''وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ'': یعنی یہ اللہ کی طرف سے دین حق ہے، اگر تم نے اس کو قبول کر لیا تو اس کا نفع تمہیں پہنچے گا اور اگر تم نے اس کو قبول نہیں کیا تو اس کا ضرر بھی تمہیں پہنچے گا۔ اور اس کا مال و دولت کی کمی یا زیادتی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

''فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ'': اس آیت میں یہ تصریح ہے کہ ایمان اور کفر اور اطاعت اور نافرمانی کا معاملہ بندے اور اس کے اختیار کی طرف مفوض ہے، اور جو اس کا انکار کرتا ہے وہ صریح قرآن کا انکار کرتا ہے۔

بندوں سے کفر کے مطالبہ کا نہ ہونا

اس آیت سے یہ مراد نہیں ہے کہ بندوں سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ ایمان لائیں یا کفر کریں بلکہ یہ صیغہ تہدید اور وعید کے لیے ہے یعنی انہیں دھمکانے اور ڈرانے کے لیے ہے اور اختیار کے لیے ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۟ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا (بنی اسرائیل: ۷)" (اگر تم نیک کام کرو گے تو ان کا فائدہ تم کو ہی ملے گا، اور اگر تم برے کام کرو گے تو اس کا ضرر بھی تم ہی کو پہنچے گا)۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے کفر پر وعید کا ذکر فرمایا ہے: "اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِیْنَ نَارًا" یعنی جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور عبادت کو اس کی جگہ میں نہیں رکھا، تو ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے وعید سنائی کہ ان لوگوں کے لیے دوزخ کی آگ تیار رکھی ہے۔

"اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا": السرادق اُن قناتوں اور رکاوٹوں کو کہتے ہیں جو خیموں کے گرد ہوتی ہیں، پس دوزخ کو اس چیز کے ساتھ تشبیہ دی جو جمیع جہات سے محیط ہوتی ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے لیے دوزخ سے کوئی نجات کی جگہ نہیں ہے، اور نہ دوزخ کی آگ کے سوا کوئی اور چیز انہیں دکھائی دے گی۔ "وَاِنْ یَّسْتَغِیْثُوْا یُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ": امام ابوعبیدہ اور الاخفش نے کہا: ہر سونا یا تانبا یا چاندی جس کو پگھلا یا جائے تو وہ "المھل" ہے۔ پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب وہ پینے کے لیے پانی طلب کریں گے تو ان کو یہ "المھل" دیا جائے گا۔ "یَشْوِی الْوُجُوْهَ": اس مشروب کی گرمی سے چہرے جل بھن جاتے ہیں۔

"بِئْسَ الشَّرَابُ": یعنی جو پانی پگھلے ہوئے تانبے کی شکل ہے وہ بہت برا مشروب ہے، اور مشروب اس لیے ہوتا ہے کہ اس سے پیاس کی حرارت سے تسکین حاصل ہو اور یہ پگھلا ہوا تانبا تو جسم کو جلا دیتا ہے۔

"وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا": یعنی آگ برا ٹھکانا ہے۔ اور رفیقوں کے جمع ہونے کی بری جگہ ہے، کیونکہ اہل دوزخ میں بھی رفقاء ہوں گے جیسے اہل جنت میں رفقاء ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جنت کی صفت میں فرمایا ہے: "وَحَسُنَ اُولٰٓىِٕكَ رَفِیْقًا ۝ (النساء: ۶۹)" (اور یہ کیسے اچھے ساتھی ہیں O)۔ اور دوزخ کے رفقاء کفار اور شیاطین ہیں، اور یہ بہت برے ساتھی ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے، بے شک ہم نیک کام کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں فرماتے O" (الکھف: ۳۰)

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے باطل پرستوں کی وعید ذکر فرمائی تھی، اب اس کے بعد حق پرستوں کے متعلق وعدہ کا ذکر فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ": اس آیت میں اعمال صالحہ کا ایمان پر عطف فرمایا ہے، اور عطف مغایرت کا تقاضا کرتا ہے، یعنی اعمال صالحہ ایمان کا غیر ہیں۔

اس کے بعد فرمایا: "اِنَّا لَا نُضِیْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا": اس آیت کا ظاہر یہ تقاضا کرتا ہے کہ جس نے نیک عمل کیے اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر واجب ہے، ہمارے اصحاب اہل سنت کے نزدیک اللہ تعالیٰ پر یہ اجر اس لیے واجب ہے کہ انہوں نے اپنے کرم کے تقاضا سے اپنے اوپر نیکوکاروں کے لیے اجر کو لازم فرما لیا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے دائمی جنتیں ہیں جن کے نیچے سے دریا جاری ہیں، انہیں

وہاں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے، وہ وہاں دبیز اور باریک ریشم کے سبز کپڑے پہنیں گے، اور مسہریوں پر ٹیک لگائے ہوئے ہوں گے، یہ بہت عمدہ ثواب ہے اور بہت اچھی آرام کی جگہ ہے O"

(الکہف: ۳۱)

عدن کا معنی

"اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ": لغت میں عدن کا معنی اقامت ہے، لہٰذا اس آیت کا معنی ہے کہ یہ جنات مومنین کی اقامت کی جگہیں ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عدن جنت میں کسی معین جگہ کا نام ہو اور وہ جنت کا وسط ہے۔

اور جنات کا لفظ جمع ہے، ہو سکتا ہے اس سے مراد وہ جنتیں ہوں جن کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر فرمایا ہے: "وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۞ (الرحمٰن: ۴۶)" (اور جو شخص اپنے رب کی بارگاہ میں حاضر ہونے سے ڈرے اس کے لیے دو جنتیں ہیں O)۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہر مکلف کے لیے الگ الگ جنت ہو۔ اور یہ فرمایا کہ ان جنات کی صفت یہ ہے کہ ان کے نیچے سے دریا جاری ہوتے ہیں، کیونکہ دنیا میں سب سے افضل گھر ایسے باغات ہیں جن کے نیچے سے دریا جاری ہوں۔

"یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ": اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ دنیا میں لوگوں کا لباس زینت کے لیے زیورات پر مشتمل ہوتا ہے اور یا برہنگی کو چھپانے کے لیے ہوتا ہے، اور جو لباس زینت کے لیے زیورات پر مشتمل ہے وہ اہل جنت کو دیا جائے گا یعنی اللہ تعالیٰ ان کو زیورات والا لباس عطا فرمائیں گے یا فرشتے ان کو زیورات پہنا دیں گے۔

بعض مفسرین نے کہا: ہر جنتی کو تین کنگن پہنائے جائیں گے۔ ایک کنگن سونے کا ہوگا جیسا کہ اس آیت کا تقاضا ہے اور ایک کنگن چاندی کا ہوگا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ۔ (الدھر: ۲۱)" (اور انہیں چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے)۔ اور ایک کنگن موتیوں کا ہوگا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا۔ (الحج: ۲۳)" (ان میں انہیں سونے کے اور موتیوں کے کنگن پہنائے جائیں گے)۔

"وَیَلْبَسُوْنَ ثِیَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ": "سُنْدُسٍ" کا معنی ہے باریک ریشم اور "اِسْتَبْرَقٍ" کا معنی ہے دبیز ریشم۔ یہ دنیاوی ریشم کے اعتبار سے ہے۔ "مُّتَّكِـِٕیْنَ فِیْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ": اس آیت میں اہل جنت کے بیٹھنے کی صفت بیان فرمائی ہے کہ وہ مسہریوں پر بیٹھے ہوں گے۔ "نِعْمَ الثَّوَابُؕ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا": یہ بہت عمدہ ثواب ہے اور بہت اچھی آرام کی جگہ ہے۔ (التفسیر الکبیر ج ۷ ص ۴۵۰۔ ۴۶۱ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَیْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَیْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَیْنَهُمَا زَرْعًاؕ ۝۳۲

اور (اے رسول اکرم!) ان لوگوں کے لیے دو مردوں کی مثال بیان کیجئے، ان دو مردوں میں سے ایک کے لیے ہم نے انگوروں کے دو باغ بنائے اور ان باغوں کے گرد کھجوروں کے درخت لگا دیے اور ان دونوں باغوں کے درمیان کھیت پیدا فرما دیے O

كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَ لَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَیْــٴًـا ۙ وَّ فَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۙ﴿۳۳﴾

دونوں باغ اپنے پھل لاتے تھے اور انہوں نے پھل دینے میں کوئی کمی نہیں کی اور ہم نے ان دونوں باغوں کے درمیان دریا جاری فرمادیا ۝

وَّ كَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَ هُوَ یُحَاوِرُهٗۤ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾

اور (ان دو مردوں میں سے) ایک کے پاس بہت پھل تھے، اس نے اپنے ساتھی سے گفتگو کرتے ہوئے فخریہ کہا: میں تم سے زیادہ مال دار ہوں اور تم سے زیادہ طاقتور لوگ رکھتا ہوں ۝

وَ دَخَلَ جَنَّتَهٗ وَ هُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِیْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ۙ﴿۳۵﴾

اور ایک دن وہ اپنی جان پر ظلم کرتا ہوا اپنے باغ میں داخل ہوا، اس نے کہا: میرا گمان ہے کہ یہ باغ کبھی بھی برباد نہیں ہوگا ۝

وَّ مَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآىٕمَةً ۙ وَّ لَىٕنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّیْ لَاَجِدَنَّ خَیْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿۳۶﴾

اور میں نہیں گمان کرتا کہ کبھی قیامت واقع ہوگی، اور اگر بالفرض میں اپنے رب کی طرف لوٹایا گیا تو میں وہاں ضرور اس باغ سے اچھی جگہ پاؤں گا ۝

قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَ هُوَ یُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرْتَ بِالَّذِیْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ؕ﴿۳۷﴾

وہ اپنے جس ساتھی سے باتیں کررہا تھا اس نے کہا: کیا تم اس ذات کا کفر کررہے ہو جنہوں نے تم کو مٹی سے پیدا فرمایا، پھر نطفہ سے پیدا فرمایا، پھر تم کو مکمل مرد بنادیا ۝

لٰكِنَّاۡ هُوَ اللّٰهُ رَبِّیْ وَ لَاۤ اُشْرِكُ بِرَبِّیْۤ اَحَدًا ﴿۳۸﴾

لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ وہ اللہ ہی میرے رب ہیں اور میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں قرار دوں گا ۝

وَ لَوْ لَاۤ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّ وَلَدًا ۚ﴿۳۹﴾

اور جب تم اپنے باغ میں داخل ہوئے تھے تو تم نے یہ کیوں نہ کہا: ”جو اللہ چاہتے ہیں وہی ہوتا ہے اور اللہ کے سوا کسی کی خیر پر طاقت نہیں ہے“، اگر تم مجھے مال اور اولاد میں اپنے سے کم سمجھتے ہو ۝

فَعَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ﴿۴۰﴾

تو ہوسکتا ہے کہ میرے رب مجھے تمہارے باغ سے بہتر باغ عطا فرما دیں، اور تمہارے اس باغ پر آسمان سے کوئی آفت بھیج دیں جس سے وہ باغ بنجر پھسلواں میدان بن جائے O

اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ﴿۴۱﴾

یا اس کا پانی زمین میں دھنس جائے پس تم اس پانی کو ہرگز تلاش نہ کرسکو O

وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ﴿۴۲﴾

اور اس کے پھلوں کو اللہ کے عذاب نے گھیر لیا، پھر وہ اپنے خرچ کیے ہوئے مال پر افسوس سے ہاتھ ملتا ہوا رہ گیا اور وہ باغ اپنے چھپروں پر گر گیا اور وہ کہنے لگا: کاش! میں نے اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہوتا O

وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ﴿۴۳﴾

اور اس کے پاس کوئی ایسی جماعت نہ تھی جو اللہ کو چھوڑ کر اس کی مدد کرتی اور نہ ہی وہ بدلہ لے سکتا تھا O

هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ؕ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ﴿۴۴﴾ ع

یہیں سے واضح ہوا کہ تمام سلطنت اللہ ہی کے لیے ہے جو برحق ہیں، وہی سب سے بہتر ثواب اور جزا عطا فرمانے والے ہیں O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور (اے رسولِ اکرم!) ان لوگوں کے لیے دو مردوں کی مثال بیان کیجئے، ان دو مردوں میں سے ایک کے لیے ہم نے انگوروں کے دو باغ بنائے اور اُن باغوں کے گرد کھجوروں کے درخت لگا دیے اور ان دونوں باغوں کے درمیان کھیت پیدا فرما دیے O" (الکھف: ۳۲)

<u>جن دو مردوں کی قرآن مجید نے مثال بیان فرمائی ہے، ان کا تذکرہ</u>

علامہ ابو الفرج عبد الرحمٰن بن علی بن الجوزی الحنبلی المتوفی ۵۹۷ھ، الکھف: ۳۲ تا ۴۴ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ":

عطاء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ یہ دونوں مرد بنی اسرائیل کے ایک بادشاہ کے بیٹے تھے، اس بادشاہ نے فوت ہونے سے پہلے ان دونوں بیٹوں کو اپنا ترکہ دے دیا، پس ان میں سے ایک بیٹے نے تو اس ترکہ سے باغات اور محلات بنائے اور دوسرا

بیٹا دنیا سے بے رغبتی کرتا تھا، اور جب اس کا بھائی دنیا کی زینت میں سے کچھ خرچ کرتا تو وہ اتنا ہی مال اپنی آخرت کے لیے صدقہ دیتا، حتیٰ کہ اس کا مال ختم ہو گیا، پس اللہ عزوجل نے ان دونوں کی مثال مومن اور اس کافر کے لیے بیان فرمائی جو دنیا کی نعمت پر اترا رہا ہو۔

اور ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ جب مسلمان اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنا سارا مال خرچ کر کے محتاج ہو گیا تو اس نے اپنے کافر بھائی سے مدد چاہی، پس کافر نے کہا: وہ مال کہاں ہے جس کے تم اپنے باپ سے وارث ہوئے تھے، مسلمان نے کہا: میں نے اس مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا ہے، کافر نے کہا: لیکن میں نے تو اس مال سے باغات بنائے ہیں اور بکریاں اور گائیں خریدی ہیں، اور اللہ کی قسم! میں تمہیں کچھ بھی نہیں دوں گا حتیٰ کہ تم میرے دین کی پیروی کرو، پھر اس نے مسلمان کا ہاتھ پکڑا اور اس کو اپنے باغات میں داخل کیا اور ان باغات میں گھمایا اور اس کو اپنے دین کی طرف رغبت دیتا رہا۔

اور مقاتل نے کہا: مومن کا نام یملیخا تھا اور کافر کا نام قرطس تھا، دوسرا قول ہے کہ فطرس تھا، اور ایک قول یہ ہے کہ یہ مثال عیینہ بن حصن اور اس کے اصحاب اور حضرت سلمان اور ان کے اصحاب رضی اللہ عنہم کے متعلق بیان فرمائی ہے۔

میں کہتا ہوں: اس قول پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ سورۃ الکہف مکی ہے اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہ اس وقت مکہ میں نہیں تھے۔

(سعیدی غفرلہٗ)

''وَحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ'': ''حَفَفْنٰهُمَا'' الحف سے ماخوذ ہے، اس کا معنی ہے: کسی چیز کا احاطہ کرنا، جیسے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ۔ (الزمر: ۷۵)'' (اور (اے رسول اکرم!) آپ دیکھیں گے کہ فرشتے عرش کا احاطہ کیے ہوئے اپنے رب کی تسبیح ان کی حمد کے ساتھ کر رہے ہیں)۔ اور معنی یہ ہے کہ ہم نے کھجور کے درختوں کو ان باغوں کا احاطہ کرنے والا بنا دیا۔ ''وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا'': اور ہم نے اُن کے درمیان کھیت بنا دیا۔ اس آیت میں یہ خبر دی ہے کہ اُن دونوں باغوں کی تعمیر مکمل تھی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''دونوں باغ اپنے پھل لاتے تھے اور انہوں نے پھل دینے میں کوئی کمی نہیں کی اور ہم نے ان دونوں باغوں کے درمیان دریا جاری فرما دیا O'' (الکہف: ۳۳)

''كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا'': الفراء نے کہا ہے اس جگہ ''اٰتَتَا'' نہیں فرمایا، اس لیے کہ ''كِلْتَا'' تثنیہ کا صیغہ ہے اور اس کا واحد نہیں آتا۔ اور بصریوں نے کہا ہے کہ ''کلا اور کلتا'' دونوں اسم مفرد ہیں تثنیہ نہیں ہیں اور الفراء نے کہا ہے کہ یہ تثنیہ ہے اور ''کل'' سے ماخوذ ہے۔ اور اس میں الف کا اضافہ تثنیہ کی وجہ سے کیا گیا ہے۔

یعنی دونوں باغوں کے پھل مکمل تھے۔ ''وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا'': اور ان باغوں کے پھلوں میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔

''وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا'': یعنی ہم نے ان باغوں کے درمیان زمین کو پھاڑا اور اس کے وسط سے ایک دریا جاری فرما دیا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور (ان دو مردوں میں سے) ایک کے پاس بہت پھل تھے، اس نے اپنے ساتھی سے گفتگو کرتے ہوئے فخر یہ کہا: میں تم سے زیادہ مال دار ہوں اور تم سے زیادہ طاقتور لوگ رکھتا ہوں O''

(الکہف: ۳۴)

"وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ": اس آیت میں "ثَمَرٌ" فرمایا ہے، یہ ثمرۃ کی جمع ہے اور ثمرۃ سے مراد وہ پھل ہیں جو درخت سے حاصل ہوتے ہیں۔ اور اگر یہ لفظ "ثُمُرٌ" ہو تو اس کا معنی ہے اموالِ کثیرہ۔ اور مجاہد نے کہا: اس سے مراد ہے سونا اور چاندی۔ اور الازہری نے کہا: "الثمرۃ" کی جمع ثمر آتی ہے اور الثمر کی جمع ثمار آتی ہے، پھر ثمار کی جمع ثُمُر آتی ہے۔

"فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ": پس اس باغ والے نے یعنی کافر نے اپنے مسلمان ساتھی سے کہا۔ "وَهُوَ یُحَاوِرُهٗۤ": اور وہ اس سے خطاب کر رہا تھا۔ "اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا": کہ میں تم سے زیادہ مال دار ہوں اور میرے خدام اور نوکر چاکر بہت زیادہ ہیں۔ اور مقاتل نے کہا: اس کا معنی ہے میرے بیٹے بہت زیادہ ہیں، کیونکہ اس کے مقابلہ میں یہ فرمایا: "اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا" یعنی اگر تو دیکھتا ہے تو میں تجھ سے مال و دولت اور بیٹوں میں کم ہوں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ایک دن وہ اپنی جان پر ظلم کرتا ہوا اپنے باغ میں داخل ہوا، اس نے کہا: میرا گمان ہے کہ یہ باغ کبھی بھی برباد نہیں ہوگا O" (الکہف: ۳۵)

"وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ": یعنی کافر نے مسلمان کا ہاتھ پکڑا اور اس کو اپنے باغ کے گرد گھمایا اور اس کو اپنے باغ کے پھل دکھائے۔

"وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ" اور وہ اپنے کفر کی وجہ سے اپنی جان پر ظلم کرنے والا تھا۔

"قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِیْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا": یعنی میرا گمان ہے کہ یہ باغ کبھی برباد نہیں ہوگا۔ اہل المعانی نے کہا ہے: اسے اس باغ کا حسن بہت اچھا لگا اور اس نے یہ وہم کیا کہ یہ کبھی فنا نہیں ہوگا اور حشر ونشر کا انکار کیا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور میں نہیں گمان کرتا کہ کبھی قیامت واقع ہوگی، اور اگر بالفرض میں اپنے رب کی طرف لوٹایا گیا تو میں وہاں ضرور اس باغ سے اچھی جگہ پاؤں گا O" (الکہف: ۳۶)

"وَّمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآىٕمَةً": اور اس نے کہا کہ میں یہ گمان نہیں کرتا کہ قیامت واقع ہوگی۔

"وَّلَىٕنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّیْ لَاَجِدَنَّ خَیْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا": اور اگر بالفرض میں اپنے رب کی طرف لوٹایا گیا تو میں وہاں ضرور اس باغ سے اچھی جگہ پاؤں گا۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ وہ تو مرنے کے بعد اٹھنے کا منکر تھا تو اس نے کیسے کہا کہ اگر میں اپنے رب کی طرف لوٹایا گیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس نے مسلمان سے کہا کہ اگر میں تمہارے زعم کے مطابق اپنے رب کی طرف لوٹایا گیا تو میرے رب مجھے اس سے اچھا باغ عطا فرمائیں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وہ اپنے جس ساتھی سے باتیں کر رہا تھا اس نے کہا: کیا تم اس ذات کا کفر کر رہے ہو جنہوں نے تم کو مٹی سے پیدا فرمایا، پھر نطفہ سے پیدا فرمایا، پھر تم کو مکمل مرد بنا دیا O" (الکہف: ۳۷)

"قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ": اس کے مسلمان ساتھی نے کہا: "وَهُوَ یُحَاوِرُهٗۤ": جب کہ وہ اس سے بحث کر رہا تھا۔

"اَكَفَرْتَ بِالَّذِیْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ": یعنی کیا تم اس ذات کا کفر کر رہے ہو جنہوں نے تم کو اصل میں مٹی سے پیدا فرمایا۔

"ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ": پھر تمہیں نطفہ سے پیدا فرمایا۔ "ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا": پھر تم کو مکمل مرد بنا دیا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ وہ اللہ ہی میرے رب ہیں اور میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں قرار دوں گاO'' (الکھف: ۳۸)

''لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّیْ وَ لَاۤ اُشْرِكُ بِرَبِّیْۤ اَحَدًا'': لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ اللہ ہی میرے رب ہیں اور میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کروں گا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور جب تم اپنے باغ میں داخل ہوئے تھے تو تم نے یہ کیوں نہ کہا: ''جو اللہ چاہتے ہیں وہی ہوتا ہے اور اللہ کے سوا کسی کی خیر پر طاقت نہیں ہے''، اگر تم مجھے مال اور اولاد میں اپنے سے کم سمجھتے ہوO''
(الکھف: ۳۹)

''وَ لَوْ لَاۤ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ'': اور جب تم اپنے باغ میں داخل ہوئے تھے تم نے کیوں نہیں کہا:

''مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ'': یعنی جو اللہ چاہتے ہیں، وہ ہوتا ہے۔ اور میں اپنے مال کی حفاظت کرنے پر اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر قادر نہیں ہوں، یا کسی آفت اور مصیبت کو دور کرنے پر اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر قادر نہیں ہوں۔

ہشام بن عروہ نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ جب کسی شخص کو اس کا مال بہت اچھا لگے یا وہ اپنے باغ میں داخل ہو اور اس کو اپنا باغ بہت اچھا لگے تو اسے چاہیے کہ وہ کہے: ''مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ''۔

''اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّ وَلَدًا'': اس کا معنی یہ ہے کہ اگر تم یہ دیکھتے ہو کہ میرا مال تم سے کم ہے اور میری اولاد تم سے کم ہے تو اس وجہ سے تم نے تکبر کیا اور اپنے آپ کو مجھ سے بڑا سمجھا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''تو ہوسکتا ہے کہ میرے رب مجھے تمہارے باغ سے بہتر باغ عطا فرمادیں، اور تمہارے اس باغ پر آسمان سے کوئی آفت بھیج دیں جس سے وہ باغ بنجر پھسلواں میدان بن جائےO''
(الکھف: ۴۰)

''فَعَسٰى رَبِّیْۤ اَنْ یُّؤْتِیَنِ'': پس ہوسکتا ہے کہ میرے رب مجھے آخرت میں ''خَیْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ'' تمہارے باغ سے بہتر عطا فرمائیں۔ ''وَ یُرْسِلَ عَلَیْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ'': اور تمہارے باغ پر کوئی عذاب بھیج دیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: آگ بھیج دیں، اور الشعبی نے کہا: یا آسمان سے بجلی کی کڑک کی مثل کوئی چیز بھیج دیں۔

''فَتُصْبِحَ صَعِیْدًا زَلَقًا'': پھر وہ باغ ایک خالی چکنی زمین ہو جائے جس میں کوئی سبزہ نہ ہو۔ دوسرا قول یہ ہے کہ جس میں پیر پھسل جائیں۔ اور مجاہد نے کہا: وہ ریت کا ٹیلا ہو جائے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''یا اس کا پانی زمین میں دھنس جائے پس تم اس پانی کو ہرگز تلاش نہ کر سکوO''
(الکھف: ۴۱)

''اَوْ یُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا'': یا اس باغ کا پانی منقطع ہو جائے۔

''فَلَنْ تَسْتَطِیْعَ لَهٗ طَلَبًا'': یعنی تم اس پانی کو طلب کرنا چاہو تو نہ پاسکو۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور اس کے پھلوں کو اللہ کے عذاب نے گھیر لیا، پھر وہ اپنے خرچ کیے ہوئے مال پر افسوس سے ہاتھ ملتا ہوا رہ گیا اور وہ باغ اپنے چھپروں پر گر گیا اور وہ کہنے لگا: کاش! میں نے اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہوتا O'' (الکہف:۴۲)

''وَ اُحِیْطَ بِثَمَرِهٖ'': یعنی اس کافر کے باغ کے پھلوں کا عذاب نے احاطہ کر لیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک آگ بھیجی جس نے اس باغ کو جلا دیا اور اس کا پانی زمین میں دھنس گیا۔ ''فَاَصْبَحَ یُقَلِّبُ كَفَّیْهِ'': پھر وہ کافر اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر افسوس سے مار رہا تھا۔ ''عَلٰى مَاۤ اَنْفَقَ فِیْهَا'': اس نے اس باغ پر جو خرچ کیا تھا اس پر افسوس کر رہا تھا۔

''وَ هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا'': اور وہ باغ اپنے چھپروں پر گر گیا، العروش کا معنی ہے چھتیں اور اس کا معنی یہ ہے کہ اس کی دیواریں کھڑی ہوئی تھیں اور چھت منہدم ہو گئی تھی۔

''وَ یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّیْۤ اَحَدًا'': اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ اللہ تعالیٰ نے جو اس پر انعام فرمایا تھا وہ انعام اس سے چھین لیا اور اس کے بھائی نے اس کو جن چیزوں سے ڈرایا تھا وہ ثابت ہو گئیں تو وہ اپنے شرک پر اس وقت نادم ہوا جب ندامت کوئی نفع نہیں دیتی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور اس کے پاس کوئی ایسی جماعت نہ تھی جو اللہ کو چھوڑ کر اس کی مدد کرتی اور نہ ہی وہ بدلہ لے سکتا تھا O'' (الکہف:۴۳)

''وَ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ یَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ مَا كَانَ مُنْتَصِرًا'': اور اس کے پاس کوئی ایسی جماعت نہیں تھی جو اس کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچاتی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''یہیں سے واضح ہوا کہ تمام سلطنت اللہ ہی کے لیے ہے جو برحق ہیں، وہی سب سے بہتر ثواب اور جزا عطا فرمانے والے ہیں O'' (الکہف:۴۴)

''هُنَالِكَ الْوَلَایَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ'': اس آیت کے دو محمل ہیں: ابن قتیبہ نے کہا: یہ لوگ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئیں گے اور دنیا میں جن کی عبادات کرتے تھے، ان سے بے زاری کا اظہار کریں گے۔

اور دوسرا محمل یہ ہے کہ یہیں سے معلوم ہوا کہ حقیقی سلطنت اللہ ہی کے لیے ہے۔

''هُوَ خَیْرٌ ثَوَابًا'': اور جو ان سے ثواب کی امید رکھے وہ اس کو افضل ثواب عطا فرمانے والے ہیں۔

''وَّ خَیْرٌ عُقْبًا'': اس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا انجام اللہ تعالیٰ کے غیر کی اطاعت سے بہت بہتر ہے۔

(زاد المسیر فی علم التفسیر، ج ۳ ص ۸۵-۸۷، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۱ھ، وتفاسیر اخری)

وَ اضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ

الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِیْمًا تَذْرُوْهُ الرِّیٰحُ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿۴۵﴾

اور ان لوگوں کے لیے دنیا کی زندگی کی مثال (بھی) بیان کیجئے جو اس پانی کی مثل ہے جس کو ہم نے آسمان سے نازل فرمایا، تو زمین کی پیداوار خوب گھنی ہو گئی، پھر وہ پیداوار سوکھی ہوئی گھاس ہو گئی جس کو ہوائیں اڑاتی پھرتی ہیں، اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والے ہیں ○

اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِیْنَةُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَ الْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَیْرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾

مال اور بیٹے دنیا کی زندگی کی عارضی خوش نمائی ہیں اور باقی رہنے والے نیک اعمال آپ کے رب کے نزدیک بہ طور ثواب سب سے اچھے ہیں اور بہ طور امید سب سے بہتر ہیں ○

وَ یَوْمَ نُسَیِّرُ الْجِبَالَ وَ تَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّ حَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ﴿۴۷﴾ۚ

اور جس دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور تم زمین کو کھلا ہوا میدان دیکھو گے، ہم (اس دن) تمام انسانوں کو جمع فرمائیں گے اور ان میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑیں گے ○

وَ عُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ؕ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۫ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ﴿۴۸﴾

اور سب آپ کے رب کے حضور قطار در قطار پیش کیے جائیں گے، (ان سے کہا جائے گا:) آج تم ہمارے پاس اسی طرح آئے ہو جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار (تنہا اور برہنہ) پیدا فرمایا تھا، بلکہ تم نے یہ زعم کیا ہوا تھا کہ ہم تم سے ملاقات کے لیے ہرگز کوئی وقت مقرر نہیں فرمائیں گے ○

وَ وُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِیْنَ مُشْفِقِیْنَ مِمَّا فِیْهِ وَ یَقُوْلُوْنَ یٰوَیْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا یُغَادِرُ صَغِیْرَةً وَّ لَا كَبِیْرَةً اِلَّاۤ اَحْصٰىهَا ۚ وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ وَ لَا یَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾ۚ

ع ۶ ۱۸

اور (ہر ایک کے ہاتھ میں) صحیفۂ اعمال رکھ دیا جائے گا، پس آپ دیکھیں گے کہ مجرمین اس صحیفہ کے مندرجات سے خوف زدہ ہوں گے اور وہ کہیں گے: ہائے ہماری بدبختی! اس صحیفۂ اعمال کو کیا ہوا کہ اس نے کوئی چھوٹا گناہ اور بڑا گناہ نہیں چھوڑا مگر اس کو درج کر لیا، اور وہ اپنے تمام کیے ہوئے کاموں کو حاضر پائیں گے، اور آپ کے رب کسی پر بھی ظلم نہیں فرماتے ○

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اوران لوگوں کے لیے دنیا کی زندگی کی مثال (بھی) بیان کیجئے جو اس پانی کی مثل ہے جس کو ہم نے آسمان سے نازل فرمایا، تو زمین کی پیداوار خوب گھنی ہوگئی، پھر وہ پیداوار سوکھی ہوئی گھاس ہوگئی جس کو ہوائیں اڑاتی پھرتی ہیں اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والے ہیں O'' (الکہف: ۴۵)

کفار کی مثال کا بیان

القاضی مجیر الدین بن محمد العلیمی المقدسی الحنبلی المتوفی ۹۲۸ھ، الکہف: ۴۵ تا ۴۹ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وَاضْرِبْ لَهُمْ'': یعنی اے محمد! اپنی قوم کے لیے مثال بیان کیجئے۔ ''مَّثَلَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ'': اس سے مراد بارش ہے۔ ''فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ'': پھر بارش کے سبب سے زمین سے پیدا ہونے والی نباتات گھنی ہوگئیں، حتیٰ کہ وہ خوبصورت لگیں۔ ''فَاَصْبَحَ هَشِیْمًا تَذْرُوْهُ الرِّیٰحُ'' پس عنقریب وہ سبزہ اور نباتات ٹوٹ پھوٹ جائیں گی اور ان کو ہوائیں اڑاتی پھریں گی۔

اس کا معنی یہ ہے کہ دنیا کو خوبصورت زمین کی پیداوار سے تشبیہ دی گئی ہے، پھر وہ زمین کی پیداوار خشک ہوکر ٹوٹ پھوٹ جائے گی، پھر ہوائیں اس کو اڑاتی پھریں گی۔ ''وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ مُّقْتَدِرًا'': اور اللہ تعالیٰ ہر قسم کی سعادت اور شقاوت پر قدرت رکھنے والے ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''مال اور بیٹے دنیا کی زندگی کی عارضی خوش نمائی ہیں اور باقی رہنے والے نیک اعمال آپ کے رب کے نزدیک بہ طورِ ثواب سب سے اچھے ہیں اور بہ طورِ امید سب سے بہتر ہیں O''
(الکہف: ۴۶)

''اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ'': پھر اللہ تعالیٰ نے دنیا کی بے رغبتی دکھائی اور دنیا کی زینت پر فخر کرنے والوں کو زجر و توبیخ فرمائی، پس فرمایا کہ مال اور بیٹے جس پر عیینہ اور اس کے مال دار اصحاب فخر کرتے ہیں، ''زِیْنَةُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا'' وہ دنیا کی زندگی کی خوبصورتی ہے۔

''وَالْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ'': جمہور کے نزدیک اس سے مراد سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم پڑھنا ہے۔

''خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا'': یہ تمہارے رب کے نزدیک مال اور بیٹوں سے بہت بہتر ہے اور ان کی جزا بہت اچھی ہے۔

''وَّخَیْرٌ اَمَلًا'': اور جن چیزوں کے ساتھ امید رکھی جائے ان میں یہ سب سے بہتر ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور جس دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور تم زمین کو کھلا ہوا میدان دیکھو گے، ہم (اس دن) تمام انسانوں کو جمع فرمائیں گے اور ان میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑیں گے O'' (الکہف: ۴۷)

''وَیَوْمَ'': اور اس دن کو یاد کیجئے۔ ''نُسَیِّرُ الْجِبَالَ'' جب ہم پہاڑوں کو ان کی جگہ سے اکھاڑ کر چلائیں گے، اور ان کو اس طرح چلائیں گے جیسے بادلوں کو چلاتے ہیں، جیسے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''وَتَرَی الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِیَ تَمُرُّ مَرَّ

السَّحَابِ۔ (النمل: ۸۸) ”(اور اے مخاطب!تو پہاڑوں کو دیکھ کر گمان کرے گا کہ وہ اپنی جگہ پر قائم ہیں حالانکہ وہ بادلوں کی طرح چل رہے ہوں گے)۔

”وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً“: اور آپ زمین کو ظاہر دیکھیں گے، اس میں ایسی کوئی چیز نہیں ہوگی جس سے سایا طلب کیا جائے، نہ کوئی درخت ہوگا نہ کوئی عمارت ہوگی، اور جو کچھ زمین پر تھا وہ سب مٹ چکا ہوگا۔

”وَحَشَرْنٰهُمْ“: اور ہم تمام مومنین اور کافرین کو محشر میں جمع کریں گے۔

”فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا“: اور ہم اس زمین میں کسی کو نہیں چھوڑیں گے مگر وہ زمین اس کو خود پھینک دے گی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”اور سب آپ کے رب کے حضور قطار در قطار پیش کیے جائیں گے، (ان سے کہا جائے گا:) آج تم ہمارے پاس اسی طرح آئے ہو جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار (تنہا اور برہنہ) پیدا فرمایا تھا، بلکہ تم نے یہ زعم کیا ہوا تھا کہ ہم تم سے ملاقات کے لیے ہرگز کوئی وقت مقرر نہیں فرمائیں گے ○“ (الکہف: ۴۸)

”وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا“: اور تم صف باندھے ہوئے اپنے رب کے سامنے پیش ہو گے۔

”لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ“: آج تم اسی طرح ننگے بدن اور ننگے پیر اور الگ الگ حاضر ہوئے ہو کہ تمہارے ساتھ نہ مال ہے اور نہ اولاد ہے۔

”بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا“: بلکہ تم نے یہ گمان کیا تھا کہ ہم نے تم سے حساب لینے کے لیے کوئی دن مقرر نہیں فرمایا تھا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”اور (ہر ایک کے ہاتھ میں) صحیفۂ اعمال رکھ دیا جائے گا، پس آپ دیکھیں گے کہ مجرمین اس صحیفہ کے مندرجات سے خوف زدہ ہوں گے اور وہ کہیں گے: ہائے ہماری بدبختی! اس صحیفۂ اعمال کو کیا ہوا کہ اس نے کوئی چھوٹا گناہ اور بڑا گناہ نہیں چھوڑا مگر اس کو درج کر لیا، اور وہ اپنے تمام کیے ہوئے کاموں کو حاضر پائیں گے، اور آپ کے رب کسی پر بھی ظلم نہیں فرماتے ○“ (الکہف: ۴۹)

”وَوُضِعَ الْكِتٰبُ“: اور وہ صحیفہ رکھ دیا جائے گا جس میں ان کے اعمال لکھے ہوئے ہوں گے۔

”فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ“: پس آپ دیکھیں گے کہ مجرمین اس میں لکھے ہوئے گناہوں سے خوف زدہ ہوں گے۔ ”وَيَقُوْلُوْنَ“ اور وہ جب اپنے کیے ہوئے برے کاموں کو پڑھیں گے تو کہیں گے: ”يٰوَيْلَتَنَا“ ہائے ہماری ہلاکت۔ ”مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ“: اس صحیفۂ اعمال سے تعجب کرتے ہوئے کہیں گے: ”لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّا اَحْصٰىهَا“ کہ اس صحیفہ نے نہ کسی چھوٹے گناہ کو چھوڑا اور نہ کسی بڑے گناہ کو چھوڑا مگر اس کو شمار کر لیا اور ثابت کر لیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ”صَغِيْرَةً“ سے مراد ہے مسکرانا اور ”كَبِيْرَةً“ سے مراد ہے قہقہہ لگانا۔

(آداب اللسان لابن ابی الدنیا ص ۲۹۰، حلیۃ الاولیاء ج ۶ ص ۳۰۷، شعب الایمان للبیہقی: ۴۳۱۳)

"وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا": اور انہوں نے جو بھی اچھے یا برے کام کئے تھے ان کو لکھا ہوا پائیں گے، ان میں سے کوئی غائب نہیں ہوگا۔ "وَ لَا یَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا": اور آپ کے رب کسی سے اس کام پر مواخذہ نہیں فرماتے جس کو اس نے نہ کیا ہو۔
(فتح الرحمٰن فی تفسیر القرآن، ج ۴ ص ۱۸۱۔۱۸۵، دار النوادر، بیروت، ۱۴۳۰ھ)

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّیَّتَهٗۤ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِیْ وَ هُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِیْنَ بَدَلًا ﴿۵۰﴾

اور یاد کیجئے جب ہم نے فرشتوں کو حکم فرمایا کہ آدم کو سجدہ (تعظیم) کرو، پس ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا، وہ جنات میں سے تھا پس اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی، اے لوگو! کیا تم ابلیس کو اور اس کی اولاد کو مجھے چھوڑ کر اپنا مددگار بناتے ہو حالانکہ وہ سب تمہارے دشمن ہیں، وہ بہت ہی برا اللہ کا بدل ہے جس کو ظالم لوگ اختیار کرتے ہیں O

مَاۤ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۪ وَ مَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّیْنَ عَضُدًا ﴿۵۱﴾

میں نے ان کو آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش کے وقت نہیں بلایا تھا اور نہ خود ان کی پیدائش کے وقت، اور نہ میں گمراہ کرنے والوں کو مددگار بنانے والا ہوں O

وَ یَوْمَ یَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِیَ الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَهُمْ وَ جَعَلْنَا بَیْنَهُمْ مَّوْبِقًا ﴿۵۲﴾

اور جس دن اللہ فرمائیں گے: تمہارے زعم میں جو میرے شرکاء تھے تم اُن کو بلاؤ، پس مشرکین ان کو بلائیں گے لیکن وہ ان کو جواب نہیں دیں گے اور ہم نے ان کے درمیان ہلاکت کی ایک کھائی بنادی ہے O

وَ رَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَ لَمْ یَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ﴿۵۳﴾ ع

اور مجرم لوگ دوزخ کو دیکھیں گے سو یہ گمان کریں گے کہ وہ دوزخ میں گرنے والے ہیں اور وہ اس سے بچنے کی کوئی جگہ نہیں پائیں گے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور یاد کیجئے جب ہم نے فرشتوں کو حکم فرمایا کہ آدم کو سجدہ (تعظیم) کرو، پس ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا، وہ جنات میں سے تھا پس اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی، اے لوگو! کیا تم

ابلیس کو اور اس کی اولاد کو مجھے چھوڑ کر اپنا مددگار بناتے ہو حالانکہ وہ سب تمہارے دشمن ہیں، وہ بہت ہی برا اللہ کا بدل ہے جس کو ظالم لوگ اختیار کرتے ہیں O" (الکھف: ۵۰)

شیطان کا جنات میں سے ہونا

ابواللیث نصر بن محمد بن احمد السمرقندی الحنفی المتوفی ۳۷۵ھ، الکھف: ۵۰ تا ۵۳ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ": یعنی جب ہم نے اُن فرشتوں کو حکم فرمایا جو زمین پر ابلیس کے ساتھ تھے۔

"اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ": (آدم کو سجدہ (تعظیم) کرو، پس ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا، وہ جنات میں سے تھا)۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ابلیس کی اصل جنات میں سے تھی، پس وہ فرشتوں کے ساتھ مل گیا اور ان کے ساتھ مل کر عبادت کرتا تھا۔ اور مقاتل نے کہا کہ ابلیس جنات میں سے تھا اور وہ اُن ملائکہ کی جنس میں سے تھا جن کو "جن" کہا جاتا تھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ابلیس ان فرشتوں میں سے تھا جو جنتوں کے محافظ تھے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ جنات میں سے ہو گیا۔ "فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ": یعنی اس نے اپنے رب کی اطاعت کرنے سے تکبر کیا اور اپنے رب کے طریقہ سے نکل گیا۔ "اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ": یعنی کیا تم اس کی اطاعت کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو ترک کرتے ہو۔ "وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ": حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں۔ "بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا": یعنی انہوں نے شیطان کی عبادت کرنے کو اللہ تعالیٰ کی عبادت سے بدلا، ان کا یہ بدلنا بہت برا ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ولایت کو شیطان کی ولایت سے بدلا، یہ بہت برا بدل ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "میں نے ان کو آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش کے وقت نہیں بلایا تھا اور نہ خود ان کی پیدائش کے وقت، اور نہ میں گمراہ کرنے والوں کو مددگار بنانے والا ہوں O" (الکھف: ۵۱)

"مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ": یعنی میں نے آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش کے وقت ابلیس اور اس کی ذریت سے مدد طلب نہیں فرمائی، اور نہ خود ان کی پیدائش کے وقت اُن سے مدد طلب فرمائی۔

"وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا": اور نہ میں اُن لوگوں کو مددگار بناتا ہوں جو لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں یعنی شیاطین۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور جس دن اللہ فرمائیں گے: تمہارے زعم میں جو میرے شرکاء تھے تم اُن کو بلاؤ، پس مشرکین ان کو بلائیں گے لیکن وہ ان کو جواب نہیں دیں گے اور ہم نے ان کے درمیان ہلاکت کی ایک گھاٹی بنا دی ہے O" (الکھف: ۵۲)

"وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ": اور جب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بت پرستوں سے فرمائیں گے: میرے اُن شرکاء کو بلاؤ جن کے متعلق دنیا میں تمہارا یہ زعم تھا کہ وہ میرے شرکاء ہیں۔ "فَدَعَوْهُمْ": تو وہ ان کو بلائیں گے۔ "فَلَمْ

یستجیبوا لھم": لیکن وہ خود ساختہ شرکاء ان کو کوئی جواب نہیں دیں گے۔

"وجعلنا بینھم موبقا": مجاہد نے کہا: وہ جہنم میں ایک وادی ہے اور اسی طرح مقاتل نے کہا۔ اور قتبی نے کہا: وہ اُن کے اور اُن کے خود ساختہ شرکاء کے درمیان جہنم میں ہلاکت کی جگہ ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور مجرم لوگ دوزخ کو دیکھیں گے سو یہ گمان کریں گے کہ وہ دوزخ میں گرنے والے ہیں اور وہ اس سے بچنے کی کوئی جگہ نہیں پائیں گے O" (الکہف: ۵۳)

"ورا المجرمون النار": اور مشرکین دور سے دوزخ کو دیکھیں گے۔ "فظنوا انھم مواقعوھا": پس اُن کو یہ یقین ہوگا کہ وہ اس دوزخ میں گرنے والے ہیں۔ "ولم یجدوا عنھا مصرفا": اور وہ دوزخ کے عذاب سے بچنے کی کوئی جگہ نہیں پائیں گے۔

(تفسیر السمرقندی ج ۲ ص ۳۰۲-۳۰۳، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۳ھ)

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا ﴿۵۴﴾

اور بے شک ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر قسم کی مثال بیان فرمائی ہے، اور انسان ہر چیز سے زیادہ جھگڑا کرنے والا ہے O

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَیَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِیَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِیْنَ اَوْ یَاْتِیَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿۵۵﴾

اور جب لوگوں کے پاس ہدایت آ گئی تو ان کو اس ہدایت کے قبول کرنے سے اور اپنے رب سے استغفار کرنے سے کس چیز نے روکا سوا اس کے کہ اُن کے پاس اُن سے پہلی امتوں کا معاملہ پیش آ جائے یا وہ اپنے سامنے عذاب آتا ہوا دیکھ لیں O

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّا مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَۚ وَیُجَادِلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِیُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوْۤا اٰیٰتِیْ وَمَاۤ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ﴿۵۶﴾

اور ہم رسولوں کو صرف ثواب کی خوش خبری دینے والے اور عذاب سے ڈرانے والے بنا کر بھیجتے رہے ہیں اور کفار باطل شبہات سے حق کو نیچا دکھانے کے لیے جھگڑتے رہتے ہیں، اور انہوں نے میری آیتوں کو اور جن نشانیوں سے اُن کو ڈرایا گیا تھا مذاق بنا لیا ہے O

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰیٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِیَ مَا قَدَّمَتْ یَدٰهُؕ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ یَّفْقَهُوْهُ وَفِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًاؕ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ یَّهْتَدُوْۤا اِذًا اَبَدًا ﴿۵۷﴾

اور اس سے بڑا ظالم کون ہو گا جسے اس کے رب کی نشانیوں سے نصیحت کی گئی ہو، پس وہ ان نشانیوں سے اعراض کرے اور اس نے اپنے ہاتھوں سے جو برے کام بھیجے ہیں ان کے انجام کو بھول جائے، ہم نے ان کے دلوں پر غلاف چڑھا دیئے ہیں تا کہ یہ قرآن کو نہ سمجھ سکیں اور ان کے کانوں میں ڈاٹ لگا دیئے ہیں، اور (اے رسولِ اکرم!) اگر آپ ان لوگوں کو ہدایت کی طرف بلائیں تو وہ کبھی بھی ہرگز ہدایت کو قبول نہیں کریں گے O

وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۭ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْىِٕلًا ﴿۵۸﴾

اور آپ کے رب بہت بخشنے والے، بڑی رحمت والے ہیں، اگر وہ کفار کو ان کے کرتوتوں کی وجہ سے پکڑ لیتے تو اُن پر جلد عذاب بھیج دیتے بلکہ ان کی وعید کے لیے ایک وقت مقرر ہے، وہ اس وعید سے بچنے کی کوئی جگہ نہیں پائیں گے O

وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ﴿۵۹﴾

اور ان بستیوں کے لوگوں نے جب ظلم کیا تو ہم نے ان کو ہلاک فرما دیا، اور ہم نے ان کی ہلاکت کا ایک وقت مقرر کر رکھا تھا O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”اور بے شک ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر قسم کی مثال بیان فرمائی ہے، اور انسان ہر چیز سے زیادہ جھگڑا کرنے والا ہے O“ (الکہف: ۵۴)

امام ابو منصور محمد بن محمد ماتریدی المتوفی ۳۳۳ھ، الکہف: ۵۴ تا ۵۹ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”مَثَل“ کے دو معنی

”وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ“: ہم پہلے کئی بار بیان کر چکے ہیں کہ ”مَثَل“ کا معنی صفت ہے، جیسے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى (الروم: ۲۷)“ (یعنی اللہ ہی کے لیے بلند صفات ہیں)۔ اور ”مَثَل“ کا دوسرا معنی شبیہ ہے، جیسے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۔ (الشوریٰ: ۱۱)“ (اللہ کی مثل کوئی چیز نہیں ہے)۔

اگر اس آیت میں ”مَثَل“ کا معنی شبیہ ہو تو گویا کہ اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا: ہم نے اس قرآن میں ہر وہ چیز بیان فرما دی ہے جس کے جاننے کی لوگوں کو ضرورت ہے، تا کہ جو چیز اُن سے غائب ہو اس کی ایسی شبیہ اس میں بنا دیں جس کا لوگ مشاہدہ کرتے ہیں، تا کہ جو چیز ان سے غائب ہو اس کو وہ جان لیں۔ اور اگر اس آیت میں ”مَثَل“ کا معنی صفت ہو تو گویا اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ہم نے اس قرآن میں ہر چیز کی ایسی صفت بیان فرما دی ہے جس سے وہ جان لیں کہ کس چیز میں اُن کا نفع ہے اور کس چیز میں اُن کا ضرر ہے تا کہ وہ اپنے نفع کی چیزوں کو لائیں اور ضرر کی چیزوں کو ترک کر دیں۔

علامہ ابو حفص عمر بن علی الدمشقی الحنبلی المتوفی ۸۸۰ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

کفار نے فقراءِ مسلمین پر فخر کیا کہ اُن کے پاس بہت مال ہے اور اُن کے مددگار بہت زیادہ ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اقوال

فاسدہ کو باطل فرمایا اور اس سے پہلے دو مثالیں ذکر فرمائیں (ایک مثال مومن اور کافر کی بیان فرمائی جو الکہف: ۳۲ تا ۴۴ میں ہے، اور دوسری مثال دنیاوی زندگی کی بیان فرمائی جو الکہف: ۴۵ تا ۴۶ میں مذکور ہے)، پھر اس کے بعد فرمایا: ہم نے اس قرآن میں ہر قسم کی مثال کی تصریف فرمائی ہے اور تصریف کا تقاضا تکرار ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے شبہات کا متعدد وجوہ سے رد فرمایا اور ان جوابات کے باوجود کفار نے جھگڑنے کو ترک نہیں کیا تو اللہ عزوجل نے فرمایا: "وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا"۔

علامہ ماتریدی لکھتے ہیں: اہل التاویل نے کہا ہے کہ انسان سے مراد کافر ہے، یعنی کافر ہر چیز سے زیادہ جھگڑنے والا ہے۔

یعنی انسان کا جوہر دوسرے جواہر کی بہ نسبت زیادہ جھگڑنے والا ہے، کیونکہ جب جنات پر قرآن مجید اور اس کی آیات کو پیش کیا گیا تو انہوں نے اس کو بغیر کسی جدال کے قبول کر لیا، کیونکہ انہوں نے کہا: "اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝ یَّهْدِیْۤ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ۔ (الجن: ۱۔۲)" (ہم نے ایک عجیب قرآن سنا O جو سیدھی راہ کی طرف ہدایت کرتا ہے ہم اس پر ایمان لائے)۔ اسی طرح فرشتوں سے بھی کوئی جدال اور جھگڑا نہیں سنا گیا۔

جھگڑنے کے ثبوت میں آیات

قرآن مجید میں ہے: "هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِیْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِیْمَا لَیْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (آل عمران: ۶۶)" (سنو! تم ہی وہ لوگ ہو جنہوں نے اس چیز کے متعلق جھگڑا کیا جس کا تمہیں کچھ علم تھا، پس اب تم اس چیز کے متعلق کیوں جھگڑا کرتے ہو جس کا تمہیں کچھ بھی علم نہیں ہے، اور اللہ سب کچھ جانتے ہیں اور تم کچھ بھی نہیں جانتےO)، نیز قرآن مجید میں ہے: "وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (النحل: ۱۲۵)" (اور عمدہ طریقہ کے ساتھ ان سے جھگڑیے)، نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَلَا تُجَادِلُوْۤا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ـــ (العنکبوت: ۴۶)" (اور اے مسلمانو! اہل کتاب سے صرف اچھے طریقہ سے جھگڑا کرو)۔

مطلقاً جدال اور جھگڑے کا مذموم نہ ہونا

علامہ ماتریدی فرماتے ہیں: جب قرآن مجید کی متعدد آیات میں عمدہ طریقہ سے جھگڑا کرنے کا ثبوت ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ مطلقاً جھگڑا کرنا مذموم نہیں ہے، بلکہ وہ جھگڑا کرنا مذموم ہے جس سے حق کی مخالفت میں اور باطل کی حمایت میں جھگڑا کیا جائے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: "وَیُجَادِلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِیُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ ـــ (الکہف: ۵۶)" (اور کفار باطل شبہات سے حق کو نیچا دکھانے کے لیے جھگڑتے رہتے ہیں)۔ پس ان آیات میں حق کے اظہار کے لیے جھگڑا کرنے کی اجازت ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور جب لوگوں کے پاس ہدایت آ گئی تو ان کو اس ہدایت کے قبول کرنے سے اور اپنے رب سے استغفار کرنے سے کس چیز نے روکا سوا اس کے کہ ان کے پاس ان سے پہلی امتوں کا معاملہ پیش آ جائے یا وہ اپنے سامنے عذاب آتا ہوا دیکھ لیںO" (الکہف: ۵۵)

"وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى": یعنی کفار کو صرف سرکشی اور ہٹ دھرمی نے ایمان لانے سے روکا، کیونکہ ان پر بہ کثرت دلائل پیش فرمائے گئے اور آیات پیش فرمائی گئیں جن کی وجہ سے کوئی انسان اللہ پر ایمان لا سکتا ہے اور ان کے رسول

اور اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جسے اس کے رب کی نشانیوں سے نصیحت کی گئی ہو، پس وہ ان نشانیوں سے اعراض کرے اور اس نے اپنے ہاتھوں سے جو برے کام بھیجے ہیں ان کے انجام کو بھول جائے، ہم نے ان کے دلوں پر غلاف چڑھا دیئے ہیں تا کہ یہ قرآن کو نہ سمجھ سکیں اور ان کے کانوں میں ڈاٹ لگا دیئے ہیں، اور (اے رسول اکرم!) اگر آپ ان لوگوں کو ہدایت کی طرف بلائیں تو وہ کبھی بھی ہرگز ہدایت کو قبول نہیں کریں گے ○

وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۭ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْىِٕلًا ﴿۵۸﴾

اور آپ کے رب بہت بخشنے والے، بڑی رحمت والے ہیں، اگر وہ کفار کو ان کے کرتوتوں کی وجہ سے پکڑ لیتے تو ان پر جلد عذاب بھیج دیتے بلکہ ان کی وعید کے لیے ایک وقت مقرر ہے، وہ اس وعید سے بچنے کی کوئی جگہ نہیں پائیں گے ○

وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ﴿۵۹﴾ ع

اور ان بستیوں کے لوگوں نے جب ظلم کیا تو ہم نے ان کو ہلاک فرما دیا، اور ہم نے ان کی ہلاکت کا ایک وقت مقرر کر رکھا تھا ○

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”اور بے شک ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر قسم کی مثال بیان فرمائی ہے، اور انسان ہر چیز سے زیادہ جھگڑا کرنے والا ہے ○“ (الکھف: ۵۴)

امام ابو منصور محمد بن محمد ماتریدی المتوفی ۳۳۳ھ، الکھف: ۵۴ تا ۵۹ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”مَثَل“ کے دو معنی

”وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ“: ہم پہلے کئی بار بیان کر چکے ہیں کہ ”مَثَل“ کا معنی صفت ہے، جیسے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى (الروم: ۲۷)“ (یعنی اللہ ہی کے لیے بلند صفات ہیں)۔ اور ”مَثَل“ کا دوسرا معنی شبیہ ہے، جیسے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۔ (الشوریٰ: ۱۱)“ (اللہ کی مثل کوئی چیز نہیں ہے)۔

اگر اس آیت میں ”مَثَل“ کا معنی شبیہ ہو تو گویا کہ اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا: ہم نے اس قرآن میں ہر وہ چیز بیان فرما دی ہے جس کے جاننے کی لوگوں کو ضرورت ہے، تا کہ جو چیز اُن سے غائب ہو اس کی ایسی شبیہ اس میں بنا دیں جس کا لوگ مشاہدہ کرتے ہیں، تا کہ جو چیز ان سے غائب ہو اس کو وہ جان لیں۔ اور اگر اس آیت میں ”مَثَل“ کا معنی صفت ہو تو گویا اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ہم نے اس قرآن میں ہر چیز کی ایسی صفت بیان فرما دی ہے جس سے وہ جان لیں کہ کس چیز میں اُن کا نفع ہے اور کس چیز میں اُن کا ضرر ہے تا کہ وہ اپنے نفع کی چیزوں کو لائیں اور ضرر کی چیزوں کو ترک کر دیں۔

علامہ ابو حفص عمر بن علی الدمشقی الحنبلی المتوفی ۸۸۰ھ، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

کفار نے فقراء مسلمین پر فخر کیا کہ اُن کے پاس بہت مال ہے اور اُن کے پیروکار بہت زیادہ ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اقوال

فاسدہ کو باطل فرمایا اور اس سے پہلے دو مثالیں ذکر فرمائیں (ایک مثال مومن اور کافر کی بیان فرمائی جو الکہف: ۳۲ تا ۴۴ میں ہے، اور دوسری مثال دنیاوی زندگی کی بیان فرمائی جو الکہف: ۴۵ تا ۴۶ میں مذکور ہے)، پھر اس کے بعد فرمایا: ہم نے اس قرآن میں ہر قسم کی مثال کی تصریف فرمائی ہے اور تصریف کا تقاضا تکرار ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے شبہات کا متعدد وجوہ سے رد فرمایا اور ان جوابات کے باوجود کفار نے جھگڑنے کو ترک نہیں کیا تو اللہ عزوجل نے فرمایا: ''وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا''۔

علامہ ماتریدی لکھتے ہیں: اہل التاویل نے کہا ہے کہ انسان سے مراد کافر ہے، یعنی کافر ہر چیز سے زیادہ جھگڑنے والا ہے۔

یعنی انسان کا جوہر دوسرے جواہر کی بہ نسبت زیادہ جھگڑنے والا ہے، کیونکہ جب جنات پر قرآن مجید اور اس کی آیات کو پیش کیا گیا تو انہوں نے اس کو بغیر کسی جدال کے قبول کر لیا، کیونکہ انہوں نے کہا: ''اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۙ يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ۔ (الجن: ۱۔۲)'' (ہم نے ایک عجیب قرآن سنا O جو سیدھی راہ کی طرف ہدایت کرتا ہے ہم اس پر ایمان لائے)۔ اسی طرح فرشتوں سے بھی کوئی جدال اور جھگڑا نہیں سنا گیا۔

جھگڑنے کے ثبوت میں آیات

قرآن مجید میں ہے: ''هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ؀ (آل عمران: ۶۶)'' (سنو! تم ہی وہ لوگ ہو جنہوں نے اس چیز کے متعلق جھگڑا کیا جس کا تمہیں کچھ علم تھا، پس اب تم اس چیز کے متعلق کیوں جھگڑا کرتے ہو جس کا تمہیں کچھ بھی علم نہیں ہے، اور اللہ سب کچھ جانتے ہیں اور تم کچھ بھی نہیں جانتے O)، نیز قرآن مجید میں ہے: ''وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ (النحل: ۱۲۵)'' (اور عمدہ طریقہ کے ساتھ ان سے جھگڑیے)۔ نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ۔۔۔ (العنکبوت: ۴۶)'' (اور اے مسلمانو! اہل کتاب سے صرف اچھے طریقہ سے جھگڑا کرو)۔

مطلقاً جدال اور جھگڑے کا مذموم نہ ہونا

علامہ ماتریدی فرماتے ہیں: جب قرآن مجید کی متعدد آیات میں عمدہ طریقہ سے جھگڑا کرنے کا ثبوت ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ مطلقاً جھگڑا کرنا مذموم نہیں ہے، بلکہ وہ جھگڑا کرنا مذموم ہے جس سے حق کی مخالفت میں اور باطل کی حمایت میں جھگڑا کیا جائے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ''وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ۔۔۔ (الکہف: ۵۶)'' (اور کفار باطل شبہات سے حق کو نیچا دکھانے کے لیے جھگڑتے رہتے ہیں)۔ پس ان آیات میں حق کے اظہار کے لیے جھگڑا کرنے کی اجازت ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور جب لوگوں کے پاس ہدایت آ گئی تو ان کو اس ہدایت کے قبول کرنے سے اور اپنے رب سے استغفار کرنے سے کس چیز نے روکا سوا اس کے کہ اُن کے پاس اُن سے پہلی امتوں کا معاملہ پیش آ جائے یا وہ اپنے سامنے عذاب آتا ہوا دیکھ لیں O'' (الکہف: ۵۵)

''وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَاۗءَهُمُ الْهُدٰى'': یعنی کفار کو صرف سرکشی اور ہٹ دھرمی نے ایمان لانے سے روکا، کیونکہ ان پر بہ کثرت دلائل پیش فرمائے گئے اور آیات پیش فرمائی گئیں جن کی وجہ سے کوئی انسان اللہ پر ایمان لا سکتا ہے اور ان کے رسول

کی تصدیق کر سکتا ہے، لیکن ان کو ان کے عناد اور ہٹ دھرمی نے ایمان لانے سے روکے رکھا۔

"وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ": یعنی اُن کو ایمان لانے سے اور اللہ عزوجل سے معافی طلب کرنے سے صرف اس چیز نے روکا کہ اُن پر پہلی امتوں کا طریقہ پیش آجائے اور پہلی امتوں کا طریقہ یہ تھا کہ اُن امتوں کو بالکلیہ ہلاک فرما دیا جاتا تھا، یعنی وہ اسی وقت ایمان لا سکتے تھے اور اس وقت ایمان لانا ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ۝" (المؤمن:۸۵) "(پس جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو اس وقت ان کا ایمان لانا انہیں فائدہ نہیں دے سکتا تھا، اللہ نے ان کے بارے میں وہی طریقہ نافذ فرمایا جو ان کے پہلے بندوں میں گزر چکا تھا اور اس وقت کافروں کا خسارہ سب پر واضح ہو گیا O)۔

"اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا": یعنی اُن کے سامنے کھلم کھلا عذاب آجائے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ہم رسولوں کو صرف ثواب کی خوش خبری دینے والے اور عذاب سے ڈرانے والے بنا کر بھیجتے رہے ہیں اور کفار باطل شبہات سے حق کو نیچا دکھانے کے لیے جھگڑتے رہتے ہیں، اور انہوں نے میری آیتوں کو اور جن نشانیوں سے اُن کو ڈرایا گیا تھا مذاق بنا لیا ہے O" (الکہف:۵۶)

"وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ": یعنی ہم نے رسولوں کو صرف ایسا پیغام دے کر بھیجا ہے جو خوش خبری سنانے اور عذاب سے ڈرانے کو واجب کرتا ہے، رسولوں کو امر اور نہی دے کر بھیجا گیا ہے تاکہ وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم دیں اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے منع کریں، پس خوش خبری کا سنانا اُن کے لیے ہے جو اُن کے حکم کی پیروی کریں اور عذاب سے ڈرانا اُن کے لیے ہے جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ارتکاب کریں۔

"وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ": باطل سے مراد جادو ہے اور کہانت ہے، یعنی کفار قرآن مجید کو جادو اور کہانت قرار دیتے تھے۔ یہ کفار و مشرکین رسولوں سے جدال اور جھگڑا کرتے ہیں اور اُن کے خلاف باطل سے دلائل پیش کرتے ہیں، حالانکہ رسول جس چیز کی طرف دعوت دیتے ہیں وہ حق، صدق اور نور ہے لیکن یہ کفار اُن سے عناد کرتے ہیں اور اُن سے جھگڑا کرتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (الصف:۸)" (وہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنی پھونکوں سے اللہ کا نور بجھا دیں، حالانکہ اللہ اپنے نور کو مکمل فرمانے والے ہیں اگرچہ کافر اسے ناپسند کریں O)۔ کفار یہ جان چکے تھے کہ انبیاء علیہم السلام جو تعلیم دیتے ہیں اور جو احکام دیتے ہیں وہ اللہ کا نور ہے لیکن وہ عناد سے جھگڑا کرتے ہیں اور باطل سے اس کے خلاف دلائل پیش کرتے ہیں۔

کفار کے حق کو نیچا دکھانے کے دو محمل

(۱) "لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ": تاکہ وہ حق کو باطل کر دیں۔ "وَاتَّخَذُوْۤا اٰيٰتِيْ": بعض مفسرین نے کہا: اس آیت میں آیات سے مراد سورج اور چاند وغیرہ ہیں۔ "وَمَاۤ اُنْذِرُوْا": اور جس سے رسولوں نے ڈرایا وہ قرآن مجید ہے۔ اور دوسرے مفسرین نے کہا: "وَاتَّخَذُوْۤا اٰيٰتِيْ وَمَاۤ اُنْذِرُوْا هُزُوًا" سے مراد قرآن مجید ہے اور وہ دلائل ہیں جو قرآن مجید نے قائم کیے۔ اور "وَمَاۤ اُنْذِرُوْا"

سے مراد قرآن مجید کے علاوہ دوسری وعیدیں ہیں، ان مشرکین نے قرآن مجید کے ان دلائل کو اور دوسری وعیدوں کو مذاق بنالیا۔

(۲) اور اصحاب التاویل نے کہا: یہ تاویل صحیح نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد ارشاد فرمایا ہے: ''وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا''۔ (اور اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جسے اس کے رب کی نشانیوں سے نصیحت کی گئی ہو، پس وہ ان نشانیوں سے اعراض کرے)۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جب کفار اور مشرکین نے اللہ تعالیٰ کی آیات کے تقاضوں پر عمل نہیں کیا تو اُن کے عمل نہ کرنے کو ان آیات کے ساتھ مذاق اڑانے سے تعبیر فرمایا خواہ انہوں نے ان آیات کا مذاق نہ اڑایا ہو، جیسے اللہ تعالیٰ نے کفار کو اندھا، گونگا اور بہرا فرمایا ہے، کیونکہ انہوں نے ان حواس سے فائدہ نہیں اٹھایا اور جس مقصد کے لیے یہ حواس عطا فرمائے گئے تھے اس مقصد کے لیے انہوں نے ان کو استعمال نہیں کیا، اگرچہ حقیقت میں وہ اندھے، گونگے اور بہرے نہیں تھے۔

پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کفار کے مجادلہ اور جھگڑنے سے مراد یہ ہو کہ وہ قرآن مجید کو کہتے تھے کہ یہ جادو ہے اور کہانت ہے اور یہ شعر ہے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے اُن کے مجادلہ اور جھگڑنے سے مراد یہ ہو کہ انہوں نے کہا تھا: ''اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝'' (بنی اسرائیل: ۹۴) (کیا اللہ تعالیٰ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے)، اور انہوں نے کہا تھا: ''اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا'' (ابراہیم: ۱۰) (تم تو ہماری ہی مثل بشر ہو)، اور اس طرح کے ان کے دیگر اقوال کو ان کے جھگڑے اور مجادلہ سے تعبیر فرمایا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جسے اس کے رب کی نشانیوں سے نصیحت کی گئی ہو، پس وہ ان نشانیوں سے اعراض کرے اور اس نے اپنے ہاتھوں سے جو برے کام بھیجے ہیں ان کے انجام کو بھول جائے، ہم نے ان کے دلوں پر غلاف چڑھا دیے ہیں تاکہ یہ قرآن کو نہ سمجھ سکیں اور ان کے کانوں میں ڈاٹ لگا دیے ہیں، اور (اے رسولِ اکرم!) اگر آپ ان لوگوں کو ہدایت کی طرف بلائیں تو وہ کبھی بھی ہرگز ہدایت کو قبول نہیں کریں گے ۝'' (الکہف: ۵۷)

''وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ'': یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ'' سے مراد یہ ہو کہ جس کو ان نشانیوں سے نصیحت فرمائی گئی جو کہ میں نازل ہوئی تھیں کہ جن پچھلی امتوں نے رسولوں کی تکذیب کی تو اُن کا کیا انجام ہوا، اور اس آیت کا معنی اس طرح ہوگا کہ اس سے بڑھ کر کوئی شخص اپنے اوپر ظلم کرنے والا نہیں ہوگا جس کو اس کے رب کی آیات سے وعظ کیا گیا، پھر اس نے اُن سے اعراض کیا۔

یا اُس کے رب کی آیات کے ذکر سے مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور ان کے رسول کی رسالت کے اوپر جو دلائل اور براہین پیش فرمائے گئے تو ان لوگوں نے ان دلائل اور براہین کو قبول نہیں کیا اور نہ اُن کی تصدیق کی۔

''فَاَعْرَضَ عَنْهَا'': یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اعراض سے مراد یہ ہو کہ اس نے اُن دلائل اور براہین کو قبول نہیں کیا اور ان کی طرف غور سے نہیں دیکھا، یا اس نے یہ جاننے کے بعد کہ یہ اللہ تعالیٰ کی آیات اور دلائل ہیں، ہٹ دھرمی اور سرکشی سے ان سے اعراض کیا۔ ''وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ'': یعنی اس سے بڑھ کر اپنی جان پر کوئی ظلم کرنے والا نہیں ہوگا جو اپنے ہاتھوں سے پہلے بھیجے ہوئے کاموں کو

بھول گیا۔

کفار کے دلوں پر غلاف چڑھ جانے کا محمل

"اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا": کفر اندھیرا کرنے والا ہے، جب انسان کفر کو اختیار کرتا ہے تو اس کے دل میں جو نور ہے وہ چھپ جاتا ہے اور اس کے اعضاء میں جو نور ہے وہ بھی چھپ جاتا ہے اور ایمان روشن کرنے والا ہے، وہ دل کو بھی روشن کرتا ہے اور انسان کے ہر عضو کو روشن کرتا ہے اور یہ وہ بات ہے جس کو ہم نے کئی مرتبہ ذکر کیا ہے کہ انسان دو نوروں سے دیکھتا ہے، ایک اپنے نفس کے نور سے اور دوسرا اپنے اعضاء کے نور سے۔ پس جب ان میں سے ایک نور چلا جائے تو دوسرے نور کا نفع بھی چلا جاتا ہے، اور ہم نے ذکر کیا ہے کہ ایمان روشن کرنے والا ہے اور دل میں نور ہے، پس جب یہ دونوں نور جمع ہو جائیں تو اس وقت نفع حاصل ہوتا ہے اور تب وہ دل کے نور سے اور ایمان کے نور سے کسی چیز کو سمجھتا ہے، اسی طرح کانوں اور آنکھوں اور زبان کے نور سے بھی وہ چیزوں کو سمجھتا ہے۔ اور کفر اندھیرا کرنے والا ہے، وہ اعضاء کے نور کو چھپا دیتا ہے، پس گویا کہ نہ وہ دیکھتا ہے نہ غور کرتا ہے اور نہ سنتا ہے اور نہ حق بات کو بیان کرتا ہے۔

جو کفار کبھی ہدایت کو قبول نہیں کریں گے ان کا مصداق

"وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْۤا اِذًا اَبَدًا": یہ آیت خصوصیت کے ساتھ اُن لوگوں کے متعلق ہے جن کا اللہ تعالیٰ کو ازل میں علم تھا کہ وہ کبھی بھی ایمان نہیں لائیں گے، اور یہ آیت تمام کفار کے متعلق نہیں ہے، کیونکہ بعض کفار ایمان لے آئے تھے۔

حسن بصری نے کہا: یہ آیت اُن لوگوں کے متعلق ہے جن کے دلوں پر اللہ تعالیٰ نے پردہ ڈال دیا اور مہر لگا دی، کیونکہ کفر کی ایک حد ہے اور جب کافر اس حد پر پہنچ جائے تو اس کے دل پر مہر لگا دی جاتی ہے پھر وہ کبھی بھی ایمان نہیں لاتا۔

اور بعض لوگوں نے کہا: یہ آیت اُن لوگوں کے متعلق ہے جن کی عادت عناد اور ہٹ دھرمی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کی اور ان کے دلائل کی تکذیب کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ وہ اپنے عناد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے کبھی بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور آپ کے رب بہت بخشنے والے، بڑی رحمت والے ہیں، اگر وہ کفار کو ان کے کرتوتوں کی وجہ سے پکڑ لیتے تو اُن پر جلد عذاب بھیج دیتے بلکہ ان کی وعید کے لیے ایک وقت مقرر ہے، وہ اس وعید سے بچنے کی کوئی جگہ نہیں پائیں گے ○" (الکہف: ۵۸)

"اَلْغَفُوْرُ" اور "ذُو الرَّحْمَةِ" کے محامل

"وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ": اس آیت کے دو محمل ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ "اَلْغَفُوْرُ" ہیں کیونکہ وہ بندوں پر ستر فرماتے ہیں اور اُن کی نافرمانی کے وقت اُن کو فوراً سزا نہیں دیتے۔ اور "ذُو الرَّحْمَةِ" ہیں، کیونکہ جب بندے توبہ کریں تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرما لیتے ہیں۔

(۲) اللہ تعالیٰ "اَلْغَفُوْرُ" ہیں، جب بندے استغفار کریں اور توبہ کریں تو اللہ تعالیٰ اُن کو معاف فرما دیتے ہیں۔ اور "ذُو الرَّحْمَةِ" ہیں، اللہ تعالیٰ اُن پر رحم فرماتے ہیں اور اُن کے گناہوں سے درگزر فرماتے ہیں۔

پچھلی امتوں اور اس امت کے لیے عذاب کے وقت کا تعین

"لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۚ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ": یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر امت کی ہلاکت کے لیے ایک وقت مقرر فرمادیا ہے، جیسے قرآن مجید میں ہے: "اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ۔" (ہود:۸۱) "(ان پر عذاب آنے کے لیے صبح کا وقت مقرر ہو چکا ہے)، اور دوسری آیت میں فرمایا: "فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَیْرُ مَكْذُوْبٍ۝" (ہود:۶۵) "(سو صالح کی قوم نے اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں، تب صالح نے کہا: "تم اپنے اپنے گھروں میں تین دنوں تک فائدہ اٹھاتے رہو (یعنی تم صرف تین دن تک زندہ رہو گے) یہ اللہ کا برحق وعدہ ہے اور اس میں جھوٹ نہیں ہے"O)۔

اور اس امت کے عذاب کے لیے اللہ تعالیٰ نے قیامت کو مقرر فرمادیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ" (القمر:۴۶) "(بلکہ قیامت ان کے لیے (عذاب کے) وعدہ کا دن ہے)۔

بعض اہل علم نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ہر اس امت کو عذاب سے ہلاک فرمادیا جس نے اپنے رسول کی تکذیب کی تاکہ اس کے بعد آنے والی امت اس سے نصیحت حاصل کرے اور امت محمدیہ کی ہلاکت اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن رکھی ہے، کیونکہ اس کے بعد اور کوئی امت آنے والی نہیں ہے جو ان کے عذاب سے نصیحت حاصل کرے۔

"لَنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْىِٕلًا": "مَوْىِٕلًا" کا معنی ہے "ملجأ" یعنی پناہ کی جگہ۔ کہا جاتا ہے "وال فلان الی کذا" یعنی فلاں نے اس جگہ نجات پالی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اور ان بستیوں کے لوگوں نے جب ظلم کیا تو ہم نے ان کو ہلاک فرمادیا، اور ہم نے ان کی ہلاکت کا ایک وقت مقرر کر رکھا تھاO" (الکہف:۵۹)

"وَتِلْكَ الْقُرٰۤى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا": اس آیت میں معتزلہ کا رد ہے، کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ مہلک اپنے وقت سے پہلے بھی آسکتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ ان کی ہلاکت کی وعید مقرر ہے، نہ وہ اس سے پہلے ہوگی اور نہ وہ اس کے بعد ہوگی۔ (تاویلات اہل السنۃ ج ۷ ص ۱۸۵۔۱۸۹، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۶ھ، وتفاسیر اخری)

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَاۤ اَبْرَحُ حَتّٰۤى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ اَوْ اَمْضِیَ حُقُبًا۝۶۰

اور جب موسیٰ نے اپنے شاگرد سے کہا: میں مسلسل سفر کرتا رہوں گا حتیٰ کہ میں دو سمندروں کے جمع ہونے کی جگہ پر پہنچ جاؤں گا ورنہ میں زمانہ دراز تک سفر کرتا ہی رہوں گاO

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَیْنِهِمَا نَسِیَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِیْلَهٗ فِی الْبَحْرِ سَرَبًا۝۶۱

پس جب وہ دونوں دو سمندروں کے مجمع پر پہنچ گئے تو وہ دونوں مچھلی کو بھول گئے اور وہ مچھلی سمندر میں سرنگ جیسا راستہ بنا کر چلی گئیO

فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا ؗ لَقَدْ لَقِیْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا۝۶۲

پس جب وہ دونوں اس جگہ سے آگے پہنچے تو موسیٰ نے اپنے شاگرد سے کہا: ہمارا ناشتہ لاؤ، کیونکہ ہم کو اس سفر سے تھکاوٹ ہوگئی ہے O

قَالَ اَرَءَیْتَ اِذْ اَوَیْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوْتَ ۡ وَمَآ اَنْسٰنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِیْلَهٗ فِی الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ﴿۶۳﴾

ان کے شاگرد نے کہا: یہ بتائیے کہ جب ہم نے چٹان پر آرام کیا تھا تو میں مچھلی کو بھول گیا تھا اور مجھے صرف شیطان نے اس کا ذکر کرنا بھلایا تھا، اور اس مچھلی نے سمندر میں عجیب وغریب راستہ اختیار کر لیا تھا O

قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿۶۴﴾

موسیٰ نے کہا: ہم کو اسی (نشانی) کی تلاش تھی، پس وہ دونوں اپنے قدموں کے نشانات پر واپس گئے O

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿۶۵﴾

پس (وہاں) اُن دونوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے (خضر) کو پایا جس کو ہم نے اپنے پاس سے رحمت عطا فرمائی تھی اور اس کو ہم نے علم لدنی عطا فرمایا تھا O

قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿۶۶﴾

موسیٰ نے اس بندے سے کہا: کیا میں اس شرط پر آپ کی پیروی کر سکتا ہوں کہ آپ مجھے بھی اس علم لدنی سے کچھ سکھائیں جس کی آپ کو تعلیم دی گئی ہے O

قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا ﴿۶۷﴾

اس بندے نے کہا: بے شک آپ میرے ساتھ ہرگز صبر نہیں کر سکیں گے O

وَكَیْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿۶۸﴾

اور آپ اس چیز پر کیسے صبر کر سکتے ہیں جس کی آپ کو خبر نہ دی گئی ہو O

قَالَ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِیْ لَكَ اَمْرًا ﴿۶۹﴾

موسیٰ نے کہا: آپ ان شاء اللہ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے اور میں آپ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کروں گا O

قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِیْ فَلَا تَسْـَٔلْنِیْ عَنْ شَیْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿۷۰﴾ ع

اس بندے نے کہا: اگر آپ میری پیروی کریں تو آپ مجھ سے کسی چیز کے متعلق سوال نہ کریں حتیٰ کہ میں خود آپ سے اس کا ذکر کروں O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور جب موسیٰ نے اپنے شاگرد سے کہا: میں مسلسل سفر کرتا رہوں گا حتیٰ کہ میں دو سمندروں کے جمع ہونے کی جگہ پر پہنچ جاؤں گا ورنہ میں زمانہ دراز تک سفر کرتا ہی رہوں گا O'' (الکہف: ۶۰)

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے شاگرد حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کے سفر کا قصہ

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ ھ، الکہف: ۶۰ تا ۷۰ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَاۤ اَبْرَحُ حَتّٰۤى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ اَوْ اَمْضِیَ حُقُبًا'':

امام رازی نے کہا ہے: اس آیت کی تفسیر میں کئی مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ، (اس قصہ کا پہلے دو قصوں کے ساتھ ربط): سورۃ الکہف میں جو اللہ عزوجل نے قصے بیان فرمائے ہیں، اُن میں سے یہ تیسرا قصہ ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت خضر علیہ السلام کی طرف گئے تا کہ اُن سے علم لدنی حاصل کریں، اور اس قصے کا گزشتہ آیات کے ساتھ ربط اس طرح ہے کہ اس قصہ سے بھی مقصود اُن کفار پر رد کرنا ہے جو فقراء مسلمین پر مال کی کثرت اور مددگاروں کی کثرت کی وجہ سے فخر کرتے تھے، تو اس آیت میں یہ بتایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام علم و عمل کی کثرت اور بلند مرتبہ کے حامل ہونے اور فضیلت کی متعدد وجوہ حاصل کرنے کے باوجود حضرت خضر علیہ السلام کے پاس علم لدنی کو طلب کرنے کے لیے گئے، اور یہ قصہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ تواضع کرنا، تکبر کرنے سے بہتر ہے۔

اور اصحاب کہف کے قصہ کے ساتھ اس قصہ کا ربط یہ ہے کہ یہود نے کفار مکہ سے کہا تھا کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم کو موسیٰ اور خضر کے متعلق خبر دیں تو وہ برحق نبی ہیں ورنہ نہیں ہیں، اور ان کا یہ قول باطل ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اللہ کے نبی ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ تمام قصص اور واقعات کے عالم ہوں جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی صادق ہونا اس کے منافی نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ اُن کو حضرت خضر علیہ السلام کی طرف جانے کا حکم دیں، تا کہ وہ اُن سے علم لدنی سیکھیں، پس ہماری اس تفسیر سے ظاہر ہو گیا کہ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہ السلام کا قصہ فی نفسہٖ مستقل ہے، اس کے باوجود وہ پہلے دو قصوں کے ساتھ مربوط ہے۔

دوسرا مسئلہ، (موسیٰ بن عمران کا مصداق): اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے، اکثر علماء اس پر متفق ہیں کہ اس آیت میں جس موسیٰ کا ذکر ہے وہ حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام ہیں، جن سے بہ کثرت معجزات ظاہر ہوئے اور جو صاحب التورات ہیں۔ اور اس کے متعلق درج ذیل حدیث ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ان کا اور حر بن قیس بن حصن الفزاری کا اس میں مباحثہ ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صاحب کون تھے کیا وہ حضرت خضر علیہ السلام تھے؟ پس ان دونوں کے پاس سے حضرت ابی بن کعب الانصاری رضی اللہ عنہ کا گزر ہوا، سو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ان کو بلایا، پس انہوں نے کہا: بے شک میرا اور میرے اس ساتھی کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس صاحب کے متعلق مباحثہ ہوا ہے جس سے ان کے ساتھ ملاقات کا سوال کیا تھا، کیا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے اس

کے متعلق کچھ ذکر فرمایا؟ انہوں نے کہا: ہاں! بے شک میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی ایک جماعت میں تھے اس وقت ان کے پاس ایک مرد آیا، پس اس نے کہا: کیا آپ کو علم ہے کہ کوئی شخص آپ سے زیادہ علم والا ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: نہیں! پس اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی، کیوں نہیں! ہمارا بندہ خضر ہے، پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے ملاقات کا سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے مچھلی کو نشانی بنا دیا اور ان سے کہا گیا: جب آپ مچھلی کو گم پائیں تو واپس جائیں، پس بے شک عنقریب آپ ان سے ملاقات کریں گے، پس حضرت موسیٰ علیہ السلام مچھلی کے نشان کو سمندر میں تلاش کرتے رہے، سو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے شاگرد نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: "قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ۡ وَمَآ اَنْسٰىنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ۝ (الکہف: ۶۳)" (ان کے شاگرد نے کہا: یہ بتائیے کہ جب ہم نے چٹان پر آرام کیا تھا تو میں مچھلی کو بھول گیا تھا اور مجھے صرف شیطان نے اس کا ذکر کرنا بھلایا تھا، اور اس مچھلی نے سمندر میں عجیب و غریب راستہ اختیار کر لیا تھا ○)، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: "قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ۝ (الکہف: ۶۴)" (موسیٰ نے کہا: ہم کو اسی (نشانی) کی تلاش تھی، پس وہ دونوں اپنے قدموں کے نشانات پر واپس گئے)، پس ان دونوں نے حضرت خضر کو پا لیا پھر ان کی شان سے وہ معاملہ ہوا جس کا اللہ تعالیٰ نے قصہ بیان فرمایا ہے۔

(صحیح البخاری: ۷۴، ۷۸، ۱۲۲، ۲۲۶۷، ۲۷۲۸، ۳۲۷۸، ۳۴۰۰، ۳۴۰۱، ۴۷۲۵، ۴۷۲۶، ۴۷۲۷، ۶۶۷۲، ۷۴۷۸، صحیح مسلم: ۲۳۸۰، سنن ترمذی: ۳۱۴۹، مسند احمد: ۲۱۱۰۹، صحیح ابن حبان: ۱۰۲، السنن الکبریٰ للنسائی: ۱۱۳۰۹، اتحاف السمر، ج ۱ ص ۲۲۶، السند الموضوعی الجامع للکتب العشر، ج ۸ ص ۷)

حضرت یوشع بن نون اور حضرت خضر علیہما السلام کا قصہ

حضرت یوسف علیہ السلام کے دو بیٹے تھے: افرائیم اور میشا۔ پس افرائیم کے بیٹے نون تھے اور نون کے بیٹے یوشع بن نون تھے اور وہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سفر پر گئے تھے، اور وہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کے ولی عہد ہوئے اور رہے میشا کے بیٹے تو ایک قول یہ ہے کہ حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام کی طرف سے ان کے پاس نبوت آئی اور اہل تورات کا یہ زعم ہے کہ انہوں نے ہی اس علم لدنی کو سیکھنے کے لیے طلب کیا تھا، اور حضرت خضر علیہ السلام وہ ہیں جنہوں نے کشتی کو پھاڑ دیا تھا اور ایک لڑکے کو قتل کیا تھا اور گری ہوئی دیوار کو بنایا تھا، اور موسیٰ بن میشا اُن کے ساتھ تھے، یہ جمہور یہود کا قول ہے۔

اور القفال نے ہمارے اس قول کی صحت پر استدلال کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام وہی ہیں جو صاحب التوراۃ تھے، انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جہاں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کا ذکر فرمایا اس سے صاحب التوراۃ کا ارادہ فرمایا۔ اور اس اسم کو مطلقاً ذکر کرنا اس کو مستلزم ہے کہ اسی کی طرف لوٹا جائے۔ اور اگر اس سے مراد کوئی اور شخص ہوتے تو اس کا نام موسیٰ ہوتا اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا غیر ہوتا، تو واجب تھا کہ اُن کی کسی ایسی صفت کو بیان کیا جاتا جس سے ان کے درمیان امتیاز ہو جاتا اور شبہ زائل ہو جاتا۔

اس دلیل کا جواب کہ حضرت موسیٰ بہت عظیم الشان نبی تھے، ان کا حضرت خضر علیہ السلام کے پاس سیکھنے کے لیے جانا بعید ہے

اور ابوحنیفہ دینوری نے کہا ہے کہ جن لوگوں کا یہ قول ہے کہ ان آیات میں موسیٰ سے مراد وہ ہیں جو صاحب التوراۃ کے علاوہ

ہیں، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمائی اور ان سے بلاواسطہ کلام فرمایا اور ان کے دشمن فرعون کے سامنے زبردست معجزات پیش فرمائے جن میں سے اکثر معجزات ایسے تھے کہ اکابر انبیاء کو بھی وہ نہیں دیے گئے تو بہت بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کو حضرت خضر علیہ السلام سے استفادہ کے لیے بھیجے اور ابوحنیفہ دینوری کی اس دلیل کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ یہ بعید نہیں ہے کہ کوئی بڑا عالم جو اکثر علوم میں کامل ہو بعض چیزوں سے ناواقف ہو، پس وہ اس کا محتاج ہو کہ وہ اپنے سے کسی بڑے عالم سے اُن علوم کو سیکھنے کے لیے جائے۔

تیسرا مسئلہ (حضرت یوشع بن نون کا تذکرہ):

اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جوان شاگرد کا ذکر فرمایا ہے، پس اکثر مفسرین اس پر متفق ہیں کہ اس شاگرد سے مراد حضرت یوشع بن نون علیہ السلام ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ وہ جوان شاگرد حضرت یوشع بن نون علیہ السلام تھے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے شاگرد حضرت یوشع علیہ السلام کے بھائی تھے اور وہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اس سفر میں ساتھ تھے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عبد اور غلام ہے، اور عبد اور غلام کو بھی "فتی" کہا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اپنے مملوک کو میرا عبد یا میری باندی نہ کہے، اور نہ مملوک اپنے مالک کو میرا رب کہے اور مالک کو چاہیے کہ وہ کہے: یہ میرا "فتی" ہے اور مملوک کو چاہیے کہ وہ کہے کہ یہ میرا سید ہے اور سیدہ ہے، کیونکہ سب مملوک ہیں اور رب اللہ عزوجل ہیں۔

(صحیح مسلم: ۲۲۴۹، سنن ابوداؤد: ۴۹۷۵، مسند احمد: ۹۳۵۱، الادب المفرد: ۲۱۰، مسند البزار: ۹۹۷۰، السنن الکبریٰ للنسائی: ۱۰۰۰۰، ۱۰۰۰۱، عمل الیوم واللیلۃ: ۲۳۱، شرح مشکل الآثار: ۱۵۶۹، عمل الیوم واللیلۃ لابن السنی: ۳۹۰، الاداب للبیہقی: ۳۲۱، شعب الایمان للبیہقی: ۳۸۵۳، شرح السنۃ للبغوی: ۳۳۸۱، معجم ابن عساکر: ۱۰۰۷)

چوتھا مسئلہ: ایک قول یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات کی تختیاں دی گئیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو شرف کلام سے نوازا تو انہوں نے کہا: مجھ سے زیادہ افضل اور زیادہ علم والا کون ہوگا، انہیں بتایا گیا کہ اللہ کے ایک بندے ہیں جو سمندر کے جزائر میں رہتے ہیں اور وہ الخضر ہیں اور دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب وہ علم عطا فرمایا گیا جو عطا فرمایا گیا تو انہوں نے یہ گمان کیا کہ اُن کی مثل کوئی نہیں ہے، پس اُن کے پاس حضرت جبریل علیہ السلام سمندر کے کنارے پر آئے اور کہا: اے موسیٰ! ان چھوٹے چھوٹے پرندوں کو دیکھیں جو سمندر سے اپنی چونچ میں پانی لے کر جاتے ہیں اور پھر اڑ جاتے ہیں، پس آپ کو جو علم دیا گیا ہے وہ ان پرندوں کی چونچ میں پانی سے بھی کم ہے۔

اصولیین نے کہا کہ یہ روایت ضعیف ہے، کیونکہ یہ واجب ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو یہ معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ کی معلومات غیر متناہی ہیں اور ان کو یہ معلوم ہو کہ مخلوق کی معلومات متناہی ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "وَ فَوْقَ كُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ ﴿۷۶﴾ (یوسف: ۷۶)" (اور ہر متناہی علم والے سے اوپر ایک زیادہ علم والا ہے O)، اور جب یہ مقدمات معلوم ہوں تو بہت بعید ہے کہ کوئی عقل والا یہ کہے کہ مجھ سے بڑا کوئی عالم نہیں ہے، خاص طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام جن کو حقائق اشیاء کا بہت وافر علم عطا فرمایا گیا تھا اور

وہ مذموم اخلاق سے بہت دور تھے۔

اس سلسلے میں دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے سوال کیا: آپ کو اپنے بندوں میں سب سے زیادہ کون محبوب ہے، فرمایا: جو مجھے یاد کرتا رہتا ہے اور مجھے بھولتا نہیں ہے، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سوال کیا: آپ کے بندوں میں سب سے صحیح فیصلہ کرنے والا کون ہے؟ فرمایا: جو حق کے موافق فیصلہ کرے اور خواہش کی پیروی نہ کرے، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سوال کیا: آپ کے بندوں میں سب سے زیادہ علم والا کون ہے؟ فرمایا: جو لوگوں کے علم کو اپنے علم کے ساتھ ملاتا ہو تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اگر آپ کے بندوں میں سے کوئی مجھ سے بڑا عالم ہے تو میری اس کی طرف رہنمائی فرمایئے! تو اللہ عزوجل نے فرمایا: آپ سے بڑا علم والا الخضر ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا: میں انہیں کہاں ڈھونڈوں؟ فرمایا: چٹان کے پاس ساحلِ سمندر پر، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا: اے میرے رب! میں اُن تک کیسے پہنچوں گا، فرمایا: تم ایک مچھلی اپنی ٹوکری میں رکھو، پس جس جگہ اس مچھلی کو تم گم پاؤ گے وہیں خضر ہوں گے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے شاگرد سے کہا کہ جب تم مچھلی کو گم پاؤ تو مجھے بتانا، پھر وہ دونوں چلتے رہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سو گئے اور وہ مچھلی اس ٹوکری میں مضطرب ہوئی اور سمندر میں چھلانگ لگا کر چلی گئی، پس جب ناشتے کا وقت آیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مچھلی کو طلب کیا تو ان کے ایک شاگرد نے بتایا کہ وہ تو سمندر میں چھلانگ لگا کر چلی گئی، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اس جگہ سے واپس اس جگہ گئے جہاں مچھلی نے سمندر میں چھلانگ لگائی تھی، پس وہاں ایک مرد چادر میں لپٹے ہوئے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن کو سلام کیا تو انہوں نے کہا: آپ کی سرزمین میں سلامتی کہاں ہے، اور انہوں نے اپنا تعارف کرایا، تب حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: اے موسیٰ! مجھے اللہ عزوجل نے ایسا علم (تکوین) عطا فرمایا ہے جو آپ کو عطا نہیں فرمایا ہے، اور آپ کو ایسا علم (تشریع) عطا فرمایا ہے جو مجھے نہیں عطا فرمایا۔

علمِ تکوین اور علمِ تشریع کی تعریف

علمِ تکوین سے مراد ان چیزوں کا علم ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے امر "کُنْ" سے واقع فرماتا ہو اور علمِ تشریع سے مراد ان چیزوں کا علم ہے جن میں بندوں کو کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دیا ہو، مثلاً کہا جائے کہ تم سچ بولو اور جھوٹ نہ بولو، اور اس میں بندوں کا اختیار ہوتا ہے اور انبیاء علیہم السلام اسی کی تبلیغ فرماتے ہیں، اور علمِ تکوین سے مراد ایسی چیزوں کا علم ہے جن میں بندوں کا اختیار نہیں ہوتا مثلاً مرنا اور جینا، بیماری اور صحت، اور دوسرے وہ کام جو اللہ تعالیٰ کے لفظ "کُنْ" سے وقوع پذیر ہوتے ہیں، پس حضرت خضر علیہ السلام تکوین کے نبی تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام تشریع کے نبی تھے۔ (سعیدی غفرلہ)۔

امام رازی فرماتے ہیں: پس حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام دونوں ایک کشتی میں سوار ہوئے، ایک چڑیا آئی اور کشتی کے کنارے پر بیٹھ گئی، پس اس نے اپنی چونچ میں سمندر کا پانی لیا تو حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: میرا علم اور تمہارا علم اللہ تعالیٰ کے علم سے اتنی کمی بھی نہیں کرتا جتنا اس چڑیا کی چونچ میں سمندر کا پانی ہے۔

امام رازی اس پر اعتراض فرماتے ہیں کہ چڑیا کی چونچ میں جو پانی تھا وہ بھی متناہی ہے اور پورے سمندر کا پانی بھی متناہی ہے اور یہ متناہی کی متناہی کی طرف نسبت ہے اور تمام مخلوقات کے علم کی اللہ تعالیٰ کے علم کی طرف نسبت یہ متناہی کی غیر متناہی کی طرف نسبت ہے، پس یہ کہنا کس طرح صحیح ہوگا کہ میرے اور تمہارے علم کی نسبت اللہ تعالیٰ کے علم کی طرف ایسی ہے جیسے چڑیا کی چونچ

میں پانی کی نسبت سمندر کے پانی کی طرف ہے۔

مصنف کی طرف سے امام رازی کے اعتراض کا جواب

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ نے یہ مثال ظاہر کے اعتبار سے بیان فرمائی ہے، کیونکہ بہ ظاہر چڑیا کی چونچ میں جو پانی ہے وہ اس سے بہت کم ہے جو سمندر کا پانی ہے۔ سو اس مثال کا حاصل یہ ہے کہ میرا اور تمہارا علم اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلہ میں بہت کم ہے جیسا کہ چڑیا کی چونچ میں پانی سمندر کے پانی کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ (سعیدی غفرلہٗ)

"لَاۤ اَبْرَحُ" کی تفسیر

الزجاج نے کہا ہے: "لَاۤ اَبْرَحُ" کا معنی "لا ازول" نہیں ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ مسافت کو قطع نہ کرتے اور ہمیشہ چلتے رہتے۔ امام رازی فرماتے ہیں: اس کا یہ جواب ممکن ہے کہ کسی چیز کے زوال کا معنی ہے اس کو ترک کرنا اور اس سے اعراض کرنا، پس "لَاۤ اَبْرَحُ" کا معنی ہے: میں اس عمل کو ترک نہیں کروں گا۔ اور اس پر اُن کا حال اور کلام دلالت کرتا ہے، حال اس طرح دلالت کرتا ہے کہ یہ حالتِ سفر تھی اور کلام اس طرح دلالت کرتا ہے کہ انہوں نے کہا: "حَتّٰۤى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ" یعنی میں ہمیشہ چلتا رہوں گا حتیٰ کہ مجمع البحرین پر پہنچ جاؤں۔

"مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ" کا مصداق

رہا مجمع البحرین تو اس سے مراد وہ جگہ ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کا وعدہ کیا تھا، اور یہ بحرِ فارس اور بحرِ روم کے ملنے کی جگہ ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ اس کے علاوہ کوئی جگہ ہے اور اس آیت میں ان دونوں بحروں کی تعیین کے اوپر کوئی دلیل نہیں ہے، پس اگر کسی صحیح حدیث سے اس جگہ کا تعین ہو سکے تو فبہا ورنہ اس سے سکوت کرنا زیادہ مناسب ہے۔

اور بعض علماء نے کہا کہ ان دو بحروں سے مراد حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام ہیں، کیونکہ وہ دونوں علم کے سمندر تھے۔ حضرت خضر علیہ السلام علم تکوین کے سمندر تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام علم تشریع کے سمندر تھے۔

طلب علم کے لیے دور دراز سفر کی مشقت کو برداشت کرنا

"لَاۤ اَبْرَحُ حَتّٰۤى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا": اور خلاصہ یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس عالم کے حال سے واقف فرمایا اور اس سے ملاقات کی کسی معین جگہ سے واقف نہیں فرمایا، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں مسلسل چلتا رہوں گا حتیٰ کہ اس عالم کو پالوں، اور اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ خبر دی ہے کہ وہ علم کی طلب کے لیے اپنی جان پر مشقت کو برداشت کریں گے اور اس سفر کی سخت تکلیف کو برداشت کریں گے۔ اور اس میں اس پر تنبیہ ہے کہ متعلم ایک مسئلہ کا علم حاصل کرنے کے لیے اگر مشرق سے لے کر مغرب تک کا سفر کرے تو یہ اس پر حق ہے۔

"حُقُب" کا معنی

اس آیت میں فرمایا ہے: "اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا": یعنی میں طویل زمانہ تک چلتا رہوں گا۔ ایک قول یہ ہے کہ "الحقب" اسی (۸۰) سال کی مدت ہے، اور ہم نے "لّٰبِثِيْنَ فِيْهَاۤ اَحْقَابًا ۝ (النبا: ۲۳)" کی تفسیر میں اس کی تحقیق کی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں ہمیشہ چلتا رہوں گا حتیٰ کہ اس جگہ پہنچ جاؤں جہاں پر دو سمندر جمع ہوتے ہیں، ورنہ میں طویل زمانے تک چلتا رہوں گا حتیٰ کہ میں اس عالم کو پالوں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''پس جب وہ دونوں دو سمندروں کے مجمع پر پہنچ گئے تو وہ دونوں مچھلی کو بھول گئے اور وہ مچھلی سمندر میں سرنگ جیسا راستہ بنا کر چلی گئیO'' (الکہف: ۶۱)

''فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا'': اس آیت کا معنی یہ ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت یوشع بن نون علیہما السلام چلتے رہے حتیٰ کہ وہ مجمع البحرین تک پہنچ گئے۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ جب وہ اس جگہ پہنچ گئے جس جگہ کا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے شاگرد نے قصد کیا تھا، اور وہاں پر وہ مچھلی کو بھول گئے۔

روایات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ بتایا کہ وہ عالم اس جگہ ہے جہاں مجمع البحرین ہے، اور مچھلی کا زندہ ہونا اس جگہ کی علامت قرار دی، پس جب آپ دیکھیں گے کہ مچھلی زندہ ہو کر سمندر میں چلی گئی تو وہیں آپ کی (حضرت) خضر (علیہ السلام) سے ملاقات ہوگی۔

''نَسِيَا حُوتَهُمَا'': اس پر یہ اعتراض ہے کہ مچھلی کا زندہ ہو کر سمندر میں چھلانگ مار کر چلا جانا بہت عجیب و غریب کام تھا تو حضرت یوشع علیہ السلام اس کو کیسے بھول گئے؟

علماء نے اس کا یہ جواب دیا کہ حضرت یوشع علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بہت بڑے بڑے معجزات کا مشاہدہ کیا تھا تو اُن کے لیے اس مچھلی کا زندہ ہو کر سمندر میں چھلانگ مار کر چلے جانا کوئی اتنی زیادہ تعجب خیز بات نہیں تھی، لہٰذا ان کا بھولنا ممکن ہے۔

''فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا'': اس کا ایک معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سمندر کے پانی کے چلنے کو روک دیا اور وہ پانی طاق کی طرح ہو گیا حتیٰ کہ مچھلی اس طاق میں پہنچ گئی۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''پس جب وہ دونوں اس جگہ سے آگے پہنچے تو موسیٰ نے اپنے شاگرد سے کہا: ہمارا ناشتہ لاؤ، کیونکہ ہم کو اس سفر سے تھکاوٹ ہوگئی ہےO'' (الکہف: ۶۲)

''فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا'': پس جب وہ دونوں اس جگہ سے آگے پہنچے تو موسیٰ نے اپنے شاگرد سے کہا: ہمارا ناشتہ لاؤ، کیونکہ ہم کو اس سفر سے تھکاوٹ ہوگئی ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''ان کے شاگرد نے کہا: یہ بتایئے کہ جب ہم نے چٹان پر آرام کیا تھا تو میں مچھلی کو بھول گیا تھا اور مجھے صرف شیطان نے اس کا ذکر کرنا بھلایا تھا، اور اس مچھلی نے سمندر میں عجیب و غریب راستہ اختیار کر لیا تھاO'' (الکہف: ۶۳)

''قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ'': ان کے شاگرد نے کہا: یہ بتایئے کہ جب ہم نے چٹان پر آرام کیا تھا تو میں مچھلی کو بھول گیا تھا۔ ''وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ'': یعنی مجھے اس واقعہ کے ذکر کرنے کو صرف شیطان نے

بھلا دیا۔ "وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا": اس کی تفسیر یہ ہے کہ مچھلی اتنے عجیب و غریب طریقہ سے سمندر میں گئی، یعنی وہ ٹوکری میں پڑی ہوئی تھی، پھر زندہ ہوئی اور اس نے اپنے آپ کو سمندر میں ڈال دیا اور حضرت یوشع بن نون اور حضرت موسیٰ علیہما السلام دونوں کو اس کا پتا نہیں چلا۔

ایک قول یہ ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تعجب سے حکایت ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "موسیٰ نے کہا: ہم کو اسی (نشانی) کی تلاش تھی، پس وہ دونوں اپنے قدموں کے نشانات پر واپس گئے O" (الکہف: ۶۴)

"قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا": یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ہم اسی چیز کو طلب کر رہے تھے، کیونکہ مچھلی کا چھلانگ مار کر سمندر میں جانا حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کی علامت تھی، سو ہم اسی چیز کو طلب کر رہے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب ان دونوں نے پہچان لیا کہ وہ اس جگہ سے دور آ گئے ہیں جہاں ٹھہر کر اس عالم سے ملاقات کرنی تھی تو وہ دونوں اسی جگہ کی طرف واپس لوٹے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "پس (وہاں) اُن دونوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے (خضر) کو پایا جس کو ہم نے اپنے پاس سے رحمت عطا فرمائی تھی اور اس کو ہم نے علم لدنی عطا فرمایا تھا O" (الکہف: ۶۵)

حضرت خضر علیہ السلام کے نبی ہونے پر دلائل

"فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا":

پس موسیٰ اور یوشع بن نون نے وہاں پر ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جس کو ہم نے اپنے پاس سے رحمت عطا فرمائی تھی اور علم لدنی عطا فرمایا تھا۔

اکثر مفسرین اس پر متفق ہیں کہ یہ بندہ نبی تھا اور اس پر حسب ذیل دلائل ہیں۔

(۱) اس آیت میں فرمایا ہے: "اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا" اور رحمت سے مراد نبوت ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۚ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ (الزخرف: ۳۲)" (کیا وہ آپ کے رب کی رحمت (نبوت) تقسیم کرتے ہیں؟ ہم نے دنیاوی زندگی میں ان کے درمیان سامانِ معیشت تقسیم فرمایا ہے اور بعض کو بعض پر دولت میں کئی درجے بلندی عطا فرمائی ہے)۔ اور اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿٨٦﴾ (القصص: ۸۶)" (اور آپ تو توقع نہیں رکھتے تھے کہ آپ کی طرف کتاب نازل فرمائی جائے گی لیکن آپ کے رب نے آپ کو نبوت عطا فرما دی لہٰذا آپ کافروں کے مددگار ہرگز نہ بنیں O)۔

اور ان دونوں آیتوں میں رحمت سے مراد نبوت ہے۔ اور اس دلیل پر اس اعتراض کی گنجائش ہے کہ ہم یہ مانتے ہیں کہ ان آیتوں میں رحمت سے مراد نبوت ہے، لیکن یہ لازم نہیں آتا کہ ہر رحمت نبوت ہے۔

(۲) اس آیت میں فرمایا ہے: "وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا" اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو کسی معلم کے واسطہ کے بغیر علم

عطا فرمایا ہے، اور جس کو اللہ تعالیٰ بغیر بشر کے واسطہ کے علم عطا فرمائیں، اس کا نبی ہونا واجب ہے جو اللہ تعالیٰ کی وحی سے امور کو جانتے ہیں۔

اس دلیل پر بھی یہ اعتراض ہے کہ علوم بدیہیہ (مثلاً سردی اور گرمی) بھی ابتداءً اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہوتے ہیں اور یہ نبوت پر دلالت نہیں کرتے۔

(۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: "هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلٰٓى أَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ۝ (الکہف: ۶۶)" (کیا میں اس شرط پر آپ کی پیروی کرسکتا ہوں کہ آپ مجھے بھی اس علم لدنی سے کچھ سکھائیں جس کی آپ کو تعلیم دی گئی ہے)۔ اور نبی تعلیم میں غیر نبی کی پیروی نہیں کرتا، اس سے معلوم ہوا کہ حضرت خضر علیہ السلام نبی تھے۔

اس دلیل پر بھی یہ اعتراض ہے کہ نبی غیر نبی کی اُن علوم میں پیروی نہیں کرتا جن علوم کی وجہ سے اُن کو نبوت حاصل ہوئی لیکن دیگر علوم میں اگر وہ غیر نبی کی پیروی کریں تو اس کی گنجائش ہے۔

(۴) اس بندے (حضرت خضر علیہ السلام) نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اپنی برتری ظاہر کی، کیونکہ انہوں نے کہا: "وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ۝ (الکہف: ۶۸)" (اور آپ اس چیز پر کیسے صبر کرسکتے ہیں جس کی آپ کو خبر نہ دی گئی ہو)۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام کے سامنے تواضع ظاہر کی جب یہ کہا: "لَآ أَعْصِيْ لَكَ أَمْرًا ۝ (الکہف: ۶۹)" (اور میں آپ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کروں گا)۔ اور ان دونوں باتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اُن کا مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ تھا، اور جو نبی نہ ہو اس کا نبی پر مرتبہ زیادہ نہیں ہوتا۔

اس دلیل پر بھی یہ اعتراض ہے کہ ہوسکتا ہے کہ غیر نبی، نبی پر اُن علوم کے اعتبار سے برتر ہو جن پر نبوت موقوف نہیں ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ غیر نبی کا نبی پر مرتبہ زیادہ ہو تو اس سے لوگ نبی سے دور ہوں گے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس بندے (حضرت خضر علیہ السلام) سے علم حاصل کرنے کے لیے بھیجنا بھی لوگوں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دور کرنے کا موجب ہے جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل ہوچکی تھی اور اللہ تعالیٰ ان سے بالواسطہ کلام فرماچکے تھے۔

(۵) الاصم نے حضرت خضر علیہ السلام کی نبوت پر اس سے استدلال کیا ہے کہ اس قصہ کے درمیان حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: "وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ أَمْرِيْ (الکہف: ۸۲)" (اور میں نے یہ سب کچھ اپنی مرضی سے نہیں کیا)۔ اس کا معنی یہ ہے کہ یہ کام میں نے اللہ تعالیٰ کی وحی سے کئے ہیں اور یہ چیز نبوت پر دلالت کرتی ہے۔ (تفسیر ابوبکر الاصم ص ۸۸، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۸ھ)

امام رازی فرماتے ہیں: یہ بھی ضعیف دلیل ہے اور اس کا ضعف ظاہر ہے۔

(تفسیر الکبیر ج ۷ ص ۴۸۲، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

"وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ أَمْرِيْ" کا حضرت خضر علیہ السلام کی نبوت پر قطعی دلیل ہونا

میں کہتا ہوں: حضرت خضر علیہ السلام کی نبوت پر یہ بہت واضح اور قطعی دلیل ہے، کیونکہ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک بے قصور لڑکے کو قتل کردیا تھا اور قتل ناحق کا ممنوع اور حرام ہونا دلائل قطعیہ سے ثابت ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ

فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا (المائدہ: ۳۲) "(جس نے کسی جان کو بغیر کسی جان کے بدلہ کے قتل کیا، یا ناحق زمین میں دہشت گردی کرنے کے لیے قتل کیا تو گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کر دیا)، نیز اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا ہے: "وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۝ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ۝ (الفرقان: ۶۸۔۶۹) "(اور جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کی عبادت نہیں کرتے اور جس جان کو قتل کرنا اللہ نے حرام قرار دے دیا ہے اسے بغیر حق کے قتل نہیں کرتے اور زنا نہیں کرتے اور جو ان تینوں میں سے کوئی جرم کرے گا وہ سخت سزا پائے گا O اسے قیامت کے دن دوگنا عذاب دیا جائے گا اور وہ اس میں ہمیشہ ذلیل ہو کر رہے گا O) اور اس کا یہ جواب دینا صحیح نہیں ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے الہام سے اس بے قصور لڑکے کو قتل کر دیا تھا، کیونکہ الہام دلیل ظنی ہے، اور دلیل ظنی کی بنیاد پر کسی حرام قطعی کا ارتکاب نہیں کیا جا سکتا، اس لیے لامحالہ ماننا پڑے گا کہ حضرت خضر علیہ السلام نبی تھے اور ان کو وحی کے ذریعے حکم فرمایا گیا تھا کہ اس لڑکے کو قتل کر دیں اور وحی دلیل قطعی ہے، اس لیے اُن کا اس بے قصور لڑکے کو قتل کرنا قابل اعتراض نہیں ہے کیونکہ انہوں نے یہ کام وحی سے انجام دیا تھا۔ (سعیدی غفرلہ)

(۲) روایت ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کے لیے پہنچے تو انہوں نے کہا: السلام علیک، حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: وعلیک السلام اے بنی اسرائیل کے نبی! پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا: آپ کو اس جواب کی کس نے تعلیم دی؟ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: جس نے آپ کو میرے پاس بھیجا ہے اور اس سے یہ معلوم ہوا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نبی ہونے کو وحی سے جان لیا تھا اور وحی صرف نبی پر نازل ہوتی ہے۔ لیکن اس دلیل پر بھی یہ اعتراض ہے کہ ہو سکتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کا اس چیز کو جاننا باب الکرامات اور الہامات سے ہو۔

میں کہتا ہوں: یہ تو ہو سکتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کو الہام سے جان لیا ہو لیکن یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے الہام سے جان کر اس بے قصور لڑکے کو قتل کر دیا تھا، کیونکہ اگر یہ دروازہ کھول دیا جائے کہ الہام سے کوئی شخص دوسرے کو قتل کر سکتا ہے تو ہر شخص اپنے مخالف کو قتل کر دے گا اور کہے گا کہ مجھے الہام ہوا تھا کہ اس کو قتل کر دو، اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ بغیر وحی کے حضرت خضر علیہ السلام نے کسی بے قصور لڑکے کو قتل نہیں کیا تھا۔ اور وحی صرف نبی پر نازل ہوتی ہے تو اس سے واضح ہوا کہ حضرت خضر علیہ السلام نبی تھے۔ (سعیدی غفرلہ)

علامہ ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ، "وَعَلَّمْنٰهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا" کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یعنی ہم نے اس بندے کو باطن کا علم بطور الہام سکھایا اور اکثر اہل علم کے نزدیک الخضر نبی نہیں تھے۔

(معالم التنزیل، ج ۳ ص ۲۰۵، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

علامہ بدرالدین ابو محمد محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ، لکھتے ہیں:

حضرت خضر علیہ السلام کے ولی یا نبی ہونے میں بھی اختلاف ہے، صحیح یہ ہے کہ وہ نبی ہیں، کیونکہ انہوں نے کہا: "وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ۔ (الکہف: ۸۲)" (اور میں نے یہ سب کچھ اپنی مرضی سے نہیں کیا)، یعنی جن کاموں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اعتراض کئے تھے، وہ سب کام انہوں نے اپنی رائے سے نہیں کیے تھے بلکہ وحی سے کیے تھے اور وحی صرف انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتی ہے،

ورنہ الہام کی بناء پر کسی کو قتل کرنا جائز نہیں ہے یا کسی کی کشتی توڑنا جائز نہیں ہے۔

(عمدۃ القاری ج ۲ ص ۸۹، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۱ھ)

شیخ ابن عثیمین نے کہا ہے کہ اگر حضرت خضر علیہ السلام نبی تھے تو ان کی امت کون تھی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہر نبی کی امت کا ہونا ضروری نہیں کیونکہ ایسے بھی نبی ہیں جن کے ساتھ امت کا کوئی فرد نہیں ہوگا حدیث میں ہے:

امام بخاری اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ پر امتیں پیش کی گئی ہیں، پس نبی کے پاس اس کی امت گزرتی اور کسی نبی کے ساتھ ایک جماعت ہوتی، اور کسی نبی کے ساتھ دس امتی ہوتے اور کسی نبی کے ساتھ پانچ امتی ہوتے اور کوئی نبی تنہا گزرتا (یعنی اس کے ساتھ کوئی امتی نہ ہوتا)۔ (صحیح البخاری: ۶۵۴۱)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”موسیٰ نے اس بندے سے کہا: کیا میں اس شرط پر آپ کی پیروی کر سکتا ہوں کہ آپ مجھے بھی اس علمِ لدنی سے کچھ سکھائیں جس کی آپ کو تعلیم دی گئی ہے O“ (الکہف: ۶۶)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت خضر علیہ السلام کے سامنے ادب وانکسار

”قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰۤى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا“: یہ آیات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے متعدد وجوہ سے حضرت خضر علیہ السلام کے سامنے ادب اور انکسار کا اظہار کیا:

(۱) انہوں نے اپنے آپ کو حضرت خضر علیہ السلام کا تابع قرار دیا، کیونکہ انہوں نے کہا: ”هَلْ اَتَّبِعُكَ“ کیا میں آپ کی پیروی کروں۔ (۲) انہوں نے اتباع کرنے میں حضرت خضر علیہ السلام کی اجازت طلب کی اور یہ تواضع کرنے میں بہت بڑا مبالغہ ہے۔ (۳) انہوں نے کہا: ”اَنْ تُعَلِّمَنِ“ گویا کہ انہوں نے حضرت خضر علیہ السلام کو اپنا استاذ قرار دیا اور اُن کے سامنے اپنی بے علمی کا اقرار کیا۔ (۴) انہوں نے کہا: ”مِمَّا عُلِّمْتَ“ گویا انہوں نے کہا کہ جو کچھ آپ کو علم عطا فرمایا گیا ہے اس میں سے بعض مجھ کو سکھائیں، یہ نہیں کہا کہ سارا علم مجھ کو دے دیں حتیٰ کہ میں آپ کے برابر ہو جاؤں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ”اس بندے نے کہا: بے شک آپ میرے ساتھ ہرگز صبر نہیں کر سکیں گے O“ (الکہف: ۶۷)

”قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا“:

جو لوگ عصمتِ انبیاء پر اعتراض کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جب حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے جواب میں کہا: ”سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَاۤ اَعْصِیْ لَكَ اَمْرًا۔ (الکہف: ۶۹)“ (آپ ان شاء اللہ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے اور میں آپ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کروں گا)۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے جو کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے، وہ جھوٹ تھا، تبھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن کا رد کر دیا اور کہا کہ آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے جو کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ ہرگز صبر نہیں کر سکیں گے، وہ با اعتبار اکثر اور اغلب کے کہا تھا، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تشریعی نبی تھے اور جو کام شریعت کے خلاف ہو تو نبی پر لازم ہے کہ وہ اس پر ٹوکے، اور حضرت خضر علیہ السلام تکوینی نبی تھے، ان کا کشتی کو توڑنا اس وجہ سے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اسی طرح حکم فرمایا تھا لیکن جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ انہوں نے بغیر کسی سبب کے کشتی کو توڑ دیا ہے تو اس پر اعتراض کیا، سو حضرت خضر علیہ السلام کا کشتی کو توڑنا بھی برحق تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اس پر اعتراض بھی برحق تھا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اور آپ اس چیز پر کیسے صبر کر سکتے ہیں جس کی آپ کو خبر نہ دی گئی ہو O''

(الکہف: ۶۸)

''وَ كَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا'': اور آپ اس چیز پر کیسے صبر کر سکتے ہیں جس کی آپ کو خبر نہ دی گئی ہو۔

حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا: ''وَ كَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا''، اس سے معلوم ہوا کہ حضرت خضر علیہ السلام کے مقابلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا علم کم تھا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو اس کے جواب میں کہا: ''قَالَ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّ لَاۤ اَعْصِیْ لَكَ اَمْرًا''، یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے بہت شدید تواضع کا اظہار ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''موسیٰ نے کہا: آپ ان شاء اللہ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے اور میں آپ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کروں گا O'' (الکہف: ۶۹)

''قَالَ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّ لَاۤ اَعْصِیْ لَكَ اَمْرًا'': لفظ ان شاء اللہ شک پر دلالت کرتا ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شک تھا کہ وہ صبر کر سکیں گے یا نہیں، اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مقام توقف میں صبر کرنا واجب ہے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس اعتبار سے ان شاء اللہ فرمایا۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ ان شاء اللہ ہمیشہ شک کے موقعوں پر نہیں کہا جاتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے نام سے برکت اور مدد حاصل کرنے کے لیے بھی کہا جاتا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''اس بندے نے کہا: اگر آپ میری پیروی کریں تو آپ مجھ سے کسی چیز کے متعلق سوال نہ کریں حتیٰ کہ میں خود آپ سے اس کا ذکر کروں O'' (الکہف: ۷۰)

''قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِیْ فَلَا تَسْــٴَـلْنِیْ عَنْ شَیْءٍ حَتّٰۤى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا'': یعنی آپ جس کام کو دیکھیں اور آپ کو اس کی توجیہ معلوم نہ ہو تو آپ مجھ سے اس کے متعلق سوال نہ کریں حتیٰ کہ میں خود آپ کو بتاؤں کہ میں نے وہ کام کس لیے کیا ہے۔

(التفسیر الکبیر ج ۷ ص ۴۷۷-۴۸۵، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ، وتفاسیر اخریٰ)

فَانْطَلَقَا ٜ حَتّٰۤى اِذَا رَكِبَا فِی السَّفِیْنَةِ خَرَقَهَا ؕ قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَیْــٴًـا اِمْرًا ﴿۷۱﴾

پس وہ دونوں چل پڑے حتیٰ کہ جب وہ دونوں کشتی میں سوار ہوئے تو خضر نے اس کشتی کو پھاڑ ڈالا، موسیٰ نے کہا: کیا آپ نے اس

کشتی کو پھاڑ ڈالا ہے تاکہ اس کی سواریوں کو غرق کردیں، آپ نے ضرور بہت عجیب کام کیا ہے O

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا ﴿۷۲﴾

خضر نے کہا: کیا میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے؟ O

قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِیْ بِمَا نَسِیْتُ وَلَا تُرْهِقْنِیْ مِنْ اَمْرِیْ عُسْرًا ﴿۷۳﴾

موسیٰ نے کہا: اس کام پر میرا مواخذہ نہ کریں جس کو میں بھول گیا ہوں اور اس معاملہ میں مجھ پر سختی نہ کریں O

فَانْطَلَقَا حَتّٰۤی اِذَا لَقِیَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِیَّةًۢ بِغَیْرِ نَفْسٍ لَقَدْ جِئْتَ شَیْـًٔا نُّكْرًا ﴿۷۴﴾

پھر وہ دونوں چل پڑے حتیٰ کہ جب ان دونوں کی ملاقات ایک لڑکے سے ہوئی، تو خضر نے اس کو قتل کردیا، موسیٰ نے کہا: کیا آپ نے بے قصور لڑکے کو بغیر کسی جان کے عوض قتل کردیا ہے، ضرور آپ نے بہت برا کام کیا ہے O

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''پس وہ دونوں چل پڑے حتیٰ کہ جب وہ دونوں کشتی میں سوار ہوئے تو خضر نے اس کشتی کو پھاڑ ڈالا، موسیٰ نے کہا: کیا آپ نے اس کشتی کو پھاڑ ڈالا ہے تاکہ اس کی سواریوں کو غرق کردیں، آپ نے ضرور بہت عجیب کام کیا ہے O'' (الکہف: ۷۱)

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ، الکہف: ۷۱ تا ۷۴ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''فَانْطَلَقَا حَتّٰۤی اِذَا رَكِبَا فِی السَّفِیْنَةِ خَرَقَهَا قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا لَقَدْ جِئْتَ شَیْـًٔا اِمْرًا'':

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اس عالم یعنی حضرت خضر علیہ السلام نے جب اس شرط پر اتفاق کرلیا کہ جب تک حضرت خضر علیہ السلام خود نہیں بتائیں گے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سوال نہیں کریں گے، پھر وہ دونوں چل پڑے اور ایسی جگہ پہنچے جہاں انہیں کسی کشتی میں سوار ہونے کی ضرورت تھی۔ اور اس عالم یعنی حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کو پھاڑنے کا اقدام کیا۔

امام رازی فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں: شاید انہوں نے کشتی کی دیوار کو پھاڑنے کا اقدام کیا تاکہ اس کی وجہ سے اس کشتی میں ظاہر عیب ہو جائے اور اس کی وجہ سے کشتی میں بیٹھنے والے فوراً غرق نہیں ہوتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ''اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا لَقَدْ جِئْتَ شَیْـًٔا اِمْرًا''۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اس کام کا مشاہدہ کیا جو بہ ظاہر غلط تھا تو وہ پہلی شرط کو بھول گئے کہ جب تک حضرت خضر علیہ السلام خود نہ بتائیں وہ سوال نہیں کریں گے، اسی لیے انہوں نے کہا جو کہا۔

منکرین عصمت انبیاء نے یہاں پر یہ اعتراض کیا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نبی تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن پر اعتراض کیا، اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام صادق تھے تو انہوں نے اس نبی کی گستاخی کی اور اگر وہ کاذب تھے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جھوٹ کا صدور ہوا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خلاف عادت کام کو دیکھا تو انہوں نے اس پر اعتراض کیا، یہ مطلب نہیں تھا کہ انہوں نے حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق یہ اعتقاد کیا کہ انہوں نے برا کام کیا ہے، بلکہ انہوں نے یہ چاہا کہ وہ اس عجیب و غریب کام کی توجیہ پر مطلع ہو جائیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''خضر نے کہا: کیا میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے؟O'' (الکہف: ۷۲)

''قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا'': نیز حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نسیان سے یہ کہا تھا، اور حضرت خضر علیہ السلام نے ان کے اس اعتراض پر صرف اتنا کہا کہ کیا میں نے پہلے نہیں کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے۔ اور اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ عذر پیش کیا۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''موسیٰ نے کہا: اس کام پر میرا مواخذہ نہ کریں جس کو میں بھول گیا ہوں اور اس معاملہ میں مجھ پر سختی نہ کریںO'' (الکہف: ۷۳)

''قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا'': حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ کہا کہ وہ اُن سے کیے ہوئے وعدے اور وصیت کو بھول گئے ہیں اور جو شخص بھولنے والا ہوتا ہے اس پر مواخذہ نہیں کیا جاتا، یعنی اب آپ میری پیروی کرنے کو مشکل میں نہ ڈالیں، اور اس مناقشہ کو ترک کر کے آسانی فرمادیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''پھر وہ دونوں چل پڑے حتیٰ کہ جب ان دونوں کی ملاقات ایک لڑکے سے ہوئی، تو خضر نے اس کو قتل کر دیا، موسیٰ نے کہا: کیا آپ نے بے قصور لڑکے کو بغیر کسی جان کے عوض قتل کر دیا ہے، ضرور آپ نے بہت برا کام کیا ہےO'' (الکہف: ۷۴)

''فَانْطَلَقَا حَتّٰى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا نُّكْرًا'':

اس آیت میں ''غلام'' کا لفظ ہے اور غلام کا لفظ بالغ نوجوان کو بھی شامل ہے۔ اور یہ لفظ چھوٹے بچے کو بھی شامل ہے اور یہ ظاہر ہے، قرآن مجید میں یہ ذکر نہیں ہے کہ ان دونوں کی اس لڑکے سے کیسے ملاقات ہوئی، کیا وہ لڑکا دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا تھا یا وہ لڑکا اکیلا تھا، اور آیا وہ مسلمان تھا یا کافر تھا، اور آیا وہ بچہ تھا یا بالغ ہو چکا تھا۔ اور غلام کا لفظ کم عمر کے ساتھ زیادہ لائق ہے اگرچہ یہ نوجوان کا بھی احتمال رکھتا ہے۔ اور اس آیت میں ''بِغَيْرِ نَفْسٍ'' فرمایا ہے اور یہ بچے کے بجائے بالغ کے ساتھ زیادہ مناسب ہے، کیونکہ بچے کو قتل نہیں کیا جاتا خواہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو۔ نیز حضرت خضر علیہ السلام نے جو اس لڑکے کو قتل کیا تو کیا اس کا سر دھڑ سے الگ کر دیا تھا یا اس کے سر کو دیوار پر مارا تھا یا کسی اور طریقہ سے قتل کیا تھا، اور ان محتملات میں سے قرآن مجید میں کسی احتمال کا ذکر نہیں ہے۔

اور اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ''اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ'': ظاہر آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بغیر قصاص کے کسی شخص کے قتل کرنے کو بعید جانا، حالانکہ اس طرح نہیں ہے، کیونکہ کسی شخص کا خون بہانا متعدد اسباب کی وجہ

سے ہوتا ہے لیکن قوی سبب یہ ہے کہ کسی شخص کو قصاص میں قتل کیا جاتا ہے۔

"لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُّكْرًا": النکر کا معنی ہے کہ جو کام بہت قبیح اور بہت برا ہو۔ اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ اس لڑکے کو قتل کرنا کشتی کو پھاڑنے سے زیادہ قبیح تھا، کیونکہ کشتی کو پھاڑنے سے کوئی جان تلف نہیں ہوئی تھی، کیونکہ ہو سکتا تھا کہ اس کشتی میں کوئی غرق نہ ہو، لیکن اس صورت میں تو قطعی طور پر ایک جان تلف ہو گئی، سو یہ بہت برا کام ہے۔ اور اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا: "لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا اِمْرًا" یعنی آپ نے بہت تعجب ناک کام کیا ہے اور النکر تعجب ناک سے سے زیادہ سنگین ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ "نکر" اس کام کو کہتے ہیں جس کا عقول انکار کریں اور نفوس اس سے متنفر ہوں، تو کسی کام کی برائی بیان کرنے میں اس کام کو "نکر" کہنا زیادہ بلیغ ہے۔

اور بعض مفسرین نے کہا کہ "اِمْر" کا لفظ "نکر" سے زیادہ سنگین ہے، کیونکہ کشتی کو پھاڑنا متعدد نفوس کی ہلاکت کا موجب ہے اور اس لڑکے کو قتل کرنے کی صورت میں تو صرف ایک نفس ہلاک ہوا تھا، اور حضرت خضر علیہ السلام نے جو اس پر ملامت کی اور انہیں ان کا معاہدہ یاد دلایا تو صرف یہ کہا: "اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا"۔ اور یہ وہی قول ہے جو انہوں نے پہلے مسئلہ میں کہا تھا مگر یہاں پر "لک" کا لفظ زائد فرمایا ہے، کیونکہ یہ لفظ زجر و توبیخ میں اضافہ کرتا ہے۔

(تفسیر الکبیر، ج ۷ ص ۴۸۵۔ ۴۸۶، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

تبیان القرآن جلد ثالث کی تکمیل

الحمد للہ رب العالمین حمد الشاکرین! والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد افضل المرسلین خاتم النبیین، رحمۃ للعالمین، شفیعنا یوم الدین!

آج ۱۵ رشعبان المعظم ۱۴۳۶ھ/ ۳ رجون ۲۰۱۵ء بروز بدھ "تبیان القرآن" کی جلد ثالث مکمل ہو گئی۔

اے بار الٰہ! اس جلد کی تصنیف میں میری کم فہمی اور ناقص مطالعہ کی بناء پر جو فروگزاشت ہو گئی ہیں ان کو آپ معاف فرما دیں اور درگزر فرمائیں اور مجھے اپنی عنایات بے غایات سے محروم نہ فرمائیں، اس جلد کو اپنی بارگاہ میں مقبول فرمائیں اور اپنے حبیب اکرم سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میری اس کاوش کو سند قبول عطا فرمائیں اور تا قیام قیامت اس تفسیر کو سلامت اور فیض آفریں رکھیں، محبین کے لیے اس کو مسلک حق پر استقامت کا سبب بنائیں اور معاندین اور مخالفین کے لیے اس تفسیر کو رشد و ہدایت کا ذریعہ بنائیں، مجھے، میرے والدین، میرے اساتذہ، میرے احباب، میرے تلامذہ اور جملہ قارئین کو بخش دیں، ہماری خطاؤں کو معاف فرمائیں، ہم سب کو دنیا اور آخرت کے اس عذاب سے مامون اور محفوظ رکھیں جس عذاب کے ہم اپنی کوتاہیوں اور تقصیرات کی وجہ سے مستحق ہیں اور ہم کو محض اپنے فضل و کرم سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت مقبولہ سے جنت الفردوس عطا فرمائیں۔

اس جلد میں سورۃ التوبہ کی آخری ۳۶ آیات، سورۂ یونس، سورۂ ہود، سورۂ یوسف، سورۃ الرعد، سورۃ ابراہیم، سورۃ الحجر، سورۃ النحل، سورۂ بنی اسرائیل، اور سورۃ الکہف کی ابتدائی آیات تا آیت نمبر ۷۴ کی تفسیر آ گئی ہے۔

اس جلد کی ابتداء" 14 مارچ 2015ء/ ۲۲ رجمادی الاولیٰ ۱۴۳۶ھ، بروز بدھ" کو ہوئی اور تکمیل 3 جون 2015ء/ ۱۵ رشعبان المعظم، ۱۴۳۶ھ، بروز بدھ کو۔ یعنی اس جلد کی تکمیل میں دو ماہ اور انیس (۱۹) دن کا عرصہ لگا۔

اس جلد کی پروف ریڈنگ اولاً سید عمیر الحسن برنی نے عمیق نظر سے کی ہے، پھر طباعت سے پہلے اس جلد کی پروف ریڈنگ حضرت مولانا محمد اکرم ساجد صاحب زید مجدہٗ نے بہت گہری نظر سے کی ہے، اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔

کلمات تشکر

اس جلد کی تکمیل پر میں حضرت مفتی اعظم پاکستان علامہ منیب الرحمٰن زید مجدہم، محترم محمد حفیظ البرکات شاہ صاحب دامت العالیہم العالیہ، جناب احمد سلمان پیرزادہ صاحب، حافظ محمد اکرم ساجد، مولانا محمد مختار (منیجر ضیاء القرآن پبلی کیشنز)، مولانا حافظ عبدالمجید زید علمہٗ (برٹل)، سید جمیل الرحمٰن شاہ زید فضلہٗ (کاموکی)، سید عمیر الحسن برنی زید حبہٗ، الحاج محمد شفیق قریشی، مفتی محمد اسماعیل نورانی اور دیگر احباب کا شکر گزار اور ان کے حق میں دعا گو ہوں۔ اس جلد کی کمپوزنگ اسی دارالعلوم میں حافظ محمد جمشید ہاشمی سلمہٗ نے کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے فضل و کرم سے نوازیں، ہماری خطاؤں کو معاف فرمائیں اور ہم کو ہمیشہ نیکی کی راہ پر گامزن رکھیں اور خصوصاً اس تفسیر میں مجھے کج روی اور اغلاط سے محفوظ اور مامون رکھیں۔ اور اس کے بعد تبیان القرآن کی بقیہ مجلدات کو مکمل کرنے کی توفیق مرحمت فرمائیں۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز

غلام رسول سعیدی غفرلہٗ

خادم القرآن والحدیث

دارالعلوم نعیمیہ، بلاک ۱۵، فیڈرل بی ایریا، کراچی

۳ جون 2015ء / ۱۵ شعبان المعظم ۱۴۳۶ھ، بروز بدھ

تبیان الفرقان فی تفسیر القرآن جلد ثالث کی ڈائری

افتتاح ۲۲ جمادی الاولی ۱۴۳۶ھ/ ۱۴ مارچ 2015ء بروز ہفتہ

اختتام: ۱۵ شعبان المعظم ۱۴۳۶ھ/3 جون 2015ء بروز بدھ

تقویم میلادی	تقویم ہجری	دن	ایک ماہ کے صفحات	کل صفحات
۱۴ مارچ ۲۰۱۵ء	۲۲ جمادی الاولی ۱۴۳۶ھ	ہفتہ	=	=
یکم اپریل ۲۰۱۵ء	۱۱ جمادی الثانی ۱۴۳۶ھ	بدھ	۱۵۵	۱۵۵
یکم مئی ۲۰۱۵ء	۱۱ رجب المرجب ۱۴۳۶ھ	جمعۃ المبارک	۳۷۹	۵۳۴
یکم جون ۲۰۱۵ء	۱۳ شعبان المعظم ۱۴۳۶ھ	پیر	۳۴۳	۸۷۷
۳ جون ۲۰۱۵ء	۱۵ شعبان المعظم ۱۴۳۶ھ	بدھ	۲۰	۸۹۷

مصادر التحقیق فی تبیان الفرقان

کتب سماویہ

۱۔	قرآن مجید فرقان حمید
۲۔	تورات
۳۔	زبور
۴۔	انجیل

کتب تفاسیر اہل السنۃ والمعتزلۃ

الرقم مسلسل	اسم الکتاب	اسم المصنف	اسم المطبع
۵	تنویر المقباس من تفسیر ابن عباس	محمد بن یعقوب بن فضل اللہ الطبیر وزآبادی المتوفی ۸۱۷ھ	المکتبۃ العصریہ، ۱۴۳۳ھ
۶	معانی القرآن	امام ابوزکریا یحییٰ بن زیاد فراء حنفی، المتوفی ۲۰۷ھ	------بیروت
۷	تفسیر عبدالرزاق	امام ابوبکر عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی المتوفی ۲۱۱ھ	دارالمعرفۃ، بیروت، ۱۴۱۱ھ
۸	تفسیر ابوبکر الاصم	عبدالرحمٰن بن کیسان المعتزلی المتوفی ۲۲۵ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۸ھ
۹	تفسیر ابوعلی الجبائی	ابوعلی الجبائی المعتزلی المتوفی ۳۰۳ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۸ھ
۱۰	جامع البیان	امام ابوجعفر محمد بن جریر الطبری المتوفی ۳۱۰ھ	دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۲۴ھ
۱۱	کتاب تفسیر القرآن	امام ابوبکر محمد بن ابراہیم بن المنذر النیشاپوری المتوفی ۳۱۸ھ	دارالماٰثر، المدینۃ المنورۃ ۱۴۲۳ھ
۱۲	تفسیر الکعبی البلخی	ابوالقاسم الکعبی البلخی المعتزلی المتوفی ۳۱۹ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۸ھ
۱۳	تفسیر ابومسلم	ابومسلم محمد بن بحر الاصفہانی المعتزلی المتوفی ۳۲۲ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۸ھ
۱۴	تفسیر القرآن العظیم	امام عبدالرحمٰن بن محمد بن ادریس بن ابی حاتم الرازی المتوفی ۳۲۷ھ	نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ
۱۵	تاویلات اہل السنۃ	امام ابومنصور محمد بن محمد ماتریدی المتوفی ۳۳۳ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۶ھ
۱۶	احکام القرآن	امام ابوبکر احمد بن علی رازی جصاص المتوفی ۳۷۰ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۴ھ
۱۷	بحر العلوم	ابواللیث نصر بن محمد بن احمد السمرقندی الحنفی المتوفی ۳۷۵ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۳ھ

۱۸	تفسیر ابوالحسن الرمانی	ابوالحسن الرمانی علی بن عیسیٰ المعتزلی المتوفی ۳۸۴ھ	دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۲۸ھ
۱۹	تفسیر القرآن العزیز	ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ بن ابی زمنین المتوفی ۳۹۹ھ	الفاروق الحدیثیۃ للطباعۃ والنشر، قاہرہ، ۱۴۲۶ھ
۲۰	التفسیر الکبیر اوالتفسیر المحیط	القاضی ابوالحسن عبدالجبار بن احمد الاسد آبادی المعتزلی المتوفی ۴۱۵ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۸ھ
۲۱	الکشف والبیان	امام ابواسحاق احمد بن محمد الثعلبی المتوفی ۴۲۷ھ	داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۲ھ
۲۲	النکت والعیون	علامہ ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردی المصری المتوفی ۴۵۰ھ	مؤسسۃ الکتب الثقافیۃ، بیروت
۲۳	لطائف الاسرار	امام ابوالقاسم بن ہوازن القشیری الشافعی المتوفی ۴۶۵ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۰ھ
۲۴	اسباب نزول القرآن	ابوالحسن علی بن احمد الواحدی المتوفی ۴۶۸ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت
۲۵	الوسیط	علامہ ابوالحسن علی بن احمد واحدی نیشاپوری المتوفی ۴۶۸ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۵ھ
۲۶	تفسیر القرآن	علامہ ابوالمظفر السمعانی الشافعی المتوفی ۴۸۹ھ	دارالوطن، ریاض ۱۴۱۸ھ
۲۷	معالم التنزیل	علامہ ابومحمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ	داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ
۲۸	الکشاف عن حقائق التنزیل	علامہ محمود بن عمر الزمخشری الخوارزمی المتوفی ۵۳۸ھ	ـ
۲۹	المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز	ابوبکر عبدالحق بن عطیہ الاندلسی المتوفی ۵۴۱ھ	دار ابن حزم، ۱۴۲۳ھ
۳۰	احکام القرآن	علامہ ابوبکر محمد بن عبداللہ ابن العربی المالکی المتوفی ۵۴۳ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۰۸ھ
۳۱	زادالمسیر فی علم التفسیر	علامہ ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی بن الجوزی الحنبلی المتوفی ۵۹۷ھ	دارالکتاب العربی، بیروت، ۱۴۳۱ھ
۳۲	التفسیر الکبیر	امام فخرالدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ	داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ
۳۳	اسرار التنزیل وانوار التاویل (تفسیر صغیر)	امام فخرالدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ	دارالکتب الوثائق، بغداد، عراق ۱۹۹۰ء
۳۴	تفسیر القرآن العظیم	علامہ ابوالحسن علی بن محمد علم الدین السخاوی الشافعی المتوفی ۶۴۳ھ	دارالنشر للجامعات، القاہرہ، ۱۴۳۰ھ
۳۵	الجامع لاحکام القرآن	علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ	دارالکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ
۳۶	انوار التنزیل واسرار التاویل	قاضی ابوالخیر عبداللہ بن عمر بیضاوی شافعی متوفی ۶۸۵ھ	دارالفکر، بیروت، ۱۴۱۶ھ

۳۷	عنایۃ القاضی وکفایۃ الراضی	قاضی شہاب الدین احمد بن محمد بن عمر الخفاجی المتوفی ۱۰۶۹ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۷ھ
۳۸	مدارک التنزیل	علامہ ابو البرکات احمد بن محمد نسفی حنفی متوفی ۷۱۰ھ	دار ابن کثیر، بیروت، ۱۴۳۲ھ
۳۹	لباب التاویل فی معانی التنزیل (تفسیر خازن)	علامہ علاؤ الدین علی بن محمد البغدادی الشہیر بالخازن المتوفی ۷۲۵ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۱۰ء
۴۰	تفسیر غرائب القرآن ورغائب الفرقان	علامہ نظام الدین الحسن بن محمد بن حسین القمی النیشاپوری المتوفی ۷۲۸ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۶ھ
۴۱	فتوح الغیب حاشیہ علی الکشاف	امام شرف الدین الحسین بن عبد اللہ الطیبی الشافعی المتوفی ۷۴۳ھ	جائزۃ دبی الدولیۃ للقرآن الکریم، ۱۴۳۴ھ
۴۲	البحر المحیط فی التفسیر	علامہ محمد بن یوسف الشہیر بابی حیان الاندلسی المالکی المتوفی ۷۵۴ھ	دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۲ھ
۴۳	تفسیر القرآن العظیم	حافظ اسماعیل بن کثیر الشافعی الدمشقی المتوفی ۷۷۴ھ	دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۹ھ
۴۴	تفسیر القرآن العظیم	حافظ اسماعیل بن کثیر الشافعی الدمشقی المتوفی ۷۷۴ھ	دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۳۲ھ
۴۵	اللباب فی علوم الکتاب	علامہ ابو حفص عمر بن علی الدمشقی الحنبلی المتوفی ۸۸۰ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۱۱ء
۴۶	تفسیر جلالین	علامہ محمد بن احمد بن محمد بن ابراہیم بن احمد بن ہاشم المحلی الشافعی المتوفی ۸۶۴ھ/ حافظ جلال الدین سیوطی شافعی متوفی ۹۱۱ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت
۴۷	الدر المنثور فی التفسیر بالماثور	حافظ جلال الدین سیوطی شافعی متوفی ۹۱۱ھ	دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۱ھ
۴۸	فتح الرحمٰن فی تفسیر القرآن	القاضی مجیر الدین بن محمد العلیمی المقدسی الحنبلی المتوفی ۹۲۸ھ	دار النوادر، لبنان، ۱۴۳۲ھ
۴۹	حاشیہ شیخ زادہ علی البیضاوی	علامہ محمد بن مصباح الدین مصطفیٰ القوجوی الحنفی المتوفی ۹۵۱ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۹ھ
۵۰	السراج المنیر	الشیخ الخطیب الشربینی الشافعی المتوفی ۹۷۷ھ	دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۵ھ
۵۱	ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم	قاضی ابو سعود محمد بن محمد بن مصطفیٰ العمادی الحنفی المتوفی ۹۸۲ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۹ھ
۵۲	التفسیرات الاحمدیہ	علامہ مولوی رحیم بخش المتوفی ۱۱۳۰ھ	مکتبہ حقانیہ، پشاور
۵۳	روح البیان	علامہ اسماعیل حقی حنفی متوفی ۱۱۳۷ھ	دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۱ھ
۵۴	حاشیہ الجمل علی الجلالین	شیخ سلیمان الجمل المتوفی ۱۲۰۴ھ	قدیمی کتب خانہ، کراچی
۵۵	تفسیر المظہری	القاضی محمد ثناء اللہ العثمانی الحنفی المظہری المتوفی ۱۲۲۵ھ	مکتبہ حنفیہ، کوئٹہ، ۱۴۲۵ھ

٥٦	حاشیۃ الصاوی علی الجلالین	علامہ احمد بن محمد الصاوی المصری المالکی المتوفی ۱۲۴۱ھ	دار الفکر، بیروت، ۱۴۲۱ھ
٥٧	فتح القدیر	شیخ محمد بن علی بن محمد الشوکانی المتوفی ۱۲۵۰ھ	دار الوفاء، المنصورہ، ۱۴۱۸ھ
٥٨	روح المعانی	علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ	دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۷ھ
٥٩	فتح البیان	نواب صدیق حسن بھوپالی (غیر مقلد) متوفی ۱۳۰۷ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۰ھ
٦٠	تفسیر القرآن وھو الھدیٰ والفرقان	سر سید احمد خان متوفی ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء	سر سید ریسرچ اکیڈمی، لاہور ۲۰۱۰ء
٦١	حاشیۃ القرآن	شیخ محمود الحسن دیوبندی متوفی ۱۳۳۹ھ	دار التصنیف، شاہراہ لیاقت، کراچی
٦٢	مجموعہ تفاسیر فراہی	شیخ حمید الدین فراہی متوفی ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء	فاران فاؤنڈیشن، لاہور ۲۰۰۸ء
٦٣	بلغۃ الحیران	مولانا حسین علی متوفی ۱۳۶۳ھ	اسد پرنٹرز، لاہور
٦٤	تفسیر بیان القرآن	شیخ اشرف علی تھانوی دیوبندی متوفی ۱۳۶۲ھ	مکتبہ رحمانیہ، لاہور
٦٥	خزائن العرفان	صدر الافاضل علامہ سید محمد نعیم الدین مراد آبادی حنفی متوفی ۱۳۶۷ھ	مکتبۃ المدینہ، کراچی، ۱۴۳۲ھ
٦٦	المنتخب من عیون التفاسیر	علامہ مصطفیٰ الخیری الحسنی المنصوری الحنفی المتوفی ۱۳۹۰ھ	دار القلم، دمشق ۱۴۱۶ھ
٦٧	تفسیر کبیر	مرزا بشیر الدین محمود احمد قادیانی متوفی ۱۹۶۵ء	نظارت اشاعت، ربوہ
٦٨	معارف القرآن	مفتی محمد شفیع دیوبندی متوفی ۱۹۷۶ء	ادارہ معارف القرآن، کراچی
٦٩	نور العرفان	مفتی احمد یار خان نعیمی حنفی متوفی ۱۳۹۱ھ	دار الکتب الاسلامیہ، گجرات
٧٠	تفسیر ماجدی	شیخ عبد الماجد دریا آبادی متوفی ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء	پاک کمپنی، لاہور
٧١	تفہیم القرآن	سید ابو الاعلیٰ مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء	ادارہ ترجمان القرآن، لاہور ۲۰۱۳ء
٧٢	التبیان العظیم فی تفسیر سورۃ التحریم	علامہ سید احمد سعید کاظمی حنفی متوفی ۱۴۰۶ھ	فانوس پبلی کیشنز، پاکستان، ۲۰۰۳ء
٧٣	مطالب الفرقان	غلام احمد پرویز متوفی ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۵ء	ادارہ طلوع اسلام، لاہور، ۱۹۸۱ء
٧٤	مطالب القرآن	غلام احمد پرویز متوفی ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۵ء	ادارہ طلوع اسلام، لاہور، ۲۰۱۲ء
٧٥	تدبر قرآن	شیخ امین احسن اصلاحی متوفی ۱۴۱۸ھ/۱۹۹۷ء	فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۴۳۴ھ
٧٦	ضیاء القرآن	ضیاء الامت حضرت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری حنفی متوفی ۱۴۱۸ھ	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
٧٧	سید التفاسیر المعروف بہ تفسیر اشرفی	علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی حنفی	گلوبل اسلامک مشن، نیویارک (USA) ۱۴۳۰ھ

۷۸	معالم العرفان	شیخ صوفی عبدالحمید سواتی متوفی ۱۴۲۹ھ/۲۰۰۸ء	مکتبہ دروس القرآن، گوجرانوالہ ۱۴۳۳ھ
۷۹	البیان	جاوید احمد غامدی	المورد، لاہور، ۲۰۱۰ء
۸۰	التفسیر المنیر	الاستاذ الدکتور وہبہ الزحیلی	دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۱ھ
۸۱	تذکیر القرآن	مولانا وحید الدین خان	دار التذکیر، لاہور، ۲۰۰۹ء
۸۲	آسان ترجمہ قرآن وتشریحات کے ساتھ	شیخ محمد تقی عثمانی	مکتبہ معارف القرآن، کراچی
۸۳	تفسیر قرآن	شیخ محمود الحسن دیوبندی متوفی ۱۳۳۹ھ، از ابتداء تا سورۃ آل عمران/ شیخ شبیر احمد عثمانی دیوبندی متوفی ۱۳۶۹ھ، از سورۃ النساء تا آخر قرآن	الملک فہد بن عبدالعزیز آل سعود، المملکۃ العربیۃ السعودیہ
۸۴	تفسیر قرآن	شیخ محمود الحسن دیوبندی متوفی ۱۳۳۹ھ، از ابتداء تا سورۃ آل عمران/ شیخ شبیر احمد عثمانی دیوبندی متوفی ۱۳۶۹ھ، از سورۃ النساء تا آخر قرآن	دار التصنیف لمیٹڈ، شاہراہ لیاقت، صدر کراچی، پاکستان
۸۵	صفوۃ التفاسیر	شیخ محمد علی صابونی	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۰ھ
۸۶	البیان	سید احمد سعید کاظمی متوفی ۱۴۰۶ھ	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
۸۷	انوار الفرقان فی معانی القرآن	عبدالحکیم شرف قادری رحمہ اللہ متوفی ۱۴۲۸ھ	مکتبہ قادریہ، لاہور
۸۸	ترجمہ قرآن	مولانا محمد جونا گڑھی	مملکۃ العربی سعودیہ
۸۹	ترجمہ قرآن	سید فرمان علی	عمران کمپنی لاہور
۹۰	تبیان القرآن	علامہ غلام رسول سعیدی حنفی	فرید بک اسٹال، لاہور
۹۱	عرفان القرآن	ڈاکٹر محمد طاہر القادری	منہاج القرآن پبلی کیشنز، لاہور

کتب تفاسیر الشیعہ

۹۲	تفسیر القمی	ابوالحسن علی بن ابراہیم القمی المتوفی ۳۲۹ھ	مؤسسۃ الاعلمی، بیروت، ۱۴۳۵ھ
۹۳	التبیان فی تفسیر القرآن	ابو جعفر محمد بن الحسن الطوسی المتوفی ۴۶۰ھ	دار احیاء التراث العربی، بیروت
۹۴	مجمع البیان فی تفسیر القرآن	شیخ ابوعلی الفضل بن الحسن الطبرسی المتوفی فی القرن السادس	دار المعرفۃ، بیروت، ۱۴۰۶ھ
۹۵	المیزان فی تفسیر القرآن	محمد حسین طباطبائی المتوفی ۱۴۰۲ھ	دار الکتب الاسلامیہ طہران، ۱۳۹۷ھ

کتب احادیث اہل السنۃ

۹۶	مسند امام اعظم	امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت متوفی ۱۵۰ھ	المکتبۃ الامدادیہ، مکہ مکرمہ ۱۴۳۱ھ
۹۷	موطا امام مالک	امام مالک بن انس اصبحی متوفی ۱۷۹ھ	دار الحدیث، قاہرہ، ۱۴۲۶ھ
۹۸	موطا امام مالک	امام مالک بن انس اصبحی متوفی ۱۷۹ھ	دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۲۰ھ
۹۹	موطا امام مالک	امام مالک بن انس اصبحی متوفی ۱۷۹ھ	المکتبۃ التوفیقیہ
۱۰۰	کتاب الزہد	امام عبداللہ بن مبارک حنفی متوفی ۱۸۱ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت
۱۰۱	کتاب الآثار	امام ابویوسف یعقوب بن ابراہیم حنفی متوفی ۱۸۳ھ	مکتبہ عصریہ، سانگلہ ہل
۱۰۲	کتاب الآثار	امام محمد بن حسن شیبانی حنفی متوفی ۱۸۹ھ	ادارۃ القرآن، کراچی، ۱۴۰۷ھ
۱۰۳	موطا امام محمد	امام محمد بن حسن شیبانی حنفی متوفی ۱۸۹ھ	نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی
۱۰۴	المسند	امام محمد بن ادریس الشافعی المتوفی ۲۰۴ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۰۰ھ
۱۰۵	مسند ابوداؤد طیالسی	امام سلیمان بن داؤد شافعی متوفی ۲۰۴ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۵ھ
۱۰۶	کتاب المغازی	امام محمد بن عمر بن واقد شافعی متوفی ۲۰۷ھ	عالم الکتب، بیروت، ۱۴۰۳ھ
۱۰۷	مصنف عبدالرزاق	امام عبدالرزاق بن ہمام صنعانی متوفی ۲۱۱ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۱ھ
۱۰۸	مسند ابوعوانہ	ابوعوانہ یعقوب بن اسحاق الاسفرائنی متوفی ۳۱۶ھ	دار المعرفہ، بیروت
۱۰۹	مسند الحمیدی	امام عبداللہ بن الزبیر حمیدی شافعی متوفی ۲۱۹ھ	عالم الکتب، بیروت
۱۱۰	سنن سعید بن منصور	امام سعید بن منصور خراسانی مکی شافعی متوفی ۲۲۷ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۸ھ
۱۱۱	مصنف ابن ابی شیبہ	امام ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ شافعی متوفی ۲۳۵ھ	ادارۃ القرآن، کراچی ۱۴۰۶
۱۱۲	مصنف ابن ابی شیبہ	امام ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ شافعی متوفی ۲۳۵ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۶ھ
۱۱۳	مصنف ابن ابی شیبہ (محمد عوامہ)	امام ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ شافعی متوفی ۲۳۵ھ	المجلس العلمی، دار قرطبہ، بیروت ۱۴۲۷ھ
۱۱۴	مسند احمد	امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ	دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۳ھ
۱۱۵	مسند احمد	امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ	دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ
۱۱۶	مسند احمد	امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ	عالم الکتب، بیروت، ۱۴۱۹ھ
۱۱۷	مسند احمد	امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ	موسسۃ الرسالہ، بیروت، ۱۴۲۰ھ
۱۱۸	المنتخب من مسند عبد بن حمید	علامہ ابومحمد عبد بن حمید الکشی المتوفی ۲۴۹ھ	مکتبہ ابن عباس، المنصورہ، مصر ۱۴۳۰ھ

۱۱۹	سنن دارمی	امام عبداللہ ابو عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی شافعی متوفی ۲۵۵ھ	دارالمعرفہ، بیروت، ۱۴۲۰ھ
۱۲۰	صحیح البخاری	امام ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری شافعی متوفی ۲۵۶ھ	مکتبہ دارالعلم الحدیث، ۱۴۲۶ھ
۱۲۱	صحیح البخاری	امام ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری شافعی متوفی ۲۵۶ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۰ھ
۱۲۲	صحیح البخاری	امام ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری شافعی متوفی ۲۵۶ھ	دارارقم، بیروت
۱۲۳	صحیح البخاری	امام ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری شافعی متوفی ۲۵۶ھ	المکتبۃ العصریہ، بیروت، ۱۴۳۱ھ
۱۲۴	صحیح البخاری	امام ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری شافعی متوفی ۲۵۶ھ	دارالفکر، بیروت، ۱۴۲۱ھ
۱۲۵	صحیح البخاری	امام ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری شافعی متوفی ۲۵۶ھ	مؤسسۃ الرسالہ، بیروت، ۱۴۳۱ھ
۱۲۶	صحیح البخاری	امام ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری شافعی متوفی ۲۵۶ھ	دارالمعرفہ، بیروت، ۱۴۲۵ھ
۱۲۷	صحیح البخاری	امام ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری شافعی متوفی ۲۵۶ھ	دارابن الجوزی، القاہرہ، ۲۰۰۹ء
۱۲۸	الادب المفرد	امام ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری شافعی متوفی ۲۵۶ھ	دارالمعرفہ، بیروت، ۱۴۱۲ھ
۱۲۹	صحیح مسلم	امام ابوالحسین مسلم بن حجاج القشیری الشافعی متوفی ۲۶۱ھ	دارالمعرفہ، بیروت، ۱۴۳۱ھ
۱۳۰	سنن ابن ماجہ	امام ابو عبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ شافعی متوفی ۲۷۳ھ	المکتبۃ العصریہ، بیروت، ۱۴۳۱ھ
۱۳۱	سنن ابوداؤد	امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانی متوفی ۲۷۵ھ	المکتبۃ التوفیقیہ، القاہرہ، ۲۰۱۰ء
۱۳۲	سنن ترمذی	امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ الترمذی متوفی ۲۷۹ھ	دارالفکر، بیروت، ۱۴۲۵ھ
۱۳۳	سنن ترمذی	امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ الترمذی متوفی ۲۷۹ھ	مکتبۃ العصریہ، بیروت، ۱۴۳۰ھ
۱۳۴	شمائل محمدیہ	امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ الترمذی متوفی ۲۷۹ھ	المکتبۃ التجاریہ، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۵ھ
۱۳۵	موسوعۃ الامام ابن ابی الدنیا	حافظ ابوبکر عبداللہ بن محمد بن عبید بن سفیان القرشی المعروف بابن ابی الدنیا المتوفی ۲۸۱ھ	المکتبۃ العصریہ، بیروت، ۱۴۲۶ھ
۱۳۶	الاحاد والمثانی	امام ابن ابی عاصم شافعی متوفی ۲۸۷ھ	دارالرایہ، ریاض، ۱۴۱۱ھ
۱۳۷	البحر الزخار المعروف بہ المسند البزار	امام احمد عمرو بن عبدالخالق بزار شافعی متوفی ۲۹۲ھ	مؤسسۃ الرسالہ، بیروت
۱۳۸	سنن نسائی	عبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی شافعی متوفی ۳۰۳ھ	دارالفکر، بیروت، ۱۴۲۱ھ
۱۳۹	عمل الیوم واللیلۃ	عبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی شافعی متوفی ۳۰۳ھ	مؤسسۃ الکتب الثقافیہ، بیروت، ۱۴۰۸ھ
۱۴۰	السنن الکبریٰ	عبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی شافعی متوفی ۳۰۳ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۱ھ
۱۴۱	السنن الکبریٰ	عبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی شافعی متوفی ۳۰۳ھ	مؤسسۃ الرسالہ، بیروت، ۱۴۲۱ھ

۱۴۲	مسند ابو یعلی موصلی	امام احمد بن علی المثنی التمیمی الشافعی المتوفی ۳۰۷ھ	دار المامون التراث، ۱۴۰۳ھ
۱۴۳	المنتقی	امام عبد اللہ بن علی بن جارود نیشاپوری شافعی متوفی ۳۰۷ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۷ھ
۱۴۴	صحیح ابن خزیمہ	امام محمد بن اسحاق بن خزیمہ شافعی متوفی ۳۱۱ھ	مکتب اسلامی، بیروت، ۱۳۹۵ھ
۱۴۵	مسند ابوعوانہ	امام ابوعوانہ یعقوب بن اسحاق شافعی متوفی ۳۱۶ھ	دار الباز مکہ مکرمہ
۱۴۶	الاوسط من السنن والاجماع والاختلاف	امام ابوبکر محمد بن ابراہیم بن المنذر النیشاپوری المتوفی ۳۱۸ھ	دار الفلاح، ۱۴۳۰ھ
۱۴۷	تحفۃ الاخیار	امام ابوجعفر احمد بن محمد طحاوی حنفی متوفی ۳۲۱ھ	دار بلنسیہ، ریاض ۱۴۲۰ھ
۱۴۸	مشکل الآثار	امام ابوجعفر احمد بن محمد طحاوی حنفی متوفی ۳۲۱ھ	دار الباز، ۱۴۱۵ھ
۱۴۹	شرح معانی الآثار	امام ابوجعفر احمد بن محمد طحاوی حنفی متوفی ۳۲۱ھ	قدیمی کتب خانہ، کراچی
۱۵۰	شرح مشکل الآثار	امام ابوجعفر احمد بن محمد طحاوی حنفی متوفی ۳۲۱ھ	موسسۃ الرسالہ، بیروت، ۱۴۲۷ھ
۱۵۱	مسند الطحاوی	امام ابوجعفر احمد بن محمد طحاوی حنفی متوفی ۳۲۱ھ	مکتبۃ الحرمین، دبئی، ۱۴۲۶ھ
۱۵۲	کتاب الضعفاء الکبیر	امام ابوجعفر محمد بن عمرو العقیلی شافعی متوفی ۳۲۲ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۸ھ
۱۵۳	الاحسان بترتیب صحیح ابن حبان	امام ابوحاتم محمد بن حبان البستی الشافعی المتوفی ۳۵۴ھ	موسسۃ الرسالہ بیروت، ۱۴۰۷ھ
۱۵۴	کتاب الشریعہ	امام ابوبکر محمد بن الحسین بن عبد اللہ الآجری الشافعی المتوفی ۳۶۰ھ	موسسۃ الریان، ۱۴۲۹ھ
۱۵۵	المعجم الصغیر	امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی الشافعی المتوفی ۳۶۰ھ	مکتبہ سلفیہ، مدینہ منورہ، ۱۳۸۸ھ
۱۵۶	المعجم الصغیر	امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی الشافعی المتوفی ۳۶۰ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت
۱۵۷	المعجم الکبیر	امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی الشافعی المتوفی ۳۶۰ھ	دار احیاء التراث العربی، بیروت
۱۵۸	المعجم الاوسط	امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی الشافعی المتوفی ۳۶۰ھ	مکتبۃ المعارف، ریاض، دار الفکر، بیروت، ۱۴۲۰ھ
۱۵۹	المعجم الاوسط	امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی الشافعی المتوفی ۳۶۰ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۰ھ
۱۶۰	مسند الشامیین	امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی الشافعی المتوفی ۳۶۰ھ	موسسۃ الرسالہ، بیروت، ۱۴۰۹ھ
۱۶۱	کتاب عمل الیوم واللیلۃ	حافظ ابوبکر احمد بن محمد بن اسحاق الدینوری المعروف بہ ابن السنی شافعی متوفی ۳۶۴ھ	موسسۃ الکتب الثقافیۃ، ۱۴۰۸ھ
۱۶۲	الکامل فی ضعفاء الرجال	امام عبد اللہ بن عدی الجرجانی الشافعی المتوفی ۳۶۵ھ	دار الفکر، بیروت، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۸ھ

Ataunnabi.com

۱۶۳	الناسخ والمنسوخ	امام ابو حفص عمر بن احمد المعروف با بن الشاہین المتوفی ۳۸۵ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۲ھ
۱۶۴	سنن الدار قطنی	حافظ علی بن عمر الدار قطنی متوفی ۳۸۵ھ	دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۲۲ھ
۱۶۵	المستدرک علی الصحیحین	امام ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ حاکم نیشاپوری شافعی متوفی ۴۰۵ھ	دار الباز، مکہ مکرمہ، دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۲۷ھ، المکتبۃ العصریہ بیروت، ۱۴۲۰ھ
۱۶۶	المستدرک علی الصحیحین	امام ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ حاکم نیشاپوری شافعی متوفی ۴۰۵ھ	دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۲۷ھ
۱۶۷	کتاب المغازی	امام ابو عبد اللہ محمد بن عمر الواقدی المتوفی ۲۰۷ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۴ھ
۱۶۸	حلیۃ الاولیاء	امام ابو نعیم احمد بن عبد اللہ شافعی متوفی ۴۳۰ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۸ھ، دار الکتاب العربی، ۱۴۰۷ھ
۱۶۹	دلائل النبوۃ لابی نعیم	امام ابو نعیم احمد بن عبد اللہ شافعی متوفی ۴۳۰ھ	دار النفائس، بیروت
۱۷۰	سنن کبریٰ	امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی شافعی متوفی ۴۵۸ھ	نشر السنۃ، ملتان
۱۷۱	کتاب الاسماء والصفات	امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی شافعی متوفی ۴۵۸ھ	دار احیاء التراث العربی، بیروت
۱۷۲	معرفۃ السنن والآثار	امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی شافعی متوفی ۴۵۸ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت
۱۷۳	دلائل النبوۃ للبیہقی	امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی شافعی متوفی ۴۵۸ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۳ھ
۱۷۴	کتاب فضائل الاوقات	امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی شافعی متوفی ۴۵۸ھ	مکتبۃ المنارہ، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۰ھ
۱۷۵	شعب الایمان	امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی شافعی متوفی ۴۵۸ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۰۱ھ
۱۷۶	الجامع لشعب الایمان	امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی شافعی متوفی ۴۵۸ھ	مکتبۃ الرشد، ریاض، ۱۴۲۳ھ
۱۷۷	کتاب البعث والنشور	امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی شافعی متوفی ۴۵۸ھ	دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۳ھ
۱۷۸	جامع بیان العلم وفضلہ	امام ابو عمر یوسف بن عبد البر قرطبی مالکی متوفی ۴۶۳ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت
۱۷۹	الجمع بین الصحیحین	امام محمد بن فتوح الحمیدی الشافعی المتوفی ۴۸۸ھ	دار ابن حزم، ۱۴۲۳ھ
۱۸۰	الفردوس بماثور الخطاب	امام ابو شجاع شیرویہ بن شہردار بن شیرویہ الدیلمی الشافعی متوفی ۵۰۹ھ	دار الکتب، العلمیہ، بیروت، ۱۴۰۶ھ
۱۸۱	شرح السنۃ	امام حسین بن مسعود بغوی شافعی متوفی ۵۱۶ھ	دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۴ھ
۱۸۲	القبس فی شرح موطا بن انس	امام قاضی ابو بکر محمد بن عبد اللہ ابن العربی اندلسی مالکی متوفی ۵۴۳ھ	مطبوعہ: دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۱۹ھ
۱۸۳	تاریخ دمشق الکبیر	امام ابو القاسم علی بن الحسن ابن عساکر شافعی متوفی ۵۷۱ھ	دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۲۱ھ

۱۸۴	جامع المسانید	امام ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی بن محمد جوزی الحنبلی المتوفی ۵۹۷ھ	مکتبۃ الرشد، ریاض، ۱۴۲۶ھ
۱۸۵	جامع الاصول	امام مجدالدین بن محمد الشیبانی المعروف بہ ابن الاثیر الجزری شافعی متوفی ۶۰۶ھ	دارابن کثیر، بیروت، ۱۴۳۲ھ
۱۸۶	الترغیب والترہیب	امام زکی الدین عبدالعزیز بن عبدالقوی المنذری الشافعی المتوفی ۶۵۶ھ	دارالحدیث، قاہرہ، ۱۴۰۷ھ، دارابن کثیر بیروت، ۱۴۱۴ھ
۱۸۷	المفہم لما اشکل من تلخیص کتاب مسلم	امام ابوالعباس احمد بن عمر بن ابراہیم القرطبی المتوفی ۶۵۶ھ	دارابن کثیر، بیروت ۱۴۲۰ھ
۱۸۸	التذکرۃ فی امور الآخرۃ	علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ	دارالبخاری، مدینہ منورہ
۱۸۹	الاذکار من کلام سیدالابرار	علامہ محی الدین ابوزکریا یحییٰ بن شرف نووی متوفی ۶۷۶ھ	مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ ۱۴۱۷ھ
۱۹۰	ریاض الصالحین	علامہ محی الدین ابوزکریا یحییٰ بن شرف نووی متوفی ۶۷۶ھ	قدیمی کتب خانہ، کراچی
۱۹۱	اللباب فی الجمع بین السنۃ والکتاب	علامہ ابومحمد علی بن زکریا المنبجی المتوفی ۶۸۶ھ	دارخضر، بیروت، ۱۴۱۹ھ
۱۹۲	مشکوۃ المصابیح	امام محی الدین تبریزی شافعی متوفی ۷۴۲ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۴ھ
۱۹۳	مشکوۃ المصابیح	امام محی الدین تبریزی شافعی متوفی ۷۴۲ھ	دارابن حزم، بیروت، ۱۴۲۳ھ
۱۹۴	شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام	امام علی بن عبدالکافی تقی الدین سبکی الشافعی المتوفی ۷۵۶ھ	دائرۃ المعارف النظامیہ، حیدرآباد دکن، انڈیا
۱۹۵	جلاء الافہام فی فضل الصلوٰۃ والسلام علی محمد خیرالانام	علامہ شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن ابوبکر المعروف بہ ابن القیم الجوزیہ الحنبلی المتوفی ۷۵۱ھ	دارالکتاب العربی، بیروت، ۱۴۱۷ھ
۱۹۶	نصب الرایہ	حافظ جمال الدین عبداللہ بن یوسف زیلعی حنفی متوفی ۷۶۲ھ	مجلس علمی سورۃ ہند، ۱۳۵۷ھ، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۶ھ
۱۹۷	اللآلی المنثورہ	امام محمد بن عبداللہ بن بہادر الزرکشی المتوفی ۷۹۴ھ	المکتب الاسلامی، بیروت ۱۴۱۷ھ
۱۹۸	احوال القبور واحوال اہلہا الی النشور	حافظ ابوالفرج زین الدین عبدالرحمٰن بن احمد بن رجب الحنبلی البغدادی الدمشقی، متوفی ۷۹۵ھ	دارالکتب العربی، بیروت، ۱۴۱۸ھ
۱۹۹	مجمع الزوائد	حافظ نورالدین علی بن ابی بکر الہیثمی الشافعی المتوفی ۸۰۷ھ،	دارالکتاب العربی، بیروت، ۱۴۰۲ھ، دارالفکر، بیروت ۱۴۱۴ھ

۲۰۰	کشف الاستار	حافظ نور الدین علی بن ابی بکر الہیثمی الشافعی المتوفی ۸۰۷ھ	موسسۃ الرسالہ، بیروت، ۱۴۰۴ھ
۲۰۱	اتحاف الخیرۃ المہرۃ بزوائد المسانید العشرۃ	امام ابو العباس احمد بن ابوبکر بوصیری شافعی متوفی ۸۴۰ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۲ھ
۲۰۲	المطالب العالیہ	حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی شافعی متوفی ۸۵۲ھ	دار الباز مکہ مکرمہ، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۴ھ
۲۰۳	تلخیص الحبیر فی تخریج احادیث رافعی الکبیر	حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی شافعی متوفی ۸۵۲ھ	نزار مصطفی الباز، مکہ مکرمہ ۱۴۱۷ھ
۲۰۴	نزہۃ المجالس ومنتخب النفائس	امام عبدالرحمن بن عبدالسلام بن عبدالرحمن بن عثمان الصفوری الشافعی المتوفی ۸۹۴ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۹ھ
۲۰۵	القول البدیع فی الصلوۃ علی الحبیب الشفیع	حافظ شمس الدین محمد بن عبدالرحمن السخاوی الشافعی، متوفی ۹۰۲ھ	مکتبۃ المؤید دمشق، ۱۴۰۸ھ
۲۰۶	المقاصد الحسنۃ فی بیان کثیر من الاحادیث المشتہرۃ علی الالسنۃ	حافظ شمس الدین محمد بن عبد الرحمن السخاوی الشافعی، متوفی ۹۰۲ھ	دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۰۷ھ
۲۰۷	الجامع الصغیر	حافظ جلال الدین سیوطی شافعی متوفی ۹۱۱ھ	دار المعرفہ بیروت، ۱۳۹۱ھ، مکتبہ نزار مصطفی الباز، مکہ مکرمہ
۲۰۸	جامع الاحادیث الکبیر	حافظ جلال الدین سیوطی شافعی متوفی ۹۱۱ھ	دار الفکر بیروت، ۱۴۱۴ھ
۲۰۹	جمع الجوامع	حافظ جلال الدین سیوطی شافعی متوفی ۹۱۱ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۱ھ
۲۱۰	البدور السافرہ	حافظ جلال الدین سیوطی شافعی متوفی ۹۱۱ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۶ھ، دار ابن حزم بیروت، ۱۴۱۴ھ
۲۱۱	شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور	حافظ جلال الدین سیوطی شافعی متوفی ۹۱۱ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۴ھ
۲۱۲	الخصائص الکبریٰ	حافظ جلال الدین سیوطی شافعی متوفی ۹۱۱ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۰۵ھ
۲۱۳	کنز العمال	علامہ علی متقی بن حسام الدین ہندی برہان پوری متوفی ۹۷۵ھ	موسسۃ الرسالہ، بیروت
۲۱۴	کشف الخفاء ومزیل الالباس	علامہ اسماعیل بن محمد العجلونی، متوفی ۱۱۶۲ھ	مکتبۃ الغزالی، دمشق

۲۱۵	موسوعۃ المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی الشریف للکتب الستۃ	الدکتور الشیخ خلیل مامون شیحا	دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۳۴ھ
۲۱۶	عون الباری لحل ادلۃ الصحیح البخاری	شیخ ابو الطیب صدیق بن حسن الحسینی القنوجی غیر مقلد، متوفی ۱۳۰۷ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۲۹ھ

کتب شروح حدیث

۲۱۷	البحر الذخار بمعروف المسند البزار	امام ابوبکر احمد بن عمرو بن عبد الخالق البزار المتوفی ۲۹۳ھ	مکتبۃ العلوم والحکم، مدینہ منورہ ۱۴۲۴ھ
۲۱۸	اعلام السنن فی شرح صحیح البخاری	امام ابو سلیمان حمد بن محمد الخطابی متوفی ۳۸۸ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۸ھ
۲۱۹	اکمال المعلم بفوائد مسلم	قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی، متوفی ۵۴۴ھ	دار الوفاء، بیروت ۱۴۱۹ھ
۲۲۰	المفہم	علامہ ابو العباس احمد بن عمر ابراہیم القرطبی المالکی، متوفی ۶۵۶ھ	دار ابن کثیر، بیروت ۱۴۱۷ھ
۲۲۱	بہجۃ النفوس	امام ابو محمد عبد اللہ بن ابی جمرۃ الاندلسی المتوفی ۶۹۹ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۸ھ
۲۲۲	فتح الباری	حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی شافعی متوفی ۸۵۲ھ	دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۲۶ھ دار نشر الکتب الاسلامیہ، لاہور
۲۲۳	نخب الافکار	علامہ بدر الدین ابو محمد محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ	قدیمی کتب خانہ، کراچی
۲۲۴	کتاب المیسر فی شرح مصابیح السنۃ	علامہ ابو عبد اللہ فضل اللہ بن الحسن التورپشتی الشافعی، متوفی ۶۶۱ھ	مکتبہ نزار مصطفیٰ ۱۴۲۲ھ
۲۲۵	مجمع الانہر فی شرح ملتقی الابحر	امام ابراہیم بن محمد ابراہیم المتوفی ۹۵۶ھ	المکتبۃ الغفاریہ، کوئٹہ، پاکستان ۱۴۱۹ھ
۲۲۶	عمدۃ القاری	حافظ بدر الدین محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۱ھ
۲۲۷	اشرف الوسائل الی فہم الشمائل	علامہ شہاب الدین احمد بن حجر الہیتمی الشافعی، متوفی ۹۷۳ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۱۹ھ
۲۲۸	کنز العمال	علامہ علاء الدین علی المتقی بن حسام الدین الہندی المتوفی ۹۷۵ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۴ھ
۲۲۹	البنایہ فی شرح الہدایہ	علامہ بدر الدین محمود بن احمد عینی حنفی، متوفی ۸۵۵ھ	مکتبہ حقانیہ، ملتان، پاکستان

۲۳۰	تذکرۃ الموضوعات	علامہ محمد طاہر پٹنی حنفی متوفی ۹۸۶ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۰۱ھ
۲۳۱	تذکرۃ الموضوعات	علامہ محمد طاہر پٹنی حنفی، متوفی ۹۸۶ھ	داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ
۲۳۲	المصنوع فی معرفۃ الحدیث الموضوع	امام الفقیہ المحدث علی القاری الہروی المالکی المتوفی ۱۰۱۴ھ	المطبوعات الاسلامیہ، حلب ۱۳۱۴ھ
۲۳۳	الجامع الصحیح	محدث احمد علی سہارنپوری حنفی متوفی ۱۲۹۷ھ	دارالبشائر الاسلامیہ، بیروت، ۱۴۳۲ھ
۲۳۴	مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح	ملا علی سلطان بن محمد القاری المتوفی ۱۰۱۴ھ	المکتبۃ الحقانیہ، پشاور، پاکستان
۲۳۵	لمعات التنقیح فی شرح مشکوٰۃ المصابیح (عربی)	شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ	مکتبہ محمدیہ، کراچی ۱۴۳۳ھ
۲۳۶	اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ المصابیح (فارسی)	شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ	مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ، پاکستان
۲۳۷	حاشیہ مسند امام احمد بن حنبل	علامہ ابوالحسن نورالدین محمد بن عبدالہادی السندی المتوفی ۱۱۳۸ھ	دارالنوادر بیروت، ۱۴۳۳ھ
۲۳۸	تیسیر القاری فی شرح صحیح البخاری	شیخ نورالحق محدث دہلوی حنفی، متوفی ۱۰۷۳ھ	مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ
۲۳۹	فتح المبدی بشرح مختصر الزبیدی	علامہ شیخ عبداللہ بن حجازی الشرقاوی المتوفی ۱۲۲۷ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۹ء
۲۴۰	نیل الاوطار	امام محمد بن علی بن محمد الشوکانی المتوفی ۱۲۵۵ھ	دارالوفاء بیروت، ۱۴۲۱ھ
۲۴۱	کشف مطالب مسلم بن الحجاج	ابوالطیب محمد صدیق خان بن حسن بن علی القنوجی البخاری المتوفی ۱۳۰۷ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۵ھ
۲۴۲	کتاب الجامع فی الاحادیث القدسیہ	مولانا عبدالسلام بن محمد بن عمر علوش	المکتبۃ الاسلامی، ۱۴۲۲ھ
۲۴۳	الفتح الربانی	شیخ احمد بن عبدالرحمٰن البنا الساعاتی متوفی ۱۳۷۸ھ	بیت الافکار الدولیہ، ۲۰۰۷ء
۲۴۴	کشف الاسرار	علامہ علاؤ الدین عبدالعزیز بن احمد البخاری الحنفی متوفی ۷۳۰ھ	مطبوعہ: دارالکتاب العربی ۱۴۱۱ھ

کتب لغت

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر
۲۴۵	المعجم المفہرس لالفاظ القرآن	محمد فواد عبد الباقی	دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۸ھ
۲۴۶	کتاب العین	امام اللغۃ خلیل بن احمد فراہیدی متوفی ۱۷۵ھ	انتشارات اسوہ ایران، ۱۴۱۴ھ
۲۴۷	تاج الصحاح	علامہ اسماعیل بن حماد الجوہری الشافعی المتوفی ۳۹۸ھ	دار المعرفۃ، بیروت، ۱۴۲۹ھ
۲۴۸	الصحاح	علامہ اسماعیل بن حماد الجوہری الشافعی المتوفی ۳۹۸ھ	دار العلم، بیروت، ۱۴۰۴ھ
۲۴۹	المفردات	علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی شافعی متوفی ۵۰۲ھ	مکتبہ نزار مصطفی الباز، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ
۲۵۰	نہایہ	علامہ محمد بن اثیر الجزری الشافعی متوفی ۶۰۶ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۸ھ
۲۵۱	مختار الصحاح	علامہ محمد بن ابوبکر بن عبد القادر رازی حنفی متوفی ۶۶۰ھ	دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۹ھ
۲۵۲	لسان العرب	علامہ جمال الدین محمد بن مکرم ابن منظور افریقی متوفی ۷۱۱ھ	دار صادر، بیروت، ۲۰۰۳ء
۲۵۳	کتاب التعریفات	علامہ علی بن محمد بن علی الجرجانی الحنفی المتوفی ۸۱۶ھ	دار الفکر، بیروت
۲۵۴	القاموس المحیط	علامہ مجد الدین محمد بن یعقوب فیروز آبادی متوفی ۸۱۷ھ	دار احیاء التراث العربی، بیروت
۲۵۵	مجمع بحار الانوار	علامہ محمد طاہر پٹنی حنفی متوفی ۹۸۶ھ	مکتبہ دار الایمان، مدینہ منورہ ۱۴۱۵ھ
۲۵۶	تاج العروس	علامہ سید محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی حنفی متوفی ۱۲۰۵ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۳۳ھ
۲۵۷	لغات القرآن	غلام احمد پرویز متوفی ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۵ء	ادارہ طلوع اسلام گلبرگ، لاہور ۱۹۸۴ء
۲۵۸	دستور العلماء	قاضی عبد النبی بن عبد الرسول احمد نگری حنفی	دار الکتب الاسلامیہ، بیروت ۱۴۲۱ھ
۲۵۹	فیروز اللغات	مولوی فیروز الدین	فیروز سنز، لاہور
	المنجد (عربی)	لوئیس معلوف الیسوعی المتوفی ۱۸۶۷ھ/۱۹۴۶ء	انتشارات اسلام، تہران، ایران ۱۳۷۹ھ

کتب تاریخ، سیرت و فضائل

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر
۲۶۰	المدخل لابن الحاج	ابو عبد اللہ محمد بن محمد العبدری المالکی الشہیر بابن الحاج المتوفی ۷۳۸ھ	دار الفکر، بیروت
۲۶۱	السیرۃ النبویہ	امام ابو محمد عبد الملک بن ہشام المعافری متوفی ۲۱۸ھ	دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۴۱۵ھ
۲۶۲	التاریخ الکبیر	ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم الجعفی البخاری المتوفی ۲۵۶ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۲ھ

نمبر	کتاب	مصنف	مطبوعہ
۲۶۳	الشمائل المحمدیہ والخصائص المصطفویہ	امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ الترمذی متوفی ۲۷۹ھ	المکتبۃ التجاریہ، مکہ مکرمہ ۱۴۱۵ھ
۲۶۴	الشمائل المحمدیہ والخصائص المصطفویہ	امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ الترمذی متوفی ۲۷۹ھ	دارالیسر، مدینہ منورہ ۱۴۲۸ھ
۲۶۵	الکامل فی ضعفاء الرجال	ابواحمد عبداللہ بن عدی الجرجانی المتوفی ۳۶۵ھ	المکتبۃ الاثریہ شیخوپورہ، پاکستان
۲۶۶	دلائل النبوۃ	الحافظ الکبیر ابونعیم الاصبہانی المتوفی ۴۳۰ھ	دارالنفائس
۲۶۷	الاستیعاب	حافظ ابوعمرو یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر مالکی متوفی ۴۶۳ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۶ھ
۲۶۸	تاریخ بغداد	امام ابوبکر احمد بن علی الخطیب البغدادی المتوفی ۴۶۳ھ	دارالفکر، بیروت، ۱۴۲۴ھ
۲۶۹	الشفاء	قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی، متوفی ۵۴۴ھ	عبدالتواب اکیڈمی، ملتان دارالفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ
۲۷۰	الروض الانف	امام ابوالقاسم عبدالرحمن بن عبداللہ بن احمد بن ابوالحسن السہیلی المتوفی ۵۸۱ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۸ھ
۲۷۱	الوفاء باحوال المصطفیٰ	علامہ عبدالرحمن بن علی جوزی حنبلی، متوفی ۵۹۷ھ	مکتبہ نوریہ رضویہ، فیصل آباد
۲۷۲	اسد الغابۃ	علامہ ابوالحسن علی بن ابی الکرم الشیبانی المعروف بہ ابن الاثیر شافعی متوفی ۶۳۰ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت، دارالفکر، بیروت
۲۷۳	جلاء الافہام	امام شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن ابوبکر ابن قیم الجوزیہ المتوفی ۷۵۱ھ	دارالکتاب العربی، بیروت، ۱۴۱۷ھ
۲۷۴	الریاض النضرۃ فی مناقب العشرۃ	امام ابوجعفر احمد الشہیر بالمحب الطبری المتوفی ۶۹۴ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت
۲۷۵	الاشارۃ الی سیرۃ المصطفیٰ وتاریخ من بعدہ من الخلفاء	حافظ علاؤالدین ابوعبداللہ مغلطائی بن قلیج، متوفی ۷۶۲ھ	مطبوعہ: دارالقلم، دمشق ۱۴۱۶ھ
۲۷۶	الاصابہ	حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی شافعی متوفی ۸۵۲ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت
۲۷۷	اللفظ المکرم بخصائص النبی المعظم ﷺ	الحافظ قطب الدین محمد بن محمد بن عبداللہ الخیضری الشافعی المتوفی ۸۹۴ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۷ھ

۲۷۸	وفاء الوفاء	علامہ نور الدین علی بن احمد سمہودی شافعی متوفی ۹۱۱ھ	دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۰۱ھ
۲۷۹	المواہب اللدنیہ	علامہ احمد قسطلانی شافعی متوفی ۹۱۱ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۱۶ھ
۲۸۰	سبل الہدیٰ والرشاد	علامہ محمد بن یوسف الصالحی الشامی المتوفی ۹۴۲ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۴ھ
۲۸۱	تنزیہ الشریعۃ المرفوعہ	ابو الحسن علی بن محمد بن عراق الکنانی المتوفی ۹۶۳ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۰۱ھ
۲۸۲	مدارج النبوۃ	شیخ عبد الحق محدث دہلوی حنفی متوفی ۱۰۵۲ھ	مکتبہ نوریہ، سکھر، پاکستان ۱۳۹۷ھ
۲۸۳	السیرۃ النبویۃ	احمد بن زینی دحلان الحسنی الہاشمی متوفی ۱۳۰۴ھ	مؤسسۃ الکتب الثقافیہ، بیروت، ۱۴۲۱ھ
۲۸۴	سیرت رسول عربی	علامہ نور بخش توکلی	مکتبہ غوثیہ، کراچی

کتب فقہ حنفی وفقہ حنبلی

۲۸۵	عیون المسائل	امام ابو اللیث نصر بن محمد بن ابراہیم سمرقندی متوفی ۳۷۵ھ	مکتبہ مکۃ المکرمہ، کوئٹہ، پاکستان
۲۸۶	بدائع الصنائع	علامہ ابو بکر بن مسعود کاسانی متوفی ۵۸۷ھ	دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۸ھ، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی
۲۸۷	ہدایہ اولین وآخرین	علامہ ابو الحسن علی بن ابی بکر مرغینانی حنفی متوفی ۵۹۳ھ	شرکت علمیہ، ملتان
۲۸۸	المحیط البرہانی	علامہ برہان الدین محمود بن صدر الشریعہ ابن مازہ البخاری متوفی ۶۱۶ھ	ادارۃ القرآن، کراچی، ۱۴۲۴ھ
۲۸۹	المغنی	علامہ موفق الدین عبد اللہ بن احمد بن قدامہ متوفی ۶۲۰ھ	دار الحدیث، القاہرہ، ۱۴۲۵ھ
۲۹۰	مجموعۃ الفتاویٰ	تقی الدین احمد بن تیمیہ الحرانی المتوفی ۷۲۸ھ	دار الجیل، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ
۲۹۱	الشرح الکبیر	شمس الدین عبد الرحمٰن بن محمد ابن احمد بن قدامہ المقدسی المتوفی ۶۸۲ھ	دار الحدیث، القاہرہ، ۱۴۲۵ھ
۲۹۲	بنایہ	علامہ بدر الدین محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ	دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۱ھ
۲۹۳	کشف الغمہ	الشیخ عبد الوہاب بن احمد بن علی الشعرانی المصری المتوفی ۹۷۳ھ	دار الفکر، بیروت، ۱۴۰۸ھ
۲۹۴	البحر الرائق	علامہ زین الدین ابن نجیم متوفی ۹۷۰ھ	علمیہ، مصر ۱۳۱۱ھ
۲۹۵	الدر المختار	علامہ علاؤ الدین محمد بن علی بن محمد حصکفی حنفی متوفی ۱۰۸۸ھ	دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۴۲۶ھ
۲۹۶	رد المحتار	علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی متوفی ۱۲۵۲ھ	دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۴۱۹ھ

۲۹۷	احسن الفتاوی	شیخ رشید احمد گنگوہی دیوبندی متوفی ۱۳۲۳ھ	ایچ ایم سعید کمپنی، ۱۳۲۵ھ
۲۹۸	جد الممتار	اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان فاضل بریلوی متوفی ۱۳۴۰ھ	المجمع الاسلامی، انڈیا
۲۹۹	اعلاء السنن	ظفر احمد العثمانی التھانوی المتوفی ۱۳۹۴ھ	دار الفکر، بیروت، ۱۴۲۱ھ
۳۰۰	الفقہ الحنفی وادلتہ	الشیخ اسعد محمد سعید الصاغرجی الحنفی المتوفی ۱۴۱۳ھ	دار الکلم الطیب، بیروت ۱۴۲۰ھ
۳۰۱	تفہیم المسائل	مفتی اعظم پاکستان مفتی منیب الرحمن	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور

کتب احادیث شیعہ

۳۰۲	الاصول من الکافی	شیخ ابوجعفر محمد بن یعقوب کلینی متوفی ۳۲۹ھ	دار الاضواء، ۱۴۳۱ھ
۳۰۳	الفروع من الکافی	شیخ ابوجعفر محمد بن یعقوب کلینی متوفی ۳۲۹ھ	دار الاضواء، ۱۴۳۱ھ
۳۰۴	تہذیب الاحکام	شیخ ابوجعفر محمد بن حسن طوسی متوفی ۴۶۰ھ	دار الاضواء، ۱۴۳۱ھ
۳۰۵	الاستبصار	شیخ ابوجعفر محمد بن حسن طوسی متوفی ۴۶۰ھ	دار الاضواء، ۱۴۳۱ھ

کتب فقہ شیعہ وکلامیہ

۳۰۶	وسائل الشیعہ الی تحصیل مسائل الشریعہ	محمد بن حسن بن علی بن الحسین الحر العاملی المتوفی ۱۱۰۴ھ	موسسۃ الاعلمی للمطبوعات، بیروت، ۱۴۲۷ھ
۳۰۷	حق الیقین	ملا باقر بن محمد تقی مجلسی متوفی ۱۱۱۰ھ	خیابان ناصر خسرو، ایران
۳۰۸	جلاء العیون	ملا باقر بن محمد تقی مجلسی متوفی ۱۱۱۰ھ	انصاف پریس، لاہور
۳۰۹	حیات القلوب	ملا باقر بن محمد تقی مجلسی متوفی ۱۱۱۰ھ	حمایت اہل بیت وقف، لاہور

کتب علم کلام

۳۱۰	شرح المواقف	سید شریف علی بن محمد الجرجانی المتوفی ۸۱۲ھ	منشورات الشریف الرضی، قم، ایران ۱۳۲۵ھ
۳۱۱	شرح العقائد النسفیہ	امام مسعود بن عمر بن عبد اللہ الشہیر سعد الدین تفتازانی متوفی ۷۹۳ھ	سکندر علی بہادر علی، تاجران کتب دستگیر، کراچی
۳۱۲	شرح المقاصد	امام مسعود بن عمر بن عبد اللہ الشہیر سعد الدین تفتازانی متوفی ۷۹۳ھ	منشورات الشریف الرضی، قم، ایران ۱۴۰۹ھ
۳۱۳	لوامع الانوار البہیہ وسواطع الاسرار الاثریہ	علامہ شیخ محمد السفارینی الحنبلی المتوفی ۱۱۸۸ھ	المکتب الاسلامی، بیروت ۱۴۱۱ھ

۳۱۴	النبراس شرح عقائد	مولانا عبدالعزیز پرہاروی	مکتبہ رضویہ، لاہور ۱۳۹۷ھ

کتب متفرقہ

۳۱۵	الاقتصاد فی الاعتقاد	امام ابوحامد محمد بن محمد غزالی شافعی، متوفی ۵۰۵ھ	دار و مکتبۃ الہلال، بیروت، ۱۹۹۳ء
۳۱۶	اتحاف السادۃ المتقین	امام ابوحامد محمد بن محمد غزالی شافعی، متوفی ۵۰۵ھ	دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۴۱۴ھ
۳۱۷	الیواقیت والجواہر	الشیخ عبدالوہاب بن احمد بن علی الشعرانی المصری المتوفی ۹۷۳ھ	دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۸ھ
۳۱۸	المیزان الکبریٰ	الشیخ عبدالوہاب بن احمد بن علی الشعرانی المصری المتوفی ۹۷۳ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۸ھ
۳۱۹	الکبریت الاحمر	الشیخ عبدالوہاب بن احمد بن علی الشعرانی المصری المتوفی ۹۷۳ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۸ھ
۳۲۰	الطبقات الکبریٰ	الشیخ عبدالوہاب بن احمد بن علی الشعرانی المصری المتوفی ۹۷۳ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۸ھ
۳۲۱	المنن الکبریٰ	الشیخ عبدالوہاب بن احمد بن علی الشعرانی المصری المتوفی ۹۷۳ھ	دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۰ھ
۳۲۲	الملفوظات	اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی متوفی ۱۳۴۰ھ	حامد اینڈ کمپنی، لاہور
۳۲۳	من عقائد اہل السنہ	عبدالحکیم شرف قادری متوفی ۱۴۲۸ھ	منظمۃ الدعوۃ الاسلامیہ، لاہور
۳۲۴	ہدایۃ الحنۃ بذب الحیران فی الاستعانۃ باولیاء الرحمٰن	شیخ الحدیث مولانا اشرف علی سیالوی	جامعہ غوثیہ مہریہ منیر الاسلام، سرگودھا
۳۲۵	نسائیات	پروفیسر ڈاکٹر محمد شکیل اوج متوفی ۱۴۳۵ھ	کلیہ معارف اسلامیہ، جامعہ کراچی، جون ۲۰۱۲ء
[illegible]	[illegible]	پروفیسر ڈاکٹر محمد شکیل اوج متوفی ۱۴۳۵ھ	فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ کراچی، اپریل ۲۰۱۳ء
[illegible]	[illegible]	پروفیسر ڈاکٹر محمد شکیل اوج متوفی ۱۴۳۵ھ	مجلس التفسیر کراچی، جون ۲۰۱۳ء